

فیصل الخطاب

پہا امر اور سید علی نقی ہاشمی



مسلمانان آسمان دارستان

تفسیر فصل الخطاب

جلد دوم

مصنف

سید العلماء علامہ سید علی نقی النقوی

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔

نام کتاب-----تفسیر فصل الخطاب

جلد-----دوم

مصنف-----سیدالعلماء علامہ سید علی نقی العقویؒ لکھنوی

پروف ریڈنگ-----مولانا عابد عسکری

کمپوزنگ-----مجاہد حسین حر (قائم گرافکس۔ جامعہ علمیہ۔ ڈیفنس۔ کراچی)

ترتیب نو-----قلب علی سیال

سال اشاعت-----2011

ناشر-----مصباح القرآن ٹرسٹ

ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر

۲۴۔ الفضل مارکیٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

ابتدائیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ وَاِلَيْهِ الطَّاهِرِيْنَ.

قارئین کرام! تفسیر فصل الخطاب کی دوسری جلد پیش خدمت ہے لیکن افسوس صد افسوس کہ سید العلماء علامہ سید علی نقی القنوی اب ہم میں نہیں رہے۔ میں نے ۲۹ مارچ ۱۹۸۶ء کو تفسیر کے چند خصوصی نسخے لے کر سرکار مدوح کی خدمت میں حاضری دی تو معلوم ہوا کہ آپ علیل ہیں اور کسی سے نہیں ملتے۔ بہت دکھ ہوا اور تشویش بھی بہر حال میں نے اپنا وہ نام کہنا بھجوا یا جس نام سے آپ مجھے یاد فرمایا کرتے تھے۔ آدمی واپس آیا، اس نے بیٹھک کھول دی اور مجھے انتظار کرنے کو کہا، تھوڑی دیر میں مولانا برآمد ہوئے، کافی دیر گفتگو ہوئی اور پھر خورد و نوش کا سلسلہ بھی چلا۔ میں نے تفسیر کے دو نسخے پیش کیے، تیسرے پر تبرک کے طور پر ان سے دستخط کروا لئے اور ساتھ لے آیا۔ مولانا نے تفسیر کو تھوڑی دیر دیکھا اور فرمایا: ”دیر آید درست آید“۔ کسے خبر تھی کہ یہ مولانا سے آخری ملاقات ہے اور پھر کبھی شرف نیاز حاصل نہ ہوگا۔

سید العلماء ۲۹، ۳۰ رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۹۸۸ء رحلت فرما گئے اور عین عید الفطر کے دن مدفون ہوئے۔ خداوند عالم ان کو جو ار معصومین میں جگہ عطا فرمائے۔

آہ! وہ شبح جو ۲۶ رجب ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء لکھنؤ میں روشن ہوئی تھی بگلی ہو گئی۔

افسوس کہ آج وہ ہم میں نہیں ہیں مگر وہ ہم میں روحانی طور پر موجود اور ہمارے دل و دماغ پر محیط ہیں۔ آج بھی ان کے علمی نکات ہم کو یاد آتے ہیں اور دین و دیانت اور اخلاق و شرافت سے ہماری محبت کو مستحکم کرتے ہیں۔ اب ایسی صلح کل ہستیاں کہاں ہیں جو علم و عمل کے میدان میں اسلامی تعلیمات و اقدار کی امین ہوں اور دنیا کی مشکلات میں ہمارے مژدہ فتح مبین ہوں۔

تفسیر فصل الخطاب کی پہلی جلد کی اشاعت کے تھوڑے دنوں بعد ہی ”مصباح القرآن ٹرسٹ“ لاہور نے جو تفسیر نمونہ کے ناشر ہیں خواہش ظاہر کی کہ تفسیر فصل الخطاب کی اشاعت کی ان کو اجازت دے دی جائے۔ مختلف مواقع پر اس سلسلہ میں گفتگو ہوئی لیکن نتیجہ خیز نہ ہو سکی۔ ستمبر ۱۹۹۰ء کے آخری دنوں میں میری بیرون ملک سے واپسی پر پھر گفتگو ہوئی اور طے پایا کہ تفسیر فصل الخطاب کی اشاعت مصباح القرآن ٹرسٹ کی طرف سے اور پیشکش ادارہ ترویج علوم اسلامیہ کی طرف سے ہو۔ چنانچہ ادارہ ترویج علوم اسلامیہ نے دوسری جلد کا کتابت شدہ مسودہ مصباح القرآن ٹرسٹ کے حوالے کر دیا تا کہ اشاعت کا کام مصباح القرآن ٹرسٹ کے اہتمام و انصرام کے تحت انجام پاسکے اور تفسیر فصل الخطاب کی جلدیں بہ سرعت شائع ہوتی رہیں۔ الحمد للہ کہ مصباح القرآن ٹرسٹ نے اب نئے سرے سے مکمل تفسیر کی کمپوزنگ کروائی ہے اور قارئین کی سہولت کیلئے اشاعت ہذا میں تین جلدوں پر مشتمل تفسیر فصل الخطاب کو مکمل شائع کر دیا ہے۔ چنانچہ مذکورہ تفسیر کی دوسری جلد حاضر خدمت ہے، امید ہے کہ قارئین اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں گے اور تعاون فرمائیں گے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

سید علی اکبر رضوی

صدر ادارہ ترویج علوم اسلامیہ

کراچی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عرض ناشر

سرکار سید العلماء علامہ علی نقوی نقوی اعلیٰ اللہ مقامہ کے خطیبانہ و مولفانہ فیوض و برکات کا سلسلہ لگ بھگ پچاس سال پر محیط ہے۔ آپ کی تقریر و تحریر میں بیان و زبان کی سادگی اور مفاہیم و مطالب کی گہرائی یکساں طور پر موجود رہی ہے یہی وجہ ہے کہ آپ کو برصغیر پاک و ہند کے جمہور مسلمین میں عموماً اور شیعہ مومنین میں خصوصاً مقبولیت اور ادب و احترام نصیب ہوا کہ باید و شاید!

سید العلماء کے آثار علمی میں ”شہید انسانیت“ سمیت دسیوں با عظمت کتابیں، آپ کے کئی ایک مجموعہ ہائے تقاریر اور مختلف دینی موضوعات پر کم و بیش پانچ سو رسالے موجود ہیں۔ تاہم آج سے ۲۵ برس قبل جب آپ کا مقدمہ تفسیر قرآن منظر عام پر آیا تو آپ کے تبحر علمی تحقیقی صلاحیت اور ذمہ دار قلم کی رعایت سے اپنے بیگانے ہر ایک کی نظریں آپ کی تفسیر قرآن کی طرف لگ گئیں۔

اس سلسلے میں خاص و عام کے ذوق و شوق کا یہ عالم تھا کہ آپ کی تفسیر آئندہ جلد کی تلاش میں پاکستان کے لوگ ہندوستان جاتے اور وہاں کے لوگ پاکستان آتے، نیز دیگر ممالک میں مقیم مسلمان اس کے لئے ہندو پاک کے کتب خانوں سے برابر رابطہ رکھتے تھے۔ آخر کار ان ہزاروں منتظر اور متلاشی نگاہوں کی تسکین کا سامان یوں ہوا کہ سید العلماء کے ایک نہایت ہی مخلص قدر شناس غلام محمد بٹ نے ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۸ء تک کی مدت میں شریک (مقبوضہ کشمیر) سے آپ کی تفسیر قرآن ”فصل الخطاب“ کی سات جلدیں شائع کر کے اس اہم فرض کی تکمیل کا اعزاز حاصل کر لیا۔

اس اثناء میں مذکورہ تفسیر کی پاکستان میں اشاعت کی ضرورت کا احساس فرماتے ہوئے سید العلماء نے ادارہ ترویج علوم اسلامیہ کراچی کے صدر سید علی اکبر رضوی کو بھی اس کی اشاعت کے حقوق مرحمت فرمادیئے۔ چنانچہ اس ادارے نے تفسیر فصل الخطاب کی جلد اول شائع کر دی لیکن بوجہ یہ سلسلہ کچھ آگے نہ بڑھ سکا لہذا سید علی اکبر رضوی نے مصباح القرآن ٹرسٹ کی شاندار تفسیری و علمی خدمات کو دیکھتے ہوئے ایک معاہدے کے تحت اس تفسیر کی اشاعت کا عظیم کام اس ٹرسٹ کے حوالے کر دیا۔ بنا بریں مصباح القرآن ٹرسٹ نے تفسیر فصل الخطاب کی اشاعت کو خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ جلد اول جو کہ کراچی کے ادارہ ترویج علوم اسلامیہ نے شائع کی تھی، کے ختم ہونے پر مصباح القرآن ٹرسٹ نے اسے دوبارہ شائع کرنے کی سعادت حاصل کی، اس کی اصلاح و تزئین میں مقدور بھر کوشش کی گئی، اس کے باوجود ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ آپ ہمیں اپنی تجاویز و آراء سے مستفید فرمائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی آخر میں دردمندانہ گزارش بھی کرتے ہیں کہ تفسیر ہذا کی ترویج میں ہمارے ساتھ ہر ممکن تعاون فرما کر قرآن و عترت کی نصرت اور سید العلماء کی قدر دانی کا حق ادا کرنے میں کوشاں رہیں۔

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

ضرورت تفسیر

قرآن مجید جب خود نور، ہدایت، بصیرت، آسان، واضح اور احسن (وبہترین) تفسیر ہے تو پھر تفسیر کی کیا ضرورت ہے؟
جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات قرآن میں ہے:

وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا. (فرقان--۳۳)

اور یہ لوگ کوئی بھی مثال نہ لائیں گے مگر یہ کہ ہم اس کے جواب میں حق اور بہترین بیان (وتفسیر) لے آئیں گے

فَاتِمَّا يَسْتَكْرَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ. (دخان--۵۸)

درحقیقت ہم نے اس (قرآن) کو آپ کی زبان پر بالکل آسان قرار دیا ہے، شاید وہ نصیحت قبول کریں۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّاكِرٍ. (قمر--۱۴)

”اور بلاشبہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنایا ہے تو ہے کوئی جو نصیحت قبول کرے۔“

قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ. (زمر--۲۸)

”عربی زبان کا قرآن جس میں کوئی کجی نہیں، شاید کہ وہ پرہیزگاری اختیار کریں۔“

قرآن مجید نے نہ فقط اس سوال کا جواب دیا ہے بلکہ یہ بھی بتا دیا ہے کہ مفسر قرآن کون ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ. (نحل--۴۳)

”اے رسول! ہم نے قرآن کو آپ پر نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کے لئے ان تمام احکام وغیرہ کو بیان کریں (اور ان

کی توضیح و تشریح کریں) جو ان کی طرف بھیجے گئے ہیں شاید وہ غور و فکر سے کام لیں۔“

ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا. (فاطر--۳۲)

”پھر ہم نے کتاب کا وارث بنایا انہیں جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے منتخب کیا۔“

مذکورہ آیات میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ قرآن مجید کے لئے مفسر کی ضرورت ہے اور مفسر قرآن سب سے پہلے

خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے ان کے بعد وہ مفسر قرآن ہیں جو وارث قرآن، وارث علم قرآن اور وارث علم پیغمبر ہیں یعنی

اہل بیت و عترت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔ جیسا کہ خود پیغمبر نے بھی فرمایا:

”إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمْ الثَّقَلَيْنِ ----- كِتَابِ اللَّهِ وَعِزَّتِي أَهْلَ بَيْتِي -----“

میں آپ لوگوں کے پاس دو گرا نقدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں ایک کتاب خدا (قرآن مجید) اور دوسری اپنی عترت (یعنی اہلبیت)۔

اہل بیت و عترت پیغمبرؐ کے بعد تفسیر قرآن کی ذمہ داری اُن علماء پر ہے جو انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کے حقیقی وارث اور ”الْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ“ کے مصداق ہیں۔

انہی علماء میں سے ایک حضرت آیت اللہ علامہ السید علی نقی النقوی المعروف ”علامہ نقی“ ہیں۔ جنہوں نے تفسیر فصل الخطاب لکھ کر احسن طریقہ سے فریضہ الہی انجام دیا۔

تفسیر فصل الخطاب سے قرآن مجید کا ترجمہ و حاشیہ مرتب کرتے وقت جس حد تک میں نے اس تفسیر کا مطالعہ کیا ہے تو تفسیر کی مختلف اقسام (مثلاً تفسیر روانی، تفسیر عرفانی اور تفسیر اجتہادی) میں سے فصل الخطاب کو تفسیر اجتہادی قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ علامہ موصوف نے اس تفسیر میں ان تمام علوم سے استفادہ کیا ہے جو ایک جامع اور اجتہادی تفسیر کے لئے ضروری ہیں۔

یہ تفسیر اگرچہ سابقہ کتابت کے مطابق چند مرتبہ مختلف اداروں کی طرف سے شائع ہو چکی ہے لیکن اب خداوند عالم نے خادین ادارہ مصباح القرآن لاہور مخصوصاً جناب محترم شیخ محمد امین صاحب کو یہ توفیق عنایت فرمائی کہ وہ اسے کمپوز کروا کر خوبصورت انداز میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ کمپوز اور اصلاح کا کام جناب محترم مجاہد حسین حرص صاحب کے سپرد کیا گیا انہوں نے اپنی حد تک کوشش کی لیکن اتنے بڑے کام میں نواقص اور غلطیوں کا باقی رہنا فطری امر ہے۔ قارئین محترم سے گزارش ہے کہ نواقص کے سلسلہ میں راہنمائی فرمائیں تاکہ بعد والے ایڈیشن میں اصلاح کر دی جائے۔

دعا ہے کہ خداوند عالم بانی ادارہ مصباح القرآن حضرت حجۃ الاسلام والمسلمین مرحوم علامہ سید صفدر حسین نقوی النجفی قدس سرہ کے درجات بلند فرمائے۔ ان کے قائم کردہ تمام ادارات کو ترقی و کمال عطا کرے مصباح القرآن و دیگر ادارات کی تاسیس میں ان کے معاون خاص محترم جناب سیٹھ نواز صاحب دام عزہ کو صحت و سلامتی اور طول عمر عطا کرے۔

علامہ مرحوم کے قائم کردہ تمام اداروں کے سرپرست اعلیٰ اور ان کے روحانی جانشین حضرت آیت اللہ حافظ ریاض حسین نقوی النجفی دامت برکاتہ کو صحت و سلامتی اور طول عمر بابرکت عطا فرمائے اور ان کا سایہ ہم سب کے سروں پر قائم و دائم رکھے۔ تمام معاونین و خادین ادارہ مصباح القرآن مخصوصاً جناب محترم محمد امین صاحب کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور انہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

سید فیاض حسین نقوی

جامعہ علمیہ۔ ڈیفنس۔ کراچی

ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ مارچ ۲۰۱۱ء

تفسیر فصل الخطاب

چند تاثرات

ڈاکٹر محسن نقوی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ وَعَلٰی اٰلِهِ الطَّيِّبِیْنَ
الطَّاهِرِیْنَ الَّذِیْنَ اَذْهَبَ اللّٰهُ عَنْهُمْ الرَّجْسَ وَطَهَّرَهُمْ تَطْهِیْرًا.

ہماری خوش نصیبی ہے کہ برصغیر پاک و ہند کی عظیم ترین علمی شخصیات میں سے فرد و حید و عالم جلیل سید العلماء علامہ سید علی نقوی (۲۶ رجب ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء۔ ۲۹ رمضان ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۷ مئی ۱۹۸۸ء) کی تفسیر فصل الخطاب کی طبع نو کے موقع پر اس کے بارے میں کچھ خیالات کے اظہار کا موقع ہمیں فراہم ہوا۔

ایک پوتے کے لئے اپنے جد (سید العلماء ہمارے والد کے چچا تھے) کی کسی کتاب پر لکھنا وہ بھی ”سید العلماء“ جیسی علمی شخصیت کی کتاب، اُس پر مستزاد ”تفسیر القرآن“ جیسا وسیع و دقیق موضوع اس بے بضاعت کے لئے بہت مشکل کام تھا لیکن توفیق الہی (عزوجل) اور ولی العصر، صاحب الزمان علیہ الصلاۃ والسلام اور اُن کے اجداد کرام، صلوٰۃ اللہ علیہم کی ہدایت کے توسل سے کچھ عرض کرنے کی جسارت کر رہے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں قرآن مجید کے اردو تراجم کی ابتداء سید العلماء کے اجداد میں سید علی نقوی (۱۲۰۰ھ/۱۲۵۹ھ برطابق ۱۷۸۵ء۔۔ ۱۸۴۳ھ) ابن سید دلدار علی غفرانمآب کے حصے میں آئی۔ آپ کا ترجمہ قرآن شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین سے پہلے قرار پاتا ہے۔ اس ترجمے کی زبان قدیم لیکن سلیس اور با محاورہ ہے۔ اس کا ایک نسخہ پیر ابراہیم ٹرسٹ کراچی کی لائبریری، ناظم آباد میں موجود ہے۔

یوں تو علمائے شیعہ نے قرآن مجید کے بہت سے ترجمے اور حواشی قلم بند کئے جن میں مولانا فرمان علی (۱۸۵۳ء--۱۹۱۶ء) اور مولانا مقبول احمد علی اللہ مقامہما (۱۸۷۰ء--۱۸۸۶ء) کے تراجم و حواشی کو خاص شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسی طرح اردو تفاسیر میں مولانا عمار علی رحمۃ اللہ علیہ (۱۸۲۸ء--۱۹۷۵ء) کی تفسیر ”عمدۃ البیان“ (۳ جلدیں) ایک متوسط حجم کی تفسیر شمار کی جاتی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد مولانا امداد حسین کاظمی (۱۹۰۱ء--۱۹۷۵ء) کا ترجمہ و حاشیہ تفسیر متقین ہماری نظر میں فرمان علیؒ اور مقبول احمدؒ کے تراجم و حواشی پر بوجہ فوقیت رکھتا ہے۔ اردو تفاسیر میں اس کے بعد علامہ حسین بخش جاڑا صاحب کی تفسیر ”انوار الخف“، تفسیر کے شائقین کا مرکز رہی، اسی طرح علامہ ذیشان حیدر جوادیؒ کا ترجمہ و حاشیہ بھی اس بناء پر نظر استحسان دیکھا جاتا ہے کہ ترجمہ انتہائی رواں اور حواشی عام قاری کے لئے سہل ہیں۔ آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی (دام ظلہ الوارف) کی زیر نگرانی تیار ہونے والی ”تفسیر نمونہ“ کا ترجمہ انتہائی دیانت و عرق ریزی سے کیا گیا اور اس نے خاص حد تک ایک ایسی تفسیر کی کمی پوری کر دی جو طلباء، کالج و یونیورسٹی کے پروفیسروں اور علماء کے لئے ”حوالے“ کا کام دے اور وہ اس کے ذریعے اپنی ”قرآن فہمی“ میں اضافہ کر سکیں۔ جزاء ہم اللہ احسن الجزاء جس دوران تفسیر نمونہ کی جلدیں طبع ہو کر آ رہی تھیں اسی دوران سید العلماءؒ کی تفسیر ”فصل الخطاب“ پہلے سات جلدوں میں کشمیر سے چھپی، پھر ایک جلد ادارہ ترویج علوم اسلامیہ سے اور بعد ازاں مصباح القرآن ٹرسٹ نے اس کا پورا سیٹ اچھے انداز میں طبع کیا۔

قرآن مجید کے طالب علم کی حیثیت سے عالم اسلام میں مختلف مکاتب فکر و فقہ کی تفاسیر شائع ہونے کے ساتھ زیر مطالعہ رہتی ہیں تو اپنے مکتب فکر کی اردو تفاسیر و حواشی بھی ہمیشہ زیر نظر رہتے ہیں جو اپنی قدر و قیمت میں کچھ کم نہیں جن میں سے بعض کا ذکر ماقبل ہم کر چکے۔

سید العلماءؒ کی تفسیر کی خاص بات جس نے ہمیں متاثر کیا وہ اس کا ”تفسیری ترجمہ“ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سید العلماءؒ کی ساری محنت و ژرف نگاہی آیات کے ترجمے میں مضمر ہے اور یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔

سید العلماءؒ کسی بھی آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے صرف عربی زبان، نحو و بلاغت، معانی و بدائع کو مد نظر نہیں رکھتے بلکہ اہل بیت علیہم السلام کی احادیث اور ان کو مد نظر رکھ کر لکھی جانے والی تفاسیر مثلاً شیخ طوسیؒ کی التبیان، محسن فیض الکاظمی کی الصافی، تفسیر قمی علامہ طبرسیؒ کی تفسیر مجمع البیان وغیرہ میں پیش کئے گئے مطالب کو اردو ترجمے میں سمو دیتے ہیں اور تا سیداً متعلقہ تفسیر کی متعلقہ عبارت کو مختصراً نقل کر دیتے ہیں۔ تفسیری مواد اس ترجمے ہی کی وضاحت ہوتی ہے۔ اسی لئے ترجمے میں لفظ پر لفظ نہیں رکھا ہے

بلکہ اُسے اُردو محاورے کے مطابق ادا کیا ہے۔ نمونے کے طور پر بعض مقامات پیش خدمت ہیں:

(۱) سورہ آل عمران کی آیت ۱۱۹ کے ایک جزء:

وَإِذَا خَلَوْا عَصَوْا عَالِيَكُمْ الْكَامِلَ مِنَ الْعِظِطِ

اس کا ترجمہ سید العلماء نے یہ کیا ہے: اور جب تخلیہ ہوتا ہے تو تمہارے خلاف غیظ و غضب سے اپنی بوٹیاں کاٹتے ہیں۔ اس کے بعد حاشیے میں پہلے مولانا فرمان علی کا ترجمہ دیا ہے ”تم پر غصے کے مارے انگلیاں کاٹتے ہیں“۔ پھر ان ہی کا حاشیہ نقل کیا ہے: اس ”الانامل“ کے اصلی معنی پوروں کے ہیں مگر چونکہ اردو محاورہ میں پوروں کا کاٹنا نہیں بولتے ہیں اس وجہ سے یہ ترجمہ کیا گیا ہے۔

بعد ازاں سید العلماء وضاحت کرتے ہیں: مگر حقیقت یہ ہے کہ اردو میں تو انگلیاں کاٹنا بھی محاورہ نہیں ہے، اس لئے ہم نے ترجمہ بوٹیاں کاٹنے کے ساتھ کیا ہے، (فصل الخطاب، ج ۳ ص ۷۳)

علامہ جوادی نے ترجمہ یوں کیا ہے: جب اکیلے ہوتے ہیں تو غصے سے انگلیاں کاٹتے ہیں۔ تفسیر نمونہ کے اردو ترجمے میں ہے: جب وہ تنہائی میں ہوتے ہیں تو شدید غیظ و غضب سے اپنی انگلیاں کاٹنے لگ جاتے ہیں۔ (ج ۳ ص ۶۴) سید العلماء کا ترجمہ عربی سے قریب اور اردو محاورے کے مطابق ہے۔

(۲) سورہ آل عمران ہی کی آیت ۱۵۴ کے پہلے جزء میں فرمایا:

ثُمَّ أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِ الْغَمِّ أَمْنَةً نُّعَاسًا يَغْشَى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۖ وَطَآئِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ

أَنْفُسُهُمْ...

علامہ جوادی نے ترجمہ یوں کیا ہے: ”اس کے بعد خدا نے ایک گروہ پر پرسکون نیند طاری کر دی اور ایک کو نیند بھی نہ آئی کہ اسے صرف اپنی جان کی فکر تھی“

اس ترجمے میں ایک تو ”غم“ کا ذکر نہیں ہے، دوسرے تاکہ ”أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ“ میں جو عمومیت ہے وہ مفقود ہے۔ تیسرے قرآن مجید کے الفاظ ”وَطَآئِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ...“ کا ترجمہ مبہم ہے ”اور ایک کو...“ یہاں مفرد کا گمان ہوتا ہے اگر ”گروہ“ کا اضافہ ہوتا اور ”ایک“ کی بجائے ”دوسرے“ ہوتا تو قرآنی الفاظ کی رعایت بھی ہوتی اور مطلب واضح ہوتا۔

سید العلماء نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: پھر اُس نے رنج و غم کے بعد تم پر سکون و اطمینان اتارا نیند کی صورت سے جو تم

میں سے ایک گروہ پر طاری ہو رہی تھی اور ایک گروہ ایسا تھا جسے اپنی جانوں کی فکر تھی۔ (ج ۳ ص ۷۷)

اس کی تائید میں انہوں نے علامہ طبرسیؒ کی تفسیر مجمع البیان کے الفاظ نقل کئے ہیں۔

(۳) سورہ نساء کی آیت ۹۱ کا ایک جزء ہے:

كَلَّمَآرُذُوآلِ الْفِتْنَةِ أُرْكَسُوآ فِيهَا.

علامہ جوادیؒ نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے: یہ جب بھی فتنے کی طرف بلائے جاتے ہیں اُلٹے اس میں اوندھے منہ گر

پڑتے ہیں۔

الفاظ قرآن میں ”بلائے جاتے ہیں“ کسی لفظ کا ترجمہ نہیں ہے۔

شیخ الہند محمود الحسن دیوبندی نے ترجمہ یوں کیا ہے: جب کبھی لوٹائے جاتے ہیں وہ فساد کی طرف تو اس کی طرف لوٹ

جاتے ہیں۔

”أُرْكَسُوآ فِيهَا“ کے بنیادی معنی: ”یعنی وقعوا فیہا“ (التمیاز للطوسی) یعنی ”پڑجانا“ واقع ہو جانا اس کو تائیداً

نقل کر کے سید العلماءؒ نے ترجمہ یوں کیا ہے: اور جب فتنہ پردازی کا دوبارہ موقع ملے تو وہ اس میں بالکل جُٹ جائیں

گے۔ (فصل الخطاب ج ۳ ص ۲۶۹) ”جُٹ جانا“ اردو محاورہ ہے جس میں تن دہی سے کسی کام میں دلچسپی سے لگے رہنے کا

مفہوم ہے اور یہی ”أُرْكَسُوآ فِيهَا“ کا درست ترجمہ ہے۔

ایسی بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن ہم اسی پر اکتفاء کرتے ہیں۔

درج بالا سطور سے سید العلماءؒ کی تفسیر فصل الخطاب کی چند خصوصیات مستفاد ہوتی ہیں جو یہ ہیں:

۱۔ الفاظ قرآنی کی بالالتزام رعایت

۲۔ لفظی ترجمے کی بجائے محاوراتی ترجمہ اور لکھنوی اردو محاورے کی مطابقت

۳۔ ترجمے میں عقلی و منطقی اظہار اور ربط کا لحاظ

۴۔ طوالت سے گریز

۵۔ مستند تفاسیر کے طویل اقتباسات سے گریز

۶۔ تفاسیر کے مختصر اقتباسات سے استشہاد

- ۷۔ احادیث کے طویل مندرجات کی بجائے محض متعلقہ حصے کا اقتباس و اشارہ
- ۸۔ تاریخی واقعات کی طرف اشارہ اور تفصیل سے اجتناب
- ۹۔ تفسیر میں نہ اتنی طوالت کہ قاری پر بار ہو جائے اور نہ ایسا اطناب کہ وہ حاشیے میں شمار ہو۔
- ۱۰۔ وہ مضامین جن کی ادائیگی عوام میں خلاف ادب سمجھی جاتی ہے اُس کے لئے ایسے الفاظ کا استعمال جن سے وہ دائرہ ادب و ستر سے باہر بھی نہ نکلیں اور مطلب بھی ادا ہو جائے۔ مثلاً سورہ نساء کی آیت ۶ کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں: ”بلوغ کا تعلق تو عمر کے ساتھ ہے جو لڑکے میں ۱۵ برس اور لڑکی میں ۹ برس ہے یا خاص کیفیات جو علامت بلوغ کی حیثیت سے معتبر ہیں“۔ (ج ۳ ص: ۱۴۴)
- ۱۱۔ فقہی آیات احکام کی وضاحت میں فقہی مسائل کو اپنی پوری فقہی مہارت سے بیان فرمایا ہے مگر اس کو بہت قابل فہم انداز میں تحریر فرمایا تاکہ مسائل سمجھ میں آسکیں۔ مثلاً سورہ نساء کی آیات ۱۸۔
- قابل مبارک باد ہیں مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور کے مسؤلین و منتظمین جو قرآن مجید کی خدمت کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ علوم اہل بیت علیہم السلام کو بھی نشر کر رہے ہیں اس طرح اللہ تعالیٰ ان سے فرمان خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم: ”میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں: قرآن و اہل بیت جب تک ان سے تمسک رکھو گے کبھی گمراہ نہ ہو گے“ پر عمل بھی کروا رہا ہے اور تقلین کی خدمت بھی۔

ابن سعادت بہ زور بازو نیست

تأنہ بخشد خدائے بخشدہ

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کے مساعی کو قبول فرمائے اور انہیں ”تقلین“ کی بیش از بیش خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین

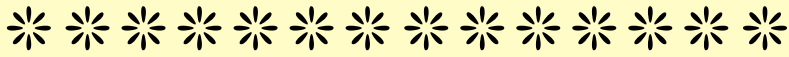
خادم الثقلین

ڈاکٹر محسن نقوی

۲۶ مارچ ۲۰۱۱ء کراچی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے



فہرست کتاب

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
96	انسانی زندگی کی رفعت اور اس کی غرض و غایت	21	سُورَةُ الْأَنْعَامِ
97	سُورَةُ الْأَعْرَافِ	22	سورہ انعام کے خاص موضوعات
97	سورہ اعراف کے خاص خاص مضامین	26	انبیاء اور تمام معصومین و انبی بشر ہوتے ہیں، نہ کہ فقط بصورت بشر
101	اعمال کا وزن	43	رہنمائی کے ذہنیت کے مقابلہ میں غریبوں کی دل جوئی
106	جناب آدم و حوا علیہما السلام سے ابلیس کی دوسرا انگیزہ گفتگو	46	خالق کے علم کی ہمہ گیری
106	لباس بہشت کا جناب آدم و حوا علیہما السلام کے جسم سے جدا ہونا	52	جناب ابراہیم علیہ السلام کے والد کون؟ آذریا تارخ؟
108	اچھے لباس اور اچھی غذا سے پرہیز ضروری نہیں		حضرت ابراہیم علیہ السلام کا توحید پر استدلال اجرام سماویہ کی الوہیت کی
112	شراب کی حرمت	54	نہی اور اللہ حق کا اثبات
116	کافروں کا بہشت میں جانا غیر ممکن	61	قمری حساب کا اعتبار
116	بہشت میں قلبی کدورتیں دور ہو جائیں گی مگر کون سی؟	63	نہی رویت
118	اہل بہشت اور اہل دوزخ کی دلچسپ اور عبرت انگیز گفتگو	66	روداداری کی تعلیم اور معبودان باطل کے سب و شتم سے ممانعت
119	اعراف کا ذکر	69	عدل الہی
124	فساد پھیلانے سے ممانعت	70	اکثریت معیار حق نہیں
125	پاکیزہ اور ناپاک زمینوں کا تذکرہ	73	رسالت بر بنائے بلندی و اوصاف
126	جناب نوح علیہ السلام کی تعلیم اور ان کی قوم کا رویہ	76	تکلیف بلا بیان قبیح ہے
127	جناب ہود علیہ السلام کی تعلیم، ان کی قوم کا رویہ اور آخری انجام	81	مشرکین کی تاریک ذہنیت اور افسوس ناک بدعت
130	جناب صالح علیہ السلام کی تعلیم، ان کی قوم کا رویہ اور آخری انجام	81	اولاد کشی کی مذمت
131	جناب لوط علیہ السلام کی تعلیم، قوم لوط کی بدکاری اور اس کا انجام	87	مشرکین کے بدعت اور ان کی مذمت
132	جناب شعیب علیہ السلام کی تعلیم اور ان کی قوم کا رویہ	89	اپنی بد اعمالیوں کی ذمہ داری تقدیر پر رکھنا غلط ہے
134	قوم شعیب کا رویہ اور انجام	91	کچھ اہم محرمات شرع کی فہرست
140	حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا تفصیلی تذکرہ، اور فرعون کا انجام	94	فرقہ بندی کی مذمت
146	بنی اسرائیل کی دل شکن باتیں	95	کافرو گناہگار کا وجود انسان کے فاعل مختار ہونے کا ثبوت ہے
150	تیس راتوں کا وعدہ اور مزید دس کا اضافہ۔ بداء کا کھلا ہوا نمونہ	95	اپنی بد اعمالیوں کی ذمہ داری تقدیر پر رکھنا غلط ہے

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
218	جہاد کی تیاری اور رباط کا حکم	152	دیدارِ خدا کا سوال اور اس کا انجام
219	مخالفین کے ساتھ صلح کا حکم	156	گوسالہ پرستی
220	بندگان الہی کے مددگار ہونے کا ثبوت	157	جناب موسیٰ علیہ السلام کا جناب ہارون علیہ السلام پر بظاہر عتاب
221	وہابیت شکن قرآنی صراحت	162	”النبی“ اس کے اوصاف اور توریت و انجیل میں اس کا تذکرہ
221	ایک اور دن کے مقابلہ کا حکم	163	رسالت محمدی کی ہمہ گیری
222	مسلمانوں میں کمزوری کا ثبوت	164	اسباط بنی اسرائیل کی تعداد
223	قیدیوں کے بارے میں الہی منشا کا اعلان	165	اہل سبت کا ذرا تفصیلی تذکرہ
228	سُورَةُ الْبُرُوجِ	167	اہل سبت کا عذاب الہی سے مسخ ہو جانا
229	سورہ براءت کے خاص خاص مضامین	170	عہد اکت اور عالم ذر
230	اس سورہ کے آغاز کی خصوصیت	174	ایک عالم عیسیٰ کا حال
	مشرکین سے معاہدہ سابق کی منسوخی اور ان سے قطعی تبرا یعنی ترک	179	قیامت کے وقت کا علم کسی کو نہیں
231	موالات کا اعلان	187	قرآن کی تلاوت کے وقت خاموشی کا حکم
233	پناہ کے طلبگار مشرکوں کو پناہ دینے اور ان کی حفاظت کی ذمہ داری کا حکم	189	سُورَةُ الْاَنْفَالِ
236	مساجد الہی کا احترام اور کافروں کے داخلہ کی ممانعت	189	سورہ انفال کے خاص خاص مضامین
239	جنگِ حنین کا تذکرہ اور باوجود کثرتِ تعداد مسلمانوں میں ابتری اور انتشار	190	انفال کے متعلق حکمِ خداوندی
244	آخر میں دین اسلام کے غالب آنے کا اعلان	192	جنگ بدر کا پس منظر
244	اکتزاز کی مذمت اور اس کی سزا	195	فرشتوں کا جنگ بدر میں اترنا ہی نہیں بلکہ جنگ کرنا
245	مہینوں کی تعداد بارہ اور چار محترم جن میں جنگ و جدل حرام ہے	196	میدان جنگ سے فرار کا باعث دوزخی ہونا
246	نسی یعنی مہینوں کی تبدیلی کی شدید مذمت	198	گمراہ اور پست کردار انسان جانوروں سے بدتر
248	شبِ ہجرت کا مختصر حال	200	سرزمین مکہ میں مہاجروں کا عالم پریشانی
253	جہاد کے موقع پر مسلمانوں کی پست ہمتی اور کمزوری کے نمونے	202	حفاظت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خداوند عالم کی تدبیریں
257	مستحقین زکوٰۃ کا بیان	204	وجود رسول صلی اللہ علیہ وسلم مانع نزول عذاب
263	کفار کے ساتھ ساتھ منافقین سے بھی جہاد کا حکم	205	بموقع حج مشرکین کے لغویات
268	کھلے ہوئے منافقین کی نمازِ جنازہ سے ممانعت	208	خمس کا صریح حکم
272	صحرائی عربوں کی مذمت	209	جنگ بدر کے کچھ کیفیات
273	اسلام میں سبقت رکھنے والوں کی تعریف	212	میدان جنگ میں برقرار رہنے کی تاکید
276	مسجد ضرار کا ذکر	212	تنازع باہمی کے خراب نتائج
278	مشرکین کے لئے استغفار کی ممانعت	215	خدا کی نعمتوں میں تبدیلی خود اپنے نفوس کی تبدیلی کا نتیجہ

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
359	اوقات نماز میں صبح، ظہرین اور مغربین، تین وقتوں کا تذکرہ	279	جناب ابراہیم کے استغفار کا پس منظر
363	سُورَةُ تِیُّوْ سَفِّ	280	تکلیف بلا ایسا کا صحیح نہ ہونا
363	سورہ یوسف کے خاص خاص موضوعات	282	صادقین کے ساتھ رہنے کا حکم
365	جناب یوسف علیہ السلام کا خواب اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے گفتگو	283	تحصیل علم دین کے لئے سفر کا حکم و جوہ کفائی
365	برادران یوسف کا منصوبہ اور یوسف کے ساتھ بدسلوکیاں	287	اوصاف پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم
369	تذکرہ عزیز مصر و زلیخا	288	سُورَةُ تِیُّوْ نَسِّ
370	واقعہ یوسف و زلیخا	288	سورہ یونس، خاص مضامین
373	چاک دامانی دلیل پاک دامانی	291	اسلام میں ماہ و سال کے قمری حساب کا اعتبار
375	جناب یوسف قید خانہ میں	292	اہل بہشت کا سلام - سلام علیکم
379	بادشاہ مصر کا خواب اور یوسف کی رہائی کا سامان	295	قبل بعثت رسول کی خاموشی سے آپ کے پیغام کے الہی ہونے کا ثبوت
381	رہائی سے مقدم بے گناہی کا ثبوت	295	قرآنی رواداری کی نمایاں مثال
383	حضرت یوسف علیہ السلام کرسی اقتدار پر	303	حجیت ظن کی بحث میں ارشاد الہی اور اس کا انعقاد
384	بھائیوں کی پہلی دفعہ حاضری اور جناب یوسف علیہ السلام کی فرمائش	310	بغیر ثبوت شرعی کسی چیز کو حرام سمجھنا اللہ پر بہتان ہے اور کفران نعمت بھی ہے
388	بھائیوں کی دوسری دفعہ حاضری اور یوسف کی اپنے حقیقی بھائی کو اپنے پاس رکھ لینے کے لئے ترکیب	322	نظام حکمت الہی جبر کا متقاضی نہیں
391	جناب یعقوب علیہ السلام کو اس کی اطلاع اور ان کا تاثر	324	سُورَةُ هُوْدِ
392	جناب یعقوب کا گریہ اور روتے روتے زوال بصارت	324	سورہ ہود کے خاص خاص موضوعات
393	بھائیوں کی تیسری دفعہ حاضری، تعارف اور ان کی توبہ و انابت	329	دس سورتوں کا جواب لانے کا مطالبہ
395	جناب یوسف علیہ السلام کی خوشبو اور پیر بہن کا جناب یعقوب علیہ السلام تک پہنچنا اور بینائی کا پلٹنا	331	ذکر رسالت مآب و ولایت مآب
396	بچپن کے خواب کی تعبیر ظاہر ہونا اور سب کا یوسف کے سامنے سر بسجود ہونا	338	طوفان نوح علیہ السلام کی غرقابی اور اس کا پس منظر
401	سُورَةُ الرَّعْدِ	340	طوفان نوح کی غرقابی اور اس کا پس منظر
401	سورہ رعد کے خاص خاص مضامین	340	کوہ جودی
405	کسی قوم میں تبدیلی نہیں ہوتی بغیر اپنے نفس کی تبدیلی کے	341	عمل صالح کے بغیر کسی پیغمبر کی فرزندگی بھی کارگر نہیں
407	کائنات کی ہر شے بارگاہ الہی میں سجدہ ریز	343	قبیلہ عاد اور جناب ہود علیہ السلام کا حال
408	بقائے صلح	346	قبیلہ ثمود اور جناب صالح علیہ السلام کا حال
410	برائی کا مقابلہ بھلائی سے (عدم تشدد)	348	حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ولادت اسحاق علیہ السلام کی خوش خبری
411	یاد خدا سب اطمینان دل	351	قوم لوط پر نزول عذاب
		352	جناب شعیب اور ان کی قوم کا حال

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
458	اسپنے گناہوں کے ساتھ ان کے گناہوں کا بوجھ جنہیں گمراہ کیا ہے	414	مجزہ کا حکم الہی پر اٹھنا
460	ملائکہ اور اہل بہشت کے الفاظ سلام	415	محو اثبات براء
461	ہر قوم میں پیغمبروں کا بھیجا جانا اور سب کے پیغام کا متحد ہونا	418	رسول کی حقانیت کے دو گواہ، کتاب اور عالم کتاب
463	اہل ذکر سے سوال کا حکم	418	سُورَةُ الْاٰنْبِیَاءِ
465	آسمان اور زمین کی ہر شے اللہ کے لئے سر بسجود	419	سورہ ابراہیم کے خاص خاص مضامین
466	لڑکیوں کی ولادت پر نخبیدہ ہونا اہل جاہلیت کا طریقہ	420	رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کے لئے واقف زباں ہونے کی ضرورت
469	شہد کی مکھی کا ذکر	421	ایام الہی اور اوران کی یاد کی اہمیت
470	خود اختیاری اشتراکیت کی دعوت	424	کفر کے ساتھ اعمال خیرانگاہ
476	ہر امت کا ایک گواہ اور ہمارے رسول ان گواہوں کے گواہ	426	اچھے اور بُرے کلموں کی مثال
477	وہ آیت جو تمام اچھائیوں اور برائیوں کے احکام پر حاوی ہے	430	حضرت ابراہیم کی مناجات
480	نیک اعمال دنیا اور آخرت کی بہتری کے ذمہ دار	431	حضرت ابراہیم کی اواخر عمر میں اپنے والدین کیلئے دعائے مغفرت
481	تلاوت قرآن کے موقع پر اعوذ باللہ کہنے کا حکم	434	قیامت میں آسمان وزمین کی تبدیلی
483	ضرورت کے وقت تقیہ کا صریح حکم	434	سُورَةُ الْحٰجِرِ
487	حضرت ابراہیم ایک عبادت گزار امت، اتباع مملکت ابراہیم کا حکم	434	سورہ حجر کے خاص خاص مضامین
	دعوت و تبلیغ کے لئے حکیمانانہ انداز کی ہدایت، ضبط و تحمل اور رواداری	437	قرآن کی حفاظت کا قطعی وعدہ
489	سے کام لینے کی خصوصی تاکید	441	فرشتوں کو سجدہ آدم کا حکم اور شیطان کی سرتابی
491	سُورَةُ الْبَقَرَةِ	442	قیامت تک سلسلہ معصومین علیہم السلام کی بقاء کی ضمانت
491	سورہ بنی اسرائیل کے خاص خاص مضامین	443	دوزخ کے سات دروازے
492	معراج پیغمبر اسلام	443	اہل بہشت کے دلوں سے کینہ و عداوت کا دور ہونا
495	بنی اسرائیل کی دوسرے خراب کاری اور اس کی پاداش	445	فرشتوں کا حضرت ابراہیم کے یہاں آنا اور ولادت اسحاق کی بشارت
497	نامہ اعمال	446	قوم لوط پر عذاب کے لئے انہی فرشتوں کا جانا
498	ہلاکت اقوام کا عام نظام	447	اصحاب ایکہ کا معذب ہونا
501	حقوق والدین	448	اصحاب حجر کا تذکرہ
503	فضول خرچی کی مذمت	449	سبعہ مثانی اور قرآن
504	خرچ میں میانہ روی کی ضرورت	451	اعلانیہ تبلیغ کلام کا ابتدائی حکم
506	قانون قصاص	451	رسول کے ساتھ تمسخر کرنے والوں کا انجام
507	ناپ تول میں انصاف کا حکم	452	سُورَةُ النَّحْلِ
512	منکرین معاد کی رد	452	سورہ نحل کے خاص خاص مضامین

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
	جنہوں نے کھانا کھلانے سے انکار کیا ان کے یہاں کی دیوار کی	513	مخالفین حق سے روادارانہ گفتگو کی تعلیم
564	بلا معاوضہ تعبیر	515	شجرہ ملعونہ
565	جناب خضر علیہ السلام کی طرف سے حقیقتوں کا اظہار	520	ہر دور کے لئے ایک امام کا وجود
566	قصہ ذوالقرنین کی ابتداء	523	اوقات نماز
570	یا جوج و ماجوج کا ذکر	529	تمام انس و جن مل کر بھی قرآن کا جواب نہیں لاسکتے
573	کلمات الہی کی وسعت بے نہایت	531	پیغمبروں کی بشریت
574	حضرت محمد کا مقام بشریت	534	جناب موسیٰ کے معجزات
574	سُورَةُ مَرْيَمَہ	536	گر بیکی تعریف
574	سورہ مریم کے خاص خاص مضامین	537	جبر و خفاء کے درمیان نماز ادا کرنے کا حکم
575	جناب زکریا علیہ السلام کی دعا اور میراث انبیاء کا ثبوت	538	سُورَةُ الْكَافِرِہ
577	ولادت جناب یحییٰ علیہ السلام کی بشارت	538	سورہ کہف کے خاص خاص مضامین
578	جناب یحییٰ علیہ السلام کے اوصاف	540	واقعہ اصحاب کہف کا آغاز
580	تذکرہ جناب مریم اور ولادت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تفصیلی حال	541	اصحاب کہف کا غار میں داخل ہونا اور اس کا پس منظر
582	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ابن اللہ ہونے کی رد	543	غار میں ان کے محل قیام کی خاص خصوصیت
584	حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تبلیغ اور اپنے منہ بولے باپ سے گفتگو	544	سگ اصحاب کہف کا ذکر
587	جناب موسیٰ و ہارون علیہما السلام کا ذکر	545	صدیوں کی نیند کے بعد ان کی بیداری
587	جناب اسماعیل علیہ السلام صادق الوعد کا تذکرہ		لوگوں کا ان کے محل قیام پر مطلع اور باہمی اختلاف کے بعد وہاں مسجد
588	جناب ادريس علیہ السلام اور ان کی رفعت جسمانی	546	بنانے کا فیصلہ
589	باہنمائے بہشت کی اوصاف	546	تعداد میں اختلاف اور حقیقت کی طرف اشارہ
592	اثبات معاد	547	انشاء اللہ کہنے کا حکم
592	دوزخ کی طرف سے عمومی گزر	551	ایک مالدار اور ایک غریب دو ساتھیوں کی پیہم گفتگو
595	ثبوت شفاعت	553	مال اور اولاد زندگی کی رونق لیکن مال کی امید اعمال سے
596	خالق کے لئے تصور اولاد کے جرم کی اہمیت	555	شیطان کا جنات میں سے ہونا اور اس کے لئے نسل کا وجود
596	ایک خاص جماعت کی محبت کے فرض قرار دیئے جانے کا پیشگی اعلان	560	حضرت موسیٰ کا سفر اور اس کی درمیانی روئداد
598	سُورَةُ طٰہِہ	561	حضرت موسیٰ کا سفر اور اس کی درمیانی روئداد
598	سورہ طہ کے خاص مضامین	562	حضرت موسیٰ اور خضر کی ابتدائی گفتگو
	جناب موسیٰ علیہ السلام کے واقعات کا تفصیلی بیان --- آگ لینے کو جانا		آغاز سفر اور خضر کا کشتی میں سوراخ کرنا اور پھر ایک لڑکے کو قتل
601	اور پیغمبری پانا	563	کردینا

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
641	زراعت سے متعلق جناب داؤد و سلیمان علیہما السلام کا فیصلہ	602	عصا اور ید بیضاء
642	جناب داؤد علیہ السلام کی زرہ سازی	602	جناب موسیٰ علیہ السلام کی مناجات اور ہارون کو اپنا وزیر اور شریک کار بنانے کی التجا
643	جناب سلیمان علیہ السلام کا دوش ہوا پر پرواز کرنا	604	جناب موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے واقعات اور مدین جانا اور مراجعت فرعون سے گفتگو میں نرمی اور رواداری برتنے کا حکم
643	جناب یوب علیہ السلام کا امتحان اور ان کا صبر	605	جناب موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی گفتگو
645	حضرت یونس علیہ السلام کی شکم مانی کے اندر تہیج	606	ساحروں کے مقابلہ کا اہتمام
645	جناب زکریا علیہ السلام کی دعا اور اس کی قبولیت	607	معجزہ کا عقلی معیار
647	یا جوج اور ماجوج کا ذکر	608	ساحروں کی فرعون سے گفتگو
650	انجام کار میں نیکو کاروں کا کمال اقتدار	609	فرعون اور اس کی فوج کا غرق دریا ہونا
651	خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا رحمۃ اللعالمین ہونا	611	سامری کی گوسالہ سازی اور اس کا انجام
654	سُورَةُ الْحَجِّ	612	ثبوت شفاعت
654	سورہ حج کے خاص مضامین	615	جناب آدم علیہ السلام کا ترک اولیٰ
655	قیامت کا زلزلہ	617	اوقات نماز کی طرف اشارہ
656	ادوار انسانی کی تبدیلیوں سے حیات بعد الموت کے امکان پر روشنی	620	سُورَةُ الْأَنْبِيَاءِ
660	اختلاف عقائد کا اصل فیصلہ قیامت میں	623	سورہ انبیاء کے خاص مضامین
661	کائنات کی ہر شے اللہ کے لئے سر بسجود	623	اہل ذکر سے سوال کا حکم
663	کعبہ پر سب کا برابر سے حق	626	افعال الہی عبث نہیں، حق و باطل کے تصادم کا عام انجام
664	سب سے پہلے ندائے حج اور اس کی تاثیر کے لئے اللہ کی ضمانت	627	فرشتوں کے اوصاف
665	اللہ کی حرمات کی عزت	628	توحید کی مشہور دلیل اور ’برہان تمانع‘
666	شعائر الہیہ کی تعظیم کا حکم	628	توحید الہی تمام پیغمبروں کا متفقہ پیغام
667	حیوانات قربانی جملہ شعائر اللہ	630	معصومین علیہم السلام کی توصیف
668	اصل چیز قربانی کی ظاہری شکل نہیں بلکہ اصل خوشنودی خدا کی فکر	631	ہر ذی حیات کی خلقت یا بقاء پانی سے، آسمانوں کے ٹھوس جسم نہ ہونے کی طرف اشارہ
669	دفاعی جنگ کی اجازت اور اس کی بین الاقوامی طور پر ضرورت	632	ہر تنفس کے لئے موت کا مزہ چکھنا ضروری ہے
671	اللہ کے یہاں کا ایک دن ایک ہزار سال کے برابر	633	قیامت میں میزان اعمال
673	پیغمبروں کی تمناؤں میں شیطان کی دراندازی	636	حضرت ابراہیم کی بت شکنی اور اس کے پہلے اور بعد قوم سے گفتگو
679	مختلف طریقے عبادت کے اللہ کی طرف سے آتے رہے نہ کہ مختلف معبود	637	خلیل خدا کا آگ میں پھینکا جانا اور آگ کا سرد ہو جانا
681	کبھی کی مثال سے انسان کی عاجزی کا ثبوت	640	
682	انبیاء کا انتخاب نوع انسان سے نہ کسی دوسری نوع سے		
683	دین میں عسرو حرج کی نفی اور ’مسلم‘ نام کی ابتداء		

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
	ضعیف العورتوں کے لئے برقع چھوڑنے کی اجازت کے باوجود	684	سُورَةُ الْمُؤْمِنُونَ
735	پردہ داری کی تاکید	684	سورہ مؤمن کے خاص خاص موضوعات
737	صاحبان ایمان کی شان	685	نجات کے حق دار اور اہل ایمان کے اوصاف
738	رسول خدا ﷺ کے لئے امتیازی طور پر تعظیم و احترام کا حکم	687	خلق انسانی پر خالق کی نوازش
738	سُورَةُ الْفُرْقَانِ	690	کشتی نوح
739	سورہ فرقان کے خاص خاص مضامین	693	حضرت عیسیٰ ﷺ اور جناب مریم سلمہ اللہ علیہا قدرت خدا کی ایک نشانی
740	تعلیمات پیغمبر خدا ﷺ اور قرآن کے لئے مشرکین کی پریشان خیالیاں	697	حق انسانی آراء اور خواہشات کا تابع نہیں ہو سکتا
742	آتش دوزخ کی کیفیت کا تفصیلی بیان	701	اثبات توحید میں برہان تملیح کی زیادہ واضح تقریر
745	فرشتوں کا عام لوگوں کے سامنے آنا قیامت سے وابستہ	703	برائی کے مقابلہ میں جھلائی کرنے کی تعلیم
746	وہ فلاں شخص جو قیامت تک گمراہی کا ذمہ دار ہے	706	سُورَةُ النَّوْرِ
747	پیغمبر ﷺ کی بارگاہ الہی میں شکایت	707	سورہ نور کے خاص خاص مضامین
748	قرآن مجید کے بندرتج اتارے جانے کی حکمت	708	جنسی گناہ (زنا) کی حد شرعی
752	پست کردار انسانوں کا جانوروں سے بدتر ہونا		ثبوت زنا کے لئے چار عینی گواہوں کی ضرورت، عدم ثبوت پر الزام
753	پانی کا ذریعہ طہارت ہونا	709	لگانے والوں پر حد شرعی کا اجراء
755	میٹھے اور کھارے پانی کے سنگم میں قدرت الہی کا ظہور	710	لعان کی صورت اور اس کی ترکیب
755	نسبتی رشتہ کے ساتھ ازدواجی رشتہ بھی تقاضائے فطرت	711	واقعہ ”افک“ اور اس قسم کی تہمت لگانے والوں کی مذمت
756	اجر رسالت جو طلب ہوا اللہ کی طرف پہنچنے کا ذریعہ ہے	712	ایسی خبر کو سن کر اس کا چرچا کرنے والوں کی سرزنش
759	اللہ کے بندوں کی شان	718	گھروں میں بلا اجازت داخل ہونے کی ممانعت اور اسلام کا حکم
	*****	719	اجنبی مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے پر نظر ڈالنے کی ممانعت
		720	خواتین کے پردہ کا حکم اور اس کی اہمیت
		721	نکاح کی ترغیب
		722	غلام و کنیز کے مکاتبہ کا حکم
		724	آیہ نور
		725	عبادت الہی کے اوقات کا لحاظ رکھنے کے ساتھ تجارت کی تعریف
		726	کافروں کے اعمال خیر و خیرات کا بے کار ہونا
		728	ہر جاندار کی خلقت پانی سے
		732	صاحب ایمان صالحین سے مکمل اقتدار کا وعدہ
		734	گھر کے خاص افراد یہاں تک کہ بچوں سے بھی ایک حد تک پردہ

تفسير فصل الخطاب

جلد دوم

صفحہ نمبر	سورۃ	صفحہ نمبر	سورۃ
99	سُورَةُ الْأَعْرَافِ	23	سُورَةُ الْأَنْعَامِ
230	سُورَةُ الْبَرَاءَةِ	191	سُورَةُ الْأَنْفَالِ
324	سُورَةُ هُودٍ	288	سُورَةُ يُونُسَ
401	سُورَةُ الرَّعْدِ	363	سُورَةُ يُوسُفَ
434	سُورَةُ الْحَجْرِ	418	سُورَةُ إِبْرَاهِيمَ
491	سُورَةُ بَنِي إِسْرَائِيلَ	452	سُورَةُ النَّحْلِ
574	سُورَةُ مَرْيَمَ	538	سُورَةُ الْكَهْفِ
623	سُورَةُ الْأَنْبِيَاءِ	598	سُورَةُ طه
684	سُورَةُ الْمُؤْمِنُونَ	654	سُورَةُ الْحَجِّ
738	سُورَةُ الْفُرْقَانِ	706	سُورَةُ النُّورِ

سُورَةُ الْأَنْعَامِ

مکیہ ۱۶۵ آیات

”انعام“ کے معنی چوپایہ جانوروں ہی کے ہیں چونکہ اس سورہ میں حلال و حرام جانوروں کا نمایاں طور پر ذکر ہے، اس لئے اس سورہ کا یہ

نام ہوا۔

اس سورہ کو عام طور پر مکیہ یعنی مکہ معظمہ کا انزال شدہ قرار دیا گیا ہے، حالانکہ زیادہ تر تصور یہ ہے کہ فروع دین یعنی احکام حلال و حرام کی آیتیں مدینہ پہنچنے کے بعد نازل ہوئی ہیں، اس کے لئے ایک قول یہ ہے کہ وہ پورا مکہ کا نازل شدہ ہے مگر چند خاص آیتیں اس کی مدینہ میں اتری ہیں۔^[۱]

اس کے خلاف ایک حدیث میں ہے کہ سورہ انعام کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ پورا ایک ہی دفعہ میں اترتا ہے۔^[۲]

اس صورت میں اس کی آیتوں کو مکی اور مدنی کا مجموعہ اسی وقت سمجھا جاسکتا ہے، جب یہ مانا جائے جو کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ ترتیب قرآن کے وقت اس میں کچھ آیتیں ایسی مل گئیں جو دراصل اس سورہ کا جزء تھیں مگر یہاں یہ اس لئے قابل قبول نہیں معلوم ہوتا کہ نام ہی اس سورہ کا انعام انہی آیات کی بنا پر ہے جو حلال و حرام جانوروں کے احکام کو بتاتی ہیں لہذا یہ تصور زیادہ درست معلوم ہوتا ہے کہ تمام فروعی احکام میں غذا کی حلت و حرمت ایسا اہم امر ہے کہ تمام احکام شرعی میں سب سے پہلے یعنی مکہ معظمہ ہی میں اس کے احکام نازل کر دیئے گئے۔

اور حقیقت میں بحیثیت کلیہ یہ تصور ہی کہ احکام شریعہ کا اجراء یا شریعت کا نفاذ بس مدینہ کی ہجرت کے بعد ہوا ہے، بے بنیاد امر معلوم ہوتا ہے جب کہ عبادات میں نماز اور معاملات و احکام میں قواعد اذواج وغیرہ ایسے نظام زندگی کے ضروریات سے متعلق احکام یقیناً مکہ معظمہ میں بھی جاری تھے اور لفظ ”شریعت“ بھی قرآن میں اسی دور میں اتر چکا ہے۔

جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِّ رِيْعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۱۶۵﴾ (سورہ جاثیہ)

ہم نے آپ کو دینی حیثیت سے ایک شریعت کا پابند بنایا ہے تو آپ اس کی پیروی کیجئے اور جاہلوں کے دل بخواہ خیالات پر عمل نہ کیجئے۔ یہ مکی سورہ ہے لہذا یہ سمجھنا کہ شریعت ہجرت مدینہ کے بعد آئی ہے، درست نہیں ہے۔

سورہ انعام کے خاص خاص مضامین

۱۔۔۔۔ خالق کے علم کی ہمہ گیری

[۱] عن ابن عباس غیر مست آیات: وما قدر الله حق قدره الى اخر ثلاث آیات: قل تعالوا اتل ما حرم ربكم الى اخر ثلاث آیات فانهن

نزلن بالمدینة وفي رواية اخرى عن غير ثلاث آیات: قل تعالوا اتل الى اخر الثلاث (مجمع البيان)

[۲] روى عن انس بن مالك انه قال قال رسول الله صلى الله عليه واله ما نزل على سورة من القرآن جملة غير سورة الانعام وروى

عن ابن ابي عبد الله انه قال ان الانعام نزلت جملة (تبيان)

بھی تم شک کرتے ہو۔“ ”مٹی سے پیدا کیا۔“

یہ آغاز نسل انسانی کا ذکر ہے جب ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام پیدا ہوئے^[۱] اور اکثر جگہ جو کہا گیا ہے کہ پانی سے پیدا کیا، وہ ہر آدمی کے لحاظ سے ہے جبکہ سلسلہ نسل انسانی کا آگے بڑھ چکا ہے چنانچہ اس آیت میں کہ: **وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ ۝۱۰ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝۱۱** ان دونوں باتوں کو جمع کر دیا گیا ہے یعنی کہا گیا ہے کہ ”ہم نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا..... پھر (یہ نظام مقرر کیا کہ) اسے نطفہ کی صورت میں ایک محل خاص (شکم مادر) میں رکھا۔“ (سورہ مومنون)

”ایک مدت مقرر کی“..... یہ ہر آدمی کی عمر ہے جس کے بعد دنیا سے اٹھالیا جائے گا اور ”ایک اور مقررہ مدت“ یہ تمام نوع انسانی کے دورِ بقاء کی مدت ہے جس کے بعد قیامت آئے گی۔^[۲]

پہلی عمر اور اس کا انجام ہر شخص کے مشاہدہ میں ہے۔ اس سے دوسری مدت اور اس کے انجام کا بھی یقین کرنا چاہیے مگر انسان اس غیب کے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور اس میں شک کرتا ہے اسی پر سرزنش کی گئی ہے کہ:

ثُمَّ أَنْتُمْ تَمْتَرُونَ ۝۱۲ پھر بھی تم شک کرتے ہو۔“

ایک دوسری تفسیر ہمارے یہاں کی یہ ہے جس کے متعلق معصوم سے بھی روایت وارد ہوئی ہے کہ پہلی مدت جسے کہا گیا ہے کہ قَضَىٰ آجَلًا ”اس نے ایک مدت طے کر دی ہے“ یہ فیصلہ شدہ مدت وہ لوح محفوظ والی ہے جس میں تغیر و تبدل ممکن نہیں اور بعد میں جو کہا گیا ہے: **وَأَجَلٌ مُّسَمًّى عِندَنَا ۝۱۳** اور ایک نامزد مدت اس کے یہاں ہے، یہ ”لوح محفوظ واثبات“ والی مدت ہے جس میں مختلف اسباب سے تغیر و تبدل ہوتا ہے جسے اصطلاح مذہب میں بداء کہتے ہیں۔^[۳].....

وَهُوَ اللَّهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ ۝۱۴ يٰۤاَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا

تَكْسِبُوْنَ ۝۱۵

”اور وہ اللہ ہے آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی۔ وہ تمہارے ظاہر اور پوشیدہ ہر امر کو جانتا ہے اور جانتا ہے اسے جو تم کرتے ہو۔“

”آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی“ یعنی لامکان ہے کسی خاص محل میں محدود نہیں ہے۔^[۴]

وَمَا تَأْتِيهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ۝۱۶ فَقَدْ كَذَّبُوْا

[۱] خلقکم من طین بخلق ابیکم ادم منہ (جلالین) فلما کان اصلتا من طین جازان یقول: خلقکم من طین (تبیان)

[۲] یعنی بالاجلین اجل الحیوة الی الموت و اجل الموت الی البعث و قیام الساعة (مجمع البیان)

[۳] عن ابی عبد اللہ قال: الاجل المقضی هو المحتوم الذی قضاہ اللہ و حتم و المسمی هو الذی فیہ البداء یقدم ما یشاء و یؤخر ما یشاء و المحتوم الذی لیس فیہ تقدیم و لا تأخیر (علی بن ابراہیم)

[۴] ان جعلت فی السموات خبرا بعد خبر فیکون التقدير هو اللہ و هو فی السموات و فی الارض یعنی انه فی کل مکان (مجمع البیان) و فی

الایة دلالة علی فساد قول من قال انه تعالیٰ فی مکان دون مکان (تبیان)

بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ ۖ فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنْبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿٥﴾
 ”اور ان کے پاس کوئی نشانی ان کے پروردگار کی نشانیوں میں سے نہیں آئی مگر یہ کہ وہ اس سے روگردانی کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس حق کو بھی جھٹلا دیا ﴿٥﴾ جب وہ ان کے پاس آیا۔ اب انہیں بہت جلدی ان باتوں کی جن کا مذاق وہ اڑاتے تھے، خبریں سامنے آئیں گی۔“

یعنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد خوب معلوم ہو جائے گا کہ عذاب الہی کیسا ہوتا ہے۔ ﴿٥﴾

الْمُ يَرَوُا كَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَرْنٍ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَكُمْ ۖ وَأَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِمْ مِدْرَارًا ۖ وَجَعَلْنَا الْأَنْهَارَ تَجْرِيًا مِنْ تَحْتِهِمْ

فَأَهْلَكْنَاهُمْ بَدُنُوبِهِمْ ۖ وَأَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ ﴿٦﴾

”کیا انہوں نے دیکھا کہ کتنے دوروں کے افراد کو ﴿٦﴾ ان کے پہلے ہم نے ہلاک کر دیا جنہیں ہم نے زمین میں اقتدار دیا تھا جو تمہیں نہیں دیا ہے اور جن پر ہم نے آسمان سے موسلا دھار بارش رحمت کی تھی اور ہم نے نہریں بنائی تھیں جو ان کے پیروں کے نیچے سے بہتی تھیں۔ پھر ان کے گناہوں کی بدولت انہیں ہم نے ہلاک کر دیا اور ان کے بعد ہم نے دوسری نسلیں پیدا کیں۔“

یہ گزشتہ امتوں کے انجام کی طرف نظروں کو موڑ کر خود انہیں اپنے انجام کے متعلق اندیشناک ہونے کی تحریک ہے۔

وَلَوْ كُنَّا عَلَيْنَا كِتَابًا فِي قِرْطَابٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالِ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنَّ

هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿٧﴾

”اور اگر ہم آپ پر لکھی ہوئی تحریر اتارتے اور یہ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو بھی لیتے تو کافر یہی کہتے کہ یہ نہیں ہے مگر کھلا ہوا جادو۔“

نہ ماننے کے لئے لاکھ بہانے ہوتے ہیں چنانچہ کافروں کا ایک بہانہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت کو تسلیم نہ کرنے کا تھا کہ یہ کیسی کتاب ہے کہ اسے رسول صلی اللہ علیہ وسلم زبانی سناتے ہیں اور پھر اسے تحریر کیا جاتا ہے۔ اگر خدا کی کتاب ہے تو آسمان ہی سے تحریری صورت میں کیوں نہیں اترتی؟! مگر یہ سب باتیں صرف عناد کے طور پر نہ ماننے کے لئے تھیں۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ اگر یہ صورت بھی ہوتی اور لکھی لکھائی شکل میں کتاب اترتی، تب بھی کافر لوگ اسے جادو کہہ کر انکار کرتے اور ایمان پھر بھی اختیار نہ کرتے۔

﴿٥﴾ ای بالحق الذی اتی بہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم من القرآن وسائر امور الدین (مجمع البیان)

﴿٦﴾ سوف یأتیہم خبر العذاب الذی ینزل بہم عقوبة علی کفرہم (تبیان)

﴿٧﴾ قال الزجاج عندی ان القرن اهل کل مدة کان فیہا نبی او کان فیہ طبقة من اهل العلم قلت السنون او کثرت (تبیان)

وَقَالُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۖ وَلَوْ أَنْزَلْنَا مَلَكَ لَقُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا

يُنظَرُونَ ﴿٨﴾

’اور انہوں نے کہا کہ ان پر فرشتہ کیوں نہیں اترتا؟ اور اگر ہم کوئی فرشتہ اتارتے تو بس فیصلہ ہی ہوتا، پھر انہیں مہلت نہ دی جاتی۔‘

رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر فرشتے اترتے ہی تھے مگر کافروں کا مطلب یہ تھا کہ ہم خود اپنی آنکھوں سے فرشتہ کو اترتے دیکھیں کہ وہ اتر کر ہمارے سامنے ان کی سچائی کی گواہی دے [۱] اب جیسا کہ گزشتہ آیات میں بیان ہو چکا، سنت الہیہ یہ رہی ہے کہ جب فرماشی معجزے دکھا دیئے جاتے ہیں تو پھر انکار کرنے پر فوراً عذاب الہی نازل ہوتا ہے، اس لئے کہا گیا ہے کہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان کی فرمائش کے مطابق اگر فرشتے اترتے تو پھر عذاب خدا سے ان کی مہلت نہیں مل سکتی تھی۔ [۲]

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكَ لَجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَا يَلْبَسُونَ ﴿٩﴾

’اور اگر ہم اسے فرشتہ قرار دیتے تو بھی اسے انسان کی شکل میں قرار دیتے اور انہیں پھر بھی ایسے ہی شے کرنے کا موقع دیتے جیسے شے وہ اب کر رہے ہیں [۳]۔‘

مشرکین کا ایک بہانہ عدم قبول کا یہ تھا کہ آخر ہم اپنے ایسے آدمیوں کو کیوں مانیں؟! خدا کو پتہ نہیں پھرنا تھا تو فرشتوں کو بھیجتا۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے کہ فرشتہ کا بھیجنا سنت الہیہ اور حکمت ربانی کے خلاف ہے فرشتہ بھی ہوتا تو ظاہری صورت میں وہ انسان ہی ہوتا کیونکہ بغیر اس کے وہ نمونہ عمل پیش نہیں ہو سکتا جس کی پیروی مطلوب الہی ہے تو اس وقت بھی یہ ایسی ہی گمراہی کی باتیں کہتے جیسی اس وقت کہہ رہے ہیں۔ کیونکہ اس وقت وہ کیا کہہ رہے ہیں؟ یہی نہ کہ یہ انسان کیوں ہے؟ چلتا پھرتا اور کھاتا پیتا کیوں ہے؟ تو جب وہ ملک ہوتے ہوئے بھی شکل انسانی میں ہوتا تو بھی یہ لوگ ایسی ہی گمراہی کی باتیں کرتے تو ان کی ان باتوں کے سدباب کے لئے ہم ان مفید حکمت کے تقاضوں کو نظر انداز تھوڑی کر دیں گے جو رسول کے ہم جنس ہونے ہی سے وابستہ ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی گمراہی کے ہم سبب ہوں گے بلکہ یہ کہ ان کی گمراہی کا جو ان کی غلط ذہنیت کا نتیجہ ہے، ہم اپنے طرز عمل کو بدل کر سدباب نہیں کریں گے۔

پھر یہ بھی پہلو بعض علماء نے پیش کیا ہے کہ قرآن نے اس شبہ و گمراہی میں مبتلا کرنے کو ان کے ملک قرار دینے کے ساتھ وابستہ کیا ہے کہ اگر ملک بناتے تو ایسا ہوتا اور جب ملک بنایا ہی نہیں تو اس گمراہ کرنے کا وقوع بھی نہیں ہوا۔ [۴]

[۱]. ملك يصدقہ (جلالین) نشا ہدہ (مجمع البیان)

[۲]. معنی لقضی الامر ای اتم ہلا کہم (تبیان)

[۳]. ہر آئینہ مشتبہہ ہی کر دیم ہر ایشاں انچہ الحال اشتباہہ ہی کنند (شاہ ولی اللہ) کا نو ایلبسون علی ضعفتمہم فی امر النبی ﷺ فیقولون انما ہذا بشر مثکم (مجمع البیان) البتہ شبہ ڈالتے ہم او پر ان کے جو شبہ کرتے ہیں یہ (شاہ رفیع الدین)

[۴]. لم یخبر انه لیس علیہم و انما قال لو جعلناہ ملکاً للبست ولم یجعلہ ملکاً فاذا مالیس (تبیان)

مگر جو مفہوم پہلے بیان ہو چکا، وہ حقیقت حال کی مطابقت کے اعتبار سے بھی اور دوسرے مقامات پر جو قرآنی تعبیرات ہیں، ان کی موافقت کے لحاظ سے بھی زیادہ مناسب ہے۔

انبیاء اور تمام معصومین واقعی بشر ہوتے ہیں، نہ کہ فقط بصورت بشر

بے شک اس آیت سے یہ صاف ظاہر ہے کہ انبیاء اور تمام معصومین حقیقت میں بشر اور انسان ہی ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ وہ حقیقت میں ملک یا کسی دوسری نوع کے افراد ہوں اور صورتاً انسان ہوں کیونکہ اسے قرآن نے ”فرض غیر واقع“ کے طور پر بیان فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا ہے نہیں۔ نہ ایسا ہے کہ وہ ملک ہوں اور بہ شکل بشر بھیجے گئے ہوں اور نہ کوئی دوسری جنس۔ اس لئے کہ جو حکمت الہیہ ملک کو رسول بنانے سے سدراہ ہے، وہی کسی دوسری جنس سے بھی سدراہ ہے یعنی وہ حکمت اس کی متقاضی ہے کہ رسول کو علامہ خلایق کا ہم جنس ہونا چاہیے جو صرف صفات شخصی میں ان پر امتیاز رکھتا ہو جو ایک رہنما کے شایان شان ہے۔
نوع یا جنس میں الگ ہوتا تو مقصد رسالت و رہنمائی حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

وَلَقَدْ اسْتَهْزِئُوا بِرُسُلِنَا مِنْ قَبْلِكَ فَخَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُمْ مَا كَانُوا بِهِ
يَسْتَهْزِئُونَ ﴿١٥﴾

”اور آپ کے پہلے بہت پیغمبروں کا مذاق اڑایا گیا تو جنہوں نے ان کا مذاق اڑایا تھا، انہیں اسی عذاب نے آکر گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔“ [۱]

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انظروا كيف كان عاقبة المكدبين ﴿١٦﴾
”کہیے کہ روئے زمین پر چلو پھرو۔ پھر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا؟“ [۲]

قُلْ لِمَنْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمٰةَ ؕ
لِيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ الَّذِيْنَ خَسِرُوْا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا
يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٧﴾ وَلَهُ مَا سَكَنَ فِي الْاَيْلِ وَالنَّهَارِ ؕ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيْمُ ﴿١٨﴾

”کہیے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ کس کا ہے؟ کہہ دیجئے کہ اللہ کا ہے۔ اس نے اپنے ذمہ رحمت کرنا عائد کر لیا ہے [۳] وہ تم سب کو یقیناً روز قیامت تک جس میں کوئی شک نہیں، اکٹھا کرتا رہے گا جنہوں نے خود اپنا نقصان کیا تو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اور اسی کا ہے جو رات اور دن میں سکونت پذیر ہے اور وہ سننے والا ہے، بڑا

[۱] ای نزل بہم العذاب (علی بن ابراہیم)

[۲] کتب قضی (جلالین)

جاننے والا۔“

”اکٹھا کرتا رہے گا“، یعنی ابھی تم پر عذاب نازل نہیں کرتا بلکہ مہلت اور ایک نسل کے بعد دوسری نسل کو آنے کا موقع دیتا ہے تاکہ جب بھی آنکھیں کھل جائیں، وہ اپنے اعمال کی اصلاح کر لیں، یہ کتنی بڑی خدا کی مہربانی ہے جو تمام افراد انسانی کے شامل حال ہے [۱] پہلی آیت میں مَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہہ کر اللہ کے اقتدار کی ہمہ گیری اجزائے طرف مکان کے اعتبار سے بتائی گئی تھی اور دوسری میں لٰہٗ مَا سَاكَنَ فِي الْاَيْلِ وَالنَّهَارِ کہہ کر اس ہمہ گیری کو اجزائے طرف زمان کے اعتبار سے بتایا گیا ہے۔ [۲]

قُلْ اَخْبِرَ اللّٰهُ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاَطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعَمُ وَلَا يُطْعَمُ ط

قُلْ اِنِّيْ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۴﴾

”کہیے کہ کیا کسی دوسرے کو میں سر پرست بناؤں اللہ کے سوا جو آسمانوں کا اور زمین کا وجود میں لانے والا ہے اور وہ روزی دیتا ہے، اسے کوئی روزی نہیں پہنچاتا۔ کہیے کہ میں مامور ہوں اس پر کہ اول درجہ کا مسلم رہوں اور (یہ حکم ہے مجھے کہ) [۱۴] تمہیں مشرکوں میں سے نہیں ہونا چاہیے۔“

یہ بھی ایک انداز گفتگو ہوتا ہے کہ جس غلطی پر دوسروں کو متنبہ کرنا ہے، اسے انسان خود اپنے اوپر رکھ کر کہہ دے۔ یہ اور اس کے بعد کی آیت دونوں اسی انداز کی حامل ہیں۔

اول من اسلمہ کا ترجمہ جو ہم نے کیا ”اول درجہ کا مسلم رہوں“ اس کی نظیر پہلے ہی پارہ میں آچکی ہے لیکن اکثر دوسرے لوگ اس اولیت کو باعتبار زمانہ قرار دیتے ہیں تو انہیں قید لگانے کی ضرورت پڑتی ہے کہ ”سب سے پہلا مسلمان اس امت میں“۔ [۱۵]

اور بعض لوگ اسے خلقت نوری میں اولیت پر منطبق کرتے ہیں کہ جب یہ اول مخلوق ہیں تو اول مسلم اور اول مؤمن بھی یہی ہیں۔ آدم اور دیگر بنی آدم سب ان کے بعد ہیں۔

قُلْ اِنِّيْ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾ مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَ مَيِّدٍ

فَقَدْ رَجَعَهُ ط وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾

”کہیے کہ میں ڈرتا ہوں، اگر اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں، ایک بہت بڑے دن کے عذاب سے۔ وہ

[۱] ای کتب علی نفسه الايستأصلكم ولا يجعل عقوبتكم بل يعذرو وينذرو بجمع آخر کم الی اولکم قرن بعد قرن الی یوم القیامة (تبیان)

[۲] انما ذکر اللیل والنہار هنا و ذکر السہوت والارض فیما قیل لان الاول یجمع المکان والثانی یجمع الزمان وهما ظرفان لكل

موجود (مجمع البیان)

[۳] وقیل لی لا تکونن من المشرکین (جلالین) ای امرت بالایمان ونہیت عن الشرک (مجمع البیان)

[۴] یعنی من هذا الامة (تبیان)

(عذاب) اس دن جس سے الگ رہا، اس پر اس (خالق) نے بڑا رحم کیا ہے [۱] اور یہ نمایاں کامیابی ہے،

وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يَمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ

شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۶﴾ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ ۖ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ ﴿۱۷﴾

’اور اگر اللہ تمہیں کسی سختی سے دو چار کرے تو اس کا دور کرنے والا سوا اس کے کوئی نہیں اور اگر کوئی بھلائی تم تک پہنچائے تو بھی وہی ہے جو ہر چیز پر قادر ہے، اور وہ اپنے بندوں سے بالادست قابو رکھنے والا ہے اور وہ صحیح صحیح کام کرنے والا ہے، بڑا باخبر۔‘

یعنی وہ اپنی بالادستی اور قدرت سے اندھا دھند کام نہیں لیتا [۲] بلکہ، مہتممائے حکمت ضبط و تحمل سے کام لیتا ہے اور باخبر ہونے کے بعد نظام عالم کے تمام مفادات کو سامنے رکھ کر جب محل ہوتا ہے، تب سزا دیتا ہے اور ظالمین کو مہلت دیتا ہے بلکہ خوب دنیوی نعمتوں سے نوازتا ہے اور پھر جب وقت آتا ہے، تب اپنے عذاب میں گرفتار کرتا ہے۔

قُلْ أَيُّ شَيْءٍ أَكْبَرُ شَهَادَةً ۖ قُلِ اللَّهُ ۖ شَهِيدٌ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۖ وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَذَا

الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُمْ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ ۖ أَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُونَ أَنَّ مَعَ اللَّهِ إِلَهَةً أُخْرَىٰ ۖ

قُلْ لَا أَشْهَدُ ۚ قُلْ إِنَّمَا هُوَ اللَّهُ وَاحِدٌ وَإِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ ﴿۱۸﴾

’کہیے کہ گواہی میں سب سے بڑھ کر کون چیز ہے؟ [۳] کہہ دیجئے کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے اور میری طرف اس قرآن کی وحی بھیجی گئی ہے تاکہ میں اس کے ذریعے سے تمہیں اور جس تک وہ پہنچے، متنبہ کروں۔ کیا تم اس بات کے گواہ ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرے خدا ہیں؟ کہیے کہ میں تو اس کی گواہی نہیں دیتا کیونکہ وہ تو بس ایک خدا ہے اور میں اس سے کہ جو تم شرک کرتے ہو، بے تعلق ہوں۔‘

’سب سے بڑھ کر کون چیز ہے‘ کہ جواب میں ’اللہ‘ کہنا اس کی دلیل قرار دیا گیا ہے کہ ذات الہی پر شے کا اطلاق درست ہے [۴] ’تمہیں اور جس تک وہ پہنچے‘ اس سے آپ کی رسالت کی ہمہ گیری زمان و مکان کے اعتبار سے ثابت ہوتی ہے یعنی اس کا دائرہ نہ کسی جغرافیائی احاطہ میں محدود ہے اور نہ اس کے حدود سے کوئی زمانہ خارج ہے۔ [۵]

[۱]. فقدر حمہ اللہ (مجمع البیان)

[۲]. معناه انہ مع قدرته علیہم لا یفعل الا ما تقتضیہ (تبیان)

[۳]. چہ چیز معتبر تر است حر بآب شہادت (شاہ ولی اللہ)

[۴]. فی الایۃ دلالت علی من قال لا یوصف تعالیٰ بانہ شیء (تبیان)

[۵]. ای لا خوف بہ من بلغہ القرآن الی یوم القیامۃ (مجمع البیان)

الَّذِينَ اتَّيْنَهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ آبْنَاءَهُمْ ۗ وَالَّذِينَ خَسِرُوا

أَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٥٠﴾

”جنہیں ہم نے کتاب دی ہے، وہ انہیں اس طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ وہ جنہوں نے اپنے کو خسارے میں ڈالا ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔“

اس مضمون کی آیت پہلے دوسرے پارہ میں آچکی ہے واریہ آیت بھی اس کا ثبوت ہے کہ اس سورہ کو تمام وکمال مکہ سمجھنا درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ مکہ میں اہل کتاب سے کوئی سابقہ نہ تھا تا کہ ان کے تذکرہ کا محل ہوتا۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ

الظَّالِمُونَ ﴿٥١﴾

”اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا کہ جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگائے یا اس کی آیتوں کو جھٹلائے بلاشبہ جو ظالم ہوں، وہ کسی طرح کی بہتری حاصل نہیں کر سکتے۔“

اس مضمون کی آیتیں قرآن مجید میں کئی جگہ ہیں اور یہ ایک روادارانہ انداز تبلیغ ہے کہ کھل کر مخاطبین کو نہیں کہا جاتا کہ تم ظالم ہو بلکہ اس طرح گفتگو کر کے خود انہیں غور کرانے یا ان کے ضمیر کو بیدار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یاد رکھو کہ اگر میں غلط دعوائے رسالت کرتا ہوں اور اللہ کی طرف منسوب کر کے غلط کلام پیش کرتا ہوں تو بلاشبہ مجھ سے زیادہ ظالم کوئی نہیں اور اگر میں ٹھیک کہتا ہوں مگر تم یا کوئی اس کی تکذیب کرتا ہے تو اس سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں اور بہر حال جو ظالم ہوں، وہ کبھی فلاح یعنی دین و دنیا کی بہتری حاصل نہیں کر سکتے۔ یہی وہ حکیمانہ انداز کلام ہے جسے مختلف خیال جماعتوں کے سامنے اس دور میں اختیار کیا جاتا ہے تو سطحی نظر والے اپنی جماعت کے آدمی چیخ اٹھتے ہیں کہ اس میں عقائد و مسلمات کو مشکوک بنا دیا گیا ہے مگر قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں یہی انداز اختیار کیا گیا ہے اور وہی روح تبلیغ اور حکیمانہ مخاطب کی جان ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ دونوں باتیں مشرکین ہی پر منطبق ہیں کہ وہی اللہ پر افتراء کرنے والے تھے کہ اس کا شریک قرار دیتے تھے یا اس کے لئے اولاد تجویز کرتے تھے [۱] اور وہی آیات الہی کی تکذیب کرنے والے تھے مگر ہمارے خیال میں اس صورت میں درمیان میں ”او“ نہ ہوتا جس کے معنی ”یا“ کے ہیں بلکہ ”و“ ہوتا جس کے معنی ”اور“ کے ہوتے۔ اس لئے کہ اگر افتراء سے یہ مراد ہے تو وہ افتراء اور تکذیب تو ان میں مجتمعا تھی نہ کہ ان میں سے کوئی ایک بات۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا آيِنَ شَرِّ كَاؤُكُمْ الَّذِينَ

كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٥٢﴾ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا

مُشْرِكِينَ ﴿٥٣﴾ أَنْظِرْ كَيْفَ كَذَبُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا

[۱]. معنای کہ من اکفر من اختلق علی اللہ کذبا فاشترک به الالہتہ (مجمع البیان)

يَفْتَرُونَ ﴿٢٣﴾

”اور جس دن ہم ان سب کو میدانِ حشر میں لائیں گے، پھر ان سے جنہوں نے شرک اختیار کیا تھا، کہیں گے کہ کہاں ہیں تمہارے وہ شریک [۱] جن کا تم گمان باطل کرتے تھے؟ پھر کوئی ترکیب ان کے پاس نہ ہوگی سوا اس کے کہ وہ کہیں کہ قسم ہمارے پروردگار اللہ کی، ہم مشرک نہیں تھے۔ دیکھو! کس طرح یہ خود اپنے اوپر جھوٹ باندھنے لگے اور جو کچھ یہ جھوٹ باندھا کرتے، وہ ان سے غائب ہو گیا۔“

لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اہم نے جو ترجمہ کیا ہے ”کوئی ترکیب ان کے پاس نہ ہوگی“ یہ اکثر تفسیروں کے مطابق ہے۔ [۲] اس کے علاوہ ایک دوسری تفسیر کے مطابق یہ معنی ہیں کہ ”اب ان کے پاس کوئی جھوٹ بولنے کو نہیں رہ جائے گا، سوا اس کے کہ وہ یہ کہیں یعنی بس مکر جائیں کہ ہم کبھی مشرک تھے ہی نہیں۔“ [۳]

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ إِلَيْكَ ۗ وَجَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۗ وَإِنْ يَرَوْا كَلًّا آيَةً لَا يُؤْمِنُوا بِهَا ۗ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوكَ يُجَادِلُونَكَ يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَذَا إِلَّا آسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٢٤﴾

”اور ان میں سے ایسے بھی ہیں جو آپ کی بات غور سے سنتے ہیں اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں کہ وہ اسے سمجھتے نہیں اور ان کے کانوں میں بھاری پن [۴] اور اگر وہ ہر طرح کا معجزہ دیکھ لیں [۵] جب بھی اس پر ایمان نہیں لائیں گے، یہاں تک کہ جب آپ کے پاس بحث کرتے ہوئے آئیں گے تو یہ کافر کہیں گے کہ یہ نہیں ہیں مگر اگلے لوگوں کی داستانیں۔“ [۶]

غور سے سننا کبھی طلب حق کے لئے ہوتا ہے اور کبھی اس لئے کہ اس میں نکتہ چینی کی کوشش کی جائے ایسا آدمی سنتا تو بڑے غور سے ہے مگر اس سے فائدہ کچھ نہیں اٹھاتا، اس لئے کہ اس کی نیت بھیر نہیں۔ یہی ان کی نفسیاتی کیفیت وہ ہے جسے دلوں پر پردہ اور کانوں میں بھاری پن سے تعبیر کیا گیا ہے اور چونکہ یہ ان کی بدینتی کا ایک لازمی نتیجہ ہے جس سے اللہ کی توفیقات خیران سے سلب ہو جاتی ہیں، اس لئے اس کی پوری ذمہ داری خود ان پر ہوتے ہوئے، اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ ہم نے ایسا کیا۔

[۱]. انما اضاف الشر کاؤ الیہم لادہم اتخذوہا لانفسہم (مجمع البیان)

[۲]. فتنتہم۔ ای معندہم (جلالین) بنا شد عند ایشان (شاہ ولی اللہ)

[۳]. فتنتہم ای کذابہم (علی بن ابراہیم)

[۴]. حر گوش ایشان گران (شاہ ولی اللہ) وقر اصمہا (جلالین)

[۵]. کل علامتہ و معجزتہ تدلہم علی نبوتہ النبی ﷺ (تبیان)

[۶]. قصہائے پیشینیان (شاہ ولی اللہ) کہانیاں پہلوں کی (رفیع الدین) اساطیر اکاذیب (جلالین)

وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْهَوْنَ عَنْهُ ۗ وَإِنْ يُهْلِكُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿٦٦﴾
 ”اور وہ ان کی طرف سے روکتے ہیں اور خود ان سے دور رہتے ہیں اور وہ نہیں ہلاکت میں ڈالتے مگر خود اپنے کو اور
 انہیں شعور نہیں ہے۔“

سلسلہ آیات سے آسانی جو مفہوم سمجھ میں آتا ہے، وہ تو یہ ہے کہ یہ انہی کا ذکر ہے جن کے تارک کر دار کا ذکر پہلے سے ہو رہا ہے اور اس طرح ”ان کی طرف سے روکتے ہیں“ کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں کو رسول ﷺ کی طرف آنے اور ان کی بات ماننے سے روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور رہتے ہیں مگر اس میں ذرا سی خلش ذہن کو یہ محسوس ہوتی ہے کہ دوسروں کو روکنے کے بعد خود ان کے دور رہنے کا ذکر جیسے افادیت کا حامل نہیں ہے۔

ایک تفسیر جس کے متعلق گمان قوی یہ ہے کہ روایت پر مبنی ہے، یہ ہے کہ یہ کچھ بنی ہاشم کے کردار کا بیان ہے جو حمیت خاندانی یا جناب ابوطالب کے اثر سے پیغمبر خدا ﷺ کی ان کی دشمنوں سے حفاظت کرتے تھے جس کو کہا گیا ہے کہ ان کی طرف سے روکتے ہیں یعنی ان کی ایذا رسانی سے مخالفین کو باز رکھتے ہیں مگر خود ان پر ایمان نہیں لاتے [۱] ایسے افراد کے کردار کا ذکر جناب امیر علیہ السلام کے کلام میں بھی ملتا ہے جو نوح البلاغہ میں موجود ہے۔

**وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وَقَفُوا عَلَى النَّارِ فَقَالُوا يَلَيْتَنَا نُرُدُّ وَلَا نُكَذِّبُ بِآيَاتِ رَبِّنَا
 وَنَكُونُ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٦٧﴾ بَلْ بَدَأَ لَهُمْ مَا كَانُوا يُخْفُونَ مِنْ قَبْلُ ۗ وَلَوْ رُدُّوْا
 لَعَادُوا إِلَيْهَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَيْهِمْ لَكَذِبُونَ ﴿٦٨﴾**

”اور کاش تم دیکھو جب وہ آتش و دوزخ پر کھڑے کئے جائیں گے تو وہ کہیں گے کاش ہم پلٹا دیئے جاتے اور پھر اپنے پروردگار کی نشانیوں کو نہ جھٹلاتے اور ایمان لانے والوں میں ہوتے، بلکہ ظاہر ہو گیا ان کے لئے، وہ جو چھپاتے تھے پہلے [۲] اور اگر یہ پلٹائے جائیں گے تو پھر وہی کریں گے۔ جس سے انہیں ممانعت ہوئی ہو اور بلاشبہ وہ جھوٹے ہیں۔“

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ”یعنی دوزخ کے کنارے پہنچ کر حکم ہوگا کہ ٹھہراؤ تو کافروں کو توقع پڑے گی کہ شاید ہم کو پھر دنیا میں بھیجیں تو اب کی بار کفر نہ کریں اور ایمان لاویں۔ سو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس واسطے ان کو نہیں ٹھہرایا بلکہ اس تدبیر سے ان کے منہ سے اقرار کرادیا کہ ہم نے کفر کیا تھا“ (موضح القرآن)

علامہ طبرسی کا خیال ہے کہ ”وقفوا“ کے یہ معنی ہیں ہی نہیں کہ وہ کھڑے کئے جائیں گے بلکہ یہ مطلب ہے کہ وہ داخل جہنم کئے جائیں

[۱] قال بنو ہاشم كانوا ينصرون رسول الله عليه واله وسلم ويمنعون قريشاً عنه وينأون عنه اي... لا يؤمنون (علي بن ابراهيم)

[۲] ظهرت فضيحتهم في الاخره وتوهمت استارهم (مجمع البيان)

گے اور اس طرح وہ اپنے مشاہدہ و احساس کے ساتھ اس کی حقیقت سے واقف بنا دیئے جائیں گے۔^[۱]
 تمنا اگرچہ بذات خود سوچ اور جھوٹ سے متصف نہیں ہو سکتی مگر اس تمنا میں بطور اظہار واقعہ ایک خبر بھی مضمر ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ہم دنیا میں دوبارہ جائیں تو پھر آیات الہی کو نہ جھٹلائیں گے اور ہم مومنین میں سے ہوں گے، آخر میں انہیں جھوٹا اسی خبر کے اعتبار سے کیا گیا ہے۔

وَقَالُوا إِن هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ ﴿٢٩﴾

”اور وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہے مگر ہماری یہی دنیوی زندگی اور ہم دوبارہ اٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔“

اگر اس آیت کو مستقل طور پر دیکھا جائے تو یہ ترجمہ ہوگا جو ہم نے کیا ہے اور یہ عام دہریوں کا نقطہ نظر ہے جو ہر دور میں منکرین خدا اور منکرین آخرت کا رہا ہے اور زبان سے اعلان نہ بھی ہو تو ان کا عمل اسی کا ترجمان رہتا ہے۔ اور اگر یہ آیت مقام تنزیل میں گزشتہ آیت سے متصل ہو جو یہاں پر انداز کلام کو دیکھتے ہوئے بعید نہیں ہے تو یہ عطف ہوگا، اس کے قبل کی آیت کے الفاظ: لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْهُ پر اور اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ ”اور وہ یہی کہیں گے“ یعنی اگر دنیا میں دوبارہ جائیں گے تو وہ کریں گے جس سے انہیں ممانعت ہوئی تھی اور یہ کہیں گے جو اب تک کہتے آئے تھے کہ بس جو کچھ ہے، یہی دنیا ہے، اس سے آگے کچھ نہیں ہے۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وَقَفُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۖ قَالَ أَلَيْسَ هَذَا بِالْحَقِّ ۗ قَالُوا بَلَىٰ وَرَبِّنَا ۗ

قَالَ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿٣٠﴾

”اور کاش دیکھو^[۲] وہ موقع جب وہ ٹھہرائے جائیں گے اپنے پروردگار کے سامنے۔ وہ کہے گا کیا یہ حق نہیں ہے؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں، قسم ہمارے پروردگار کی۔ کہے گا تو چکھو اس عذاب کو اس سبب سے کہ تم کفر کرتے رہے تھے۔“

علامہ طبریؒ جنہوں نے گزشتہ آیت میں وَقَفُوا عَلَى النَّارِ کے معنی میں اس مفہوم کو ترجیح دی تھی کہ وہ آگ کی حقیقت پر اب اس میں داخل ہو کر واقف ہوں گے، انہوں نے یہاں تو حتم و جزم کے ساتھ یہی معنی قرار دیئے ہیں کہ وہ اپنے پروردگار کی عظمت سے واقف ہوں گے اور اب انہیں اس کی معرفت حاصل ہوگی اور کہا ہے کہ یہاں اس کے سوا کچھ بن ہی نہیں سکتا^[۳]
 مگر جب کہ قرآن میں روز قیامت کے بارے میں دوسری جگہ صاف ہے:

يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٥١﴾

جس دن تمام لوگ کائنات کے پروردگار کی بارگاہ میں کھڑے ہوں گے۔ (سورہ مطففین)

تو یہاں بھی یہی معنی کیوں مراد نہیں ہو سکتے؟ اس لئے کہ ہم نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ ”وہ ٹھہرائے جائیں گے اپنے پروردگار کے سامنے۔“

[۱] الا جودان يكون معناها ادخلوها فاعرفوا مقدار عذابها (مجمع البيان)

[۲] کاش کہ دیکھے تو (شاہ فنج الدین)

[۳] ليس بصح في هذه الآية الا وجهها واحد... وهو ان للعبث عرفوا بهم ضرورة (مجمع البيان)

اگرچہ ”بارگاہ“ کہا جائے ”درگاہ“ کہا جائے یا ”سامنے“ کہا جائے۔ یہ سب الفاظ مجازی ہی طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اس کے سامنے کھڑے ہونے کے معنی اس کی طرف کے فیصلہ کے انتظار میں ٹھہرنے کے ہیں۔ نہ یہ کہ جسمانی طور پر اس کے منہ کے سامنے کھڑے ہوں گے [۱] جو کہ اس ذات کی بہ نسبت جو جسم و جسمانیات سے بری ہے، غیر ممکن ہے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوا
يَحْسِرُ تَنَا عَلَىٰ مَا فَرَّطْنَا فِيهَا ۖ وَهُمْ يَحْمِلُونَ أَوْزَارَهُمْ عَلَىٰ ظُهُورِهِمْ ۖ أَلَا
سَاءَ مَا يَزُرُونَ ﴿۳۱﴾

”گھانا اٹھایا ہے انہوں نے کہ جو اللہ کی بارگاہ میں حاضری کو جھوٹ بتاتے رہے یہاں تک کہ جب اچانک ان پر قیامت آجائے گی تو وہ کہیں گے کہ وا حسرتا! ہم نے اس کے بارے میں کوتاہی کو اور وہ اٹھارہے ہیں اپنے بوجھوں کو اپنی پشت پر۔ کیا برا بوجھ ہے جو وہ اٹھارہے ہیں۔“

”اس کے بارے میں کوتاہی کی“ یعنی ایمان لانے اور ان اعمال کے انجام دینے میں جو آج کے دن کام آتے۔ [۲]

وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَعِبٌ وَلَهْوٌ ۖ وَلِلْآخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ يُتَّقُونَ ۖ أَفَلَا
تَعْقِلُونَ ﴿۳۲﴾

”اوپنہیں ہے دنیوی زندگی مگر کھیل تماشہ اور بے شک آخرت والا گھر بہتر ہے ان کے لئے جو پرہیزگار ہوں، تو کیا عقل سے تم کام نہیں لو گے؟“

”دنیوی زندگی“ یعنی لذت دنیا اور وہ کام جو صرف دنیا کی خاطر کئے جاتے ہیں مثل کھیل تماشے کے ہیں جو وقتی تفریح کا ذریعہ ہوتے ہیں لیکن ان کا کوئی حاصل نہیں ہوتا لیکن آخرت کی خاطر جو کام کئے جائیں، وہ دائمی زندگی میں انسان کے کام آئیں گے۔ [۳]

قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَكِنَّ الظَّالِمِينَ
بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴿۳۳﴾

”ہمیں معلوم ہے کہ جو وہ کہتے ہیں، وہ آپ کو یقیناً رنج پہنچتا ہے تو وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے ہیں بلکہ وہ ظالم اللہ کی

[۱]۔ یحتمل ان یکون معنی اذوقفوا علی ربہم۔ حبسو اینتظر بہم ما یامر... وقد ظن قوم من المشتبہة... اذہم یشاہدونہ و ہذا فاسد (تبیان)

[۲]۔ تحسر و اعلی تفریطہم فی الایمان و التاہب لہا بالاعمال الصالحہ (تبیان)

[۳]۔ ای ما یمتبع بہ فی الدنیا۔ بمنزلۃ اللعب و اللہو الذین لا عاقبۃ لہم فی المنفعۃ... فاما الاعمال الصالحات فہی من اعمال الاخرۃ و لیس بلہو و لا بلع (تبیان)

آیتوں کا جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں۔“

بلند نفوس کے لئے سنگ و خدنگ اتنے تکلیف دہ نہیں ہوتے جتنی جاہل اشخاص کی لفظی بد تمیزیاں۔ یہ مصیبت پیغام حق کے اعلان کے بعد سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے انتہائی سوبان روح کا باعث تھی۔ اس پر خالق نے بطور تسلی و دل جوئی یہ آیات اتاری ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ آپ کو جو صدمہ ان کی باتوں سے پہنچتا ہے، وہ فطری طور پر بالکل صحیح ہے مگر حقیقت میں وہ شخصاً آپ کو جھوٹا تھوڑی بناتے ہیں۔ یہ بات تو خدا تک پہنچتی ہے، وہ تو خدا کی نشانیوں کا جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں، اس لئے ان کے معاملہ کو اللہ پر چھوڑ دیجئے اور آپ رنج نہ کیجئے۔

لَا يُكْذِبُ نَفْسُكَ كَمَا يَكْذِبُونَ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَوِّمٍ لَمَّا كَفَرُوا ۗ كَذِبُكَ كَذِبُكُمْ كَمَا كَذَبْتُمْ عَلَىٰ رَبِّكُمْ ۗ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَاقِلُ ۗ

قبول کرنا منظور نہیں ہے، اس لئے وہ انکار کرتے ہیں۔ علامہ طبرسی نے اس جملہ کے پانچ مفاہیم درج کئے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے ہمارے بیان کردہ دوسرے مفہوم کو درج کیا ہے اور کہا ہے:

هو قول اكثر المفسرين: وهو زيادة ترمفسرين كاقول ہے۔

اور سب سے آخر میں پہلے معنی کو جو ہم نے درج کئے ہیں مگر ہماری نظر میں اسی کو ترجیح ہے، اس لئے ہم نے اسی کو مقدم کیا ہے۔

وَلَقَدْ كَذَّبْتَ رَسُولًا مِّن قَبْلِكَ فَاصْبِرْ ۗ مَا كُذِّبُوا ۗ وَأُوذُوا حَتَّىٰ أَنتَهُمُ

نَصْرْنَا ۗ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۗ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِن نَّبِيَّائِ الْمُرْسَلِينَ ﴿٣٧﴾

”اور بہت سے پیغمبروں کو اس کے پہلے جھٹلایا گیا تو انہوں نے اس پر جو انہیں جھٹلایا گیا اور ایذائیں پہنچائی گئیں صبر کیا، یہاں تک کہ ہماری مدد ان کے پاس آئی اور اللہ کی باتوں کا کوئی بدلنے والا نہیں اور آپ کو کچھ نہ کچھ پیغمبروں کی خبریں پہنچ ہی چکی ہیں“ ﴿٣٧﴾

یہ دوسرا رخ ہے تسلی کا یہ نئی بات تھوڑی ہے۔ آپ کے پہلے ہمیشہ یہی ہوتا رہا اور تمام پیغمبروں کو اس طرح کی باتوں کا سامنا کرنا پڑا اور سنت الہیہ یہی رہی ہے کہ وہ پہلے ظالموں کو خوب کھل کھیلنے کا موقع دیتا ہے اور اپنے انبیاء سے صبر و تحمل کے ساتھ اس سب کو برداشت کراتا ہے، پھر آخر میں ان کی مدد کرتا ہے یہی اب بھی ہو رہا ہے اور ہونے والا ہے۔ ﴿٣٧﴾

وَإِنْ كَانَ كِبُرُ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَن تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ

سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُمْ بِآيَةٍ ۖ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَىٰ فَلَا

[1] لا يكدبونك في السر لعلمهم بأنك صادق (جلالين)

[2] المعنى انه اجره عليه و آله السلام ببعض اخبارهم على حسب ما علم من المصالح (مجمع البيان)

[3] لا احد يقدر على تكذيب خبر الله على الحقيقة ولا على اخلاف و عده (تبيان)

تَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿٣٥﴾

”اور اگر آپ پر ان کی روگردانی بڑی شاق ہے تو اگر کوئی سرنگ زمین میں نکال سکے، یا کوئی سیڑھی لگا سکے آسمان میں تو کوئی خاص معجزہ ان کے سامنے لائے اور اگر اللہ چاہتا تو انہیں سیدھے راستے پر اکٹھا کر دیتا تو ہرگز آپ جاہلوں میں سے نہ ہو جائے۔“

یہ ایک انداز بلاغت ہے کہ کبھی محبت کی باتیں ترش روئی کے انداز میں اور سخت لب و لہجہ میں ہوتی ہیں لیکن ان میں مضمر ہوتی ہے

شفقت و محبت۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا بڑا غم ہوتا تھا کہ یہ لوگ گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں اور اپنی بد اعمالیوں سے مستحق دوزخ بن رہے ہیں۔ اس کے لئے آپ بڑے ہی سوچ میں رہتے تھے اور ایک خاص کرب اور اذیت محسوس فرماتے تھے۔ اس کے لئے خالق نے کبھی یوں تلخ انداز اختیار کیا ہے جس میں کوٹ کوٹ کر محبت بھری ہوئی ہے کہ:-

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا ﴿٣٦﴾ (سورة كهف)

کیا آپ اپنی جان دے دیجئے گا اس رنج میں کہ یہ لوگ اس قرآن پر ایمان کیوں نہیں لاتے۔

اسی طرح کا تلخ لب و لہجہ اختیار کر کے یہاں کہا جا رہا ہے کہ ہمیں جتنے معجزات بھیجنا تھے، وہ ہم نے بھیج دیئے اور یہ پھر بھی ایمان نہیں لائے تو اب کیا کیا جائے۔ اس کے بعد بھی آپ کو پریشانی ہے تو اگر آپ سے ہو سکے تو آپ زمین میں سرنگ نکال کر یا آسمان میں سیڑھی لگا کر کوئی معجزہ پیش کیجئے ایسا کہ وہ ضرور ہی ایمان لے آئیں۔

پھر جیسے نرم لہجہ اختیار کر کے فلسفہ سمجھا یا جانے لگا کہ خالق کا اصول ہی یہ نہیں ہے کہ وہ جبر سے کام لے۔ نہیں تو وہ چاہتا تو کیا ممکن بھی تھا کہ کوئی گمراہ رہ جائے۔^[1]

آخر میں پھر جیسے لہجہ سخت ہو گیا کہ آپ خود سمجھدار ہیں۔ ان حقیقتوں سے بے خبر نہیں ہیں لہذا اس طرح کی باتیں کبھی نہ کیجئے جو بے خبری کا نتیجہ قرار پاسکتی ہیں۔

إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ ۗ وَالْمَوْتَىٰ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ ثُمَّ إِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ﴿٣٧﴾

”قبول بس وہی کرتے ہیں کہ جو سنتے ہیں اور جو مردے ہیں انہیں تو اللہ جلّائے گا، پھر وہ اس کی طرف پلٹ کر جائیں گے۔“

یہ چوتھا انداز ہے تسلی کا^[2]

مطلب یہ ہے کہ آپ کا کام تبلیغ کرنا ہے، ان کا کام اس تبلیغ کو توجہ سے سننا اور اس سے اثر لینا ہے لیکن اگر سننے والے غور سے سنیں ہی

[1]. انما ليفعل ما يلجئهم الى الايمان لان الدنيا في التكليف ويسقط استحقاق الثواب الذي هو الغرض بالتكليف (تبيان)

[2]. ثم بين سبحانه الوجه الذي لاجله لا يجتمع هؤلاء الكفار على الايمان (مجمع البيان)

نہیں اور ان میں اتنی زندگی ہی نہ ہو کہ وہ سن سکیں تو مردوں کو جلانا آپ کا کام تھوڑی ہے۔ وہ تو اللہ کا کام ہے۔ مردوں کو تو وہ قیامت میں جلانے گا اور وہاں ان کو مزادے گا۔

اس میں غور سے نہ سننے والوں کو فائدہ اٹھانے کی صلاحیت مفقود ہونے میں مردوں سے تشبیہ دی ہے [۱] ورنہ اگر مردہ ہی ہوتے تو ان پر نہ سننے کا جرم ہی کہاں عائد ہوتا!!

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ ط قُلْ إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَى أَنْ يُنْزِلَ آيَةً وَلَكِنَّ

أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۴۵﴾

”اور وہ کہتے ہیں کہ کیوں ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے کوئی معجزہ نہیں اترتا؟ کہہ دیجئے کہ یقیناً اللہ تو کسی بھی معجزہ کے اتارنے پر قادر ہے مگر ان میں سے اکثر جانتے نہیں۔“

معجزات تو برابر پیغمبر خدا ﷺ کے ہاتھوں پر نمایاں ہوتے ہی رہتے تھے مگر کفار ہٹ دھرمی سے طرح طرح کی فرمائشیں کرتے اور دیکھے ہوئے معجزات کو ان دیکھنا کے یہی رٹ لگاتے تھے کہ آخر کوئی معجزہ یہ کیوں نہیں لاتے۔ [۲]

اس کا تذکرہ قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے اور حسب موقع اس کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ یہاں یہ جواب دیا گیا ہے کہ خدا کی قدرت تو ہر معجزہ پیش کر سکتی ہے مگر اس کا فعل حکمت و مصلحت کی بنا پر ہوتا ہے۔ تمہاری نادانی اور جہالت کے مطالبوں کا وہ پابند نہیں ہو سکتا۔ آخر میں جو کہا گیا ہے کہ ”وہ جانتے نہیں“ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ وہ اپنی جہالت سے ایسی باتیں کہتے ہیں۔ اگر وہ علم کا جوہر رکھتے ہوتے تو اس طرح کی جاہلانہ باتیں نہ کہتے۔ اور ایک تفسیر میں اس کا مطلب یہ لیا گیا ہے کہ وہ نہیں جانتے کہ اگر ان کے فرمائشی معجزات آجائیں تو پھر نہ ماننے پر عذاب الہی میں دیر نہیں ہوگی۔ [۳]

جیسا کہ قرآن میں دوسرے مقام پر یہ مضمون صاف طور پر موجود ہے۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا ظَلِيْرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمٌّ أَمْثَالِكُمْ ط مَا

فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ ﴿۴۸﴾

”اور کوئی چلنے پھرنے والا زمین میں نہیں اور نہ کوئی پرندہ ہے جو اپنے دونوں پروں سے اڑتا ہے مگر تمہارے ہی ایسے مختلف اقسام [۴] ہم نے تحریر میں کوئی چیز اٹھا نہیں رکھی ہے۔ پھر وہ اپنے پروردگار کی طرف محشور ہوں گے۔“

[۱]۔ بمنزلہ المونی فکما ان المونی لایستجیبون لمن یدعوهم الی الحق والایمان فکذلک هؤلء الکفار

[۲]۔ هلا انزل علیه آیه یعنی الایة التي سألوها و اقتروا ان یأتیهم بها من جنس ما شاءوا (تبیان)

[۳]۔ لایعلمون ان الایة اذا جائت ولحمیة منوا بها یهلكوا (علی بن ابراہیم)

[۴]۔ اصناف مصنفة تعرف بأسماءها (مجمع البیان)

بظاہر یہ مراد ہے کہ خالق کا نظام تقدیر تمام کائنات پر حاوی ہے [۱] اور تم کیا اس سے نکلو گے۔ کوئی مخلوق اس سے نہیں نکل سکتی۔ نوشتہ تقدیر [۲] میں کوئی چیز نظر انداز نہیں ہوتی ہے۔

بعض مفسرین نے کتاب کے معنی قرآن لئے ہیں [۳] مگر شروع آیت کے مضمون سے اس کا کچھ لگاؤ معلوم نہیں ہوتا۔

وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا صُحْمٌ وَأُبْحَامٌ وَيَأْتِنَا فَسَادٌ أُولَٰئِكَ هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا هُمْ وَقَوْمُهُمْ لِيَأْخُذَهُمُ الْعَذَابُ لَو كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿۳۹﴾

”اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، وہ بہرے اور گونگے ہیں تاریکیوں میں۔ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے [۴] اور جسے چاہتا ہے سیدھے راستے پر لگا دیتا ہے۔“

یہ چاہنا اس کا اور اس کا بلا وجہ نہیں ہوتا بلکہ انسان کے ذاتی کردار کی سزا یا جزا میں ہوتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:-

وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ

اللہ گمراہی میں انہیں چھوڑتا ہے جو ظلم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ (سورہ ابراہیم - ۲۷)

اور دوسری جگہ:

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى

اور جو ہدایت حاصل کرتے ہیں، وہ ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیتا ہے۔ (سورہ محمد - ۱۷)

پھر ایک جگہ:

يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ

جو اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے درپے ہیں، انہیں اللہ اس کے ذریعہ سلامتی کی راہوں پر لگا دیتا ہے۔ (مانندہ: ۱۶)

اگر یہ نہ ہوتا تو بلا وجہ تفریق عدالت الہی کے خلاف ہوتی۔

قُلْ آرَاءَ يُعَذِّبُكُمْ إِنَّ أَلْسِنَتِكُمْ وَاللَّهُ أَوْ اتَّخَذْتُمْ السَّاعَةَ أَغْيَرَ اللَّهُ تَدْعُونَ ؕ

إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۴۰﴾ بَلْ آيَاتُهُ تَدْعُونَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَاءَ

وَتَنْسَوْنَ مَا أَنْشَرَكُمْ كُونَ ﴿۴۱﴾

”کہیے کہ کیا تم نے غور کیا ہے کہ اگر تم پر اللہ کا عذاب آئے یا قیامت تم پر آجائے تو کیا اللہ کے سوا کسی کو پکارو گے تو

[۱]۔ امم امثالکم فی تقدیر خلقہا ورزقہا و احوالہا (جلالین)

[۲]۔ کتاب یعنی لوح محفوظ (شاہ ولی اللہ)

[۳]۔ وهو قول اکثر المفسرین (مجمع البیان)

[۴]۔ یخذه بان بمنعه الطافه (مجمع البیان)

اگر سچے ہو، بلکہ اسی کو پکارو گے تو اگر وہ چاہے گا تو جس کے لئے تم نے اسے پکارا ہے، اس آفت کو دور کر دے گا اور تم انہیں جن کو شریک کرتے ہو، بھول جاؤ گے۔“

یوں تو ”رأیت“ واحد مذکر حاضر کا صیغہ ہے جس میں فاعل مفرد ہے اور ظاہر ایسا ہوتا ہے کہ مفعول اس کا کُم کے لفظ کے ساتھ لایا گیا ہے جو جمع مذکر حاضر کی ضمیر ہے، اس لئے یہ ترجمہ ہو سکتا ہے کہ ”کیا تم میں سے ہر ایک نے اپنی جماعت کو دیکھا ہے مگر نحوی قواعد کے لحاظ سے محاورہ میں اس کا ترجمہ وہی ہوتا ہے جو ”أَرَأَيْتُمْ“ کے لفظ کا ہوا کرتا ہے یعنی کیا تم نے دیکھا ہے یا غور کیا ہے [۱]؟

اس کے لئے جناب شیخ طوسی رحمۃ اللہ علیہ نے تبیان میں اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے مجمع البیان میں کافی بسط مگر پیچیدہ قسم کی بحث کی ہے جو اردو داں طبقہ کے لئے بہت غیر عام فہم چیز ہے۔ بہر حال نتیجہ تمام بحثوں کا یہ ہوتا ہے کہ یہ بس ایک محاورہ ہے جو اہل زبان بولتے ہیں۔ اس میں یہ بیچ میں جو ضمیر ہوتی ہے۔ (ک۔ کما۔ کم) اس کے کوئی خاص معنی الگ سے نہیں ہوتے [۲]

مطلب یہی ہوتا ہے کہ کیا تم نے دیکھا وہ جس کا بیان اس کے بعد ہے!؟

ہاں! بعض مترجمین ایسے ملتے ہیں جو رأیت کم لفظ میں فاعل اور مفعول دونوں کے معنی کہتے ہیں۔ [۳] مگر میرے خیال میں وہ اہل زبان کے محاورات سے غفلت کے ساتھ صرف عام قواعد نحوی کے ماتحت لفظ پر نظر کرنے کا نتیجہ ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَآخَذْنَا مِنْهُمُ بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ

يَتَضَرَّعُونَ ﴿۳۲﴾ فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُمْ بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا وَلَكِنْ قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ

لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۳۳﴾

”اور ہم نے آپ سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف رسول بھیجے تو ان کو طرح طرح کی تکلیفوں میں گرفتار کیا، شاید کہ وہ تضرع و زاری کریں تو آخر یوں انہوں نے جب ہماری طرف سے سختی آئی، تضرع و زاری نہ کی بلکہ ان کے دل سخت ہو گئے اور شیطان نے آراستہ کر کے پیش کیا ان کی نگاہوں میں ان کاموں کو جو وہ کرتے تھے۔“

قرآن مجید میں جو دو لفظ ہیں: البأساء والضراء ان میں مفہوم کے لحاظ سے کیا فرق ہے اس کے تعین میں اقوال مختلف ہیں۔ بعض نے بأساء کے معنی تنگدستی کے اور ضراء کے معنی بیماری کے لئے ہیں [۴] اور بعض نے کچھ اور [۵] اس لئے ہم نے ترجمہ میں ان سب کا حاصل

[۱] آیادیدید (شاہ ولی اللہ)

[۲] الصحيح الذى عليها النحويون ان الكفلا موضع لها والمعنى ارأيت زيدا ما حاله والكف زيادة في بيان الخطاب (تبیان)

[۳] کیا دیکھا تم نے اپنے تئیں (شاه رفیع الدین)

[۴] يرید به الفقر والبؤس والاسقام والواجع (مجمع البیان) تنگی معیشت و بیماری (شاه ولی اللہ) ساتھ فقر کے اور مرض کے (رفیع الدین)

[۵] قال قوم البأساء والجوع والضراء النقص في اموال والانفس والبأساء من البأس والخوف والضراء من الضر وقد يكون البأساء من البؤس (تبیان)

”طرح طرح کی تکلیفوں“ کے ساتھ درج کر دیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اکثر انسانی فطرت مصیبت کے وقت پر اللہ کو یاد دلاتی ہے جیسا کہ جناب امید لکھنوی نے فرمایا ہے:

گر پڑھی بھی کبھی ہم نے تو نماز حاجت

اپنے مطلب کے لئے یاد خدا بھی آئی

اور اس لئے اکثر افراد کے لئے یہ تکالیف دینا اصلاح نفس کا باعث بن جانے کی بنا پر خالق کی طرف سے ایک لطف خاص کی حیثیت رکھتے ہیں۔

خالق نے ان افراد کے بارے میں اس ذریعہ کو بھی آزمایا، اپنے علم کے لئے نہیں بلکہ دوسروں کو دکھانے کے لئے کہ یہ ایسے ”کج فطرت“ ہیں کہ یہ ذریعہ بھی اصلاح کا ان میں ناکام ہوتا ہے۔ اس کج فطرتی کو ”قساوت“ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ ان کے دل ایسے سخت تھے کہ اس یاد الہی کے محرک ہونے والے ذریعہ سے بھی متاثر نہ ہوئے بلکہ ان تمام تکالیف میں بھی ان کے لہو و لعب اور ناجائز تفریحات کے مشغلے جو شیطانی کام ہیں، جاری رہے جس کا مشاہدہ اس تہذیب جدید میں بھی اکثر ملکوں میں ہوتا ہے کہ سخت بھونچالوں اور تباہیوں میں بھی سینما گھروں کی رونق میں فرق نہیں آتا۔

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمُ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ط حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَآ

أُوتُوا أَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً فَاذَاهُمْ مُبْلِسُونَ ﴿٣٣﴾ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا ط

وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٣٤﴾

”توجہ انہوں نے بھلا دیا ان باتوں کو جن کے متعلق انہیں نصیحت کی گئی تھی تو ان پر ہر چیز کے دروازے ہم نے کھول دیئے یہاں تک کہ جب وہ خوب خوش ہوئے اس سے جو انہیں ملا تھا تو ہم نے اچانک انہیں گرفت میں لے لیا تو وہ ایک دم بے آس ہو گئے ﴿۳۳﴾ تو ظالموں کی اصل نسل قطع ہو گئی ﴿۳۴﴾ اور شکر ہے اللہ کا جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔“

”ہر چیز کے دروازے کھول دیئے“ یعنی دولت اور دنیوی عیش و آرام کے سامانوں کی بہتات کر دی۔ ﴿۳۳﴾ اس سے معلوم ہوا کہ یہ دنیوی کامرانیاں اکثر انسانوں پر عتاب الہی کی علامت ہوتی ہیں۔ اسی لئے حضرت امیر علیہ السلام سے وارد ہوا ہے:-

یا بن آدم اذا رأيت ربك يتابع عليك نعمه فاحذره (مجمع البیان)

اے آدم زاد! جب تو اپنے پروردگار کو دیکھ کہ وہ مسلسل نعمتیں دے رہا ہے تو اس سے خوف کر۔

آخر میں الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ کا فقرہ ان کی انتہائی بد اعمالی کا اظہار ہے کہ ان کا وجود صفحہٴ حیات پر ایک بہت بڑا دھبہ تھا اور خلق

[۱]. ائسون من كل خير (جلالین) شدندنا اميدشونده (شاه ولی اللہ)

[۲]. فلم يبق لهم عقب ولا نسل (مجمع البیان)

[۳]. ای کل نعمة وبركة من السماء والارض (مجمع)

خدا کے لئے ایک وبال تھا جو ہٹا دیا گیا تو یہ اللہ کا بہت بڑا احسان ہوا۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَخَذَ اللَّهُ سَمْعَكُمْ وَأَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلَى قُلُوبِكُمْ مَنِ إِلَهٌ

غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بِهِ ۗ أَنْظُرْ كَيْفَ نَصَرَفَ الْآيَاتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُونَ ﴿٣٦﴾

”کیسے کہ کیا تم نے دیکھا ہے کہ اگر اللہ تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں لے لے اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے تو اللہ کے سوا کون خدا ہے جو یہ سب تمہیں دے دے؟! دیکھئے کس طرح ہم طرح طرح سے حقیقتیں واضح کرتے ہیں، پھر بھی وہ روگردانی کرتے ہیں۔“

یہاں دلوں پر مہر لگانے سے مراد شعور کی طاقت کا سلب کرنا ہے۔^[۱]

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَنْتُمْ عَذَابَ اللَّهِ بَعْتُمْ أَوْ جَهَنَّمَ هَلْ يُهْلِكُ إِلَّا الْقَوْمَ

الظَّالِمُونَ ﴿٣٧﴾

”کیسے کہ کیا تم نے غور کیا ہے کہ اگر تم پر اللہ کا عذاب آئے اچانک یا ظاہر بظاہر تو کیا سوا ظالم جماعت کے کوئی تباہ و برباد ہوگا۔“

”اچانک“ کے معنی میں مضمحل ہے بے خبری مثلاً رات کو عذاب آگیا، جب وہ سو رہے تھے کہ عذاب کے پیشگی آثار کو بھی نہ دیکھ سکے..... اس لئے اس کے مقابل میں کہا گیا ”ظاہر بظاہر“ یعنی اس طرح کہ آنکھوں سے اس عذاب کی آمد کا مشاہدہ کریں۔^[۲] قرآن مجید کا انداز رواداری دیکھئے کہ بہت سخت بات بھی کہتا ہے تو اس میں زیادہ سے زیادہ جو ممکن نرمی ہو، وہ پیدا کر دی جاتی ہے۔ یہاں شرط و جزاء دونوں پر غور کیجئے۔ ”اگر تم پر اللہ کا عذاب آئے اچانک یا ظاہر بظاہر“..... کھلی ہوئی جزاء اس شرط کے بعد کے مضمون کے لحاظ سے یہ ہے کہ ”کیا تمہارے سوا اس سے کوئی تباہ و برباد ہوگا؟“ مگر تباہی و بربادی کے محل پر صاف صاف مخاطب جماعت کو نہ لاکر قرآن نے جیسے بات ان سے علیحدہ کر کے کہہ دی کہ ”کیا سوا ظالم جماعت کے کوئی اور تباہ و برباد ہوگا؟“ مطلب وہی ہے مگر ذرا سے انداز کے بدلنے سے کلام کی تلخی میں کتنی کمی ہوگئی؟ اسے وہ کیا سمجھیں جنہیں رواداری کی قدر و قیمت معلوم نہیں۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ ۗ فَمَنْ آمَنَ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ

عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٣٨﴾ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوا

يَفْسُقُونَ ﴿٣٩﴾

”اور ہم پیغمبروں کو نہیں بھیجتے مگر خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر تو جو ایمان لایا اور ٹھیک اعمال کرتا رہا تو نہ

[۱]. طبع علی قلوبکم فلا تعرفون شہیناً (جلالین) بان سلب ما فیہا من العقول التي بہایتہا لکم ان تؤمنوا برکم (تبیان)

[۲]. المغاجا تو هو ان یأتیہم العذاب وہم غافلون غیر متوقعین لذلك او جہر قای وہم مشاہدون لہو معانیون نزولہ (تبیان)

ان پر کوئی اندیشہ ہے اور نہ انہیں افسوس ہوگا ﴿۱﴾ اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، انہیں عذاب ہوگا ﴿۲﴾ اس لئے کہ وہ فسق و فجور کرتے رہے۔

اولیائے الہی سے خوف و حزن کی نفی قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی ہوئی ہے جس کے تحت میں باختلاف الفاظ ہر جگہ لکھا گیا ہے کہ دنیا میں خاصانِ خدا کو بلاشبہ خوف اور حزن سے سابقہ پڑا کرتا ہے، اس لئے جس خوف کی نفی ہوئی ہے وہ ’اندیشہ انجام‘ ہے جو ضمیر کی بے اطمینانی کا نتیجہ ہوتا ہے اور جس حزن کی نفی ہے، وہ اپنے کردار پر افسوس ہے جو پشیمانی کا مرادف ہوتا ہے۔ یہ دونوں باتیں باایمان نیک کردار افراد کے یہاں کبھی نہیں ہوتیں اور اسی کے نتیجہ میں ان کے یہاں وہ ثبات قدم اور استقلال نظر آتا ہے کہ آندھیاں اور زلزلے ان میں جنبش پیدا نہیں کرتے۔

قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ ۗ إِنِ اتَّبَعُ إِلَّا مَا يُوْحَىٰ إِلَيَّ ۗ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۗ أَفَلَا تَتَفَكَّرُونَ ﴿۵﴾

”کہہ دیجئے کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں (بذات خود) غیب جانتا ہوں اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں نہیں پیروی کرتا مگر اس کی جو میری طرف وحی ہو۔ کہیے کہ کیا برابر ہے اندھا اور آنکھوں والا؟! کیوں غور و فکر سے کام نہیں لیتے ہو۔“

رسول کو جو کچھ اقتدار ہوتا ہے، وہ منجانب اللہ ہوتا ہے اور جو جو کچھ علم غیب ہوتا ہے، وہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے ﴿۳﴾ اور جو غیب کی باتیں ایسی ہوں جنہیں اللہ نے اپنے سے مخصوص قرار دیا ہے تو ان کا علم غیر اللہ کو نہیں ہو سکتا ﴿۴﴾۔

ذاتاً پیغمبر کے قبضہ میں کچھ نہیں اور نہ بذات خود علم غیب ہے۔ اسی کی نفی ہوئی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ میں معاذ اللہ، اللہ کا مقابل نہیں ہوں کہ بغیر اس کی مرضی کے کوئی معجزہ دکھا سکوں۔ ﴿۵﴾

وَأَنْذِرْ بِهِ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَنْ يُحْشَرُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِنْ دُونِهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿۶﴾

”اور ڈراؤ اس کے ذریعہ سے ﴿۶﴾ ان کو جو اندیشہ رکھتے ہیں اس کا کہ وہ اپنے پروردگار کی طرف محشور ہوں گے۔ نہ

[۱]. کہا یحزن اهل النار (مجمع البيان)

[۲]. يصيبهم العذاب (مجمع البيان)

[۳]. انما اعلم قدر ما يعلمني الله تعالى (مجمع البيان)

[۴]. لا اعلم الغيب الذي يختص بعلم الله تعالى (تبيان)

[۵]. انى لا ادعى الربوبية مواناً ادعى النبوة (مجمع)

[۶]. اى بالقران... وقيل بالله (مجمع البيان)

ہوگا ان کا اس کے سوا کوئی سرپرست اور نہ سفارشی۔ شاید وہ پرہیزگاری اختیار کریں۔“

’جو آخرت کا اندیشہ رکھتے ہیں‘ ان کا اندیشہ انجام بخیر ہونے کی وجہ سے نتیجتاً امید ثابت ہوگا، اس لئے ہماری قدیم تفسیر میں یحافون کے معنی آئے ہیں: یرجون یعنی امید رکھتے ہیں [۱] ورنہ فعلی حیثیت سے خوف، رجاء کے مقابل کی چیز ہے اور مومن کی شان یہ ہے کہ وہ خوف اور امید دونوں جو ہروں کا حامل ہو جیسا کہ حدیث میں ہے:- الايمان نصفان نصف خوف و نصف رجاء۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ ۗ مَا عَلَيْكَ
مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ
فَتَكُونُ مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿۵۶﴾

’اور انہیں پاس سے دھتکارے نہیں جو اپنے پروردگار کو صبح و شام پکارتے ہیں کہ اس کی رضا کے طلب گار ہیں۔ آپ پر ان کے حساب کتاب کی کچھ ذمہ داری نہیں ہے، نہ آپ کے حساب کتاب کی ذمہ داری کچھ ان پر ہے، جو آپ انہیں دھتکار دیں تو ہو جائیں گے ظالموں میں سے۔‘

رہیسوں کے ذہنیت کے مقابلہ میں غریبوں کی دل جوئی

طبقة رؤسا کی ایک ذہنیت یہ ہے کہ غریبوں کے پاس بیٹھنا اٹھنا یا ان کے حلقہ میں رہنا اپنے لئے کسر شان اور باعثِ عار سمجھتے ہیں چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام سے خطاب کر کے قرآن مجید میں ان کا کہنا درج ہے کہ:

أَتُوْا مِنْ لَدُنْكَ وَاتَّبِعَكَ الْأَثَرُ ۚ

کیا ہم آپ پر ایمان لائیں حالانکہ آپ کے پیرو ہوئے ہیں بہت کم درجہ کے لوگ۔ (شعراء: ۱۱۱)

اس طرح پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض رؤسائے عرب کا مطالبہ یہ تھا کہ آپ غریب مسلمانوں کو اپنے پاس بیٹھنے نہ دیا کریں [۲] اس کے جواب میں یہ آیت اتری۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم خود معاذ اللہ ایسا کرنا چاہتے تھے [۳] بلکہ اس قسم کے سخت الفاظ میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قسم کے کام سے روکنا ان لوگوں کی زبان بند کرنے کے لئے تھا جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کا کردار اختیار کرنے کے متقاضی تھے۔ اس کے لئے کبھی اسے یوں صرف ممانعت کے انداز میں پیش کیا گیا ہے اور کبھی اس طرح کہ:

وَأِنْ تَطَعْتَ أَكْثَرُ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ:

اگر آپ دنیا کے بہت سے آدمیوں کی خواہشوں پر چلنے لگے تو وہ آپ کو اللہ کے راستے سے ہٹا دیں گے۔ (انعام: ۱۱۶)

[۱] یحافون ای یرجون (علی بن ابراہیم)

[۲] سبب نزول هذه الآية ماروا ابن مسعود وغيره ان ملائق قريش وقال الظرا من الكفار منهم عينية بن حصين قالوا يا رسول

الله صلى الله عليه واله وسلم لو نهيت هؤلاء عنك لفاك اشرف قومك واسلموا (تبيين)

[۳] كما قال تعالى: لئن اشركت ليجبطن عملك وان كان الشرك مأمونا منه (تبيان)

اور بعض جگہ تمثیلی انداز میں اس قسم کے کردار کی تصویر کشی کر کے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے جیسے سورہ عبس میں ہے جس کی تشریح اپنے محل پر آئے گی چنانچہ وہاں بھی یہ تصور غلط ہے کہ معاذ اللہ رسول ﷺ سے یہ کردار ظہور میں آیا تھا۔ ایسا ہرگز نہیں تھا۔

وَكَذَلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لِّيَقُولُوا أَهَؤُلَاءِ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِن بَيْنِنَا ۗ

أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِالشَّاكِرِينَ ﴿٥٣﴾

’اور اسی طرح ہم نے کچھ لوگوں کی آزمائش کی ہے کچھ کے ذریعہ سے تاکہ وہ کہیں کہ کیا یہ وہ ہیں جن کو ہم میں سے اللہ نے اپنے احسان سے نوازا ہے؟ کیا اللہ شکر گزاروں کا بہترین جاننے والا نہیں ہے؟‘

رہیسوں کا یہ مطالبہ کہ غریبوں کو اپنے پاس سے نکال دیجئے، یہ بھی ایک طرح کے حسد کا نتیجہ ہے یعنی وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان غریبوں نے جو رتبہ حاصل کر لیا ہے وہ ہمیں حاصل نہیں ہے۔ اسی کو کہا جا رہا ہے کہ اس جذبہ حسد ہی کی وجہ سے مختلف اشخاص میں ایک، دوسرے کے لئے ذریعہ آزمائش بن جاتا ہے [۱]۔

وہ بطور رشک یہ کہتے ہیں کہ اللہ کا یہ انعام ان غریبوں کے شامل حال کیوں ہوا ہے؟ یہ ان کا کہنا اللہ کا کوئی مطلوبہ مقصد نہیں ہے مگر چونکہ اس امتحان کے نتیجہ میں ہوتا یہی ہے، اس لئے کہا گیا کہ ہم اس طرح آزمائش کرتے ہیں تاکہ وہ یوں کہیں۔ [۲]

اس کا جواب آخر کے جملہ سے دیا گیا ہے کہ اسے کیا کیا جائے کہ ان غریبوں نے ہی بعثت رسول ﷺ کی نعمت کی قدر کی اور شکر گزار ثابت ہوئے اور تم رہیسوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی، ناشکرے ثابت ہوئے تو کیا اللہ شکر گزاروں کو کوئی صلہ نہ دے اور اب تم ناشکروں کی خاطر سے انہیں نظر انداز کر دے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔

دوسری طرح اس کی تشریح یوں ہوئی ہے کہ دولت اور غربت کوئی معیار بلند و پستی نہیں ہے۔ یہ دونوں امتحان کے طریقے ہیں۔ مالداروں کا امتحان غریبوں کے ذریعہ سے ہے کہ وہ ان کے ساتھ کیسی ہمدردی کرتے ہیں اور غریبوں کا امتحان مالداروں کے ذریعہ سے ہے کہ وہ کس طرح ان سے بے نیازی اختیار کرتے ہیں۔ پھر یہ انہی غریبوں میں سے کچھ افراد کا کردار ہے (جو امتحان میں ناکام ہیں) کہ وہ مالداروں پر رشک کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کیا اللہ کی نعمتیں سب انہی سے مخصوص ہو گئی ہیں؟ [۳]

وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَّمَ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَى

نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۖ أَنَّهُ مَن عَمِلَ مِنكُمْ سُوءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِن بَعْدِهِ

وَاصْلَحَ ۖ فَأَنَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٥٤﴾

[۱]. ابتلینا هذا الرؤساء من قريش بالموالی (مجمع البيان)

[۲]. فليس المراد باللام الغرض... لكن اللام لام العاقبة (تبيان)

[۳]. يقولوا ای الفقراء أهؤلاء الاغنياء من الله عليهم من بيننا (علی بن ابراہیم)

”اور جب آپ کے پاس آئیں وہ جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے ہیں تو کیسے سلام علیکم [۱] تمہارے پروردگار نے اپنے ذمہ رحمت کو عائد کر لیا [۲] کہ جو تم میں سے کوئی برائی ناواقفیت سے کرے، پھر اس کے بعد توبہ کر لے اور ٹھیک اعمال کرے تو وہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔“

قرآن نے صاف طریقہ سلام سکھایا ہے: سلام علیکم.....

اس صورت میں کتنی بڑی جہالت ہے کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ سلام علیکم کہنے سے گریز کرتا ہے اور وہ السلام علیکم کا پابند ہو گیا ہے۔ حالانکہ از روئے قرآن، یہ دونوں ہی طریقے صحیح ثابت ہو رہے ہیں۔

وَ كَذَلِكَ نَفْصِلُ الْأَيَاتِ وَلِتَسْتَبِينَ سَبِيلَ الْمُجْرِمِينَ ﴿٥٥﴾

”اور اسی طرح ہم اپنی باتوں کو تفصیل کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور تاکہ مجرموں کا راستہ صاف طور پر سمجھ میں آجائے“ [۳]

قُلْ إِنِّي مُهَيِّتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۗ قُلْ لَا أَتَّبِعُ أَهْوَاءَ كُمْ ۗ

قَدْ ضَلَلْتُ إِذًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُهْتَدِينَ ﴿٥٦﴾

”کہہ دیجئے کہ مجھے اس سے ممانعت ہوئی ہے کہ میں عبادت کروں ان کی جنہیں تم اللہ کے سوا خدا کہہ کے پکارتے ہو [۴] کہیے کہ میں تمہارے دل بخواہ خیالات کی پیروی نہیں کروں گا۔ اس صورت میں تو میں گمراہ ہو جاؤں گا اور منزل تک پہنچنے والوں میں نہیں ہوں گا۔“

”اہو آء“ یعنی ”دل بخواہ خیالات“ کے لفظ نے ان کی ہم رنگی سے انکار کی وجہ ظاہر کر دی کہ تمہاری یہ عبادتیں اپنی صحت کی کوئی سند نہیں رکھتیں [۵] ان کا ”اہو آء“ یعنی ”ایجاد بندہ“ کی حیثیت رکھنا ہی خود ان کے بطلان کی دلیل ہے۔

قُلْ إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي ۖ وَ كَذَّبْتُمْ بِهِ ۗ مَا عِندِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ ۗ إِن

الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۗ يَقْضُ الْحَقُّ ۖ وَهُوَ خَيْرُ الْفَصِّلِينَ ﴿٥٧﴾ قُلْ لَوْ أَنَّ عِندِي مَا

تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ لَقُضِيَ الْأَمْرُ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۗ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِالظَّالِمِينَ ﴿٥٨﴾

[۱]. بگو سلام علیکم (شاہ ولی اللہ)

[۲]. یعنی او جب الرحمة لمن تآب والدلیل علی ذلك قوله: انه من عمل منكم سوء بمجھالة (علی بن ابراہیم)

[۳]. ای لیظہر طریق من عاند بعد البیان... لیجانبوہا ویسلکو غیرہا (مجمع البیان)

[۴]. الاوثان التي تعبدونها من دون الله وتدعونها الهة (تبیان)

[۵]. ای انما عبدتموها علی طریق الهوی لا علی طریق البینة والبرهان (مجمع البیان)

”کہہ دیجئے کہ میں اپنے پروردگار کی طرف سے کھلی ہوئی دلیل پر قائم ہوں [۱] اور تم نے اسے جھٹلایا ہے۔ میرے پاس وہ نہیں ہے جس کے لئے تم جلدی کرتے ہو۔ فیصلہ کا اختیار نہیں ہے مگر اللہ کو۔ وہ حق باتیں بیان کرتا ہے اور بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ کہہ دیجئے کہ اگر میرے قبضہ میں ہوتا وہ جس کے لئے تم جلدی کرتے ہو تو فیصلہ ہو چکتا میرے اور تمہارے درمیان اور اللہ ظالموں کا بہترین جاننے والا ہے۔“

”جس کے لئے تم جلدی کرتے ہو“۔ یعنی عذاب الہی جیسا کہ دوسری جگہ ہے:

يَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وہ آپ سے عذاب کے لئے جلدی کرتے ہیں۔ (عنکبوت: ۵۴)

یہ ”جلدی کرنا“ ان کا واقعی عذاب کی خبروں کو صحیح سمجھ کر تھوڑی ہوتا تھا بلکہ چونکہ وہ منکر تھے اور اسے بے اصل سمجھتے تھے، اس لئے کہتے تھے کہ اگر ہمارے اعمال جیسا کہ تم کہتے ہو، عذاب ہی کے مستوجب ہیں تو تم ہم پر عذاب نازل کیوں نہیں کر دیتے؟! اس کا جواب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی یہاں اس انداز میں دیا جا رہا ہے۔

اس جواب میں جو الفاظ صرف کئے گئے ہیں، وہ عام انسانی فطرت کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ جلد باز اور اپنے مخالف کے خلاف مشتعل ہونے والا اور جذبہ انتقام سے کام لینے والا ہوتا ہے تو اگر معاملہ اس کے ہاتھ میں ہو تو وہ ایک دم اپنے مخالفین کو تھس تھس کر دے مگر یہ اللہ ہے جو حکیم ہونے کی بنا پر حلیم ہے اور وہ اپنے بندوں کو طویل مہلتیں دیتا رہتا ہے تاکہ اصلاح کا زیادہ سے زیادہ موقع ملے اور حجت تمام ہو۔

اب جو بندے بھی مرضی الہی کے انتہائی پابند ہیں، وہ خالق کے اس حلم کی بنا پر خود بھی تحمل سے کام لیتے ہیں جیسا کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مخالفوں کے لئے بددعا کے بجائے، خود بارگاہ الہی میں ان کی طرف سے معذرت فرماتے تھے کہ رَبِّ اِهْدِنَا صِرَاطَكَ فَتَعْلَمُونَ۔ یہ اللہ کی ربوبیت کے زیر سایہ اس کی عبودیت کا حق ادا کرنا تھا اور اسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ یہ قول کہ ”اگر معاملہ میرے ہاتھ میں ہوتا تو کب کا فیصلہ ہو جاتا۔“ یہ آپ کے مخصوص درجہ عبودیت سے قطع نظر کرتے ہوئے عام فطرت بشری کا اظہار ہی ہے۔

وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ط وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلْمَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ﴿۵۹﴾

”اور اس کے پاس کنجیاں ہیں غیب کی جنہیں سوا اس کے کوئی نہیں جانتا اور وہ جانتا ہے اسے کہ جو خشکی اور تری میں ہے اور کوئی پتہ نہیں گرتا مگر وہ اسے جانتا ہے اور نہ کوئی دانہ زمین کی تارکیوں میں اور نہ تراور نہ خشک مگر یہ کہ وہ ایک روشن نوشتہ میں موجود ہے۔“

خالق کے علم کی ہمہ گیری

[۱]۔ علی مرتبین من معرفة الله وصحة نبوته لا متبع للهوئی (تبیان)

یہ خداوند عالم کی وسعت علم کا بیان ہے اور اسی سیاق میں: ”وَلَا رَطْبٌ وَلَا يَابِسٌ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ“ میں کا جملہ ہے جس کا نمایاں مفہوم علم الہی ہے جو لوح محفوظ میں ثبت مانا جاتا ہے [۱]۔
جناب شیخ طوسی نے ان دونوں کا الگ الگ بطور دو احتمالوں کے ذکر کیا ہے [۲]۔
مگر عام طور سے یہ فقرہ مستقل آیت کے طور پر اس مضمون کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں ہر چیز کا بیان موجود ہے۔
ابھی تک اس کا ماخذ میرے علم میں نہیں ہے۔

وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ
لِيُقَضَىٰ أَجَلٌ مُّسَمًّى ۖ ثُمَّ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ
تَعْمَلُونَ ﴿٦٠﴾

”اور وہ ہے جو رات کے وقت تمہاری روح کو لے لیتا ہے اور جو کچھ تم نے دن میں کیا ہے [۳] اسے جانتا ہے۔ پھر تمہیں اس میں اٹھاتا ہے تاکہ (زندگی کی) مقررہ مدت پوری ہو [۴] پھر اسی کی طرف تمہارا پلٹنا ہوگا۔ پھر وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کیا کرتے تھے۔“
پہلے آچکا ہے کہ تَوَفَّىٰ کے معنی موت کے نہیں ہیں چنانچہ یہاں یہ لفظ رات کی نیند کے لئے صرف ہوا ہے کہ اس میں بھی ایک طرح سے انسان کی روح کو اس عالم سے اٹھایا جاتا ہے۔ [۵]

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمْ
الْمَوْتُ تَوَفَّنَاهُ رُسُلَنَا وَهُمْ لَا يَفْزِطُونَ ﴿٦١﴾ ثُمَّ رُدُّوْا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمْ الْحَقِّ ۖ
أَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۖ وَهُوَ أَسْرَعُ الْحَاسِبِينَ ﴿٦٢﴾

”اور وہ اپنے بندوں پر پورا قابو رکھتا ہے اور تم پر نگہبانوں کو بھیجتا ہے یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی ایک کو رات کا ہنگام آتا ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) اس کی روح قبض کرتے ہیں اور وہ کوتاہی نہیں کرتے۔ پھر وہ پلٹائے جاتے ہیں اللہ کی طرف جو ان کا حقیقی مالک ہے بلاشبہ اس کے لئے فیصلہ کرتا ہے اور وہ تیز ترین حساب

[۱] فی کتب مبین ہو اللوح المحفوظ (جلالین) ای فی اللوح المحفوظ (مجمع البیان)

[۲] یجتمل امرین: احدهما ان یکون معناہ فی علم اللہ.. وثانیہا... ان یکون اللہ تعالیٰ اثبت ذلك فی کتاب قبل ان یخلق (تبیان)

[۳] کسبتم یقال فلان جارحة اہلہ ای کاسیبہم (تبیان)

[۴] ای لتستوفوا أجالکم (مجمع البیان) هو الموت (علی بن ابراہیم)

[۵] یقبض ارواحکم عند النوم (جلالین) قبض روح شمشاہی کندیشب (شاہ ولی اللہ)

کرنے والا ہے۔

نگہبانوں سے مراد کاتبان اعمال ہیں [۱] اور ایک تفسیر کے مطابق یہ لفظ عام ہے۔ اس میں وہ فرشتے بھی داخل ہیں جو آفات و بلیات سے خود انسان کی حفاظت کرتے ہیں اور وہ بھی جو اس کے اعمال کو قلم بند کر کے محفوظ کرتے ہیں۔ [۲]

قُلْ مَنْ يُنَجِّبِكُمْ مِّنْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُونَهُ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ۗ لِّئِنْ
أُنجِئَا مِنْ هَذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴿۶۳﴾ قُلِ اللَّهُ يُنَجِّبِكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ
كَرْبٍ ثُمَّ أَنْتُمْ تُشْرِكُونَ ﴿۶۴﴾

”کہیے کہ کون تمہیں چھٹکارا دیتا ہے، بیابان اور دریا کے اندھیروں سے [۳] کہ تم اسے پکارتے ہو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے، اگر اس سے ہمیں وہ چھٹکارا دیدے تو ہم شکر گزاروں میں سے ہوں گے کہنے کا اللہ تمہیں ان سے اور ہر طرح کی تکلیف سے چھٹکارا دیا ہی کرتا ہے۔ پھر بھی تم شرک اختیار کرتے ہو۔“

”اندھیروں“ سے چھٹکارا دینے کے معنی ہیں ”سخت اور ہولناک تکالیف“ سے نجات دینا جو عرب کے عام محاورہ کے مطابق ہے [۴]

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ
أَرْضِكُمْ أَوْ يَلْبَسَكُمْ شِيْعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ ۗ أَنْظُرْ كَيْفَ
نُصِّرُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ ﴿۶۵﴾

”کہیے وہ یہ قدرت رکھتا ہے کہ تم پر عذاب بھیجے تمہارے اوپر سے یا تمہارے پیروں کے نیچے سے یا تمہیں مختلف گروہوں کی صورت میں کر کے دست و گریبان کر دے اور تم میں سے بعض کو بعض کی سختی کا مزہ چکھائے۔ دیکھئے ہم کس طرح حقیقتوں کو طرح طرح سے پیش کرتے ہیں، شاید کہ وہ سمجھیں۔“

”اوپر سے یا نیچے سے“ اس سے بظاہر تو وہ عذاب مراد ہیں جو آسمان کی طرف سے آتے ہیں [۵] یا جو زمین کی طرف سے آتے ہیں [۶] اور یہ بلاشبہ وہ حوادث ہیں جو اللہ کی طرف سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ لیکن ایک تفسیر اس کی یہ ہوئی ہے ”اوپر سے عذاب“ سے مراد کسی حاکم جابر

[۱] یعنی یرسل علیکم ملائکة یحفظون۔ اعمالکم و بخصوہا علیکم و یکتوبہا (تبیان) ملائکة تحصى اعمالکم (جلالین)

[۲] یعنی الملائکة الذین یحفظونکم و یحفظون اعمالکم (علی بن ابراہیم)

[۳] ظلمات البر و البحر اھو الھما فی اسفارکم (جلالین)

[۴] یقول العرب لیلوم الذی یلقى فیہ الشدۃ یوم مظلم (تبیان)

[۵] کالجارة و الصیحة (جلالین)

[۶] کالجسف (جلالین)

کے ہاتھوں پہنچنے والے مظالم اور نیچے سے عذاب کے معنی ہیں کینے افراد کے ہاتھوں پہنچنے والی تکالیف^[۱] اس صورت میں یہ اور نیز اس کے بعد جو ہے یعنی مختلف گروہوں کو دست و گریبان کرنا جیسا فرقہ وارانہ فسادات میں ہوتا ہے^[۲] یہ براہ راست اللہ کی طرف سے نہیں ہوتا بلکہ وہ اشخاص بطور خود یہ امور انجام دیتے ہیں اور خداوند عالم اپنی قوت قاہرہ سے ان کے ارادوں میں سدراہ نہیں ہوتا اور نہ اپنی توفیق خاص سے وہ ایسا سامان کرتا ہے کہ وہ اس سے باز آجائیں بلکہ انہیں یہ سب باتیں کرنے دیتا ہے^[۳] جو کبھی اولیائے الہی کے لئے بطور امتحان ہوتا ہے اور کبھی یہ اس قوم کے لئے ایک عذاب کی صورت سے ہوتا ہے جس کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔

وَكَذَّبَ بِهِ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ۗ قُلْ لَسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ ﴿٦٦﴾ لِكُلِّ نَبِيٍّ

مُسْتَقَرٌّ ۚ وَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿٦٧﴾

’اور آپ کی قوم نے اس کو جھٹلایا حالانکہ وہ حق ہے۔ کہہ دیجئے کہ میں تمہارا ٹھیکے دار نہیں ہوں^[۴] ہر چیز کی ایک مقررہ میعاد ہے اور عنقریب تمہیں معلوم ہوگا۔‘

’میں تمہارا ٹھیکے دار نہیں ہوں‘..... اس کا مطلب یہ ہے کہ میرا کام تو بس تبلیغ کر دینا ہے۔ اب تم مانتے ہو یا نہیں مانتے ہو، اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔

’ہر چیز کی ایک مقررہ میعاد ہے‘ یعنی عذاب کی جو جرتم کو دی گئی ہے وہ ابھی پوری نہیں ہوئی تو یہ نہ سمجھو کہ بات ٹل گئی۔ نہیں جو کہا گیا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔ یہ اور بات ہے کہ ابھی اس کا وقت جو حکمت الہیہ کے تقاضا سے مقرر ہوا ہے، آیا نہیں۔^[۵]

وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ

غَيْرِهِ ۗ وَإِنَّمَا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَىٰ مَعَ الْقَوْمِ

الظَّالِمِينَ ﴿٦٨﴾

’اور جب دیکھو ان لوگوں کو جو ہماری آیتوں کے بارے میں نکتہ چینی میں مصروف ہیں تو ان سے بے توجہی اختیار کرو جب تک کہ وہ کسی اور بات چیت میں مصروف نہ ہو جائیں، اور اگر کبھی شیطان بھلاوے میں ڈال دے تو یا آنے کے بعد پھر ظالم جماعت کے ساتھ نہ بیٹھو۔‘

اس آیت میں مخاطب رسول ﷺ سے ماننا ضروری نہیں اکثر جگہ اس قسم کے واحد کے جو صیغے ہیں، ان میں مخاطب غیر معین مراد ہوتا

[۱] من فوقکم قال السلطان الجابر من تحت ارجلکم قال السفلة ومن لا خیر فیہ (علی بن ابراہیم)

[۲] ای یخلطکم فرقا مختلفی الالهؤ لاءوقیل عنی بہ یضر ب بعضکم ببعض وهو المر وی عن ابی عبد اللہ (مجمع البیان)

[۳] بان یکلمهم الی انفسهم ولا یلطف لهم (تبیان)

[۴] الوکیل علی الشئ هو القائم بحفظه والذی یدفع الضر عنه (مجمع البیان)

[۵] وقتہ الذی یعلمون فیہ صحۃ ما وعدہم بہ وحقیقۃ اما فی الدنیا واما فی الآخرة (تبیان)

ہے یعنی کوئی بھی ہو، اس کو یہی کرنا چاہیے۔

ایسی صحبتوں میں جہاں حقائق دینی کا مذاق اڑا یا جارہا ہو حتی الامکان شریک نہیں ہونا چاہا۔

آخری فقرہ کا مطلب ظاہر الفاظ سے وہی نکلتا ہے جس کے مطابق میں نے ترجمہ کیا ہے کہ ایک دفعہ بھولے سے ایسا ہو جائے ^[۱] تو پھر یاد آنے کے بعد دوبارہ ایسا نہ کرو اور اس مجمع میں شریک نہ ہو لیکن اس کا دوسرا مطلب یہ کہا گیا ہے کہ:

”اگر خطرہ ہو کہ باتوں میں مشغول ہو کر سرکنا بھول جائے تو سوائے نصیحت کے وقت ان میں بیٹھنا موقوف کرے۔“..... (موضح القرآن)

میں سمجھتا ہوں کہ یہ ”أَمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ“، اگر شیطان تمہیں بھلا دے، کا مطلب نہیں۔ اس کے لئے تو یہ لفظ چاہیے تھے کہ: ان خفت ان ينسبك الشيطان ”اگر تمہیں ڈر ہو کہ شیطان تمہیں بھلا دے گا۔“ مگر قرآن کے الفاظ یہ نہیں ہیں۔ جو لفظ قرآن مجید میں ہیں، ان کا مطلب وہی ہوتا ہے جو ہم نے درج کیا ہے۔

وَمَا عَلَى الَّذِينَ يَتَّقُونَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَلَكِنْ ذِكْرِي لَعَلَّهُمْ

يَتَّقُونَ ﴿٦٩﴾

’اور جو پرہیزگاری اختیار کرتے ہیں، ان پر ان کا حساب کتاب کچھ نہیں ہے مگر نصیحت کرنا ہے، شاید کہ وہ بھی پرہیزگاری اختیار کریں۔‘

مطلب یہ ہے کہ کفار اپنے اعمال کے خود جوابدہ ہیں۔ مسلمانوں پر ان کی ذمہ داری کچھ نہیں ہے ^[۲] ہاں نصیحت کرنا فرض ہے۔ عمل کریں یا نہ کریں یہ ان کا کام ہے۔

ایک روایت میں وارد ہوا ہے امام محمد باقر علیہ السلام سے کہ جب سابق آیت نازل ہوئی کہ مشرکین جب اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم یا مسلمانوں پر نکتہ چینی میں مصروف ہوں تو ان کے پاس نہ بیٹھو اور ان کی باتیں سننے سے پرہیز کرو تو مسلمانوں نے کہا کہ وہ تو ہر وقت ہی ایسی باتیں کرتے رہتے ہیں تو اب ہم مسجد الحرام جا کر کعبہ کا طواف ہی ترک کر دیں تو اس کے جواب میں یہ کہا جا رہا ہے کہ نہیں تم اپنے کام سے اپنی عبادت کے لئے وہاں گئے ہو تو وہ جو باتیں کرتے رہیں، اس کی ذمہ داری تم پر تھوڑی ہوگی مگر خاص طور پر ان باتوں سے دلچسپی نہ لو اور موقع ہو تو سمجھا دو کہ اس قسم کی باتیں اچھی نہیں ہیں۔ ^[۳]

وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا وَعَرَاهُمْ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَذَكْرِي بَرِيءٌ أَنْ

[۱] ای انساك الشيطان ذلك (تبیان)

[۲] نیست بر کسانیکہ پرہیزگاری کردند از حساب کافر ان چیز (شاه ولی اللہ)

[۳] قال ابو جعفر علیہ السلام لما نزلت: فلا تقعد بعد الذکری مع القوم الظالمین. قال المسلمون کیف نضع. فلاندخل المسجد الحرام لانطوف بالبيت الحرام فانزل الله: وما على الذين يتقون (تبیان)

تُبَسَّلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ ۗ وَإِنْ
تَعْدِلْ كُلُّ عَدَلٍ لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا ۗ أُولَئِكَ الَّذِينَ أُبْسِلُوا بِمَا كَسَبُوا ۗ لَهُمْ
شَرَابٌ مِنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ ۖ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿٤٦﴾

’اور چھوڑو انہیں کہ جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تفریح بنا لیا اور دھوکے فریب میں مبتلا کر رکھا انہیں دنیوی زندگی نے [۱] اور ان کو اس کے ذریعہ سے [۲] نصیحت کرتے رہتا کہ بے بسی کے ساتھ بتلائے ہلاکت نہ ہوا [۳] کوئی اپنے افعال سے درحالیہ نہ ہوگا اس کے لئے اللہ کو چھوڑ کر کوئی مالک اور نہ سفارشی اور اگر ہر طرح کا معاوضہ دینا چاہے تو بھی وہ اس سے نہیں لیا جائے گا۔ یہ ہے عالم ان لوگوں کا جو بے بسی کے ساتھ ہلاک ہوئے ان اعمال کی وجہ سے جو وہ کرتے تھے کہ ان کے لئے کھولتا ہوا گرم پانی پینے کو ہوگا اور دردناک عذاب اس وجہ سے کہ وہ کفر کرتے تھے۔“

’تا کہ بے بسی کے ساتھ بتلائے ہلاکت نہ ہو‘۔ یعنی رسول ﷺ کی طرف سے تبلیغ ہوتے رہنے کا مقصد یہ ہے کہ خلق خدا کی طرف سے پیش خدا یہ حجت پیش نہ ہو سکے کہ ہم بے بس تھے [۴] ہمیں تعلیمات الہیہ کا علم ہی نہ تھا ہم کو کسی نے ہدایت نہیں کی یعنی جاہل قاصر تھے جو معذور ہوا کرتا ہے۔ اس لئے رسول ﷺ کو ضروری ہے کہ وہ ہر ایک کو متنبہ کرتے رہیں تا کہ اب جو مخالفت کرے، وہ جان بوجھ کر یا اگر کوئی تساہل سے کام لے کر ان کی آواز کو سننے ہی نہ تو جاہل مقصر ہو جو معذور نہیں ہے جس کا بعد میں ذکر ہے کہ یہ بے بسی کے ساتھ ہلاک ہونے کے مستحق ہی ہیں اپنی بدکرداری اور کفر پر اصرار اور عناد کی وجہ سے۔

تو پہلی جگہ جو ’بے بسی‘ کا ذکر تھا، وہ مخالفت میں بے بسی تھی لاعلمی کی وجہ سے اور دوسری جگہ سزا اٹھانے میں بے بسی ہے، اس معنی سے جس کی تفصیل درج ہوئی ہے کہ نہ مددگار ہے، نہ سفارشی، نہ کوئی رشوت چل سکتی ہے اور نہ مال و دولت کام آسکتا ہے۔ یہ بے بسی وہ ہے جو اپنے اعمال کا خمیازہ ہے، اس لئے وہ انسان کو قابل رحم نہیں قرار دیتی۔

قُلْ أَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلَىٰ أَعْقَابِنَا بَعْدَ إِذْ
هَدَانَا اللَّهُ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيْطَانُ فِي الْأَرْضِ حَيْرَانَ ۗ لَهُ أَصْحَابٌ
يَدْعُونَهُ إِلَى الْهُدَىٰ انْتِنًا ۗ قُلْ إِنَّ هُدَىٰ اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ ۗ وَأَمْرًا لِنُنْسِلِمَ
لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٤٧﴾ وَأَنْ أَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَهُوَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٤٨﴾

[۱] یعنی بہ اغترو ابحیو تہم (مجمع البیان)

[۲] ای عظ بالقرآن و قیل بیوم الدین و قیل بالحساب (مجمع)

[۳] لکی لا تبسل... ای تدفع الی الهلکة علی وجه الغفلة و تسلم لعلہا غیر قادر علی التخلص (تبیان)

[۴] المجہل المستسلم الذی یعلم انه لا یقدر علی التخلص (مجمع البیان)

”کہیے کہ کیا ہم خدا کہہ کے پکاریں اللہ کے سوا ایسی چیزوں کو جو نہ ہمیں نفع پہنچا سکتی ہیں اور نہ ہمیں نقصان پہنچا سکتی ہیں اور اپنے پچھلے پیروں پلٹیں [۱] بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں صحیح راستے پر لگا دیا، اس آدمی کی طرح جسے بھوت پریت زمین میں حیران و سرگردان پھر انہیں درآخا لیکہ اس کے کچھ ساتھی ایسے ہوں جو اسے ٹھیک راستے کی طرف بلا رہے ہوں کہ ہماری طرف آؤ۔ کہہ دیجئے کہ اصل ہدایت اللہ کی ہدایت ہے اور ہم اس پر مامور ہیں کہ اللہ کے سامنے سر جھکائیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے اور یہ کہ [۲] نماز ادا کرتے رہو اور اس کی نافرمانی سے بچتے رہو اور وہی وہ ہے جس کی طرف تم سمٹ کر جاؤ گے۔“

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۗ وَيَوْمَ يَقُولُ كُنْ فَيَكُونُ ۗ قَوْلُهُ الْحَقُّ ۗ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ ۗ عِلْمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۗ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْحَبِيرُ ﴿۴۳﴾

”اور وہ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا بالکل صحیح [۳] اور جس دن وہ کہے گا ”ہو جا“ تو وہ سب (پھر) ہو جائے گا۔ اس کی بات درست ہے اور اس کا اقتدار ہو گا جس دن صور پھونکا جائے گا، وہ ان دیکھی اور دیکھی سب باتوں کا جاننے والا ہے اور وہ صحیح کام کرنے والا ہے بڑا باخبر۔“

اصطلاح قرآنی ایسی معلوم ہوتی ہے کہ جو باتیں نظام عادت کے مطابق تدریجی طور پر وقوع میں آتی ہیں انہیں ”خلق“ کہا جاتا ہے اور جو باتیں قدرت الہی کے مظاہرہ کے طور پر ایک دم ہوتی ہیں، انہیں ”کُنْ فَيَكُونُ“ کے تحت میں لایا جاتا ہے یعنی خالق نے کہا ”ہو جا“ وہ ہو گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیز بس اشارہ قدرت سے وقوع میں آتی ہے۔ اس میں تدریجی اسباب والا نظام کارفرما نہیں ہے۔ ابتداء میں آفرینش اشیاء کی عموماً نظام اسباب کے ساتھ ہوتی ہے اس لئے یہ کہا گیا کہ آسمانوں اور زمین کو خلق کیا اور قیامت میں سب کو زندہ کرنا دوبارہ، یہ نظام امر کے ماتحت ہوگا۔ یعنی صرف اشارہ قدرت سے۔ اس لئے اسے یوں کہا جا رہا ہے کہ وہ دن جب وہ کہے گا، ہو جا اور سب کچھ ہو جائے گا۔ [۴]

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ أَرَزَّ أَتَّخِذُ أَصْنَامًا آلِهَةً ۖ إِنِّي أَرَىٰ أَرْسَكَ وَقَوْمَكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۴۴﴾

”اور جب کہا ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہ کیا تم کچھ بتوں کو خدا بناتے ہو؟ میں تمہیں اور تمہاری قوم والوں کو

[۱]۔ اندرجع عن دیننا الذی ہو خیر الادیان (مجمع البیان)

[۲]۔ هذه الآية موصولة بالتي قبلها ای امرنا لنسلم لرب العلمین وقیل لنا اقیمو الصلوة (تبیان)

[۳]۔ خلقها حق و صوابا بالباطل و خطأ (مجمع البیان)

[۴]۔ یوم یقول للشیء کن فیکون هو یوم القیمة (جلالین)

کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھ رہا ہوں۔“

جناب ابراہیم علیہ السلام کے والد کون؟ آذریا تاریخ؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اصل باپ کا نام تاریخ تھا اور وہ مؤحد تھے مگر ان کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بچپن میں انتقال ہو گیا، اس لئے ان کے ایک خاندانی عزیز [۱] آذرنے ان کی پرورش کی تھی جس کو پرورش کی بنا پر وہ باپ کہہ کر پکارتے تھے۔

قرآن میں جتنی باتیں ’باپ‘ کہہ کر درج کی گئی ہیں، وہ سب اسی آذر سے متعلق ہیں، تاریخ سے نہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد تھے۔ اہل سنت جو کہ انبیاء و مرسلین کے آباؤ اجداد کے لئے مؤحد ہونا ضروری نہیں سمجھتے وہ بھی اس کا انکار نہیں کر سکتے کہ ابراہیم کے باپ تاریخ تھے مگر وہ خواہ مخواہ ان کی شخصیت کو آذر کے ساتھ منغم کر کے کہتے ہیں کہ انہی تاریخ کو آذر بھی کہا جاتا ہے [۲]

حالانکہ یہ خیال غلط ہے اور اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

فرقہ حقہ امامیہ کا اجماع اس پر ہے کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے آباؤ اجداد میں سے کوئی ایک فرد بھی کافر و مشرک نہیں تھا [۳] اسی لئے جناب ابراہیم علیہ السلام کے باپ کو جو حقیقتاً ان کے والد ہوں، ہم کافر و مشرک ماننے سے قاصر ہیں، جب کہ قرآن مجید میں باپ کہہ کے جو نام درج ہے، وہ بالا اجماع جناب ابراہیم علیہ السلام کے والد بزرگوار کا نام نہیں ہے۔

وَكَذَلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمٰوٰتِ وَالأَرْضِ وَلِيَكُوْنُ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۵﴾ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأٰ كَوْكَبًا ؕ قَالَ هَذَا رَبِّيْ ؕ فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَآ أُحِبُّ الأَفْلٰكِيْنَ ﴿۵۶﴾ فَلَمَّا رَأٰ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هَذَا رَبِّيْ ؕ فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَئِن لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَآ كُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّيْنَ ﴿۵۷﴾ فَلَمَّا رَأٰ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هَذَا رَبِّيْ هَذَا أَكْبَرُ ؕ فَلَمَّا أَفَلَتْ قَالَ يُقَوْمِ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۵۸﴾ إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالأَرْضِ حَنِيفًا وَّمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۵۹﴾

”اور اسی طرح ہم دکھا رہے تھے ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی قلم و سلطنت [۴] اور یہ اس لئے کہ وہ یقین رکھنے

[۱] . كان جدّه لاقمه او حمّه (تبیان)

[۲] . ادر هو لقبه واسمه تاریخ (جلالین)

[۳] . وقد ثبت ان اجماعها حجة لدخول المعصوم فيها (تبیان)

[۴] . ملك آسما ہا و زمین (شا ولی اللہ) عجائبات آسمانوں اور زمین کے (رفیع الدین)

والوں میں سے ہوں تو جب رات کی تاریکی ان پر چھائی، انہوں نے ایک تارا دیکھا کہا ”یہ میرا پروردگار ہے تو جب وہ ڈوب گیا، کہا میں ڈوبنے والوں کو دوست نہیں رکھتا پھر جب چاند کو چمکتے دیکھا کہا یہ میرا پروردگار ہے تو جب وہ ڈوب گیا، کہا اگر میرا پروردگار مجھے سیدھے راستے پر نہ رکھے تو میں گمراہ لوگوں میں ہو جاؤں پھر جب سورج کو چمکتے دیکھا کہا یہ میرا پروردگار ہے۔ یہ سب سے بڑا ہے تو جب وہ ڈوب گیا، کہا اے میری قوم! یقیناً میں بڑی ہوں اس سے جو تم شرک کرتے ہو۔ میں یقیناً اپنا رخ موڑے ہوئے ہوں، اس کی طرف جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا ہے، باقی سب طرف سے ہٹ کر اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔“

عام مفسرین نے اس سب کو ایک واقعہ کی صورت میں فرض کیا ہے کہ یوں ہوا اور یوں کہا اور یہ ہوا اور یہ کہا اور اس لئے اہل سنت کے یہاں یہ حدیث بھی آگئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام معاذ اللہ تین جھوٹ بولے، حالانکہ صورت حال پر غور کیجئے جو قرآن سے ظاہر ہے: رات ہوئی، ستارہ دیکھا کہا یہ میرا پروردگار ہے، یہ کن سے کہا جاسکتا ہے؟ ان سے جو ستارہ پرست ہوں۔

جب وہ غروب کر گیا۔ یہ غروب اسی وقت تھوڑی ہوتا ہے۔ کوئی ستارہ نصف شب کو غروب ہوتا ہے۔ کوئی صبح کو غروب ہوتا ہے تو وہ مجمع جس کے سامنے ہلڈار بی کہا تھا، کیا بیٹھا رہا جو اب غروب کے وقت ان سے کہا: لَا أُحِبُّ إِلَّا فِئْلِيْنَ میں ڈوبنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ پھر جب چاند نکلا، ظاہر ہے کہ اب یہ اس رات کی بات نہیں ہے۔ اب یہ چاند کے طلوع کی بات دوسری رات کی ہوگی۔ اب یہاں ماہتاب پرست سامنے ہیں، ان سے کہہ رہے ہیں کہ یہ میرا پروردگار ہے جب اس نے غروب کیا۔ وہ کیا اسی وقت غروب ہو گیا؟ ظاہر ہے کہ وہ آخر شب تک کسی وقت میں غروب ہوگا تو اب ان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ میرا پروردگار میری ہدایت نہ کرے تو میں گمراہوں میں سے ہوں۔

اب جب سورج نکلا۔ یہ صبح کو نکلے گا۔ اب مجمع اس وقت آفتاب پرستوں کا ہے تو کہا یہ میرا رب ہے یہ سب میں بڑا ہے۔ جب یہ ڈوبا تو اب فقط ان سے نہیں کہا کہ میں ایسے ڈوبنے والے کو دوست نہیں رکھتا بلکہ اب ستارہ پرستوں، ماہتاب پرستوں اور آفتاب پرستوں، سب ہی کو مخاطب کر کے ان سب کے معبودوں کی نفی کی کہ اے قوم! میں اس پروردگار کی طرف رخ کئے ہوں جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا توحید پر استدلال اجرام سماویہ کی الوہیت کی نفی اور الحق کا اثبات

تو اگر یہ کوئی ایک واقعہ ہو تو ماننا چاہیے کہ یہ ایک کوئی بڑی کانفرنس ہوئی جس میں ستارہ پرست بھی جمع ہوئے ہوں، ماہتاب پرست بھی جمع ہوئے ہوں اور آفتاب پرست بھی اور یہ کانفرنس اول شب سے شروع ہوئی اور تمام مجمع بندھا ہوا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے بیٹھا رہا، جس کے نتیجے میں وہ ستارہ کے غروب کے وقت وہ جملہ فرمائیں اور پھر بھی ابھی یہ کانفرنس اکٹھا رہی اس انتظار میں کہ اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کیا کہتے ہیں اور ایک دن گزر کر دوسری رات آگئی اور اب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ماہتاب پرستوں سے کہا طہار بی اور پھر سکوت چھا گیا اور کانفرنس اب اس کے انجام کو دیکھنے کے لئے بیٹھی رہی اور پھر اس کے غروب کے وقت انہوں نے اس کی رد کو مکمل کیا اور اب بھی کانفرنس صبح کے انتظار میں بیٹھی رہی یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سورج کو دیکھا اور پکار کر ذرا زور سے اس کی ربوبیت کا اعلان کیا لیکن کانفرنس اب بھی جمی رہی اور اب اس کے غروب کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سب کے مزعومات کی مشترکہ طور پر رد کر کے ان کے تمام مشرکانہ نظریات کے بطلان کا اعلان کرتے ہوئے توحید کامل کے ثبوت پر یہ کانفرنس برخواست کی۔

کیا ایسی کسی کانفرنس کا ہونا عقل میں آنے کی بات ہے؟ پھر آخر اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے عقل سے کام کیوں نہیں لیا جاتا تا کہ سمجھ میں آئے کہ یہ کسی خاص ایک موقع کی بات کا اظہار نہیں ہے بلکہ ایک انداز ہے اس کے بیان کا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کس کس طرح معبودانِ باطل کی مدتِ عمر نفی کرتے رہے اور کس کس طرح انہوں نے توحید حقیقی کو ثابت کیا اور اس ذیل میں جو اقوال درج ہوئے ہیں ان میں کا کوئی قول، ضروری نہیں ہے کہ انہی الفاظ میں زبان سے نکلا ہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ کبھی انہوں نے ستارہ پرستوں کے قول کو سامنے رکھ کر یوں رد کی اور کبھی مہتاب پرستوں کے قول کو ہدف نگاہ بنا کر اس طرح ابطال کیا اور پھر آفتاب پرستوں کا اس طرح جس کے نتیجے میں توحید حق منزل ثبوت کو پہنچ گئی۔

رہ گیا سچ اور جھوٹ کا سوال تو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کلام جو کسی بات کی خبر دینے کی غرض سے یعنی حکایت واقع کے قصد سے کیا گیا ہو، اس میں سچ اور جھوٹ کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ نہ کہ جو مخاطب کا قول رد کرنے کے لئے ہی بطور مفروضہ زبان پر جاری کیا گیا ہو، اس کو جھوٹ کہنا ہرگز درست نہیں ہے۔

وَحَاجَّةُ قَوْمِهِ ط قَالَ أَمْحَاجُوتِي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدِسِنِ ط وَلَا أَخَافُ مَا تُشِيرُ كُؤْنَ بِهِ

إِلَّا أَنْ يَشَاءَ رَبِّي شَيْئًا ط وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ط أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ﴿٥٨﴾

’اور ان سے بحث کی ان کی قوم والوں نے۔ انہوں نے کہا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں بحث کرتے ہو حالانکہ اس نے خود مجھے راستہ دکھایا ہے اور میں ان چیزوں سے جنہیں تم اس کا شریک کرتے ہو نہیں ڈرتا، سو اس کے کہ میرا پروردگار کوئی بات چاہے۔ میرا پروردگار ہر شے پر اپنے علم کے ساتھ حاوی ہے تو کیوں تم نصیحت قبول نہیں کرتے؟!‘ معلوم ہوتا ہے بحث میں ان لوگوں نے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ تم ہمارے بتوں کو برا کہتے ہو، دیکھنا تمہارے لئے کیا ہوتا ہے! ﴿٥٨﴾!

اس کا جواب یہ دیا ہے کہ تمہارے معبودانِ باطل سے میں نہیں ڈرتا کچھ ہونا ہے تو وہ میرے خدا ہی کے حکم سے ہوگا۔ معبودانِ باطل کچھ نہیں کر سکتے۔

وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُونَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُمْ بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزَّلْ بِهِ

عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا ط فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ ؕ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٥٩﴾ الَّذِينَ

أَمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُمْ مُهْتَدُونَ ﴿٥٩﴾

’اور میں بھلا ان سے جنہیں تم شریک کرتے ہو کس طرح ڈروں گا، جبکہ تم نہیں ڈرتے اس سے کہ تم نے اللہ کے

[٥٨] - خوفہ من ترک عبادۃ الہتہم (مجمع البیان)

ساتھ ایسی چیزوں کو شریک کیا ہے جن کے متعلق اس نے تمہارے پاس کوئی دلیل [۱] نہیں سمجھی ہے تو دونوں فریق میں سے کون مطمئن رہنے کا زیادہ حق دار ہے؟ (اسے سمجھو) اگر تم علم و شعور رکھتے ہو، وہ جو ایمان لائے اور اپنے ایمان کے ساتھ ظلم کی ملاوٹ نہیں کی۔ یہ وہ ہیں جن کے لئے امن ہے اور یہ صحیح راستے پر قائم ہیں۔“

”ایمان میں ظلم کی ملاوٹ نہیں کی۔“ اس کی تشریح اہل تفسیر نے یہ کی ہے کہ شرک اختیار نہیں کیا اس لئے کہ قرآن میں شرک کو کہا گیا ہے ظلم عظیم، ”بہت بڑا ظلم“ [۲] مگر جہاں تک میری نظر قرآن مجید کی اصطلاح پر ہے ”شرک“ کو داخل ایمان کسی درجہ پر بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس لئے الذین امنوا کے بعد ”و“ کے ساتھ جو اضافہ کیا گیا ہے اس سے مراد عملی برائیاں لینا چاہئیں جنہیں گناہ کہا جاتا ہے کیونکہ یہ اصطلاح بھی قرآن سے ثابت ہے کہ ہر گناہ داخل ظلم ہے۔ اگر وہ غیر ظلم نہیں ہے تو اپنے اوپر تو ظلم ہے ہی لہذا استحقاق امن کی منزل پر امنوا کے ساتھ (وَلَمَّا يَلْمِزُوا أِيْمَانَهُمْ بِيْظْلَمٍ) کی وہی حیثیت ہے جیسی دوسری جگہ بشارتوں کے موقع پر امنوا کے ساتھ (وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ) کا اضافہ جو تقریباً ہر جگہ قرآن میں موجود ہے۔

وَتِلْكَ مَجْئِنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَى قَوْمِهِ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مِّنْ نَّشَأِهِ إِنَّ رَبَّكَ

حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿۴۳﴾

”اور یہ ہماری دلیل تھی جو ہم نے ابراہیم کو ان کی قوم کے مقابلہ میں عطا کی تھی ہم جسے چاہتے ہیں درجوں میں بلندی عطا کرتے ہیں۔ یقیناً تمہارا پروردگار صحیح صحیح کام کرنے والا ہے، بڑا جاننے والا۔“

یہ اسی استدلال کی طرف اشارہ ہے جو پہلے ستارے اور چاند اور سورج کی الوہیت کی نفی کر کے توحید الہی کے ثبوت میں گزر چکا ہے [۳] اور اس کے لئے یہ ضرورت نہیں ہے کہ یہ کسی ایک دفعہ کے واقعہ میں بحث ہوئی ہو اور استدلال کیا گیا ہو بلکہ پوری عمر میں مختلف معبودان باطل کے مقابلہ میں ان کا طریقہ استدلال یہ تھا جسے خالق اپنی تعلیم خاص کا نتیجہ بتا رہا ہے۔ [۴]

دوسرا احتمال یہ ہے کہ گزشتہ تمام استدلال کے طریقوں کی طرف مجموعی طور پر اشارہ ہو جن میں سے ایک وہ ستاروں اور چاند وغیرہ کے حالات سے استدلال بھی ہے۔

اب خالق تو فرما رہا ہے کہ یہ ہماری طرف کی دلیل تھی جو ہم نے ابراہیم کو عطا کی اور اسے وہ ان کی خاص بلندی کا ثبوت قرار دے رہا ہے کہ جسے چاہتے ہیں ہم مرتبوں میں بلندیاں دیتے ہیں۔ اس کے بعد کوئی نام نہاد حدیث کہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام معاذ اللہ تین دفعہ جھوٹ بولے تو یہ حدیث دیوار پر پھینکنے کے قابل ہوئی یا نہیں؟

[۱]. سلطاناى حجة لان السلطان هو الحجة فى اكثر القران (تبیان)

[۲]. الظلم العذ كور فى الآية هو الشرك عند اكثر المفسرين (تبیان) نیا میختند ایمان خود را بشرك (شاکہ ولی اللہ)

[۳]. حججتنا التى احتج بها ابراهيم على وحدانية الله من افول الكواكب وما بعدة (جلالین)

[۴]. الحجج التى ذكرها ابراهيم لقومه اعطاها اياته معنى انه هدا لمر ما (تبیان)

وَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۖ كُلًّا هَدَيْنَا ۗ وَنُوحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمَنْ
 ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَى وَهَارُونَ ۖ وَكَذَلِكَ نَجْزِي
 الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٧﴾ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَى وَعِيسَى وَإِلْيَاسَ ۖ كُلًّا مِمَّن الصَّالِحِينَ ﴿٥٨﴾
 وَإِسْمَاعِيلَ وَالْيَسَعَ وَيُونُسَ وَلُوطًا ۖ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٥٩﴾ وَمَنْ
 آبَاهُمْ وَذُرِّيَّتِهِمْ وَإِخْوَانِهِمْ ۗ وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَى صِرَاطٍ
 مُسْتَقِيمٍ ﴿٦٠﴾ ذَلِكَ هُدَى اللَّهِ يَهْدِي بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۗ وَلَوْ أَشْرَكُوا
 لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٦١﴾

”اور ہم نے عطا کئے انہیں اسحاق اور یعقوب، ہر ایک کو ہم نے راستہ دکھایا اور نوح کو اس کے پہلے ہم نے راستہ
 دکھایا اور ان کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو اور اسی طرح ہم صلہ
 دیتے ہیں حسن عمل رکھنے والوں کو اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو، ہر ایک نیک افراد میں سے تھا اور اسماعیل
 اور یسع اور یونس اور لوط اور ہر ایک کو ہم نے تمام جہانوں سے زیادہ عطا کیا اور ان کے باپ داداؤں اور ان کی
 اولاد اور ان کے بھائیوں میں سے بھی اور انہیں ہم نے منتخب کیا اور سیدھے راستے پر لگایا۔ یہ اللہ کی خاص ہدایت
 ہے جس کے ذریعہ سے وہ جسے چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے نوازتا ہے اور اگر وہ شرک اختیار کرتے تو اکارت
 جاتے، وہ سب کارنامے جو انہوں نے انجام دیئے تھے۔“

اس آیت میں ذریت نوح علیہ السلام میں جناب عیسیٰ علیہ السلام کو درج کیا گیا ہے، یہ اس کا ثبوت ہے کہ نوا سے بھی ذریت میں داخل ہوتے ہیں
 اور اس لئے حضرات حسین علیہ السلام کو اولاد ذریت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کہنا عام اصول قرآنی کے مطابق بھی درست ہے۔ [۱]

أُولَئِكَ الَّذِينَ اتَّيْنَهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالنُّبُوَّةَ ۗ فَإِنْ يَكْفُرْ بِهَا هُوَ لَا فَتَقَدْ
 وَكَلَّمْنَا بِهَا قَوْمًا لَيَكْفُرُنَّ بِهَا بِكُفْرَيْنَ ﴿٦٢﴾ أُولَئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهِدُ بِهِمْ
 اقْتِدَاءً ۖ قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ﴿٦٣﴾
 ”یہ وہ ہیں جنہیں ہم نے کتاب حکمت [۲] اور نبوت عطا کی ہے۔ اب اگر یہ لوگ [۳] اس کے ساتھ کفر اختیار کرتے

[۱]۔ یغیب۔ ان الذریۃ تتناول اولاد البنات (جلالین) فی الآية دلالة علی ان الحسن والحسین من ولد رسول الله ﷺ (تبیان)

[۲]۔ الحکم معناه الحکم بین الناس وقیل الحکم (مجمع البیان)

[۳]۔ کافر شونذ بآیات قرآن این کافران (شاه ولی اللہ)

ہیں تو ہم نے اسے حوالہ کیا ہے ایسے لوگوں کے جو اس کے ساتھ کفر نہیں کریں گے [۱] یہ وہ ہیں جنہیں اللہ نے راستے پر لگا یا ہے تو ان ہی کی ہدایت کی پیروی کیجئے۔ کہہ دیجئے کہ میں اس پر [۲] کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ وہ نہیں ہے مگر نصیحت تمام جہانوں کے لئے۔“

”وہ نہیں ہے“ یعنی قرآن..... مگر زیادہ قریب باعتبار لفظ ”اجر“ ہے جب کہ دوسری آیت میں ایک اجر کا سوال ہوا بھی ہے: قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ (شوریٰ- ۲۳) تو یہ ہُو کی ضمیر بھی اجر ہی کی طرف کیوں عائد نہ ہو۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ وہ اجر جو میں نے طلب کیا ہے، وہ کوئی میرے فائدہ کی چیز نہیں ہے۔ وہ تو خلائق کی ہدایت کا ایک سامان ہے اور تمہاری ہی بہتری کے لئے ہے جیسا کہ تیسری آیت میں ہے: مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ (سبأء- ۴) ”میں نے جو تم سے اجر مانگا ہے، وہ تو تمہارے ہی نفع کے لئے ہے۔“

وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ إِذْ قَالُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَىٰ بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ۗ قُلْ مَن آتَزَلَ الْكِتَابَ الَّذِي جَاءَ بِهِ مُوسَىٰ نُورًا وَهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُونَهُ قَرَاطِيسٍ تُبْدُونَهَا وَتُخْفُونَ كَثِيرًا ۗ وَعَلَّمْتُمْ مَا لَمْ تَعْلَمُوا أَنْتُمْ وَلَا آبَاؤُكُمْ ۗ قُلْ اللَّهُ ۗ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِي خَوْضِهِمْ يَلْعَبُونَ ﴿۹۱﴾

”اور انہوں نے اللہ کو اس کی واقعی شان کے ساتھ نہیں سمجھا [۳] جب انہوں نے کہا کہ نہیں اتارا اللہ نے کسی انسان پر کچھ بھی۔ کہیے کہ کس نے اتاری تھی وہ کتاب جسے موسیٰ لے کر آئے تھے روشنی اور ہدایت کا ذریعہ بنا کر لوگوں کے لئے جسے تم متفرق کاغذوں کی شکل میں رکھتے ہو [۴] جنہیں لوگوں کے سامنے لاتے ہو اور بہت سادہ چھپا دیتے ہو اور تمہیں اب وہ علم دیا گیا جو تمہیں نہیں معلوم تھا [۵] اور نہ تمہارے باپ داداؤں کو۔ کہیے کہ اللہ نے (وہ کتاب اتاری تھی) پھر چھوڑ دیجئے انہیں کہ وہ اپنی نکتہ چینیوں میں کھیل کود مچائے رہیں۔“

یعنی خودی وہ اس کی سزا پائیں گے۔ [۶]

[۱] مقرر ساختیمیر ای ایمان بآدہا گروہمرا کہ ہرگز کافر نشوند (شاہ ولی اللہ)

[۲] علیہ ای علی القرآن (جلالین)

[۳] لہم یبلغوا من عظمة الله ان یصفوا بصفاته (علی بن ابراہیم) ای ماعرفوه حق معرفته وما وصفوه بما هو اهل ان یوصف به (تبیان)

[۴] ای یکتبونہ فی دفاتر مقطعة (جلالین) ورق ورق ظاہر کرتے ہو اس کو (شاہ فہج الدین)

[۵] علمتم ایہا الیہود فی القرآن (جلالین)

[۶] لیس علی اباحتہ ترک الدعاء والانداز بل علی ضرب من الوعیو والتہدید (تبیان)

وَهَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ مُصَدِّقٌ لِّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ يُؤْمِنُونَ بِهِ وَهُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ﴿٩٢﴾

”اور یہ وہ بابرکت کتاب ہے جسے ہم نے اتارا ہے تصدیق کرنے والی اس کی جو اس کے پہلے ہے اور اس لئے کہ آپ متنبہ کریں مکہ میں اور اس کے ارد گرد جتنے ہیں، سب کو۔ اور جو روز آخرت کو مانتے ہوں، وہ سب اسے مانتے ہیں اور وہ اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔“

چونکہ مکہ معظمہ تقریباً وسط معمورہ میں تھا، اس لئے اس کے ارد گرد کا احاطہ تمام دنیا کو حاوی ہے جس میں کسی ملک کی قید نہیں ہے۔^[۱]

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ قَالَ أُوحِيَ إِلَيَّ وَلَمْ يُوحَ إِلَيْهِ شَيْءٌ وَمَنْ قَالَ سَأُنزِلُ مِثْلَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ ط لَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُوا أَيْدِيهِمْ ۖ أَخْرِجُوا أَنْفُسَكُمُ ط أَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ آيَاتِهِ تَسْتَكْبِرُونَ ﴿٩٣﴾

”اور کون ظالم ہوگا زیادہ اس سے کہ جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگائے یا کہے کہ میری طرف وحی اتری ہے حالانکہ اس پر کچھ بھی وحی نہ اتری ہو اور جو کہے کہ ویسا ہی عنقریب میں اتار دوں گا جیسا اللہ نے اتارا ہے اور کاش دیکھو تم وہ موقع کہ جب ظالم لوگ مرگ کے سکرات میں ہوں گے اور فرشتے اپنے ہاتھ پھیلائے ہوں گے کہ نکالو اپنی روحوں کو آج تمہیں ذلت کا عذاب اس سزا میں ہے کہ تم اللہ کی نسبت غلط باتیں کہتے تھے اور تم اس کی آیتوں کے مقابلہ میں تکبر سے کام لیتے تھے۔“

آیت کس کے بارے میں وارد ہوئی ہے؟ اس سے اختلاف ہے۔ وہ قول جسے معصوم سے وارد شدہ روایت کی تائید حاصل ہے ایک یہ ہے کہ وہ مسلمہ کذاب کے بارے میں ہے جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور کچھ تک بندی کر کے اسے بخیاں خود قرآن کے جواب کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔^[۲]

اورد و سراقول جس کے بارے میں بھی حدیث وارد ہوئی ہے، یہ ہے کہ وہ عثمان خلیفہ ثالث کے دودھ شریک بھائی عبد اللہ ابن سعد بن ابی سرح کے بارے میں اتری ہے جو خوش نویسی کی بنا پر کتابت وحی کے لئے مامور کیا گیا تھا تو وہ تیزی کر کے جو آیت حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بولتے تھے، اس کا آخری جملہ وہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بولنے سے پہلے اپنے ذوق کے لحاظ سے لکھ دیتا تھا۔ کبھی ایسا ہوا کہ وہ ٹھیک نکلا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے

[۱]. ومن حولها اهل الارض كلهم عن ابن عباس (مجمع البيان)

[۲]. الاوّل هو المروى عن ابي جعفر (تبيين)

نہیں بدلا۔ بس اسے شیطان نے اس کی گمراہی کا ذریعہ بنا دیا اور وہ کہنے لگا کہ قرآن کی آیتوں کو میں اپنے ذوق کی بنا پر تیار کر سکتا ہوں۔ یہ آیت اس کے بارے میں آئی ہے۔^[۱]

وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ وَتَرَكْتُمْ مَا خَوَّلْنَاكُمْ وَرَاءَ
ظُهُورِكُمْ ۗ وَمَا نَرَىٰ مَعَكُمْ شُفَعَاءَ كُفَّ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ فِيكُمْ شُرَكَاءَ ۗ
لَقَدْ تَقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَا كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿۹۴﴾

”اور تم ہمارے پاس تنہا آئے ہو^[۱] جیسے کہ ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا اور جو کچھ ہم نے تمہیں دیا تھا^[۲] وہ سب تم اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو نہیں دیکھتے جن کے متعلق تم نے خیال کیا تھا کہ وہ تمہارے بارے میں (ہمارے ساتھ) شریک^[۳] تمہارے باہمی تعلقات قطع ہو گئے^[۴] اور جو کچھ تمہارا زعم باطل تھا، غائب ہو چکا ہے۔“

إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَىٰ ۗ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ
الْحَيِّ ۗ ذَٰلِكُمْ اللَّهُ فَأَلَّيْتُ تُوَفِّكُونَ ﴿۹۵﴾

”یقیناً اللہ شگافتہ کرنے والا ہے دانوں اور گھلیوں کا۔ وہ نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالنے والا ہے مردہ کا زندہ سے۔ یہ ہے اللہ تو کدھر بھٹکتے پھرتے ہو^[۵]۔“

دانے اور گھلی کے شگافتہ کرنے کا یہ مطلب ہے کہ اس کے اندر جو درخت پنہاں ہے، خواہ کھیتی کی قسم سے یا باغ سے، وہ اس میں سے اپنی قدرت سے برآمد کرتا ہے۔^[۶]

فَالِقُ الْإِصْبَاحِ ۗ وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا ۗ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ حُسْبَانًا ۗ ذَٰلِكَ

[۱]. عن ابی بصیر عن ابی عبد اللہ (علی بن ابراہیم)

[۲]. وحدانا لا مال لکم ولا ائاث ولا رقیق ولا شیء مما کان اللہ خولکم (تبیان)

[۳]. ما ملکنا کم فی الدنیا (مجمع البیان)

[۴]. معناه زعمتم انہم شرکاء ونا فیکم (مجمع البیان)

[۵]. تقطع بینکم یعنی المودعة (علی بن ابراہیم)

[۶]. فکیف تطرفون عن الایمان بعد قیام البرہان (جلالین)

[۷]. فالق الحب یعنی شگفتہ من کل ما ینبت من النناات فاخرج منه النور علی اختلافها والنوی من کل ما یغرس جماله نواة فاخرج منه الشجر (تبیان)

تَقْدِيرِ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿٩٦﴾ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي

ظُلُمَاتِ اللَّيْلِ وَالْبَحْرِ ۖ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿٩٧﴾

’وہ سفیدہ سحری کا نمایاں کرنے والا ہے اور اس نے رات کو آرام کا وقت اور سورج اور چاند کو حساب کا ذریعہ بنا دیا ہے [۱] یز بردست واقف کار کا مقرر کردہ نظام ہے اور اس نے تمہارے لئے ستاروں کو قرار دیا ہے تاکہ تم ان سے راستہ حاصل کرو خشکی اور تری کی تاریکیوں میں۔ ہم نے کھول کھول کر باتیں بیان کر دی ہیں ان کے لئے جو جاننے والے ہوں۔‘

قمری حساب کا اعتبار

سورج کے طلوع و غروب سے دن اور رات کی تشکیل ہوتی ہے جن سے ہفتے بنتے ہیں، ہفتوں سے مہینے اور مہینوں سے سال اور چاند کے بصورت ہلال طالع ہونے اور پھر آخر میں غائب ہو کر دوبارہ نکلنے سے مہینوں کی تشکیل ہوتی ہے جن کے اجتماع سے سال بنتے ہیں لہذا دونوں ہی کو حساب میں داخل قرار دیا ہے اور اگر مہینوں اور تاریخوں میں بھی شمسی حساب معتبر ہوتا تو چاند کا حساب کے مقصد میں کوئی دخل ہی نہ ہوتا۔ قرآن کا محل حساب میں قمر کو اہمیت دینا اس کی دلیل ہے کہ اسلام میں قمری تاریخیں معتبر ہیں اور سوا استثنائی صورتوں کے شمسی تاریخوں کا اعتبار نہیں ہے۔

ستاروں کی رہنمائی کے فائدہ کو بیان کرنے میں جاننے والوں کی قید اس لئے ہے کہ ستاروں کی رہنمائی سے عوام فائدہ نہیں اٹھا سکتے بلکہ وہی لوگ جو ستاروں کی علامتوں کا علم رکھتے ہوں۔ [۲]

وَ هُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَمُسْتَوْدَعٌ ۖ قَدْ فَصَّلْنَا

الآيَاتِ لِقَوْمٍ يُفْقَهُونَ ﴿٩٨﴾ وَ هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً ۖ فَأَخْرَجْنَا بِهِ

نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَأَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُخْرَجُ مِنْهُ حَبًّا مُتَرَاكِبًا ۖ وَمِنَ النَّخْلِ

مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَجَنَّاتٍ مِنْ أَعْنَابٍ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا

وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۖ نُنظِرُ وَإِلَى ثَمَرَةٍ إِذَا أَثْمَرَ وَيَنْعِهِ ۖ إِنَّ فِي ذَلِكَ لآيَاتٍ لِقَوْمٍ

يُؤْمِنُونَ ﴿٩٩﴾

[۱] اشارہ سبحانہ بذلک الی مافی حسابہا من مصالح العباد فی معاملاتہم و تواریخہم و اوقات عباداتہم (مجمع البیان)

[۲] انما اضاف الی الذین یعلمون وان کانت آیات لغیرہم لانہم المنتضحون بہا (تبیان)

”اور وہ وہ ہے جس نے تم سب کو ایک تنفس سے [۱] پیدا کیا ہے پھر ایک ٹھہرنے کی جگہ اور سوچنے کے مقام پر رکھا۔ ہم نے تفصیل کے ساتھ باتیں بیان کی ہیں ان کے لئے جو سمجھنا چاہیں، اور وہ وہ ہے جس نے آسمان کی طرف سے پانی اتارا تو اس سے ہم نے نکالے ہر طرح کے نباتات تو اس سے باہر نکالی ہری ہری کھیتی [۲] جس سے ہم نکالتے ہیں تمہ بہ تمہ [۳] دانے اور کھجور کے درختوں سے جن کی شاخوں میں سے کچھ گچھے زمین کی طرف جھکے ہوتے ہیں اور باغ انگور اور زیتون اور انار کے جو ملتے جلتے ہوئے بھی ہیں اور نہیں بھی ملتے جلتے۔ دیکھو ان کے پھلوں کو جب وہ میوہ دار ہوں اور ان کی رسیدگی کو۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لانا چاہیں۔“

”ٹھہرنے کی جگہ اور سوچنے کے مقام“ کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں جنہیں علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں درج کیا ہے مگر ان میں سے کوئی بھی معصوم کی طرف استناد نہیں رکھتا۔ ان میں سے جو ذہن میں آنے والا قریبی مفہوم ہے وہ ہے کہ مُسْتَقَرٌّ سے مراد صلب پدر اور مُسْتَوْدَعٌ سے شکم مادر مراد ہے یا اس کے برعکس۔ [۴]

وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوا لَهُ بَنِينَ وَبَنَاتٍ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ سُبْحٰنَهُ
وَتَعَلٰی عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۶﴾ ۗ اَتَىٰ يَكُوْنُ لَهُ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ
لَهُ صَاحِبَةً ۗ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۗ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾

”اور انہوں نے نظروں سے پوشیدہ مخلوق کو اللہ کا شریک بنایا ہے حالانکہ اس نے انہیں پیدا کیا ہے اور انہوں نے اس کے لئے جہالت سے لڑکے اور لڑکیاں تصنیف کی ہیں۔ پاک ہے وہ اور بلند ہے اس سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ موجد ہے آسمانوں کا اور زمین کا۔ اس کے لئے اولاد کہاں سے ہوگی۔ حالانکہ اس کی کوئی بیوی تو ہے ہی نہیں اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔“

یہاں بہت سے مذاہب باطلہ کے مزومات کو سمیٹ کر ایک ساتھ انہیں یاد دلایا ہے کہ انہوں نے اس کے لئے لڑکے اور لڑکیاں تصنیف کی ہیں، جیسے یہود و نصاریٰ نے عزیر اور مسیح کو اس کا بیٹا قرار دیا اور مشرکین نے فرشتوں کو بیٹیاں قرار دیا۔

اب چونکہ جنات جس قوم کا نام ہے، ان کے متعلق کسی ایسی جماعت کا پتہ نہیں چلتا جس نے ان کا اللہ سے رشتہ قرار دیا ہو جیسا کہ دوسری جگہ قرآن میں ہے: وَجَعَلُوا اٰبِنٰهٖ وَبَنِيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (صافات، ۱۵۸)، یا انہیں شریک خدا قرار دیا ہو جیسا کہ یہاں کہا جا رہا ہے، اس لئے مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں جن سے لغوی معنی ”آنکھ سے پوشیدہ“ ہونے کی بنا پر فرشتے مراد ہیں [۵] اور اس لئے ہم نے اس کا ترجمہ ”نظروں سے

[۱] ای من آدم (مجمع البیان)

[۲] رطباً من الزرع (تبیان)

[۳] یکی بر دیگوری پیوستہ (شاه ولی اللہ) ایک پر ایک چڑھا ہوا (شاه فہج الدین)

[۴] فمستقر منکم فی الرحمہ مستودع منکم فی الصلب (جلالین)

[۵] وصفہم بالجن لخبائہم عن الابصار (تبیان)

پوشیدہ مخلوق“ کے ساتھ کیا ہے مگر ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ کائنات کے بارے میں اسی طرح کا عقیدہ ہو جو غالباً ہمارے یہاں کی حدیث میں موجود ہے۔^[۱]

اس کے بعد چونکہ ان مذاہب باطلہ میں سے جن کی رد مقصود ہے، کسی نے اللہ کے لئے بیوی کا ہونا تجویز نہیں کیا ہے، اس لئے بیوی کے نہ ہونے کو اولاد نہ ہونے کی دلیل میں پیش کیا گیا ہے۔

ذَلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ ۚ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۚ فَاعْبُدُوهُ ۚ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ﴿۱۳۱﴾ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ ۚ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ﴿۱۳۲﴾

”یہ ہے اللہ تمہارا پروردگار، کوئی خدا نہیں سوا اس کے، وہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے تو اسی کی عبادت کرو اور وہ ہر چیز پر کارساز ہے۔ اسے نگاہیں پا نہیں سکتیں اور وہ سب نگاہوں پر حاوی ہے اور وہ جسم و جسمانیات سے بری ہے، بڑا خبر رکھنے والا۔“

نفی رویت

یہ آیت صاف نفی رویت کی دلیل ہے۔ خالق کی شانِ جلال و کمال بیان ہو رہی ہے کہ نگاہیں اسے پا نہیں سکتیں۔ اس میں دنیا اور آخرت کی کوئی قید نہیں ہے مگر کیا جائے تقلید آباء کو کہ شاہ ولی اللہ صاحب حاشیہ یا تفسیر میں نہیں بلکہ اصل ترجمہ میں یہ لفظ بڑھا دیتے ہیں کہ: ”در نمی یابند اور اچشمہا یعنی در دنیا“

آخر جلال و کمال رب میں دنیا کی خصوصیت کیا ہے؟ کیا قیامت میں وہ خدا خدا نہیں رہے گا جو اس کا کمال ختم ہو جائے گا اور جلال ذات میں فرق آجائے گا۔

ان کے ایک صاحبزادہ بلند اقبال جناب شاہ رفیع الدین صاحب نے ترجمہ میں خیر تصرف نہیں کیا۔ یہ لکھ دیا کہ: ”نہیں پاتیں اس کو نظریں“، مگر دوسرے صاحبزادہ عالی شان شاہ عبدالقادر نے حاشیہ میں تحریر فرمادیا۔

”یعنی آنکھ میں قوت نہیں کہ اس کو دیکھ لے مگر جو وہ آپ کو دکھا دے اس واسطے کہ وہ لطیف ہے۔“ (موضح القرآن)

مگر ذرا بیان قرآن کا انداز دیکھئے۔ وہاں انسان کے نقص کا ذکر نہیں ہو رہا ہے کہ ”یہ ہوتم جو اتنے ناقص ہو کر اپنے زیر قدم نہیں دیکھ سکتے اور تمہاری نگاہیں خدا کو نہیں پاسکتیں“، اگر یہ انداز ہوتا یعنی موضوع کلام انسان کا نقص ہوتا تو آپ یہ معنی فرماتے کہ آنکھ میں یہ قوت نہیں کہ اس کو دیکھ لے مگر وہاں تو یوں ارشاد ہو رہا ہے کہ ”یہ ہے تمہارا پروردگار جو واحد حقیقی ہے۔ جو ہر شے کا خالق ہے۔ اس کی شان یہ ہے کہ نگاہیں اس کو نہیں پاسکتیں“، تو یہ ہماری نگاہوں کا ذکر نہیں بلکہ خالق کے کمال و رفعت کا تذکرہ ہے۔ اس لئے اس کے کمال و رفعت میں دنیا اور آخرت کی تریق غلط ہے۔

[۱]. قال وکانوا یعبدون الجن (علی بن ابراہیم)

اور اب اس استثناء کی بھی گنجائش نہیں کہ ”مگر جو وہ آپ کو دکھادے“..... یہ ”مگر“ اول تو قرآن میں کہاں ہے جو ”لطیف“ کے لفظ کا تعلق اس سے قرار دیا جائے پھر کیا جو اس کی شان بیان ہوئی ہے کہ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ”کوئی اس کے سوا خدا نہیں“ اس میں یہ گنجائش ہے کہ ”مگر جو وہ کسی کو اپنے ساتھ خدا بنا دے کیونکہ وہ لطیف ہے۔“ ظاہر ہے کہ اس میں اس استثناء کی گنجائش نہیں تو پھر اس لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ میں شان الہی کا ایک پہلو ہے، اس ”مگر“ کی گنجائش اور لطیف کے اس سے تعلق کی معقولیت کیا ہے!

ان لوگوں نے اس معنی کے قرار دینے کے لئے ہی ”لطیف“ کے معنی ”مہربان“ کے قرار دیئے ہیں [۱] حالانکہ لطیف کے اس معنی کا کلام سابق کے کسی جز سے ربط نہیں قائم ہوتا بلکہ اس لطیف کے معنی ہیں ”مادہ کی کثافتوں سے بری“ اور یہ کہ لا تدركه الابصار کی ایک طرح سے دلیل ہے یعنی نگاہیں اس کو اس لئے نہیں پاسکتیں کہ وہ جسمائیت سے بری ہیں اور دوسرا جز الخبیر دوسرے فقرہ یدرک الابصار کی دلیل ہے کہ وہ نگاہوں پر حاوی ہے اس لئے کہ وہ باخبر ہے۔ لطف یہ ہے کہ شاہ رفیع الدین صاحب نے ترجمہ میں ”لطیف“ کے معنی مہربان کے نہیں لئے ہیں بلکہ هُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ کا ترجمہ کیا ہے ”وہ ہے باریک، دیکھنے والا۔“

یہ ”باریک“ کا لفظ انتہائی کوتاہی تعبیر کے ساتھ وہی مادیت و جسمائیت سے بری ہونے کے مفہوم کا حامل ہو سکتا ہے۔ اس کا مہربانی سے یقیناً کوئی تعلق نہیں مگر دوسرے بھائی صاحب بلا وجہ یہ کہنے لگے کہ ”مگر وہ آپ کو دکھادے اس واسطے کہ لطیف ہے“ یہ ہوتے ہیں سخن پروری یا روایت پرستی کے کرشمے۔

قَدْ جَاءَكُمْ بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۗ وَمَا
 أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ ﴿١٠٤﴾ وَكَذَلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِيَتَّقَوْا ۖ وَلِيُبَيِّنَ
 لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿١٠٥﴾

”آئی ہیں تمہارے پاس بصیرتیں [۲] تمہارے پروردگار کی جانب سے تو جو نظر کرے گا، وہ اپنا فائدہ کرے گا اور جو اندھا بنا رہے گا، وہ اپنا نقصان کرے گا اور میں تمہارا پہریدار نہیں ہوں۔ اور اسی طرح ہم طرح طرح سے حقیقتیں بیان کرتے ہیں [۳] اور اس لئے کہ وہ کہیں کہ آپ نے خوب پڑھا ہے اور تاکہ اسے صاف صاف ہم بیان کر دیں ان لوگوں کے لئے جو جاننا چاہیں۔“

”لِيَتَّقَوْا ۖ وَلِيُبَيِّنَ“ کا ترجمہ جو ہم نے کیا ہے کہ ”وہ کہیں کہ آپ نے خوب پڑھا ہے“ یعنی ان کا ضمیر اس کی گواہی دے دے یا کبھی زبان سے بھی اس کا اقرار کر لیں، یہی سیاق و سباق دونوں کا تقاضا ہے کیونکہ تمام حجت ہونے کا ذکر ہو رہا ہے مگر دوسرے مفسرین نے اس بیچ کے ٹکڑے کو سابق اور لاحق سے علیحدہ کر کے اس لام کو بیلام قرار دیا ہے جیسے جناب مولیٰ علیہ کے ذکر میں ہے:

[۱]. اوست مہربان. آگاہ (شاہ ولی اللہ)

[۲]. بینات و دلالات (مجمع البیان)

[۳]. لیتقوا ای الکفار فی عاقبة الامر درست ذکر اهل الكتاب (جلالین)

’فَالْتَقَطَهُ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا‘ (قصص- ۸) فرعون والوں نے انہیں دریا سے نکال لیا تاکہ وہ ان کے لئے دشمن جان ثابت ہوں، یعنی نتیجہ اس کا ان کے لئے یہ ہوا، نہ یہ کہ ان کا مقصد یہ تھا۔ اسی طرح یہاں یہ معنی ہیں کہ ہم نے ہی قرآن اتارا اور بصیرتیں ان کے سامنے پیش کیں، تاکہ وہ یہ کہیں کہ آپ نے یہ سبق یہودیوں سے حاصل کئے ہیں اور ان سے یہ علوم آپ کو ملے ہیں یعنی ایمان پھر بھی اس پر نہ لائیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔^[۱]

میرے نزدیک یہ مفہوم قرآن کے قبل اور بعد کے نفروں کی بنا پر جن میں اسی طرح لام موجود ہے اور وہ لام غایت و مقصد ہی کے لئے ہے، ناقابل قبول ہے۔

بعض مترجمین نے اس لام کو غرض و غایت ہی کا قرار دیتے ہوئے ایک عجیب طرح کے حذف و اضمار کا تصور کر کے ترجمہ کیا ہے کہ یہ اس لئے ہے کہ ایسا نہ ہو وہ یہ کہیں کہ آپ نے اس کو پڑھا ہے۔^[۲] ظاہر ہے کہ یہ ’ایسا نہ ہو‘ بالکل ایجاد بندہ ہے جس کا قرآن میں کوئی نشان نہیں ہے۔

اتَّبِعْ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۚ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۳۱﴾
 شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكُوا ۗ وَمَا جَعَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۗ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ

بِوَكِيلٍ ﴿۱۳۲﴾

’پیروی کیجئے اس کی جو آپ کی طرف وحی اتری ہے آپ کے پروردگار کی طرف سے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں اور مشرکین سے بے اعتنائی اختیار کیجئے اور اگر اللہ چاہتا تو وہ شرک نہ کرتے اور آپ کو ہم نے ان پر پہریدار مقرر نہیں کیا ہے اور نہ آپ ان کے ٹھیکے دار ہیں۔‘

یہ وہی تسلی کی قسم کی آیت ہے یعنی مشرکین کے افعال کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔ آپ اپنا فرض انجام دیتے رہیے۔ پھر اس سے مطلب نہ رکھئے کہ وہ مانتے ہیں یا نہیں۔ خدا کو جبر سے کام لینا تو ہے نہیں، ورنہ ایک بھی مشرک نہ ہوتا^[۳] پھر اگر وہ شرک اختیار کرتے ہیں تو آپ کیا کریں گے؟ آپ ان کے پہریدار نہیں ہیں کہ زبردستی انہیں شرک سے روکنا آپ کے لئے ضروری ہو اور نہ آپ ان کے ٹھیکے دار ہیں کہ ان کے افعال کی ذمہ داری آپ پر عائد ہو۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ
 كَذَلِكَ زَيْنًا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلُهُمْ ۗ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ مَرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا

[۱]۔ هذه اللام تستعملها اهل اللغة لام الصيرورة (مجمع البيان)

[۲]۔ برای احتراز آنکه گویند که خوانده (شاه ولی الله)

[۳]۔ لو شاء الله ان يكونوا على غير الشرك فسر اما اشركوا (تبيين)

يَعْمَلُونَ ﴿١٠٨﴾

”اور جن کی یہ اللہ کے سوا ہائی دیتے ہیں، انہیں گالیاں نہ دو کہ وہ جہالت کی بنا پر تجاوز کر کے اللہ کو گالیاں دیں۔ یوں ہی ہم نے ہر قوم کے کردار کو سنوارا ہے۔ پھر ان کے پروردگار کی طرف ان کا رجوع ہوگا تو وہ انہیں جو کچھ کرتے تھے، اس کے متعلق بتائے گا۔“

رواداری کی تعلیم اور معبودان باطل کے سب و شتم سے ممانعت

خالق کریم نے معبودان باطل کی نسبت جس حکیمانہ رویہ کی دعوت دی ہے یہ بات تمام پیشوایان باطل کے لئے ہے۔ وہ لاکھ برا کہنے کے قابل ہوں مگر اعلانیہ انہیں برا کہو گے تو وہ جسارت و گستاخی کر کے تمہارے پیشوایان حق کے خلاف بدگوئی سے کام لیں گے اور اس ”ناصیبت“ و ”خارجیت“ کے مظاہرہ کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔

بے شک دلائل کے ذریعہ سے کسی کی کمزوریوں کا سنجیدہ اور مہذب انداز میں ظاہر کرنا اور چیز ہے اور برا کہنا یا گالیاں دینا دوسری چیز ہے۔ اس میں کسی حق کا اثبات نہیں ہوتا، صرف فریق مخالف کا دل دکھ جاتا ہے۔ اس لئے کد میں وہ بھی ہمارے معبود یا پیشوا کے خلاف سب و شتم پر اتر آتا ہے لیکن پہلی صورت میں یہ خطرہ یوں نہیں ہے کہ ہم تو استدلال کے ذریعہ سے ان کا ابطال کر رہے ہیں لیکن مخالف حق کے پاس اس طرح کے دلائل ہو ہی نہیں سکتے، اس لئے مجبوراً اگر وہ قبول نہ بھی کرے تو اسے خاموشی کے سوا چارہ کار نہ ہوگا۔

”یونہی ہم نے ہر قوم کے کردار کو سنوارا ہے“..... یعنی ہم ہمیشہ صحیح سیرت و کردار ہی کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ لوگ اس کی پیروی نہ کریں۔^[۱]

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ہر قوم جو کچھ وہ کر رہی ہے اس میں لگن ہے اور وہ اسی کو اچھا سمجھ رہے ہیں اور اب ہم نے بھی انہیں ایسا ہی چھوڑ رکھا ہے کہ ان کے اعمال ان کی نظر میں درست نظر آتے ہیں۔

یہ اللہ کا یوں چھوڑ دینا، ان کے سوء اختیار کا نتیجہ ہے۔ نہ کہ ان کی بد اعمالی کا سبب ہے، اس لئے ان سے اس کا محاسبہ ہوگا جس کا آخر آیت میں ذکر ہے۔^[۲]

وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِن جَاءَتْهُمْ آيَةٌ لِّيُؤْمِنُوا بِهَا ۗ قُلْ إِنَّمَا الْآيَةُ عِنْدَ اللَّهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۚ إِنَّهَا إِذَا جَاءَتْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٠٩﴾ وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَنَنْزِرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿١١٠﴾

[۱]. المراد به في الآية تزئین اعمال الطاعة (مجمع البيان)

[۲]. زینا لكل امة عملهم یعنی بعد اختیار ہم و دخولهم فيه والدلیل علی ان ذلك نفع لهم للتقدم قوله: ثم الی ربهم مرجعهم فینبئهم بما كانوا یعملون (علی بن ابراہیم)

”اور انہوں نے تمام ممکن صورتوں کے ساتھ اللہ کی قسم کھائی کہ اگر کوئی معجزہ ان کے پاس آئے گا تو وہ ضرور اس پر ایمان لائیں گے، کہیے کہ معجزے تو بس اللہ کے قبضہ میں ہیں اور تم لوگوں کو کیا خبر ہے کہ وہ جب آئے گا تو وہ ایمان نہیں لائیں گے اور ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو تہہ وبالا کر دیں گے جیسا کہ انہوں نے پہلی بار اس پر ایمان اختیار نہیں کیا اور انہیں چھوڑ دیں گے ان کی سرکشی میں کہ وہ اندھے بنے پھرتے رہیں گے۔“

اس فقرہ سے کہ ”جیسا کہ انہوں نے پہلی بار ایمان اختیار نہیں کیا“^[۱] ظاہر ہے کہ معجزات جو تمام حجت کے لئے کافی ہوں، آپکے تھے۔ اس کے بعد ان کا یہ کہنا کہ کوئی معجزہ آئے تو ہم ایمان لائیں گے، دھاندلی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس لئے کہا گیا کہ ”معجزے بس خدا کے پاس ہیں“ یعنی ایسے معجزے جنہیں تم مان لو، میرے بس میں قطعاً نہیں ہیں۔

وَلَوْ أَنَّا نَزَّلْنَا إِلَيْهِمُ الْمَلِئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتَى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ

قَبْلًا مَّا كَانُوا لِلْيَوْمِ مُنْوًا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ وَلَكِنْ أَكْثَرُهُمْ يَجْهَلُونَ ﴿۱۱﴾

”اور اگر ہم ان کی طرف فرشتے اتارتے اور ان سے مُردے باتیں کرتے اور ان کے سامنے تمام چیزوں کو گروہ در گروہ روزِ محشر کی صورت سے لا کر کھڑا کر دیتے^[۲] تب بھی وہ ایمان لانے والے نہ تھے، سوا اس کے کہ اللہ طے کر لیتا لیکن ان میں زیادہ تر جہالت سے کام لیتے ہیں۔“

”اللہ طے کر لیتا“، یعنی جبری طور پر^[۳] اسے منظور ہوتا کہ وہ اپنی قوتِ قاہرہ سے انہیں ایمان کے راستے پر لگا دے جو اس کی حکمتِ کامل اور انسان کے امتیازی جوہر یعنی اس کے فاعلِ مختار ہونے کے خلاف ہے۔ اس صورت میں تو خدا کی قدرت کے مقابلہ میں انسان کی قوت ختم ہی ہو جاتی اس لئے یہ سب ایمان لے آتے جو ایمانِ اضطراری ہوتا، ورنہ جہاں تک ان کا اختیار ہے، یہ اتنے معجزات..... جتنے بھی کسی کے تصور میں آسکیں مثلاً فرشتے براہِ راست ان کے پاس اترتے۔

مُردے ان سے باتیں کرتے۔ تمام عالم کی اشیاءِ محسوس ہو کر ان کے سامنے اکٹھا ہو جاتیں، یہ سب ہو جاتا، پھر بھی یہ ایمان نہ لاتے۔ اس لئے کہ سوتا ہوا ہو تو کسی آواز پر جاگ جائے گا اور جو جاگ رہا ہو مگر اٹھنا نہ چاہتا ہو اسے کون سی آواز ہوگی جو بیدار کرے؟!

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيْطِينِ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَى

بَعْضٍ زُخْرَفَ الْقَوْلِ غُرُورًا ۗ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا

يَفْتَرُونَ ﴿۱۲﴾ وَلِتَصْغَىٰ إِلَيْهِ أَفْئِدَةُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ

[۱]۔ کمالیہ منو ایما انزل من الایات اول مرۃ عن ابن عباس و مجاہد (مجمع البیان)

[۲]۔ قبلا بضم تین جمع قبیل ای فر جافو جا (جلالین)

[۳]۔ ای یجبرهم علی الایمان (علی بن ابراہیم)

وَلِيَقْتَرِفُوا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُونَ ﴿١١٣﴾

”اور اسی طرح ہم نے قرار دیا ہر نبی کے لئے دشمن آدمی اور جنات میں کے شیطانوں کو جن میں سے ایک دوسرے کی طرف بناوٹی باتوں کا فریب دہی کے لئے القا کرتا رہتا ہے اور اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے لہذا چھوڑیے انہیں اور اسے جو افترا پردازی کرتے رہتے ہیں اور اس لئے کہ مائل ہوں اس کی طرف دل ان کے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اس لئے کہ وہ اسے پسند کریں جس کا یہ ارتکاب کرتے ہیں۔“

”دشمن قرار دیئے“ یعنی نبی نے حکم خدا سے اعلان نبوت کیا اور پیغام حق پہنچایا تو یہ لوگ اپنی ”کفر دوستی“ اور ”باطل پرستی“ کی وجہ سے ان کے دشمن ہو گئے۔

یہ دشمنی ان کے سوء اختیار کا نتیجہ ہے لیکن چونکہ اس کے ظہور میں آنے کے اسباب خدا کی طرف سے پیدا ہوئے۔ نہ وہ نبی بناتا، نہ ان سے اعلان حق کرتا، نہ یہ لوگ ان کے دشمن ہوتے، اس لئے ان کو دشمن بنانے کی نسبت اللہ کی طرف دی گئی۔

پھر اس کے بعد جو مضمون ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ جو ایک دوسرے کو بناوٹی باتوں کا القاء کرتے رہتے ہیں، وہ فریب دہی کے لئے [۱] اور اس لئے ہے [۲] کہ ایمان سے بے بہرہ افراد ان کی طرف متوجہ ہوں اور پسند کریں اور وہ بھی ایسا ہی کرنے لگیں۔

درمیان میں جو یہ فقرہ ہے کہ ”اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کر سکتے“ یہ جملہ معترضہ کی حیثیت سے ہے جس کے وہی معنی ہیں جو اس کے قبل کی آیت میں تھے یعنی اپنی قوت قاہرہ سے وہ انہیں روکنا چاہتا تو وہ ایسا نہ کر سکتے مگر جبر کو صرف کرنا اس کا کام نہیں ہے۔ [۳]

أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكْمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا وَالَّذِينَ
اتَّبَعَتْهُمْ إِذَا بَلَغُوا الْحُلُمَ لَقُوا لِقَاءَ أَلِيمٍ ﴿١١٤﴾

الْمُتَّبِعِينَ ﴿١١٤﴾

”تو کیا اللہ کے علاوہ کسی کو میں فیصلہ کے لئے تلاش کروں اور وہی تو وہ ہے جس نے تمہاری جانب کتاب اتاری ہے تفصیلی بیانات کی حامل اور جنہیں ہم نے کتاب دی تھی، وہ جانتے ہیں کہ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے سچائی کے ساتھ اتاری ہوئی ہے تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔“

چونکہ کتب سابقہ میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے علامات تفصیل کے ساتھ مذکور تھے اس لئے جا بجا قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ اہل کتاب اس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو خوب پہچانتے ہیں۔ اسی طرح یہاں کہا جا رہا ہے کہ وہ اس کتاب یعنی قرآن کو بھی جانتے ہیں پورے طور پر کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ جانتے سب ہیں، یہ اور بات ہے کہ ان میں سے کچھ مانتے بھی ہیں اور وہ وہ ہیں کہ جو ایمان لے آئے اور کچھ جانتے ہیں مگر مانتے نہیں ہیں۔

[۱]. تافریب دھندہ (شاکہ ولی اللہ)

[۲]. العامل فی قوله ”التصغی“ قوله ”یوحی“ (مجمع البیان)

[۳]. ذلک ینافی التکلیف ولو حال بینہم و بینہ لما فعلوا (تبیان)

اسی کا نام کفر جھوٹی ہوتا ہے کہ آدمی جان بوجھ کر انکار کرے۔

اب قرآن مجید میں چونکہ یہاں ماننے کا نہیں، بس جاننے کا ذکر ہے لہذا کوئی ضرورت نہیں کہ اسے اہل کتاب کے ان خاص افراد سے متعلق قرار دیا جائے جو مسلمان ہو گئے تھے جیسا کہ بعض مفسرین نے خیال کیا ہے۔^[۱]

ہاں اس خصوصیت کی قید لگانے میں کوئی حرج نہیں کہ یہ ان میں کے علماء اور اپنی کتابوں سے واقف افراد کا ذکر ہے۔ نہ کہ عوام الناس^[۲] کا جنہیں خود اپنے یہاں کی کوئی خبر نہیں ہے۔ صرف نام کے لئے وہ اپنے کو ان فرقوں سے متعلق قرار دیتے ہیں۔

وَمَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ۗ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ ۗ وَهُوَ السَّمِيعُ

الْعَلِيمُ ﴿۱۱۵﴾

”اور آپ کے پروردگار کی بات پوری ہے سچائی اور عدالت میں اور اس کی باتوں کا بدلنے والا کوئی نہیں اور وہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا۔“

عدل الہی

قرآن میں مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے ثبوت عدل اور نفی ظلم پر طرح طرح زور دیا گیا ہے۔ اس کے بعد معلوم نہیں کس واسطے مسلمانوں کے ایک طبقہ نے اس کے صفات سے عدل کو خارج کر دیا ہے جس کے نتیجے میں علم کلام کی اصطلاح میں عدلیہ مسلمانوں کا صرف ایک فرقہ رہ گیا ہے۔ حالانکہ از روئے قرآن تمام امت اسلامیہ کو عدلیہ ہونا چاہئے۔

عدل چونکہ مقابل ”ظلم“ ہے اور ”ظلم“ ہر قسم کی بے راہ روی اور غیر مستحسن ہر کام پر حاوی ہے۔ اس لئے عدل ہر حیثیت سے اس کے افعال کے خیر اور مستحسن ہونے کا نام ہے۔ اس ترجمہ ”انصاف“ کے ساتھ کرنا^[۳] اس کے مفہوم کو محدود بنا دیتا ہے مگر ظاہر ہے کہ جو عدل کے قائل نہیں اور حسن و قبح عقلی کا تصور نہیں رکھتے وہ عدل و حکمت کی پوری قدروں کا اندازہ کہاں کر سکتے ہیں؟!

وَإِنْ تَطَّعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۗ إِنَّ يَتَّبِعُونَ إِلَّا

الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَجْرُؤُونَ ﴿۱۱۶﴾

”اور اس زمین کے رہنے والوں کی اکثریت کا اگر تم کہنا مانو تو تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے، وہ نہیں پیروی کرتے مگر گمان کی اور نہیں وہ باتیں کرتے مگر اٹکل پچو۔“

اکثریت معیار حق نہیں

[۱]۔ یعنی بہر مؤمنی اہل کتاب (مجمع البیان)

[۲]۔ لایحوزان یکون علیٰ عمو ملان کثیر امن اہل کتاب بل اکثر ہم جہال لایعرفون (تبیان)

[۳]۔ تمام است سخن پروردگار تو در راستی و انصاف (شاہ ولی اللہ) پوری ہوئی بات رب تیرے کی راستی میں اور انصاف میں (شاہ فنج الدین)

اس میں صاف اس اصول کا اعلان ہے کہ اکثریت معیار حق نہیں ہے [۱] بلکہ اکثریت تو زیادہ تر عوام کی ہوتی ہے جن کے خیالات کسی ٹھوس دلیل پر نہیں بلکہ توہمات اور بے بنیاد گمانوں پر مبنی ہوتے ہیں تو ان کی پیروی معیار حق کیوں کر ہو سکتی ہے؟

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ مَنْ يَضِلُّ عَنْ سَبِيلِهِ ۗ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿۱۷﴾
 ’یقیناً تمہارا پروردگار خوب جاننے والا ہے ان کا [۲] جو اس کے راستے سے بھٹکتے ہیں اور وہ بہترین جاننے والا ہے ان کا جو سیدھے راستے پر برقرار رہتے ہیں۔‘
 اس لئے کہ دوسرے لوگ ظاہر کو دیکھتے ہیں، باطن کی خبر نہیں، اور حال سے واقف ہیں، مستقبل پر نظر نہیں۔ [۳]

**فَكُلُوا مِمَّا ذُكِّرَ عَلَيْكُمْ أَن كُنْتُمْ بآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ ﴿۱۸﴾ وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا
 مِمَّا ذُكِّرَ عَلَيْكُمْ وَقَدْ فَضَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ
 إِلَيْهِ ۗ وَإِنَّ كَثِيرًا لَّيُضِلُّونَ بِأَهْوَاءِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ
 بِالْمُعْتَدِينَ ﴿۱۹﴾**

’تو کھاؤ تم اس سے جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے اگر تم اس کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہو، اور تمہیں حق نہیں ہے کہ تم نہ کھاؤ اس سے جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے حالانکہ اس نے تفصیل سے بیان کر دیا ہے تمہارے لئے ان چیزوں کو جو اس نے تم پر حرام کی ہیں سوا اس کے جس کی تمہیں اضطراری طور پر مجبوری ہو اور یقیناً بہت سے لوگ اپنے بے بنیاد خیالات سے نادانستہ گمراہ کرتے ہیں، بلاشبہ تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے انہیں جو ظلم و تعدی سے کام لیتے ہیں۔‘
 ’جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو‘ اس سے مراد ہے ذبیحہ یعنی جسے بسم اللہ واللہ اکبر کہہ کر ذبح کیا گیا ہو۔ [۴]

اگر فقط پہلے والی آیت ہوتی کہ ’کھاؤ تم اس میں سے جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو‘ تو ہم یہ سمجھ سکتے تھے کہ اس سے مقصود میوہ کے کھانے کی ممانعت ہے یعنی جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، اسے نہ کھاؤ، جیسا کہ بعض ترجموں سے ظاہر ہوتا ہے [۵] مگر اس کے بعد کی آیت نے یہ بات صاف کر دی ہے کہ یہ اجازت اس ممانعت کے مقابلہ میں جو میوہ کے بارے میں ہے، نہیں ہے بلکہ یہ اجازت کا اعلان ان چیزوں کے بالمقابل ہے جنہیں یہود اور مشرکین نے بلاوجہ حرام سمجھ رکھا تھا یا جسے اب کوئی بغیر کسی معیار شرعی کے کسی رسم و رواج کے ماتحت ممنوع الاکل قرار دے دے۔ ان کے بالمقابل یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ پابندیاں غلط ہیں، بس ایک پابندی ہے اور وہ یہ کہ بسم اللہ کہہ کر ذبح کیا گیا ہو اگر ایسا ہے تو بلا توقف اس کا کھانا

[۱] فی ہذا دلالة علی انہ لا عبرة فی دین اللہ و معرفة الحق بالقللة و اکثرية (مجمع البیان)

[۲] اعلم ای عالم (جلالین)

[۳] لان غیرہ لا یعلم جمیع الاشیاء و ما یعلم الا بعلمہ من جمیع جوہہا (تبیان)

[۴] الذکر هو قول بسم اللہ (مجمع البیان)

[۵] جس ذبیحہ پر (وقت ذبح) خدا کا نام لیا گیا ہو، اسی کو کھاؤ (مولانا فرمان علی صاحب مرحوم)

درست ہے، اس سے پرہیز کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

**وَذُرُّوا ظَاهِرَ الْأَيْمَنِ وَبَاطِنَهُ ۗ إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْأَيْمَنَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوا
يَقْتَرِفُونَ ﴿١٣٠﴾**

’اور گناہ کو چاہے علانیہ ہو اور چاہے خفیہ [۱] (بہر صورت ترک کرو، بلاشبہ وہ جو گناہ کرتے ہیں) انہیں سزا ملے گی اس کی جس کا وہ ارتکاب کرتے تھے۔‘

**وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ ۗ وَإِنَّ الشَّيْطَانَ لِيُؤْخَذَ
إِلَىٰ أَوْلِيَيْهِمْ لِيَجْادِلُوْكُمْ ۗ وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ ﴿١٣١﴾**

’اور جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، اسے نہ کھاؤ اور یقیناً وہ بہت بڑا گناہ ہے اور بلاشبہ شیطان ہیں جو اپنے حوالی موالی کو القاء کرتے ہیں کہ وہ تم سے جھگڑا کریں اور اگر تم ان کا کہنا مانو تو یقیناً تم مشرک ہو جاؤ۔‘

پہلے تو اس پر تنبیہ تھی کہ بعض اقسام کے ذبیحہ سے جو غلط توہمات کی بنا پر پرہیز کرتے ہو، یہ غلط ہے بلکہ جس چیز کو اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا، اسے تمہیں حلال سمجھنا چاہیے اور اب اس دوسرے رخ پر تنبیہ ہے کہ مردار سے یعنی جسے بسم اللہ کہہ کر ذبح نہ کیا گیا ہو، اس سے پرہیز ضروری ہے، یہ حرام ہے اور اس کا کھانا بہت بڑا گناہ ہے۔

آخر میں جو کہا گیا ہے کہ اگر ان کا کہنا مانو گے تو مشرک ہو جاؤ گے، اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر اس گناہ میں ان کی دعوت کو قبول کر لو گے اور ان کے کہنے سے اکل حرام پر آمادہ ہو جاؤ گے تو پھر رفتہ رفتہ ان کے کہنے سے بتلائے شرک بھی ہو جاؤ گے۔

اور یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ بلکہ اسی کو زیادہ قوت ہے کہ حکم الہی کے خلاف ان شیاطین کی اطاعت کرنا خود ایک قسم کا شرک ہے۔ [۲]

**أَوْ مَنْ كَانَ مَيِّتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلَهُ فِي
الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۗ كَذَلِكَ زُيِّنَ لِلْكَافِرِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٣٢﴾**

’اور کیا وہ جو مردہ تھا تو ہم نے اسے زندہ بنایا اور اس کے لئے ایک روشنی قرار دی جس کو لئے ہوئے وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے، اس کی طرح ہے جس کی حالت تاریکیوں میں یہ ہے [۳] کہ وہ ان سے نکل ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح کافروں کی نظر میں آراستہ ہوئے ہیں وہ اعمال جو وہ کرتے ہیں۔‘

’مردہ تھا اور اسے زندہ بنایا‘ اس سے مراد یہ ہے کہ کافر تھا، اسے ہم نے ایمان کی طرف ہدایت کی اور جہالت میں تھا ہم نے علم عطا

[۱] الاثم قبیل الاہل و قبیل کل معصیۃ (جلالین) الاصح القول الاہل (کل اثم) لانہ یعمد الحجیم (مجمع البیان)

[۲] - انکم اذا المشرکون (تبیان) یعنی شرک فقط یہی نہیں کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجے بلکہ شرک کے حکم میں ہے کہ اس کا مطیع ہووے (موضح القرآن)

[۳] - مانند کسی باشد کہ صفتش این است کہ در تاریکیہا است (شاہ ولی اللہ)

کیا۔^[۱] ”روشنی جس کو لئے ہوئے وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے“ ایک مسلمان کا وہ طرز حیات ہے جو دین اسلامی کی تعلیمات کی بنا پر اس کی ہر نقل و حرکت سے نمودار ہوتا ہے جس سے دوسرے دیکھنے والوں کو اگر وہ آنکھوں سے کام لیں اپنے کردار کی پستی کا احساس ہوگا اور وہ اس طرز زندگی سے متاثر ہو کر صحیح راستے کی طرف آجائیں گے۔

”اس طرح آراستہ ہونے“ یعنی جیسے اہل ایمان کو ہدایت کا راستہ بھلا معلوم ہوا، وہ اس پر چل کھڑے ہوئے ویسے ہی کافروں کو اپنی جہالت سے ان کی بد اعمالیاں بھلی معلوم ہوئیں^[۲] اور یہ اپنے اپنے حسن اختیار و سوء اختیار کا کرشمہ ہے۔

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ أَكْبَرًا كِبْرًا لِيَذُكَّرُوا فِيهَا ۗ وَمَا يَمْكُرُونَ إِلَّا

بِأَنْفُسِهِمْ ۗ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿۲۳﴾

”اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں کچھ بڑے بڑے مجرم قرار دیئے ہیں کہ وہ اس میں طرح طرح کے منصوبے بناتے ہیں اور وہ منصوبے نہیں بناتے مگر خود اپنی ہی تخریب کے لیکن انہیں شعور نہیں ہے“۔

وہ پیدا تو ان منصوبہ سازوں کے لئے نہیں کئے گئے تھے مگر چونکہ نتیجتاً انہوں نے پیدا ہونے کے بعد یہی وطیرہ اختیار کیا، اس لئے ان کی پیدائش پر مرتب شدہ نتیجہ کو ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ ہم نے یہ مجرم قرار دیئے ہیں کہ جو طرح طرح کے منصوبے بناتے ہیں۔^[۳]

وَإِذَا جَاءَتْهُمْ آيَةٌ قَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ بِهَا حَتَّىٰ نُؤْتَىٰ مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ

أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ ۗ سَيُصِيبُ الَّذِينَ أَجْرَمُوا صَغَارٌ عِنْدَ اللَّهِ

وَعَذَابٌ شَدِيدٌ لِّمَا كَانُوا يَمْكُرُونَ ﴿۲۴﴾

”اور جب ان کے پاس کوئی معجزہ آتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، جب تک ہمیں نہ ملیں ویسی ہی چیزیں جیسی اللہ کے پیغمبروں کو ملتی ہیں، اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ اپنی پیغمبری کا منصب کہاں رکھے^[۴] ان مجرموں کو عنقریب ذلت ہوگی اللہ کے یہاں اور سخت سزا ان تخریبی کاروائیوں کی وجہ سے جو وہ کرتے رہتے تھے“۔

مطلب یہ ہے کہ وہ کفار کہتے تھے کہ اللہ ہم ہی کو رسول کیوں نہیں بناتا اور وہ سب چیزیں نہیں عطا کر دیتا جو پیغمبروں کو ملی ہیں۔^[۵]

اس کا جواب خالق نے یہ دیا ہے کہ پیغمبری ہر ایک کو تھوڑی ملتی ہے۔ وہ کچھ خاص اوصاف سے وابستہ ہے اور خدا ہی ان اوصاف کو جانتا ہے کہ وہ کس میں پائے جاتے ہیں۔

[۱]. کان میتا بالکفر فصار حیا بالاسلام (تبیان) تشبہ سبحانہ الکفر بالادقوالایمان بالحیوة (مجمع البیان)

[۲]. کمأزین للمؤمنین الایمان (جلالین)

[۳]. لامر العاقبة کما فی قولہ سبحانہ: لیکون لہم عدو او حزناً (مجمع البیان)

[۴]. خدا ذات راست، محل مذاہن پیغمبری خود (شاہ ولی اللہ) اللہ خوب جانتا ہے کہ کس جگر کھے پیغمبری اپنی کو (شاہ رفیع الدین)

[۵]. من یعلم انہ یقوم بأعباء الرسالة (تبیان)

رسالت بر بنائے بلندی اوصاف

اس سے ظاہر ہے کہ پیغمبروں کی رفعت رسالت کے نتیجے میں نہیں ہے چونکہ رسالت کا منصب خالق نے عطا کر دیا، اس لئے وہ بلند ہو گئے بلکہ رسالت ان کو رفعت اوصاف و کردار کی بنا پر ملتی ہے۔

یہ اور بات ہے کہ خالق کا علم محیط ہے اور وہ تجربہ اور مشاہدہ کا محتاج نہیں ہے، اس لئے عطائے منصب ان کو بحیثیت زمانہ مقدم ہے اور عالم خارج میں ان اوصاف کا ظہور مؤخر ہے جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے لئے قرآن کی آیت ان کا یہ اعلان گہوارہ میں بتا رہی ہے کہ اَنْدِيعِ الْكِتَابِ وَجَعَلْنِي نَبِيًّا” مجھے اس نے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا ہے۔“

اور ہمارے پیغمبر ﷺ کی مشہور حدیث ہے: كُنْتُ نَبِيًّا وَاِدْمُ بَيْنَ الْمَاءِ وَالطَّلِيْنِ ”میں اس وقت بھی نبی تھا، جب آدمؑ آب و گل کے درمیان تھا، یعنی ابھی مفرد عناصر کی منزل تھی اور ترکیب جسمانی کے ساتھ پتلا بھی تیار نہ ہوا تھا۔ روح پھونکے جانے کا کیا ذکر ہے۔

فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ ۗ وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ
صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَمَّا يَصْعَدُ فِي السَّمَاءِ ۖ كَذَلِكَ يَجْعَلُ اللَّهُ الرِّجْسَ عَلَى
الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٢٥﴾

”تو جسے اللہ سیدھے راستے پر لگانا چاہتا ہے، اس کے سینہ کو اسلام کے لئے کشادہ کر دیتا ہے اور جسے گمراہی میں چھوڑ دینا چاہتا ہے اس کے سینہ کو تنگی کے ساتھ بالکل بند [۱] کر دیتا ہے جیسے کہ وہ جو آسمان میں اونچا ہو رہا ہے [۲] اس طرح اللہ نجاست کا حکم لگا دیتا ہے ان پر جو ایمان نہیں لاتے۔“

یہ اللہ کا چاہنا انسان کے کسی کردار کی نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی لئے آخر میں یہ کہا گیا ہے کہ اس طرح نجاست کو پائے نام کر دیتا ہے ان کے جو ایمان نہیں لاتے۔ معلوم ہوا کہ یہ ایمان نہ لانا اللہ کے عمل کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اللہ کا یہ عمل جو ہے، وہ ان کے عمداً ایمان سے انحراف کا نتیجہ ہے۔ [۳] لہذا اس کے بالمقابل جو ”شرح صدر“ (سینہ کو کشادہ کرنا) ہے وہ بھی انسان کے ارادہ توجہ و التفات کا نتیجہ ہے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے: ”وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا“ جو ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں، انہیں ہم اپنے راستوں پر لگا دیتے ہیں۔“ اسی کو یہاں کہا گیا ہے کہ جسے وہ راستے پر لگانا چاہتا ہے، اس کے سینہ کو کشادہ کرتا ہے۔ ”سینہ کشادہ کرنا“، حقائق کو اس کے ذہن نشین کرنا اور اسے مزید بصیرت عطا کرنا ہے۔ [۴]

[۱]. فالجرح الذي لا مدخل فيه والضييق ما يكون له الدخول الضيق (علی بن ابراہیم)

[۲]. گویا بالاحی رود در آسمان (شاه ولی اللہ)

[۳]. عقوبة له على ترك الايمان من غير ان يكون سبحانه ما فعالة من الايمان وسالبا اياه القدرة عليه (مجمع البيان)

[۴]. یعنی بفہمائندش حقیقت اسلام و محاسن آن (شاه ولی اللہ) بأن يثبتته عليه ويقوى داعيه على التمسك به وينهل عن قلبه وساوس الشيطان (مجمع)

اور جو اپنے اختیار سے اعراض و انحراف کرتا ہے، اللہ کی طرف سے بھی اس سے بے توجہی اختیار کر لی جاتی ہے اور اس کے ذہن کے دروازوں کو بند کر دیا جاتا ہے جس کے بعد وہ تعصب اور عناد کی بنا پر رہی سہی اپنے عقل و شعور کی طاقت سے بھی کام لینے کے لائق نہیں رہتا۔^[۱]

”اس کا سیدہ تنگ ہو جاتا ہے“ یعنی اس پر حق کا قبول کرنا بہت ہی شاق و ناگوار ہوتا ہے۔^[۲]
اس کی تشبیہ دی گئی ہے اس شخص سے جو بہت اونچائی پر چڑھے تو معلوم ہوتا ہے کہ سینہ میں دم گھٹا جا رہا ہے۔

وَهَذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيمًا ۖ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ ﴿۳۶﴾ لَهُمْ دَارُ

السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ مِمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۳۷﴾

”اور یہ تمہارے پروردگار کا سیدھا راستہ ہے۔ ہم نے نشانیاں تفصیل سے پیش کر دی ہیں، ان لوگوں کے لئے جو نصیحت قبول کرتے ہیں۔ ان کے لئے سلامتی کا گھر ہے ان کے پروردگار کے یہاں اور وہ ان کا سرپرست ہے^[۳] ان اعمال کے صلہ میں جو وہ انجام دیتے تھے۔“

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ۗ لِمَعْشَرِ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْبَرْتُمْ ۗ مِنَ الْإِنْسِ ۗ وَقَالَ

أَوْلِيُّوهُمْ مِنَ الْإِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَبَلَّغْنَا أَجَلَنَا الَّذِي

أَجَلْت لَنَا ۗ قَالَ النَّارُ مَثْوَاكُمْ خَالِدِينَ فِيهَا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ إِنَّ رَبَّكَ

حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿۳۸﴾ وَكَذَلِكَ نُؤَيِّبُ بَعْضَ الظَّالِمِينَ بَعْضًا مِمَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۳۹﴾

”اور جس دن وہ ان سب کو محشر میں اکٹھا کرے گا، اے گروہ جنات تم نے بہت آدمیوں پر قبضہ کیا^[۴] اور ان کے حوالی موالی نے جو آدمیوں میں سے تھے کہا اے پروردگار! ہم نے ایک دوسرے سے فائدہ اٹھایا اور عمر کو بسر کیا جو تو نے ہمارے لئے مقرر کی تھی۔ اس نے کہا کہ اب تمہارا ٹھکانہ دوزخ ہے جس میں تم سب ہمیشہ رہو گے، سو اس کے جسے اللہ چاہے۔ یقیناً تمہارا پروردگار صحیح صحیح کام کرنے والا ہے، بڑا جاننے والا۔ اور اس طرح ہم ظالموں کو آپس میں ایک دوسرے کے سپرد کر دیتے ہیں^[۵] ان اعمال کی وجہ سے جو وہ کرتے تھے۔“

گروہ جنات سے مراد شیاطین ہیں^[۶] جو انسانوں کو بہکاتے ہیں اور خالق کا کلام ان سے جس کا ذکر ہے یوں بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی آواز

[۱] یعنی ہر چند کہ میخو اھند حقیقت اسلام و محاسن آن بفھند نامی تو انند (شاولی اللہ)

[۲] معنایا نہ ثیققل علیہ مایدعی الیہ من الایمان (تبیان)

[۳] اوکار ساز ایشاں است (شاولی اللہ) اور وہ دست ہے ان کا (فنج الدین)

[۴] ای قدا استکثرتم من اضللتموہ من الانس (تبیان) تابع خود بے سیار گر فتیدا از مردمان (شاولی اللہ)

[۵] مسلط ہی کنیم بعض ستمگار اندر بعضی (شاولی اللہ)

[۶] یعنی اے شیاطین (شاولی اللہ)

خلق ہو جسے وہ سنیں اور یوں بھی کہ فرشتے ان سے مخاطب کریں اور فرشتوں کے مخاطب کو اللہ نے اپنا کلام کہا ہو۔^[۱]
دوزخ میں ہمیشہ قیام کے اعلان کے ساتھ ”سو اس کے جسے اللہ چاہے“ ان گنہگاروں کے لحاظ سے ہو سکتا ہے جن کا گناہ کفر کے درجہ تک نہ پہنچا ہو۔

یہ کہ ”ظالموں کو ہم آپس ہی میں ایک دوسرے کے سپرد کر دیتے ہیں“ اس کا ایک مطلب تو وہ ہے جو پہلے لکھا گیا ہے اور دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی سرپرستی سے انہیں خارج کر دیتے ہیں ان کے اعمال کی سزا میں۔^[۲]

يٰۤمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمُ الْآيَاتِ
وَيُنذِرُونَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا ۖ قَالُوا شَهِدْنَا عَلَىٰ أَنفُسِنَا وَغَرَّبْنَاهُمُ الْحَيٰوةَ
الدُّنْيَا وَشَهِدُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا كٰفِرِينَ ﴿۱۴﴾

”اے گروہ جن و انسان! کیا تمہاری طرف پیغمبر تم ہی میں کے نہیں آئے جو تمہارے سامنے میری آیتیں بیان کرتے تھے اور تمہیں اس دن کے درپیش ہونے سے ڈراتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ ہم بے شک اپنے خلاف گواہ ہیں اور انہیں دنیوی زندگی نے فریب میں مبتلا کر دیا تھا اور اب انہوں نے اپنے خلاف گواہی دی ہے کہ بیشک وہ کافر تھے۔“

انسان اور جنات کو ایک قبیلہ قرار دے کر خطاب کیا گیا اس اعتبار سے کہ دونوں اس جوہر اختیار کے حامل ہیں جو تکالیف الہیہ کی ذمہ داری عائد ہونے کے لئے ضروری ہے جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے کہ: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ”میں نے جنات اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔“

رُسُلٌ مِّنكُمْ کے خطاب کو اس مخلوط قبیلہ یعنی جن و انس کے مجموعہ سے بھی متعلق کیا جاسکتا ہے^[۳] اس صورت میں یہ ضروری نہ ہوگا کہ جنات کے رسول از قسم جنات ہی ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ پیغمبر از قسم جنات بھی مانے جائیں۔
یہ اور بات ہے کہ کوئی رسول جو افضل المرسلین ہے، وہ انسانوں میں سے ہو اور ان سب کا حاکم اور اس پورے سلسلہ کا خاتم ہو۔

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَّاَهْلَهَا غٰفِلُوْنَ ﴿۱۵﴾
”بات یہ ہے کہ تمہارا پروردگار یہ کرنے کا نہیں ہے کہ بستیوں کو ظلم و ستم کی بنا پر^[۴] ختم کر دے اس عالم میں کہ اس

[۱]. قال تعالى لهم على لسان الملائكة (جلالين)

[۲]. الغرض بذلك اعلامهم انه ليس لهم يوم القيامة ولي يدفع عنهم شيئا من العذاب (تبيان)

[۳]. منكم اي من مجموعكم الصادق بالانس والجن (جلالين) لتغليب احدهما على الاخرى كما يغلب المذكر على المؤنث وكما وصل يخرج منهما اللؤلؤ والمرجان بعد قوله: مرج البحرين يلتقيان وانما يخرج اللؤلؤ من الملح دون الغدب. وهذا قول اكثر المفسرين (تبيان) وهو الاقوى (تبيان)

[۴]. بظلم يكون منهم (مجمع البيان) بظلم منها (جلالين) بجزائ ظلم (شاه ولي الله)

کے رہنے والے بے خبر ہوں۔“

”بے خبر“ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ ان تک احکام الہیہ کے پہنچانے کا خالق کی طرف سے انتظام ہی نہ ہوا ہو۔^[۱] اس صورت میں یہ نہیں ہو سکتا کہ انہیں ان کی غلطیوں کی سزا دی جائے جو خلاف عدل ہوگا، ظلم قرار پائے گا، اور خدا ہر برائی سے پاک اور بری ہے۔

تکلیف بلا بیان قبیح ہے

یہ جماعت عدلیہ کا وہ اصول ”عدل“ ہے جو قرآن مجید کی بے شمار آیتوں کے ساتھ ساتھ اس آیت سے بھی ثابت ہے۔ اسی کو اصول فقہ میں ان الفاظ میں تعبیر کرتے ہیں کہ ”تکلیف بلا بیان قبیح ہے“ جس پر اصول عملیہ میں سے ”اصل براءۃ“ کی بنیاد ہے۔ اور علم کلام میں اسی سے اس کی ضرورت ثابت ہوتی ہے کہ خالق پیغمبر مقرر کرے جو خلق خدا کو صحیح راستہ بتا کر حجت تمام کرے جس کا ذکر اس کے قبل کی آیت میں ہے۔^[۲]

وَلِكُلِّ دَرَجَةٍ مِمَّا عَمِلُوا ۖ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ ﴿۳۳﴾

”اور ہر ایک کے لئے مرتبے ہیں اس اعتبار سے کہ جو انہوں نے اعمال کئے ہیں اور تمہارا پروردگار بے خبر نہیں اس سے کہ جو وہ کرتے تھے۔“

یاد رہے کہ قرآن مجید میں ہر جگہ مراتب اخرویہ کو اعمال سے وابستہ کیا ہے^[۳] جن کی صحت ایمان کے ساتھ مشروط ہے۔ ایمان بلا عمل کا تصور قرآن کی روشنی میں ممکن ہی نہیں ہے۔

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۗ إِنَّ يَشَاءُ يَذْهَبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَاءُ

كَمَا أَنْشَأَكُمْ مِنْ ذُرِّيَّةٍ قَوْمٍ آخَرِينَ ﴿۳۴﴾

”اور تمہارا پروردگار بے نیاز ہے، رحمت والا۔ اگر چاہے، تم لوگوں کو لے جائے^[۴] اور تمہارے بعد تمہاری جگہ جسے چاہے دیدے جیسا کہ تم لوگوں کو اس نے پیدا کیا کچھ اور لوگوں کی نسل سے۔“

یعنی اس کا تمہیں خلق کرنا اور اس دنیا میں برقرار رکھنا صرف اس کی رحمت ہے، ورنہ اسے تمہاری ضرورت نہیں ہے اور نہ تمہاری

[۱]. غافلون لحدیر سل الیہم رسول یدبین لہم (جلالین)

[۲]. ابن ارسالہ سل بسبب آنست یعنی قبل از بعثت رسل عقوبت نہ نمی آید (شاہ ولی اللہ)

[۳]. ای مراتب فی عملہ علی حسب ما یتحققہ فیجازی علیہ. (مجمع البیان) فالاعظم من العقاب للاعظم من المعاصی والاعلم

من اللثواب الاعظم من الاطاعات (تبیان)

[۴]. اگر خواہد دور کند شمارا (شاہ ولی اللہ)

نافرمانیوں اور سرتانیوں سے اس کا کچھ بگڑتا ہے۔^[۱]

إِنَّ مَا تُوْعَدُونَ لَأَيُّ لَوْ مَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿۱۳۷﴾

”یقیناً جو وعدہ و وعید تم سے ہوتا ہے، وہ ضرور آنے والا ہے اور تم قدرت کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتے۔“

عربی زبان میں وعدہ اچھی بات کے وعدہ کے لئے آتا ہے اور وعید کسی برے نتیجے سے دھمکانے کے لئے آتا ہے۔ تو عدون کا لفظ عربی قاعدہ کے لحاظ سے دونوں سے ہو سکتا ہے، وعد سے بھی اور وعید سے بھی۔

عموماً اس کا ترجمہ ”وعدہ“ کے لفظ سے کیا گیا ہے^[۲] لیکن بعض مفسرین نے اسے وعید سے مانو لیا ہے^[۳] اور آخر کا فقرہ ”وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ“ جس کا مطلب یہ ہے کہ تم اللہ کو بے بس نہیں بنا سکتے جس کو ہم نے ترجمہ میں اس طرح ادا کیا ہے کہ ”تم قدرت کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتے“۔ یہ دوسرے معنی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے یعنی جس عذاب آخرت اور پاداش اعمال سے تمہیں ڈرایا جاتا ہے، تم اسے روک نہیں سکتے اس لئے کہ تمہارے امکان میں یہ نہیں ہے کہ تم اللہ کی قدرت کا مقابلہ کر کے اسے عاجز و مجبور بنا سکو۔

ہم نے ایسا ترجمہ کیا ہے جو دونوں پر منطبق ہو سکتا ہے اور دوسرے مفسرین بھی ایسے ہیں جنہوں نے اس لفظ کو ثواب و عذاب دونوں پر حاوی قرار دیا ہے۔^[۴]

قُلْ يٰقَوْمِ اَعْمَلُوا عَلٰی مَا كَانَتْكُمْ اِٰتِیَ عَامِلًا ۚ فَاَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ مَنْ تَكُوْنُ لَهُ

عَاقِبَةُ الدَّارِ ۗ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُوْنَ ﴿۱۳۹﴾

”کہہ دیجئے کہ اے میری قوم والو! تم اپنی حد پر اپنے کام کئے جاؤ^[۵] میں اپنا کام کرتا ہوں۔ اس کے بعد تمہیں معلوم

ہوگا کہ انجام میں اس عالم کی بہتری کس کے لئے ہے^[۶] جو ظالم ہیں وہ بلاشبہ دین و دنیا کی بہتری نہیں پائیں گے۔“

”اپنے کام کئے جاؤ“..... یہ کوئی حکم یا واقعی مطالبہ نہیں ہے بلکہ تہدید کا ایک طریقہ ہے کہ جو کرنا ہو کر لو۔ میرا اس سے کوئی نقصان نہیں ہے تمہیں بعد میں پتہ چلے گا کہ انجام کیا ہوتا ہے۔^[۷]

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْأَنْعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ

[۱] الغنی عن خلقه وعبادتهم ولكنہ تعالیٰ ابقا کم رحمة لکم۔ (جلالین) لاینفعہ طاعتہم ولا نصیرہ معصیتہم (مجمع البیان)

[۲] آنچه وعدہ کردہ می شود شمارا (شاه ولی اللہ) جو کچھ وعدہ دیئے جاتے ہو تم (شاہ رفیع الدین) جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے (فرمان علی صاحب)

[۳] ان ما تو عدون من الساعة و العذاب (جلالین) ان الذی اوعد الخلق به من عقابہ علی معاصیہ و الکفر بہ و اوقع (تبیان)

[۴] من القیامة و الحساب و الجنة و النار و الثواب و العقاب و تفاوت اهل الجنة فی الدرجات و تفاوت اهل النار فی الدرجات (مجمع البیان)

[۵] اعملوا علی قدر منزلتکم او تمکنکم من الدنیا (تبیان) و قیل علی طریقتکم و قیل علی حالتکم (مجمع البیان)

[۶] ای العاقبة المحمودة فی الدار الاخرة (جلالین)

[۷] وان کان ضیعة ضیعة الامر فالمراد به التہدید (تبیان)

وَهَذَا لِشُرِّ كَابِنَا ۖ فَمَا كَانَ لِشُرِّ كَابِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَمَا كَانَ لِلَّهِ

فَهُوَ يَصِلُ إِلَى شُرِّ كَابِهِمْ ۖ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿١٣٦﴾

”اور انہوں نے ان چیزوں سے کہ جو اس نے پیدا کی ہیں، کھیت اور چوپائے، ایک حصہ اللہ کا رکھا ہے [۱] تو اپنے خیال ناقص کے مطابق کہتے ہیں کہ یہ اللہ کا ہے اور یہ ہمارے شریکوں کا [۲] تو جو ان کے والے شریکوں کا ہے، وہ اللہ کی طرف نہیں جاسکتا اور جو اللہ کا ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جائے گا۔ کیا برا ہے وہ حکم جو وہ لگاتے ہیں۔“

شاہ عبدالقادر صاحب لکھتے ہیں: ”کافر اپنی کھیتی میں سے اور مویشی کے بچوں میں سے اللہ کے نیاز کا نکالتے اور بتوں کے بھی نیاز کا۔ پھر اگر جانور اللہ کے نام کا بہتر دیکھا، بتوں کی طرف بدل دیا اور بتوں کی طرف کا اللہ کی طرف نہ کرتے، اس سے زیادہ ڈرتے۔“ (موضح القرآن) ان کی اس تفریق کی بنیاد یہ تھی کہ وہ کہتے تھے اللہ تو بے نیاز ہے اسے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے یہ بت بچارے ضرورت مند ہیں [۳] لہذا بعض صورتوں میں اللہ کا حصہ ان کی طرف چلا جائے تو کوئی حرج نہیں اگرچہ اللہ کی بے نیازی کا تصور بجائے خود ایک صحیح بات ہے مگر چونکہ ان کے اس رویہ سے اہمیت بتوں کی زیادہ نمایاں ہوتی ہے، اس لئے قرآن مجید نے ان کے اس عمل کو ان کی باطل پرستی کے نمونہ کے طور پر پیش کیا ہے۔

وَكَذَلِكَ زَيْنٌ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتَلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَّكَائِهِمْ لِيُزِدُوهُمْ

وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ ۖ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا فَعَلُوا فَنذَرُكُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ﴿١٣٧﴾

”اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لئے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کی جان لینے کو نظروں میں سجا دیا ہے کہ انہیں تباہ کریں اور تاکہ ان کے مذہب کو ان پر مشتبہ کریں [۴] اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے لہذا اچھوڑیے انہیں اور اسے کہ جو وہ جھوٹ باندا کرتے ہیں۔“

”اسی طرح“ یعنی جیسے انہوں نے قربانیوں میں بٹوارا کیا ہے کہ یہ اللہ کا ہے اور یہ ان کے شریکوں یعنی بتوں کا اور اسے ان بتوں نے یعنی ان کی محبت نے ان کی آنکھوں میں آراستہ و پیراستہ بنا کر پیش کیا ہے، ویسے ہی اولاد کی جان لینے کو ان کی نظروں میں سجا دیا ہے۔ [۵]

اس جان لینے سے مراد بظاہر وہ دختر کشی کی رسم ہے جو عرب میں رائج تھی۔ [۶]

اور ہو سکتا ہے کہ بتوں پر بچوں کو بھینٹ چڑھانے کی رسم بھی ان میں پائی جاتی ہو۔

[۱] ھھنا حذف بیدل الکلام علیہ وھو: جعلوا اللواتان منہ نصیباً (مجمع البیان)

[۲] انما جعلوا اللواتان شرکاء ہم لا ہم جعلوا الھان نصیباً من اموالھم (مجمع) برای شرکائی کہ ما مقرر کردہ ایم (شاہ ولی اللہ)

[۳] یقولون ان اللہ غنی والاصنام ارجح (مجمع البیان)

[۴] تا مختلط کنند بر ایشاں دین را (شاہ ولی اللہ) ملا دیویں او پر ان کے دین ان کا (شاہ فنج الدین)

[۵] كذلك كما زين لهم ما ذكر (جلالین)

[۶] زينوا لهم قتل البنات (مجمع البیان)

اگر ”شرکاء“ سے بت مراد لئے جائیں جیسا کہ اس کے پہلے لکھا گیا ہے تو ان کی طرف اس فعل کے سجنے کی نسبت اسی معنی سے ہوگی کہ ان بتوں کی محبت انہیں اس پر آمادہ کرتی تھی اور یہ اس دوسرے مفہوم سے زیادہ مناسب رہتی ہے۔
مولانا فرمان علی صاحب مرحوم نے ان دونوں باتوں کو سمو دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:
”ان میں سے کسی کے یہاں جب لڑکی پیدا ہوتی تو لوگ اس کو ملامت کرتے تھے اور وہ تنگ و عار کے مارے اسے مار ڈالتا تھا یا زندہ درگور کر دیتا یا پجاریوں کے بہکانے سے بتوں کے آگے بھینٹ چڑھادیتا اور اپنے خیال میں اے بہت اچھا کام سمجھتا۔“
ایک احتمال یہ ہے کہ ”شرکاء“ سے شیاطین مراد ہوں، اس لئے کہ گمراہ افراد جب خدا کی اطاعت کے بجائے شیطان کا کہنا مانتے ہیں تو گویا وہ بھی ایک صنم ہے جس کی وہ عبادت کر رہے ہیں اور اس نے ایسی ایسی غلط کاریوں کو ان کی نظر میں سجا کر مستحسن قرار دے دیا ہے [۱]
ایک تفسیر یہ ہے کہ شرکاء سے مراد ان کے وہ آباؤ اجداد ہیں جن کی وہ اندھا دھند پیروی کر رہے ہیں۔ [۲]
”اور اگر وہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے“ اس طرح کے جملے قرآن مجید میں کئی جگہ ہیں اور ہر جگہ مطلب ایک ہی ہے کہ اگر خالق جبری طاقت کو اپنی بروئے کار لاتا [۳] تو یہ ہونہی نہیں سکتا تھا مگر جبر کرنا اس کی حکمت کے تقاضا کے خلاف ہے۔

وَقَالُوا هَذِهِ أَنْعَامٌ وَحَرِثٌ حَجْرٌ ۗ لَا يَصْعَقُهَا إِلَّا مَنْ نَشَاءُ بِزَعْمِهِمْ وَأَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُورُهَا وَأَنْعَامٌ لَا يَذْكُرُونَ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا افْتِرَاءٌ عَلَيْهِ ۗ سَيَجْزِيهِمْ مِمَّا كَانُوا يَفْتُرُونَ ﴿۱۳۸﴾

”اور ان کا کہنا ہے اپنی خام خیالی سے کہ یہ چوپائے اور کھیت اچھوتے ہیں [۴] کہ انہیں نہیں کھا سکتا مگر وہ جسے ہم چاہیں اور کچھ چوپائے ہیں جن کی پشت پر سواری کو ممنوع قرار دیا ہے [۵] اور کچھ چوپائے ہیں جن پر وہ اللہ کا نام نہیں لیتے اس پر غلط تہمت لگاتے ہوئے، وہ انہیں عنقریب اس کی جو وہ غلط تہمت لگاتے ہیں، سزا دے گا۔“
یہ سب ان بدعتوں کی فہرست ہے جو ان مشرکین نے ایجاد کر رکھی تھیں۔
یہ چوپائے اور کھیت ”یعنی جنہیں انہوں نے اپنے بتوں پر چڑھا دیا ہے [۶]
ان کے کھانے کے لئے انہوں نے دل بخواہ پابندیاں عائد کر رکھی تھیں مثلاً وہ کھائیں گے جو بتوں کے خاص خدمت گزار ہیں۔ وہ بھی،

[۱] یعنی الشیاطین الذین زینوا الھم قتل البنات (مجمع البیان)

[۲] قال یعنی اسلافھم (علی بن ابراھیم)

[۳] لو شاء ان یضطرھم الی ترکہ (تبیان)

[۴] حجور حرامہ (جلالین) یہ جانور ہیں اور کھیتی ہے اچھوتی (شاہ رفیع الدین)

[۵] حرامہ کردہ شدہ است سواری بر پشت آئیا (شاه ولی اللہ)

[۶] الانعام والزروع الذین جعلوھما لالھتم واثانہم (تبیان)

مرد، عورتیں نہیں۔^[۱]

وَقَالُوا مَا فِي بُطُونِ هَذِهِ الْأَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُورِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلَىٰ أَزْوَاجِنَا ۗ
وَإِنْ يَكُنْ مَيْتَةً فَهُمْ فِيهِ شُرَكَاءُ ۗ سَيَجْزِيهِمْ وَصْفُهُمْ ۗ إِنَّهُ حَكِيمٌ
عَلِيمٌ ﴿۱۳۹﴾

”اور ان کا کہنا ہے کہ جو ان چوپایوں کے اندر ہے وہ ہمارے افراد ذکور سے مخصوص ہے اور ہماری عورتوں پر حرام ہے اور اگر مردار ہو تو وہ سب اس میں حصہ دار ہیں بہت جلد وہ انہیں ان کے اس حکم لگانے کی سزا دے گا۔ یقیناً وہ صحیح کام کرنے والا ہے، بڑا جاننے والا۔“
اس کی تشریح شاہ صاحب کے لفظوں میں پڑھئے:

”ایک یہ مسئلہ بھی بنایا تھا کہ جانور ذبح کیا۔ اس کے پیٹ میں سے بچہ نکلا۔ اگر زندہ نکلا تو مرد کھائیں اور عورتیں نہ کھائیں اور مردہ نکلے تو سب کھائیں“ (موضح القرآن)

مشرکین کی تاریک ذہنیت اور افسوس ناک بدعت

ان کے اس مزعومہ کی رد کی جا رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو غذا حلال ہے، وہ سب کے لئے اور جو حرام ہے وہ بھی سب کے لئے۔ اس میں مرد اور عورت کا کوئی فرق نہیں ہے۔

بعض مفسرین نے تصریح کی ہے کہ یہ تصور ان کا انہی چوپایوں سے متعلق تھا جن کا کھانا وہ حرام سمجھتے تھے جیسے بحیرہ اور سائبہ۔^[۲]
”چوپایوں اندر“ کے معنی ایک روایت کے مطابق دودھ کے ہیں^[۳] اور دوسری روایت کے مطابق پیٹ کے بچے مراد ہیں۔ بعد کے جملہ سے کہ ”اگر مردار ہو“ اس دوسرے مفہوم کو تقویت پہنچتی ہے کیونکہ یہاں سب ہی کے نزدیک پیٹ کے بچے مراد ہیں۔^[۴]

قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَحَرَّمُوا مَا رَزَقَهُمُ اللَّهُ
افْتِرَاءً عَلَى اللَّهِ ۗ قَدْ ضَلُّوا وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿۱۴۰﴾

”بلاشبہ گھائے میں ہیں جنہوں نے اپنے بچوں کی جان لی نادانستہ حماقت سے اور حرام سمجھ لیا اسے جو اللہ نے انہیں عطا کیا تھا اللہ پر غلط باتیں منڈھ کر۔ بے شک وہ گمراہ ہوئے اور انہوں نے سیدھا راستہ اختیار نہیں کیا“^[۵]

[۱] لا یجلبون ذلک الا لعین قام بخدمة اصنامهم من الرجال دون النساء (مجمع البیان)

[۲] هذه الانعام المحرّمات هي العائبات والبجائر (جلالین)

[۳] یعنی البیان البجائر والسیب (مجمع البیان)

[۴] معنا وان كان حنین الانعام میتة (تبیان)

[۵] قتلوا اولادهم بالواد (جلالین)

اولاد کشتی کی مذمت

بچوں کی جان لینے سے مراد وہی ”ذختر کشتی“ کی رسم ہے جسے جاہل عربوں نے قائم کر رکھی تھی [۱] اور چونکہ اس کا محرک ان کے خیال میں ایک بڑا مستحسن جذبہ یعنی شرافت اور حفظ ناموس کا خیال رکھا، اس لئے خالق نے ان کے اس فعل کو ”شعوری“ اور ”ارادی“ گناہ قرار نہیں دیا بلکہ اس کا سبب ”حمالت“ اور ”بے عملی“ کو قرار دیا۔

اس کے بعد ارشاد ہوا ہے کہ ”حرام سمجھ لیا اسے جو اللہ نے انہیں عطا کیا تھا“..... یہ گزشتہ بات کا تتمہ بھی ہو سکتا ہے یعنی یہ اولاد اللہ نے عطا کی تھی اور یہ اس کی نعمت تھی مگر وہ اپنی جہالت سے اپنے کو اس سے محروم کر لیتے ہیں۔ [۲]
اور بہت ممکن ہے کہ اس سے مراد وہی بحیرہ اور سائبہ ایسی غذائیں ہوں جنہیں انہوں نے حرام قرار دے لیا تھا [۳] جس کا تذکرہ اس کے قبل کی آیتوں میں تھا۔

میرے خیال میں اس ذکر کے بعد یہ فقرہ کہ اَفْتِرَاءٍ عَلَى اللَّهِ اللہ پر غلط بات منڈھ کر، یہ اسی دوسرے احتمال کو تقویت دیتا ہے۔ اس لئے لڑکیوں کا زندہ درگور کرنا ان کے ایک ذاتی تصور پر مبنی تھا کہ وہ اسے لڑکیوں کی عصمت و عفت کے تحفظ کا ذریعہ سمجھتے تھے اور اسے مستقبل کی آبروریزی سے حفاظت کا سامان کہتے تھے۔ وہ ”سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ“ یعنی بے شعوری اور لاعلمی کا نتیجہ تو ہے مگر اَفْتِرَاءٍ عَلَى اللَّهِ نہیں ہے کیونکہ وہ اسے کسی حکم الہی پر مبنی قرار نہیں دیتے تھے مگر ہاں جانوروں کو جو انہوں نے حرام کیا تھا تو اسے ایسا سمجھ رکھا تھا اور کہتے تھے کہ ان کا کھانا اللہ کی طرف سے ممنوع ہے۔ حالانکہ کسی کتاب سماوی میں اللہ کا کوئی حکم ایسا موجود نہ تھا تو یہ ان کا کہنا بلاشبہ اَفْتِرَاءٍ عَلَى اللَّهِ کی حیثیت رکھتا تھا۔

وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَ جَنَّاتٍ مَّعْرُوسَاتٍ وَغَيْرٍ مَّعْرُوسَاتٍ وَالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا
أُكْلُهُ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَغَيْرٍ مُتَشَابِهٍ ط كُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ
وَأَتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ ۗ وَلَا تَسْرِفُوا ۗ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ﴿۱۳﴾

”اور وہ وہی ہے جس نے پیدا کئے گئے باغ، وہ بھی جو ایسی بیلوں کے ہیں جو (بانسوں وغیرہ کی مدد سے، اونچی کی جاتی ہیں اور وہ بھی جو اونچی نہیں کی جاتیں [۴] اور کھجور کے درخت اور طرح طرح کی کھیتی اور زیتون اور انار، جو ملتے جلتے ہوئے بھی ہیں اور نہیں بھی ملتے جلتے ہیں [۵] جب یہ چیزیں پھلیں تو ان کے پھلوں میں سے کھاؤ اور اس کے

[۱] حرّ موا مارز قھم اللہ حماد کر (جلالین)

[۲] حرّ موا مارز قھم اللہ حماد کر (جلالین)

[۳] یعنی الانعام والحرف الذین یزعمون انہا حجر (مجمع البیان)

[۴] مرفوعات بالذعائم وغیرہ معروضات... یعنی ماخرج من قبل نفسه من انواع الاشجار (مجمع البیان) بوستانہای برداشتنہ

شده بر پایہا بوستانہای غیر برداشتنہ شده بر پایہا (شاکولی اللہ)

[۵] متشابه ہا حرّ قھما وغیرہ متشابهہ مطعہا (جلالین)

گاٹنے کے وقت جو اس میں کا واجب الادا حق ہے وہ ادا کر دو [۱] اور حد سے آگے نہ بڑھو، یقیناً وہ حد سے آگے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔“

”واجب الادا حق“ سے مراد حق مساکین ہے جو زکوٰۃ کے وجوب سے پہلے کوئی تعین نہ رکھتا تھا اور اس فریضہ کے بطور قانون نافذ ہونے کے بعد اس کی مقدار مقرر ہو گئی ہے کہ وہ دسواں یا بیسواں حصہ ہے جس کی تفصیل کتب فقہیہ میں درج ہے۔

آخر میں جو کہا گیا ہے کہ ”حد سے آگے نہ بڑھو“ یہ حد سے بڑھنا حق مساکین کے نکالنے میں بھی ہو سکتا ہے کہ انسان سب لٹا دے اور گھر والوں کے لئے کچھ رکھے ہی نہ اور اپنے صرف میں لانے سے بھی متعلق ہو سکتا ہے کہ انسان فضول خرچیوں میں اڑا دے اور حقوق مساکین دے ہی نہیں اور زکوٰۃ وصول کرنے والوں سے بھی متعلق ہو سکتا ہے کہ حقوق مالیہ کے وصول کرنے میں ان کے ساتھ سختی کرنے میں حد سے قدم آگے نہ بڑھاؤ۔ [۲]

وَمِنَ الْأَنْعَامِ حَمُولَةٌ وَفَرَسًا ۖ كُلُوا مِنَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوبَ

الشَّيْطَانِ ۖ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿۳۲﴾

”اور چوپایوں میں سے بار برداری والے اور زمین پر بچھے ہوئے کھاؤ اس سے جو اللہ نے تمہیں روشنی عطا کی ہے اور شیطان کے قدم بقدم نہ چلو یقیناً وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔“

یہ گزشتہ آیات ہی کے سلسلہ سے ہے یعنی اللہ نے ایسے ایسے باغ پیدا کئے تمہاری غذا کے لئے اور یہ جانور بھی پیدا کئے تمہارے فائدہ کے لئے۔

”زمین پر بچھے ہوئے“ سے ایک مطلب یہ سمجھا گیا ہے کہ وہ قابل ذبح ہیں کہ انہیں تم زمین پر لٹا کر ذبح کرتے ہو۔ [۳]

اور یہ بھی سمجھا گیا ہے کہ اس سے نیچے قدم والے جانور مراد ہیں جیسے بکری، بھینٹ وغیرہ جو اپنے قدم و قامت کی پستی کی وجہ سے زمین سے لگے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ [۴]

اور یہ بھی مفہوم لیا گیا ہے کہ چوپایوں سے دونوں فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ ان کی پشت بار برداری کے کام آتی ہے اور ان کے اون اور بالوں سے بچھانے والی چادریں وغیرہ تیار کی جاتی ہیں۔ [۵]

آخر میں پھر مشرکین کی ان پابندیوں کے خلاف تشبیہ ہے جو انہوں نے ان جانوروں میں عائد کر رکھی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ یہ سب خدا

[۱]۔ بدھید زکوٰۃ اورا (شاہ ولی اللہ)

[۲]۔ الخطاب للجمیع بان لایسرف رب المال فی الاعطاء والامام فی الاخذ واصرف ذلك الی غیر مصارفه وهذا اعم قائدہ (مجمع البیان)

[۳]۔ بر زمین غلطانند بجهت ذبح (شاہ ولی اللہ)

[۴]۔ زمین کو لگے ہوئے (شاہ فیح الدین) کالابل الصغار والغنم سمیت فر شالا ذہا کالفرش للارض لدنوہا منها (جلالین)

[۵]۔ منها ما یتخذ من ادبارھا واصوافھا ما یفرش ویبسط عن ابی علی الجبائی (مجمع البیان)

نے تمہارے لئے پیدا کیا ہے تو جو اللہ نے رزق تمہیں عطا کیا ہے، اس میں سے کھاؤ اور بلا وجہ اپنے اوپر پابندیاں عائد کر کے کفرانِ نعمت کے مرتکب نہ ہو کہ یہ بھی شیطان کی ایک کارستانی ہے جس سے وہ تمہارے لئے دنیا اور آخرت میں محرومی کا سامان کرتا ہے تو ان بلا وجہ کی پابندیوں کو اپنے لئے قبول کرنا شیطان کے قدم بقدم چلنا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو صوفیا کی بعض ریاضتوں میں جو ترک حیوانات وغیرہ کی تعلیم ہے، وہ اس قرآنی ارشاد کی رو سے مستحسن سمجھی نہیں جاسکتی۔

ثُمَّ نِيَّةَ أَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّالِّينَ وَمِنَ الْمَعْرِضِينَ ۖ قُلْ إِلَّا الَّذِينَ كَفَرُوا حَرَّمَ ۖ
 أَمِ الْأُنثِيَيْنِ ۖ أَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ أَرْحَامُ الْأُنثِيَيْنِ ۖ نَبِيُّنِي يَعْلَمُ إِنَّ
 كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٣٣﴾ وَمَنِ الْإِبِلِ ۖ وَالضَّالِّينَ وَمَنِ الْبَقَرِ ۖ وَالضَّالِّينَ ۖ قُلْ إِلَّا الَّذِينَ كَفَرُوا
 حَرَّمَ ۖ أَمِ الْأُنثِيَيْنِ ۖ أَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ أَرْحَامُ الْأُنثِيَيْنِ ۖ أَمِ كُنْتُمْ
 شُهَدَاءَ ۖ إِذْ وَصَّيْتُمْ اللَّهُ بِهَذَا ۖ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا لِيُضِلَّ
 النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٣٤﴾

”آٹھ قسمیں: دو بھیڑ کی جنس سے اور دو بکری کی جنس سے۔ کہو کہ کیا اس نے دونوں قسم کے نروں کو حرام کیا یا دونوں قسم کی ماداؤں کو یا جو دونوں ماداؤں کے پیٹ میں ہو؟ مجھے کسی علم کی بنیاد پر بتاؤ اگر تم سچے ہو اور دو اونٹ کی جنس سے اور دو گائے بیل کی جنس سے۔ کہو کہ (ان میں) کیا اس نے دونوں نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں ماداؤں کو یا جو دونوں ماداؤں کے پیٹ میں ہو؟ کیا تم موجود تھے جب اللہ نے تمہیں یہ ہدایت کی تو کون ظالم ہوگا اس سے بڑھ کر کہ جو اللہ پر چھوٹی باتیں منڈھے تاکہ لوگوں کو بغیر کسی علم کے گمراہ کرے! بلاشبہ اللہ ظالم جماعت کے لئے منزل مقصود تک پہنچنے کا سامان نہیں کرتا۔“

یہ بھی اُنْثِيًا (پیدا کیا) کے تحت میں ہے جس کا سلسلہ قبل کی آیتوں سے چل رہا ہے [۱] اور یہ تمام رد و قدح انہی مشرکین کے مقابلہ میں ہے جنہوں نے ان جانوروں میں خواہ مخواہ کی پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔

چونکہ جوڑے میں ہر ایک دوسرے کا زوج کہلاتا ہے، اس لئے بھیڑ بکری وغیرہ کی تمام اقسام کے جوڑوں کو ثمانیۃ ازواج کے لفظ سے تعبیر کیا جو افراد کے لحاظ سے آٹھ ہیں لیکن ہمارے محاورے کے اعتبار سے جوڑوں کی تعداد چار ہوگی۔ [۲]

قُلْ لَا آجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَىٰ طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَنْ يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ

[۱]. تقدیرہ: وانشاء حمولۃ و فرشا ثمانیۃ ازواج (تبیان)

[۲]. معنای ثمانیۃ افراد... و قبیل معنای ثمانیۃ اصناف (مجمع البیان)

دَمًا مَسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقًا أُهْلًا لِيُغَيِّرَ اللَّهُ بِهٖ ۚ فَمَنْ

أَضْطَرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَإِنَّ رَبَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٣٥﴾

”کہیے کہ میں نہیں پاتا اس میں کہ جس کی میری طرف وحی اتاری گئی ہے کسی کھانے والے پر کوئی شے جس کا کھانا حرام ہو، سو اس کے کہ مردار ہو یا یا بہا ہوا خون یا سور کا گوشت کہ وہ بہت گندی چیز ہے یا غلط ذبیحہ جس پر اللہ کے سوا کوئی نام لیا گیا ہو۔ اب جو اضطراری حالت میں مبتلا ہو اور نہ باغی ہو، نہ حد سے تجاوز کرنے والا تو یقیناً تمہارا پروردگار بخشنے والا ہے، بڑا مہربان ہے۔“

چونکہ زیر بحث چندہ جانوروں کے اقسام تھے، اس لئے اس نوع میں جو حرام چیزیں ہیں، ان کا ذکر ہوا ہے۔ اس لئے طیور یا دریا کے جانوروں میں جو چیزیں حرام ہیں یا چوپایوں میں جو درندہ قسم کے ہیں وہ اس میں داخل نہیں ہیں۔^[۱]

بہر حال اس صورت میں یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ ان چیزوں کی حرمت قرآن سے نہیں، سنت سے ثابت ہے^[۲] جس کے بغیر تنہا قرآن ماخذ احکام شرعیہ ہونے کے لئے کافی نہیں ہے۔

”خون“ کے ساتھ ”بہا ہوا“ کی قید اس حکم شرعی پر منطبق ہوتی ہے کہ خون متعارف بہنے کے بعد ذبیحہ میں جو خون اجزائے گوشت میں پیوست رہ جائے، وہ خون طاہر و حلال ہے۔

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفْرِ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا

عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۗ

ذٰلِكَ جَزَاؤُهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۗ وَإِنَّا لَصٰدِقُونَ ﴿١٣٦﴾

”اور جنہوں نے یہودیت اختیار کی، ان پر ہم نے حرام کر دیا ہر ناخن دار جانور^[۳] اور گائے نیل اور بھیڑ میں سے حرام کر دیا ان پر چربی کو سو اس کے کہ جو ان کی پشت پر ہو یا آنتوں میں ہا جو ہڈی سے ملی ہوئی ہو۔ یہ انہیں سزا دی ہم نے ان کی بغاوت کی اور یقیناً ہم سچے ہیں۔“

جماعت یہود کے لئے یہ سخت قسم کے احکام منجانب اللہ تھے ان کی سابقہ بد اعمالیوں کی سزا میں جیسا کہ دوسری جگہ ہے:

[۱] انما هذه الآية رد على ما احدثت العرب او حرمت (علی بن ابراہیم) مراد حصر اضافی است بہ نسبت بہ بیتہ الانعام... سگ و شیرو بازو وغیر ان اگر چہ حرام است از بہیمة الانعام نیست (شاہ ولی اللہ)

[۲] یلحق بما ذکر بالسنة كل ذی ناب من السباع و مغلّب من الطیر (جلالین) قبیل ان ماعدا حرم فیما بعد بالمدينة و السورة مکیة (تبیان)

[۳] هو مالہ یفرق بین اصابعہ کالابل و النعام (جلالین) یعنی مثل شتر و شتر مرغ (شاہ ولی اللہ) یعنی اونٹ ان پر حرام تھا (موضع القرآن)

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنِ سَبِيلِ اللَّهِ كَيْفِيًّا ﴿١٤٥﴾ (سورة

نساء)

اس بیغی کی تشریح ہماری قدیم تفسیر میں یہ آئی ہے کہ رؤسائے یہود نے ان چیزوں کو ان کے مرغوب ہونے کی وجہ سے غریبوں کے لئے ممنوع قرار دے دیا تھا تو اللہ نے اس کی سزا دیدی کہ ان پر بھی ان چیزوں کے استعمال کو حرام قرار دے دیا۔^[۱]
اب یہ کہنے ہی سے کہ یہ چیزیں یہود پر ان کی بد اعمالیوں کی وجہ سے بطور سزا حرام کی گئی تھیں ظاہر ہو جاتا ہے کہ اب شرع محمدی میں یہ چیزیں حلال ہیں کیونکہ ان میں ذاتا کوئی خرابی نہیں ہے۔^[۲]

فَإِنَّ كَذَّبُوكَ فَقُلْ رَبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسِعَةٍ ۖ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ عَنِ الْقَوْمِ

الْمُجْرِمِينَ ﴿١٤٦﴾

”اب اگر یہ آپ کو جھٹلائیں گے تو کہہ دیجئے کہ تمہارا پروردگار بڑی وسیع رحمت والا ہے۔ ہاں اس کا عذاب مجرموں کی جماعت سے ہٹایا نہیں جاسکتا۔“

ہمارے جذبات کا تقاضا یہ ہے کہ تکذیب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کرنے والوں کے لئے بس آخری ہی جملہ آنا چاہیے اور وہ بھی یوں کہ اس کا عذاب ان کم بختوں سے ہٹایا نہیں جاسکتا مگر یہ قرآن کی رواداری نہیں تو کیا ہے کہ اتنے سخت مجرموں کے تذکرہ کے بعد بھی خالق کی وسعت رحمت کو یاد دلایا جاتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان تکذیب کرنے والوں کے لئے بھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کام رحمت سے مایوس کرنا نہیں ہے۔ جب بھی ان کے ضمیر میں عرفان حق کی ٹرپ پیدا ہو جائے اور وہ تکذیب کے راستے سے ہٹ جائیں تو اللہ کی رحمت ان کا خیر مقدم کرنے کے لئے موجود ہے۔ ہاں (اگر آخر دم تک اپنی مجرمانہ روش پر قائم رہیں تو ان کے لئے آخر والا جملہ ہے جس کو ضمیر عائد کر کے براہ راست ان سے متعلق کرنے کے بجائے ایک عام اصول کے طور پر ارشاد ہوا کہ ”اس کا عذاب مجرموں سے ہٹایا نہیں جاسکتا یعنی جو آخر دم تک مجرمانہ روش پر قائم رہیں، ان کے لئے عذاب کے سوا دوسرا انجام کیا ہو سکتا ہے؟!

ہم ان دونوں فقروں کا باہمی تعلق ایسا ہی محسوس کرتے ہیں لیکن دوسرے مفسرین میں کوئی یہ مطلب کہتا ہے کہ اس کی رحمت کے عام ہونے کے باوجود اس کا عذاب مجرموں سے نہیں ہٹ سکتا^[۳] اور کوئی یہ کہتا ہے کہ اب تک تم عذاب سے اس کی وسعت رحمت کی وجہ سے بچے رہے مگر یہ نہ سمجھو کہ تم اس کے عذاب سے تا آخر بچنے ہی رہو گے۔^[۴]

[۱]. كان ملوك بني اسرائيل يمنعون فقراء هم من اكل لحم الطير والشحوم فحرم الله ذلك عليهم بيغيبهم على فقرائهم (علي بن ابراهيم)

[۲]. هذه الاشياء وان كان الله تعالى حرما على اليهود في شرع موسى ﷺ فقد نسخ تحرهما على لسان محمد صلى الله عليه واله و اباحها (تبيين)

[۳]. معناه ان احدا لا يتمن من رد عقاب الله عن العصاة المستحقين العقاب مع انه تعالى ذورحمته واسعته (تبيين)

[۴]. یعنی رحمت کی سائی سے اب تک تم بچے ہو لیکن نہ جانو کہ عذاب پھر گیا (موضح القرآن)

ہماری نظر میں الفاظ قرآن میں دونوں فقروں کے ورود کا انداز ان دونوں مفہوموں سے اجنبیت رکھتا ہے۔

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَمْنَا مِنْ شَيْءٍ ط كَذَلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتَّى ذَاقُوا بَأْسَنَا ط قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ط إِنَّ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تُخْرِصُونَ ﴿١٧٨﴾
قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۗ فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿١٧٩﴾

”نزدیک ہے وہ وقت کہ مشرک لوگ کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم مشرک نہ ہوتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کوئی چیز اپنی طرف سے حرام کرتے۔ ایسا ہی جھٹلایا انہوں نے جو ان کے پہلے تھے، یہاں تک کہ ہمارے عذاب کا مزہ چکھا۔ کہیے کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے کہ تم ہمارے لئے اسے نکالو۔ تم تو نہیں پیروی کرتے مگر گمان کی اور نہیں کرتے مگر اٹکل پچو باتیں۔ کہہ دیجئے کہ یہ تو اللہ کی زبردست دلیل ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ زبردستی، چاہتا تو سب کو سیدھے راستے پر لگا دیتا۔“

یہ انسان کی وہ کمزوری ہے یا دھاندلی جو اکثر سست اعمال یا بد اعمال افراد کی زبان سے ظاہر ہوتی ہے کہ ہماری قسمت میں یہی لکھا تھا اگر اللہ نہ چاہتا تو ہم ایسا کیوں کرتے۔ مشرکین اسے مسلمانوں کے سامنے بطور حجت پیش کرتے تھے کہ ہماری یہ سب باتیں اللہ کو ناپسند ہوتیں تو وہ قادر مطلق ہے۔ وہ ہم کو اس سب سے روک نہ دیتا!

مشرکین کے بدعات اور ان کی مذمت

حقیقت امر یہ ہے کہ اس میں مغالطہ ہے۔ ایک چیز رضا اور پسندیدگی ہے اور ایک یہ کہ اپنے نظام حکمت کی بنا پر وہ جبر سے کام لینا نہیں چاہتا، اس لئے جو انسان کرے، اسے کرنے دیتا ہے۔

مشرکین مشیت کے وہ معنی لیتے تھے کہ اللہ اسے پسند کرتا ہے۔ قرآن نے اس کی رد کی اور کہا کہ اگر وہ پسند کرتا تو پھر اس پر سزا کیوں دیتا؟! اور پھر پسند کے ثبوت کے لئے تو اس کی طرف سے کوئی دلیل ہونا چاہیے۔

پہلی بات کو اس آیت میں ان الفاظ میں کہا گیا ہے کہ ”تمہارے ہی ایسے افعال قبل والوں نے کئے تھے اور اس پر انہیں ہمارے عذاب کا مزہ چکھنا پڑا“ یہ عذاب کا ہونا اس کی دلیل ہے کہ وہ اسے پسند نہیں ہیں۔

شاہ عبدالقادر صاحب نے اسے اس طرح لکھا ہے کہ:

”کافروں کا شبہ ہے کہ اگر ہمارے کام اللہ کو پسند نہ ہوتے تو ہم کو کرنے نہ دیتا۔ اس کا جواب فرمایا کہ اگلوں کو گناہ پر کیوں پکڑا؟ معلوم ہوا کہ وہ بھی ایک مدت ناپسند کام کرتے تھے، اللہ نہ پکڑتا تھا، آخر پکڑا“۔ (موضح القرآن)

پھر دوسری بات کہی ان الفاظ میں کہ:

”یا تمہارے پاس کوئی علم ہے کہ ہمارے لئے اسے نکالو“ یعنی خدا کی جو کتابیں اس سے پہلے نازل ہوئی ہیں، ان میں کہیں بتاؤ کہ تمہارے افعال کی کوئی سند ہے؟“ [۱]

جب عذاب آنے سے یہ ثابت ہو گیا کہ وہ ان افعال کو پسند نہیں کرتا تو اسی کو پھر انسانوں کے فاعل مختار ہونے کے ثبوت میں پیش کر دیا گیا کہ اگر نظام جبر کا فرما ہوتا تو خالق کی ناپسند باتوں کا وقوع ہی عالم میں نہ ہوتا۔ یہ کفر و شرک اور معصیت کا وقوع خارج میں جو بالمشاہدہ ہے، یہ خود اس کا ثبوت ہے کہ خالق کی جانب سے بندے اپنے افعال میں مجبور نہیں ہیں بلکہ مختار خلق کئے گئے ہیں اور اسی لئے وہ اپنے اختیار سے کبھی اس کا پسندیدہ راستہ اختیار کرتے ہیں تو جڑا پاتے ہیں اور کبھی اس کا ناپسند راستہ تو سزا پاتے ہیں۔

انسوس ہے کہ سواد اعظم کے علماء چاہے زبان سے جبر کا اقرار نہ کریں مگر اختیار کا تصور ان کے دل و دماغ میں جاگزیں نہیں ہے، اس لئے ایسے مقامات پر ان کے بیانات میں عجیب ٹولیدگی پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ اس ٹکڑے کی تشریح شاہ عبدالقادر صاحب نے عجیب فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں:

”یہ تمہاری غلطی ثابت ہو چکی کہ دلیل نہیں رکھتے تو یہی تو علامت ہے کہ تمہاری قسمت میں ہدایت نہیں ہے۔“ (موضح القرآن)

ارے لیجئے! یہی تو مشرکین بھی کہہ رہے تھے کہ ہم مجبور ہیں۔ ہماری قسمت میں یہی تھا کہ ہم شرک کریں اور یہ غلط مسائل ایجاد کریں۔ اب ہر پھر کے آخر میں وہی بات صحیح نکلی تو ان کی دلیل پوری ہوئی یا اللہ سبحانہ کی؟ یہ تو کوئی ان کی رد نہ ہوئی بلکہ تائید ہو گئی نعوذ باللہ من ذلک۔

قُلْ هَلْ مَسَّ شُهَدَاءُ كُمْ الَّذِينَ يَشْهَدُونَ أَنَّ اللَّهَ حَرَّمَ هَذَا ۖ فَإِنْ شَهِدُوا فَلَا تَشْهَدُوا مَعَهُمْ ۗ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ ﴿۱۵۰﴾

”کہہ دیجئے کہ لاؤ [۱] اپنے ان گواہوں کو جو گواہی دیتے ہوں کہ اللہ نے اس کو حرام کیا ہے، اب اگر وہ گواہی دیں تو آپ ان سے پھر بھی متفق نہ ہوں [۲] اور پیروی نہ کیجئے ان لوگوں کے خیالات کی جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ اپنے پروردگار کا (دوسروں کو) برابر دار سمجھتے ہیں۔“

قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۗ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِنْ إِمْلَاقٍ ۗ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ۗ وَلَا تَقْرُبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَّنَ ۗ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ

[۱] یعنی نقلی از کتب الہی (شاہ ولی اللہ)

[۲] ہلم لفظ یتعدی تارة واخری لا یتعدی فاذا كانت، بمعنی ہا تو افاہا تتعدی... واذا كانت، بمعنی تعالیٰ ابنحو ہلم الینا فامہا لا تتعدی (تبیان)

[۳] یا عمداً اگر بفرض گواہی دھندا ایشان تو معترف مشو با ایشان (شاہ ولی اللہ)

اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ط ذَلِكُمْ وَصَّكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿١٥١﴾

”کیسے کہ آؤ! میں سناؤں [۱] جو کچھ تمہارے پروردگار نے تم پر پابندیاں عائد کی ہیں۔ یہ کہ تم اس کا کسی چیز کو شریک قرار نہ دو اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو اور اپنے بچوں کی فقر و فاقہ کے مارے [۲] جان نہ لو؛ ہم تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور انہیں بھی (دیں گے) اور جنسی غلط کاریوں کے پاس نہ جاؤ، چاہے وہ نمایاں ہوں اور چاہے پوشیدہ [۳] اور جس جان کی اللہ نے حرمت قرار دی ہے، اسے مارو نہیں مگر حق کے ساتھ۔ یہ وہ ہے جس کی اللہ نے تمہیں ہدایت کی ہے۔ شاید کہ تم عقل و شعور سے کام لو۔“

اپنی بد اعمالیوں کی ذمہ داری تقدیر پر رکھنا غلط ہے

”حق“ سے مراد مزائے شرعی ہے جیسے قصاص یا سنگسار کیا جانا۔

محرمات کی فہرست گنوانے میں جو ان کے مقابل حکم ہے، اسے پیش کیا گیا ہے یعنی شرک حرام ہے، اسے یوں کہا گیا کہ اس کا کسی چیز کو شریک قرار نہ دو۔ ماں باپ کے ساتھ بد سلوکی حرام ہے، اسے یوں کہا کہ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو اور اسی طرح آخر تک۔

وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ۖ وَأَوْفُوا
الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ ۖ لَا تَكْلَفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۖ وَإِذَا قُلْتُمْ
فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۖ وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا ط ذَلِكُمْ وَصَّكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ
تَذَكَّرُونَ ﴿١٥٢﴾

”اور یتیم کے مال کے پاس نہ پھٹو مگر ایسی صورت سے جو بہتر ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے کمال کی منزل تک پہنچے اور ناپ تول پوری کرو انصاف کے ساتھ۔ ہم کسی پر پابندی نہیں لگاتے مگر اس کی طاقت بھر اور جب بات کہو تو انصاف کرو، چاہے وہ عزیز کیوں نہ ہو [۴] اور اللہ کے عہد و پیمان کو پورا کرو۔ یہ وہ ہے جس کی اس کی طرف سے تمہیں ہدایت ہے، شاید کہ تم نصیحت قبول کرو۔“

یتیم کے کمال کی منزل تک پہنچنے سے مراد بالغ و راشد ہونا ہے [۵]

ناپ تول کے پورا کرنے کے حکم سے متصل یہ جو کہا گیا ہے کہ ”ہم کسی پر پابندی نہیں لگاتے مگر اس کی طاقت بھر“ اس کا مطلب یہ معلوم

[۱]. بخوانم (شاہ ولی اللہ)

[۲]. ڈرافلاس کے سے (شاہ فیح الدین)

[۳]. ای علانیہا و سرھا (جلالین) قال ابو جعفر رضی اللہ عنہ ما ظہر هو الزنا و ما بطن هو الخالة (تبیان)

[۴]. اگر چہ آن محکوم علیہ صاحب قرابت باشد (شاہ ولی اللہ)

[۵]. قال قوم انه لا حد له و انما المراد به حتى يكمل عقله و لا يكون سفیهاً یحجر علیہ (تبیان) و لهذا قوی و جوه (مجمع البیان)

ہوتا ہے کہ نادانستہ اگر کچھ کمی ہو جائے تو اس کی معافی ہے مگر جان کر ایسا نہ کرو۔^[۱]

جیسا کہ مولانا فرمان علی صاحب مرحوم نے لکھا ہے:

”اسی وجہ سے شریعت نے یہ بتا دیا کہ خریداریہ قصد کرے کہ میں دام زیادہ دوں اور چیز کم لوں، اور بیچنے والا یہ قصد کرے کہ میں دام کم لوں، چیز زیادہ دوں کیونکہ فریقین جب یہ قصد کریں گے تو ہرگز کسی کو کم نہ پڑے گا مگر اب تو وہ زمانہ ہے کہ اس کا الٹا ہوتا ہے“۔ (حاشیہ ترجمہ قرآن)

وَأَنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ فَاتَّبِعُوهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ

سَبِيلِهِ ۗ ذَلِكُمْ وَصَّيْكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۵۲﴾

”اور یہ کہ یہ میرا خاص راستہ ہے، اس کے ساتھ وہ سیدھا بھی ہے^[۲] تو اس کی پیروی کرو اور دوسرے راستوں کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہیں اس کے راستے سے تڑپتر کر کے ہٹا دیں^[۳] یہ ہے جو اللہ نے تم کو ہدایت کی ہے، شاید کہ تم ان خطرات سے بچو۔“

ثُمَّ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ تَمَامًا عَلَى الَّذِي أَحْسَنَ وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ

وَهَدْيًى وَرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُونَ ﴿۱۵۳﴾

”پھر یہ کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی نعمت تمام کرنے کا ذریعہ اس پر جو نیک کردار ہو^[۴] اور تفصیل ہر چیز کی اور صحیح رہنمائی اور رحمت بنا کر، شاید کہ وہ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضری پر ایمان لائیں“۔

”پھر“ کا لفظ ہمیشہ ترتیب واقعہ ہی کے لئے نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات ترتیب ذکر کی کے لئے ہوتا ہے یعنی یہ تو سن چکے۔ اب یہ سنو۔ اگر یہ آیت شان نزول میں اسی محل پر اتری ہوئی ہو تو یہاں پر لفظ ”پھر“ کے یہی معنی ہیں۔ اس کی نظیر نوح البلاغہ کے پہلے ہی خطبہ میں ہے جہاں خلقت زمین وغیرہ کے ذکر کے بعد ارشاد ہوا ہے: ثُمَّ أَنْشَأْنَا سُبْحَانَہٗ، فَتَقَّ الْأَجْوَاءِ، وَشَقَّ الْأَرْجَاءِ، وَسَكَّاءِ كَالْهَوَاءِ۔ حالانکہ یہ چیزیں خلقت میں اس کے قبل والی چیزوں پر مقدم ہیں مگر بیان بعد میں ہو رہی ہیں۔ اس لئے ثُمَّ کا لفظ لایا گیا ہے۔

کچھ اہم محرّمات شرع کی فہرست

شاہ ولی اللہ صاحب نے حالانکہ ترجمہ ایسا کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ثم ترتیب ذکر کی کے لئے ہے^[۵] مگر حاشیہ میں اسے

[۱] لما كان التعديل في الوزن والكيل على التحديد... يتعذر بين سبحانه انه لا يلزم في ذلك الا الاجتهاد في التحوز من النقصان

(مجمع)

[۲] نصب مستقيماً على الحال والقائد ان هذا صراطى وهو مستقيم فاجتمع له الله ان ولورفع مستقيماً ان افاد ذلك (تبيين)

[۳] متفرق کریں گی تم کو راہ اس کی سے (شاہ فنج الدین) جدا کنندہ شمار ازراہ خدا (شاہ ولی اللہ)

[۴] تمنا مال اللغۃ (جلالین) پورا کرنا نعمت کا اور اس شخص کے کہ نیکی کرتا ہو (شاہ فنج الدین)

[۵] بلای حی گویم کہ (شاہ ولی اللہ)

”ترتیب واقعہ“ کے معنی میں قرار دینے کی کوشش کی ہے، اس طرح کہ قبل کی آیات میں جو آیا تھا: قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلْحٰلِحِ ”آؤ! میں تمہیں سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے کیا حرام کیا ہے“ یہ حرام کرنا روز ازل کا واقعہ ہے یعنی اللہ نے ہمیشہ سے ان چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ اور ”پھر“ یعنی اس کے بعد اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو توریت عطا کی۔ [۱]

ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر نے اس بارے میں ان کی پیروی کی ہے [۲]۔

مگر معلوم نہیں کہ جب جناب مترجم کے نزدیک یہ معنی ظاہر ہیں تو انہوں نے ترجمہ اس طرح کیوں کیا؟ ہمارے نزدیک یا تو یہ آیت سلسلہ نزول میں اس مقام کی ہے ہی نہیں، پھر اس کا ربط سابق آیتوں سے قائم کرنا ضروری ہی نہیں۔ اگر وہ کسی اور محل پر نازل ہوئی ہے تو ممکن ہے وہاں وہ ترتیب واقعہ ہی کے عنوان سے ہو لیکن اگر یہ آیت یہیں پر نازل ہوئی ہے تو پھر اسے ترتیب ذکر کیلئے قرار دینا زیادہ مناسب ہے۔ [۳] علامہ طبرسی نے اس کے مفہوم میں چار احتمالوں کا ذکر کیا ہے۔ تین ترتیب ذکر پر مبنی ہیں اور ایک میں آیت کو اسی مقام پر نازل شدہ مان کر ترتیب واقعہ قرار دی گئی ہے، اس طرح کہ اس کے پہلے جناب ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ میں جو آیا تھا: وَهَبْنَا لَهُ اسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ ”ہم نے انہیں اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام عطا کئے“ اس پر عطف کر کے کہا گیا ہے کہ ”پھر ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا کی“۔

”ہر چیز کا بیان“ اس میں عموم و شمولیت تناسب موضوع کے لحاظ سے ہے یعنی جن چیزوں کا دین و شریعت سے تعلق ہے اور جس جس چیز کی ضرورت تھی، اس میں ہر شے کا بیان آ گیا تھا [۴] اس کو غیر متعلق اشیاء یعنی دنیا کی ہر چیز سے متعلق سمجھنا ذوق سلیم کا تقاضا نہیں ہے۔

وَهَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوهُ وَاتَّقُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿۱۵۵﴾ أَنْ تَقُولُوا إِنَّمَا أَنْزَلَ الْكِتَابَ عَلَى طَائِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۖ وَإِن كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغَفْلِينَ ﴿۱۵۶﴾ أَوْ تَقُولُوا لَوْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْهِ الْكِتَابَ لَكُنَّا أَهْدَىٰ مِنْهُمْ ۖ فَقَدْ جَاءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ ۖ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن كَذَّبَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ۗ سَنَجْزِي الَّذِينَ يَصْدِفُونَ عَنَّا أَسْوَأَ الْعَذَابِ مِمَّا كَانُوا يَصْدِفُونَ ﴿۱۵۷﴾

”اور یہ ایک بڑی بابرکت کتاب ہے جسے ہم نے اتارا ہے۔ اب اس کی پیروی کرو اور نجات کا سامان کرو کہ رحمت

[۱] مترجم گوید ظاہر نزدیک این بندہ آنست کہ حرام گردانیدیم اشیاء مذکورہ ادر ازل و بر قوم نوح دادیم موسیٰ را کتاب و الله اعلم (شاه ولی الله)

[۲] اس سے معلوم ہوا کہ پہلے حکم ہمیشہ سے جاری رہے، پیچھے توریت اتزی تو مشرح اور مفصل ہوئی (موضح القرآن)

[۳] ثم لترتيب الاخبار (جلالین)

[۴] بیان لكل شیء یحتاج الیه فی الدین (جلالین)

تمہارے شامل حال ہو [۱] لیکن تم ایسا نہ کہو [۲] کہ کتاب بس ہمارے پہلے کی دو امتوں پر نازل ہوئی، اگرچہ ہم ان کی تعلیم سے [۳] (بھی) انجان ہی رہے) تھے یا کہو کہ اگر ہم پر کتاب نازل ہوتی تو ہم ان سے زیادہ راہ راست پر ہوتے تو اب آگئی تمہارے پاس کھلی ہوئی دلیل تمہارے پروردگار کی طرف کی [۴] اور ہدایت اور رحمت۔ اب اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا کہ جو آیات الہی کو جھٹلائے اور ان سے روگردانی کرے۔ ہم عنقریب انہیں کہ جو روگردانی کرتے ہیں ہماری آیتوں سے برے عذاب کی سزا دیں گے اس پاداش میں کہ وہ روگردانی کرتے تھے۔“

پہلے کی دو امتیں یعنی یہود و نصاریٰ جو توریت اور انجیل کی طرف نسبت رکھتے ہوئے اہل کتاب کہے جاتے ہیں۔ [۵]

**هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلَائِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ رَبُّكَ أَوْ يَأْتِيَ بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ ط
يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِنْ قَبْلُ أَوْ**

كَسَبَتْ فِي إِيمَانِهَا خَيْرًا ط قُلِ الْاُنْتِظِرُوا اِنَّا مُنْتَظِرُونَ ﴿۵۹﴾

”کیا انہیں سو اس کے کچھ اور انتظار ہے کہ فرشتے خود ان کے پاس آئیں یا تمہارا پروردگار بذات خود آجائے یا تمہارے پروردگار کی بعض مخصوص نشانیاں [۶] آجائیں، جس دن وہ مخصوص نشانیاں آجائیں گی، اس دن کسی کو جو پہلے ایمان نہ لایا ہو یا اس نے اپنے ایمان میں کچھ بھلائی کے کام نہ کئے ہوں [۷] ایمان لانا فائدہ نہ دے گا۔ کہیے کہ انتظار کرو بلاشبہ ہم بھی منتظر ہیں۔“

”کیا انہیں سو اس کے کچھ اور انتظار ہے“ یہ استنفہام انکاری ہے یعنی سو اس کے کچھ اور انتظار نہیں ہے [۸] بس اس کا انتظار ہے۔

مطلب اس کا شاہ عبدالقادر صاحب کے لفظوں میں یہ ہے کہ:

”اللہ کی طرف سے جو حدیسی ہدایت کی، سو آپسکی ہے اور شرع اور کتاب تب بھی نہیں مانتے تو اب منتظر ہیں کہ اللہ آپ آوے یا قیامت کے نشان دیکھیں، تب یقین کریں جب قیامت کا نشان آوے گا یعنی آفتاب مغرب سے نکلے، تب کافر کا ایمان اور عاصی کی توبہ قبول نہ

[۱]. ای لکی ترجمہ (مجمع البیان)

[۲]. کراہة تقولوا (مجمع)

[۳]. قراءہ تبہم (جلالین) بودیم ما از تلاوت ایشاں بے خبر (شاہ ولی اللہ)

[۴]. ای حجة واضحة ودلالة ظاهرة (مجمع البیان)

[۵]. اليهود والنصارى (تبیان)

[۶]. التي قضطوهم الى المعرفة ويزول التكليف عندها (مجمع البیان)

[۷]. يانفع ندهنفس را کہ کسب نہ کردہ بود ایمان خود عمل خیر (شاہ ولی اللہ)

[۸]. ما ينتظر المکتابون (جلالین)

ہوگی۔ (موضح القرآن)

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَأَسْتَمُ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ط إِيْمًا أَمْرُهُمْ إِلَى
اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿٥٩﴾

”یقیناً وہ جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈال دیا اور بہت سے گروہوں میں بٹ گئے [۱] آپ کو ان سے کوئی سروکار نہیں ہے، ان کا معاملہ بس اللہ کے سپرد ہے، پھر وہ انہیں بتلائے گا کہ وہ کیا کرتے رہتے تھے۔“

”آپ کو ان سے کوئی سروکار نہیں ہے“ اس کا ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ان کے باہمی اختلافات میں کوئی دخل نہ دیجئے [۲] اور یہ بھی کہ اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔ آپ سے اس کا کوئی محاسبہ نہ ہوگا [۳] اور یہ بھی کہ آپ کا ان میں سے کسی گروہ سے بھی تعلق نہیں ہے [۴] ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی بھی معنی کے لحاظ سے وہ کوئی ایسا حکم نہیں ہے جو قائم و برقرار سمجھا جاسکے لیکن بعض مفسرین کے ذوق جہاد کی شدت پر یہ حکم بار ہوا ہے تو انہوں نے لکھ دیا کہ یہ حکم آیت ”سیف“ سے منسوخ ہو گیا [۵] ایسے ہی شارحین و مفسرین قرآن وہ ہیں جو مخالفین اسلام کے اس الزام و تقویت دیتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا یا گیا۔

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا ۖ وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى إِلَّا مِثْلَهَا
وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٦٠﴾

”جو نیک کام کرے اسے دس گنا اجر ملے گا اور جو برا کام کرے تو اسے بس اتنی ہی سزا ملے گی، اور ان پر ظلم نہیں ہو گا۔“ بھلائی کے بدلے میں زیادہ بھلائی احسان ہے اور تفضیل و کرم۔ یہ خلاف عدالت نہیں ہے [۶] لیکن برائی کے بدلے میں زیادہ پاداش خلاف عدل ہے، جو شان الہی کے خلاف ہے۔

قُلْ إِنِّي هَدَيْتِي رَبِّي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۖ دِينًا قِيمًا مِّلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۗ
وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٦١﴾

”کہیے کہ بلاشبہ مجھے میرے پروردگار نے ایک بڑے سیدھے راستے کی طرف (خاص طور سے) رہنمائی کی ہے،

[۱]. گروہ در گروہ شدن (شاہ ولی اللہ)

[۲]. فلا تعرض لهم (جلالین)

[۳]. یعنی از تو مواخذة نہ خواہند کرد

[۴]. انہ علی العبادۃ التامة من ان یجتمع معهم فی معنی مناطیم الفاسدة (تبیان)

[۵]. ہذا منسوخ بأیہ السیف

[۶]. زیادة الثواب علی الجزاء تفضل واحسان فجاز ان زید علیہ (تبیان)

اس صحیح و درست [۱] دین کی طرف جو خالص و مخلص ابراہیم کا مسلک ہے [۲] اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھے۔

فرقہ بندی کی مذمت

ان آیات سے ایک مفہوم یہ بھی نکلتا ہے کہ خداوند قدوس کا دین فرقہ بندی سے پاک و صاف ہے۔

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۳۲﴾ لَا شَرِيكَ لَهُ ۗ

وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ﴿۱۳۳﴾

”کہیے کہ میری نماز اور میری سب عبادتیں [۳] اور میری زندگی اور میری موت خاص اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور اسی پر میں مامور ہوں [۴] اور میں سرطاعت جھکانے والوں میں سب سے پہلا ہوں“۔ [۵]

”سب سے پہلا“ باعتبار تقدم زمانی لیا جائے تو اول مخلوق ہونے کے ساتھ بالکل سازگار ہے جیسا کہ اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللَّهُ نُورِ حَمِي سے مستفاد ہے۔ پھر معلوم نہیں سواد اعظم کے بعض مفسرین نے اس میں قید لگانے کی کیا ضرورت محسوس کی ہے کہ اس امت میں پہلا سرطاعت جھکانے والا ہوں۔ [۶]

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اول المسلمین کے معنی ہوں، اول درجہ کا سرطاعت جھکانے والا جس کی نظیر قرآن میں پہلے آچکی ہے، تب بھی کوئی قید لگانا اس میں بلاوجہ ہے۔

قُلْ أَعْبُدُوا اللَّهَ أَيْبَغَى رَبَّآ وَهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ۗ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا ۗ

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى ۗ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ مَرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنتُمْ

فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿۱۳۴﴾

”کہیے کہ کیا اللہ کے سوا کوئی پروردگار تلاش کروں حالانکہ وہ ہر چیز کا پروردگار ہے۔ کوئی شخص بھی برائی نہیں کرتا مگر

[۱] استغنی بجزی ذکر الفعل عن ذکره فقال دینا قیما کہا قال: اهدنا الصراط المستقیم فیما مستقیما (جلالین)

[۲] مراد میدانہ ازین درست کیش ابراہیم را (شاکہ ولی اللہ)

[۳] عبادتی من حج و غیرہ (جلالین)

[۴] بایں توحید فرمودہ شد مرا (شاکہ ولی اللہ)

[۵] من نختین مسلمانم (شاکہ ولی اللہ)

[۶] اول المسلمین من ہذا الامۃ (جلالین)

یہ کہ وہ خود اپنا نقصان کرتا ہے اور کوئی دوسرے کے گناہ کا ذمہ دار نہیں ہے۔ پھر تم سب کا رجوع اللہ کی طرف ہوتا ہے تو وہ تمہیں بتائے گا وہ سب جس میں تم آپس میں اختلاف رکھتے تھے۔“

کافر و گناہ گار کا وجود انسان کے فاعل مختار ہونے کا ثبوت ہے

پہلے خدا کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے معبود بنانے کی رکعت کا اپنی جگہ یوں اظہار کیا گیا کہ یہ فطرت کائنات کے خلاف ہے۔ تمام کائنات تو صرف اس ایک اللہ کی اطاعت کر رہی ہو اور انسان اسے چھوڑ کر کسی دوسرے کو معبود مانے یہ قانون فطرت کے خلاف کتنی بڑی بدعت ہے؟! اب اس کے خلاف شرک کی چونکہ صرف ایک دلیل تھی اور وہ آباؤ اجداد کی پیروی جسے بار بار پیش کیا کرتے تھے کہ: **إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَرِهِمْ مُّقْتَدُونَ** (زخرف) تو اس کی رد کے لئے یہ کہا گیا ہے کہ ہر ایک خود اپنے عمل کا ذمہ دار ہے۔

اپنی بد اعمالیوں کی ذمہ داری تقدیر پر رکھنا غلط ہے

اگر آباؤ اجداد غلط راستہ اختیار کئے ہوئے تھے تو وہ اس کا بھگتانا بھگتیں گے۔ تم کیوں اس راستے پر چلو۔ بعض نے کہا ہے کہ چونکہ پہلے اپنے لئے کہا گیا ہے کہ میں کیا اللہ کے سوا کسی کو معبود بناؤں؟ تو پھر روئے خطاب مقابل جماعت کی طرف کر کے اشارتاً کہا گیا ہے کیا رہ گئے تم، تم اپنے عمل کے ذمہ دار ہو اس کی جواب دہی مجھ پر نہیں ہے۔^[۱] مگر ہمارے نزدیک تو آغاز آیت میں ”میں“ سے مراد ”تم“ ہے^[۲] تو اب دوسروں سے مراد جو اپنے عمل کے ذمہ دار ہیں، آباؤ اجداد ہی کا قرار دیا جانا زیادہ درست ہے۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ

لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ ۗ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ٦٥

”اور وہ ہے جس نے تمہیں زمین میں پہلوں کی جگہ لینے والا بنایا اور تم میں سے بعض کو دوسروں پر درجوں کے اعتبار سے بلندی عطا کی تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں عطا کیا ہے، اس کے بارے میں تمہاری آزمائش کرے۔ یقیناً تمہارا پروردگار تیزی سے حساب لینے والا ہے اور یقیناً وہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔“

انسانی زندگی کی رفعت اور اس کی غرض و غایت

بعض مفسرین نے خواہ مخواہ یہاں ”خلائف“ کو اس خلیفہ کی جمع لے لیا ہے جس کے معنی حکمران کے ہوتے ہیں^[۳] حالانکہ اس صورت

[۱] وجہ اتصالہ بما قبلہ انہ لا ینفعنی فی ابتغاء رب غیرہ ما انتم علیہ من ذلک لانہ لیس یعدنی فی اکتساب الاتم اکتساب غیری لہ (مجمع البیان)

[۲] یقول علی وجہ الانکار لفعلمہم (تبیان)

[۳] ساخت شمار ابادشاہان زمین (شاہ ولی اللہ) کیا تم کو جانشین زمین کا (شاہ فیض الدین)

میں ”منکھ“ کا لفظ آتا جس سے پتہ چلتا کہ ان کے اندر کچھ لوگوں کو سلطنت عطا ہوئی حالانکہ وہاں تمام نوع یا تمام امت سے کہا جا رہا ہے لیکن اہل سنت میں بعض مفسرین نے وہی معنی کہے ہیں جو ہم نے ترجمہ میں اختیار کئے ہیں^[۱] اور وہی یہاں پر درست ہیں اور ہمارے مفسرین نے عموماً یہی معنی درج کئے ہیں۔^[۲]

تعب ہے کہ مولانا فرمان علی صاحب مرحوم نے یہاں یہ ترجمہ کر دیا ہے کہ:

”تمہیں زمیں میں (اپنا) نائب بنایا“ جو مسلک جمہور کے مطابق ہے۔ حالانکہ اس آیت میں جمہور نے بھی یہ مفہوم قرار نہیں دیا ہے۔

اہل حق کے عقیدہ میں تمام نوع انسانی اللہ کی نائب نہیں ہے بلکہ اس کے نائب خاص افراد ہوتے ہیں جو تمام نوع میں امتیاز خاص یعنی

جو ہر عصمت کے حامل ہوتے ہیں۔

[۱]. خلائف الارض... ای یخلف بعضکم بعضاً فیہا (جلالین)

[۲]. معناہ ان اهل كل عصر یخلف اهل العصر الذی قبلہ کلہما مضمی واحد خلقہ اخر علی انتظام و انساق (تبیان)

سُورَةُ الْأَعْرَافِ

مکیہ..... ۲۰۰..... آیات

چونکہ اعراف کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس سورہ میں ہے، اس لئے اس سورہ کا یہ نام ہوا۔

سورہ اعراف کے خاص خاص مضامین

- ۱۔۔۔ اعمال کا تولد جانا
- ۲۔۔۔ جناب آدم سے ابلیس کی وسوسہ انگیز گفتگو
- ۳۔۔۔ لباس بہشت کا جناب آدم وحواء کے جسم سے جدا ہونا
- ۴۔۔۔ نماز کے وقت زینت کا حکم
- ۵۔۔۔ کھانے پینے میں اعتدال کا حکم و راسراف سے ممانعت
- ۶۔۔۔ یہ کہ اچھے لباس اور اچھی غذا سے پرہیز ضروری نہیں
- ۷۔۔۔ اہل بہشت و اہل دوزخ کی دلچسپ اور عبرت انگیز گفتگو
- ۸۔۔۔ فساد سے ممانعت
- ۹۔۔۔ پاکیزہ اور ناپاک زمینوں کا تذکرہ
- ۱۰۔۔۔ جناب نوح، جناب ہود، جناب صالح، جناب لوط اور جناب شعیب کی تعلیم اور ان کی قوموں کا رویہ
- ۱۱۔۔۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا تفصیلی تذکرہ اور فرعون کا انجام
- ۱۲۔۔۔ بنی اسرائیل کی دل شکن باتیں
- ۱۳۔۔۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات
- ۱۴۔۔۔ جناب موسیٰ علیہ السلام کا تیس راتوں کا وعدہ، پھر اس میں بداء چالیس کی میعاد اور قوم کی گمراہی۔
- ۱۵۔۔۔ دیدار خدا کا سوال اور اس کا انجام
- ۱۶۔۔۔ گو سالہ پرستی
- ۱۷۔۔۔ موسیٰ علیہ السلام کا ہارون پر عتاب
- ۱۸۔۔۔ النبی، اس کے اوصاف اور تورات و انجیل میں اس کا تذکرہ

- ۱۹۔۔۔۔ رسالت محمدی ﷺ کی ہمہ گیری
 ۲۰۔۔۔۔ اسباط بنی اسرائیل کی تعداد اور بارہ چشتے
 ۲۱۔۔۔۔ اہل سبت اور ان کا مسخ ہونا
 ۲۲۔۔۔۔ عہد الست یا عالم ذر
 ۲۳۔۔۔۔ یہ کہ قیامت کی وقت کا علم کسی کو نہیں
 ۲۴۔۔۔۔ قرآن کی تلاوت کے وقت خاموشی کا حکم..... وغیرہ وغیرہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

الْمُضَّ ۱ كِتَابٌ أَنْزَلَ إِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِي صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنذِرَ بِهِ

وَذِكْرَىٰ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۝۱

”الف۔ لام۔ میم۔ صاد۔ یہ وہ کتاب ہے [۱] جو آپ پر اتاری گئی ہے تو آپ کو اس کی طرف سے دل تنگی نہ ہونا

چاہیے کہ آپ اس کے ذریعہ سے ہدایت کریں [۲] اور یاد دہانی ہو ایمان والوں کے لئے [۳]“

الفاظ کے باہمی ربط میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ سبھا ہوا مطلب آیت کا یہ ہے کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے آپ پر اتاری گئی ہے تو آپ کو تو اس کی تبلیغ کرنا ہے۔ اب یہ لوگ کتنا ہی آپ کو اپنے حملوں کا نشانہ بنائیں، آپ کو دل تنگ نہیں ہونا چاہیے اور وہ اتاری گئی ہے اس لئے تھوڑی کہ آپ اسے خاموشی کے ساتھ اپنے پاس رکھے رہیں بلکہ وہ اتاری اسی لئے گئی ہے کہ آپ اس کے ذریعہ سے خلق خدا کو عذاب الہی سے ڈرائیں اور ایمان لانے والوں کو حقیقتوں کی یاد دہانی ہوتی رہے۔ لہذا یہ کام آپ کو بہر صورت انجام دینا ہے [۴]۔

اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ ۗ قَلِيلًا مَّا

تَذَكَّرُونَ ۝۲

”پیروی کرو اس کی جو تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی طرف سے اتارا گیا ہے اور اسے چھوڑ کر دوسرے حوالی

[۱] ابن کتبایست (شاہ ولی اللہ) اجمع النحویون علی ان قوله: کتاب انزل الیک مرفوع بغير هذه الحروف فالمعنى لهذا کتاب انزل

الیک (مجمع البيان)

[۲] لتندرت متعلق بانزل ای للانذار به (جلالین)

[۳] ویرای پند مسلمانان را (شاہ ولی اللہ)

[۴] قال الفراء والنزاج واكثر العلماء انه على التقديم والتأخير وتقديره: كتب انزل الیک لتندرت وقال آخرون هو متصل

بقوله: فلا یکن فی صدرك حرج منه لتندرت به ای کن علی انشراح صدق بالانذار (مجمع البيان)

موالی کی پیروی نہ کرو [۱] بہت کم ہے تمہارا نصیحت قبول کرنا“۔ [۲]

وَ كَمْ مِنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا فَجَاءَهَا بَأْسُنَا بَيَاتًا أَوْ هُمْ قَائِلُونَ ﴿۵﴾

”اور بہت سی ایسی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے تباہ کیا تو آیا ان پر ہمارا عذاب رات کی رات یا جب وہ دو پہر کو محو آرام تھے۔“

یہی ترجمہ تمام مفسرین کی تفسیر کے مطابق ہے [۳] مگر شاہ رفیع الدین نے ایسا ترجمہ کیا ہے جس میں اگر کتابت کی غلطی سے کچھ نہیں گیا ہے تو وہ عجیب ہے:

”پس آیا ان کے پاس عذاب ہمارا اور وہ سوتے تھے۔“

فَمَا كَانَ دَعْوَاهُمْ إِذْ جَاءَهُمْ بَأْسُنَا إِلَّا أَنْ قَالُوا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿۶﴾

”تو نتیجی ان کی چیخ پکار [۴] جبکہ ہمارا عذاب ان پر آیا سو اس کے کہ وہ کہہ رہے تھے بے شک ہم گنہگار تھے۔“

یہ اعتراف اگر اس وقت ہو جب موقع اصلاح باقی ہے اور پھر اس کے ساتھ عزم اصلاح بھی ہو تو وہ توبہ کی حیثیت رکھے گا، اس لئے سزا سے بچا سکتا ہے مگر یہ اعتراف اس وقت جب توبہ کا دروازہ بند ہو چکا ہو یا اس کے پہلے ہی مگر صرف ضمیر کے دباؤ سے ایک اعتراف حق کی صورت سے جس کے ساتھ آئندہ زندگی میں کسی تبدیلی کی نیت پائی نہ جاتی ہو کچھ بھی نتیجہ بخش نہیں ہے بلکہ اس انسان کے خلاف عذاب کے حق بجانب قرار پانے کے لئے ایک حجت بنتا ہے جیسا کہ یزید کی زبانی حضرت امام حسین علیہ السلام کو شہید کرنے کے بعد جو اعترافات تاریخ میں ملتے ہیں وہ اسی نوعیت کے ہیں۔

فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ ﴿۷﴾ فَلَنَقْضِصَنَّ عَلَيْهِمْ

بِعِلْمٍ وَمَا كُنَّا غَائِبِينَ ﴿۸﴾

”تو ہم بلاشبہ ان سے بھی پوچھیں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے اور بلاشبہ رسولوں سے بھی پوچھ چکھ کریں گے، اس کے بعد بے شک ان کے سامنے پوری واقفیت کے ساتھ سب واقعات پیش کریں گے [۵] اور ہم غیر حاضر تو تھے نہیں۔“

[۱] اولیاء طبیعوہم فی معصیة تعالیٰ (جلالین)

[۲] اند کی پندھی پذیرید (شاہ ولی اللہ)

[۳] بیاتاً لیلاً او ہم قائلون نائمون بالظہیرة (جلالین) یعنی فی وقت القیلولة و هو نصف النهار (تبیان) ایشان شبانگاہ آرامیدہ بودند یا وقتیکہ ایشان در خواب نیمروز بودند (شاہ ولی اللہ)

[۴] ای لحدیکن دعاء ہؤلآء (مجمع البیان) پس نہ تہا پکارنان کا (شاہ رفیع الدین)

[۵] بیان خواہیم کرد بحضور ایشان بدانہن (شاہ ولی اللہ)

یعنی روز حشر ان سب سے جو اب وہی ہوگی اور ان کے سامنے خالق کی جانب سے جو کچھ رسولوں کی کارکردگی اور امتوں کی نافرمانی سب ہی پر حاضر و ناظر تھا^[۱] وہ سب واقعات پیش کئے جائیں گے تاکہ ان کی بنا پر جزا و سزا دی جائے۔

آخر کے جملہ سے کہ ”ہم غیر حاضر تو تھے نہیں“ ظاہر ہے کہ خالق کا پوچھ گچھ کرنا خود معلوم کرنے کی خاطر نہیں ہے اور اسی لئے بعض جگہ قرآن میں سوال کی نفی کی گئی ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

وَلَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوبِهِمُ الْمُجْرِمُونَ

گنہگاروں سے ان کے گناہوں کے بارے میں کچھ دریافت نہیں کیا جائے گا۔ (قصص-۷۸)

فَيَوْمَئِذٍ لَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوبِهِ إِنْسٌ وَلَا جَانٌّ

تو اس دن کسی آدمی یا جنات میں سے کسی سے بھی اس کے گناہ کے متعلق پوچھا نہیں جائے گا۔ (رحمن-۳۹)

یہ پوچھا جانا جس کی نفی ہوئی ہے وہی تحقیق حال کے لئے دریافت کرنا ہے جس کی خالق کو ضرورت نہیں کیونکہ اس کے علم میں سب کچھ ہے۔^[۲] لیکن یہ سوال جس کا آیت زیر تحریر میں اعلان ہے کہ ”ہم پوچھیں گے“۔ ایک تو تہدید کی حیثیت رکھتا ہے^[۳] اور پھر اس لئے ہے کہ جزا کی بنیاد خود ان لوگوں پر ظاہر ہو جائے جن کو جزا و سزا دی جا رہی ہے اور جزا و سزا کا مفاد پورا ہونے کے لئے ضروری چیز ہے اور یہ ایک بڑا نقصان ہے جو آریوں کے نظام جزا و سزا میں جو تباہی کے تصور پر مبنی ہے پایا جاتا ہے۔ یعنی وہاں جزا ہے اور سزا پانے والے کو بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کا ہے کی سزا ہے اور اس سے مقصد جزا و سزا کا نوت ہو جاتا ہے۔

تعلیمات اسلام میں جزاء و سزا کے ساتھ حساب و کتاب، میزان اور نامہ اعمال، یہ سب چیزیں اسی نقص کے مقابلہ میں بندوں کو پورے طور پر بنیاد جزاء و سزا بتانے کے لئے ہیں۔

وَالْوِزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ ۖ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۸﴾ وَمَنْ

خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ ۖ مِمَّا كَانُوا بِآيَاتِنَا

يُظْلِمُونَ ﴿۹﴾

”اور اس دن تو لا جانا بالکل حق ہے تو جس شخص کے اعمال کے پلے بھاری ہوں گے تو یہی لوگ دین اور دنیا کی بہتری حاصل کرنے والے ہیں اور جس کے اعمال کے پلے سبک ہوں گے تو یہ ہیں جنہوں نے اپنے کو گھائٹے میں مبتلا کیا، اس وجہ سے کہ وہ ہماری آیتوں کے ساتھ انصافی کرتے تھے۔“

اعمال کا وزن:

[۱] لَنْخَبِرْ بِهِمْ عَنْ عِلْمِهِمْ مَا فَعَلُوا ۖ وَهُمْ كُنَّا غَائِبِينَ عَنْ ابْلَاقِ الرُّسُلِ وَالْإِمَامِ الْخَالِيَةِ مَا فَعَلُوا (جلالین)

[۲] المراد به لا يسألون سؤ الاستعلام واستخبار (تبیان)

[۳] هو تعالیٰ وان كان عالما بما كان منهم فانما اخرج الكلام مخرج التهديد والنزجر (مجمع البيان)

”اس دن“، یعنی اس موقع پر جس کا ذکر پہلے ہوا کہ ”ہم ان سے پوچھ گچھ کریں گے اور سب واقعات پیش کریں گے۔“^[۱]

”تولا جانا“، یعنی اعمال خیر کی زیادتی اور کمی، نیز کمال اور نقص کی جانچ پڑتال^[۲]

”حق ہے“ اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ یہ ہونا حق ہے اور ایسا ہو کر رہے گا^[۳] اور یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ اس دن جو جانچ پڑتال ہو گی، وہ بالکل ٹھیک ٹھیک ہوگی۔^[۴]

اور اعمال کے پلوں کا گراں ہونا، نیک اعمال کا زیادہ ہونا ہے^[۵]

مولانا فرمان علی صاحب مرحوم اپنے حاشیہ میں تحریر کرتے ہیں:

”اعمال کے تولے جانے کا بظاہر یہ مطلب ہے کہ جس طرح کوئی شخص کسی چیز کو ترازو میں تول کر بتا دیتا ہے، اسی طرح خداوند عالم عدل و انصاف کے ساتھ حکم دے گا کہ اس میں ذرا سی کمی زیادتی نہ ہوگی۔ اسی وجہ سے جب کسی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا اعمال تولے جائیں گے؟ تو آپ نے فرمایا کہ اعمال جسم نہیں ہیں کہ تولے جائیں۔ اس کے علاوہ تولنے کی ضرورت تو اس کو ہوتی ہے جو اس کی گرانی اور سبکی کو نہ جانتا ہو اور خدا پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ اس نے پوچھا کہ پھر فاکٹما فمئن ثقَلت مَوَازِينُهُ کے کیا معنی ہیں؟ فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کے اچھے اعمال غالب ہوں۔“

اسی مفہوم کو ہمارے قدیم علماء نے بھی ترجیح دی ہے چنانچہ جناب شیخ الطائف نے فرمایا ہے:

قال مجاهد والوزن عبارة عن العدل في الآخرة وانه لا ظلم فيها على احد وهو قول البلخي وهو احسن

الوجوه (تبیان)

مجاہد کا قول ہے کہ وزن، آخرت میں کامل عدل و انصاف کی ایک تعبیر ہے اور یہ کہ کسی پر ظلم نہیں ہوگا اور یہی بلخی کا قول ہے اور یہ تمام توجیہات میں سب سے بہتر ہے۔

اسی کو علامہ طبرسی نے اس آیت کے تحت میں اس طرح لکھا ہے:

ذكر فيه اقوال احدها ان الوزن عبارة عن العدل في الآخرة وانه لا ظلم فيها على احد.

اس میں چند قول بیان ہوئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ وزن، آخرت میں عدل و انصاف کی ایک تعبیر ہے اور یہ کہ اس میں کسی پر ظلم نہیں ہوگا۔

پھر دوسرے متعدد قول نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

واحسن الاقوال القول الاول (مجمع البيان)

[۱]. ای یوم السؤل العذ کو روہو یوم القیامة (جلالین)

[۲]. سنجدین اعمال بانصاف (شاه ولی اللہ)

[۳]. بودنیست (ولی اللہ)

[۴]. الحق العدل صفة الوزن (جلالین)

[۵]. ہر کہ گراں شد پلہ نیکہا سے او (شاه ولی اللہ)

تمام قولوں میں سب سے بہتر پہلا قول ہے۔

اعمال کے ساتھ بھاری اور ہلکے ہونے میں جمع کے صیغے ”موازن“ کا استعمال جس کی بنا پر ہم ترجمہ میں ”پلے بھاری ہوں گے“ اور ”ہلکے پلے ہوں گے“ لکھنے پر مجبور ہوئے، اس کا پتہ دیتا ہے کہ ہر قسم کے اعمال میں صحت و بطلان یا کمال و نقص کے تولنے کے معیار الگ ہیں [1] اور چونکہ میزان یعنی ترازو حقیقت میں ہر وہ شے ہے جس سے کسی چیز کی زیادتی اور کمی وغیرہ نمایاں ہو سکے۔ اسی لئے منطق کو علم المیزان کہتے ہیں کہ اس میں نتائج کے صحیح و غلط ہونے کے معیار بتائے جاتے ہیں اور اشعر میں ”وزن“ کا لفظ استعمال ہوتا ہے کہ تقطیع کر کے ان کی کمی یا زیادتی کا اندازہ ہوتا ہے اور اس سے ظاہر ہے کہ ترازو ہر شے کا اس کے اعتبار سے ہوتا ہے لہذا ہو سکتا ہے کہ مثلاً نماز کے جانچ کا ترازو کسی کامل نمازی کی نماز ہو اور روزہ کا ترازو کسی ایسے ہی روزہ دار کے روزے ہوں اور راہ خدا میں قربانی کا ترازو ایک بلند مرتبہ شہید کی شہادت ہو اور ایسے ہی زندگی کا ہر شعبہ اور اس سے متعلقہ عبادات و فرائض۔

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ ۗ قَلِيلًا مَّا

تَشْكُرُونَ ﴿١٥﴾

”اور بلاشبہ ہم نے تمہیں زمین میں اقتدار عطا کیا اور تمہارے لئے اس میں زندگی کے سامان بنائے [2] (پھر بھی) بہت کم ہے تمہارا شکر گزار ہونا۔“

”مکنا کما“ کا جو ترجمہ کیا گیا ہے: ”تمہیں زمین میں اقتدار عطا کیا“ یہ اس لفظ کا ذہن سے زیادہ قریب مفہوم ہے جس کے مطابق شاہ رفیع الدین صاحب نے بھی ترجمہ کیا ہے: ”قدرت دی ہم نے تم کو“ لیکن ان کے والد بزرگوار نے اس کے خلاف ترجمہ کیا ہے: ”استقرار داد ادم بشمار ادر زمین“ لیکن قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر اس طرح کے الفاظ کا جو تمکین سے ہیں پہلے ہی معنی میں استعمال پایا جاتا ہے لہذا وہی یہاں بھی ترجیح رکھتے ہیں۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۗ فَسَجَدُوْۤا

اِلَّا اِبٰلٰٓسَ ۗ لَمَّ يَكُنْ مِنَ السَّٰجِدِيْنَ ﴿١٦﴾

”اور ہم نے تم کو پیدا کیا اور پھر یہ کہ تمہاری صورت گری کی تو اس کے بعد فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو، اس پر ان سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس، وہ سجدہ کرنے والوں میں سے نہ تھا۔“

چونکہ بعد والے واقعات کا تعلق نوع بشر میں ہر فرد کے ساتھ نہیں ہے بلکہ صرف ابوالبشر حضرت آدم علی نبینا وآلہ وعلیہ السلام سے ہے، اس لئے بعض مفسرین نے شروع سے اس خلقت کو آغاز تخلیق کے معنی میں لے لیا۔ اس طرح ”تمہیں“ یا ”تم کو“ سے مراد یہ ہے کہ تمہارے مورث

[1]. انما جمع الموازین لانه یجوز ان یکون لكل نوع من انواع انطاعات یوم القیامة میزان (مجمع البیان)

[2]. ای ماتعیشون به من انواع الرزق ووجوه النعم والمنافع (مجمع البیان)

اعلیٰ کو پیدا کیا اور تمہاری صورت بنائی یعنی تمہارے مورث اعلیٰ کی صورت بنائی [۱] اور بعض نے پہلے جملہ کو آدم سے متعلق کیا ہے اور دوسرے کو تمام نوع سے [۲] مگر تیسرا تو ظاہر بظاہر آدم ہی سے متعلق ہے، اس لئے اسلوب کلام کو اس انتشار پر محمول کرنا درست معلوم نہیں ہوتا۔

ہاں اس میں کوئی حرج نہیں کہ پہلا فعل یعنی ”تم کو پیدا کیا“ پوری نوع سے متعلق ہو اور اس کے بعد کے واقعات ابوالبشر سے متعلق ہوں اور اسی لئے ”پھر“ کے لفظ کو ہم ترتیب واقعہ کے لئے نہیں سمجھتے بلکہ ترتیب ذکر کے لئے سمجھتے ہیں جسے ترجمہ میں ہم نے یوں ظاہر کیا ہے کہ ”پھر یہ کہ“ بلکہ ہمارے نزدیک تو پہلی صورت میں بھی اس ”پھر“ کے یہی معنی سمجھنا چاہئیں کیونکہ ”صورت کا بنانا“ خلقت کے بعد کا کوئی مرحلہ نہیں ہے جب کہ خود خلقت لازماً کسی صورت پر ہوگی، بلا صورت نہیں ہو سکتی۔

ہاں یہ ممکن ہے کہ خلق بلا صورت سے مراد وہ منزل ہو کہ جب وہ صلب پدر میں ہوتے ہیں کیونکہ اس وقت سب کی ایک شکل ہوتی ہے۔ اختلاف صورت نمایاں نہیں ہوتا اور دوسری منزل شکم مادر کی ہو، جب ہر انسان میں شکل و صورت کا امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ [۳]

قَالَ مَا مَنَّكَ إِلَّا تَسْجُدًا إِذْ أَمَرْتُكَ ۖ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۖ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ

وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ ﴿۱۴﴾

’ارشاد ہوا کیا امر تجھے مانع ہوا جو تو سجدہ نہ کرے باوجودیکہ میں نے تجھے حکم دیا۔ اس نے کہا میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔‘

مانع فعل سے روکتا ہے اور ترک کا باعث ہوتا ہے، اس لئے اس کا انتساب قرآن مجید میں ایک جگہ فعل کی طرف ہوا ہے روکنے کے معنی میں اور ارشاد ہوا ہے: **فَمَا مَنَّكَ أَنْ تَسْجُدَ**، وہاں ترجمہ یہ ہوگا کہ کون امر اس سے مانع ہوا کہ تو سجدہ کرے، اور یہاں اس کا انتساب ترک عمل کی طرف ہوا ہے اس لئے معنی باعث ہونے کے پیدا ہوئے یعنی تعمیل حکم سے کون مانع پیش آیا جو باعث ہوا کہ تو سجدہ نہ کرے؟ [۴] تعجب ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے اور بعض ہمارے مترجمین نے بھی اس **مَا مَنَّكَ أَنْ تَسْجُدَ** کا ترجمہ وہی کیا ہے جو **مَا مَنَّكَ أَنْ تَسْجُدَ** کا ہونا چاہیے۔ [۵]

غالباً یہ اس وجہ سے ہے کہ بعض مفسرین نے یہاں پر لا کو زائدہ لکھ دیا ہے۔ [۶]

مگر کچھ مفسرین کی یہ روش جو اکثر آیات قرآنی میں انہوں نے اختیار کی ہے، بالکل غلط ہے جس نے مخالفین اسلام کو قرآن پر زبان طعن

[۱] ہر آئینہ آفرید شمارا یعنی پدر شمارا و صورت دادیم شمارا یعنی پدر شمارا (شاہ ولی اللہ) انا بدأنا خلق آدم ثم صورناہ (مجمع

البیان) کہا یذکر المخاطب ویراد بہ اسلافہ (تبیان)

[۲] الربیع وقتاد قوالضحاک والسدی ان المعنی خلقنا آدم ثم صورنا کم فی ظہرہ (تبیان)

[۳] خلقنا کم فی اصلاب الرجال وصورنا کم فی ارحام النساء (علی بن ابراہیم)

[۴] ای مادعاک الی ان لا تسجد وما اضطرک الیہ (مجمع البیان) کس چیز نے منع کیا تجھے کہ نہ سجدہ کیا تو نے (شاہ فنج الدین)

[۵] چہ چیز منع کرد ترا از انکہ سجدہ کنی (شاہ ولی اللہ) تجھے سجدہ کرنے سے کس نے روکا (مولانا فرمان علی صاحب)

[۶] لا زائده (جلالین)

دراز کرنے کا موقع دیا ہے اور اس پر علامہ شیخ جواد بلاغی نے اپنی تفسیر آلاء الرحمن کے مقدمہ میں بڑی مبسوط بحث کی ہے جسے جدید ایڈیشن میں ہم نے اپنے مقدمہ تفسیر کے آخر میں بطور ضمیرہ شامل کیا ہے۔

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّغِيرِينَ ﴿١٣﴾ قَالَ أَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿١٤﴾ قَالَ إِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ﴿١٥﴾ قَالَ فِيمَا أُغْوِيَنِّي لِأَفْعَدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ ﴿١٦﴾ ثُمَّ لَا تِيْنَهُمْ مِّنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ ۗ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ ﴿١٧﴾ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُومًا مَّدْحُورًا ۗ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿١٨﴾

”ارشاد ہوا تو پھر تو اس میں سے اتر جا کیونکہ تجھے اس میں رہ کر یہ زیب نہیں دیتا کہ تو غرور سے کام لے [۱] تو نکل جا۔ یقیناً تو ذلیل ہونے والوں میں سے ہے، اس نے کہا مجھے مہلت عطا کر اس دن تک کہ جب سب دوبارہ زندہ ہوں گے، کہا اچھا تو ان میں سے ہے جنہیں مہلت دی گئی۔ اس نے کہا تو جیسا تو نے مجھے گمراہ قرار دیا ہے، اب میں ضرور بیٹھوں گا ان کیلئے تیرے سیدھے راستے پر۔ پھر میں آؤں گا ان کی طرف ان کے سامنے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے اور تو ان میں سے زیادہ کو شکر گزار نہیں پائے گا، اس نے کہا نکل جا یہاں سے قابل نفرت اور مردود ہو کر یقیناً جو ان میں سے تیری پیروی کرے گا تو میں بھر دوں گا دوزخ کو تم سے سے۔“

”اس میں سے اتر جا“ اس سے اشارہ جنت کی طرف بھی ہو سکتا ہے اور معلق عالم بالا کی طرف بھی۔ [۲] ”مہلت“ کے معنی عام طور پر زندہ رکھنے کے سمجھے جاتے ہیں، اس لئے کہا گیا ہے کہ شیطان کی خواہش کو پورا منظور نہیں کیا گیا کیونکہ اس نے تو قیامت کے دن تک کے لئے زندہ رکھنے کو کہا تھا مگر قیامت تو دوبارہ زندہ کرنے کا دن ہے، نہ کہ موت کا! اس لئے مہلت دی گئی مگر قیامت تک کی نہیں بلکہ قیامت کے پہلے ایک خاص وقت تک جبکہ خالق اس پر موت طاری کر دے گا جسے دوسری جگہ کہا گیا ہے۔

إِلَى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ﴿١٦﴾ (سورہ ص) یعنی اس وقت تک کی مہلت دیتا ہوں جو میرے علم میں معین ہے۔

مگر جناب شیخ طوسی کا رجحان اس طرف ہے کہ مہلت سے مراد دنیا میں مورد عذاب نہ بنانا اور اس کے عذاب کو قیامت پر اٹھا رکھنا ہے اور اس کی اس خواہش کو خالق نے منظور فرمایا اور اس لئے قیامت سے پہلے اس کی تمام نافرمانیوں کی کوئی پاداش نہیں مل رہی ہے۔

[۱] فائدہ الیست بموضع المتکبرین (مجمع البیان)

[۲] منها ای من الجنة وقیل من السموات (جلالین)

شیطان کی زبانی ”بِمَا آغْوَيْتَنِي“ کے جو الفاظ ہیں، ان کا ترجمہ ہم نے یہ کیا کہ ”جیسا تو نے مجھے گمراہ قرار دیا ہے“..... یہ اس بنا پر کہ گمراہ کرنے کی نسبت ذات الہی کی طرف درست نہیں ہے اور شیطان بھی بر بنائے غرور سرکشی کے باوجود شان الہی سے اس وقت اتنا جاہل نہیں مانا جاسکتا کہ گمراہ کرنے کے عمل کو جو نتیجہ ہے ذات الہی کی طرف منسوب کرے مگر علمائے اہل سنت جو حسن و قبح کے عقلی ہونے کے قائل نہیں ہیں، بلا تکلف گمراہ کرنے کی نسبت اس کی جانب دید دیتے ہیں چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:

”بسبب آنکہ مرگمراہ کر دی۔“

ان کے صاحبزادہ بھی اس پہلو سے ان کے پیرو ہیں، اگرچہ اتنا فرق ہے کہ یہ ”بِمَا آغْوَيْتَنِي“ کی ”ب“ کو قسم کالیتے ہیں۔ کہتے ہیں:

”قسم ہے اس کی کہ گمراہ کیا تو نے مجھ کو“۔ (شاہ رفیع الدین)

یہ ”ب“ کو برائے قسم لینا پہلے کی بعض تفسیروں کے مطابق ہے [۱]۔

شیطان کا یہ کہنا کہ ”میں بنی آدم کی طرف سامنے سے آؤں گا اور دائیں سے اور بائیں سے“ اس میں جناب ابن عباسؓ کی زبانی یہ نکتہ وارد ہوا ہے کہ سمت شیطان کے دسترس سے باہر رہی ہے تاکہ خالق کی رحمت کا راستہ پھر بھی کھلا رہے۔ [۲]

ایک پر لطف تفسیر ان سمتوں کی جو بظاہر حدیث معصوم سے ماخوذ ہے یہ ہے کہ آگے سے مراد آخرت ہے کہ شیطان لوگوں کو سمجھاتا ہے کہ انجام میں کچھ بھی نہیں ہے، نہ حساب، نہ کتاب، نہ بہشت، نہ دوزخ، اور پیچھے سے مراد وہ مال و متاع دنیا ہے جو انسان کما چکا ہے، شیطان اسے خیر خیرات میں صرف کرنے سے روکتا ہے اور دائیں سے مراد دین و ایمان ہے کہ وہ حقانیت میں شے پیدا کر کے اسے کمزور کرتا ہے اور بائیں سے مراد انسانی خواہشیں ہیں جن میں بے راہ روی پیدا کر کے وہ آدمی کی ہلاکت کا سامان کرتا ہے۔ (تفسیر علی بن ابراہیم)

وَيَأْتِيهِمْ مِنَ الشَّجَرَةِ الْمُنْتَهَىٰ ۚ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُورِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوَاءٍ ۖ فَذُكِرُوا بِهِمَا ۗ وَقَالَ مِمَّا تَهْتَكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هَذِهِ الشَّجَرَةِ ۖ إِلَّا أَنْ تَكُونَا مَلَكَتَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ الْخَالِدِينَ ۚ وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ ۗ فَدَلَّهُمَا بِعُرْوَةٍ ۖ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوَاءُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفْنَ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۗ وَنَادَاهُمَا رَبُّهُمَا أَلَمْ أَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكَ الشَّجَرَةِ ۚ وَأَقْبَل لَّكُمَا إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۗ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِنْ

[۱] الباء للقسمة (جلالین)

[۲] قال ابن عباس ولا يستطيع ان يأتي من فوقهم لئلا يحول بين العبد وبين رحمة الله تعالى (مجمع البيان)

لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿٣١﴾

”اور اے آدم! رہو تم اور تمہاری بیوی بہشت میں اور کھاؤ جہاں سے تم دونوں چاہو اور اس درخت کے نیچے نہ جانا، نہیں تو ہو گے تم دونوں ظالموں میں سے تو وسوسہ میں ڈالا ان دونوں کو شیطان نے تاکہ نمایاں کر دے ان کے لئے وہ جو ان کے چھپانے کے قابل جسم کے حصے خود ان سے چھپے ہوئے تھے اور کہا تم دونوں کو تمہارے پروردگار نے نہیں روکا اس درخت سے مگر اس لئے کہ کہیں تم دونوں فرشتے نہ ہو جاؤ یا ہمیشہ زندہ رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ، اور ان دونوں سے قسم کھائی کہ میں تمہارے خیر خواہوں میں سے ہوں تو ان دونوں کو اس نے دھوکے میں ڈال دیا تو جب انہوں نے اس درخت میں سے چکھا تو چھپے ہوئے ان کے جسم کے حصے نمودار ہو گئے اور وہ اپنے اپنے اوپر بہشت کے پتوں کو جوڑ کر پردہ کرنے لگے اور آواز دی ان کو ان کے پروردگار نے کہ کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے روکا نہیں تھا اور نہیں کہا تھا کہ بلاشبہ شیطان تم دونوں کا کھلا ہوا دشمن ہے۔ ان دونوں نے کہا کہ اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں نہ بخشے گا اور نہ رحم کرے گا تو ہم گھانا اٹھانے والوں میں سے ہوں گے۔“

جناب آدم و حوا علیہما السلام سے ابلیس کی وسوسہ انگیز گفتگو

اس واقعہ کا بیان پہلے پارے میں آچکا ہے اور وہاں اس پر بقدر ضرورت تفصیلی بحث بھی کی جا چکی ہے شیطان نے انہیں وسوسہ میں ڈالا تاکہ نمایاں کر دے ان کے لئے وہ جو ان کے چھپائے جانے کے قابل جسم کے حصے خود ان کی نگاہ سے پہلے چھپے ہوئے تھے۔ اس کا یہ مطلب ہو تو سکتا ہے کہ وہ از اول برہنہ تھے مگر خود انہیں اس کا احساس نہ تھا یعنی یہ حقیقت ان سے چھپی ہوئی تھی جیسا کہ بائبل میں اس واقعہ کے بیان میں درج ہے مگر قرآن مجید میں دوسری جگہ تصریح ہے کہ ان کے جسم پر لباس جنت موجود تھا اور اس درخت سے کھانے کے بعد وہ لباس ان کے جسم سے جدا ہوا تو وہ برہنہ ہو گئے اور اس لئے جلدی جلدی پتوں سے ستر کرنے لگے، اس لئے یہاں بھی مطلب یہی لینا پڑے گا کہ ان کے جسم پر لباس بہشت کے موجود ہونے کی وجہ سے یہ اعضاء پوشیدہ تھے مگر اب وہ لباس ان کے جسم سے جدا ہوا تو انہوں نے دیکھا کہ وہ برہنہ ہیں۔

لباس بہشت کا جناب آدم اور حوا علیہما السلام کے جسم سے جدا ہونا

اب یہ کہ شیطان نے یہ اس لئے کیا ”تاکہ نمایاں کرے“ یہ ویسا ہی ہو سکتا ہے کہ جیسے اکثر جگہ اس نتیجہ کو جو کسی امر پر مرتب ہو بطور غرض و غایت بیان کیا جاتا ہے جس کی نمایاں مثال ہے:- **فَالْتَفَتَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَدْرًا** فرعون کے گھر والوں نے موسیٰ کو دریا سے نکال لیا تاکہ یہ ان کے دشمن جان اور باعث غم و غصہ ہوں، ویسے ہی یہاں بھی چونکہ ان کے وسوسہ پر نتیجہ یہی مرتب ہوا، اس لئے ان الفاظ میں ذکر کیا گیا۔

پھر یہ کہ شیطان کا مقصود بہشت سے نکلوانا اور آدم کو نقصان پہنچانا تو ضروری تھا۔ اب چاہے سب لوازم اس کے وہ نہ بھی جانتا ہو، تب بھی اس کی طرف ان تمام چیزوں کا بطور غرض و مقصد استناد ہو سکتا ہے اس لئے بعض مفسرین نے جو اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شیطان جانتا تھا کہ اس

درخت کے پاس جانے سے یہ برہنہ ہو جائیں گے اور جو برہنہ ہو جائے، وہ بہشت میں نہیں رہ سکتا^[۱] کوئی مضبوط وجہ نہیں رکھ سکتا۔

قَالَ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۗ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ

حِينٍ ۗ قَالَ فِيهَا تُحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ ۗ

’’ارشاد ہوا اترو! تم لوگوں میں سے ایک دوسرے کا دشمن ہوگا اور تمہارے لئے زمین میں ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہوگا ایک وقت تک کے لئے^[۲] (یہ بھی) کہا کہ اس میں تم جیو گے اور اسی میں مرو گے اور اسی سے (دوبارہ) نکالے جاؤ گے‘‘^[۳]

اخلاقی نتائج اس پورے واقعہ کے مولانا فرمان علی صاحب مرحوم نے بہت اچھے لکھے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

(۱) آدمی کا ساری خدائی حتیٰ کہ جنوں اور فرشتوں سے بہتر ہونا۔

(۲) طبعی عصمت کا فعلی و ارادی عصمت سے کم ہونا۔

(۳) حسد و تکبر کی برائی۔

(۴) اپنی جماعت سے علیحدگی کی برائی۔

(۵) خلقی صفت نسب وغیرہ پر ناز کرنے کی برائی۔

(۶) تعلیٰ کے خواہشمند کا پست ہونا۔

(۷) برے آغاز کا برا انجام۔

(۸) قصور وار کے بھی واجب حق کا ساقط نہ ہونا۔

(۹) مجرم کے ضد کرنے پر سزا کی زیادتی۔

(۱۰) بدی کے پیرو کا بانی کی طرح انجام خراب ہونا۔

(۱۱) حقیقی دوست کا مشکل سے بہم پہنچنا۔

(۱۲) بے جا نچے کسی بات پر بھروسہ کرنے کی برائی۔

(۱۳) دشمن کی بات پر بھروسہ کرنے کی برائی۔

(۱۴) ناصح کے خلاف کرنے میں زک اٹھانا۔

(۱۵) دشمن کی جھوٹی قسموں پر اعتماد نہ کرنا۔

(۱۶) غلطی پر توبہ اور ندامت کا مفید ہونا۔

[۱] یو جب ان یکون ابلیس علم ان من اکل هذا الشجرة بدت عورتہ وان من بدت عورتہ لا یتک فی الجنة (مجمع البیان)

[۲] تا وقتی معین یعنی تا مرگ (شاه ولی اللہ)

[۳] عند البعث یوم القیامة (مجمع البیان)

- (۱۷) ندامت سے پھر اصلی مرتبہ ہاتھ آنا۔
 (۱۸) کبھی ذاتی عداوت کا موروثی عداوت ہو جانا۔
 (۱۹) دشمن کی لگاؤٹ پر نہ اترانا۔

بر تواضع ہائے دشمن تکہ کردن ابلہی است

پائے بوس سبیل از پا افگند دیوار را

يَبْنِيْ اَدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُؤَارِجِي سَوَاتِكُمْ وَرِيْشًا ط وَ لِبَاسًا

التَّقْوَى لَا ذَلِكْ خَيْرٌ ط ذَلِكْ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَدُّوْنَ ۝۲۱

”اے اولاد آدم! ہم نے تم پر پوشاک اتاری ہے جو تمہارے جسم کے چھپانے کے قابل حصول کو چھپائے اور دیگر ساز و سامان [۱] اور پرہیزگاری کا لباس۔ یہ سب سے اچھی چیز ہے۔ یہ سب اللہ کی نشانیوں میں سے ہے، شاید کہ وہ نصیحت قبول کریں۔“

اچھے لباس اور اچھی غذا سے پرہیز ضروری نہیں

”تم پر پوشاک اتاری“ یعنی وہ چیزیں خلق کیں جن سے پوشاک تیار ہوتی ہے اور تمہیں وہ عقل و شعور عطا کیا جس سے تمہیں ستر پوشی اور آرائش کی ترکیبیں آئیں۔ اس پوشاک کے تذکرہ میں پرہیزگاری کے لباس کا ذکر اس بنا پر ہو سکتا ہے کہ لباس میں بھی تو شریعت کی طرف سے پابندیاں ہیں لہذا ایسا نہ ہونا چاہیے کہ تم ستر پوشی اور آرائش کی دھن میں ان پابندیوں کو نظر انداز کر دو۔

يَبْنِيْ اَدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمْ الشَّيْطٰنُ كَمَا اَخْرَجَ اَبُوَيْكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا

لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوَاتِرَهُمَا ط اِنَّهٗ يَرٰكُمْ هُوَ وَقَبِيْلَهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ط

اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيْطٰنَ اَوْلِيَاً لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۲۲

”اے نسل آدم کے لوگو! ایسا ہرگز نہ ہو کہ شیطان تمہیں بہکا دے جیسا تمہارے باپ ماں کو اس نے بہشت سے نکلوایا یا اس طرح کہ ان کے جسم سے ان کے کپڑے تک اتر وادے تاکہ ان کے جسم کے چھپانے کے قابل حصے ان کی آنکھوں کے سامنے لے آئے یقیناً وہ اور ان کا قبیلہ تمہیں جس طرح دیکھتا ہے، تم انہیں نہیں دیکھتے یقیناً ہم نے شیطان کو ان کا حوالی موالی قرار دیا ہے کہ جو ایمان نہیں رکھتے۔“

”قرار دیا ہے“ یعنی محسوب کیا ہے [۲] جو حقیقت کے مطابق ہے۔ نہ یہ کہ اس نے ان افراد کو ان شیطانوں کی پیروی پر یا ان شیطانوں کو

[۱]. الریش والاثالث متاع البیت من فراش اودثار (مجمع البیان)

[۲]. معناہ انا حکمنا ببدلک ومثله قوله: وجعلوا الملائكة الذین ہم عباد الرحمن انا ائی حکموا ببدلک (تبیان)

ان کی سرپرستی پر مجبور کیا ہے۔

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۗ قُلْ إِنْ أَلَّ اللَّهُ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۗ اتَّقُوا لَوْ نَعَىٰ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢٨﴾

”اور جب وہ کسی بدکاری کا ارتکاب کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقہ پر پایا تھا اور اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ کہیے کہ اللہ بدکاری کا حکم نہیں دیا کرتا، کیا تم اللہ پر ایسی بات کی تہمت لگاتے ہو جو تم جانتے نہیں ہو۔“

یہ فقرہ کہ ”اللہ بدکاری کا حکم نہیں دیا کرتا“ اس کی دلیل ہے کہ حکم الہی سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی کچھ افعال میں ذاتاً بھلائی اور برائی موجود ہے۔ یہ وہ مسلک ہے جسے عدلیہ اختیار کئے ہوئے ہیں مگر جمہور اہل اسلام اس کے خلاف ہیں، یہ جمہور کا مسلک عقل اور قرآن دونوں کے خلاف ہے۔

یوں تو مشرکین طرح طرح کی بدکاریوں کے مرتکب تھے اور فاحشہ کا لفظ ان سب پر حاوی ہے ^[۱] مگر یہاں مفسرین کا بیان ہے کہ اس سے مشرکین کا برہنہ طواف کرنا مراد ہے۔ ^[۲]

وہ اس کی توجیہ یہ کرتے تھے کہ وہ کپڑے جن میں ہم نے طرح طرح کے گناہ کئے ہیں، اس لائق نہیں ہیں کہ ہم انہیں طواف کی حالت میں جسم پر رکھیں لہذا ہم اس حالت میں طواف کرتے ہیں، جس حالت میں معصومیت کے عالم میں ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔ ^[۳]

دیکھا جائے تو اسلام نے حالت احرام کے لئے خاص طرح کے لباس کا حکم دے کر کم از کم مردوں کے لئے تو ان کے اس وہم کو بھی دور کر دیا ہے جو عام لباس پہن کر طواف کرتے ہیں ان کے ذہن میں تھا۔ ہاں عورتوں کے لئے عزت نسوانی کا پہلو اتنا اہم تھا کہ ان کے لئے اس طرح کے لباس کو مناسب نہیں سمجھا گیا اور انہی اپنے عام لباس میں احرام کی اجازت دی گئی۔

قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ ۚ وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ كَمَا بَدَأَكُمْ تَعُودُونَ ﴿٢٩﴾

”کہیے کہ میرے پروردگار نے عدالت کا حکم دیا ہے اور یہ کہ اپنے چہرہ کو سیدھ پر رکھو ہر نماز کے وقت ^[۴] اور اسے پکارو زنی کھری اس کی عبادت کرتے ہوئے جس طرح اس نے پہلی دفعہ تمہیں پیدا کیا، اسی طرح پھر دوبارہ پلٹنا ہو گا۔“

[۱]۔ ہو اسم جامع للقبائح والسيئات (مجمع البيان)

[۲]۔ كناية عن المشركين الذين كانوا يبدون سوءاً تبهم في طوافهم النساء والرجال (تبيان)

[۳]۔ نطوف كما ولدتنا امهاتنا ولا نطوف في الشيايب التي فارفنا فيها الذنوب (مجمع البيان)

[۴]۔ راست کنید روئے خود را (شاه ولی اللہ) سیدھا کرو اپنے منہ کو (شاہ رفیع الدین)

چہرہ کو سیدھ پر رکھنے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قبلہ کی سیدھ پر رکھو جو شرائط نماز میں سے ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خضوع و خشوع کے ساتھ اللہ سے لو لگانا مقصود ہو [۱]

علامہ طبرسی نے اس کی تفسیر میں پانچ قول نقل کئے ہیں مگر ہمارا ترجمہ ”چہروں کو سیدھ پر رکھو“ ان سب ہی پر منطبق ہے۔ اسی لئے ہم نے بریکٹ وغیرہ کے اندر کوئی ایسی تشریح نہیں کی جو صرف ایک قول پر مبنی ہو سکے۔

فَرِيقًا هَدَىٰ وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ ۗ إِنَّهُمْ اتَّخَذُوا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ

مِنْ دُونِ اللَّهِ وَيَحْسَبُونَ أَنََّّهُمْ مُّهْتَدُونَ ﴿۳۰﴾

”ایک گروہ کی اس نے ہدایت کی اور ایک گروہ پر گمراہی ثابت ہوگئی [۲] بلاشبہ انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو سرپرست بنا لیا اور پھر سمجھتے ہیں کہ وہ صحیح راستے پر ہیں۔“

گمراہی ثابت ہونے کے ساتھ شیطانوں کو سرپرست بنانے کا ذکر اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اللہ کی طرف سے کسی پر بلا وجہ گمراہی ثابت نہیں ہوتی بلکہ یہ اس کے غلط کردار کا ایک نتیجہ ہوتا ہے جو ظہور پذیر ہوتا ہے۔ [۳]

يٰۤاٰدَمُ خُذْ وَاٰزِيْنَتَكَ مِنْ عِنْدِ كُلِّ مَسْجِدٍ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۗ اِنَّهٗ

لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾

”اے آدم کی نسل کے لوگو! ہر نماز کے وقت اپنی آرائش کی صورتیں اختیار کرو اور کھاؤ پیا اور فضول خرچی نہ کرو۔ یقیناً وہ فضول خرچی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔“

واجب حد آرائش کی جو نماز میں ضروری ہے وہ لباس ہے جس سے ضروری ستر ہو اور وہ مرد کے لئے صرف اتنا ہے کہ جو ساتر عورتیں ہو اور عورت کے لئے چہرہ اور دونوں ہاتھوں کے سوا پورے جسم کا لباس ہے۔ اس لئے بعض مفسرین نے زینت کی تفسیر یہی کی ہے۔ [۴] مگر یہ بعید نہیں ہے کہ اس میں لفظ زینت کے اندر اس کے ماسوا چیزیں مثلاً لباس فاخرہ اور بالوں میں لٹکا اور عطر وغیرہ بھی داخل ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے متعلق حکم وجوبی نہیں بلکہ استحبابی ہو جیسا کہ امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام دونوں بزرگوں کی حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے۔ [۵] امام حسن علیہ السلام کا عمل بھی وارد ہوا ہے کہ آپ نماز کے وقت اپنے سب سے بہتر لباس کو زیب جسم فرماتے تھے اور پھر جب کسی نے اس کا

[۱] ای اخلصوا اسجودکم (جلالین)

[۲] حق ای وجب (مجمع البیان)

[۳] انه فعل بهم ما فعل من الضلال لانهم اتخذوا الشیاطین اولیاء (تبیان)

[۴] زینتکم ما یستر عورتکم (جلالین)

[۵] ای خذوا ثیاباً بکم التي تتزینون بها للصلوة فی الجمعات والا عیاد عن ابی جعفر الباقر علیہ السلام وقیل ان اخذ الزینة هو المشط عند کل صلوة روی ذلك عن الصادق علیہ السلام (مجمع البیان)

سبب دریافت کیا تو حضرت نے اس آیت کو پیش فرمایا۔^[۱]

ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس آیت میں ”عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ“ سے مراد خاص خاص نمازوں کے ہنگام یعنی جمعہ و عیدین مراد ہیں۔^[۲]

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَذَلِكَ نَفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ^[۳]

”کہیے کہ کس نے حرام کیا ہے اللہ کی طرف کے سامان آرائش کو جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے اور اچھی غذاؤں کو؟ کہیے کہ وہ مومنین کے لئے دنیوی زندگی میں بھی ہیں اور روز قیامت تو نری کھری انہی کے لئے ہوں گی۔ اسی طرح ہم اپنی آیتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں ان کے لئے جو علم رکھتے ہیں۔“

فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَالْتَعْلُقِ نَحْوِي قَوَاعِدِ كَالْحَاظِ مِنْ بَظَاهِرِ كَائِنَاتِهِ يَأْتِلِبَتَةً كَالسَّاهِءِ جُوْمَقْدَرِهِ يَعْنِي نِعْمَتِيْنَ ثَابِتِ هِيْنَ مُسْلِمَانُوْا كَاللَّذِيْنَ لَمْ يَكُنْ فِي دُنْيَا هِيْ مَكْرٍ هِيْهَا غَيْرِ مُؤْمِنٍ هِيْ اَنْ كَالسَّاهِءِ مُخْصُوْصِ هِيْنَ - غَيْرِ مُؤْمِنٍ كَالاِنْ فِي كُوْنِيْ حَصَّةٌ هِيْ نِيْسِ هُوْكَ -^[۴]

مگر ایک دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ اٰمنوا کے ساتھ متعلق ہو یعنی جو زندگانی دنیا میں ایمان لائے ہیں ان کے لئے یہ چیزیں روز قیامت بالکل مخصوص ہوں گی۔^[۵]

بعض مترجمین نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے^[۶] اور پہلے احتمال کی بنا پر بھی مطلب ایک دوسرا ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ لام استحقاق کا ہو یعنی یہ نعمتیں اس زندگانی دنیا میں حق اہل ایمان ہی کا ہیں مگر یہاں دوسرے لوگ بھی ان کے ساتھ غاصبانہ حصہ اپنا لگالیتے ہیں اور آخرت میں وہ صرف انہی کے قبضہ میں ہوں گی۔ دوسروں کا ان تک دسترس نہ ہوگا۔^[۷]

پھر خالصتہ کے لحاظ سے ایک تیسرا مفہوم بھی قرار دیا ہے۔ وہ یہ کہ یہ نعمتیں اس دنیا میں بھی مومنین کو حاصل ہیں مگر یہاں ان کے ساتھ طرح طرح کے افکار و آلام بھی ملے ہوئے ہیں اور آخرت میں وہ نری کھری ان کے لئے ہوں گی یعنی کسی غم و رنج اور فکر کا شائبہ نہ ہوگا۔^[۸]

[۱]. روى العياشى باسناداه (مجمع البيان)

[۲]. مروى عن ابى جعفر عليه السلام انه قال فى الجمعات والاعباد (تبيان)

[۳]. ثابته للذنين اٰمنوا فى حال خلوصهم يوم القيامة لهم (مجمع البيان)

[۴]. يحتمل ان يكون قوله فى الحيوٰة الدنيا متصلة بالصلة التى هى اٰمنوا (مجمع)

[۵]. واسطه ان لوگوں کے كہ ایمان لائے ہج زندگانی دنیا کے خالص ہوں دن قیامت کے (شاه رفیع الدین)

[۶]. هى للذنين اٰمنوا فى الحيوٰة الدنيا بالاستحقاق وان شاركهم فيها غيرهم (جلالین)

[۷]. هى للذنين اٰمنوا فى الحيوٰة الدنيا للذنين اٰمنوا غير خالصه من الهموم والاحزان والمشقة وهى خالصه يوم القيامة عن ذلك عن

الجبائى (مجمع البيان)

بہر حال اصل کلام کا مقصد وہ ہے جس سے آیات شروع ہوئی ہیں کہ ان لوگوں کا تصور غلط ہے جو بغیر ممانعت شرعی کے کچھ لہذا لہذا دنیا کو ممنوع سمجھ لیں لیکن اگر انسان ممنوع نہیں سمجھتا پھر بھی اس نے ذاتی طور پر کچھ چیزوں کو ترک کرنے کی پابندی کر لی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ اگر خلق خدا کی ہمدردی و عنخواری یا اور کسی مقصد بلند کے لئے ہے تو ممدوح اور باعث رضائے خالق بھی ہوگی۔^[۱]

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَّنَ ۖ وَالْأَثْمَ ۗ وَالْبَعْثُ بِغَيْرِ
الْحَقِّ ۖ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزَّلْ بِهِ سُلْطَانًا ۖ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا
تَعْلَمُونَ ﴿۳۲﴾

”کہیے کہ میرے پروردگار نے تو بس حرام کیا ہے بدکاریوں کو جو کھلی ہوئی ہوں ان میں سے اور جو پوشیدہ ہوں اور شراب کو اور حدود سے ناحق تجاوز کرو اور یہ کہ اللہ کا شریک کرو کسی کو جس کے لئے اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری ہے اور یہ کہ اللہ کی نسبت کہو ایسی بات جو تم جانتے نہیں ہو۔“

شراب کی حرمت

یوں تو اٹھ کے معنی عام گناہ کے ہیں اور اسی کے مطابق ترجمہ یہاں بھی کیا جاتا رہا ہے مگر ایک تو گناہ کے معنی ہی ہیں کسی ممنوع کام کا ارتکاب تو گناہ کو کہنا کہ اسے حرام قرار دیا گیا ہے بظاہر کسی افادیت کا حامل نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ فواحش کا لفظ جس سے متبادر جنسی قسم کے جرائم ہیں، نمبر ایک اور بیغی جس سے متبادر دوسروں کے حقوق کے خلاف کسی بھی صورت سے دستِ تعدی دراز کرنا ہے نمبر 3، ان دونوں کے درمیان حرف عطف کے ساتھ ”الاثم“ کو نمبر 3 بنا کر ذکر کرنا جب اٹھ کا وہ عام مفہوم نمبر 1 اور نمبر 3 پر بھی حاوی ہے، یہ پتہ دیتا ہے کہ یہ نمبر 2 عام مفہوم گناہ نہیں ہے بلکہ کوئی خاص قسم گناہ ہے جو نمبر 1 اور نمبر 3 کے علاوہ ہے۔ جب کہ خود قرآن مجید میں دوسری جگہ اس لفظ کا استعمال شراب کے معنی میں ہوا ہے جس کے شواہد کلام عرب میں بھی موجود ہیں لہذا کیوں نہ یہاں بھی ”الاثم“ کے یہی معنی لئے جائیں اس لئے اس آیت میں بھی زیادہ قوت میرے نزدیک اسی قول کو ہے کہ اس کے معنی شراب کے ہیں^[۲] جیسا کہ میں نے ترجمہ کیا ہے۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا
يَسْتَقْدِمُونَ ﴿۳۳﴾

[۱] ظاہر الآية يدل على انه لا يجوز لاحد تجنب الزينة والملاذ الطيبة على وجه التحريم واما من اجتنبها على ان غيرها افضل منها فلا مانع منه (تبيين)

[۲] قال قوم الاثم هو الخمر وانشه ابن النباري به شربت الاثم حتى ضل عقلي كذا الاثم يصنع بالعقول (تبيين)

”اور جو بھی کسی دور کے لوگ ہوں [۱] ان کی ایک عمر ہوتی ہے تو جب ان کی پوری عمر ہونے کا وقت [۲] آجاتا ہے تو ذرا دیر نہ وہ پیچھے رہتے ہیں اور نہ آگے بڑھتے ہیں۔“

”اجل“ کے معنی مدت مقررہ کے ہوتے ہیں۔ عمر بھی ایک مقررہ مدت ہے۔ اس اعتبار سے وہ خود ایک اجل ہے اور اس مدت کا اختتام موت کے ذریعہ ہوتا ہے، اس لئے موت حقیقتاً اختتام اجل کا نام ہے لیکن یہ اختتام چونکہ موت کی صورت میں ہوتا ہے، اس لئے عرفاً موت کو ”اجل“ کہا جانے لگا ہے۔

يَبْنَئِي أَدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي ۖ فَمَنِ اتَّقَىٰ
وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٣٥﴾ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا
وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٣٦﴾

”اے آدم کی نسل کے لوگو! اگر تمہاری [۳] طرف آئیں کچھ پیغمبر تم میں سے جو تمہارے سامنے میرے احکام پیش کریں تو جو پرہیزگاری سے کام لے گا اور اعمال درست رکھے گا تو ان پر نہ خوف طاری ہوگا اور نہ انہیں افسوس کی نوبت آئے گی اور جنہوں نے ہمارے احکام کو جھٹلایا اور ان کے مقابلہ میں اکڑے کام لیا تو یہ لوگ دوزخ والے ہوں گے کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔“

فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۖ أُولَٰئِكَ يَنَالُهُمُ
نَصِيبُهُم مِّنَ الْكِتَابِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۖ قَالُوا آيِنَ مَا
كُنْتُمْ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ ۖ قَالُوا ضَلُّوا عَنَّا وَشَهِدُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَنَّهُمْ
كَانُوا كَافِرِينَ ﴿٣٧﴾

”تو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا کہ جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگائے یا اس کی آیتوں کو جھٹلائے؟ انہیں جو ان کے مقدر کا لکھا ہے [۴] وہ تو پہنچے گا، یہاں تک کہ جب ان کے پاس آئیں گے ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) ان کی روجوں کو قبض کرتے ہوئے، تب وہ کہیں گے کہ کہاں ہیں وہ جن کی تم اللہ کے سوا دہائی دیتے تھے [۵] وہ کہیں گے کہ

[۱]۔ قبیل ذکر الامۃ یقتضی تقارب اعمالا ہلا العصر (تبیان)

[۲]۔ بیاید میعاد ایشاں (شاہ ولی اللہ) جب آتا ہے وقت ان کا (شاہ رفیع الدین)

[۳]۔ اما اصلہ ان (تبیان) ای ان یأتکم (مجمع البیان)

[۴]۔ بہرہ ایشاں از آنچہ نوشتہ شد در لوح محفوظ (شاہ ولی اللہ)

[۵]۔ تدعون تعبدون (جلالین)

وہ تو ہم سے غائب ہو گئے اور وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ بے شک کافر تھے۔“
 ”انہیں جو ان کے مقدر کا لکھا ہے ضرور پہنچے گا“ اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ دنیا میں رزق و نعمت الہی کا دروازہ ان پر بند نہیں ہوگا [۱]
 اور یہ بھی کہ جو سزا انہیں ملنا ہے، وہ ملے [۲] اور چونکہ الفاظ آیت کا دامن وسیع ہے، اس لئے دنیا و آخرت دونوں کی اچھائی برائی، سب ہی پر انہیں
 حاوی بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ [۳]

قَالَ ادْخُلُوا فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ فِي النَّارِ ط كَلَّمَا
 دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَعَنَتْ أُخْتَهَا ط حَتَّىٰ إِذَا ادَّارَكُوا فِيهَا جَمِيعًا ۗ قَالَتْ أُخْرِبُهُمْ
 لَا وِلَهُمْ رَبَّنَا هَؤُلَاءِ أَضَلُّونَا فَأَتِيهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِنَ النَّارِ ۗ قَالَ لِكُلِّ
 ضِعْفٍ وَلَكِنْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۳۸﴾

”ارشاد ہوگا کہ انہی گروہوں کے ذیل میں جنات اور آدمیوں میں کے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں، تم بھی دوزخ
 میں داخل ہو، جب بھی کوئی گروہ داخل ہوتا ہے تو وہ اپنے ساتھ والے دوسرے گروہ کو لعنت ملامت کرتا ہے [۴]
 یہاں تک کہ جب وہ سب وہاں باہم مل جائیں گے [۵] تو بعد والے پہلے والوں کے لئے کہیں گے کہ پروردگار!
 انہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا تو انہیں دوزخ میں زیادہ عذاب کر۔ ارشاد ہوگا کہ ہر ایک ہی کے لئے دو ناعذاب ہے
 مگر تم جانتے نہیں۔“

”قال“ کا لفظ جس کا ترجمہ کیا گیا ہے ’ارشاد ہو‘ یہ ارشاد لفظی بھی ہو سکتا ہے اور ارادہ الہی کی ایک تعبیر بھی [۶] جیسا کہ کن فیکون میں
 ہوتا ہے۔ ”ہر ایک کے لئے دو ناعذاب ہے، یعنی حیثیتیں مختلف ہیں، کسی اعتبار سے اگلوں کا عذاب زیادہ ہے کہ وہ دوسروں کی گمراہی کا بھی باعث
 ہوئے اور کسی حیثیت سے پچھلے عذاب کے زیادہ مستحق ہیں کہ انہوں نے سابق امتوں کے انجام سے بھی عبرت حاصل نہ کی۔ [۷]
 نتیجہ یہ ہے کہ دونوں ہی عذاب کے یکساں طور پر مستحق ہیں۔“

[۱]۔ مما کتب لہم فی اللوح المحفوظ من الرزق والوجل وغیر ذلک (جلالین)

[۲]۔ ینالہم ما فی الكتاب من عقوبات المعاصی (علی بن ابراہیم)

[۳]۔ قال مجاہد: جمیع ما کتب لہم وعلیہم وھو فی قول عطیة (تبیان)

[۴]۔ لعنت کند قوم دیگر مانند خود را (شاہ ولی اللہ)

[۵]۔ اذارکوا اتلا حقوا (جلالین)

[۶]۔ یجوز ان یکون ذلک اخبار اعن جعلہ ایہم فی جملة اولئک فی النار من غیر ان یکون ہناک قول کہا قال: کونوا قردة خاسئین
 و المراد انه جعلہم کذلک (تبیان)

[۷]۔ یعنی ایک حساب سے پہلی امت کا عذاب بڑھا کہ پچھلوں کو راہ ڈالی اور ایک طرح پچھلوں کا بڑھا کہ پہلوں کا حال دیکھن کر عبرت نہ پڑی (موضح القرآن)

وَقَالَتْ أُولَهُمْ لِأَخْرِبُهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فذُوقُوا الْعَذَابَ
بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿٦٩﴾

”اور کہا ان میں کے پہلوں نے ان میں کے بعد والوں سے، تو پھر تم کو ہم پر کوئی فوقیت تو نہ ہوئی تو بس چکھو اس عذاب کو اس وجہ سے جو تم اعمال کرتے تھے۔“

بعد والے تو یہ چاہتے تھے کہ قبل والوں پر ذمہ داری عائد کر کے کہ انہوں نے ہمیں گمراہ کیا خود بری الذمہ ہو جائیں اور بالکل نہ بھی بچیں تو پہلے والوں پر عذاب تو ان سے زیادہ ہو اور یہ ان کی بہ نسبت کم عذاب کے مستحق ہوں اس لئے کہ یہ ’بیچارے‘ دوسروں کے کہنے میں آگئے تھے۔ اس صورت میں ان کو پہلوں کے مقابل میں کچھ فوقیت ہوتی، خواہ مطلق نجات کی بنا پر اور خواہ کی عذاب کی بنا پر مگر یہ اس کے قبل کی آیت میں معلوم ہو گیا کہ نہیں، نہ یہ عذاب سے بچ سکتے ہیں اور نہ پہلوں کی بہ نسبت ان کے عذاب میں کمی ہے۔ اس طرح پہلے لوگوں کو ان پر اس طعنہ زنی کا موقع ہو گیا کہ تم جو چاہتے تھے کہ ہم پر ذمہ داری عائد کر کے خود ہم سے بہتر حالت میں ہو جاؤ، یہ تمہاری امید بر نہیں آئی بلکہ معلوم ہو گیا کہ تم پورے پورے اپنی گمراہی اور اپنی بد اعمالیوں کی ذمہ دار ہو تو اب ان بد اعمالیوں کا مزہ چکھو اور سزا برداشت کرو۔

سیاق کلام کا ظاہر تو یہی ہے کہ یہ ”فذوقوا العذاب“ اب سزا اپنے اعمال کی چکھو، انہی قبل والوں کے کلام کا تہمتہ ہے مگر بعض مفسرین نے اس کو ان کے کلام سے خارج کر کے ارشاد حضرت احدیت قرار دیدیا ہے یعنی ان کی بات اس پر ختم ہو گئی کہ ”تمہیں ہم پر فوقیت نہیں ہوئی“ اور اب اللہ یہ ارشاد فرماتا ہے کہ ”بس اب اپنے کردار کا مزہ چکھو“ مگر مجھے پہلے معنی زیادہ درست معلوم ہوتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا
يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّى يَلْبِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ ۗ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ﴿٧٠﴾
لَهُمْ مِنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۗ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ﴿٧١﴾

”یقیناً وہ کہ جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان کے مقابلہ میں اکڑ سے کام لیا، ان کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھلیں گے اور نہ وہ بہشت میں داخل ہوں گے اس وقت تک کہ جب تک اونٹ سوئی کے ناکے میں نہ چلا جائے اور اسی طرح ہم بالادیتے ہیں گنہگاروں کو۔ ان کے لئے دوزخ کا بچھونا ہے اور ان کے اوپر سے اوڑھنا بھی ہے اور یوں ہی ہم پاداش دیتے ہیں ظالموں کو۔“

کافروں کا بہشت میں جانا غیر ممکن

”آسمان کے دروازے کھلنے“ سے مراد ہے رحمت خدا کا متوجہ ہونا اور کلام معصوم میں اس کی تشریح یہ وارد ہوئی ہے کہ ان کی دعا اور ان

[١] قال تعالى لهم: فذوقوا العذاب بما كنتم تكسبون (جلالین)

کے اعمال بارگاہ الہی کی طرف بلند اور قابل قبول نہیں ہوتے۔ [۱] ”اس وقت تک یہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں نہ جائے..... یہ تعلق الحال بالمحال ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی بات میں ناممکن شرط لگا کر خود اس بات کو ناممکن ظاہر کیا جائے۔ اب یہاں معنی یہ ہیں کہ جیسے اونٹ کا سوئی کے ناکے میں جانا غیر ممکن ہے، ویسے ہی ان کا بہشت میں جانا غیر ممکن ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ
الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۳۶﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غَلٍّ تَجَرَّيْ مِنْ
تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارَ ۖ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَذَا ۖ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا
أَنْ هَدَانَا اللَّهُ ۖ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلٌ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۖ وَتُودُّونَا أَنْ تِلْكَمُ الْجَنَّةُ
أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۳۷﴾

’اور جو ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال کرتے رہے ہم کسی پر پابندی عائد نہیں کرتے مگر اس کے مقدور بھر، یہ لوگ بہشت والے ہیں کہ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور ہم دور کر دیں گے جو ان کے سینوں میں کدورت ہو، ان کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ کہتے ہوں گے کہ شکر اللہ کا جس نے ہم کو اس راستے پر لگایا اور ہم یہ راستہ نہیں پاسکتے تھے اگر اللہ ہمیں راہ پر نہ لگاتا بلاشبہ آئے ہمارے پروردگار کے پیغمبر سچائی کے ساتھ اور آواز دی جائے گی انہیں کہ یہ بہشت ہے جس کے تم وارث قرار دیئے گئے ہو ان اعمال کے سبب سے جو تم نے انجام دیئے تھے۔“

بہشت میں قلبی کدورتیں دور ہو جائیں گی مگر کون سی؟

اہل بہشت کے متعلق اس ارشاد میں کہ ”ہم نے دور کر دی ہوگی جو ان کے سینہ میں کدورت ہو“ کدورت سے مراد ذاتی اور دنیوی امور سے متعلق منازعات ہی ہو سکتے ہیں جن کا اصول ایمان اور اس صلاح عمل سے کوئی تعلق نہ ہو جو معیار دخول جنت ہے۔ اس لئے کہ منازعت اگر ان شعبوں سے متعلق ہوئی تو جو سرنامہ اوصاف اہل جنت کا یعنی الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ، وہ دونوں طرف ایک ساتھ موجود ہی نہ ہوگا تو پھر بعد کے تفصیلات اس سے کہاں متعلق ہو سکتے ہیں؟

اس سے ظاہر ہے کہ کچھ مفسرین نے جو اس آیت کے مضمون کو حضرت علی بن ابی طالب ؑ اور ان سے جنگ کرنے والے افراد مثلاً طلحہ و زبیر وغیرہ سے مرہبط کیا ہے جیسا کہ شاہ ولی اللہ اپنے حاشیہ میں فرماتے ہیں:

”مثل آنچه میان عثمان و علی و طلحہ و زبیر و عائشہ و عثمان واقع شد“

اور ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر صاحب نے تو اسے حضرت علی بن ابی طالب ؑ کی زبانی نسبت دے کر وارد کر دیا ہے۔

[۱] قال ابو جعفر ؑ: اما المؤمنون فيرفع اعمالهم و ارواحهم الى السماء فتفتح لهم ابوابها (تبيين)

فرماتے ہیں:

”معلوم ہوا کہ نیکیوں کے دل میں بھی آپس میں خفگی ہوگی، جنت کے قریب پہنچ کر آپس میں دل صاف ہوں گے، تب جنت میں جاویں گے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ میں اور عثمان اور طلحہ اور زبیر ان لوگوں میں ہیں اور جنت کے وارث فرمایا یعنی آدم کی میراث پائی۔“ (موضح القرآن)

ہم اس قول کی نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف درست نہیں سمجھتے کیونکہ جیسا کہ پہلے کہا گیا وہ خلاف اصول ہے۔ مزید براں یہ کہ قرآن تو قلبی ”کدورتوں“ کو کہہ رہا ہے، نہ یہ کہ جب یہ قلبی کدورت عملی حیثیت سے خوز یزیوں کے درجہ پر پہنچ جائے اور پھر ایسی ذات کے مقابلہ میں جس کے لئے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرمائے ہوں: ”حَرْبُكَ حَرْبِي“ تم سے جنگ مجھ سے جنگ ہے، اور جس کی محبت اور عداوت کو معیار ایمان و کفر قرار دیا گیا ہے: يَا عَلِيُّ حُبُّكَ إِيمَانٌ وَبُغْضُكَ كُفْرٌ وَنِفَاقٌ“ اے علی تمہاری محبت ایمان اور تمہاری دشمنی کفر و نفاق ہے..... وہاں اس آیت کے مضمون کو لے جا کر منطبق کرنا صرف اپنے دل کی تسلی یا سخن پروری کے سوا، کیا حقیقت پروری کا نتیجہ ہو سکتا ہے؟

ایک دوسرا مفہوم ان الفاظ کا بہت قرین قیاس یہ ہے کہ ان کے دلوں سے کینہ و عداوت دور ہو گئے ہوں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسے دنیا میں ایک آدمی دوسرے کی بلندی کو دکھ کر جل جاتا ہے اور اس سے کینہ و عداوت پر کمر باندھ لیتا ہے، یہ بات وہاں نہیں ہوگی۔ اہل جنت آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ نہ کینہ رکھتے ہوں گے نہ عداوت و رشک و حسد کا وہاں نام نہ ہوگا [۱] جیسے دوسرے مقام پر بہشت اور اہل بہشت کے اوصاف میں ہے:

لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْتِيهَا إِلَّا قِيْلًا سَلَامًا ۝۱۵

وہاں انہیں کوئی لغو بات سننے میں نہ آئے گی اور نہ گناہ کی بات سوا ہر طرف دعائے خیر و سلامتی کی باتوں کے۔ (سورہ واقعہ)
اس کے بعد تو اس کے مضمون کا کوئی تعلق دنیا کے باہمی تعلقات کی کشیدگیوں اور منازعتوں کے ساتھ رہتا ہی نہیں ہے۔

آخری جملوں میں ایک بڑا لطیف اسلوب ہے کہ بندے بتقاضائے عبودیت اپنے انجام بخیر ہونے کا واحد سبب توفیق الہی کو قرار دے رہے ہیں کہ ہم اس منزل تک پہنچ ہی نہیں سکتے تھے اگر اس کی توفیق نہ ہوتی اور اللہ اپنے کرم سے اس کا سہرا ان کے حسن اختیار کے سر پر باندھ رہا ہے کہ یہ تم پر کوئی مفت کا احسان تھوڑی ہے۔ یہ تو تمہارے حسن خدمات کا صلہ ہے جو تمہیں آج دیا جا رہا ہے۔

وَنَادَى أَصْحَابُ الْجَنَّةِ أَصْحَابَ النَّارِ أَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ
وَجَدْتُمْ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ۚ قَالُوا نَعَمْ ۚ فَأَذَّنَ مُؤَذِّنٌ بَيْنَهُمْ أَنْ لَعْنَةُ اللَّهِ
عَلَى الظَّالِمِينَ ۝۱۶ الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَنِ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمْ
بِالْآخِرَةِ كَافِرُونَ ۝۱۷

[۱] نزع الغل في الجنة تصبغة الطباع ولسقاط الوسوس واعطاء كل نفس مناها ولا تتبني ما لغيرها (تبیان)

”اور آواز دیں گے [۱] بہشت والے دوزخ والوں کو کہ ہم نے تو جو ہم سے ہمارے پروردگار نے وعدہ کیا تھا، اسے سچا پایا تو کیا تم نے بھی اس وعدہ کو جو تم سے تمہارے پروردگار نے کیا تھا، سچا پایا؟ وہ کہیں گے ہاں تو ایک اعلان کرنے والا ان کے درمیان اعلان کرے گا کہ اللہ کی لعنت ہو ظالموں پر، جو اللہ کی راہ سے روکتے رہے ہوں [۲] اور اسے کج بنانے کے درپے ہوں اور وہ آخرت کا انکار کرتے ہوں۔“

اہل بہشت اور اہل دوزخ کی دلچسپ اور عبرت انگیز گفتگو

”کج بنانے کے درپے ہونا“ شکوک اور بیجا اعتراضات کے ذریعہ سے راہ راست کو مشتبہ بنانے کی کوشش کرنا ہے [۳] ان لوگوں سے جو وعدہ تھا، وہ ان کی بد اعمالیوں پر عذاب کا تھا جو اصطلاحی طور پر وعید کہلاتا ہے مگر قرآن مجید نے اسے خواہ عام مفہوم کے اعتبار سے اور خواہ بطور طنز تعبیر کیا ہے وعدہ ہی کے لفظ کے ساتھ [۴]۔

من جملہ کثیر التعداد آیات کے یہ آیت بھی لعن کے استحسان پر دلالت کرتی ہے اور اس سے ثابت ہے کہ بد اعمالی کا ایک درجہ وہ ضرور ہے جو لعنت خدا کا استحقاق پیدا کرتا ہے اور بد اعمالی میں خاص چیز جو صراحتاً اس آیت میں درج ہے وہ راہ حق کو مشتبہ بنانے اور لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش ہے۔

شاہ عبدالقادر صاحب لکھتے ہیں: ”حق تعالیٰ نے قرآن شریف میں بے انصاف فرمایا ہے اکثر گناہوں پر لیکن ہر گناہ پر لعنت نہیں مگر ایسوں پر۔ (موضح القرآن)

پھر کم از کم ”ایسوں پر“ لعنت میں تمام امت کو متفق ہو جانا چاہیے اور اس کو دشنام نہیں سمجھنا چاہیے۔

اعلان کرنے والا جس کا ذکر قرآن میں ہے ملک تو ہو ہی سکتا ہے جس کے لئے ایک روایت ہے کہ وہ مالک خازن جہنم ہوں گے مگر ایک روایت جو کئی طرق سے وارد ہوئی ہے، یہ بتاتی ہے کہ یہ اعلان کرنے والے اللہ کی طرف سے حضرت علی بن ابی طالب ؑ ہوں گے اور یہ آپ کے ان مناصب میں سے ایک ہے جو آپ کو روز جزاء منجانب اللہ حاصل ہوں گے۔

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۖ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسَيِّئِهِمْ ۖ وَتَادُوا
أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ سَلِمَ عَلَيْكُمْ ۖ تَسَلَّمُ يَقُولُونَ هِيَ خُلُوعًا وَهُمْ يَطْمَعُونَ ﴿٣٦﴾ وَإِذَا صُرِفَتْ
أَبْصَارُهُمْ تَلْقَاءَ أَصْحَابِ النَّارِ ۖ قَالُوا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٣٧﴾

”اور ان دونوں کے درمیان ایک حد فاصل ہوگی ”اعراف“ پر کچھ اشخاص ہونگے جو ہر ایک کو اس کی صورت سے

[۱]. ناذی ای وینادی (مجمع البیان)

[۲]. يعرضون وقيل معناه يصر فون غير هم (مجمع)

[۳]. يطلبون لها العوج بالشبه التي يلبسون بها ويهيمون انما تقدر فيها (تبيان).

[۴]. ما وعدكم ربكم من العذاب (جلالين)

پچھانتے ہوں گے اور وہ بہشت والوں کو آواز دیں گے کہ سلام ہو تم پر، وہ اس میں داخل نہیں ہوئے حالانکہ وہ اس کی خواہش رکھتے ہوں گے اور جب ان کی نگاہیں دوزخ والوں کی طرف مڑتی ہیں تو وہ کہتے ہیں، اے ہمارے پروردگار! ہمیں ظالم جماعت کے ساتھ قرار نہ دے۔“

اعراف کا ذکر

”ان دونوں“ یعنی بہشت و دوزخ کے درمیان [۱] ایک پردہ ہے یا حد فاصل ہے یعنی ایک تیسری جگہ ہے جو دونوں کے درمیان ہوگی، اسی کا نام اعراف ہے جس کے نام پر اس سورہ کا نام ”اعراف“ ہو گیا۔

اعراف کے متعلق ایک قول یہ ہے کہ وہ بہشت اور دوزخ کے درمیان ایک جگہ ہے جہاں ایسے اشخاص کو جگہ دی جائے گی جو دائرہ تکلیف سے خارج ہیں، جن سے نہ جزاء کا وعدہ ہے اور نہ انہیں سزا کا استحقاق ہے یا ایسے لوگ جن کے نیک اور بد اعمال کا پلہ برابر ہے۔ [۲] مگر شاہ عبدالقادر صاحب لکھتے ہیں کہ:

”جنت و دوزخ کے درمیان میں ایک دیوار ہوگی، اس کے سرے پر ایک مرد ہیں نجات والے جو حشر اور حساب سے فارغ ہیں، بہشتی اور دوزخی کو نشان سے پہچان کر جنت والوں کو خوشخبری کہیں گے سلامتی کی“ (موخ القرآن)

کچھ دوسرے مفسرین کا کلام بھی اس کے موافق ہے [۳] اور احادیث اہل بیت علیہم السلام میں جن کی تائید بعض روایات اہل سنت سے ہوتی ہے، یہ وارد ہوا ہے کہ یہ ہستیاں آل محمد علیہم السلام کی ہیں جو مومن اور کافر میں تمیز دے رہی ہوں گی۔ اس سلسلہ میں جناب امیر علیہ السلام کا لقب: ’قسیم الجنة والنار‘ بہشت اور دوزخ کے تقسیم کرنے والے، کتب فریقین میں مسلم ہے۔

یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اہل بہشت کا سلام سلام علیکم ہے، السلام علیکم نہیں ہے جس کا ایک فریق پابند ہو گیا ہے اگرچہ درست وہ بھی ہے مگر آخر سلام علیکم کے جملہ سے پرہیز کی کیا بنیاد ہو سکتی ہے؟

جناب شیخ طوسی نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی جو حدیث درج کی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اعراف والی بلندی پر جہاں سے جنت اور دوزخ دونوں زیر نظر ہوتے ہیں، معصومین علیہم السلام اہل ایمان کی اس جماعت کو اپنے ساتھ لئے ہوئے ہوں گے جن کی بد اعمالیاں ابھی تک دخول جنت سے سدرا رہی ہیں [۴] یہ جماعت وہ ہے جو اہل جنت کو بہشت میں جاتے دیکھ کر انہیں سلام کرتی ہے اور خود یہ لوگ اس کے امیدوار ہیں کہ یہی معصومین جنہیں وہ گھیرے ہوئے ہیں، ان کی شفاعت کریں تو ان کے لئے بھی بہشت میں داخلہ کا حکم ہو جائے اور یہی وہ ہیں کہ جب ان کی نگاہ اہل دوزخ پر پڑتی ہے تو وہ اپنے پروردگار سے پناہ طلب کرتے ہیں کہ پروردگار! ہمیں اس جماعت کے ساتھ قرار نہ دینا۔

[۱] درمیان بہشت و دوزخ حجاب بیست (شاہ ولی اللہ)

[۲] رجال استوت حسناً تہم و سباً تہم کہا فی الحدیث (جلالین)

[۳] حجاب حجاز قبیل ہو سورہ الاعراف و علی الاعراف و ہو سورہ الجنۃ (جلالین)

[۴] کہا یوقف قائد الجیش مع الضعفاء من جندۃ (تبیان)

ہماری قدیم تفسیر میں معصوم کی زبانی جو حدیث ہے، وہ بھی قریب قریب یہی ہے۔^[۱]

وَنَادَى الْأَعْرَابُ رِجَالًا يَعْرِفُونَهُمْ بِسِيمَاهُمْ قَالُوا مَا آغَىٰ عَنْكُمُ
بِحُجَّتِكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ ﴿۳۸﴾ أَهَؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللَّهُ
بِرَحْمَةٍ ۖ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ ﴿۳۹﴾

”اور آواز دیں گے اعراف والے کچھ لوگوں کو جنہیں وہ ان کی صورت سے پہچانتے ہوں گے کہ تمہیں تمہاری جمع
آوری اور اس گھمنڈ نے جو تم رکھتے تھے^[۲] کچھ فائدہ نہ دیا کیا یہی وہ ہیں جن کے لئے تم نے قسمیں کھائی تھیں کہ
اللہ ان تک اپنی رحمت نہیں پہنچائے گا تم داخل ہو بہشت میں، نہ تم پر خوف ہے اور نہ تم کسی رنج و غم سے دوچار ہو
گے۔“

معانی، بیان کی اصطلاح میں یہ انداز کہ کسی جماعت کا پہلے بطور غائب ذکر ہو اور پھر اسی کو صیغہ حاضر کے ساتھ مخاطب بنا لے
”التفات من الغيبة الى الخطاب“ کہلاتا ہے۔ یہاں اہل اعراف کی آواز میں پہلا مخاطب اہل دوزخ سے ہوا اور اس میں اہل بہشت کا
ذکر صیغہ غائب کے ساتھ اس طرح ہے کہ:

”کیا یہی وہ ہیں جن کے لئے تم نے قسمیں کھائی تھیں کہ اللہ ان تک اپنی رحمت نہیں پہنچائے گا۔“ اس طرح اہل دوزخ کو شرمندہ اور ان
کے سابق مرمومات کو یاد دلا کر پشیمان کرتے ہوئے آخر میں مخاطب اہل بہشت کے ساتھ ہو گیا کہ یہ تو ان کے مرمومات تھے جو غلط ثابت ہو چکے۔
اب تم جاؤ اور شوق سے بہشت میں داخل ہو۔^[۳] اگر پہلے مخاطب کے ساتھ اس مخاطب کو دیکھا جائے تو یہ ایک نئی قسم التفات ہوگی یعنی التفات من
الخطاب الى الخطاب، جس میں انداز کلام کی تبدیلی مخاطب کے بدلنے سے ہوتی ہے یعنی ایک شخص یا جماعت سے خطاب کرتے کرتے ایک دم
مخاطب دوسرے سے ہونے لگے۔ یہ بھی فصحاء کلام میں ہر زبان میں کبھی کبھی ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ معانی بیان کی کتابوں میں ”التفات“
کے اقسام میں اس قسم کا ذکر نہیں۔ اور غالباً اسی وجہ سے اکثر مفسرین نے اس جملہ کو کہ ”ادْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا أَنْتُمْ
تَحْزَنُونَ“ سلسلہ کے ساتھ اہل اعراف کی آواز کا جزء قرار دینے میں زحمت محسوس کی ہے اور انہوں نے اس میں یہ ٹکڑا مقدر (ذہن میں پوشیدہ)
قرار دیا ہے کہ ”ان سے کہا گیا کہ“ تم جنت میں داخل ہو۔^[۴]

[۱] عن ابی عبد اللہ قال: الاعراف کثبان بین الجنة والنار والرجال الائمة صلوات الله عليهم يقفون على الاعراف مع شيعتهم
فيقول الائمة لشيعتهم من اصحاب الذنوب الخ (علی بن ابراہیم)

[۲] جمعكم الاموال والعدد في الدنيا (مجمع البيان) جمعيت شما و آنکه سرکشی حی کرديد (ولی الله)

[۳] ثم يقولون لهؤلاء (مجمع البيان)

[۴] قد قيل لهم ادخلوا الجنة (جلالین) گفته شد ايشان را که در آئيد به بهشت (شاه ولی الله) کہا گیا ان کو بہشت میں داخل ہو (شاه

مگر ہمارے نزدیک اس تقدیر کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہمارے قول کے لئے سند کافی ہے ^[۱] قرآن مجید کے معجزہ انداز کے اسلوب بیان سے اس مقام پر اور اس مطلب کو دیکھتے ہوئے میری آنکھوں کے سامنے تو جیسے ایک منظر اس وقت کا جسم شکل میں یہ آتا ہے کہ کامل الایمان اور نیک اعمال لوگ جنت میں جا رہے ہیں اور یہ ہستیاں جو بیچ میں کھڑی ہوئی ادھر ادھر کا معائنہ کر رہی ہیں ان جنت کی طرف جانے والوں کے بارے میں اہل دوزخ کو مخاطب کر کے ان کے دنیاوی دوحیات کے تشنیعات کو یاد دلا کر تاز یا نہ لگا رہی ہیں کہ دیکھو! یہ وہ لوگ ہیں جنہیں تم کہتے تھے کہ انجام ان کا خراب ہے دیکھو آج وہ کس طرح بلا توقف بہشت عنبر سرشت کی طف جا رہے ہیں۔ بس اب جیسے ان کے یہ الفاظ ان بہشت کی طرف جانے والوں کے کان میں گئے اور انہوں نے محسوس کیا کہ یہ ہمارا کچھڑ کر ہے تو وہ ٹھٹھک گئے اور مڑ کر دیکھنے لگے کہ یہ کیوں ہیں جو ہمارے لئے یہ فرما رہے ہیں۔ ان کا یہ رکنا اور مڑ کر دیکھنا ان الفاظ کی کہنے والی ہستیاں نے دیکھ لیا اور انہیں مخاطب کر کے کہا ”اے تم کیوں رکتے ہو.....؟ یہ تو ہم ادھر والوں سے کہہ رہے ہیں، تم اپنی راہ جاؤ، اس جنت میں داخل ہو جو گویا تمہاری منتظر ہے اور اب اطمینان رکھو کہ اس میں داخل ہونے کے بعد تمہیں کسی خوف کا سامنا ہوگا اور نہ حزن و ملال درپیش ہوگا۔ یہ جیسے ان کی ماضی کی زندگی کی طرف اشارہ ہے کہ تم نے توحق کی راہ میں عمر بھر خوف اور حزن کی زندگی گزاری، اس کے صلہ میں اب یہ جنت تمہیں مبارک جس میں خوف اور حزن کا گزر ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ انداز گفتگو بتا رہا ہے کہ یہ افراد اور محشر کے نمائندہ ہیں اور یہیں پر جو کھڑے ہیں، وہ اس کا رخا نہ عدل و مجازاۃ کے ایک کارندہ کی حیثیت سے جن کے قصور ان کی آمد کے لئے آغوش کشادہ ہیں مگر انہیں ابھی اپنے کارہائے منہی سے فرصت نہیں ہے کہ وہ جا کر اپنے قصور میں متمکن ہوں۔

وَنَادَىٰ أَصْحَابُ النَّارِ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ آفِضُوا عَلَيْنَا مِنَ الْمَاءِ أَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ
اللَّهُ ۗ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ حَرَّمَهَا عَلَى الْكٰفِرِينَ ۗ ۝۵۱ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَهْوًا
وَلَعِبًا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۗ فَالْيَوْمَ نَنسِفُهُمْ كَمَا نَسَوٰ اِلِقَاءَ يَوْمِهِمْ
هٰذَا ۗ وَمَا كَانُوْا بِآيٰتِنَا يَجِدُوْنَ ۝۵۱

”اور آواز دیں گے دوزخ والے بہشت والوں کو، ڈال دو ہماری طرف بھی ^[۲] تھوڑا سا پانی یا اور جو تمہیں اللہ نے عطا کیا ہے وہ کہیں گے کہ اللہ نے ان دونوں چیزوں کو حرام کیا ہے کافروں پر، وہ جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشہ بنا لیا اور جنہیں زندگی دنیا نے فریفتہ رکھا۔ اب آج ہم انہیں بھلاوے میں ڈالیں گے اسی طرح جیسے وہ اپنے اس دور کے سامنے آنے کو بھولے رہے اور جیسے وہ ہماری آیتوں کو برابر جھٹلاتے رہے۔“

دوسری آیت کے آخر میں یہ الفاظ کہ ”ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے“ یہ بتلاتے ہیں کہ اہل بہشت کا جواب اس پر ختم ہو گیا ہے کہ اِنَّ
اللَّهَ حَرَّمَهَا عَلَى الْكٰفِرِينَ ۗ ”اللہ نے ان دونوں چیزوں کو حرام کیا ہے کافروں پر۔“ اور اس کے بعد یہاں سے کہ: الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ

[۱]. اضطربت اقوال المفسرين في القائل لهذا القول... والصحيح ما ذكرنا لانه المروي عن الصادق عليه السلام (مجمع البيان)

[۲]. الا فاضة اجراء المانع من علو (مجمع البيان) بریزید بر ما (شاه ولی اللہ) ڈالو اوپر ہمارے (شاہ فیج الدین)

لَهُوَ أَوْلَعِبًا” جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا لیا، یہ خود خالق کا ارشاد ہے [۱] اور اسی لئے ”ننساہم“ کے معنی ہم نے نہ بھولنے کے نہیں بلکہ بھلاوے میں ڈالنے کے درج کئے ہیں کیونکہ بھولنے کی نسبت خالق کی طرف درست نہیں ہے۔ [۲]

وَلَقَدْ جِئْتُمُوهُمْ بِكِتَابٍ فَصَلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۵۶﴾

”اور ہم ان کے پاس لائے ہیں ایک ایسی کتاب جسے پورے علم کے ساتھ ہم نے تفصیلی بیانات کا حامل بنایا ہے، سراسر رہنمائی اور رحمت قرار دیتے ہوئے [۳] ان کے لئے جو ایمان لائیں۔“

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ ۚ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلَهُ يَقُولُ الَّذِينَ نَسُواهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَاءَتْ رُسُلٌ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَنَا مِنْ شَفَعَاءَ فَيَشْفَعُوا لَنَا أَوْ نُرَدِّدْ فَتَعْمَلْ غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ ۚ قَدْ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۵۷﴾

”کیا انتظار ہے انہیں سوا اس کے کہ اس کا انجام [۴] ان کے سامنے آئے؟ جس دن اس کا انجام آئے گا تو وہ جنہوں نے اس کو پہلے بھلایا ہوگا کہیں گے کہ بے شک ہمارے پروردگار کے پیغمبر ہمارے پاس سچائی کے ساتھ آئے تھے تو کیا اب ہمارے کچھ سفارشی ہیں جو ہماری سفارش کریں یا ہم واپس کئے جائیں تو اب ایسے اعمال کریں جو پہلے اعمال سے مختلف ہوں، بلاشبہ انہوں نے اپنے لوگھائے میں مبتلا کیا ہے اور اب غائب ہو گئے ہیں ان سے وہ سب جو یہ بہتان باندھا کرتے تھے۔“

”اس کا انجام“ یعنی جو عذاب آخر میں ان کے لئے مقدر ہے۔ اس کا شعوری طور پر تو انتظار کافروں کو نہیں ہے کیونکہ وہ اسے مانتے ہی نہیں بلکہ مومنین حقیقت میں اس کا انتظار رکھتے ہیں مگر چونکہ وہ ایمان لانے میں دیر کر رہے ہیں تو ان کی سرزنش کے طور پر کہا جا رہا ہے کہ ابھی جب موقع ایمان لانے کا ہے وہ ایمان نہیں لاتے تو کیا اس وقت کا انتظار ہے جب عذاب آئی جائے اور پھر موقع ایمان لانے کا باقی ہی نہ رہے [۵] ایک تصور یہ بھی صحیح ہو سکتا ہے کہ نہیں، انتظار واقعی ان کو تھا چونکہ انہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اطلاع دینے سے دل کے اندر ایک تذبذب کی کیفیت تو کم سے کم

[۱] یحتمل ان یکون رفاعا بالابتداء ویکون اخبارا من اللہ تعالیٰ علی وجه الذم (تبیان)

[۲] ننساہم نترکہم فی النار (جلالین) فراموش کر دینا ترک ایشان است حد دوزخ (فتح الرحمن)

[۳] ہدی حال من الہاء (جلالین) بیوز ان یکون حالا و بیوز ان یکون مفعولا لہ (مجمع البیان)

[۴] عاقبة ما فیہ (جلالین) مصداق این وعدہ (شاکولی اللہ)

[۵] انما اضاف الیہم مجاز الا انہم کانوا جا حدین لذلك غیر متوقعین وانما کان ینتظر بہم المؤمنون (تبیان)

پیدا ہوتی ہی تھی تو وہ راستہ دیکھتے تھے کہ دیکھیں ان کی دی ہوئی ان خبروں کا انجام کیا ہوتا ہے؟^[۱]

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى
الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا ۖ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ
مَسْجَرَاتٍ بِأَمْرِهِ ۗ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۗ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿۵۲﴾

”یقیناً تمہارا پروردگار وہ اللہ ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پھر عرش کی جانب توجہ فرمائی وہ رات کا پردہ ڈالتا ہے دن پر کہ اسے تیزی کے ساتھ جا پکڑتی ہے^[۲] اور سورج اور چاند اور ستاروں کو قرار دیا ہے ایسا کہ وہ اس کے حکم کے پابند ہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس سے مخصوص ہے پیدا کرنا بھی اور حاکم ہونا بھی^[۳] بابرکت ہے اللہ جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔“

رات کا پردہ دن پر ڈالنے سے بظاہر ہر روز کا یہ مشاہدہ مراد ہے کہ ابھی سب چیزیں آنکھوں سے دکھلائی دے رہی ہیں اور ایک دم رات آ کر سب چیزوں کو نظروں سے چھپا دیتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے رات کا لشکر تیزی کے ساتھ آ کر دن کو گرفتار کر لیتا ہے اور بعض مفسرین نے اس سے مراد یہ قرار دیا ہے کہ رات کا پردہ دن پر پڑتا ہے یعنی جاڑون میں رات بڑھ جاتی ہے اور دن کے کچھ گھنٹے رات میں داخل ہو جاتے ہیں۔^[۴] مگر یہ بات تو دونوں طرف ہے یعنی گرمیوں میں دن آ کر رات پر چھاتا ہے اسی لئے جہاں اس کا ذکر ہوا ہے وہاں دونوں چیزوں کا اس طرح کہ: يُوجِبُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوجِبُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ مگر یہاں دوسری بات کا ذکر ہی نہیں ہے۔ اس ضرورت سے بعض مفسرین نے ان الفاظ سے دونوں پہلوؤں کا لانا چاہا ہے ہیں کہ ایک کو دوسرے پر ڈھانپتا ہے،^[۵] لیکن وہاں تو اللیل مفعول اول اور النهار مفعول دوم ہے۔ جس سے مراد رات کا دن پر چھانا ہی نکلے گا، دوسرے کا چھانا اس پر نکل نہیں سکتا، ورنہ استعمال لفظ بوقت واحد و معنوں میں لازم آئے گا جو قطعاً ممکن نہیں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ دوسرے جز کا ذکر بنظر اختصار نہیں ہوا کہ وہ اسی سے سمجھ میں آجائے گا^[۶] مگر یہ اختصار یہیں پر کیوں ہوا؟ دوسرے مقامات پر تو ہر جگہ جہاں ایک کا ذکر ہے، دوسرے کا بھی ہے جیسے: يُكْوِّرُ اللَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكْوِّرُ النَّهَارَ عَلَى اللَّيْلِ ”وہ لپیٹتا ہے دن کو رات پر“ یہاں اس طرح کیوں نہیں کہا گیا؟ اس سے میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ یہاں وہ مفہوم مراد نہیں ہے۔

[۱]۔ یعنی کا فر راہ دیکھتے ہیں کہ اس کتاب میں خبر ہے عذاب کی۔ ہم دیکھ لیں کہ ٹھیک پڑے تب قبول کریں، سو جب ٹھیک پڑے گی تب خلاصی کہاں ملے گی خبر اسی واسطے ہے کہ عذاب سے بچاؤ پکڑیں (موضح القرآن)

[۲]۔ یجمل اللیل النهار ای یدخله فيه (تبیان)

[۳]۔ اور است آفریدن و فر مانروائی (شاکہ ولی اللہ)

[۴]۔ یعنی گاہی اجزائے شب را بلباس نہار پوشانیدہ در حساب نہار می گرداند از پے در آمدن شب بعد در مشابہ آنست کہ گویا کسی را حوان و شتابان می طلبد (فتح الرحمن)

[۵]۔ ای یغشی کلا منہما بالآخر یطلبہ یطلب کل منہما الا آخر طالباً حثیثاً مریعا (جلالین)

[۶]۔ لہ یقل: ویغشی النهار اللیل لان الکلام یدل علیہ (مجمع البیان)

أَدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ۗ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿٥٥﴾

”اپنے پروردگار سے دعا کرو گڑ گڑا کر اور چپکے چپکے، یقیناً وہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔“

آخری فقرہ کا ربط پہلے جملے سے یہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دعا میں انسان کو سمجھ بوجھ سے کام لینے کی دعوت دی جا رہی ہے یعنی دعا کرتے وقت یہ دیکھ لو کہ تم کوئی ناروا اور حد سے بڑھی ہوئی بات تو نہیں مانگ رہے ہو۔^[۱]
دوسرا مطلب اس کا یہ کہا گیا ہے کہ یہ حد سے تجاوز گڑ گڑانے اور چپکے چپکے دعا کرنے کے بالمقابل ہے کہ تم اکڑ کے ساتھ اور بہت اونچی آواز سے دعا مانگو، یہ خدا کو پسند نہیں ہے۔^[۲]

وَلَا تَفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا ۗ إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ

قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٦﴾

”اور دنیا میں اس کے بالکل درست حالت میں ہونے کے بعد خرابیاں نہ پیدا کرو، اور اس سے دعا کرو خوف سے بھی اور امید سے بھی۔ یقیناً اللہ کی رحمت نیک اعمال والوں سے نزدیک ہے۔“

فساد پھیلانے سے ممانعت

نظا یہ خطاب مسلمانوں سے اور بالخصوص اسی دور والوں سے ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے دنیا کے حالات درست ہو گئے ہیں^[۱] اب ایسا نہ کرنا کہ پھر خرابیاں پھیلاؤ اور سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے حفظ نظام شریعت کے لئے جو انتظام کیا ہے اسے قبول نہ کر کے اپنی من مانی کاروائیاں کرو۔^[۲]

اور مضر توں کے خوف اور منافع کی امید میں اللہ سے لو لگا نا ضروری ہے مگر یہ یاد رکھو کہ اس کی رحمت تمہارے حسن کردار سے وابستہ ہے۔

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۗ حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا

سُقْنَهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۗ كَذَٰلِكَ

نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿٥٧﴾

”اور وہ ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو مژدہ دیتی ہوئی اس کے باران رحمت کے آگے، یہاں تک کہ جب انہوں نے

[۱] ای لا تجاوزوا حد الحق فی الدعاء فتطلبوا منازل الانبیاء و مالا یجوز ان یرعمل فی الدنیا (تبیان)

[۲] و قیل هو الصباح فی الدعاء (مجمع البیان) انه لا یحب المعتدین فی الدعاء بالتشدد و رفع الصوت (جلالین)

[۳] عن ابی حمزہ فی ہذہ الآیۃ قال: ان الارض کانت فاسدۃ فاصلاحها اللہ نبیہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم (مجمع البیان)

[۴] فافسدوا حین ترکوا امیر المؤمنینؑ و خزیبتہ (علی بن ابراہیم)

بوجھل بادلوں کو اٹھایا تو ہم نے انہیں روانہ کر دیا ایک مردہ بستی کی طرف [۱] تو برسایا وہاں پانی جس سے نکالے ہر طرح کے پھل اسی طرح ہم مردوں کو (جلا کر) باہر نکالیں گے [۲] شاید کہ تم ہدایتوں کا اثر قبول کرو۔“

**وَالْبَلَدِ الطَّيِّبِ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۗ وَالَّذِي خَبِثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۗ
كَذَلِكَ نَصْرَفُ الْأَيْتِ لِقَوْمٍ لِّيَشْكُرُوا ۗ**

’اور جو اچھی پاکیزہ سرزمین ہوتی ہے، اس کے نباتات [۱] خوب نکلتے ہیں اللہ کے حکم سے اور جو خراب ہوتی ہے، اس میں نہیں نکلتی مگر بری گھانس۔ یوں ہم طرح طرح سے حقیقتیں پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو شکر گزار ہوں۔‘

پاکیزہ اور ناپاک زمینوں کا تذکرہ

مطلب یہ ہے کہ نصیبتیں اچھے دلوں میں اثر کرتی ہیں اور جو بدنہاد ہیں، ان میں ان کا اثر خراب ہی پڑتا ہے، اچھا نہیں پڑتا۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

’ایں مثل است بر ای تاثیر یبند در قلب سلیم و عدم تاثیر آن در غیر سلیم‘ (فتح الرحمن)
شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

’ستھرے استعداد و اے کمال کو پہنچے اور جن کی استعداد خراب تھی، ان کو فائدہ پہنچ رہا تھوڑا سا‘ (موضح القرآن)
اگر اس قرآنی انتباہ کو سامنے رکھا جائے تو پینمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے سب بیٹھنے والوں کو ایک ہی مرتبہ بلند پر نہ سمجھا جائے۔

**لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنَ اللَّهِ غَيْرُهُ ۗ
إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۗ قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرُكَ فِي
ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۗ قَالَ لِقَوْمِهِ لَيْسَ بِي ضَلَالَةٌ وَلَكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۗ
أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَأَنْصَحُ لَكُمْ وَأَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۗ**

’بلاشبہ ہم نے نوحؑ کو بھیجا ان کی قوم کی جانب، انہوں نے کہا اے میری قوم والو! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے، یقیناً مجھے تمہارے اوپر بڑے سخت دن کی سزا کا اندیشہ ہے، ان کی قوم کے ممتاز لوگوں نے کہا کہ بلاشبہ ہم تم کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتے ہیں، انہوں نے کہا اے میری قوم والو! مجھ میں کوئی گمراہی تو ہے

[۱] البلد المیت هو الذی اندرست مشاربہ و تعفت مزارعہ (تبیان)

[۲] كذلك الاخراج مخرج الموتی من قبورهم بالاحیاء (جلالین)

[۳] ای زروعہ (مجمع البیان)

نہیں بلکہ میں تمام جہانوں کے پروردگار کا بھیجا ہوا ہوں، تمہیں اپنے پروردگار کے پیغام پہنچاتا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں اور اللہ کی طرف سے وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔“

جناب نوح علیہ السلام کی تعلیم اور ان کی قوم کا رویہ

ان آیات میں حضرت نوح علیہ السلام کا اپنی قوم کو تعلیم دینا اور جو ابان کے رویہ کو ذکر کیا گیا ہے۔

أَوْعَجِبْتُمْ أَنْ جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَلَى رَجُلٍ مِنْكُمْ لِيُنذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوا
وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿۳۳﴾

”اور کیا تمہیں تعجب ہے کہ تمہارے پاس وعظ و نصیحت کا پیغام تمہارے پروردگار کی طرف سے تم میں سے ایک آدمی پر آیا ہے تاکہ وہ تمہیں عذاب کا خوف دلائے اور اس لئے کہ تم پر ہیزگاری اختیار کرو اور شاید رحمت تمہارے شامل حال ہو۔“

ذکر اور تذکرہ کے الفاظ دوسرے مقامات پر قرآن مجید میں ایسے ہی انداز سے آئے ہیں کہ اس سے وعظ و نصیحت کا مفہوم پیدا ہوتا ہے

اس لئے یہاں بھی ہم نے ترجمہ یہی کیا ہے جو بعض تفاسیر میں بھی موجود ہے [۱]

لیکن بعض مفسرین نے اس کے معنی وضاحت اور بیان کے لئے ہیں۔ [۲]

جناب شیخ الطائفہ نے فرمایا ہے کہ ذکر کی دو قسمیں ہیں: ذکر بیان اور ذکر برہان۔ پہلے کے معنی ہیں کسی بات کا ذہن نشین کرنا۔ دوسرے کے معنی ہیں کسی چیز کو حد ثبوت تک پہنچانا۔ یہاں ذکر میں دونوں معنی کا احتمال ہے۔

فَكَذَّبُوهُ فَأَنْجَيْنَاهُ وَالَّذِينَ مَعَهُ فِي الْفُلِّ وَأَعْرَقْنَا الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا
إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا عَمِينَ ﴿۳۴﴾

”تو ان لوگوں نے انہیں جھٹلایا جس کے نتیجے میں ہم نے انہیں اور ان کو جو کشتی میں ان کے ساتھ تھے، نجات دی

اور ان کو جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا ہم نے ڈبو دیا، بلاشبہ وہ بے بصیرت لوگ تھے۔“ [۳]

طوفان نوح علیہ السلام کا اجمالی تذکرہ قرآن میں سب سے پہلے یہیں پر ہوا ہے۔

قرآن سے پتہ نہیں چلتا کہ اس طوفان کی وسعت کتنی تھی؟ بس یہ ثابت ہوتا ہے کہ جنہوں نے جناب نوح کی تکذیب کی تھی، وہ سب

[۱]. ذکر و موعظة (جلالین)

[۲]. بیان (مجمع البیان)

[۳]. يقال رجم عم اذا كان اعمى القلب ورجل اعمى في البصر (مجمع البیان)

غرق ہو گئے [۱] اور جو ان کے ساتھ کشتی میں بیٹھ گئے تھے، وہ نجات پا گئے۔

کشتی اور اس کے بنائے جانے اور اس سے متعلقہ تفصیلات قرآن مجید کی آیتوں میں متفرق مقامات پر اس کے بعد ہیں جن کا بیان انشاء اللہ آئے گا۔

وَالِى عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۖ قَالَ يَقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ ۖ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿٦٥﴾ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرُكَ فِي سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿٦٦﴾ قَالَ يَقَوْمِ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ وَلَكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٦٧﴾ أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَإِنَّا لَكُم نَاصِحٌ أَمِينٌ ﴿٦٨﴾

’اور قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو، انہوں نے کہا کہ اے میری قوم والو! اللہ کی عبادت کرو، تمہارا اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے تو تم آخر پرہیزگاری کیوں اختیار نہیں کرتے؟ ان کی قوم کے ان ممتاز آدمیوں نے جو کافر تھے، کہا کہ یقیناً ہم تمہیں حماقت میں مبتلا دیکھتے ہیں اور بلاشبہ ہم تمہیں جھوٹوں میں خیال کرتے ہیں۔ کہا اے میری قوم والو! مجھ میں کوئی حماقت نہیں ہے بلکہ میں تمام جہانوں کے پروردگار کا بھیجا ہوا ہوں، تمہیں اپنے پروردگار کے پیغام پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا ایمان دار خیر خواہ ہوں۔‘

جناب ہود علیہ السلام کی تعلیم، ان کی قوم کا رویہ اور آخری انجام:

اس کے پہلے اچکا ہے: لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا ۖ ”ہم نے نوح“ کو بھیجا“۔ یہ ہود کا ذکر اسی سلسلہ میں ہے یعنی اور قبیلہ عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ [۲]

جب ایک ہی واقعہ کی تفصیل سے کلام میں طول ہوا ہو تو یہ فاصلہ معطوف علیہ اور معطوف کے باہمی تعلق میں حارج نہیں ہوتا۔ [۳]

أَوْعَجِبْتُمْ أَنْ جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَلَى رَجُلٍ مِّنكُمْ لِيُنذِرَكُمْ ۖ وَأَذْكُرُوا
إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءً مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَضْطَةً ۖ فَادْكُرُوا
آلَاءَ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٦٩﴾

’اور کیا تمہیں تعجب ہے کہ تمہارے پاس نصیحت آئی تمہارے پروردگار کی طرف سے تم ہی میں سے ایک آدمی

[۱]. اغرقنا الذين كذبوا بايتنا بالطوفان (جلالین)

[۲]. عطف سبحانه على قصة هود (مجمع البيان)

[۳]. انتصب قوله ”اخواهم هوداً“ بقوله: ”ارسلنا“ في اول الكلام وان تطاول بينهما لان تفصيل القصص يقتضى ذلك (تبيان)

پر تاکہ وہ تمہیں متنبہ کرے اور یاد کرو جب اس نے تمہیں نوحؑ کی قوم کے بعد ان کی جگہ صاحب اقتدار بنایا [۱] اور تمہیں پیدائشی طور پر طاقت اور قد و قامت میں زیادتی عطا کی تو اللہ کی نعمتوں کو یاد رکھو شاید تم ہر طرح کی بہتری حاصل کرو۔“

قَالُوا أَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللَّهَ وَحْدَهُ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا ۗ فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا

إِنْ كُنْتُمْ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۶﴾

”انہوں نے کہا کیا تم ہماری طرف آئے ہو اس لئے کہ ہم اکیلے اللہ کی عبادت کریں اور جس جس چیز کو ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے، اسے چھوڑ دیں تو لاؤ ہمارے پاس وہ جس کی تم ہمیں دھمکیاں دیتے ہو، اگر تم سچے ہو۔“

تمام انبیاء کے تذکروں سے ظاہر ہے کہ پیغام سب کا بالکل ایک تھا اور ان کے مقابلہ میں جو کہا جاتا تھا، وہ سب بھی تقریباً ایک ہی رہا۔ پیغام ایک اکیلے اللہ کی عبادت کا اور اس کے مقابلہ میں دنیا کو اللہ کی عبادت میں اتنا عذر نہ تھا جتنا اسے اکیلا ماننے میں یعنی غیر اللہ کی عبادت کا چھوڑنا ان کیلئے بڑی زحمت کا باعث تھا اور وجہ اس کی تقلید آباء تھی۔

ان ہی منزلوں سے نوحؑ کو گزرنا پڑا۔ انہی سے ہودؑ و صالحؑ و ابراہیمؑ کو اور یہی سب کچھ آخر میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں نظر آتا ہے۔

اور اس لئے آپ کی تسلی اور سچے مسلمانوں کے سکون قلب کے لئے گزشتہ انبیاء کے یکے بعد دیگرے واقعات دہرائے جاتے ہیں کہ جو کچھ آج ہو رہا ہے، یہ کوئی نیا امر نہیں ہے، ہمیشہ ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔

قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّن رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَغَضَبٌ ۗ أَتَجَادِلُونِنِي فِيْ اَسْمَاءِ سَمِيَّتُمْ هٰذَا اَنْتُمْ وَاَبَاؤُكُمْ ۗ مَا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۗ فَاَنْتُمْ ظٰرِفُوْنَ الرَّسُوْلِ مَعَكُمْ

مِّن الْمُنْتَظِرِیْنَ ﴿۷﴾

”انہوں نے کہا تم لوگوں پر تمہارے پروردگار کی طرف سے عذاب [۲] اور غضب نازل ہو گیا ہے، کیا تم مجھ سے جھگڑا کرتے ہو ایسے ناموں کے بارے میں جو خود تم نے اور تمہارے باپ دادا نے تجویز کر لئے ہیں [۳] جن کے متعلق اللہ نے کوئی سند نہیں اتاری ہے۔ اچھا تو پھر انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔“

[۱] جعلکم سکان الارض من بعد قوم نوح (مجمع البیان)

[۲] الرجس العذاب (تبیان)

[۳] یعنی بے اصل است (فتح الرحمن)

”نام تجویز کر لئے ہیں۔“ یعنی انہیں تم دل بخواہ خدا یا دیوتا وغیرہ سے موسوم کرتے ہو یا مختلف طرح کے تدبیرات سماوی وارضی سے انہیں نسبت دے رکھی ہے، مثلاً فلاں بارش کا دیوتا ہے اور فلاں دولت کی دیوی ہے وغیرہ وغیرہ۔

فَأَنْجَيْنَاهُ وَالَّذِينَ مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا وَقَطَّعْنَا دَابِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَمَا كَانُوا مُؤْمِنِينَ ﴿٤٦﴾

”تو بچا دیا ہم نے انہیں اور ان کے ساتھ والوں کو اپنی رحمت سے اور رگ دریشہ اکھاڑ ڈالا ﴿٤٦﴾ ہم نے ان کا جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور وہ ایمان لانے والے نہیں تھے۔“

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ قَدْ جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ هَذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةٌ فَمَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِي الْأَرْضِ ۗ اللَّهُ وَلَا تَمْسُوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٤٧﴾

”اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالحؑ کو، انہوں نے کہا اے میری قوم والو! عبادت کرو، اللہ کی نہیں ہے اس کے سوا تمہارا کوئی خدا، تمہارے پاس آیا ہے ایک خاص معجزہ تمہارے پروردگار کی طرف سے ﴿٤٧﴾ یہ اللہ کی طرف کی اونٹنی ہے جو تمہارے لئے ایک قدرتی نشانی ہے تو اسے چھوڑ دو کہ کھاتی رہے اللہ کی زمین میں اور اسے ذرا بھی تکلیف نہ پہنچانا، نہیں تو تمہیں دردناک عذاب اپنی گرفت میں لے لے گا۔“

جناب صالحؑ کی تعلیم، ان کی قوم کا رویہ اور آخری انجام

ان آیات میں حضرت صالحؑ کا اپنی قوم کو تعلیم دینا اور جو اب ان کے رویہ اور انجام کو ذکر کیا گیا ہے۔

وَإِذْ كُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ عَادٍ وَبَوَّأَكُمْ فِي الْأَرْضِ تَتَّخِذُونَ مِنْ سُهُولِهَا قُصُورًا وَتَنْحِتُونَ الْجِبَالَ بُيُوتًا ۖ فَاذْكُرُوا الْآلَاءَ اللَّهِ وَلَا تَعْتُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٤٨﴾

”اور یاد کرو وہ وقت کہ جب اس نے تمہیں قوم عاد کے بعد ان کی جگہ صاحب اقتدار بنایا اور تمہیں زمین میں رہنے کا ٹھکانہ دیا کہ تم اس کے نرم و ہموار حصوں میں بھی محلات بناتے اور پہاڑوں کو بھی تراش کر گھر بناتے ہو، تو یاد رکھو اللہ کی نعمتوں کو اور زمین میں خرابیاں پھیلاتے نہ پھرو۔“

[١]. ای استأصلناهم (جلالین)

[٢]. بیئنة معجزة من ربکم (جلالین) ای دلالة معجزة قشاهدة على صدق (مجمع البيان)

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِمَنْ آمَنَ مِنْهُمْ
 اَتَعْلَمُونَ أَنَّ صَلِحًا مَرْسَلًا مِنْ رَبِّهِ ط قَالُوا إِنَّا بِمَا أُرْسِلَ بِهِ مُؤْمِنُونَ ﴿٤٥﴾ قَالَ
 الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا بِالَّذِي آمَنْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ ﴿٤٦﴾

”ان کی قوم کے ممتاز آدمیوں نے جو گھمنڈ رکھتے تھے، ان لوگوں سے جو دبے پسے ہوئے تھے، ان سے کہہ جانے میں سے ایمان لائے تھے ﴿٤٥﴾ کہا کیا تم جانتے ہو کہ صالحؑ واقعی اپنے پروردگار کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں؟ انہوں نے کہا بے شک ہم اس پر جس کے ساتھ وہ بھیجے گئے ہیں ایمان رکھتے ہیں اس پر انہوں نے جو گھمنڈ رکھتے تھے کہا کہ جس پر تم ایمان لائے ہم اس کے ساتھ کفر رکھتے ہیں۔“

کافر کے معنی منکر کے ہیں۔ اس لئے جو کسی دین کے عقائد کو نہ مانیں گے، وہ فخر سے کہیں گے کہ ہم اس کے کافر ہیں اور اس سے ظاہر ہے کہ اسلام کا غیر مسلموں کو کافر کہنا کوئی ”دشنام“ نہیں بلکہ ایک واقعیت کا اظہار ہے جسے وہ خود تسلیم کرنے پر مجبور رہیں۔

فَعَقَرُوا وَالنَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوا يُصْلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتِ
 مِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿٤٧﴾ فَأَخَذْتَهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جُثِيمِينَ ﴿٤٨﴾ فَتَوَلَّى
 عَنْهُمْ وَقَالَ يَاقَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلَكِنْ لَا تُحِبُّونَ
 النَّصِيحِينَ ﴿٤٩﴾

”آخر انہوں نے اس اونٹنی کو پے کر ڈالا ﴿٤٧﴾ اور اپنے پروردگار کے حکم سے سرتابی کی اور کہا اے صالح! لاؤ ہمارے پاس وہ جس کی ہمیں تم دھمکی دیتے رہے ہو ﴿٤٨﴾ اگر تم پیغمبروں میں سے ہو۔ نتیجے میں ان کو زلزلہ نے اپنی گرفت میں لے لیا تو وہ اپنے گھروں میں بے حس و حرکت ہو کر رہ گئے تو انہوں نے ان لوگوں سے روگردانی اختیار کی اور کہا اے میری قوم والو! میں نے تمہیں اپنے پروردگار کا پیغام پہنچا دیا اور تمہارے لئے خیر خواہی سے کام لیا مگر تم خیر خواہوں کو پسند ہی نہیں کرتے۔“

مضمون کے لحاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخری آیت یعنی ”فَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَقَالَ...“ الخ انہوں نے ان لوگوں سے روگردانی اختیار کی اور یہ کہا اس عذاب کے آنے اور ان کے ہلاک ہونے کے تذکرہ سے قبل کی ہے اور چونکہ ترتیب مطابق تنزیل نہیں ہے، اس لئے ایسا ہونا کوئی عجیب امر نہیں ہے۔

[١] بدل مما قبله بأعادة الجار (جلالین) وهو بدل البعض من الكل الا انه اعيد فيه حرف الجر (تبیان)

[٢] ای فنحرو الناقة (مجمع البيان)

[٣] فائتنا لان بالعذاب الذي خو فتننا عنه (تبیان)

بعض لوگوں نے اس آیت کو بعد ہی میں مانا ہے اور یہ تو جیہہ کی ہے کہ ان کی ہلاکت کے بعد یہ مخاطب ویسا ہے جیسے آدمی غصہ یا رنج میں اپنے تاثرات کو بطور خود ہی اس طرح ظاہر کیا کرتا ہے جس میں دوسروں کے لئے عبرت کا سامان ہوتا ہے۔^[۱]

وَلَوْ ظَا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِّنَ الْعَالَمِينَ ﴿۸۱﴾ إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُونِ النِّسَاءِ ۗ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ ﴿۸۱﴾

’اور لو طٰؑ کو جب کہ انہوں نے اپنی قوم والوں سے کہا کہ کیا تم ایسی شرمناک بدکاری^[۲] کے مرتکب ہوتے ہو جس کا تمہارے پہلے دنیا جہان میں کوئی مرتکب نہیں ہوا۔ ارے تم لوگ نفسانی جذبہ سے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کی طرف رخ کرتے ہو! تم بڑے حد سے گزرے ہوئے لوگ ہو۔‘

جناب لوط علیہ السلام کی تعلیم، قوم لوط کی بدکاری اور اس کا انجام

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنسی بے راہ روی میں التذاذ بالمثل کا گناہ قوم لوط کے پہلے دنیا میں ناپید تھا۔ اسی لئے شاید عرف عام میں اس عمل کے مرتکب کا نام ہی لوط کے لفظ کی طرف منسوب ہو گیا ہے۔

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَخْرِجُوهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۗ إِنَّهُمْ أَنَاسٌ يَّتَطَهَّرُونَ ﴿۸۲﴾ فَأَنْجَيْنَاهُ وَأَهْلَهُ إِلَّا امْرَأَتَهُ ۗ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ ﴿۸۳﴾ وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا ۗ فَأَنْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ ﴿۸۴﴾

’اور نہ تھا ان کی قوم والوں کا جواب سوا اس کے کہ انہوں نے کہا نکال دو انہیں اپنی بستی سے۔ یہ ایسے اشخاص ہیں جو اپنے کو آلودہ ہونے سے بچاتے ہیں^[۳] تو ہم نے نجات دی انہیں اور ان کے گھر والوں کو سوا ان کی بیوی کے کہ وہ تھی رہ جانے والوں میں^[۴] اور ہم نے ان پر ایک خاص طرح کی بارش کی تو دیکھو کیسا انجام ہوا ان گنہگاروں کا۔‘

’ایک خاص طرح کی بارش‘ یعنی پتھروں کا مینہ، جیسا کہ دوسری جگہ قرآن میں صاف ارشاد ہوا ہے: وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارًا مِّنْ سِجِّيلٍ: ہم نے ان پر سخت مٹی کے پتھروں کی بارش کی۔ (حجر: ۷۴)

[۱] انما جازان يناديهم مع كونهم جاثمين موفى العا في تذكار ما اصابهم الى تلك الحال... من الحكمة والموعة الحسنة (تبيان)

[۲] اى السيئة العظيمة القبح (مجمع البيان)

[۳] يتحرجون عن ادبار الرجال (مجمع البيان)

[۴] اى من الباقيين في قومه المتخلفين عن لوط (مجمع)

وَالِى مَدَيِّنَ آخَاهُمْ شُعَيْبًا ۖ قَالَ يَقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنِّ إِلٰهِ غَيْرُهُ ۖ
 قَدْ جَاءَ تَكْمٌ بَيْنَهُ مِن رَّبِّكُمْ فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ
 أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ۖ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن
 كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١٥﴾

”اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو۔ انہوں نے کہا اے میری قوم! عبادت کرو اللہ کی، تمہارا اس سے سوا کوئی خدا نہیں، تمہارے پاس آتی ہے کھلی ہوئی دلیل تمہارے پروردگار کی طرف سے تو تم ناپ تول پوری کیا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو ﴿۱۵﴾ اور دنیا میں اس کی درستی کے بعد خرابی نہ پھیلاؤ۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔“

جناب شعیب علیہ السلام کی تعلیم اور ان کی قوم کا رویہ

ان آیات سے جناب شعیب علیہ السلام کا اپنی قوم کو توحید کی تعلیم دینا اور جو اب ان کی قوم کے رویہ کو بیان کیا جا رہا ہے۔

وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَنِ سَبِيلِ اللَّهِ مَن آتٰنَ بِهِ
 وَتَبْغُوا نَهَا عِوَجًا ۗ وَادْكُرُوا إِذْ كُنْتُمْ قَلِيلًا فَكَثَرْتُمْ ۗ وَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ
 عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ﴿١٦﴾

”اور نہ بیٹھو ہر راستے پر اس طرح کہ دھمکتے ہو اور روکتے ہو اللہ کی راہ سے اس کو جو اس پر ایمان لائے اور اس (راہ) کو کج کرنے کے درپے ہوتے ہو اور یاد کرو اس وقت کہ جب تم کم تھے تو اس نے تمہیں زیادہ کیا اور دیکھو کہ کیسا ہوتا رہا ہے انجام خرابیاں کرنے والوں کا۔“

وَإِن كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنكُمْ آمَنُوا بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوا
 فَاصْبِرُوا حَتَّى يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَنَا ۗ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ﴿١٧﴾

”اور اگر تم میں کے ایک گروہ نے ایمان اختیار کیا اس پر جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں اور ایک گروہ نے ایمان قبول نہیں کیا تو پھر صبر کرو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کرے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔“

یعنی چاہیے تو یہ تھا کہ سب ہی ایمان لے آئیں۔ اب ایسا نہیں ہوا تو نتیجہ میں لازماً ایک گروہ ہوگا جو نجات پائے گا اور ایک گروہ ہلاک

[۱]. اسم المدينة او القبلة (مجمع البيان)

[۲]. النجس النقص عن الحق الذى يوجب الحق (تبيان)

ہوگا مگر اس کا فیصلہ آنکھوں کے سامنے آج نہیں آئے گا بعد میں ہوگا۔^[۱]

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ يَشْعِيبَ وَالَّذِينَ آمَنُوا
مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعُوذُنَّ فِي مِلَّتِنَا ۚ قَالَ أُولُو كُنُفٍ هُمْ هَاهُنَا قَدْ افْتَرَيْنَا
عَلَى اللَّهِ كَذِبًا إِنْ عُدْنَا فِي مِلَّتِكُمْ بَعْدَ إِذْ نَجَّيْنَا اللَّهُ مِنْهَا ۚ وَمَا يَكُونُ لَنَا أَنْ
نَعُوذَ فِيهَا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّنَا ۚ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۚ عَلَى اللَّهِ
تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ ۝۸۹

”کہا ان کی قوم کے ان بڑے آدمیوں نے جو گھمنڈ کئے ہوئے تھے کہ ہم نکال دیں گے اے شعیب! تم کو اور
انہیں جو تمہارے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی بستی سے یا تم لوگ واپس آؤ ہمارے مذہب میں۔ کہا کیا چاہے ہم
اسے ناپسند کرتے ہوں۔ ہم اللہ پر جھوٹ بہتان لگائیں گے اگر واپس آئیں تمہارے مذہب میں بعد اس کے کہ
اللہ نے ہمیں اس سے چھٹکارا دے دیا ہے ہمارے لئے زیبا نہیں کہ ہم اس میں واپس جائیں سو اس صورت کے
کہ ہمارے پروردگار کو یہی منظور ہو۔ ہمارا پروردگار حاوی ہے ہر شے پر علم سے، اللہ ہی پر ہم بھروسہ رکھتے ہیں۔
اے ہمارے پروردگار! تو ہی فیصلہ کر دے ہمارے درمیان اور ہماری قوم والوں کے درمیان حق کے ساتھ اور تو
بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔“

قوم شعیب کا رویہ اور انجام

یہ کہنا ان کا کہ ”تم لوگ واپس آؤ“ اور اس کے جواب میں بھی ”واپس آئے“ کا ذکر ان ساتھ والوں کی اکثریت کے لحاظ سے ہے جو
پہلے اس گمراہ جماعت سے وابستہ تھے اور پھر ان سے نکل کر شعیب کے ساتھ آئے تھے، یہ فردا فردا ہر ایک کے لئے نہیں ہے کیونکہ کوئی نبی خود کبھی
اس جماعت کی گمراہی میں شریک نہیں ہوتا جس کی ہدایت کے لئے وہ آتا ہے۔^[۲]
ہاں! یہ بھی پہلو ہو سکتا ہے کہ اعلان رسالت کے پہلے قوم کا تصور یہی ہوتا ہے کہ یہ ہم ہی میں سے ہیں۔ وہ تو جب اعلان حق کرتا ہے،
تب انہیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہم سے الگ ہے تو ان کا کہنا اور اس کا جواب دونوں میں واپسی کا لفظ ان کے عام تصور کے لحاظ سے ہو جو ظاہر کی بنا پر
قائم تھا۔^[۳]

[۱]. بآنجاء المحق اهلاك المبطل (جلالین)

[۲]. اغلبوا فی الخطاب الجمع علی الواحد لان شعيبا لم يكن في ملتهم قط (جلالین)

[۳]. لانه كان عندهم في ظنهم انه كان قبل ذلك على دينهم (مجمع البيان)

یہ کہ اللہ کو منظور ہو یعنی اس کی توفیق ہمارا ساتھ چھوڑ دے اور ہم اپنے سوء اختیار سے گمراہی میں مبتلا ہو جائیں [۱] جس پر مورد الزام ہم ہی ہوں گے۔ نہ یہ کہ وہ جبراً کسی کو برے راستے پر لگاتا ہے۔

اور یہ ”تعلیق المحال بالمحال“ کے طور پر بھی ہو سکتا ہے کہ خدا کا کسی کے لئے بھی شرک کو چاہنا غیر ممکن ہے تو ہمارا داخل ہونا بھی تمہاری ملت میں ناممکن شے ہے۔ [۲]

وَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لِيِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا إِنَّكُمْ إِذًا
لَخَسِرُونَ ﴿۹۵﴾ فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جُثَمِينَ ﴿۹۶﴾ الَّذِينَ
كَذَّبُوا شُعَيْبًا كَأَن لَّمْ يَعْنُوا فِيهَا ۚ الَّذِينَ كَذَّبُوا شُعَيْبًا كَانُوا هُمُ
الْخَاسِرِينَ ﴿۹۷﴾ فَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَقَالَ يَا قَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالِ رَبِّي وَنَصَحْتُ
لَكُمْ ۖ فَكَيْفَ آلَيْتُمْ عَلَىٰ قَوْمٍ كَافِرِينَ ﴿۹۸﴾

’اور ان کی قوم کے ان بڑے آدمیوں نے جو کافر تھے، کہا کہ اگر تم لوگ شعیب کے پیچھے چلو گے تو یقیناً تم لوگ گھائے میں رہو گے تو انہیں زلزلہ نے لے لیا جس کے بعد وہ اپنے گھروں میں مردہ ہو کر اپنے گھٹنوں کے بل گرے ہوئے پڑے تھے جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا وہ گویا کبھی ان مکانات میں رہتے ہی نہ تھے [۳] جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا، وہی گھانا اٹھانے والے ثابت ہوئے تو انہوں نے ان لوگوں کی طرف سے منہ پھیر لیا اور کہا اے میری قوم والو! میں نے تو تمہیں اپنے پروردگار کے پیغام پہنچا دیئے اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا لیکن ایک ایسی جماعت پر جو انکار پر قائم رہی افسوس بھی کیوں کر کروں۔‘

بڑے آدمیوں کا یہ قول جو یہاں کی پہلی آیت میں بیان ہوا ہے وہ شعیب علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والوں کو چھوڑ کر دوسرے عوام سے ہے جن کے لئے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ بھی شعیب علیہ السلام کے دین کو اختیار نہ کر لیں۔
آخر کا جملہ خالق کی طرف سے ان بڑے آدمیوں کی بات کا جواب ہے۔

وہ کہتے تھے کہ تم شعیب کی پیروی کرو گے تو خسارہ میں رہو گے تو کہا جا رہا ہے کہ اب دنیا دیکھے خسارہ میں کون رہا؟ [۴]
اور یہاں ضمیر لانے کے بجائے کہ ”وہ خسارے میں رہے“ پھر اس فقرہ کو کہ ”جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا“ دہرایا گیا، اس پر زور دینے کے لئے کہ شعیب پر ایمان لانا تو خسارہ کا باعث نہیں ہوا، ہاں ان کو جھٹلانا ہی وہ تھا جس کے نتیجے میں انتہائی خسارہ سب کی آنکھوں کے

[۱] یشاء اللہ ربنا اذک فیغذ لنا (جلالین)

[۲] کمال یشاء اللہ عبادۃ الاصنام والقباہ لان ذلک لایلیق بحکمة فکذلک لا اعود فی ملتکم (تبیان)

[۳] لہر یغنونہ الحریقیموا فیہا فی دیارہم (جلالین)

[۴] بین سبحانہ انہم الخاسرون دون من امن بہ (مجمع البیان)

سامنے ہے۔^[۱]

پورے واقعہ کے ذکر کے بعد، روگردانی کرنے اور پھر اس قوم سے مخاطب کا عنوان وہی ہے جو پہلے آچکا ہے اور اس پر تبصرہ وہاں کیا جا چکا ہے یہاں خاص چیز اس مخاطب کے بعد آخر میں یہ جملہ ہے کہ ”میں ایک ایسی جماعت پر جو انکار پر قائم رہی، کیوں کر افسوس کرو؟“ اس جملہ سے یہ کیفیت سمجھ میں آتی ہے کہ ان کی ہلاکت پر جیسے انسانی ہمدردی کے جذبہ میں یا بشری حیثیت سے اس انس و محبت کی بنا پر جو اپنی قوم کے ساتھ ہونا چاہیے جناب شعیب کا دل کڑھا مگر خود ہی ذہن نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ لوگ اس کے مستحق نہیں کہ ان پر کوئی صدمہ کیا جائے کیونکہ انہوں نے خود ہی کفر و عناد پر قائم رہ کے اپنی تباہی کا سامان کیا اور اس عذاب کے مستوجب ہوئے۔^[۲]

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ إِلَّا أَخَذْنَا أَهْلَهَا بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ
يَضُرَّ عَوْناً ﴿۹۷﴾ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتَّىٰ عَفَوْا وَقَالُوا قَدْ مَسَّ
آبَاءَنَا الضَّرَّاءُ وَالسَّرَّاءُ فَأَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۹۸﴾

”اور ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس کے باشندوں کو سختی اور تکلیف کی گرفت میں ضرور ڈالا^[۳] شاید کہ وہ تضرع و زاری کریں پھر ہم نے برائی کی جگہ بھلائی عطا کر دی یہاں تک کہ ان کی تعداد خوب بڑھی^[۴] اور وہ کہنے لگے کہ ہمارے بزرگوں کو تکلیف اور راحت دونوں ہی پہنچتی رہی ہیں تو ایک دم ہم نے ان کو گرفت میں لیا اس عالم میں کہ انہیں اس کا تصور بھی نہ تھا۔“

قرآن مجید اکثر بیان واقعات میں ایسے اجزاء کو جنہیں قبل اور بعد کے ربط سے ذہن خود سوچ سکے الفاظ میں نظر انداز کر دیتا ہے چنانچہ سنت الہیہ کا بیان امم کے بارے میں جو کیا گیا ہے، اس میں پہلا جزیہ ہے کہ انبیاء بھیجے گئے۔ اب اس کے بعد کیا ہوا؟ وہ معلوم ہے کہ قوم کی اکثریت نے ان کی تکذیب کی^[۵] اور پیغام ربانی کے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے تو اس کے بعد کی یہ بات ہے جو قرآن بتا رہا ہے کہ اللہ نے ان کو سختی اور تکلیف میں مبتلا کیا۔

یہ سختی اور تکلیف ابھی بغرض اصلاح ہے کہ وہ اس طرح شاید اللہ سے لو لگائیں اور اپنی اصلاح کریں^[۶] مگر اس کے بعد بھی صورت کیا ظاہر ہوئی؟ وہ الفاظ قرآنی میں درج نہیں ہے۔ خود سمجھئے کہ ان میں سے اکثر اس کے بعد بھی متنہ نہیں ہوئے اور وہ اپنے کفر و عصیان پر قائم رہے تو اب وہ سختی اور تکلیف دور کر دی گئی جسے قرآن بتا رہا ہے۔

[۱]. اعبید ذکور ”الذین“ صفة ثانیة من غیر کنایة لتغلیظ الامر فی تکذیبہم شعیباً (تبیان)

[۲]. قال ابن اسحق عزیٰ نفسہ عنہم بعد ان کان حزن علیہم (تبیان)

[۳]. گر فتار کر دیم اهل آن را بسختی ورنج (شاه ولی اللہ)

[۴]. یہاں تک کہ زیادہ ہوئے (شاه فہج الدین)

[۵]. فلم یؤمنوا بہ بعد قیام الحجۃ علیہم (مجمع البیان)

[۶]. لیبتنہوا ویعلموا انہ مقدمة العذاب (مجمع البیان)

یہ تکلیف دور کیوں ہوئی؟ اس وجہ سے کہ جو مقصد اس کا تھا وہ جن میں پورا ہونا تھا ان میں پورا ہو چکا اور وہ جماعت زیادہ تراقلیت میں ہوتی ہے۔ اس کے بعد اکثریت کے بارے میں اس مقصد کا حصول ہونے والا نہیں ہے تو اب ان کے لئے راحت و آرام کی فروانی ہوگئی جو اب ان کے لئے بطور امہال ہے جس کے نتیجے میں وہ خوب معاصی الہی کے میدان میں کھل کھیلیں گے، حالانکہ اگر ان میں شعور ایمانی ہوتا تو اب اس راحت و آرام سے اللہ کے شکر کی طرف مائل ہوتے مگر انہیں تو عظمت الہی اور اس کی قدرت کی کارفرمائی کا تصور ہی نہیں ہے۔ وہ تو تکلیف اور راحت دونوں کو اتفاقات زمانہ کا نتیجہ قرار دے کر کہتے ہیں کہ یہ کوئی خاص بات تھوڑی ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد کے لئے یہی ہوا کیا کہ کبھی تکلیفوں کا دور ہوا اور کبھی عیش و آرام کا۔^[۱]

اس سب کے بعد خالق کی طرف سے ان پر رحمت پوری طرح تمام ہوگئی اس لئے اس کے بعد ایک دم بے خبری کے عالم میں ان پر عذاب استیصال آگیا جس نے ان کا قلع قمع کر دیا۔

اگر مسلمان بصیرت سے کام لیں تو شاید ان کو تاریخ اسلام میں قبل کے سب نمونے مل جائیں اور اس لئے یہ ضروری نہیں کہ جسے وہ اپنا سب سے بڑا سطوت و شوکت کا دور کہتے ہیں، وہ کوئی اللہ کی مہربانی کا نتیجہ ہو بلکہ بہت ممکن ہے کہ وہ بھی ان کے ایک طرح کے امتحان کا دور ہو اور جو بلا و مصیبت کے دور آئے وہ بھی آزمائش کی حیثیت رکھتے ہوں۔

بس ایک بابرکت وجود کا فیض ہے جس سے وہ آخری انجام یعنی عذاب استیصال سے اب تک بچے ہوئے ہیں جس کا صریحی اعلان قرآن میں ہے:

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ.

اللہ اس وقت تک ان پر عذاب نازل کرنے والا نہیں جب تک آپ ان کے درمیان موجود ہیں۔“ (انفال: ۳۳)

پھر اس کے بعد یہ کتنی عبرت ناک صورت واقعہ ہے کہ ان میں کا ایک بڑا طبقہ اس وجود مقدس کی حیات بابرکات کا قائل نہیں ہے جس کی بدولت اس کی زندگی قائم ہے۔

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ
وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۹۶﴾

”اور اگر ان بستیوں کے باشندے ایمان لاتے اور نجات کا سامان کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی طرف سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے مگر انہوں نے جھٹلایا تو ہم نے ان کو گرفت میں لے لیا ان اعمال کی بدولت جو وہ کرتے تھے۔“

”آسمان کی طرف سے برکت“ بارش ہے اور زمین کی طرف سے نباتات کی پیداوار ہے۔^[۲]

[۱]. لہذا إعادة الدهر (تبیان)

[۲]. اهل هذه القرى التي اهلكناها (تبیان)

[۳]. من السماء بالمطر والارض بالنبات (جلالین)

اس کے علاوہ دوسرا قول یہ بھی ہے کہ آسمان کی برکت سے مراد دعا کا قبول ہونا ہے اور زمین کی برکت ضرورتوں کا پورا ہوتے رہنا ہے [۱] اور یہ دونوں باتیں لازم و ملزوم ہیں۔

أَفَأَمِّنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَنْ يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا بَيَاتًا وَهُمْ نَائِمُونَ ﴿۹۷﴾ أَوْ آمِنَ أَهْلُ
الْقُرَىٰ أَنْ يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا ضُحًى وَهُمْ يُلْعَبُونَ ﴿۹۸﴾ أَفَأَمِنُوا مَكْرَ اللَّهِ ۗ فَلَا يَأْمَنُ
مَكْرَ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ ﴿۹۹﴾

”تو کیا (اب) ان بستیوں والے بالکل بے خوف ہو گئے ہیں اس سے کہ آئے ان پر ہمارا عذاب رات کو [۹۷] جب کہ وہ سوتے ہوں اور کیا وہ بے خوف ہو گئے ہیں اس سے بھی آئے ان پر ہمارا عذاب دن چڑھے جب کہ وہ کھیل تفریح میں مصروف ہوں تو کیا وہ اللہ کے منصوبہ کی طرف سے بالکل نڈر ہو گئے ہیں مگر اللہ کے منصوبہ سے نڈر نہیں ہوتے مگر وہ جو گھانا اٹھانے والے ہوں۔“

مَکْرُ اللّٰہِ سے جس کا ترجمہ ہم نے ”اللہ کے منصوبہ“ کے لفظ سے کیا ہے، بد اعمالوں کے مقابلہ میں اللہ کی طرف کا وہ انتظام مراد ہے جو انہیں پورے طور پر مستحق عقوبت بنا کر آخر میں گرفتار کرنا ہے [۹۸] سابقہ آیتوں میں گزشتہ امتوں کے ساتھ اللہ کا رویہ جور ہا، اسے بیان کیا گیا تھا اور اس کے بعد ان آیتوں میں اس امت کو متنبہ کیا جا رہا ہے [۹۹] کہ یہ اپنے رسول کے ساتھ جور وید اختیار کئے ہوئے ہے تو آخر اسے عذاب الہی سے اتنی بے خوفی کیوں پیدا ہو گئی ہے!؟

أَوْ لَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ يَرِثُونَ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ أَهْلِهَا أَنْ لَوْ نَشَاءُ أَصَبْنَاهُمْ
بِذُنُوبِهِمْ ۗ وَنَطْبَعُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿۱۰۰﴾

”کیا ان لوگوں کے سامنے جو زمین پر اقتدار کے مالک ہیں، اس کے پہلے صاحبان اقتدار کے بعد یہ بات نہیں کھلی ہے کہ اگر ہم چاہیں تو ان کو بھی ان کے گناہوں کے سبب سے مبتلائے مصیبت کر دیں اور ہم ان کے دلوں پر مہر کر دیتے ہیں کہ وہ سنتے نہیں۔“

”لَمْ يَهْدِ“ کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے: یہ بات نہیں کھلی ہے۔ ظاہر الفاظ سے لغت دیکھے بغیر سمجھ میں زیادہ آتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ یہ فعل لازم کے طور پر ہے جس کا فاعل بعد میں: أَنْ لَوْ نَشَاءُ أَصَبْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ ہے اور بعض تفسیر و تراجم، اس میں ہم سے متفق ہیں۔

[۱]. قبیل برکات السماء اجابة الدعاء والارض تيسير الحوائج (مجمع البيان)

[۲]. بيئات اليل (جلالين)

[۳]. اخذ العبد بالضر من حيث لا يشعر (تبيان)

[۴]. استدر اجه اياهم بالنعمة واخذهم نعتبة (جلالين) افامن اهل القرى المكذبون لك يا محمد ﷺ (مجمع البيان)

[1]

مگر کچھ مفسرین کے سامنے مشکل ہے کہ ”یہدی“ کی لفظ کا لغت کے اعتبار سے بس ہدایت ہی سے ماخوذ ہونا سمجھ میں آتا ہے اور ہدایت لغتاً فعل متعدی ہے اور اس کے معنی رہنمائی کے ہیں، اس لئے کچھ قاریوں نے اسے ”لحد یہد“ کے بجائے ”لحد نہد“ (نون کے ساتھ) پڑھا ہے یعنی کیا ہم نے ہدایت نہیں کی اور متداول قرأت کے ساتھ بھی بعض مترجمین نے ترجمہ اسی ہدایت کے مفہوم کو پیش نظر رکھ کر کرنے کی کوشش کی۔ [۲]

مگر اس صورت میں فاعل اس کا واضح نہیں ہوتا کہ کون ہے؟ اس کی خانہ پری کچھ تفاسیر میں فاعل کو ضمیر مقدر مان کر کی ہے کہ ”کیا خدا نے ان کی رہنمائی اس حقیقت کی طرف نہیں کی ہے؟“ ”یا“ جو کچھ پہلے بیان ہوا ہے اس نے ان کی رہنمائی اس طرف نہیں کی۔“ [۳]

ہمارے نزدیک اس صورت میں زیادہ بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس یہد کے فعل کا فاعل بعد کے فقرہ: ”أَنْ لَّوْ نَشَاءُ“ الخ کو مان لیا جائے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ کیا ان کی رہنمائی کے لئے کافی نہیں ہے اس بات کا تصور کہ اگر ہم چاہیں تو ان کو بھی ان کے گناہوں کے سبب سے بتلائے مصیبت کر دیں؟ مگر یہد کے اس مفہوم میں جو ہدایت کے معنی پر مبنی ہے بہت بڑی خلش ذہن میں ”لحد یہد“ کے بعد کے لام سے محسوس ہوتی ہے۔ محسوس ایسا ہوتا ہے کہ اس صورت میں ”لحد یہد لِلَّذِينَ“ ہونا چاہیے۔ یہ لام تو اس منزل کے ساتھ آیا کرتا ہے جس کی طرف ہدایت ہو جیسے: ”يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ“ آخر جن لوگوں کی ہدایت ہونا مد نظر ہے، ان کے ساتھ لام کا ہے کہ لئے ہے؟ اس لئے قوت پہلے ہی مفہوم کو ہے جس کے مطابق ترجمہ کیا گیا تھا۔

تِلْكَ الْقُرَى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِهَا ۖ وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ ۖ
فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا مِنْ قَبْلُ ۗ كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِ
الْكَافِرِينَ ﴿١١٠﴾ وَمَا وَجَدْنَا لِأَكْثَرِهِمْ مِنْ عَهْدٍ ۖ وَإِنْ وَجَدْنَا أَكْثَرَهُمْ
لَفَاسِقِينَ ﴿١١١﴾

”یہ وہ بستیاں ہیں جن کے کچھ واقعات ہم آپ کے سامنے بیان کرتے ہیں اور بلاشبہ ان کے پاس ان کے پیغمبر معجزے [۱۱۰] لے کر آئے تو وہ ایسے نہیں تھے کہ ایمان لاتے اس پر جسے وہ پہلے جھٹلاتے رہے۔ اس طرح اللہ مہر کرتا ہے کافروں کے دلوں پر اور نہیں پائی ہم نے ان میں سے اکثر کے عہد و پیمان کی کوئی حقیقت [۱۱۱] اور ہم نے ان میں

[1] لحد یہد لحد یتجدین (جلالین) آیا واضح نشد بر آنا کہ وہ ارشاد میں شدند بعد از هلاک ساکنان آن زمین (شاکہ ولی اللہ)

[2] کیا نہیں راہ دکھائی واسطے ان لوگوں کے (شاہ رفیع الدین)

[3] ای اولحد یتجدین اللہ... و قیل معناه: اولحد یہد ماتلو نامن انباء القری (مجمع البیان)

[4] المعجزات الظاہرات (جلالین) بامعجزها (شاکہ ولی اللہ)

[5] ای وفاء بعہدہم (جلالین) قائم رہنا او پر عہد کے (شاہ رفیع الدین)

سے زیادہ تر افراد کو بد اعمال پایا۔“

پہلے جھٹلاتے رہے۔ اب کتنے ہی معجزے آجائیں، سخن پروری اور بے جا ضدان کے لئے ایمان لانے سے سدا رہے۔
 ”اسی طرح اللہ مہر کرتا ہے“ یعنی یہ قبل کے کفر و تکذیب کا پھر ایک نفسیاتی نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ اب اور زیادہ ایمان سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ یہ تقریباً فطری طور پر ان سے صلاحیت ایمان کا سلب ہونا جو خود ان کے سابق اختیار کردہ کفر کا نتیجہ ہے، اسی کی تعبیر اللہ کی طرف کی مہر سے قرآن مجید میں بہت مقامات پر ہوئی ہے۔

”اکثر کے عہد کی کوئی حقیقت نہیں پائی“، یعنی جو ان سے عہد و پیمان تھا، عہد فطرت بزبان عقل و ضمیر بھی اور عہد شریعت انبیاء کے ذریعہ سے بھی انہوں نے اس عہد کو اس طرح بے عملی سے نسیاً منسیاً کیا، گویا کہ ان میں کبھی عہد و پیمان ہوا ہی نہ تھا۔^[۱]
 ”اور ان میں سے زیادہ تر کو بد اعمال پایا“ یعنی وہ کافر تو سب ہی ہیں مگر ان میں کچھ بد اعمالی میں کم ہیں لیکن زیادہ افراد وہ ہیں جو کفر کے ساتھ ساتھ شدت سے بد اعمال بھی ہیں۔^[۲]

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَظَلَمُوا بِهَا ۗ فَانظُرْ

كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ﴿۱۳﴾

”پھر ہم نے بھیجا ان کے بعد موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے یہاں کے عمائد کی طرف^[۳] تو ان لوگوں نے ان کے ساتھ ظلم سے کام لیا^[۴] تو دیکھو کیسا انجام ہو افساد یوں کا۔“

وَقَالَ مُوسَىٰ يُفِرُّ عَوْنُ رَبِّي رَسُولٌ مِّنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۴﴾ حَقِيقٌ عَلَىٰ أَنْ لَا أَقُولَ

عَلَىٰ اللَّهِ إِلَّا الْحَقُّ ۗ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَبِّكُمْ فَأَرْسِلْ مَعِيَ بَنِي

إِسْرَائِيلَ ﴿۱۵﴾

”اور کہا موسیٰ نے اے فرعون! میں پیغمبر ہوں تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے۔ میری شان یہ ہے^[۵] کہ اللہ کی نسبت حق کے سوا کوئی بات نہ کہوں میں لایا ہوں تم لوگوں کی طرف معجزہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تو بنی اسرائیل کو آزاد کر دے کہ وہ میرے ساتھ چلے جائیں۔“

[۱] ای اشرف قومہ وذوی الامر منهم (مجمع البیان) اذا اخذ على الانسان العهد فنقضه قبيل ليس عليه اي كانه لم يعهد اليه

[۲] فيكون تأويل الاية كفروا بها (جلالين) پس ظلم کیا ساتھ اس کے (شاہ فنج الدین)

[۳] ای اشرف اف تو حدوذوی الامر منهم (مجمع البیان)

[۴] كفروا بها (جلالين) پس ظلم کیا ساتھ اس کے (شاہ فنج الدین)

[۵] حقیق جدیر علی ان بان (جلالین) سزاوار بآنکہ (شاہ ولی اللہ)

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا تفصیلی تذکرہ، اور فرعون کا انجام

فرعون بنی اسرائیل کو غلام بنائے ہوئے تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کی آزادی کا مطالبہ کر رہے تھے اور فرعون سے کہہ رہے تھے کہ انہیں ان کے آبائی وطن شام کی طرف واپس چلا جانے دے۔ [۱]

قَالَ إِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِآيَةٍ فَأْتِ بِهَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ

فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ ﴿۱۰۷﴾ وَنَزَعَ يَدَهُ فَإِذَا هِيَ بِيْضَاءٌ لِلنّٰظِرِیْنَ ﴿۱۰۸﴾

”اس نے کہا کہ اگر تم کوئی معجزہ لائے ہو [۱] تو اسے پیش کرو، اگر تم سچے ہو، انہوں نے اپنے عصا کو پھینک دیا جو ایک دم کھلا ہوا اژدھا بن گیا اور اپنا ہاتھ باہر نکالا تو ایک دفعہ ایسا ہو گیا کہ وہ سفید نورانی تھا دیکھنے والوں کے سامنے۔“

”اپنا ہاتھ باہر نکالا“ اس میں ایک کڑی درمیان کی ضرورت محذوف ہے۔ اس لئے دو قول ہو گئے، ایک یہ کہ ہاتھ گریبان کے اندر لے گئے اور دوسرے یہ کہ بغل کے نیچے [۲]

بہر صورت باہر نکالا تو اس سے نور تاباں تھا۔ [۳]

قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ إِنَّ هَذَا لَسِحْرٌ عَلَیْمٌ ﴿۱۰۹﴾ یُرِیْدُ أَنْ یُخْرِجَکُمْ مِنْ

أَرْضِکُمْ ۚ فَمَاذَا تَأْمُرُونَ ﴿۱۱۰﴾ قَالُوا أَرْجِهْ وَأَخَاهُ وَأَرْسِلْ فِی الْمَدَآئِنِ حٰشِرِیْنَ ﴿۱۱۱﴾

یٰٓأَتُوکَ بِکُلِّ سِحْرِ عَلَیْمٍ ﴿۱۱۲﴾

”فرعون والوں میں سے ممتاز آدمیوں نے کہا کہ بلاشبہ یہ بڑا ماہر جادوگر ہے جو تمہیں تمہارے ملک سے نکالنا چاہتا ہے تو تم لوگ کیا رائے دیتے ہو؟! ان لوگوں نے کہا کہ انہیں اور ان کے بھائی کو روک رکھے [۴] اور شہروں میں جمع کرنے والے آدمی [۵] بھیجے جو ہر بڑے ماہر جادوگر کو بلا کر لائیں۔“

فرعون والوں میں سے ممتاز آدمیوں نے کہا کہ تم کیا رائے دیتے ہو؟ تو یہ کس سے کہا؟ ایک معنی اس کے یہ کئے گئے ہیں کہ انہوں نے

[۱] ای ماطلق بنی اسرائیل من عقلا لتسخرہ و خلعم ان یرجعوا الی الارض المقدسة (مجمع البیان)

[۲] اگر آوردہ معجزہ (شاکہ ولی اللہ)

[۳] فادخل یدہ فی جیبہ و قبیل تحت ابطہ ثم نزعها منه و اظہرہا (مجمع البیان)

[۴] قال ابو علی کان فیہا من النور و الشعاع ما لم یشاہد مثله فی ید احد (تبیان)

[۵] موقوف دار اورا (شاکہ ولی اللہ)

[۶] جامعین (جلالین) اکٹھا کرنے والے آدمی (شاہ رفیع الدین)

آپس میں ایک دوسرے سے کہا [۱]

دوسرا خیال یہ ہے کہ خواص نے جن میں فرعون بھی تھا، کانفرنس کر کے عوام کی رائے دریافت کی جس کا جواب عوام نے فرعون کو مخاطب کر کے دیا۔ [۲]

قرآن مجید سورہ شعراء میں اس قول کی خود فرعون کی طرف نسبت دی گئی ہے۔

اس لئے بہت ممکن ہے کہ یہاں بھی مراد یہی ہو کہ خود فرعون نے دوسرے لوگوں سے یوں رائے لی اور اس کی نسبت الملائک من قوہ فرعون کی طرف ویسی ہے کہ جیسے بادشاہوں کی طرف کسی بات کے انتساب میں یوں کہا جاتا ہے کہ ملازمان بارگاہ سلطانی نے ایسا کیا اور اس لئے جواب جو ہے، وہ بصیغہ مفرود خود فرعون ہی سے مخاطب کے ساتھ ہے: اَرْجِهْ وَاَخَاكُ جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے ”ان کو اور ان کے بھائی کو روک رکھے۔“

ایک بات یہ ذہن میں آتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ تو بنی اسرائیل کے ملک سے باہر لے جانے کا تھا۔ پھر فرعون یا اس کے عمائد نے اپنی قوم سے کیوں کہا کہ یہ تمہیں تمہارے ملک سے نکالنا چاہتے ہیں؟!

معلوم ہوتا ہے جیسے سیاستدان اصحاب اقتدار کا قاعدہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اقتدار کے دباؤ سے خود مظلوم عوام کی آواز اپنے حق میں اٹھواتے ہیں، اسی طرح یہاں صورت یہ تھی کہ عمائد تو سب قوم قبیل سے ہوتے تھے جو فرعون کے خاندان کے لوگ تھے اور بنی اسرائیل بیچارے غریب عوام تھے تو یہ جلسہ ان لوگوں نے انہی بنی اسرائیل کا کر کے ان کے ہمدرد کے لباس میں یہ کہا کہ یہ شخص جو آیا ہے تمہیں تمہارے ملک سے نکال کر بے گھر کرنا چاہتا ہے اور ان عوام نے ان کی مرضی کے مطابق یا خود اپنے فطری ذہن سے یہ جواب دیا کہ یہ دونوں ساحر ہیں تو ان کے مقابلہ کے لئے شہروں شہروں سے ساحر بلوائے تاکہ اگر یہ غلط قسم کے دعویٰ ہوں تو ان کا دعویٰ باطل ہو جائے۔

وَجَاءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوا إِنَّ لَنَا لَأَجْرًا إِن كُنَّا نَمُنَّ ۝۱۳۰ قَالَ نَعَمْ

وَأَنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۝۱۳۱ قَالُوا يُمُوسَىٰ إِمَّا أَنْ تُلْقِيَ وَإِمَّا أَنْ نَكُونَ نَمُنَّ

الْمُلْقِينَ ۝۱۳۲ قَالَ الْقَوَا ۚ فَلَمَّا أَلْقَوْا سَحَرُوا أَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوهُمْ

وَجَاءُوا بِسِحْرِ عَظِيمٍ ۝۱۳۳

”اور سب جادوگر فرعون کے پاس آئے، انہوں نے کہا گیا کہ ہم غالب آئے تو ہمیں ایک بڑے معاوضہ کا ضرور حق ہوگا، اس نے کہا ”ہاں اور بلاشبہ تم خاص تقرب رکھنے والوں میں سے بھی ہو گے۔“ انہوں نے کہا اے موسیٰ! یا تو تم پھینکو اور یا ہم ہی پھینکنے والے ہوں۔ انہوں نے کہا کہ تم ہی پھینکو، جب انہوں نے پھینکا تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور انہیں خوفزدہ کر دیا اور بہت بڑا جادو پیش کیا۔“

[۱]. گفتند اشرف از قوم فرعون بایکدیگر (شاہ ولی اللہ)

[۲]. قال الملائک... لمن دونهم فی الرتبة من الحاضرين (مجمع البیان)

بیان واقعہ میں درمیان کی کڑیوں کا اچھا خاصہ سلسلہ مخدوف ہے [۱] یعنی ان کے مشورہ کے مطابق فرعون نے اطراف و جوانب میں آدمی بھیج کر ساحروں کو بلوایا اور وہ سب آکر فرعون کے پاس اکٹھا ہوئے ان سے موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا گیا اور ان سے مقابلہ کا انہیں حکم دیا گیا، تب انہوں نے یہ بات کہی۔

جادو کی قسموں میں سے ایک ”شعبہ بازی“ ہوتی ہے جسے اردو میں ”ڈھٹ بندی“ کہا جاتا ہے۔ اس سے اصل شے کی کیفیت میں تبدیلی نہیں ہوتی بلکہ دیکھنے والوں کا حاسہ متاثر ہوتا ہے کہ انہیں ایسا ہی نظر آتا ہے۔ اس آیت میں قرآن کے یہ الفاظ کہ ”لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا“ بتلاتے ہیں کہ ساحران فرعون کے جادو کی نوعیت یہی تھی۔ [۲]

يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْمَعُ

”ان کے جادو کی وجہ سے خیال یہی ہوتا تھا کہ یہ دوڑ رہے ہیں۔“ (سورہ طہ - ۶۶)

بعض لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ مطلق سحر کا اثر واقعاً خارج میں موجود نہیں ہوتا بلکہ خیال متاثر ہوتا ہے۔ [۳] مگر ہمارے نزدیک بطور عموم یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے۔ ہاں سحر کی یہ قسم جو ہر ساحر عمل میں لائے تھے، ایسی ہی تھی۔

یہاں پر قرآن مجید کے دونوں جگہ کے الفاظ: سِحْرًا وَعَيْنِ النَّاسِ اور يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْمَعُ ان کا تقاضا یہی ہے جو دوسرے مفسرین سے اتفاق کرتے ہوئے میں نے لکھا مگر میں ابھی اس سے مطمئن نہیں ہوں اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو اس کے مقابلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعجاز کو بھی ماننا پڑے گا کہ انہوں نے دیکھنے والوں کی نگاہوں پر سے اس اثر کو دور کر کے ایک دوسرا اثر پیدا کر دیا کہ وہ ایسا محسوس کرنے لگے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا نے ان سانپوں کو نگل لیا مگر الفاظ قرآنی ایسا بتاتے ہیں کہ واقعی وہاں حرکت کرتے ہوئے سانپ موجود تھے جنہیں عصا نے موسیٰ نے اڑ دھا بن کر نگل لیا۔ بہر صورت ان دونوں واقعوں میں تفریق نہیں ہو سکتی۔ اگر ساحروں کا عمل خیال کو متاثر کرتا تو موسیٰ علیہ السلام کے عمل کو بھی ایسا ہی ماننا پڑے گا اور اگر وہاں واقعیت مانی جائے تو ساحروں کے کرتب کو بھی واقعیت کا حامل تسلیم کرنا ضروری ہے۔

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنْ أَلْقِ عَصَاكَ ۖ فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ ﴿۱۷۲﴾ فَوَقَعَ
الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۷۳﴾ فَغَلَبُوا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوا صَبِيرِينَ ﴿۱۷۴﴾ وَالْقِيَمَةُ
السَّحَرَةُ سُجَّدِينَ ﴿۱۷۵﴾ قَالُوا آمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۷۶﴾ رَبِّ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ﴿۱۷۷﴾
”اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ اپنا عصا پھینکتو تو ایک دم وہ نکلنے لگا اسے جو انہوں نے جھوٹ موٹ ظاہر کیا

[۱] فی الکلام حذف کثیر (مجمع البیان)

[۲] بجا دو بستند چشمہائے مردمان را (شاه والی اللہ) جادو کر دیا آنکھوں پر لوگوں کے (شاه رفیع الدین) صرفون عن حقیقة ادراکھا (جلالین)

[۳] فی ہذا دلالة علی ان السحر لا حقیقة له (مجمع البیان)

تھا تو حق نمایاں ہو گیا [۱] اور جو کچھ وہ کرتب دکھایا کرتے تھے، وہ بے حقیقت ثابت ہو گیا تو اس طرح وہ لوگ [۲]
مغلوب ہوئے اور ذلیل ہو کر رہ گئے [۳] اور تمام جادوگر سجدہ میں گر پڑے کہا کہ ہم ایمان لائے تمام جہانوں کے
پروردگار پر جو موسیٰ اور ہارون کا پروردگار ہے۔“

”تمام جہانوں کے پروردگار“ کہنے کے بعد ”موسیٰ اور ہارون کا پروردگار“ کہنا اس کا اظہار ہے کہ ہمیں اس ”رب العالمین“ کا تصور نہیں
موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے ذریعہ سے ہوا ہے کہ فرعون خدائی کا غلط دعویدار ہے اور جس کی طرف سے وہ دعوت دیتے ہیں، وہ خدائے برحق ہے۔ [۴]

قَالَ فِرْعَوْنُ اَمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اَذِنَ لَكُمْ ؕ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكْرٌ مُّمُوٓءَا فِي
الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَا اَهْلَهَا ؕ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾ لَا قَطْعَانَ اَيْدِيْكُمْ
وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَا صَلْبٰنِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ قَالُوْا اِنَّا اِلٰى رَبِّنَا
مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّا اِلَّا اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَاءَنَا ۗ رَبَّنَا اَفْرِغْ
عَلَيْنَا صَبْرًا وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

”فرعون نے کہا تم لوگ اس پر ایمان لے آئے اس سے پہلے کہ میں تم کو اجازت دوں، یقیناً یہ ایک چال ہے جو تم
لوگوں نے اس شہر میں چلی ہے اس غرض سے کہ اس سے اس کے باشندوں کو باہر نکالو۔ اب تمہیں پتہ چلے گا۔ میں
یقیناً تمہارے ہاتھوں اور تمہارے پیروں کو مختلف سمتوں سے کاٹ دوں گا۔ پھر تم سب کو سولی پر لٹکا دوں گا، انہوں
نے کہا کہ یقیناً ہم اپنے پروردگار کی طرف پلٹیں گے اور تم ناراض نہیں ہماری کسی بات سے سو اس کے کہ ہم ایمان
لائے اپنے پروردگار کی نشانیوں پر جب وہ ہمارے سامنے آئیں۔ اے ہمارے پروردگار! لٹکا دے ہم پر صبر
کی طاقت اور ہمیں دنیا سے اٹھا مسلمان ہونے کی حالت میں۔“

”ہاتھوں اور پیروں کو مختلف سمتوں سے کاٹ دوں گا۔“ یعنی ایک طرف کا ہاتھ اور ایک طرف کا پیر [۵]

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوسٰى وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ
وَيَذَرُكَ وَالِهٰتِكَ ۗ قَالَ سَنَقْتُلُ اَبْنَاءَهُمْ وَنَسْتَحْيِ نِسَاءَهُمْ ۗ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ

[۱]. ثبت و ظہر (جلالین)

[۲]. فغلبوا ای فرعون و قومہ (جلالین)

[۳]. صاروا ذلیلین (جلالین)

[۴]. فیہ معنی الذی دعا الی الایمان بہ موسیٰ و ہارون (تبیان)

[۵]. ای من کل شق طرف (مجمع البیان)

فَهْرُونَ ﴿١٢٥﴾

”اور فرعون کی قوم کے بڑے آدمیوں نے کہا کہ کیا آپ موسیٰؑ اور ان کی قوم کے آدمیوں کو چھوڑے رکھیں گے کہ وہ زمین میں خرابیاں پیدا کریں اور آپ کو اور آپ والے خداؤں کو چھوڑ دیں؟ اس نے کہا ہم عنقریب ان کے لڑکوں کو قتل کرنا شروع کر دیں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے اور بلاشبہ ہم ان پر پورا قابو رکھتے ہیں۔“

اب معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰؑ کے گرد بنی اسرائیل کے لوگ کافی جمع ہو گئے تھے اور انہیں اپنا سردار ماننے لگے تھے، اس لئے قوم فرعون کے عمائدین کو تشویش پیدا ہوئی اور انہوں نے فرعون کو ان کے خلاف کسی سخت اقدام کے کرنے پر آمادہ کرنا چاہا۔

ہاں ایک بات قابل غور ہے کہ دوسری آیات سے پتہ چلتا ہے کہ فرعون خود خدائی کا مدعی تھا۔ پھر یہاں قوم کے افراد کے اس کہنے کا کیا مطلب ہے کہ ”آپ کو اور آپ کے خداؤں کو چھوڑ دیں“..... اس کے لئے شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”فرعون کے بت یہ تھے کہ اپنی صورت بنا دیتا تھا لوگوں کو کہ اس کی پوجا کریں“ (موضح القرآن)

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس نے کچھ چھوٹے چھوٹے بت قوم میں بنوادیئے تھے یہ کہہ کر کہ میں تمہارا اور ان خداؤں کا بھی خدا ہوں (جلالین) اور اس لئے دوسری جگہ فرعون کی زبانی قرآن مجید میں یہ الفاظ ہیں کہ: ”أَنَا رَبُّكُمْ الْأَعْمَلِي“ میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں۔“ دونوں صورتوں میں ”الْهَيْتَكَ“ کے معنی وہی ہوں گے جو ہم نے ترجمہ میں ظاہر کئے ہیں کہ ”آپ کی طرف کے خدا“۔ نہ یہ کہ ”آپ کے خدا“ کیونکہ ان بتوں کو اس نے عوام کے خداؤں کی حیثیت سے بنوایا تھا۔ اپنے خدا کی حیثیت سے نہیں۔

بعض قاریوں نے اس لفظ ہی میں تصرف کر کے ”الْهَيْتَكَ“^[۱] اور ”الْهَيْتَكَ“^[۲] کر دیا جو ہمارے نزدیک درخود اعتناء نہیں ہے۔ میں تو اس لفظ کی اسی قرات سے مطلب ہے جس پر مسلمانوں کا عمل درآمد ہے اور ہمیں اسی کے معنی سمجھنے کی ضرورت۔

ہماری قدیم تفسیر سے اس سوال کا حل بہت آسان ہو جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ فرعون پہلے خود بت پرست تھا اس کے بعد اس نے دعوائے خدائی کیا ہے۔ اس صورت میں ”الْهَيْتَكَ“ کے معنی صاف ہیں کہ جن خداؤں کی آپ پرستش کرتے رہے ہیں۔^[۳]

جن مظالم کا فرعون نے اب ارادہ ظاہر کیا ہے، یہ وہی مظالم ہیں جو وہ حضرت موسیٰؑ کی ولادت سے پہلے کرتا رہا تھا۔ اب اس نے پھر انہی کے اعادہ کا اعلان کیا ہے^[۴]

ہاں! ان دونوں میں ایک فرق بھی ہو سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ پہلے بچوں کا قتل کرنا جو تھا، وہ ان بچوں کا تھا جو نئے پیدا ہوں، تاکہ وہ بچے موجود نہ رہے جو نجومیوں کے قول کے مطابق اس کی تباہی کا باعث ہوگا اور اب قتل اس قوم کے ان بچوں اور نوجوانوں کا ہے جن سے اندیشہ ہے

[۱]۔ یعنی عبادتک (تبیان)

[۲]۔ انما هو تأنیث الہ (تبیان)

[۳]۔ کان فرعون یعبد الا صنما ثم ادعی بعد ذلك الربوبیة (علی بن ابراہیم)

[۴]۔ درمیان میں چھوڑ دیا تھا۔ اب پھر قصد کیا (موضح القرآن)

کہ وہ منظم ہو کر اس سے مقابلہ کریں۔^[۱]

قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا ۗ إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿۱۷۸﴾

”موسیٰ نے اپنی قوم والوں سے کہا کہ تم اللہ سے مدد طلب کرو اور صبر و برداشت سے کام لو یقیناً زمین اللہ کی ہے وہ اس پر تسلط عطا کرتا ہے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے^[۲] اور آخرت کی بہتری پر ہیزگاروں ہی کا حصہ ہے۔“

یہاں ”وارث“ کرنے کا مطلب، اسباب تکوینیہ سے تسلط عطا کرنا ہی ہے۔ یہ نہیں کہ جو تسلط حاصل کر لے وہ منجانب اللہ اس تسلط کا حق دار بھی ہے اور اسی لئے بعد میں کہا ہے کہ ”آخرت کی بہتری پر ہیزگاروں کے لئے ہے“ یعنی دنیوی تسلط دوسروں کو بھی ہو جاتا ہے لیکن اگر تقویٰ کا جوہر نہیں ہے تو یہ دنیوی کامیابی آخرت کی ناکامی کی ذمہ داری ہوگی۔

بے شک جمہور کے مفسرین جو تسلط و اقتدار کو خود حقانیت کا ایک ثبوت سمجھتے ہیں، انہوں نے وارث ہونے سے مطلب استحقاق کا لیا ہے^[۳] مگر انہیں اس پہلو پر غور کرنا چاہیے کہ یہ تسلط و اقتدار تو کبھی کافروں کو بھی حاصل ہو جاتا ہے، پھر ان کافروں کو بھی حقدار ہی ماننا پڑے گا اور اس صورت میں خود یہ فرعون بھی جواب تک اس بے پناہ اقتدار کا حامل تھا تو اس اقتدار کو منجانب اللہ استحقاق کا مرادف کیوں نہ سمجھا جائے؟! پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس امتزاع سلطنت کی مہم پراٹھے ہی کیوں ہیں اور اگر فرعون کے خلاف اٹھنا اس لئے درست ہے کہ وہ خلق خدا پر احکام الہی کے خلاف حکمرانی کرتا ہے اور مظالم کا مرتکب ہے تو پھر کسی نام نہاد مسلمان کے اقتدار کے خلاف بھی اٹھنا درست ہے جو یزید کو حکام الہی کے خلاف رویہ اختیار کرے اور خلائق کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنائے۔

قَالُوا أُوذِينَا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَأْتِينَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۗ قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يُهْلِكَ عَدُوُّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ﴿۱۷۹﴾

”ان لوگوں نے کہا کہ ہمیں آپ کے آنے سے پہلے بھی ایذا نہیں پہنچیں اور اب آپ کے آنے کے بعد بھی۔ انہوں نے کہا قریب ہے وہ منزل^[۴] کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تمہیں اس کے بجائے زمین پر اقتدار عطا کر کے دیکھے کہ تم کیسے اعمال کرتے ہو۔“

[۱] الذین یکون فہیم النجدۃ والقوتو یصلحون للقتال (مجمع البیان)

[۲] ای الی من یشاء نقل الموارث فیورثکم بعد اہلاک فرعون لہما اور ثہا فرعون (مجمع البیان)

[۳] زمین کا وارث کرے یعنی ملک کا حکم کرے جو حق ہے حضرت آدم علیہ السلام کا (موضح القرآن)

[۴] امید است کہ (شاہ ولی اللہ) شتاب ہے یہ کہ (شاہ فیض الدین)

بنی اسرائیل کی دل شکن باتیں

چونکہ جیسا کہ پہلے آچکا ہے، جناب موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے پہلے بھی یہی ہو چکا تھا کہ لڑکے ہلاک کر دیئے جاتے تھے اور لڑکیاں کنیز بنا کر رکھ لی جاتی تھیں اور وہی اب بعثت موسیٰ علیہ السلام کے بعد فرعون نے اپنے ارادہ کا اعلان کیا ہے [۱] اس لئے قوم بنی اسرائیل نے گھبرا کر جناب موسیٰ علیہ السلام سے یہ دل شکن جملہ کہا جس میں ان پر معاذ اللہ ایک طرح کی نحوست کا الزام تھا مگر انہوں نے اسے ان کے وقتی اضطراب کا ایک اضطراری نتیجہ قرار دیتے ہوئے اس کا جواب بڑے تسلی آمیز انداز سے دیا ہے جو ان کی اخلاقی رفعت کا آئینہ بردار ہے۔ اس سے ان لوگوں کو اپنے خیال کی اصلاح کرنا چاہیے جنہوں نے عام شہرت اور بعض غیر مستند روایات کی بنا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تمام سلسلہ انبیاء میں خاص طور پر ”میر غضب“ مان لیا ہے اور ان کی سیرت کا نقشہ جلال ہی کے چوکھٹے میں دیکھا ہے۔ وہ دیکھیں کہ قوم کی کہی ہوئی کتنی سخت بات کا انہوں نے کتنے نرم لہجہ میں جواب دیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ دوسرے تمام انبیاء ہی کی طرح غیر معتدل اور بے محل غیظ و غضب سے بری ہیں اور وہی حلم و تحمل رکھتے ہیں جو عام طور سے انبیاء کا شعار رہا ہے۔

وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِينَ وَنَقْصِ مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَدْكَرُونَ ﴿۱۳۰﴾
فَإِذَا جَاءَتْهُمْ الْحَسَنَةُ قَالُوا لَنَا هَذِهِ ۗ وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَطَّيَّرُوا بِمُوسَىٰ
وَمَنْ مَعَهُ ۗ أَلَا إِنَّمَا طَّيَّرَهُمْ عِنْدَ اللَّهِ وَلَكِنَّ آكَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۱۳۱﴾

”اور ہم نے فرعون والوں کو گرفتار کیا قحط اور پھلوں کی کمی میں۔ شاید کہ وہ نصیحت قبول کریں تو جب ان کے لئے بھلائی ہوتی تھی تو وہ کہتے تھے کہ یہ ہمارا حق ہے [۲] اور اگر انہیں کچھ برائی پہنچتی تھی تو موسیٰ اور ان کے ساتھ والوں کی نحوست قرار دیتے تھے۔ ارے ان کی نحوست [۳] تو اللہ کے یہاں ہے مگر ان میں کے زیادہ لوگ علم نہیں رکھتے۔“
”إِنَّمَا طَّيَّرَهُمْ عِنْدَ اللَّهِ“ ان کی نحوست تو اللہ کے یہاں ہے۔“ اس کا ایک مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ شومی تقدیر یا شامت اعمال ہے جو ان کے شامل حال ہے، کسی دوسرے آدمی کی نحوست کا اثر تھوڑی ہے۔
شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”اس کا جواب یہ فرمایا کہ شومی ان کے کفر سے تھی، کیونکہ کافر بھی دنیا میں عیش کرتے ہیں، اصل حقیقت تھی، سو فرمایا کہ دنیا کے احوال موقوف بر تقدیر ہیں“ (موضح القرآن)

ہمارے مفسرین میں جناب شیخ الطائف نے بھی یہی تحریر کیا ہے۔ [۴]

[۱]. الذی کان بعد مجیئ موسیٰ الوعد لہم تجدید ذلک العذاب (تبیان)

[۲]. ای انا نستحق ذلک (مجمع البیان)

[۳]. طائرهم شو مهم (جلالین)

[۴]. معناہ ان اللہ هو الذی یاتی بطائر البرکة وطائر الشوم من الخیر والشر والنفع والضر (تبیان)

لیکن شاہ ولی اللہ دہلوی نے اس نحوست کے معنی یہ قرار دیئے ہیں کہ:

”یعنی مواخذہ بر اعمال ایشان است“ (فتح الرحمن)

اسی کو ہم نے ”شامت اعمال“ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ ایک مفہوم اس جملہ کا جس کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا ہے۔ یہ ہے کہ یہ دنیا کی نحوست جو قحط وغیرہ کی صورت میں ہے، یہ تو کوئی چیز نہیں ہے۔ اصل نحوست ان کی جو ہے وہ اللہ کے یہاں ظاہر ہوگی یعنی روز جزاء جب انہیں ان کے اعمال کی پاداش ملے گی۔^[۱]

وَقَالُوا مَهْمَا تَأْتِنَا بِهِ مِنْ آيَةٍ لِنَسْحَرَنَّ بِهَا ۖ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ﴿۱۳۲﴾

فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجُرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالِدَّمَ آيَةَ

مُقْصَلَاتٍ ۖ فَاسْتَكَبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مُجْرِمِينَ ﴿۱۳۳﴾

”اور انہوں نے کہا کہ جو بھی ”معجزہ“ تم ہمارے سامنے لاؤ^[۱۳۲] کہ ہم پر اس کے ذریعہ سے جادو کرو، پھر بھی ہم تمہاری بات نہیں مانیں گے، تو ہم نے ان پر بھیجا طوفان ٹڈیوں، جوؤں، مینڈکوں اور خون کے کھلے ہوئے معجزوں کی حیثیت سے^[۱۳۳] اس پر بھی انہوں نے گھمنڈ سے کام لیا اور وہ بڑے گنہگار لوگ تھے۔“

حقیقت میں وہ جناب موسیٰ علیہ السلام کے پیش کردہ امور کو ”معجزہ“ مان لیتے تو پھر کافر ہی کیوں ہوتے مگر چونکہ یہ باتیں تھیں غیر معمولی اور بحیثیت معجزہ پیش ہوئی تھیں تو انہوں نے پہلے تو ”آیت“ کا لفظ صرف کیا جس کے معنی نشانی کے ہیں اور اسی کو ”معجزہ“ کہتے ہیں، پھر اس کی تاثیر کو جادو کہہ کر انہوں نے اپنی کفرانہ ذہنیت کا ثبوت دے دیا اور یہ اعلان کر دیا کہ ہم بہر حال ان چیزوں پر جنہیں تم معجزہ کہہ کر پیش کرتے ہو، ایمان نہیں لائیں گے۔

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا يُمُوسَىٰ اذْعُ لَنَا رَبِّكَ ۖ مِمَّا عٰهَدَ عِنْدَكَ ۗ لَئِن كَشَفْتُمْ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ ۚ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿۱۳۴﴾ فَلَمَّا

كَشَفْنَا عَنْهُمْ الرِّجْزَ إِلَىٰ آجَلٍ هُمْ بِلُغْوِهِ إِذَا هُمْ يَنْكُثُونَ ﴿۱۳۵﴾

”اور جب ان پر عذاب وقوع میں آ گیا^[۱۳۴] تو انہوں نے کہا اے موسیٰ! ہمارے لئے اپنے پروردگار سے دعا کرو، اس عہدہ کے سبب سے جو اس نے تمہیں عطا کیا ہے۔ اگر تم ہم سے اس عذاب کو ہٹا دو گے تو ہم تم پر ایمان لے

[۱] معناه الا انما الشوم الذي يلحقهم هو الذي وعدوا به من العقاب عند الله يفعل بهم في الاخرة (مجمع البيان)

[۲] ای شئی تأتینا به من المعجزات (تبیان)

[۳] ای معجزات بینات ظاہرات وادلة واطحات (مجمع البيان)

[۴] الرجز العذاب (جلالین)

آئیں گے اور تمہارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دیں گے تو جب ہم نے ان سے عذاب کو ہٹا دیا اس مدت تک کہ جس تک پہنچنا ان کے نصیب میں تھا تو وہ ایک دم عہد کو توڑتے ہوئے نظر آئے۔“

بِمَا عٰهَدَ عِنْدَكَ، اس کے ایک معنی یہ کہے گئے ہیں کہ ان واسطوں اور دعاؤں کے ذریعہ سے جو اس نے تمہیں بتلائی ہیں [۱] ہمارے لئے دعا کرو اور دوسرے یہ معنی کہ جیسا اس نے تم سے پہلے کہہ رکھا ہے کہ اگر یہ ایمان لائیں گے تو میں عذاب سے ان کو بچا لوں گا [۲] تیسرے معنی یہ کہے گئے ہیں کہ اس نے قبولیت دعا کا جو تم سے عہد کیا ہے [۳] مگر مجھے یہ معنی زیادہ ذہن سے قریب معلوم ہوتے ہیں کہ عہد عندک کے معنی ہیں، وہ عہدہ اور منصب نبوت و رسالت کا جو اس نے تمہیں عطا کیا ہے [۴] اس لئے میں نے ترجمہ اسی کے مطابق کیا ہے۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَاُوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشٰرِقِ الْاَرْضِ وَمَغْرِبِهَا الَّذِيْنَ بَرَكْنَا فِيْهَا ۗ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْ اِسْرٰٓءِيْلَ ۗ

بِمَا صَبَرُوْا ۗ وَذَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۴﴾

”تو ہم نے ان سے بدل لیا [۵] اور انہیں دریا میں ڈبو دیا، اس لئے کہ وہ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے اور ان کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ اور ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے ہم نے زمین کے مشرق اور مغرب کے تمام اطراف پر جن میں ہم نے برکت عطا کی تھی، اقتدار کا مالک بنایا اور تمہارے پروردگار کا نیک وعدہ بنی اسرائیل پر پورا ہو گیا [۶] اس بنا پر کہ انہوں نے صبر سے کام لیا تھا اور مٹا دیا ہم نے اسے جو فرعون اور اس کی قوم والے کرتے تھے اور جو کہ وہ اونچی اونچی عمارتیں بناتے تھے“ [۷]

وَجُوْرًا بِبَنِيْ اِسْرٰٓءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتُوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ؕ
قَالُوْا اَيُّ مَوْسٰى جَعَلْنَا لَهَا كَمَا لَهُمُ الْهٰٓةُ ۗ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۵﴾ اِنَّ

[۱] بآں اسماء و ادعیه کہ وحی کردہ است نزدیک تو (شاه ولی اللہ)

[۲] بما عہد عندک من کشف العذاب عن ان اٰمننا (جلالین)

[۳] تم سے جو خدا نے (قبول دعا کا) عہد کیا ہے (مولوی فرمان علی صاحب)

[۴] بما عہد عندک من النبوة عن ابی مسلم فعلى هذا يكون الباء بآء القسم المعنى بحق ما اتاك الله من النبوة (مجمع البيان)

[۵] ای فجازینا ہم علی سوء صنیعہم بالعذاب (مجمع البيان)

[۶] راست شد وعدہ نیک پروردگار تو (شاه ولی اللہ)

[۷] یرفعون من البنیان (جلالین)

هُؤُلَاءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيهِ وَبِطْلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٣٩﴾ قَالَ أَعْيَرَ اللَّهُ أَبْغِيكُمْ
إِلَهًا وَهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿١٤٠﴾

”اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا کے پار اتار دیا تو ان کا گزر ایک ایسی جماعت کی طرف سے ہوا جو اپنے کچھ بتوں کی عبادت پر ٹوٹی ہوئی تھی [۱] انہوں نے کہا اے موسیٰ! ہمارے لئے بھی ایک خدا بنا دیجئے جیسے ان کے خدا ہیں۔ انہوں نے کہا تم ایسے لوگ ہو جو جہالت سے کام لیتے ہو، یقیناً یہ لوگ جس عالم میں ہیں وہ مٹنے والا ہے [۲] اور غلط ہیں جو وہ کام کر رہے ہیں (پھر) کہا کیا اللہ کے سوا تمہارے لئے کوئی خدا تلاش کروں؟ [۳] حالانکہ اس نے تمہیں تمام جہانوں سے زیادہ عطا کیا ہے۔“

فَضَّلَكُمْ کے معنی اکثر مفسرین و مترجمین نے ”فضیلت عطا کی ہے“ قرار دیئے ہیں [۴] اس صورت میں قید لگانے کی ضرورت پڑتی ہے کہ یہ فضیلت صرف اس دور والوں کے لحاظ سے ہے [۵] اس لئے کہ بعد میں غیر بنی اسرائیل میں ایسی ہستیاں ہوئیں جو بنی اسرائیل کی ہر فرد سے افضل تھیں، مگر ہم اسے فضیلت بمعنی بزرگی سے نہیں سمجھتے بلکہ فضل بمعنی کثرت عطا سے سمجھتے ہیں جسے ہم نے اپنے ترجمہ میں ملحوظ رکھا ہے اور اس کی نظیر ابتدا کے پاروں میں آچکی ہے مگر بنی اسرائیل نے اس کثرت عطا کا مقابلہ شدت کفران کے ساتھ کیا، اس لئے وہ ”فضل“ ان کے لئے باعث فضیلت بننے کے بجائے انتہائی پستی کا مستوجب ہو گیا۔

وَإِذْ أَنْجَيْنَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ ۖ يُقْتَلُونَ أَبْنَاءَكُمْ
وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ ۗ وَفِي ذَلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿١٤١﴾

”اور (یاد رکھنے کا ہے وہ وقت) جب ہم نے تمہیں چھٹکارا دیا فرعون والوں سے کہ وہ تمہیں طرح طرح کی سزاؤں میں مبتلا کرتے تھے، تمہارے لڑکوں کو قتل کرتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھ لیتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بہت بڑی آزمائش تھی۔“
یہ مضمون تمام و کمال شروع کے پاروں میں آچکا ہے، اس لئے اس مقام پر کسی تشریح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

وَوَعَدْنَا مُوسَىٰ ثَلَاثِينَ لَيْلَةً وَأَمَمْنَا بِهَا بِعَشْرِ فَتَمَّ مِيقَاتُ رَبِّهِ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ۗ

[۱]. یقیناً علیہا ملازمین لہا (مجمع البیان)

[۲]. هلك ما هم فيه (جلالین) باطل کر دہ شدہ است مذہبی کہ ایشان در آنند (شاہ ولی اللہ)

[۳]. اصلہ ابغی لہ (جلالین)

[۴]. فضل دادہ است شمارا بر عالمہا (شاہ ولی اللہ) بزرگی تم کو او پر عالموں کے (شاہ فریح الدین)

[۵]. فی زمانکم (جلالین) قال الحسن و ابو علی وغیرہما یرید علی عالمی زمانہ (تبیان)

وَقَالَ مُوسَى لِأَخِيهِ هَارُونَ اخْلُفْنِي فِي قَوْمِي وَأَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ

الْمُفْسِدِينَ ﴿٣٧﴾

”اور ہم نے موسیٰؑ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور ان کا تہمتہ قرار دیا مزید دس کو جس سے ان کے پروردگار کی میعاد چالیس راتوں کی پوری ہوگئی اور موسیٰؑ نے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا تھا کہ تم میری قوم میں میری جانشینی کرو اور ٹھیک کام کرنا اور خرابی کرنے والوں کے طریق کار کی پیروی نہ کرنا۔“

تیس راتوں کا وعدہ اور مزید دس کا اضافہ۔ بداء کا کھلا ہوا نمونہ

یہ واقعہ جس کا قرآن میں صاف تذکرہ ہے، ”بداء“ کا کھلا ہوا نمونہ ہے۔ ”بداء“ میں کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ مصلحت الہی اس کی متقاضی ہوتی ہے کہ جو محتتم نتیجہ تقدیر کا ہے، اسے ایک دم سامنے نہ لایا جائے بلکہ پہلے وہ لایا جائے جو خالق کے یہاں کچھ شرائط کے ساتھ مشروط ہے، بعد میں جب اس کی کوئی خاص شرط پوری نہ ہو، جس کا پورا نہ ہونا علم الہی میں پہلے ہی سے تھا مگر ظاہر نہیں کیا گیا تھا اس وقت دوسرا فیصلہ سنایا جائے۔ مثلاً تقدیرات کے نوشتہ میں یہ لکھ دیا گیا کہ فلاں شخص کی عمر چالیس برس ہے اس کے بعد اس نے راہ خدا میں کچھ صدقہ دے دیا۔ اب اعلان کر دیا گیا کہ اس کی عمر میں اس صدقہ کی وجہ سے دس برس کا اضافہ کیا جاتا ہے جس سے اس کی عمر پچاس برس ہوگئی۔

یہاں تقدیر الہی میں جو تبدیلی ہے، وہ معاذ اللہ کسی لاعلمی کی بنا پر نہیں ہے۔ علم الہی میں جس کا مظہر ”لوح محفوظ“ کہلاتا ہے، از اول یہی تھا کہ اس کی پچاس برس کی عمر ہو مگر اس نوشتہ میں جو تقدیروں کا ہے اور جسے ”لوح محفوظات“ کہا جاتا ہے، وہ نتیجہ ایک دم درج نہیں ہوتا بلکہ پہلے چالیس برس درج ہوتے ہیں اور پھر دس کا اضافہ کیا جاتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کے اس واقعہ میں بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔ تیس دن کا وعدہ کیا گیا کہ اس کے بعد توریت تم کو عطا ہوگی اور پھر دس دن کا اضافہ کر دیا گیا جس کے بعد ارشاد ہوا کہ ”اس طرح ان کے پروردگار کی میعاد چالیس راتوں کی پوری ہوگئی“..... یہ میعاد، وہی ”لوح محفوظ“ یعنی علم الہی والی ہے جس کا ظہور حضرت موسیٰؑ کے لئے تدریجی طور پر ہوا ہے۔

اس کا سبب کیا ہوا؟ اس کے لئے کتب اہل سنت میں عجیب طرح کی روایت ہے جسے شاہ عبدالقادر دہلوی کی زبان قلم سے سنئے۔

حق تعالیٰ نے وعدہ دیا حضرت موسیٰؑ کو کہ پہاڑ پر تیس رات خلوت کرو کہ تمہاری قوم کو توریت دوں۔ اس مدت میں انہوں نے ایک دن مسواک کی فرشتوں کو ان کے منہ کی بو سے خوشی تھی وہ جاتی رہی۔ اس کے بدل دس رات اور بڑھا کر مدت پوری کی۔“ (موضح القرآن)

تفسیر جلالین میں بھی تقریباً ایسا ہی ہے بس اس میں فرشتوں کا نہیں خود اللہ سبحانہ کا ذکر ہے کہ تیس (۳۰) راتیں پوری ہونے پر موسیٰؑ کو اپنے منہ کی بو بری معلوم ہوئی تو انہوں نے مسواک کر لیا اور اللہ نے دس راتیں بڑھا دیں تاکہ وہ جب اس سے کلام کریں تو دہن سے بو آتی ہوئی ہو۔^[۱] یہ وجہ ہمیں قطعاً غلط معلوم ہوتی ہے اور اس سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے کہ صفائی اللہ کو ناپسند ہے، وہ اسلامی نقطہ نظر سے درست نہیں ہے، جب کہ مسواک اسلامی شریعت میں ایک ایسی مستحب عبادت ہے جو واجب کی سرحد سے متصل ہے۔

[۱]. فلما تمت انكر خلوف فمہ فاستاك فامر الله بعشره اخرى ليكلمه بخلوف فمہ (جلالین)

پھر بھی یہ اس کی نوعیت بہر حال وہی ہے جو ”ہدا“ کی ہوتی ہے جسے یہ علمائے جمہور فرقہ شیعہ کے خلاف الزامات کی فہرست میں بڑی شدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

آیت کا جو ترجمہ ہے کہ ”موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ تم میری قوم میں جانشینی کرو، اس سے علامہ طبرسی نے ایک لطیف استدلال کیا ہے جس کی مختصر تشریح یہ ہے کہ حضرت ہارون نبی تو اس وقت ہو چکے تھے جب جناب موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف جانے کا حکم ہوا، انہوں نے بارگاہ الہی میں عرض کیا: **وَإِنَّكَ لَفِي أَمْرٍ مِّنِي**، ہارون کو میرے منصب میں شریک قرار دے۔ (سورہ طہ - ۲۳) اور خالق نے اس کا اعلان کیا کہ:

وَجَعَلْنَا مَعَهُ أَخَاهُ هَارُونَ وَزِيْرًا ہم نے ان کے ساتھ ان کے بھائی ہارون کو ان کا وزیر قرار دیا۔ (سورہ فرقان - ۳۵) مگر اس نبوت کے باوجود وہ امام یعنی قوم کے سربراہ نہیں تھے، امامت حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کو حاصل تھی۔ طور پر جاتے وقت جب انہوں نے کہا:

اخْلُقْنِي فِي قَوْمِي ”تم قوم میں میری جانشینی کا کام انجام دو“

تو اس کے معنی یہ تھے کہ اپنی عدم موجودگی میں امامت کا منصب ان کے تفویض کیا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نبوت کا لازمہ امامت نہیں ہے ورنہ جبکہ وہ نبی تھے ہی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ضرورت کیا تھی کہ وہ انہیں اپنے خلیفہ قرار دیں۔^[۱] اب اس کے بعد جب ہم متفق علیہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ:

انت منی بمنزلہ ہرون من موسی الا انه لانی بعدی۔

تم کو مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام سے تھی مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ نظر ڈالتے ہیں تو صاف یہ حقیقت جلوہ آرا نظر آتی ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہارون کی منزل جو موسیٰ علیہ السلام سے تھی وہ اپنے سے حضرت علی بن ابی طالب کے لئے ثابت کی مگر آخر کے جملہ سے نبوت کو مستثنیٰ قرار دیا تو اس سے بھی معلوم ہوا کہ حضرت ہارون کو علاوہ نبوت کے کوئی منزل خاص حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہ نسبت حاصل تھی اور وہ بخص قرآن خلافت بصورت امامت تھی اور حضرت علی علیہ السلام سے نبوت کی نفی کر دی گئی تھی تو اب لازماً آپ کے لئے وہ دوسری ہی نسبت حاصل ہے کہ آپ بلا فصل خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپ کے لئے نبی کا نہیں بلکہ امام کا منصب من جانب اللہ حاصل ہے جو حضرت ہارون علیہ السلام کو حاصل تھا اور جو مسلمانوں میں فرقہ حقہ امامیہ کے نزدیک حضرت علی علیہ السلام کو حاصل ہے جسے بد نصیبی سے مسلمان اکثریت تسلیم نہیں کرتی۔

وَلَمَّا جَاءَ مُوسَىٰ لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ ۖ قَالَ رَبِّ أَرِنِي أَنظُرَ إِلَيْكَ ۗ قَالَ لَن نُّرِيكَ وَلَٰكِنِ انظُرْ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَانِي ۗ فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا ۗ فَلَمَّا أَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ

[۱] فی ہذا دلالة علی ان منزلة الامانة منفصلة عن النبوة و غیر دالة فیہا و انما اجتمع الامران (انبیاء مخصوصین) مجمع البیان

إِيَّاكَ وَأَنَا أَوَّلَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٣٣﴾

”اور جب موسیٰ آئے ہمارے وعدہ کی جگہ پر [۱] اور ان سے ان کے پروردگار نے کلام کیا تو انہوں نے کہا پروردگار! مجھے جلوہ دکھلا کہ میں تیری طرف نظر کروں۔ ارشاد ہوا کہ تم ہرگز مجھے نہیں دیکھو گے [۲] مگر اس پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر یہ اپنی جگہ ٹھہرا رہے تو پھر یہ امید کرنا کہ تم مجھے دیکھ لو گے تو جب ان کے پروردگار نے پہاڑ پر جلوہ نمایاں کیا تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑے، جب وہ ہوش میں آئے تو کہا کہ پاک ہے تیری ذات۔ تیری طرف توبہ کرتا ہوں اور میں اول درجہ کا ایمان لانے والا ہوں۔“

دیدارِ خدا کا سوال اور اس کا انجام

پروردگار کا دیدار اگر کسی دور میں ہونے والا ہوتا تو یہ نہ کہا جاتا کہ تم ہرگز مجھے نہیں دیکھو گے۔ اس ہرگز میں مستقبل کا ہر دور داخل ہے۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کے غش کھا کے گرنے پر بعد میں موسیٰ علیہ السلام کا یہ معروضہ کہ ”پاک ہے تیری ذات“ یہ بتلاتا ہے کہ اس واقعہ سے یہ بات نمایاں ہو گئی کہ رویت شان الہی کے خلاف ہے اور اس کے واسطے نقص ہے۔ اسی لئے تسبیح یعنی عیوب و نقائص سے اس کے بری ہونے کی گواہی سے آغاز کلام کیا۔ تیسرے یہ اقرار کہ ”أَنَا أَوَّلَ الْمُؤْمِنِينَ“ میں اول درجہ کا مومن ہوں، اسے ثابت کرتا ہے کہ خالق کے دیدار کو ناممکن سمجھنا جزا ایمان ہے [۳] اور جناب موسیٰ علیہ السلام اس کا یقین رکھتے تھے۔

رہ گیا موسیٰ علیہ السلام کا معروضہ پیش کرنا کہ ”ارنی“ اپنا جلوہ مجھے دکھلا، وہ جیسا کہ دوسری آیتوں سے قرآن مجید کی پتہ چلتا ہے، کچھ جاہل افراد پر اس حقیقت کے ظاہر کرنے کے لئے تھا، نہ کہ اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے۔ [۴]

اس سب کے بعد شاہ عبدالقادر صاحب نے نہ جانیں، کیوں کہ اس آیت ہی سے یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ: ”معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کو دیکھنا ہو سکتا ہے کیونکہ نمودار ہوا تھا پہاڑ کی طرف لیکن دنیا کے وجود کو برداشت نہ ہوئی، پہاڑ ٹوٹ گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش گرے تو آخرت کے وجود کو برداشت ہوگی، وہاں دیکھنا تحقیق ہے“ (موضح القرآن)

حالانکہ اگر یہ طور پر جو ہوا، جلوہ ذات تھا تو ”لَنْ تَرَانِي“ کا دعویٰ تو اسی وقت غلط ہو جاتا ہے کیونکہ رویت کی نفی تھی۔ اس کا کوئی ذکر نہیں تھا کہ تم اس کے بعد ہوش میں رہو گے یا نہیں۔ پھر خدا نے ثبوت رویت کو مطلق طور پر اس دنیا کے وجود کے برداشت کرنے سے وابستہ قرار دیا تھا جب وہ نہیں ہوا تو رویت کی ابدی نفی ہو گئی۔ [۵]

آخرت کے وجود کا برداشت کرنا یا نہ کرنا تو یہاں خارج از بحث ہی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو خالق یہ فرماتا کہ اس دنیا میں تم مجھے نہیں دیکھ

[۱] اَلِ الْمَكَانِ الَّذِي وَقْتَنَا لَهُ (مجمع البيان)

[۲] ہرگز نہ دیکھ سکے گا تو مجھے (شاہ فنج الدین)

[۳] عَنْ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ قَالَ مَعْنَاكَ أَنَا أَوَّلُ مَنْ آمَنَ وَصَدَّقَ بِأَنَّكَ لَا تَرَانِي (مجمع البيان)

[۴] مَا قَالَهُ الْجَهْوَرُ وَهُوَ الْأَقْوَى أَنَّهُ لِحَدِّسْ أَلِ الرَّوِيَّةِ لِنَفْسِهِ وَأَمَّا سَأَلَهَا الْقَوْمَ (مجمع)

[۵] لِأَنَّهُ لَا يَبْلُغُ الْمَحَالَّ إِلَّا بِالْمَحَالِّ (تبیان)

سکتے۔ آخرت میں اس تمنا کو پورا کر لینا تو موسیٰ علیہ السلام کے دل کو پوری پوری تسلی بھی ہو جاتی اور غش کھانے کی نوبت نہ آتی۔
بعض مفسرین نے ایک دوسرا پہلو مکان رویت کا پیدا کیا ہے کہ خالق نے ارشاد کیا: «لَنْ تَرَانِي»، تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکو گے، یہ نہیں کہا کہ ”میں ہرگز نہیں دکھائی دوں گا“ اس سے پتہ چلتا ہے کہ نفس رویت ناممکن نہیں ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا احساس شخصی اس سے قاصر تھا کہ اسے دیکھ سکے۔^[۱]

مگر یہ بھی غلط ہے۔ یہ ”تم“ تو اس لئے ہے کہ انہوں نے سوال اپنے ہی لئے کیا تھا۔ اگر وہ کہتے کہ پروردگار میری خواہش ہے کہ تو کبھی کسی کو دکھائی دے جا تو اس کے جواب میں یہ کہنے کا محل تھا کہ میں ہرگز دکھائی نہ دوں گا۔
پھر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سواد اعظم اس رویت کا ”عامہ مؤمنین“ کے لئے آخرت میں قائل ہے تو کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام ان عام مؤمنین کے مقابلہ میں گئے گزرے تھے کہ انہیں تو ہمیشہ کے لئے کہہ دیا گیا تھا کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکو گے اور عام مسلمان ایسی تاب نظر رکھتے ہیں کہ وہ دیکھ سکیں گے۔ لا حول ولا قوۃ۔

حالانکہ یہ سواد اعظم امہ مسلمین کا کیا ذکر، ان نفوس کو جو خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے اجزائے نور میں داخل تھے، دوسرے عام انبیاء و مرسلین سے (چہ جائیکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایسے اولو العزم رسول) مساوی ماننے کے لئے تیار نہیں، چہ جائیکہ فضل مگر یہاں سخن پروری یا بخاری و مسلم کے مندرجات کی تصحیح کے لئے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بیچارے کو عام افراد ملت اسلامیہ سے بھی گھٹا دینے پر تلے نظر آتے ہیں نعوذ باللہ من ذلک۔

قَالَ بِمُوسَىٰ إِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسَالَتِي وَبِكَلَامِي ۖ فَخُذْ مَا آتَيْتُكَ

وَ كُنْ مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴿۱۳۳﴾

”ارشاد ہوا اے موسیٰ! بلاشبہ میں نے تم کو تمام لوگوں پر مقدم کیا ہے اپنے پیغاموں اور اپنے کلام کے ساتھ تو لو اسے جو میں نے تمہیں دیا ہے^[۲] اور شکر گزاروں میں سے ہو۔“

وَ كَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَوْعِظَةً وَ تَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۖ فَخُذْهَا

بِقُوَّةٍ وَ أَمْرٌ قَوْمَكَ يَأْخُذُوا بِأَحْسَنِهَا ۗ سَأُورِيكُمْ ذَارَ الْفَاسِقِينَ ﴿۱۳۴﴾

”اور لکھا ہم نے ان کے لئے تختیوں میں ہر قسم کے وعظ و نصیحت اور ہر بات کی تفصیل کو^[۳] تو لو اسے طاقت کے ساتھ اور اپنی قوم کو حکم دو کہ وہ ان میں کی بہترین باتوں کے پابند رہیں میں جلدی دکھاؤں گا تم لوگوں کو بد اعمال لوگوں کا گھر۔“

بظاہر اس آیت میں دوبارہ صنعت ہے جسے ”التفات“ کہتے ہیں، اس لئے کہ پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ بطور غیبت ہے کہ ”لکھا

[۱] للتعبير به دون ”لن آری“ یفید امکان روية تعالیٰ (جلالین)

[۲] ما آتیتک من الفضل (جلالین)

[۳] بدل من الجارو المجرور قبله (جلالین)

ہم نے ان کے لئے، پھر ان کی طرف خطاب آگیا کہ ”لو اسے طاقت کے ساتھ اور اپنی قوم کو حکم دو“ پھر اسی سلسلہ میں خطاب پوری قوم کی طرف ہو گیا کہ ”میں دکھلاؤں گا تم لوگوں کو بد اعمالوں کا گھر۔“

اس آخری فقرہ سے مقصود یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم دیکھو گے کہ بد اعمالوں کا گھر آخرت میں کونسا ہے یعنی دوزخ اور یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ بد اعمال لوگوں یعنی فرعون اور اس کی قوم کے برباد شدہ گھر تمہاری آنکھوں کے سامنے آئیں گے [۱]

جناب شیخ الطائفہ نے یہ دونوں قول درج کئے ہیں۔ [۲]

ہمارے نزدیک پہلے معنی کو ترجیح ہے۔ اس لئے کہ ”دار“ واحد لفظ ہے جس کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ تمام فاسقین کا ایک ہی گھر ہے۔ اگر دوسرے معنی مراد ہوتے تو گھر کے بجائے ”گھروں“ کے ہم معنی جمع کا لفظ لاتا جاتا۔

سَأَصْرِفُ عَنْ آيَتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ط وَإِنْ يَرَوْا كُلَّ
آيَةٍ لَا يُؤْمِنُوا بِهَا ه وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ه وَإِنْ يَرَوْا
سَبِيلَ الغَيْ يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ط ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا
غَافِلِينَ ﴿١٣٦﴾ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ ط هَلْ
يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٣٧﴾

”میں اپنی آیتوں سے محروم کر دوں گا انہیں جو دنیا میں ناحق گھمنڈ سے کام لیتے ہیں اور اگر وہ ہر معجزہ دیکھ لیں تو بھی اس پر ایمان نہیں لائیں گے اور اگر وہ دیکھیں ہدایت کے راستے کو تو اسے اپنا راستہ نہیں بنائیں گے اور اگر وہ گمراہی کی راہ دیکھیں تو اسے اپنا راستہ قرار دے لیں گے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور وہ ان کی طرف سے غفلت برتتے رہے اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو اور آخرت کی حاضری کو جھٹلایا، ان کے اعمال اکارت گئے، کیا انہیں سزا ملے گی سوا اس کے جو وہ اعمال کرتے تھے۔“

”محروم کرنے“ کا ایک مطلب یہ کہا گیا ہے کہ ایسی توفیق ان کے شامل حال نہ ہوگی کہ وہ ان آیتوں پر غور کریں۔ [۳]

مگر چونکہ اس کے بعد صاف ”معجزہ“ کا ذکر معلوم ہوتا ہے، اس لئے پہلے جملہ میں بھی آیت کے معنی معجزہ کے ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں ”سَأَصْرِفُ عَنْ آيَتِيَ“ کے معنی یہ ہوں گے کہ میں مزید اپنے معجزے ان کے سامنے نہیں لاؤں گا، اس لئے کہ یہ گھمنڈی ہیں اور ان کے لئے جو معجزہ بھی پیش ہو، وہ بے کار ہے جیسا کہ خود اس آیت میں ہے کہ ”اگر وہ ہر معجزہ دیکھ لیں تو بھی اس پر ایمان نہیں لائیں گے [۴] اور دوسرے

[۱] یعنی منازل فرعونیان خراب شدہ خواہید دید (فتح الرحمن)

[۲] قال الحسن ومجاهد والجبائی یعنی بہ جہنم... وقال قتادة هي منازل لهم اي لتعتبروا بها وما صاروا اليه من التكال فيها (تبيان)

[۳] بان اخذ لهم فلا تتفكرون فيها (جلالين)

[۴] هذا اخبار من الله تعالى عن هؤلاء بعلمه فيهم... وبيان انه انما صر فهم عن آياته لذلك (مجمع البيان)

مقامات پر ہے کہ چونکہ اس کے قبل معجزات سامنے آئے اور انہوں نے ایمان اختیار نہ کیا تو اب مزید معجزات کا پیش کرنا ان کے سامنے لا حاصل ہے۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَىٰ مِنْ بَعْدِهِ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهُ خُوَارٌ ۗ أَلَمْ يَرَوْا أَنَّهُ
لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيهِمْ سَبِيلًا ۚ اتَّخَذُوهُ وَكَانُوا ظَالِمِينَ ﴿١٣٨﴾ وَلَمَّا سَقَطَ فِي
أَيْدِيهِمْ وَرَأَوْا أَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوا ۗ قَالُوا لَئِن لَّمْ يَرَحْمَنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا
لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿١٣٩﴾

’اور موسیٰؑ کی قوم نے ان کے بعد اپنے زیوروں سے ایک بچھڑے کی مورتی بنا لی جس میں سے آواز پیدا ہوتی تھی، کیا انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ وہ ان سے بات نہیں کرتا اور نہ انہیں کوئی رہنمائی کر سکتا ہے۔ انہوں نے اسے بنایا اور وہ ظالم لوگ تھے اور جب وہ پشیمان ہوئے اور محسوس کیا کہ وہ گمراہ ہو گئے تھے تو کہنے لگے کہ اگر ہمارا پروردگار ہم پر رحم نہ کرے گا اور ہمیں نہ بخشے گا تو یقیناً ہم گھانا اٹھانے والوں میں ہوں گے۔‘

گوسالہ پرستی

’ان کے بعد‘ یعنی کوہ طور پر مناجات کے لئے ان کے جانے کے بعد۔^[۱]

وَلَمَّا رَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ أَسِفًا ۗ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُونِي مِنْ
بَعْدِي ۗ أَعَجَلْتُمْ أَمْرَ رَبِّكُمْ ۗ وَالْقَىٰ الْأَلْوَاخَ ۗ وَآخَذَ بِرَأْسِ أَخِيهِ يَجُرُّهُ إِلَيْهِ ۗ
قَالَ ابْنُ أُمِّ إِبْرَاهِيمَ إِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضَعَفُونِي ۖ وَأَكَادُوا يَاقْتُلُونَنِي ۗ فَلَا تُشْمِتْ بِي
الْأَعْدَاءَ وَلَا تَجْعَلْنِي مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿١٤٥﴾

’اور جب واپس ہوئے موسیٰؑ اپنی قوم کی طرف غصہ اور رنج کے عالم میں تو کہا کتنا برا رویہ اختیار کیا تم نے میرے بعد^[۲] کیا تم نے اپنے پروردگار کے حکم کے مقابلہ میں جلدی سے کام کیا^[۳] اور تختیاں انہوں نے ہاتھ سے پھینک دیں اور اپنے بھائی کا سر ہاتھ میں لے کر اپنی طرف انہیں کھینچنے لگے، انہوں نے کہا اے میرے ماں جائے!^[۴]

[۱]. من بعد مفارقة موسى لهم ومضيه الى ميقاته (تبيين)

[۲]. اي بئسما عملتم خلفي (تبيين)

[۳]. آيا شتائي كرديد از حكم پروردگار خویش (شاه ولی الله)

[۴]. اراداعي و ذکرها اعطى لقلبه (جلالین)

یقین مانو کہ ان لوگوں نے مجھے بے بس کر دیا تھا اور قریب تھا کہ مجھے قتل کر ڈالیں اب تم تو میرے ساتھ دشمنوں کو طعن و تشنیع کا موقعہ نہ دو اور مجھے ظالم گروہ میں قرار نہ دو۔“

”جلدی سے کام لیا“ یعنی میرے آنے میں جو دیر ہوئی تو تم اللہ کی مقرر کردہ مدت ختم ہونے کا انتظارہ کر سکتے۔^[1]

شاہ عبدالقادر صاحب برادر صاحب تحفہ نے اس آیت کے مضمون سے کچھ نشیب محسوس کیا، اس لئے اس کی تشریح میں لکھا ہے:

”حضرت ہارون اور ان کی اولاد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امامت میں امام تھی لیکن جب ان کی جگہ خلیفہ ہوئی تو امت حکم میں نہ رہی۔ خلافت اور قسمت میں تھی۔ خلیفہ وہ کہ امت کو دین اور دنیا کے بند و بست میں رکھے جس طرح پیغمبر سنوار گیا تھا، نصرت حق ان کے ساتھ رہے اور امام وہ کہ پیغمبر کا یادگار ہو، جو خدمت و ایثار پیغمبر سے منظور ہو، سو امت ان سے کرے تا برکت اور قبولیت پائیں“ (موضح القرآن)

قطع نظر اس سے کہ یہ دین اور دنیا کا تفرقہ خدا اور قیصر والے حقوق کی تقسیم ہے جس کی دین حق میں گنجائش نہیں، اس سلسلہ میں یہ سوال تو غور طلب بہر حال ہے کہ امت جب امام کے حکم میں نہ رہی تو حق امت کے ساتھ تھا یا امام کے ساتھ؟ اگر حق امت کے ساتھ ہوتا تو ان کی سرتابی و مخالفت کی انہیں سزا کیوں ملتی جس کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے اور اگر یہ مان لیا جائے اور ماننا بہر حال ناگزیر ہے کہ حق امام کے ساتھ ہے تو اس سے ظاہر ہے کہ امام کے خلاف اجماع و شوریٰ وغیرہ جو بھی ہو، وہ باطل ہی ہوگا اور اس اجماع وغیرہ کے نتیجہ میں جو اقتدار قائم ہو، وہ برحق ہرگز نہیں ہو سکتا۔ رہ گیا یہ کہ خلیفہ وہی ہے جو امت کو صحیح راستے پر قائم رکھے تو ظاہر ہے کہ یہ قائم رکھنا جبر یہ تو نہیں ہو سکتا جب کہ جبر کی طاقت خود رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا نہیں کی گئی تو خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کیوں کر ہو سکتی ہے۔

خود رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کام بس تبلیغ کرنا ہے، اس سے زیادہ نہیں تو خلیفہ رسول کا کام اس سے زیادہ کیوں کر سمجھا جا سکتا ہے؟ بلکہ خالق نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب کر کے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر یہ اعلان کیا ہے کہ خود ہم لوگوں کو راہ راست پر لانے میں اپنی قوت قاہرہ سے کام نہیں لیتے ورنہ دنیا میں کفار کا وجود نہ ہوتا تو جب کافروں کا وجود خدا کی خدائی میں قاصر نہیں اور منافقین کا رہنا پیغمبر کی رسالت کی ناکامی کا ثبوت نہیں تو منافقین کا وجود یا ان کا برسر اقتدار آجانا خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تقاضائے منصب کے خلاف کیوں کر ہو سکتا ہے؟ خلیفہ رسول کا کام خود رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کام سے زیادہ کیوں کر سمجھا جائے؟ اور اس بنا پر یہ تصور بالکل غلط ہے کہ حضرت ہارون کی خلافت ناکام تھی اور انہوں نے اس کام کو حسن و خوبی انجام نہیں دیا تھا۔

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلَا جُنِّي وَأَدْخِلْنَا فِي رَحْمَتِكَ ۖ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ﴿١٥١﴾ إِنَّ

الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۗ

وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ ﴿١٥٢﴾ وَالَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِهَا

وَأَمَّنُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٥٣﴾

”انہوں نے کہا پرودگار! مجھے بخش دے اور میرے بھائی کو اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما اور تو تمام رحم کرنے

[1]. امر ربکم ای میعاد ربکم فلم تصبروا له (مجمع البیان)

والوں میں سب سے زیادہ رحیم ہے۔ یقیناً جنہوں نے کچھڑا بنایا، انہیں پہنچے گا غضب ان کے پروردگار کی طرف سے اور ذلت اس دنیاوی زندگی میں اور ایسی ہی ہم سزا دیا کرتے ہیں غلط باتیں بتانے والوں کو اور جو غلطیاں کریں، پھر اس کے بعد توبہ کر لیں اور ایمان لائیں تو یقیناً تمہارا پروردگار اس کے بعد بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔“

جناب موسیٰ علیہ السلام کا جناب ہارون علیہ السلام پر بظاہر عتاب

حضرت ہارون علیہ السلام نے جو اپنی صفائی پیش کی، اس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام فوراً مطمئن ہو گئے اور انہیں ساتھ شامل کر کے بارگاہ الہی میں فصل و کرم اور رحمت کی دعائیں مانگنے لگے۔ جس میں اپنا شامل کرنا جیسے اس احساس کا ترجمان ہے کہ میں نے دوسروں کی بد اعمالی کا غصہ جو بر بنائے یگانگی ان پر اتارا جس میں دوسروں کی تنبیہ کی مصلحت مضرتھی، یہ حقیقتاً اس کے مستحق نہ تھے۔^[۱]

اس سے بھی ظاہر ہے کہ قوم اگر امام کے ساتھ ظلم و تعدی سے کام لے تو وہ قوم ہی مجرم ہوتی ہے۔ امام پر اس سے کوئی الزام عائد نہیں ہوتا، چنانچہ اس کے بعد جو واقعی مجرم تھے یعنی گوسالہ پرستی کرنے والے انہیں ان کے جرم کی جو پاداش دنیا و آخرت میں ملنے والی ہے۔ اس کا تذکرہ ہے اور اسے شاہ عبدالقادر صاحب اور ان کے ہم خیالوں کو آنکھیں کھول کر دیکھنے کی ضرورت ہے کہ امام کی مخالفت کا کیا انجام ہوا کرتا ہے جس میں آخرت کی سزا ہی نہیں ہوتی بلکہ دنیاوی ذلت اور رسوائی بھی ہوتی ہے اور اس کے بعد کون سمجھ سکتا ہے کہ گزشتہ صدیوں میں مسلمانوں کی جو رسوائیاں اور ذلتیں ہر شخص کی آنکھوں کے سامنے ہیں اور آج بھی جس عنایت کا مشاہدہ ہو رہا ہے، اس پر ”مفکر اسلام“ ڈاکٹر اقبال کتنا ہی ”شکوہ“ کریں مگر حقیقت کے لحاظ سے وہ اللہ کی طرف کے مقرر کردہ امام اور اس کے قائم کردہ نظام ہی کی مخالفت کا نتیجہ تو نہیں ہیں؟ جس کی خبر پہلے ہی قرآن نے دے دی تھی کہ: **وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ**۔ یعنی سنت الہیہ یہی ہے کہ یہی سزا ہوا کرتی ہے افتراء یعنی اللہ کی بات کے مقابلہ میں اپنی طرف سے دل بخواہ باتیں کرنے والوں کی^[۲] یہ افتراء تو ہی نہیں ہوا کرتا جو اس سے ظاہر ہے کہ ان لوگوں نے جنہیں یہاں سزا دی گئی ہے، لفظ کوئی غلط بات اللہ کی طرف منسوب نہیں کی ہے بلکہ یہ عملی افتراء تھا کہ بغیر حکم الہی کے اپنے دل سے انہوں نے اپنا ایک معبود بنا لیا تھا جس کا تجویز کرنے والا سامری تھا، اسے بھی سزائے سخت ملی اور اس قوم کو بھی جس نے اس معبود کی پرستش کی تو یقیناً اللہ کے مقرر کردہ نظام کے بجائے دوسرے نظام کو ”دینی نظام“ کہہ کر رائج کرنا بھی بہت بڑا عملی افتراء ہے اور اس کے مقرر کردہ پیشوا کے مقابلہ میں ”سامری صفت“ اشخاص جس صاحب اقتدار کو ”گوسالہ“ بنا کر نصب کر دیں، ان کی بھی سزا اصولی طور پر وہی ہونا چاہیے جو مفتزین کی ہو کرتی ہے۔

وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُوسَى الْغَضَبُ أَخَذَ الْأُلُوْحَ ۗ وَفِي نُسْخَتِهَا هُدًى وَرَحْمَةٌ

لِلَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُونَ ﴿۱۵۶﴾

[۱] رب اغفر لی ما صنعت باخی ولاخی اشر کہ فی الدعاء ارضاء له وفعاللسماتہ (جلالین)

[۲] کذالك كما جزينا هم نجزي المفتريين على الله بالاشراك وغيره (جلالین)

”اور جب موسیٰؑ کا غصہ فرو ہوا تو انہوں نے تختیاں اٹھالیں ﴿۱﴾ اور ان کے لکھے ہوئے میں ﴿۲﴾ ہدایت اور رحمت تھی ان کے لئے جو اپنے پروردگار سے ڈرتے ہوں۔“

غصہ ساکن ہونے کو سکوت سے تعبیر کرنے میں ادبی حیثیت سے اس کا اظہار مضمحل ہے کہ غصہ کے عالم میں وہ جو اپنے بھائی کو خفا ہو رہے تھے، وہ حقیقت میں ان کی آواز نہ تھی، ان کا غصہ تھا جو بول رہا تھا۔ اب جو وہ غصہ کے کم ہونے سے خاموش ہوئے تو یوں سمجھنا چاہیے کہ غصہ خاموش ہو گیا۔ ﴿۳﴾ لیکن چونکہ غصہ قوم کی معصیت پر تھا جس کے اظہار کا ایک طریقہ یہ بھائی کے ساتھ مخاطب تھا، اس لئے اس غصہ کو بھی شان رسالت کے خلاف نہیں سمجھا جاسکتا۔

وَاخْتَارَ مُوسَىٰ قَوْمَهُ سَبْعِينَ رَجُلًا لِّمِيقَاتِنَا ۗ فَلَمَّا أَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ أَهْلَكْتَهُم مِّن قَبْلُ وَإِيَّاي ۖ أَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاءُ مِنَّا ۗ إِنَّ هِيَ إِلَّا فِتْنَتُكَ ۖ تُضِلُّ بِهَا مَن تَشَاءُ وَتَهْدِي مَن تَشَاءُ ۖ أَنْتَ وَلِيِّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الْغَافِرِينَ ﴿۵﴾ وَكُتِبَ لَنَا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَفِي الْآخِرَةِ إِنَّا هُدُنَا إِلَيْكَ ۖ قَالَ عَذَابِي أُصِيبُ بِهِ مَن يَشَاءُ ۗ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۖ فَسَاكُنْ بِهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ ۖ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ ﴿۶﴾

”اور موسیٰؑ نے اپنی قوم کے ستر آدمیوں کو ﴿۱﴾ ہمارے وعدہ کی جگہ کے لئے منتخب کیا۔ جب انہیں زلزلہ نے اپنی گرفت میں لیا ﴿۲﴾ تو انہوں نے کہا کہ پروردگار اگر تو چاہتا تو ان سب کو ہلاک کر دیتا پہلے ہی اور مجھے بھی۔ کیا تو ہمیں ہلاک کرتا ہے اس کے سبب سے جو ہم میں سے احمق لوگوں نے کیا؟ یہ نہیں ہے مگر تیری طرف کی آزمائش ﴿۳﴾ جس سے جنہیں چاہتا ہے، ان کی گمراہی کا سامان کرتا ہے اور جنہیں چاہتا ہے تو ہدایت کرتا ہے۔ تو ہمارا مالک ہے تو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما اور تو تمام..... بخشنے والوں میں سب سے بہتر ہے اور لکھ ہمارے نصیب میں اس

﴿۱﴾. اخذ الالواح التي القاها (جلالین)

﴿۲﴾. حر مکتوب وے (شاہ ولی اللہ)

﴿۳﴾. السکوت فی هذا الموضوع احسن من السکوت لتضمنه معنی سکوتہ عن المعاتبۃ لایخیه مع اسکون غضبه (تیبیان)

﴿۴﴾. اختیار کرد موسیٰ از قوم خود ہفتاد کس (شاہ ولی اللہ)

﴿۵﴾. پڑا ان کو زلزلہ نے (شاہ رفیع الدین)

﴿۶﴾. نیست این حادثہ مگر امتحان تو (شاہ ولی اللہ)

دنیا میں بھی بھلائی اور آخرت میں بھی، ہم نے تجھ سے لو لگائی ہے [۱] ارشاد ہوا کہ میرا عذاب، اسے میں پہنچاتا ہوں جس تک چاہتا ہوں اور میری رحمت ہر شے کو گھیرے ہوئے ہے۔ میں اسے لکھوں گا ان کے نصیب میں جو پرہیزگاری سے کام لیں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے۔“

یہ ستر آدمیوں کا انتخاب کس لئے تھا؟ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

”تاعذر گویند از عبادت گو سالہ، این جماعت اگرچہ عبادت نکردہ بودند، بر عبادت کنندگان انکار ہم نکردند پس خدائے تعالیٰ ہلاک ساخت۔“ (فتح الرحمن)

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ گزشتہ واقعہ ہی کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور اب منتخب کرنے کی نوعیت یہ قرار پاتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس جماعت میں سے ان افراد کو الگ کر لیا جن کے متعلق انہیں علم تھا کہ وہ گوسالہ پرستی سے الگ رہے تھے اور انہیں اس لئے اپنے ساتھ لے گئے تھے کہ وہ اس جرم عظیم پر قوم کیلئے بارگاہ الہی میں توبہ و انابت کریں مگر چونکہ علم الہی میں یہ لوگ بھی ایک حد تک مجرم تھے جیسا کہ حدیث میں ہے:

الراضی بفعل قوم کالداخل فیہ معہم

جو کسی جماعت کے عمل سے راضی رہے، وہ مثل اس کے ہے کہ جو ان کے ساتھ اس عمل میں شریک رہے۔ اور اسی لئے زیارت حضرت امام حسین علیہ السلام میں یہ الفاظ ہیں کہ:

لعن الله امة سمعت بذلك فرضيت به

اس گروہ پر اللہ کی لعنت جس نے اس ظلم عظیم کو سنا اور وہ اس پر راضی رہا۔

اس لئے خالق نے اس جماعت کو بھی ہلاک کر دیا۔ چونکہ موسیٰ علیہ السلام نے ان لوگوں کو یہ دیکھ کر منتخب کیا تھا کہ یہ گوسالہ پرستی میں شریک نہیں ہیں، اس لئے ان کے ہلاک ہونے کو انہوں نے اپنے توقعات کے خلاف محسوس کیا اور اب ان الفاظ کے معنی سمجھ میں آتے ہیں کہ انہوں نے کہا:

أَهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الشُّفَهَاءُ مِنَّا

کیا تو ہمیں ہلاک کرتا ہے اس کے سبب سے جو ہم میں سے احمق لوگوں نے کیا ہے۔

احمق لوگوں سے مراد وہ ہوں گے جنہوں نے گوسالہ پرستی کے جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ دوسرے مفسرین کے بیان سے بھی شاہ صاحب کی تائید ہوتی ہے۔ [۲]

مگر ان کے صاحبزادہ نے اس آیت کا محل نزول دوسرا بتایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے ساتھ لے گئے ستر آدمی سردار قوم کے جب حق تعالیٰ نے کلام کیا سن کر کہنے لگے ہم جب تک نہ دیکھیں ہمیں

[۱]۔ ہدنا تبتان (جلالین)

[۲]۔ سبعین رجلا ممن لحد یعیبوا والعجل بأمره تعالیٰ... ليعتذروا من عبادة اصحابهم العجل فلما اخذتهم الرجفة الزلزلة الشديدة قال ابن عباس رضي الله عنه لا نهم لحدیر ایلوا قومهم حين عبدوا العجل قال وهم غير الذين سألوا الرؤية واخذتهم الساعة. (جلالین)

یقین نہیں، اس سے ان پر بجلی گری اور کانپ کر مرنے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس طرح دعا کی آپ کو شامل کر کے، تب بخشے گئے، پھر زندہ ہوئے، یہ شاید کچھڑا پونے سے پہلے تھا یا شاید پیچھے تھا۔“ (موضح القرآن)

اس صورت میں یہ واقعہ ہے جس کا حوالہ دوسری جگہ قرآن میں اس طرح ہے کہ:-

فَقَدْ سَأَلُوا مُوسَىٰ أَكْبَرَ مِنْ ذَلِكَ فَقَالُوا أَرِنَا اللَّهَ جَهْرَةً.

انہوں نے موسیٰ سے تو اس سے بڑا سوال کیا تھا کہ ہمیں اللہ کو کھلم کھلا دکھا دیجئے۔ (نساء: ۱۵۳)

ہمارے مفسرین نے دونوں قول نقل کئے ہیں [۱] اور بعض نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے [۲] مگر جناب موسیٰ علیہ السلام کے الفاظ بعد والے، اس صورت میں زیادہ چسپاں نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ اس صورت میں جو لوگ ہلاک ہوئے، وہ خود مجرم تھے۔ پھر یہ کہنا کیسا کہ: ’جو ہم میں کے احق لوگوں نے کیا، اس کی وجہ سے کیا تو ہمیں ہلاک کر دے گا؟‘

آخر میں جو خالق کا ارشاد ہے کہ ’میں اپنی رحمت ان کے نصیب میں لکھوں گا جو پرہیزگار ہوں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے‘ اس سے مراد امت محمدیہ کو لیا گیا ہے، غالباً اس بنا پر کہ اس کے بعد بلا فاصلہ یہ آیت ہے کہ

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْنُوتًا عِنْدَهُمْ فِي السَّنَةِ وَالْأَنْجِيلِ. (اعراف: ۱۵۴)

جس کی تفسیر ابھی آئے گی۔ اس میں بلاشبہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ماننے والوں کا ذکر ہے لہذا یہ فقرات انہی سے متعلق ہونا چاہیے اور اب اس کا تعلق پہلے کے واقعہ سے کیا ہے؟ اس سے شاہ عبدالقادر صاحب یوں لکھتے ہیں کہ:

”حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کے حق میں دنیا اور آخرت کی نیکی جو مانگی، مراد یہ تھی کہ سب امتوں پر مقدم رہیں دنیا اور آخرت میں۔ فرمایا کہ میرا عذاب اور رحمت کسی فرقہ پر مخصوص نہیں۔ سو عذاب تو اس پر ہے جس کو اللہ چاہے اور رحمت کا ملہ لکھی ہے ان کے نصیب میں جو اللہ کی ساری باتیں یقین کریں گے یعنی آخری امت کہ سب کتابوں پر ایمان لاویں گے سو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت میں سے جو کوئی آخری کتاب پر یقین لائے، وہ پانچے اس نعمت کو اور حضرت موسیٰ کی دعا اس کو لگے۔“ (موضح القرآن)

یہ الفاظ قرآنی کے رو سے بھی بعید نہیں ہے۔ اس لئے کہ سورہ بقرہ کے آغاز میں قرآنی ہدایت سے جو فائدہ اٹھاتے ہیں، ان کے لئے یہی اوصاف وارد ہوئے ہیں کہ:

لِّلْمُتَّقِينَ ۝ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ۝ (بقرہ)

ان پرہیزگاروں کے لئے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز کی پابندی قائم رکھتے ہیں اور جو ہم نے انہیں رزق عطا کیا ہے، اس میں سے خیرات کرتے ہیں۔ ان اوصاف کا مضمون اس کے بالکل مطابق ہے جو یہاں ذکر ہوا ہے کہ:-

لِّلَّذِينَ يُتَّقُونَ ۝ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ ۝ (اعراف)

اس کے معنی یہ ہیں کہ اصطلاح قرآنی میں اس امت کے ایمان و عمل صالح رکھنے والے افراد کا سرنامہ تعریف یہی اوصاف ہیں کہ

[۱]. قولان احدہما لا ینہم سألوا الرؤیة فی قول ابن اسحاق الثانی قال ابن عباس لا ینہم لاینہوا عن عبادة العجل (تبیان)

[۲]. هو الصحيح ورواه اعلی بن ابزہیم فی تفسیرہ (مجمع البیان)

جو وہاں بیان ہوئے ہیں۔ انہی کو کہیں پھیلا کر بہت سے اوصاف پر تقسیم کر دیا گیا ہے جیسے سورہ مومنوں میں:

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ﴿١﴾ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ﴿٢﴾ سے لے کر بہت دور تک جو ایک اوصاف کا کس سلسلہ مذکور ہے، یہی اوصاف سمٹ جائیں تو امتقین کے ایک لفظ سے ادا ہوں اور یہی پھیل جائیں تو بہت سے جملوں کی شکل اختیار کریں۔

آخر میں جو دو فقرے ہیں:

(۱) ”میری رحمت ہر شے کو گھیرے ہوئے ہے۔“

(۲) ”میں اسے لکھوں گا ان کے نصیب میں جو پرہیزگاری سے کام لیں گے۔“

یہ اس بنا پر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا میں دنیا کا بھی ذکر تھا اور آخرت کا بھی تو اس کا جواب بطور لطف و نثر اس طرح ہے کہ دنیا والی رحمت تو ہر شے کو گھیرے ہوئے ہے۔ یہ وہی رحمت ہے جو رحمن کے لفظ میں مضمر ہے اور آخرت والی رحمت، اس کا خاص معیار ہے اور وہ ایمان و تقویٰ جو ان جوہروں کے حامل ہوں گے وہ ان کے نصیب میں ہوگی۔^[۱]

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي
التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ يَا أُولَئِكَ هُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ
الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي
كَانَتْ عَلَيْهِمْ ط فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي
أُنزِلَ مَعَهُ ۗ أُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٥٥﴾

”جو پیروی کریں اس پیغمبر کی جو وہی نبی امی ہے جسے وہ اپنے پاس لکھا ہوا پاتے ہیں تو ریت اور انجیل میں، جو انہیں ہدایت کرتا ہے نیک کام کی اور انہیں روکتا ہے برے کرتوت سے اور ان کے لئے صاف ستھری چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے اور ان پر گندی چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان پر سے ان کے بوجھ کو اتارتا ہے اور ان زنجیروں کو جو ان پر تھیں تو جو اس پر ایمان لائیں اور اس کی عظمت کو مد نظر رکھیں اور اس کی مدد کریں اور اس روشنی کی پیروی کریں جو اس کے ہاتھ اتاری گئی ہے، یہی لوگ ہر طرح کی بہتری حاصل کرنے والے ہیں۔“

”النبی“ اس کے اوصاف اور توریت و انجیل میں اس کا تذکرہ

چونکہ اس آیت کو عام طور پر گزشتہ آیات سے مربوط سمجھا گیا ہے، اس لئے یہ تمام اوصاف اسی سلسلہ کے ہوں گے کہ میں اپنی رحمت لکھوں گا ان کے نصیب میں جو پرہیزگار ہوں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے اور اس صورت میں یہاں بھی تمام

[۱]. رحمتی وسعت کل شئی فی الدنیا فساکتہا فی الآخر قللذین یتقون الخ (جلالین)

افعال مستقبل سے تعلق رکھتے ہوں گے یعنی جو پیروی کرتے ہوں گے اس پیغمبر کی۔^[۱]
مگر وہ آیت خالق کے اس خطاب کی حیثیت رکھتی تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تھا۔ اس خطاب کے ذیل میں انجیل کے تذکرہ کو ذہن قبول نہیں کرتا اور جب کہ ترتیب قرآن مسلم مطابق تنزیل نہیں ہے تو ضرورت ہی کیا ہے کہ اسے گزشتہ آیات سے مرتبہ کیا جائے بلکہ اس آیت کے مضمون پر الگ سے نظر کرنا چاہیے اور ”الذین آمنوا“ کس موصوف کی صفت ہے؟ اس کے صحیح مقام کو نظم قرآنی میں لا معلوم سمجھنا چاہیے۔
”بوجہ کو اتارتا ہے اور ان زنجیروں کو جو ان پر تھیں“ اس سے مقصود وہ سخت احکام ہیں جو گزشتہ انبیاء کی امتوں کے لئے تھے۔^[۲]
ان مؤمنین کے اوصاف میں ”امنوا بہ“ کے ساتھ ”وعزروہ“ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ آپ کی عظمت کو مد نظر رکھتے اور آپ کی تعظیم و تکریم کرتے۔^[۳]

ان کے لئے سرمہ چشم ہے جو تعظیم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو داخل شرک قرار دیتے ہیں۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ
وَالْأَرْضِ ۗ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۗ فَأَمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ
الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۵۸﴾

”کہیے کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف بھیجا ہوا اس اللہ کا پیغمبر ہوں جس سے مخصوص ہے آسمانوں اور زمین کی سلطنت، کوئی خدا نہیں سوا اس کے جو جلاتا اور مارتا ہے تو ایمان لاؤ اللہ اور اس کے نبی امی پیغمبر پر جو اللہ اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی پیروی کرو، شاید کہ تم صحیح راستے پر آ جاؤ۔“

رسالت محمدی کی ہمہ گیری

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ہمہ گیر اعلان رسالت ہے جس میں کسی قوم و قبیلہ، کسی ملک بلکہ کسی دور کی بھی تخصیص نہیں ہے جس میں خطاب کی عمومیت ہی ہمہ گیری کے لئے کافی تھی اور پھر ”جمیعاً“ کے لفظ نے اس میں اور قوت پیدا کر دی۔^[۴]
اس کے برخلاف کسی ایک جگہ بھی قرآن میں یا ایہا العرب کہہ کے آواز نہیں دی گئی ہے۔ اس لئے اس دور کے بعض سیکولر قسم کے افراد کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو ان الفاظ میں ماننا کہ وہ عرب قوم کی ہدایت کے لئے آئے تھے اور انہوں نے قوم عرب کو بہت اچھی تعلیم دی اور وہ بڑے درجہ کے رسول تھے وغیرہ وغیرہ، یہ رسالت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں ہے بلکہ حقیقتاً اس پیغام کے ساتھ جو آپ نے پیش کیا تھا کفر ہی ہے۔ دینی اصطلاح میں جیسا کہ کلمات معصومین سے معلوم ہوا ہے، رسالت کا منصب نبوت سے بالا ہے پھر ان دونوں آیتوں میں ”رسول“ کہہ کر

[۱]. خواہدنوشت رحمت اخرویہ برای آنانکہ پیروی می کنند (شاه ولی اللہ)

[۲]. امر ہم یعنی الثقل بامور محرمة فی تکلیفها مشقة کتحریر العروق والغدد و تحریر السبب (تبیان)

[۳]. تعظیم کر دند اور را (شاه ولی اللہ) عزروہ و قزوہ (جلالین)

[۴]. امر سبحانہ تبتیان بخاطب جمیع الخلق من العرب والعجم (مجمع التبیان)

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وصف ”نبی“ کے ساتھ کیوں لایا گیا ہے؟ اس کا راز بائبل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے اور اس کا حوالہ گزشتہ آیت میں دیا بھی گیا ہے کہ: **يَجِدُونَ نَهْمًا مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ** وہ اسے پارہے ہیں لکھا ہوا توریت میں بھی اور انجیل میں بھی“..... ان دونوں کتابوں میں اب بھی وہ فقرے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیائے ماسلف نے اس پیغمبر کے آنے کی اطلاع ”وہ نبی“ کہہ کر دی تھی۔ گویا کہ اس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب انبیاء کی زبان میں ”النبی“ تھا۔ اسی لئے قرآن میں خالق کی طرف سے آپ کے ساتھ مخاطب اکثر ”یا ایہا النبی“ کے الفاظ میں کیا گیا ہے اور ان دونوں آیتوں میں رسول کہنے کے بعد آپ کو ”النبی“ کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔

وَمِنْ قَوْمِ مُوسَىٰ أُمَّةٍ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ ﴿١٥٩﴾

”اور موسیٰ کی قوم میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو حق کا رستہ دکھاتے ہیں اور اس کے ساتھ منصفانہ فیصلہ کرتے ہیں“^[۱]

جن کا یہ وصف ہوگا، وہ حق کی آواز پہنچنے پر اسے قبول کر رہی لیں گے لہذا وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اختیار کر لیں گے اور جو ان کی کتابوں میں آپ کی بشارتیں ہیں، وہ دوسرے لوگوں کو بھی سنا کر انہیں ایمان کی دعوت دیں گے۔ لیکن بعض روایات سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ امت مسلمہ یعنی مسلمان قوم سے الگ ایک طبقہ کا پتہ دیا جا رہا ہے جو کسی دور دراز مقام پر بسا ہوا ہے اور وہ صحیح معنی میں شریعت موسوی پر عامل ہوتے ہوئے خالق کی توصیف و ثناء کا مستحق ہوا ہے^[۲] اور چونکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اس تک پہنچی ہی نہیں لہذا اس کے لئے وہی شریعت موسوی پر قائم رہنا نجات کے لئے کافی قرار پایا ہے۔^[۳]

وَقَطَّعْنَهُمْ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ أَسْبَاطًا أُمَّمًا ۖ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ إِذِ اسْتَسْقَمَهُ
قَوْمَهُ أَنِ اصْرِبْ لِيَعْصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانْبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ
عَلِمَ كُلُّ أَنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۖ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ ۖ وَأَنزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّٰنَ وَ
السَّلْوٰى ۖ كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُونَا وَلٰكِنْ كَانُوا أَنفُسَهُمْ
يَظْلِمُونَ ﴿١٦٥﴾

”اور ہم نے انہیں بارہ نسلوں کے اعتبار سے^[۴] گروہوں میں تقسیم کیا اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی جب ان سے ان کی قوم نے پانی پلانے کی درخواست کی کہ تم اپنی لکڑی کو مارو پتھر پر تو اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ

[۱] ای بالحق یكون ویعدلون فی حکمهم (مجمع البیان)

[۲] قال ابو جعفر علیہ السلام ہم قوم خلف الرمل لحدیغیرو اولحدییدلوا (تبیان)

[۳] لا یمنع ان یكون قوم لحدیغهم الدعوة من النبی علیہ السلام فلان حکم بکفرهم (تبیان)

[۴] اسباط ای قبائل (جلالین)

پڑے۔ ہر گروہ نے اپنا پان گھاٹ جان لیا اور ہم نے ان پر ابر کا سایہ کیا اور ان پر من و سلویٰ اتارا کہ کھاؤ اچھی غذاؤں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں اور انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے تھے۔“

اسباط بنی اسرائیل کی تعداد

اللہ کے جتنے احکام ہوتے ہیں، وہ دوسروں کی بھلائی کے لئے ہوتے ہیں اور ان کی مخالفت سے اللہ کا کوئی نقصان نہیں ہوتا بلکہ خود ان کا نقصان ہوتا ہے، اس اعتبار سے اکثر جگہ کافروں اور بد اعمالوں کے لئے کہا گیا ہے کہ وہ ہم پر ظلم تھوڑی کرتے ہیں خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں یعنی بھگتتاں اس ظلم کا انہی کو بھگتنا پڑتا ہے اور نقصان انہی کا ہوتا ہے [۱] ورنہ جہاں تک ان کے کردار کا تعلق ہے، یہ بے شک اللہ پر ظلم کرتے ہیں کہ اس کے حقوق کو ادا نہیں کرتے جیسا کہ شرک کے لئے قرآن مجید میں ہے:

لَإِنَّ الشُّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ شُرْكَ يَقِينًا بَهِتٌ بَرُّ ظُلْمٍ هُوَ۔ (لقمان - ۱۳)

واقعات اس آیت میں جتنے بیان ہوئے ہیں ان کا ذکر قرآن میں آچکا ہے اور وہاں ان کی تشریح ہو چکی ہے۔

وَإِذْ قِيلَ لَهُمْ اسْكُنُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُولُوا حِطَّةٌ
وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَتِكُمْ ۗ سَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۳۱﴾ فَبَدَّلَ
الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ
السَّمَاءِ مِمَّا كَانُوا يَظْلِمُونَ ﴿۱۳۲﴾

”اور جب ان سے کہا گیا کہ اس بستی میں جا کر قیام کرو اور وہاں جس جگہ سے چاہو کھاؤ اور ”حِطَّةٌ“ کہو اور دروازہ میں داخل ہو سجدہ کرتے ہوئے تو ہم تمہاری غلطیوں کو معاف کر دیں گے جو نیک اعمال والے ہیں، ان کو زیادتی عطا کریں گے تو جو ان میں سے ظلم کے مرتکب ہوئے، انہوں نے اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی بدل کر دوسری بات کہہ دی تو ہم نے ان پر آسمان سے عذاب بھیجا، اس وجہ سے کہ وہ ظلم کرتے رہتے تھے۔“

اس واقعہ کا ذکر پہلے پارہ میں ہو چکا ہے۔

وَسَأَلُهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ
تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ لَا تَأْتِيهِمْ ۗ
كَذَلِكَ نَبْلُوهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿۱۳۳﴾

”اور ان سے اس بستی کا حال پوچھو جو دریا کے کنارے تھی جب کہ وہ ہفتے کے دن کے بارے میں حد سے قدم

[۱] .معناہما نقصونا شیئا ولكن نقصوا انفسہم (تبیان)

آگے بڑھاتے تھے، جب کہ ان کے پاس ان کی مچھلیاں کھلے بندوں آتی تھیں اس دن جب وہ ہفتہ کے احترام کے پابند ہوتے تھے^[۱] اور جب ہفتہ کا دن نہیں ہوتا تھا^[۲] تو وہ نہیں آتی تھیں۔ یوں ہم ان کی آزمائش کرتے تھے، اس بنا پر کہ وہ بد اعمالیاں کیا کرتے تھے۔“

اہل سبت کا ذرا تفصیلی تذکرہ

یہ سستی کون سی تھی؟ اس میں کئی قول ہیں جن میں سے کوئی بھی مستند نہیں ہے^[۳] لہذا اس کی تعیین وثوق کے ساتھ بالکل نہیں ہو سکتی۔

وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا

شَدِيدًا ط قَالُوا مَعذِرَةٌ أَلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿۱۳۳﴾

”اور جب ان میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ کیوں نصیحت کرتے ہو ایسے لوگوں کو جنہیں اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا انہیں بہت سخت عذاب میں مبتلا کرنے والا ہے تو انہوں نے کہا کہ صرف اپنے پروردگار کے پاس عذر پیش کرنے کے لئے اور یہ کہ شاید وہ پرہیزگاری اختیار کریں۔“

اسے گزشتہ آیت کے سلسلہ ہی میں لیا جائے تو یہ مطلب ہوتا ہے کہ ان اصحاب سبت کو نصیحت کرنے والے افراد سے کچھ لوگ کہتے ہیں

کہ انہیں نصیحت کرنے سے فائدہ کیا ہے؟^[۴]

مگر اس کے قبل کی آیات میں چونکہ اس نصیحت اور ان نصیحت کرنے والوں کا کوئی ذکر نہیں ہے اس لئے یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اسی سلسلہ کی آیت ہے۔ پھر بھی چونکہ اس کے بعد کی آیتیں زیادہ واضح طور پر انہی لوگوں کے بارے میں ہیں جو اصحاب السبت تھے لہذا اس آیت کا بھی اسی سلسلہ میں ہونا زیادہ سمجھ میں آتا ہے۔

بہر حال اس میں شک نہیں کہ مضمون اس کا کسی ایسے ہی موقع سے متعلق ہے جس میں کچھ مرتکب گناہ ہوں، کچھ انہیں نصیحت کرتے ہوں اور کچھ لوگ تماشائی کے طور پر خاموش ہوں اور یہ خاموش رہنے والے ہی وہ ہیں جو نصیحت کرنے والوں کو یہ کہہ کر منع کرتے ہیں^[۵] کہ آخر انہیں نصیحت کرنے سے فائدہ کیا؟ یہ لوگ تو کم بخت عذاب کے مستحق ہو ہی رہے ہیں۔ اس پر وہ لوگ جو نصیحت کر رہے ہیں یہ جواب دیتے ہیں۔

چونکہ وہ امت جو اپنی بد اعمالی سے عذاب کی حقدار ہوتی ہے جب اس پر عذاب آیا کیا ہے تو اس نے ان لوگوں کو بھی گھیر لیا ہے جو ان کے ساتھ اصل عمل میں شریک نہ تھے مگر خاموش رہے تھے جیسا کہ اس کے پہلے گوسالہ پرستی کے سلسلہ میں آچکا ہے، اس لئے ان نصیحت کرنے

[۱] روزی کہ ایشاں بتعظیم شنبہ مشغول ہی شدند (شاه ولی اللہ)

[۲] یومر لا یكون السبت (مجمع البیان)

[۳] ہی ایلة عن ابن عباس و قبیل ہی مدین عنہ ایضا و قبیل الطبریة عن الزهری (مجمع البیان)

[۴] فكانوا اثلث فرق: فرقة فانصة و فرقة ساكنة و فرقة واعظة (مجمع البیان) اهل دیہ سه قسم بودند قسمی شکار ہی کردند و

قسمی ازان نہی ہی کردند و قسمی نہ شکار کردند و نہ ازاں منع کردند (فتح الرحمن)

[۵] فقال الساكتون للواعظین و الناهین (مجمع)

والوں کا یہ کہنا کہ ”پروردگار کے پاس عذر پیش کرنے کے لئے“ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نصیحت کرنے کے بعد کم از کم پیش خدا ہم معذور قرار پائیں گے، اس لئے اس عذاب کا استحقاق نہ ہوگا جس کا سکوت کی صورت میں اندیشہ ہے۔ [۱]

پھر آخری فقرہ: ”لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ“ یہ بتلاتا ہے کہ ان کی طرف سے بالکل مایوسی کی بھی کوئی وجہ ہیں ہے کہ ان میں سے کسی پر کوئی اثر نصیحت کا نہ ہوگا۔ ممکن ہے کہ کوئی ان میں سے نصیحت کا اثر قبول ہی کر لے [۲] تو وہ اس نصیحت کا پورا ما حاصل ہوگا اور اس لئے یہ اس اصول کے خلاف بھی نہیں ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے وجوب کی شرط ہے کہ سننے والے کے اثر لینے کا کم از کم احتمال ہو، ورنہ یہ فریضہ عائد نہ ہوگا۔

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَئِيسٍ مِّمَّا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَا نُهُوا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ﴿۳۶﴾

”تو جب انہوں نے بھلا دیا اسے جو انہیں نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے انہیں نجات دے دی جو برائی سے روکتے رہتے تھے اور انہیں کہ جو ظالم تھے، ان کی بد اعمالی کے سبب سے سخت عذاب میں گرفتار کر دیا اور جب انہوں نے سرکشی کی ان چیزوں کے بارے میں جن سے وہ روکے جاتے تھے تو ہم نے انہیں کہا کہ ہو جاؤ ذلیل بندر“

اہل سبت کا عذاب الہی سے مسخ ہو جانا

پہلی آیت میں چونکہ نجات کو روکنے والوں سے مخصوص قرار دیا گیا ہے، اس لئے ظالموں کے تحت میں وہ بھی داخل سمجھے جاسکتے ہیں جو خاموش رہے اور اس طرح عذاب ان کے لئے بھی ثابت ہوگا مگر دوسری آیت میں جو کہا گیا کہ ”انہوں نے سرکشی سے کام لیا ان چیزوں میں کہ جن سے وہ روکے جاتے تھے“ اس سے مراد وہی ہو سکتے ہیں جو اصل مرتکب تھے کیوں کہ روکے وہی جاتے تھے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ عذاب الہی ان کے لئے نہیں تھا جو عملاً ان سے علیحدہ رہتے تھے، اگرچہ خاموش رہے ہوں۔

ہاں! یہ ہو سکتا ہے کہ پہلی آیت کی بنا پر ظالمین کے لفظ کو دونوں پر حاوی سمجھا جائے اور اس طرح وہ عذاب جو ظلم کے نتیجہ میں ہے دونوں کے لئے ہو لیکن یہ خاص عذاب یعنی بندروں کی شکل میں مسخ ہونا، انہی لوگوں کے لئے ہو جو اصل میں مرتکب گناہ تھے۔

بہر حال ان خاموش رہنے والوں کے لئے آیت کے الفاظ سے کوئی واضح نتیجہ نہیں نکلتا جسے صدر اول کے مفسرین بھی پیچیدہ مسئلہ سمجھتے رہے تھے [۳]۔

[۱]. لعلہم ینتقون الی تقصیر فی ترک النہی (جلالین)

[۲]. لعلہم یتقون الصید (جلالین)

[۳]. قال ابن عباس ما احرى ما فعل بالفرقة الساكنة وقال عكرمة لم تبهلك لانها كرهت ما فعلوا وقالت لم تعظون الخ وروى الحاكم عن ابن عباس رضي الله عنه انه رجع اليه واعجبه (صافي) روى عن ابن عباس فيهم ثلاثة اقوال (مجمع البيان)

اس ذیل میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ جناب ابن عباسؓ اس آیت کو اپنے دور کے حالات پر منطبق کر کے روتے تھے اور فرماتے تھے کہ ہم اس وقت اسی تیسرے گروہ میں داخل ہیں اور اس لئے ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ہمارا مستقبل کیا ہوگا۔^[۱]

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لِيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ يَسُومُهُمْ سُوءَ

الْعَذَابِ ۗ إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ ۗ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۶۷﴾

”اور جب کہ تمہارا پروردگار نے یہ اطلاع دے دی ہے^[۲] کہ وہ ان کے خلاف قیامت کے دن تک ایسے لوگوں کو اٹھاتا رہے گا جو انہیں طرح طرح کی تکلیفیں پہنچاتے رہیں گے یقیناً تمہارا پروردگار بہت جلد سزا دینے والا ہے اور وہ بلاشبہ بڑا بخشنے والا بھی ہے، بڑا مہربان۔“

یہ آیت یہود کے لئے بظاہر حکم قطعی کی حیثیت رکھتی ہے کہ روز قیامت تک برابر ایسے افراد کے ہاتھ میں مبتلا رہیں گے جو انہیں طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں چنانچہ بارہ تیرہ سو برس کا مشاہدہ اس کی تصدیق کرتا رہا۔ اس لئے یہ حکم ہمیشہ اٹل سمجھا جاتا رہا مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ خود اسی آیت میں آخری جملہ کو ”وہ بلاشبہ بڑا بخشنے والا بھی ہے، بڑا مہربان۔“ اس کی گنجائش پیدا کرتا ہے کہ یہ قوم بھی اپنے کردار کی کبھی اگر اصلاح کر لے تو جس حد تک وہ اصلاح کرے، اس حد تک یہ عذاب کم یا برطرف بھی ہو سکتا ہے۔

خیر، یہ تو یہود کا معاملہ ہے مگر یہاں پر شاہ عبدالقادر صاحب کا یہ نوٹ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ:

”یہ احوال اس امت کو سنایا ہے کہ یہ سب کچھ ان پر بھی ہوگا۔“ (موضح القرآن)

اسے یاد رکھیں وہ افراد امت جو اپنی نکتہ پر اللہ سے ”شکوہ“ کرنے بیٹھے ہیں۔

وَقَطَّعُوهُمْ فِي الْأَرْضِ أَهْمًا ۖ مِنْهُمْ الصَّالِحُونَ وَمِنْهُمْ دُونَ ذَلِكَ ۖ وَبَلَّوْنَهُمْ

بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۱۶۸﴾

”اور ہم نے انہیں دنیا میں بہت سی جماعتوں کی شکل میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ان میں نیک لوگ ہیں اور ان میں ان کے علاوہ بھی ہیں اور ہم نے بھلائیوں اور برائیوں کے ساتھ ان کی آزمائش کی، شاید وہ اللہ سے لو لگائیں۔“^[۳] یہ ہم کی ضمیر بنی اسرائیل کی طرف ہے کہ ان کے بہت سے جتھے ہو گئے۔

”بھلائیوں اور برائیوں کے ساتھ“ یعنی کبھی دنیا کے راحت و آرام اور اقتدار و دولت کے ساتھ ان کی آزمائش کی اور کبھی تکلیف و

[۱] روى عن عطاء بن رطله دخل على ابن عباس وبين يديه المصحف وهو يبكي وقد اتى على هذه الآية الى اخرها فقال ابن عباس قد عملت ان الله اهلك الدين اخذ والحيتان وانجا الذين دبوهم ولا احدى ماصنع بالذين لم ينهواهم ولم يواقعو المعصية وهي حالنا (تبيان)

[۲] معنى "تأذن" اعلم (تبيان)

[۳] اى يرجعوا الى طاعة وينيبوا الى امتثال امره (تبيان)

اذیت اور مصیبت و نکت میں مبتلا کر کے [۱] کہ ان میں سے ہر ایک چیز باختلاف مزاج و طبیعت اصلاح کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرِثُوا الْكِتَابَ يَأْخُذُونَ عَرَضَ هَذَا الْأَدْنَى
وَيَقُولُونَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۗ وَإِنْ يَأْتِهِمْ عَرَضٌ مِثْلَهُ يَأْخُذُوهُ ۗ أَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ
مِيثَاقُ الْكِتَابِ أَنْ لَا يَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوا مَا فِيهِ ۗ وَاللَّذَّارُ
الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۱۶۹﴾

”تو ان کے بعد ایسے ناخلف [۲] توریت کی ذمہ داری کے حامل ہوئے جو اس دنیا کے عارضی ساز و سامان [۳] کو اختیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو بخش ہی دیئے جائیں گے، اور اگر اتنا ہی اور عارضی ساز و سامان ہاتھ آئے تو اس پر بھی قبضہ کریں۔ کیا ان سے توریت والا یہ عہد و پیمانہ نہیں لیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی نسبت نہ کہیں کوئی بات سوا حق کے اور انہوں نے پڑھا ہے اسے جو اس میں ہے اور آخرت والا گھر بہتر ہے ان کے لئے جو پرہیزگار ہوں، پھر کیوں تم عقل سے کام نہیں لیتے ہو؟“

ان ناخلفوں سے جو توریت کے وارث ہوئے علمائے یہود مراد ہیں [۴] جن کا سب سے بڑا برائیوں کا سرچشمہ قرآن نے دنیا طلبی کو قرار

دیا ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ علماء کے طبقہ میں یہی فساد کا سب سے بڑا سبب ہوتا ہے جس سے ان کے علیحدہ رہنے کی ضرورت ہے۔ اور یہ جو ارشاد ہوا کہ ”اتنا ہی عارضی ساز و سامان اور ہاتھ آئے تو اس پر بھی قبضہ کر لیں“، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا طلبی کے سیلاب میں بہے جا رہے ہیں جس پر کبھی ان میں ندامت و پشیمانی بھی پیدا نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کو اپنی کامیابی و کامرانی سمجھتے ہیں [۵] اور اس کے بعد بھی مغفرت کا تصور رکھتے ہیں حالانکہ مغفرت تو اس کی ہوتی ہے جو گناہ پر اصرار نہ رکھتا ہو [۶] اور گناہ پر اصرار کے باوجود مغفرت کا تصور ہی خدا پر ایک طرح کا بہتان ہے، اس لئے کہ اس نے کبھی ایسا وعدہ نہیں کیا۔ [۷]

وَالَّذِينَ يُمَسِّكُونَ بِالْكِتَابِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ ۗ إِنَّا لَا نَضِيعُ أَجْرَ الْمُصْلِحِينَ ﴿۱۷۰﴾

[۱] بلو ناہم بالنعم والنقم والرخاء الشدة (مجمع البیان)

[۲] جانشینان بد (شاہ ولی اللہ) برے جانشین (شاہ فیع الدین)

[۳] العرض ما يعرض ويقل لبشه (مجمع البیان)

[۴] یعنی اصرار بنی اسرائیل (فتح الرحمن)

[۵] دلیل علی اصرار ہم (تبیان)

[۶] ای یرون المغفر تو ہم عائدون الی ما فعلوا مصر و علیہ (جلالین)

[۷] فلم کذبوا علیہ بنسبۃ المغفرۃ الیہ مع الاصرار (جلالین)

”اور جو لوگ کتاب کے ساتھ تمسک رکھتے ہیں ﴿۱﴾ اور جو ”صلوٰۃ“ ادا کرتے رہے ہیں تو بلاشبہ ہم درست اعمال رکھنے والوں کے ثواب کو برابرا نہیں کرتے۔“

اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ دور فترت میں یعنی پیغمبر اسلام ﷺ کی بعثت کے پہلے اہل کتاب میں ایسے لوگ تھے جو انبیاء کے تعلیمات کی پیروی کرتے تھے اور جو اس وقت طریقہ عبادت تھا اور اس دور میں ”صلوٰۃ“ سے موسوم وہی طریقہ تھا، اس پر قائم تھے۔ یہ پیش خدا ضرور اجر پائیں گے۔ اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اب جنہوں نے توریت وغیرہ کی بشارتوں پر عمل کرتے ہوئے رسول ﷺ پر ایمان اختیار کیا اور نماز ادا کی یعنی مسلمان ہوئے اور اس طریقہ سے عبادت کرنا اختیار کیا، وہ نجات پائیں گے۔

وَإِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَأَنَّهُ ظُلَّةٌ وَظَنُّوا أَنَّهُ وَاقِعٌ بِهِمْ ۗ خُذُوا مَا

آتَيْنَكُم بِقُوَّةٍ ۖ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۴۱﴾

”اور جب ہم نے پہاڑ جڑ سے اکھاڑ کر بلند کیا ان پر جیسے کہ وہ ایک سا تباہان ہے اور انہیں گمان ہوا کہ وہ ان پر گرا ہی چاہتا ہے کہ لو اسے جو ہم نے تمہیں دیا ہے مضبوطی کے ساتھ اور یاد رکھنا اسے جو اس میں ہے، شاید تم بچاؤ کا سامان کر لو۔“

پہاڑ کے اونچا کرنے کا ذکر پہلے کئی مقامات پر آچکا ہے، یہاں جو لفظ صرف کیا گیا ہے، اس کے معنی میں ”جڑ سے اکھاڑنے“ کے پہلو کا اضافہ ہے ﴿۱﴾ یعنی اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ پہاڑ کا کوئی ٹکڑا الگ ہو کر ان کے سر پر بلند ہو گیا ہو بلکہ پہاڑ سر تا سر نہ سہی تو کم از کم اس کا وہ جزء جو ان کے حد نظر کے سامنے ہے، پورا زمین سے اکھڑ کر اونچا ہوا اور ان کے سر پر سایہ آگن ہوا جیسے کہ وہ ان پر گرا چاہتا ہے۔

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَى

أَنفُسِهِمْ ۗ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۗ شَهِدْنَا ۗ أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا

كُنَّا عَنْ هَذَا غَافِلِينَ ﴿۱۴۲﴾ أَوْ تَقُولُوا إِنَّمَا أَشْرَكَ آبَاؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِنْ

بَعْدِهِمْ ۗ أَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُونَ ﴿۱۴۳﴾ وَكَذَلِكَ نَقُصُّلُ الْآيَاتِ وَلَعَلَّهُمْ

يَرْجِعُونَ ﴿۱۴۴﴾

”اور جب کہ تمہارے پروردگار نے اولاد آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو لیا اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بنایا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں! ہم گواہی دیتے ہیں، اس لئے کہ ﴿۱﴾ کہیں تم بروز قیامت

﴿۱﴾۔ یمسکون بالکتاب و یمسکون و یتمسکون و ستمسکون بمعنی واحد (تبیان)

﴿۲﴾۔ النتیق قلع الشیء من الاصل (مجمع البیان)

﴿۳﴾۔ ابن شہد گورفتن برای احتراز از ان است کہ نگویند (شاه ولی اللہ)

یہ نہ کہو کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے یا تم کہو کہ اصل شرک تو ہمارے باپ دادا نے پہلے کیا تھا اور ہم ان کے بعد ان کی نسل تھے تو کیا تو ہمیں ہلاک کرے گا اس سبب سے جو باطل پرستوں نے کیا اور اس طرح ہم حقیقتوں کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں اور شاید وہ رجوع کریں۔^[1]

عہد آلت اور عالم ذر

اس آیت کی بنا پر ’عالم ذر‘ اور ’روزالت‘ کے محاورات مسلمانوں میں رائج ہوئے ہیں اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قبل تخلیق ظاہری ایک وقت ایسا تھا کہ تمام اولاد آدم علیہ السلام کسی خاص شکل میں بیک وقت جمع کی گئی تھی اور اس سے یہ سوال وجواب ہوا تھا۔ بعض لوگ اسے کسی ایک دن کی بات نہیں قرار دیتے بلکہ اسے رفتہ رفتہ جو نسلیں ظہور پذیر ہوتی ہیں ان سب کے متعلق بیان حال کی حیثیت سے مانتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ کے الفاظ عجیب ہیں جن سے شروع میں سمجھ میں آتا ہے کہ وہ اس کے قائل ہیں جو مشہور عقیدہ ہے کہ یہ کوئی خاص دن تھا اور بعد میں کچھ ایسا کہہ دیا ہے جو دوسرے تصور کا پتہ دیتا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

یعنی روز میثاق از آدم اولاد اور اپید اکرد و از ایشان اولاد ایشان را بتریبی کہ در خارج متحقق شود (فتح الرحمن)

یعنی عہد آلت کے دن آدم سے ان کی اولاد کو پیدا کیا اور ان سے ان کی اولاد کو اس ترتیب سے جو ان کی وجود خارجی میں واقع ہوگی۔ شاہ عبدالقادر نے اس کو واضح طور پر قبل تخلیق سے متعلق قرار دیا ہے مگر یہ زیادہ صاف نہیں کہ یہ معاملہ بحیثیت مجموعی سب سے ایک ہی دن ہوا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی اولاد اور ان سے ان کی اولاد نکالی۔ سب سے اقرار کر لیا اپنی خدائی کا اور پھر پشت میں داخل کیا۔ اس سے مدعا یہ کہ خدا کو ماننے میں ہر کو آپ کی بات ہے۔ باپ کی تقلید نہیں۔ اگر باپ شرک کرے تو بیٹا ایمان لاوے، اگر کسی کو شبہ ہو کہ وہ عہد تو یاد نہیں رہا۔ پھر کیا حاصل تو یوں سمجھے کہ اس کا نشان ہر کسی کے دل میں رہا ہے اور ہر زبان پر مشہور ہو رہا ہے کہ سب کا خالق ہے۔ سارا جہاں قائل ہے اور جو کوئی منکر ہے اور جو شرک کرتا ہے، سو اپنی عقل ناقص کے دخل سے، پھر آپ ہی جھوٹا ہوتا ہے، (موضح القرآن) جو سوال ممدوح نے اٹھایا ہے، اس کا جواب صاحب جلالین نے یوں دیا ہے:

والتذکیر بہ علی لسان صاحب المعجزة قائم مقام ذکرہ فی النفوس.

صاحب اعجاز کی زبانی اس کی یاد دہانی قائم مقام ہے اس کی کہ خود اپنے ذہن میں اس واقعہ کی یاد موجود ہوتی۔ ہمارے بعض بالغ نظر علماء جنہیں جرأت تحقیق عطا ہوئی تھی اور وہ مخالفت جمہور میں سطحی نگاہ والوں کی طرف سے انکار مسلمات کے الزام کی پروا نہیں رکھتے تھے جیسے علم الہدیٰ جناب سید مرتضیٰ امالی میں اور شریف رضی موسوی ’محقق للتاویل‘ میں اور جناب شیخ الطائفہ ’تبیان‘ میں اس شہرت عامہ کو الفاظ قرآنی اور عقل کے خلاف قرار دیتے ہیں اور انہوں نے اس کا مفہوم دوسرا قرار دیا ہے جس کے بعد وہ سوال جو مذکورہ تصور

[1] نیبینہا مثل ما بیننا الميثاق ليتدبروها ولعلهم يرجعون عن كفرهم (جلالین)

میں اٹھ رہا تھا ختم ہو جاتا ہے چنانچہ انہی قدیم اکابر علماء کا تتبع کرتے ہوئے اس نقطہ نظر کو جناب امین الاسلام علامہ طبرسی نے ”مجمع البیان“ میں چونکہ کافی وضاحت کے ساتھ درج کیا ہے لہذا اس بحث کی اہمیت کے پیش نظر اس مقام پر اس تفسیر کی پوری بحث کو جو اس آیت کے متعلق ہے عیون الفاظ کے ساتھ ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

ذکر سبحانہ ما اخذ علی الخلق من الموائیق بعقولہم عقیب ما ذکرہ من الموائیق التي فی الكتب جمعاً بین دلائل السمع والعقل وابلغاً فی اقامة الحجۃ فقال: واذا خذ ربك ای واذا ذكر لهم یا حمداً اذا خرج ربك من بنی آدم من ظهورهم ای من ظهور بنی آدم ذریتهم واشهدهم علی انفسهم الست بربکم قالوا بلی، اختلف العلماء من العام والخاص فی معنی هذه الآية وفي هذا الاخراج والاشهاد علی وجوه! احدها ان الله تعالى اخرج ذرية آدم من صلبه كهيئة الذر فعرضهم علی آدم وقال انی اخذ علی ذریتك میثاقهم ان یعبدونی ولا یشرکوا بی شیئاً ثم قال لهم الست بربکم قالوا بلی شهدنا انک ربنا فقال للملائكة اشهدوا فقالوا شهدنا وقیل ان الله تعالى جعلهم فهماً عقلاء ۛ یسمعون خطابه ویفوهونه ثم ردهم الی صلب آدم والناس محبوسون بأجمعهم حتی یمخرج کل من اخرجه فی ذلك الوقت وکل من ثبت علی الاسلام فهو علی الفطرة الا ولی ومن کفر ووجد فقد تغیر عن الفطرة اولاً ولی عن جماعة من المفسرین وردوا فی ذلك اثاراً بعضها مرفوعة وبعضها مرفوعة یجعلونها تاویلاً للآیه ورد المحققون هذا التاویل وقالوا انه مما یشهد ظاهر القرآن بخلافه لانه تعالى قال: واذا اخذ ربك من بنی آدم ولم یقل من آدم وقال من ظهورهم ولم یقل من ظهره وقال ذریتهم ولم یقل ذریته ثم اخبر تعالى بانه فعل ذلك لئلا یقولوا انهم كانوا عن ذلك غافلين او یعتذر وایسرک اباؤهم وانهم نشأوا بینهم ولهذا یقتضی ان یكون لهم اباؤ مشرکون فلا یتناول الظاهر ولد آدم لصلبه وایضاً فان هذه الذریة المستخرجة من صلب آدم لا یخلوا ما ان جعلهم الله عقلاء اولم یجعلهم كذلك فان لم یجعلهم عقلاء فلا یصح ان یعرفوا التوحید وان یفوهوا خطاب الله تعالى وان جعلهم عقلاء واخذ علیهم الميثاق فیجب ان یتذکر واذلك ولا ینسوه لان اخذ الميثاق لا یكون حجة علی الماخذ علیه الا ان یكون ذا کراهه فیجب ان نذکر نحن الميثاق ولا نه لا یجوز ان ینسی الجمع الكثير والحجم الغفیر من العقلاء شیئاً كانوا عرفوه ومیزوه حتی لا یذکره احد منهم وان طال العهد الاثری ان اهل الجنة یعرفون کثیراً من احوال الدنیا حتی یقول اهل الجنة ان قد وجدنا ما وعد ربنا حقاً ولو جاز ان ینسوا ذلك مع هذا الکثرة جاز ان یكون الله تعالى قد کلف الخلق فیما مضی ثم اعادهم اما لیتیمهم واما لیعاقبهم ونسوا ذلك وذلك یؤدی الی التجاهل والی حصة مذهب الناسخته.

خداوند عالم نے ان عہد و پیمان کے واقعات کے ذکر کے بعد جو کتب سماوی میں خلق خدا سے لئے گئے تھے، اس عہد و پیمان کا ذکر کیا ہے جو ان سے ان کے عقل و ضمیر کے ذریعہ سے لئے گئے ہیں تاکہ نقلی اور عقلی دلائل ہم آہنگ ہو جائیں اور استدلال میں کوئی پہلو باقی نہ رہ جائے تو ارشاد کیا: اور وہ موقع جب تمہارے پروردگار نے لیا یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہ ہنگام یاد دلائیے جب آپ کے پروردگار نے اولاد آدم سے ان کی

پشتوں سے یعنی اولاد آدم کی پشتوں سے برآمد کیا ان کی نسل کو اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ کیا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں۔ سنی اور شیعہ علماء کے درمیان اس آیت کے معنی اور اس برآمد کرنے اور گواہ بنانے کے بارے میں اختلاف ہوا ہے جس میں چند قول ہیں:- پہلے یہ کہ خداوند عالم نے آدم کی نسل کو جو ان کے صلب سے پیدا ہونے والی تھی، چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں (ذروں) کی شکل میں برآمد کر کے ان سب کو آدم کے سامنے پیش کیا اور کہا میں تمہاری نسل سے عہد و پیمان لینا چاہتا ہوں کہ وہ میری عبادت کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں پھر ان سب سے کہا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں ہم اس کے گواہ ہیں کہ تو ہمارا پروردگار ہے، تو فرشتوں سے ارشاد ہوا کہ تم گواہ رہنا انہوں نے کہا ہم گواہ ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ اللہ نے ان کو فہم و عقل عطا کی کہ وہ اس کے مخاطب کو سنیں اور سمجھیں۔ پھر انہیں آدم کی پشت کی طرف پلٹا دیا اور آدم کا سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک کہ وہ تمام اشخاص جو اس وقت تک باہر آئے تھے پیدا ہو کر باہر آجائیں اور جو مسلمان رہتا ہے وہ اپنی اصلی فطرت پر برقرار ہے اور جو کافر ہوتا اور جان بوجھ کر انکار کرتا ہے، وہ اپنی پہلی فطرت سے پلٹ گیا ہے۔ یہ قول مفسرین میں ایک جماعت کا ہے، اور اس بارے میں انہوں نے حدیثیں بھی نقل کی ہیں جن میں سے بعض کا استناد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے اور بعض کی سند بیچ میں رک گئی ہے، ان روایات کو وہ اس آیت کی تفسیر قرار دیتے ہیں اور محققین نے اس تفسیر کو رد کیا ہے اور کہا ہے کہ قرآن کے الفاظ کے ظاہری معنی اس تفسیر کے خلاف ہیں۔ اس لئے کہ ارشاد ہوا ہے کہ ”جب تمہارے پروردگار نے بنی آدم سے برآمد کیا، یہ نہیں کہا کہ آدم سے اور کہا کہ ان لوگوں کی پشتوں سے یہ نہیں کہا کہ آدم کی نسل سے اور یہ نہیں کہا کہ آدم کی نسل سے پھر یہ ارشاد ہوا کہ اللہ نے یہ اس لئے کیا کہ وہ یہ نہ کہیں کہ وہ اس سے بے خبر تھے یا یہ عذر نہ کریں کہ ان کے آباؤ اجداد نے شرک کیا تھا اور وہ انہی میں پلے بڑھے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے آباؤ اجداد میں مشرک افراد تھے لہذا ان کے ظاہری مفہوم میں آدم کی براہ راست صلیبی اولاد داخل نہیں ہے، اس کے علاوہ یہ نسل جو برآمد کی گئی تھی آدم کی صلب سے اس میں دو ہی صورتیں ہیں:- یا تو یہ کہ اللہ نے ان کو عقل عطا کی تھی یا صاحب عقل نہیں بنایا تھا۔ اگر انہیں عقل تمیز عطا نہیں کی تھی تو ان کے لئے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ توحید کو جانیں اور اللہ کے مخاطب کو سمجھیں اور اگر انہیں صاحب عقل و شعور بنایا تھا اور پھر ان سے عہد و پیمان لیا تو ضرور انہیں وہ پیمان یا دہونا چاہیے اور فراموش نہ ہونا چاہیے اس لئے کہ عہد و پیمان کا لینا اس شخص کے خلاف جس سے وہ عہد لیا گیا تھا سند نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اسے یاد نہ ہو لہذا ضروری ہے کہ ہمیں وہ عہد و پیمان یاد ہو اور پھر یہ ممکن بھی نہیں کہ اتنا بڑا مجمع اور صاحبان عقل کا جم غفیر ایک ایسی چیز کو جسے انہوں نے جانا تھا اور سمجھا تھا ایک دم بھول جائیں اس طرح کہ ایک کو بھی ان میں سے یاد نہ ہو چاہے زمانہ کتنا ہی زیادہ گزر گیا ہو کیا تم نہیں دیکھتے کہ اہل بہشت دنیا کے گزرے ہوئے بہت سے حالات کو محسوس کر رہے ہوں گے، یہاں تک کہ (اہل دوزخ سے) کہیں گے کہ جو ہمارے پروردگار نے ہم سے وعدہ کیا تھا ہم نے اسے سچا پایا اور اگر اتنی کثرت تعداد کے باوجود بھول ممکن ہو تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ قبل کے جنم میں اللہ نے احکام جاری کئے ہوں پھر اب انہیں اس دنیا میں لایا ہوتا کہ اس جنم کے اعمال کا ثواب دے یا عذاب کرے مگر وہ اس جنم کو بھولے ہوئے ہیں، اس کا نتیجہ اصول دین میں شک پیدا ہونا ہے اور پھر آواگون کا تصور درست ہو جائے گا۔

اس طویل عبارت میں جو استعارات عقل مذکور ہیں، ان کا میری نظر میں اتنا وزن نہیں ہے جتنا الفاظ آیت سے اس استدلال کا کہ اس آیت میں ضمیر خود جناب آدم کی طرف نہیں ہے، نہ ان کا خود پہلے ذکر ہے بلکہ قبل میں بنی آدم کا ذکر ہے اور ظہور ہمد اور ذریت ہمد یہ ضمیریں سب انہی کی طرف ہیں لیکن آغاز آیت جس انداز سے ہوا ہے: واذا اخذ ربك جس کے معنی عموماً اس طرح کے ہوتے ہیں کہ وہ موقع بھی خاص تھا

یا وہ موقع بھی یاد رکھنے کا ہے، یہ انداز بتاتا ہے کہ یہ کسی ایک وقت پر وقوع میں آنے والے کسی واقعہ کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ کچھ حدیثوں میں بھی جیسا کہ مذکورہ بالا عبارت میں اشارہ موجود ہے، 'یوم الذر اور یوم اخذ الميثاق' یعنی عہد الست کا ذکر ہے۔ اس لئے ان محققین کی اتنی مستحکم بحث کے بعد بھی میں اس مرحلہ میں کسی قابل الطمینان نتیجہ تک نہیں پہنچا ہوں۔

وَأْتَلَّ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاتَّبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ ﴿١٤٥﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ ۖ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۖ إِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثُ ۗ ذَٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۖ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿١٤٦﴾ سَاءَ مَثَلًا الْقَوْمُ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَأَنْفُسُهُمْ كَانُوا لَا يَتْلُمُونَ ﴿١٤٧﴾

’اور ان کے سامنے بیان کیجئے واقعہ اس کا جسے ہم نے اپنی آیتیں عطا کیں تو وہ ان سے عاری ہو گیا جس کے بعد شیطان اس کے پیچھے لگ گیا وہ گمراہوں میں سے فرار پایا اور اگر ہم چاہتے تو ان کی وجہ سے اسے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو خود زمین سے لگ گیا اور اپنی نفسانی خواہش کا پیرو ہو گیا تو اس کی کیفیت اس کتنے کی سی ہوئی کہ اگر اس پر بوجھار کھو تو وہ زبان منہ سے نکالے یا اسے یونہی چھوڑ دو تو بھی زبان باہر نکالے۔ یہ مثال ہے ان کی جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور آپ یہ واقعات پیش کرتے رہے شاید وہ غور کریں۔ کیا بری مثال ہے اس جماعت کی جس نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور جو خود اپنے اوپر ستم ڈھاتے رہے۔‘

’اپنی آیتیں عطا کیں‘ یعنی ان کا علم دیا۔ [1]

’وہ ان سے عاری ہو گیا‘ یعنی ان آیات کے علم کا جو تقاضا تھا اسے ترک کر دیا۔ [2]

ایک عالم بے عمل کا حال

یہ آیت کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ وہ کسی شخص خاص کا واقعہ ہے جو عالم ہونے کے باوجود عمل کے جوہر سے خالی رہا تو اس کی مذمت وارد ہوئی۔

روایات اس شخص کا نام بلعم باعور بتاتے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تھا اور اس نے باوجود کتب سماویہ کا علم رکھنے کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کی [3]

[1] داداۃ بودیم اور اعلم آیات (شاہ ولی اللہ)

[2] یعنی تابع شہوت نفس شد و تابع شہوت نفس را عالم نیتوان گفت (فتح الرحمن)

[3] وهو بلعم بن باعوراء من علماء بني اسرائيل سئل ان يدعو اعلیٰ موسیٰ و اهدیٰ الیه شیء فدعا فانقلب علیہ (جلالین)

اور ایک روایت یہ ہے کہ وہ امیہ بن ابی الصلت ثقفی ہے جو زمانہ حضرت پیغمبر اسلام ﷺ میں موجود تھا [۱]۔
یہ جو ارشاد ہوا کہ ”اگر ہم چاہتے تو ان کی وجہ سے اسے بلندی عطا کرتے“ تو یہ چونکہ حکیم مطلق چاہتا ہے لہذا بلا وجہ نہیں ہو سکتا۔ اس بنا پر چاہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ”اگر ہم اسے اس لائق سمجھتے تو ان آیات کے علم کی وجہ سے اسے رفعت و سر بلندی حاصل ہوتی [۲] مگر کیا کیا جائے کہ ”وہ تو خود زمین سے لگ گیا“ یعنی دنیا طلبی کر کے سیرت و کردار کی پستی میں گر گیا۔ [۳]

اس سے بھی ظاہر ہے کہ وہ چاہنا اس کے ذاتی صفات کی بنا پر ہوتا اور یہ نہ چاہنا اس کے سوء اختیار کی بنا پر ہوا۔
یہ کہ ”اس کی کیفیت اس کتے کی سی ہے“ اسے صرف تمثیل پر بھی مبنی سمجھا جاسکتا ہے مگر بعض روایتیں بتاتی ہیں کہ اس پر عذاب یہی نازل ہوا تھا کہ اس کی زبان کتے کی طرح منہ سے باہر نکل پڑی تھی [۴]

کتے کے وصف میں یہ ارشاد کہ: اِنَّ تَحْمِلُ عَلَيَّهِ يَلْهَثُ، اسے عموماً حمل سے لیا گیا ہے [۵] چنانچہ ہم نے اس کا ترجمہ بوجھ رکھنے کے ساتھ کیا ہے مگر یہ ”حملہ“ سے بھی ہو سکتا ہے یعنی اسے ڈانٹو، ڈپٹو اور اس کی طرف مارنے کے لئے بڑھو۔ [۶]
مگر یہ معنی اس وقت مناسب ہوتے جب لہٹ کے یعنی بھونکنے کے ہوتے کہ کتے کی یہ حالت ہے کہ تم اس سے بولو نہ بولو، وہ بھونکتا ہے مگر زبان منہ سے نکالنے اور ہونکنے [۷] کی کیفیت کے ساتھ بوجھ کالا دنا زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

مَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِي ۖ وَمَنْ يُضِلِّ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ﴿٤٥﴾

”جسے اللہ ہدایت کرے، وہ ہدایت پانے والا ہے اور جسے وہ گمراہی میں چھوڑ دے تو یہی لوگ وہ ہیں جو گھاٹا اٹھانے والے ہیں۔“

اللہ ہدایت اسی کی کرتا ہے جس میں طلب صادق اور سعی خالص پاتا ہے (وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا) اور گمراہی میں اسی کو چھوڑ دیتا ہے جو مسلسل اعراض سے کام لیتا ہے، اس لئے نتیجتاً دونوں باتیں انسان کے اختیار سے وابستہ ہیں۔

**وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۗ لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ
بِهَآءِ نَوْءِهِمْ أَصْنَانٌ ۗ لَّآ يُبْصِرُونَ بِهَآءِ نَوْءِهِمْ أَذَانٌ ۗ لَّآ يَسْمَعُونَ بِهَآءِ أُولَٰئِكَ**

[۱]. بلغنا ايضاً والله اعلم انه اميه بن ابى الصلت الثقفى الشاعر المشهور (مجمع البيان)

[۲]. يعنى منزلت اور السبب ایں آيات (فتح الرحمن)

[۳]. سكن الى الدنيا وركن اليها (تبيان)

[۴]. اس کو عذاب یہ ہوا کہ کتے کی طرح زبان نکل پڑی (موضح القرآن)

[۵]. بوجھ رکھے تو اوپر اس کے (شاہ رفیع الدین)

[۶]. ان تحمل علیہ بالطر دو الزجر (جلالین)

[۷]. الھت التنفس الشدید من شدۃ الاعیاء (تبيان)

كَأَلَّا نَعَامٍ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۖ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغٰفِلُونَ ﴿١٤٩﴾

’اور بے شک ہم نے دوزخ کے واسطے پیدا کیا ہے جنات اور آدمیوں میں سے بہتوں کو، ان کے دل و دماغ ہیں۔ جن سے وہ سمجھتے نہیں اور ان کے پاس آنکھیں ہیں وہ جن سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ یہ لوگ مثل چوپایوں کے ہیں بلکہ وہ اس سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ یہ وہ ہیں جو بالکل مدہوش ہیں۔‘

اصل میں اللہ نے پیدا تو اس لئے نہیں کیا تھا بلکہ جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

”وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴿٥١﴾ (ذاریات۔ ۵۱)۔

پیدا اس لئے کیا تھا کہ وہ تقاضائے عبودیت پر عمل کر کے بہتر سے بہتر انجام تک پہنچیں مگر چونکہ نتیجتاً اکثریت نے اپنے سوء اختیار سے جو راستہ اپنایا، اس کا مال دوزخ ہی ہے، اس لئے یہاں یہ تعبیر کی گئی کہ ہم نے ان سب کو دوزخ کے لئے پیدا کیا تھا^[۱] اس کی نمایاں نظیر قرآن کی جو اور دوسرے ایسے مقامات پر بکثرت پیش کی جاتی ہے، یہ ہے کہ:

فَالْتَقَطَهُ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا.

موسیٰ کو فرعون کے گھروالوں نے دریا سے نکال لیا تاکہ وہ ان کے لئے دشمن اور باعثِ غم و غصہ قرار پائیں۔ (قصص: ۸)

ظاہر ہے کہ ان لوگوں نے تو اس لئے نہیں نکالا تھا مگر چونکہ نتیجہ یہی ہوا اس لئے اس نتیجہ کا بیان اس طرح کیا گیا جیسے کہ انہوں نے نکالا اسی لئے تھا۔

’وہ چوپایوں کے مثل ہیں‘۔ یہ تو بے شعوری کے لحاظ سے اور ’ان سے زیادہ گمراہ ہیں‘۔ کیونکہ وہ بھی اپنے اپنے حس فطری سے اپنے فائدہ

کی چیزوں کی طرف متوجہ ہوتے اور مضرتوں اور اذیتوں سے بچتے ہیں مگر یہ خود اپنے ہاتھوں اپنی ہلاکت کا سامان کرتے ہیں۔^[۲] پھر یہ بھی کہ وہ اپنی پستی کردار میں مورد الزام نہیں، اس لئے کہ ان میں عقل و شعور اور تمیز حق و باطل نہیں ہے اور یہ عقل و شعور رکھتے ہوئے اس پستی میں مبتلا ہیں تو یہ مورد الزام اور گنہگار بھی ہیں۔^[۳]

وَاللَّهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا ۖ وَذُرُوا الدِّينَ يُلْحِدُونَ فِي أَسْمَائِهِ ۖ

سَيَجْزُونَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٥٠﴾

’اور اللہ سے مخصوص ہیں وہ نام جو بہترین ہیں تو اسے پکارو انہی کے ذریعے سے^[۴] اور چھوڑو انہیں جو غلط راستہ

[۱] اللام فی ’لجنہم‘ لام العاقبة والمعنى انه لما كانوا يصيرون اليها بسوء اختيارهم وقبح اعمالهم جازان يقال انه ذرأهم لذلك (تبيان)

[۲] اضل من الانعام لانها تطلب منافعها وتهرب من مضارها وهو لاء يقدمون على النار معاندة (جلالين)

[۳] اضل من الانعام لان الانعام لم تعط آلة المعرفة والتميز فلا تلحقها المذمة وهو لاء اعطوا آلة المعرفة والتميز فضيعوها. (مجمع البيان)

[۴] سموها (جلالين)

اختیار کرتے ہیں [۱] اس کے ناموں میں جلد ہی انہیں سزا ملے گی اس کی جو وہ کیا کئے ہیں۔“

ایسے ناموں سے جو شانِ الہی کے لائق نہیں ہیں، اس کو یاد کرنا اس کی ذات کے بارے میں کسی غلط اعتقاد کا ترجمان ہوتا ہے۔ اسی کو غلط راستہ کہا گیا ہے۔ [۲]

ایک دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ باری تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اس واسطے ہیں کہ ان سے دعا کرو اور اس کی حمد و ثناء میں ان کا استعمال کرو۔ یہ نہیں کہ ان سے سحر وغیرہ کا کام لو۔ [۳]

اس صورت میں کج روی کا تعلق تعین اسماء سے نہیں بلکہ طریقہ استعمال سے ہے۔ ایک تیسری صورت کج روی کی یہ ہے کہ الفاظ جو ذاتِ باری کے لئے ہیں، وہی رہیں مگر انہیں کو بیعینہ یا انہیں بگاڑ کر وہ نام غیر اللہ کے لئے استعمال کر دیئے جائیں جیسا کہ مشرکین کرتے تھے۔ [۴]

وَمَنْ خَلَقْنَا أُمَّةً يَهْتَدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ ﴿١٨﴾

’اور ہماری مخلوق میں ایک گروہ ہے ان کا جو حق کا راستہ بتاتے ہیں اور اس کے ساتھ فیصلہ کرتے ہیں‘۔ [۵]

پہلے یہی الفاظ بنی اسرائیل کے لئے آئے تھے کہ ان میں کچھ ایسے ہیں اور اب عامہٴ خلائق میں کہا جا رہا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہیں اور الفاظ بتاتے ہیں کہ ایسے لوگ خلائق کے اندر اقلیت ہی میں ہیں۔ اکثریت اس کے خلاف ہے۔

ایک معنی آیت کے یہ لئے گئے ہیں کہ ہر دور میں کچھ لوگ راہِ راست اور حسنِ کردار پر قائم رہنے والے ضرور موجود رہیں گے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ تمام خلق گمراہی پر کبھی مجتمع نہیں ہو سکتی۔

ہمارے نقطہ نظر سے یہ اس طرح درست ہے کہ ہم ہر دور میں ایک معصوم کے وجود کو ضروری مانتے ہیں جو خلق پر رحمتِ خدا کی حیثیت رکھتا ہے، اس طرح ضلالت کے عام طوفان میں بھی ایک منارہٴ ہدایت قائم رہتا ہے۔ [۶]

ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر بھی جو غالباً حدیثوں سے ماخوذ ہے، اسی کے مطابق ہے۔ [۷]

وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٩﴾ وَأُمْلِي لَهُمْ ﴿٢٠﴾

إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ ﴿٢١﴾

[۱]. الاحقاد الغدول عن الاستقامة والانحراف عنها (تبیان)

[۲]. یعنی ابو المسیح والو الملائکہ ہی گفتند (فتح الرحمن)

[۳]. ایک کج راہ یہ ہے کہ سحر میں چلاوے (موضح القرآن)

[۴]. حیث اشدتقوا منها اسماء لا لہتم کاللات من اللہ والعزى من العزیز ومنات من المنان (جلالین)

[۵]. ای بالحق یحکمون (مجمع البیان)

[۶]. عندنا انه لا یخلو وقت من الاوقات من یجب اتباعه ویشبت عصمتہ ویكون حجة اللہ علی خلقہ فیمكن ان یكون المراد بانہ ما ذکرناہ (تبیان)

[۷]. هذه الآية لآل محمد ﷺ واتباعهم (علی بن ابراہیم).

”اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، انہیں ہم آہستہ آہستہ گرفت میں لیں گے [۱] اس طرح کہ انہیں خبر بھی نہ ہو گی اور میں انہیں ڈھیل دوں گا۔ [۲] یقیناً میرا منصوبہ بڑا مضبوط ہوتا ہے،“ [۳]

لفظ ”کید“ قرآن میں زیادہ تر ایسے ہی انتظام کے لئے آتا ہے جس میں دوسرا شخص بے شعوری کے عالم میں رہے اور اس کی تباہی کا سامان ہو جائے، ہم نے ”منصوبہ“ کے لفظ سے اس کا ترجمہ مجبوری ہی سے کیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ”کید“ کے لفظ کے تمام خصوصیات ”منصوبہ“ کے لفظ سے ادا نہیں ہوتے جیسا کہ کہیں ہم نے اس کا ترجمہ ”ترکیب“ کے لفظ کے ساتھ بھی کیا ہے، اس کی بھی یہی نوعیت ہے مگر یہاں مضبوطی کے لفظ کے ساتھ ترکیب سے ”منصوبہ“ کا لفظ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا لِمَا بَصَّاحِهِمْ مِّنْ جَنَّةٍ ۚ إِنَّ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿۸۶﴾

”کیا وہ سوچتے نہیں کہ ان کے ساتھی میں کسی طرح کی دیوانگی نہیں ہے، وہ تو نہیں ہے مگر کھلا ہوا خطرہ سے ہوشیار کرنے والا۔“

پیغمبر ﷺ کی باتوں کو سن کر، ان کے دل و دماغ پر جو اثر ہوتا تھا، اسے مٹانے کے لئے وہ آپ کی باتوں کو ’دیوانہ‘ کہہ کر ٹالنا چاہتے تھے۔ یہ ان کی بالکل رواروی کی ایک ترکیب تھی۔ قرآن نے ”کیا وہ سوچتے نہیں“ کہہ کر ان کی اسی کمزوری کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تمہاری اس رواروی سے تمہاری بریت نہیں ہو سکتی۔ ذرا سوچ سمجھ کر سنجیدگی سے محسوس کرو کہ کیا تمہارا ساتھی یعنی یہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم جس سے تمہارا سابقہ ہے اس میں کوئی بھی جنون کی علامت ہے؟ اگر تم غور کرو تو خود تمہاری سمجھ میں یہ آجائے گا کہ وہ حقیقتاً تمہارا ہمدرد ہے جو تمہیں خطروں سے آگاہ کرتا رہتا ہے۔ چونکہ ان کے دل میں دل ڈال کر بات کرنا تھی اور وہ رسول نہیں مانتے تھے، اس لئے صاحب یعنی ساتھی کے لفظ کا استعمال ہوا ہے جو قرآن مجید کے بعض دوسرے مقامات پر بھی ہوا ہے۔

پھر اسی میں یہ بھی مضمحل ہے کہ یہ کوئی اجنبی شخص نہیں ہیں۔ یہ تو برابر ان کے ساتھی رہے ہیں اور اسی ساتھ رہنے سے جو انہیں ان کی ذہنی اور عملی صلاحیتوں کا اندازہ ہے، وہ ان پر خدا کی طرف سے ایک بڑی حجت ہے۔

أَوَلَمْ يَنْظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۗ وَّ اَنْ

عَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ قَدًا قَتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۗ فَبَاۤسِیْ حٰدِیْثٍۭۤ بَعْدَ اَیُّوْمٍۭۤ مِّنۡوَن ﴿۸۷﴾

”کیا وہ غور نہیں کرتے آسمانوں اور زمین کے کارخانہ قدرت میں اور ان چیزوں میں جو اللہ نے پیدا کی ہیں اور یہ

کہ ممکن ہے ان کی موت [۴] نزدیک آچکی ہو تو اب کس کلام پر وہ اس کے بعد ایمان لائیں گے؟!!“

”اس کے بعد“ کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ قرآن جس نے اتنے مؤثر انداز میں ان باتوں کو پیش کیا ہے، اس کے بعد بھی وہ نہیں مانتے تو

[۱] تاخذهم قليلا قليلا (جلالین)

[۲] امهلهم ولا اعاجلهم بالعقوبة (مجمع البيان)

[۳] هر آئینه تدبیر من محکم است (شاه والی اللہ)

[۴] اجلهم هو هلاکهم (علی بن ابراہیم)

اور کون سا کلام ہوگا جس کا ان پر اثر ہو اور وہ ایمان قبول کریں^[۱] اور یہ بھی مفہوم ہو سکتا ہے کہ اب نہ مانیں گے تو کیا بلاکت واقع ہو جائے گی، اس کے بعد وہ مانیں گے؟ مگر ”بایٰ حدیث“ ”کس کلام پر“ کے لفظ سے ذہن میں زیادہ آنے والا مفہوم پہلا ہی ہے۔

مَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ ۖ وَيَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿۸۷﴾
 ”جسے اللہ گمراہی میں چھوڑ دے، اس کا کوئی رہنما نہیں ہو سکتا اور وہ انہیں چھوڑ دیتا ہے ان کی سرکشی میں کہ وہ دل کے اندھے بنے رہیں“^[۲]

”سرکشی“ کے لفظ سے ظاہر ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے گمراہی میں چھوڑ دینا، اس بنا پر ہوتا ہے کہ تمام حجت کی حد بھر ان کی ہدایت ہوئی مگر انہوں نے کسی طرح قبول نہ کیا تو اب اللہ بھی ان سے صرف نظر کر لیتا ہے اور جب اللہ ایسا قادر و حکیم اور پھر مہربان ان کی طرف سے مایوس ہو کر رخ پھیر لے تو اب کس کے بس میں ہوگا کہ ان کی ہدایت کرے۔

مترجمین اہل سنت جو عدالت باری تعالیٰ کے قائل نہیں ہیں، بلا تکلف یہ ترجمہ کر دیتے ہیں کہ ”جسے اللہ گمراہ کرے، اسے کون ہدایت کر سکتا ہے“^[۳] مگر ہم اصول حق کی بنا پر اس ترجمہ سے کسی طرح اتفاق نہیں کر سکتے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسِدُهَا ۖ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي ۖ لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ ۖ ثَقُلَتْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً ۖ يَسْأَلُونَكَ كَأَنَّكَ خَفِيٌّ عَنْهَا ۖ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللَّهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۸۸﴾

”آپ سے پوچھتے ہیں قیامت کی گھڑی کے متعلق کہ اس کا قیام^[۴] کب ہوگا؟ کہیے کہ اس کا علم تو بس میرے پروردگار کے پاس ہے، نہیں نمایاں کرے گا اسے اس کا ہنگام آنے پر^[۵] مگر وہی، بھاری ہے وہ آسمانوں اور زمین میں^[۶] نہیں وہ تمہارے پاس آئے گی مگر بس اچانک آپ سے پوچھتے ہیں ایسا جیسے کہ آپ اس کے متعلق غلطان و

[۱]. بایٰ حدیث بعد القرآن یؤمنون (تبیان)

[۲]. العہد فی القلب کالعمی فی العین (مجمع البیان)

[۳]. ہر کہ گمراہ سازدش خدا (شاہ ولی اللہ) جس کو گمراہ کرے اللہ (شاہ فیض الدین)

[۴]. ای وقت قیامہا وثباتہا (تبیان)

[۵]. لوقتہا اللام بمعنی فی (جلالین)

[۶]. گران شدہ استحر آسمانہا وزمین (شاہ ولی اللہ)

بیچان رہے ہیں [۱] کہیے کہ اس کا علم تو بس اللہ کے پاس ہے مگر زیادہ تر لوگ نہیں جانتے۔“

قیامت کے وقت کا علم کسی کو نہیں

’بھاری ہے وہ آسمانوں اور زمین میں‘ اس کا مطلب بمناسبت سیاق یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا علم اہل آسمان و زمین سب ہی کے لئے دشوار ہے [۲] اور یہ بھی کہ اس کے شدائد و احوال تمام اہل آسمان و زمین کے لئے خاص اہمیت رکھتے ہیں [۳]

’آپ سے پوچھتے ہیں ایسا جیسے کہ آپ اس میں غطان و بیچان رہے ہیں‘ یعنی جیسے کہ آپ اس کے درپے رہے ہیں تو اپنے خالق سے بار بار اس کے متعلق دریافت کر کے علم حاصل کر لیا ہوگا۔ [۴]

’مگر زیادہ تر لوگ نہیں جانتے‘ اس بات کو کہ اس کا علم اللہ کے ساتھ مخصوص ہے کسی دوسرے کو نہیں ہے [۵]

اس سے نمایاں طور پر یہ مستفاد ہوتا ہے کہ یہ ایسا علم ہے جو اس نے اپنے انبیاء و مرسلین کو بھی عطا نہیں کیا ہے۔ اس کے بعد کتنی بے بنیاد ہیں وہ پیشین گوئیاں جو وقتاً فوقتاً قیامت کے لئے ہوتی رہتی ہیں اور کتنی بے عقلی ہے ان پیشین گوئیوں سے وحشت زدہ ہونا اور انہیں اہمیت دینا جس کے حالات ماضی قریب میں کئی مرتبہ اخباروں کے صفحے پر بھی آچکے ہیں۔

قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبِ
لَأَسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۗ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ ۗ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ
يُؤْمِنُونَ ۝۸۸

’کہیے کہ میں نہیں قدرت رکھتا اپنے لئے کسی نفع اور نہ نقصان پر مگر جو اللہ چاہے اور میں خود غیب جانتا ہوتا تو بہت فائدہ اپنے لئے حاصل کر لیتا اور مجھ تک کوئی برائی پہنچتی ہی نہ میں تو نہیں ہوں مگر خطرہ سے متنبہ کرنے والا اور خوشخبری دینے والا ان لوگوں کو جو ایمان لائیں۔‘

اس آیت کی بنا پر مطلق طور سے شفاعت وغیرہ کی نفی کا تصور درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ ماشاء اللہ ’جو اللہ چاہے‘ کے استثناء میں داخل ہے۔ اسی طرح غیب کے جاننے سے جو انکار ہے وہ بھی ذاتی علم کی نفی ہے۔ نہ کہ عطائے الہی سے جو علم حاصل ہو جس کا ثبوت قرآن اور اخبار متواترہ دونوں میں موجود ہے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا ۗ

[۱]۔ گویا کہ تو بحث کرنے والا ہے اس سے (شاہ رفیع الدین)

[۲]۔ یعنی مشکل شدہ استدانستن قیامت (شاہ ولی اللہ)

[۳]۔ ثقلت عظمت.. لہولہا (جلالین)

[۴]۔ مبالغہ فی السؤال عنہا حتی علمتہا (جلالین)

[۵]۔ لایعلمون ان ذلک لایعلمہ الا اللہ ویظنون انہ قد یعلمہ الانبیاء وغیر ہم من خلقہ (تبیان)

فَلَمَّا تَعَشَّدَهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا فَمَرَّتْ بِهِ ۖ فَلَمَّا أَثْقَلَتْ دَعَا اللَّهُ رَبَّهُمَا
لِيَنْ أْتِيَتَنَا صَالِحًا لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴿١٨٩﴾ فَلَمَّا آتَاهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهُ
شُرَكَاءَ فِيمَا آتَاهُمَا ۖ فَتَعَلَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿١٩٠﴾

’وہ وہ ہے جس نے تم کو ایک تنفس سے پیدا کیا اور اسی سے اس کے شریک حیات کو قرار دیا تاکہ وہ اس کے ساتھ سکون پائے تو جب اس (مرد) نے اس (عورت) سے مباشرت کی تو ایک ہلکا بوجھ اس کا لے لیا اور اس کو لئے ہوئے چلنے پھرنے لگی۔ پھر جب اس پر بار زیادہ ہوتا تو دونوں نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ اگر تو ہمیں ایک نیک فرزند عطا کرے تو ضرور ہم تیرے شکرگزاروں میں سے ہوں گے مگر جب اس نے ان دونوں کو ایک اچھی اولاد عطا کی تو ان دونوں نے اس کے لئے شریک قرار دیئے اس میں جو انہیں اس نے عطا کیا۔ برتر ہے اللہ اس سے کہ جو وہ شرک کرتے ہیں۔‘

آغاز میں ابتدائے خلقت کا ذکر ہے جو آدم اور حوا کی تخلیق کی منزل ہے اور پھر عام مرد اور عورت کے حال کی مصوری ہے [۱] جن میں زیادہ تر افراد اللہ سے نعمت اولاد التجاؤں اور تمناؤں کے ساتھ مانگ کر پاتے ہیں اور پھر ناشکر اپن کرتے ہیں چنانچہ شروع میں اگرچہ تنبیہ کے صیغے ہیں جو مرد اور عورت کے لحاظ سے ہیں اور فعل بھی ماضی ہیں جس سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ گزرے ہوئے خاص واقعہ کا اظہار ہے مگر آخر میں ’فَتَعَلَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ‘ (اعراف: ۱۹۰) جمع اور حال کا صیغہ آگیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ عام انسانوں کی بات ہے جو ان کی حالی کیفیت سے متعلق ہے۔ جناب آدم اور حوا کا کوئی خاص گزرا ہوا واقعہ بیان نہیں ہو رہا ہے۔

سواد اعظم کے یہاں احادیث کے ذخیرہ میں بہت سی چیزیں دشمنان اسلام کے یہاں کی آگئی ہیں چنانچہ اس آیت کے تحت میں ترمذی وغیرہ نے ایک روایت درج کر دی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ یہ آخرتک خود آدم اور حوا کا تذکرہ ہے اور یہ کہ ان کے یہاں شروع میں کوئی اولاد زندہ نہیں رہتی تھی تو شیطان نے ان سے آکر کہا کہ اب کی جولوڑکا ہو، اس کا نام عبدالحارث رکھنا اور وہ زندہ رہا۔

ہمارے نقطہ نظر سے اس روایت کا کیا درجہ ہے، وہ اس سے ظاہر ہے کہ اس کا براہ راست پہلا راوی سمرہ بن جندب ہے جس کی سفاکیوں کے تذکرے دور بنی امیہ میں صفحات تاریخ پر آج تک درج ہیں۔

علمائے اہل سنت کا عصمت انبیاء کے بارے میں موقف عجیب رہا ہے، ان سے عصمت انبیاء کا کھل کر انکار کرتے بھی نہیں بنتا اور اس کے اقرار پر بھی پورے طور پر جمنا کچھ ان کے لئے دشوار معلوم ہوتا ہے چنانچہ اس آیت کے ذیل میں ان کی پریشان ذہنی اور پریشان کلامی کا جو منظر ہے اسے ذرا ملاحظہ کیجئے۔ جلالین صاحبان سمرہ کی اس روایت کو درج کرتے ہیں اور اسے صحیح بھی ماننے ہیں مگر ارشاد ہوتا ہے:

ولیس باشرک فی العبودیۃ لعصمة ادم

یہ عبودیت الہی میں شرک نہ تھا، اس لئے کہ آدم معصوم تھے۔

[۱] فالکناية فی جميع ذلك غير متعلقة بآدم و حواء (مجمع البيان)

مگر قرآن کی آیت کے الفاظ جعلاً لہ شرکاء ہیں جس کی تشریح میں انہوں نے یہ اضافہ کیا ہے کہ:- بتسمیہ عبدالحارث یعنی یہ اللہ کے ساتھ شریک قرار دینا اس طرح تھا کہ انہوں نے ”عبدالحارث“ نام رکھا اور اس حدیث میں جسے وہ مان رہے ہیں، آخر میں ہے:

وكان ذلك من وحى الشيطان وامره

اور یہ شیطان کی وحی اور اس کے حکم سے تھا۔

پھر اس کے صحیح تسلیم کرنے سے آدمؑ کی عصمت کیوں قائم رہ سکتی ہے جب کہ آیت کا خاتمہ اس جملہ پر ہے ”فَتَعَلَى اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ“ برتر ہے اللہ اس سے کہ جو وہ شرک کرتے ہیں۔ اب شاہ ولی اللہ صاحب کو جو بڑے محدث اور ولی مانے جاتے ہیں، کا نامہ ملاحظہ ہو، وہ فرماتے ہیں:-

مترجم گوید منطبق بر حال حوا چنانکہ در حدیث صحیح آمدہ کہ چوں حوا حاملہ شد شیطان بدلش و سو اس انداخت چوں فرزند متولد شد نام اور عبدالحارث مقرر کرد و چوں وجود جمیع قیود در امثال این مواضع ضرور نیست آدم از لوٹ شرک مبرا باشد و این آیت عصمت اور امصارمت نکند کذا فہمت۔

میں کہتا ہوں کہ یہ حوا کے حال پر منطبق ہے جیسا کہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جب حوا حاملہ ہوئیں تو شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا جب لڑکا پیدا ہوا تو نام اس کا عبدالحارث رکھا اور چونکہ تمام قیدیوں کی موجودگی ایسے مقامات پر ضروری نہیں ہے لہذا آدم شرک کے دھبے سے بری رہیں گے۔

اور یہ آیت ان کی عصمت سے نہیں ٹکرائے گی۔ میں ایسا ہی سمجھا ہوں۔

اب یہ ہر بانہم پڑھنے والا غور کرے کہ وہ خود اس سے کچھ سمجھا؟ اس کے بعد بلا فاصلہ موصوف کا پھر ارشاد یہ ہے:

فلما تغشاہا کلام علیحدہ است یعنی خدائے تعالیٰ آدم و حوا پیدا کر دو از ایشان نسل بسیار پیدا آورد و بعد از آن تفصیل انتشار نسل می فرماید۔

”جب اس (مرد) نے اس (عورت) سے مقاربت کی“ یہ الگ کلام ہے یعنی خداوند عالم نے آدم اور حوا کو پیدا کیا اور ان سے بہت سی اولاد خلق فرمائی اور اس کے بعد ان کی نسل پھیلنے کی کیفیت بیان فرمائی۔

اس کے بعد آیت کے دوسرے جز:- ”فلما اثقلت الح“ جب اس پر بار زیادہ ہوا“ پر حاشیہ لکھا ہے:

مترجم گوید این تصویر است حال آدمی را کہ نزدیک ثقل حمل نیت اخلاص درست کند و چوں فرزند بوجود آید آن را فراموش سازد و در تسمیہ اشراک کند و اینجاد انستہ شد کہ شرک در تسمیہ نو عیست اس شرک چنانکہ اہل زمان ما غلام فلاں و عبد فلاں نام می نہند“ (فتح الرحمن)

میں کہتا ہوں کہ یہ مرقع کشی ہے آدمی کی حالت کی کہ جب حمل کا بوجھ بڑھتا ہے تو اس وقت تک اپنی نیت کو خلوص کے ساتھ ٹھیک رکھتا ہے مگر جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اسے بھول جاتا ہے اور اس کے نام کے رکھنے میں شرک کرتا ہے اور یہاں سے معلوم ہوا کہ نام رکھنے میں شرک بھی ایک قسم ہے شرک کی جیسا کہ ہمارے زمانے والے فلاں کا غلام اور فلاں کا بندہ نام رکھتے ہیں۔“

یہ بعد والی تشریح پہلے سے بالکل مطابق نہیں ہے اور ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ شاہ صاحب نے پہلے وہ حاشیہ لکھا تھا جس کے آخر میں ہے: ”کدام علیحدہ است“ سے شروع ہوتا ہے۔ یہ اس حدیث کے رد کر دینے پر مبنی ہے اور بالکل ہماری درج کردہ تشریح سے جو پہلے لکھی جا چکی ہے، مطابق ہے۔

مگر پھر آخر میں جو موصوف نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک ”وہابی تصور“ کے ثابت کرنے کا نتیجہ نکالا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ غلام محمد یا عبدالحسین نام رکھنا ایک طرح کا شرک ہے، یہ فقط آیت قرآن سے تو نتیجہ نہیں نکلے گا جب تک کہ اس حدیث کو بھی قبول نہ کیا جائے جو ”عبدالحارث“ والے نام کے متعلق قبل میں درج ہوئی ہے۔ اس صورت میں مدوح کی یہ تشریح کہ ”فلما تعشوا ہما لکلا علیحدہ است“ درست نہیں ہوگی کیونکہ اس حدیث میں تو پورا قصہ حضرت آدم اور حوا ہی سے متعلق کہا گیا ہے! نسل آدم سے نہیں جیسا اب شاہ صاحب عصمت آدم کے تحفظ کے لئے تشریح فرما رہے ہیں۔ کیا یہ اضطراب بیان خود اضطراب ذہن کا ترجمان نہیں ہے؟!

ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر نے عجائب وغرائب میں مزید اضافہ فرما کر اپنے کمال علمی کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: ”بعضے کہتے ہیں حضرت آدم اور حوا پر یہ گزرا، اول جو حمل ہوا، اہلیس ایک نیک مرد کی صورت میں آیا اور ڈرا یا کہ تیرے پیٹ میں شاید کچھ بلا ہے۔ جب دونوں دعا کرنے لگے، تب یہ کہا کہ میری دعا سے یہ بلا بدل کر بیٹا ہوگا۔ اس کا نام رکھے عبدالحارث۔ حارث شیطان کا نام تھا۔ وہی کیا، اس قصہ میں پیغمبروں سے شرک ثابت ہوتا ہے، یا یہ قصہ غلط ہے۔ اس آیت میں مرد اور عورت کو فرمایا ہے۔ آدم اور حوا کو نہیں کہ اول ان کا ذکر ہو چکا۔ یا یوں کہیے کہ جو کچھ انسانوں میں ہونا مقدر تھا، وہ حضرت آدم میں اول ظہور پکڑ گیا، اس میں وہ نمونہ تقدیر تھے۔ اولاد کے گناہ ان میں نظر آئے جیسے آئینہ میں صورت، چنانچہ نفس کی خواہش اور اللہ کی بے حکمی اور کہہ کر بھول جانا اور دے کر مکر جانا، یہ سب اولاد کی خوئیں ان میں نظر آچکیں“ (موضح القرآن)

علمائے شیعہ بہر صورت اس روایت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور وہ ان کے نزدیک ضروریات دین کے خلاف ہے۔^[۱]

اس کے علاوہ بجائے خود بھی اس کی سند معتبر نہیں ہے۔^[۲]

أَيُّشِرُ كُونَ مَا لَا يُخْلِقُ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلِقُونَ ﴿١٩١﴾ وَلَا يَسْتَيْعُونَ لَهُمْ نَصْرًا وَلَا
 أَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُونَ ﴿١٩٢﴾ وَإِنْ تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَى لَا يَتَّبِعُواكُمْ ط سَوَاءٌ عَلَيْكُمْ
 أَدَعَوْهُمْ أَمْ أَنْتُمْ صَامِتُونَ ﴿١٩٣﴾

”کیا وہ شریک کرتے ہیں انہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے اور وہ خود بنائے جاتے ہیں اور نہ وہ ان کی کچھ مدد پر

[۱] فان البراہین الساطعة التي لا یصح فیہا الاحتمال ولا یتطرق الیہا المجاز والاتساع قد دلت علی عصمة الانبیاء فلا یجوز علیہم الشرک والمعاوی وطاعة الشیطان (مجمع البیان)

[۲] مطعون فی سندہ لانه یرویہ قتادة عن الحسن عن سمرة وهو مرسل لان الحسن لم یسمع من سمرة شیئا فی قول البعدادیین. (تبیان)

قدرت رکھتے ہیں اور نہ خود اپنی مدد کرتے ہیں اور اگر تم انہیں ٹھیک راستے کی طرف دعوت دو تو وہ تمہاری پیروی نہیں کریں گے، تمہارے لئے برابر ہے خواہ تم انہیں دعوت دو یا تم چپکے رہو۔“
 ”انہیں ٹھیک راستے کی طرف دعوت دو، وہ تمہاری پیروی نہیں کریں گے“ یہ مشرکین یعنی ان اصنام کی عبادت کرنے والوں کے لئے بھی ہو سکتا ہے جیسے دوسری جگہ ہے۔

وَسَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٥﴾

ان پر یکساں ہے، آپ انہیں متنبہ کیجئے یا آپ انہیں متنبہ نہ کیجئے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ (یسین)
 ایک قول اس کے موافق ہے [۱] چونکہ اس کے قبل کی ضمیریں معبودان باطل یعنی اصنام کی طرف راجع ہیں، اس لئے دوسرے لوگوں نے بعد والی ضمیروں کا مرجع بھی انہی کو قرار دیا ہے [۲] اور مطلب یہ لیا ہے کہ کسی بھی کام کو ان سے کہو تو وہ چونکہ ایسے بے حس و حرکت ہیں، نہ تمہاری سنیں گے اور نہ اس پر عمل کریں گے۔

إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَلُكُمْ فَادْعُوهُمْ فَلْيَسْتَجِيبُوا

لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٦﴾

”یقیناً یہ جن کو تم پکارتے ہو اللہ کو چھوڑ کر، وہ تمہارے ایسے اللہ کے بندے ہیں، اچھا تو پکارے جاؤ، تب جانیں کہ وہ تمہاری حاجت براری کریں، اگر تم سچے ہو۔“

پکارنے سے مراد بحیثیت معبودان کی دہائی دینا ہے [۳] اس لئے شاہ ولی اللہ نے ترجمہ بھی کیا ہے کہ ”کسانیکہ عبادت می کنید ایشان را“
 اس بنا پر اگر معبود حقیقی اللہ کو مانتے ہوئے صرف سبب مجازی اور ذریعہ ظاہری ہونے کی حیثیت سے کسی کو پکارے اور اس سے مدد کا خواستگار ہو تو وہ اس آیت کے تحت میں داخل نہ ہوگا۔

أَلَهُمْ آزِجُلٌ يَّمْسُونَ بِهَا ۚ أَمْ لَهُمْ آعِينٌ

يُبْصِرُونَ بِهَا ۚ أَمْ لَهُمْ أَذَانٌ يَّمْسَعُونَ بِهَا ۗ قُلِ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ

كَيْدُونَ فَلَا تَنْظُرُونَ ﴿١٧﴾

”کیا ان کے پیر ہیں جن سے وہ چلتے ہوں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ جھپٹ کر کچھ اٹھائیں [۴] یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہوں یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہوں؟ کہئے کہ تم پکارو اپنے تمام شریکوں کو پھر

[۱] عن الحسن (مجمع البيان)

[۲] ای الاصنام (جلالین) لا لها جمادات لا تفقه ولا تعقل (تبیان)

[۳] یرید تدعونہم الہة (مجمع البيان)

[۴] معنی البطش التناول والاخذ بشدة (مجمع البيان)

میرے خلاف کاروائی کرو کہ مجھے مہلت بھی نہ دو۔“

اس آیت کے مضمون سے ظاہر ہے کہ یہ سب بتوں کے متعلق کہا گیا ہے [۱] اور مخاطب وہی ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر ان معبودانِ باطل کی پرستش کرتے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ تمہارے ہاتھ، پیر، کان، آنکھیں تو ہیں جن سے اپنے مطلب کے لئے سہی کام لیتے ہو اور جن کی تم عبادت کرتے ہو، ان کے تو یہ سب بھی نہیں ہے، اس لئے وہ تم سے بدتر ہیں، پھر کتنی بڑی بے عقلی ہے کہ تم انہیں اپنا معبود بنائے ہوئے ہو۔ [۲]

إِنَّ وَلِيَ اللَّهِ الذِّمَى نَزَلَ الْكِتَابَ ۗ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ ﴿۱۹۶﴾ وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُونَ نَصْرَكُمْ وَلَا أَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُونَ ﴿۱۹۷﴾ وَإِنْ تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَى لَا يَسْمَعُوا ۗ وَتَرَاهُمْ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ ﴿۱۹۸﴾

”یقیناً میرا ولی [۳] اللہ ہے جس نے یہ کتاب [۴] اتاری ہے اور وہ سر پرستی کرتا ہے نیک اعمال لوگوں کی اور جنہیں تم پکارتے ہو اسے چھوڑ کر وہ تمہاری مدد پر قدرت نہیں رکھتے اور نہ خود اپنی ہی مدد کرتے ہیں اور اگر انہیں ٹھیک راستے کی طرف دعوت دو تو وہ نہیں سنیں گے اور دیکھو گے انہیں [۵] کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں، حالانکہ انہیں دکھائی نہیں دیتا۔“

صورت تو بتوں کی آدمیوں ہی کی طرح کی بنائی جاتی تھی تو دور سے دیکھتے تو معلوم ہوگا کہ وہ آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں [۶] مگر وہ تو پتھر، لوہے وغیرہ کی آنکھ ہے، اس میں بینائی تھوڑی ہے۔

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ ﴿۱۹۹﴾ وَإِنَّمَا يَنْزِعُكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْعٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۗ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۰۰﴾

”معاف کرنے کا وتیرہ اختیار کیجئے اور نیکو کاری کا حکم کیجئے اور جاہلوں سے بے اعتنائی کیجئے اور اگر شیطان کی طرف سے آپ کو کچھ بھڑکانے کی کوشش ہو تو اللہ سے پناہ مانگئے، یقیناً وہ بڑا سننے والا ہے، جاننے والا۔“

یہ جاہل کون ہوتے ہیں؟ وہ جو برائیوں پر تشبیہ سن کر بجائے قائل ہونے کے لڑنے لگتے ہیں، ان کی طرف سے جو سخت کلامی یا دشنام طرازی ہو چکی، اس کے لئے معاف کرنے کی ہدایت ہوئی کہ اب اس کے بدلے کا کوئی خیال رکھنا نہ چاہیے۔ یہ ”گزشتہ راصلوات“ ہے اور آئندہ

[۱]. الهم... ای لہو لاء الا صنمہ (مجمع البیان)

[۲]. فیکف یجوز لکم ان تتخذوها الہة (تبیان)

[۳]. یتولی امورى (جلالین)

[۴]. القرآن (جلالین)

[۵]. حی بیینی بتان را (شاه ولی اللہ)

[۶]. تراہم فاتحة اعینہم نحو کم علی ما صورتم علیہ من الصور (تبیان)

کے واسطے ”احتیاط“ کا حکم یوں دیا گیا کہ ”ان سے بے اعتنائی کیجئے“ یعنی اب عمومی حیثیت سے نیوکاری کی ہدایت کرتے رہیے مگر ایسے جاہلوں کو مخاطب کر کے نصیحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے مگر یہ معاف کرنا اور پھر بے اعتنائی کرنا ایک جہاد نفس کی منزل ہے، کچھ آسان تھوڑی ہے۔ بعض وقت طبیعت آمادہ کرتی ہے کہ اپنا اور ان کا خون ایک کر دیا جائے۔ اسی طبیعت کی تحریک کو کہا گیا کہ اگر شیطان کی طرف سے بھڑکانے کی کوشش ہو تو اللہ سے پناہ مانگئے یعنی ضبط نفس سے کام لیجئے اور اللہ کی توفیق کو رفیق راہ بنائیے اور اشتعال سے کام نہ لیجئے۔

”خدا سننے والا ہے اور جاننے والا“ یعنی اس ہدایت حق میں جو زخم زبان آپ کو پہنچتے ہیں، اللہ انہیں سنتا ہے اور جو کچھ آپ کے ساتھ بدسلوکی ہوتی ہے، اسے وہ جانتا ہے [۱] اس لئے آپ کے صبر و تحمل کی جزا بھی اس کے یہاں ہے اور ان ظالموں کی سزا بھی اس کے ذمہ ہے۔ ہم نے جو ترجمہ کیا ہے اور جو تشریح لکھی ہے، وہ اس پر مبنی ہے کہ عفو کے معنی معاف کرنے کے ہیں مگر علامہ طبرسی نے اس قول کو سب سے آخر میں درج کیا ہے [۲] اور سب سے پہلے جو غالباً ان کے مختار کی حیثیت رکھتا ہے، یہ قول ہے کہ یہ ”عفو“ کا لفظ اس آیت میں ویسا ہے، جیسے دوسری آیت ہے:

”وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ۗ قُلِ الْعَفْوَ“

اس ”عفو“ کے معنی ہوتے ہیں ”ضرورت سے فاضل مال“ اس صورت میں یہاں مطلب یہ ہوگا کہ لوگوں سے ان کی ضرورتوں سے فاضل جو مال ہو، وہ لیجئے۔ [۳]

مگر ہمیں پہلا مفہوم خود آیت کے الفاظ اور سیاق مضمون آیات کے لحاظ سے زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طِيفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ

مُبْصِرُونَ ﴿۲۱﴾ وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوهُمْ فِي الضَّيْقِ ثُمَّ لَا يُقْصِرُونَ ﴿۲۲﴾

”جو پرہیزگار ہیں، جب انہیں شیطان کی طرف کا کوئی خیال پیدا ہوتا ہے تو فوراً ہوشیار ہو جاتے ہیں [۴] اور ایک دم ان کی بصیرت تازہ ہو جاتی ہے اور جو ان کے بھائی بند ہوتے ہیں، وہ انہیں گمراہی میں کھینچتے ہیں، پھر کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔“

”ان کے بھائی بند“ یعنی شیطانوں کے حوالی موالی جو ہیں [۵] وہ خوب شیطانوں کے قبضہ میں آجاتے ہیں۔

مطلب بہر حال یہی ہے، خواہ ہم کی ضمیر کافروں کی طرف پھیری جائے حالانکہ ان کا کسی طرح بھی پہلے ذکر نہیں ہے یا شیطانوں کی طرف جن کا جنس شیطان کی شکل میں پہلے ذکر موجود ہے۔

[۱] سمیع بالقول علیہم بالفعل (جلالین)

[۲] قیل العفو هو قبول العذر عن المعتذر وترك المواءمة بالسوء (مجمع البیان)

[۳] ای خذ یا محمد ما عفا من اموال الناس ای ما فضل عن النفقة (مجمع البیان)

[۴] تذکروا فوا علیہم من العقاب بذلك فیجتنبونہ ویترونہ (تبیان)

[۵] ای اخوان الشیاطین میں الکفار (جلالین)

”کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے“، یعنی مکمل گمراہی کا سامان کر کے انہیں ہلاکت ابدی میں مبتلا کر کے رہتے ہیں۔^[۱]

وَإِذَا لَمْ تَأْتِهِمْ بآيَةٍ قَالُوا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِنْ

رَبِّي ۗ هَذَا بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۴۲﴾

”اور جب کوئی خاص معجزہ ان کے سامنے پیش نہ کیجئے تو وہ کہتے ہیں کہ آپ نے اسی کو کیوں منتخب نہ کیا؟ کہہ دیجئے کہ میں تو بس اس کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس پروردگار کی طرف سے پیغام پہنچتا ہے، یہ کھلی ہوئی نشانیاں ہیں تمہارے پروردگار کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ان کے لئے جو ایمان لائیں۔“

اس آیت کے مضمون سے ظاہر ہے کہ ان کے سامنے معجزات خالق کی طرف سے پیش ہوتے تھے مگر وہ اپنے فرمائشی کسی معجزہ پر اصرار کرتے تھے^[۲] اس پر جواب یہ دیا گیا ہے کہ میں تو وحی الہی کا پابند ہوں اور تمہارے سامنے اتنے معجزات پیش ہو چکے ہیں جو اتمام حجت کے لئے کافی ہیں، اس کے بعد یہ ضروری نہیں کہ تم جو کہتے ہو، وہی معجزہ تمہیں ضرور دکھلایا جائے، اس پر مقدمہ تفسیر میں ہم نے کافی روشنی ڈالی ہے۔
تعب ہے کہ بعض مترجمین کو اس آیت کا مفہوم سمجھنے میں دقت ہوئی ہے اور انہوں نے عجیب عجیب ترجمے کئے ہیں^[۳] جس میں قبل کے بعض مفسرین کی تولیدہ بیانیوں کا بھی دخل ہے۔^[۴]

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿۴۳﴾

”اور جب قرآن پڑھا جائے تو توجہ سے سنو^[۵] اور خاموش رہو، شاید کہ رحمت تمہارے شامل حال ہو۔“

قرآن کی تلاوت کے وقت خاموشی کا حکم

یہ ہدایت ہے مسلمانوں کے لئے اسی لئے جس طرح قرآن کا پڑھنا عبادت ہے اسی طرح اس کا سننا بھی عبادت ہے۔
یہ قرآن مجید کی ایک طرح کی بے احترامی ہے کہ قرآن با آواز پڑھا جا رہا ہو اور لوگ ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف رہیں۔
ایک صورت وہ ہے جس میں خاموشی سے سننا واجب ہے اور وہ نماز جماعت میں ماموم کے لئے جب امام حمد و سورہ پڑھ رہا ہو، اس لئے

[۱]. لا يقصرون عن استغوائهم (تبیان)

[۲]. بآية يقترحوها (تبیان)

[۳]. چون نمی آوری نزدیک ایشان آیتی می گویند چرا از طرف خود انشائی کنی (شاه ولی اللہ) اور جب نہ لاتا تو ان کے پاس نشانی کہتے ہیں کیوں نہ کھینچ لایا تو اس کو (شاه فیج الدین)

[۴]. هلا اجتبیتهما معناه اختلقتها وافتعلتها من قبل نفسک فی قول الزجاج والقراء... وفی روایة اخرى عن ابن عباس وقتادة معناه هلا اخذتہا من ربک وتقبلتہا منه (تبیان)

[۵]. النصات السکوت مع استماع (مجمع البیان)

بعض مفسرین کا رجحان یہ ہے کہ اس آیت سے یہی صورت مراد ہے [۱]

ہماری قدیم تفسیر بھی اس کے مطابق ہے [۲]

مگر آیت کو جس انداز سے ختم کیا گیا ہے ”شاید کہ رحمت تمہارے شامل حال ہو“..... اس سے اس حکم کا وجوبی ہونا ذہن میں نہیں آتا لہذا کیوں نہ اسے حکم استجبائی سمجھا جائے جس کے بعد حالت نماز کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے، یہ ایک تہذیب اسلامی کی تعلیم ہے جس کا قرآن مجید کی شان و جلالت کے پیش نظر تاکید حکم ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت بھی اس کے مطابق ہے۔ [۳]

وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَدُؤُنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ

وَالْأَصَالِ وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِينَ ﴿۴۵﴾

”اور اپنے پروردگار کو یاد کرو اپنے دل میں بھی گڑ گڑاہٹ کے ساتھ اور ڈری سہمی حالت میں اور زبان سے بھی ایسی آواز سے جو زیادہ اونچی نہ ہو [۴] صبح اور شام اور غفلت کرنے والوں میں سے نہ ہو۔“

حدیث معصوم سے پتہ چلتا ہے..... کہ ذکر الہی کی مختلف حالتوں کے اعتبار سے مختلف صورتیں ہیں۔ پہلا جز کہ دل ہی دل میں یاد کرو یعنی زبان سے کچھ پڑھو ہی نہیں، یہ حالت جماعت میں ماموم کے لئے ہے کہ امام کو سورے پڑھنے کا حکم ہے اور ماموم کو خاموش رہنے کا [۵] اور بعد والی صورت امام جماعت یا فردی نماز پڑھنے والے کے لئے ہے کہ اسے نماز آواز سے پڑھنا چاہیے مگر زیادہ چیخ چیخ کر نہیں جو شانِ خضوع و خشوع کے خلاف ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيَسَبِّحُونَهُ وَلَهُ يَسْجُدُونَ ﴿۴۶﴾

”یقیناً جو تمہارے پروردگار سے نزدیک ہیں، اس کی عبادت سے سرکشی نہیں کرتے اور اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوتے ہیں۔“

”جو پروردگار سے نزدیک ہیں“ یعنی فرشتے [۶]

ان کے کردار کو پیش کرتے ہوئے انسانی شرافت کو غیرت دلائی گئی ہے کہ اسے کب زیبا ہے کہ اس کی عبادت میں کوتاہی کرے۔ قرآن مجید میں یہ پہلا مقام ہے جہاں سجدہ وارد ہوا ہے مگر فقہ اہل بیت کرام علیہم السلام میں یہ سجدہ واجب نہیں ہے۔ [۷]

[۱] لانہ لا حال یجب فیہا الانصات لقراءة القرآن الاحال قراة الامام فی الصلوٰۃ (تبیان)

[۲] یعنی فی الصلوٰۃ اذا سمعت قراة الامام الذی تأتمر بہ فانصت (علی بن ابراہیم)

[۳] عن ابی عبد اللہ انہ فی حال الصلوٰۃ وغیرہا وذلک علی وجہ الاستحباب (تبیان)

[۴] فوق المسردون الجهر من القول ای قصد ابینہا (جلالین)

[۵] روی زرارة عن احدهما: قال معناه اذا كنت خلف الامام متأتمر به فانصت وسبح في نفسك (مجمع البيان)

[۶] هم الملائكة (مجمع البيان)

[۷] هذه اول سجدة القرآن وهي عندنا مستحبة غير واجبة (تبیان)

سُورَةُ الْأَنْفَالِ

مکیہ ۵ آیات

سورۃ انفال کے خاص خاص مضامین

اس سورہ کی ابتدائی چونکہ انفال کے بیان سے ہوئی ہے جس کے معنی ابھی پہلی آیت کے ذیل میں لکھے جائیں گے، اس لئے اس سورہ کا انفال نام ہوا۔ اس کے علاوہ جو خاص امور اس سورہ میں درج ہوئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

- ۱۔۔۔۔۔ جنگ بدر کا پس منظر
- ۲۔۔۔۔۔ فرشتوں کا میدان بدر میں اترا نہی نہیں بلکہ جنگ کرنا۔
- ۳۔۔۔۔۔ میدان جنگ سے فرار کا باعثِ دوزخ ہونا۔
- ۴۔۔۔۔۔ ہجرت کے موقع پر حفاظتِ رسول ﷺ کے لئے خداوندی تدابیر کی طرف اشارہ۔
- ۵۔۔۔۔۔ وجود رسول ﷺ مانعِ نزولِ عذاب۔
- ۶۔۔۔۔۔ خمس کا صریح حکم۔
- ۷۔۔۔۔۔ تنازعِ باہمی کے خراب نتائج پر انتباہ۔
- ۸۔۔۔۔۔ جہاد کی تیاری اور رباط کا حکم۔
- ۹۔۔۔۔۔ مخالفین کے ساتھ صلح کا حکم
- ۱۰۔۔۔۔۔ ایک اور دس کے مقابلہ کی دعوت پر مسلمانوں کی کمزوری کا ثبوت اور پھر ایک اور دو کے مقابلہ کا کم سے کم حکم۔
- ۱۱۔۔۔۔۔ قیدیوں کے بارے میں الہی منشا کا اعلان وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ ۗ قُلِ الْأَنْفَالُ لِلَّهِ وَالرَّسُولِ ۗ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَصْلِحُوا

ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۗ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ①

”آپ سے پوچھتے ہیں انفال کے متعلق، کہیے کہ انفال اللہ کے لئے ہیں اور پیغمبر کے لئے لہذا غضبِ خدا سے ڈرو

اور اپنے درمیانی تعلقات کی اصلاح کرو اور اللہ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرو، اگر تم ایمان والے ہو۔“

انفال کے متعلق حکم خداوندی

انفال کے معنی اموال غنیمت کے کہے گئے ہیں [1]

شاہ ولی اللہ نے اس سورہ کی شان نزول لکھی ہے کہ وہ غزوہ بدر کے بعد نازل ہوا ہے:

مسلمانان در غنیمت مباحثہ می کردند آنانکہ غارت کردہ بودند خواستند کہ تنہا بران متصرف شدند دیگران خواستند علی السویہ قسمت شود خدائے تعالیٰ نازل ساخت کہ متصرف و مختار غنائم خدا و رسول اوست و دیگری را دریں باب دخل نیست و انچہ اہل جاہلیت می کردند از استیثار غارت کنندہ بغنیمت باطل است بعد از ان حکم فرمود کہ غنیمت را پنج قسم باید کرد چہار قسم در میان غانمان قسمت کنند و یکی در بیت المال نگاہ داشتہ بمصرف آن رسانند و این تصرف حق است و عطای اوست بغیر دخل غارت کنندگان پس آیہ قل لله و الرسول محکم است غیر منسوخ. (فتح الرحمن)

مسلمان غنیمت کے بارے میں باہم بحث کر رہے تھے، جنہوں نے لوٹا تھا انہوں نے چاہا کہ اس پر وہ اکیلے قابض ہوں، دوسروں نے چاہا کہ برابر سے تقسیم ہو، خداوند عالم نے یہ حکم اتارا کہ اموال غنیمت پر قابض و متصرف اور صاحب اختیار خدا اور رسول ہیں اور کسی دوسرے کو اس بارے میں کوئی دخل نہیں ہے اور جو مانہ جاہلیت والے کرتے تھے کہ لوٹنے والے کو مال غنیمت پر قبضہ میں ترجیح دیں، وہ غلط ہے اس کے بعد حکم دیا کہ مال غنیمت کے پانچ حصے کرنا چاہئیں، چار حصے غنیمت حاصل کرنے والوں میں تقسیم کئے جائیں اور ایک بیت المال میں محفوظ رکھا جائے اور پھر مناسب موقع پر صرف ہو اور یہ حق تعالیٰ کا اختیار ہے اور اس کی عطا ہے جس میں لوٹنے والوں کا کوئی دخل نہیں لہذا یہ آیت کہ ”انفال اللہ کے لئے ہیں اور پیغمبر کے لئے“ برقرار ہے اور منسوخ نہیں ہوئی ہے۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”جنگ میں بعض آگے بڑھے اور بعض پشت پر رہے جب غنیمت جمع ہوئی، بڑھنے والوں نے کہا یہ حق ہمارا ہے کہ فتح ہم نے کی اور پشت والوں نے کہا کہ ہماری ہی قوت سے لڑے۔ حق تعالیٰ نے دونوں کو خاموش کیا کہ فتح اللہ کی مدد سے ہے اور کسی کی پیش نہیں جاتی، سو مالک اللہ ہے اور نائب اس کا رسول ہے۔ پھر آگے بہت دور تک یہی بیان فرمایا کہ فتح اللہ کی مدد سے ہے۔ اپنی قوت نہ سمجھو۔“ (موضح القرآن)

بعض مفسرین یہ اختلاف جو انوں اور بوڑھوں کے درمیان کا بتاتے ہیں:

لما اختلف المسلمون في غنائم بدر فقال الشبان هي لنا لاننا باشرنا القتال وقال الشيوخ كنا ردء لكم تحت الرايات ولو انكشفتهم لفتحتم الينا فلا نستأثر واهبنا نزل (جلالین)

جب مسلمانوں کے درمیان جنگ بدر کے اموال غنیمت میں اختلاف ہوا کہ جوانوں نے کہا کہ یہ سب ہمارا ہے اس لئے کہ ہم نے

[1]۔ جی پر سند ترا از غنیمتہا (شاہ ولی اللہ) سوال کرتے ہیں تجھ کولوٹوں سے (شاہ فہج الدین)

جنگ کی ہے اور بڑھوں نے کہا کہ ہم تمہاری پشت پناہ تھے اور اگر تم میدان سے ہٹتے تو پلٹ کر ہمارے پاس پناہ لیتے تو ان اموال میں تم اپنے کو مقدم نہ کرو تو یہ آیت نازل ہوئی۔

مذکورہ بالا مندرجات سے جمہور کے درمیان کی پریشان خیالی ظاہر ہے مگر ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے ارشادات نے انفال کے اقسام پر کافی بسط و تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے [۱] اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انفال حسب ذیل قسم کی چیزیں ہیں:

(۱) جو مال دارالحرب سے بغیر جنگ حاصل ہو۔

(۲) وہ زمین جس کے مالک بغیر لڑے اسے چھوڑ کر چلے جائیں۔

(۳) لاوارث شخص کا ترکہ۔

(۴) جنگل، میدان اور پہاڑوں کی چوٹیاں وغیرہ، غرض جن چیزوں کا کوئی خاص انسان مالک نہیں ہے۔ یہ سب ملک خدا ہونے کے

لحاظ سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے بعد امام کا حق ہے جس میں عام مسلمانوں کا کوئی حق نہیں ہے۔ آیت کے بعد کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ عام مسلمان اس سلسلہ میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نزاع کر رہے تھے جس پر سختی کے ساتھ متنبہ کیا گیا ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَّتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تَلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَةُ
رَأَدْتَهُمْ إِيْمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿۲﴾ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَهِمَّا
رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ﴿۳﴾ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۖ لَهُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ
وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿۴﴾

”خاص ایمان والے تو بس وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر ہو جائے تو ان کے دل سہم جاتے ہیں اور جب اس کی آیتوں کی تلاوت ان کے سامنے ہو جائے تو وہ ان کے ایمان میں اضافہ کا باعث ہوتی ہیں اور اپنے پروردگار پر وہ بھروسہ رکھتے ہیں، جو نماز ادا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں عطا کیا ہے، اس میں سے خیرات کرتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جو خاص ایمان والے ہیں۔ ان کے لئے مرتبے ہیں ان کے پروردگار کے یہاں اور بخشش ہے اور عزت والی روزی ہے۔“

قرآن مجید نے اہل ایمان کا جو معیار پیش کیا ہے وہ ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے اور جتنا کوئی اس سے قریب ہوگا، اتنا اس کے ایمان کا درجہ سمجھا جائے گا لہذا قرآن مجید کی اس آیت سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ جس میں یہ اوصاف بحکم الوجود نہ ہوں، وہ ایمان کا کوئی حصہ رکھتا ہی نہیں۔ [۲]

[۱] صحت الرایة عن ابی جعفر و ابی عبد اللہ علیہما السلام (مجمع البیان)

[۲] ہذا صفات خیيار المؤمنین و افاضلہم... فلا تدل علی ان من کان دوہم فی المنزلۃ خارج عن الایمان (مجمع البیان)

كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۖ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكُرْهُوْنَ ۝٥

يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُونَ ۝٦

”جیسا کہ نکالا آپ کو آپ کے پروردگار نے آپ کے گھر سے بالکل صحیح [۱] اور ایک جماعت مسلمانوں میں کی اسے ناپسند کر رہی تھی۔ آپ سے صحیح طریقہ کار کے بارے میں جب کہ وہ ظاہر ہو گیا تھا وہ بحث کر رہے تھے گویا کہ وہ موت کی طرف لے جائے جا رہے ہوں [۲] اس حال میں کہ وہ دیکھ رہے ہیں۔“

”جیسا کہ“ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ انفال کے بارے میں اللہ کا فیصلہ اسی طرح ہے جیسا کہ ابتدا میں اس کا اس مہم یعنی بدر کی جنگ کے لئے آپ کو آپ کے گھر یعنی مدینہ سے [۳] نکالنا حق تھا اور اس موقع پر بھی جمہور نے اختلاف کیا تھا مگر اللہ نے ان کی رائے پر عمل نہیں کیا اور اس وقت بھی ان میں سے بہت لوگ اس فیصلہ سے متفق نہیں ہیں، مگر اللہ کو اس کی پرواہ نہیں ہے [۴] کاش جمہور اس کے بعد محسوس کرے کہ حکم خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں رائے جمہور کوئی چیز نہیں ہے۔

وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللَّهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشُّوْكَةِ

تَكُونُ لَكُمْ وَيُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ ۝٧ لِيُحِقَّ

الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ۝٨

”اور جب اللہ تم لوگوں سے وعدہ کر رہا تھا دونوں گروہوں میں سے ایک کا کہ وہ تمہارے لئے ہے اور تم لوگ خواہش رکھتے تھے کہ جو فوجی ساز و سامان والا نہیں ہے، وہ تمہارے حصہ میں آئے اور اللہ یہ چاہتا تھا کہ اپنے احکام کے تحت حق کو ثابت کر دے اور کافروں کی اصل نسل کو ختم کر دے تاکہ وہ اپنی باتوں سے حق کو ثابت کر دے اور باطل کو نیست و نابود کر دے چہرے بد اعمال لوگ کتنا ہی ناپسند کرتے ہوں۔“

جنگ بدر کا پس منظر

ایک طرف تو تجارتی قافلہ آ رہا ہے اور دوسری جانب سے ابوسفیان فوج لئے ہوئے آ رہا تھا۔ خالق نے خبر دی تھی کہ تم لوگ مدینہ سے نکلو

[۱] بتدبیر درست (شاہ ولی اللہ)

[۲] ہانکے جاتے ہیں طرف موت کے (شاہ رفیع الدین)

[۳] بیتناکیر ادبہ المدینة اخر جہ اللہ الی بدر۔ (تبیان)

[۴] یعنی کار در قسمت غنائم بر موافق حکم خدا است، نہ موافق ازوی نفوس چنان کہ بیرون آمدن بتدبیر درست بود و از نزدیک خدا بر خلاف ارادۃ قوم (فتح الرحمن) یعنی غنیمت کا جھگڑا بھی ویسا ہی ہے جیسا نکتے وقت عقل کی تدبیریں کرنے لگے اور آخر صلاح وہی نکلی جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو ہر کام میں یہی اختیار کرو کہ حکم برداری میں اپنی عقل کو دخل نہ دو۔ (موضح القرآن) ای ہذا الحالة فی کراہتہم لہا مثل اخر اجک فی حال کراہتہم و قد کان خیر الہم فکذا لک ایضا (جلالین)

گے تو ان میں کے ایک سے تمہاری مڈ بھیڑ ہوگی [۱] اس پر خود غرض اور پست ذہنیت والے مسلمان یہ سبز باغ دیکھنے لگے کہ وہ تجارتی قافلہ ہمارے ہاتھ آئے گا اور ہم اس کے سامان تجارت پر قابض ہو جائیں گے۔

قرآن نے اس کی نسبت صیغہ جمع کے ساتھ عام مسلمانوں کی طرف دی ہے، کہیں اس میں یہ نہیں ہے کہ رسول خدا ﷺ قافلہ کو لوٹنے کے لئے مدینہ سے نکلے تھے مگر اسے کیا کیا جائے کہ دشمنان اسلام کا ذکر نہیں شاہ ولی اللہ صاحب تک یہ لکھتے ہیں کہ:

”در این آیات تعریض است بآن قصد کہ آنحضرت ﷺ در غزوة بدر برای غارت کردن کاروان قریش متوجه شد“ (فتح الرحمن)

کلام الہی کا انداز بالکل اس کے خلاف ہے اور ان دنیا طلب مسلمانوں کی تمبیہ ایسے انداز میں ہے جس سے ان کی مذمت نمایاں ہے بلکہ آخری فقرہ بھی ”چاہے بد اعمال لوگ کتنا ہی ناپسند کرتے ہوں“ انہی لوگوں سے متعلق معلوم ہوتا ہے جو قافلہ کے ہاتھ آنے کی خواہش رکھتے تھے اور فوج سے مقابلہ کو ناپسند کرتے تھے، اگرچہ عام تفسیروں نے اسے کفار و مشرکین سے متعلق کر دیا ہے [۲] حالانکہ مشرکین کو ناگواری تو اس قافلہ کے مسلمانوں کے ہاتھ آجانے پر زیادہ ہوتی بلکہ ان کا عین مقصد یہی تھا کہ قافلہ مسلمانوں کے ہاتھ نہ آئے بلکہ فوج کا مقابلہ ہو جائے۔ یہ اور بات ہے کہ نتیجہ اس مقابلہ کا ایسا نکلا جو ان کی مرضی کے خلاف تھا مگر یہاں تو نتیجہ کا نہیں اصل اس مقابلہ کا ذکر ہے لہذا یہاں مجرمین سے مراد یہی مسلمان ہو سکتے ہیں جو قافلہ کے لوٹنے کے خیال میں تھے۔

اِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابْ لَكُمْ اِنِّي هُمُّدُكُمْ بِاَلْفِ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ

مُرْدِفِيْنَ ۙ

”جب کہ تم لوگ اپنے پروردگار سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمہاری التجا قبول کی کہ میں تمہیں مدد دوں گا ہزار فرشتوں کے ساتھ جس کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہے گا۔“

یعنی ان ہزار ہی پر مدد ختم نہیں ہو جائے گی بلکہ یہ پہلی قسط ہوگی جس کے بعد اس میں اور اضافہ ہوگا۔ [۳]

وَمَا جَعَلَهُ اللهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِيَتَّطَمِئِنَّا بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ

اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۙ

”اور اسے نہیں قرار دیا ہے اللہ نے مگر خوشخبری کے طور پر اور اس لئے کہ اس سے تمہارے دلوں کو اطمینان ہو اور فتح و نافر نہیں ہے مگر اللہ کی طرف سے یقیناً اللہ زبردست ہے، بالکل صحیح کام کرنے والا۔“

[۱]. المعجمون المشركون (جلالین)

[۲]. المعجمون المشركون (جلالین)

[۳] متتابعین یردف بعضهم بعضا و عدھم بہا اولائم صارت ثلاثة الاف ثم خمسة كما فی ال عمران (جلالین) یعنی یک ہزار بودند

بعد از ان سہ ہزار گشتند و بعد از ان پنج ہزار شدند (فتح الرحمن)

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی اصول نہیں ہے کہ ہمیشہ فرشتے آ ہی جایا کریں۔ یہ تو اس دفعہ ہو گیا کہ تمہارے دلوں کو تقویت ہو جائے مگر آئندہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ایسا ہو اور اصل فتح و ظفر عطا کرنے والا تو خداوند عالم ہے۔ فرشتے بھی صرف ایک ظاہری ذریعہ ہی ہیں اور فرشتوں سے کام لینا بھی ہوتا اتنی تعداد کی ضرورت نہیں۔ ایک فرشتہ حکم الہی سے ایک قوم کو تباہ کرنے کے لئے کافی ہے۔^[۱]

بعض لوگوں نے اس خوشخبری اور تقویت قلب کے لفظ سے یہ عجیب نتیجہ نکالا کہ فرشتوں کا آنا جانا اصل میں کچھ نہیں ہے۔ یہ بس مسلمانوں کی تقویت قلب کے لئے ایک سامان تھا کہ فرشتوں کے آنے کا اعلان کر دیا گیا۔ حالانکہ اگر اللہ کی خوشخبری معاذ اللہ ایسی ہوا کرے کہ اسے واقعیت سے کوئی لگاؤ نہ ہو، بس دل کے بہلاوے کا ایک سامان ہی ہو تو اس سے وہ تقویت قلب کا مقصد ہی کہاں پورا ہوگا اور پھر وہ خوشخبری کب ہوگی۔ وہ تو دل کی تسلی ہوگی جو شان الہی کے بالکل خلاف ہے۔

خدا ہی آج کل کے روشن خیالوں کو ہدایت فرمائے کہ وہ روشن خیالی کی دُھن میں اتنے تو مدہوش نہ ہوں کہ ان کو خود خبر نہ ہو کہ جو وہ کہہ رہے ہیں، اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟

اِذْ يُغَشِّبُكُمُ التُّعَاسُ اَمْنَةً مِنْهُ وَيُنْزِلُ عَلَيْكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُمُ
بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰی قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهٖ
الْاَقْدَامَ ۝۱۱

”جب کہ وہ تم پر نیند غالب کر رہا تھا، اپنی طرف سے سکون دل کے لئے اور اتار رہا تھا تم پر آسمان سے پانی کہ اس سے تمہاری طہارت کا سامان کرے اور تم سے شیطان کی نجاست کو دور کرے اور اس لئے کہ تمہارے دلوں میں قرار پیدا کرے“^[۲] اور اس کے ذریعے سے قدموں کو جمادے۔“

مفسرین لکھتے ہیں کہ جنگ بدر میں بہت سے مسلمانوں کو غسل کی ضرورت تھی مگر پانی تھا نہیں کہ وہ غسل کریں اور اس لئے ان کے دلوں میں یہ وسوسا ہو رہا تھا کہ آج رنگ اچھا نہیں اور ہمیں شکست سے دوچار ہونا پڑے گا اور زمین نرم تھی جس سے پیر چلنے میں دھنسے جا رہے تھے مگر صبح جو ہوئی تو خوب بارش ہو گئی جس کے پانی سے انہوں نے غسل کیا، اس سے ذہن کو یکسوئی ہوئی تو نیند آگئی اور اس طرح ان کے دلوں کا وسوسہ بالکل دور ہو گیا اور سکون قلب حاصل ہو گیا۔^[۳]

ثبات قدم خود ہی سکون قلب کا اثر ہوتا ہے، پھر یہ کہ بارش کے اثر سے زمین سخت ہو گئی جس سے پاؤں زمین پر جمنے لگے اور ریت میں جو دھنسے جاتے تھے، وہ بات جاتی رہی^[۴] بلکہ دشمنوں کی طرف کی زمین جو پہلے ذرا سخت تھی، وہاں کچھڑ ہو گئی۔^[۵]

[۱]. كما فعل جبريل بقوم لوط فاهلكهم (مجمع البيان)

[۲]. به بندد بردل شما یعنی ثابت دارد دلہارا (شاہ ولی اللہ)

[۳]. فشر یواوا غتسلوا ذہب بہ وسوسۃ الشیطان (تبیان)

[۴]. یثبت بہ الاقدام ان تسوخ فی الرمل (جلالین)

[۵]. تلبدت بہ ارضہم واولحت ارض عدوہم (مجمع البيان)

إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنْي مَعَكُمْ فَثَبَّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۗ سَأَلْتَنِي فِي قُلُوبِ
الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْبِرُّوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْبِرُّوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴿١٤﴾
ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۗ وَمَنْ يُشَاقِقِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ
الْعِقَابِ ﴿١٥﴾ ذَلِكُمْ فَذُقُوهُ وَأَنَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابَ النَّارِ ﴿١٦﴾

”جب کہ تمہارا پروردگار خطاب فرما رہا تھا فرشتوں کو کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم ثبات قدم پیدا کرو ان میں جو ایمان لائے ہیں، بہت جلد ایسا ہوگا کہ میں کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا تو تم ان کی گردنوں پر ضربیں لگاؤ اور ہر ہر پور پر ضرب لگاؤ، یہ اس لئے ہے کہ انہوں نے مقابلہ کیا اللہ اور اس کے پیغمبر سے اور جو اللہ اور اس کے پیغمبر سے مقابلہ کرے گا تو بلاشبہ اللہ سخت سزا والا ہے تو اب اس کا مزہ چکھو اور بلاشبہ کافروں کے لئے آتش دوزخ کا عذاب ہے۔“

فرشتوں کا جنگ بدر میں اترنا ہی نہیں بلکہ جنگ کرنا

پہلی آیت کی ابتدا چونکہ اس تذکرہ سے ہے کہ فرشتوں کو یہ پیغام دیا جا رہا تھا تو ظاہر یہی ہے کہ آخر تک خطاب انہی سے ہے اور اس لئے گردنوں اور ہاتھوں پر ضربیں لگانے کی ہدایت انہی کو ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فرشتے تسلی کے لئے صرف اترے ہی نہیں تھے بلکہ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر باقاعدہ جنگ بھی کی۔

اس جگہ بعض علماء کی یہ توجیہ بھی واقع ہے کہ فرشتوں کو آدمیوں کی شکل میں انہی کی طرح بنی آدم سے جنگ کرنے کا پہلے کبھی موقع نہیں آیا تھا، اس لئے خالق کی طرف سے انہیں طریقہ جنگ کی تعلیم دی گئی۔^[۱] دوسرا ضعیف قول یہ ہے کہ اس میں صنعت التفات ہے جس کے معنی ہیں ایک انداز میں کسی سے بات کرتے کرتے انداز پلٹ دینا، یہاں پہلے خطاب فرشتوں سے تھا کہ اہل ایمان میں ثبات قدم پیدا کرو، اس کے بعد مخاطب مسلمانوں سے ہو گیا کہ تم ان کی گردنوں پر ضربیں لگاؤ^[۲] اور اس کے بعد چونکہ کافروں کا تذکرہ آ ہی گیا کہ انہیں تلواریں لگاؤ تو آخر میں مخاطب ان کافروں سے ہو گیا ہے ”تو اب اس کا مزہ چکھو“^[۳]

یہاں بلاشبہ صنعت التفات ہے کہ پہلے کافروں کا ذکر بصیغہ غائب تھا اور اب خود ان سے مخاطب کا انداز ہو گیا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقَيْتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُولُوهُمْ الْاَدْبَارَ ﴿١٥﴾
وَمَنْ يُؤَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبرَهُ إِلَّا مَتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَى فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ

[۱] قال ابن الانباري ان الملائكة حين امرت بالقتال لم تعلم اين تقصد بالضر ب من الناس فعلمهم الله تعالى (تبيين)

[۲] اے مسلمانان (شاکہ ولی اللہ)

[۳] خطاب للمشرکین (تبيين) فذوقوا ايها الكفار (جلالين)

بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَا أُوهُ جَهَنَّمَ ۖ وَيَبُئْسَ الْمَصِيرُ ﴿١٦﴾

”اے ایمان لانے والو! جب کافروں سے جنگ میں مڈ بھٹے ہو تو ان کے سامنے سے پیٹھ نہ پھراؤ اور جو ان کے سامنے سے پیٹھ پھرائے گا بجز تدبیر جنگ کے لئے کسی سمت ہٹتے ہوئے یا کسی خاص گروہ کی طرف پناہ لیتے ہوئے تو وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہوگا اور اس کی جائے پناہ دوزخ ہوگی اور وہ بہت بری بازگشت ہے۔“

میدان جنگ سے فرار کا باعث دوزخی ہونا

تدبیر جنگ کے لئے ہٹنے کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ دکھاوے کے طور پر پیچھے ہٹیں تاکہ مخالف فریق دھوکا کھا کر آگے بڑھے اور پھر زد پر لا کر انہیں گھر لیا جائے۔ یہ فرار میں داخل نہیں ہے۔^[۱]

علمائے اہل سنت شاید کسی حفظ ما تقدم کے لئے اس کے قائل ہیں کہ میدان جنگ سے فرار پر یہ غضب الہی اور سزائے آخرت کا اعلان جنگ بدر سے مخصوص تھا مگر الفاظ آیت اس تخصیص کے متقاضی نہیں ہیں اور روایت اہل بیت یہی ہے کہ کسی بھی میدان جنگ سے فرار ہو، وہ غضب خداوندی کا مستوجب ہے۔^[۲]

فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ ۖ وَمَا رَمَيْتُمْ إِذْ رَمَيْتُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ۗ وَلِيُبَلِّغَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا ۖ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٧﴾ ذَلِكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ

مُؤْمِنِينَ كَيْدِ الْكُفْرِيِّينَ ﴿١٨﴾

”تو تم لوگوں نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کے قتل کا سامان کیا اور آپ نے جب (سنگریزے) پھینکے تو آپ نے نہیں پھینکے بلکہ اللہ نے پھینکے اور اس لئے کہ وہ مسلمانوں کے لئے اپنی طرف سے ایک خاص فضل و کرم کا مظاہرہ کرے^[۳] یقیناً اللہ سننے والا ہے بڑا جاننے والا۔ یہ حقیقت ہے^[۴] اور یقیناً اللہ کافروں کی ترکیب کو شکست دینے والا ہے۔“

روایت میں ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے بدر میں تھوڑی سی کنکریاں ہاتھ میں لے کر فوج دشمن کی جانب پھینکیں جس کے بعد انہیں شکست ہوئی^[۵] اسی کو قرآن کی آیت میں کہا جا رہا ہے۔

[۱]. بانیر بہم الفرة مکیدة و هو یزید الکررة (جلالین)

[۲]. قال ابن عباس هو عام و هو قول ابی جعفر و ابی عبد اللہ (تبیان)

[۳]. تا عطا کند مسلمانان را از نزدیک خویش عطائے نیکو. (شاه ولی اللہ)

[۴]. ذلکم الابلاء حق (جلالین)

[۵]. ذکر جماعۃ من المفسرین کابن عباس وغیرہ (تبیان)

إِنْ تَسْتَفْتِحُوا فَقَدْ جَاءَكُمْ الْفَتْحُ ، وَإِنْ تَنْتَهُوا فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ ، وَإِنْ تَعُدُّوْا نَعْدًا ، وَلَنْ تُغْنِيَّ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَلَوْ كَثُرَتْ ، وَأَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٩﴾

”اگر تم فتح چاہتے تھے تو سامنے فتح آ تو گئی اور اگر باز آ جاؤ تو تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر پھر تم ایسا کرو گے تو ہم بھی ایسا ہی کریں گے اور تمہیں تمہاری جمعیت چاہے کتنی ہی زیادہ ہو کچھ فائدہ نہ دے گی اور بات یہ ہے کہ اللہ ضرور بالضرور ایمان والوں کے ساتھ ہے۔“

یہ مخاطب کفار کے ساتھ ہے۔ شاہ ولی اللہ کہتے ہیں کہ روز بدر ابو جہل نے کہا تھا کہ خداوند اجوہم میں سے زیادتی کر رہا ہے، اسے شکست ہو تو قرآنی ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ تو خود تمہاری دعا تھی کہ جو حق پر ہو اس کی فتح ہو چنانچہ حق والوں کی فتح ہو گئی۔ دوسرے بہت سے مفسرین بھی اس سے متفق ہیں۔^[۱]

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنَّهُ وَ أَنْتُمْ تَسْمَعُونَ ﴿٢٠﴾

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿٢١﴾

”اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ اور اس کے پیغمبر کی اور اس کی طرف سے روگردانی نہ کرو، درحالیکہ تم سن رہے ہو اور ان کی طرح نہ ہو جنہوں نے کہا تو کہ ہم نے سن لیا مگر وہ (جو حقیقت میں سننا ہوتا ہے، اس طرح) سنتے نہیں ہیں۔“

”ان کی طرح نہ ہو جنہوں نے یوں کہا اور نہ کیا،“ بعض نے اس کی تفسیر یہود و نصاریٰ کے ساتھ کی ہے^[۲] اور بعض نے مشرکین اور اس امت کے منافقین کے ساتھ^[۳] مگر مشرکین پر تو اس کا منطبق ہونا مشکل ہے اس لئے کہ وہ زبان سے بھی دعویٰ نہیں رکھتے کہ ”ہم نے سن لیا، جس میں قبول کرنے کا مفہوم مضمحل ہے اور ظاہر ہے کہ مشرکین اس کے قبول کرنے سے انکاری ہیں، پھر وہ کیوں کہیں گے سمعنا ”سننا ہم نے“ ہاں! اہل کتاب اس امت کے منافقین، یہ دونوں اس سے مراد ہو سکتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ نے جو سلوک اپنی کتابوں کے ساتھ کیا یعنی زبانی اقرار اور قلباً انکار، وہی منافقین کا عمل اس کتاب یعنی قرآن اور احکام رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے اور مقصود مسلمانوں کو متنبہ کرنا ہے کہ تم منافقین میں سے نہ ہو۔

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الضُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٢٢﴾

”بلاشبہ زمین پر بدترین چلنے والے، اللہ کے نزدیک یہ بہرے گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔“

[۱]۔ حیث قال ابو جہل : اللهم اينما كان اقطع للرحم وانا نأبما لانعرف فاحنه الغداة اى اهلکه (جلالین) قال الحسن و مجاهد والزهرى والضحاك والسدى والغراء (تبیان)

[۲]۔ یعنی مانند اہل کتاب کہ توریت خواندند و بزبان معترف شدن و بران عمل نہ کردند (فتح الرحمن)

[۳]۔ ہم منافقون و المشرکون (جلالین)

گمراہ اور پست کردار انسان جانوروں سے بدتر

زمین پر چلنے والے حیوان اور انسان سب ہی ہیں، ان میں سب سے بدتر کہا گیا ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ انسان جانوروں سے اور ان میں بھی سب سے بدتر ہیں۔^[۱]

وَلَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَأَسْمَعَهُمْ ۗ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿۲۳﴾
 ”اور اگر اللہ ان میں کوئی بھلائی جانتا ہوتا تو انہیں سناتا اور اگر انہیں وہ سناتا تو بھی وہ پیٹھ پھراتے اس صورت سے کہ وہ بے اعتنائی اختیار کئے ہوئے ہیں۔“

ایک سنانا تو ہدایت عام کی صورت سے سب ہی کے لئے ہوتا ہے جس کے ذریعہ سے تمام حجت ہوتی ہے، وہ یہاں مراد نہیں ہو سکتا بلکہ یہ سنانا خصوصی ہدایت کا انتظام ہے جو اسی وقت ہوتا ہے جب کسی سے اثر پذیر ہونے کی امید ہو، اس اثر پذیری کی صلاحیت کو یہاں خیر الٰہی یعنی ”کوئی بھلائی“ کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔^[۲]

یہاں کہا گیا ہے کہ ”اگر اللہ ان میں کوئی بھلائی جانتا“ ظاہر ہے کہ جاننا کسی حقیقت واقعہ سے متعلق ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا ذاتی تصور اس کا باعث ہے کہ اللہ ان کی خصوصی ہدایت نہیں فرماتا مگر بعض مفسرین اہل سنت کو کیا کیا جائے کہ وہ بلا وجہ بھی بعض آیات میں جبر کا مفہوم پیدا کرتے ہیں چنانچہ شاہ عبدالقادر صاحب اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:
 ”یعنی اللہ نے ان کے دل میں ہدایت کی لیاقت نہیں رکھی، جن میں لیاقت رکھی، انہی کو ہدایت دیتا ہے“ (موضح القرآن)
 ہمیں نہیں معلوم کہ جاننے کے معنی ہدایت کی لیاقت رکھنا کس لغت میں ہیں؟

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ۖ
وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ وَأَنَّهُ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿۲۴﴾
 ”اے ایمان لانے والو! البیک کہو اللہ اور رسول کی آواز پر جب وہ تمہیں دعوت دیں اس چیز کی طرف جو تمہیں زندہ کر دے گی اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ انسان اور اس کے دل کے درمیان سدراہ ہو جاتا ہے اور وہ وہ ہے جس کی طرف تم محشور ہو کر جاؤ گے۔“

یہ دعوت اس دین کی دعوت ہے جو حیاتِ ابدی کا پیغام ہے^[۳] اس پر لبیک کہو تا کہ توفیقاتِ الہی تمہارے شامل حال ہوں اور اگر تم نے روگردانی کی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ توفیقات تم سے سلب ہو جائیں۔ اس کو کہا گیا ہے کہ اللہ انسان اور اس کے دل کے درمیان سدراہ ہو جاتا ہے۔
 غنیمت ہے کہ یہاں شاہ عبدالقادر نے بھی حقیقتِ بینی سے کام لیا ہے اور لکھا ہے:

[۱]. ان هولا الكفار شر من دب على الارض من الحيوان (مجمع البيان) یعنی جانوروں سے بدتر ہیں وہ آدمی جو دین حق کو نہ سمجھیں (موضح القرآن)

[۲]. انهم يصلحون بما يورده عليهم من حججه و آياته (تبيان) قبولاً للهدي و اقبالا على طلب الحق (مجمع البيان)

[۳]. لما يحييكم من امر الدين لانه سبب الحياة الابدية (جلالين)

”یعنی حکم بجالانے میں دیر نہ کرو، شاید اس وقت دل ایسا نہ رہے۔ اور اللہ اول کسی کے دل کو روکتا نہیں اور مہر نہیں کرتا۔ جب بندہ کا ہلی کرے تو اس کی جزا میں روک دیتا ہے یا ضد کرے، حق پرستی نہ کرے تو مہر کر دیتا ہے۔“ (موضح القرآن)۔

چونکہ آخر میں یہ جملہ ہے کہ تم اسی کی طرف محشور ہو گے لہذا پہلا مفہوم ذہن میں یہی آتا ہے کہ یہ کسی برے انجام سے خوف دلایا جا رہا ہے مگر علامہ طبرسی نے دو روایتیں جو معصوم کی طرف نسبت رکھتی ہیں ایسی درج کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ”یحول بین المرء وقلبه“ اللہ انسان اور اس کے دل کے درمیان سد راہ ہو جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے گمراہی سے بچاتا ہے [۱] اس طرح یہ اس کی دعوت پر لپیک کہنے کا ایک صلہ ہے جس کا اعلان کیا جا رہا ہے۔

ان حدیثوں کو دیکھنے کے بعد ذہن بھی اس مفہوم کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور اس صورت میں آخر کے جملہ کو بھی کہ ”اسی کی طرف تمہیں محشور ہونا ہے“ کوئی تہدید نہیں، بلکہ ڈھارس دینا سمجھنا چاہیے۔

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ

شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾

”اور بچو اس ابتلاء سے کہ جو بلاشبہ انہی لوگوں سے مخصوص نہیں رہے گا کہ جو تم میں سے ظلم و تعدی کے مرتکب ہیں اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ سخت سزا والا ہے۔“

یعنی بلا جوتی ہے، وہ چاہے ایک طبقہ کی بد اعمالی کے سبب سے ہو مگر وہ اپنی لپیٹ میں سب ہی کو لے لیتی ہے [۲] لہذا اس سے بچنے کی کوشش کرنا چاہیے اس طرح کہ خود ایسے اعمال کے مرتکب نہ ہوں اور جو مرتکب ہوتے ہیں، ان کو روکنے کی کوشش کریں۔

وَأَذْكُرُوا إِذْ أَنْتُمْ قَلِيلٌ مُسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَنْ يَتَخَطَّفَكُمُ

النَّاسُ فَأَوْبَكُمْ وَآيَدِكُمْ بِنَصْرِهِ وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ

تَشْكُرُونَ ﴿۲۶﴾

”اور یاد کرو وہ وقت کہ جب تم ایسے کم تعداد میں تھے، اس سرزمین پر کمزور شمار کئے جانے والے کہ تمہیں اندیشہ رہتا تھا کہ لوگ تم پر چھپٹانہ ماریں [۳] تو اس نے تم کو پناہ دی اور اپنی مدد سے تقویت پہنچائی اور تمہیں پاک و پاکیزہ غذا پہنچائی کہ تم شکر گزار ہو۔“

[۱] روی یونس بن عمار عن ابی عبد اللہ قال: معناہ لا یستیقن القلب ان الحق باطل ابدا ولا یستیقن القلب ان الباطل حق ابدا وروی ہشام بن سالم عنہ قال: معناہ یحول بینہ و بین ان یعلم ان الباطل حق اور دہما العیاشی فی تفسیرہ (مجمع البیان)

[۲] معناہ انہا تعمر لان الہرج اذا وقع دخل ضررہ علی کل احد (تبیان)

[۳] یاخذ کم الکفار بسرة (جلالین) اچک لے جاویں تم کو (شاہ رفیع الدین)

سرزمین مکہ میں مہاجرین کا عالم پریشانی

یہ مسلمان مہاجرین سے خطاب ہے اور ان کو سرزمین مکہ والا ماضی یاد دلایا جا رہا ہے [۱] پھر مدینہ کا حال ہے جہاں ان کو پناہ، قوت اور خوشحالی سب ہی کچھ حاصل ہوا۔

”شاید کہ تم شکر گزار ہو، اس میں یہ طنز محسوس ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی تم میں سے بہت سے ناشکرے ہوں گے جو اطاعت خدا و رسول ﷺ کے راستے سے منحرف ہو جائیں گے۔

علاوہ ان آیتوں کے جن میں بہت صفائی سے ”کردارِ صحابہ“ پر روشنی ڈالی گئی ہے قرآن کے یہ محمل اشارے بھی جمہور کے ”عدالت صحابہ“ کی عمومیت والے مسلمہ کو بڑی شدید ضربیں لگاتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمْنِيَكُمْ وَأَنْتُمْ
تَعْلَمُونَ ﴿۲۴﴾ وَأَعْلَمُوا أَنَّ مَالَهُمْ وَأَوْلَادَهُمْ فِتْنَةٌ ۖ وَأَنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ أَجْرٌ
عَظِيمٌ ﴿۲۸﴾

”اے ایمان لانے والو! اللہ اور پیغمبر سے خیانت نہ کرو اور خود اپنی امانتوں میں بھی خیانت نہ کرو در حالیکہ تم علم رکھتے ہو اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے مال اور اولاد آرزو مائش کا ذریعہ ہیں اور یہ کہ اللہ وہ ہے کہ اس کے پاس بڑے سے بڑا صلہ ہے۔“

امانتوں میں اموال بھی ہیں اور وہ ذمہ داریاں جو قراردادیں کی بنا پر عائد ہوتی ہیں [۲] بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اس آیت کا تعلق ابولہبہ سے ہے جنہیں بنی قریظہ نے مشورہ لینے کے لئے طلب کیا تھا تو انہوں نے اشارہ سے انہیں رسول ﷺ کا ارادہ جو ان کے بارے میں ہے بتلا دیا تھا [۳]

فتنہ کے معنی بعض لوگوں نے یہ قرار دیئے ہیں کہ یہ راہِ حق سے ہٹانے کا سبب ہیں [۴] مگر یہ اس معنی والا سبب نہیں سمجھا جاسکتا کہ اس کے خلاف ممکن نہ ہو بلکہ یہ ناقص نفوس کی کمزوری ہے کہ ان کے لئے ان کی محبت اس کا باعث ہوتی ہے اور یہی ان کے ذریعہ آرزو مائش ہونے کی بنیاد ہے لہذا فتنہ کے معنی ذریعہ آرزو مائش ہی کے درست ہیں [۵] کیونکہ یہ چیزیں انسان کے ارتقاء درجات کا باعث بھی ہوتی ہیں جبکہ وہ حق اور فرض کے

[۱] حرز میں یعنی حر مکہ (شہادہ ولی اللہ)

[۲] مَا وَتَمَنَّتُمْ عَلَيْهِ مِنَ الدِّينِ وَغَيْرِهِ (جلالین)

[۳] قَالَ الزُّهْرِيُّ نَزَلَتْ فِي أَبِي لُبَابَةَ فِي قِصَّةِ بَنِي قُرَيْظَةَ وَهُوَ الْمَرْوِيُّ عَنِ أَبِي جَعْفَرٍ وَابْنِ عَبْدِ اللَّهِ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ (تبیان)

[۴] فِتْنَةٌ لَكُمْ صَادَةٌ عَنِ امْرِئِ الْأَخْرَةِ (جلالین)

[۵] الْمَرَادُ بِالْفِتْنَةِ هُنَا الْمَحَبَّةُ الَّتِي تَطْهِّرُ بِهَا فَا فِي النَّفْسِ مِنْ اتِّبَاعِ الْهَدْيِ أَوْ تَجَنُّبِهِ (تبیان) لیختبر خلقه بالاموال والاولاد.

(مجمع البیان)

راستے پر ثابت قدم رہے۔

کیونکہ یہی چیزیں انسان کے ارتقاع درجات کا باعث بھی ہوتی ہیں جبکہ وہ حق اور فرض کے راستے پر ثابت قدم رہے۔ اور اسی لئے اس فتنہ سے بچنے کی کوشش کوئی ممدوح بات نہیں بلکہ وہ منزل جہاد نفس سے فرار کی حیثیت رکھتی ہے چنانچہ امیر المؤمنین علیہ السلام کا ارشاد ہے جسے علامہ طبری نے اس آیت کے ذیل میں درج فرمایا ہے کہ:

لا يقولن احدكم اللهم اني اعوذ بك
تم میں سے کوئی ہرگز یہ نہ کہے کہ خدایا میں تجھ سے۔

من الفتنة لانه ليس احد الا وهو مشتمل على فتنه ولكن من استعاذ فليستعد من مضلات
الفتن. (مجمع البيان)

مانگتا ہوں پناہ فتنہ سے، اس لئے کہ فتنہ (آزمائش کا سامان، تو ہر آدمی کے لئے ناگزیر ہے، ہاں جو شخص پناہ مانگے، وہ پناہ مانگے ان فتنوں سے جو آدمی کی گمراہی کا باعث ہوتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ
وَيَعْفِرْ لَكُمْ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿٢٩﴾

”اے ایمان لانے والو! اگر اللہ کے غضب سے بچنے کی فکر رکھو تو وہ تمہارے لئے ایک خاص طرح کی حد فاصل بنا دے گا اور تمہاری غلطیوں سے درگزر کرے گا اور تمہیں معاف کرے گا اور اللہ بڑا فضل و احسان والا ہے۔“

”حد فاصل“ کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ تمہیں مرتبہ میں بلندی عطا فرما کر ایک خاص امتیاز کا مالک بنا دے گا^[۱] اور یہ بھی کہ فتح و غلبہ عطا فرمائے فوقیت کے لحاظ سے امتیاز دیدے گا^[۲] اور یہ بھی کہ ان اندیشوں سے جو تمہیں راہ حق میں درپیش ہیں، الگ کر دے گا^[۳] اور یہ بھی کہ تمہیں وہ نگاہ عطا کرے گا جس سے تم حق و باطل میں تمیز کر سکو^[۴] غالباً معصوم سے یہی تفسیر وارد ہے^[۵] اس سب کے علاوہ خود قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی یہ دعا وارد ہے کہ:

فَأَفْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ﴿٢٥﴾

جدائی ڈال دے ہم میں اور اس فاسق گروہ میں (سورہ مائدہ)

یہ آیت فرقان کے لفظ کے ساتھ بھی اس مفہوم کو ذہن میں لاتی ہے کہ اللہ تمہیں گمراہوں اور گنہگاروں سے الگ رکھے گا اور تم ان کے

[۱]۔ کرے گا واسطے تمہارے امتیاز (شاہ فیض الدین)

[۲]۔ پیدا کند بر ای شما فتیجی را (شاه ولی اللہ)

[۳]۔ فرقانا بینکم و بین ما تخافون فتنجون (جلالین)

[۴]۔ ای ہدایۃ و نور افی قلوبکم تفرقون بہا بین الحق و الباطل (مجمع البیان)

[۵]۔ یعنی العلم الذی تفرقون بہ بین الحق و الباطل (علی بن ابراہیم)

وبال میں مبتلا نہیں ہو گے۔

وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۗ وَيَمْكُرُونَ
وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۗ وَاللَّهُ خَيْرٌ الْمَكْرِينِ ﴿٥٠﴾

’اور جب کہ آپ کے خلاف کافر لوگ منصوبے بنا رہے تھے کہ آپ کو قید کر دیں یا جان سے ماریں یا آپ کو نکال باہر کریں اور وہ تو اپنے منصوبے بنا رہے تھے اور اللہ اپنا منصوبہ بنا رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر منصوبہ بنانے والا ہے۔‘

حفاظت رسول ﷺ کے لئے خداوند عالم کی تدبیریں

یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ کفار کی منصوبہ سازی قبل ہجرت اس وقت کی ہے جب حضرت ﷺ مکہ معظمہ میں تھے۔^[۱]

ہوسکتا ہے کہ یہ اس وقت کا ذکر ہو، جب بالآخر یہ طے پایا کہ آپ کا اور بنی ہاشم کا مقاطعہ کیا جائے جس کے بعد آپ شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے۔ اس صورت میں ان کے بالمقابل اللہ کا منصوبہ وہ قرار پائے گا جس کی تکمیل جناب ابوطالب کے ذریعہ سے ہوئی اور جس طرح انہوں نے رسول ﷺ کی حفاظت فرمائی، وہ خالق کے اس منصوبہ کے اجزاء ہوں گے مگر بعض مفسرین تصریح کرتے ہیں کہ اس سے مقصود مشرکین کی وہ منصوبہ سازی ہے جو دارالندوہ میں مشورہ کے لئے اجتماع کے موقع پر ہوئی تھی جس کے بعد ہجرت ہوئی^[۲] اس صورت میں خالق کا منصوبہ وہ ہوگا جس کی تکمیل اس نے علی بن ابی طالب کو بستر رسول ﷺ پر سلا کر فرمائی جس کے نتیجے میں پیغمبر ﷺ نے بسلا متی ہجرت فرمائی^[۳] اور اس تدبیر الہی کی صورت بھی بے شک ایسی ہے جسے خالق ان کے مکر کے مقابلہ میں لفظ مکر سے تعبیر فرمائے جیسے حضرت عیسیٰ ﷺ کو صلیب سے بچانے اور آسمان پر اٹھانے کے موقع پر بھی ارشاد ہوا ہے:

وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ ۗ وَاللَّهُ خَيْرٌ الْمَكْرِينِ ﴿٥٠﴾ (آل عمران)

مگر مجھے اس محل نزول کے ماننے میں بس اتنا تامل ہے کہ ہجرت کا منصوبہ تو پیغمبر خدا ﷺ کے لئے بن چکا تھا چنانچہ اصحاب سب تقریباً مدینہ کی طرف بھیجے جا چکے تھے۔ اسی منصوبہ کو ناکام بنانے کے لئے مشرکین کا اجتماع ہوا تھا۔ اس صورت میں مشرکین کے منصوبہ میں لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ کی دو شقیں تو سمجھ میں آتی ہیں کہ آپ کو قید کریں یا قتل کر دیں مگر تیسری شق: أَوْ يُخْرِجُوكَ ”یا آپ ﷺ کو نکال دیں“ سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ نکالنا تو رسول ﷺ کے مقصد کو پورا کرنا تھا، اسے ناکام بنانا نہیں تھا، پھر اگر ان کے منصوبہ کا یہ بھی جز تھا تو خالق کا اس کے بالمقابل یہ منصوبہ کہ ”نکل جائے“ کیا معنی رکھتا ہے؟ یہ ان کے منصوبہ کو شکست دینا کہاں ہوا؟

ہاں! اس صورت میں بھی ایک قول قرین قیاس ہے کہ نکالنے سے مراد ایک خاص طرح سے نکالنا تھا یعنی ایک شتر سرکش پر سوار کر کے

[۱]. تعریض استبان قصد کہ کفار در مکہ جمع شدہ ابیندائے میروند (فتح الرحمن)

[۲]. وقد اجتمعوا للمشاورۃ فی شأنک بدار الندوۃ (جلالین)

[۳]. بان اوحی الیک مادبروہو امرک بالخروج (جلالین)

اس سے ہنگامہ بنا جو باعث ہلاکت ہو جائے۔^[۱]

وَإِذَا تَنَلَىٰ عَلَيْهِمْ أَيْتُنَا قَالُوا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هَذَا إِنْ هَذَا

إِلَّا آسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿۳۱﴾

”اور جب ان کے سامنے ہماری آیتوں کی تلاوت ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا ہے۔ اگر ہم چاہیں تو ہم بھی ایسا ہی کلام پیش کریں۔ یہ نہیں ہیں مگر اگلے زمانہ کی فرضی کہانیاں۔“

یہ ان کا کہنا کہ ”ہم چاہیں تو ہم ایسا ہی کلام پیش کریں“ دھاندلی کے طور پر اپنے کھسیانے پن کو چھپاتے ہوئے نفسیاتی طور پر ضمیر کے اس چور کا غماز ہے کہ وہ محسوس کرتے تھے کہ ہم ایسے کلام پر قادر نہیں ہیں۔ ورنہ ”ہم چاہیں“ کے کیا معنی؟ قرآن کے مسلسل تازیانوں پر کہ اس کا مثل لاسکتے ہو تو لاؤ، چاہنا تو فطری امر ہے۔

آخر میں وہ مقابلہ میں جائیں دے رہے ہیں تو اسے کیوں نہیں چاہتے کہ ہم قرآن کے اس مطالبہ کو منظور کر کے اس کا مثل پیش ہی کر دیں۔ یہ ”نہ چاہنا“ ان کی زبان میں حقیقتاً مجبوری کا دوسرا نام ہے۔

وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ

السَّمَاءِ أَوْ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿۳۲﴾

”اور وہ بھی ایک وقت ہے جب انہوں نے کہا کہ خداوند! اگر یہ تیری طرف کا حق ہو تو ہم پر آسمان سے پتھر برسایا ہم پر لاکوئی اور ایسا ہی دردناک عذاب۔“

چونکہ وہ ظاہر ایسا کرتے تھے کہ یہ حق نہیں ہے، اس لئے گویا اپنی سچائی کو پایہ ثبوت تک پہنچانے کے لئے چاہے دل میں اسی وقت ڈر رہے ہوں مگر دیدہ دلیری سے کام لے کر زبان سے اس طرح کی دعا کرتے تھے اور اللہ کی اس مہلت سے جو انہیں دی جا رہی تھی، غلط فائدہ اٹھا کر اس تکذیب کے حق بجانب ہونے کی بخیال خود ایک دلیل پیش کر رہے تھے کہ اگر یہ سچ ہو تو ہم خود اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ ہم پر پتھروں کا یا اور اسی قسم کا عذاب نازل کر دے مگر دیکھو ہماری اس دعا کے باوجود ہم پر ایسا کوئی عذاب نہیں آتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس پیغام میں کوئی حقانیت نہیں ہے۔

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ ۗ وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ

يَسْتَغْفِرُونَ ﴿۳۳﴾

”اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ ان پر عذاب نازل کرے اس حالت میں کہ آپ ان کے درمیان ہیں اور نہ اللہ ان پر عذاب نازل کرنے والا ہے اس حالت میں کہ جب وہ معافی مانگ رہے ہوں۔“

[۱]. قالوا لغراء: او بخر جوک علی بعیر یطر دبه حتی یتہلك (تبیان)

وجودِ رسول ﷺ مانعِ نزولِ عذاب

اس میں اللہ کی طرف کے ایک عام قاعدہ کا اعلان ہے جسے شاہ ولی اللہ صاحب ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

یعنی سنتہ اللہ آنست کہ تا پیغامبرد در میان قوم باشد عذاب عام نمی کند و بمجنین تا آن کہ ایشان استغفار می کنند عذاب نمی نماید (فتح الرحمن)

یعنی اللہ کا مستقل طریقہ یہ ہے کہ جب تک پیغمبر قوم کے درمیان ہوتا ہے وہ عمومی عذاب نازل نہیں کرتا اور اسی طرح جب تک وہ معافی مانگتے رہتے ہیں عذاب نازل نہیں کرتا۔

اس کا ربط کلام سے ظاہر کرتے ہوئے شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”یعنی مکہ میں حضرت کے قدم سے عذاب رک رہا تھا، اب ان پر عذاب آیا، اسی طرح جب تک گنہگار نام رہے اور توبہ کرتا رہے تو پکڑا نہیں جاتا، اگر چہ اس سے بڑا گناہ ہو۔ حضرت نے فرمایا کہ گنہگاروں کو دو چیز پناہ ہیں، ایک میرا وجود اور دوسری استغفار“ (موضح القرآن)

اس سے دنیا کو محسوس ہونا چاہیے کہ اب جب کہ پیغمبر خدا ﷺ کی وفات ہو چکی ہے اور خلق خدا کی بد اعمالیوں کا اس وقت سے اب تک ہر شخص مشاہدہ کر رہا ہے تو دنیا پر عذاب کیوں نہیں آتا؟

اس سے لازمی طور پر ماننا پڑتا ہے کہ دنیا اس حقیقت محمدی ﷺ کے وجود سے خالی نہیں ہے اور اس سلسلہ کی کوئی فرد اب بھی آنکھوں کے سامنے نہیں تو پروردہ غیبت میں قائم و برقرار ہے اور اسی کے سبب سے یہ آسمان و زمین قائم ہیں اور خلق خدا عذاب استیصال سے محفوظ ہے۔

**وَمَا لَهُمْ آلَا يُعَذِّبُهُمُ اللَّهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوا
أَوْلِيَاءَ ؕ إِنْ أَوْلِيَاءُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٧﴾**

”اور کیا استحقاق ہے انہیں کہ اللہ ان پر عذاب نہ کرے جب کہ وہ مسجد الحرام سے روکتے رہے حالانکہ وہ اس کے کوئی ورثہ دار نہیں ہیں، اس کے ورثہ دار نہیں ہیں مگر پرہیزگار لوگ لیکن ان میں کے زیادہ تر آدمی علم نہیں رکھتے۔“

یعنی یہ تو پیغمبر ﷺ کی ان میں موجودگی تھی کہ ان پر عذاب نازل ہوا، ورنہ ان کے افعال ایسے ہی تھے کہ یہ مورد عذاب ہو جاتے۔^[1]

وہ اپنے کعبہ کا والی و وارث سمجھتے تھے۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ وہ اس کے اولیاء ہونے کے لائق نہیں ہیں، اس کے اولیاء تو پرہیزگار ہی ہو سکتے ہیں اور وہ مسلمان ہیں۔

اولیاء کا ترجمہ جو ہم نے کیا ہے ”ورثہ دار“ یہ عام ترجموں میں چاہے نہ کیا گیا ہو^[2] مگر اس کی جو تشریح کی جاتی ہے وہ اسی ترجمہ کو ترجیح دیتے ہیں چنانچہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”قریش آپ کو اولاد ابراہیم سمجھ کر کعبہ کے مختار ٹھہراتے تھے اور مسلمانوں کو آنے نہ دیتے تھے۔ سو فرمایا کہ اولاد ابراہیم میں جو

[1] یعنی اصل استحقاق عذاب دارندو لیکن ہوں پیغامبرد در میان ایشان مانع بود (فتح الرحمن)

[2] نیستند سزاوار آبجاء (شاہ ولی اللہ) نہیں و لائق والی ہونے اس کے (شاہ فہج الدین)

پرہیزگار ہو اسی کا حق ہے۔‘ (موضح القرآن)

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصَدِيَةً ۖ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿٣٥﴾

’اور ان کی نماز خانہ کعبہ کے پاس سیٹی یا تالیاں بجانے^[۱] کے سوانہ تھی، تو اب اس سزا کو چکھو اس کفر کی پاداش میں جو تم کرتے تھے۔‘

بموقع حج مشرکین کے لغویات

یعنی بجائے نماز و عبادت کے جو اس خانہ مقدس کے شایان شان ہے، وہ وہاں ایسے ناشائستہ حرکات کرتے تھے۔^[۲]

کہا جاتا ہے کہ ’اس سزا‘ سے مراد وہ تباہی ہے جو ان پر جنگ بدر میں آئی۔^[۳]

اور آخرت کا عذاب بھی مراد ہو سکتا ہے، مطلب یہ ہے کہ بصورت کلام یا بزبان حال ان سے یوں کہا جائے گا^[۴] کہ اب اس سزا کو چکھو اس کفر کی پاداش میں جو تم کرتے تھے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۖ فَسَيُنْفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ ﴿٣٦﴾ لِيَمِيزَ اللَّهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضَهُ عَلَىٰ بَعْضٍ فَيَرْكُمَهُ جَمِيعًا فَيَجْعَلَهُ فِي جَهَنَّمَ ۗ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ﴿٣٧﴾

’بلاشبہ کافر لوگ اپنے مال صرف کرتے ہیں اس غرض سے کہ اللہ کے راستے سے روکیں، تو بہت جلد ایسا ہوگا^[۵] کہ یہ ان کو صرف کریں گے اور پھر وہ ان کے لئے رنج و ملال کا باعث بنیں گے، پھر وہ مغلوب بھی ہوں گے اور جو کافر ہیں وہ حشر میں دوزخ کی طرف لے جائے جائیں گے تاکہ اللہ امتیاز کر دے ناپاک کا پاک سے اور جو کچھ ناپاک ہو، اسے ایک دوسرے پر رکھ دے اور ان سب کو تہہ بہ تہہ کر کے دوزخ میں ڈال دے، وہ لوگ ہیں جو گھانا اٹھانے والے ہیں۔‘

[۱]. التصديفة التصفيق وهو ضرب اليد باليد (مجمع البيان)

[۲]. ای جعلوا اذلك موضوع صلواتهم التي امروا بها (جلالين)

[۳]. فذوقوا العذاب ببدر (جلالين)

[۴]. قال ابو علي الجبائي: يقال لهم في الآخرة: ذوقوا العذاب بما كنتم تكفرون (تبیان)

[۵]. زود باشد کہ (شاه ولی الله)

”اللہ کے راستے سے روکیں“ یعنی دین الہی کے قبول کرنے سے۔^[۱]
 ”جو کچھ ناپاک ہو، اسے ایک دوسرے پر رکھ دے“ یعنی جس طرح وہ خیرات جو راہِ خدا میں ہو ذخیرہٴ آخرت ہوتی ہے، اسی طرح یہ خرچ جو وہ بڑی فیاضی کے ساتھ باطل پروری کے لئے کر رہے ہیں آخرت کے لئے اکٹھا ہو رہے ہیں اور وہاں یہ سب جمع ہو کر ان کے لئے عذابِ آخرت میں اضافہ کا سبب ہو جائیں گے۔^[۲]

اور گھانا اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کیونکہ یہ سب اموال خرچ بھی کریں اور پھر آخرت میں اس کی شدید سزا بھی پائیں گے۔

قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ يَتَّعْتُوا يُعْفَرُ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۗ وَإِنْ يَعُودُوا فَقَدْ

مَضَتْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ ﴿۳۸﴾

”کافروں سے کہہ دیجئے کہ اگر وہ باز آجائیں تو ان کے لئے بخشش ہو جائے گی اس کی جو کچھ پہلے ہو چکا ہے اور اگر وہ پھر ایسا کریں گے تو یہ اگلے آدمیوں کی روش ہے جو ہوتی چلی آئی ہے۔“

آخری فقرہ کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے، یہ ایک تشریح کے مطابق ہے^[۳] دوسرے معنی اس کے یہ کہے گئے ہیں کہ اگلے لوگوں کے لئے اللہ کا جو طریقہ ہے وہ سب کے سامنے آچکا ہے یعنی یہ کہ جب ان کی بد اعمالیاں زیادہ ہو جائیں تو ان پر عذاب نازل ہو^[۴] مگر یہ معنی ظاہر الفاظ سے ذرا بعید ہیں۔ پھر بھی علامہ طبرسی نے جو اس کی حمایت میں ارشاد فرمایا ہے وہ قابل لحاظ ضرور ہے۔ وہ فرماتے ہیں سنۃ (جس کا ترجمہ روش یا طریقہ کے ساتھ ہوتا ہے) اس کی اضافت قرآن مجید میں کئی طرح سے آئی ہے۔ پہلے یہی کہ وہ طریقہ جس کے ساتھ اختیار کیا جائے، اس کی طرف اضافت ہو جیسے یہاں کہا گیا: سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ ”پہلے والوں کا طریقہ“ یعنی اللہ کا طریقہ جو اس نے پہلوں کے ساتھ اختیار کیا۔^[۵] دوسرے وہ طریقہ جس کے ہاتھ سے عمل میں آئے، اس کی طرف اضافت جیسے: سُنَّةٌ مِّنْ قَدْ أَرْسَلْنَا ”ان کے طریقہ کے مطابق جنہیں ہم نے رسول بنایا“ یہاں طریقہ کی اضافت مرسلین کی طرف کی گئی ہے، اس لئے کہ اس کا ظہور انہی کے ہاتھ سے ہوتا تھا۔ اور تیسرے خود اپنی طرف اضافت جو کہ حقیقتاً اس طریقہ کا جاری کرنے والا ہے جیسے اس کے بعد ارشاد ہوا:

وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا تم ہمارے طریقہ کو بدلتا ہوا نہیں پاؤ گے۔ (بنی اسرائیل: ۷۷)

یہ علامہ طبرسی کا ارشاد بہت وقیع ہے مگر اس میں کمی بس اتنی ہے اور وہ بہت بڑی کمی ہے کہ پہلی قسم کی اضافت میں زیر بحث آیت کے علاوہ کوئی شاہد موصوف نے درج نہیں کیا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو اس مفہوم کو کافی تقویت حاصل ہو جاتی۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ ۗ فَإِنَّ آتَهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ

[۱]. سبیل اللہ ہنا ہود دین اللہ (تبیان)

[۲]. فی عاقبتہم بہ کہا قال: یوم یحییٰ علیہا فی نار جہنم الآية (مجمع البیان)

[۳]. گزشتہ استروشن پیشینان (شہ ولی اللہ) تحقیق گزری ہے یہی عادت پہلوں کی (شاہ فنج الدین)

[۴]. سنۃ الاولین فی تعجیل العقاب لہم (تبیان) ای سنۃ فیہم (جلالین)

[۵]. اضافة السنۃ الیہم لایہا کانت تجری علیہم (مجمع البیان)

بِمَا يَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٣٩﴾ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَاَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ط نِعْمَ الْمَوْلٰى

وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿٤٠﴾

”اور ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ کا وجود نہ رہے اور عبادت بالکل اللہ کی ہونے لگے اب اگر وہ باز آجائیں تو یقیناً اللہ دیکھنے والا ہے اس کا جوہ کرتے ہیں اور اگر وہ منہ موڑیں تو جان لو کہ اللہ تمہارا مالک ہے، کتنا اچھا مالک اور کتنا اچھا سرپرست۔“

”فتنہ“ کے معنی غلبہ کفر و کفار کے کہے گئے ہیں ^[1] اور بعض مفسرین نے خود کفر شرک کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ ^[2]

بعد کا فقرہ: ”يَكُوْنُ الدِّيْنُ كُلُّهُ لِلّٰهِ“ عبادت بالکل اللہ کی ہونے لگے ^[3] اس تشریح کے ساتھ بہت چسپاں ہے۔

امام جعفر صادق عليه السلام کی حدیث ہے کہ اس آیت کا مضمون ابھی تک وقوع میں نہیں آیا ہے وہ وقوع میں اس وقت آئے گا جب امام

منتظر عليه السلام ظہور فرمائیں گے ^[4]۔

مولیٰ کے معنی مددگار کے لئے جاتے ہیں ^[5] مگر اس صورت میں آخری فقرہ: ”نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ“ میں معنوی حیثیت سے تکرار ہو جاتی ہے لیکن جب مولیٰ کے معنی مالک کے لیں تو دونوں فقروں میں سے ہر ایک مستقل افادیت کا حامل قرار پاتا ہے اور معانی بیان کا مسلمہ اصول ہے کہ التا سیدس اولی من التاکید یعنی کسی نئے معنی کا لفظ میں پیدا ہونا اس سے بہتر ہے کہ اسے گزشتہ معنی ہی پر زور دینے پر محمول کیا جائے۔

وَاعْلَمُوْا اَنَّكُمْ غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاِنَّ لِلّٰهِ حُمْسَهُ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى

وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسْكِيْنَ وَابْنِ السَّبِيْلِ ﴿٤١﴾ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَا اَنْزَلْنَا عَلٰى

عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقٰنِ يَوْمَ التَّقٰى الْجَمْعِ ط وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٤٢﴾

”اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جو چیز بھی تم بطور غنیمت حاصل کرو تو بلاشبہ اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لئے ہوگا اور یتیموں کے لئے اور صاحبان قرابت اور یتیموں اور غریبوں اور اس کے لئے جو سفر کی راہ میں ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ اور اس پیغام پر جو ہم نے اتارا اپنے بندہ پر فیصلہ کے دن، اس دن جب دونوں جمعیتوں میں ٹکھیر ہوئی اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

[1]. فتنہ یعنی غلبہ کفر (شاہ ولی اللہ)

[2]. فتنہ شرک (جلالین)

[3]. یکون الدین کلہ للہ و حدیث لا یعبد غیرہ (جلالین)

[4]. روی زرارة و غیرہ عن ابی عبد اللہ (مجمع)

[5]. مولا کمر ناصر کمر (جلالین)

خمس کا صریحی حکم

لغت میں غنمہ کے معنی فائدہ کے ہیں اور اس لئے مالی فائدہ جو حاصل ہو وہ ما غنمتمہ کا مصداق ہوتا ہے لیکن چونکہ عموماً جہاد کے سلسلہ میں کفار کی شکست کے بعد جو اموال مسلمانوں کے ہاتھ آئیں، وہ مال غنیمت کہلاتے ہیں، اس لئے عام مفسرین نے اس ما غنمتمہ کو انہی اموال غنیمت کے معنی میں لیا ہے۔^[۱]

فقہائے شیعہ اس کے دائرہ کو اس کے لغوی معنی کی وسعت کے مطابق تعلیمات اہل بیت علیہم السلام کی روشنی میں حاوی کرتے ہیں بہت سی قسم کے اموال پر جیسے دینیے اور معاون اور منافع اموال تجارت اور غیر مسلمین سے جو مال کسی ایسے ذریعہ سے حاصل ہو جو عام انسانی قوانین کے ماتحت جرم نہیں ہے لیکن شریعت اسلام اسے ممنوع قرار دیتی ہے^[۲] تفصیل اس کی کتب فقہیہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

بہر حال ما غنمتمہ کے جو بھی حدود ہوں، یہ تو صاف نص قرآن سے ظاہر ہے کہ علاوہ زکوٰۃ کے ایک فریضہ مال خمس کا ہے اور یہ اتنا معزز حق ہے کہ اس کے حقداروں میں سب سے پہلے اللہ کا نام ہے اور اس کے بعد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اور اس کے بعد ذوی القربیٰ کا۔

شکر ہے کہ یہاں بہت سے مفسرین اہل سنت بھی اس سے متفق ہیں کہ ذوی القربیٰ سے خود مسلمانوں کے قرابت دار مراد نہیں ہیں بلکہ قرابت داران رسول صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں چنانچہ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

”یعنی خویشاوندان پیغمبر را کہ بنی ہاشم و بنی مطلب اند“ (فتح الرحمن)
تفسیر جلالین میں بھی ایسا ہی ہے۔

قرباۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم من بنی ہاشم والمطلب

بس اس بارے میں بھی دونوں فرقوں کے نقطہ نظر میں اتنا فرق ہے کہ یہاں چونکہ ذوی القربیٰ بصورت جمع نہیں بلکہ ذی القربیٰ بصورت واحد ہے جس کا مفہوم نکلتا ہے ایک شخص خاص جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے امتیازی رشتہ رکھتا ہے، اس لئے شیعہ تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد امام ہے^[۳] اور چونکہ وہی بعد رسول صلی اللہ علیہ وسلم نمائندہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہے، اس لئے حق اللہ، حق الرسول اور حق ذی القربیٰ، ان تینوں کا مجموعہ جو خمس کا نصف حصہ ہوتا ہے، وہ ”سہم امام“ کہلاتا ہے۔

پھر آخر میں جو ”وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَالْبَنِ السَّبِيلِ“ کے الفاظ قرآن مجید میں ہیں اگرچہ بلا قید ہیں مگر ہمارے یہاں احادیث کی بنا پر یہ قید ثابت ہوئی ہے کہ ان میں سادات ہونے کی شرط ہے^[۴] اور اس لئے ان تینوں کے مجموعہ کو ”سہم سادات“ کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ کوئی غیر متوقع بات نہ ہوتی کہ حصوں کی تعیین میں یا تقسیم کے طریقہ میں شیعہ اور سنی میں اختلاف ہو جاتا جیسا کہ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

[۱]. اخذتم من الکفار قهرا (جلالین) آنچه غنیمت یافتند از کافران (شاہ ولی اللہ)
[۲]. عند اصحابنا یجب فی کل فائده تحصل للانسان من المكاسب و ارباح التجارات و الکنوذو المعاون و الفروض و غیر ذلک... لان جمیع ذلک یسمی غنیمه (تبیان)
[۳]. هو الامام (علی بن ابراہیم)
[۴]. فہم ایتام ال محمد ﷺ خاصه و مساکینہم و انباء سبیلہم خاصه (علی بن ابراہیم)

”چهارخمس عانماز باید ادا و یک خمس در بیت المال نهادہ بر پنج حصہ یا سہ حصہ قسمت باید کرد علی اختلاف المذہب۔“ (فتح الرحمن)
جو فقہ اہل بیت علیہم السلام کے خلاف ہے مگر اندوہناک سانحہ تو یہ ہے کہ قرآن کی اس آیت کے باقی ہوتے ہوئے جمہور اہل سنت کے یہاں
خمس کا فریضہ ہی ساقط کر دیا گیا اور ہمیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اس حکم کے آخر میں یہ تہدید الی الفاظ کہ ”اگر ایمان رکھتے ہو اللہ پر“ اسی مستقبل کو دیکھتے
ہوئے رکھے گئے تھے کہ باوجود دعوائے اسلام و ایمان کے مسلمانوں کی اکثریت اس حکم پر خط نہ کھینچ دے گی۔

جنگ بدر کے کچھ کیفیات

”فیصلہ کے دن“ اور ”دُنوں جمعیتوں کی مڈ بھیڑ کے دن سے مراد روز بدر ہے [۱] اور اس کا حوالہ اس لئے دیا گیا ہے کہ اس دن کی فتح
مسلمانوں کے لئے صرف قدرت ربانی اور تائید الہی سے ایک معجزہ کے طور پر ہوئی تھی لہذا مسلمانوں کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ فتح وہ اپنی قوت بازو
سے حاصل کرتے ہیں اور مال غنیمت کا پورا پورا استحقاق خود انہی کو ہے۔ اس میں دوسرے حصے کیوں قرار دیئے جاتے ہیں؟ انہیں اس موقع کو یاد دلا
کر ایک طرف استحقاق ایمان کا سرمایہ فراہم کیا جاتا ہے کہ اگر ابھی تمہارے ایمان میں کمزوری ہے تو ان قدرتی آثار کو دیکھ کر جو جنگ بدر میں نمودار
ہوئے تمہارے ایمان کو مستحکم ہو جانا چاہیے اور دوسری طرف یہ کہ تمہیں سمجھنا چاہیے کہ تمہارے فتوحات تائید حق پر مبنی ہیں تو جو اس کی طرف کا
فریضہ ہو اس کے ادا کرنے کے لئے برضا و رغبت تیار ہو۔

إِذْ أَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَى وَالرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنْكُمْ ط
وَلَوْ تَوَاعَدْتُمْ لَا خْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ ۖ وَلَكِنَّ لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ
مَفْعُولًا ۗ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنَّا بَيْنَةً وَيَجِيءَ مَنْ حَىٰ عَنَّا بَيْنَةً ط وَإِنَّ اللَّهَ
لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۲﴾

”جب کہ تم ادھر کے کنارے پر تھے اور وہ ادھر کے کنارے پر [۲] اور قافلہ تم سے نیچے اور اگر تم میں آپس میں
وقت مقرر ہوا ہوتا تب بھی تم میں باہم وقت کے اعتبار سے اختلاف ہو جاتا مگر اللہ کو تو پورا کرنا تھا اس بات کو جو کہ
ہونے والی تھی تاکہ جو ہلاک ہو وہ حجت تمام ہونے کے بعد ہلاک ہو اور جو زندہ ہو وہ حجت کی بنا پر زندہ رہے اور
یقیناً اللہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا۔“

یہاں سے جنگ بدر کی روند ادبیان ہونا شروع ہوتی ہے۔ مسلمان مدینہ کی طرف سے چلے اور ابو جہل کی سرکردگی میں مشرکین کا لشکر مکہ
سے آ رہا تھا اور ابوسفیان کی سرکردگی میں تجارتی قافلہ شام کی جانب سے آ رہا تھا ہوسکتا تھا کہ مسلمان مکہ والوں کے آنے سے پہلے آگے بڑھ جاتے
اور شام کے قافلہ تک پہنچ جاتے اور کفار مکہ کی جماعتیں ٹھیک ایک دوسرے کے مقابلہ میں ایک ہی وقت پر اس طرح آمنے سامنے پہنچ گئیں کہ مقابلہ

[۱]. یوم الفریقان ای یوم بدر الفاروق بین الحق والباطل (جلالین)

[۲]. العدوۃ شفیر الراوی (تبیان) شما بکنار ک نزدیک بودید و ایشان بکنار ک دور تر (شاه ولی اللہ)

ناگزیر ہو گیا۔ اس کو ایک غیر معمولی کرشمہ قدرت کے طور پر بیان کیا جا رہا ہے کہ اس طرح ایک ہی وقت پر اس جگہ دونوں جماعتوں کا پہنچنا ہوا کہ معلوم ہوتا ہے جیسے پہلے سے دونوں میں طے ہو گیا تھا کہ وہاں پر ہم دونوں اس وقت پر ملیں گے بلکہ اگر آپس میں اس طرح کا قول و قرار بھی ہوتا تب بھی کچھ تو اختلاف ہو ہی جاتا کہ ایک کچھ پہلے پہنچتا اور دوسرا کچھ بعد لیکن یہ خداوندی انتظام تھا تا کہ اب ایک دفعہ کفر کو اسلام کے مقابلہ میں طاقت آزمائی کا موقع دے ہی دیا جائے اور پھر ظاہری اسباب کے تقاضا کے بالکل برخلاف اس اقلیت کو اس اکثریت کے مقابلہ میں فتح عطا کر کے دکھلادیا جائے [۱] اور اس کرشمہ قدرت کے ذریعہ سے حق اور باطل بالکل نمایاں ہو جائے۔

اب جو ہلاک ہو یعنی کفر پر قائم رہے وہ حق کے آثار آنکھوں سے نمایاں دیکھنے کے بعد [۲] صرف ہٹ دھرمی سے کفر پر قائم رہے گا اور جو زندہ ہو یعنی ایمان اختیار کرے وہ حجت یعنی پوری بصیرت ایمان کے ساتھ۔

اِذْ يُرِيكُهُمُ اللّٰهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيْلًا ۗ وَلَوْ اَرَاكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشَلْتُمْ

وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ۗ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذٰتِ الصُّدُوْرِ ﴿۳۳﴾

”جب کہ اللہ نے آپ کے خواب میں ان کی تعداد آپ کو کم دکھائی اور اگر وہ آپ کو ان کی تعداد زیادہ دکھاتا تو تم لوگ سست ہو جاتے اور طریقہ کار میں آپس میں دست و گریبان ہو جاتے [۳] لیکن اللہ نے خیریت رکھی یقیناً وہ سینوں کے اندر والی باتوں کا جاننے والا ہے۔“

اس آیت سے ظاہر ہے کہ جنگ بدر کے پہلے پیغمبر خدا ﷺ کو اس جنگ کی صورت خواب میں دکھائی گئی ہے اور اسی کے پیش نظر آپ برآمد ہوئے۔

اس سے بھی وہ حکایت یا خیال غلط ہو جاتا ہے کہ پیغمبر ﷺ اصل میں مشرکین کے قافلہ کو لوٹنے کے لئے نکلے تھے مگر اتفاق سے مقابلہ اس فوج سے ہو گیا جو قافلہ کی حفاظت کے لئے روانہ ہوئی تھی۔

ہاں! قرآن یہ کہتا ہے کہ رسول ﷺ کو کو اب میں تعداد مشرکین کی کم دکھائی گئی ورنہ رسول ﷺ اس خواب کو بیان فرماتے تو عام مسلمانوں پر خوف و دہشت طاری ہو جاتی اور طریق کار کے اختیار کرنے میں اختلاف ہو جاتا یعنی کچھ اشخاص مرعوبیت کے نتیجہ میں ایسی رائیں دیتے کہ جنگ کی نوبت نہ آئے اور گوشہ عافیت سے نکلنا نہ پڑے۔

خالق کریم نے اس مصلحت سے خواب میں تعداد کم دکھائی اور اس طرح اس باہمی اختلاف اور کشمکش سے بچالیا۔ [۴] یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ خواب رسول ﷺ کو دکھا یا گیا ہے مگر سستی وغیرہ کی نسبت رسول ﷺ کی طرف نہیں ہے ورنہ اس کا ذکر اسی واحد حاضر کے صیغہ کے ساتھ ہوتا جو آیت کے شروع میں ہے بلکہ اس کی نسبت عام مسلمانوں کی طرف ہے اس لئے صیغہ جمع حاضر استعمال کیا جا رہا

[۱]. ليقضى الله امر اكان مفعولا في عمل هو نصر الاسلام وحق للكفر (جلالين)

[۲]. قيام حجة عليه بما رأى من المعجزات العاشرات (تجيان)

[۳]. بزدي هي كوديدو بايكديگر نزاع هي كوديد (شاه ولي الله) البته سستی کرتے تو تم اور البته جھگڑتے تم بیچ کام کے (شاه فوج الدين)

[۴]. سلمكم من الفشل و التنازع (جلالين)

ہے۔ (لَفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ)

یہ قرآن مجید کے انداز تعمیر کے وہ پہلو ہیں جن پر سطحی نگاہیں اکثر متوجہ نہیں ہوتیں اور اس لئے غلط اندیشوں میں مبتلا ہوتی ہیں۔ شاہ عبدالقادر نے یہاں پر ایک اچھی نکتہ آفرینی کی ہے وہ لکھتے ہیں: ”پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں کافر تھوڑے نظر آئے اور مسلمانوں کو مقابلہ کے وقت تاکہ جرأت سے لڑیں پیغمبر کا خواب غلط نہیں، ان میں کافر رہنے والے کم ہی تھے اکثر وہ تھے جو پیچھے مسلمان ہوئے۔“ (موضح القرآن) مگر یہ حقیقت تو از روئے قرآن ناقابل انکار ہے کہ اس وقت جو حقیقت واقعہ یعنی جتنی تعداد نوح کی تھی اسے خالق نے خواب میں نمایاں نہیں کیا جس کی مصلحت خداوند عالم کی جانب سے بتائی جا رہی ہے اس کے بعد اس اصول کا تو قائل ہونا چاہیے کہ بعض اہم مصالِح کی بنا پر حقیقت کو نمایاں نہ ہونے دینا درست ہے اور اس سے تفسیر کا جو مطلق طور پر انکار کیا جاتا ہے یا اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے، وہ بلاشبہ غلط قرار پاتا ہے۔

وَإِذْ يُرِيكُمْهُمْ إِذِ التَّقِيْتُمْ فِي آعْيُنِكُمْ قَلِيلًا وَيُقَلِّلُكُمْ فِي آعْيُنِهِمْ

لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا ۗ وَاللَّهُ تَرْجِعُ الْأُمُورَ ۗ

”اور جب کہ تمہارے ایک دوسرے کے آمنے سامنے پہنچنے کے وقت وہ ان کی تعداد تمہاری آنکھوں میں کم دکھلا رہا تھا تا کہ اللہ پورا کرے اس بات کو جو وہ کرنے والا تھا اور اللہ ہی کی طرف رجوع ہے تمام چیزوں کا۔“

مشرکین کی تعداد مسلمانوں کو زیادہ نظر آتی تو ان میں سستی پیدا ہوتی اور کفار کی نظروں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ محسوس ہوتی تو وہ مقابلہ سے گریز کرتے لہذا وہ جنگ نہ ہوتی جس میں اللہ کو اپنی قوت قاہرہ کا ثبوت دے کر کفار کو شکست دینا تھی لہذا اس نے اپنی قدرت کے تصرف سے ان کی تعداد انہیں کم دکھائی اور ان کی تعداد انہیں کم محسوس ہوئی اس طرح دونوں نے جم کر مقابلہ کیا اور نتیجتاً قدرت کو جو منظور تھا وہ وقوع میں آ کر رہا مگر معلوم ہونا چاہیے کہ کفار کا یہ احساس کہ مسلمان تعداد میں بہت کم ہیں جو کہ واقعہ تھا، جنگ شروع ہونے کے قبل تک قائم رہا اور جب لڑائی شروع ہو گئی تو اب خالق کا کرنا یہ تھا کہ یہ انہیں تعداد میں اپنے سے دوئے نظر آنے لگے جس کا سورہ آل عمران میں تذکرہ ہے۔ [۱]

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَانْثَبِتُوا ۚ وَأَذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ

تُفْلِحُونَ ۗ

”اے ایمان لانے والو! جب کسی جماعت کا سامنا کرو تو ثابت قدم رہا کرو اور اللہ کو بہت یاد کرو، شاید کہ تم ہر طرح کی بہتری حاصل کرو۔“

میدان جنگ میں برقرار رہنے کی تاکید

اس کے پہلے پہلو یعنی فرار سے ممانعت ہو چکی ہے اور اب مثبت طور پر ثابت قدمی کا حکم دیا جا رہا ہے جس سے التزامی طور پر وہ ممانعت برآمد ہوتی ہے۔

[۱]. هذا قبل التحام الحرب فلما التحم اراهم اياهم مثلهم كما في ال عمران (جلالين)

آخری فقرہ سے ظاہر ہے کہ فرار کرنے والے ”بہتری“ سے محروم رہیں گے اور چونکہ یہ دین و دنیا کی بہتری ہے اور دینی بہتری کے معنی نجات کے ہیں، اس لئے اس سے ظاہر ہے کہ فرار کرنے والے نجات سے محروم رہیں گے اور بعض مترجمین نے فلاح کے معنی ہی نجات کے قرار دے دیئے ہیں۔^[۱]

بے شک یہ حکم کہ جب کسی جماعت کا سامنا کر تو ثابت قدم رہو، اس میں عقلی و نقلی قرآن سے یہ قید ضروری ہے کہ وہ جماعت ایسی ہو جس سے جنگ بحکم شرع درست ہو اس لئے کہ اگر جنگ ناجائز ہوئی تو اس میں ثابت قدمی بھی شرعاً کوئی ممدوح چیز نہیں ہو سکتی۔^[۲]

وَاطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ

اللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿۳۶﴾

”اور اللہ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو کہ تم میں سستی پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا بگڑ جائے گی اور صبر و برداشت سے کام لو یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

تنازع باہمی کے خراب نتائج

آیت بتا رہی ہے کہ اگر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنے کی بجائے آپس کے اختلافات میں پڑ گئے تو اس کے کیا نتائج نکلیں گے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطْرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَنِ

سَبِيلِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿۳۷﴾

”اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو نکلے اپنے گھروں سے اکڑ میں^[۳] اور آدمیوں کو دکھانے کے لئے اور وہ اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اللہ اس پر جو وہ کرتے ہیں حاوی ہے۔“

خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں تعریض ابو جہل اور اس کے ہمراہیوں پر ہے^[۴] مگر دوسرا تصور یہ ہے کہ یہ خود مسلمانوں کو جو جہاد میں جاتے ہیں تنبیہ ہے کہ اس میں اکڑ اور دکھلاوے کی نیت شامل نہ ہونا چاہیے^[۵] مگر اس صورت میں راہ راست سے روکنے کا جز کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

وَإِذْ زَيْنٌ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمْ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ

[۱] بود کہ شمار سنگار شوید (شاہ ولی اللہ) تو کہ تم چھکارا پاؤ (شاہ رفیع الدین)

[۲] الفئۃ المذکورۃ فی الایۃ وان کانت فتطلقۃ فالمراد منها کمشركة والباغیۃ (تبیان)

[۳] از روئے سرکشی (شاہ ولی اللہ) اتر آکر (شاہ رفیع الدین)

[۴] ایں حال ابو جہل و تابعان اوست (فتح الرحمن) ہم قریش لما جت خدمت لتحصی ایقن (تبیان)

[۵] - جہاد عبادت ہے، عبادت پر اتراوے یا دکھاوے کو کرے تو قبول نہیں (موضح القرآن)

وَأِنِّي جَارٌ لَكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَ آيَاتِ الْفِتَنِ نَكَصَ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ وَقَالَ إِنِّي بَرِيءٌ

مِّنْكُمْ إِنِّي أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ ۗ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٣٧﴾

”اور جب کہ شیطان نے ان کے سامنے ان کے کرتوتوں کو بنا ٹھنڈا کر پیش کیا اور کہا کہ آج آدمیوں میں کوئی تم پر غالب آنے والا ہے ہی نہیں اور میں تمہارا حمایتی ہوں [۱] اس کے بعد جب دونوں جماعتیں آمنے سامنے آئیں تو وہ پچھلے پیروں پلٹ گیا اور کہا میں تم سے بے تعلق ہوں بلاشبہ میں وہ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھتے۔ میں تو یقیناً اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ سخت سزا والا ہے۔“

بعض مفسرین تو لکھتے ہیں کہ واقعی شیطان آدمی کے بھیس میں آیا اور اس نے ابو جہل سے اس طرح گفتگو کی۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”وہ شیطان تھا جب اس نے جبریلؑ و میکائیلؑ دیکھے مسلمانوں کی طرف، تب بھاگا“ (موضح القرآن) بلکہ صورت بھی بتائی گئی ہے کہ:

كان اتاهم في صورة سراقه ابن مالك سيد تلك الناحية (جلالین)

وہ ان کے پاس سراقہ بن مالک کی صورت میں آیا تھا جو ان اطراف کا سردار تھا۔

ہمارے یہاں بھی اس کی روایت موجود ہے [۲]

اور ایسا نہ بھی ہو تو وہ بد اعمال لوگوں کے ذہن میں خیالات اسی طرح پیدا کرتا ہے جیسے کہ وہ ان سے باتیں کر رہا ہو۔

إِذْ يَقُولُ الْمُنِفِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ غَرَّ هُوَ لَاءِ دِينِهِمْ ۗ وَمَنْ

يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٣٩﴾

”جب کہتے تھے منافق لوگ اور وہ جن کے دلوں میں بیماری ہے کہ ان لوگوں کو فریب میں مبتلا کر دیا ہے ان کے دین نے اور جو اللہ پر بھروسہ کرے تو یقیناً اللہ زبردست ہے صحیح و درست کام کرنے والا۔“

کھلا ہوا مطلب تو اس کا بھی سمجھ میں آتا ہے کہ جنگ کے قبل مسلمانوں کی قلت اور دشمنوں کی کثرت کی بنا پر منافق اور مسلمانوں کے بدخواہ گویا خوش ہو رہے تھے اور مسلمانوں پر یہ طعن کس رہے تھے کہ ان کے دین نے ان کو فریب میں مبتلا کر دیا ہے کہ یہ اس بے سرو سامانی کے عالم میں اتنی کثیر جمعیت کے مقابلہ کے لئے جا رہے ہیں۔ اب غرہم کا لفظ غرہ بمعنی فریب سے ہوگا۔

شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادہ شاہ رفیع الدین نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے [۳] جلالین کی تشریح بھی یہی ہے:

غَرَّ هُوَ لَاءِ الْمُسْلِمِينَ دِينُهُمْ إِذْ خَرَّ جَوَامِعُ قُلُوبِهِمْ يَقَاتِلُونَ الْجَمْعَ الْكَثِيرَ تَوْهَمًا إِنَّهُمْ يَنْصُرُونَ بِسَبَبِهِ.

[۱] من مدد کنندہ امر شمارا (شاہ ولی اللہ)

[۲] ہو قول ابی جعفر و ابی عبد اللہ علیہما السلام (تبیان)

[۳] فریفتہ است این مسلمانان را دین ایشان (شاہ ولی اللہ) فریب دیا ہے ان کو دین ان کے نے (شاہ رفیع الدین)

دھوکا دیا ہے ان مسلمانوں کو ان کے دین نے جب کہ وہ اپنی قلت تعداد کے باوجود نکلے ہیں اس بڑی جماعت سے جنگ کے لئے یہ تصور کر کے کہ اس دین کے سبب سے مدد الہی ان کے شامل حال ہوگی۔

ہمارے اکابر مفسرین نے بھی اسی کے مطابق تشریح کی ہے [۱] مگر شاہ ولی اللہ کے دوسرے فرزند شاہ عبدالقادر نے اس غرور کو گھنٹڈ کے معنی میں لے کر یہ مطلب کہا ہے کہ:

مسلمانوں کی دلیری دیکھ کر منافق اس طرح طعن کرنے لگے تھے سو اللہ نے فرمایا کہ یہ غرور نہیں توکل ہے۔ (موضح القرآن) پہلی صورت میں آخری فقرہ منافقوں کی اس طعن زنی کے مقابلہ میں مسلمانوں کو ڈھارس بندھانا ہے کہ ان کی کثرت تعداد جتنی بھی ہو تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ اللہ کی طاقت سے بڑھ کر نہ کسی کی طاقت ہے نہ اس کی طرح صحیح و درست کوئی کام کرنے والا ہے۔ تم کو اس پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا ۖ الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوْهُهُمْ ۖ وَأَدْبَارَهُمْ ۗ
وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ﴿۵۰﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمْتُمْ آيٰدِيكُمْ ۖ وَآَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلّٰمٍ
لِّلْعٰبِیْدِ ﴿۵۱﴾ كَذٰبِ اِلٰ فِرْعَوْنَ ۖ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۗ كَفَرُوْا بِآيٰتِ اللّٰهِ
فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۵۲﴾

’اور کاش تم دیکھو [۱] وہ موقع جب فرشتے کافروں کی قبض روح کر رہے ہوں گے، وہ مارتے ہوں گے ان کے منہ اور پشت پر اور (کہتے ہوں گے) چکھو اس آگ میں جلنے کا مزہ [۲]۔ یہ پاداش اس کی ہے جو تمہارے ہاتھ کر چکے ہیں اور یہ کہ اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ اسی طرح کہ جیسے ہوا [۳] فرعون کے حوالی موالی اور ان کے ساتھ جوان کے پہلے تھے انہوں نے آیات الہی کے ساتھ کفر اختیار کیا تو اللہ نے ان کے گناہوں کے سبب انہیں گرفت میں لے لیا یقیناً اللہ طاقتور ہے سخت سزا دینے والا۔‘

بعض تفاسیر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ جنگ بدر ہی کے موقع کا تذکرہ ہے جب ملائکہ مسلمانوں کی مدد کے لئے آئے تھے اور کافروں سے جنگ کر رہے تھے۔ اور یہ منہ اور پشت پر مارنا جنگ کے عالم کا حال ہے کہ وہ انہیں اسلحہ جنگ سے منہ اور پشت پر ضربیں لگا رہے تھے۔ [۴]

[۱] الغرور اظہار النصح مع ابطان الغش (تبیان)

[۲] کاش کہ دیکھتے تو (شاہ رفیع الدین) دوسرے لوگوں نے ’لو کو شرطیہ لیا ہے جیسے ’تعجب می کر دی اگر می دیدی (شاہ ولی اللہ) جواب ’لو‘: لورایت امر اعظیما. (جلالین)

[۳] ویقولون لهم ذوقوا (جلالین) می گویند بچشید (ولی اللہ)

[۴] مانند عادت قوم فرعون (ولی اللہ)

[۵] انه یوم بدر (تبیان)

اس صورت میں ترجمہ یوں ہوگا کہ ”جب فرشتے کافروں کی پوری طرح جانیں لے رہے تھے اس طرح کہ مار رہے تھے ان کے منہ اور پشت پر اور (کہتے تھے)..... (یہ تو اس وقت تمہاری سزا ہے اور) پکھنا (اس کے بعد دوزخ کی) آگ کا مزہ، یعنی ابھی یہ تو تلوار کی آنج ہے جس میں تم بھسم ہو رہے ہو مگر اسی پر خاتمہ نہیں ہے بلکہ اس کے بعد آتش جہنم کا عذاب بھی ہے جس میں تمہیں مبتلا ہونا ہے مگر آیت کے الفاظ سے مجھے یہ مفہوم زیادہ قریب معلوم نہیں ہوتا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۗ
 وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٥٣﴾ كَذٰبِ اِلٍ فِرْعَوْنَ ۗ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ط كَذَّبُوْا
 بِآيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِدُؤُوْبِهِمْ ۗ وَاَعْرَفْنٰ اِلٍ فِرْعَوْنَ ۗ وَكُلُّ كَاٰتِلٍ
 ظٰلِمِيْنَ ﴿٥٤﴾

”یہ اس بنا پر ہے کہ اللہ نہیں ہے بدلنے والا کسی نعمت کا جو اس نے کسی جماعت کو دی ہے جب تک وہ خود اپنے میں تبدیلی پیدا نہ کریں اور یہ کہ اللہ سننے والا ہے، جاننے والا، اسی طرح کہ جیسے ہوا فرعون کے حوالی موالی اور ان کے ساتھ جو ان کے بھی پہلے تھے، انہوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں کو جھٹلایا تو ان کے گناہوں کے سبب سے ہم نے ان کو ہلاک کیا اور فرعون کے حوالی موالی کو ڈبو دیا اور وہ سب ظالم لوگ تھے۔“

خدا کی نعمتوں میں تبدیلی خود اپنے نفوس کی تبدیلی کا نتیجہ

یہ وہی اصول قدرت ہے جو دوسری جگہ قرآن میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے کہ:

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ .

خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے میں تبدیلی پیدا نہ کرے۔ (سورہ رعد - ۱۱)

یہ تبدیلی کیا ہے جو وہ اپنے میں کریں گے؟! یعنی خالق کی نعمتوں کی ناقدری کرنے لگیں، اسے بھول جائیں، تن آسانی اور عیش پرستی میں

مبتلا ہو جائیں، معاصی الہیہ میں منہمک ہو جائیں، تب اللہ اپنی نعمتوں کو سلب کر لیتا ہے۔

کیا اس کے بعد اقبال کو اپنے ”شکوہ“ کا جواب کچھ نظم کرنے کی ضرورت تھی؟ پورے شکوہ کا جواب یہ ایک قرآن کی آیت ہے۔

اِنَّ شَرَّ الدّٰوَابِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٥٥﴾ الَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ
 مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عٰهَدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿٥٦﴾ فَاِمَا تَتَّقُنَّهُمْ فِي
 الْحَرْبِ فَشَرٌّ دَرِيْبُهُمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَدَّكُرُوْنَ ﴿٥٧﴾

”یقیناً بدترین چلنے پھرنے والی مخلوق اللہ کے نزدیک یہ ہیں جنہوں نے کفر اختیار کیا تو اب کسی طرح وہ ایمان

لائیں گے، ہی نہیں جن سے آپ معاہدہ کرتے ہیں پھر وہ ہر دفعہ اس عہد و پیمان کو توڑ ڈالتے ہیں اور انہیں اس میں کوئی باک نہیں ہے تو اب اگر جنگ میں وہ آپ کے ہاتھ آجائیں تو ان کا صفایا کر کے ان کے بعد والوں کی جمعیت کو منتشر کر دیجئے [۱] شاید وہ اس سبق کو یاد رکھیں۔“

کفر اگر نادانستہ، بے شعوری کے ساتھ ہو تو وہ درحقیقت ایک کیفیت ہے، انسان کا فعل نہیں ہے قرآن مجید میں زیادہ تر ”کافر کی صفت استعمال کرنے کے بجائے اسم موصول کے ساتھ فعل لایا گیا ہے:

«الَّذِينَ كَفَرُوا»، جس کا ترجمہ یہ ہوا کرتا ہے کہ ”جنہوں نے کفر اختیار کیا“، یہ اختیار ایک دانستگی کا اظہار کرتا ہے جس میں دھاندلی، سخن پروری، نفسانیت اور عناد کے کیفیات مضمحل ہیں اور یہ چیزیں قبول حق سے آئندہ بھی سدرہ ہیں، اسی لئے یہاں ماضی کے کفر کے ساتھ کہ ”الذین کفروا“، جنہوں نے کفر اختیار کیا آئندہ کی خبر کو کہ ”وہ ایمان نہیں لائیں گے“، صرف تفریح کے ساتھ بطور نتیجہ بیان کیا ہے یعنی قبل میں جب کہ جان بوجھ کر انکار کیا ہے تو آئندہ کے لئے ان سے یہ امید غلط ہے کہ وہ کبھی ایمان لائیں گے۔ [۲]

بعد میں جو اوصاف ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ بنی قریظہ کا کردار ہے۔ آخر میں جو ہے کہ ”شاید وہ اس سبق کو یاد رکھیں“، یعنی ان کے انجام کو دیکھ کر بعد والے عبرت حاصل کریں اور متنبہ ہو جائیں۔ [۳]

وَأَمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَأَبْذُ إِلَيْهِمْ عَلَى سَوَاءٍ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ

الْخَائِنِينَ ﴿۵۷﴾

”اور اگر آپ کو کسی جماعت سے بددیانتی کے آثار محسوس ہوں تو ان کے عہد و پیمان کو ان کی طرف پھینک دیجئے [۴] کہ معاملہ برابر ہو جائے، بلاشبہ اللہ بددیانتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔“

اس کے پہلے جو حکم تھا کہ ”وہ جنگ میں آپ کے ہاتھ آجائیں تو صفایا کر دیجئے“، ان لوگوں کے لئے تھا جن سے غداری ظہور میں آچکی ہو لیکن دوسری صورت یہ ہے کہ ابھی غداری عمل میں نہیں آئی لیکن آثار و قرآن اس کے پیدا ہو گئے ہیں کہ یہ بھی غداری کریں گے۔ ان کے لئے یہ کہا جا رہا ہے کہ عہد و پیمان کے قائم رکھتے ہوئے تو ان پر کوئی دستِ تعدی دراز نہیں کیا جاسکتا لیکن ان کے لئے یہ صورت ہے کہ ان کے عہد و پیمان کو ان کی طرف پھینک دیا جائے یعنی انہیں آگاہ کر دیا جائے کہ اب ہم اس معاہدہ کو منسوخ کرتے ہیں۔ [۵]

”معاملہ برابر ہو جائے“ یعنی معاہدہ کے قبل جو صورت حال تھی کہ کوئی خاص آئینی پابندی ان کے بارے میں عائد نہیں تھی، وہی

[۱]. متفرق ساز بسبب کشتن ایشان آنان را کہ پس پشت ایشان باشند (شاہ ولی اللہ)

[۲]. کانه قال کفروا مصممین علی الکفر فهم لایؤمنون (تبیان)

[۳]. لعلمهم ای الذین خلفهم (جلالین)

[۴]. اطرح عہدہم الیہم (جلالین)

[۵]. لظہور امارات الخیانة التي دلت علی نقض العہد (تبیان)

صورت حال اب پیدا ہو جائے۔^[۱]

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَبَقُوا ۗ إِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُونَ ﴿۵۹﴾

’اور وہ جنہوں نے کفر اختیار کیا، یہ نہ سمجھیں کہ وہ نکل گئے، بلاشبہ وہ عاجز نہیں کر سکیں گے۔‘

یہ آیت باعتبار مضمون گزشتہ سلسلہ سے بھی متعلق ہو سکتی ہے اور ’نکل گئے‘ کا مطلب اس صورت میں یہ ہوگا کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ ان کی ترکیب چل گئی اور وہ دواؤں اپنا کر گئے۔^[۲]

لیکن بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ جنگ بدر کے شکست خوردہ مشرکین کے بارے میں ہے اور ’نکل گئے‘ کا مطلب یہ ہے کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ بچ کر نکل گئے اور اب وہ محفوظ ہیں، نہیں تقدیر الہی سے بچ کر وہ کہیں تھوڑی جاسکتے ہیں۔^[۳]

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مِمَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهِ وَعَدُّوا لِلَّهِ

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مِمَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهِ وَعَدُّوا لِلَّهِ

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مِمَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهِ وَعَدُّوا لِلَّهِ

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مِمَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهِ وَعَدُّوا لِلَّهِ

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مِمَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهِ وَعَدُّوا لِلَّهِ

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مِمَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهِ وَعَدُّوا لِلَّهِ

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مِمَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهِ وَعَدُّوا لِلَّهِ

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مِمَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهِ وَعَدُّوا لِلَّهِ

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مِمَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهِ وَعَدُّوا لِلَّهِ

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مِمَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهِ وَعَدُّوا لِلَّهِ

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مِمَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهِ وَعَدُّوا لِلَّهِ

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مِمَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهِ وَعَدُّوا لِلَّهِ

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مِمَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهِ وَعَدُّوا لِلَّهِ

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مِمَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهِ وَعَدُّوا لِلَّهِ

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مِمَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهِ وَعَدُّوا لِلَّهِ

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مِمَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهِ وَعَدُّوا لِلَّهِ

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مِمَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهِ وَعَدُّوا لِلَّهِ

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مِمَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهِ وَعَدُّوا لِلَّهِ

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مِمَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهِ وَعَدُّوا لِلَّهِ

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مِمَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهِ وَعَدُّوا لِلَّهِ

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مِمَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهِ وَعَدُّوا لِلَّهِ

[۱]۔ برابر کے برابر یعنی جو سرانجام صلح سے پہلے کر سکتے ہو، سوا ب بھی کر سکتے ہو لڑائی کا، اس میں کچھ بدقولی نہیں (موضح القرآن)

[۲]۔ ایشان پیدش دستی کو دہاند (شاہ ولی اللہ) کہ آگے نکل گئے (شاہ رفیع الدین)

[۳]۔ نزل فی من افلت یوم بدر... سبحو اللہ ای فاتوہ... انہم لایعجزون لایفوتونہ (جلالین)

اس سے کہ ”تم نہیں جانتے“ صاف ظاہر ہے کہ ایک طبقہ منافقوں کا ایسا تھا جن کا عموماً مسلمانوں کو علم اور احساس نہیں تھا۔ اس لئے منافقین کے لفظ کو جہاں جہاں قرآن میں آئے، بس عبد اللہ بن ابی بن سلول اور اس کے ساتھیوں پر ڈھال کر اطمینان کی سانس لینا درست نہیں ہے۔ یہ تو وہ منافقین تھے جن کا نفاق بالکل کھل گیا تھا اور سب جانتے تھے کہ یہ منافقین ہیں اور اسی لئے ان سے تو بعد میں احکام اسلام بھی سلب کر لئے گئے چنانچہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر نماز جنازہ پڑھنے سے روک دیا گیا، استغفار کرنے سے منع کیا گیا تو یہ منافقین وہ کب ہو سکتے ہیں جن کے لئے خالق ارشاد فرما رہا ہے کہ ”تم لوگ انہیں نہیں جانتے۔ ہم جانتے ہیں“ اور یہ فقرہ قرآن کا، جلالین کی اس کوشش کو نا کام بنا دیتا ہے جو انہوں نے اس لفظ کو مشکوک بنانے کے لئے کیا ہے اور کہا ہے:

وهو المنافقون واليهود اس سے مراد منافقین ہیں یا یہودی

یہ تردید و تردد بالکل بے محل ہے، اس لئے کہ یہود کے لئے کون نہیں جانتا تھا کہ وہ دشمن اسلام ہیں، جو خالق فرماتا کہ ”انہیں بس ہم ہی جانتے ہیں“۔

اس فقرہ کو دیکھتے ہوئے یہی ماننا ناگزیر ہے کہ اس سے مراد منافقین ہیں اور منافق بھی وہ نہیں جو عام طور پر منافق سمجھے ہی لئے گئے تھے بلکہ کچھ بڑے گہرے قسم کے منافق جو آخر تک اسلامی جماعت میں گھلے ملے رہے اور اسلام کے پردہ میں اپنے کو مخفی کئے رہے۔ بعد میں مسلمانوں میں قیامت تک کے واسطے جو انتشار و افتراق کا سامان مہیا کیا، وہ سب انہی منافقین کے گروہ نے جن کے خطرات سے خالق نے بہت سے مقامات پر قرآن میں مسلمانوں کو آگاہ کیا تھا۔

رہ گئے عبد اللہ بن ابی وغیرہ، وہ تو وقت سازشیں کرتے رہتے تھے جو اسی وقت پر منکشف ہو جاتی رہیں اور اس لئے وہ جماعت رسوا اور ذلیل ہو کر ختم ہو گئی۔ اس سے اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کو کیا صدمہ ایسا پہنچا جس کا اثر کوئی دیر پا ہوتا اور جس پر متنبہ کرنے کی قرآن اتنی قوت و شدت کے ساتھ برابر ضرورت محسوس کرتا۔

وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۗ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٦١﴾

”اور اگر وہ صلح کی جانب مائل ہوں تو آپ بھی اس کی طرف مائل ہو جائیے اور اللہ پر بھروسہ کیجئے، یقیناً وہ سننے والا، بڑا جاننے والا۔“

منافقین کے ساتھ صلح کا حکم

اسلام میں جنگ اضطراری صورت سے ہوتی ہے یعنی جب امن و صلح کے امکانات ختم ہو گئے ہوں اس وقت جنگ شروع ہونا چاہیے اور جب امن و صلح کے امکانات پھر پیدا ہو جائیں تو اس وقت جنگ کو ختم ہو جانا چاہیے۔ یہ اس آیت سے بالکل صاف ظاہر ہے۔

”اللہ پر بھروسہ کیجئے“..... یعنی اس پر غور بھی نہ کیجئے کہ وہ صلح کی جانب جو مائل ہوئے ہیں، اس سے کہیں مہلت پا کر انہیں مزید مضبوطی حاصل کرنا مقصود نہ ہو یا یہ کہ مسلمانوں پر بے خبری کی حالت میں حملہ کرنا مقصود نہ ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ ان دو دراز کے اندیشوں کو صلح کی راہ میں ہرگز حائل نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے اور صلح کر لینا چاہیے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے ”آپ بھی صلح کی طرف مائل ہو جائیے“ والے لکڑے کے مضمون پر جوان کے لفظوں میں ہے، حاشیہ دیا ہے کہ: ”این امر برائے اباحت است“ (فتح الرحمن) مطلب یہ ہے کہ ”مائل ہو جائیے“ سے کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی ہے بلکہ اجازت ہے کہ آپ بھی مائل ہو سکتے ہیں مگر اس کے ساتھ جو ”اللہ پر بھروسہ“ کرنے کا حکم ہے، وہ کیسا جس جواز کا پتہ دیتا ہے؟!

پھر آخر میں جو کہا ہے کہ ”وہ سننے والا ہے، جاننے والا“..... یعنی جو پیشکش صلح کی ان کی طرف سے ہوئی، اس بات کو اللہ سن رہا ہے اور اس پیشکش کا جواب ویسا ہی دینا چاہیے جیسا خدا کو مطلوب ہے اور ”جاننے والا ہے“ یعنی ان کی نیت اس صلح کی پیشکش سے کیا ہے؟ اسے اللہ جانتا ہے لہذا وہ اس کا تدارک کرے گا یا ان کو اس کی سزا دے گا [۱] بہر حال تم کو ان کی نیت سے کوئی بحث نہ ہونا چاہیے۔

ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ حکم قرآنی میں حالات کی نوعیت کا دخل ہو۔ بعض حالات میں مخالف کی پیشکش قبول کرنا لازم ہو اور بعض حالات میں جائز ہو جس پر نظر کرنا اس سربراہ کی ذمہ داری ہے جس کی قیادت میں جہاد ہو رہا ہے۔ [۲]

وَإِنْ يَرِيدُوا أَنْ يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ ۗ هُوَ الَّذِي آتَاكَ بِنَضْرِهِ ۗ
بِالْمُؤْمِنِينَ ﴿۳۷﴾ وَالْفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ۗ لَوْ أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَلْفَتْ

بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ۗ وَلَكِنَّ اللَّهَ أَلْفَ بَيْنَهُمْ ۗ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۳۸﴾

”اور اگر وہ چاہیں گے کہ آپ کو دھوکا دیں تو بلاشبہ آپ کے واسطے اللہ کافی ہے، وہ وہ ہے جس نے آپ کو تقویت پہنچائی اپنی امداد سے اور ایمان والوں کی جماعت سے اور ان کے دلوں میں باہمی محبت پیدا کی۔ اگر آپ تمام روئے زمین کی دولت صرف کر دیتے تو بھی ان کے دلوں میں باہمی محبت پیدا نہیں کر سکتے تھے مگر اللہ نے ان کے دلوں میں باہمی محبت پیدا کی، یقیناً وہ زبردست ہے، صحیح صحیح کام کرنے والا۔“

بندگان الہی کے مددگار ہونے کا ثبوت

اصل مدد کرنے والا تو خداوند عالم ہے مگر ظاہری ذریعہ امداد کا ایمان والوں کی جماعت ہے تو اس کا بھی خالق نے اپنی امداد کے ساتھ ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ [۳]

اس مثال کو سامنے رکھتے تو معلوم ہوگا کہ کسی ولی الہی کسی مقرب بارگاہ خداوندی اور خصوصیت کے ساتھ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام یا دیگر آل طاہرین کو وقت مصیبت طلب امداد کے لئے پکارنے پر جو ایک جماعت ”شُرک“ ”شُرک“ کی آواز بلند کرتی ہے، وہ کتنا غلط ہے۔

[۱] یعنی اگر دل میں دفا کریں گے، اللہ کو معلوم ہے۔ اس کی سزا دے گا۔ (موضح القرآن)

[۲] لیس فی الایة ما یدل علی ان الکفار اذا مالوا الی الہدنة و جب اجابتہم ایہا علی کل حال لان الاحوال مختلف فی ذلک (تبیان)

[۳] بیداری دادن خود و مسلیمانان (شاہ ولی اللہ) ساتھ مدد اپنے کے اور ساتھ مسلمانوں کے (شاہ فہج الدین)

خالق نے مومنین سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرائی تو وہ اسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ”سہارے“ کے طور پر ”بالمومنین“ کہہ کے ذکر فرما رہا ہے، اب وہی اگر ان بزرگواروں سے ہماری مدد کرادے تو اس میں شرک کا کیا سوال ہے؟! پکارنے والے کے ذہن میں یہ ہونا چاہیے کہ اصل مدد کرنے والا خداوند عالم ہے اور یہ حضرات اس کی طرف سے مقرر شدہ ذرائع ہیں اور بس۔ اس میں شرک کا کوئی تصور قائم کرنا بالکل غلط ہے۔

یہ الفت باہمی جسے خالق نے قدرت الہی کا کرشمہ کہا ہے، انصار کی جماعت سے تعلق رکھتی ہے جن میں پہلے اوس و خزرج کے دو جتھے ہمیشہ برسر پیکار رہے تھے^[۱] مگر اسلام نے انہیں گلے ملا دیا اور یہ واقعہ ہے کہ اس کے بعد تاریخ میں اوس و خزرج کی قبیلہ داری جنگ پھر کبھی وقوع میں نہیں آئی مگر اب اسے کیا جائے کہ اس کے بعد خود مہاجرین میں ”حب دنیا“ پھوٹ ڈلوادے اور پھر ”مؤلفۃ القلوب“ کی جماعت کا ایک تیسرا عنصر بھی ایسا داخل ہو جائے جس سے بعد میں مسلمانوں کے درمیان وہ خون ریز لڑائیاں برپا ہو جائیں جن کی لپیٹ میں مہاجرین و انصار سب ہی آجائیں اور جن کی ہنگامہ خیزی کی شدت کے سامنے اوس و خزرج کی پرانی لڑائیاں بھی گر و کارواں بن کر پیچھے رہ جائیں اور جن کے نتائج آج تک مختلف خطہ ہائے ارض میں مسلمانوں کو جھگلتا پڑ رہے ہوں۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۲۴﴾
 ”اے پیغمبر! آپ کے لئے اللہ کافی ہے اور مومنین میں سے وہ جس نے آپ کی پیروی کی ہے۔“

وہایت شکن قرآنی صراحت

اے لیجئے! یہاں تو ”کافی“ ہونے کی منزل میں اللہ نے الفاظ قرآن میں اپنے ساتھ ان مومنین کو بھی شریک کر لیا چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب بھی ترجمہ میں یہی لکھتے ہیں:

”کفایت کنندہ است ترا خدا او کفایت کنند ترا آنانکہ پیروی تو کردہ انداز مسلمانان“

شاہ رفیع الدین فرماتے ہیں:

”کفایت ہے تجھ کو اللہ اور جن نے پیروی کی تیری مسلمانوں میں سے۔“

مفسرین نے بھی یہی تشریح کی ہے:-

حسب الله وحسبك من اتبعك من المؤمنين (جلالین)

کافی ہے آپ کے لئے اللہ اور کافی ہے آپ کے لئے وہ جس نے مومنین میں سے آپ کی پیروی کی۔

اب ہر مسلمان جانتا ہے کہ بالذات اللہ کافی ہے مگر اسی کی دی ہوئی طاقت سے جو کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کر رہا ہے جب اللہ اپنے ساتھ اس پر بھی ”کافی“ کے ہم معنی لفظ کا اطلاق کر رہا ہے تو اب اگر کوئی اسی کو ”مدگار“، ”کارساز“، ”مشکل کشا“ وغیرہ کے الفاظ سے یاد

[۱] المراد بالمؤمنين الانصار وبتأليف قلوبهم صاكان بين الاوس والخزرج من المعاداة القتال هذا قول ابى جعفر عليه السلام

کرتے تو اس پر ”شُرک، شرک“ کی آوازیں کیوں بلند ہوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس سے ظاہر ہے کہ جماعت ”اہل ایمان“ میں بہت سے ایسے بھی ہیں جو پیغمبر کے پیرو کی حیثیت نہیں رکھتے اب وہ پیروی کرنے والے چاہے دو چار ہی ہوں بلکہ کسی منزل پر ایک ہی رہ جائے تو اسی کو پیغمبر ﷺ اپنے لئے کافی سمجھیں گے جیسا کہ احد میں ہوا کہ مددگاروں کی جماعت متفرق ہو گئی تھی اور آخر میں ایک علی بن ابی طالبؓ کی ذات تھی جس نے رسول ﷺ کی نصرت کا حق ادا کر کے آخر میں جنگ کو فتح کر کے دکھلایا جس پر ملک کو بھی کلمہ پڑھنا پڑا کہ لا فعی الا علی لا سیف الا ذو الفقار۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ ۗ إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ
صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتِينَ ۚ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِنَ الَّذِينَ
كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ﴿٦٥﴾

”اے پیغمبر! ایمان لانے والوں کو جنگ پر آمادہ کیجئے۔ اگر تم میں کے بیس صبر کرنے والے ہوں تو دو سو (۲۰۰) پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں کے سو (۱۰۰) ہوں تو کافروں میں سے ایک ہزار پر غالب آئیں گے اس لئے کہ وہ ایک ایسی جماعت ہے جو سمجھ نہیں رکھتی۔“

ایک اور دس کے مقابلہ کا حکم

کیا معنی ”سمجھ نہیں رکھتی“؟ یعنی بصیرت ایمانی سے محروم ہے۔^[۱]

شاہ عبد القادر کے لفظوں میں ”یعنی یقین نہیں رکھتے اللہ پر اور ثواب پر اور جس کو یقین ہو، وہ موت پر دلیر ہے“ (موضح القرآن)

کہا گیا ہے کہ ”يَغْلِبُوا“ کے معنی خبر کے نہیں کہ ”غالب آئیں گے“ بلکہ مطالبہ کے ہیں کہ غالب آنا چاہیے۔^[۲]

چنانچہ وقوع اس کا نہیں ہوا جو بعد کی آیت سے ظاہر ہے۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ جب خالق کی طرف کی خیر مشروط تھی ان میں صبر اور بصیرت ایمانی کے ساتھ تو اس نتیجے کے عدم وقوع کو اس کی دلیل کیوں نہ سمجھا جائے کہ ان میں صبر کی کمی ثابت ہوئی اور آخرت پر یقین کی بھی جو اس معیاری مقابلہ کی شرط تھی۔

أَلَنْ خَفَّفَ اللَّهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا ۗ فَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ
صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ
وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿٦٦﴾

[۱] اہم علی جہالہ خلاف من قاتل علی بصیرتو ہویر جو بہ ثواب الاخرۃ (تبیان)

[۲] وان کان بلفظ الخبر فالمراد بہ الامر (تبیان)

”اب اللہ نے تم پر سے بار ہلکا کر دیا اور معلوم ہو گیا کہ تم میں کمزوری ہے۔ اچھا تو اب تم میں کے سو صبر والے ہوں تو دو سو پر غالب آئیں اور اگر تم میں کے ہزار ہوں تو دو ہزار پر غالب آئیں۔ اللہ کے حکم سے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

مسلمانوں میں کمزوری کا ثبوت

ترتیب قرآن میں دونوں آیتیں پاس پاس ہیں لیکن دونوں کے مضمون سے ظاہر ہے کہ ان دونوں میں بڑا فاصلہ ہے۔ وہ آیت معرکہ امتحان میں جانے سے پہلے کی ہے اور یہ معرکہ امتحان کے نتیجے کے وقوع میں آنے کے بعد کی ہے جن کے درمیان نہ جانے کتنی آیات اور کتنے سورے دوسرے مضمونوں سے متعلق نازل ہوئے تھے لیکن وہ سب اور مقامات پر ہیں اور یہ دونوں آیتیں ایک ساتھ درج ہو گئی ہیں۔

آیت کے مضمون سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا زعم اپنے ثبات قدم اور بصیرت و یقین کے استحکام پر بہت کچھ تھا جس کے لئے پہلا معیار پیش کیا گیا اور اس کے بعد یہ اس پر پورے نہیں اترے۔

اللہ کو علم اس کا ازل سے تھا لیکن وہ امتیاز وقوع میں آیا۔ اس لئے کہا جا رہا ہے کہ اسے علم ہو گیا کہ تم میں کمزوری ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب بھی کہہ رہے ہیں کہ:

”دانست کہ در میان شما ضعفی ہست۔“

ضعف کیا؟ مادی طاقت سے ضعف تو پہلے ہی تھا، اس لئے کہ کفار دس گنے زیادہ تھے۔ ماننا پڑے گا کہ ایمان کا ضعف، یقین کا ضعف اور صبر میں ضعف ہے۔ اور یاد رکھئے کہ ”تم میں ضعف ہے“

یہ نہیں کہ ”تمہاری آئندہ نسلوں میں ضعف ہو گا لہذا تخفیف کی جاتی ہے، مگر شاہ عبدالقادر نے اس میں کچھ خطرناک پہلو محسوس کرتے ہوئے لکھ دیا ہے کہ:

”اول کے مسلمان یقین میں کامل تھے ان پر حکم ہوا تھا کہ آپ سے دس برابر کافروں پر جہاد کریں۔ پچھلے مسلمان ایک قدم آگے تھے تب یہی حکم ہوا کہ دونوں پر جہاد کریں۔ یہی حکم اب بھی باقی ہے“ (موضح القرآن)

اب جلالین کو ملاحظہ فرمائیے، قرآن تو تخفیف کا سبب بنا رہا ہے کہ تم میں کمزوری ظاہر ہوئی اور وہ فرماتے ہیں کہ:

ثُمَّ نَسَخَ لَهَا كَثْرًا وَقَوْلُهُ: أَنْ يُخَفَّفَ عَنْكُمْ.

جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تو وہ پہلا حکم اس آیت کے ذریعے سے منسوخ کر دیا گیا کہ اب اللہ تم سے تخفیف کرتا ہے۔ یعنی جب تعداد کم تھی تو وہ سخت حکم تھا اور جب تعداد زیادہ ہو گئی تو وہ حکم منسوخ ہو گیا اور یہ دوسری آیت اتری، سبحان اللہ یہ اضطراب کیا ضمیر کے کسی چور کا پتہ نہیں دیتا!؟

مَا كَانَ لِنَبِيِّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أُسْرَىٰ حَتَّىٰ يَشْتَرِنَ فِي الْأَرْضِ ۗ تُرِيدُونَ عَرَضَ

الدُّنْيَا ۗ وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٤٦﴾

”کسی نبی کو یہ حق نہیں ہے کہ اس کے ہاتھ میں کچھ قیدی ہوں، جب تک کہ خوب زمین میں ان کے خون نہ بہائے [۱] تم لوگ مال دنیا کے طلبگار ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے اور اللہ زبردست ہے، صحیح کام کرنے والا۔“

قیدیوں کے بارے میں الہی منشا کا اعلان

کہا جاتا ہے کہ جنگ بدر میں کچھ صحابہ کی یہ رائے ہوئی کہ کفار کے قیدیوں سے فدیہ یعنی مالی معاوضہ لے کر ان کو چھوڑ دیا جائے اور خالق کا منشا یہ تھا کہ انہیں قتل کیا جائے۔ اس پر یہ آیت آئی۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ حکم وقتی تھا جو بعد میں منسوخ ہو گیا اور یہ حکم ہوا کہ فدیہ لے کر چھوڑا جاسکتا ہے۔ [۲]
حقیقت یہ ہے کہ ترتیب کے شان نزول کے مطابق نہ ہونے سے ہم سمجھ نہیں سکتے کہ یہ حکم کن حالات میں ہوا تھا حالانکہ خالق کی جانب سے بعد میں بڑے نرم لب و لہجہ میں عفو و کرم اور فدیہ کی اجازت دی گئی ہے جس کا اس آیت کے لب و لہجہ سے کوئی تناسب محسوس نہیں ہوتا تو معلوم ہوتا ہے کہ خالق کا یہ قہر آمیز عتاب اس پر ہوا کہ کچھ مسلمانوں نے صرف مال دنیا کی حرص میں بغیر حکم الہی از خود یہ فیصلہ کر لیا کہ ان سے مالی معاوضہ لے لیا جائے بلکہ بعد کی آیت سے پتہ چلتا ہے کہ وصول بھی کر لیا جس پر ارشاد ہوا کہ یہ ایسی بات تھی کہ اس پر عذاب الہی کا نازل ہو جانا بعید نہ تھا۔

لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٨﴾ فَكُلُوا مِنَّمَا

غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٩﴾

”اگر خالق کی طرف سے پہلے سے نوشتہ موجود نہ ہوتا تو تم نے جو کیا، اس میں تم پر بڑا عذاب آجاتا لہذا کھاؤ اس سے جو صاف ستھرا مال غنیمت میں تمہیں ملے اور اللہ سے ڈرو۔ یقیناً اللہ بخشنے والا ہے بڑا مہربان۔“

”اگر پہلے سے نوشتہ موجود نہ ہوتا۔“ اس سے کون نوشتہ مراد ہے؟ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

”یعنی بعفو غیر منصوص۔“

”خالق کا یہ حکم کہ جس بات میں ممانعت وارد نہ ہوئی ہو، وہ معاف ہے۔“

اس صورت میں نوشتہ سے مراد حکم تشریحی ہے۔

ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”وہ بات یہ لکھ چکا کہ ان قیدی لوگوں میں بہتوں کی قسمت تھی مسلمان ہونا، (موضح القرآن)

اس صورت میں یہ نوشتہ تقدیر ہے۔

جلالین رقم طراز ہیں:

لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ بِالْحَلَالِ الْغَنَائِمِ وَالْإِسْرَىٰ لَكُمْ

[۱]. یبالغی فی قتل الکفار (جلالین)

[۲]. ہذا منسوخ بقولہ: فَأَمَّا مَنَابِعُهُمْ فَمَا بَعْدُوا مَا فِدَاءُ (جلالین)

اگر اللہ کا نوشتہ پہلے سے یہ نہ ہو گیا ہوتا کہ ماہائے غنیمت اور قیدی تمہارے لئے حلال کئے گئے ہیں۔ اس صورت میں بھی نوشتہ سے مراد حکم تشریحی ہے لیکن اگر نوشتہ یہ تھا کہ یہ حلال ہیں تو پھر عتاب کا ہے پر ہے؟ عتاب اس پر ہے کہ تم نے بغیر اجازت کے آئے ہوئے از خود یہ اقدام کیوں کر لیا؟ [۱] وہ تو اتفاق سے تمہارا عمل نوشتہ الہی کے مطابق ہو گیا، اس لئے تم عذاب سے بچ گئے..... ورنہ یہ کام تم نے ایسا کیا تھا کہ عذاب آجاتا۔

بہت سے قدیم مفسرین نے اس نوشتہ الہی کو عذاب نہ آنے سے متعلق قرار دیا ہے اور اس کی بنا پر ہمارا ذہن یہ کہتا ہے کہ اس نوشتہ سے خود قرآن کا یہ اعلان مراد ہے کہ:

مَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ

آپ کی موجودگی میں ان پر عذاب نہیں آسکتا

تو مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ تمہارا کردار تو یہ ایسا تھا جیسے کردار سے امم سابقہ پر عذاب آجایا کرتا تھا مگر کیا کیا جائے کہ تم رحمۃ للعالمین کے زیر سایہ ہو اور ان کا وجود تم پر عذاب سے سدراہ ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِمَنْ فِي آيِدِيكُمْ مِنَ الْأَسْرَىٰ ۖ إِنْ يَعْلَمِ اللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا

يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّا أُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۵۰﴾ وَإِنْ يَرِيدُوا

خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللَّهَ مِنْ قَبْلُ فَأَمْكَنَ مِنْهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۵۱﴾

”اے پیغمبر! کہہ دیجئے ان قیدیوں سے جو آپ لوگوں کے قبضہ میں ہیں کہ اگر جانے گا اللہ تمہارے دلوں میں کچھ بھلائی تو وہ عطا کرے گا تمہیں بہتر اس سے کہ جو تم سے لیا گیا ہے اور تمہیں بخشے گا اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان اور اگر انہوں نے آپ سے غداری کرنا چاہی تو وہ اس کے پلے اللہ سے غداری کر چکے ہیں تو اس نے ان پر قابو دے دیا اور اللہ جاننے والا ہے، صحیح صحیح کام کرنے والا۔“

”بھلائی“ سے مراد یہاں خیر خواہی، خلوص اور چال چلن کا آئندہ ٹھیک رہنا ہے [۲] اور ’عطا کرے گا بہتر‘، یعنی تمہارے حسن خدمات سے خوش ہو کر جتنا تم سے فدیہ ان مسلمانوں نے لے لیا ہے، اس سے زیادہ تمہیں یہاں سے مل جائے گا اور پھر ایمان و عمل صالح کی صورت میں آخرت کی بخشش، اس کے ماوراء ہوگی، جس کے مقابلہ میں یہ اتنا سارو پیہ جو تم سے لے لیا گیا ہے، کوئی چیز نہیں ہے۔

یہ قرآن کا حکیمانہ انداز بیان دیکھنے کا ہے کہ ادھر مسلمانوں کو تو رسول ﷺ سے مخاطب کر کے اتنا سخت عتاب کیا گیا اور ادھر ان قیدیوں کی جن سے فدیہ لیا گیا تھا، اس طرح دلجوئی کی جارہی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ

[۱] عاتبہم علی ذلک لانہم بأدروا الیہ قبل ان یومروا بہ (تبیان)

[۲] ہو ہھنا البصیرة فی دین اللہ و حسن النیة فی امر اللہ (تبیان)

وَالَّذِينَ آوَوْا وَنَصَرُوا أُولَئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ
يُهَاجِرُوا مَا لَكُمْ مِّنْ وَلَا يَتَّبِعُهُم مِّنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا ۗ وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ
فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ ۗ وَاللَّهُ بِمَا
تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٤٢﴾

”بلاشبہ جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور ہجرت کی اور اپنے جان و مال سے راہ خدا میں جہاد کیا اور جنہوں نے پناہ دی اور امداد کی، یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے حامی و مددگار ہیں اور جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور ہجرت نہیں کی، تمہیں ان کی حمایت کا کچھ موقع نہیں، جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں اور اگر تم سے کسی دینی مہم میں مدد مانگیں تو تمہارا فرض ہے کہ مدد کرو، سوا اس صورت کے کہ جب کسی ایسی جماعت کے خلاف ہو کہ تمہارے اور ان کے درمیان کوئی عہد و پیمانہ ہے اور اللہ اس کا جو تم کرتے ہو دیکھنے والا ہے۔“

پہلے مہاجرین کا ذکر ہے کہ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا اور پھر انصار کا ذکر ہے: ”الَّذِينَ آمَنُوا وَنَصَرُوا“ جنہوں نے پناہ دی اور امداد کی، اور ان سب کو کہا گیا ہے [۱] کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے حامی و مددگار ہیں یعنی ہونا چاہیے اور ان میں ملکی اور غیر ملکی کا کوئی سوال نہیں ہونا چاہیے جیسا کہ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:

”یعنی مہاجرین و انصار با یکدیگر باید کہ نصرت دہند و مواخات کنند“ (فتح الرحمن)

یہ وہ قومیت ہے جس کی وحدت تصور اور اتحاد عقیدہ پر بنیاد قائم ہوتی ہے۔ اس وحدت قومی کا تقاضا شاہ عبدالقادر کے لفظوں میں یہ ہے کہ: ”جتنے مسلمان حضرت کے ساتھ حاضر ہیں، ان سب کی صلح اور جنگ ایک ہے۔ ایک کا موافق سب کا موافق، ایک کا مخالف سب کا مخالف“ (موضح القرآن)

مگر یہ بیچتی انہی مسلمانوں کے ساتھ ہو سکتی ہے جو آزاد فضا میں سانس لے رہے ہیں لیکن اگر کچھ مسلمان ابھی مشرکین کے زیر اقتدار ہیں تو ان کے معاملات وہاں کے حالات سے وابستہ ہیں۔ ان کے ساتھ یہاں کے مسلمان بیچتی اختیار نہیں کر سکتے اور ان کے سیاسی قسم کے معاملات سے آزاد ملک کے مسلمانوں کو کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ ہاں اگر کسی دینی مہم میں وہ خود امداد طلب کریں تو یہ لوگ دینی رشتہ سے امداد کریں، ورنہ خواہ مخواہ ان کے معاملات میں اپنا پاؤں اڑانے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ بسا اوقات مفید ہونے کے بجائے مضر ہوگا۔

بعض مفسرین نے اولیاء بعض کے مفہوم میں یہ قرار دیا ہے کہ ایک دوسرے کا وارث بھی قرار دیا گیا تھا [۲] اور اس لئے کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہو گئی اور اسی سورہ کی آخری آیت سے جس میں میراث کی بنیاد قرابت رکھ دی گئی ہے۔ [۳]

[۱]. اولئك یعنی المہاجرین و الانصار (تبیان)

[۲]. اولیاء بعض فی النصر تو الارث (جلالین)

[۳]. لهذا منسوخ بالأخر السورۃ (جلالین)

مگر ہمیں یہاں کی آیتیں آخر سورہ تک ایک ڈال ہونے کی بنا پر ایک ساتھ نازل شدہ معلوم ہوتی ہیں لہذا ان میں ایک کو ناسخ اور دوسری کو منسوخ ماننے کے کوئی معنی نہیں ہوں گے۔ اس لئے قبل کی ولایت میں میراث کو داخل کرنا ہی غلط معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کا شاہد درمیان کی آیت ہے جو ابھی آئے گی کہ:

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۗ إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ ﴿٨١﴾

جو کافر ہیں، وہ ایک دوسرے کے حمایتی ہیں اگر تم لوگ ایسا نہ کرو تو دنیا میں بڑا فتنہ برپا ہوگا اور بڑی خرابی ہوگی۔ (سورہ انفال)

ظاہر ہے کہ کافروں میں بھی یہ بات نہیں ہے کہ ایک دوسرے کا وارث ہو تو اہل ایمان کو جس ولایت کی دعوت دی جا رہی ہے اسے میراث سے متعلق کیوں سمجھا جائے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۗ إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ
وَفَسَادٌ كَبِيرٌ ﴿٨١﴾

”اور جو کافر ہیں، وہ ایک دوسرے کے حمایتی ہیں، اگر تم لوگ ایسا نہ کرو تو دنیا میں بڑا فتنہ پیدا ہوگا اور بڑی خرابی ہوگی۔“

اس میں مسلمانوں کی غیرت ایمانی پر ایک طرح کا تازیانہ بھی ہے اور ان کی بصیرت ایمانی کے لئے ایک طرح کا سرمہ بھی۔ تازیانہ تو اس طرح جیسے حضرت علی بن ابی طالبؓ نے نبی البلاغہ کے ایک خطبہ میں یوں غیرت دلائی ہے کہ کتنے غضب کی بات ہے کہ اہل شام اپنے امام کی باطل کی راہ میں اطاعت کرتے ہیں اور تم اپنے امام کی حق کی راہ میں نافرمانی کرتے ہو، ویسے ہی یہاں ارشاد دہورہا ہے کہ کافر تو ”کافر“ میں ایک دوسرے کے مددگار اور حمایتی ہیں۔ اب کتنے غضب کی بات ہے کہ تم مومن ہو کے آپس میں بیکجہتی نہ رکھو۔ اور بصیرت کے لئے سرمہ یہ ہے کہ تمہارے آپس میں بیکجہتی نہ رکھنے سے [۱] بڑا فتنہ اور بڑی خرابی ہے یہ فتنہ اور خرابی کیا ہے؟ سب سے زیادہ یہ کہ کفر کفووت ہوگی اور حق میں ضعف پیدا ہوگا۔ [۲]

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجْهَهُمْ وَإِنِّي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَنَصَرُوا أُولَٰئِكَ

هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۗ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿٨٢﴾

”اور جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور وہ کہ جنہوں نے پناہ دی اور امداد کی، یہ لوگ حقیقتاً ایمان لانے والے ہیں۔ ان کے لئے بخشش ہے اور عزت والی روزی ہے۔“

وَالَّذِينَ آمَنُوا مِنْ بَعْدُ وَهَاجَرُوا وَجْهَهُمْ فَأُولَٰئِكَ مِنْكُمْ ۗ وَأُولَٰئِكَ

[۱]. لا تفعلو ما امرتم به من التناصر والتعاون والبرائة من الكفار (تبیان)

[۲]. بقوة الكفر وضعف الاسلام (جلالین)

الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٥٦﴾

”اور جو بعد میں ایمان لائیں اور ہجرت کریں اور تمہارے ساتھ مل کر جہاد کریں تو یہ بھی تمہارا ہی جز ہیں اور جو صاحبانِ قرابت ہوں، وہ اللہ کے قانون میں ایک دوسرے سے زیادہ اتصال رکھتے ہیں، یقیناً اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔“

اگرچہ ترتیب قرآن عموماً مطابق تزیل نہیں ہے، پھر بھی بعض آیات کا مضمون اتنا باہم دگر چسپاں اور دست و گریبان ہوتا ہے کہ پتہ چلتا ہے کہ یہ سب ایک ہی وقت کی نازل شدہ ہیں چنانچہ جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے یہ سلسلہ آیات ایسا ہی مربوط و مسلسل ہے اور وہ ایک ہی موقع کا نازل شدہ معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ قبل کی آیات میں اس تصور کا امکان تھا کہ میراث بھی صرف اخوت دینی کی بنیاد پر تقسیم ہوگی جس کی بنا پر بعض ذہنوں نے پہلی آیت کے معنی یہی قرار دیئے اور پھر اسے منسوخ مانا جس کی ہم نے رد کی، اب اس آخری آیت میں اس تصور کو دور کیا گیا ہے کہ یہ تو اخوت ایمانی تھی جس کا تذکرہ پہلے ہوا ہے، جسے اتحاد و عمل اور تعاون کی بنیاد ہونا چاہیے مگر صاحبانِ قرابت جو ہیں وہ آپس میں زیادہ اتصال رکھتے ہیں۔ لہذا وراثت کا تعلق قرابت ہی سے ہوگا جس میں وحدت دینی بس شرط کے طور پر معتبر ہوگی۔

اس آیت کے آخری ہی جز کی بنا پر جس کی ہم مضمون آیت دوسری جگہ بھی قرآن میں موجود ہے، ان عزیزوں کے علاوہ جن کے حصے قرآن میں بیان کئے گئے ہیں اور جنہیں ”ذوی الفروض“ کہتے ہیں، دوسرے اقرباء کی وراثت کا حکم فقہ اسلامی میں قائم ہوا ہے جنہیں میراث میں اسی نام یعنی ”صاحبانِ قرابت“ کے عنوان کے ماتحت ترکہ دلویا جاتا ہے اور پھر ان میں طبقات ارث کی تفریق اسی ”أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ“ کے اصول پر ہے کیونکہ قرابت اضافی چیز ہے۔ ہر قریب اپنے سے قریب تر کی موجودگی میں دور قرار پا جاتا ہے، اس لئے اسے میراث کا استحقاق نہیں ہوتا لہذا ماں باپ اور اولاد کی موجودگی میں جن تک خطوط قرابت بلا واسطہ پہنچتے ہیں، اخوہ و اجداد (بھائی بہنوں اور دادا، دادی، نانا، نانی) کا حق نہیں ہے جن تک خط قرابت ایک واسطہ کے ساتھ پہنچتا ہے اور اس لئے یہ دوسرے طبقہ میں ہیں اور ان کی موجودگی میں ”أَخْتَمَ مِكْتُمًا وَأَخْوَالِكُمْ“ (چچا، پھوپھی، اور ماموں، خالہ) کا حق نہیں ہے جن تک خط قرابت دو واسطوں سے پہنچتا ہے۔

اس کے علاوہ محجوب الارث ہونے کا اصول اسی بنیاد پر ہے یعنی بیٹے کی موجودگی میں پوتا میراث نہیں پاسکتا اور بھائی کی موجودگی میں بیٹی کو میراث نہیں ملے گی۔

غرض بہت سے احکام شرعیہ ہیں جو اس ایک قرآنی فقرہ سے مستنبط ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

[1]. بعض ایشان نزدیک تر است ببعضی (شاہ ولی اللہ) نزدیک تر ہیں ساتھ بعض کے (شاہ فریح الدین)

سُورَةُ الْبَرَاءَةِ

مدنیہ..... ۱۲۹..... آیات

اس سورہ کا نام حدیثوں میں تو ”سورۃ البراءۃ“ ہی ہے جو سورہ کے پہلے لفظ ”بَرَاءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ“ کے مطابق ہے مگر سورہ کی پیشانی پر عموماً ”سورۃ التوبۃ“ لکھا جاتا ہے یہ توبہ کا ذکر اس سلسلہ کی تیسری آیت میں بالکل ضمنی طور پر ہے:

فَاِنْ تَابْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِذَا تَابْتُمْ تَوْبَةً لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ

اور اس کے فوراً ہی بعد اس کی مقابل شق بڑے سخت انداز میں ہے۔

وَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَأَعْلَمُوْا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ

اور اگر روگردانی کرو تو جان لو کہ تم اللہ کو بے بس نہیں بنا سکتے۔

اس سے ظاہر ہے کہ بنیادی رخ ان آیات میں تہدید اور سرزنش ہی کا ہے ایسی صورت میں اس ”توبہ“ کے ذکر کو اتنا اہم بنانا کہ سورہ کا نام یہی ہو، سمجھ میں نہیں آتا۔ تصور ہوتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ براءۃ کے لفظ کے ساتھ اعلان تہذیب سے جو ایک ناگواری مسلمانوں کے اکثریتی طبقہ کے ذہن میں پیدا ہوتی ہے، اس کے دور کرنے کے لئے ”سورۃ البراءۃ“ کے نام کے بجائے جو غضب الہی کا ترجمان ہے اس کا نام سورۃ التوبہ کر دیا جس میں مہربانی کی جھلک نمایاں ہے۔ تلاش سے معلوم ہوتا ہے کہ صدر اسلام ہی میں ایک طبقہ کی طرف سے یہ تبدیلی عمل میں آگئی تھی جس پر اسی وقت اہل حقیقت نے اعتراض کیا اور اسے اس سورہ کی بنیادی روح کے خلاف قرار دیا۔^[۱]

حالانکہ مسلماً جیسا کہ ابھی آئے گا یہ سورہ سورۃ عذاب ہی سمجھا گیا اور اسی لئے اس کے شروع میں بسم اللہ نہیں ہے۔

سورۃ براءت کے خاص خاص مضامین

- ۱۔۔۔۔۔ مشرکین کیلئے جو رعایتیں اب تک تھیں انہیں منسوخ کرنا اور ان سے قطعی طور پر تہذیب یعنی ترک موالات کا اعلان۔
- ۲۔۔۔۔۔ مشرک جو پناہ طلب کرے اسے پناہ دینے اور اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہونے کا حکم۔
- ۳۔۔۔۔۔ مساجد الہی کا احترام اور کافروں کے داخلہ کی ممانعت۔
- ۴۔۔۔۔۔ جنگ جنین کا تذکرہ اور ربا و وجود کثرت تعداد مسلمانوں میں ابتری اور انتشار پیدا ہونے کی کیفیت۔
- ۵۔۔۔۔۔ نجاست مشرکین۔

[۱] .روی عن حذیفۃ انه قال کیف یسمو نہا سورۃ التوبۃ وہی سورۃ العذاب وروی عن سعید بن جبیر قال قلت لابن عباس سورۃ التوبۃ قال: تلك الغاضمة (تبیان)

- ۶----- آخر میں دین اسلام کے تمام ادیان و مذاہب پر غالب ہونے کا اعلان۔
 ۷----- اکتناز کی ممانعت۔
 ۸----- بارہ مہینے اور ان میں چار خاص طور پر محترم۔
 ۹----- محترم مہینوں میں جدال و قتال کی ممانعت۔
 ۱۰----- نسی یعنی لوندا کا مہینہ لگا کر مہینوں کو بدلنے کی سخت ممانعت۔
 ۱۱----- شب ہجرت کا تذکرہ۔
 ۱۲----- جہاد کے موقع پر مسلمانوں کی پست ہمتی اور کمزوری کے مظاہروں کا تذکرہ۔
 ۱۳----- منافقین کے کردار کے نمونے۔
 ۱۴----- مستحقین زکوٰۃ کا بیان۔
 ۱۵----- کفار کے علاوہ منافقین سے بھی جہاد کا حکم۔
 ۱۶----- کھلے ہوئے منافقین کی نماز جنازہ سے ممانعت۔
 ۱۷----- اللہ کے ساتھ رسول ﷺ اور کچھ خاص افراد کے نگران ہونے کا اعلان۔
 ۱۸----- ایسے منافقین کے وجود پر انتباہ جن کا نفاق طشت از بام نہیں ہوا ہے۔
 ۱۹----- مسجد ضرار کا ذکر اور اس کے انہدام کا حکم۔
 ۲۰----- مؤمنین کے جان و مال کی خریداری۔
 ۲۱----- مشرکین کے لئے استغفار کی ممانعت۔
 ۲۲----- ”لفقنی الدین“ کے لئے سفر کا واجب کفائی ہونا۔
 ۲۳----- اجتہاد و تقلید وغیرہ وغیرہ۔

اس سورہ کے آغاز کی خصوصیت

اس سورہ کے شروع میں تمام عالم اسلام کے قرآن اس پر متفق ہیں کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں ہوتی۔ یہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ جن سوروں میں بسم اللہ اور پر لکھی گئی ہے ان کے ساتھ بسم اللہ من جانب اللہ نازل ہوئی تھی اور اس سورہ میں بسم اللہ نازل نہیں ہوئی۔ اس کا سبب وہی ہے جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ بسم اللہ آیہ رحمت ہے اور یہ سورہ سورہ عذاب ہے اس لئے بسم اللہ اس کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی تھی۔

شاہ عبدالقادر نے اس کا عجیب سبب لکھا ہے کہ:

”یہ سورہ برأت حضرت ﷺ نے بیان نہیں فرمایا کہ جدا سورہ ہے یا اور سورہ کی آیتیں ہیں۔ سورہ کا نشان تھا بسم اللہ نازل ہوئے۔ اس واسطے اس پر بسم اللہ نہیں“ (موضح القرآن)

حالانکہ اگر اس کا مستقل سورہ ہی ہونا محقق نہ ہوتا تو اس کا سورہ براءت یا سورہ توبہ مستقل نام کیوں ہوتا اور اس کے آیات و رکوعات کو علیحدہ شمار کر کے لکھا کیوں گیا ہوتا۔ نیز قرآنی سورتوں کی تعداد میں اس پر اختلاف کیوں نہ ہوا ہوتا۔ دوسرے مفسرین اہل سنت ہماری اس توجیہ کے ساتھ متفق ہیں۔ ملاحظہ ہو تفسیر جلالین۔

ولم تكتب فيها البسملة لانه ﷺ لم يأمر بذلك كما يؤخذ من حديث رواه الحاکم وخرج في معناه عن علي بن ابي طالب ان البسملة امان وهي نزلت لرفع الامن بالسيف وعن حذيفة انكم تسمونها سورة التوبة وهي سورة العذاب (جلالین)

اور اس میں بسم اللہ نہیں لکھی گئی، اس لئے کہ آنحضرت ﷺ نے اس کا حکم نہیں دیا جیسا کہ اس حدیث سے مستفاد ہوتا ہے جسے حاکم نے نقل کیا ہے اور اس بارے میں حضرت علی سے بھی وارد ہوا ہے کہ بسم اللہ امان ہے اور یہ سورہ اتر ہے امان کے ختم کرنے کے لئے تلواریں کے ساتھ اور حذیفہ سے منقول ہے کہ تم لوگ اسے ”سورہ توبہ“ کہتے ہو، حالانکہ وہ عذاب کا سورہ ہے۔

بخاری کی روایت ہے کہ یہ سب سے آخری سورہ ہے جو رسول ﷺ پر نازل ہوا مگر اکثر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے آخر میں نازل ہونے والا سورہ مانده ہے۔

بَرَاءَةٌ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ فَسِيحُوا فِي
الْأَرْضِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ ۝ وَأَنَّ اللَّهَ مُخْزِي
الْكَافِرِينَ ۝

”بیزاری ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین سے کہ جن سے تم لوگوں نے معاہدہ کیا تھا، اب تم (اے مشرک!) اس سرزمین میں بس چار مہینے تک گھوم پھر لو اور یقین رکھو کہ تم اللہ کو بے بس نہیں بنا سکتے اور یہ کہ اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے۔“

مشرکین سے معاہدہ سابق کی منسوخی اور ان سے قطعی تبر یعنی ترک موالات کا اعلان

جیسا کہ ترجمہ میں بریکٹ کے ذریعہ سے ہم نے واضح کیا ہے۔ ان دونوں آیتوں میں خطاب سے خطاب کی طرف ”التفات“ ہے یعنی ابتدا میں مخاطب مسلمانوں کے ساتھ ہے کہ جن سے تم لوگوں نے معاہدہ کیا تھا، اور پھر روئے خطاب مشرکین کی طرف ہے کہ چار مہینے تمہیں مہلت دی جاتی ہے۔

یہ دو اور ان کے بعد کی چند آیتیں ہی سورہ براءت کی وہ ہیں جن کا حامل بنا کر جناب ابو بکر کو بھیج دیا گیا تھا کہ وہ مکہ میں جا کر مشرکین کے مجمع میں سنادیں۔ پھر حکم الہی رسول ﷺ کے پاس آیا کہ انہیں یا آپ خود پہنچائیے یا ایسا شخص پہنچائے کہ جو آپ کا جز ہو۔ اس پر حضرت ﷺ

نے ان کو واپس بلوایا اور حضرت علی بن ابی طالبؓ کو مامور فرمایا۔ یہ ہجرت کے نویں سال کا واقعہ ہے۔^[۱]
شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے:

سال نہم حضرت پیغامبر ﷺ علی مرتضیٰ را در موسم حج فرستاد تا عہود مشرکان را بر اندازد (فتح
الرحمن)

ہجرت کے نویں سال حضرت پیغمبر خدا ﷺ نے علی مرتضیٰؓ کو حج کے زمانے میں روانہ کیا تاکہ آپ مشرکین کے عہد و پیمانہ کو توڑ
دیں۔

تفسیر جلالین میں ہے:

قد بعث ﷺ علیاً من السنة وهی سنة تسع فاذن بهم النحر بمعنی هذه الايات وان لا یحج بعد العام
مشرک ولا یطوف بالبيت عریان رواه البخاری
حضرت ﷺ نے اس سال یعنی ۹ھ میں حضرت علیؓ کو بھیجا تو انہوں نے روز عید قربان، منیٰ میں ان آیات کا اعلان کیا اور یہ کہ
اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کو نہ آئے اور کوئی بالکل ہی برہنہ خانہ کعبہ کا طواف نہ کرے، اسے بخاری نے درج کیا ہے۔

وَأَذَانٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ أَنَّ اللَّهَ بَرِيءٌ مِّنَ
الْمُشْرِكِينَ ۗ وَرَسُولُهُ ۗ فَإِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَأَعْلَمُوا

أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ ۗ وَبَشِّرِ الَّذِينَ كَفَرُوا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿۱۰﴾

’اور اعلان ہے [۱۰] اللہ اور اس کے پیغمبر کی طرف سے تمام لوگوں کو سب سے بڑے حج کے دن کہ اللہ اور اس کا
پیغمبر بیزار ہیں مشرکوں سے۔ اب اگر تم توبہ کر لو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر تم روگردانی کرو تو تمہیں معلوم ہونا
چاہیے کہ تم اللہ کو بے بس نہیں بنا سکتے اور کافروں کو خوشخبری دو دردناک عذاب کی۔‘

یہاں التفات غیبت سے خطاب کی طرف ہے یعنی ’اللہ اور رسول ﷺ بیزار ہیں مشرکوں سے‘ یہاں ان کا ذکر بطور غائب ہے اور
پھر یہ کہ اگر تم توبہ کر لو، اور ’اگر روگردانی کرو‘ یہ انہی کی طرف مخاطب ہے۔ پھر آخر میں ایک دوسرا پلٹا صنعت التفات کی قسم کا یہ ہے کہ ’خوشخبری دو
کافروں کو‘..... اور کافر یعنی وہی مشرک جن کا ذکر پہلے بطور غیبت تھا اور پھر انہی سے مخاطب ہو گیا اور اب مسلمانوں سے یا کسی بھی مخاطب غیر معین
کی طرف روئے خطاب کر کے انہی کا ذکر بطور غیبت ہو گیا۔

’خوشخبری دو‘..... کا مطلب بظاہر یہی ہے کہ ’خوشخبری‘ دی جانا چاہیے اور کوئی بھی یہ خوشخبری دے سکتا ہے اور بعض مفسرین کے رویہ
کے مطابق رسول ﷺ مخاطب ہیں کہ آپ یہ خوشخبری دیجئے۔

[۱]. نزلت براءة فی سنة تسع (تبیان)

[۲]. اعلام (جلالین) خبررسانیدن است (شاہ ولی اللہ) پکارنا ہے (شاہ فیح الدین)

اب مسلمان حج کا دن عرفات کے مقام یعنی ۹ رزی الحج کو سمجھتے ہیں اور اس لئے جب اس دن جمعہ ہو تو اسے ”حج اکبر“ کہتے ہیں مگر اس آیت میں یوم الحج الاکبر ”بڑے حج کا دن“ بقول اکثر مفسرین روز عید قربان یعنی ۱۰ رزی الحج کو کہا گیا ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوا كُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا

عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتَمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ﴿۵﴾

”سوا مشرکین میں سے ان کے جن سے تم نے معاہدہ کیا ہو، پھر انہوں نے تمہارے لئے کچھ کمی نہ کی ہو اور نہ تمہارے خلاف کسی کی امداد کی ہو تو ان کے لئے ان کے معاہدہ کو ان سے مقرر کی ہوئی مدت تک پورا کرو، یقیناً اللہ پر ہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے“۔

”تمہارے لئے کوئی کمی نہ ہو“ یعنی جو شرائط معاہدہ کی طے تھیں، ان میں سے کسی بات میں انہوں نے کمی نہیں کی۔ [۱]

آخری فقرہ سے کہ ”اللہ پر ہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے“..... یہ معنی نکلتے ہیں کہ کفار کے ساتھ بدعہدی کرنا تقویٰ کے خلاف چیز ہے اور اس میں مواخذہ اخروی ہے جس سے بچنا تمہیں ضروری ہے۔ [۲]

فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرْمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ

وَخُذُوهُمْ وَاحْضَرُوهُمْ وَأَقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصِدٍ ۗ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا

الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۶﴾

”جب محترم مہینے گزر جائیں تو پھر ان مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو اور انہیں گرفتار کرو اور ان کا گھیراؤ کرو اور ہر کیمین گاہ میں ان کی تاک میں بیٹھو، ہاں اگر وہ باز آجائیں اور نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو انہیں چھوڑ دو، یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان“۔

یہ ان پہلی قسم کے مشرکین کا ذکر ہے جن سے کوئی معاہدہ نہیں ہو یا جنہوں نے معاہدہ کی پابندی نہیں کی اور ظاہر ہے کہ وہ مشرکین ایسے ہی تھے جو پیغمبر خدا ﷺ اور مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم کرتے رہے تھے۔ اس لئے ان سے ایک صورت جنگ قائم ہی تھی۔ انہی کو چار مہینے کی مہلت دی گئی تھی اور انہی مہینوں کے گزرنے کے بعد [۳] یہ احکام ہیں کہ جب تک مسلمان نہ ہو جائیں ان کے واسطے اب پناہ نہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ اسلام میں تبلیغ کے لئے تلوار سے کام لینے کی تعلیم دی جا رہی ہے۔

وَإِن أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلِمَ اللَّهِ ثُمَّ ابْلِغْهُ

[۱]. لہذا یقیناً من شرط العہد (جلالین)

[۲]. یحب المتقین یا تمام العہود (جلالین)

[۳]. یعنی آن چہار ماہ کہ ابشار را فرصت دادہ بودند (فتح الرحمن)

مَأْمَنَةٌ ط ذَلِكِ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٦﴾

”اور اگر مشرکین میں سے کوئی آپ سے پناہ طلب کرے تو اسے پناہ دیجئے تاکہ وہ اللہ کے کلام کو سنے۔ پھر اس کے اطمینان کی جگہ پر پہنچو اور نتیجے یہ اس لئے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو واقف نہیں ہیں۔“

پناہ کے طلب گار مشرکوں کو پناہ دینے اور ان کی حفاظت کی ذمہ داری کا حکم

معلوم ہوا کہ پہلا حکم ان کے واسطے تھا جو تمام حجت کی تمام منزلیں ختم ہونے کے بعد مسلمانوں کے لئے برسر آزار رہے لیکن ایسے مشرکین جو خالی الذہن ہیں اور ان میں کچھ افراد حق طلب بھی ہو سکتے ہیں، ان کے لئے یہ رواد ارا نہ حکم ہے کہ اگر وہ اسلامی مرکز میں تحقیق کے لئے آنا چاہتے ہیں تو انہیں پورے تحفظات کے ساتھ آنے دیا جائے اور پھر ان کو اپنی طرف سے پورے انتظام حفاظت کے ساتھ ان کے مستقر تک [۱] پہنچا دینا چاہیے۔

كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ رَسُولِهِ إِلَّا الَّذِينَ عٰهَدْتُمْ
عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ ط إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ
الْمُتَّقِينَ ﴿٥﴾ كَيْفَ وَإِنْ يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوا فِيكُمْ إِلَّا وَلَا ذِمَّةً ط
يُرْضَوْنَكُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبَىٰ قُلُوبُهُمْ ۖ وَآكْثَرُهُمْ فَسِاقُونَ ﴿٦﴾ اِشْتَرَوْا بِآيَاتِ
اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَصَدُّوا عَن سَبِيلِهِ ط إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٧﴾ لَا
يَرْقُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ إِلَّا وَلَا ذِمَّةً ط وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُونَ ﴿٨﴾

”جہلا مشرکوں کا کوئی عہد و پیمانہ ہو ہی کیوں کر سکتا ہے اللہ اور اس کے پیغمبر کے یہاں، سو ان کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا ہے تو جب تک وہ تمہارے لئے ٹھیک طرح سے برقرار ہیں تم بھی ان کے واسطے برقرار رہو [۲] یقیناً اللہ پر ہیز گاروں کو دوست رکھتا ہے کیوں کر ایسا ہو سکتا ہے حالانکہ وہ اگر تم پر غلبہ حاصل کریں تو تمہارے بارے میں کسی رشتہ اور کسی ذمہ داری کا لحاظ نہ کریں گے تمہیں وہ اپنے منہ سے خوش کرتے ہیں اور ان کے دل انکاری ہیں اور ان میں سے اکثر بد اعمال ہیں۔ انہوں نے آیات الہی کے عوض میں تھوڑی سی قیمت حاصل کی ہے تو اس کے راستے سے منحرف ہو گئے ہوں گے، بہت برا ہے وہ کام جو وہ کرتے رہے ہیں۔ وہ نہیں لحاظ کرتے کسی مسلمان کے بارے میں کسی رشتہ اور نہ ذمہ داری کا اور یہی لوگ ظلم و تعدی کرنے والے ہیں۔“

[۱]. موضع امنہ و ہودار قومہ (جلالین)

[۲]. ما استمر والکم علی العہد والاسستقامۃ الاستمرار علی وجه الصواب (تبیان)

مسجد حرام کے پاس والے معاہدہ سے مراد حدیبیہ والی صلح اور اس کے شرائط ہیں۔ اسے کہا گیا ہے کہ تمہیں اس وقت تک پابند رہنا چاہیے جب تک وہ پابند ہیں [۱]۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، رسول ﷺ اس عہد و پیمان کے پابند رہے لیکن بعد میں کفار مکہ کی طرف سے بدعہدی ہوئی اور قبیلہ خزاعہ پر جو رسول ﷺ کا حلیف تھا، بنی بکر نے چھاپہ مارا اور اس کا قلع قمع کیا تو اس وقت رسول ﷺ بھی اس ذمہ داری سے بری ہو گئے اور فتح مکہ کے لئے روانہ ہوئے۔ [۲]

**فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ ۗ وَنُفِصِلُ
الْأَيْتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝ وَإِنْ نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ مِنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوا فِي
دِينِكُمْ فَقَاتِلُوا أَيْمَةَ الْكُفْرِ ۗ إِنَّهُمْ لَا أَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُونَ ۝**

”اس کے بعد اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں، اور ہم حقیقتوں کو صاف صاف پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو جاننا چاہیں اور اگر اپنی قسموں کو اپنے عہد و پیمان کے بعد توڑ دیں اور تمہارے دین پر طعن و تشنیع کریں تو کفر کے ان سرغناؤں سے [۳] جنگ کرو یقیناً ان کی کوئی قسمیں نہیں ہیں، شاید یہ باز آجائیں۔“

”توبہ کریں، نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں“ اس سے مراد یہ ہے کہ اسلام لے آئیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایمان لانے کیلئے اسلامی زندگی کا عملی طور پر اختیار کرنا بھی ضروری ہے جس میں حقوق اللہ بھی ہیں جن کا مثالی عنوان نماز ہے اور حقوق الناس بھی ہیں جن کی جامع سرخی ”زکوٰۃ“ ہے۔ قسموں کے توڑنے کے ذکر کے بعد یہ جملہ کہ ”ان کی کوئی قسمیں نہیں ہیں۔“ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ قسمیں ہی کیا جو توڑی جائیں یعنی انہوں نے کھائیں تو تمہیں قسمیں مگر جب توڑ دیں تو بے حقیقت ہو گئیں۔ [۴]

**أَلَا تَقَاتِلُونَ قَوْمًا نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُمْ بَدَءُواكُمْ
أَوَّلَ مَرَّةٍ ۗ فَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَوْهُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝**

”کیوں نہیں تم جنگ کرتے ان لوگوں سے جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑا اور پیغمبر کو نکالنے کا ارادہ کیا اور انہوں نے ہی پہلی دفعہ تمہارے مقابلہ میں پہل کی۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ تو اللہ زیادہ حق دار ہے اس کا کہ اس سے ڈرو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔“

جنگ کے لئے ان موجبات کے ذکر کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اصلاً وبالذات جنگ محبوب و مطلوب نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے

[۱] ما استمر والکم علی العہد والاستقامۃ الاستمرار علی وجه الصواب (تبیان)

[۲] قد استقام علی عہدہم حتی تقضوا بأعانة بنی بکر علی خزاعة (جلالین)

[۳] باپییشوا یان کفر (شاد ولی اللہ)

[۴] انما المراد بہ اہم لا ایمان لہم یفون بہا ویتمسکون ہر جہا (تبیان)

خاص اسباب نہ ہوں جو جنگ کو حق بجانب قرار دیں۔

یہ جملہ کہ ”انہوں نے ہی پہلی دفعہ تمہارے مقابلہ میں پہل کی“^[۱] ان تمام روایات کا قلع قمع کر دینے کے لئے کافی ہے جو ہوا خواہان آل ابوسفیان نے جنگ بدر میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جارحیت کا الزام عائد کرنے کے لئے وضع کئے ہیں جنہیں نا سمجھی سے مسلمانوں کی تاریخ میں باریابی ہوگئی ہے۔

قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبُهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْرِجُهُمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ ﴿۱۷﴾ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ ط وَيَتُوبَ اللَّهُ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ ط وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۱۵﴾

”جنگ کرو ان سے، اللہ انہیں تمہارے ہاتھوں سے سزا دلوائے گا اور انہیں رسو کرے گا اور ان کے مقابلہ میں تمہاری مدد کرے گا اور ایک صاحب ایمان جماعت کے سینہ کی حسرتیں پوری کرے گا اور ان کے دلوں کے غم و غصہ کو دور کرے گا اور اللہ جس پر چاہتا ہے، رحمت کے ساتھ توجہ فرماتا ہے اور اللہ برا جاننے والا ہے، صحیح صحیح کام کرنے والا۔“

توبہ کے اصل لغوی معنی توجہ کرنے ہی کے ہیں ہم نے اس موقع پر بھی یہی مفہوم مناسب محسوس کیا ہے جس کے موافق دور قدیم میں بھی ترجمہ کیا گیا ہے^[۲] مگر بعض اکابر مفسرین نے اس کے معنی توبہ قبول کرنے ہی کے لئے ہیں اور یہ مطلب لیا ہے کہ کافروں میں جو توبہ کر لیں گے، اللہ ان کی توبہ قبول کرے گا اور پھر ان سے جنگ کی ضرورت نہ ہوگی۔^[۳]

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَا رَسُولِهِ وَلَا الْمُؤْمِنِينَ وَلِجَنَّةٍ ط وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿۱۶﴾

”کیا تم سمجھتے ہو کہ تم چھوڑ دیئے جاؤ گے اس حالت میں کہ ابھی اللہ نے معلوم نہیں کیا ان لوگوں کو جنہوں نے جہاد کیا ہو تم میں سے اور اللہ اور اس کے پیغمبر اور اہل ایمان کو چھوڑ کر کوئی جگہری دوست^[۴] نہ بنایا ہو، اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، باخبر ہے۔“

اس طرح کی آیتیں پہلے آچکی ہیں اور وہاں اللہ کے معلوم کرنے کا مطلب بیان کیا جا چکا ہے۔

[۱]. قال الطبري: يدوهم بخروجهم الى بدر لقتالهم (تبیان)

[۲]. برحمت باؤر گورد خدا برہر کہ خواہد. (شاه ولی اللہ)

[۳]. يتوب الله على من يشاء بخروجه عن موجب القتال (تبیان)

[۴]. بطائفة اولياء (جلالین)

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَعْمُرُوا مَسْجِدَ اللَّهِ شَاهِدِينَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۗ
 أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ ۖ وَفِي النَّارِ هُمْ خَالِدُونَ ﴿١٤﴾ إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسْجِدَ اللَّهِ
 مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَلَمْ يَجْشِ إِلَّا اللَّهَ
 فَعَسَىٰ أُولَٰئِكَ أَنْ يَكُونُوا مِنَ الْمُهْتَدِينَ ﴿١٨﴾

”مشرکوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں اپنے اوپر کفر کا اقرار کرتے ہوئے۔ یہ وہ ہیں جن کے اعمال اکارت ہیں اور وہ آگ میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کی مسجدوں کو تو بس وہ آباد کرے گا جو اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور نماز پڑھے اور زکوٰۃ ادا کرے اور اللہ کے سوا کسی سے ڈرے نہیں تو یہ لوگ بہت ممکن ہے کہ ہدایت قبول کرنے والوں میں ہوں۔“

مساجد الہی کا احترام اور کافروں کے داخلہ کی ممانعت

قریش کو فخر تھا کہ وہ مسجد حرام کے آباد رکھنے والے ہیں یہی سبب کا جواب ہے۔

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ
 الْآخِرِ وَجَهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۗ لَا يَسْتَوُونَ عِنْدَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
 الظَّالِمِينَ ﴿١٩﴾ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ
 وَأَنْفُسِهِمْ ۖ أَكْبَرُ دَرَجَةً عِنْدَ اللَّهِ ۗ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿٢٠﴾ يُبَشِّرُهُمْ
 رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ ۖ وَجَنَّتٍ لَّهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ ﴿٢١﴾ خَالِدِينَ فِيهَا
 أَبَدًا ۗ إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿٢٢﴾

”کیا تم نے حاجیوں کے پانی پلانے اور مسجد حرام کے آباد رکھنے کو اس کے برابر قرار دیا ہے کہ جو ایمان لائے اللہ اور روز آخرت پر اور اللہ کی راہ میں جہاد کرے۔ وہ اللہ کے نزدیک برابر نہیں ہیں اور اللہ ظالم لوگوں کو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا، جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان کے ساتھ جہاد کیا، اللہ کے نزدیک مرتبہ میں بہت بڑے ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔ انہیں خوشخبری دیتا ہے اور ان کا پروردگار اپنی طرف کی خاص رحمت اور خوشنودی اور ان بہشتوں کی جن میں ان کے لئے برقرار رہنے والی نعمت ہے جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یقیناً اللہ کے پاس وہ صلہ ہے جو بہت بڑا ہے۔“

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں کہ:

”اوپر سے یہاں تک پانچ آیتیں نازل ہوئیں اس پر کہ کچھ گفتگو ہوئی حضرت علیؑ اور حضرت عباسؓ میں حضرت عباسؓ نے آخر کو ہجرت کی ہے۔ کہا حضرت علیؑ نے کہ اگر تم اول ہجرت کرتے تو جہاد میں حاضر ہوتے اور مرتبے بلند پاتے جیسے ہم نے پائے۔ حضرت عباس نے کہا کہ ہم بھی خدا کے کام میں تھے، خدمت حاجیوں کی اور آبادی مسجد حرام کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ کام ان کے برابر نہیں۔ کوئی مسلمان خدمت کرے تو قبول ہے“ (موضح القرآن)

پہلی دو باتیں حاجیوں کا پانی پلانا اور مسجد حرام کا آباد رکھنا ایمان باللہ وغیرہ کے مقابلہ میں درج ہوئی ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ وہ اعمال حالت عدم ایمان کے ہیں جنہیں فخر کے موقع پر پیش کیا جا رہا تھا اور قرآن مجید نے اس کی رد فرمائی۔ جناب شیخ الطائفہ تحریر فرماتے ہیں:-

خاطب الله تعالى لهذه الآية قوما جعلوا القيام بسقي الحجيج و عمارة المسجد الحرام من الكفار مع مقامهم على الكفر مساويا و افضل من ايمان من امن بالله واليوم الآخر و جاهد في سبيل الله (تبيان)

خداوند عالم نے اس آیت میں ان لوگوں کو مخاطب کیا ہے جنہوں نے حاجیوں کے سیراب کرنے اور مسجد حرام کے آباد کرنے کو باوجود کفر پر برقرار رہنے کے برابر قرار دیا تھا یا بہتر اس شخص کے ایمان سے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرے۔ ممکن ہے کہ یہاں جناب عباسؓ کا نام لینے کے بجائے ”لوگوں“ کی مبہم لفظ کہہ دینا خلافت بنی عباس کے دور کے تقاضوں کے لحاظ سے اختیار کیا گیا ہو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَ إِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ ۗ وَمَنْ يَتَّوَلَّهُمْ مِمَّنْكُمْ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٣٣﴾ قُلْ إِن كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسْكِنٌ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِّنْ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ﴿٣٤﴾

’اے ایمان لانے والو! اپنے باپ اور بھائیوں کو بھی اپنے حوالی موالی میں داخل نہ کرو، اگر وہ کفر کو ایمان کے مقابلہ میں پسند کریں اور جو تم میں سے انہیں حوالی موالی بنائے گا تو یہی ظالم لوگ ہیں، کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہاری اولاد اور تمہارے بھائی اور تمہارے شریک زندگی اور تمہارے عزیز اور وہ مال جو تم نے جمع کئے ہیں اور وہ کاروبار جس کے مدھم ہو جانے کا تمہیں ڈر ہے اور وہ مکانات جو تمہیں پسند ہیں، اللہ اور اس کے پیغمبر اور اس کی راہ میں جہاد سے تم کو زیادہ محبوب ہیں تو پھر منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر کرے اور اللہ بد اعمال

لوگوں کو منزل مقصود تک پہنچایا نہیں کرتا ہے۔“

یہ تاریخ و سیرت کی مسلمہ حقیقت ہے کہ فتح مکہ کے لئے جب پیغمبر خدا ﷺ روانہ ہونے والے تھے تو حاطب بن ابی بلتعہ نے جو صحابہ بدر میں کے معزز گروہ میں داخل تھے، خفیہ طور پر اس کی اطلاع مکہ کی طرف ایک قاصد کے ہاتھ بھیجی تھی جسے قدرت کی طرف سے افشائے راز کئے جانے پر رسول خدا ﷺ نے راستے میں روکنے کا انتظام فرمایا۔ ہمارے یہاں کی روایت کے مطابق جو بطور حدیث صراحۃً موجود ہے، یہ آیتیں اسی واقعہ سے تعلق رکھتی ہیں۔^[۱]

مگر قدیم تفسیر میں جس کے متعلق گمان غالب ہے کہ حدیث پر مبنی ہوتی ہے، اس کا گزشتہ آیات ہی سے تعلق بتایا گیا ہے کہ جب یہ حکم ہوا کہ مشرکین مکہ میں اب سے داخل نہ ہوں تو بعض مسلمانوں کو یہ فکر پیدا ہوئی کہ اس سے ہماری تجارت کو نقصان پہنچے گا اور ہمارے اہل و عیال کو بھی جو مکہ میں ہیں ضرر پہنچے گا اندیشہ ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی^[۲] مگر ہمیں پہلی تفسیر زیادہ مرجح معلوم ہوتی ہے۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ ۗ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ ۖ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمْ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمُ الْمُدْبِرِينَ ۗ ثُمَّ أَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنْزَلَ جُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا وَعَدَّ بَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۗ وَذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ۗ ثُمَّ يَتُوبُ اللَّهُ مَنْ بَعْدَ ذَلِكَ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۗ

”اللہ نے تمہاری مدد کی ہے بہت سے مقامات پر اور حنین کے دن جب کہ تمہاری کثرت تعداد نے تم میں غرور پیدا کر دیا^[۳] تو اس نے تمہیں کچھ فائدہ نہ دیا اور تم پر زمین اپنی وسعت کے ساتھ ساتھ تنگ ہو گئی، پھر تم پیٹھ پھرا کے پسپا ہوئے، پھر اللہ نے اپنی طرف کا سکون و اطمینان^[۴] اتارا اپنے پیغمبر اور (سچے) ایمان والوں پر اور ایسی فوجیں اتاریں جنہیں تم نے دیکھا نہیں اور سزا دی انہیں جنہوں نے کفر کیا اور یہی سزا ہوتی ہے کافروں کی پھر اللہ اس کے بعد جس کی چاہتا ہے توبہ قبول کرتا ہے اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔“

جنگ حنین کا تذکرہ اور باوجود کثرت تعداد مسلمانوں میں ابتری اور انتشار

[۱]. روی عن ابی جعفر و ابی عبد اللہ (تبیان)

[۲]. لما اذن امیر المؤمنین علیہ السلام ان لا یدخل المسجد الحرام مشرک بعد ذلك العام جزعت قریش جزعاً شديداً وقالوا اذهب

تجارتنا وضاعت عیالنا وضربت دورنا فانزل الله عز وجل في ذلك (علی بن ابراہیم)

[۳]. العجب السرور بالنفس علی الفخر بما يستحب منه (تبیان)

[۴]. طمانینہ (جلالین)

ان موقعوں سے جہاں اللہ نے مسلمانوں کی مدد فرمائی، وہ مواقع جہاد مراد ہیں جہاں پیغمبر خدا ﷺ کا اور مخالفین اسلام کا مقابلہ ہوا۔ روایت میں وارد ہوا ہے کہ ان مہموں کی تعداد اسی تھی [۱]

اس سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ کثیر کی قید کے ساتھ کوئی نذر وغیرہ کی جائے تو اسی کی تعداد کثیر کا یقینی مصداق ہوگی۔ (یعنی اگر کوئی شخص نذر مان لے کہ کثیر افراد کو کھانا کھلانے کی نذر مان لے تو اس کے لئے اسی افراد کو کھانا کھلانا دینا کافی ہوگا اور یہ تعداد کثیر تعداد کہلائے گی)۔

مسلمان اس جنگ میں بارہ ہزار تھے اور کفار صرف چار ہزار تو بعض مسلمانوں کی زبان سے یہ نکلا کہ اب تو ہم اکثریت میں ہیں، اس لئے دشمن پر غالب آنے میں کوئی شک نہیں۔ اسی کو قرآن مجید کہہ رہا ہے کہ تمہاری کثرت نے تم میں غرور پیدا کر دیا۔ [۲]

ان الفاظ سے کہ ایسی فوجیں اتاریں جنہیں تم نے دیکھا نہیں یہ پتہ چلتا ہے کہ بدر کی طرح جنگ حنین میں بھی فرشتوں کا لشکر مدد کے لئے آیا تھا۔ [۳]

بعض لوگوں نے بدر اور حنین میں یہ فرق بتایا ہے کہ حنین میں فقط مسلمانوں میں سکون قلب پیدا کرنے کے لئے فرشتے اترے تھے جنگ نہیں کی تھی مگر بدر میں جنگ کی تھی۔ [۴]

لیکن ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے حنین میں بدر ہی کی طرح جنگ بھی کی تھی۔ [۵]

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ
عَامِهِمْ هَذَا ۖ وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ إِن شَاءَ ۗ

إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۲۸﴾

”اے ایمان لانے والو! مشرکین سراسر نجاست ہی نجاست ہیں تو وہ اس سال کے بعد آئندہ مسجد حرام کے پاس بھی نہ جائیں اور اگر تمہیں مفلسی کا اندیشہ ہو [۶] تو عنقریب اللہ تمہیں اپنے فضل و کرم سے انشاء اللہ غنی کر دے گا۔ یقیناً اللہ بڑا جاننے والا ہے، صحیح صحیح کام کرنے والا۔“

خالق نے صاف الفاظ میں مشرکین کو ”سراسر نجاست“ کہا ہے اور انما کلمہ حصر کے ساتھ جس کی بنا پر ہم نے ترجمہ کیا کہ ”نجاست ہی

[۱] روی عن ابی عبد اللہ اذہا کانت ثمانین موطناً (تبیان)

[۲] فقلتم لن تغلب الیوم من قلة (جلالین)

[۳] المراد بها ههنا الملائكة (تبیان)

[۴] قال الحباثی انما نزلت الملائكة یوم حنین من جهة الخاطر الذی یستجمع قلوبهم و یجین عنهم اعداءهم و لمح تقاتل الایوم بدر خاصة (تبیان)

[۵] قال رجل یقال شجرة بن ربيعة للمؤمنین و هو اسیر فی ایدیہم ابن الخیل البلق و الرجال علیہم الشیاب البیض فانما قتلنا بأیدیہم... قالو اتلك الملائكة (علی بن ابراہیم)

[۶] یعنی بسبب انقطاع سودا گران (فتح الرحمن)

نجاست ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں طہارت کا کوئی پہلو ہے ہی نہیں اور اسی لئے فقہ اہل بیت علیہم السلام میں انہیں نجس العین مانا جاتا ہے مگر سواد اعظم کے اقتدار دنیا کی بنا پر سیاسی مصالح، ان کی طہارت کے متقاضی ہوئے لہذا وہ قرآن کے اس نص قطعی کے خلاف ان کی طہارت کے قائل ہو گئے اور اس لئے شاہ عبدالقادر قرآن کے حکم صریحی نجاست کے تحت یوں رقم طراز ہیں کہ:

”پلیدی ان کے دل میں، بدن پر نہیں“ (موضح القرآن)

حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو قرآن ان پر نجس ہی نہیں بلکہ نجس کا جس کے معنی ہوئے عین نجاست، اطلاق کیوں کرتا؟! جلالین کا مشرب اگر چہ وہی ہے لیکن مقام تشریح میں ان کے الفاظ پھر بھی ایک حد تک درست ہیں کہ:

نجس قدر لخبث باطنہم

وہ نجس یعنی بالکل نجاست ہیں اپنے باطن کی گندگی کی وجہ سے۔

یہاں باطن کی نجاست کو علت حکم قرار دیا ہے مگر اس علت سے حکم جو مرتب ہوا وہ کیا ہے؟ خود ان کا نجس ہونا جو ان کی اس خباثت باطنی پر ایک پاداش کی حیثیت رکھتا ہے۔

یا درکھنا چاہیے کہ یہ مشرکین کے نجس ہونے کی آیت ۹ ہجری میں یعنی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تقریباً ایک سال پہلے نازل ہوئی ہے۔^[۱]

لہذا اس کے پہلے مسجد رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں کچھ کفار کے داخلہ یا نشست و برخاست یا اکل و شرب کے واقعات جو ہوں، وہ طہارت مشرکین کے ثبوت میں پیش نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ احکام تدریجی طور پر نازل ہوئے ہیں اور اسی تدریج کے ساتھ ان پر عمل ہوا ہے۔ قبل درود شرع اگر عمل اس کے خلاف ہوا ہو تو وہ اس حکم کے مقابلہ میں کوئی سند نہیں ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ

وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ

عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَبْرُونَ^[۲]

”اہل کتاب میں سے ان سے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ روز آخرت پر اور نہیں حرام سمجھتے اسے جو اللہ اور اس کے پیغمبر نے حرام قرار دیا ہے اور سچے دین کو اختیار نہیں کرتے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ احساس کمتری رکھتے ہوئے سیدھے ہاتھ^[۲] جزیہ ادا کریں۔“

سلسلہ ترتیب تزیلی میں اس کا فیصلہ مشکل ہے کہ یہ آیت کس منزل پر اتری ہے۔

[۱] بعد عامہم لهذا عام تسع من الهجرة (جلالین) سنة تسع من الهجرة التي نبذ فيها براءة المشركين وكانت بعدها حجة الوداع (تبیان)

[۲] عن يداي منقادين او بايديهم لا يواكلون بها (جلالین)

سورہ ”براءة“ کا جزء ہونا تو اس کا مقتضی ہے کہ یہ آخری دور حیات پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آیت ہو مگر اس وقت معاملہ مشرکین یعنی بت پرستوں کا تھا۔ اس میں یہ اہل کتاب کا ذکر کہاں سے آگیا؟ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عِزِّيُّ بْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصْرِيُّ الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ذَلِك قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ ۖ يُضَاهُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ قَتَلَهُمُ اللَّهُ ۗ أَتَى يَوْمَهُمُ ۝۳۰

”اور یہودیوں نے کہا کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور عیسائیوں نے کہا کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہ اپنے منہ سے ان کی باتیں ہیں، ویسی ہی باتیں کہتے ہیں جیسے پہلے کے کافروں کی باتیں تھیں اللہ ان کو غارت کرے ۱؎ کس طرح کج روی کر رہے ہیں۔ ۲؎“

یہ اپنے منہ سے ان کی باتیں ہیں، یعنی بلا ثبوت۔ ان کے پاس ان باتوں کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے ۳؎ اور نہ کوئی صحیح مفہوم ان کا ان کے ذہن میں ہے ۴؎ ”پہلے کے کافروں کی ایسی باتیں ہیں، یعنی مشرکین بھی تو فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے ۵؎ یا یہ کہ خود ان کے باپ دادا اور مذہبی پیشوا جیسے پال جنہوں نے یہ باتیں ایجاد کیں اور یہ اندھا دھند ان کی پیروی کر رہے ہیں۔ ۶؎“

اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهَبَاءَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۖ وَمِمَّا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَهًا وَاحِدًا ۗ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۖ سُبْحٰنَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝۳۱

”انہوں نے اپنے عالموں اور راہبوں کو اللہ کے علاوہ پروردگار بنا رکھا ہے اور مریم کے فرزند مسیح کو۔ حالانکہ حکم نہیں تھا سوا اس کے کہ وہ ایک خدا کی عبادت کریں جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے، وہ بری ہے اس سے کہ جو وہ شرک کرتے ہیں۔“

احبار یہودیوں کے علماء کہے جاتے تھے اور راہب عیسائیوں کے تارک الدنیا عابد۔ ۷؎

”انہوں نے پروردگار بنا رکھا ہے، یعنی چاہے زبان سے انہیں خدا نہ کہیں لیکن حلال و حرام میں صرف ان کے اقوال پر انہوں نے

۱؎ لعنہم اللہ (جلالین) لعنت کر دیا ایشان را خدا (شاک ولی اللہ)

۲؎ کیف یصر فون عن الحی مع قیام الدلیل (جلالین)

۳؎ یعنی اصلی ندارد (فتح الرحمن)

۴؎ لایرجع الی معنی صحیح فہو لا یجاوز افواہہم (تبیان)

۵؎ یعنی اہل کتاب ہو کر مشرکین کی پیروی کرنے لگے (موضح القرآن)

۶؎ الذین کفروا من قبل من آباءہم تقلید الہم (جلالین)

۷؎ احبارہم علماء الیہود و رہبائہم عباد النصارى (جلالین)

اپنا دار و مدار قرار دے لیا ہے۔^[۱]

حالانکہ علماء کا کام تشریح احکام نہیں ہے بلکہ احکام شرعیہ کو ان کے ماخذوں سے معلوم کر کے عوام کو بتلانا ہے۔ مسلمانوں میں علماء کا جو مرتبہ ہے، وہ اسی حد تک ہے، تشریح احکام میں کسی عالم کا قول ہرگز مستند نہیں ہے۔

مفسرین اہل سنت نے بھی اس کی تشریح یہی کی ہے چنانچہ تفسیر جلالین میں ہے:

حيث اتبعوهم في تحليل ما حرم و تحريم ما احل

اس طرح کہ انہوں نے ان کی پیروی کی حلال سمجھنے میں اس کے جو خدا نے حرام کیا تھا اور حرام سمجھنے میں اس کے جو اس نے حلال کیا تھا۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”ان کے عالم یا درویش جو اپنی عقل سے ٹھہرا دیتے، وہ جانتے خدا کے ہاں ہم کو چھوڑا ہو گیا، سو عالم کا قول عوام کو سند ہے جب کہ وہ شرع سے سمجھ کر کہے۔“ (موضح القرآن)

مگر یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اصول فقہ میں اہل سنت کے یہاں جو اصول ”تصویب“ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ احکام شرعی مجتہدین کے اقوال کے پابند ہیں اور مجتہدین بس چار گزرے ہیں۔ ابوحنیفہ وغیرہ اور سب کے لئے انہی کے اقوال پر چلنا باعث نجات ہے تو بتائیے کہ یہود و نصاریٰ کے اس تصور اور اسلام کی طرف منسوب شدہ تصور میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟

يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ

الْكَافِرُونَ ﴿۳۲﴾

”وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھادیں اور اللہ انکاری ہے کسی بات سے سوا اس کے کہ وہ اپنے نور کو

کمال تک پہنچائے چاہے کافر لوگ ناگواری محسوس کریں۔“

”اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھادیں“ یعنی پھونکوں سے اس چراغ کو خاموش کر دیں۔

شاہ عبدالقادر اس کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ:

”یعنی جیسے کوئی پھونک سے چراغ بجھا دے، وہ چاہتے ہیں کہ اپنی جھوٹی باتوں سے دین اسلام کو نہ پھیلنے دیں۔“ (موضح القرآن)

ان کے والد شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے:

”یعنی بشبہات تقریر می کنند در ابطال دین“۔ (فتح الرحمن)

جلالین کے الفاظ یہ ہیں۔

نور الله شرعه وبراهينه بأفواههم بأقوالهم فيه۔

[۱] معنی اتخاؤهم ارباباً انهم قبلوا منهم التحريم والتحليل بخلاف ما امر الله تعالى وهو المروى عن ابى جعفر و ابى عبد الله

”نور خدای“ یعنی اس کی شریعت اور اس کے دلائل ”اپنے منہ سے“ یعنی اپنے اقوال سے اس کے بارے میں۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے ”جھوٹی باتوں“ ”شبہات“ اور ”اقوال“ کی خصوصیت افواہ یعنی دہنوں کی لفظ کو دیکھتے ہوئے کی ہے حالانکہ يُظْفَعُ نُورَ اللَّهِ ”وہ اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں“..... یہ الفاظ تو بطور استعارہ ہیں۔ یعنی ان کی کوششوں کو دین کے مٹانے میں چراغ کو بجھانے والے کی کوشش سے تشبیہ دی گئی ہے۔

بافواہم ”اپنے دہنوں سے“ یہ لفظ مشبہہ بہ یعنی چراغ بجھانے کی مناسبت سے ہے کہ یہ بجھانے کی کوشش زیادہ تر منہ سے ہوا کرتی ہے۔ اس کے لئے یہ ضرورت نہیں ہے کہ مشبہہ یعنی دین کے مٹانے کی جو کوشش ہے، وہ بھی منہ سے ہی متعلق سمجھی جائے۔ وہ چیزیں یعنی شبہات اور اس طرح کے اقوال، وہ ایک نوع کی کوشش دین کے مٹانے کی ہے لہذا وہ بھی اس کے تحت میں داخل ہیں لیکن ان کے علاوہ جتنی طرح کی کوششیں بھی دین کے خلاف ”داسے، درمے، قدمے، سخنے“ ہوں اور اس سے آگے بڑھ کر زیر تلوار، اور لشکروں اور سیاسی کرتبوں سے وہ کوششیں جو رہنمایان دین کیخلاف ہر دور میں ہوئیں، سب اس کے تحت میں داخل ہیں جن میں سب سے بڑی کوشش جس میں سلطنتیں مصروف رہیں، وہ ان ہستیوں کی زندگی کا خاتمہ تھا جنہیں محافظ دین کی حیثیت سے خالق نے رسول ﷺ کے بعد برقرار رکھا تھا مگر خالق صاف ارشاد فرما رہا ہے کہ ”يَأْتِي اللَّهُ إِلَّا آتٍ يُنذِرُ“ (یعنی) اللہ طے کئے ہوئے ہے کہ وہ اپنے نور کو کمال کی منزل تک پہنچا کر رہے گا۔ اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ ان تمام قہاری طاقتوں کی کوشش کے باوجود ان رہنمایان دین کا سلسلہ وجود ختم نہیں ہوا اور ان تمام منصوبوں کے برخلاف ان میں سے ایک محافظ دین قائم و برقرار ہے جو دین الہی کے کمال تک پہنچانے کا ضامن اور ”وَاللَّهُ مَتَمُّ نُورِهِ“ کا ثبوت کامل ہے۔

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظَاهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ۗ وَلَوْ

كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ﴿٣٧﴾

”وہ وہ ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تا کہ اسے ہر دین کے مقابلہ میں غالب کر کے رہے، چاہے مشرکین کو کتنا ہی ناپسند ہو۔“

آخر میں دین اسلام کے غالب آنے کا اعلان

اصل میں دین تو وہی ہے جو سچا ہو۔ اس کے خلاف جو کچھ ہو، وہ بے دینی ہے مگر اکثر باطل تصورات چونکہ بنام دین جاری ہیں، اس لئے دین ایک نہ رہا، بہت سے دین ہو گئے اور اب دین کی قسمیں ہو گئیں، دین حق اور ادا یا باطلہ ^[۱] عبوری منزلوں میں اس عمر دنیا کی اکثر باطل غالب بھی نظر آتا ہے مگر آخر میں خالق کا یہ اعلان ہے کہ وہ دین حق کو بلا استثناء تمام ادا یا باطلہ کے مقابلہ میں غلبہ عطا کر کے رہے گا یہی غلبہ دین حق وہ ہے جس کے اہل حق منتظر ہیں ^[۲] اور اس محافظ دین کی راہ دیکھ رہے ہیں جس کے ظہور سے یہ غلبہ حق دنیا کی آنکھوں کے سامنے آئے گا۔ اللھم عجل فرجہ وسهل مخرجه۔

[۱] الدین کلہ جمیع الادیان المغالفة لہ (جلالین) دین الحق هو الاسلام... وکل دین سواہ باطل (تبیان)

[۲] قال ابو جعفر علیہ السلام: ان ذلک یكون عند خروج القائم (تبیان)

يَأْتِيهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ
النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ
وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٤﴾ يَوْمَ يُجْمَى
عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هَذَا مَا
كُنْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ ﴿٣٥﴾

”اے ایمان لانے والو! یقیناً بہت سے پادری اور راہب، لوگوں کے اموال ناحق کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے
انحراف کرتے ہیں [۱] اور وہ جو سونے اور چاندی کے ذخیرے اکٹھا کرتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں
کرتے تو انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سناؤ، جس دن آتش جہنم میں ان (سونے چاندی کے سکوں) کو تپایا
جائے گا، اور ان سے ان کی پیشانیوں اور پہلوؤں کو داغا جائے گا کہ یہ وہ ہے جو تم نے اپنے لئے ذخیرہ جمع کیا تھا۔
اب چکھو مزہ ان کا جو تم ذخیرہ جمع کرتے رہتے تھے۔“

اکتناز کی مذمت اور اس کی سزا

”لوگوں کے اموال ناحق کھاتے ہیں“ یعنی رشوت وغیرہ لے کر غلط مسئلے بتاتے ہیں [۲] اکٹھا کرنے اور اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے سے
مراد زکوٰۃ وغیرہ حقوق مالی کا جو فرض عین ہیں، ادا نہ کرنا ہے۔ [۳]

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَوَاتِ
وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرْمٌ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ فَلَا تَظْلِمُوا فِيهِنَّ
أَنفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ
مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿٣٦﴾

”بلاشبہ مہینوں کی تعداد اللہ کے نزدیک بارہ مہینوں کی ہے اللہ کے نوشتہ میں اس دن کہ جب آسمانوں اور زمین کو
پیدا کیا، ان میں سے چار حرمت والے ہیں۔ یہ صحیح دین ہے تو ان میں اپنے نفوس پر ستم نہ ڈھاؤ اور مشرکوں سے

[۱]۔ دوسرا ترجمہ اس کا یہ ہے کہ ”بائزھی دارند از راه خدا“ (شاہ ولی اللہ) یہ تفسیر جلالین کے مطابق ہے:۔ یصدون الناس

[۲]۔ اكل المال بالباطل تملكه من الجهات التي يحرم منها اخذها (تبیان)

[۳]۔ لا تهم لو اخر جواز كو تبها و كنزوا ما بقى له يكونوا ملومين بلا خلاف. (تبیان)

سبھوں سے جنگ کرو جیسے وہ سب ہی تم سے جنگ کرتے ہیں اور جانے رہو کہ اللہ پر ہیزگاروں کے ساتھ ہے۔“

مہینوں کی تعداد بارہ اور چار محترم جن میں جنگ وجدل حرام ہے

”اللہ کے نوشتہ“ سے مراد لوح محفوظ بھی ہو سکتی ہے اور سابق کی نازل شدہ آسمانی کتابیں بھی [۱]

”جب سے آسمان وزمین پیدا ہوئے“ یعنی ہمیشہ سے ”چار مہینے حرام ہیں“ یعنی ان کی عزت و حرمت ایسی ہے کہ ان میں جدال و قتال حرام ہے۔ یہ چاروں مہینے ذیقعد، ذی الحج، محرم اور رجب ہیں۔ ان چاروں میں سے محرم کا تو تقریباً نام ہی ہو گیا ”محرم الحرام“۔

یہ صحیح دین ہے ”یعنی ان مہینوں کی اس عزت و حرمت کو ماننا دین کا لازمی تقاضا ہے۔“ [۲]

اور ہو سکتا ہے یہ پورے سے متعلق ہو یعنی پیش خدا بارہ مہینوں کا ہونا اور ان میں سے چار کا محترم ہونا یہ دین حق کا لازمی جز ہے۔ اس کے ساتھ مشرکین کے مقابلہ میں جنگ کا جو حکم آیا ہے اس قید کے ساتھ کہ ”جیسے تم سے سب مل کر لڑتے ہیں“..... اس سے مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ان مہینوں کی حرمت کو نہ مانیں اور آغاز جنگ کر دیں تو تم بھی مقابلہ کرو پھر تم پر ان مہینوں کی بے حرمتی کا الزام عائد نہ ہوگا۔ [۳]

إِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا إِعْلَانُهُ عَامًا وَيَجْرِمُونَهُ
عَامًا لِيُؤَاطِعُوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ فَيُحِلُّوا مَا حَرَّمَ اللَّهُ ط زَيْنَ لَهُمْ سُوءُ
أَعْمَالِهِمْ ط وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ط [۴]

”مہینوں میں ردوبدل کرنا، کفر میں ایک بڑی زیادتی ہی ہے جس سے گمراہ ہوتے ہیں، وہ جنہوں نے کفر اختیار کیا، وہ ایک سال اسے حلال قرار دیتے ہیں اور ایک سال اسے حرام بنا دیتے ہیں تاکہ جو اللہ نے حرام قرار دیئے ہیں، ان کی گنتی پوری کر دیں اور اس طرح جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے، اسے حلال کر دیں۔ ان کی بد اعمالی ان کے لئے خوش آئند معلوم ہوتی ہے اور اللہ کافروں کو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا۔“

نسیء یعنی مہینوں کی تبدیلی کی شدید مذمت

نسیء یعنی مہینوں میں ردوبدل کس طرح ہوتی تھی؟

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

”گاہے صفر را محرم می ساختند و محرم را صفر و علیٰ ہذا القیاس“ (فتح الرحمن)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسم کے اعتبار سے تو جو حرام مہینے ہیں، ان ہی کو حرام قرار دیتے تھے مگر مسمیٰ کو ان کے بدلتے تھے یعنی جو واقعاً

[۱] فیما کتبہ اللہ فی اللوح المحفوظ و فی الکتب المنزلة علی انبیاءہ (تبیان)

[۲] ذلک تحریمہا (جلالین)

[۳] واقتلو المشرکین كافة ای جمیعاً فی کل الشهور (جلالین)

محرم ہوتا، اسے صفر قرار دیتے اور جو صفر ہوتا، اسے محرم مگر یہ کیونکر ہوتا تھا؟ اس کے لئے مزید تشریح درکار ہے۔
شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”کافروں نے ایک گمراہی نکالی تھی کہ آپس میں لڑتے اس میں آجاتا ماہ محرم، اس کو ہٹا دیتے کہتے اب کے برس صفر پہلے آیا، محرم پیچھے آوے گا تو ماہ حرام میں لڑتے اس حیلہ سے“ (موخ القرآن)
یہ تفسیر جلالین سے ماخوذ ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ:

كما كانت الجاهلية تفعله من تأخير حرمة المحرم اذا اهل وهم في القتال الى صفر
جیسا کہ جاہلیت والے کرتے تھے کہ اگر جنگ میں مصروف ہیں اور اس میں محرم کا چاند ہو گیا تو اس کی حرمت کو بعد میں صفر کی طرف منتقل کر دیتے تھے۔

ایک خیال یہ ہے کہ اس کا باعث معاشی پہلو کا لحاظ تھا چونکہ عربوں کی گزر بسر لوٹ مار پر تھی اور تین مہینے مسلسل محترم ہونے کی وجہ سے اتنی طویل مدت تک وہ اپنی روزی سے محروم رہتے تھے، اس لئے وہ محرم کی جگہ صفر کا اعلان کر دیتے تھے تاکہ وہ درمیان میں لوٹ مار کر لیں اور پھر صفر کے مہینہ میں محرم بنالیں ^[۱] اس کو قرآن نے روکا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمْ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَتَأْتَلْتُمْ إِلَى
الْأَرْضِ ۗ أَرْضَيْتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ ۗ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي
الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ﴿۸۸﴾

”اے ایمان لانے والو! تمہیں کیا ہے کہ جب کہا جاتا ہے تم سے کہ اللہ کی راہ میں باہر نکلو تو تم بوجھل ہو کر زمین گیر ہو جاتے ہو! کیا تم آخرت کے بدلے اس دنیاوی زندگی پر راضی ہو تو نہیں ہے اس دنیاوی زندگی کا سرو سامان آخرت کے مقابلہ میں مگر بہت کم۔“

یہ تبوک کی جنگ کے لئے چلنے کی دعوت پر کچھ مسلمانوں کے رویہ کا بیان ہے۔ ^[۲]
اس جنگ کے لئے رواگلی کا حکم بڑی سخت گرمی کے موسم میں تھا اور پھر بظاہر رومی سلطنت کا مقابلہ تھا اس لئے مسلمان بڑی مشکل سے جنگ کے لئے آمادہ ہو رہے تھے۔

مفسرین اہل سنت جنہیں کردار صحابہ کو سنبھالنے کی فکر دامن گیر رہتی ہے، کہتے ہیں کہ یہ صرف تین آدمی تھے ^[۳] مگر وہ تین آدمی تو وہ

[۱] انما دعاهم الى ذلك لوالى ثلثة اشهر حره لا يغبرون فيها وكان معاشهم من الغارة. (تبیان)

[۲] قال الحسن ومجاهد دعوا الى الخروج الى غزوة تبوك بعد فتح مكة وغزواتهم. (تبیان)

[۳] آن حضرت ﷺ در وقت عسرت و گرمی ہو امر توجہ غزوة تبوك شدن و بسیاری از صحابه موافقت کردند و از مسلمین سه کس بے عذر تخلف کردند. (فتح الرحمن)

تھے جو آخر تک نہیں گئے اور پھر نام ہوئے۔ ان کی توبہ اور اس کی قبولیت کا ذکر تین عدد کی صراحت کے ساتھ دوسری آیت میں موجود ہے مگر صرف تین عدد کا کردار ایسا تھوڑی ہو سکتا ہے کہ اس پر تمام مسلمانوں کو مخاطب کر کے انتباہ کیا جائے اور ایسی ایسی سخت تہدید و تحویف کی صورتیں اختیار کی جائیں جن سے صاف ظاہر ہے کہ ”محمل“ میں بڑی ”گرانی“ اور ”ذوق اطاعت“ میں بڑی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ اس لئے ”نوا“ کو ”تلخ تر“ اور ”حدی“ کو ”تیز تر“ قرار دیئے جانے کی ضرورت تھی۔

إِلَّا تَنْفَرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۖ وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ

شَيْئًا ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٣٩﴾

”اگر تم باہر نہ نکلو گے تو وہ تمہیں دردناک عذاب کے ساتھ سزا دے گا اور تمہارے بدلے کسی دوسرے گروہ کو کھڑا کر دے گا اور تم انہیں کچھ نقصان نہ پہنچاؤ گے اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔“

انداز کلام سے ظاہر ہے کہ یہ آیتیں سب جنگ میں روانگی سے پہلے کی ہیں اور اس وقت مسلمانوں میں یعنی صحابہ میں ایک عام بددلی، سستی اور عدول حکمی کے رجحان کی لہری پھیلی ہوئی تھی۔

پھر ان سخت تنبیہوں کے نتیجے میں بادل ناخواستہ تمام لوگ روانہ ہوئے مگر تین آدمی ایسے تھے جو حیلے حوالے کر کے پھر بھی نہ گئے جن کے متعلق بعد میں آیتیں نازل ہوئیں۔

لَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا ۗ فِي ضَمِيرِ كَسْ كِي طَرَفِ رَاجِعٍ هِيَ؟ اِسْ مِیْنِ دَوَقُولِ هِیْنِ: اِیْكَ یَیْكَ اَللّٰهُ كِی طَرَفِ هِیْ اَو رِدوَسِرِیْ هِیْ كِی رَسُوْلِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ كِی

طرف۔ [۱]

ہم نے دوسرے قول کے مطابق ترجمہ کیا ہے، اس لئے کہ اس کے بعد کی آیت میں بلافاصلہ جو ضمیریں ہیں، وہ واضح طور پر رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف راجع ہیں۔

إِلَّا تَنْصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي

الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا ۗ فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ

وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ ۗ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ

الْعُلْيَا ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٤٠﴾

”اگر تم ان کی مدد نہ کرو گے تو (کیا ہوا؟) اللہ نے ان کی مدد کی ہے اس وقت جب کافروں نے ان کو نکال دیا تھا، جب وہ دو میں کے ایک تھے [۲] جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ رنج نہ

[۱]۔ قیل فی من یرجع الیہ قولان: اِحدہما اَنہ یعود علی اسم اللّٰہ وَاُخْرٰ اِنہا تعود الی النبی ﷺ (تبیان)

[۲]۔ اِیْ اِحْدَاثِیْنِ (جلالین)

کرو، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے تو اللہ نے اپنی طرف کا سکون و اطمینان ان پر اتارا اور ان کو تقویت پہنچائی ایسی فوجوں سے جنہیں تم لوگوں نے نہیں دیکھا اور کافروں کی بات کو نیچا کیا اور اللہ کی بات سب سے بالا اور اللہ زبردست ہے، صحیح کام کرنے والا۔“

شب ہجرت کا مختصر حال

غار میں دوسرے شخص جو حضرت پیغمبر خدا ﷺ کے ساتھ تھے، یہ مشہور و معروف صحابی ابوبکرؓ تھے۔ یہ رسول ﷺ پر بڑا سخت وقت تھا جس کی سختی میں ساتھ والے کی وجہ سے اضافہ سے اضافہ ہو گیا تھا ورنہ نصرت الہی کے تذکرہ میں اس واقعہ کے بیان کی کہ ساتھ کون تھا اور اس کی کیا حالت تھی؟ کوئی ضرورت نہ تھی۔
اُدھر مشرکین تعاقب میں آ رہے تھے اور ادھر عین اس موقع پر جب مشرکین غار کے دہانے پر تھے، رسول ﷺ کے ساتھی پر رقت طاری ہو گئی جس کے لئے روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ:

قد قال له لما رأى اقدام المشركين لو نظر احدهم تحت قدمه لا بصرنا. (جلالین)
جب انہوں نے مشرکین کی پیش قدمی دیکھی تو رسول ﷺ سے کہنے لگے کہ ان میں سے کوئی بھی نظر جھکائے اپنے پیر کے نیچے تو وہ ضرور ہمیں دیکھ لے گا۔

مشرکین پہنچ تو گئے ہی تھے وہاں تک۔ بس ایک آواز کی کمی تھی جو نظروں کو قدموں کے نیچے متوجہ کر دے یہ کمی پوری ہو گئی گریہ کے غلبہ سے تو بس اس وقت پیغمبر خدا ﷺ کی حفاظت صرف خدا کی قدرت کا کرشمہ تھی اور اس نے ان پر سکون و اطمینان اتارا یعنی پیغمبر ﷺ پر اس لئے کہ قبل اور بعد کی تمام ضمیریں حضرت ﷺ ہی کی طرف راجع ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ درمیان کی اس ضمیر کو کسی اور کی طرف پلٹا دیا جائے۔ [1]

انْفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ط

ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۳۱﴾

”چل کھڑے ہو ہلکے پھلکے اور بھاری، بوجھل (جیسے بھی ہو) اور اپنے مال و جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم جانو۔“

”ہلکے پھلکے“ اور ”بھاری بوجھل“ کا مطلب یہ بتایا گیا ہے کہ خواہ تمہارے پاس مال و دولت موجود ہو اور تم طاقت رکھتے ہو اور خواہ تم محتاج، پریشان حال اور کمزور ہو، اس صورت میں کہا گیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہو گئی ہے اس ارشاد الہی سے کہ:

لَيْدَسَ عَلَى الضُّعْفَاءِ ----- حَرَجٌ كَمَزُورٍ پر----- سخی نہیں ہے۔

مگر شاہ ولی اللہ کہتے ہیں کہ اس معنی سے طاقت اور ضعف یہاں مراد نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ خواہ تمہارے پاس اسباب، چشم و خدم زیادہ ہو اور خواہ اتنا ہی بس موجود ہو جو پیٹ پالنے کے لئے کافی ہے، اس سے زیادہ لاؤ لشکر پاس نہ ہو، وہ کہتے ہیں:

[1]. فان جميع الكنايات قيل هذا وبعد ارجعة الى النبي ﷺ (تبیان)

”بایں توجیہ آیتہ محکم باشد غیر منسوخ“ (فتح الرحمن)۔

محققین علماء کے خیال کے مطابق گراں باری اور سبک باری کی بہت سی شکلیں ہیں جن کے لحاظ سے بہت سے اقوال ہو گئے ہیں۔ یہ کہ خواہ تم جوان ہو یا بوڑھے، یہ کہ مالدار ہو یا غریب، یہ کہ تمہاری طبیعت اس کے لئے آمادہ ہو یا طبیعت پر گراں ہو، کہ سوار ہو یا پیادہ، یہ بھی کہ تم کوئی پیشہ کرتے ہو یا بے کار ہو، صاحب اہل و عیال ہو یا اس بار سے سبکدوش ہو لہذا اس کی ضرورت کیا ہے کہ ان میں سے کسی ایک میں آیت کے مفہوم کو محدود بنایا جائے بلکہ کیوں اسے ان تمام پہلوؤں پر حاوی قرار نہ دیا جائے۔^[۱]

بہر صورت اسے منسوخ ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَسَفَرًا قَاصِدًا لَا تَبْعُوكَ وَ لَكِنْ بَعَدَتْ عَلَيْهِمُ
الشُّقَّةُ ۖ وَ سَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۖ يَهْلِكُونَ
أَنْفُسَهُمْ ۖ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿۳۲﴾

”اگر قریبی کوئی منفعت ہوتی تو^[۱] اور سفر معمولی ہوتا^[۲] تو وہ آپ کے پیچھے پیچھے ہو جاتے مگر ان پر بڑی دور دراز مسافت پڑ گئی اور بہت جلد وہ اللہ کی قسم کھائیں گے کہ اگر ہم روانہ ہو سکتے تو آپ کے ساتھ ضرور نکلتے۔ وہ اپنے کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔“

یہ دور دراز مسافت شام کی سرزمین تھی جہاں جنگ تبوک کے لئے جانے کی دعوت دی گئی تھی۔^[۳]

عَفَا اللَّهُ عَنْكَ ۖ لِمَ أَذِنْتَ لَهُمْ حَتَّى يَتَّبِعِنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَ تَعَلَّمُ
الْكٰذِبِينَ ﴿۳۳﴾

”اللہ آپ کو معاف کرے، کیوں آپ نے انہیں اجازت دی جب تک کہ کھل نہ جائیں آپ پر وہ جو سچے ہیں اور وہ معلوم ہو جائیں کہ جو جھوٹے ہیں۔“

کچھ منافقین نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے خصوصی طور پر اجازت طلب کی کہ ہم گھروں میں بیٹھے رہیں اور ساتھ نہ جائیں۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اجازت دے دی۔ ارشاد حضرت احدیت ہے کہ اب تو ان کے لئے ایک پردہ ہو گیا عدول حکمی کے الزام سے بچنے کے لئے۔ آپ اجازت نہ دیتے تو پورا انکشاف ہو جاتا کہ کون تعیل حکم سچائی کے ساتھ کرتے ہیں اور کون جھوٹے ہیں؟

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اجازت دینے کا حق بنص قرآن حاصل تھا جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

[۱]. ان یحمل علی عمومہ فیدخل فیہ جمیع ذلک و هو الاولی و الالبی بالظاہر (تبیان)

[۲]. اگر بودی انچہ بآن دعوت می کنی نفع قریب الحصول (شاکہ ولی اللہ)

[۳]. سفر آسہلا باقتصادہ من غیر طول (تبیان)

[۴]. یعنی الی تبوک (علی بن ابراہیم)

وَرَسُولِهِ فَإِذَا اسْتَأْذَنَكَ لِبَعْضِ شَأْنِهِمْ فَأَذِّنْ لِمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ .
 اگر وہ اپنی کسی مجبوری سے جنگ میں نہ جانے کی اجازت مانگیں تو جسے آپ چاہیں اجازت دے دیجئے۔ (نور: ۶۲)
 اس لئے یہ اجازت دینا معاذ اللہ کوئی فعل ناجائز نہ تھا جو منافی عصمت ہو مگر خالق کی نظر میں اس موقع پر اجازت نہ دینا زیادہ مناسب

تھا۔ [۱]

لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يُجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ
 وَأَنْفُسِهِمْ ط وَاللَّهُ عَلَيْهِمُ بِالْمُتَّقِينَ ﴿۳۷﴾ إِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ
 وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوبُهُمْ فَهُمْ فِي رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُونَ ﴿۳۸﴾

”آپ سے چھٹی نہیں مانتے وہ جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اس سے [۲] کہ وہ اپنے مال اور جان سے
 جہاد کریں اور اللہ پر ہیزگاروں کا خوب جاننے والا ہے۔ آپ سے چھٹی کے طالب تو بس وہ ہوتے ہیں جو اللہ اور
 روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دلوں کو شک ہے تو وہ اپنے شک میں ڈانوا ڈول رہتے ہیں“ [۳]

وَلَوْ أَرَادُوا الْخُرُوجَ لَأَعَدُّوا لَهُ عُدَّةً وَلَكِنْ كَرِهَ اللَّهُ انْبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ
 وَقِيلَ اقْعُدُوا مَعَ الْقَاعِدِينَ ﴿۳۹﴾

”اور اگر وہ باہر نکلنے کی نیت رکھتے تو اس کے لئے پہلے سے تیاری کرتے مگر اللہ کو ان کا چل کھڑا ہونا ناپسند تھا تو اس
 نے ان کی ہمت پست کر دی اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھو بیٹھنے والوں کے ساتھ“
 توفیق الہی ذوق وطلب کے ساتھ شامل حال ہوتی ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (عنکبوت: ۶۹)

یہ لوگ اس ذوق سے محروم تھے، اس لئے توفیق ان سے سلب ہو گئی جس کا نام خذلان ہوتا ہے، اسی کو یہاں اس انداز میں بیان کیا گیا
 ہے۔ عام مفسرین نے اسے تقدیر الہی کے معنی میں قرار دیا ہے جو ازل سے ثابت ہے [۴] مگر اس طرح وہ بے تصور قرار پاتے ہیں۔

جناب شیخ الطائف نے اس کا مطلب اس طرح لکھا ہے کہ یہ منافق لوگ اگر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ واقعی نصرت اسلام اور جہاد کی نیت
 سے جانے کا قصد رکھتے ہوتے تو وہ اس کا سامان کرتے لیکن ان کی نیت یہ نہ تھی وہ تو یہ سوچے ہوئے تھے اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہاں رکنے کی
 اجازت نہ دی تو ہم جائیں گے اور ان کا کام بگاڑنے کی کوشش کریں گے اور مسلمانوں میں بددلی پھیلائیں گے لہذا اس طرح ان کے جانے کو اللہ

[۱]. ما كان الاولى ان لا يأذن (تبیان)

[۲]. في التخلف ان يجاهدوا (جلالین)

[۳]. معناه فهم في شكهم يذهبون ويرجعون (تبیان)

[۴]. ای قدر تعالیٰ ذلک (جلالین)

نے ناپسند کیا، اور ایسے اسباب فراہم کئے کہ ان کی ہمت پست ہو جائے۔

یہ ان کی ہمت کا پست ہونا اس طرح کے جانے سے ہے جو ان کے پیش نظر تھا۔ نہ کہ واقعی نصرت اسلام کے لئے جانے سے جو بلاشبہ اللہ کو پسند ہے اور اسے کہا نہیں جاسکتا کہ اللہ نے اسے ناپسند کیا [۱] اس صورت میں قدرت کی طرف سے ان کی راہ میں زبردست رکاوٹیں ڈالنے ہی کی ہمارے خیال میں بہت پُر زور تعبیر یہ ہے کہ ان سے کہہ دیا گیا کہ بیٹھو گھر میں بیٹھنے والوں کے ساتھ۔ یہ کہا جانا قدرتی اشارہ کے طور پر حکم کن کی طرح کی چیز ہے مگر تعجب ہے کہ مفسرین نے ”کہہ دیا گیا“ کے معنی میں اختلاف کے ساتھ یہ بحث کر ڈالی ہے کہ یہ کہنے والا کون ہو سکتا ہے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ انہیں اس پہلو کی طرف توجہ نہیں ہے۔ جو ہم نے لکھا ہے۔

لَوْ خَرَجُوا فِيكُمْ مَا زَادُوكُمْ إِلَّا خَبَالًا وَلَا أُوْضِعُوا لَكُمْ مَبْعُوثًا

الْفِتْنَةَ ۗ وَفِيكُمْ سَمْعُونَ لَهُمْ ط وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿۴۵﴾

”اگر وہ تم میں شامل ہو کر نکلتے تو تم میں بس خرابیوں میں اضافہ کرتے [۲] اور تمہارے درمیان گھوڑے دوڑاتے [۳] اس کوشش میں کہ تم میں فتنہ و فساد برپا ہو [۴] اور تم میں ایسے ہیں جو ان کی خوب سنتے ہیں اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔“

وہ تو منافقین کا ذکر تھا جو جنگ میں ساتھ نہیں گئے اور اب یہ مسلمانوں کی اس جماعت سے خطاب ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گئی تھی اور انہیں بتایا جا رہا ہے کہ یہ تو ان کے کردار کی مذمت ہے جسے خالق نے ظاہر کیا ہے مگر تمہیں ان کے اپنے ساتھ نہ جانے کا کوئی افسوس نہ ہونا چاہیے بلکہ خوش ہونا چاہیے کہ ان کا تمہارے ساتھ جانا تمہارے لئے زحمت کا باعث ہوتا۔ وہ اپنی بے عملی اور سہل انگاری سے تمہارے نظم و ضبط میں کمی کا باعث بھی ہوتے اور ادھر کی ادھر کر کے خود آپس ہی میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش بھی کرتے جس کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا ہے ”تمہارے درمیان گھوڑے دوڑاتے“..... اور ایک معنی اس کے یہ کہے گئے ہیں کہ وہ میدان جنگ سے فرار کی صورت سے بھاگ دوڑ کرتے [۵] مگر الفاظ سے پہلے معنی کا تبادلہ ذہن کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔

آخر میں بتلایا ہے کہ یہ ساتھ جانے والے بھی سب پختہ کار اور صحیح لوگ نہیں ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:- وَفِيكُمْ سَمْعُونَ لَهُمْ: یعنی تم میں ایسے لوگ ہیں جو ان کی باتوں میں آتے اور ان کے آلہ کار بنتے ہیں۔ [۶]

اس طرح وہ اگر میدان جنگ میں جاتے تو وہ اپنی سیسہ کاری سے پوری جماعت میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش ہی نہ کرتے بلکہ بہت

[۱]. فثبطهم الله عن الخروج الذي عزموا عليه ولحد يثبطهم عن الخروج الذي امرهم به لان الاول كفر والثاني طاعته (تبيين)

[۲]. فساد اتخذيل المو منين (جلالين)

[۳]. اسر عوا بينكم بالبعثي بالنميمة (جلالين)

[۴]. يطلبون لكم الفتنة بالقاء العداوة (جلالين)

[۵]. اى هر بوا عنكم (على بن ابراهيم)

[۶]. سماعون لهم ما يقولون سماع قبول (جلالين)

ممکن ہے وہ کامیاب ہو جاتے۔

اس آیت سے گزشتہ آیت کے مفہوم کی بالکل تشریح ہو جاتی ہے اور اسے تقویت ہوتی ہے جو آخر میں جناب شیخ الطائفہ کے حوالہ سے درج کیا گیا ہے۔^[۱]

لَقَدْ ابْتِغَوْا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلِ وَقَلَّبُوا لَكَ الْأُمُورَ حَتَّى جَاءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ أَمْرُ اللَّهِ وَهُمْ كَرِهُونَ ﴿۳۸﴾

”وہ پہلے بھی فتنہ پردازی کے خواہاں رہے ہیں اور آپ کے لئے معاملات کو درہم و برہم کرتے رہے ہیں یہاں تک کہ حق سامنے آ گیا اور اللہ کی بات غالب آ گئی، در صورتیکہ وہ ناپسند کرتے تھے۔“

یہ بظاہر تو کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے چنانچہ جناب شیخ الطائفہ نے اس کے تحت میں جنگ احد کے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ عبداللہ بن ابی اپنے ساتھ والوں کی جمعیت کے ساتھ عین موقع پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے الگ ہو کر مدینہ واپس گیا اور اس طرح دوسرے مسلمانوں کے لئے بھی پست ہمتی کا باعث ہوا۔^[۲]

دوسرے مفسر اس کے لئے اس خاص موقع کا پتہ نہیں دیتے بلکہ اسے عام بات قرار دیتے ہیں کہ منافقین ہجرت کے بعد شروع شروع ہی میں آپ کو نقصانات پہنچانے کی کوشش کرتے رہے مگر انہیں برابر ناکامی ہوئی۔^[۳]

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَقُولُ اِنَّ الدِّنَّ لِيْ وَلَا تَفْتِنِيْ ۗ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ۗ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكَافِرِيْنَ ﴿۳۹﴾

”اور ان میں ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ مجھے چھٹی دیجئے اور مجھے گمراہی میں مبتلا نہ کیجئے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ گمراہی میں وہ خود پڑ ہی چکے ہیں اور بلاشبہ دوزخ گھیرے ہوئے ہے کافروں کو۔“

جہاد کے موقع پر مسلمانوں کی پست ہمتی اور کمزوری کے نمونے

کہا جاتا ہے کہ یہ شخص جس کی طرف اشارہ ہے جَدِّ بن قیس تھا۔ اس نے جنگ تبوک کے لئے جانے سے یہ عجیب عذر کیا کہ مجھ پر جنسی خواہش کا غلبہ ہے اور وہاں روم کی حسین عورتیں سامنے آئیں گی تو میں ضبط نہ کر سکوں گا اور گمراہی میں پڑ جاؤں گا۔^[۴]

تفسیر علی بن ابراہیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے قبل و بعد کی آیتوں میں سب میں اسی جَدِّ بن قیس کی باتوں کی رد ہے۔ اسی نے یہ کہا تھا

[۱]. بین اللہ فی ہذا الایة الوجوہ فی کراہیة انبعاثہم ووجہ العلة فی تبشیرہم عن ذلک (تبیان)

[۲]. طلبوا فسادا ذات بینکم وافتراق کلمتکم فی یوم احد (تبیان)

[۳]. من قبل اول ما قدمت المدینة (جلالین)

[۴]. انی صغرہ بالنساء واخلشی ان رأیت نساء بنی الاصفران لا اصبر عنہن فافتتن (جلالین) مرا ابیلاروم برید کہ جمال رومیان دیدہ مفتون خواہم شد (فتح الرحمن) بہانہ لایا کہ روم کی عورتیں خوبصورت ہیں۔ اس ملک جا کر بدی میں گرفتار ہوں گا۔ (موضح القرآن)

کہ مجھے گمراہی میں مبتلا نہ کیجئے اور اسی نے لوگوں سے کہا تھا کہ اس گرمی میں سفر نہیں کرنا چاہیے اور اسی نے یہ کہا تھا کہ اس جنگ سے زندہ واپس نہیں آسکتے جس پر اس کے بعد کی آیت اتری کہ اگر آپ ﷺ کو کوئی بھلائی پہنچے تو انہیں صدمہ ہوگا۔

بعض مفسرین نے فتنہ یعنی گمراہی کا مطلب بس یہ لیا ہے کہ ایسا حکم مجھے نہ دیجئے جس کی میں تعمیل نہ کروں، اس طرح گمراہی سے مراد بس یہی عدم تعمیل حکم ہے۔ [۱]

بہر صورت اس کا قرآن نے یہ جواب دیا ہے کہ وہ گمراہی میں پڑیں گے کیا؟ نصرت حق میں پہلو تہی کرنے کی گمراہی خود کیا کم ہے جس میں وہ مبتلا ہیں ہی۔

إِنْ تُصِيبَكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۖ وَإِنْ تُصِيبَكَ مُصِيبَةٌ يَقُولُوا قَدْ أَخَذْنَا أَمْرًا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَهُمْ فَرِحُونَ ﴿۵۰﴾ قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا ۗ هُوَ مَوْلَانَا ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿۵۱﴾

”اگر آپ کے لئے کوئی بھلائی ہو تو وہ ان کے لئے رنج کا باعث ہوگی اور اگر آپ پر کوئی مصیبت آجائے تو وہ کہیں گے کہ (خیر) ہم نے اپنا انتظام پہلے سے کر لیا ہے اور وہ پلٹیں گے اس عالم میں کہ وہ خوش نظر آتے ہوں گے۔ کہہ دیجئے کہ ہرگز ہم کو کوئی مصیبت نہیں پہنچے گی مگر وہی جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دی ہے، وہ ہمارا مالک ہے اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ رکھنا چاہیے۔“

”ہم نے اپنا انتظام پہلے سے کر لیا ہے“..... اس انتظام سے مراد دشمنوں سے کوئی سازش بھی ہو سکتی ہے اور جنگ سے کنارہ کشی بھی۔ [۲]

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا إِلَّا إِحْدَى الْحُسَيْنِيَيْنِ ۗ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ أَنْ يُصِيبَكُمْ اللَّهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهِ أَوْ بِأَيْدِينَا ۗ فَتَرَبَّصُوا إِنَّا مَعَكُمْ مُتَرَبِّصُونَ ﴿۵۲﴾

”کہہ دیجئے کہ تم ہمارے لئے دو بھلائیوں میں سے ایک کے سوا اور کا ہے کا انتظار کر سکتے ہو؟ اور ہمیں تمہارے لئے اس کا انتظار ہے کہ اللہ تمہیں سزا دے، خواہ اپنی طرف سے یا ہمارے ہاتھوں سے تو تم انتظار رکھو، یقین سمجھو کہ ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار میں شریک ہیں۔“

بڑے بلیغ انداز میں تعلیم دی گئی ہے کہ ایک مومن کی ذہنیت کیا ہونا چاہئے اور پھر اس ذیل میں ایمان اور کفر کا جو لازمی انجام ہے، اس پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

[۱] ای لا تو ثمنی بان تکلفنی المشقة فی ذلك فارقم بالعصیان (تبیان)

[۲] یعنی پنہاں با اعدا مو افقت کردہ ایچہ یا از سفر مخلف نمودہ ایچہ (فتح الرحمن)

مثل تو یہ مشہور ہے کہ ”جنگ دوسرا در“ مگر ایمان اور کفر کی جنگ میں جو بظاہر ”دوسر“ ہیں، وہ نتیجتاً ایک ہی ہیں۔ جنگ میں ”دوسر“ کیا ہوتے ہیں؟ فتح و شکست نا؟ اور کسی ایک انسان کے لحاظ سے زندگی اور موت ہی نا؟ ان کے علاوہ تو تیسری شق کوئی نہیں ہے؟ لیکن یہ اگر مومن ہے اور حق کی خاطر جہاد کر رہا ہے تو فتح پائے تو اور شکست کھائے تو فتح پا کر زندہ واپس جائے تو، اور قتل ہو کر وہیں کام آجائے تو، بہر حال وہ کامیاب ہے یعنی اس کا انجام بخیر ہے لہذا بہر صورت دو بھلائیوں میں کی ایک اسے ملنا ضروری ہے۔ اور جو کفر کے راستے پر چل رہے ہیں، وہاں بھی وہ دونوں ”سمر“ نتیجے کے لحاظ سے ایک ہی ہیں۔ اگر انہوں نے جنگ میں فتح پائی یعنی زندہ رہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آخر میں ”انہیں کسی حادثہ ارضی و سماوی کا شکار ہونا پڑے گا جس سے خدا انہیں ان کے کفر و معصیت کی دنیا میں بھی سزا دے لے گا اور پھر آخرت میں جو سزا ہوگی، وہ تو ہے ہی اور اگر مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہو گئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے مومنین کے ہاتھ سے انہیں دنیا میں سزا دلوائی اور پھر آخرت کی سزا اس سے الگ رہی۔

غرض اہل حق کے لئے نتیجہ میں کسی برائی کا تصور نہیں ہو سکتا اور اہل باطل کے لئے نتیجہ میں کسی بھلائی کا امکان نہیں۔ اگر یہ چیز پیش نظر رہے تو کسی صاحب ایمان پر مایوسی طاری ہونے کا کہیں امکان ہے؟ یعنی اگر انسان کا ضمیر مطمئن ہو تو اسے یہ غور کرنا ہے ہی نہیں کہ نتیجہ کیا ہوگا؟ اسے سوا کامیابی و کامرانی کے کسی دوسرے تصور کی گنجائش ہی نہیں۔ اسی کو حضرت علی بن ابی طالب نے ان الفاظ میں ادا فرمایا ہے کہ:

فَإِنَّ الْمَرْءَ الْمُسْلِمَ مَا لَمْ يَغْشَ ذَنَابَةً تَنْظَهُ فَيَخْشَعُ لَهَا إِذَا ذُكِرَتْ، وَيُغْرَى بِهَا لِنَاهُ النَّاسِ، كَانَ كَالْفَالِجِ الْبَاسِرِ شَتَا الَّذِي يَنْتَظِرُ أَوَّلَ فَوْزَةٍ مِنْ قِدَاحِهِ تُوَجِّبُ لَهُ الْمَغْنَمَ، وَيُزْفَعُ عَنْهُ بِهَا الْمَغْرَمُ. وَكَذَلِكَ الْمَرْءُ الْمُسْلِمُ الْبَرِيءُ مِنَ الْخِيَانَةِ يَنْتَظِرُ مِنَ اللَّهِ إِحْدَى الْحُسَيْنَيْنِ: إِمَّا دَاعِيَ اللَّهِ فَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ لَهُ، وَإِمَّا رِزْقَ اللَّهِ فَإِذَا هُوَ ذُو أَهْلٍ وَمَالٍ وَمَعَهُ دِينُهُ وَحَسْبُهُ. (نہج البلاغہ مطبوعہ مصر ص ۶۷ و ۶۸)

جب تک کوئی مرد مسلمان کسی ایسی ذلیل حرکت کا مرتکب نہیں ہوتا کہ جو ظاہر ہو جائے تو اس کے تذکرہ سے اس کی آنکھیں نیچی ہو جائیں اور جس سے ذلیل آدمیوں کی جرأت بڑھے وہ اس کامیاب جواری کے مانند ہے جو جوئے کے تیروں کا پانسہ پھینک کر پہلے مرحلہ پر ہی ایسی جیت کا متوقع ہوتا ہے جس سے اسے فائدہ حاصل ہو اور پہلے نقصان ہو بھی چکا ہے تو وہ دور ہو جائے، اسی طرح وہ مسلمان جو بددیانتی سے پاک دامن ہو، دو اچھائیوں میں سے ایک کا منتظر رہتا ہے، یا اللہ کی طرف سے بلا و آئے تو اس شکل میں اللہ کے یہاں کی نعمتیں ہی اس کے لئے بہترین ہیں اور یا اللہ کی طرف سے دنیا کی نعمتیں حاصل ہوں تو اس صورت میں اس کے مال بھی ہے اور اولاد بھی اور پھر اس کا دین اور عزت نفس بھی برقرار ہے۔ (ترجمہ مفتی جعفر حسین صاحب مطبوعہ لاہور بار اول جلد اول ص ۱۳۹)

قُلْ أَنْفِقُوا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا لَنْ يُتَقَبَلَ مِنْكُمْ ۗ إِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فَسِيقِينَ ﴿۵۷﴾

”کہہ دیجئے کہ تم بخوشی یا بناخوشی کتنی ہی خیرات کرو، تم سے ہرگز قبول نہیں ہوگی۔ یقیناً تم بد اعمال لوگ ہو۔“

کہا جاتا ہے کہ اسی جہن قیس نے (جس کا ذکر چار آیتوں کے پہلے آیت ۴۹: ”وَمِنْهُمْ مَّنْ يَقُولُ ائْتِنِي وَلَا تَقْنِي“ کے تحت میں آچکا ہے) ساتھ چلنے میں اپنی شہوانی کمزوری کی بنا پر معذوری ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں مال سے مدد کرنے کے لئے تیار ہوں، یہ

اسی کا جواب ہے۔^[۱]

وَمَا مَنَعَهُمْ أَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقَتُهُمْ إِلَّا أَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَبِرَسُولِهِ وَلَا يَأْتُونَ الصَّلَاةَ إِلَّا وَهُمْ كُسَالَىٰ وَلَا يُنْفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كُرْهُونَ ۗ^[۵۵]

”اور کون سی چیز مانع ہے اس سے کہ ان کی خیرات ان سے قبول ہو سوا اس کے کہ انہوں نے اللہ اور رسول کے ساتھ کفر اختیار کیا ہے اور نماز کی طرف نہیں آتے مگر الکساتے ہوئے اور خیرات نہیں کرتے مگر اس حالت میں کہ دل سے اسے پسند نہیں کرتے۔“

شرط قبول اعمال ایمان ہے۔ ان میں ایمان جو شرط صحت عمل ہے مفقود ہے۔ اس کا مرکزی اظہار تو اسی جملہ سے ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کفر اختیار کئے ہوئے ہیں لیکن اگر وہ کھلے ہوئے کافر ہوتے تو اتنا کہہ دینا کافی تھا۔ اس کے لئے آثار و قرآن کی ضرورت نہ تھی مگر چونکہ ہیں وہ منافق یعنی زبان سے ایمان کا ادعا رکھنے والے لہذا صرف انہیں کافر کہہ دینے پر اکتفاء نہیں کی جاتی بلکہ دل سے ان کے ایمان نہ رکھنے کے شواہد بیان کئے جاتے ہیں کہ جو مؤمن ہیں، وہ تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے کیلئے بڑے ذوق و شوق سے آتے ہوں گے لیکن یہ لوگ چونکہ دل سے تو ذوق اطاعت رکھتے نہیں، اس لئے لاشتم پشتم بڑے الکساتے ہوئے نماز میں آتے ہیں اور خیرات بھی رغبت اور شوق کے ساتھ نہیں کرتے بلکہ دکھاوے کی خاطر مصالح پر نظر کر کے بادل ناخواستہ خیرات کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارا مال بیکار جا رہا ہے۔^[۲]

فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ ۗ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ ۗ^[۵۶]

”تو تمہیں ان کے مال اور اولاد خوش آئند نہ معلوم ہوں^[۳] اس سے اللہ بس یہ چاہتا ہے کہ انہیں اس دنیاوی زندگی میں سزا دے اور کشاکش ان کی جانیں نکلیں^[۴] اس عالم میں کہ وہ کافر ہیں۔“

یعنی کافروں کے لئے دنیاوی مال و دولت وغیرہ اکثر عذاب کی ایک شکل ہوتی ہے جس سے ان کے معاصی میں اور اضافہ ہوتا ہے اور وہ دنیا سے جاتے وقت پورے پورے عذاب آخرت کے مستحق ہو کر جاتے ہیں۔^[۵]

وَيَجْلِفُونَ بِاللَّهِ إِيَّاهُمْ لِمَنكُم ۗ وَمَا هُمْ مِنْكُمْ وَلَكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَفْرَقُونَ ۗ^[۵۶]

[۱]۔ وہ جو مدخر حج دینے لگا تھا، سو جواب ملا کہ بے اعتقاد کا مال قبول نہیں (موضح القرآن)

[۲]۔ لا تہم یعدوہا مغرماً (جلالین)

[۳]۔ ای لا تستحسن نعمتاً علیہم فہی استدراج (جلالین)

[۴]۔ الزهق الخروج بصعوبة (تبیان)

[۵]۔ فی عذابہم فی الآخرۃ اشد العذاب (جلالین)

يَجِدُونَ مَلْجَأًا أَوْ مَغْرِبًا أَوْ مَدْخَلًا لَّوَلَوْ اَلَّيْتَهُ وَهُمْ يَجْمَعُونَ ﴿٥٤﴾

”اور وہ اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ وہ تم ہی میں سے ہیں حالانکہ وہ تم میں سے ہیں نہیں مگر وہ ایسے لوگ ہیں جو ڈرتے رہتے ہیں۔ اگر وہ کوئی جائے پناہ پا جائیں یا غاریا کوئی داخل ہونے کی جگہ تو وہ بگ ٹٹ اس کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔“

جموح کا لفظ سواری کی سرکشی کے لئے آتا ہے چنانچہ شاہ رفیع الدین نے یجمعون کے لفظ کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ ”پھر جائیں طرف اس کے اور وہ سرکشی کرتے ہوں۔“ اس کے برخلاف ان کے والد شاہ ولی اللہ نے اس طرح ترجمہ کیا ہے کہ ”متوجہ شوند بان شتاب کنان۔“ یہ جلالین کے اتباع میں ہے جنہوں نے لکھا ہے:

یسرّ عون فی دخوله والانصراف عنکم اسرا عالا یردّہ شیء کالفرس الجموح.

اس کے اندر جانے اور تم سے مخرف ہونے میں بہت زیادہ تیزی کرتے ہیں جس سے کوئی چیز روک نہیں سکتی جیسے سرکش گھوڑا۔ ہم نے جو ترجمہ ”بگ ٹٹ“ کے لفظ کے ساتھ کیا ہے، وہ غالباً دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔ ”وہ ایسے لوگ ہیں جو ڈرتے رہتے ہیں“..... یعنی ان کے دلوں میں کفر و عناد چھپا ہے، اس کے اظہار سے وہ ڈرتے ہیں لہذا ظاہر داری سے کام لے کر تمہاری دوستی کی جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔^[۱]

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ ۖ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِنْ لَمْ يُعْطُوا مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْعَطُونَ ﴿٥٥﴾ وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُوا مَا آتَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَقَالُوا

حَسْبُنَا اللَّهُ سَيُؤْتِينَا اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَرَسُولُهُ ۖ إِنَّا إِلَى اللَّهِ رَاغِبُونَ ﴿٥٦﴾

”اور ان میں سے کوئی کوئی ایسا بھی ہے جو اموال زکوٰۃ کے بارے میں آپ پر نکتہ چینی کرتا ہے تو اگر انہیں اس میں سے مل جائے تو وہ راضی رہیں گے اور انہیں اس میں نہ دیا گیا تو وہ ایک دم ناراض ہو جاتے ہیں اور کاش وہ راضی رہتے اس پر کہ جو اللہ اور اس کے پیغمبر نے انہیں دیا ہے اور کہتے کہ اللہ ہمارے لئے کافی ہے۔ وہ عنقریب ہمیں اپنے فضل و کرم سے عطا کرے گا اور اس کا پیغمبر بلاشبہ ہم اللہ ہی سے لو لگائے ہوئے ہیں۔“

یاد رکھنا چاہئے کہ یہاں دو دفعہ عطا کی نسبت اللہ کے ساتھ ساتھ اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دی گئی ہے تو پھر معلوم نہیں کہ اگر کوئی مسلمان اللہ کو مانتے ہوئے بحیثیت وسیلہ یہ کہے کہ اس کا رسول یا اس کا ولی ہماری مدد کرے گا ہمیں مالا مال کر دے گا، ہمیں اولاد عطا کرے گا تو اس پر کچھ مسلمان کیوں ”شک“ ”شک“ کی آواز بلند کرتے ہیں!؟

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ وَالْعَمِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمَوْلَافَةِ قُلُوبِهِمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَرْمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ

[۱] یفرقون من اظہار الکفر (تبیان)

عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٦٥﴾

”اموال زکوٰۃ کا استحقاق تو بس فقیروں اور محتاجوں کو ہے اور انہیں کہ جو زکوٰۃ کے کارندے ہوں اور مؤلفۃ القلوب کو اور گلو خلاصی میں غلاموں کینیزوں کی اور قرض داروں کو اور راہ خدا میں اور مسافروں کو۔ یہ لازمی قانون ہے اللہ کی طرف کا اور اللہ بڑا جاننے والا ہے، صحیح کام کرنے والا۔“

مستحقین زکوٰۃ کا بیان

تمام مستحقین زکوٰۃ جماعت اہل اسلام سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر..... درمیان میں ایک صنف مؤلفۃ القلوب کی ہے۔ یہ وہ غیر مسلم اور خام کارنومسلم^[۱] ہیں جنہیں مدد دینا اسلامی ہمدردی اور اخلاق کے اثر کو ان کے دل پر قائم کر کے انہیں محاسن اسلامی پر غور کرنے کی ایک طرح سے دعوت دینا ہے۔ مؤلفۃ القلوب کے علاوہ دوسرے اقسام میں یہ شرط صحیح العقیدہ مسلمان ہوں، قرآن میں مذکور نہیں ہے بلکہ سنت سے ثابت ہے۔ نیز یہ کہ غیر سادات کی زکوٰۃ سادات پر حرام ہے۔^[۲]

وَمِنْهُمْ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ وَيَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ ط قُلْ أُذُنٌ خَيْرٌ لَّكُمْ يُؤْمِنُ
بِاللَّهِ وَيُؤْمِنُ لِمُؤْمِنِينَ وَرَحْمَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ ط وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ
اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٦٦﴾

”اور ان میں سے ایسے بھی ہیں جو پیغمبر کو ایذا پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ تو کان ہیں، کہیے کہ تمہارے لئے بہتری کا کان جو اللہ پر ایمان لائے ہوئے ہے اور مسلمانوں کی بات کو باور کر لیتا ہے اور (اللہ کی) مہربانی ان کے لئے جو تم میں سے ایمان رکھتے ہوں اور جو پیغمبر خدا کو ایذا پہنچاتے ہیں، ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔“

پیغمبر خدا ﷺ کا حسن خلق یہ تھا کہ آپ ہر ایک کی بات سن لیتے تھے اور اس پر چپ رہتے تھے جیسے کہ وہ اسے باور کر رہے ہیں۔ اس پر منافقین کہنے لگے کہ یہ تو بس کان ہیں یعنی ہر ایک کی سن لینا ہی ان کا کام ہے۔^[۳]

اس پر ارشاد قدرت ہوا کہ یہ تو تمہارے لئے بڑی اچھی بات ہے۔ اس پر شکوہ کیسا!

يَجْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ لِيَرْضَوْكُمْ ؕ وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضَوْهُ إِنْ كَانُوا
مُؤْمِنِينَ ﴿٦٧﴾

”وہ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ تمہیں خوش کریں حالانکہ اللہ اور اس کا رسول اس کا زیادہ حقدار ہے

[۱]۔ یعنی ضعیف اسلام (فتح الرحمن)

[۲]۔ بیعت السنۃ ان شرط المعطیٰ منها الاسلام وان لا یكون ہاشمیاً و مطلبیاً (جلالین)

[۳]۔ یعنی ہر چہ کسی بگوید قبول ہی کند (فتح الرحمن)

کہ وہ اسے خوش کریں اگر وہ ایمان لائے ہوئے ہوں۔“

أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّهُ مَنْ يُخَادِدُ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَأَنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا ۗ ذَٰلِكَ

الْحِزْبُ الْعَظِيمُ ﴿٣٣﴾

”کیا انہیں نہیں معلوم کہ جو اللہ اور اس کے پیغمبر سے مخالفت کرے گا تو بلاشبہ اس کے لئے دوزخ کی آگ ہوگی

جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، یہ بہت بڑی رسوائی ہے۔“

یاد رکھنا چاہیے کہ یہ کفار و مشرکین کا ذکر نہیں ہے بلکہ مسلمانوں میں سے ان افراد کا ذکر ہے جو اللہ اور رسول ﷺ کی مخالفت کریں۔ [۱] اس سے ظاہر ہے کہ مخلد فی النار ہونا کفار و مشرکین سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ظاہری اسلام لانے والوں میں بھی جو نص خدا اور رسول ﷺ کو نہ مانیں وہ اس زد میں آتے ہیں۔

يَحْذَرُ الْمُنَافِقُونَ أَنْ تُنزَّلَ عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِي قُلُوبِهِمْ ۗ قُلِ

اسْتَهْزِئُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُونَ ﴿٣٤﴾

”منافق لوگ ڈرتے ہیں کہ ان پر کوئی سورہ ایسا نہ آئے کہ جو انہیں بتلا دے وہ جو ان کے دلوں میں ہے۔ کہیے

کہ اڑاؤ مذاق، یقیناً اللہ برآمد کرے گا اسے جس سے تم ڈرتے ہو۔“

منافق ڈرتے ہیں کہ ان پر ”یعنی مسلمانوں پر [۲]“ کوئی سورہ ایسا نہ آئے جو انہیں بتلا دے وہ جو ان کے دلوں میں ہے۔ [۳] یہ ڈرنا اگر حقیقتاً ہوتا تو وہ تو اللہ اور رسالت دونوں پر ایمان کا نتیجہ ہوتا مگر یہ تو منافق ہیں لہذا انہیں واقعاً یہ ڈر کیوں کر ہو سکتا ہے بلکہ یہ بطور تمسخر اس ڈر کا اظہار ہے یعنی وہ آپس میں مذاق اڑانے کے طور پر کہتے ہیں کہ ارے بھئی! ایسی باتیں نہ کرو، کہیں کوئی سورہ ان پر اتنے آئے جو انہیں ان باتوں کی اطلاع دے دے، اس لئے قرآن نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ اڑاؤ مذاق۔ یہ تمہارا خوف جسے تم بطور تمسخر ظاہر کرتے ہو حقیقت کا لباس پہن کر رہے گا۔ ہماری قدیم تفسیر اس کے مطابق ہے۔ [۴]

بعض مفسرین نے اس پہلو کو نہ سمجھ کر اس جواب کو مرتبط بنانے کے لئے ایک فقرہ کو محذوف مانا ہے کہ وہ ڈرتے تو ہیں اس بات سے اور

[۱] علی وجہ التہدید والتقریر والتویب لہؤلاء المنافقین (تبیان)

[۲] علیہم ای المؤمنین (جلالین)

[۳] خبر دہدا یشارہا بآنچه در دل منافقان است (شاہ ولی اللہ)

[۴] کان قوم من المنافقین لما خرج رسول اللہ ﷺ الی تبوک کانوا يتحلقون فیما بینہم ویقولون لویریخ محمدان حرب الروم مثل

حرب غیر ہم لایرجع منہم احد ابدا فقال بعضهم اخاف ان یخبر اللہ محمدنا بما کنا فیہ وما فی قلوبنا وینزل علیہ بہذا قرانا یقرأ

علی الناس وقالوا لہذا علی حد الاستہزاء (علی بن ابراہیم)

پھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کا مذاق بھی اڑاتے ہیں [۱] اس پر کہا گیا کہ کہہ دیجئے کہ خوب مذاق اڑاؤ، اللہ ان باتوں کو ظاہر کرے رہے گا۔

وَلَيْن سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ ۗ قُلْ أَلَيْسَ بِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ

كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُونَ ﴿۶۵﴾

’اور اگر ان سے پوچھئے تو وہ کہیں گے کہ ہم تو بحث کر رہے تھے اور تفریح کر رہے تھے، کہنے کہ کیا اللہ اور اس کی

آیتوں اور اس کے پیغمبر کے ساتھ تم تمسخر کر رہے تھے۔‘

بعض لوگ کسی غلط بات کی اہمیت کو مذاق کہہ کر گھٹانا چاہتے ہیں حالانکہ جس کی عظمت نظر میں ہو اس کے ساتھ بطور مذاق بھی انسان کوئی

گستاخی نہیں کر سکتا۔

لَا تَعْتَدِرُوا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ ۗ إِنَّ نَعْفَ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ يُعَذِّبُ

طَآئِفَةٌ بِآثِمِهِمْ ۗ كَانُوا هُجْرًا مِّمَّنْ ﴿۶۶﴾

’عذرخواہی نہ کرو، تم مسلمان ہونے [۲] کے بعد کافر ہو چکے ہو۔ اگر تم میں سے ایک گروہ سے ہم درگزر بھی کریں تو

دوسرے گروہ کو سزا دیں گے اس بنا پر کہ وہ گنہگار تھے۔‘

’عذرخواہی نہ کرو‘ یعنی ایسی عذرخواہی جو صدق دل سے نہیں، اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

’ایک گروہ سے درگزر کریں تو دوسروں کو سزا دیں گے‘ یہ تفریق بلاوجہ نہ ہوگی بلکہ وہ چند آدمی پہلے گروہ والے وہ ہوں گے جنہوں نے

صدق دل سے توبہ کی [۳] اور جنہیں سزا دی جائے گی، وہ ہیں جو آخر تک اپنے نفاق اور مخالفت پر قائم رہے [۴] اور اسی لئے آخر میں کہا گیا:۔

’بِآثِمِهِمْ كَانُوا هُجْرًا مِّمَّنْ‘ اس بنا پر کہ وہ گنہگار تھے۔ [۵] اس سے ظاہر ہے کہ وہ جنہیں معاف کر دیا گیا، وہ ہیں جو توبہ کی وجہ سے گنہگار کی صف

سے باہر نکل گئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ تین آدمیوں کا ذکر جو قرآن میں کیا گیا ہے (وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِفُوا)۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے

کہ یہ پوری جماعت تین ہی آدمیوں کی تھی بلکہ یہ تین آدمی وہ ہیں جن کی توبہ قبول ہوئی اور ان کے علاوہ کتنے وہ تھے جو اپنے نفاق پر قائم و برقرار

رہے۔ ان کی تعداد کہیں قرآن میں مذکور نہیں ہے۔

الْمُنْفِقُونَ وَالْمُنْفِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ مَّيْمُونُونَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ

[۱] وہم مع ذلك يستهزئون (جلالین)

[۲] یعنی ایمان زبانی خود (فتح الرحمن)

[۳] باخلاصہا و توبتہا بخشی بن حسب بضم الحاء و فتح الميم و سکون الباء (جلالین)

[۴] معناه انہم کانوا هجرا ميمین مصرین علی النفاق (جلالین)

[۵] معناه انہ انما یعذب الطائفة التي یعذبہا لکونہا هجرة مذنبہ مرتکبة لما يستحق به العقاب (تبیان)

الْمَعْرُوفِ وَيَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ ط نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ ط إِنَّ الْمُنْفِقِينَ هُمُ
الْفٰسِقُونَ ﴿١٦﴾ وَعَدَّ اللَّهُ الْمُنْفِقِينَ وَالْمُنْفِقَاتِ وَالْكٰفِرَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِينَ
فِيهَا ط هِيَ حَسْبُهُمْ ؕ وَلَعَنَهُمُ اللَّهُ ؕ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴿١٧﴾

”منافق مرد اور منافق عورتیں۔ سب ایک تھالی کے چٹے بٹے ہیں [۱] برائیوں کی تحریک کرتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں، وہ اللہ کو بھول گئے تو اس نے انہیں بھلاوے میں ڈال دیا [۲] بلاشبہ منافق لوگ فاسق ہیں۔ اللہ نے وعدہ کیا ہے منافق مردوں، منافق عورتوں اور تمام کافروں سے آتش دوزخ کا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ وہ ان کے واسطے کافی ہے، اور اللہ نے ان پر لعنت کی ہے اور ان کے لئے رہنے والا عذاب ہے۔“

”اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں“ یعنی راہ خدا میں خیرات سے ہاتھ روک رہتے ہیں۔ [۳]

كَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوا أَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَآكثَرَ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا ط
فَاسْتَمْتَعُوا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِينَ مِنْ
قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِي خَاضُوا ط أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي
الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ؕ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ﴿١٩﴾

”ان لوگوں کی طرح جو تم سے پہلے، تم سے زیادہ طاقتور اور مال و اولاد میں تم سے زیادہ تھے تو وہ اپنے نصیب سے بہرہ ور ہوئے۔ اس کے بعد تم بھی اپنے نصیب سے ویسے ہی بہرہ اندوز ہوئے جیسے وہ کہ جو تم سے پہلے تھے اپنے نصیب سے بہرہ ور ہوئے اور تم بھی ویسے ہی مہملات میں پڑے جیسے وہ پڑے تھے [۴] یہ وہ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت ہوئے اور یہی لوگ گھانا اٹھانے والے ہیں۔“

أَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ ؕ وَقَوْمِ إِبْرٰهِيْمَ
وَآصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكِ ط أَتٰهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ؕ فَمَا كَانَ اللَّهُ

[۱]. المعنى ان بعضهم يضاف الى بعض بالاجتماع على النفاق كما يقول القائل لغيره انت منى وانا منك والمعنى ان امرنا واحدا لا ينفصل (تبيان)

[۲]. تر کہم من لطفه (جلالین)

[۳]. ای ہمسکون اموالهم عن انفاقها فی طاعه الله ومرضاته (تبيان)

[۴]. خضتم فی الباطل والكذب علی الله (تبيان)

لِيُظْلِمَهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٤٦﴾

”کیا انہیں نہیں پہنچی خبر ان لوگوں کی جو ان کے پہلے تھے، نوحؑ کی قوم اور عاد اور ثمود اور ابراہیمؑ کی قوم اور مدین والے اور مؤتفکات والے۔ ان کے پاس ان کے پیغمبر معجزے۔ [۱] لے کر آئے تو اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرے مگر وہ خود اپنے اوپر ظلم ڈھاتے تھے۔“

”مؤتفکات“ سے مراد قوم لوط کی بستیاں ہیں، چونکہ وہ تین تھیں، اس لئے یہاں انہیں بصورت جمع لایا گیا ہے اور دوسری جگہ سورہٴ نجم میں ان سب کو ایک کر کے اس طرح کیا گیا ہے کہ ”وَالْمُؤْتَفِكَةَ أَهْوَى“ بہر صورت کہا گیا ہے کہ ان بستیوں کو اس لفظ سے ان کے انجام کے لحاظ سے یاد کیا گیا ہے کہ ان پر عذاب نازل کیا گیا تو انہیں الٹ دیا گیا۔ [۲]

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۗ أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٤٧﴾ وَعَدَّ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَمَسْكِنٍ طَيِّبَةٍ فِي جَنَّاتٍ عَدْنٍ ۗ وَرِضْوَانٍ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ ۗ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٤٨﴾

”اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ وہ نیک باتوں کی تحریک کرتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں، اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن پر اللہ اپنی رحمت اتارے گا، یقیناً اللہ زبردست ہے، صحیح صحیح کام کرنے والا۔ اللہ نے ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں سے وعدہ کیا ہے ان بہشتوں کا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور پاک و پاکیزہ مکانات کا ہمیشہ رہنے والے بہشتوں میں اور اللہ کی طرف کی ذرا بھی خوشنودی سب سے بڑی چیز ہے، یہی ہے بہت بڑی کامیابی۔“

سابق میں جو اوصاف اور ان کے نتائج نفاق رکھنے والے مردوں اور عورتوں کے لئے بیان ہوئے تھے ان کے بالمقابل اوصاف اور نتائج اب صاحب ایمان مردوں اور عورتوں کے لئے بیان ہو رہے ہیں۔ ”مؤمنین اور مومنات آپس میں ایک دوسرے کے ہم آہنگ ہیں“ یعنی انہیں آپس میں ہمدردی و ہمدردی ہونا چاہیے اور اتحاد و عمل سے کام لینا چاہیے۔ یہی ان کی ایمانی وحدت کا تقاضا ہے۔ [۳]

[۱]۔ بالبینات بالمعجزات (جلالین)

[۲]۔ قرئی قوم لوط ای اہلہا (جلالین) قال الزجاج معناه اتتفکت باہلہا انقلب (تبیان)

[۳]۔ ای یلزم کل واحد منهم نصرۃ صاحبہ (تبیان)

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ط وَمَا لَهُمْ جَهَنَّمَ ط

وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿٥٣﴾

”اے پیغمبر! جہاد کیجئے کافروں اور منافقوں سے اور ان پر سختی کیجئے اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔“

کفار کے ساتھ ساتھ منافقین سے بھی جہاد کا حکم

یہاں صاف رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار اور منافقین سے جہاد کا حکم ہوا ہے اور دونوں ایک ہی لفظ سے ہیں۔ اس لئے اس میں یہ تفریق کہ وہ پہلا جہاد تلوار والا ہے اور دوسرا زبان سے [۱] بالکل ”بیجا بندہ“ کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن میں ذرا بھی یہ تفریق نہیں ہے۔

مگر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی مدت حیات میں جتنے جہادوں کا موقع ملا وہ سب کفار کے مقابلہ میں تھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی نے اتنی وفا نہیں کی کہ وہ دوسرے جزیء کی تکمیل فرما سکیں۔ اس لئے لازماً ضرورت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بعد خود اپنے کسی ایسے جانشین کو چھوڑ جائیں جو آپ کے باقی کام کی تکمیل کرے۔ اس لئے کہ کوئی بعد میں بطور خود جانشین بن جائے یا دوسرے لوگ بنا دیں تو وہ اپنے افعال کا خود ذمہ دار ہے۔ اس کے فعل سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری پوری نہیں ہوتی۔ ہاں وہ جانشین اگر بحکم خدا خود رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مقرر کیا ہوا ہے تو جو کچھ وہ کرے، اس کے ذمہ دار رسول صلی اللہ علیہ وسلم سمجھے جاسکتے ہیں۔ اب جس طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے جزیء کی تکمیل فرمائی اس طرف زمانہ کے لحاظ سے، اسی طرح اگر ان کے بعد والا جانشین اپنے طرف زمانہ کے مطابق صرف دوسرے جزیء کی تکمیل کرتا ہوا نظر آئے جو تتمہ فعل رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے تو اس کے دور پر یہ اعتراض وارد نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے پہلے جزیء پر کیوں عمل نہ کیا یعنی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اپنے دور میں کافروں سے کوئی جہاد کیوں نہ کیا جب کہ تقسیم عمل کے طور پر تقدیر الہی نے ایک فریضہ کے دو جزو دوزندگیوں میں تقسیم کر دیئے تھے تو اب دونوں کو ملا ہی کر دیکھنا درست ہوگا۔ جس طرح پہلے جزیء کے وقت دوسرے جزیء کو ڈھونڈنا غلط ہے اسی طرح دوسرے جزیء کے ہنگام میں پہلے جزیء کو تلاش کرنا اصولاً بالکل غلط ہوگا۔

یہی تقسیم عمل ہے جسے حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے متفق علیہ حدیث میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے ظاہر فرمایا تھا کہ:

انك تقاتل على تأويل القرآن كما قاتلت على تنزيله.

(اے علیؓ) تم تاویل قرآن پر جنگ کرو گے جس طرح میں نے اس کی تنزیل پر جنگ کی۔

ظاہر ہے کہ تنزیل قرآن کے منکر کافر تھے اور تاویل قرآن کے منکر یعنی صحیح مفہوم کے بجائے غلط مفہوم تراشنے والے تنزیل قرآن کو بظاہر ماننے والے ہوں گے لہذا وہ منافقین ہوں گے اور ان سے جنگ کرنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذمہ داری ہے۔

يَجْلِفُونَ بِاللَّهِ مَا قَالُوا ط وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ

وَهُمْ أَوْمًا يَتَّالُوا ط وَمَا نَقَبُوا إِلَّا أَنْ أَعْنَدَهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ مِنْ فَضْلِهِ ؕ

فَإِنْ يَتُوبُوا إِلَيْكَ خَيْرٌ لَّهُمْ ؕ وَإِنْ يَتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ عَذَابًا أَلِيمًا ؕ فِي الدُّنْيَا

[۱] الكفار بالسيف والمنافقين باللسان والحجة (جلالین)

وَالْآخِرَةُ ۖ وَمَا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿٤٣﴾

”وہ اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ انہوں نے نہیں کہا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے کہا کفر کا کلمہ اور اسلام لانے کے بعد کافر ہو گئے اور ایسے منصوبے بنائے جن میں کامیاب نہیں ہوئے اور کوئی بات ایسی نہیں جس سے وہ ناراض ہوں سوا اس کے کہ اللہ اور پیغمبر نے انہیں اپنے فضل و کرم سے مالدار بنایا۔ اب اگر وہ توبہ کر لیں تو انہی کے لئے بہتر ہے اور اگر وہ روگردانی کریں تو انہیں اللہ دنیا و آخرت میں دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا اور روئے زمین پر ان کا کوئی حامی و مددگار نہ ہوگا۔“

”کوئی بات ایسی نہیں جس سے وہ ناراض ہوں سوا اس کے“ یہ جملہ معافی و بیان کے لحاظ سے ایک صنعت کے قبیل سے ہے جسے ”تاکید المدح بما یشبہ الذم“ کہتے ہیں یعنی تعریف میں زور پیدا کرنا ایسے انداز میں جو مشابہ مذمت کے ہو“ اس کی مثال عربی میں شاعر کا یہ شعر ہے:

و لا عیب فیہم غیر ان سیوفہم

بہن فلول من قراع الکتائب

”ان میں کوئی عیب نہیں ہے سوا اس کے کہ ان کی تلواریں جا بجا گر گئی ہیں افواج سے جنگ میں۔“

عرب نقطہ نظر سے مسلسل جنگ آزمائی و شمشیر زنی کوئی عیب نہیں، بلکہ بڑا ہنر ہے۔ یہ کہنا کہ سوا اس کے کوئی عیب نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ عیب ڈھونڈنا بھی جائز ہے تو ہنر ہی ملے گا۔ نتیجہ یہی ہے کہ ان میں قطعاً کوئی عیب نہیں ہے۔

اسی طرح یہاں قرآن کا جملہ ہے کہ ”وہ ان کی کسی بات سے ناراض نہیں سوا اس کے کہ اللہ اور رسول ﷺ نے ان کو دولت مند بنا دیا“..... ظاہر ہے کہ یہ ناراضگی کی بات نہیں تو نتیجہ یہ ہے کہ ان کی ناراضگی رسول ﷺ سے قطعاً حق بجانب نہیں ہے اور ہرگز کوئی وجہ ناراضگی کی ان کے لئے رسول ﷺ سے عقلی طور پر نہیں ہے۔ اس آیت پر نظر کر کے پھر یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن مالدار بنانے کی نسبت اللہ کے ساتھ رسول ﷺ کی طرف دے رہا ہے۔ [۱] حالانکہ اصل فاعل خداوند عالم ہے لیکن یہی وہ چیز ہے جس کے کسی مسلمان کی زبان پر آنے سے ایک طبقہ ”شُرک“ ”شُرک“ کی آوازیں بلند کرنے لگتا ہے جو از روئے قرآن مجید صحیح نہیں ہے۔ ”جو منصوبہ ان منافقین نے بنایا تھا، اس میں کامیاب نہیں ہوئے“..... یہ منصوبہ رسول خدا ﷺ کو شہید کرنے کا تھا، اس موقع پر جب آپ تبوک سے واپس ہو رہے تھے۔ [۲]

و مِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَیْنِ اٰتِنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ

الصّٰلِحِیْنَ ﴿٤٤﴾ فَلَمَّآ اٰتٰهُمْ مِنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَهُمْ

مُعْرِضُوْنَ ﴿٤٥﴾ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَوْنَهٗۤ مَا اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا و

[۱] تو گر ساخت ایشان را خدا و رسول او (شاه ولی اللہ) دولت مند کیا ان کو اللہ نے اور رسول اس کے نے (شاه فوج الدین)

[۲] همو اما لم یبالوا من الفتك بالنبي ﷺ ليلة العقبة عند عودته من تبوك (جلالین)

عَدُوَّهُوَمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ﴿٤٤﴾

”اور ان میں ایسے بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر وہ اپنے فضل و کرم سے ہمیں عطا کرے تو ہم خیرات کریں گے اور نیک اعمال بجالانے والوں میں سے ہوں گے تو جب اللہ نے انہیں اپنے فضل و کرم سے دیا تو انہوں نے اس کے ساتھ بخل کیا اور بے اعتنائی اختیار کرتے ہوئے روگردانی سے کام لیا تو اللہ نے ان کا انجام یہ کیا کہ ان کے دلوں میں نفاق رہ گیا [۱] اس دن تک کے لئے کہ جب تک وہ اسے منہ دکھائیں گے، اس سزا میں کہ انہوں نے خلف و عد کیا اللہ سے اور اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔“

مفسرین اس ذیل میں ایک ہی آدمی کا نام لیتے ہیں اور اس کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ اس نے رسول ﷺ سے درخواست کی کہ آپ میرے لئے وسعت رزق کی دعا فرمائیں چنانچہ آپ نے دعا فرمائی اور اس کے مال و دولت میں فراوانی ہوئی مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے نماز جماعت میں آنا چھوڑ دیا اور زکوٰۃ بند کر دی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس کے بعد ایک وقت ایسا آیا کہ وہ رسول ﷺ کی خدمت میں زکوٰۃ لے کر آیا مگر آپ نے اس کے قبول کرنے سے انکار فرما دیا۔ پھر وہ خلیفہ اول کے دور میں آیا۔ انہوں نے بھی اس کی زکوٰۃ نہیں لی یہاں تک کہ انہی کے دور میں وہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس شخص کا نام مہدیہ بن حاطب تھا۔ حالانکہ الفاظ قرآن مجید میں جمع کے صیغے صرف ہوئے ہیں۔ اس نظیر کو سامنے رکھتے تو آیہ ولایت میں یہ سوال پیدا نہیں ہوگا کہ الفاظ قرآن مجید میں جمع کے ہیں: الَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ زَكَاةُونَ۔ پھر کیوں کہا جاتا ہے کہ یہ آیت خاص حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ وَأَنَّ اللَّهَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ﴿٤٥﴾

”کیا انہیں نہیں معلوم کہ اللہ جانتا ہے ان کی خفیہ باتیں اور ان کی سرگوشیاں اور یہ کہ اللہ غیب کی باتوں کا بہت بڑا جاننے والا ہے۔“

الَّذِينَ يَلْمِزُونَ الْمُطَّوِّعِينَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فِي الصَّدَقَاتِ وَالَّذِينَ لَا يَجِدُونَ

إِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُونَ مِنْهُمْ ۖ سَخِرَ اللَّهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٤٦﴾

”وہ لوگ جو نکتہ چینی کرتے ہیں خیرات کے بارے میں ایسے مومنین پر جو اپنی خوشی سے خیرات کرتے ہیں [۲] اور جو اپنی محنت مزدوری کے سوا اور کچھ رکھتے ہی نہیں [۳] تو ان کا وہ مذاق اڑاتے ہیں۔ اللہ خود ان کا مذاق اڑائے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔“

ایک غریب اگر اپنی حسب حیثیت تھوڑا سا راہ خدا میں دیتا ہے تو بہت ممکن ہے کہ وقعت اس کی پیش خدا اس بڑی رقم سے زیادہ ہو جو کوئی

[۱]. صبر عاقبتہم نفاقا ثابتا فی قلوبہم (جلالین)

[۲]. معنای المتغلبین من طاعة اللہ ما لیس بواجب. (تبیان)

[۳]. یعنی، مزدوری چینی پیدا ہی کنند و صدقہ ہی دھند. (فتح الرحمن)

امیر دیتا ہے مگر دنیا والے رقم کی کمی پر نظر کرتے ہوئے اس غریب کی پیش کش کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور بسا اوقات اس پر طعن و تشنیع کرتے اور تمسخر کرتے ہیں جس پر قرآن نے اتنے سخت الفاظ میں تنبیہ کی ہے۔

اِسْتَعْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ
اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الْفٰسِقِيْنَ ﴿٨٥﴾

”آپ ان کے لئے دعائے مغفرت کیجئے یا ان کے لئے دعائے مغفرت نہ کیجئے۔ اگر آپ ستر مرتبہ بھی [۱] ان کے لئے دعائے مغفرت کیجئے تو اللہ انہیں ہرگز نہیں بخشے گا۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے پیغمبر کے ساتھ کفر اختیار کیا ہے اور اللہ ایسے فاسق لوگوں کو منزل مقصود تک نہیں پہنچایا کرتا۔“

کفر کی بنیاد پر یہ بتانا کہ ”آپ استغفار کیجئے ان کے لئے یا نہ کیجئے، یکساں ہے، اس کا ثبوت ہے کہ دوسرے گنہگاروں کے لئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا استغفار سود مند ہوتا ہے۔ جیسا کہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ”یہاں سے فرق نکلتا ہے بے اعتقاد کا اور گنہگار کا۔ گناہ ایسا کون سا ہے کہ پیغمبر کی بخشائی سے نہ بخشا جائے اور بے اعتقاد کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ستر مرتبہ استغفار فائدہ نہ کرے۔ اب جو بے اعتقاد لوگ بھروسہ کریں پیغمبر کی سفارش پر کس دلیل سے مثلاً آدمی سے بدی ہو یا نماز و روزہ نہ ہو اور وہ شرمندہ ہے اور نادم ہے تو وہ گنہگار ہے اور جو کوئی بد کام کو عیب نہ جانے اور فرض خدا کو کرنا، نہ کرنا برابری سمجھے اور کرنے والوں کو طعن کرے، وہ بے اعتقاد ہے“ (موضح القرآن)

فَرِحَ الْمُخَلَّفُونَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلَافَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْا اَنْ يُجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ
وَانْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا اَلَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ
لَوْ كَانُوْا اَيْفَقَهُوْنَ ﴿٨٦﴾

”جو پیچھے چھوڑ دیئے گئے، وہ پیغمبر خدا کے پیچھے گھروں میں بیٹھے رہنے پر خوش ہوئے اور انہوں نے ناپسند کیا اسے کہ وہ اپنے مال اور جان کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور کہا کہ گرمی میں سفر نہ کرو، کہہ دیجئے کہ دوزخ کی آگ زیادہ گرم ہے، کاش وہ سمجھ سے کام لیں۔“

”خِلَافَ رَسُوْلِ اللّٰهِ“ کے معنی جو ہم نے کئے ”پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے“ یہ ترجمہ ایک تفسیر کے مطابق ہے [۲] لیکن دوسری تفسیر کی بنا پر اس کا ترجمہ یوں ہوگا کہ ”جو پیچھے چھوڑ دیئے گئے، وہ پیغمبر خدا کی مخالفت میں بیٹھے رہنے پر خوش ہیں۔“ [۳]

[۱] المراد به المبالغة لا العدد الخصوص (تبیان)

[۲] ای بعد رسول اللہ (جلالین) پیچھے رسول اللہ کے (شاہ فنج الدین)

[۳] قال ابو عبیدة بعد رسول الله... وقال غيره معناه المصدر من قولك خالف خلافا (تبیان)

فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا ۗ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٧٧﴾

”تو انہیں ہنسنا کم چاہیے اور انہیں رونا زیادہ چاہیے، سزا میں اس کی جو وہ کرتے رہے ہیں۔“

یعنی دنیا میں ان کی خوشی بے بنیاد ہے۔ اگر یہ انجام سے واقف ہوں کہ آخرت میں ان کے لئے کیا ہونے والا ہے تو ان کی ہنسی سب ختم ہو جائے گی۔ بعض وقت صحیح باتوں کیلئے دلیل غلط پیش کی جاتی ہے۔ اس کا بہت بڑا نمونہ یہ ہے کہ جو بہت چلا ہوا ہے کہ عزائے امام حسینؑ میں گریہ کے ثبوت میں اس آیت سے استدلال کیا جاتا ہے حالانکہ یہ آیت منافقین و کفار کے بارے میں ہے اور جو کہا جا رہا ہے وہ بد اعمالی کی سزا کے طور پر ہے۔ اس کا اہل ایمان سے نعوذ باللہ ربط ہی کیا ہو سکتا ہے؟ ایک مفہوم آیت کا یہ کہا گیا ہے کہ ان کی ہنسی کا زمانہ بہت کم ہے یعنی اس دنیا کی مختصر عمر اور انہیں رونا بہت پڑے گا سزائے اخروی سے جس کی مدت بے حد طولانی ہے۔^[۱] اس کے بعد اور بھی اس کا تعلق کل استدلال سے ختم ہو جاتا ہے۔

فَإِنْ رَجَعَكَ اللَّهُ إِلَى طَائِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَأْذِنُوكَ لِلْخُرُوجِ فَقُلْ لَّنْ نَّخْرُجُوا مَعِيَ أَبَدًا وَلَئِن تَقَاتِلُوا مَعِيَ عَدُوًّا ۗ إِنَّكُمْ رَضِيتُمْ بِالْقُعُودِ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوا مَعَ الْخُلَفَاءِ ﴿٧٨﴾

”اب اگر اللہ آپ کو واپس لائے ان میں کی ایک جماعت کی طرف اور آپ سے اجازت نکلنے کی مانگیں تو کہہ دیجئے کہ تم اب میرے ساتھ کبھی نہیں نکل سکتے اور میرے ساتھ کسی دشمن کے مقابلہ میں کبھی تم جنگ نہیں کر سکتے۔ تم تو پہلی ہی مرتبہ گھر بیٹھنے پر راضی ہوئے تو اب بیٹھو پیچھے رہنے والوں کے ساتھ۔“

جنگ تبوک میں تو موسم بھی بڑا سخت تھا اور مقابلہ بھی بظاہر زبردست دشمن یعنی سلطنت روم تھا مگر اب کسی اور دفعہ جب سازگار حالات میں کوئی مہم درپیش ہوگی تو یہی لوگ جو اس وقت حیلے بہانے کر کے ساتھ جانے سے باز رہے، مال غنیمت کی توقع میں^[۲] آ کر اپنی خدمات کو پیش کریں گے تو قرآن کہتا ہے کہ اس کے بعد اب صاف انکار کر دیجئے گا کہ اس دفعہ جب تم نے جہاد سے کنارہ کشی کی تو اب کبھی تمہیں اس سعادت سے بہرہ یاب نہیں کیا جائے گا۔

وَلَا تَصَلِّ عَلَى أَحَدٍ مِّنْهُمْ مَاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَى قَبْرِهِ ۗ إِنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَاتُوا وَهُمْ فَسِقُونَ ﴿٧٩﴾

”اور کوئی ان میں سے مر جائے تو اس کی نماز جنازہ کبھی نہ پڑھیے اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہو جائیے، بلاشبہ ان لوگوں نے کفر کیا اللہ اور اس کے پیغمبر کے ساتھ اور مر گئے اس عالم میں کہ وہ بد اعمال تھے۔“

[۱]. فاضل کو ابقلیل تمتعکم فی الدنیا فانکم ستبکون کثیرا یوم القیامة (تبیان)

[۲]. برای احراز غنائم (شاہ ولی اللہ)

کھلے ہوئے منافقین کی نماز جنازہ سے ممانعت

اہل سنت کی روایت یہ ہے کہ حضرت ﷺ نے ابی بن کعب کی نماز جنازہ پڑھائی تھی جس پر بعض صحابہ نے اختلاف کیا تھا مگر حضرت ﷺ نے نہ مانا۔ اس پر یہ آیت اتری [۱] حالانکہ جہاں ایسا ہوا ہے کہ مصلحت الہی اس کی متقاضی ہوئی ہے کہ پیغمبر ﷺ کے کسی عمل پر ٹوکا جائے وہاں یہ کہا گیا ہے کہ آپ نے ایسا کیوں کیا جیسے:

عَفَا اللَّهُ عَنْكَ لِمَ أَذِنْتَ لَهُمْ . اللہ آپ کو معاف کرے، آپ نے کیوں چھٹی دی انہیں؟

مگر یہاں کوئی اس کا اشارہ نہیں بلکہ یہ مستقل طور پر ہدایت ہے کہ ان منافقین کی آپ نماز جنازہ کبھی نہ پڑھیے گا۔ یہ بھی واضح ہونا چاہیے کہ یہ حکم کچھ خاص منافقین کے لئے تھا جن کی عدول حکمی اس درجہ پر پہنچ گئی کہ ان پر احکام کفر جاری ہو گئے، ورنہ بہت سے منافقین کے لئے تو قرآن کی تصریح ہے کہ:

لَا تَعْلَمُهُمْ طَخُنُوا نَعْلَهُمْ . آپ انہیں نہیں جانتے، ہم انہیں جانتے ہیں۔ (توبہ۔ ۱۰۱)

ظاہر ہے کہ جب اسباب ظاہری سے نفاق ان کا معلوم ہی نہیں ہوا تھا تو پیغمبر ﷺ اس کے مکلف کیوں کر ہو سکتے ہیں کہ وہ ان کی نماز جنازہ نہ پڑھیں اس لئے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ نفاق کا دائرہ محدود تھا اور وہ بس یہی لوگ تھے جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ ایک ضمنی استدلال اس آیت سے اور ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ان منافقین کے لئے کہا جا رہا ہے کہ ان کی قبر پر کبھی کھڑے نہ ہو جائیے گا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مومنین کے واسطے جس طرح نماز جنازہ احکام اسلام میں داخل ہے، اسی طرح ان کے قبور پر وقتاً فوقتاً جانا بھی راجح و مستحسن ہے۔

وَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَأَوْلَادُهُمْ ۗ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا

وَتَزْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ ﴿۱۵﴾

”اور تم کو ان کے مال اور اولاد خوش آئند معلوم نہ ہوں۔ اللہ کا مطلب بس یہ ہے کہ ان کو دنیا میں انہی کے ذریعہ سے سزا دے اور ان کی جانیں نکلیں اس حال میں کہ وہ کافر ہیں۔“
اس مضمون کی آیت پہلے آچکی ہے۔

وَإِذَا أَنْزَلْتُ سُورَةً أَنْ آمِنُوا بِاللَّهِ وَجَاهِدُوا مَعَ رَسُولِهِ اسْتَأْذَنَكَ أُولُوا

الطُّولِ مِنْهُمْ وَقَالُوا ذَرْنَا نَكُنْ مَعَ الْقَاعِدِينَ ﴿۱۶﴾ رَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا مَعَ

الْحَوَافِيفِ وَطَبَعَ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ ﴿۱۷﴾

[۱]. العاصمی النبی ﷺ علیٰ نبیہ نزول (جلالین)

”اور جب بھی کوئی سورہ [۱] اترتا ہے کہ ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے پیغمبر کی معیت میں جہاد کرو تو ان میں سے قوت و طاقت رکھنے والے افراد آپ سے چھٹی مانگنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں گھر بیٹھنے والوں کے ساتھ چھوڑ دیجئے۔ ان کو پسند ہوئی یہ چیز کہ یہ گھر میں بیٹھنے والی عورتوں کے ساتھ رہیں اور ان کے دلوں پر مہر لگ گئی تو وہ سمجھیں گے نہیں۔“

ان کے کردار کے وہی پہلو ہیں جو پہلے پیش کئے جا چکے ہیں مگر انہی کو اس طرح دہرایا جا رہا ہے جیسے کوئی حاکم یا بزرگ بڑے زور زور سے کسی پر خفا ہوتا اور ڈانٹتا ہے تم ہمیشہ یہی کرتے ہو تمہاری عادت یہی ہے جب بھی میں تمہیں حکم دیتا ہوں تم ہمیشہ ایسے ہی حیلے حوالے کرتے ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان سب جملوں میں بڑے سخت تیور اور کراخت آواز بنائے تب پورا مطلب واضح ہوگا۔

لٰكِنَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهُ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ط وَاُوْلِيْكَ
لَهُمْ الْخَيْرٰتُ ز وَاُوْلِيْكَ هُمْ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸۸﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ط ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۸۹﴾

”مگر پیغمبر اور وہ مومنین جو ان کی معیت میں ہیں، انہوں نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کیا اور یہ وہ ہیں جن کے لئے بھلائیاں ہیں اور یہی وہ ہیں جو ہر طرح کی بھلائی حاصل کرنے والے ہیں۔ اللہ نے تیار رکھا ہے ان کے لئے ان بہشتوں کو جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔“

منافقین بھی باعتبار زمانہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معیت رکھتے تھے، نیز پاس رہتے بھی تھے، اٹھتے بیٹھتے بھی تھے مگر خالق نے یہاں ان کے مقابلہ میں خالص مومنین کے لئے ”مَعَهُ“ کا لفظ استعمال کیا ہے کہ وہ مومنین جو ان کی معیت میں ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ معیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عالم مشاہدہ میں ساتھ رہنے سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ خالص ایمان اور اطاعت سے تعلق رکھتی ہے۔

اس کے بعد اس آیت کے مفہوم میں کوئی گجٹک نہیں رہتی جہاں کہا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ مَعَهُ اَشِدَّاءُ عَلٰى الْكٰفِرِيْنَ رَحْمٰٓءٌ بَيْنَهُمْ

جس کی تفسیر کی منزل ہماری کتاب میں ابھی بہت دور رہے مگر یہاں کی آیت اس کے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوا اللّٰهَ
وَرَسُوْلَهُ ط سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۰﴾

”اور صحرائی عربوں میں سے معذور اشخاص آئے کہ انہیں چھٹی دے دی جائے اور جو اللہ اور اس کے پیغمبر سے جھوٹ بولے ہیں، وہ بیٹھ رہے، عنقریب پہنچے گا انہیں جنہوں نے کفر اختیار کیا ان میں سے دردناک عذاب“

”الْمُعَذِّرُونَ“ کا ترجمہ ”معذور“ ایک تفسیر کے مطابق ہے۔^[۱] لیکن دوسری تفسیر یہ ہے کہ تغذیر کے معنی تفسیر کے ہیں یعنی قصور وار اشخاص^[۲] جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جھوٹ بولے، وہ ”بیٹھے رہے“ یعنی عذرخواہی کے لئے بھی نہیں آئے۔^[۳]

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضَى وَلَا عَلَى الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ مَا يَنْفِقُونَ
 حَرْجًا إِذَا نَصَحُوا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ ۗ مَا عَلَى الْمُحْسِنِينَ مِنْ سَبِيلٍ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ
 رَحِيمٌ ﴿۹۱﴾ وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا اتَّوَكَّلْتَ لِيَتَحِمَبْهُمْ فَكُلْتُمْ لَأَجْدُمَا أحمَلَكُمْ
 عَلَيْهِ ۗ تَوَلَّوْا وَأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يَنْفِقُونَ ﴿۹۲﴾

”نہیں ہے کمزوروں پر اور بیماروں پر اور نہ ان پر جن کے پاس خرچہ نہ ہو کوئی سختی^[۴] جب کہ وہ اللہ اور رسول کے وفادار ہیں۔ نیک اعمال لوگوں پر کوئی الزام نہیں ہے^[۵] اور اللہ بخشنے والا ہے بڑا مہربان اور نہ ان پر کہ جب وہ آپ کے پاس آئیں اس غرض سے کہ آپ ان کے لئے سواری کا انتظام کر دیں، اس پر آپ ان سے کہیں کہ میرے پاس نہیں ہے کوئی چیز جو میں سواری کے لئے تمہیں دوں تو وہ واپس ہوں اس حال میں کہ آنکھیں ان کی آنسو بہا رہی ہیں اس رنج میں کہ ان کے پاس (راہ خدا میں) خرچ کے لئے پیسہ نہیں ہے۔“

کمزوروں کو جو بیماروں سے پہلے ذکر کیا گیا ہے تو اسے مراد وہ ہیں جو پیدائشی طور پر یا بڑھاپے سے ناتواں ہیں^[۶] اور بیماری ایک عارضی مجبوری ہے جو قوی بیکل آدمی کو بھی وقتی طور پر معذور بنا سکتی ہے۔

إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَستَأْذِنُونَكَ وَهُمْ أَغْنِيَاءُ ۖ رَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا مَعَ
 الْخَوَالِفِ ۗ وَطَبَعَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۹۳﴾

”الزام^[۷] تو بس ان پر ہے جو آپ سے چھٹی مانگتے ہیں باوجودیکہ وہ دولت مند ہیں، وہ راضی ہوئے اس پر کہ گھر بیٹھے والیوں کے ساتھ رہیں اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے تو وہ کچھ جانتے ہی نہیں۔“

[۱] ای المعتدرون بمعنى المعذورين (جلالین) اهل عذر از صحران شبینان (شاه ولی اللہ)

[۲] المعذر المقصر (تبیان)

[۳] من المجيء للاعتذار (جلالین)

[۴] اثم في التخلف عنه (جلالین)

[۵] هیچ راہ عتاب (شاه ولی اللہ)

[۶] هو الذی قوته ناقصة (تبیان)

[۷] الطريق بالعقاب والحرج (تبیان)

يَعْتَدِ رُؤْنَ الْيَوْمِ إِذَا رَجَعْتُمْ إِلَيْهِمْ ط قُلْ لَا تَعْتَدِ رُؤْنَ الْيَوْمِ لَكُمْ قَدْ
نَبَأْنَا اللَّهُ مِنْ آخِبَارِكُمْ ط وَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَىٰ عِلْمِ
الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٩٣﴾

’وہ عذر خود ہی کریں گے تم سے جب تم لوگ ان کی طرف واپس آؤ گے، کہیے کہ تم عذر خواہی نہ کرو، ہم کبھی تمہارا یقین نہیں مانیں گے، ہمیں اللہ نے تمہارے حالات کی اطلاع دے دی ہے [۱] اور اللہ اور اس کا پیغمبر تمہارے اعمال کو دیکھے گا [۲] پھر تم پلٹا کر لے جائے جاؤ گے۔ اس کی طرف جو حاضر و غائب کا جاننے والا ہے، وہ تمہیں بتلائے گا کہ تم کیا کرتے تھے‘

سَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ إِذَا انْقَلَبْتُمْ إِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوا عَنْهُمْ ط فَأَعْرِضُوا
عَنْهُمْ ط إِنَّهُمْ رِجْسٌ نَوْمًا وَبِهِمْ جَهَنَّمُ ۗ جَزَاءٌ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٩٤﴾
يَحْلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۗ فَإِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَرْضَىٰ عَنِ
الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ﴿٩٥﴾

’وہ اللہ کی قسمیں تم سے کھائیں گے جب تم ان کی طرف پلٹو گے تاکہ تم ان سے بے اعتنائی اختیار کر دو اچھا تم بے اعتنائی ان سے اختیار کر لو، وہ سراپا خباثت ہیں اور ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے سزا میں ان کی جو وہ کرتے تھے وہ تم سے قسمیں کھاتے ہیں کہ تم لوگ ان سے خوش ہو جاؤ تو تم ان سے خوش ہو بھی جاؤ تو بلاشبہ اللہ بد اعمال لوگوں سے خوش ہونے والا نہیں ہے۔‘

دونوں آیات کو ملا کر مطلب نکالا جائے تو یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے بار بار قسمیں کھائیں کے دو مقصد ہیں ایک تو یہ کہ تم لوگ ان سے آئندہ کوئی شکایت نہ کرو اور بے اعتنائی اختیار کر لو، اور دوسرے یہ کہ تم ان سے خوش بھی ہو جاؤ تو جہاں تک پہلی بات ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، تم ان سے بے شک کوئی تعرض نہ کرو، اس لئے کہ خالق کی مصلحت ہی یہی ہے کہ جو لوگ اسلام کے دامن میں پناہ لیں، ان کے ظاہری اسلام کو قبول کیا جائے اور انہیں اس دنیا میں ان کی منافقت کی سزا نہ دی جائے اور شکوہ شکایت سے کوئی فائدہ نہیں مگر دوسری بات یعنی تم ان سے خوش بھی ہو جاؤ، یہ بالکل غلط تصور ہے۔ [۳]

ایک تو مسلمانوں پر جب ان کی منافقت کا حال کھل گیا تو یہ ان سے دل سے خوش نہیں ہو سکتے۔ پھر اگر یہ خوش ہو بھی جائیں تو اس سے کیا

[۱] ای اخبارنا بحوالہ الکہ (جلالین)

[۲] یعنی درد نیا (شاہ ولی اللہ)

[۳] یعنی جس شخص کا حال معلوم ہو کہ منافق ہے، اس کی طرف سے تغافل روا ہے لیکن دوستی اور محبت اور لگاؤ کو نہیں (موضح القرآن)

ہوتا ہے، خالق جو عالم الضمائر والاسرار ہے وہ تو ان سے کبھی خوش ہونے والا نہیں اور ظاہر ہے کہ نجات کا انحصار اس کی خوشی پر ہے۔ دنیا والے خوش ہو بھی جائیں تو کیا ہے۔ [۱]

الْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَنِفَاقًا وَّاجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰی

رَسُوْلِهِ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۹۷﴾

”صحرائی عرب کفر اور نفاق میں بہت سخت ہوتے ہیں اور زیادہ امکان ہوتا ہے اس کا کہ وہ نہ واقف ہوں اور ان احکام کے حدود و قواعد سے جو اللہ نے اپنے پیغمبر پر اتارے ہیں اور اللہ بڑا جاننے والا ہے صحیح صحیح کام کرنے والا۔“

صحرائی عربوں کی مذمت

جہاں تک سمجھ میں آتا ہے یہ اس وقت کے زیادہ تر صحرائی عربوں کی عام کیفیت اور مرکز علم سے دوری کی وجہ سے طبعی اقتضاء کا اظہار ہے نہ کہ کسی اصول کا اعلان ہے اس میں نہ عمومیت ہے اور نہ دوام و استمرار ہو سکتا ہے کہ اس وقت بھی ان میں ناقابل لحاظ اقلیت میں کچھ ایسے اشخاص ہوں جو خاص و مخلص مؤمن اور احکام شرعیہ سے واقف ہوں اور ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد ان میں ایسے افراد پیدا ہو جائیں جو ایمان علم شریعت کے حامل ہوں۔ خود اس آیت کے بعد ہی قرآن اعراب میں دو قسم کے لوگوں کا پتہ دے رہا ہے جو ابھی آپ کے سامنے آئے گا۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَيَتَرَبَّصُّ بِكُمْ الدَّوَابِرَ ط عَلَيْهِمْ

دَاۤیْرَةُ السُّوۤءِ ط وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۹۸﴾ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرْبٰی عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ط اَلَا اِنَّهَا قُرْبٰی

لَهُمْ ط سَيَدْخِلُھُمْ اللّٰهُ فِی رَحْمَتِہٖ ط اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۹﴾

”اور صحرائی عربوں میں سے کچھ ایسے ہیں کہ خیر و خیرات میں جو صرف کرتے ہیں اسے ایک بڑا گھانا سمجھتے ہیں اور تم لوگوں کے لئے زمانہ کی گردشوں کا راستہ دیکھتے ہیں انہی کو برے دن دیکھنا پڑیں [۲] اور اللہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا، اور ان صحرائی عربوں میں کچھ ایسے ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ اور روز آخرت پر اور جو خیرات کرتے ہیں اسے بارگاہ الہی میں تقرب اور پیغمبر کی دعائے خیر کا ذریعہ سمجھتے ہیں، بلاشبہ وہ ان کے لئے تقرب کا سبب ہوگا، عنقریب اللہ انہیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا، بلاشبہ اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔“

[۱]. لا ینفعہم رضا کم مع سخط اللہ علیہم (تبیان)

[۲]. یدور العذاب الہلاک علیکم لا علیکم (جلالین)

وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ ۗ
 رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ
 فِيهَا أَبَدًا ۗ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿١٥﴾

’اور شروع شروع ہی میں پہلے اسلام لانے والے مہاجر اور انصار اور جو حسن عمل کے ساتھ ان کی پیروی کریں، اللہ ان سے خوش ہے اور وہ اللہ سے خوش ہیں اور اس نے مہیار کھے ہیں ان کے لئے بہشت جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ ہے بہت بڑی کامیابی‘۔

اسلام میں سبقت رکھنے والوں کی تعریف

سبقت اسلام کے بہت سے درجے ہیں، سب سے سابق تو کوئی ایک فرد ہی ہوگا، اور وہ تاریخ اسلام میں حضرت علی ابن ابی طالبؓ کی ذات گرامی ہے اس کے بعد اضافی حیثیت سے دیکھا جائے تو مثلاً پہلے ہفتہ میں دعوت اسلام کے ایمان لانے والے تمام مسلمانوں میں سب سے زیادہ سابق الاسلام ہیں پھر مثلاً پہلے مہینہ میں ایمان قبول کرنے والے پھر پہلے سال میں۔ اسی طرح ہجرت کے پہلے اسلام لانے والے بہ نسبت ان کے جو بعد میں اسلام لائے ہیں یہاں چونکہ کہ السَّابِقُونَ الْأَوْلُونَ میں مہاجرین کے ساتھ انصار کا بھی نام ہے اور ظاہر ہے کہ انصار آغاز دعوت اسلامی میں وجود نہ رکھتے تھے اس لئے یہ سبقت کچھ زیادہ وسیع معنی میں ہے اور یہ سبقت اس حد تک ہو سکتی ہے کہ ہجرت کے قبل اسلام لانے والے السَّابِقُونَ الْأَوْلُونَ مانے جائیں اس لئے کہ انصار یعنی باشندگان مدینہ بہت سے وہ تھے جو غائبانہ طور پر یا بیعت عقبہ کے موقع پر رسولؐ کی خدمت میں جا کر مسلمان ہو گئے تھے یعنی علماء اس سبقت کو ہجرت کے بعد بھی جنگ بدر کے اعتبار سے لیتے ہیں چنانچہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

’جنگ بدر تک جو مسلمان ہوئے ہیں وہ آگے بڑھ جانے والے ہیں اور باقی ان کے تابع ہیں‘۔ (موضح القرآن)

بعض اس کو بیت الرضوان سے وابستہ قرار دیتے ہیں جو حدیبیہ میں ہوئی۔^[1]

اور بعض اس کے دائرہ کو تمام صحابہ پر حاوی قرار دے لیتے ہیں۔^[2]

بہر صورت اللہ کی یہ خوشنودی ان کی اس صفت سے متعلق ہے جو سبقت الی الاسلام ہے اور اس کا صلہ بجائے خود وہ ہے جو آخر میں بتایا گیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب ان کی مستقبل کی زندگی کے متعلق بھی کوئی ضمانت ہوگئی ہے کہ وہ اسی معیار پر قائم رہے گی اور یہ ظاہر ہے کہ آخرت کا انجام جو بھی ہو، وہ مجموعی زندگی اور بالخصوص آخری حالت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے نہ کہ ابتدائی یا عبوری دور کے کسی عمل سے۔

وَمِنْ حَوْلِكُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ مُنْفِقُونَ ۖ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ مَرَدُوا عَلَىٰ

[1]. قال الشعبي نزلت في من يبيع ببيعة الرضوان (تبیان)

[2]. اوجیب الصحابة (جلالین)

النِّفَاقِ تَلَّا تَعْلَمُهُمْ ط نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ط سَنَعَذِّبُهُمْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّونَ إِلَى

عَذَابٍ عَظِيمٍ ﴿١٠١﴾

”اور تمہارے ارد گرد جو صحرائی عرب ہیں ان میں سے کچھ منافق ہیں اور اس شہر (مدینہ) کے باشندوں میں سے بھی، وہ نفاق پر سرکشی کے ساتھ قائم ہیں ﴿١٠١﴾ آپ انہیں نہیں جانتے، ہم انہیں دو دفعہ سزا دیں گے، پھر وہ بڑے عذاب کی طرف پلٹائے جائیں گے۔“

”دو دفعہ سزا دیں گے“ اس کے معنی دو قسم کے سزا کے بھی ہو سکتے ہیں ﴿١٠٢﴾ اور یہ بھی کہ بار بار انہیں سزا ملے گی ﴿١٠٣﴾ اور دو کا عدد صرف تکرار کے اظہار کے لئے ہے۔ بہر حال یہ سزا جسے دو دفعہ یا بار بار کہا گیا ہے، قیامت کے پہلے کی ہے ﴿١٠٤﴾ کیونکہ قیامت کی سزا کا عذاب عظیم کہہ کے، بعد میں ذکر کیا گیا ہے۔

وَأَخْرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا ط عَسَى اللَّهُ أَنْ

يَتُوبَ عَلَيْهِمْ ط إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٠٢﴾ خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ

وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ط إِنَّ صَلَوَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ ط وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٠٣﴾

”اور دوسرے کچھ ہیں جنہیں اقرار ہے اپنے گناہوں کا، انہوں نے نیک اور بد اعمال ملے جلے کئے ہیں بہت ممکن ہے کہ اللہ ان پر رحمت کی نظر ڈالے، یقیناً اللہ بخشنے والا ہے بڑا مہربان، ان کے اموال کی زکوٰۃ آپ لے لیجئے جس کے ذریعہ سے آپ انہیں پاک کر دیں اور انہیں برکت دیں اور ان کے لئے دعا خیر کیجئے۔ یقیناً آپ کی دعائے خیر ان کے لئے باعث سکون ہوگی اور اللہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا۔“

سابق میں منافقوں میں سے بعض کا تذکرہ آپکا ہے کہ وہ زکوٰۃ، اب دیں بھی تو ان سے نہ لی جائے۔ یہ اسی کے بالمقابل حکم ہے کہ جنہوں نے صدق دل سے توبہ کی ہے وہ زکوٰۃ لائیں تو ان سے قبول کیجئے۔

أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَأْخُذُ الصَّدَقَاتِ وَأَنَّ اللَّهَ

هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١٠٤﴾

”کیا انہیں نہیں معلوم کہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور زکوٰۃ لیتا ہے اور یقیناً اللہ توبہ قبول کرنے

[١]. الحوافیہ واستمروا (جلالین)

[٢]. یعنی درمیان مسلمانان ذلیل شو نودھرا موال و اولاد آفات بینند (فتح الرحمن)

[٣]. تکلیف پر تکلیف (موضح القرآن)

[٤]. فعلم ان الموتین معاقبل ان یردوا الی عذاب یوم القیامة (تبیان)

والا ہے، بڑا مہربان۔

انداز بتاتا ہے کہ یہ اس غلط فہمی کا دفعیہ ہے کہ تو بہ قبول کرنا، نہ کرنا اور زکوٰۃ کو لینا، نہ لینا ذاتاً خود رسولؐ کا کام ہے اس طرح لوگ سمجھتے تھے کہ یہ تفریق آپؐ کی طرف سے بلا وجہ ہے کہ آپؐ ایک سے زکوٰۃ اب وہ لاتا بھی ہے تو نہیں لیتے اور باقی دوسرے لوگوں سے لیتے ہیں خداوند عالم نے اس تصور کو غلط قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ رسولؐ کا خود فعل نہیں ہے بلکہ یہ خدا کا عمل ہے جو رسولؐ کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے اس لئے یہ تفریق اسی کی جانب سے ہے جسے لوگ رسولؐ کی طرف سے سمجھتے ہیں۔

وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ ۖ وَسَتُرَدُّونَ إِلَىٰ عِلْمِ

الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۱۰۵﴾

’اور کہیے کہ تم عمل کرتے رہو، اللہ دیکھے گا تمہارے عمل کو اور اس کا پیغمبر اور ایمان والے اور بہت جلد تم پلٹائے جاؤ گے غائب و حاضر ہر بات کے جاننے والے کی طرف تو وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کیا اعمال کرتے تھے۔‘

اس آیت کا مضمون پہلے آچکا ہے مگر وہاں صرف اللہ اور پیغمبرؐ کا ذکر تھا اور یہاں ان کے ساتھ اہل ایمان کا بھی تذکرہ ہے اب چونکہ مخاطب بھی کھلے ہوئے کا فر تو نہیں ہیں بلکہ آمتا کہنے والے بہ اقرار خود مومنین ہی ہیں اس لئے ان اہل ایمان سے مراد جنہیں کہا گیا ہے کہ اللہ اور رسولؐ کے ساتھ ساتھ یہ تمہارے اعمال دیکھ رہے ہیں وہ خالص و مخلص افراد ہی ہو سکتے ہیں جن کے یہاں نفاق و عصیان کا شائبہ تک نہیں اور اس کے مصداق اکل صرف معصومین ہی ہو سکتے ہیں جو ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر میں وارد ہے۔^[۱]

وَأَخْرُونَ مُرْجُونَ لِأَمْرِ اللَّهِ إِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَإِمَّا يَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ

حَكِيمٌ ﴿۱۰۶﴾

’اور وہ دوسرے ایسے ہیں جن کا معاملہ اللہ کے حکم پر موقوف ہے یا انہیں سزا دے گا اور یا ان کی توبہ قبول کر لے گا اور اللہ بڑا جاننے والا ہے صحیح کام کرنے والا۔‘

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَكُفْرًا وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ وَإِرْصَادًا

لِمَنْ حَارَبَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ مِنْ قَبْلُ ۖ وَلَيَحْلِفْنَ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنَىٰ ۗ وَاللَّهُ

يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿۱۰۷﴾ لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا ۗ لِمَسْجِدٍ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ

أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُومَ فِيهِ ۗ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَّطَهَّرُوا ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ

الْمُطَهَّرِينَ ﴿۱۰۸﴾

[۱] المؤمنون ههنا الأئمة الطاهرون صلوة الله عليهم (علی بن ابراہیم)

”اور وہ بھی ہیں [۱] جنہوں نے مسجد بنائی ضرر رسانی، کفر، مومنین میں تفرقہ پیدا کرنے اور ان لوگوں کو موقع دینے کے لئے جنہوں نے اس کے پہلے اللہ اور اس کے پیغمبر سے جنگ کی ہے اور ضرور وہ قسمیں کھائیں گے کہ ہمارا کوئی مقصد نہیں ہے سوائے بھلائی کے اور اللہ اس کا گواہ ہے کہ وہ جھوٹے ہیں آپ اس میں کبھی کھڑے نہوجیے، بے شک وہ مسجد جس کی شروع دن سے ہی بنیاد پر ہیز گاری پر رکھی گئی ہے اس کی زیادہ مستحق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں، اس میں ایسے اشخاص ہیں جن کی خواہش ہے کہ وہ پاک رہیں اور اللہ پاک رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔“

مسجد ضرار کا ذکر

قرآن مجید جس حد تک بیان کرتا ہے اس میں واقعات بطور اجمال ہی معلوم ہوتے ہیں، یہ تشنگی باقی رہتی ہے کہ اس کا پورا واقعہ کیا ہے اور پیاس بغیر احادیث و روایات کے مطالعہ کے بچھ ہی نہیں سکتی چنانچہ روایات سے منفرق طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ انصار کے قبیلہ بنی عوف کے کچھ لوگ تھے۔

اس مسجد کی تعمیر میں جو اغراض مضمحل تھے ان میں قرآن مجید نے تفریق بین المومنین کو بھی درج کیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی کار خیر بھی اگر پارٹی بندی کی بنا پر ہوا ہے [۲] تو وہ خالق کے غضب کا مستوجب ہو جاتا ہے۔ اس کے بالمقابل جس مسجد کی تعریف کی گئی ہے وہ مسجد قبا ہے یا مسجد مدینہ جسے ”مسجد نبوی“ کہا جاتا ہے۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جن کی خواہش ہے کہ وہ پاک رہیں اس پاکی سے مراد پرہیز گاری ہو سکتی ہے مگر ہمارے آئمہ معصومین کی تفسیر جو ظاہر لفظ کے بالکل مطابق ہے یہی ہے کہ اس سے طہارت پسندی مراد ہے [۳] جو بحمد اللہ ہو البیان اہل بیت علیہم السلام کی خاص طور پر امتیازی علامت ہے۔

أَمَّنْ أَسَسَ بُنْيَانَهُ عَلَى تَقْوَىٰ مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ أَمَّ مَنْ أَسَسَ بُنْيَانَهُ
عَلَىٰ شَفَا جُرْفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهِ فِي نَارٍ جَهَنَّمَ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الظَّالِمِينَ ﴿۱۰۹﴾

”کیا وہ جو اپنی عمارت کی بنیاد رکھے خوف الہی اور اس کی خوشنودی پر وہ بہتر ہے یا جو اپنی بنیاد رکھے ایک گڑھے کے کنارے جو دھنس جانے والا ہو تو وہ اس کے ساتھ دھنس جائے آتش جہنم میں اور اللہ ظالم لوگوں کو منزل مقصود تک نہیں پہنچایا کرتا۔“

[۱] تقدیرہ: ومنہم الذین (تبیان)

[۲] انما یکون تفریقاً بین المومنین بان یتخزروا فخر ب یصلی فیہ وخر ب یصلی فی غیرہ (تبیان)

[۳] قیل یتطہرون بالماء من الغایط و البول و هو المرؤی عن ابی جعفر و ابی عبد اللہ (تبیان)

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ إِلَّا أَنْ تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ ط وَاللَّهُ
عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿١١﴾

”یہ ان کی عمارت جو انہوں نے تعمیر کی ہے ہمیشہ ان کے دل میں خلجان پیدا کئے رہے گی الا یہ کہ ان کے دل ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور اللہ بڑا جاننے والا ہے صحیح کام کرنے والا“۔

”خلجان“ یعنی حقانیت اسلام میں ان کے شکوک و شبہات بڑھتے ہی رہیں گے [۱] کیونکہ وہاں جو بھی جمع ہوں گے وہ سب منافق قسم کے لوگ ہوں گے لہذا آپس کی باتوں میں عمر بھر اصلاح کے بجائے اور ذہنیت میں خرابی پیدا ہوتی رہے گی اور یہی ”عمر بھر“ کا مفہوم ان الفاظ سے ادا کیا گیا ہے کہ ”الا یہ کہ ان کے دل ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں“ [۲]

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةُ ط
يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ وَعَدًّا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَةِ
وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ ط وَمَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي
بَايَعْتُمْ بِهِ ط وَذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿١٢﴾

”بلاشبہ اللہ نے خرید لیے ہیں ایمان لانے والوں سے ان کے جان اور مال اس قیمت پر کہ ان کے لئے جنت ہے وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں تو مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں۔ یہ وعدہ ہے اس کے ذمہ سچا تورات اور انجیل اور قرآن میں اور اللہ سے زیادہ اپنے وعدہ کا پورا کرنے والا کون ہے تو مبارک ہو تمہیں تمہارا یہ بیچنا جس کی معاملت تم نے اس سے کی ہے یہی تو بہت بڑی کامیابی ہے“۔

یہ مومنین کو کوئی حکم نہیں ہے کہ تمہیں بیچنا چاہیے اور اس کے بعد اللہ تم سے خرید لے گا کہ یہ اس صورت میں ان کے ارادہ و اختیار سے وابستہ ہوتا کہ فروخت کریں یا نہ کریں۔ بلکہ یہ اس حقیقت کا بیان ہے کہ خود ایمان اختیار کرنا یہ اپنے جان و مال کو اللہ کے ہاتھ فروخت کرنے کا معاہدہ ہے اور اس ایمان کے ساتھ ہی اللہ اس جان و مال کا خود ہمارے معاہدہ کی بناء پر مالک ہو جاتا ہے جس کے بعد کسی سچے مسلمان کو اپنے معاملہ میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔ نہ انفرادی طور پر، نہ اجتماعی طور پر، اس طرح نہ شوری کی کوئی وقعت رہتی ہے نہ جماع کی۔

التَّائِبُونَ الْعَبْدُونَ الْحِمْدُونَ السَّائِحُونَ الرُّكُعُونَ السُّجِدُونَ الْأَمْرُونَ
بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَفِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ ط وَبَشِيرٌ

[۱]۔ ہمیشہ باشد سبب شك..... دردل ایشان (شاه ولی اللہ)

[۲]۔ الا ان تقطع قلوبهم بالموت والبلی (تبیان)

الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٣٢﴾

”توبہ کرنے والے، عبادت گزار، حمد الہی بجالانے والے، روزوں میں عمر بسر کرنے والے رکوع کرنے والے، سجدے کرنے والے، اچھائیوں کی ہدایت کرنے والے اور برائیوں سے روکنے والے، حدود خداوندی کی حفاظت کرنے والے، اور خوش خبری دوایسے ایمان لانے والوں کو“۔

السَّامِخُونَ کا جو ہم نے ترجمہ کیا ہے ”روزوں میں عمر بسر کرنے والے“ یہ بڑے معتبر مفسرین کے قول کے مطابق ہے جس کی تائید میں حدیث رسول بھی موجود ہے اور لغت کی مدد سے اس کا ترجمہ کیا جائے تو معنی ہوں گے ”رواں دواں پھرنے والے“^[۱] اس کے ساتھ قید لگانے کی ضرورت ہے کہ ”خدمت دین میں“ یا ”راہ خدا میں“^[۲] کیونکہ ظاہر ہے کہ بجائے خود رواں دواں پھرنا کوئی صفت مدح نہیں ہے۔ اس کے قبل کی آیت جس میں جہاد میں مرنے مارنے کی دعوت تھی اور یہ آیت مقام تنزیل میں ایک ساتھ ہوں تو سمجھ میں آتا ہے کہ قرآنی معیار پر جہاد راہ خدا وہ ہے جس کے ذمہ دار افراد ان اوصاف سے متصف ہوں جن کا کامل مرقع سوا معصومین کے کوئی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ایک حدیث میں معصوم نے اسی آیت سے اس پر استشہاد فرمایا ہے کہ عام مسلمان جسے جہاد سمجھ رہے ہیں وہ سیاسی لڑائیاں ہیں۔ قرآنی معیار کے مطابق جہاد نہیں ہیں^[۳]

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أَوْلَىٰ قُرْبَىٰ

مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿١٣٣﴾

”پیغمبر کو اور انہیں جو ایمان لائے ہیں، یہ حق نہیں کہ وہ دعائے مغفرت کریں مشرکین کے لئے، چاہے وہ عزیز ہوں بعد اس کے کہ ان پر ثابت ہو گیا وہ دوزخ والے ہیں“۔

مشرکین کے لئے استغفار کی ممانعت

قرآن مجید میں اکثر دوسروں کے انتہاء کے لئے اپنے رسول کو مخاطب کر کے ایک بات کہی گئی ہے اور یہاں تو صراحتاً پیغمبر کے ساتھ ایمان لانے والوں کا ذکر ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس آیت کا تعلق کچھ اس وقت کے مسلمانوں ہی کے ساتھ ان کو متنبہ کرنے کے لئے ہے جس میں صرف اصول کی وحدت نمایاں کرنے کے لئے پیغمبر کا نام لے لیا گیا ہے جیسے:

[۱] روی عن النبی ﷺ انه قال سیاحۃ امتی الصوم وهو قول ابن مسعود وابن عباس وسعید بن جبیر والحسن ومجاہد (تبیان) السَّامِخُونَ الصَّامُونَ (جلالین)

[۲] سفر حر راہ خدا کنندگان (شاہ ولی اللہ) پھرنے والے ہیں (شاہ رفیع الدین)

[۳] حدیثی ابن عن بعض رجالہ قال لقی الزہری علی بن الحسین رضی اللہ عنہما فی طریق الحج فقال یا علی بن الحسین تریکت الجہاد و صعوبتہ واقبلت للحج... واللہ بقول: ان اللہ اشتري من المؤمنین الخ قال له علی بن الحسین اتم الایة فقال: الثائبون العابدون السَّامِخُونَ... اذار اینا هولاء الذین ہذا صفتہم فی الجہاد معہم افضل من الحج (علی بن ابراہیم)

لئن اشرکت لیحیطن عملک

اگر آپ بھی شرک کریں تو آپ کے سب اعمال اکارت ہو جائیں۔

وہی صورت یہاں بھی ہے مگر جمہور اہلسنت نے جنہیں جناب ابوطالبؓ کے ایمان پر حرف لانے کے ساتھ خاص دلچسپی ہے اس آیت کا تعلق ابوطالبؓ ہی سے قرار دیا ہے کہ ان کے لئے رسولؐ نے استغفار کیا، اس پر آیت نازل ہوئی ہم اس سے متفق نہیں ہیں۔

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَا اِيَّاهُ ۗ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ

اَنَّهُ عَدُوٌّ لِلّٰهِ تَبَيَّرَ اَمْنُهٗ ۗ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَا وَاَهًا حَلِيْمًا ﴿۸۳﴾

”اور ابراہیم کا دعائے مغفرت کرنا اپنے باپ کے لئے نہ تھا مگر ایک وعدہ کی رو سے جو انہوں نے کیا تھا اس سے مگر جب ثابت ہو گیا ان پر کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو انہوں نے اس سے اظہار برأت کر دیا، بلاشبہ ابراہیم ختم خوار انسان تھے خصل سے کام لینے والے۔“

جناب ابراہیمؑ کے استغفار کا پس منظر

جس وعدہ کا اس آیت میں حوالہ ہے اس کا بیان بھی دوسری جگہ قرآن مجید میں موجود ہے حضرت ابراہیمؑ کی اس گفتگو میں جو انہوں نے اپنے چچا کسی دوسری طرح کے عزیز آذر سے جسے وہ باپ کہہ کر پکارتے تھے کی تھی جس میں ہدایت حق کو سن کر اس کے انکار پر انہوں نے کہا تھا: تَسُوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي (یعنی تمہیں اپنے فعل کا اختیار ہے مانو، یا نہ مانو، بہر حال میں تمہارے لئے اپنے پروردگار سے دعائے مغفرت کروں گا۔

یہاں پر تو الفاظ قرآن سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس استغفار کے وعدے سے قبل اس نے کچھ رجحان ایمان لانے کا ظاہر کیا ہو مگر ممکن ہے اس میں موجود ترتیب قرآن کا تصور ہو۔ زیر نظر آیت کے جو الفاظ ہیں، ان سے جناب شیخ طوسی علیہ الرحمہ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ آذر نے جناب ابراہیمؑ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر میں ایمان اختیار کر لوں تو تمہیں میرے لئے دعائے مغفرت کرنی لازم ہوگی۔ حضرت ابراہیمؑ سے یہ وعدہ کر لیا اور اس نے اظہار ایمان کر دیا چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے حسب وعدہ اس کے لئے خالق سے مغفرت طلب کی مگر بعد میں ثابت ہوا کہ اس کا اظہار ایمان صرف نمائشی تھا تو حضرت ابراہیمؑ نے اس سے برأت کر لی۔

یہ نتیجہ انہوں نے قرآن کے ان الفاظ سے نکالا ہے کہ ”جب ثابت ہو گیا ان پر کہ وہ اللہ کا دشمن ہے“ کیونکہ اگر اس نے درمیان میں اظہار ایمان نہ کیا ہوتا تو ابتدائے عمر سے حضرت ابراہیمؑ کو اس کا مشرک ہونا معلوم تھا اس صورت میں ”ثابت ہو گیا“ کے معنی ہی کیا ہوں گے؟ اس کے علاوہ انہوں نے دعائے مغفرت میں یہ الفاظ صرف کئے ہیں کہ:

واغفر لابی انه کان من الضّالّین

میرے باپ کو بخش دے! وہ گمراہوں میں سے تھا (شعراء ۸۶)

اس سے ظاہر ہے کہ جس وقت دعائے مغفرت کی ہے اس وقت کی صورت ظاہر یہی ہے کہ وہ اب راہ راست پر آ گیا ہے اور گمراہوں

میں سے نہیں ہے۔

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ إِذْ هَدَاهُمْ حَتَّى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَا يَتَّقُونَ ۗ إِنَّ اللَّهَ

بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿١١٥﴾

’اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ کسی جماعت کو گمراہ قرار دے [۱] جب کہ انہیں اس نے راہ راست پر لگا دیا جب تک کہ صاف صاف ان پر ظاہر نہ کر دے وہ باتیں جن سے انہیں بچنا ہے۔ یقیناً اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔‘

تکلیف بلا بیاں کا صحیح نہ ہونا

یہ اس اصول کا اعلان ہے جو اصول فقہ میں اصل برأت کے ذیل میں عقلی و نقلی طور پر ثابت ہوا ہے کہ تکلیف بلا بیان قبیح ہے اور جب تک کہ کسی شے سے ممانعت وارد نہ ہو، اس پر مواخذہ ہونے والا نہیں ہے۔

’اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے‘۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اضلال اور ہدایت اللہ کا اندھا دھند کوئی عمل نہیں ہے بلکہ یہ ایک صفت ثابت پر مبنی ہے جس سے علم الہی کا تعلق ہوتا ہے اور وہ اسی اپنے علم پر احکام ضلال و ہدایت مرتب فرماتا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۗ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ

مِنْ وَّلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿١١٦﴾

’یقیناً اللہ کے لئے ہے بادشاہت آسمانوں اور زمین کی، وہ جلاتا ہے اور مارتا ہے اور نہیں ہے تمہارے لئے اللہ کو چھوڑ کر کوئی حامی اور نہ مددگار‘۔

لَقَدْ تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ

الْعُسْرَةِ مِّنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبَ فَرِيقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۗ إِنَّهُ بِهِمْ

رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿١١٧﴾

’اللہ نے رحمت کی نظر ڈالی [۲] پیغمبر اور ان مہاجرین اور انصار پر جنہوں نے سختی کے وقت پران کا ساتھ دیا جب

کہ قریب تھا کہ ان میں سے کچھ کے دلوں میں کجی آجائے۔ پھر اللہ نے ان پر نظر رحمت ڈالی۔ یقیناً وہ ان کے ساتھ شفیق ہے، بڑا مہربان‘۔

یاد رکھئے کہ مہاجرین و انصار میں سے انہی کے لئے نظر رحمت کی توجہ کا بیان ہو رہا ہے جنہوں نے سختی و مصیبت میں رسول کا ساتھ دیا

[۱] یعنی در حساب گمراہان نمی شمارد قوهی را (فتح الرحمن) نہیں ہے اللہ کہ گمراہ ٹھہرائے قوم کو (شاہ رفیع الدین)

[۲] بر حمت متوجه شد (شاہکولی اللہ)

ہو، نہ یہ کہ رسولؐ کو مصیبت میں چھوڑ کر انہوں نے اپنے لئے گوشہ ہائے عافیت تلاش کئے ہوں۔

وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خَلَفُوا ط حَتَّىٰ إِذَا صَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ
وَصَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَن لَّا مَلْجَأَ مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ ط ثُمَّ تَابَ
عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا ط إِنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١١٨﴾

’اور ان تینوں پر کہ جو پیچھے رہ گئے تھے یہاں تک کہ یہ عالم ہوا کہ زمین ان پر باوجود اپنی وسعت کے تنگ ہو گئی اور وہ خود اپنے سے تنگ ہو گئے [۱] اور انہوں نے سمجھا کہ اللہ سے بچاؤ کے لئے کوئی جائے پناہ سوا خود اسی کے نہیں ہے پھر اللہ نے ان کی طرف توجہ فرمائی کہ وہ توبہ کریں، یقیناً اللہ ہی وہ ہے جو بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے، بڑا مہربان۔‘

’اور ان تینوں پر‘ اس کا تعلق اس کے قبل والی آیت کے ساتھ ہے کہ اللہ نے اپنی نظر تو جب مبذول فرمائی رسولؐ اور ان مہاجرین و انصار پر جنہوں نے رسولؐ کی پیروی کی اور ان تین آدمیوں پر جنہوں نے جنگ تبوک کے سفر میں رسولؐ کا ساتھ چھوڑنے کے بعد صدق دل سے توبہ کی اور یہ حقیقت میں ان افراد کی انتہائی دل جوئی ہے کہ ان کی توبہ قبول کرنے کا تذکرہ کرنے کے لئے رسولؐ اور آپؐ کی سچی اطاعت کرنے والے افراد پر اپنی نظر توجہ کا تذکرہ پہلے کرتے ہوئے اسی سلسلہ میں ان کا نام لے کر اس کا عملی طور پر ثبوت دے دیا کہ التائب عن ذنبہ کمن لا ذنب له : گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے وہ جس نے گناہ کیا ہی نہ ہو۔

چونکہ ان کی توبہ کو بطور نتیجہ ذکر کیا ہے تاب اللہ کے مضمون پر مترتب کر کے، اس لئے پہلے تاب کے معنی ہم نے قبول توبہ کے نہیں بلکہ توجہ مبذول فرمانے کے قرار دیے ہیں اور اس توبہ کے بعد جو تو اب آیا ہے اس کے معنی توبہ قبول کرنے والا قرار دیے ہیں جو بالکل سیاق قرآنی کے مطابق ہیں۔

یہ الفاظ کہ زمین اُن پر تنگ ہو گئی اور وہ خود اپنے سے تنگ ہو گئے اس ضمیر کی شدید بے چینی کے اظہار کے لئے ہیں جو صحیح احساس جرم کی بنا پر ان میں پیدا ہوئی تھی اور پھر روایت بتاتی ہے کہ ان کے لئے حالات بھی ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ گھر والوں تک اُن سے بات نہ کرتے تھے اور انہوں نے خود بھی آپس میں ایک دوسرے سے بات کرنا موقوف کر دی تھی اور جنگل میں ایک دوسرے سے بالکل الگ زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ [۲]

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ﴿١١٩﴾
’اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔‘

[۱] ان کی جانیں (تنگ) ان پر تنگ ہو گئیں (مولانا فرمان علی صاحب)

[۲] فضاقت عليهم المدينة فخر جو الی روس الجبال فكان اهلهم يبيعون لهم بالطعام و يتركونه لهم ولا يكلمو منهم فقال بعضهم لبعض قد هجوا الناس ولا يكلمنا احد فهلا نتمها جرحن ايضا فتفرقوا ولم يجتمع منهم اثنان (تبيين)

صادقین کے ساتھ رہنے کا حکم

یہ ایک مستقل آیت ہے اور چونکہ ترتیب مطابق تزیل نہیں ہے اس لئے یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں کہ وہ ما قبل یا ما بعد ہی کے سلسلہ کی کوئی آیت ہے لیکن مفسرین اہل سنت نے بلا وجہ اس کا تعلق سیاق سے قرار دے دیا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اصلی مرکز سے دور ہو گئی ہے۔^[۱] تفسیر اہل بیت یہ ہے کہ صادقین سے مراد معصومین ہیں۔

مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَتَخَلَّفُوا عَنِ رَسُولِ اللَّهِ وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنْفُسِهِمْ عَنْ نَفْسِهِ ۗ ذَلِكُمْ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَطْئُونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نِيلاً إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۲۳﴾
وَلَا يُنْفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۲۴﴾

’مدینہ کے باشندوں اور ان کے ارگرد کے صحرائی عربوں کو یہ درست نہیں ہے کہ وہ پیغمبر خدا کا ساتھ چھوڑ کر گھر بیٹھیں اور اپنی جانوں کو آپ کا ساتھ دینے سے بچائیں، اس لئے کہ انہیں نہ پیاس، نہ زحمت، نہ مشقت اور نہ بھوک کی مصیبت راہ خدا میں پہنچے گی اور نہ کہیں قدم ایسا رکھیں گے^[۲] جو کافروں کے لئے غم و غصہ کا باعث ہو اور نہ وہ دشمنوں کے مقابلہ میں کوئی کامیابی حاصل کریں گے مگر یہ کہ اس کے سبب سے ایک نیک عمل ان کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا، بلاشبہ اللہ اچھے اعمال والوں کے ثواب کو رازگاہ نہیں کیا کرتا اور نہ وہ کوئی خرچ کریں گے چھوٹا اور نہ بڑا اور نہ کوئی وادی قطع کریں گے مگر یہ کہ ان کے واسطے اسے نامہ عمل میں لکھا جائے گا تا کہ اللہ انہیں صلہ دے ان کے بہتر سے بہتر اعمال کے لحاظ سے جو وہ کرتے تھے‘۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً ۗ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ﴿۲۴﴾
’اور ایمان لانے والوں کے لئے یہ نہیں ہے کہ وہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں تو ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ہر

[۱] کونوا مع الصادقین فی الایمان والعود بان تلزموا الصدق (جلالین) ساتھ مہاجرین و انصار کے تین شخص اور بھی داخل ہوئے پچاس دن میں (موضح القرآن)

[۲] موطأ مصدر بمعنی وطأ (جلالین)

جماعت میں سے کچھ لوگ سفر کریں تاکہ دین کے سمجھنے کی قابلیت حاصل کریں اور پھر جب واپس جائیں تو اپنی قوم کو متنبہ کریں، شاید وہ اثر لیں۔“

تحصیل علم دین کے لئے سفر کا حکم و جوہر کفائی

اس آیت کا تعلق گزشتہ سلسلہ کلام سے معلوم نہیں ہوتا، اس لئے کہ وہ جہاد میں جانے کا ذکر تھا اور وہاں تو پیچھے رہنے والوں کی سختی کے ساتھ مذمت کی گئی ہے اگر یہ آیت اس سے متعلق سمجھ لی جائے تو رسولؐ کے ساتھ نہ جانے والوں پر کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا۔ اور جیسا کہ بہت دفعہ لکھا گیا، ترتیب مطابق تنزیل نہیں ہے لہذا کوئی وجہ بھی نہیں کہ خواہ مخواہ اسے گزشتہ کے ساتھ مرصط کرنے کی کوشش کی جائے۔^[1] درحقیقت یہ آیت ایک دوسری بات سے متعلق ہے اور وہ تحصیل علم دین کے لئے سفر ہے اور اسی بناء پر علماء نے اسے اجتہاد اور تقلید کے ثبوت میں پیش کیا ہے اس لئے کہ قرآن نے تحصیل علوم دین کا ذریعہ یہی بتایا ہے کہ ایک جماعت جا کر قابلیت فہم احکام دینیہ کی حاصل کرے۔ یہ ہوئے فقہاء اور پھر جب وہ واپس آئیں تو قوم کے دوسرے لوگوں کو وہ احکام دین پر مطلع کریں اور وہ ان احکام پر عمل کریں۔ یہ ہوئے مقلدین۔ یہی عملی طریقہ ہے جو عقل و فطرت کے عین مطابق ہے۔

تفسیر جلالین میں ایک عجیب طرح سے اس آیت کو گزشتہ سے مرتبط بھی کیا ہے اور پھر اسے علم دین کے واجب کفائی ہونے سے بھی متعلق قرار دیا ہے اور اس تضاد کو بھی رفع کرنے کی کوشش کی ہے جسے ہم نے پہلے دکھلایا ہے کہ اگر جہاد میں جانا واجب کفائی ہوتا جیسا کہ سیاق سے متعلق قرار دینے کے بعد اس آیت سے ثابت ہوتا ہے تو اس کے پہلے ساتھ نہ جانے والوں پر اتنی زبرد تو بیخ کیوں ہوتی۔

وہ کہتے ہیں کہ گزشتہ آیات کے نازل ہونے کے بعد ایک مہم اور پیش آئی تو اب کہ جتنے مسلمان تھے، سب کے سب چل کھڑے ہوئے اور مدینہ میں کوئی نہ رہ گیا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ: وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً (یعنی) مومنین کے لئے یہ نہیں ہے کہ وہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں۔ اس میں بیچ میں انہوں نے بڑھایا الی الغزو یعنی میدان جنگ کی طرف، مطلب یہ نکلا کہ تمام مومنین کو ایک دم جنگ کے لئے روانہ نہیں ہونا چاہیے فَالَوْ لَا نَفَرْنَا مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ اِيسَا كِیوں نہیں ہوتا کہ ہر قبیلہ میں سے کچھ لوگ جائیں۔ اب یہاں وہ جملہ بڑھاتے ہیں: وَمَكَثَ الْبَاقُونَ اور باقی لوگ قیام کریں۔ لِيَتَفَقَّهُوا تاکہ وہ لوگ یہاں پر وہ تشریح فرماتے ہیں: اِی الْمَاكُتُونَ یعنی یہ قیام کرنے والے علم دین حاصل کریں۔ وَلِيُؤَدِّبُوا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوا اِلَيْهِمْ اور وہ اپنی قوم کو آگاہ کریں جب وہ یعنی وہ قوم جو جہاد میں گئی ہے واپس آئے۔

اب اس تضاد کو یوں رفع کیا ہے کہ:

قال ابن عباس فهذه مخصوصة بالشرایا والى قبيلها بالنهي عن تخلف احد فيها اذا خرج النبي ﷺ. ابن عباس نے کہا ہے کہ یہ آیت سریوں سے مخصوص ہے (جن میں پیغمبرؐ خود تشریف نہیں لے جاتے تھے اور کسی کو سردار لشکر بنا کر بھیج دیتے تھے) اور جو آیات اس کے پہلے ہیں کہ کوئی پیچھے نہ رہ جائے وہ اس صورت کے لئے ہیں کہ جب خود رسول تشریف لے جائیں۔

[1] مثلاً یوں کہا جائے کہ ”اور یہ (بھی) مناسب نہیں کہ مومنین کل کے کل (اپنے گھروں سے) نکل کھڑے ہوں۔“ (مولانا فرمان علی صاحب)

اب بظاہر تو چولیس سب بیٹھ گئیں مگر اس کی بنیاد میں ایک بڑی منطقی کمزوری ہے وہ یہ ہے کہ اصل الفاظ قرآن یہ ہیں۔
فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ کیوں نہیں ایک گروہ ان میں کا سفر کرتا تاکہ وہ علم دین حاصل
کریں۔

یہاں ضمیر وہ کے پہلے ذکر سفر کرنے والوں کا ہے تو اس کا مطلب لازماً یہی ہوگا کہ وہ سفر کرنے والے علم دین حاصل کریں۔ قیام کرنے
والوں کا کوئی ذکر ابھی آئی قرآنی میں نہیں ہے۔ یہ تو مفسر صاحب نے بیچ میں ”ومکت باقون“ اور باقی لوگ قیام کریں بڑھایا اور پھر
لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ کے معنی قرار دے رہے ہیں کہ وہ قیام کرنے والے علم دین حاصل کریں۔ گویا خداوند عالم ضمیر پھیر رہا ہے ایک ایسے مرجع
کی طرف جسے کئی صدی کے بعد جلالین صاحبان میں کا کوئی ایک بیچ میں لکھ کر اس خلا کو پر کرے گا جو قرآن میں معاذ اللہ پایا جاتا تھا۔
اسی بناء پر بعض مفسرین اہل سنت نے بھی اس سفر کو جہاد سے متعلق قرار نہیں دیا ہے چنانچہ شاہ ولی اللہ نے ممکن نیست مومنوں را کہ
برآیند پر نوٹ دیا ہے یعنی بطلب علم اور آخر میں لکھا ہے یعنی بطلب علم فرض کفایہ است (فتح القرآن)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ
غِلْظَةً ۗ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿١٣٣﴾

”اے ایمان لانے والو! جنگ کرو ان سے کہ جو تمہارے آس پاس ہیں اور وہ تم میں سختی و مضبوطی محسوس کریں اور
جانے رہو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔“

قرآن مجید کی اکثر آیات سلسلہ نزول کے مطابق مرتب نہ ہونے کی وجہ سے اپنے پس منظر سے جدا ہو گئی ہیں جن میں وہ آیت نازل
ہوئی تھی یہ آیت بھی اسی طرح کی ہے اور اس لئے ایک ایسا شخص جو اسلام کو شمشیر زنی اور خونریزی کا حامل قرار دینے کے درپے ہے، باسانی اس
آیت کا استعمال کر سکتا ہے لیکن اگر اس آیت کو اس منظر میں دیکھا جائے جس میں یہ آیت اتری تھی تو معلوم ہوگا کہ اسباب جنگ ان کفار سے پہلے
سے موجود تھے اور ان کی بنا پر یہ حکم آیا ہے جسے کوئی عمومی حیثیت نہیں ہے کہ ہر دور میں مسلمانوں کے لئے یہ اصول قائم ہو کہ انہیں اپنے آس پاس
کے کافروں سے جنگ کرنا لازم ہو۔

وَإِذَا مَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَقُولُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَذِهِ إِيمَانًا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ
آمَنُوا فزَادَتْهُمْ إِيمَانًا ۚ وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿١٣٤﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ

فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ وَمَاتُوا وَهُمْ كَافِرُونَ ﴿١٣٥﴾

”اور جب کوئی سورہ اترتا ہے تو ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ تم میں سے کون ہے جس کے ایمان میں اس
نے اضافہ کیا ہو تو (اس کا جواب یہ ہے کہ) جو ایمان رکھتے ہیں ان کے ایمان میں اس سے اضافہ ہوا ہے اور وہ
خوش ہوتے ہیں اور جن کے دلوں میں پہلے سے بیماری ہے، ان کو تو ان کی موجودہ خباثت کے ساتھ اور خباثت میں

اضافہ ہوتا ہے اور وہ مرے گے بھی اس عالم میں کہ وہ کافر ہیں۔^[۱]

نفاق کا مظاہرہ نکتہ چینوں کی شکل میں ہوتا ہے چنانچہ ایک ایسا ہی سوال و جواب سورہ بقرہ میں آچکا ہے: إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيَ أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا. فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ. وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا. يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا. وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا. وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ﴿۱۶﴾ ﴿البقرة﴾ اللہ نہیں شرمانا اس سے کہ مچھر یا اس سے بھی چھوٹی چیز کی مثال دے تو جو ایمان رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ انکے پروردگار کی طرف سے حق ہے اور جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس مثال سے اللہ کا مطلب کیا ہے بہت سوں کو وہ اس سے گمراہ کرتا ہے اور بہت سوں کی ہدایت کرتا ہے اور گمراہی میں انہی کو ڈالتا ہے جو بد اعمال ہیں۔

ویسا ہی یہاں ہے کہ قرآن مجید کی کچھ آیات اترنے پر منافقین کہتے ہیں کہ اس کا حاصل کیا ہوا؟ اس میں افادیت ہی کیا ہے؟ اس سے آخر کس کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے؟ اس کا جواب قرآن نے یہی دیا ہے کہ تم میں ایمان ہو تو تمہارے ایمان میں اضافہ بھی ہو۔ تم میں تو نفاق کی بیماری دلوں میں موجود ہے اس لئے آیات الہی سے تمہارے نفوس میں بجائے ایمان کے اور خباثت ہی زیادہ ہوتی ہے، اور یہ آخری لمحہ زندگی تک تمہاری کیفیت برقرار رہے گی مرو گے بھی تم اسی کفر کے عالم میں۔

معلوم ہوا کہ خالق کی جانب سے کوئی جبر کی کارفرمائی نہیں ہے، انسانی نفوس کی بذات خود حالت ہے جس سے آیات الہی کے مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ
يَذَكَّرُونَ ﴿۱۶﴾

’کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ ہر سال ایک دو بار آزمائشوں میں مبتلا کئے جاتے ہیں، پھر اس کے بعد بھی نہ وہ توبہ کرتے ہیں اور نہ نصیحت قبول کرتے ہیں‘۔

یہ آزمائشیں مختلف طرح کے عوارض و امراض کے ساتھ ہوا کرتی ہیں جن سے صاحبان ایمان اصلاح نفس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور دوسرے لوگ ان سے کوئی اثر قبول نہیں کرتے۔

وَإِذَا مَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ ۖ هَلْ يَرِيكُمْ مِّنْ أَحَدٍ ثُمَّ
انصَرَفُوا ۗ صَرَفَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ﴿۱۷﴾

’اور جب کوئی سورہ اترتا ہے تو ان میں سے ایک دوسرے کی صورت دیکھتا ہے کوئی تمہیں دیکھتا تو نہیں ہے؟ پھر وہ پلٹ جاتے ہیں اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا ہے اس سبب سے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے نہیں ہیں۔‘

[۱] ماتوا علی لفظ الماضي لانه عطف علی زادهم... والمعنی انهم يموتون وهم كافرون (تبیان)

کوئی سورہ یعنی ایسی قرآن کی آیات جن میں ان کی منافقانہ روشوں کا تذکرہ اور ایسے اوصاف ہیں جو بالکل انہی پر منطبق ہیں۔^[۱] ایک دوسرے کی صورت دیکھتا ہے۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہو سکتے ہیں کہ وہ کچھ شرمندگی اور انفعال محسوس کرتے ہیں۔^[۲] یا یہ کہ جب رسول ان آیات کو جمع میں سناتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کے آپس میں اشارے کرتے ہیں کہ اب یہاں ٹھہرنے کا موقع نہیں، چلنا چاہیے۔^[۳]

پھر ادھر ادھر دیکھتے ہیں کہ کوئی مسلمان انہیں دیکھتا تو نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کا ایک دوسرے کی طرف دیکھنا اسی مطلب سے ہو کہ کوئی تمہیں دیکھ تو نہیں رہا ہے اور اس لئے یہ ضروری نہیں کہ یہ الفاظ وہ کہتے بھی ہوں۔ بلکہ یہ ان کی صورت حال کی ترجمانی ہے جو قرآن نے کی ہے۔^[۴] مگر عام مترجمین یہاں ان الفاظ کا اضافہ کرتے ہیں کہ وہ ایسا کہتے ہیں^[۵] پھر وہ پلٹ جاتے ہیں یعنی اس بزم سے ہٹ کر ادھر ادھر چلے جاتے ہیں۔^[۶]

اللہ کا ان کے دلوں کو پھیر دینا از خود نہیں ہے بلکہ ان کے شعور ایمانی سے کام نہ لینے کا نتیجہ ہے جسے آخر میں ظاہر کر دیا ہے۔^[۷]

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ

بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۸﴾

”تمہارے پاس آیا ہے تم ہی میں سے ایسا پیغمبر جس پر تمہاری زحمت و تکلیف شاق ہے، جسے تمہاری ہر وقت فکر ہے، جو ایمان قبول کرنے والوں پر بہت شفیق ہے بڑا مہربان۔“

یہ آیت گویا اِنَّكَ لَعَلَّ خُلُقِي عَظِيمٍ ﴿۱۷﴾ القلم کے متن کی ایک بڑی متین شرح ہے جس کی تفصیل ہم بیان کرنا چاہیں تو دفتر کے دفتر ناکافی ہیں۔

اوصاف پیغمبر خدا ﷺ

پیغمبر کو جا بجا جو مِّنْ أَنْفُسِكُمْ کہا ہے، اس کے معنی عموماً قوم قبیلہ کے لئے جاتے ہیں چنانچہ یہاں بھی یہی معنی لئے گئے ہیں۔ حالانکہ پیغمبر کی رسالت نبص قرآن تمام نوع بشر پر حاوی ہے جس میں قبیلہ اور قومیت کا اختلاف ظاہر ہے۔ اس لئے میں ایک دوسری قرآنی نظیر کے سہارے اور وہ یہ ہے کہ متعدد مقامات پر شریک حیات کے لئے یہ مضمون ہے کہ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا (روم۔ ۲۱) اس نے تم ہی

[۱] سورۃ فیہا ذکر ہم (جلالین) یعنی سورتی کہدروے بیان نفاق ایشاں باشد (فتح الرحمن)

[۲] از جہت شرمندگی (فتح الرحمن)

[۳] یریدون الہوب (جلالین)

[۴] فکاہم یقول بعضہم بعض ہل یرئی مکم من احد (تبیان)

[۵] (یہ کہہ کر کہ تم کو کوئی مسلمان دیکھتا تو نہیں ہے پھر (اپنے گھر پر) پلٹ جاتے ہیں (مولانا فرمان علی صاحب)

[۶] ای تفرقوا (علی بن ابراہیم)

[۷] پیغامبری از قبیلہ شما (شاه ولی اللہ)

میں سے تمہارے لئے شریک زندگی پیدا کئے۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ زوجہ ہمیشہ اسی قوم کی نہیں ہوتی جس قوم قبیلہ سے اس کا شوہر ہے لہذا اس کے معنی یہ معلوم ہوتے ہیں کہ وہ حقیقت نوعیہ میں اس شوہر کے ساتھ شریک ہے چونکہ ایک عرصہ تک دانشوروں میں یہ چیز محل بحث رہی کہ عورت نوع انسانی میں داخل ہے یا نہیں؟ تو اس کا فیصلہ قدرت نے مِنْ أَنْفُسِكُمْ کہہ کر کیا، اسی طرح انبیاء و مرسلین کے لئے ایسا تصور ہر دور میں ہوتا رہا اور آج بھی موجود ہے کہ وہ حقیقت و نوعیت ذات میں افراد انسانی سے الگ ایک مخلوق ہوتے ہیں، اسے پیش نظر رکھ کر خالق نے متعدد جگہ قرآن مجید میں اس پر زور دیا ہے کہ پیغمبر تم ہی میں سے ایک ہوتا ہے یعنی حقیقت و ماہیت نوعیہ میں تمہارا ہم جنس ہی ہوتا ہے۔ فرشتہ یا کسی دوسری نوع کا فرد نہیں ہوتا۔ بے شک اس کے صفات شخصی ہوتے ہیں جو اسے افراد نوع سے ممتاز بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ تم اگر اس کی پیروی کرو گے تو اسی پیروی کے تناسب سے تم بلند سے بلند تر درجے حاصل کر کے نوع انسانی میں ایک شرف و امتیاز کے حامل ہو جاؤ گے۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ

الْعَظِيمِ ﴿١٢٩﴾

”اس کے بعد وہ اگر روگردانی کریں تو کہیے کہ اللہ میرے لئے کافی ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں، اس پر میرا

بھروسہ ہے اور وہ عظیم المرتبت عرش کا مالک ہے۔“

بعض روایات میں اہل سنت میں ہے کہ لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ سے لے کر یہاں تک، یہ دو آیات قرآن کی سب

سے آخری آیات ہیں ان کے بعد پھر کوئی آیت نازل نہیں ہوئی ہے۔^[۱]

[۱] روی الحاکم فی المستدرک عن ابی بن کعب قال أخر آية نزلت: لقد جاءكم رسول إلى آخر السورة (جلالین)

سُورَةُ يُوسُفَ

مکیہ --- آیات ۱۰۹

سورہ یونس کے خاص خاص مضامین

مگر دو تین آیات کو مستثنیٰ کیا جاتا ہے کہ وہ مدینہ کی نازل شدہ ہیں۔^[۱]

اس سورہ میں جو خاص واقعہ مذکور ہے اور موجودہ ترتیب قرآن میں سب سے پہلے یہیں درج ہوا ہے وہ قوم یونس پر عذاب کا آنا اور پھر توبہ و انابت سے اس کا برطرف ہو جانا ہے اور یہ واقعہ تاریخ ام میں ایک نادر حیثیت رکھتا ہے کہ عذاب نازل ہو اور پھر سچے دل سے توبہ ہونے کی وجہ سے وہ پلٹ جائے اس لئے اس واقعہ کو یاد دلانے کی خاطر اس سورہ کا نام ”سورہ یونس“ ہوا۔

یوں جناب یونس علیہ السلام کا نام اور دوسری سورتوں میں بھی آیا ہے مگر وہ ضمناً ہے اس واقعہ کا تذکرہ اسی سورہ میں ہے ہاں اس واقعہ کی بعض کڑیوں کی طرف انتہیوں پارہ کے سورہ قلم میں اشارہ ہے مگر وہاں جناب یونس علیہ السلام کا نام نہیں ہے اور واقعہ کی خاص کڑی یعنی قوم سے عذاب دور ہونے کا ذکر وہاں نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس سورہ میں جو خاص باتیں ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔۔۔۔۔ قرآن اور تعلیم اسلام کے بوجی الہی ہونے پر رسول کی اس خاموش زندگی سے جو قبل بعثت تھی، استدلال کہ یہ سب اگر ان کے ذہن کی پیداوار ہوتا تو کبھی اس چالیس برس کے اندران کی زبان سے اس طرح کی باتیں تمہیں سننے میں آتیں۔

۲۔۔۔۔۔ یہ اصول کہ جو خود دوسرے کی رہ نمائی کا محتاج ہو، وہ پیشوائے خلق نہیں ہو سکتا۔

۳۔۔۔۔۔ جس چیز کے لئے اللہ کی طرف سے کوئی حکم نہ آئے، اس میں کوئی حکم اپنے دل سے جاری کرنا اللہ پر افتراء ہے۔

۴۔۔۔۔۔ اولیائے الہی خوف و حزن سے بری ہے۔

۵۔۔۔۔۔ حقانیت معجزہ کا معیار، جو غلط بات اللہ کی طرف منسوب کی جائے، اس کا باطل ثابت کرنا اللہ کو لازم ہے۔

۶۔۔۔۔۔ فرعون کا جسم کا غرق ہونے کے بعد پھر دریا سے نکل کر محفوظ ہو جانا۔۔۔ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۱

[۱]. مکیہ الافان کنت فی شک الایتین او الثلث او ومنہم من یؤمن بہ الایة (جلالین)

”الف۔ لام۔ را۔ یہ [۱] آیات ہیں حکمت والی کتاب کی“۔

شروع کے حروف تو مقطعات قرآنیہ ہیں جن کے متعلق لکھا جا چکا ہے کتاب کے وسط میں حکیم کی لفظ کو عموماً حکمت سے لیا گیا ہے [۲] جس کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے لیکن بعض مفسرین نے اسے محکم سے لیا ہے جس کے معنی مضبوط کے ہیں۔ [۳]

أَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا أَنْ أَوْحَيْنَا إِلَى رَجُلٍ مِّنْهُمْ أَنْ أَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِينَ
آمَنُوا أَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ قَالَ الْكٰفِرُونَ إِنَّ هَذَا لَسِحْرٌ

مُبِينٌ ﴿۲﴾

”کیا یہ لوگوں کے لئے عجیب بات تھی کہ ہم نے انہی میں سے ایک شخص پر وحی بھیجی کہ آپ لوگوں کو ڈرائیے اور ایمان لانے والوں کو خوش خبری دیجئے کہ ان کے لئے سچائی کی روایت قائم ہے ان کے پروردگار کے یہاں کافر کہنے لگے کہ بلاشبہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے“۔

انہی میں سے ایک شخص یعنی رسالت مآب جن کا خاص فریضہ بشارت و انداز ہے اور آپ کا لقب ہی بشیر و نذیر تھا۔ [۴]
”قَدَمَ صِدْقٍ“ کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے اس میں بھی تقدم یعنی ماقبل کی صورت حال کا تصور محفوظ ہے [۵] اور بعض مفسرین نے تقدم کا مطلب یہ لیا ہے کہ جو سچائی کا ذخیرہ وہ اپنے گفتار و کردار سے اللہ کے یہاں پہلے بھیج چکے ہیں اور وہ اللہ کے یہاں جزا کی صورت میں ان کے لئے محفوظ ہے۔ [۶]

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى
الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ۗ مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهِ ۗ ذٰلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ
فَاعْبُدُوْهُ ۗ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۳﴾

”یقیناً تمہارا پروردگار اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر عرش پر برقرار ہوا تدبیر کائنات کرتا ہوا کوئی سفارشی نہیں ہے مگر اس کی اجازت کے بعد یہ ہے کہ اللہ تمہارا پروردگار تو عبادت کرو اس کی۔ تو کیا تم نصیحت قبول نہ کرو گے؟“

[۱] قال ابو عبیدہ ”تلك“ معناہ هذا (تبیان)

[۲] این ایٹہای کتاب حکمت است (شام ولی اللہ) یہ ہیں نشانیاں کتاب حکمت والی کی (شاہ رفیع الدین)

[۳] المحکم المحکم (جلالین)

[۴] استواء ۱ یلیق بہ (جلالین)

[۵] معناہ استواء علیہ بانشاء التدبیر من جہتہک ۱ استواء علی سریر ملکہ بالاستیلاء علی تدبیرہ (تبیان)

اس آیت کے تمام اجزاء پہلے آچکے ہیں آسمان اور زمین کو چھ دن میں پیدا کرنا، عرش پر مستوی ہونا یہ استواء جس کا ترجمہ ہم نے برقرار ہونے سے کیا ہے جسمانی نہیں ہے! بلکہ مقام انتساب میں نقطہ اعلیٰ کو عرش یعنی تخت سلطنت قرار دیا گیا ہے۔ ۲ تو اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ وہ عرش پر ہے تدبیر کائنات بذات خود کر رہا ہے یہ شرک کی اس قسم کے مقابلہ میں ہے جو کائنات کے نظام کو مختلف دیوتاؤں پر تقسیم کر کے اللہ کو اس نظام سے بے تعلق بنا دیتی ہے اور اس لئے عبادت بھی انہی دیوتاؤں کی کرتی ہے اللہ سے کوئی رابطہ قائم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ اسلام میں اس طرح کے وساطت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ جن کے بعد اللہ سے کوئی مطلب نہ رہے۔

اسلام میں جس طرح کے وسیلہ اور شفیع کا تصور ہے وہ وہی ہے جسے اس آیت میں الا من بعد اذ ذہ کہہ کر متشبیٰ کیا گیا ہے یعنی جو وسیلہ ہوتا ہے وہ بھی اللہ کی اجازت سے اور جو شفیع ہوتا ہے وہ بھی اس کے اذن سے۔ اس لئے اس وسیلہ اور شفیع کے ساتھ وابستگی کے بعد بھی بندہ کی لواحد سے لگی رہتی ہے اور اس کی طرف سے ذہن کی توجہ منقطع نہیں ہوتی۔

یہی وہ نکتہ ہے جسے وہابی جماعت نہیں سمجھتی اور وہ مشرکین کے تصور وسائل اور مسلمین و مومنین کے تصور وسائل میں فرق محسوس نہیں کرتی حالانکہ ان دونوں میں بڑا فرق ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مشرکین چونکہ وسائل کو مستقل مان لیتے ہیں اور اللہ سے اب بے نیاز ہونے کا احساس رکھتے ہیں اس لئے عبادت انہیں وسائل کی کرنے لگتے ہیں اور مسلمان ان وسائل کے بعد بھی اصل کارساز اللہ کو جانتا ہے اس لئے مقررین سے توسل کے باوجود بھی عبادت ان مقررین کی نہیں کرتا بلکہ عبادت اللہ ہی کی کرتا ہے۔

إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا ۖ وَعَدَ اللَّهُ حَقًّا ۖ إِنَّهُ يَبْدُوُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ لِيَجْزِيَ
الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ بِالْقِسْطِ ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ
حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ ۖ مِمَّا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿۵﴾

’اسی کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے، بلاشبہ وہی پہلے پہل مخلوق کو پیدا کرتا ہے پھر دوبارہ اسے زندہ کرے گا تاکہ جزا دے انہیں کہ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کئے عدالت کے ساتھ اور جنہوں نے کفر اختیار کیا، انہیں کھولتا ہوا پانی پینے کو ہوگا اور دردناک عذاب اس وجہ سے کہ وہ کفر کرتے تھے‘۔

جزا و جزا کو عدالت کے ساتھ وابستہ کرنا اس عقلی حقیقت کا اظہار ہے کہ کارگاہِ آخرت کی ترتیب عدل الہی کا نتیجہ ہے اس لئے جو مسلمان فرقے عدل کو اللہ کے لئے ضروری نہیں سمجھتے ان کا آخرت پر ایمان بے بنیاد قرار پاتا ہے جسے صرف رسمی حیثیت حاصل ہو سکتی ہے حقیقی ایمان قرار نہیں دیا جاسکتا۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسُ ضِيَاءً ۖ وَالْقَمَرَ نُورًا ۖ وَقَدَرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ
السِّنِينَ وَالْحِسَابِ ۖ مَا خَلَقَ اللَّهُ ذَلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ ۖ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ
يَعْلَمُونَ ﴿۵﴾

’وہ وہ ہے جس نے آفتاب کو چمک دار بنایا اور چاند کو روشن اور اس کی مختلف منازل قرار دیں تاکہ تمہیں برسوں کا شمار اور حساب معلوم ہو۔ اللہ نے یہ سب نہیں پیدا کیا مگر بالکل صحیح و مناسب [۱] وہ تفصیل کے ساتھ پیش کرتا ہے آیات ان لوگوں کے لئے جو جاننا چاہیں۔‘

اسلام میں ماہ و سال کے قمری حساب کا اعتبار

چاند کی منازل قرار دینے کا مقصد برسوں کا شمار قرار دینا، اس کی دلیل ہے کہ اسلام میں سال قمری ہی معتبر ہے نہ کہ سال شمسی جیسا کہ آج کل کے بعض خود رو، آزاد مفکرین کا رجحان ہے

إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَّقُونَ ﴿٦﴾

یقیناً رات اور دن کی ادل بدل میں [۲] اور اس میں کہ جو اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے، نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو نجات کی فکر رکھتے ہوں۔‘

رات اور دن کے ادل بدل کے ساتھ خلقت آسمان و زمین کیلئے جن نشانیوں کا اجمالی حوالہ دیا گیا ہے ان کا کافی زیادہ تفصیل کے ساتھ اس کے پہلے دوسرے پارہ میں تذکرہ آچکا ہے، اس طرح کہ:

یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں، رات اور دن کی ادل بدل میں کشتیوں میں جو لوگوں کے فائدے کی چیزیں لے کر سمندر میں چلتی ہیں، اس پانی میں جسے اللہ نے آسمان سے برسایا تو اس سے زمین کو اس کے بے جان ہونے کے بعد جان دار بنا دیا اور اس میں ہر قسم کے چلنے پھرنے والے پھیلا دیئے، ہواؤں کے ہیر پھیر میں اور اس بادل میں جسے آسمانوں اور زمین کے درمیان پابندر ہنا پڑتا ہے، نشانیاں ہیں ان کے لئے جو عقل سے کام لیں۔‘ (بقرہ آیت ۶۴)

وہاں ان نشانیوں کو کہا گیا تھا لقوم یعقلون ان کے لئے جو عقل سے کام لیں، یہاں کہا جا رہا ہے: لقوم یتقون ان لوگوں کے لئے جو نجات یعنی عذاب آخرت سے بچنے کی فکر رکھتے ہیں، یہ دونوں باتیں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں، عقل کا تقاضا یہی ہے کہ امکانی خطرات سے اپنا بچاؤ کرے اور یہی عقل کا فیصلہ تحقیق حق اور فکر و نظر کی دعوت دیتا ہے اور جب فکر و نظر سے کام لے گا تو پھر یہ دلائل قدرت جو کائنات آسمان و زمین میں جلوہ گر ہیں، رہ نمائی کریں گے اور انسان اپنے ضمیر کے فیصلہ سے قبول حق اور ایمان کے لئے مجبور ہوگا۔ [۳]

ان لوگوں کے لئے ان نشانیوں کا ہونا اسی طرح کہا گیا ہے جیسے قرآن کو کہا گیا ہدیٰ للمتقین وہ ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لئے۔ مطلب یہ ہے کہ فائدہ اس سے یہی لوگ اٹھاتے ہیں اسی طرح یہ نشانیاں نمایاں تو سب کے لئے ہیں، لیکن ان سے صحیح فائدہ اٹھانے

[۱]. لا عبثاً تعالیٰ عن ذلک (جلالین)

[۲]. بالذہابو المجیبی والزیادۃ والنقصان (جلالین)

[۳]. یتقون فیئومنون (جلالین)

والے وہی ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں اور جو نجات کی فکر رکھتے ہیں۔^[۱]

إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنَّنُوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ

عَنْ آيَاتِنَا غُفْلُونَ ۚ أُولَٰئِكَ مَا لَهُمْ النَّارُ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝

’یقیناً وہ جنہیں ہم سے ملنے کی امید نہیں ہے اور وہ اس دنیوی زندگی سے خوش اور اس پر مطمئن ہیں اور وہ جو ہماری آیات سے بے پرواہ ہیں، یہ وہ ہیں جن کا ٹھکانہ دوزخ میں ہیں ان اعمال کی سزائیں جو وہ کرتے تھے۔‘

ہم سے ملنے کی امید نہیں ہے، یعنی اس دنیا کے بعد کسی اور دوحیات کے جسے آخرت کہتے ہیں، وہ قائل نہیں ہیں۔^[۲] چونکہ دنیا میں جو حالات انسان کو پیش آتے ہیں اکثر اسباب طبعیہ کی طرف یا کسی انسان کی طرف منسوب ہوتے ہیں لیکن آخرت کی تمام منازل وہ ہیں جن میں اللہ کے سوا کوئی دوسرا سبب کار فرما ہو ہی نہیں سکتا، اس لئے ان منازل کے پیش آنے کو مجازاً قرآن میں لقائے الہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔^[۳]

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُم بِأَيْمَانِهِمْ ۖ تَجْرِي مِنْ

تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِي جَنَّةِ النَّعِيمِ ۙ دَعْوُهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ

فِيهَا سَلَامٌ ۖ وَأَخْرَجَهُمْ مِنْهَا اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ۝

’یقیناً وہ کہ جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال کئے، انہیں ان کا پروردگار ان کے ایمان کی بدولت منزل مقصود تک پہنچائے گا۔ ان کے زیر قدم نہریں رواں ہوں گی، آرام والے بہشت کے باغوں میں، وہاں ان کی صدا یہی ہوگی کہ پاک ہے تیری ذات اے اللہ اور آپس کی ملاقات کے وقت ان کی دعا سلام کے ساتھ ہوگی اور آخر میں ان کی آواز ہوگی کہ سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔‘

اہل بہشت کا سلام۔ سلام علیکم

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

اؤل عجائب نعمات دیکھ کر کہیں گے پاک ذات یعنی سبحان اللہ، پھر اس کی لذت پا کر کہیں گے الحمد للہ اور جنت میں طور ملاقات یہی ہے، السلام علیک جو دنیا میں مسلمان کرتے ہیں (موضح القرآن)

اب اسے دھاندلی نہ کہیے تو کیا کہیے کہ قرآن کہہ رہا ہے: سلام (بغیر الف لام) اور آپ اس کی شرح میں فرما رہے ہیں السلام علیک

[۱]. خص المثقفين بالذکر لما كانوا هم المنتفعين دون غيرهم (تبیان)

[۲]. لقاء بالبعث (جلالین)

[۳]. لاق ملاقاتاً ما لا یقدر علیه الا الله بحسن ان یجعل لقاء الله تعظیماً لشانته (تبیان)

(السلام بڑھا کر) جس کی عادت آپ کو ہے، یہ آخر کیوں؟

یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ اہل جنت کا آپس کا سلام ’سلام علیکم‘ ہی ہے جو دنیا میں مومنین کرتے ہیں۔

وَلَوْ يَعِجَلُ اللَّهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتَعَجَلَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ إِلَيْهِمْ أَجْلُهُمْ ۗ

فَنَذَرَ الَّذِينَ لَا يَرِجُونَ لِقَاءَنَا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ۝۱۱

’اور یہ لوگ جھلائی حاصل کرنے کے لئے جتنی جلدی کرتے ہیں، اتنی جلد اگر اللہ ان کے واسطے خرابی لے آئے تو ان کی عمر کا خاتمہ ہی ہو جائے مگر ہم تو چھوڑے ہوئے ہیں ان لوگوں کو جو ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے کہ وہ اپنی سرکشی کے اندر اندھادھند مبتلا رہیں۔‘

انسان کوئی اچھا کام کرتا ہے تو چاہتا ہے کہ اس کے خوش گوار نتائج جلد سے جلد اس کے سامنے آجائیں خالق فرماتا ہے کہ اسی طرح اگر ان کے برے کاموں کے جو خراب نتائج ہیں، ان کے سامنے لانے میں اللہ یونہی جلد بازی سے کام لے تو کیا ہو؟ لیکن اللہ ایسا نہیں کرتا، تحمل سے کام لیتا ہے اور انہیں ڈھیل دیتا ہے کہ وہ خوب کھیل کھیل لیں، پھر آخر میں ان کو جس سخت ترین سزا کے وہ مستحق ہیں، وہ دی جائے گی۔

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا ۖ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ

ضُرَّهُ مَرَّ كَأَنْ لَّمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرِّ مَسَّهُ ۗ كَذَلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا

يَعْمَلُونَ ۝۱۲

’اور آدمی پر جب مصیبت پڑتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے کروٹ کے بل یا بیٹھے یا کھڑے (جس عالم میں بھی ہو) اس کے بعد جب ہم اس کی مصیبت دور کر دیتے ہیں تو وہ ایسا چلتا ہوتا ہے جیسے کہ کسی مصیبت میں جو اس پر پڑی ہو، اس نے ہمیں پکارا ہی نہ تھا، اسی طرح حد سے تجاوز کرنے والوں کے لئے آراستہ ہوا وہ طر عمل جو وہ اختیار کئے ہوئے تھے۔‘

ظاہر ہے کہ صریحی کافروں اور اللہ کے منکروں کا ذکر نہیں ہے بلکہ ان کا ہے جو زبان سے خدا کے قائل ہیں لیکن عملی زندگی میں اس کی اطاعت سے بے نیاز ہیں، یہ جب وقت پڑتا ہے تو دیکھتے کیسی منتیں مرادیں مانتے ہیں اور کس طرح خدا سے دعا کرتے ہیں اور جب وقت نکل جاتا ہے تو کس طرح خدا فراموشی میں مبتلا ہو جاتے ہیں یہی جن پر اس آیت میں تنبیہ تازیانہ لگایا گیا ہے۔

وَلَقَدْ أَهَلَكْنَا الْقُرُونَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا ۖ وَجَاءَهُمْ رَسُولُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ

وَمَا كَانُوا الْيُؤْمِنُونَ ۗ كَذَلِكَ نُجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ۝۱۳

’اور ہم نے تمہارے پہلے بہت نسلوں کو ختم کر دیا جب کہ انہوں نے ظلم سے کام لیا اور ان کے پاس ان کے پیغمبر مجزے لے کر آئے اور وہ کسی طرح ایمان لانے والے نہ تھے، یونہی سزا دیتے ہیں ہم مجرم لوگوں کو۔‘

”قرن“ یوں تو زمانہ کی ایک خاص مدت کا نام ہے مگر یہاں پر ہر زمانہ کے وہ لوگ مراد ہیں جو اس کے بعد والے زمانہ میں افسانہ ماضی بن جاتے ہیں اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے۔^[۱]

ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلِيفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ﴿۱۴﴾

”پھر ان کے بعد ہم نے تمہیں روئے زمین پر ان کی جگہ پیدا کیا تاکہ ہم دیکھیں تم کیسے اعمال کرتے ہو“۔

یعنی اگر تم نے بھی ویسا ہی ظلم و ستم کیا جیسا کہ وہ کر چکے تھے تو تمہیں بھی اسی انجام کا منتظر رہنا چاہیے جو ان کا ہوا۔^[۲]

**وَإِذَا تَنَلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ ۖ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا إِنَّا بُرْهَانَ
غَيْرِ هَذَا أَوْ بَدِّلْهُ ۗ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تَلْقَائِي نَفْسِي ۚ إِنْ أَتَّبِعْ إِلَّا**

مَا يُؤْحَىٰ إِلَيَّ ۚ إِنِّي أَخَافُ أَنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿۱۵﴾

”اور جب ان کے سامنے ہماری آیات جو بہت ہی صاف ہیں پیش ہوتی ہیں تو وہ جنہیں ہم سے ملنے کی امید نہیں ہے، کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی اور قرآن پیش کیجئے یا اس کو بدل دیجئے، کہیے کہ مجھے یہ حق نہیں ہے کہ میں اسے خود اپنی طرف سے بدل دوں، میں تو نہیں بیرونی کرتا مگر اس کی کہ جو میری جانب وحی ہوتی ہے یقیناً میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں، تو میں ڈرتا ہوں ایک بڑے دن کے عذاب سے“۔

ان کے مطالبہ میں جو دو لفظ ہیں: ’اس کے علاوہ کوئی اور قرآن پیش کیجئے یا اس کو بدل دیجئے‘ اس کا مطلب ہمارے ذہن میں جو پہلی دفعہ آتا ہے وہ یہ ہے کہ ’اس کے علاوہ‘ پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک دوسری کتاب پیش کیجئے۔ جو بنیادی طور پر اس کتاب سے الگ ہو اور بدل دیجئے کا مطلب یہ ہے کہ کتاب اپنے ڈھانچے کے لحاظ سے تو یہی رہے مگر اس کی مندرجہ مضامین میں کچھ ردو بدل ہو جائے جو ان کے حسب دل خواہ ہو مگر ایک فرق ان دونوں میں یہ کہا گیا ہے کہ اس کے علاوہ دوسرا قرآن پیش کیجئے۔ اس میں تو یہ ہے کہ یہ کتاب بھی چاہے رہے مگر کوئی اور قرآن بھی جو ہمارے لئے قابل قبول ہو، پیش کیجئے اور بدلنے کے یہ معنی ہیں کہ یہ کتاب اٹھا ہی لی جائے اور اس کے بجائے دوسری کتاب آجائے۔^[۳]

مگر مجھے اس تفسیر کے دیکھنے کے بعد بھی پہلا ہی مفہوم درست معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ وہ تو اس قرآن سے اس لئے ناراض ہیں کہ اس میں ان کے خداؤں کی مذمت ہے اور ان کے شرک اور دیگر مزمومات کی رد ہے تو اگر یہ قرآن اسی طرح باقی رہا اور کوئی دوسری کتاب بھی اگر تو اس سے ان کی طبیعت کو پھر بھی خوشی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ چیز تو موجود ہی ہے جو ان کے لئے باعث آزار و تکلیف ہے۔

پھر یہ کہ اس کے ساتھ دوسری کتاب آنے اور اسی میں تبدیلی ہونے میں بنیادی طور پر اتنا فرق ہے کہ اس کے جواب میں رسول کی طرف سے پھر دو باتوں کے کہنے کی ضرورت ہے کہ نہ میرے لئے دوسرا قرآن پیش کرنا ممکن ہے اور نہ اس کا بدلنا ممکن ہے لیکن جواب میں جو کہا گیا

[۱]. القرون الامم (جلالین) سمی اهل كل عصر قرون المقارنه بعضهم لبعض (تبیان)

[۲]. معنا كانكم ان عملتم بالمعاصي مثل ما عمل بها اولئك اهلكم كما اهلك من تقدم (تبیان)

[۳]. انما فرق... لان الايتان بغيره قد يكون معه... وتبديله لا يكون الا برفعه (تبیان)

ہے اس میں تبدیلی ہی کو کہا گیا ہے کہ میرے اختیار میں نہیں ہے یہ ہمارے مفہوم کی بنا پر درست ہے کیونکہ اس صورت میں دونوں شقیں تبدیلی ہی کی حیثیت رکھتی ہیں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں کل کی تبدیلی کا مطالبہ ہے دوسرے میں جز کی تبدیلی کا۔ اس لئے جواب میں مطلق تبدیل کو اپنے اختیار سے باہر کہنے سے دونوں ہی باتوں سے معذوری کا اظہار ہو جاتا ہے۔

**قُلْ لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرَاكُمْ بِهِ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا
مِّن قَبْلِهِ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٦﴾**

”کہیے کہ اگر اللہ کو ایسا منظور ہوتا تو میں اس کو تمہارے سامنے نہ پڑھتا اور نہ وہ تمہیں اس پر مطلع کرتا [۱] کیونکہ اس کے پہلے میں ایک عمر تک تمہارے درمیان رہ چکا ہوں تو کیا تم عقل سے کام نہیں لو گے؟“

قبل بعثت رسول کی خاموشی سے آپ کے پیغام کے الہی ہونے کا ثبوت

انسانی تصورات فطری طور پر تدریجی حیثیت سے نشوونما پاتے ہیں، اگر رسالت کا وہ تصور صحیح ہوتا جو ذہنی ارتقاء اور ماحول وغیرہ کی مناسبیوں پر بنیاد قائم کر کے آج بھی اکثر تعلیم یافتہ حلقوں کے اندر پیش کیا جاتا ہے کہ اس وقت کے سماجی ماحول کے تقاضے سے رسول کا ذہن جو فطری طور پر غیر معمولی حس رکھتا تھا، متاثر ہو کر ان اصلاحات کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ بنام رسالت پیش کیے تو چالیس برس تک آپ کی زبان پروقتاً فوقتاً اس طرح کی گفتگو میں آنا چاہتیں تھیں جو اس ماحول سے بیزاری اور ان امراض کی نشان دہی پر مشتمل جنہیں آپ سماج میں محسوس فرما رہے تھے [۲] مگر چالیس برس تک آپ کی زبان پر اس قسم کا کوئی جملہ نہ آتا [۳] اور پھر ایک دم اس پیغام کو لے کر کھڑے ہو جانا، یہ خود اس کا ثبوت ہے کہ یہ آپ کے ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ خدا کی طرف کا پیغام ہے جس کے آپ حامل بنائے گئے ہیں۔

**فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ
الْمُجْرِمُونَ ﴿١٤﴾**

”تو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگائے یا اس کی آیات کو جھٹلائے یقیناً جو مجرم ہیں وہ کبھی فلاح و نجات نہیں پاسکتے۔“

قرآنی رواداری کی نمایاں مثال

اس مضمون کی آیات قرآن مجید میں کئی جگہ ہیں اور یہ انتہائی روادار انداز میں فریق مخالف کو اپنے برابر کی سطح پر لا کر دعوتِ تفکر دینا ہے۔ یعنی۔۔۔ سوچو، سمجھو اور غور کرو، جو میں پیش کر رہا ہوں، وہ اگر میری طبع زاد چیز ہو اور میں خدا کی طرف غلط نسبت دے رہا ہوں تو بے

[۱] معنی قولہ ولا ادر اعلکم بہ (تبیان) خیردار نکر دے خدا شمارا بان (شاہ ولی اللہ)

[۲] یعنی اپنی طرف سے بنا تا تو چالیس برس کی عمر میں بناتا یا اس قسم کا خیال رکھتا (موضح القرآن)

[۳] مکتتہ فیکم عمر اسنہین اربعین من قبلہ لا احد شکر شی (جلالین)

شک مجھ سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں لیکن اگر یہ اللہ کا کلام ہے اور تم اس کا انکار کر رہے ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو حقیقۃً اللہ کی آیات ہیں، انہیں تم جھٹلا رہے ہو تو تم سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں، اب خوب سمجھ لو اور غور کر لو کہ ہم میں سے کون ہے جو واقعاً ایسے جرم عظیم کا مرتکب ہے۔^[۱]

یہی حکیمانہ انداز بحث وہ ہے جسے آج غیر اقوام کے سامنے دعوتِ تدبر کے لیے اختیار کیا جاتا ہے تو ایک حلقہ اس میں انکارِ مسلمات یا عقائد کو مشکوک قرار دینے کے پہلو پیدا کرتا ہے لیکن حقیقت میں وہی حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ سبیل رب کی طرف دعوت کا اصل انداز ہے جس کی قرآن نے تعلیم بھی دی ہے اور پیغمبر خدا کا بوجی الہی اسی کے مطابق عمل بھی قرآن میں موجود ہے۔

بے شک بعض مفسرین ہیں جنہوں نے دونوں جزء کو کفار سے متعلق قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اللہ پر جھوٹ باندھنے سے مراد اس کے لیے شریک قرار دینا اور آیات قرآن کو جھٹلانا ہے۔^[۲]

مگر اس صورت میں اِفْتَرَى عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ (یونس۔ ۱۴) اللہ پر جھوٹ افترا کرے اور اس کی آیات کی تکذیب کرے، ہوتا اس لیے کہ ان میں دونوں باتیں جمع تھیں مگر قرآن کے الفاظ یہ ہیں کہ یا تو اس پر جھوٹ افترا کرے اور یا اس کی آیات کو جھٹلائے۔ اس سے پہلے ہی معنی زیادہ صحیح و مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ ط قُلْ أَتَدْبِرُونَ اللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ط سُبْحٰنَهُ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُونَ ١٨

’وہ اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انہیں نقصان پہنچا سکتی ہیں اور نہ انہیں نفع پہنچا سکتی ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے یہاں ہماری سفارش کرنے والے ہیں، کہتے ہیں کہ کیا تم اللہ کو اطلاع دیتے ہو ایک ایسی چیز کی جس کی خود اسے آسمانوں اور زمین میں کوئی خبر نہیں ہے پاک ہے وہ اور بالاتر ہے اس سے کہ جو یہ شریک قرار دیتے ہیں۔‘

علم مطابق واقعہ ہوتا ہے، جب کہ ان کا شریک خدا ہونا خلاف واقعہ ہے تو اللہ کو اس کا علم بھی کہاں ہو سکتا ہے، اللہ کو علم نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس شے کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔^[۳]

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ط وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَقَضَىٰ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ١٩

[۱] لا اجد اذ ظلمت من اختراع كلاما او خبرا ثم اضافه الى الله ويريد به النبي ﷺ نفسه او كان فعل "او كذب بايته" (تبيين) يعني اگر میں بناتا ہوں تو مجھ سا ظالم نہیں اور جو میں سچا ہوں تو جھٹلانے والوں پر یہی بات ہے۔ (موضح القرآن)

[۲] افترا على الله كذا بائبیتہ الشريك اليه (جلالين)

[۳] لما نفي العلم بذلك نفي المعلوم (تبيين) لو كان له شريك لعلمه اذ لا يخفى عليه شئ (جلالين)

”اور نہ تھے لوگ مگر ایک مذہب کے، پھر انہوں نے آپس میں اختلاف کیا اور اگر نہ ہوتی اللہ کی ایک بات جو پہلے سے طے شدہ تھی تو فیصلہ کر دیا جاتا ان کے درمیان ان باتوں میں کہ جن میں ان کے درمیان اختلاف تھا“۔

اس آیت کا مضمون بھی قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے ”سب ایک مذہب کے تھے“ یعنی سب کا اصلی دین اسلام تھا^[۱] یہ اختلاف بعد میں

پیدا ہوا۔

”اگر نہ ہوتی اللہ کی ایک بات جو پہلے سے طے شدہ تھی۔“ یعنی یہ کہ اصل جزا و سزا اعمال کی آخرت میں ہوگی^[۲] تو یہی دنیا میں فیصلہ ہو جاتا یعنی کافروں پر عذاب نازل ہو جاتا اور دنیا میں ایک ہی دین رہ جاتا جو دین حق ہے۔

وَيَقُولُونَ لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ ۖ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ فَانْتَظِرُوا ۗ إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ ﴿۱۰﴾

”اور وہ کہتے ہیں کہ ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اترتی؟ کہہ دیجئے کہ غیب اللہ سے مخصوص ہے تو انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔“

یہ کفار کی دھاندلی تھی کہ آیات و دلائل حقانیت پیش ہونے کے باوجود^[۳] وہ برابر کہے جاتے تھے کہ کوئی نشانی کیوں نہیں اترتی؟ اس کے جواب طرح طرح سے قرآن میں آئے ہیں۔

یہاں جو کہا جا رہا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو نشانیاں آپ لکھیں، تو تم نے مانیں نہیں، اب آگے کوئی نشانی ایسی ہوگی جسے تم بھی مان لو، یہ غیب کی بات ہے، تم بھی انتظار کرو میں بھی انتظار کرتا ہوں۔

وَإِذَا أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِنْ بَعْدِ ضَرَاءٍ مَسَّتْهُمْ إِذًا لَّهُمْ مَكْرُفٍ آيَاتِنَا ۗ قُلِ اللَّهُ أَسْرَعُ مَكْرًا ۗ إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَ ﴿۱۱﴾

”اور جب ہم انسانوں کو رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں کسی تکلیف کے بعد جو ان پر پڑی ہے تو وہ ہماری قدرت کی نشانیوں کے بارے میں اپنی ترکیبیں لڑنے لگتے ہیں، کہہ دیجئے کہ اللہ ترکیب میں زیادہ تیز ہے، بلاشبہ ہمارے نمائندے لکھ رہے ہیں، وہ جو تم ترکیبیں لڑتے ہو۔“

ترکیبیں لڑنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ نعمت الہی کے لئے اعتراف کے تیار نہیں ہوتے بلکہ ایک تو اپنی ذہانتیں صرف کر کے اس کے مادی اسباب تجویز کرنے لگتے ہیں اور پھر اس نعمت الہی کے استعمال کے ایسے طریقے نکالتے ہیں جو مرضی الہی کے خلاف ہیں، یہ دونوں کفران نعمت

[۱] علی دین واحد هو الاسلام من لدن آدم ﷺ الی نوح ﷺ (جلالین)

[۲] بتا خیر الجزاء الی یوم القیامة (جلالین) من انه لا یعاجل العصاة بالعقوبة (تبیان)

[۳] قد کان اتاهم بالمعجزات التي تدل علی صندته (تبیان)

کی صورتیں ہیں۔^[۱]

”اللہ ترکیب میں زیادہ تیز ہے“ یعنی اسباب بھی تو اسی کے قبضہ میں ہیں۔ وہ چاہے تو اسباب راحت کے بجائے پھر فوراً اسباب زحمت

پیدا کر دے۔^[۲]

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ط حَتَّىٰ إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلِكِ ۖ وَجَرَيْنَ بِهِمْ
بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ
وَظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ ۗ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۗ لَئِنِ أَجَبْنَا مَنْ
هَذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴿۳۱﴾ فَلَمَّا أَجَسُّوهُمُ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ
الْحَقِّ ط يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغَيْكُمُ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ ۗ مَتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۗ ثُمَّ
إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۳۲﴾

’وہ وہ ہے جو تمہیں خشکی اور تری میں سفر کراتا ہے، یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں سوار ہوئے اور وہ چلیں ان
(مسافروں) کو لے کر موافق ہوا کے ساتھ اور وہ اس سے خوش ہوئے تو آگئی ان پر تیز جھکڑ کی ہوا اور آگئیں ان پر
لہریں ہر طرف سے اور انہوں نے سمجھا کہ وہ گھر گئے ہیں تو وہ پکارنے لگے اللہ کو خالص اس سے لو لگاتے ہوئے^[۳]
اگر تو ہم کو اس سے چھٹکارا دے دے تو ضرور ہم شکر گزار ہوں گے۔ اس کے بعد جب اس نے انہیں چھٹکارا دے
دیا تو ایک دم وہ دنیا میں ناحق بغاوت کرنے لگے اے لوگو! تمہاری بغاوت سے نقصان خود تمہارا ہی ہے۔ اس
دنیوی زندگی سے فائدہ اٹھا لو، پھر ہماری ہی طرف تمہارا پلٹنا ہے تو ہم تمہیں بتائیں گے جو تم اعمال کرتے تھے۔

گزشتہ آیت میں انسان کا رویہ جو مجملاً بیان ہوا تھا، اس کی یہاں تمثیلی طور پر تفصیل ہے۔“^[۴]

إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ
مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ ط حَتَّىٰ إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ
وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَدِرُونَ عَلَيْهِهَا ۗ لَآتِيهَا أَمْرٌ نَالِيًّا ۗ أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَاهَا حَصِيدًا

[۱]۔ یعنی سختی کے وقت آدمی کی نظر اسباب سے اٹھ کر اللہ پر رہتی ہے جب کام بن گیا، لگا اسباب پر کھنے (موضح القرآن)

[۲]۔ ڈرتا نہیں کہ اللہ پھر ایک سبب کھڑا کر دے اسی تکلیف کا (موضح القرآن)

[۳]۔ مخلصین لہ الدین الدعاء (جلالین)

[۴]۔ خدا تعالیٰ بیان ہی فرمایا کہ کیفیت مکر و کفر ان نعمت (فتح الرحمن)

كَأَن لَّمْ تَعْنِ بِالْأَمْسِ ط كَذَلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿٢٦﴾

”ذبیوی زندگی کی مثال تو بس اس پانی کی سی ہے جسے ہم نے آسمان سے اتارا تو اس کے سبب سے مل جل کر پیدا ہوئیں زمین سے اگنے والی چیزیں جنہیں انسان ومویشی کھاتے ہیں، یہاں تک کہ جب زمین زیب وزینت کو لے چکی اور وہ سنورگئی اور اس کے باشندے سمجھنے لگے کہ انہیں اس پر قابو حاصل ہے تو آگیا اس پر ہمارا حکم رات یادن کو تو ہم نے اس کو کٹا پھٹا بنا دیا ایسا جیسے کہ کل اس کا وجود ہی نہ تھا، اس طرح تفصیل کے ساتھ ہم آیات پیش کرتے ہیں ان کے لیے جو غور و فکر سے کام لیں۔“

وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى دَارِ السَّلَامِ ط وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿٢٧﴾

”اور اللہ بلاتا ہے سلامتی کے گھر کی طرف اور جسے چاہتا ہے سیدھے راستے پر لگاتا ہے۔“

”سلامتی“ کے گھر ”یعنی بہشت کی طرف“^[1] یہ دعوت اس کی سب سے پہلی اور یہ اس کا بلاناوہ ہدایت عام ہے جس کے ذریعہ سے تمام حجت ہوتی ہے، اس کا سب کے لیے ہونا ضروری ہے۔ اب جن میں طلب خیر کا جذبہ ظاہر ہوتا ہے اس کی توفیقات خاص شامل حال ہوتے ہیں، انہیں کہا گیا ہے کہ ”جسے چاہتا ہے، سیدھے راستے پر لگاتا ہے۔“

لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَى وَزِيَادَةٌ ط وَلَا يَزَهُقُ وُجُوهُهُمْ قَتْرٌ وَلَا ذِلَّةٌ ط أُولَئِكَ

أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ه هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٨﴾ وَالَّذِينَ كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ

بِمِثْلِهَا ه وَتَرَهُقُهُمْ ذِلَّةٌ ط مَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ ه كَأَمَّا أُغْشِيَتْ

وُجُوهُهُمْ قِطْعًا مِّنَ اللَّيْلِ مُظْلِمًا ط أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ه هُمْ فِيهَا

خَالِدُونَ ﴿٢٩﴾

”جنہوں نے نیک کام کیے ہوں، ان کو ویسا ہی نیک بدلہ ملے گا اور کچھ بڑھ کر اور نہیں چھائے گی ان کے چہروں پر سیاہی اور نہ ذلت وحقارت یہ جنت والے ہیں کہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جنہوں نے برے اعمال کیے تو انہیں برائی کی سزا ملے گی، ان پر ذلت وحقارت چھائی ہوئی ہوگی، اللہ سے ان کو بچانے والا کوئی نہیں ہے، گویا ان کے چہروں کو ڈھانپ دیا گیا ہوگا اندھیری رات کے ٹکڑوں سے، یہ دوزخ والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“

”نیک کاموں“ کے بدلے میں ”ویسا ہی“ کہا گیا پھر کہا گیا ”کچھ بڑھ کر“ کیوں کہ جزا کا بڑھ کر دینا تفضل ہونے کی بنا پر مستحسن ہے

[1]. یعنی الجنة (علی بن ابراہیم)

لیکن برے کاموں میں بس اتنی ہی کا اعلان ہے کیوں کہ سزا کا بڑھ کر دنیا ظلم ہے جو عدل الہی کے خلاف ہے۔^[۱]
علمائے اہل سنت جو دیدار کے قائل ہیں، انہوں نے اس سے اپنا مطلب عجیب طرح نکالا ہے کہ جنہوں نے نیک کام کیے ان کے لیے
حسنی ہے یعنی جنت اور زیادتی ہے یعنی دیدار الہی^[۲] مگر اس صورت میں اس کے بالمقابل بد اعمالوں کے لیے بھی ہونا چاہیے کہ ان کے لیے ویسی
ہی سزا ہے اور وہ دوزخ ہے اور اس پر زیادتی اور وہ دیدار سے محرومی مگر ایسا نہیں کہا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر جو تصریحات موجود ہیں، ان کے پیش نظر یہاں جو جزا کے لیے "الحسنى و
زیادة" کہا گیا اور سزا کے لیے جو "جَزَاءٌ سَيِّئَةٍ مِّمِثْلَهَا" کہا گیا ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ وہی چیز ہے جو دوسرے مقامات پر دوسرے
الفاظ میں کہے گئے ہیں۔ مثلاً مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا ۗ وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى إِلَّا مِثْلَهَا ۗ جُونِک کام کرے،
اسے دس گنا ملے گا اور جو برا کام کرے، اسے بس اتنی ہی سزا ملے گی۔^[۳] (انعام ۱۶۰)

اب یہاں جلالین یا ان کے پہلے صحیح مسلم کی راوی صاحب کیا کہیں گے؟ ایک جزا سے مراد لیں جنت اور پھر نو عدد کی جو زیادتی ہے،
اسے کیا نو بار دیدار کے معنی میں لیں گے؟ اور پھر ایک جگہ جو راہ خدا میں خیرات کی جزا بتائی گئی ہے:

كَمْثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَعَابِلٍ فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِائَةٌ حَبَّةٍ ۗ
مثل اس دانہ کے جس سے سات بالیاں اگیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ (بقرہ ۲۶۱)

اور پھر: وَاللَّهُ يُضْعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ ۗ اللَّهُ جَسَّهٖ چاہتا ہے اور بڑھا کر دیتا ہے، اسے کیا کہا جائے گا؟ دیدار کا شوق بھی اتنا کیا کہ قرآن
کے ہر لفظ سے بلاوجہ دیدار ہی کا خواب نظر آئے۔

ہاں الحسنى و زیادة کا ایک اور مفہوم ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر میں وارد ہے جس کے قبول کرنے میں کوئی خرابی نہیں۔ وہ یہ ہے کہ
الحسنى سے مراد تو ایمان و عمل کی اصل جزا ہے جس کا آخرت سے تعلق ہے اور وہ بہشت ہے اور "زیادة" سے مراد یہ ہے کہ اس جزا کے علاوہ دنیا
میں انہیں جو نعمتیں عطا ہوتی ہیں، وہ اس پر مزید ہیں یہ نہیں ہے کہ یہ دنیا کی نعمتیں ان کے آخرت کے ثواب میں سے مجرا کر لی جائیں۔^[۴]

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنْتُمْ
وَأَشْرِكَاؤُكُمْ ۗ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَاءُهُمْ مَا كُنْتُمْ إِلَّا نَا تَعْبُدُونَ ﴿۲۸﴾

[۱]. لان الزيادة على قدر المستحق من العقاب ظلم وليس كذلك الزيادة على قدر المستحق من الثواب لان ذلك تفضل يحسن
تعلبه ابتداءً (تبیان)

[۲]. الحسنى الجنة و زیادة هي النظر اليه تعالى كما حديث في مسلم (جلالین)

[۳]. معناه ان لهم زیادة الفضل على قدر المستحق على طاها تبهم من الثواب وهي المضاعفة المذکورة في قوله: فله عشر امثالها
(تبیان)

[۴]. فاما الحسنى فالجنة و اما الزيادة فالدنیا ما اعطاهم الله في الدنيا لم يحاسبهم به في الاخرة و يجمع ثواب الدنيا و الاخرة (علی بن
ابراہیم)

فَكَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغْفِيلِينَ ﴿٢٩﴾ هُنَالِكَ تَبْلُوا كُلُّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ وَرُدُّوْا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمْ الْحَقِّ وَصَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٣٠﴾

”اور جس دن ہم ان سب کو محشور کریں گے، پھر کہیں گے ان سے جنہوں نے شرک کیا تھا، رہو اپنی جگہ ﴿٢٩﴾ تم اور تمہارے بنائے ہوئے شریک، تو ہم تفرقہ ڈال دیں گے ان کے درمیان اور ان کے بنائے ہوئے شریک کہیں گے کہ تم ہماری عبادت نہیں کرتے تھے۔ اچھا تو اللہ ہمارے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے کہ ہم تمہاری عبادت سے بے خبر تھے۔ یہ وہ موقع ہوگا کہ جب ہر ایک نتیجہ دیکھ لے گا ﴿٢٩﴾ اس کا جو وہ پہلے کر چکا ہے اور سب پلٹائے گئے ہوں گے اللہ کی طرف جو ان کا حقیقی مالک ہے ﴿٣٠﴾ اور غائب ہو جائے گا ان سے جو وہ جھوٹ تہمت لگاتے تھے۔“

”تفرقہ ڈال دیں گے ان کے درمیان“ سیاق اور سباق کے لحاظ سے یہ ضمیر مشرکین اور ان کے بنائے ہوئے شرکاء کی طرف راجع معلوم ہوتی ہے۔ یعنی آج ان کا باہمی ایک ختم ہو جائے گا اور ہر ایک شرک کے جرم کو دوسرے پر ڈال کے خود الگ ہونا چاہیے گا ﴿٢٩﴾ لیکن ایک مفہوم کے لحاظ سے جو مجھے الفاظ آیت سے دور معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ضمیر مشرکین اور مومنین کی طرف راجع ہے کہ ان میں امتیاز اس دن نمایاں ہو جائے گا۔ ﴿٥﴾

قُلْ مَنْ يَّرِزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ۗ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ ۗ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿٣١﴾ قَدْ لَكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ الْحَقُّ ۗ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ ۗ فَأَنَّى تُصْرَفُونَ ﴿٣٢﴾

”کہیے کہ کون تمہیں روزی دیتا ہے آسمان اور زمین سے یا کون ہے جو سننے کی طاقت اور نگاہوں کا مالک ہے؟ اور کون نکالتا ہے جاندار کو بے جان سے اور نکالتا ہے بے جان کو جاندار سے اور کون کائنات کا انتظام کرتا ہے؟ اس پر وہ کہیں گے کہ اللہ، کہئے کہ پھر تم بچاؤ کا خیال کیوں نہیں کرتے؟ تو یہی تو تمہارا حقیقی پروردگار ہے تو کیا ہے حق کو

[١]. مکانکم نصب بالزمو مقدر (جلالین)

[٢]. دریایدھر شخصی (شاکہ ولی اللہ)

[٣]. مالک حقیقی ایشان (شاکہ ولی اللہ) مالک اپنے حق کے (شاکہ فریح الدین)

[٤]. المعنی فرقنا بین المشرکین باللہ وما اشرکوا به (تجیان)

[٥]. میزنابینہم و بین المومنین کہا فی آیة: وامتازوا الیومہا ایہا المعجز موم (جلالین)

چھوڑنے کے بعد سوا گمراہی کے تو کیسے تم مڑے چلے جا رہے ہو“۔^[۱]
 ”سننے کی طاقت اور نگاہوں کا مالک ہے“ یعنی کون انسان کو یہ نعمتیں عطا کر سکتا ہے اور پھر ان طاقتوں کا کام کرتے رہنا بھی اسی کے اختیار سے وابستہ ہے۔^[۲]

جاندار کو بے جان سے اور بے جان کو جاندار سے نکالنے کی مثال بتائی گئی ہے کہ حیوان کو برآمد کرتا ہے نطفہ سے اور پھر نطفہ کو حیوان سے۔^[۳]

كَذٰلِكَ حَقَّقَتْ كَلِمَاتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْا اَنْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۴﴾

”اسی طرح تمہارے پروردگار کی بات سچ ہوئی ان لوگوں پر جو بد اعمال ہیں کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔“

ان کی بد عملی، اعراض اور عناد کا تقاضا تھا جس کی بنا پر خالق نے اعلان فرمایا تھا کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے، وہی نتیجہ آخر میں سامنے آ گیا، نہ یہ کہ خدا کا یہ اعلان کر دینا اس نتیجے کے وقوع کا باعث ہوا تا کہ اس کی ذمہ داری خالق پر عائد ہو۔
 سواد اعظم کے علماء اس منزل جبر و اختیار میں ہمیشہ گولگو میں رہے ہیں، اس لیے ان کی تحریروں میں دو رنگی سی نظر آتی ہے چنانچہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:-

”یعنی اللہ نے ازل سے ان کی قسمت میں یقین نہیں لکھا اور سب اس کا بے حکمی“ (موضح القرآن)

آخر الفاظ سے ظاہر ہے کہ خالق کے فیصلہ کا سبب ان کی بے حکمی یعنی مخالفت احکام الہی ہے۔ نہ یہ کہ ان کی بے حکمی کا سبب خالق کا فیصلہ ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”پروردگار کی بات“ سے مراد عذاب کرنے کا فیصلہ ہو۔ اس صورت میں ”انہم لا یؤمنون“ کا ترجمہ ہوگا ”اس لیے کہ وہ ایمان اختیار نہیں کرتے۔“^[۴]

قُلْ هَلْ مِنْ شَرِّكُمْ مَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ط قُلِ اللّٰهُ يَّهْدِيْٓ لِلْحَقِّ ط اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَنْ يُتَّبَعَ اَمْ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمْ اَنْ يُّهْدَى ؕ فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۵﴾

”کہیے تمہارے والے شریکوں میں سے کیا کوئی ہے ایسا جو کائنات کو پہلے پہلے پیدا کرتا ہو، پھر اسے دوبارہ زندہ کرتا ہو، کہیے کہ اللہ وہ ہے جو کائنات کو پہلے پہلے پیدا بھی کرتا ہے اور اسے دوبارہ زندہ بھی کرے گا، تو تم کس طرح

[۱]. کیف تصر فون عن الایمان مع قیام الدلیل (جلالین)

[۲]. ان شاء اللہ اصحها وان شاء امرضاها (تبیان)

[۳]. حیوان دا از نطفہ از حیوان (فتح الرحمن)

[۴]. التقدير بأبهم ولا أبهم لا يؤمنون (تبیان)

منحرف ہوتے ہو؟ [۱] کہیے کہ کیا تمہارے والے شریکوں میں سے کوئی ہے جو حق کی طرف رہ نمائی کرتا ہو؟ کہیے کہ اللہ حق کی طرف رہ نمائی کرتا ہے؟ کہیے کہ اللہ حق کی طرف رہ نمائی کرتا ہے تو کیا جو حق کی طرف رہ نمائی کرے، وہ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود اس وقت تک راستا نہ پائے جب تک کہ اسے راستہ دکھایا نہ جائے، تو تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیسے فیصلے کرتے ہو؟

ابتدائے آفرینش سے جتنے انبیاء آئے سب خدائے واحد کی طرف دعوت دیتے رہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ رہ نمائی خلاق کا نظام اسی ایک ذات کا قائم کیا ہوا ہے جسے ”اللہ“ کہتے ہیں، کوئی دوسرا واقعی خدا ہوتا تو اس کا بھی کوئی ولی کبھی آتا مگر جب ہدایت خلق ایک ہی کی طرف سے ہو رہی ہے تو ماننا پڑے گا کہ وہ خدائے واحد ایک اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

یہی وہ استدلال ہے جسے حضرت علی بن ابی طالب ؓ نے اپنے اس وصیت نامہ میں جو امام حسن ؓ کے نام ہے ان الفاظ میں پیش فرمایا ہے:

لَوْ كَانَ لِوَلِيِّكَ شَرِيكَ لَاتْتَعَكَ رُسُلُهُ. وَلَرَأَيْتَ اَثَارَ مُلْكِهِ وَسُلْطَانِهِ.

اگر تمہارے پروردگار کا کوئی شریک ہوتا تو اس کے بھی رسول آتے اور اس کی سلطنت و حکمت کے بھی آثار تمہیں دکھائی دیتے۔
(نوح البلاغ شائع کردہ احباب پبلشرز لکھنؤ ۷۷۵)

وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ

عَلِيمٌ مِّمَّا يَفْعَلُونَ ﴿۳۶﴾

’اور ان میں سے زیادہ تر ایسے ہیں جو نہیں پیروی کرتے مگر ایک طرح کے گمان کی، بلاشبہ گمان حق تک پہنچنے میں کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ یقیناً اللہ جانتا ہے ان کاموں کو جو تم کرتے ہو۔‘

حجیت ظن کی بحث میں ارشاد الہی اور اس کا انعقاد

’حجیت ظن‘ کی بحث میں یہ آیت اس کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہے کہ ظن یعنی گمان غالب شرعاً معتبر نہیں ہے مگر یہ قابل لحاظ بات ہے کہ یہ آیت مشرکین کے بارے میں آتی ہے جو اپنا معبود اصنام کو صرف توہمات باطل کی بنا پر بنائے ہوئے ہیں انہیں کہا گیا ہے کہ ان کے پاس کوئی علمی سند نہیں ہے صرف خیال اور گمان ہے جس کی یہ پیروی کر رہے ہیں۔ یہ اصول دین کا باب ہے اور اصول دین میں کوئی بھی ظن کو معتبر قرار نہیں دیتا۔ حجیت ظن کی بحث جو ہے وہ مسائل شرعیہ کے باب میں ہے اس بناء پر اس آیت سے اس بحث میں استدلال قابل نظر ہے۔

لیکن کہا جاسکتا ہے کہ آغاز آیت یعنی وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا اس کا تعلق اگرچہ خاص مشرکین کے ساتھ ہے مگر بعد کا فقرہ:

إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا

یقیناً گمان حق تک پہنچنے میں کوئی فائدہ نہیں دیتا۔

[۱] تصر فون عن عبادتہ مع قیام الدلیل (جلالین)

یہ ایک عام اصول کے طور پر دین و شریعت کے ہر شعبہ پر حاوی ہے اس لئے لُحْلُ وِرواد اصول دین سے متعلق سہی مگر اس کلیہ کے دائرہ میں احکام و مسائل شرع بھی داخل ہو جاتے ہیں اور اس سے استدلال ہر مقام پر درست قرار پاتا ہے، اس لئے بعض مفسرین اہل سنت کو جو اس آیت کے ہوتے ہوئے بھی ظن پر عمل کی گنجائش باقی رکھنا چاہتے ہیں اس کی تفسیر میں قید لگانا پڑی ہے:

لَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا قِيمًا الْمَطْلُوبُ مِنْهُ الْعِلْمُ (جلالین)
 بلاشبہ گمان حق تک پہنچنے میں کچھ فائدہ نہیں دیتا، ان چیزوں میں کہ جن میں یقین مطلوب ہے۔
 حالانکہ حکمت آیت تو عام ہے یہ قید اس میں کچھ بلا وجہی معلوم ہوتی ہے۔

بے شک کسی خاص طریق ظنی کو جب شارع مقدس نے مستند قرار دے دیا ہے، اپنے نظام حکیمانہ کی بناء پر جو مصالح عمومی یا خصوصی پر مبنی ہوتا ہے تو پھر اس ظن پر عمل حقیقۃً ظن پر عمل ہے ہی نہیں بلکہ اس دلیل علمی پر عمل ہے جو اس ظن کے معتبر ہونے کی متقاضی ہے لہذا ایسے ظن کے مطابق عمل اس آیت کی رو سے ممنوع نہیں ہو سکتا۔ [۱]

وَمَا كَانَ هَذَا الْقُرْآنُ أَنْ يُفْتَرَىٰ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ

يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۳۵﴾

”یہ قرآن ایسا نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے غلط بنا دیا گیا ہو بلکہ وہ تو تصدیق ہے اس کی جو اس کے پہلے ہے اور قانون الہی کی تفصیل ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے، تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے۔“

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۗ قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ وَادْعُوا مَنِ اسْتَدْعَيْتُمْ مِّنْ

دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۳۶﴾ بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعَلَمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ

تَأْوِيلُهُ ۗ كَذَلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

الظَّالِمِينَ ﴿۳۷﴾

”کیا وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اس کو گھڑ لیا ہے؟ کہیے کہ پھر لے آؤ ایک سورہ اس کے مثل اور بلا جو جس کو بلا سکو اللہ کے علاوہ، اگر تم سچے ہو، بلکہ انہوں نے جھٹلایا اسے جس کے علم پر وہ حاوی نہیں ہیں اور جس کی حقیقت ابھی ان کے سامنے نہیں آئی، اسی طرح جھٹلاتے رہے وہ جو ان کے پہلے تھے تو دیکھو کیا ہوا انجام ان ظالموں کا۔“
 یہ انسان کی کوتاہ اندیشی ہے کہ جسے پورے طور پر سمجھنا نہیں، اس کا انکار کرتا ہے اور پھر اس میں جلد بازی کا دخل ہوتا ہے کہ حقیقت ابھی سامنے نہیں آئی تو انکار کر دیا۔

[۱]. انما تعبد الله في الشرع في مواضع بالرجوع الى الظن... لما في ذلك من المصلحة (تبیان)

شاہ ولی اللہ نے لہمایا ہم تاویلہ کا ترجمہ کیا ہے:

وہنوز نیامدہ است مصداق وعدہ و

اور ابھی وہ جس پر اس کا وعدہ منطبق ہوتا ہے آیا نہیں ہے۔

ان کے صاحبزادے شاہ عبد القادر نے بطور شرع لکھا ہے:

”اس کی حقیقت نہیں آئی یعنی جو وعدہ ہے اس قرآن میں، وہ ابھی ظاہر نہیں ہوا ہے“ (موضح القرآن)

اس کے بعد کیا قابل فسوس بات نہیں ہے یہ کہ اس امت کا ایک طبقہ بھی یہی کر رہا ہے کہ مہدی منتظر کے وعدہ کا مصداق چونکہ ابھی تک

سامنے نہیں آیا، اس لئے وہ بجائے انتظار کے انکار پر آمادہ ہو گیا ہے۔ ہماری تفسیر بتاتی ہے کہ یہ آیت رجعت ہی کے بارے میں ہے۔^[۱]

وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهِ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَا يُوْمِنُ بِهِ ۗ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۵۰﴾

وَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ لِيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۗ اَنْتُمْ بَرِيْءُونَ مِمَّا اَعْمَلُ وَاَنَا

بَرِيْءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۱﴾

”اور ان میں ایسے بھی ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو ان پر ایمان نہیں لاتے اور تمہارا پروردگار

خوب جاننے والا ہے فسادیوں کا اور اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو کہیے کہ میرے لئے میرے اعمال ہیں اور تمہارے

لئے تمہارے اعمال، تم بے تعلق ہو اس سے جو میں کرتا ہوں اور میں بے سروکار ہو اس سے جو تم کرتے ہو“۔

یہ رواد ارنا انداز تبلیغ ہے جو دوسرے کو اگر وہ عناد و انکار پر بالکل تلا ہوا نہ ہو، اپنے موقف پر غور کرنے کے لئے مجبور کر سکتا ہے۔^[۲]

”بے سروکار“ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے افعال کی ذمہ داری مجھ پر نہ ہوگی جسے دوسرے مقام پر یوں کہا گیا ہے کہ

لَا تُوْرُوْا زُرًا وَّزُرُوْا اٰخَرٰى

کوئی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔

اس میں کوئی حکم شرعی ایسا نہیں ہے جس میں اختلاف اوقات سے تبدیلی پیش آنے کا امکان ہو۔ مگر بعض مفسرین بلاوجہ لکھ رہے ہیں کہ

یہ آیت احکام جہاد آنے کے بعد منسوخ ہوگی۔^[۳]

در اصل یہ بعض قدیم مفسرین اہل سنت کا قول ہے مگر نظر تحقیق سے اس آیت کا جو مطلب نکلتا ہے اور جو درج ہوا، اس میں جیسا کہ ہم نے

[۱]. نزلت فی الرجعة (علی بن ابراہیم)

[۲]. لعن یقول النبی ﷺ هذا القول شکافیا یجازی اللہ الکفار و المؤمنین بہ من الشواب و العقاب و انما قال علی وجہ التلطف لخصمه و حسن العشر تو ان یتقبلہم لہما یکرہونہ من الخطاب فر بما کان داعیا لہم ذلک الی الانقیاد و النظر الی قولہ (تبیان)

[۳]. هذا منسوخ بآیة السیف (جلالین)

لکھا، نسخ کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔^[۱]

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ ۖ أَفَأَنْتَ تَسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوا لَا يَعْقِلُونَ ﴿۳۲﴾

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَنْظُرُ إِلَيْكَ ۖ أَفَأَنْتَ تَهْدِي الْعُمْىَ وَلَوْ كَانُوا لَا يُبْصِرُونَ ﴿۳۳﴾

’اور ان میں کچھ تو وہ ہیں جو آپ کی باتیں توجہ سے سنتے ہیں مگر کیا آپ بہروں کو بھی سنا دیں گے؟ چاہے وہ عقل سے کام نہ لیتے ہوں اور ان میں کچھ وہ ہیں جو آپ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں مگر کیا آپ اندھوں کو بھی راستا دکھا دیجئے گا؟ چاہے وہ دیکھیں نہ۔‘

پیغمبرؐ کو تسلیٰ مختلف اندازوں سے دی گئی ہے ان میں سے ایک انداز یہاں ہے مطلب یہ ہے کہ جو توجہ سے سنتے ہیں، آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہیں وہ متاثر بھی ہوتے ہیں اور ایمان قبول کرتے ہیں مگر جو آنکھیں ہوتے ہوئے اندھے بنے رہیں اور کان رکھتے ہوئے بہرے رہیں، ان کے لئے آپ کیوں اس فکر میں رہتے ہیں کہ ان کی ہدایت ضرور ہو جائے، جب وہ اندھے بہرے ہیں تو آپ کے لئے ممکن ہی کب ہے کہ آپ انہیں صدائے حق سنا دیں اور راہ حق دکھا دیں۔

اس تشریح کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ جو توجہ سے سنتے ہیں وہ اور ہیں اور جنہیں بہرا کہا گیا ہے وہ دوسرے ہیں جو توجہ سے نہیں سنتے، اسی طرح جو نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں وہ اور ہیں اور جنہیں اندھا کہا گیا، وہ دوسرے ہیں جو نظر اٹھا کر دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔ یہ تشریح بالکل اس کے قبل کی آیت کے بھی مطابق ہے کہ:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يُؤْمِنُ بِهِ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَا يُؤْمِنُ بِهِ ۗ
ان میں سے کچھ ایمان لاتے ہیں اور کچھ ایمان نہیں لاتے۔

وہ جو ایمان لاتے ہیں وہ وہی ہیں جنہیں کہا گیا ہے کہ وہ توجہ سے سنتے ہیں آپ کی باتیں اور نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں آپ کی طرف اور اسی بنا پر وہ ایمان لے آتے ہیں اور وہ جو ایمان نہیں لاتے وہ، وہ ہیں جنہیں بہرا اور اندھا کہا گیا ہے اور جو عقل سے کام نہیں لیتے اور دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے، ان کے ایمان لانے کا بظاہر کوئی امکان بھی نہیں۔

اس میں بظاہر تو کوئی پیچیدگی نہیں ہے مگر شاہ عبدالقادر صاحب نے خواہ مخواہ اس کی تشریح میں جبر کا پہلو پیدا فرما دیا ہے وہ توجہ سے سنتے والوں ہی کو بہرا اور نظر اٹھا کر دیکھنے والوں ہی کو اندھا قرار دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

’یعنی کان رکھتے ہیں یا نگاہ کرتے ہیں اس توقع میں کہ ہمارے دل پر تصرف کر دیں جیسا بعضوں پر ہو گیا، سو یہ بات اللہ کے ہاتھ میں ہے‘ (موضح القرآن)

اب یہ جماعت بے چاری کتنی مستحق ہمدردی ہوگئی اور اب روز قیامت خالق کا اسے کفر و عدیم ایمان کی سزا دینا معاذ اللہ کتنا بڑا ظلم ہو جاتا ہے؟ سُبْحٰنَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُقُولُونَ عَلُّوْا كَبِيْرًا ﴿الاسراء: ۳۳﴾

[۱] قال ابن زيد هذه الآية منسوخة بآية الجهاد على ما قلنا لا يمتنع الى ذلك (تبيان)

حالانکہ اس کے بعد بلافاصلہ وہ آیت آتی ہے جس میں خالق اپنے سے ظلم کی نفی کر رہا ہے۔ ایک دوسری طرح سے بھی دونوں فقروں کو ایک ہی جماعت سے متعلق کیا گیا ہے ایسے انداز میں کہ جبر لازم نہیں آتا۔ اور وہ یہ ہے کہ کافروں میں کچھ ایسے ہیں جو بڑے غور سے آپ کی باتیں سنتے ہیں مگر یہ فیض حاصل کرنے کی خاطر نہیں ہوتا بلکہ نکتہ چینی کے پہلو تلاش کرنے کے لئے لہذا ایسا ان کا سننا نیت کے خراب ہونے کی وجہ سے مثل نہ سننے کے ہے اور اس بنا پر کہا گیا ہے کہ یہ بہروں کی طرح ہیں اور ان میں سے کچھ آپ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں مگر فائدہ حاصل کرنے کے لئے نہیں لہذا ان کا دیکھنا نہ دیکھنے کے برابر ہے اور اس دیکھنے کے باوجود اندھے ہیں جنہیں ہدایت نصیب نہیں ہو سکتی۔^[۱]

اس میں ویسا ہی مخدو تو کوئی نہیں ہے جیسا پہلی تشریح میں ہے مگر اس تشریح کی یہ کڑی کہ یہ سننا نکتہ چینی کی خاطر ہے اور دیکھنا بغیر استفادہ کی نیت کے ہے الفاظ قرآن سے سمجھ میں نہیں آتے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَكِنَّ النَّاسَ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۳۷﴾

’یقیناً اللہ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا مگر لوگ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔‘

اب یہاں عبدالقادر صاحب بھی ایک دم پلٹا کھا گئے، فرماتے ہیں:

’یعنی بعضوں کے دل میں اثر نہیں دیتا، سوان کی تفسیر ہے کہ دل صاف کر کے نہیں سنتے‘۔ (موضح القرآن)

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَن لَّمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ ۗ قَدْ

خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ وَ مَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿۳۸﴾

’اور جس دن ہم انہیں قیامت میں اٹھائیں گے، ایسا معلوم ہوگا کہ وہ نہیں رہے اس عالم میں مگر دن کے تھوڑے حصہ میں، آپس میں ایک دوسرے کو پہچان رہے ہوں گے اس وقت گھائے میں ہیں وہ جو اللہ سے ملنے کو غلط کہتے تھے اور وہ صبح راستے پر نہ تھے۔‘

دوسری جگہ قرآن میں ہے کہ اس دن ایک دوسرے کو پہچانتا نہ ہوگا مگر یہ دونوں باتیں درست ہیں، قبروں سے اٹھائے جانے کے بعد فطری طور پر تو ایک دوسرے کو پہچان رہے ہوں گے مگر پھر ہول محشر وہ ہوگا کہ جس سے بدحواسی اور نفسا نفسی کا عالم ہو جائے گا اور اب جیسے کہ کوئی دوسرے کو پہچانتا ہی نہ ہوگا۔^[۲]

وَأَمَّا تُرِبَّتِكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيْتَنَا فَالْيَنَّا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللَّهُ

[۱] كانوا ا يطلبون السمع الرد لا للفهم... فهم اذا سمعوه على هذا الوجه كانوا ختم لهم يسمعوه... ثم قال: افانت تبهدي

العمى... اي نظرهم اليك لا على وجه الاستفاد من منزلة نظر الاعمى الذي لا يبصر (تبیان)

[۲] يعرف بعضهم بعضا اذا بعثوا ثم ينقطع التعارف لشدة الاحوال (جلالین)

شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ ﴿٣٦﴾

”اور خواہ ہم آپ کو آنکھوں سے دکھادیں کچھ وہ باتیں جن کا ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں یا آپ کو پہلے ہی دنیا سے اٹھالیں، بہر صورت ان کی رجوع ہماری ہی طرف ہوتی ہے پھر اللہ گواہ ہے اس پر جو یہ کرتے تھے۔“
یعنی آخر میں اسلام غالب آکر رہے گا اور دوسری تمام جماعتیں مضمحل ہو کر رہیں گی اب اگر ابھی تک یہ بات پورے طور پر نظر نہ آتی ہو اور یقیناً نظر نہیں آتی تو ایمان بالقرآن کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے لئے آئندہ وقت کا انتظار کیا جائے کیونکہ یہ محتمم غلبہ کا اعلان ہے ایسا وقتی غلبہ نہیں جو ہوا کے جھونکوں کی طرح سامنے آئے اور پھر ختم ہو جائے۔ اس لئے شاہ عبدالقادر صاحب نے یہاں بلاوجہ اپنے منظور نظر صحابہ کی مدح کا جو پہلو پیدا کیا ہے کہ:

”غلبہ اسلام کچھ حضرت کے روبرو ہوا اور باقی ان کے خلفاء سے (موضح القرآن) یہ درست نہیں ہے۔“

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا

يُظْلَمُونَ ﴿٣٧﴾

”اور ہر قوم کے لئے ایک پیغمبر ہوتا ہے تو جب ان کا پیغمبر آجاتا ہے تو ان کے درمیان عدالت کے ساتھ فیصلہ ہو جاتا ہے اور ان پر ظلم نہیں ہوتا۔“
اس کا مطلب یہ ہے کہ خالق کی طرف سے رہنما کے آئے بغیر اتمام حجت نہیں ہوتا اس لئے سزا کا استحقاق پیدا نہیں ہو سکتا مگر جب خالق کی طرف کارہ نما آجاتا ہے تو اب جو مخالفت کرتے ہیں انہیں سزا کا استحقاق ہوتا ہے اور ظلم لازم نہیں آتا۔
شاہ عبدالقادر صاحب نے کچھ عجیب سا لکھا ہے کہ:
عمل آگے سے ہوتے ہیں لیکن رسول کے پہنچنے سے سزا ملتی ہے (موضح القرآن)
اس کا مطلب واضح طور پر سمجھ میں نہیں آتا۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَذَا الْوَعْدِٰنِ إِن كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٣٨﴾ قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا

وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ ۗ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۖ إِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ

سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٣٩﴾

”اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو؟ کہہ دیجئے کہ میں خود اپنے لئے نہ کسی نقصان پر قبضہ رکھتا ہوں اور نہ کسی نفع پر مگر جو اللہ چاہے، ہر قوم کی ایک عمر ہوتی ہے جب ان کی عمر پوری ہو جاتی ہے تو ذرا دیر نہ پیچھے ہٹتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔“

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَتٰكُمْ عَذَابُهُ بَيٰتًا أَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ

الْمُجْرِمُونَ ۝۵۱ اَتَمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اَمْنُكُمْ بِهِ ط اَلَّنَّ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ ۝۵۱
 ثُمَّ قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ
 تَكْسِبُونَ ۝۵۲ وَيَسْتَنْبِئُونَكَ اَحَقُّ هُوَ ۚ قُلْ اِنِّى وَرِىِّ اِنَّهُ لَحَقُّ ۚ وَمَا اَنْتُمْ
 بِمُعْجِزِينَ ۝۵۳

”کہیے کہ کیا تم نے غور کیا ہے کہ اگر تم پر اس کا عذاب رات کے وقت یا دن کو آجائے تو وہ کیا چیز ہوگی جس کی گنہگار لوگ جلدی کر رہے ہیں؟ کیا اس کے بعد جب وہ آجائے گا تو تم ایمان لاؤ گے؟ کیا اب! حالانکہ اس کی تم جلدی کر رہے تھے۔ پھر کہا جائے گا ان سے جو ظالم تھے کہ چکھو ہمیشہ ہمیشہ کا عذاب، کیا تمہیں سزا مل رہی ہے سو اس کے کہ جو تم اعمال کرتے تھے؟ اور وہ آپ سے دریافت کر رہے ہیں کہ کیا یہ سچ ہے؟ کہیے کہ ہاں خدا کی قسم وہ ضرور سچ ہے اور تم بے بس نہیں بنا سکتے۔“

یعنی اللہ جب تمہیں سزا دینے کے لئے اپنی گرفت میں لائے تو تم بھاگ کر اس کے قبضے سے نکل نہیں سکتے کہ وہ بے بس ہو جائے۔^[۱]

وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِى الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهِ ط وَاَسْرُ وَاالنَّدَامَةَ لَمَّا

رَاوَا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِىَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝۵۴

”اور اگر ہر اس شخص کی ملک میں جو ظالم ہے، وہ سب ہو جو روئے زمین پر ہے تو وہ معاوضہ میں دے دے اور وہ دل میں چھپائے ہوئے ہوں گے پشیمانی جب کہ عذاب کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں گے اور ان کے درمیان فیصلہ ہوا ہوگا، عدالت کے ساتھ^[۲] اور ان پر ظلم نہیں ہو رہا ہوگا۔“

پشیمانی کا دل میں چھپانا، اس انسان کی نفسیاتی کیفیت کا اظہار ہے کہ وہ پشیمان ہوتا بھی ہے تو کوشش یہی کرتا ہے کہ لوگوں پر اس کا اظہار نہ ہوتا کہ کسی دوسرے کو طعن و تشنیع کا موقع نہ ملے اس کے لئے حدیث نبوی بھی نقل ہوئی ہے اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی روایت آئی ہے۔^[۳]

اَلَا اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط اَلَا اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنْ اَكْثَرُهُمْ لَا

[۱] ای لستم تقدرون على اعجاز الله عما يريد من انزال العذاب بكم (تبیان)

[۲] بالقسط بالعدل (جلالین)

[۳] روى انه قيل لرسول الله ما يعنيتهم اسرار الندامة وهم في النار قال يكرهون شماتة الاعداء وروى مثله عن ابى عبد الله عليه السلام (تبیان) عن جابر ابن عيسى رواه عن ابى عبد الله عليه السلام قال قيل له ما ينفعهم اسرار الندامة وهم في العذاب قال كرهوا شماتة الاعداء (على بن ابراهيم)

يَعْلَمُونَ ﴿٥٥﴾ هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَالْيَهُ تَرَجَعُونَ ﴿٥٦﴾

”معلوم ہونا چاہیے کہ بلاشبہ اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، آگاہ ہو کہ بلاشبہ اللہ کا وعدہ سچا ہے مگر ان میں کے زیادہ نادانی میں مبتلا ہیں۔ وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اسی کی طرف تم کو پلٹنا ہے۔“

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَ تَكُمْ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ ۖ
وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿٥٤﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَلِكَ فَلْيَفْرَحُوا ۗ

هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ﴿٥٦﴾

”اے انسانو! تمہارے پاس آیا ہے وعظ و نصیحت کا مجموعہ تمہارے پروردگار کی طرف سے اور سینوں کے اندر کی بیماریوں کا علاج اور رہنمائی اور رحمت ایمان لانے والوں کے لئے کہیے کہ یہ اللہ ہی کی طرف کے فضل و کرم سے ہے تو اس پر تو انہیں خوش ہونا چاہیے، وہ بہتر ہے اس دولت سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔“

موعظہ، و شفاء و ہدایت و رحمت، یہ سب اوصاف جن کا پہلی آیت میں ذکر ہے، قرآن مجید اور شریعت محمدیہ سے متعلق ہیں۔^[۱]

قُلْ أَرَأَيْتُمْ مَّا أَنْزَلَ اللَّهُ لَكُمْ مِّن رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَحَلَالًا ۗ قُلْ اللَّهُ

أَذِنَ لَكُمْ أَمْ عَلَى اللَّهِ تَفْتَرُونَ ﴿٥٩﴾

”کہیے کہ کیا تم نے غور کیا ہے کہ جو اللہ نے تمہارے لئے روزی کا سامان پیدا کیا ہے تو تم نے اس میں حرام اور حلال خود قرار دے لئے ہیں، کہیے کہ کیا اللہ نے تمہیں حکم دیا تھا یا تم اللہ پر غلط تہمت لگاتے ہو؟“

بغیر ثبوت شرعی کسی چیز کو حرام سمجھنا اللہ پر بہتان ہے اور کفران نعمت بھی ہے

چاہے یہ آیت نازل ہوئی ہو اہل کتاب کے بارے میں کہ انہوں نے دل بخواہ کچھ چیزوں کو حلال اور کچھ کو حرام قرار دے لیا تھا۔^[۲] مگر اس سے یہ عام اصول بھی مستفاد ہوتا ہے کہ حرام اور حلال کے احکام کو خالق کی جانب سے ہونا چاہیے کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے دل سے کچھ چیزوں کو حلال اور کچھ چیزوں کو حرام قرار دے لے، اگر ایسا کرے گا تو وہ خالق پر ایک افتراء و بہتان کی حیثیت رکھے گا، اسی لئے جناب شیخ مرتضیٰ انصاری رحمہ اللہ نے اس آیت کو اس کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ جب تک خالق کی طرف سے کوئی حکم اس کے مقرر کردہ ذرائع سے ثابت نہ ہو صرف گمان پر حکم لگانا حرام و ناجائز ہے۔

وَمَا ظَنُّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ

[۱]۔ یريد بذلك القرآن ما أتى به النبي من الشريعة (تبیان)

[۲]۔ هو ما أحله و حرّمه اهل الكتاب (علی بن ابراہیم)

عَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٦٦﴾

’اور کیا ہے گمان ان کا جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں قیامت کے دن اور بلاشبہ اللہ لوگوں پر بڑے فضل و کرم والا ہے مگر زیادہ تر لوگ شکرگزاری نہیں کرتے۔‘

کیا ہے گمان؟ یعنی قیامت کے دن جو جزا و سزا کا دن ہے ان کا گمان چیز ہی کیا ہے؟ اس کی وقعت ہی کیا ہے؟ وہاں ان کے گمان پر تو فیصلہ نہیں ہوگا۔

دوسرے معنی یہ قرار دیے گئے ہیں کہ ان کا روز قیامت کے متعلق کیا گمان ہے یعنی خدا ان کے ساتھ کیا سلوک کرے گا، اس بارے میں ان کا کیا تصور ہے؟ [۱]

آخری الفاظ بتاتے ہیں کہ اللہ نے انسانی رزق کے لئے جو چیزیں پیدا کی ہیں، ان میں سے کچھ کو بلاوجہ حرام قرار دے لینا کفرانِ نعمت کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس سے ہمارے اخباری اصحاب کو بھی ہوشیار ہونے کی ضرورت ہے، جنہوں نے حالت شک میں احتیاط اسی میں سمجھی ہے کہ اس شے کو حرام سمجھ لیا جائے، حالانکہ قرآن مجید پتہ دے رہا ہے کہ اس سے کفرانِ نعمت کی زد میں آنے کا خطرہ ہے۔

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا

عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ ۗ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي

الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ﴿٦٧﴾

’اور نہیں ہوتے آپ کسی حالت میں اور نہ اس کی طرف کی کوئی چیز آپ پڑھتے ہیں اور نہ تم لوگ کوئی کام کرتے ہو مگر تمہارے اوپر حاضر و ناظر ہوتے ہیں جب تم اس میں بڑے انہماک کے ساتھ مصروف ہوتے ہو [۲] اور تمہارے پروردگار سے کوئی ذرہ بھر چیز پوشیدہ نہیں رہتی زمین میں نہ آسمان میں اور نہ اس سے چھوٹی اور بڑی مگر یہ کہ وہ ایک واضح نوشتہ میں موجود ہے۔‘

یعنی لوح محفوظ میں جو علم الہی کی خزانہ دار ہے [۳] یہ اللہ کے حاضر و ناظر ہونے کا تصور ہی سب سے بڑا خوف الہی کا معیار ہے جو اصلاح نفوس کے واسطے اور بے راہ روی سے روکنے کے لئے کافی ہے مگر جو گناہگار ہیں ان پر ان کا اثر مرتب نہیں ہوتا اور اثر پذیر اس سے سب سے زیادہ

[۱]. لمعنى اى شئ يظن الذى يكلفون على الله انه يصيبهم يوم القيامة على افتراءهم على الله اى لا ينبغى ان يظنوا ان يصيبهم على ذلك العذاب والعقاب (تبيان)

[۲]. فالافاضة الدخول فى العمل على جهة الانصب عليه وهو الانبساط اليه فالعمل ماخوذ من فيض الاناء اذا انصب من جوانيه (تبيان)

[۳]. مبين بين هو اللوح المحفوظ (جلالين)

وہی ہوتے تھے جن کا دامن گناہ سے کبھی آلودہ ہی نہ ہوا تھا۔^[۱]

أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفَ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۳۶﴾ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا
يَتَّقُونَ ﴿۳۷﴾ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۗ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ
اللَّهِ ۗ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۳۸﴾

”آگاہ ہو کہ اللہ کے جو دوست ہیں، ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ انہیں رنج ہوتا ہے جو ایمان لائیں اور پرہیزگار رہیں، ان کے لئے خوش خبری ہے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی اللہ کی باتوں میں تبدیلی نہیں ہوتی، وہ بہت بڑی کامیابی ہے۔“

دنیوی خوف اور رنج پیش آتے ہیں مگر یہ سب عارضی ہوتے ہیں نتیجہ میں ان کے واسطے کامیابی و کامرانی کے سوا کچھ اور نہیں ہے^[۲] جس کی خوشخبری ان کو دنیوی زندگی میں مل جاتی ہے جو پیش آمدہ مشکلات و مصائب کے خوف اور رنج کو خوش گوار بنا دیتی ہے اور یہ خوش خبری قرآن وحدیث کے ان عام اعلانات سے بھی ملتی ہے جو ایمان اور تقویٰ پر گراں قدر اجر و ثواب کے متعلق ہیں اور کبھی خصوصی طور پر خواب وغیرہ کے ذریعہ سے جس کے متعلق اہل سنت کے یہاں بھی حدیث ہے^[۳] اور ہمارے یہاں بھی^[۴] اور آخرت میں اس کے مظاہر و آثار آنکھوں کے سامنے ہوں گے۔

وَلَا يَحْزَنُكَ قَوْلُهُمْ ۗ إِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ۗ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۳۹﴾
”اور ان کی گفتگو آپ کو رنجیدہ نہ کرے، یقیناً عزت تمام کی تمام اللہ کے لئے ہے، وہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا۔“

مشرکین رسول کی شان میں جو توہین آمیز جملے کہتے تھے، ان کے مقابلہ میں رسولؐ تو تسلی دی جا رہی ہے^[۵] کہ ان کی ان باتوں سے آپ کی شان گھٹ تھوڑی سکتی ہے اصل عزت کا مالک اللہ ہے اور جب اس کی طرف سے آپ کو عزت دی گئی ہے تو دنیا میں وہ کون ہے جو آپ کو سبک اور حقیر کر سکے؟

أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ۗ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ شَرَّ كَاٰءٍ ۗ اِنْ يَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۴۰﴾

[۱] کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ إذا قرأ هذه الآية بكى بكاء شديدا (علی بن ابراہیم)

[۲] فی الآخرة (جلالین)

[۳] فسیرت فی حدیث صحیحہ الحاکم بالرؤیا الصالحہ یراها الرجل او تری له (جلالین)

[۴] فی الحیاة الدنیا الرؤیا الحسنہ یراها المؤمن و فی الآخرة عند الموت (علی بن ابراہیم) قال ابو جعفر رضی اللہ عنہ اللبشری فی الدنیا الرویا الصالحہ یراها المؤمن لا تری له (تبیان)

[۵] المراد به تسلیة النبی عن قولهم الذی یؤذونه به (تبیان)

”آگاہ ہونا چاہیے کہ اللہ کے ہیں وہ جو آسمانوں میں ہیں اور وہ جو زمین میں ہیں اور اللہ کو چھوڑ کر شرکاء کی جو دہائی دیتے ہیں وہ کاہے کی پیروی کرتے ہیں؟ وہ نہیں پیروی کرتے کسی چیز کی سوائے گمان کے اور نہیں ہیں وہ سوا اس کے کہ اٹکل بچو باتیں کرتے ہیں؟“

ما یتبع میں جو ”ما“ کا لفظ ہے یہ قافیہ بھی ہو سکتا ہے جس کے بعد معنی یہ ہوں گے کہ جو اللہ کو چھوڑ کر دہائی دیتے ہیں وہ نہیں پیروی کرتے کچھ اور شرکاء کی [۱] وہ نہیں پیروی کرتے کسی چیز کی سوا گمان کے مگر ہمیں یہ قول زیادہ درست معلوم ہوتا ہے کہ ما سوا الیہ ہے جس کی بنا پر وہ ترجمہ ہوا کہ وہ کاہے کی پیروی کرتے ہیں۔ [۲]

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ

لِقَوْمٍ يَسْمَعُونَ ﴿۱۶﴾

”وہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے رات کو قرار دیا، اس لئے کہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو دیکھنے والا، بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو سنتے ہیں۔“

دن خود دیکھنے والا نہیں ہوتا مگر چونکہ دن کو چیزیں دکھائی دینے لگتی ہیں، اس لئے محاورہ عرب میں دن کی صفت ”دیکھنے والا“ قرار پاتی ہے جس کی مثال ایک بہت زیادہ شائع و ذائع محاورہ ہے جو اردو کا بھی تقریباً جز سمجھا جاسکتا ہے ”قائمہ اللیل و صائمہ النهار“ جس کے معنی یہ ہونے کہ ”نماز گزار راتوں والا اور روزہ دار دنوں والا“ ظاہر ہے کہ راتیں نماز گزار اور دن روزہ دار نہیں ہوتے۔ مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص راتوں میں نماز پڑھتا رہتا ہے اور دنوں میں روزہ سے رہا کرتا ہے۔

بس اسی طرح دن کو دیکھنے والا کہا گیا ہے، اس اعتبار سے کہ دن میں چیزیں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ [۳]
مبصر ا کے لفظی ترجمہ میں ”دکھلانے والا“ کہنا درست [۴] نہیں ہے۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهُ ۗ هُوَ الْغَنِيُّ ۗ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ

اِنَّ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا ۗ اَتَقْوِلُوْنَ عَلٰی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۷﴾ قُلْ اِنَّ

الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلٰی اللّٰهِ الْكُذِبُ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸﴾ مَتَاعٌ فِى الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا

[۱] پیروی نمی کنند (شاہ ولی اللہ) نہیں پیروی کرتے وہ (شاہ فریح الدین)

[۲] بچھمٹل ”ما“ فی قولہ ”وما یتبع“ وجہین: احدہما ان تکون بمعنی ای کا نہ قال: وای شئی یتبع الذین یدعون من دون اللہ شرکاء (تبیان)

[۳] جعل النهار مبصر او انما مبصر فیہ (تبیان) اسناد الا بصار الیہ مجاز لانہ مبصر فیہ (جلالین)

[۴] دن کو دکھلانے والا (شاہ فریح الدین)

مَرَجِعُهُمْ ثُمَّ نَذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيدَ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿٤٦﴾

”انہوں نے کہا کہ اللہ نے ایک بیٹا بنایا ہے ^[۱] پاک ہے اس کی ذات، وہ بے نیاز ہے، اس کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، تمہارے پاس کوئی دلیل اس پر نہیں ہے، کیا تم اللہ پر منڈھتے ہو ایسی بات جو تم جانتے نہیں ہو۔ کہہ دیجئے کہ بلاشبہ جو اللہ پر جھوٹ تہمت باندھتے ہیں وہ بہتری حاصل نہیں کریں گے، دنیا میں تھوڑا فائدہ اٹھالیں، پھر ہماری طرف ان کی رجوع ہوگی، پھر ہم ان کو سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے بدلے میں اس کے جو وہ کفر اختیار کرتے تھے۔“

پہلے پارہ کی ایک آیت کے ذیل میں مولانا عبدالماجد ریا بادی کا ایک بیان آچکا ہے کہ نصاریٰ کا ایک فرقہ اس کا قائل ہے کہ مسیح، اللہ کے بیٹے نہیں ہیں مگر اللہ نے ان کو متنبیٰ بنا لیا ہے اور انہیں اپنے کاموں میں شریک کر لیا ہے انہوں نے اِتَّخَذَ کے لفظ سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ قرآن نے اسی فرقہ کی رد کی ہے مگر اس آیت کے ذیل میں ہم نے اس خیال سے اختلاف کیا تھا اور بتایا تھا کہ وہاں رد میں جو الفاظ کہے گئے ہیں وہ حقیقی ابن ہونے کی رد بتلاتے ہیں۔ اس طرح کے متنبیٰ بنائے جانے کی نہیں مگر یہاں آیت میں بعد میں جو الفاظ ہیں ان سے یہ سمجھ میں ضرور آتا ہے کہ یہ اس کا متنبیٰ بنانے کی رد ہے۔

پہلے یہ کہنا کہ هو الغنی یعنی وہ بے نیاز ہے، اس کو دوسرے کی ضرورت نہیں ^[۲] دوسرے یہ کہنا کہ ایسی بات کہتے ہو جس کا کوئی ثبوت نہیں، تم جھوٹ کہتے ہو، ان سب سے ایسا پتہ چلتا ہے کہ یہ وہ ابن حقیقی ہونے کا عقیدہ نہیں ہے جو بالکل محال عقل ہے اور خدا کی ذات کا بے مثال ہونا اس سے مانع ہے بلکہ یہ وہی ابن قرار دینے کا تصور ہے جس کا ایک جز کہ اس نے اپنا شریک قرار دیا ہے، اس کی یہ کہہ کر رد کی گئی ہے کہ اللہ تنہا کیا خدائی کے کام انجام نہیں دے سکتا۔ جو وہ شریک قرار دے اور پھر بیٹا بنانے کی رد یوں کی جارہی ہے کہ اپنا بیٹا قرار دینا، یہ تو اللہ کا عمل ہے کیا اس کی طرف سے تمہارے پاس کوئی پیغام آیا ہے کہ میں نے مسیح کو اپنا بیٹا قرار دیا۔ پھر بلا وجہ اللہ پر تہمت کیوں لگاتے ہو؟!

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يٰقَوْمِ اِنَّ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَقَامِي وَتَذٰكِرِيْٓ اٰلِيٓتِ اللّٰهِ فَعَلٰى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاٰجْمَعُوْا اٰمْرَكُمْ وَشُرَكَاءُكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اٰمْرَكُمْ عَلَيْكُمْ عُمَّةً ثُمَّ اَقْضُوْا اِلٰىّ وَلَا تَنْظُرُوْنَ ﴿٤٧﴾ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اٰجْرٍ اِنْ اٰجِرِيْٓ اِلَّا عَلٰى اللّٰهِ ۗ وَاْمَرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٤٨﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَتَجٰوَزْهُ وَمَنْ مَّعَهُ فِى الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلِيْفَ وَاعْرَفْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِآيٰتِنَا ۗ فَاَنْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿٤٩﴾

[۱]. فرزند گرفتہ است خدا (شاہ ولی اللہ)

[۲]. انما یطلب الولد من یحتاج الیہ (جلالین)

”اور ان کے سامنے نوحؑ کا واقعہ بیان کیجئے کہ جب کہ انہوں نے اپنی قوم والوں سے کہا: اے میری قوم والو! اگر تم پر شاق ہے میرا قیام اور میری نصیحت کرنا آیاتِ الہی کے ساتھ تو میرا تو بھر و سا صرف اللہ پر ہے تو تم اپنے تمام مددگاروں کو ساتھ میں ملا کر اپنی مہم کی تیاری کرو [۱] پھر تمہیں اس میں کوئی تذبذب و تردد بھی نہیں ہونا چاہیے پھر کر گزرو میرے ساتھ جو کرنا ہو اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو، اب اگر تم روگردانی کرتے ہو تو میں نے تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگا ہے میرا معاوضہ نہیں ہے مگر اللہ پر اور میں مامور اس پر ہوں کہ اس کے سامنے سر جھکائے رہوں، اس پر ان لوگوں نے انہیں جھٹلایا تو ہم نے انہیں چھٹکارا دیا اور انہیں کہ جو ان کے ساتھ کشتی میں تھے اور انہیں دوسری جگہ متمسکین کیا، اور غرق کر دیا انہیں کہ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا تو دیکھو کیسا برا انجام ہوا ڈرائے جانے والوں کا“۔

جناب نوح علیہ السلام اور ان کی کشتی اور طوفانِ عذاب کا تذکرہ متفرق طور پر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ہوا ہے یہاں وہ پورا واقعہ بیان نہیں ہوا۔ صرف کشتی اور غرق کا لفظ ہے جو اس پورے واقعہ کی تفصیل کی طرف اجمالی اشارہ کرتا ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِ رُسُلًا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ فَجَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانُوا لِيَوْمِنَا
بِمَا كَذَّبُوا بِهِ مِنْ قَبْلُ ۚ كَذَلِكَ نَطْبَعُ عَلَىٰ قُلُوبِ الْمُعْتَدِينَ ﴿۴۵﴾

”پھر ان کے بعد بہت سے پیغمبران کی قوموں کی طرف ہم نے بھیجے تو وہ ان کے پاس معجزے لے کر آئے [۲] مگر وہ ایمان نہیں لانے والے تھے اسی پر کہ جسے پہلے جھٹلا چکے تھے اس طرح ہم مہر لگا دیتے ہیں ظلم و تعدی کرنے والوں کے دلوں پر“۔

”ان کے بعد“ یعنی نوح کے بعد [۳] بہت سے پیغمبر آئے جیسے حضرت ابراہیم، ہود اور صالح علیہم السلام وغیرہ“۔
”مہر لگا دیتے ہیں ظلم و تعدی کرنے والوں کے دلوں پر“ اس سے ظاہر ہے کہ مہر لگانا یعنی سلب توفیقات الہیہ نتیجہ ہوتا ہے خود اختیاری ظلم و تعدی کا، نہ کہ اس پر مجبور کرنے والا سبب۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُوسَىٰ وَهَارُونَ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ بِآيَاتِنَا
فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ ﴿۴۶﴾ فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا إِنَّ
هَذَا لَسِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿۴۷﴾ قَالَ مُوسَىٰ اتَّقُوا لِيَوْمَ لَآتِيكُمْ لَمَّا جَاءَكُمْ ۗ أَسِحْرٌ هَذَا وَلَا

[۱] یعنی سمجھانے سے برامانتے ہو تو جو کر سکو میرا کر ڈالو (موضح القرآن)

[۲] فاتوہم بالحق والمعجزات الدالة على صدقهم (تبیان)

[۳] من بعدہ ای نوح (جلالین)

يُفْلِحُ السَّحْرُونَ ﴿٤٥﴾

”پھر ہم نے بھیجا ان کے بعد موسیٰؑ اور ہارونؑ کو فرعون اور اس کے یہاں کے بڑے بڑے آدمیوں کی طرف [۱] اپنی نشانیوں کے ساتھ تو انہوں نے تکبر سے کام لیا اور وہ بڑے گنہگار لوگ تھے تو جب ان کے پاس حق آیا ہمارے پاس سے تو انہوں نے کہا یقیناً یہ کھلا ہوا جادو ہے۔ موسیٰ نے کہا کیا تم حق کو ایسا کہتے ہو جب کہ وہ تمہارے پاس آیا، کیا یہ جادو ہے؟ اور جادو گر لوگ کبھی بہتری حاصل نہیں کرتے“۔

اس میں دلیل اعجاز کی طرف بھی اشارہ ہے جس کی تشریح ہم نے ”مقدمہ تفسیر میں کی ہے یعنی اگر یہ جادو ہوتا تو خدا سے باطل کر دیتا اور جب اس کے باطل کرنے کی کوشش کرنے والے ساحر خود ہی شکست کھائیں گے جیسا کہ بعد میں آئے گا تو اس سے سمجھ لینا چاہیے کہ یہ پروردگار کی طرف کا حق ہے۔

قَالُوا أَجِئْتَنَا لِنَلْفِتْنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا وَتَكُونُ لَكُمُ الْكِبْرِيَاءُ فِي
الْأَرْضِ ۗ وَمَا نَحْنُ لَكُمُ بِمُؤْمِنِينَ ﴿٤٥﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُونِي بِكُلِّ سِحْرِ
عَلَيْكُمْ ﴿٤٦﴾ فَلَمَّا جَاءَ السَّحْرُ قَالَ لَهُمْ مُوسَى الْقُوا مَا أَنْتُمْ مُلْقُونَ ﴿٤٧﴾ فَلَمَّا
الْقُوا قَالَ مُوسَى مَا جِئْتُمْ بِهِ السَّحْرُ ۗ إِنَّ اللَّهَ سَابِطُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُصْلِحُ
عَمَلُ الْمُفْسِدِينَ ﴿٤٨﴾ وَيُحِقُّ اللَّهُ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ﴿٤٩﴾

”انہوں نے کہا کہ کیا تم آئے ہو اس لئے کہ ہمیں پھیرو اس سے کہ جس پر ہم نے باپ داداؤں کو پایا ہے اور تمہارے لئے بڑائی ہو اس سرزمین پر [۲] اور ہم تم پر ایمان لانے والے نہیں ہیں اور فرعون نے کہا کہ لاؤ میرے پاس ہر بڑے واقف کار جادو گر کو تو وہ جادو گر آئے تو ان سے موسیٰ نے کہا کہ پھینکو جو تم پھینکنے والے ہو تو جب انہوں نے پھینکا، موسیٰ نے کہا کہ جو تم لائے ہو، وہ جادو ہے یقیناً اللہ اسے باطل کر دے گا، بلاشبہ اللہ ٹھیک نہیں رہنے دیتا کام فساد یوں کا اور اللہ حق کو اپنی باتوں سے ثابت کر دے گا، چاہے گنہگار لوگ ناپسند کریں“۔

مَا جِئْتُمْ بِهِ السَّحْرُ کا ترجمہ ہم نے اسے ایک جملہ قرار دے کر یوں کیا ہے کہ ”جو تم لائے ہو، وہ جادو ہے“ دوسرے مترجمین بھی اس سے متفق ہیں [۳] مگر ایک تشریح کی بنا پر اس جملہ کا ترجمہ یوں ہوتا ہے کہ کیا ہے وہ جو تم لائے ہو؟ وہ تو جادو ہے“ [۴]

[۱]. الملاء الجماعة الذين هم وجوه القبيلة مأخوذ من اءهم تملأ الصدور هبتهم عند منظرهم (تبیان)

[۲]. ارض مصر (جلالین)

[۳]. آنچه آورده اید سحر است (شاه ولی اللہ) جو کچھ لائے ہو تم ساتھ اس کے جادو ہے (شاه فنج الدین)

[۴]. ما استفهامية مبتداء خبره جئتكم به (جلالین)

مذکورہ بالا آیات میں معجزہ کی حقانیت کا عقلی فلسفہ درج ہے جیسا کہ اس کے پہلے ابھی آیت ۷۷ کے ذیل میں ہم نے مجملاً اشارہ کیا ہے وہ اب ان آیات میں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے جس پر مقدمہ تفسیر میں ہم نے ان آیات کو پیش کرتے ہوئے تبصرہ کیا ہے۔

فَمَا أَمَّنَ لِمُوسَىٰ إِلَّا ذُرِّيَّتَهُ مِّنْ قَوْمِهِ عَلَىٰ خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِمْ أَن

يَقْتُلِيَهُمْ ۗ وَإِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْأَرْضِ ۗ وَإِنَّهُ لَمِنَ الْمُسْرِفِينَ ﴿٨٣﴾

”تو نہیں ایمان لائے موسیٰ علیہ السلام پر مگر ان کی قوم کے کچھ بچے فرعون اور ان کے بڑے آدمیوں سے سہمے ہوئے کہ کہیں وہ انہیں سزا نہ دیں اور بلاشبہ فرعون سرکشی کرنے والا تھا روئے زمین پر اور حد سے تجاوز کرنے والوں میں سے تھا“۔

”ان کی قوم“ سے بقرنیہ اتصال و تقدم ذکر سمجھ میں یہی آتا ہے کہ ”موسیٰ کی قوم“، یعنی بنی اسرائیل [۱] لیکن بعض لوگوں نے اس ضمیر کو فرعون کی طرف عائد کیا ہے کہ اس کی بھی قوم کے کچھ بچے ایمان لائے۔ [۲]

وَقَالَ مُوسَىٰ يَقَوْمِ إِن كُنتُمْ مِّنكُمْ بِاللَّهِ فَاعْلَيْهِ تَوَكَّلُوا إِن كُنتُمْ

مُسْلِمِينَ ﴿٨٤﴾ فَقَالُوا عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا ۗ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ

الظَّالِمِينَ ﴿٨٥﴾ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٨٦﴾

”اور موسیٰ نے کہا اے میری قوم والو! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو پھر اسی پر بھروسہ رکھو اگر تم مسلم ہو، اس پر انہوں نے کہا کہ اللہ ہی پر ہم بھروسہ کرتے ہیں، اے ہمارے پروردگار! ہمیں ظالم جماعت کا تختہ مشق نہ بنا اور اپنی رحمت سے ہمیں نجات دے اس کافر جماعت سے“۔

اللہ پر ایمان اس مرکز کا صحیح تصور ہے جو انسان کا ملجا و مآولی ہو سکتا ہے اور ”اسلام“ عملی منزل میں اس کے تقاضے کو پورا کرتا ہے کہ اپنے تمام امور کو اس پر چھوڑ دے پھر کسی بات کی پرواہ نہ رکھے، اسی لئے شروع میں کہا گیا ہے اگر تم ایمان لائے ہو اور آخر میں کہا گیا اگر تم مسلم ہو۔ [۳]

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ وَأَخِيهِ أَن تَبَوَّآ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بَيْوتًا وَاجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ

قِبْلَةً وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٨٧﴾

”اور ہم نے وحی بھیجی موسیٰ اور ان کے بھائی کی طرف کہ جگہ لو اپنی قوم کے لئے مصر کے گھروں میں اور بناؤ اپنے

[۱]. جماعتی از قوم و سے (شاہ ولی اللہ)

[۲]. طائفہ من اولاد قومہ ای فرعون (جلالین)

[۳]. قولہ ”ان کنتم مسلمین“ بعد قولہ ”ان کنتم امنتم باللہ“ لتبیین المعنی بالصفحتین من الاسلام والایمان علی ان الثقة باللہ

توجب الاستعلام لامرہ (تبیان)

گھروں کو قبلہ اور نماز کی پابندی کرو اور خوش خبری دو ایمان والوں کو۔

”گھروں کو قبلہ بناؤ“ اس کے ایک معنی یہ قرار دیئے گئے ہیں کہ گھروں کو قبلہ رخ بناؤ۔^[۱]

حالانکہ یہ ان الفاظ کے معنی نہیں ہوتے ہیں اس کا مطلب ہماری قدیم تفسیر میں یہ درج ہے کہ نماز اپنے گھروں کے اندر ادا کرو^[۲] یعنی راز فاش نہ ہو اور فرعون والوں کے شر سے محفوظ رہو۔

پہلے معنی قرار دینے والے بھی شاید یہی مطلب قرار دیتے ہیں چنانچہ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

”مساجد البیت بناکنند“ (فتح الرحمن)

اپنے گھروں کے (اندر) مساجد بناؤ۔

تفسیر جلالین میں ہے:

مصَلَّى یصلُّون فیہ لیأمنوا من الخوف وکان فرعون منعہم من الصلوة قبلہ یعنی نماز کی جگہ کہ وہیں نماز پڑھیں تاکہ ضرور دشمن سے محفوظ رہیں کیونکہ فرعون انہیں نماز سے روکتا تھا۔ اب دیکھنے کی چیز ہے کہ یہ تفسیر کی تعلیم نہیں تو کیا ہے؟

وَقَالَ مُوسَى رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَآئِهِ زِينَةً وَأَمْوَالًا فِي الْحَيَاةِ
الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَى أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَى
قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا حَتَّى يَرَوْا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴿۸۹﴾ قَالَ قَدْ أُجِيبَتِ
دَعْوَتُكُمْ مَا فَاسْتَقِيمًا وَلَا تَتَّبِعَنَّ سَبِيلَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۹۰﴾

”موسیٰ نے کہا اے ہمارے پروردگار! تو نے فرعون اور اس کے ساتھ کے بڑے آدمیوں کو اس دنیوی زندگی میں زیب و زینت اور بہت اموال دے رکھے ہیں، اے پروردگار! نتیجہ اس کا یہ ہے کہ^[۳] وہ تیرے راستے سے بہکاتے ہیں، اے ہمارے مالک! نیست و نابود کر دے ان کے اموال اور سختی کر ان کے دلوں پر کہ جب تک درد ناک عذاب وہ دیکھ نہ لیں گے ایمان نہیں لائیں گے۔ اس نے کہا کہ تم دونوں کی دعا قبول ہوتی ہے اب تم ذرا ٹھیک رہنا اور ان کے راستوں کی پیروی نہ کرنا جو علم نہیں رکھتے۔“

دعا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی بیان ہوئی ہے ممکن ہے جناب ہارون علیہ السلام نے آمین کہی ہو کیونکہ جواب موسیٰ اور ہارون دونوں کو مخاطب

[۱]. بسا زید آن خانہ ہای خود را قبلہ رو (شاہ ولی اللہ) کرو گھروں اپنوں کو رو بقبلہ (شاہ رفیع الدین)

[۲]. امر و ان یصلوا فی بیوتہم (علی بن ابراہیم)

[۳]. لیضلو ا فی عاقبۃ (جلالین)

کر کے دیا گیا ہے [۱] اور تنبیہ پوری قوم بنی اسرائیل کو ہے کہ اب تمہاری خواہش کے مطابق تمہارا دشمن تباہ تو کیا جاتا ہے مگر کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی کفرانِ نعت کرو اور پھر تم بھی تباہی کے مستحق قرار پاؤ۔

وَجُوزْنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ فَأَتَبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهُ بَغْيًا وَعَدُوًّا ۗ حَتَّىٰ
إِذَا أَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۖ قَالَ آمَنْتُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا الَّذِي آمَنْتُ بِهِ بَنُو إِسْرَائِيلَ
وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿۹۱﴾ أَلَمْ يَكُنْ مِنْ الْمُسْلِمِينَ ﴿۹۲﴾
فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً ۗ وَإِنَّ كَثِيرًا مِنَ النَّاسِ
عَنِ الْآيَاتِ لَغَفْلُونَ ﴿۹۳﴾

”اور ہم نے گزاردیا، بنی اسرائیل کو دریا سے تو پیچھا کیا ان کا [۲] فرعون اور اس کے لشکر والوں نے بغاوت اور ظلم و تعدی سے یہاں تک کہ جب اس کو ڈوبنے کی صورت سامنے آئی تو اس نے کہا میں ایمان لاتا ہوں کہ کوئی خدا نہیں سوا اس ذات کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں مسلمانوں میں سے ہوں، اب؟ حالانکہ اس کے پہلے تو نے نافرمانی کی اور توفساد یوں میں سے تھا۔ اب آج ہم تجھے تیرے جسم کے ساتھ چھنکارا دے دیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لئے قدرت کی نشانی رہے اور لوگوں میں زیادہ ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں سے بے خبر ہیں۔“

پوری قوم کے ڈوبنے کے ساتھ صرف ایک آدمی کی لاش کا محفوظ طریقہ پر نکل کے خشکی پر آجانا [۳] خود ہی ایک غیر فطری بات ہے اور پھر ”بعد والوں کے لئے نشانی“ ہونے کا ذکر بتاتا ہے کہ وہ جسم بعد والی نسلوں کی عبرت کے لئے محفوظ رہے گا۔ اس آیت الہی کا تذکرہ قرآن سے پہلے کی کتب آسمانی کے مجموعہ بائبل میں نہیں ہے اب اسے معجزہ قرآنی نہ سمجھا جائے تو کیا ہے کہ اہرام مصر کی کھدائی میں جولائیں برآمد ہوئی ہیں ان میں اس فرعون کی لاش بھی موجود ہے جو جناب موسیٰ کا ہم عصر تھا اور جو بائبل اور قرآن دونوں کی متفقہ شہادت کے مطابق غرق ہو گیا تھا۔

وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ مَبْوَأً صِدْقٍ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ ۗ فَمَا اخْتَلَفُوا

[۱] انما قال ”اجیببت دعوتکما“ والداعی موسیٰ لان دعاً موسیٰ کان مع تامین ہرون (تبیان)

[۲] اتبعه اتباعاً وتبعه بمعنی (تبیان)

[۳] اما فرعون فنبتہا اللہ وحده فالقہاہ بالساحل لینظر والیہ ولیعرفوہ (علی بن ابراہیم) نلقیک علی نحوۃ من الارض ببیدنک عریانادون روح (تبیان) نخرجک من البحر ببیدنک جدک الذی لاروح فیہ (جلالین) بر مکان بلند افگینم یعنی بروئے آب آریم ترا بہمان جسد تو یعنی بغیر تغیر (شاه ولی اللہ)

حَتَّىٰ جَاءَهُمُ الْعِلْمُ ۗ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ

يُخْتَلِفُونَ ﴿٩٣﴾

”اور ہم نے جگہ دی بنی اسرائیل کو شایان شان مقام پر اور اچھی اچھی نعمت سے انہیں غذادی تو انہوں نے آپس میں اختلاف نہیں کیا، یہاں تک کہ ان کے پاس آیا علم یقیناً تمہارا پروردگار ان کے درمیان فیصلہ کرے گا قیامت کے دن ان باتوں میں جن میں وہ اختلاف کرتے تھے“۔

علم آنے کے پہلے اختلاف پیدا ہوتا تو قابل معافی ہو سکتا تھا لیکن علم آنے اور حجت تمام ہونے کے بعد انہوں نے اختلاف کیا اس لئے روز آخرت کی باز پرس سے بچ نہیں سکتے اور یہ باز پرس ہی غلط کاروں سے وہ فیصلہ قدرت ہے جو قیامت میں ان کے درمیان ہوگا۔

فَإِنْ كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِّمَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ فَسْأَلِ الَّذِينَ يُفَرِّغُونَ الْكِتَابَ مِنْ

قَتْلِكَ ۗ لَقَدْ جَاءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿٩٤﴾ وَلَا تَكُونَنَّ

مِنَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ فَتَكُونُوا مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿٩٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ

كَلِمَاتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٩٦﴾ وَلَوْ جَاءَهُمْ كُلُّ آيَةٍ حَتَّىٰ يَرَوْا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴿٩٧﴾

”تو اگر کوئی شک ہو آپ کو اس میں جو ہم نے آپ پر اتارا ہے تو پوچھ لیجئے ان سے جو کتاب پڑھا کرتے ہیں آپ کے پہلے سے آپ کے پروردگار کی طرف سے حق آ گیا ہے تو نہ ہو جیسے شک کرنے والوں میں سے اور نہ ہو جیسے ان میں سے جنہوں نے آیات الہی کو جھٹلایا اور آپ ہونگے گھانا اٹھانے والوں میں سے، یقیناً وہ کہ جن پر آپ کے پروردگار کی بات پوری ہو کر رہی، وہ ایمان نہیں لائیں گے، چاہے ان کے پاس ہر طرح کا معجزہ آ جائے، جب تک کہ دردناک عذاب کو آنکھوں سے نہ دیکھ لیں“۔

قرآن مجید کا یہ حکیمانہ انداز بیان ہے کہ بہت سی باتیں پیغمبر خدا کو مخاطب بنا کر کہتا ہے اور اس سے تشبیہ دوسروں کی مقصود ہوتی ہے۔

یہاں بھی ایسا ہی ہے۔

نہ آپ کو کوئی شک تھا نہ آپ کو اہل کتاب سے پوچھنے کی ضرورت تھی ﴿٩٤﴾ نہ آپ کے لئے یہ اندیشہ تھا کہ آپ معاذ اللہ جھٹلانے والوں

میں ہوں گے یہ سب باتیں دوسروں سے متعلق ہیں اور یہ راز فاش ہوتا ہے آخر کی آیات سے جب ارشاد ہوا ہے کہ: ”جن پر اللہ کی بات پوری ہو چکی ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے چاہے کتنے ہی معجزے دیکھ لیں، جب تک کہ عذاب کو آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ معلوم ہوا کہ شروع سے سب

[٩٤] روى عنه ﷺ، انه قال: ما شككت والانا ان شك وقال ابو عبد الله ﷺ لم يستأل النبي ﷺ ويقول ان الخطاب متوجه الى النبي ﷺ

والمواد به غير كاي شهد به قوله بعد هذا: يا ايها الناس ان كنتم في شك (تبيين)

باتیں انہی لوگوں کی تشبیہ کے لئے کہی جا رہی تھیں، جب تک عذاب آنکھوں سے نہ دیکھ لیں، یعنی بعد از وقت [۱] اس لئے کہ عذاب سامنے آنے کے بعد توبہ کرنے کی کوئی قیمت نہیں ہے جس کا مشاہدہ اس کے پہلے قصہ فرعون میں ہو چکا۔

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرِيَّةً اَمَّتْ فَنَفَعَهَا اِيْمَانُهَا اِلَّا قَوْمَ يُونُسَ لَمَّا اٰمَنُوْا كَشَفْنَا

عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۙ ۹۸

”تو کیوں نہ کوئی بستی اس وقت ایمان لائی جب کہ اسے اس کا ایمان فائدہ پہنچائے سوائے یونس کی قوم کے جب وہ ایمان لائے تو ہم نے ہٹا دیا ان سے رسوائی والا عذاب اس دنیوی زندگی میں اور فائدہ اٹھانے کا موقع دیا انہیں ایک مدت تک۔“

پہلے کے جملہ میں جو ضمناً ایک نفی نکلتی تھی کہ عذاب کو دیکھنے کے بعد ایمان لانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے یا یہ کہ عذاب کے آثار پیدا ہونے کے بعد بھی کوئی بستی ایسی نہ تھی جو صدق دل سے پوری کی پوری ایمان لے آئی ہو [۲] اس سے استثناء ہوا ہے کہ قوم یونس کا عموماً تو ایسا ہی ہوتا رہا ہے مگر بس ایک مثال اس کی ہے کہ عذاب آنے کے بعد پوری قوم نے صدق دل سے توبہ کر لی اور وہ توبہ قبول ہو گئی۔ جناب یونس کے قصہ کے اجزاء متعدد مقامات پر قرآن میں بکھرے ہوئے ہیں یہاں اتنے جز کا حوالہ دیا گیا ہے جو موضوع کلام سے متعلق ہے۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مِنْ فِى الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۗ اَفَاَنْتَ تُكْرَهُ النَّاسَ حَتّٰى

يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۙ ۹۹

”اور اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو دنیا میں جتنے ہیں، سب ہی ایمان لے آتے تو کیا آپ لوگوں کو مجبور کیجئے گا کہ وہ مومن ہو جائیں؟“

نظام حکمت الہی جبر کا متقاضی نہیں

مطلب یہ ہے کہ خالق کا نظام حکمت جبر کا متقاضی نہیں ہے ورنہ اگر خدا جبر کی طاقت سے کام لینا چاہتا تو کافر کا وجود ہی کہاں رہتا۔ [۳]

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُوْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلٰى الَّذِيْنَ لَا

يَعْقِلُوْنَ ۙ ۱۰۰

[۱]. فلا ینفعہم حیثینذ (جلالین)

[۲]. قال الحسن: معنی الایة انه لحدیکن فیما خلا ان یؤمن اهل قریة باجمعها حتی لا یشذ منہم احدا الا قومه یونس فہلا کانت القرئی کلہا ہکذا (تبیان)

[۳]. یعنی لو شاء اللہ ان یمیر الناس کلہم علی الایمان لقععل (علی بن ابراہیم)

”اور کسی تنفس کے لئے یہ نہیں ہے کہ وہ ایمان لائے مگر اللہ کی مشیت کے مطابق اور اللہ نجاست کا حکم لگا دیتا ہے ان پر جو عقل سے کام نہیں لیتے۔“

یعنی جبری ایمان اللہ کے اصول کے خلاف ہے تو اس طرح سے تو کوئی آدمی مومن قرار بھی نہیں پاسکتا۔ ان کا کام تو یہ ہے کہ عقل سے کام لیں اور آرزو اور ضمیر کے فیصلہ کے مطابق ایمان لائیں اور جو ایسا نہیں کرتے [۱] انہیں اللہ کفار کے زمرہ میں شمار کر کے نجاست کا حکم لگا دیتا ہے اور مورد عذاب بناتا ہے۔ [۲]

قُلِ انظُرُوا مَا ذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَمَا تُغْنِي الْاٰلٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠١﴾ فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الدِّينِ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۗ قُلِ فَاَنْتَظِرُوْا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿١٠٢﴾ ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۗ حَقًّا عَلَيْنَا نَجِجُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٣﴾

”کہیے کہ غور کرو، کیا کیا ہے آسمانوں اور زمین میں؟ اور نشانیاں قدرت کی اور تنبیہات فائدہ نہیں دیتیں ان کو جو ایمان نہیں لاتے۔ تو کیا انتظار کر رہے ہیں وہ سو ایسے دنوں کے جیسے ان لوگوں پر آئے جو ان کے پہلے تھے کہیے کہ اچھا پھر انتظار کرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں، پھر ہم چھٹکارا دیتے ہیں اپنے پیغمبروں کو اور ان کو جو ایمان لائے ہیں، اس طرح ہمارے ذمہ حق ہے [۳] کہ ہم اہل ایمان کو چھٹکارا دیں۔“

ما تغنی الايات والنذر میں اگر ما کو استفہامیہ مانا جائے تو یہ معنی ہوں گے کہ بھلا نشانیاں قدرت کی اور تنبیہات کیا فائدہ دے سکتی ہیں انہیں جو ایمان نہیں لاتے۔ [۴]

مطلب اس کا بھی یہی ہے کہ قدرت کی نشانیاں اور تنبیہات فائدہ نہیں دیتیں جیسا کہ ہم نے ترجمہ کیا ہے۔

قُلِ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَا اَعْبُدُ الدِّينَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفَّكُمُ ۗ وَاْمَرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٤﴾ وَاَنْ اَقُمَّ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيفًا ۗ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٠٥﴾

[۱]. لا يعقلون يتدبرون آيات الله (جلالین)

[۲]. قيل في معناه: قولان احدهما قال الفراء الر جس العذاب.. الثاني قال الحسن الر جس الكفر (تبیان)

[۳]. واجبا علينا (تبیان)

[۴]. قولان: احدهما ان تكون ”ما“ نفيًا والاخر ان تكون بلا استفهام (تبیان)

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَإِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذَا مِنْ

الظَّالِمِينَ ﴿١٥٦﴾

”کہیے کہ اے لوگو! اگر تم میرے دین کی طرف سے کچھ شک و شبہ میں گرفتار ہو تو (صاف سن لو) میں عبادت نہیں کرتا ان کی کہ جن کی اللہ کو چھوڑ کر تم عبادت کرتے ہو بلکہ میں عبادت کرتا ہوں اللہ کی جو تمہاری روح قبض کرتا ہے اور میں مامور ہوں اس پر کہ ایمان لانے والوں میں سے ہوں اور یہ (مجھ سے کہا گیا ہے) کہ تم اپنے چہرہ کو ادھر ادھر سے ہٹا کر اس دین کی طرف سیدھا رکھو اور مشرکوں میں سے نہ ہو اور اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی دہائی نہ دو جو نہ تمہیں نفع پہنچاتی ہیں اور نہ نقصان کہ اگر تم ایسا کرو گے تو یقیناً اس وقت تم ظالموں میں سے ہو گے۔“

وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ ۚ وَإِنْ يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ

لِفَضْلِهِ ۚ يُصِيبُ بِهٖ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۗ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿١٥٧﴾ قُلْ يَا أَيُّهَا

النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۚ

وَمَنْ ضَلَّٰ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۗ وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ ﴿١٥٨﴾ وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ

إِلَيْكَ ۖ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ ۗ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ﴿١٥٩﴾

”اور اگر اللہ تمہیں کوئی نقصان پہنچائے تو سوا اس کے کوئی دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تمہارے ساتھ بھلائی چاہے تو کوئی اس کے فضل و کرم کا پلٹانے والا نہیں، اللہ اسے پہنچاتا ہے اپنے بندوں میں سے جس تک چاہتا ہے اور وہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان، کہہ دیجئے کہ اے لوگو! تمہارے پاس آیا ہے حق تمہارے پروردگار کی طرف سے تو جو ہدایت حاصل کرے گا وہ صرف اپنے لئے ہدایت حاصل کرے گا اور جو گمراہ ہوگا وہ گمراہ ہو کر اپنا ہی نقصان کرے گا اور میں تمہارا کوئی ٹھیکہ دار نہیں ہوں اور پیروی کیجئے اس کی جو آپ پر وحی اتاری کی گئی ہے اور صبر و تحمل سے کام لیجئے جب تک کہ اللہ کی طرف سے فیصلہ ہو اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے“

سُورَةُ هُودٍ

مکیہ ----- آیات

جناب ہود علیہ السلام کا تذکرہ تو اس سورہ کے علاوہ اور سوروں میں بھی ہے اور اس سورہ میں جس طرح جناب ہود علیہ السلام کا ذکر ہے اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام وغیرہ کا بھی ذکر ہے پھر بھی نام اس کا سورہ ہود قرار پایا ہے جس کی خصوصیات کا کوئی سبب ابھی سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ اس کے علاوہ جو خاص امور اس سورہ میں ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

سورہ ہود کے خاص خاص موضوعات:

- ۱..... عطاء منصب بحسب قرنیہ فضیلت
- ۲..... قرآن کے کلام الہی ہونے سے منکر، قوم عرب کے فصحاء وبلغاء سے اس کے مثل دس سوروں کا مطالبہ
- ۳..... طوفان نوح کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ
- ۴..... فرزند نوح کی غرقابی، نوح علیہ السلام کی بارگاہ الہی میں سفارش اور خالق کا جواب
- ۵..... پیغمبر عمل صالح، پیغمبر کی فرزندگی بھی کارگر نہیں۔
- ۶..... کوہ جودی پر کشتی نوح کا ٹھہرنا
- ۷..... قوم لوط پر عذاب لانے والے فرشتوں کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرزند کی بشارت دینا، جناب سارہ کا تعجب اور فرشتوں کا جواب
- ۸..... اوقات نماز میں صبح، ظہرین اور مغربین، تین وقتوں کا تذکرہ وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے“

الرَّتْ كِتَابٌ اُحْكِمَتْ اٰيَتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝۱ اَلَّا تَعْبُدُوْا
اِلَّا اللّٰهَ ۝۲ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ ۝۳ وَاِنْ اِسْتَعْفَرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تَوْبُوْا اِلَيْهِ
يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلَىٰ اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّ يُوْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهُ ۝۴ وَاِنْ
تَوَلَّوْا فَاِنَّىْ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۝۵ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۝۶ وَهُوَ عَلَىٰ

كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٧﴾

”الف۔ لام۔ را۔ وہ کتاب ہے جس کی آیات مضبوط اتاری گئی ہیں پھر یہ کہ انہیں واضح بنایا گیا ہے اس ٹھیک ٹھیک کام کرنے والے کی طرف سے جو بڑا خبر ہے یہ کہ عبادت نہ کرو مگر اللہ کی۔ میں تمہیں اس کی طرف سے متنبہ کرنے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں اور یہ کہ بخشش کے طلبگار ہوا اپنے پروردگار سے، پھر اس کی بارگاہ میں لو لگاؤ، وہ تمہیں بہرہ مند کرے گا جتنے فائدوں سے ایک مقررہ مدت تک اور ہر مرتبہ والے کو اس کے درجہ کے مطابق عطا کرے گا اور اگر تم نے روگردانی کی تو مجھے اندیشہ ہے تمہارے لئے ایک بہت بڑے دن کے عذاب کا۔ اللہ ہی کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

مقطعات قرآنیہ میں ہمارے ایک ہم عصر صاحب نظر نے یہ ریسرچ کی ہے کہ ہر جگہ اس کے بعد پیغمبرؐ سے مخاطب ضرور ہے اور اس سے وہ اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ یہ مختلف القاب کے ساتھ حضرت کو پکارا گیا ہے ہم نے جستجو کے بعد اکثر مقامات پر ہم عصر کی اس تلاش کو صحیح پایا ہے مگر اس سورہ میں ایسا نہیں ہے یہاں ”الر“ کے بعد کوئی لفظ پیغمبرؐ سے مخاطب کے لئے نہیں ہے بلکہ خود آپ کی جانب سے بطور تکلم بیان ہے۔ کتاب کے معنی میں ایک پیغام کا ہونا مضمحل ہے اس لئے یہ کہنے کے بعد کہ یہ کتاب ایسی ہے جو محکم ہے، مفصل ہے، خالق کی طرف سے ہے، اس پیغام کا خلاصہ شروع کر دیا گیا ہے کہ وہ پیغام یہ ہے۔ [۱]

اس میں یہ اعلان کہ ہر مرتبہ والے کو اس کے درجہ کے مطابق وہ عطا کرے گا [۲] بہت دور رس ہے اس سے اس اصول عقلی کی تصدیق ہوتی ہے کہ ترجیح، بلا مرجح اور ترجیح مرجوح دونوں قبیح ہیں اور ان اشخاص کا تصور بالکل غلط ہے جن میں ایک حمد و ثنائے کے باری تعالیٰ میں یہ کہنے کی جرات کر ڈالتا ہے کہ ”قدیم المفضل علی الفاضل“ اسی نے غیر افضل پر مقدم کر دیا ہے۔

أَلَا إِنَّهُمْ يَثْنُونَ صُدُورَهُمْ لِيَسْتَخْفُوا مِنْهُ ۗ أَلَا حِينَ يَسْتَغْشُونَ ثِيَابَهُمْ ۖ

يَعْلَمُ مَا يَسْرُرُونَ ۖ وَمَا يُعْلِنُونَ ۗ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٥﴾

”آگاہ ہو کہ وہ اپنے سینوں کو دہرا کیے دیتے ہیں کہ اس سے چھپنے کی کوشش کریں۔ آگاہ ہو کہ جب وہ اوڑھتے لپیٹتے ہیں اپنے کپڑوں کو تو وہ جانتا ہے اسے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ یقیناً وہ سینہ کے اندر والی باتوں کا جاننے والا ہے۔“

”سینوں کے دہرا کرنے“ کا ذکر دل کے رازوں کو چھپانے کی کوشش کے مجسم صورت میں اظہار کا ایک پیرایہ ہے یہ کوشش ایسی ہے جیسے کہ جھکے جاتے ہیں اپنے سینوں کو دبائے لیتے ہیں، سینوں کو توڑے مروڑے ڈال رہے ہیں کہ اندر کے راز کہیں باہر نکل کر طشت از بام نہ ہو جائیں۔

[۱]۔ باں مضمون کہ پیغامبر گوید عبادت کنید الخ (شاہ ولی اللہ)

[۲]۔ دے گا ہر بڑائی والے کو بڑائی اس کی (شاہ فہج الدین)

شاہ عبدالقادر صاحب نے اس تمثیل کو بطور واقعہ شان نزول کی صورت سے بیان کیا ہے کہ:
 ”کافر لوگ کچھ مخالفت کی بات گھر میں کہتے، اس کا جواب قرآن میں اترتا، سمجھتے کہ کوئی کھڑا سنتا ہے، جا کر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیتا ہے تب سے ایسی بات کہتے تو کپڑا اوڑھ کر، جھک کر، دہرے ہو کر اللہ تعالیٰ نے یہ نازل کیا۔“ (موضح القرآن)
 شاہ ولی اللہ نے اس سے ایک دوسرے معنی پیدا کئے ہیں جو بظاہر بعید ہیں، وہ کہتے ہیں کہ:

می تو ان گفت پیچیدن سینہ عبارت از این است کہ فکر پای ناصواب کند و بشبہات و اہیہ دل خود را اطمینان و ہدو عقائد حقہ را فراموش سازد زیرا آلہ صدور اینجا بمعنی علوم صدر آمدہ (فتح الرحمن)
 کہا جاسکتا ہے کہ سینہ کے دہرا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ نادرست فکریں کرتے ہیں اور کمزور شبہات کے ساتھ اپنے دل کو اطمینان دلاتے ہیں اور صحیح عقائد کو بھول جاتے ہیں کیونکہ سینوں کا لفظ یہاں سینہ کے علوم کے معنی میں آتا ہے۔
 شروع میں کہا جاسکتا ہے ”کہہ کر تو موصوف نے پھر بھی احتیاط سے کام لیا تھا مگر آخر میں کیوں کہ سینوں کا لفظ یہاں سینہ کے علوم کے معنی میں آیا ہے کہہ کے جو مدعا فرمایا ہے اس کے لیے کسی مستحکم ثبوت کی ضرورت ہے ورنہ الفاظ قرآنی اس کے قبول سے انکاری معلوم ہوتے ہیں۔“

وَمَا مِنْ ذَاتٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رُزُقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ط

كُلُّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ⑥

”اور کوئی چلنے پھرنے والا زمین میں نہیں ہے مگر یہ کہ اللہ پر اس کی روزی ہے اور وہ جانتا ہے اس کے قیام کی جگہ اور اس کے ٹھہرائے جانے کے مقام کو۔ ہر بات ایک صاف کھلے ہوئے نوشتہ میں ہے۔“
 صاف کھلے ہوئے نوشتہ سے مراد اس کے پہلے بھی اور یہاں بھی اور شاید اس کے بعد بھی لوح محفوظ ہوا کرتی ہے [۱] اور ان نظیروں سے ایک اور آیت:

وَلَا رَظْفٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ﴿الأنعام: ٥٩﴾
 کوئی خشک و تر ایسا نہیں جو ایک صاف کھلے ہوئے نوشتہ میں نہ ہو۔

اس کا یہ مطلب جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ قرآن میں ہر چیز موجود ہے، مشکوک ہو جاتا ہے مستقر ”قیام کی جگہ“ اور مستودع ”ٹھہرائے جانے کا مقام“ ان دونوں میں فرق یہ محسوس ہوتا ہے کہ مستقر تو مستقل قیام کی جگہ ہے اور ”ٹھہرائے جانے کا مقام“ عارضی قیام کا محل ہے۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”جہاں ٹھہرنا ہے بہشت، دوزخ، جہاں سوچا جاتا ہے اس کی قبر۔“ (موضح القرآن)
 شاہ ولی اللہ نے یہ فرق بتایا ہے کہ:

”مستودع“ جائی است کہ بغیر اختیار او آنجا نگاہ داشتہ باشند مانند صلب و رحم و ”مستقر“ جائی است

[۱]. یعنی اللوح المحفوظ (تبیان) هو اللوح المحفوظ (جلالین) یعنی در لوح نوشتہ شدہ (فتح الرحمن)

کہ باختیار خود می ماند مثل خانہ“ (فتح الرحمن)
 ”مستودع“ وہ جگہ جہاں بلا اس کے اختیار کے اس کو رکھا گیا ہو، جیسے پشت پدر اور شکم مادر اور مستقر وہ جگہ ہے جہاں اپنے اختیار سے رہتا ہے جیسے گھر۔

مگر اس فرق کا دونوں الفاظ کے لغوی معنی میں کوئی اشارہ نہیں ہے۔

تیسرا فرق یہ بتایا گیا ہے کہ:

مستقر ہا مسکنہا فی الدنیا او الصلب و مستودعها بعد الموت او الرحم (جلالین)
 مستقر اس کے رہنے کی جگہ ہے دنیا میں یا صلب پدر میں اور ودیعت رہنے کی جگہ سے مراد موت کے بعد کی جگہ ہے یا شکم مادر میں۔
 اس ایک فرق میں بطور احتمال ایک دوسرا فرق بھی ہے مگر ان میں سے کسی کی بھی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔
 ہمارے یہاں تفسیر علی بن ابراہیم میں ہے:

مستقر ہا حیث یأدی باللیل و مستودعها حیث یموت

مستقر سے مراد وہ جگہ ہے جہاں وہ رات کو قیام کرتا ہے اور مستودع وہ ہے جہاں اس کی موت ہوگی۔

اس کی نسبت اگر معصوم کی طرف ہوتی تو اس کا دینی وزن ہوتا یوں اس کی بھی حیثیت وہی ہے جو دوسرے اقوال کی ہے۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ

لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۗ وَلَئِنْ قُلْتُمْ إِنَّكُمْ مَبْعُوثُونَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ

لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿٤٠﴾

’اور وہی وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا چھ دنوں اور اس کا عرش پانی پر تھا تا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اعمال میں بہتر ہے اور اگر آپ کہیے کہ تم لوگ موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جاؤ گے تو ضرور وہ جو کافر ہیں، کہیں گے کہ یہ تو نہیں ہے مگر کھلا ہوا جادو‘۔

پہلا جز تو متعدد مرتبہ آچکا ہے اس کے بعد خاص جز یہ ہے کہ اس کا عرش پانی پر تھا۔ یعنی آسمان اور زمین کی خلقت کے پہلے، اس سے ظاہر ہے کہ کچھ اسلامی علمائے ریاضی کا یہ تصور کہ عرش قرآن نے آسمان ہفتم یعنی فلک افلاک ہی کو کہا ہے درست نہیں ہے بلکہ قرآن بتا رہا ہے کہ جب آسمان نہ تھے تب بھی عرش تھا۔

وہ ’پانی پر تھا‘ اس سے ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ عرش اس طرح کی جسمانی قسم کی چیز نہیں ہے جسے ہم کسی مادی نوعیت میں محدود کریں بلکہ جلال و جبروت الہی کا بلند ترین مرکز جو کائنات پر حاوی ہے وہی عرش ہے اور اسی سے یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ آسمانوں اور زمین کے پہلے کائنات میں پانی تھا یہ نہج البلاغہ میں جو تخلیق عالم کی کیفیت بیان ہوئی ہے اس کے بالکل مطابق ہے ^[۱] تا کہ تمہیں آزمائے اس کا تعلق کا ہے سے ہے؟ ایک

[۱]. علی المآء و هو علی متن الریح (جلالین)

خیال یہ ہے کہ اس کا متعلق محذوف ہے یعنی آسمان و زمین کی تخلیق کے بعد پھر تمہیں پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمائے [۱] مگر یہ محذوف جزء چونکہ سلسلہ کلام سے سمجھ میں نہیں آتا اس لئے وہ اصول تکلم کے خلاف معلوم ہوتا ہے دوسری تشریح یہ ہے کہ یہ سب چیزیں اس لئے پیدا کی ہیں کہ تمہاری آزمائش کی جائے کہ تم اس سب سے کس طرح صحیح فائدہ اٹھاتے ہو [۲] یہ معنی ظاہر الفاظ سے زیادہ قریب الفہم معلوم ہوتے ہیں۔

وَلِئِنْ أَخَّرْنَا عَنْهُمْ الْعَذَابَ إِلَىٰ أُمَّةٍ مَّعْدُودَةٍ لَّيَقُولَنَّ مَا يَجِبُ سَهْ ط ۖ أَلَا يَوْمَهُ

يَأْتِيهِمْ لَيْسَ مَصْرُوفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ۝۸

”اور اگر ہم ان پر عذاب میں دیر کریں ایک مقررہ مدت تک [۳] تو وہ ضرور یہ کہیں گے کہ کوئی چیز اسے روکے ہوئے ہے؟ آگاہ ہونا چاہیے کہ جس دن وہ ان پر آئے گا تو اسے ان سے ہٹایا نہیں جاسکے گا اور گھبر لے گا نہیں وہی (عذاب) جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے“۔

وَلِئِنْ أَدْقْنَا الْإِنْسَانَ مِثْرَ حِمَّةٍ ثُمَّ نَزَعْنَا مِنْهُ ۖ إِنَّهُ لَيَكْفُرُ ۙ وَلِئِنْ

أَدْقْنَاهُ نَعْمَاءً بَعْدَ ضَرَاءٍ مَّسْتَه لَيَقُولَنَّ ذَهَبَ السَّيِّئَاتُ عَنِّي ط ۖ إِنَّهُ لَفَرِحٌ

فَخُورٌ ۙ إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ط ۖ أُولَٰئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ

كَبِيرٌ ۙ ۝۱۱

”اور اگر ہم انسان کو اپنی طرف سے کچھ رحمت کا مزہ چکھائیں پھر اس سے اسے سلب کر لیں تو وہ بلاشبہ بڑا مایوس اور ناشکر اثابت ہوتا ہے اور اگر اسے کسی نعمت کا مزہ چکھائیں بعد کسی سختی کے جو اسے لائق تھی تو وہ کہے گا کہ بس مصیبتیں مجھ سے دور ہوئیں بلاشبہ وہ خوش ہونے والا ہوگا۔ بڑا ہی فخر کرنے والا، سوائے ان کے جو صبر و تحمل سے کام لیتے ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں ان کے لئے بخشش ہے اور بہت بڑا ثواب ہے“۔

صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ صبر و تحمل سے کام لیتے ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں یہ دونوں ٹکڑے زندگی کے دو مختلف ادوار سے متعلق ہیں، سختی و مصیبت سے متعلق صبر ہے اور جب کشائش، راحت اور آرام ہو تو عیش و عشرت میں مبتلا ہو کر فرائض سے غفلت نہ برتیں، اسے یہاں عملوا الصالحات کی لفظ سے ادا کیا گیا ہے۔ [۴]

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَضَائِقٌ بِهِ صَدْرُكَ أَنْ يَقُولُوا لَوْلَا أُنزِلَ

[۱]. آفریدن شما آنکہ تابیا از ما ید شمارا (شاه ولی اللہ)

[۲]. لیبلو کم متعلق بخلق ای خلقها و فیہا من منافع لکم و مصالح لتخبر کم (جلالین)

[۳]. تا مدّ تے شمرده شده (شاه ولی اللہ) کہا قال: واذکر بعد اتمه ای حین (تبیان)

[۴]. صبروا فی الشدة و عملوا الصالحات فی الرخاء (علی بن ابراہیم)

عَلَيْهِ كُنُزٌ أَوْ جَاءَ مَعَهُ مَلَكٌ ۖ إِنَّمَا أَنْتَ نَذِيرٌ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ﴿١٧﴾

”تو جیسے آپ چھوڑ دیں گے کچھ ان باتوں کو جن کی آپ کی طرف وحی ہوتی ہے اور اس سے آپ کا دم الجھتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ان پر ایک خزانہ کیوں نہیں اتارا گیا یا ان کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا؟ ارے آپ تو بس متنہ کرنے والے ہیں اور اللہ ہر چیز کا ذمہ دار ہے۔“

”جیسے آپ چھوڑ دیں گے“ یعنی آپ کو ان کے کفر عصیان اور بے ہودہ مطالبات سے تکلیف اتنی پہنچتی ہے کہ کوئی اور ہو تو اس کام کو چھوڑ ہی دے جس پر اسے یہ سب سننا پڑتا ہے۔

اور یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ یہ مشرکین ایسا تصور کرتے ہیں کہ ان کا یہ تشدد، یہ زخم زبان اور یہ آزار رسانیاں آپ کو اس راہ سے ہٹا دیں گی [۱] مگر یہ ہونے والی بات نہیں ہے اور یہ حسرت ان کی کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۗ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوْرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرِيَةٍ ۖ وَادْعُوا مَنِ

اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٨﴾

”کیا وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اس کو گھڑ لیا ہے؟ کہیے کہ پھر لے آؤ اس کے مثل دس ہی سورہ گھڑے ہوئے ہیں اور بلا لو جنہیں بلا سکو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔“

دس سوروں کا جواب لانے کا مطالبہ

اس کے پہلے سورہ بقرہ کے تقریباً شروع ہی میں پہلے پارے میں ایک سورہ کے مقابلہ کی دعوت بڑی شدت و قوت کے ساتھ آچکی ہے اور اس اعلان کے ساتھ اگر تم ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو پھر تم کو تیار ہونا چاہیے اس آگ کے لئے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسی جماعت جس کے سامنے ایک سورہ کے پیش کرنے کا مطالبہ پیش ہو چکا ہو اور وہ ناکام ہو چکی ہو، پھر اس کے سامنے دس سوروں کے مثل پیش کرنے کا مطالبہ پیش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس لئے یہ مقام ان بدیہی قرائن میں سے ہے جو اس حقیقت کو ثابت کرتے ہیں کہ ترتیب قرآن مطالبہ تنزیل نہیں ہے اور اس لئے شاہ ولی اللہ صاحب کو بھی حاشیہ میں لکھنا پڑا ہے کہ:

مترجم گوید نخست بدہ سورہ مخدی واقع شد و چون ازاں عاجز شدند بیک سورہ تحدی فرمود (فتح القرآن)

میں کہتا ہوں کہ پہلے دس سوروں کے مقابلہ کی دعوت دی گئی ہے اور جب اس سے عاجز ثابت ہوئے تو ایک سورہ کے مقابلہ کی دعوت دی گئی۔

تفسیر جلالین میں ہے:

[۱] یوہون علیک اذ ہم یریلونک عن بعض ما انت علیہ من امر ربک (تبیان)

تحدی بہا اولاً ثم بسورة۔

پہلے یہ (دس سوروں کے لانے کا) مطالبہ کیا گیا پھر ایک سورہ کا۔

فَالَمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا اَنْمَّا اُنزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ

اَنْتُمْ مُّسْلِمُونَ ﴿۱۳﴾

”تو وہ اگر تمہاری دعوت پر لبیک نہ کہیں تو جان لو کہ وہ بس اللہ کے علم سے اتارا گیا ہے، اور یہ کہ سوا اس کے کوئی

معبود نہیں ہے، تو اب کیا تم اسلام لاؤ گے؟“

”بس اللہ کے علم سے اتارا گیا ہے“ یعنی اگر انسانی ہنر کا نتیجہ ہوتا تو اس مرتبہ فصاحت و بلاغت پر ہوتے ہوئے نصحاء عرب اس کے

مقابلہ سے عاجز نہ ہوتے اور یہ کہ سوا اس کے کوئی معبود نہیں ہے“ یعنی اگر کوئی اور معبود ہوتا جسے مشرکین مانتے ہیں تو وہ اپنے پیروؤں کی اس مہم میں امداد کیوں نہ کرتا؟

اس طرح یہ دلیل اثبات رسالت کے ساتھ اثبات وحدانیت کی بھی کفیل ہوگی۔

”اگر وہ تمہاری دعوت پر لبیک نہ کہیں“ یعنی تم جنہیں اپنے مدد کے لیے بلا تے ہو، وہ تمہاری مدد کے لیے نہ آئیں یہ خطاب انہی مشرکین

سے ہے جنہیں کہا گیا کہ ”بلا لو جنہیں بلا سکو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو“ اسی لیے ہم نے کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ ”تو اب کیا تم اسلام لاؤ گے“ بعض تفاسیر اسی کے مطابق ہیں [۱]۔

ایک دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ خطاب مسلمانوں سے ہو یعنی تم نے جو ان مشرکین کو مقابلہ کی دعوت دی ہے، اگر وہ اس سے عاجز رہیں اور

دس سوروں کے مثل پیش نہ کر سکیں تو تم جان لو یہ یعنی اس ثبوت کے بعد اس حقیقت کا مزید یقین حاصل کر لو۔ اس صورت میں کے معنی ہوں گے کہ اب تمہیں اسلام پر قائم رہنا چاہیے [۲]۔

میرے نزدیک چونکہ قبل کی آیت میں دعوت دینے کی لفظ مشرکین سے مخاطب ہو کر ان کے لیے تھی، جنہیں وہ اللہ کو چھوڑ کر پکارتے

ہیں، اس لیے اس لبیک کا اسی دعوت سے تعلق زیادہ قریب الفہم ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزَيِّنَتْهَا نُوْفِ اِلَيْهِمْ اَعْمَالُهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا

لَا يُبْخَسُوْنَ ﴿۱۴﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۗ وَحَبِطَ مَا

صَنَعُوْا فِيْهَا وَبَطُلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾

[۱] فالَمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ اى من دعوتهم للمعاونة فاعلموا خطاب للمشركين فهل انتم مسلمون بعد هذه الحجة القاطعة اى اسلموا (جلالين)

[۲] اگر قبول نکند آن کافران سخن شمارا پس آیا شما مسلمان بستید (شاہ ولی اللہ) یعنی بر اسلام ثابت باشید (فتح الرحمن)

”جو دنیوی زندگی اور اس کی زیب و زینت کا طلب گار ہو تو ہم اس میں اُن کے کاموں کا پورا پورا نتیجہ ظاہر کر دیں گے اور اُن کے لیے اس میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ یہ وہ ہوں گے جن کے لیے آخرت میں سوا آتش دوزخ کے کچھ اور نہیں ہے اور جو کچھ انہوں نے اس میں کیا ہوگا اور جو کچھ ان کے کام تھے، وہ بے حقیقت ثابت ہوں گے۔“

اس میں ”غایانِ راہِ خدا“ کی صفوں میں شامل ہونے والے وہ ”مجاہدین“ بھی داخل ہیں جن کا مقصد فقط مالِ غنیمت کا حصول ہو [۱]۔

جب تمام اعمال خیر میں نیت صرف دنیا کے حصول کی ہوگی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی کام بقصد قربت نہیں ہوا اور ظاہر ہے کہ عبادتوں کی صحت میں قصد قربت کے نہ ہونے سے باطل ہوں گی۔ اس کے بعد آخرت میں دوزخ کے سوار ہی کیا جاتا ہے [۲]۔

أَمَّنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهِ كِتَابٌ مُّوسَىٰ
إِمَامًا وَرَحْمَةً ۗ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۗ وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ
مَوْعِدُهُ ۗ فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۗ إِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا

يُؤْمِنُونَ ﴿١٤﴾

”تو کیا جو اپنے پروردگار کی طرف سے کھلی ہوئی حقانیت کی دلیل کے ساتھ آیا ہے اور جس کے پیچھے آیا ہے اُس کا گواہ جو اُس کا جزء ہے اور اُس سے پہلے موسیٰ کی کتاب ایک پیشوا اور رحمت کی حیثیت سے یہ اس پر ایمان لائیں گے؟ اور جو ان گروہوں میں سے اُس کے ساتھ کفر اختیار کرے گا تو اس سے قول و قرار بس آتش دوزخ کا ہے تو تمہیں اس میں کوئی شک نہ ہو، وہ یقیناً حق ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے مگر اکثر لوگ ایمان نہیں رکھتے۔“

ذکر رسالت مآب و ولایت مآب

جو اپنے پروردگار کی طرف سے کھلی ہوئی حقانیت کی دلیل لے کر آیا ہے؟ وہ کون ہے؟ باجماع مفسرین اس سے مراد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ [۳]

اب وہ گواہ جو اس کے پیچھے آیا ہو اور اس کا جز ہو، وہ کون ہے؟ اسے خود پیغمبر کے اقوال میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ علی منیٰ و انامنہ اور پھر قصہ برات میں وحی الہی: لا یبلغھا الا انت اور جل منک ”اس کی تبلیغ کوئی نہیں کر سکتا سوا آپ کے یا ایسے شخص کے جو آپ کا جز ہو“ اور باجماع مفسرین و محدثین اس کے بعد حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہی کے سپرد یہ خدمت کی گئی۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ یہ گواہ تھا جو اس گواہی کے لئے پیدا ہوا تھا اس لئے اس کے قول و عمل سے کوئی بات اس گواہی کے خلاف کبھی ظاہر

[۱]. ہذا صفة المنافقین ذکرہ الجبائی (تبیان)

[۲]. من عمل الخیر علی ان یعطیہ اللہ ثوابہ فی الدنیا اعطاہ ثوابہ فی الدنیا و کان لہ فی الآخرة النار (علی بن ابراہیم)

[۳]. هو النبی ﷺ (جلالین)

ہی نہیں ہوئی۔ یہ تفسیر اقوال اہل بیت علیہم السلام میں تو وارد ہوئی ہے، اس کے علاوہ بعض صحابہ سے بھی نقل ہوئی ہے۔^[۱]

بعض مفسرین اہل سنت نے معنی میں تبدیلی کی خاطر **يَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُمْ** کی دونوں ضمیروں کے مرجع میں تفریق کر دی ہے یعنی **يتلوه** کی ضمیر تو رسول کی طرف راجع کی ہے اور **شاهدٌ مِّنْهُمْ** کی ضمیر خدا کی طرف۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ اس کے پیچھے آیا ہے ایک گواہ اس کی طرف سے یعنی خدا کی جانب سے^[۲] مگر ظاہر ہے کہ یہ ضمیروں کا اختلاف ظاہر کلام کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ پروردگار کی طرف سے کھلی ہوئی دلیل حقانیت کا ذکر پہلے ہی ہو چکا ہے۔ اب یہ گواہ اس کی طرف سے کیا ہے؟ اسے سمجھانے کی یوں کوشش کی گئی ہے کہ وہ کھلی ہوئی حقانیت کی دلیل جس کے ساتھ رسول آئے ہیں وہ تو دلیل عقل ہے اور یہ بعد میں جو گواہ آیا، وہ قرآن ہے^[۳] مگر عقل تو اس گواہ یعنی معجزات کی بنا پر جن میں سب سے اہم قرآن ہے، نبوت پر دلالت کر سکتی ہے گواہ یعنی قرآن سے پہلے نبوت خاصہ یعنی رسالت مآب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر دلیل عقلی کیا ہو سکتی ہے؟ اسی لئے مفسرین اہل سنت بھی سب اس سے مطمئن نہیں ہیں چنانچہ بعض کہتے ہیں کہ کھلی ہوئی حقانیت کی دلیل قرآن ہے تو اب اس کے پیچھے جو گواہ آیا ہے؟ وہ کون ہے؟ اس پر گہرا کر کہہ دیتے ہیں 'جبریل'۔^[۴]

اب اسے منطقی طور پر جانچئے۔ اول تو حضرت جبریل علیہ السلام کی شخصیت ایسی نہیں ہے کہ جو لوگوں کے سامنے آ کر گواہی دے۔ ان کے وجود پر ایمان تو خود قرآن اور رسالت کے تسلیم کرنے پر موقوف ہے۔ پھر یہ کہ قرآن لے کر جبریل امین علیہ السلام ہی تو آئے تو وہ قرآن کے ساتھ یا اس کے پہلے ہوئے، اس کے بعد کہاں سے ہوئے؟

دیکھئے حقیقت کو چھوڑ کر انسان کو کس کس طرح ٹھوکریں کھانا پڑتی ہیں؟

آخر ضمیروں کو الگ الگ مان کر جس سے یہ معنی ہوں گے کہ ان کے بعد آیا ہے ایک گواہ اس کی طرف سے۔ یعنی خدا کی طرف سے، پھر بھی اگر گواہ سے مراد حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کو لے لیا جائے تو ان حضرات کا کیا نقصان ہو جائے گا؟ جب کہ الفاظ قرآنی اس صورت میں بغیر کسی زحمت کے صادق آئیں گے۔ جو دلائل لے کر آئے وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور جو گواہ بنا کر اللہ کی طرف سے بھیجے گئے وہ حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام ہیں اور پھر جب کہ دلائل اور گواہ کے مفہوم میں یہ فرق بھی بالکل ذوق سلیم کے مطابق ہے کہ دلائل و بے زبان سچائی کی نشانیاں ہیں جن سے عقل رسالت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلیم کرتی ہے اور گواہ وہ ناطق انسان ہے جو اپنے گفتار و کردار سے ان کی سچائی کو عمر بھر ثابت کرتا رہا۔

ایک شک اس آیت میں جمہور مفسرین کو محسوس ہوا جس نے انہیں غطاں و پچپاں بنایا صرف اس سبب سے کہ جو حقیقت ہے اسے وہ قبول کرنا نہیں چاہتے اور ایک دوسری پیچیدگی آیت کی ترکیب نحوی میں محسوس ہوئی ہے جو ہمارے ترجمہ میں بالکل نہیں ہے ہم نے **مَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيْتِهِ مِحْرَابٌ مِّنْ رَبِّهِ** مبتداء قرار دیا ہے اور **أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ** پہ پورے جملہ کو اس کی خبر اور ہمزہ استفہام کے سوالیہ مضمون کو ہم اس جملہ سے متعلق قرار دیتے ہیں یعنی جو اس طرح دلیل لے کر آیا ہو اور اس کے بعد اس کا گواہ ہو اور اس کے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب اس کی گواہی دے رہی ہو تو کیا

[۱] روى عن ابى جعفر محمد بن على بن الحسين عليه السلام انه على بن ابى طالب ورواه الترمذى وذكره الطبري باسنادة عن جابر بن عبد الله عن على عليه السلام (تبیان)

[۲] متصل وے می آید گواہی از جانب پروردگار او (شاه ولی اللہ) پیچھے پیچھے آتا ہے اس کے ایک شاہد اس کی طرف سے (شاہ فنج الدین)

[۳] حجتی از جانب پروردگار خود یعنی دلیل عقل --- و گواہی از جانب پروردگار! و یعنی قرآن (فتح الرحمن)

[۴] بیئنة بیان من ربہ... وہی القرآن ویتلوہا بتعبہ شہادہ یصدقہ منہ الی من اللہ وہو جبرئیل (جلالین)

یہ لوگ اس پر ایمان لائیں گے؟ ہمیں تو اس میں کوئی دشواری نظر نہیں آتی مگر عام مترجمین و مفسرین کی سمجھ میں یہ نہیں آیا ہے۔ وہ اولئک یومنون بہ کو مستقل ایک جملہ خبریہ قرار دینا چاہتے ہیں تو اب آفمن کان علیٰ بینه من ربہ (تا آخر فقرہ) کی خبر کا آیت میں وجود نہیں رہتا تو اس کے لئے انہیں کوئی فقرہ بڑھانا پڑتا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

آیا کسی کو باشد بر حجتی مثل دیگران باشد؟

کیا وہ جو روشن دلیل کے ساتھ ہو۔۔۔ مثل دوسروں کے ہوگا؟

یہ تفسیر جلالین سے ماخوذ ہے انہوں نے اس کو عربی میں آفمن کان علیٰ بینه من ربہ کے پورے فقرہ کی تشریح کے ساتھ اس طرح

لکھا ہے کہ:

کمن لیس کذالك مثل اس کے ہوگا جو اس طرح نہ ہو

مگر ہم اس حذف و اضمار کی مضمون آیت میں کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۗ أُولَٰئِكَ يُعْرَضُونَ عَلَىٰ رَبِّهِمْ وَيَقُولُ
الْأَشْهَادُ هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۗ أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿١٨﴾
الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَنِ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا ۗ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ
كٰفِرُونَ ﴿١٩﴾ أُولَٰئِكَ لَمْ يَكُونُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ
مِنْ أَوْلِيَاءَ مِيضَعُفٌ لَهُمُ الْعَذَابُ ۗ مَا كَانُوا يَسْتَطِيعُونَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوا
يُبْصِرُونَ ﴿٢٠﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا
يَفْتَرُونَ ﴿٢١﴾ لَا جَزْمَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمْ الْآخِسُونَ ﴿٢٢﴾

’اور کون زیادہ ظالم ہوگا اس سے کہ جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگائے؟ یہ لوگ پیش ہوں گے اپنے پروردگار کے سامنے اور گواہی دینے والے کہیں گے کہ یہ وہ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار پر غلط تہمت لگائی، آگاہ ہو کہ اللہ کی لعنت ہے ان ظالموں پر جو اللہ کی راہ سے روکیں اور اسے ٹیڑھا کرنے کی کوشش کریں اور وہ آخرت کے منکر تھے۔ یہ لوگ دنیا میں اللہ کے قبضہ سے نکل نہ سکتے تھے اور نہ ان کے اللہ کو چھوڑ کر کوئی مددگار تھے۔ ان کو دونوں عذاب ہو گا، نہ وہ سن ہی سکتے تھے اور نہ آنکھوں سے دیکھتے ہی تھے یہ وہ ہیں جنہوں نے اپنے کو خسارے میں مبتلا کیا اور غائب ہو گئے ان سے وہ جنہیں وہ غلط طور پر گھڑتے تھے بلاشبہ آخرت میں وہی گھانا اٹھانے والے ہیں۔‘

’گواہی دینے والے کہیں گے‘ یہاں گواہ دینے والوں سے کا تباہ اعمال مراد لئے گئے ہیں جو روز آخرت انسانوں کے اعمال کی گواہی

دیں گے [۱] اور جن جن کو اس حقیقت کا علم ہو وہ سب بھی اس میں داخل ہو سکتے ہیں۔ [۲]
 ”نہ وہ سنتے ہی تھے اور نہ آنکھوں سے دیکھتے ہی تھے“ یعنی باوجود گوش و ہوش رکھنے کے عقل سے کام نہ لیتے تھے۔ [۳]
 یہی اللہ کی حجت ہے ان کے خلاف جو انہیں مورد عقوبت قرار دیتی ہے۔
 شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

می تو ان گفت بمزہ استفہام انکاری محذوف است یعنی آیا نمی تو انستند شنید و آیانہ می دیدند (فتح الرحمن)

کہا جاسکتا ہے کہ سوالیہ معنی پیدا کرنے کے لئے (عربی میں) جو ہمزہ (الف مفتوح) ہوتا ہے جس کا مقصد انکار و اعتراض ہے، وہ محذوف ہے کیا وہ نہیں سن سکتے تھے اور کیا وہ نہیں دیکھتے تھے؟
 مگر یہ خلاف ظاہر کلام ہے۔

یہ اللہ کی لعنتیں اور عذاب وغیرہ کس پر ہیں؟ پھر سن لیجئے۔
 ”اللہ پر جھوٹ باندھنے والوں پر، ان پر جنہوں نے اللہ کی راہ سے روکا اور اسے کج کرنے کی کوشش کی“۔
 شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں:

”خدا پر جھوٹ بولنا کس طرح ہے؟ علم میں غلط نقل کرنا یا خواب بنا لینا یا عقل سے حکم کرنا، دین کی بات میں یا دعویٰ کرنا کہ کشف رکھتا ہوں، یا اللہ کا مقرب ہوں“۔ (موضح القرآن)

اب اسی فہرست میں بڑھا لیجئے: کسی ایسے منصب کا جو اللہ سے تعلق رکھتا ہو، مدعی ہو جانا یا کسی ایسے عہدہ پر جس کا مقرر کرنا اللہ کے ذمہ ہو، بطور خود یا کسی اجماع یا شوریٰ کا ڈھونگ رچا کر کسی کو متمکن بنانا اور کسی کا بن جانا۔ ان سب کے لئے اللہ قرآن حکیم میں لعنت کا اعلان فرما رہا ہے کسی ایسے مذہب کے پیروں نہیں ہے جسے کہہ دیجئے:

دشنام بمذہبی کہ طاعت باشد
 مذہب معلوم و اہل مذہب معلوم

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَخْبَتُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ ۗ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ

الْجَنَّةِ ۗ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۲۳﴾

”یقیناً جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال کیے اور لگا تار اپنے پروردگار سے لو لگائے رہے [۴] یہ اہل بہشت

[۱] ہم الملائکۃ یشہدون علی الرسل بالبلاغ و علی الکفار بالتکذیب (جلالین) یعنی کراماً کاتبین (فتح الرحمن)

[۲] یعنی الملائکۃ و الانبیاء و العلماء (تبیان) گواہی والے آخرت میں فرشتے ہوں گے جو عمل لکھتے ہیں اور نیک بخت آدمی جن کو خیر تھی (موضح القرآن)

[۳] یعنی لفرط کراہتہم لہ کاہم لہم لیسمعوا اذک (جلالین)

[۴] ای تو اضعوا اللہ و اعبدوا (علی بن ابراہیم) الاخبات الخشوع المستمر علی استواء فیہ (تبیان)

ہیں جو اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے“

مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمَى وَالْأَصْمَى وَالْبَصِيرِ وَالسَّمِيعِ ط هَلْ يَسْتَوِينَ مَثَلًا ط
أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٣٢﴾

’ان دونوں فریقوں کی مثال مثل اندھے، بہرے اور آنکھ کان والے کی ہے کیا ان دونوں کی بات یکساں ہے؟ کیوں نصیحت قبول نہیں کرتے ہو؟‘

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿٣٥﴾ أَنْ لَا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ط
إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمِ آلِ يَمٍّ ﴿٣٦﴾ فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ
مَا نُرِيدُ إِلَّا بَشَرًا مِثْلَنَا وَمَا نُرِيدُ إِلَّا اتِّبَاعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَادْنَا بِأَدَى
الرَّأْيِ ؕ وَمَا نَرَىٰ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَنْظُنُّكُمْ كَاذِبِينَ ﴿٣٧﴾ قَالَ يَقَوْمِ
أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَأَتَيْنِي رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهِ فَعُصَيْتُ
عَلَيْكُمْ ط أَنْزَلْنَا مَكُومَهَا وَأَنْتُمْ لَهَا كِرْهُونَ ﴿٣٨﴾ وَيَقَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ
مَالًا ط إِنْ أَجْرِي إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَمَا أَنَا بِظَارِدِ الَّذِينَ آمَنُوا ط إِنَّهُمْ مُّلقُوا رَبَّهُمْ
وَلَكِنِّي أَرَاكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُونَ ﴿٣٩﴾ وَيَقَوْمِ مَنْ يَنْصُرُنِي مِنَ اللَّهِ إِنْ طَرَدْتُمُوهُمْ ط
أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٤٠﴾

’اور ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف بھیجا کہ میں تمہارے لئے کھلا ہوا عذاب سے ڈرانے والا ہوں کہ عبادت نہ کرو کسی کی سوا اللہ کے، یقیناً مجھے ڈر ہے تمہارے لئے ایک دردناک دن کے عذاب سے تو کہا ان کی قوم کے بڑے آدمیوں نے کہ جو کافر تھے، ہم نہیں دیکھتے ہیں تمہیں مگر اپنا ایسا ایک آدمی اور نہیں دیکھتے ہم کہ تمہاری پیروی کی ہے مگر ایسوں نے جو ہم میں پست طبقہ کے لوگ ہیں روادی میں [۱] اور نہیں دیکھتے ہم تم لوگوں کے لئے اپنے مقابلہ میں کوئی فضیلت بلکہ ہم تم لوگوں کو جھوٹا خیال کرتے ہیں کہا اے میری قوم والو! کیا تم نے غور کیا ہے کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے حقانیت کی دلیل رکھتا ہوں اور اس نے مجھے اپنے پاس سے رحمت دی ہے مگر وہ تمہاری سمجھ میں نہ آتی ہو تو کیا ہم تمہیں زبردستی اس کا پابند بنا سکتے ہیں جب کہ تم اسے ناپسند کرتے ہو؟ اے میری

[۱] ای ابتداءً من غیر تفکر فیہ (جلالین) بتامل سرسری (شاہ ولی اللہ)

قوم والو! میں تم سے اس پر کوئی مالی معاوضہ نہیں مانگتا میرا معاوضہ نہیں ہے مگر اللہ پر اور میں نکالنے والا نہیں ہوں انہیں جو ایمان لائے وہ اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں مگر میں دیکھتا ہوں تمہیں کہ تم جہالت سے کام لیتے ہو اور اے میری قوم والو! کون اللہ کے عذاب کے مقابلہ میں میری مدد کرے گا اگر میں انہیں نکال دوں؟ کیوں تم نصیحت قبول نہیں کرتے؟

وَلَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ إِنِّي مَلَكٌ وَلَا أَقُولُ لِلَّذِينَ تَزْدِرِي أَعْيُنُكُمْ لَنْ يُؤْتِيَهُمُ اللَّهُ خَيْرًا ۗ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا فِي أَنْفُسِهِمْ ۗ إِنِّي إِذًا لَمِنَ الظَّالِمِينَ ﴿٣١﴾

’اور میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں کوئی فرشتہ ہوں، ہاں میں ان لوگوں کے لئے جنہیں تمہاری نگاہیں حقیر محسوس کر رہی ہیں، یہ بھی نہیں کہتا کہ انہیں اللہ ہرگز کوئی بھلائی عطا نہیں کرے گا اللہ خوب جانتا ہے اسے جو ان کے دلوں میں ہے اس وقت بلاشبہ میں ظالموں میں سے ہوں گا۔‘

یہ غالباً اس جزء کا جواب ہے جو انہوں نے کہا تھا کہ ہم تو تمہیں بس ایک آدمی جانتے ہیں ہم تم میں اپنے اوپر کوئی فضیلت نہیں پاتے۔ اس کا جواب یہ دیا جا رہا ہے کہ میں خود کب اس کا مدعی ہوں کہ میں آدمی کے سوا کچھ اور ہوں اور یہ کہ مجھ میں ذائقہ کوئی ایسی بات ہے کہ میں عجوبہ چیز ہوں۔^[۱]

اصل تو یہ ہے کہ خالق نے مجھے نوازا ہے اور مجھے نبوت کے خلعت سے سرفراز کیا ہے، اس کی میں تبلیغ کرتا ہوں تو پھر تم جو وہ سب کچھ میرے مقابلہ میں کہہ رہے ہو، یہ جہالت نہیں تو کیا ہے؟

قَالُوا يَنْبُوحُ قَدْ جَدَلْتَنَا فَأَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿٣٢﴾ قَالَ إِنَّمَا يَأْتِيَكُمْ بِهِ اللَّهُ إِنْ شَاءَ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿٣٣﴾

’ان لوگوں نے کہا کہ اے نوح! تم نے تو ہم سے تکرار کی ہے اور بہت زیادہ تکرار کی ہے تو بس اب لے آؤ اسے جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو اگر تم سچے ہو، کہا کہ اسے اللہ ہی لائے گا اگر چاہے گا اور تم اسے (بھاگ کر) بے بس نہیں کر سکتے،‘^[۲]

وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِي إِنْ أَرَدْتُ أَنْ أَنْصَحَ لَكُمْ إِنْ كَانَ اللَّهُ يُرِيدُ أَنْ يُغْوِيَكُمْ ۗ هُوَ رَبُّكُمْ ۗ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٣٤﴾

[۱] انی لا ارفع نفسی فوق قدرها (تبیان)

[۲] لستم تفر تونہ ہر با (تبیان)

”اور تمہیں میری نصیحت فائدہ نہیں پہنچا سکتی، کتنا ہی میں تمہیں کرنا چاہوں، اگر اللہ تمہیں گمراہی میں چھوڑ دینا چاہتا ہو، وہ تمہارا پروردگار ہے اور اسی کی طرف تم کو پلٹ کر جانا ہے۔“

اللہ گمراہی میں چھوڑتا ہے انسان کے سوء اختیار سے تو نتیجتاً مطلب یہ ہوا کہ جب تم خود گمراہی میں پڑے رہنا چاہتے ہو [۱] تو میری نصیحت تمہیں کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے؟ اب تو عذاب تم پر آ ہی جائے گا جو تمہاری بد اعمالیوں کی وجہ سے اللہ کو منظور ہے کہ تم پر نازل کرے۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۗ قُلْ إِنْ افْتَرَيْتُهُ فَعَلَىٰ آجْرٍ آجِيٍّ وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تُجْرُمُونَ ﴿۳۵﴾
”کیا وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اس کو گھڑ لیا ہے؟ کہیے کہ اگر میں نے اسے گھڑا ہے تو میرے جرم کی ذمہ داری مجھ ہی پر ہے اور میں بری ہوں اس جرم سے جو تم کرتے ہو۔“

یہ ایک خاص روادارانہ گفتگو کا انداز ہے جسے مسلمات کے حامی اصول و عقائد کے خلاف قرار دے سکتے ہیں مگر حقیقت میں یہ انداز آزاد ضمیر کو معاملہ پر غور کرنے کی دعوت دیا کرتے ہیں۔

اس کے پہلے جناب نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کی گفتگو کا ذکر تھا اور اس کے بعد بھی اسی کا سلسلہ ہے لیکن درمیان میں یہ خود ہمارے پیغمبرؐ سے مخاطب آ گیا ہے اور آپ کی قوم جو قرآن کا انکار کر رہی ہے اس کا ذکر ہے۔ [۲]

اس سے ظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ مقام تنزیل میں اس سلسلہ کے ساتھ یہ آیت تعلق ہی نہیں رکھتی اور ترتیب میں بے جوڑ طور پر درمیان میں درج ہو گئی ہے اور اس نظیر کو سامنے رکھتے ہوئے یہ آیت تطہیر کی نوعیت وقوع کے سمجھنے میں دشواری نہیں رہتی مگر مفسرین اہل سنت نے کہا ہے کہ درمیان میں یہ آیت اس لئے آئی ہے کہ مشرکین قریش بھی تقریباً ویسی ہی باتیں کہتے تھے جیسی قوم نوح علیہ السلام کے افراد نے کہی تھیں۔ اس مطابقت کو دکھانے کے لئے درمیان میں ذکر مشرکین عرب کا آ گیا۔ [۳]

وَأُوْحِيَٰ إِلَىٰ نُوحٍ أَنَّهُ لَنْ يُؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ إِلَّا مَنْ قَدْ آمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَآ كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿۳۶﴾ وَأَصْنَعِ الْفُلَكَ بِأَعْيُنِنَا وَّوْحَيْنَا وَلَا تَخَاطِبُنِي فِي الدِّينِ ظَلَمُوا ۗ إِنَّهُمْ مُّغْرَقُونَ ﴿۳۷﴾

”اور نوح کی طرف وحی بھیجی گئی کہ اب ان لوگوں کے سوا جو ایمان لے آئے ہیں تمہاری قوم میں سے کوئی کبھی ایمان نہیں لائے گا تو رنجیدہ نہ ہو تم اس سے جو وہ کرتے ہیں اور بناؤ کشتی ہماری نگاہوں کے سامنے اور ہماری وحی سے

[۱] مع ایتانکم بما یوجب خیبتکم والعذاب الذی جرہ علیکم قبیح افعالکم ویرید اللہ اہلاکم و عقوبتکم علی ذلک (تبیان)

[۲] یقولون ای کفار مکة افتراه اختلق محمد القرآن (جلالین) یا محمد آیامی گویند بر بستہ است قرآن را (شاکولی اللہ)

[۳] ایں جملہ زیادہ کردہ شدہ است در وسط قصہ قوم نوح تامتنہ باشد بر تطبیق حال مشرکین مکہ باحال حضرت نوح علیہ السلام (فتح الرحمن) یہاں تک جتنے سوال اس قوم کے تھے وہی تھے حضرت کی قوم کے۔ گویا یہ سب جواب ان کو ملے، ایک کانیا دعویٰ تھا سو آگے فرمایا (موضح القرآن)

اور مجھ سے بات نہ کرنا ان کے بارے میں جو ظالم ہیں، وہ سب یقیناً غرق کر دیئے جائیں گے۔“

طوفان نوح علیہ السلام کی غرقابی اور اس کا پس منظر

آیت کا سیاق اس مشہور تصور کی نفی کرتا ہے کہ خواہ مخواہ حضرت نوح علیہ السلام اللہ سے عذاب کی دعا کرتے تھے اور ہر مرتبہ خالق اسے ایک مدت کے لئے ٹال دیتا تھا اور آخر میں جب دعا کی تو یہ ارشاد ہوا کہ ایک کشتی بناؤ۔

قرآن کا انداز بتاتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام تو جیسے اب بھی پُر امید تھے اور خیال کرتے تھے کہ شاید قوم ہدایت پا جائے مگر خالق نے خود اطلاع دی کہ اب جو باقی رہ گئے ہیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اب حضرت نوح علیہ السلام نے وہ دعا مانگی جس کا سورہ نوح میں تذکرہ ہے کہ رَبِّ لَا تَذَرْنِي مَعَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ﴿نوح: ۲۱﴾ اس وقت حکم ہوا کہ کشتی بناؤ۔

وَيَصْنَعُ الْفُلَكَ ۖ وَكَلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأُّ مِنْ قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ ۖ قَالَ إِن تَسْخَرُوا مِنِّي فَإِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُونَ ﴿۲۸﴾ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ۗ مَنْ يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴿۳۹﴾

”اور وہ کشتی بنا رہے تھے اور جب بھی ان کی طرف سے ان کی قوم کے کچھ بڑے لوگ گزرتے تھے تو ان سے وہ تمسخر کرتے تھے انہوں نے کہا اگر تم ہم سے تمسخر کرتے ہو تو ہم بھی (ایک دن) تم سے تمسخر کریں گے جس طرح تم تمسخر کر رہے ہو۔ اب بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر آتا ہے وہ عذاب جو اسے رسوا کر دے اور اترتا ہے اس پر قائم رہنے والا عذاب۔“

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”وہ ہنستے تھے اس پر کہ خشک زمین پر غرق کا بچاؤ کرتا ہے۔ یہ ہنستے اس پر کہ موت سر پر کھڑی ہے اور یہ ہنستے ہیں۔“ (موضح القرآن) دوسرا عنوان تمسخر کا یہ بتایا گیا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ اچھا! آپ پیغمبری کرتے کرتے، اب بڑھی گیری کرنے لگے ہیں۔^[۱]

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّورُ ۗ قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ ۗ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَن سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ آمَنَ ۗ وَمَا آمَنَ مَعَهُ إِلَّا قَلِيلٌ ﴿۴۵﴾

وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللَّهِ حَجَّ رَبِّهَا وَمُرْسَدَهَا ۗ إِنَّ رَبِّي لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۴۶﴾

”یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آیا اور تندور اُبلنا، ہم نے کہا کہ سوار کر لو اس (کشتی) میں ہر چیز کے دو جوڑے اور اپنے گھروالوں کو سوا ان کے جن پر بات پہلے ہو چکی ہے اور جو ایمان لائے ہوں اور نہیں ایمان لائے تھے ان پر مگر

[۱]. قبیل انہم كانوا يقولون يا نوح صرنا تجارا بعد النبوة (تبیان)

بہت کم اور کہا کہ سوار ہو اس میں اللہ کے نام کے سہارے پر اور اس کا چلنا اور اس کا رکنا۔ یقیناً میرا پروردگار بخشنے والا ہے بڑا مہربان۔“

”سو ان کے جن پر بات پہلے ہو چکی ہے یعنی پہلے کہا جا چکا ہے کہ

لَا تُخَاطَبُنِي فِي الدِّينِ ظَلَمُوا ۗ إِنَّهُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿٣٥﴾

مجھ سے ظالموں کے بارے میں بات نہ کرنا، وہ تو غرق ہو کر رہیں گے (ہود۔ ۳۵)

اس کے بعد بعض لوگوں کا یہ لکھنا کہ اس قول سے مراد قضائے الہی ہے [۱] تو ہم جبر پیدا کرنے کے شوق کے سوا اور کیا سمجھا جاسکتا ہے؟

پھر خود شاہ صاحب نے تصریح کی ہے کہ یہ جن کے لئے بات پہلے ہو چکی تھی، دو تھے ”یعنی زن نوح و کنعان پسر نوح“ (فتح الرحمن)

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”گھر والوں میں سے جس پر بات پڑ چکی ایک بیٹا کنعان اور اس کی ماں، سو وہ ڈوبے“ (موخ القرآن)

روایات بتاتے ہیں کہ پانی ایک تندور میں سے ابلا تھا جس میں روٹیاں پکتی تھیں۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”تور تھا حضرت نوح علیہ السلام کے گھر میں“ (موخ القرآن)

مگر تفسیر جلالین میں ہے:

فَارَا التَّنُورَ لِلنَّجَارِ بِالْمَاءِ۔

ایک نان بائی کا تندور پانی سے اُٹنے لگا۔

معلوم نہیں کس وجہ سے تھا شاہ ولی اللہ نے اس کو استعارہ پر محمول کر کے حاشیہ لکھنے کی ضرورت محسوس کی ہے کہ:

”یعنی تنور غضب الہی“ (فتح الرحمن)

حالانکہ بطور استعارہ دریائے غضب الہی تو محاورہ میں ہے ”تنور الہی“ نہیں اور تنور غضب الہی کے ساتھ بطور استعارہ کہا جائے تو وہ

مشتعل ہوگا، طوفان نہیں لائے گا۔

اس طرح کا بعد استعارہ بخیاں خود ”خلاف فطرت“ تصورات سے بچنے کے لئے نیاز صاحب فتح پوری ایسے افراد کو تویب دے سکتا

ہے، کسی ذمہ دار ”مسلمان عالم“ کو نہیں۔“

طوفان نوح کی غرقابی اور اس کا پس منظر

وَهِيَ تَجْرِي بِهِمْ فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۗ وَتَادِي نُوحَ ابْنَهُ وَكَانَ فِي مَعْزِلٍ يُبَيِّنُ

ارْكَبْ مَعَنَا وَلَا تَكُنْ مَعَ الْكَافِرِينَ ﴿٣٦﴾ قَالَ سَاوِي إِلَىٰ جَبَلٍ يَّعَصِمُنِي مِنَ

[۱]. سبقت کردہ است بروے قضایا (شاہ ولی اللہ)

الْمَاءِ ط قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا مَنْ رَحِمَ ۗ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ

فَكَانَ مِنَ الْمُعْرِقِينَ ﴿٣٦﴾

”اور وہ چل رہی تھی ان کو لئے ہوئے ایسی لہروں میں جو پہاڑوں جیسی تھیں اور آواز دی نوح نے اپنے بیٹے کو اور وہ الگ ایک طرف تھا کہ اے میرے بیٹے! سوار ہو لے ہمارے ساتھ اور کافروں کے ساتھ نہ ہو۔ اس نے کہا میں بہت جلد پناہ لے لوں گا ایک ایسے پہاڑ کی طرف جو مجھے پانی سے بچالے گا۔ انہوں نے کہا آج اللہ کا حکم سے بچانے والا کوئی نہیں ہے سوا اس کے جس پر وہ رحم کرے اور ان دونوں کے درمیان موج حائل ہوگئی تو وہ ڈبوئے جانے والوں میں سے تھا“۔

وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَسْمَأُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءِ وَقُضِيَ الْأَمْرُ

وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ وَقِيلَ بُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٣٧﴾

”اور کہا گیا کہ اے زمین نگل لے اپنے پانی کو اور اے آسمان تھم جا [۱] اور پانی تہہ نشین ہو گیا اور جو ہونا تھا وہ ہو چکا اور وہ جودی (پہاڑ) پر ٹھہری اور کہا گیا کہ لعنت ہو ظالم لوگوں پر“۔

یہ ان آیات میں سے ایک ہے جن کی فصاحت و بلاغت نے ارادہ مقابلہ کرنے والے منکرین قرآن کے ہاتھ سے قلم گرا دیا، یہ اور بات ہے کہ ہمارا اردو یا کسی اور زبان کا ترجمہ ان تمام کیفیات کا حامل نہیں ہو سکتا جو اس آیت کے اصل الفاظ میں موجود ہیں اور جن کا احساس اہل زبان ہی خوب کر سکتے ہیں۔

وَنَادَى نُوحٌ رَبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنْتَ أَحْكَمُ

الْحَكِيمِينَ ﴿٣٨﴾ قَالَ يُنوح إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ ۗ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ فَلَا

تَسْأَلُنِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ط إِنَِّّي أَعْطُكُ أَنْ تَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿٣٩﴾ قَالَ رَبِّ

إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْأَلَكَ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ ط وَإِلَّا تَغْفِرْ لِي وَتَرْحَمْنِي أَكُنْ مِنَ

الْخَاسِرِينَ ﴿٤٠﴾

”اور پکارا نوح نے اپنے پروردگار کو تو کہا اے میرے پروردگار! میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور یقیناً تیرا وعدہ سچا ہے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ کہا اے نوح! وہ تمہارے اہل میں سے نہیں ہے وہ تو برے اعمال کا مجسمہ ہے، تو مجھ سے سوال نہ کرو ایسا جس کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے، میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم جاہلوں میں سے نہ

[۱] امسکی عن المطر (جلالین) باز مان (شاہ ولی اللہ) بس کو (رفیع الدین)

ہو۔ کہا اے میرے پروردگار! میں پناہ مانگتا ہوں خود تجھ سے اس بات سے کہ تجھ سے سوال کروں ایسا جس کے متعلق مجھے علم نہ ہو اور اگر تو مجھے نہ بخشے اور نہ رحم کرے تو میں خسار اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔“

عمل صالح کے بغیر کسی پیغمبر کی فرزندگی بھی کارگر نہیں

سوال کے معنی طلب کے ہیں اس لئے مجھ سے سوال نہ کرو ایسا جس کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بے سمجھے مجھ سے کسی بات کی خواہش نہ کرو۔ شاہ عبدالقادر نے خواہ مخواہ سوال کو پوچھنے کے معنی میں لے لیا اس لئے ایک پیچیدگی میں پڑ گئے اور پھر اس سے نکلنے کی کوشش کرنے لگے ہیں وہ کہتے ہیں:

آدمی پوچھتا وہی ہے جو معلوم نہ ہو لیکن مرضی معلوم ہونی چاہیے، یہ کام ہے جاہل کا کہ اگلے کی مرضی نہ دیکھے پوچھنے کی، پھر پوچھے۔ (موضح القرآن)

واقعہ یہ ہے کہ یہاں حضرت نوح علیہ السلام پوچھ گچھ بھی نہیں رہے تھے۔ وہ تو خواہش کر رہے تھے کہ میرے بیٹے کو نجات دے دے، پھر سوال کے معنی پوچھنے کے قرار دینے کی ضرورت ہی کیا ہے!

ہماری قدیم تفسیر میں معصوم کی حدیث ہے کہ یہ جناب نوح علیہ السلام کا صلیبی بیٹا نہ تھا بلکہ مادر جلو تھا یعنی اس کی ماں جناب نوح علیہ السلام کے حوالہ عقد میں آئی تو وہ اس کے ساتھ تھا، اس لیے بیٹا کہلایا [۱]۔ جو عام محاورہ کے مطابق ہے۔ اس لیے خالق نے بھی ’بیٹے‘ ہونے کی نسبت کی نفی نہیں فرمائی لیکن اہل میں سے ہونے کی نفی کر دی۔

اس نظیر کو سامنے رکھا جائے تو کچھ علمائے شیعہ کا یہ تصور کہ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے سوا جو پیغمبر کی بیٹیاں تاریخ سے معلوم ہوئی ہیں، وہ حضرت کی صلیبی بیٹیاں نہ تھیں بلکہ وہ جناب خدیجہ کے ساتھ آئی تھیں، اس نظیر کے مطابق محسوس ہوگا۔ اس لئے ممکن ہے قرآن مجید کے الفاظ میں جو پردہ کے بارے میں ہیں:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لَأَزْوَاجِكُمْ وَبَنَاتِكُمْ

اے پیغمبر! اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے کہیے۔ (احزاب- ۵۹)

وہ بیٹیاں داخل سمجھ لی جائیں مگر جب پیغمبر کچھ خاص افراد کو جمع کر کے یہ فرمائیں کہ ہؤلاء اہلی یہ میرے اہل ہیں“ تو وہاں بالا تفاق ایک ہی بیٹی نظر آئے اور وہ جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا ہوں۔

قِيلَ يَا نُوحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِنَّا وَبَرَكَاتٍ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ أُمَمٍ مِّمَّنْ مَعَكَ ۗ وَأُمَّرُ

سَنُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۗ ﴿٦٨﴾

’کہا گیا ہے کہ اے نوح! اتر ہماری طرف کی سلامتی اور برکتوں کے ساتھ جو تم پر اور تمہارے ساتھ والوں سے

[۱]. عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال لیس بابنہ اثمًا هو ابنہ عن زوجتہ علی لغتہ یقولون لابن المرآة ابنہ (علی بن ابراہیم)

پیدا ہونے والی نسلوں پر ہیں [۱] اور کچھ جماعتیں ایسی ہوں گی جنہیں ہم فائدہ اٹھانے کا موقع دیں گے، پھر ان پر ہماری طرف سے دردناک عذاب آجائے گا۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”حق تعالیٰ نے تسلی فرمادی کہ پھر ساری قوم نوع انسان ہلاک نہ آوے گا قیامت سے پہلے مگر بعض فرقتے ہلاک ہوں گے۔“ (موضح

القرآن)

مگر اس میں آخر کا ٹکڑا خلاف واقعہ ہے اکثر فرقتے بھی جو گمراہ ہیں ان کی ہلاکت قیامت ہی سے وابستہ ہے ورنہ دنیا میں تو اکثر پھلتے پھولتے بلکہ غلبہ و تسلط بھی حاصل کرتے اور اقتدار سلطنت کے مالک ہو جاتے ہیں۔

تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ ۖ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ

قَبْلِ هَذَا ۖ فَاصْبِرْ ۗ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ ﴿٥٩﴾

”غیب کی خبروں میں سے ہے جنہیں ہم آپ پر وحی کے ذریعے سے بھیجتے ہیں آپ اس سے پہلے ان سے واقف نہ تھے اور نہ آپ کی قوم والے، تو برداشت سے کام لیجئے، بلاشبہ انجام پر ہیروزگاروں کے حق میں ہے۔“

یعنی جیسی نوح علیہ السلام کو تکلیفیں پہنچائی گئیں اور انہوں نے صبر سے کام لیا اور انجام میں انہیں کامیابی ہوئی، ویسے ہی آپ بھی صبر سے کام لیجئے آخر میں کامیابی آپ کو ہو کر رہے گی۔ [۲]

اس سے بھی ظاہر ہے کہ جناب نوح علیہ السلام کا صبر و ضبط خالق کی نگاہ میں مثالی حیثیت رکھتا ہے اور یہ تصور کرنا کہ انہوں نے معاذ اللہ نشانے الہی کے خلاف بار بار قوم کے لئے بددعا کی، حقیقت کے خلاف ہے۔

وَالِى عَادِ أَخَاهُمْ هُودًا ۖ قَالَ يَقَوْمِ اَعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ غَيْرُهُ ۗ اِنْ

اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُونَ ﴿٥٠﴾ يَقَوْمِ لَا اَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۗ اِنْ اَجْرِى اِلَّا عَلَى الَّذِى

فَطَرَنِى ۗ اَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٥١﴾ وَيَقَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا اِلَيْهِ يُرْسِلِ

السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلَى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا حُجْرَ مِىْنٍ ﴿٥٢﴾

”اور قبیلہ عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو، انہوں نے کہا اے میری قوم والو! اللہ کی عبادت کرو تمہارا سوا اس کے کوئی خدا نہیں ہے تم مگر دل سے باتیں بنانے والے، اے میری قوم والو! میں تم سے اس پر کوئی معاوضہ نہیں

[۱] من معك في السفينة اى من اولادهم وخرّياً تبهم وهم المؤمنون (جلالین)

[۲] فاصبر على التبليغ واذى قومك كما صبر نوح (جلالین) امر للنبي ﷺ بأن يصبر على اذى قومه وجهلهم بموضعه كما صبر نوح

قبل ذلك على اذى قومه (تبیان)

مانگتا۔ میرا معاوضہ نہیں ہے مگر اس پر کہ جس نے مجھے پیدا کیا ہے تو کیوں تم عقل سے کام نہیں لیتے اور میری قوم والو! اپنے پروردگار سے بخشش کے طلبگار ہو، پھر اس سے لو لگاؤ کہ وہ تمہاری طرف گھٹا بھیجے خوب برستی ہوئی اور تمہاری قوت میں مزید قوت عطا کرے اور تم مجرمانہ طور پر روگردانی اختیار نہ کرو۔

قبیلہ عاد اور جناب ہود علیہ السلام کا حال

اس کے پہلے نوح علیہ السلام کے ساتھ ارسلنا کا لفظ آچکا ہے کہ ہم نے بھیجا نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف، یہ ہود علیہ السلام کا ذکر بطور عطف اسی سلسلہ سے متعلق ہے مطلب یہ ہے کہ اور قبیلہ عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود علیہ السلام کو بھیجا [۱]۔ ہود کو بھائی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسی قبیلہ کا ایک فرد تھے۔ [۲]

قَالُوا يَا هُودُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِي آلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ﴿۵۳﴾ اِنْ نَقُولُ اِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوِّءٍ ط قَالَ اِنِّي اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُ وَا اِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ مِنْ دُوْنِهِ فَا كَيْدُوْنِي جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنظِرُوْنَ ﴿۵۵﴾ اِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّي وَرَبِّكُمْ ط مَا مِنْ دَابَّةٍ اِلَّا هُوَا خِذْ بِنَاصِيَتِهَا ط اِنَّ رَبِّي عَلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۶﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّا اُرْسَلْتُ بِهٖ اِلَيْكُمْ ط وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ ؕ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا ط اِنَّ رَبِّي عَلَى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿۵۷﴾

”ان لوگوں نے کہا اے ہود! تم ہمارے پاس کھلی ہوئی دلیل نہیں لائے اور ہم تمہارے کہنے سے اپنے خداؤں کو چھوڑنے والے نہیں ہیں اور نہ ہم تم پر ایمان لانے والے ہیں۔ ہم سوا اس کے کچھ کہہ نہیں سکتے کہ ہمارے خداؤں میں کسی نے تمہیں کچھ نقصان پہنچا دیا ہے، انہوں نے کہا کہ میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں بے تعلق ہوں ان سے جنہیں تم اسے چھوڑ کر شریک ماننے ہو تو تم سب مل کر میرے خلاف تدابیر کرو، پھر مجھے مہلت نہ دو، بلاشبہ میرا بھر دوسا ہے اللہ پر جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے کوئی چلنے پھرنے والا نہیں مگر یہ کہ وہ پکڑے ہوئے ہیں اس کی پیشانی کے اوپر کے بالوں کو یقیناً میرا پروردگار سیدھے راستے پر ہے۔ اب اگر تم روگردانی کرو تو میں تمہیں تبلیغ کر چکا اس کی جس کے ساتھ مجھے تمہاری جانب بھیجا گیا تھا اور میرا پروردگار تمہاری جگہ

[۱]. نصب بتقدیر ارسلنا (تبیان)

[۲]. اخاهم من القبيلة (جلالین)

تمہارے علاوہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا اور تم اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکو گے یقیناً میرا پروردگار ہر چیز پر نگہبان ہے۔“

”ہم سوا اس کے کچھ کہہ نہیں سکتے“ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ہمارے بتوں کی مخالفت کیوں کرتے ہو؟ بس یہ ایک بات ہو سکتی ہے کہ انہوں نے تمہیں کسی مصیبت میں مبتلا کر دیا ہو اور انتقام کے جذبہ میں تم ان کی مخالفت کر رہے ہو۔^[۱]

اس کے بعد جناب ہود علیہ السلام نے جو جواب دیا ہے اس میں یہ پہلو ہے کہ یہ اصنام بیچارے بھلا مجھے کیا تکلیف پہنچائیں گے؟ ہر چیز تو اللہ کے قبضہ میں ہے یہ اصنام بالکل بے بس ہیں، کچھ کر ہی نہیں سکتے۔

پیشانی کے اوپر جو سر کے بال ہیں، وہ اگر پکڑ میں آجائیں تو انسان بالکل بے قابو ہو جاتا ہے اس لئے پیشانی کے اوپر کے بال پکڑنے کا مطلب ہے پورے طور پر قدرت رکھنا یعنی اللہ ہر چلنے پھرنے والے پر کامل اقتدار رکھتا ہے“^[۲]۔

”یقیناً میرا پروردگار سیدھے راستے پر ہے“ یعنی وہ جو کرتا ہے، ٹھیک ہی ہوتا ہے۔
تفسیر جلالین میں ہے:

علیٰ صراط مستقیم ای طریق الحق والعدل
سیدھے راستے پر ہے، یعنی حق اور عدالت کے راستے پر۔
شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

”یعنی حکیم است“ (فتح الرحمن)

ہمارے یہاں کی تفسیر بھی اس کے موافق ہے۔^[۳]

مگر شاہ صاحب موصوف کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر اس کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ:
”جو سیدھی راہ پر چلے، وہ اس سے ملے“۔ (موضح القرآن)

وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُودًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا ۖ وَنَجَّيْنَاهُمْ مِّنْ
عَذَابٍ غَلِيظٍ ۝۸۸ وَتِلْكَ عَادٌ ۖ جَاءَتْهُمْ آيَاتُ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهُ وَاتَّبَعُوا أَمْرَ
كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ۝۸۹ وَاتَّبَعُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ أَلَا إِنَّ عَادًا
كَفَرُوا رَبَّهُمْ ۗ أَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُودٍ ۝۹۰

”اور جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے ہود کو اور انہیں کہ جنہوں نے ان کا ساتھ دیتے ہوئے ایمان اختیار کیا تھا اپنی

[۱]. مانقول فی سبب الخلاف الا ان اعتراک (تبیان)

[۲]. خص الناصیۃ بالذکر لان من اخذ بنا صیۃ یكون فی غایۃ الذل (تبیان)

[۳]. معناہ ان امر ربی فی تدبیر خلقہ... لا عرج فیہ والاضطراب (تبیان)

طرف کی رحمت کے ساتھ چھٹکارا دے دیا اور انہیں بڑے سخت عذاب سے بچا دیا اور یہ ہے وہ قبیلہ عاد جس نے جان بوجھ کر اپنے پروردگار کی آیات کا انکار کیا اور اس کے پیغمبروں کی نافرمانی کی اور ہر ہٹ دھرم، سرکش کے احکام کی پیروی کی اور ان کے پیچھے لگا دی گئی اس دنیا میں بھی لعنت اور قیامت کے دن بھی معلوم ہونا چاہیے کہ قبیلہ عاد نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی۔ آگاہ ہو کہ لعنت ہے عاد پر جو ہود کی قوم والے تھے۔

”ہمارا حکم آگیا، یعنی عذاب۔“^[۱]

”یہ ہے وہ قبیلہ عاد“ یعنی اس قبیلہ کی سرگزشت ہے جو آپ کے سامنے پیش کی گئی^[۲] اور یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ دنیا میں آنکھ کھول کر ذرا ان کا عالم دیکھو کہ کیا ہو گیا۔^[۳]

قبیلہ عاد کے لئے ارشاد ہوا ہے کہ ”انہوں نے اس کے پیغمبروں کی نافرمانی کی، حالانکہ قرآن نے ان کی جانب صرف ایک نبی کی بعثت کا ذکر کیا ہے اور وہ جناب ہود علیہ السلام ہیں مگر چونکہ پیغام تمام رسولوں کا مشترک ہوتا ہے، اس لئے ایک پیغمبر کی جو نافرمانی کی گئی، وہ تمام پیغمبروں کی نافرمانی ہے۔“^[۴]

”ان کے پیچھے دنیا میں بھی لعنت لگا دی گئی اور آخرت میں بھی، اسے ان افراد کو دیکھنا چاہیے جو فخر یہ کہتے ہیں کہ ہم تو شیطان پر بھی لعنت نہیں کرتے وہ محسوس کریں کہ منشاء ربانی کیا ہے؟
یہ تفسیر جلالین سے ظاہر ہے:

اتبعوا في هذه الدنيا لعنة من الناس ويوم القيامة لعنة على رؤس الخلائق
ان کے پیچھے لگا دی گئی ہے اس دنیا میں بھی لعنت لوگوں کی طرف سے (کہ وہ برابر لعنت کرتے رہیں گے) اور قیامت کے دن تمام خلایق کے مجمع عام میں (منادی قدرت کی طرف سے لعنت ہوگی)

وَالِی تَمُودَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا مَّ قَالَ یَقُوْمِ اَعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ۗ
هُوَ اَنْشَاَکُمْ مِّنْ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَکُمْ فِیْہَا فَاسْتَغْفِرُوْہَا ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَیْہِ ۗ اِنَّ
رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ ﴿۶۱﴾

”اور قبیلہ ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو، انہوں نے کہا اے میری قوم والو! عبادت کرو اللہ کی، اس کے سوا کوئی تمہارا خدا نہیں ہے، اس نے تم کو شروع شروع میں زمین سے پیدا کیا اور تمہیں اس میں آباد کیا تو اس سے

[۱]. امرنا عذابنا (جلالین)

[۲]. اینست سرگزشت عاد (شاہ ولی اللہ)

[۳]. تلك عاد اشارة الى آثارهم اى فسبحوا في الارض فانظروا اليها (جلالین)

[۴]. جمع لان من عصي سولا فقد عصي جميع الرسل لا اشتراكهم في اصل ما جاءوا به وهو التوحيد (جلالین)

مغفرت طلب کرو، پھر اُس سے لوگاؤ، یقیناً میرا پروردگار نزدیک ہے، دعاؤں کا قبول کرنے والا۔

قبیلہ شموذ اور جناب صالح علیہ السلام کا حال

وہی سلسلہ ہے کلام کا کہ نوح علیہ السلام کو ہم نے بھیجا اور عاد کی طرف ہووے علیہ السلام کو بھیجا۔ اب کہا جا رہا ہے کہ شموذ کی طرف صالح علیہ السلام کو بھیجا۔ زمین سے پیدا کیا، یعنی ابتدائے خلقت میں ابو البشر کی تخلیق خاک سے کی۔ [۱]

قَالُوا يٰصَالِحُ كُنْتَ فِينَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَا اَتَنْهٰنَا اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ

اٰبَاؤُنَا وَاَنْتَ اَلْفِي شَكِّ هِمَّا تَدْعُوْنَا اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۴۲﴾

”ان لوگوں نے کہا کہ اے صالح! ہمارے اندر تم سے اس کے پہلے بڑی امیدیں وابستہ تھیں، کیا تم ہمیں روکتے ہو، اس سے کہ ہم عبادت نہ کریں اس کی جس کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے رہے اور ہم اس سے جس کی طرف تم ہمیں دعوت دیتے ہو بڑے شک و شبہ میں ہیں جو پریشان کن ہے۔“

قَالَ يَقَوْمِ اَرَاۤءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاْتٰنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ

يَنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهُ فَمَا تَزِيْدُوْنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ﴿۴۳﴾ وَيَقَوْمِ هٰذِهِ نٰقَةٌ

اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةٌ فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمْسُوْهَا بِسُوْءٍ فَيَاْخُذْكُمْ

عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿۴۴﴾

”انہوں نے کہا اے میری قوم والو! کیا تم نے غور کیا ہے کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے حقانیت کی نمایاں دلیل کے ساتھ بھیجا گیا ہوں اور اس نے مجھے اپنی طرف سے خاص رحمت عطا کی ہے تو کون میری مدد کرے گا اللہ کے مقابلہ میں اگر میں اس کی نافرمانی کروں؟ اس صورت میں تو ہمارے لئے سوا خسارہ پہنچانے کے کچھ اور نہیں کر سکتے اے میری قوم والو! یہ اللہ کی طرف کی اونٹنی ہے تمہارے لئے ایک معجزہ کے طور پر تو اسے زمین خدا سے غذا حاصل کرنے دو اور کوئی برائی اسے چھلانا بھی نہیں کہ تمہیں بہت جلد عذاب گرفت میں لے لے گا،“ [۲]

”ناقہ صالح“ مشہور ہے خدا نے اس کو بطور اعزاز یہاں اور سورہ والشمس میں بھی ناقہ اللہ کہا ہے صرف اس لئے کہ خالق نے بطور اپنے مظاہرہ قدرت کے نمودار کیا۔

اس کے بعد حضرت عیسیٰ کو جو روح اللہ کہا گیا ہے، اس کی حقیقت بھی ظاہر ہو جاتی ہے جسے خواہ مخواہ مسیحی حضرات جناب عیسیٰ کے بارے

[۱]۔ قيل في معناه قولان: احمد هما انه خلقكم من ادم و ادم من تراب. الثاني انه خلقكم من الارض والاول اختيار الجبائي وهو الاقوي (تبيان)

[۲]۔ اخذكم عذاب عاجل (تبيان)

میں اپنے مزعومہ کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔

ناقہ صالح اپنے اس انتساب کی وجہ سے محترم بھی ہو گیا چنانچہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں کہ:

”حضرت صالح عليه السلام نے فرمایا کہ اس کی تعظیم کرنا ہوگی“ (موضح القرآن)

بے شمار شواہد و دلائل میں سے کیا یہ نظیر بھی یہ ثابت نہیں کرتی کہ غیر اللہ کی تعظیم مطلقاً شرک نہیں ہے بلکہ اگر اللہ کی طرف انتساب کی وجہ سے ہو تو مطلوب الہی ہے۔

فَعَقَرُوهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوا فِي دَارِكُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ ۖ ذٰلِكَ وَعَدُّ غَيْرٍ مَّكْدُوبٍ ﴿٦٥﴾
 فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا صَالِحًا وَالدِّينَ أَمَّنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا وَمِنْ خِزْيِ
 يَوْمِئِذٍ ۖ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ ﴿٦٦﴾ وَأَخَذَ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةَ
 فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جُثَمِينَ ﴿٦٧﴾ كَأَن لَّمْ يَعْنُوا فِيهَا ۖ آلَ إِيۡمَانَ تَمُودًا كَفَرُوا
 رَبَّهُمْ ۖ آلَ الْبُعْدَا لِّلثَمُودِ ﴿٦٨﴾

”تو ان لوگوں نے اسے پے کر دیا تو انہوں نے کہا کہ اپنے گھروں میں بس اب تین دن تک مزے اڑالو، یہ وعدہ ہے جو جھوٹا نہیں ہے، چنانچہ جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے صالح کو اور انہیں جنہوں نے ان کا ساتھ دے کر ایمان اختیار کیا تھا اپنی طرف کی رحمت کے ساتھ نجات دے دی اور اس دن کی رسوائی سے بچا دیا، یقیناً تمہارا پروردگار طاقت ور ہے بڑا زبردست اور جو ظالم تھے ان کو کڑک نے اپنی گرفت میں لے لیا تو وہ اپنے مکانوں میں منہ کے بل گر گئے جیسے کبھی وہ یہاں بسے ہی ہوئے نہ تھے آگاہ ہو کہ ثمود نے اپنے پروردگار کے ساتھ کفر کیا، آگاہ ہو کہ لعنت ہے ثمود پر۔“

نزول عذاب کے بعد اس قوم کے بے جان ہونے کے مفہوم کو ظاہر کرنے کے لئے کئی جگہ قرآن مجید میں جاٹھمیں کا لفظ آیا ہے جس کے معنی عموماً گھٹنوں کے بل بیٹھنے کے ہوتے ہیں اور یہی اکثر مفسرین نے اس کے معنی کہے ہیں [۱] مگر بے جان ہونے سے گھٹنوں یا زانوؤں کے بل بیٹھنے کا کوئی تعلق سمجھ میں نہیں آتا، لیکن چونکہ عموماً اس لفظ کے یہی معنی ہوتے تھے، لہذا فاصبحوا فی دیارہم جاٹھمیں کا ترجمہ بعض جگہ ہم نے اس طرح کیا ہے کہ وہ بیٹھے بیٹھے بے جان ہو گئے لیکن جناب شیخ الطائفہ نے اس کے معنی لکھ دیے ہیں ”منہ کے بل گرنا“ [۲] جو بے جان ہونے کے ساتھ زیادہ مناسب رکھتے ہیں، اس لئے ہم نے اب اس کا ترجمہ ہی تفسیر کے لحاظ سے کیا ہے۔

وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَى قَالُوا سَلَامًا ۖ قَالَ سَلَامٌ فَمَا لَبِثَ أَنْ

[۱]. بارکین علی الرکب میبین (جلالین) فخر اٹھے، گھروں اپنے کے زانو پر گرے ہوئے (شاہ فنج الدین)

[۲]. الجثوم السقوط علی الوجوه (تبیان)

جَاءَ بِعَجَلٍ حَيْنٍ ۖ فَلَمَّا رَأَىٰ أَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ إِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً ۗ قَالُوا لَا تَخَفْ إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمٍ لُّوطِيٍّ ۗ

”اور جب ابراہیم کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے خوش خبری لے کر آئے، کہا سلام پھر ذرا دیر نہ گزری کہ وہ لے آئے بھنا ہوا بچھڑا تو جب دیکھا ان کے ہاتھوں کو کہ نہیں پہنچتے اس تک تو انہیں ان پر شک ہوا، اور دل ہی دل میں ان سے ذرا ڈر محسوس کیا ۱۱ انہوں نے کہا ڈریے نہیں۔ ہم تو لوط کی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ولادت اسحاق علیہ السلام کی خوش خبری

”بھیجے ہوئے“ فرشتے تھے اور خوش خبری ولادت فرزند کی تھی جس کا ذکر اس کے بعد ہے، انہوں نے سلام کیا، ابراہیم علیہ السلام نے جواب سلام دیا۔ یہاں دیکھ لیجئے سلام ہی ہے السلام نہیں ہے۔ جلالین میں ہے قَالَ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ انہوں نے کہا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صرف السَّلَام کہا ہو اور عَلَيْكُمْ مقرر ہو۔ ۱۲

قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں ”یعنی ان پر عذاب نازل کرنے کے لئے“ اصل منزل مقصد وہ تھی، اور برسرِ راہ ابراہیم علیہ السلام کے پاس ٹھہر گئے بشارت دینے کے لئے۔

وَأَمْرًا تُهْتَبُهُ فَصَاحَتْ لَهَا بِإِسْحَاقَ ۖ وَمِنْ وَّرَاءِ إِسْحَاقَ يَعْقُوبَ ۗ قَالَتْ يَوَيْلَ لِيَ آئِدًا وَآنَا حَجُوزٌ ۖ وَهَذَا بَعْلِي شَيْخًا ۗ إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ عَجِيبٌ ۗ قَالُوا أَتَعْجَبِينَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ رَحْمَتُ اللَّهِ وَبَرَكَتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ ۗ إِنَّهُ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ ۗ

”اور ان کی بیوی کھڑی ہوئی تھیں تو وہ ہنسنے لگیں، اس پر ہم نے ان کو اسحاق کی خوشخبری دی اور اسحاق کے پیچھے یعقوب کی۔ وہ کہنے لگیں: ارے غضب! کیا میرے یہاں اولاد ہوگی اس حال میں کہ میں بڑھیا ہوں اور یہ میرے شوہر ہیں اسی عالم میں کہ بوڑھے ہیں؟ بلاشبہ یہ ایک عجیب چیز ہے انہوں نے کہا آپ تعجب کرتی ہیں اللہ کی بات سے۔ اللہ کی رحمت اور اس کی برکات ہیں۔ آپ لوگوں پر اسے اس گھر والو! یقیناً وہ قابلِ تعریف ہے، بزرگی والا۔“

یہ بیوی جناب سارہ تھیں وہ خواہ اس صورت حال پر کہ ان کے شوہر نے مہمان نوازی کے ذوق میں فرشتوں کے سامنے کھانا رکھ دیا اور

[۱]. اوجس اضمر فی نفسہ (جلالین)

[۲]. تقدیرہ: ”سلم علیکم“ فحذف الخبر كما حذف من قوله: فصبر جميل (تبیان)

بعد میں پتہ چلا کہ وہ فرشتے ہیں اور خواہ خوف و دہشت کے دور ہونے سے جس کا شروع میں غلبہ ہوا تھا [۱] اور خواہ قوم لوط پر عذاب آنے کی خبر سننے سے خوش ہو کر [۲] ہنسنے لگیں، اس پر فرشتوں نے انہیں ولادت فرزند کی بشارت دی۔ یہ فرزند اسحاق علیہ السلام تھے اور پھر یعقوب علیہ السلام کی بشارت دی یعنی یہ بھی خوش خبری سنائی کہ فرزند جو پیدا ہوگا وہ زندہ رہے گا اور اس کی نسل چلے گی۔

اہل بیت کا ترجمہ جو ہم نے کیا ہے اس گھر والو یہ ہم ہی نے نہیں کیا ہے بلکہ مفسرین اہل سنت نے بھی یہی کیا ہے۔

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

”بخششائش خدا و برکات اور بر شمسما است اے اہل این خانہ“

شاہ رفیع الدین کے الفاظ یہ ہیں:

رحمت ہے اللہ کی اور برکات اس کی اوپر تمہارے ہیں اے گھر والو“۔

اسے یاد رکھئے۔ اب آیہ تطہیر میں جو کہا گیا ہے:

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ. تو وہاں اہل البیت کا ترجمہ یہی کرنا پڑے گا کہ ”اس گھر والو“ اور اس کے بعد لغت میں بیت دیکھ کر اس کا مطلب سمجھ میں نہ آئے گا جب تک کہ ”اس“ کے اشارہ کو نہ دیکھا جائے کہ وہ کس گھر کی طرف ہے اب اس گھر میں جو ہیں وہی آیت میں اہل البیت سے مراد ہوں، چاہے لغوی طور پر اہل خانہ کی مصداق کچھ فرمادیں اور ہوں۔

ہاں یہ ملحوظ خاطر رہے کہ جناب سارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فقط زوجیت کا رشتہ نہ رکھتی تھیں بلکہ وہ نسبی رشتہ دار بھی جناب ابراہیم علیہ السلام سے رکھتی تھیں یعنی خاندان رسالت کی ایک فرد بھی تھیں اور اس لئے اہل البیت کے خطاب میں وہ بلا تکلف داخل ہوئیں۔ اتنا تو ہمارے پہلے کے مفسرین نے بھی کہا ہے [۳] اور اس میں ہم مزید یہ اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ جناب ابراہیم علیہ السلام سے سببی و نسبی رشتہ کے علاوہ سنخ و جوہر شخصی میں بھی ایسا اتحاد رکھتی تھیں کہ ملائکہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ساتھ ان سے بلا واسطہ کلام کیا۔ یہ بات ہر ایک کو حاصل نہیں ہو سکتی۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ الرَّوْعُ وَجَاءَتْهُ الْبُشْرَىٰ يُجَادِلُنَا فِى قَوْمِ لُوطٍ ﴿۵۱﴾

إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمًا أَوَّاهٌ مُّنِيبٌ ﴿۵۲﴾ يَا إِبْرَاهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هَذَا ۖ إِنَّهُ قَدْ جَاءَ أَمْرُ

رَبِّكَ ۖ وَاتَّبِعْ آيَاتِهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ ﴿۵۳﴾

”تو جب ابراہیم سے خوف و دہشت کی کیفیت دور ہوئی اور خوش خبری انہیں مل گئی تو وہ ہم سے لوط کی قوم کے بارے میں لڑنے لگے۔ یقیناً ابراہیم بڑی قوت برداشت رکھنے والے، ہمدردی رکھنے والے، خدا سے لولگانے والے تھے۔“ اے ابراہیم درگزر رو اُس سے بلاشبہ آپکا ہے حکم تمہارے پروردگار کا اور یقیناً آ کے رہے گا ان پر وہ

[۱] اس ڈر کے رفع ہونے سے خوش ہو کر ہنس پڑیں (موضح القرآن)

[۲] فضحکت است بشاراً بہلاً کہ (جلالین) یعنی بسبب خوش و وقتی از ہلاک قوم لوط (فتح الرحمن)

[۳] انما جعل سارة من اهل البیت لہا کانت بنت عمہ (تبیان)

عذاب جو پلٹنا یا نہیں جاسکتا۔

ایک بندہ بارگاہ الہی میں جو کچھ کہہ سکتا ہے وہ عرض معروض ہی کہلا یا جاسکتا ہے بھلا بندہ کی کیا مجال اور وہ بھی ایک پیغمبر کی کہ وہ خالق سے بحث کرے، تکرار کرے اور لڑے؟ مگر یاد رکھئے کہ یہ وہ بندہ ہے جسے خالق نے اپنے خلیل یعنی دوست کا درجہ دیا ہے جو کچھ ابراہیم علیہ السلام کا عمل تھا اسے خود ابراہیم علیہ السلام بیان کرتے تو یقیناً اسے عرض و مناجات ہی کے نام سے یاد کرتے کہ میں نے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں عرض معروض کیا مگر خالق اس ”دوست“ ہونے کے رشتہ کو سامنے رکھ کر ان الفاظ میں اس کا ذکر کر رہا ہے کہ وہ ہم سے قوم لوط کے بارے میں لڑنے لگے یعنی یہ کوشش کرنے لگے کہ کسی طرح عذاب ان سے ٹل جائے مگر یہ لڑنا ایسا تھا جو خالق کی نظر میں قابل تعریف ٹھہرا کہ اس پر ابراہیم علیہ السلام کے لئے ثناء یہ الفاظ صرف کئے جانے لگے کہ ”إِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوْ اٰمْنِيْبٌ“ ابراہیم بڑے متحمل، درد مند دل رکھنے والے، خدا ترس تھے۔ یہ اور بات ہے کہ حکمت الہی اب اس قوم کو زیادہ مہلت دینے کی متقاضی نہ تھی اس لئے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عرض معروض کے عذاب آکر رہا اور اس قوم کو چھٹکارا حاصل نہ ہو سکا۔

وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِئًا يٰۤهٖمُ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَقَالَ هٰذَا يَوْمٌ
عَصِيْبٌ ۝۷۰ وَجَاءَهُ قَوْمُهُ يُهْرَعُونَ اِلَيْهِ ۝۷۱ وَمَنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّئَاتِ ۝۷۲
قَالَ يَقَوْمِ هٰؤُلَاءِ بَنَاتِي هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزَوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ۝۷۳
اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۝۷۴ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا لَنَا فِيْ بَنَاتِكُمْ مِنْ حَقٍّ ۝۷۵
وَإِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا تُرِيْدُ ۝۷۶ قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةٌ اَوْ اُوْتِيَ اِلَى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ۝۷۷

”اور جب وہ ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس آئے تو وہ رنجیدہ ہو گئے ان کی وجہ سے اور وہ ان کے سبب سے شش و پنج میں پڑ گئے اور کہا یہ بڑا شراکتیز دن ہے اور ان کی قوم والے دوڑتے ہوئے ان کی طرف آگئے اور اس کے پہلے برابر وہ سیاہ کاریوں کے مرتکب رہا ہی کرتے تھے انہوں نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! یہ میری لڑکیاں موجود ہیں یہ تمہارے لئے زیادہ مناسب ہیں تو اللہ سے ڈرو اور مجھے میرے مہمان کے معاملہ میں رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں ایک بھی شائستہ شخص موجود نہیں ہے؟ ان لوگوں نے کہا تم جانتے ہو کہ ہمیں تمہاری بیٹیوں سے کوئی مطلب نہیں ہے بلکہ تم بلاشبہ جانتے ہو کہ ہمارا مقصد کیا ہوا کرتا ہے؟ انہوں نے کہا کاش مجھے تمہارے مقابلہ کی طاقت ہوتی یا میں سہارا لے سکتا کسی مضبوط ستون کا۔“

قوم لوط صنف ممال کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنے میں مشہور ہے فرشتے جناب لوط کے پاس نو عمر لڑکوں کی صورت میں آئے تو انہیں دیکھ کر اس قوم کے اباؤں نے لوط کو گھیر لیا اور سمجھے کہ ان کو ہوس رانی کا اچھا ذریعہ ہاتھ آیا۔ اس سے جناب لوط علیہ السلام کو بڑا صدمہ پہنچا اور ان سے ان کی قوم سے یہ گفتگو ہوئی۔

”بیٹیوں“ کے لفظ سے عام طور پر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ انہوں نے ان کے سامنے خود اپنی بیٹیوں کو پیش کیا مگر ہماری قدیم تفسیر میں یہ ہے کہ بیٹیوں کے لفظ سے خود اس قوم کی عورتیں مراد ہیں کیونکہ ایک نبی کے لئے اس قوم کی سب عورتیں ایک طرح بیٹی کی حیثیت رکھتی ہیں۔^[۱]

قَالُوا اِلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصْلُوْا اِلَيْكَ فَاَسِرْ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ النَّيْلِ وَلَا
 لَتَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدًا اِلَّا اَمْرًا تَكُ ۗ اِنَّهٗ مُصِيبُهَا مَا اَصَابَهُمْ ۗ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ
 الصُّبْحُ ۗ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ۙ ﴿١١﴾ فَلَمَّا جَاءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَلِيْهَا سَافِلَهَا
 وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيلٍ ۙ اِمْنُضُوْدٍ ﴿١٢﴾ مُّسَوِّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ۗ وَمَا هِيَ
 مِنَ الظَّالِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿١٣﴾

”انہوں نے کہا اے لوط! ہم آپ کے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں، یہ لوگ ہرگز آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے، اب آپ اپنے اہل کو لے کر رات کے کسی حصہ میں چلے جائیے گا اور کوئی آپ لوگوں میں سے مڑ کر نہ دیکھے سوا آپ کی بیوی یقیناً اس تک پہنچنے والی ہے وہی مصیبت جو ان لوگوں پر آئے گی۔ بلاشبہ ان کا مقرر شدہ وقت صبح کا ہے کیا صبح نزدیک نہیں ہے؟ چنانچہ جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے اس سر زمین کو تہ و بالا کر دیا اور ان پر مسلسل کنکر پتھر برسائے جو تمہارے پروردگار کے یہاں نشان زدہ تھے اور وہ ان ظالموں سے کچھ دور نہیں ہیں؟

قوم لوط پر نزل عذاب

فرشتوں نے جب جناب لوط عليه السلام کو بہت پریشان دیکھا تو انہیں مطمئن کیا اور حقیقت حال سے اطلاع دی ”سوا آپ کی بیوی کے“ یعنی اسے اپنے ساتھ نہ لے جائیے گا“۔^[۲]

آخر کا فقرہ وہ ان ظالموں سے کچھ دور نہیں ہیں، اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ قوم لوط کے وہ شہر جن پر عذاب نازل ہوا تھا مسافت کے اعتبار سے مکہ والوں سے کچھ زیادہ دور نہیں ہیں، یہ ان کے حالات خود معلوم کر سکتے ہیں کہ ان کا کیا انجام ہوا؟ اور یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ یہ ظالم بھی اپنی بد اعمالی کے اعتبار سے ایسے ہی عذاب کے مستحق ہیں اور وہ پتھر ان سے کچھ دور نہیں ہیں۔^[۳]

ہمیں یہ مفہوم بھی بعید معلوم نہیں ہوتا کہ ”الظالمین“ سے جنس مراد ہو یعنی جو بھی اس درجہ کے ظالم ہوں، وہ اسی طرح کے عذاب کے مستحق ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اللہ کی جانب کے کسی خاص عفو و کرم کی بنا پر یار رحمة للعالمین کے وجود ذی جوہ کی برکت سے یا کسی اور مصلحت سے وہ عذاب نازل نہ ہو۔

[۱] عقی بہ ازواجہم وذلک ان النبی ابوامۃ (علی بن ابراہیم)

[۲] استثنآء من الاہل ای فلاتسر بہا (جلالین)

[۳] ہی الحجارة او بلادھا (جلالین)

وَالِى مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يَاقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنِّ إِلَهٍ غَيْرُهُ ۗ
 وَلَا تَنقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ إِنِّي أَرَاكُمْ بِخَيْرٍ وَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ
 يَوْمٍ مُّحِيطٍ ﴿٣٧﴾ وَيَقَوْمِ أَوفُوا بِالْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخُسُوا
 النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْنُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٣٨﴾ بَقِيَّتُ اللَّهِ خَيْرٌ لَّكُمْ
 إِن كُنتُمْ مُّؤْمِنِينَ ۗ وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ ﴿٣٩﴾

”اور سرزمین مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو انہوں نے کہا اے میری قوم والو! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں اور ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو۔ میں تمہیں اچھی حالت میں دیکھتا ہوں اور مجھے اندیشہ ہے تمہارے لئے گھبرانے والے دن کے عذاب کا اور اے میری قوم والو! پورا کیا کرنا ناپ تول کو عدالت کے ساتھ اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو اور زمین میں فساد پھیلانے نہ پھرو، اللہ کی نعمت جو باقی رہ جائے بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم با ایمان ہو اور میں کوئی تمہارا نگہبان نہیں ہوں۔“

جناب شعیبؑ اور ان کی قوم کا حال

وہی سلسلہ یعنی نوحؑ کو بھیجا۔۔۔ ہودؑ کو۔۔۔ صالحؑ کو اور اب کہا جا رہا ہے کہ مدین کی طرف شعیبؑ کو بھیجا۔
 ”اللہ کی نعمت جو باقی رہ جائے“ اس سے بعض لوگوں نے یہ مراد لیا ہے کہ پورے ناپ تول کے بعد جتنا نفع تمہارے لئے رہ جائے وہ بہت اچھا ہے، اس لئے کہ وہ مال حلال ہوگا جس میں مواخذہ تم سے نہیں ہوگا [۱] اور اس سے زیادہ واضح مجھے یہ مفہوم معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے یہاں کی باقی رہنے والی نعمت جو اس کے حکم کی اطاعت سے وابستہ ہیں بہتر ہیں اس دولت فانی سے جو یوں ناجائز طریقہ پر تم حاصل کرتے ہو۔ [۲]

قَالُوا يَشْعِيبُ أَصْلُوكَ تَأْمُرُكَ أَنْ نَتَّكِرَ مَا يَعْْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَنْ نَفْعَلَ فِي
 أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ ۗ إِنَّكَ لَأَنْتَ الْحَكِيمُ الرَّشِيدُ ﴿٤٠﴾

”ان لوگوں نے کہا اے شعیب! کیا تمہاری نماز تم پر یہ حکم نافذ کرتی ہے کہ ہم چھوڑ دیں اسے جس کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے آئے ہیں یا اسے کہ ہم اپنے اموال میں اپنی خواہش کے مطابق تصرف کریں۔ تم تو یقیناً بڑے ضبط و تحمل والے ٹھیک آدمی ہو۔“

یعنی ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ تم نمازیں پڑھا کرتے ہو تو پڑھے جاؤ ہمارا کیا نقصان ہے؟ مگر اب نمازیں پڑھتے پڑھتے تم ہمیں یہ نصیحتیں

[۱]. رزقہ الباقی لکم بعد ایفاء الکیل والوزن (جلالین)

[۲]. بقیة الله من نعمته وقيل بقیة الله طاعة الله... (لانہ یبقی ثوابہا ابدًا) (تبیان)

کرنے لگے تو کیا تمہاری نماز نے اب تمہیں اس فریضہ پر مامور کیا ہے؟ تم تو بڑے ضبط و تحمل والے ٹھیک آدمی ہو یعنی ہمیں تم سے یہ امید نہ تھی کہ تم ہم سے یہ بات کہو گے کہ ہم اپنے باپ دادا کے معبودوں کی عبادت چھوڑ دیں یا اپنے اموال میں حسب دل خواہ جو تصرف کرتے ہیں، وہ تمہارے کہنے سے ترک کر دیں۔

بعض لوگوں نے اس تعریف میں کہ ”تم بڑے ضبط و تحمل والے آدمی ہو“، تمسخر کا پہلو محسوس کیا ہے [۱] مگر مجھے اس کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی بلکہ ان کے اس کہنے میں کہ بڑے ضبط و تحمل والے ٹھیک آدمی ہو مجھے یہ پہلو محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے افعال و اعمال سے تمہیں اتفاق تو کبھی نہیں تھا اور تم ناگوار می محسوس کرتے تھے مگر تم نے کبھی اس کا ظہار نکتہ چینی یا اعتراض کی شکل میں نہیں کیا، نہ ہمیں اس کے خلاف کوئی تبلیغ و تلقین کی۔ اس میں یہ حقیقت مضمحل ہے کہ پیغمبران خدا بعثت سے پہلے بھی قوم کی گمراہیوں اور بد اعمالیوں سے بیزار اور بے تعلق ہوتے ہیں مگر وہ لب کشائی اس وقت تک نہیں کرتے جب تک کہ بعثت ہو یعنی وہ خالق کی طرف سے اس تبلیغ و تلقین پر مامور ہوں۔

قَالَ يَقَوْمِ آرَاءَ يُنْمِرُونَ كُنْتُمْ عَلَىٰ بَيْنَةٍ مِّن رَّبِّي وَرَزَقْنِي مِّنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۖ
وَمَا أَرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ مَا أَنهَكُم عَنْهُ ۖ إِن أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا
اسْتَطَعْتُ ۖ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ﴿۸۸﴾ وَيَقَوْمِ لَا
يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِي أَنْ يُصِيبَكُمْ مِثْلُ مَا أَصَابَ قَوْمَ نُوحٍ أَوْ قَوْمَ هُودٍ أَوْ
قَوْمَ صَالِحٍ ۖ وَمَا قَوْمٌ لَّوِطٍ مِّنكُمْ بِبَعِيدٍ ﴿۸۹﴾ وَاسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا
إِلَيْهِ ۖ إِنَّ رَبِّي رَحِيمٌ وَدُودٌ ﴿۹۰﴾

”انہوں نے کہا اے میری قوم والو! کیا تم نے غور کیا؟ اگر میں نمایاں دلیل پر ہوں اپنے پروردگار کی طرف سے اور اس نے مجھ کو دی ہے اپنی طرف سے اچھی روزی؟ اور میرا یہ مقصود نہیں ہے کہ میں تمہاری مخالفت کروں خود ان چیزوں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے جن سے تم کو منع کرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا مگر اصلاح جہاں تک کر سکوں۔ نہیں مجھے توفیق مگر اللہ کی طرف سے اسی پر میرا بھروسہ ہے اور اسی میں لو لگا تا ہوں اور اے میری قوم والو! میری مخالفت تم سے ایسے کام کہیں نہ کروا دے کہ تمہیں پہنچ جائے ایسی آفت جیسی پہنچی نوح کی یا ہود کی قوم کو یا صالحؑ کی قوم کو اور لوٹ کی قوم تو تم سے دور نہیں ہے اور اپنے پروردگار سے مغفرت کے طالب ہو، پھر اس سے لگو لگاؤ، یقیناً میرا پروردگار مہربان ہے، بڑی محبت والا۔“

قَالُوا لِيُشْعِبَ مَا نَفَقَهُ كَثِيرًا ۖ إِنَّمَا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرُكَ فِينَا ضَعِيفًا ۖ وَلَوْلَا

[۱] قالوا ذلك استهزاء (جلالین)

رَهْطِكَ لَرَجْمِكَ ۚ وَمَا أَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيزٍ ﴿٩١﴾ قَالَ يَقَوْمِ أَرَهَيْتُمْنِي أَعَزُّ عَلَيْكُمْ
مِنَ اللَّهِ ۖ وَاتَّخَذْتُمُوهُ وَرَاءَكُمْ ظَهْرِيًّا ۖ إِنَّ رَبِّي بِمَا تَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿٩٢﴾ وَيَقَوْمِ
اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۗ مَنْ يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ
وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۖ وَارْتَقِبُوا إِلَيَّ مَعَكُمْ رَقِيبٌ ﴿٩٣﴾

’ان لوگوں نے کہا: اے شعیب! جو کچھ تم کہتے ہو، اس کا زیادہ حصہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا اور ہم تم کو اپنے میں کمزور دیکھتے ہیں اور اگر تمہارا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تم کو سنگسار کر دیتے اور تم ہمارے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتے، انہوں نے کہا: اے میری قوم والو! کیا میرا قبیلہ تمہاری نظر میں اللہ سے زیادہ زبردست ہے؟ اور تم نے اسے اپنے پس پشت ڈال دیا ہے یقیناً میرا پروردگار اس پر جو تم کرتے ہو، حاوی ہے اور اے میری قوم والو! تم اپنی جگہ جو کچھ کرتے ہو، کیے جاؤ اور جو میں کرتا ہوں، میں کئے جاؤں گا بہت جلد تم کو معلوم ہو جائے گا کہ کس پر آتا ہے وہ عذاب جو اسے رسوا کر دے اور کون جھوٹا ہے؟ اور انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔‘

وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا وَأَخَذَتِ الَّذِينَ
ظَلَمُوا الصَّيْحَةَ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جُثِيمِينَ ﴿٩٤﴾ كَأَن لَّمْ يَعْنُوا فِيهَا ۖ آلَا
بُعْدًا لِّلْمَدِينِ ۚ كَمَا بَعَدَتْ ثَمُودُ ﴿٩٥﴾

’اور جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے بچا دیا شعیب کو اور انہیں کہ جنہوں نے ان کا ساتھ دے کر ایمان اختیار کیا تھا اپنی رحمت سے، اور گرفت میں لے لیا ان کو جو ظالم تھے کڑک نے، تو وہ اپنے گھروں میں گر گئے، منہ کے بل، گویا کہ وہ وہاں بسے ہی ہوئے نہ تھے، آگاہ ہو کہ لعنت ہے مدین کے لئے جیسی لعنت میں مبتلا ہوئے ثمود۔‘

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ﴿٩٦﴾ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَاتَّبَعُوا
أَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَا أَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيدٍ ﴿٩٧﴾ يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَأَوْرَدَهُمُ
النَّارَ ۖ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُودُ ﴿٩٨﴾ وَأَتَّبَعُوا فِي هٰذِهِ لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۖ بِئْسَ
الرِّفْدُ الْمَرْفُودُ ﴿٩٩﴾

’اور ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی طرف کے معجزہ اور کھلے ہوئے اقتدار کے ساتھ فرعون اور اس کے ساتھ والے بڑے آدمیوں کے پاس تو ان لوگوں نے فرعون کے حکم کی پیروی کی اور فرعون کا حکم بالکل صحیح نہ تھا وہ اپنی قوم کی قیادت

کرے گا قیامت کے دن اور اس طرح انہیں دوزخ کی آگ میں پہنچا دے گا کیا بری ہوگی یہ منزل جہاں وارد ہوا جائے گا اور ان کے پیچھے لگا دی گئی اس دنیا میں لعنت اور قیامت کے دن کیا برا عطیہ ہے جو انہیں عطا کیا گیا [۱۴]،

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْقُرَىٰ نَقُصُّهُ عَلَيْكَ مِنْهَا قَائِمٌ وَحَصِيدٌ ﴿۱۴﴾ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ فَمَا اَغْنَتْ عَنْهُمْ اِلٰهَتُهُمُ الَّتِي يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَاءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۗ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتٰبٍ ﴿۱۵﴾

”یہ ان بستیوں کی خبریں ہیں جو آپ کے سامنے ہم بیان کرتے ہیں ان میں کچھ کچھ رہ گئی ہیں اور کچھ کا قلع قمع ہو چکا ہے اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا مگر انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا تو انہیں فائدہ پہنچایا انہیں ان کے خداؤں نے جن کی وہ اللہ کو چھوڑ کر دہائی دیتے تھے جب آگیا آپ کے پروردگار کا حکم اور انہوں نے سوا تباہی و بربادی کے انہیں کچھ اور نتیجہ نہ بخشا“۔

”ان میں کچھ رہ گئی ہیں اور کچھ کا قلع قمع ہو چکا ہے“ اس کا ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض اقوام کی نسلیں باقی ہیں اور بعض بالکل ختم ہو گئیں کہ نسل بھی باقی نہیں رہی اور دوسرا مطلب یہ کہا گیا ہے کہ کچھ ایسی بستیاں ہیں کہ وہاں کے باشندے ختم ہو گئے مگر وہ کھنڈراب تک باقی ہیں اور کچھ وہ ہیں جن کے آثار بھی مسمار ہو کر نیست و نابود ہو گئے۔

وَ كَذٰلِكَ اَخَذُ رَبُّكَ اِذَا اَخَذَ الْقُرَىٰ وَهِيَ ظٰلِمَةٌ ۗ اِنْ اَخَذَهَا اِلَيْمًا شَدِيْدًا ﴿۱۶﴾

”اور اسی طرح ہوتا ہے گرفت میں لینا تمہارے پروردگار کا جب وہ گرفت میں لیتا ہے بستیوں کو اس عالم میں کہ وہ ظلم و ستم کی مرتکب ہیں یقیناً اس کی گرفت دردناک ہوتی ہے، سخت“۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لٰاٰیةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ۗ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لِّاَلِ النَّاسِ وَ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿۱۷﴾ وَمَا نُوْجِرُكَ اِلَّا لِاجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿۱۸﴾ يَوْمَ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۗ فَمِنْهُمْ شَقِيْقٌ وَّ سَعِيْدٌ ﴿۱۹﴾

”یقیناً اس میں نشانی ہے اس کے لئے جو ڈرے آخرت کے عذاب سے۔ وہ ایسا دن ہے جس کے لئے تمام خلق اکٹھی کی جائے گی اور وہ ایسا دن ہے جس میں سب حاضر ہوں گے اور ہم اس کے لانے میں دیر نہیں کر رہے ہیں مگر ایک مقررہ مدت کے پورا ہونے کے لئے، جس دن وہ آئے گا تو کوئی تنفس بات نہ کرے گا مگر اس کی اجازت سے تو ان میں کچھ بد نصیب ہوں گے اور کچھ خوش نصیب“۔

قرآن مجید کی ایک آیت سے دوسری آیت کی تشریح ہوا کرتی ہے یہاں بات نہ کرنے میں استثناء اجازت کا کر دیا گیا ہے تو دوسری جگہ

[۱] انما قيل ههنا و فذلان اللعنة جعلت بدلا من الر فد بالعطية (تبيان)

مطلق طور پر جو کہہ دیا گیا ہے:

هَذَا يَوْمٌ لَا يَنْطِقُونَ.

وہ دن ایسا ہوگا کہ وہ بات تک نہیں کر سکیں گے۔ (مرسلات: ۳۵)

اس سے بھی سمجھنا چاہیے کہ بغیر اللہ کی اجازت کے ایسا نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ یہ بھی ایک سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ وہ ارشاد ہے کہ بات تک نہیں کر سکیں گے، مجرموں کی حالت کا اظہار ہے اور بات سے مراد حجت و دلیل اور کوئی قابل قبول صفائی ہے جسے وہ پیش کر سکیں۔^[۱]

اور یہاں اذن کے استثناء کے ساتھ جو ارشاد ہے اس میں تمام خلق کا تذکرہ ہے جن میں وہ بھی داخل ہیں جو مقرب بارگاہ الہی ہیں اور جنہیں اس نے خود اس دن کلام کے لئے مامور فرمایا ہے وہ دوسروں کے خلاف گواہی پر بھی مامور ہو سکتے ہیں جو ہماری قدیم تفسیر میں وارد ہے۔^[۲]

فَأَمَّا الَّذِينَ شَفَعُوا فِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ ﴿١٥٦﴾ خُلِدِينَ فِيهَا مَا
دَامَتِ السَّمُوتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ط إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ﴿١٥٧﴾
وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فِي الْجَنَّةِ خُلِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمُوتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا
مَا شَاءَ رَبُّكَ ط عَطَاءٌ غَيْرٌ مِّجْدُودٍ ﴿١٥٨﴾

”تو جو بد نصیب ہیں، وہ آتش دوزخ میں ہوں گے، ان کے لئے اس میں چیخ پکار ہوگی، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں سو اس کے جو تمہارا پروردگار چاہے یقیناً تمہارا پروردگار جو ارادہ کرتا ہے، اسے کر کے رہنے والا ہے، اور جو خوش نصیب ہیں، وہ بہشت میں ہوں گے ہمیشہ رہیں گے اس میں جب تک آسمان و زمین ہیں سو اس کے تمہارا پروردگار چاہے، یہ عطائے الہی ایسی ہوگی جو قطع ہونے والی نہیں ہیں۔“

مذکورہ آیات میں دو فقرے ذرا ذہن کو پریشان کرتے ہیں:

پہلے دوزخ اور جنت دونوں میں یہ کہہ کر ہمیشہ وہاں رہیں گے یہ فقرہ کہ مَا دَامَتِ السَّمُوتُ وَالْأَرْضُ جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں حالانکہ یہ آسمان و زمین قائم ہیں حالانکہ یہ آسمان اور زمین تو پہلے ہی ختم ہو چکے ہوں گے اور وہاں والے آسمان و زمین، وہ تو اس بہشت و دوزخ کے ساتھ وابستہ ہیں اور وہ بہشت و دوزخ ہمیشہ رہنے والے ہیں تو وہ آسمان و زمین بھی ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

دوسرے دونوں میں إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ کا استثناء ہے، سمجھ میں آتا ہے کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ رہنے سے متعلق ہے یعنی اہل دوزخ، دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے سو اس کے جسے اللہ چاہے، اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ جسے وہ چاہے، وہ ہمیشہ نہ رہے گا اور اہل بہشت، بہشت میں ہمیشہ رہیں گے سو اس کے جسے اللہ چاہے یعنی جسے اللہ نہ چاہے، ایسا شخص ہمیشہ نہ رہے گا اب یہ کون لوگ ہیں جو دوزخ میں ہمیشہ کے لئے ڈالے جائیں اور

[۱] ای لا ینطقون بحجۃ (تبیان)

[۲] یشہد علیہم الانبیاء والرسل (علی بن ابراہیم)

پھر مشیت الہی متقاضی ہو تو وہ نکال لئے جائیں گے اور جو جنت میں ہمیشہ کے لئے داخل کئے جائیں اور پھر مشیت الہی متقاضی ہو اور وہ وہاں سے خارج کر دیئے جائیں۔

شاہ ولی اللہ نے اِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ کا تعلق دوزخ اور جنت میں ہمیشہ کے لئے قیام سے قرار ہی نہیں دیا ہے بلکہ اسے مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ جیسے متعلق کیا ہے مگر ایسی ذلیلیدہ بیانی سے جس کا مطلب سمجھنا دشوار ہے وہ لکھتے ہیں:

یعنی مدت ماندن در بہشت و دوزخ مانند مدت دوام آسمانها و زمین است درد دنیا اگر زیادتی راکہ در مشیت خدا است و در فہم کسی نمی گنجد، اعتبار نکند حاصل بیان دوام است بابلغ وجوہ (فتح الرحمن)

یعنی جنت اور جہنم میں ان کے رہنے کی مدت آسمانوں اور زمین کے دنیا میں قیام کی مدت کے مثل ہے اگر اس زیادتی کا جو مشیت الہی میں ہے اور کسی کے ذہن میں اس کے سمجھنے کی وسعت نہیں ہے لحاظ نہ کیا جائے اور خلاصہ مطلب انتہائی مکمل طریقہ پر ہمیشہ رہنے کا اظہار ہے۔ ان کے فرزند شاہ عبدالقادر میرے خیال میں زیادہ حقیقت کے قریب پہنچے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ:

”دو معنی ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ رہیں گے کہ آگ میں جتنی دیر رہ چکے ہیں آسمان و زمین دنیا میں مگر جتنا اور چاہے تیرا رب وہ اسی کو معلوم ہے۔ دوسرے یہ کہ رہیں گے آگ میں جب تک ہے آسمان و زمین اس جہان کا یعنی ہمیشہ مگر جو چاہے رب تو موقوف کر دے لیکن چاہ چکا کہ موقوف نہ ہو۔ اس کہنے میں فرق نکلا اللہ کے ہمیشہ رہنے میں اور بندے کے کہ بندہ کو ہمیشہ رہنے کے ساتھ یہ بات ممکن ہے کہ اللہ چاہے تو فنا کر دے“ (موضح القرآن)

ان میں سے جو پہلے معنی ہیں یعنی مَا شَاءَ رَبُّكَ کا یہ مفہوم کہ اللہ چاہے تو اس مدت کو اور بڑھا دے، یہ جلالین سے ماخوذ ہیں: تفسیر جلالین میں ہے:

مادامت السموات والارض ای مدۃ دوامها فی الدنیا الا غیر ما شاء ربك من الزیادة علی مدۃ ہما لامنتہیٰ لہ والمعنی خالدین فیہا ابدًا۔

جب تک کہ رہے آسمان اور زمین یعنی جتنے عرصہ تک وہ دنیا میں قائم رہے ”سوا اسکے جو تمہارا پروردگار چاہے“ یعنی اور زیادتی ان کی مدت میں جس کی کوئی انتہا نہیں اور مطلب یہ ہے کہ وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے۔ پھر آخر میں لکھا ہے:

وما تقدم من التأویل هو الذی ظہریٰ وهو قال عن التکلف واللہ اعلم بمرادہ جو معنی بیان ہوئے ہیں وہ میرے ذہن میں آئے ہیں اور ان میں کوئی زحمت نہیں ہے اور اللہ اپنے مطلب سے خود زیادہ واقف ہے۔ ہماری ایک قدیم تفسیر میں یہ ہے کہ یہ قیامت میں ثواب و عذاب کا ذکر ہی نہیں ہے بلکہ اس کے پہلے برزخ والے ثواب اور عذاب کا تذکرہ ہے [۱]۔

[۱]. ففي النار... في نار الدنيا قبل يوم القيامة... ففي الجنة یعنی فی جناب الدنیا التي تنتقل اليها ارواح المؤمنين (علی بن ابراہیم)

اس کے بعد مَآ دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اور اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ دونوں فقروں میں کوئی دشواری باقی نہیں رہتی۔

فَلَا تَكُ فِي مَرْيَةِ هِمًّا يَعْبُدُ هُوَ لَا ۗ مَا يَعْبُدُونَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَاؤُهُمْ مِّنْ

قَبْلُ ۗ وَاِنَّا لَمَوْفُوهُمۡ نَصِيْبُهُمْ غَيْرَ مَنقُوصٍ ۝۱۰۹

”تو جن چیزوں کی یہ عبادت کرتے ہیں ان سے تمہیں کوئی تردد نہ ہونا چاہیے، یہ نہیں عبادت کرتے مگر اسی طرح کہ جیسے اس کے پہلے ان کے باپ دادا عبادت کرتے تھے اور ہم پورا پورا ان کا حصہ انہیں دیں گے، جس میں کوئی کمی نہ ہوگی۔“

اس تمہیں کا مخاطب رسولؐ کو نہیں ماننا چاہیے یا تو لفظی طور پر ہی جیسا کہ بہت سے مقامات پر ہم نے اسے ترجیح دی ہے کہ مخاطب شخصیت خاص نہیں بلکہ ہر سننے والا اور سمجھنے والا ناظر کتاب یا سامع قرآن ہے اور یا لفظی طور پر رسولؐ کے مخاطب ہوتے ہوئے مقصود اس سے آپ کی امت کو منتنبہ کرنا ہے۔^[۱]

جس کی نظیریں بھی قرآن مجید میں بہت ہیں۔

”پورا پورا حصہ“ دینے سے ایک لطیف پیرایہ ہیں پوری پوری سزا دینا مراد ہے۔

وَلَقَدْ اَتَيْنَا مُوسٰى الْكِتٰبَ فَاخْتَلَفَ فِيْهِ ۗ وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ

لَقَضٰى بَيْنَهُمْ ۗ وَاِنَّهُمْ لَفِي شَكِّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۝۱۱۰ وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيْنَهُمْ رَبُّكَ

اَعْمَالَهُمْ ۗ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۱۱۱

”اور ہم نے موسیٰؑ کو کتاب عطا کی تو اس میں اختلاف پیدا ہوا اور اگر نہ ہوتی اللہ کی طرف کی بات جو پہلے طے ہو چکی تھی تو ان کے درمیان فیصلہ ہو جاتا اور وہ یقیناً اس میں پریشان کرنے والے شک میں مبتلا ہیں اور بلاشبہ ہر ایک کو ایک وقت پورا پورا دے گا تمہارا پروردگار ان کے اعمال کا معاوضہ۔ یقیناً وہ اس سے جو وہ کرتے ہیں، بانجبر ہے۔“

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو جو اپنی قوم کے انکار سے دل تنگی پیدا ہوتی تھی اس کی بناء پر بہت سی آیات میں گزشتہ انبیاء کی نظیریں پیش کر کے آپ کو تسلی دی گئی ہے۔ یہاں حضرت موسیٰؑ کی مثال اسی مقصد سے دی گئی ہے۔^[۲]

فَاَسْتَقِمُّ كَمَا اُمِرْتُ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۗ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۱۱۲

وَلَا تَرَكُوْا اِلٰى الدِّیْنِ ظَلْمًا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۗ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ

[۱]. نہی اللہ تعالیٰ نبیہ و المراد بہ امتہ (تبیان)

[۲]. اراد بذلک تسلیة النبی ﷺ علی تکذیب قومہ (تبیان)

أُولِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنصِرُونَ ﴿١١٣﴾

”تو مضبوطی سے برقرار رہیے جیسا کہ آپ مامور ہیں اور وہ بھی جو آپ کے ساتھ لوگاتے ہیں اور تم لوگ سرکشی نہ کرو۔ یقیناً جو جو کچھ تم کرتے ہو اس کا دیکھنے والا ہے اور ان کی طرف جو ظالم ہیں نہ جھکو کہ پہنچے تم کو آتش دوزخ اور اللہ کو چھوڑ کر تمہارے کوئی حوالی موالی نہ ہوں گے پھر تمہاری مدد نہ ہوگی۔“

”یہ برقرار رہنا“ انتہائی مشکل کے باوجود حق کے جادہ پر ثابت قدم رہنا ہے جس کی جاہل لوگ ضد سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی کی خالق کی طرف سے رسول کو ہدایت ہے [۱] اور ان کے ان پیروؤں کو جو اللہ سے لوگائے ہوں یعنی اس کی مرضی کے مقابلہ میں دنیا کی پرواہ نہ کریں اور اس کے مقابل کردار کو سرکشی سے تعبیر فرمایا ہے جس پر ان الفاظ میں ڈرایا گیا ہے کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس کو دیکھنے والا ہے۔“

وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفِي النَّهَارِ وَزُلْفَا مِنْ اللَّيْلِ ط إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُدْهَبْنَ السَّيِّئَاتِ ط ذَلِكَ ذِكْرِي لِلذَّاكِرِينَ ﴿١١٤﴾

”اور نماز ادا کرو دن کے دونوں طرف کے حصوں میں اور رات کے کچھ حصوں میں یقیناً نیکیاں ختم کر دیتی ہیں برائیوں کو۔ یہ یاد آوری ہے ان کے لئے جو یاد تازہ رکھنا چاہیں۔“

اوقات نماز میں صبح، ظہرین اور مغربین، تین وقتوں کا تذکرہ

اس پر سب متفق ہیں کہ دن کے دونوں طرف کے حصوں میں نماز سے مراد صبح اور ظہر و عصر ہے اور رات کے حصوں میں نماز سے مراد مغرب و عشاء ہے جیسا کہ تفسیر جلالین میں ہے:

طرفي النهار الغداة والعشي اي الصبح والظهور والعصر و زلفا جمع زلفه اي طائفة من الليل المغرب والعشاء.

دن کے دونوں طرف کے حصے صبح اور دوپہر سے شام تک یعنی صبح اور ظہر و عصر اور زلف کا لفظ کا زلفہ کی جمع ہے یعنی رات کا ایک حصہ اس میں مغرب اور عشاء ہے۔

اسے جس طرح قرآن نے کہا ہے اس سے اوقات نماز کے بارے میں جو فقہ جعفری کی تعلیم ہے، وہی ثابت ہوتی ہے۔
جہور کا تصور کیا ہے؟ یہ کہ پانچ نمازوں کے پانچ الگ الگ وقت ہیں جن کے درمیان ایسے وقفے گزرتے ہیں جو کسی بھی نماز سے تعلق نہیں رکھتے۔

طلوع صبح صادق سے طلوع آفتاب تک صبح کا وقت ہے اور طلوع آفتاب کے بعد سے زوال تک کسی نماز کا وقت نہیں ہے ویسے زوال آفتاب کے بعد تھوڑی دیر تک ظہر کا وقت ہے اس کے بعد ظہر کا وقت نکل جاتا ہے اور ابھی عصر کا وقت آتا نہیں ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ درمیان

[۱]. امر الله التبي والتقى وامتة ان يستقيموا كما امرهم الله (تبيين)

میں ایک جز ایسا آگیا جس میں کسی نماز کا وقت نہیں ہے ایسے ہی عصر کے بعد مغرب تک ایک وقفہ ہوتا ہے جو نماز سے خالی ہے اور مغرب کے بعد پھر ایک وقفہ ایسا ہے جس میں عشاء کا وقت داخل نہیں ہوتا اور اس کے بعد عشاء کی نماز ہے جس کے بعد صبح تک پھر نماز واجب کا وقت نہیں ہے اگر یہ صورت ہو تو قرآن کو نماز کے پانچ وقت الگ الگ بیان کرنا چاہئیں۔ وہ کہے کہ دن کے ابتدائی حصہ میں نماز قائم کرو۔ پھر بیچ میں نماز ادا کرو، یہ ظہر ہے۔ پھر آخر کے کچھ حصہ میں نماز ادا کرو جو نماز عصر ہے۔ پھر رات کے اول حصہ میں ادا کرو۔ یہ مغرب ہوگی۔ پھر رات کے درمیانی حصہ میں ادا کرو یہ عشاء ہوگی۔ مگر قرآن تمام اوقات کو تین پر تقسیم کر رہا ہے۔ دو طرفی النہار ”دن کا اول اور آخری حصہ“..... اول حصہ میں صبح ہے اور آخر حصہ میں ظہر و عصر ہے۔ معلوم ہوا کہ صبح اور ظہر کے بیچ میں ایسا وقفہ ہے جس میں کسی نماز کا وقت نہ ہو مگر دن کا آخر حصہ پورا نماز کے وقت کا ہے جس میں صرف ترتیب ظہر کے پہلے اور عصر کے بعد میں ہونے کی وجہ سے عقلاً کوئی ایک جز ایک سے مختص ہو جائے وہ اور بات ہے ورنہ اس پورے وقت میں یہ دونوں نمازیں ادا ہو سکتی ہیں اور پھر رات کا کچھ حصہ ہے جس میں مغرب اور عشاء دونوں کا وقت مشترک ہے یہ اور بات ہے کہ ترتیب کی وجہ سے شروع کا کچھ جز مغرب سے اور آخر کا کچھ جز عشاء سے مختص ہو جائے۔ ورنہ یہ پورا وقت ان ہی نمازوں کا جنہیں ہم ”مغربین“ کہتے ہیں یہی فقہا مامیہ کی تعلیم ہے اور یہی صاف قرآن سے ثابت ہے۔

اس کے علاوہ یہ دیکھئے کہ مغرب اور عشاء دونوں کے وقت کو زلفاً من الیل کہا جاتا ہے رات کا کچھ حصہ ظاہر ہے کہ تاریکی چھائے ہوئے بغیر رات کو اطلاق کسی حیثیت سے نہیں ہو سکتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ فقط سورج کی نکلیا کی نظر سے اوجھل ہونے کے ساتھ جب تک کچھ تاریکی آ نہ جائے، نماز مغرب کا وقت نہیں آتا۔ جس طرح روزہ کے اختتام کے لئے کہا ہے:

أَتَشُوا الصَّيَّامَ إِلَى الْيَلِ
روزہ کو رات تک مکمل کرو۔

معلوم ہوا کہ اس جز میں بھی فقہ جعفری ہی قرآن کے موافق ہے کہ غروب حسی یعنی آفتاب کے نگاہ سے غائب ہونے پر فوراً نہ نماز مغرب پڑھنا درست ہے اور نہ روزہ کھولنا۔ صبح ہے بلکہ انتظار کرنا چاہیے کہ ذرات تاریکی پیدا ہو جائے اور وہ اسی وقت ہوگی کہ جب حرہ مشرقیہ زائل ہو جائے اور سیاہی سر کے قریب آجائے بغیر اس کے لیل کا اطلاق کسی طرح بھی درست نہیں ہے اور بغیر لیل کے آئے ہوئے از روئے قرآن نہ مغرب کی نماز پڑھنا درست ہے اور نہ روزہ کھولنا۔

وَاصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿١١٥﴾

”اور صبر برداشت سے کام لیجئے، اس لئے کہ اللہ اچھے اعمال کرنے والوں کے ثواب کو برباد نہیں کرتا“۔

یہاں پر ترتیب اگر مطابق تزیل ہے تو صبر برداشت کا حکم گزشتہ دونوں آیات کے مضمون سے مجموعاً متعلق ہو سکتا ہے یعنی راہ حق میں جو مشکلات درپیش ہوں، ان پر صبر سے کام لے استقامت یعنی ثبات قدم برقرار رکھئے اور پابندی فرائیں میں محافظت اوقات رکھتے ہوئے، عام طور پر ایسی پابندی میں انسان کو جو کلفت یعنی زحمت محسوس ہوتی ہے اسے برداشت کیجئے۔^[1]

اور یہ پہلے ہی آچکا ہے کہ یہ حکم خاص رسول کو نہیں ہے بلکہ آپ کے ساتھ آپ کے وفادار افراد امت کو بھی ہے۔

[1]. امر اللہ تعالیٰ نبیہ ﷺ بالصبر علی اذی قومہ.. و علی القیام بما افترض علیہ من اداء الواجب (تبیان)

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُو بَقِيَّةٍ يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ
إِلَّا قَلِيلًا مِمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۗ وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا

مُجْرِمِينَ ﴿١١٦﴾

”تو کیوں نہ ہوئے ان اقوام میں جو تمہارے پہلے تھیں ایسے بچے کچھ سمجھ دار لوگ جو زمین میں خرابیاں پھیلانے سے منع کرتے سوا تھوڑے سے ایسے افراد کے جن کو ہم نے نجات دی ان میں سے ظالم تھے وہ پیچھے لگے رہے ان عیش و عشرت کی لذات کے جو انہیں دی گئی تھیں اور وہ گناہ گار تھے۔“

یعنی ہر قوم میں تھوڑے ایسے ضرور تھے جو ان کی بد اعمالیوں سے الگ تھے اور انہیں منع بھی کرتے تھے چنانچہ ہمیشہ عذاب نازل ہونے کے موقع پر محدودے چند بچے جاتے تھے لیکن اگر بہت سے ایسے افراد ہوتے جو برائیوں سے روکیں تو قوم پر عذاب نازل ہی نہ ہوتا۔^[۱]
اولو بقیۃ کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے بچے کچھ سمجھ دار لوگ یہ مختلف تفسیروں سے مستفاد ہوتا ہے۔^[۲]

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ ﴿١١٧﴾

”اور تمہارا پروردگار ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو تباہ کرے ظلم کے ساتھ حالانکہ ان کے باشندے درست اعمال ہوں۔“
یعنی عذاب الہی بلا وجہ نہیں آیا کرتا جب تک کے وہاں کے باشندوں کے اعمال ایسے خراب نہ ہوں کہ انہیں سزا دینا ضروری ہو۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُُونَ مُخْتَلِفِينَ ﴿١١٨﴾ إِلَّا مَنْ رَحِمَ
رَبُّكَ ۗ وَلِلذِّكِّ خَلْقُهُمْ ۗ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ
وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿١١٩﴾ وَكَلَّا نَقْصُصُ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ
فُؤَادَكَ ۗ وَجَاءَكَ فِي هَذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿١٢٠﴾

”اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو سب کو ایک مذہب پر بنا دیتا۔^[۳] اور وہ برابر اختلاف کرتے رہیں گے سوا اس کے جس کو تمہارے پروردگار کا رحم و کرم شامل حال ہو حالانکہ اس نے پیدا نہیں اسی لئے کیا تھا اور تمہارے پروردگار کی بات پوری ہوئی کہ میں ضرور بھر دوں گا دوزخ کو جنات اور انسانوں سے۔ اور پیغمبروں کے واقعات میں سے ہر وہ

[۱]۔ یعنی نیک لوگ غالب ہوتے تو قوم ہلاک نہ ہوتی تھوڑے تھے سوا بچے گئے (موضح القرآن)

[۲]۔ ای کان یجب ان یکون منهم قوم باقون فی الارض ینہون۔ و معنی اولو بقیۃ اصحاب جماعته تبقی من نسلهم و البقیۃ مدوحۃ یقال فی فلان بقیۃ ای فیہ فضل و خیر (تبیان) اہل خرد (شاہ ولی اللہ) صاحب شعور کے (شاہ فنج الدین)

[۳]۔ امة واحده ای علی دین واحد کہا قال: انا وجدنا بائنا علی امة (تبیان)

چیز ہم آپ کے سامنے بیان کرتے ہیں جس سے ہم آپ کے دل کو مضبوط کرتے ہیں اور آئی ہے آپ کے پاس اس میں حقیقت اور موعظت اور نصیحت اہل ایمان کے لئے۔

یہ آیت مشکلات قرآن میں سے ہوگئی ہے اور جبر کے ماننے والوں نے بلا تکلف اسے کہ اللہ نے انہیں اسی لئے پیدا کیا ہے اس معنی میں لے لیا ہے کہ خدا نے اسی اختلاف کے لئے ان کو پیدا کیا ہے [۱] اور اس نے پہلے سے طے کر دیا ہے کہ دوزخ کو ان سے بھرا جائے گا مگر عقلی طور پر یہ دونوں باتیں متضاد ہیں اگر اس نے اسی اختلاف کے لئے انہیں پیدا کیا ہے تو اختلاف کر کے وہ اس کے مقصد کی تکمیل کرتے ہیں پھر دوزخ کو ان سے کیوں بھرا جائے اور اگر وہ اس اختلاف میں مبتلا ہو کر دوزخ میں بھیجے جانے کے مستحق ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اختلاف کے لئے انہیں پیدا نہیں کیا ہے اور وہ اختلاف کر کے اس کی مرضی کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ اسی لئے دوزخ کے مستحق بنتے ہیں مگر جب کہ اس سے پہلے قریب ہی من رحم ربك موجود ہے تو کیوں نہ ”ذالك“ کا مشاۃ الیہ اسی رحمت کو قرار دیا جائے جس کی تائید میں ہمارے قدیم مفسرین کے اقوال موجود ہیں اور اس لئے ہم نے ترجمہ اسی کے مطابق کیا ہے۔ [۲]

یعنی قرآن میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں یا یہ کہ اس سورہ میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں [۳] وہ کوئی تاریخ نگاری یا قصہ گوئی کے مقصد سے نہیں ہیں بلکہ ان میں کچھ عملی پہلو ہوتے ہیں جن کی طرف توجہ دہانی منظور ہوتی ہے۔

وَقُلْ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ اَعْمَلُوا عَلٰی مَا كَانْتُمْ ۙ اِنَّا عَمِلُوْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَاَنْتُمْ تَنْتَظِرُوْنَ ۙ اِنَّا

مُنْتَظِرُونَ ﴿۱۳۲﴾

”اور کہیے ان سے جو ایمان نہیں لاتے تم اپنے طور پر عمل کرتے رہو، ہم بھی عمل کر رہے ہیں اور انتظار کرو، ہم بھی انتظار رکھتے ہیں۔“

یعنی تمہارے اور ہمارے اعمال کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے دیکھنے کے تم بھی منتظر ہو، ہم بھی منتظر ہیں۔

وَاللّٰهُ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهُ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ

عَلَيْهِ ۙ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۳﴾

”اور اللہ سے مخصوص ہے آسمانوں اور زمین کے غیب کا علم اور اسی کی طرف تمام تر معاملہ کی رجوع ہے تو اسی کی عبادت اور اسی پر بھروسہ کرو اور تمہارا پروردگار اس سے جو تم لوگ کرتے ہو بے خبر نہیں ہے۔“

[۱] برای این اختلاف آفریده است ایشان را (شاہ ولی اللہ)

[۲] خلقهم یعنی اهل امة لا یختلفون فی الدین (علی بن ابراہیم) قال ابن عباس و مجاهد و قتادة و الضحاك ان المवाद: وللرحمة خلقهم (تبیان)

[۳] در این سورہ (شاہ ولی اللہ) فی ہذا آیات و الانبیاء (جلالین) الاوّل اصحّ و التقدير جاء في هذه السورة المحق مع ما جاء في سائر السور (تبیان)

سُورَةُ يُوسُفَ

مکیہ ----- آیات

جناب یوسف علیہ السلام کا نام تو بسلسلہ انبیاء اور انفرادی طور پر قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر موجود ہے لیکن اس واقعہ کا ذکر جسے قصہ یوسف کہا جاتا ہے اور قرآن نے اسے تمام قصوں میں بہترین کہا ہے، اس سورہ میں درج ہے پھر خود اسی واقعہ کے ذیل میں بہت سی عبرتیں، نصیحتیں اور تعلیمات موجود ہیں۔ مثلاً

سورہ یوسف کے خاص خاص موضوعات:

- ۱----- خوفِ فتنہ، خوفِ خدا یا کسی اہم مصلحت کی وجہ سے حقیقتوں اور واقعیتوں کے انخفاء کا مستحسن ہونا۔
- ۲----- باوجود دوسرے پر حقیقتاً اطمینان نہ ہونے کے پھر بھی ظاہری قول و قرار پر تمام حجت کے لئے اعتماد کر کے عمل کرنا۔
- ۳----- وقتی تکالیف اور مصائب میں حکمت ربانی کے جلوے اور انجام میں کامیابی و کامرانی اور بہتر سے بہتر نتیجہ کا ظہور۔
- ۴----- امانت داری اور پاک دامانی کی اہمیت اور سخت ترین ماحول میں خطرات کی پرواہ کیے بغیر اس پر ثبات و قرار۔
- ۵----- تبلیغِ حق کے لئے مناسب موقع سے فائدہ اٹھانا اور قید و بند یا کسی بھی عالم میں اپنے نصب العین کو نظر انداز نہ کرنا۔
- ۶----- قید و مصیبت سے رہائی کہ بہ نسبت زیادہ اہم جرم سے اپنے بری ہونے کی تصدیق۔
- ۷----- رہنمائے دین کی معاشی نظام کی حکمتوں سے بہترین واقفیت۔
- ۸----- دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی مجبوری کے مشاہدہ سے رحم دلانہ تاثر۔
- ۹----- نظر بد کے خطرہ کی مذہبی اصلیت۔
- ۱۰----- گریہ کا جواز۔
- ۱۱----- گریہ باوجود علمِ بحیات
- ۱۲----- ظالموں کو گریہ سے ناگواری اور ان کی طرف سے اس پر اعتراض
- ۱۳----- قابو پا کر اپنے ظالموں کے ساتھ عفو و کرم کا مظاہرہ۔
- ۱۴----- سجدہِ تعظیمی کا سابق میں جواز اور اس کے شرک نہ ہونے کا ثبوت۔
- ۱۵----- اکثریت کا راہِ ایمان سے انحراف وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

الرَّتِّ تِلْكَ آيَةُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ ① اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ قُرْءَانًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ②
 ”الف۔ لام۔ را۔ یہ واضح کتاب کی آیات ہیں ہم نے اسے عربی زبان کا قرآن بنا کر اتارا ہے، شاید تم لوگ عقل سے کام لو“۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصِصِ مِمَّا اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْآنَ ۗ وَاِنْ
 كُنْتَ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ③

”ہم آپ کے سامنے بہترین قصے سناتے ہیں اس سے جو ہم نے آپ کی طرف قرآن کی وحی بھیجی ہے اگرچہ آپ اس سے پہلے بے خبر تھے“۔

یعنی ہماری تعلیم سے قطع نظر کر کے ذرا آپ کسی بھی علم و اطلاع کے مالک نہ تھے کیونکہ آپ تو مخلوق ہیں مخلوق کا کوئی کمال بھی اس کا ذاتی

نہیں ہو سکتا۔

اِذْ قَالَ يُوسُفُ لِاَبِيْهِ يَا اَبَتِ اِنِّیْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَّ الْقَمَرَ
 رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ④ قَالَ يَبْنَیْ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰی اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا
 لَكَ كَيْدًا ۗ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسٰنِ اَعْدُوٌّ مُّبِيْنٌ ⑤ وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ
 وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلٰیكَ وَعَلٰی اٰلِ يٰعْقُوْبَ كَمَا
 اَتَمَّهَا عَلٰی اَبُوَيْكَ مِنْ قَبْلِ اِبْرٰهِيْمَ ۗ وَاَسْحَقُ ۗ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ⑥

”جب کہا یوسف نے اپنے باپ سے کہ اے بابا! میں نے خواب میں دیکھا گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو اپنے سامنے سجدہ کرتے ہوئے۔ انہوں نے کہا اے بیٹا اپنا خواب اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کرنا کہ کہیں تمہیں نقصان پہنچانے کے لئے کوئی سازش نہ کریں۔ یقیناً شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے اور اسی طرح تمہیں تمہارا پروردگار امتیاز عطا کرے گا اور تمہیں تعبیر خواب کا علم عطا کرے گا اور اپنی نعمت تم پر پوری کرے گا اور یعقوب کے خاندان پر جس طرح اس نے اسے پورا کیا اس کے پہلے تمہارے آباؤ اجداد میں سے دو ابراہیم اور اسحاق پر، یقیناً تمہارا پروردگار جاننے والا ہے، بڑا ٹھیک کام کرنے والا“۔

جناب یوسف علیہ السلام کا خواب اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے گفتگو

اس طرح تمہیں تمہارا پروردگار عطا کرے گا یعنی جیسے تمہیں اس نے اپنے فضل و کرم سے یہ خواب دکھایا، اسی طرح عالم مشاہدہ میں بھی تمہیں امتیاز عطا کرے گا۔^[۱]

لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٍ لِلنَّاسِ لِيُنْذِرُوا

”بلاشبہ یوسف اور ان کے بھائیوں (کے حالات) میں نشانیاں ہیں سوال کرنے والوں کے لئے“۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

برادران یوسف کا منصوبہ اور یوسف کے ساتھ بدسلوکیاں

”نقل ہے کہ قریش نے یہود سے کہا کچھ بتاؤ کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھیں سچ آزمانے کو کہا۔ پوچھو کہ ابراہیم علیہ السلام کا وطن شام ہے اس کی اولاد بنی اسرائیل مصر میں کیوں کرائی۔ فرمایا کہ پوچھنے والے کو نشانیاں ہیں قریش کی کہ یہ ایک بھائی کا حسد تھا کہ اطاعت قبول نہ کی۔ آخر اللہ نے اس کی طرف محتاج کیا اور اس طرح یہود حسد کر کے خراب ہوئے اور قریش نے بھائی کو وطن سے نکالا، وہیں اس کو عروج ہوا“۔ (موضح القرآن)

پھر یہ نشانی اس مثال عمل کے ساتھ بھی مطابق ہے کہ بھائیوں نے تو کس طرح ایذا نہیں پہنچائیں اور جناب یوسف علیہ السلام نے انہیں معاف کیا اور درگزر سے کام لیا جو بلاشبہ ایک غیر معمولی کردار تھا^[۲] اسی طرح پیغمبر خدا نے قریش کی ایذاؤں کے باوجود جب ان پر فتح مکہ میں قابو پایا تو عام معافی کا اعلان فرمادیا۔

إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَيْنَا مِمَّا نَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ آبَاءَنَا لَفِي ضَلَالٍ

مُبِينٍ^[۱] اقْتُلُوا يُوسُفَ أَوْ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَبْحُلُ لَكُمْ وَجَهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا

مِنْ بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ^[۲]

”جب انہوں نے کہا کہ یوسف اور ان کا بھائی، یہ ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ محبوب ہیں“۔ حالانکہ ہم اتنے ہیں طاقت ور یقیناً ہمارے باپ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں۔ قتل کر دو یوسف کو یا کسی اور سرزمین پر لے جا کر ڈال دو کہ تمہارے باپ کی توجہ تمہاری طرف ہو جائے اور تم اس کے بعد پھر نیک لوگ ہو جانا“۔

برادران یوسف کی گفتگو سے ظاہر ہے کہ وہ بغض و حسد وغیرہ صفات ذمیرہ رکھنے کے علاوہ ایک نبی خدا یعنی اپنے باپ کی نبوت پر ایمان بھی نہ رکھتے تھے ورنہ وہ انہیں گمراہ قرار نہ دیتے اور اس لئے علمائے شیعہ کو جمہور کے اس تصور سے کہ وہ برادران یوسف کی نبوت کے قائل ہیں

[۱]. کہا اگر مک بان اراک فی منامک ہذا الرؤیا (تبیان)

[۲]. وکان ذلک خروجا عن العادات (تبیان)

شدیدا اختلاف ہے۔^[۱]

یہ سب کر لو پھر نیک لوگ ہو جانا یعنی بعد میں توبہ کر لینا۔^[۲]

یہ توبہ کا وہ عام تصور ہے جو بہت سے لوگوں کے ذہن میں ہے اور جس سے وہ بے باکانہ جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں حالانکہ توبہ کوئی ایسا عمل نہیں ہے کہ جب چاہے آدمی اسے کر لے بلکہ وہ صحیح احساس گناہ اور پشیمانی کا نام ہے اگر یہ صحیح احساس گناہ شروع سے ہے اس لئے آدمی توبہ کا واقعہ تصور رکھتا ہے تو وہ ارتکاب گناہ ہی کیوں کرے گا۔

قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَفْتُلُوا يُوسُفَ وَأَلْقُوهُ فِي غَيَابَتِ الْحُبِّ يَلْتَقِطُهُ بَعْضُ

السَّيَّارَةِ إِنْ كُنْتُمْ فَعِلِينَ^[۱۰]

’ان میں سے ایک نے کہا کہ یوسف کو قتل نہ کرو اور اندھیرے کنویں میں انہیں ڈال دو تو مسافروں کے قافلوں میں سے کوئی انہیں اٹھالے جائے گا اگر ایسا کرنا چاہتے ہو۔‘

یعنی یہ تمہارا مقصد ہے کہ یوسف کو باپ کی نظر سے اچھل کر دو تو یہ صورت اس کے لئے زیادہ مناسب ہے۔^[۳]

قَالُوا يَا أَبَانَا مَا لَكَ لَا تَأْمَنَّا عَلَى يُوسُفَ وَإِنَّا لَهُ لَنَصِحُونَ^[۱۱] أَرْسَلَهُ مَعَنَا غَدًا

يَرْتَعُ وَيَلْعَبُ وَإِنَّا لَهُ لَكٰفِظُونَ^[۱۲] قَالَ إِنِّي لَيَحْزُنُنِي أَنْ تَذْهَبُوا بِهِ وَأَخَافُ أَنْ

يَأْكُلَهُ الذِّئْبُ وَأَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُونَ^[۱۳] قَالُوا لَئِنْ أَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّا

إِذَا الْخٰسِرُونَ^[۱۴]

’ان لوگوں نے کہا اے ہمارے والد صاحب! کیا بات ہے کہ آپ یوسف کے بارے میں ہم پر اطمینان نہیں کرتے حالانکہ ہم ان کے خیر خواہ ہیں، کل ہمارے ساتھ انہیں بھیج دیجئے کہ باغوں سے بہرہ اندوز ہوں^[۴] اور کھیل کود میں مصروف رہیں اور ہم سب ان کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں، کہا مجھے اس سے صدمہ ہوگا کہ تم اسے لے جاؤ اور ڈرتا ہوں کہ اسے بھیڑ یا نہ کھالے دریاں حالیکہ تم اس کی طرف سے غفلت میں رہو۔ انہوں نے کہا اگر بھیڑ یا نہیں کھالے اس صورت میں کہ ہم ایک مضبوط جماعت کی حیثیت رکھتے ہیں تو ہم یقیناً بڑے خسارے میں ہیں۔‘

یعنی اتنی تعداد اور اتنی قوت میں ہونے کے باوجود یہ ہو ہی کیوں کر سکتا ہے کہ ہمارے ہوتے ہوئے بھیڑ یا ہمارے بھائی کو کھاجائے۔

[۱]۔ ہو مذہبنالان الانبياء لا يجوز ان يقع منهم القبايح (تبیان)

[۲]۔ بان تتربو (جلالین)

[۳]۔ ان كنتم فاعلین ما اردتم من التفريق فاكتفوا بذلك (جلالین)

[۴]۔ ينال الملاذو يتفرج (تبیان)

جناب یعقوبؑ نے یہ کیوں کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں بھیڑ یا نہ کھا جائے؟ بعض کا خیال ہے کہ یہ وہ چیز ہے کہ جسے دل کو خبر ہونا کہتے ہیں۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”ان کو بھیڑیے کا بہانہ کرنا تھا وہی ان کے دل میں خوف آیا“۔ (موضح القرآن)

دوسرا خیال یہ ہے کہ اس سرزمین پر بھیڑیوں کی کثرت تھی اور یہ خطرہ عموماً رہتا تھا جیسا کہ تفسیر جلالین میں ہے

وكانت ارضاً كثيرة الذئاب.

اس سرزمین پر بھیڑیوں کی کثرت تھی۔

یا جیسا شیخ الطائفہ نے تحریر فرمایا ہے:

لان الذئاب كانت ضاربة في ذلك الوقت (تبیان)

ان دنوں میں عموماً بھیڑیے بچوں کو پھاڑ دیا کرتے تھے۔

یہ کہ ایسا کہنا کسی علم ربانی کا نتیجہ تھا اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ حقیقت میں بھیڑ یا یوسفؑ کو کھانے والا تھا ہی نہیں۔ وہ تو بھائیوں نے بعد میں جھوٹا بہانہ کیا تھا اور کوئی شخص تو ایسا کہہ سکتا ہے کہ ان کے لئے جناب یعقوبؑ کا یہ اندیشہ ظاہر کرنا، ”سرورِ بستان یادادان“ کا مصداق بن گیا کہ انہیں بہانہ بنانے کے لئے پھر کچھ سوچنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔

مگر ہمارے ذہن میں تو اس کے خلاف یہ پہلو پیدا ہوتا ہے کہ جناب یعقوبؑ کا بطور پیش بندی یہ کہہ دینا کہ ایسا تمام حجت کا انداز ہے کہ ان کے لئے اس طرح کے بہانہ کا سدباب ہو جانا چاہیے جب کہ وہ یہ کہہ چکے تھے کہ ہماری اتنی تعداد ہے کہ اس خطرہ کا تصور ہی نہیں کرنا چاہیے کہ ہمارے ساتھ کے ایک فرد کو بھیڑ یا کھا جائے اس کے بعد ان کی یہ سراسر مہملیت تھی کہ انہوں نے ایسی ہی بات تراشی جسے وہ خود ناممکن کہہ چکے تھے۔

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَاجْتَمَعُوا أَن يُجْعَلُوهُ فِي غَيْبَتِ الْجُبِّ ۗ وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ

لَتَنْبِئَنَّهُمْ بِأَمْرِهِمْ هَذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿١٥﴾

”تو وہ جب انہیں لے گئے اور اس پر متفق ہوئے کہ انہیں اندھیرے کنویں میں ڈال دیں اور ہم نے ان کی طرف

وحی بھیجی کہ تم انہیں بتلاؤ گے ان کی اس کارگزاری کو جب کہ انہیں اس کا شعور نہیں ہوگا“۔

جب وہ اس پر متفق ہوئے تو کیا ہوا؟ یہ واضح ہونے کی بنا پر محذوف ہے یعنی انہوں نے ایسا کر دیا۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

آگے نہ فرمایا کہ کیا ہوا؟ اس واسطے کہ لائق بیان نہیں جو کچھ بھائیوں نے سلوک کیا“ (موضح القرآن)

اس کے بعد جو فرمایا ہے کہ ہم نے ان کی طرف وحی بھیجی، یعنی یوسفؑ کو ہم نے یہ اطلاع دیدی بطور تسلی اور دل میں ڈال دیا کہ گھبراننا

نہیں۔ اس کا انجام تمہارے حق میں اچھا ہوگا اور انہیں آخر میں ناکامی ہوگی جس کا انہیں اس وقت احساس نہیں ہے۔^[۱]
 بعد کو جن واقعات کی تفصیل سامنے آئے گی کہ بار بار یوسفؑ کے دربار میں حاضر ہونے کے بعد ان بھائیوں نے یوسفؑ کو نہ پہچانا اور
 آخر میں جب موقع ہوا تو خود جناب یوسفؑ نے انہیں متنبہ کیا کہ تم نے یوسفؑ کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا اور بتلایا کہ میں یوسفؑ ہوں، یہ سب
 اس وقت کی وحی کے اجمال میں کہ تم انہیں بتلاؤ گے ان کی اس کارگزاری کو اور انہیں اس کا شعور نہ ہوگا، مضر ہے۔^[۲]

وَجَاءُوا آبَاهُمْ عِشَاءً يَبْكُونَ ﴿١٦﴾ قَالُوا يَا أَبَانَا إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا
 يُوسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ ۗ وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا
 صَادِقِينَ ﴿١٧﴾ وَجَاءُوا عَلَى قَمِيصِهِ بِدَمٍ كَذِبٍ ۖ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ
 أَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَى مَا تَصِفُونَ ﴿١٨﴾

”اور وہ اپنے باپ کے پاس شام کو روتے ہوئے آئے، کہنے لگے ”اے ہمارے باپ! ہم گئے دوڑ میں مقابلہ
 کرنے آپس میں اور یوسفؑ کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ گئے اور بھیڑیا آیا اور انہیں کھا گیا اور آپ ہماری بات کا
 یقین نہیں کریں گے، چاہے ہم سچے ہو“۔ اور لائے ان کے کرتے پر جھوٹا خون لگا کر، انہوں نے کہا بلکہ تمہارے
 نفس نے تمہارے لئے ایک بات بنائی ہے خیر میں صبر کرتا ہوں جو اچھا ہے اور اللہ ہی سے مدد حاصل کی جاسکتی ہے
 اس کے مقابلہ میں جو تم بیان کرتے ہو“۔

وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلَى دَلْوَهُ ۖ قَالَ يَبُشْرَىٰ هَذَا غُلْمٌ ۖ
 وَأَسْرُوهُ بَضَاعَةً ۖ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿١٩﴾ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ
 مَعْدُودَةٍ ۗ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ ﴿٢٠﴾

”اور ایک قافلہ آیا تو ان لوگوں نے اپنے پانی لانے والے کو^[۳] بھیجا تو اس نے اپنا ڈول ڈالا، کہا ارے خوش خبری
 ہو یہ ایک لڑکا ہے اور ان لوگوں نے پوشیدہ رکھا اسے ایک سرمایہ قرار دے کر اور اللہ جاننے والا ہے اس کا جو وہ
 کرتے ہیں اور ان لوگوں نے انہیں بیچا بہت کم چند گنتی کے چاندی والے سکوں کی قیمت پر اور وہ ان کی ناقدری
 کرنے والے تھے“۔

[۱]. اوحینا الیہ فی الحب ووحی حقیقہ... تطہینا لقلبہ (جلالین)

[۲]. فی روایۃ ابی جارد عن ابی جعفرؑ — یقول لایشعرون انک انت یوسف. (علی بن ابراہیم)

[۳]. الذی برد الماء لیستقی منه (جلالین)

یہ بیچنا جس کا ذکر ہے اس میں بیچنے والے وہی بھائی تھے۔^[۱]

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

بھائی وہاں گئے، کنویں میں نہ پایا، قافلہ پر دعویٰ کیا جب ثابت ہوا اٹھارہ درہم کو بیچ ڈالا۔ پھر آگے قافلہ والوں نے مصر میں جا کر بیچا۔ حق تعالیٰ نے صریحاً ایک بیچنا فرمایا۔ (موضح القرآن)
بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس کے پہلے جو ہے ان لوگوں نے پوشیدہ رکھا اسے ایک سرمایہ قرار دے کر یہ بھی برادران یوسف کا ذکر ہے تفسیر جلالین میں ہے:

معلمہ بہ اخوتہ فاتوہم و اسڑوہ ای اخضوا امرہ جا علیہ بضاعۃ بان قالوا ہو عبدنا ابق وسکت یوسف خوفاً ان یقتلوہ۔

ان کے بھائیوں کو یہ (قافلہ کا حال) معلوم ہو گیا تو وہ ان کے پاس آئے اور اسے چھپایا۔ یعنی ان کے اصل واقعہ کو چھپایا اسے اپنے لئے سرمایہ یعنی حصول مال کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے اس طرح کہ انہوں نے کہا کہ یہ ہمارا غلام ہے جو بھاگ کر آیا ہے یہاں یوسف خاموش رہے اس ڈر سے کہ وہ انہیں قتل نہ کر ڈالیں۔

اس صورت میں انہی (برادران) کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ان کی ناقدری کرنے والے تھے۔^[۲]

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِصْرَ لِمَرْأَتِهِ أَكْرَمِي مَثْوَاهُ عَسَىٰ أَنْ يَنْفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا ۗ وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهُ مِنْ تَأْوِيلِ

الْأَحَادِيثِ ۗ وَاللَّهُ غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۲۱﴾

’اور جس نے مصر سے انہیں خریدا، اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اسے عزت کے ساتھ رکھنا ممکن ہے یہ ہمیں فائدہ پہنچائے یا ہم اسے بیٹا بنالیں اور اس طرح دنیا میں ہم نے یوسف کو اقتدار ملنے کا سامان کیا اور اس لئے کہ ہم انہیں خوابوں کی تعبیر کا علم عطا کریں اور اللہ اپنے منشاء کے پورا کرنے پر قدرت رکھتا ہے لیکن زیادہ لوگ جانتے نہیں۔‘

تذکرہ عزیز مصر و لیثا

یہ قرآن مجید کا خاص انداز بیان ہے کہ یوسف کی جو دو دفعہ بیچ ہوئی ہے اور دو دفعہ ان کی خریداری ہوئی۔ پہلی دفعہ برادران یوسف نے بیچا اور اہل قافلہ نے خریدا اور دوسری دفعہ مصر میں جا کر اہل قافلہ نے بیچا اور عزیز مصر نے خریدا، ان میں پہلی جگہ قرآن نے بیچنے کا ذکر کیا خریداری کا نام نہیں لیا کہ اسے انسان اپنی عقل سے سمجھ لے اور دوسری جگہ خریداری کا ذکر کیا کسی کے فروخت کرنے کا نہیں اسے عقل پر چھوڑ دیا۔

[۱]. حکى الله تعالى عن اخوة يوسف انهم باعوا يوسف (تبیان)

[۲]. كانوا ای اخوتہ (جلالین)

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”مصر میں عزیز نے مول لیا، عزیز کہتے تھے بادشاہ کے مختار کو۔ اس نے ہوشیار دیکھ کر غلاموں کی طرح نہ رکھا، فرزند کی طرح رکھا کہ کاروبار میں نائب ہوگا۔ اس طرح حق تعالیٰ نے اس ملک میں اس کا قدم جمایا“ (موضح القرآن)

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ۗ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿۴۲﴾
 ”اور جب وہ پورے طور پر جوان ہوئے ہم نے انہیں حکمت اور علم عطا کیا اور یونہی ہم صلہ دیتے ہیں نیک اعمال اشخاص کو۔

بَلَّغَ أَشُدَّهُ عَرَبٌ كَمَا وَرَهُ هُوَ جَوْسٌ عَمْرٌ مِّنْ شَرُوعٍ هُوَ تَا هُوَ؟ اِسْ مِیْنِ اِخْتِلَافٍ هُوَ مَكْرَنْتِجِهَ سَبْ كَا وَهِي هُوَ جَسْ كَ لِحَاظِ سَ هَمْ نَ تَرْجَمَ كَيْ هُوَ ”پورے طور پر جوان ہوئے“۔^[۱]

وَرَأَوْدَتُهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنِ نَفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْآبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْت لَكَ ۗ
قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿۴۳﴾
 ”اور ان پر ڈول ڈالنے لگی^[۲] وہ جس کے گھر میں وہ تھے اور اس نے دروازوں کو بند کر دیا اور کہا بس آؤ^[۳] کہا اللہ کی پناہ۔ یہ میرے مالک ہیں جنہوں نے اچھی طرح مجھے اپنے مکان میں رکھا۔ یقیناً جو ظالم ہیں وہ بہتری نہیں پاسکتے۔“

واقعه یوسف و زلیخا

یہ میرے مالک ہیں۔۔۔ زیادہ مفسرین کے اقوال یہی ہیں کہ اس سے اشارہ زلیخا کے شوہر کی طرف ہے جس نے انہیں خریدا تھا اور اس طرح ظاہری حیثیت سے وہ ان کا مالک قرار پایا تھا۔^[۴]
 یہ شاہد ہے اس کا کہ اصل حقیقت سے قطع نظر، عامہ افراد کی زبان پر جو لقب یا وصف چڑھا ہوا ہے، اُس کا اطلاق اصل حقیقت پر کوئی ضرب نہیں ہے۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ ۖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنَّ رَأَىٰ بُرْهَانَ رَبِّهِ ۗ كَذَلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ

[۱]. شدہ ہو کمال لاقو کہو قال قوم ہو من ثمانی عشر ۵ سنۃ الی سنۃ سنۃ وقال ابن عباس من عشرین وقال مجاهد من ثلاث و

ثلاثین سنۃ والاشد جمع لاوا احد له من لفظه مستعمل (تبیان)

[۲]. المرادوة المطالبة بأمر للعجل به (تبیان)

[۳]. ای ہلم (جلالین)

[۴]. انه ای الذی اشترا فی دہی سیدی (جلالین)

السُّوَّةُ وَالْفَحْشَاءُ ط إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ ﴿٢٣﴾

”اور اس نے قصد کیا ان کی طرف اور وہ بھی قصد کرتے اس طرف اگر نہ دیکھتے اپنے پروردگار کی طرف کی دلیل [۱] اس لئے کہ ہم ان سے برائی اور ہوسنا کی دور رکھیں۔ یقیناً وہ ہمارے خالص چنے ہوئے بندوں میں سے تھے۔“
ہم نے جو ترجمہ کیا ہے اس میں یوسفؑ کی طرف سے قصد ثابت نہیں ہوتا مگر علمائے اہل سنت جو عدل باری کی طرح عصمت انبیاء کو بھی صدمہ پہنچانے کے خوگر ہیں، وہ اگر نہ دیکھتے اپنے پروردگار کی دلیل کے فقرہ کو الگ کر کے پہلے جملہ کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں کہ:
ہر آئینہ قصد کرد آن زن بسوی یوسفؑ و قصد کرد بسوی وے یوسفؑ (شاہ ولی اللہ)
اور دوسرے فقرہ کو الگ کر دیتے ہیں کہ:
”اگر نہ آں بودے کہ دیدے یوسفؑ دلیل پروردگار خود را می شد آنچه می شد“ اگر ایسا نہ ہوتا کہ دیکھتے یوسفؑ اپنے پروردگار کی دلیل تو جو ہونا تھا ہو جاتا۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ”اگر“ والی شرف کی جزاء محذوف ہے یعنی جس بات کا قصد کیا تھا وہ وقوع میں آجاتی۔
دلیل پروردگار کیا تھی؟ اس کے لئے فرماتے ہیں:

”صورت یعقوب حاضر شد انگشت بدندان گرفتہ“

یعقوبؑ کی صورت نظر آئی۔ اس طرح کہ انگلی دانتوں میں دبائے ہوئے ہیں۔

شاہ رفیع الدین ترجمہ کرتے ہیں:

”قصد کیا اس عورت نے ساتھ یوسفؑ کے اور قصد کیا یوسفؑ نے ساتھ اس کے۔“

جلالین صاحبان بھی پہلے فقرہ کو الگ کر دیتے ہیں اور لولا ان را برہان ربہ کے بعد کہتے ہیں:

جواب ”لولا“ لجامعها: لولا ”اگر ایسا ہوتا“ کا جواب یہ ہے کہ وہ اس سے مقاربت کر لیتے“

شاہ ولی اللہ نے فقط جناب یعقوبؑ کی صورت یوسفؑ کو دکھائی تھی اور انہوں نے اس حکایت میں یہ اضافہ کیا ہے کہ:

فضر ب صدرہ فخر جت شہوتہ من اناملہ :- یعقوبؑ نے ان کے سینہ پر ہاتھ مارا تو ان کی خواہش ان کے ہاتھ کی انگلیوں کے راستے سے باہر نکل گئی۔

یہ ہے ”مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ“ کا مصداق۔

یہ سب باتیں علمائے حق کے نزدیک غلط ہیں [۲] بلکہ اللہ کی طرف کی دلیل دیکھنے سے مقصود وہ بصیرت ہے [۳] جو اس فعل شنیع کے

ارتکاب سے انہیں سدرہ ہو۔

[۱]. اما تقدم جواب لولا (فجائز مستعمل) (تبیان)

[۲]. هذا الذي ذكره كالمه غير صحيح (تبیان)

[۳]. يجوز ان يكون الروية بمعنى العلم (تبیان)

اس بصیرت کا مظاہرہ عین اس وقت جو ہوا وہ ہمارے یہاں اس طرح وارد ہوا ہے کہ زلیخا نے اس وقت جب وہ اپنے منصوبہ کو پورا کرنے پر تل گئی تھی، اس بت پر جس کی وہ پرستش کرتی تھی پردہ ڈال دیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا یہ تم نے کیا کیا؟ کہا مجھے شرم آتی ہے کہ میں اپنے معبود کے سامنے اس فعل کا ارتکاب کروں۔ جناب یوسف علیہ السلام نے کہا تم اپنے اس معبود سے شرم کرتی ہو جو نہ آنکھوں سے دیکھتا ہے نہ کانوں سے سنتا ہے اور میں اپنے اس معبود سے شرم نہ کروں جو حاضر و ناظر ہے۔ بس یہ کہہ کر وہ دروازہ کی طرف دوڑے کہ گھر سے باہر نکل جائیں [۱] جس کے بعد کا حال قرآن مجید میں درج ہے۔

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِنْ دُبُرٍ وَالْغَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ط قَالَتْ
مَا جَزَاءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوءًا إِلَّا أَنْ يُسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۵۵﴾ قَالَ هِيَ
رَأَوْتُ نَفْسِي وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ أَهْلِهَا ۗ إِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ
فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِينَ ﴿۵۶﴾ وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ
الصّٰدِقِينَ ﴿۵۷﴾ فَلَمَّا رَأٰ قَمِيصَهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ إِنَّهُ مِنْ كَيْدِكُنَّ ۗ إِنَّ كَيْدَكُنَّ
عَظِيمٌ ﴿۵۸﴾ يُوسُفُ أَعْرَضَ عَنْ هٰذَا ۖ وَاسْتَغْفِرَ لِيذْنِبِكِ ۖ إِنَّكَ كُنْتِ مِنَ
الْخٰطِئِينَ ﴿۵۹﴾

’اور وہ دونوں ایک دوسرے سے پہلے دروازہ کی طرف پہنچنے کے لئے دوڑے اور اس نے ان کے کرتے کو پیچھے سے لمبان میں پھاڑ دیا [۱] اور ان دونوں نے اس کے شوہر کو دروازہ پر پایا۔ وہ کہنے لگی نہیں ہے سزا اس کی جو آپ کے ناموس کے ساتھ بدی کرنا چاہے سوا اس کے کہ اسے قید کیا جائے یا اور کوئی دردناک سزا۔ انہوں نے کہا کہ اس نے مجھ پر ڈول ڈالے اور اس کے گھرانے والوں میں سے [۲] ایک گواہ نے گواہی دی کہ اگر ان کا کرتا آگے سے پھٹا ہو تو یہ سچی ہے اور وہ جھوٹوں میں سے ہیں اور اگر ان کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہو تو یہ جھوٹ بول رہی ہے اور وہ سچوں میں سے ہیں تو جب اس نے دیکھا ان کے کرتے کو پیچھے سے پھٹا ہوا تو کہنے لگا کہ یقیناً یہ تم عورتوں کی چال ہے یقیناً تمہاری چال بہت سخت ہوتی ہے اے یوسف! اس سے درگزر کرو اور تو اپنے جرم سے توبہ کر، یقیناً تو خطا کاروں میں سے ہے۔‘

[۱] حدیثی ابی عن بعض رجالہ دفعہ قال قال ابو عبد اللہ ﷺ (علی بن ابراہیم)

[۲] القدشیق الشئی طولا (تبیان)

[۳] گواہی از قبیلہ زن (شاہ ولی اللہ)

چاک دامانی دلیل پاک دامانی

گواہ جس نے گواہی دی کیسا تھا؟ اس کا بیان قرآن مجید میں نہیں ہے روایات میں ہے کہ وہ دودھ پیتا ہوا ایک بچہ تھا جو گوارہ میں لیٹا ہوا تھا یہ فریقین کی کتب میں موجود ہے [۱] مگر دوسرا قول اس کے خلاف یہ ہے کہ وہ اس کے گھرانے کا کوئی غیر معمولی دانش مند قسم کا آدمی تھا اور اس کا شاہد یہ ہے کہ اگر وہ گوارہ کا بچہ ہوتا تو اس کا بول دینا خارق عادت ہونے کی بنا پر خود حقیقت کے اظہار کے لئے کافی تھا اس کے لئے براہ راست یہ کہہ دینا کافی تھا کہ زلیخا غلط کہہ رہی ہے اور یوسف بے گناہ ہیں مگر یہاں ایسا نہیں ہے بلکہ عقلی قرینہ پیش کیا جاتا ہے جو دونوں میں سے ایک کے قول کو درست ثابت کرتا ہے اس کی ضرورت دودھ پیتے ہوئے بچے کے لئے کوئی نہ تھی۔ [۲]

”اے یوسف! اس سے درگزر کرو“ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب اس کا کوئی چرچا نہ کرنا تا کہ بات گھر کی گھر ہی میں رہے اور عام رسوائی

نہ ہو۔ [۳]

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدْيَنَةِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتَاهَا عَن نَّفْسِهِ ۗ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۗ إِنَّا لَنَرَاهَا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۳۰﴾ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكًا ۖ وَأَتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّينًا ۖ وَقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۗ فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ ۖ وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا هَذَا بَشَرًا ۗ إِنْ هَذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ ﴿۳۱﴾

”اور کہا اس شہر کی کچھ عورتوں نے کہ عزیز مصر کی بیوی اپنے نوجوان پر ڈول ڈال رہی ہے، اس کی محبت نے اس کے دل کی گہرائیوں میں اثر کیا ہے [۴] ہم اس کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتے ہیں تو جب اس نے سنان کی ترکیب کو تو انہیں بلوا بھیجا اور ان سب کے لئے ایک ایک مسند بچھوادی اور ہر ایک کو ان میں سے ایک ایک چھری دے دی اور کہا نکلوان کے سامنے تو جب ان سب نے انہیں دیکھا تو بہت بڑھا ہوا پایا انہیں اور انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے اور کہنے لگیں سبحان اللہ یہ آدمی نہیں ہے یہ تو نہیں ہے مگر کوئی بزرگ فرشتہ۔“

عورتوں نے آپس میں جو چرچا کیا تھا، اس کے لئے قرآن کے یہ لفظ کہ فلما سمعت بمكرهن جب اس نے ان کی ترکیب سنی بتلاتا ہے کہ ان کی زلیخا پر نکتہ چینیوں واقعی اس کے فعل کو ناپسند کرنے کی بنا پر نہ تھیں بلکہ اس طرح ان کا مقصد یہی تھا کہ زلیخا انہیں بھی حسن و جمال یوسف

[۱] قال لهم الله يوسف ان قال للملك سل هذا الصبي في المهد فانطلق الله الصبي في المهد ليوسف (علي بن ابراهيم)

[۲] ابن عمه روى انه كان في المهد (جلالين) اس عورت کا رشتہ دار ایک لڑکا دودھ پیتا ہوا بول اٹھا (موضح القرآن)

[۳] لاتذکر لاشلا يشيع (جلالين)

[۴] بلغ الحب شغاف قلبها و هو داخله (تبیان)

کا نظارہ کرادے [۱] جیسا کہ بعد میں ہوا جس کے بعد وہ گویا قائل ہوئیں کہ زلیخا ان پر وارفتگی میں مجبور و معذور ہے۔

قَالَتْ فَذَلِكُنَّ الَّذِي لُمْتُنَّنِي فِيهِ ط وَلَقَدْ رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ فَاسْتَعْصَمَ ط

وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَا أُمِرْ لَأَكِيدَنَّ فِيهِ ط وَلَيَكُونَنَّ مِنَ الصَّغِيرِينَ ﴿۳۲﴾

’اس نے کہا تو یہی ہے وہ جس کے بارے میں تم لوگ مجھے ملامت کرتے تھے اور بے شک میں نے اس پر ڈول ڈالے تو اس نے اپنے کو بچائے رکھا اور اگر نہ کیا اس نے وہ جس کا میں اسے حکم دیتی ہوں تو وہ ضرور قید کر دیا جائے گا اور ضرور وہ ذلیل ہوگا‘۔

شاہ عبدالقادر صاحب لکھتے ہیں:

ان کے روبرو یہ بات کہی تاکہ وہ بھی سمجھا دیں اور حضرت یوسف علیہ السلام ڈر کر قبول کریں (موضح القرآن)

تفسیر جلالین میں ہے: فقلن له اطمع مولا تک مطلب یہ ہے کہ اب ان سب کو زلیخا سے ہمدردی پیدا ہوگئی اور جناب یوسف علیہ السلام

سے کہا اپنی مالکہ کا کہنا مانو۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ ؕ وَلَا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ

أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُنْ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿۳۳﴾ فَاسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ فَصَرَفَ عَنْهُ

كَيْدَهُنَّ ط إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۳۴﴾

’وہ کہنے لگے اے میرے پروردگار! قیدخانہ مجھے زیادہ پسند ہے اس سے جس کی طرف یہ سب مجھے تحریک کرتی ہیں اور اگر تو دور نہ کرے مجھ سے ان کی چال کو تو میں بھی جھک جاؤں ان کی طرف اور جاہلوں میں سے ہوں، تو ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول کی تو ان سے ان کی چال کو ناکام بنا کر ہٹا دیا، یقیناً اللہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا‘۔

ان کی چال کو دور کرنے کا مطلب ہے اس سے ان کا اثر پذیر نہ ہونے دینا اور جو ان عورتوں کا اپنی چال سے مقصد تھا اس میں ناکام

رہنا۔ [۲]

یہاں یوسف علیہ السلام کا لفظ جمع مونث حاضر کا صیغہ ہے اور اس لئے ہم نے ترجمہ کیا ہے ’یہ سب مجھے تحریک کر رہی ہیں‘ یہ یا تو اس وجہ سے ہے جیسا کہ قبل کی آیت کے آخر میں لکھا گیا ہے کہ ان سب کو زلیخا سے ہمدردی پیدا ہوگئی اور کہنے لگیں کہ اس کا کہنا مان لو جیسا کہ بعض تفاسیر میں ہے اور یا جیسا کہ ہماری قدیم تفسیر میں ہے کہ اس واقعہ کے بعد اب جناب یوسف پر ان تمام عورتوں کے مطالبات کی یورش ہوگئی اور ہر ایک کا پیغام

[۱]. المکر الفتل بالحيلة الى ما يراه من الطلبة (تبیان)

[۲]. معناه ضرر كيدهن لان كيدهن قد وقع. (تبیان)

جناب یوسف علیہ السلام کے پاس آیا کہ وہ ان سے تعلقات کی خواہش مند ہیں اس سے کبیدہ خاطر ہو کر جناب یوسف علیہ السلام نے بارگاہ الہی میں دعا کی۔ [۱]

ثُمَّ بَدَأَ لَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا رَأَوْا الْآيَاتِ لَيْسَ جُنَّتْهُ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿٣٥﴾

پھر قدرت کی نشانیاں [۲] دیکھنے کے باوجود بعد میں ان کی رائے یہ ہو گئی کہ وہ انہیں ایک مدت تک لازمی طور پر قید رکھیں گے۔

جناب یوسف قید خانہ میں

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

اگرچہ نشان سب دیکھ چکے کہ گناہ عورت کا ہے تو بھی ان کو قید کیا تاکہ بدنامی خلق میں عورت سے اترے یا اس واسطے کہ اس کی نظر سے دور رہیں۔ (موضح القرآن)
تفسیر جلالین میں ہے:

ينقطع فيه كلام للناس

یعنی اس لئے قید کیا تاکہ لوگوں میں جو چرچے رہتے ہیں، وہ کسی طرح ختم ہوں۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيْنِ ۖ قَالَ أَحَدُهُمَا إِنِّي أَرَانِي أَعْصِرُ خَمْرًا ۗ وَقَالَ الْآخَرُ

إِنِّي أَرَانِي أَحْمِلُ فَوْقَ رَأْسِي خُبْرًا تَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۗ نَبِّئْنَا بِتَأْوِيلِهِ ۗ إِنَّا نَرَاكَ

مِنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٣٦﴾

’اور ان کے ساتھ قید خانہ میں دو جوان داخل ہوئے، ان میں سے ایک نے کہا میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں انگور کارس نچوڑ رہا ہوں اور دوسرے نے کہا میں نے دیکھا کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں جس میں سے چڑیاں کھا رہی ہیں۔ ہمیں اس کی تعبیر بتائیے۔ ہم آپ کو نیک اعمال آدمیوں میں سے دیکھتے ہیں‘۔

قرآن مجید میں اکثر درمیانی کڑیاں سننے والے کی عقل کے حوالے کر کے بنظر اختصار ترک کر دی جاتی ہیں چنانچہ اس ذکر کے بعد ’ان کی رائے یہ ہو گئی کہ وہ انہیں ایک مدت تک قید رکھیں گے‘۔ درمیان کی لازمی کڑی یہ ہے کہ چنانچہ انہوں نے ان کو قید کر دیا [۳] اب اس کے بعد کا ذکر یہ ہے کہ ان کے ساتھ قید خانہ میں دو جوان داخل ہوئے۔

ہم نے المحسنین کے لفظ کا ’حسن عمل‘ سے لے کر ’نیک اعمال‘ تک کا ترجمہ کر دیا ہے مگر ایک معنی اس کے یہ کئے گئے ہیں کہ ہم

[۱]. فما أمسى يوسف في ذلك اليوم حتى بعث اليه كل أمأقراته تدعوها إلى نفسها فضعر يوسف فقال (علی بن ابراہیم)

[۲]. فالآيات شهامة الصبي والقميص المنخرق من دبر استبا قهما الباب حتى سمع مجاذبتها اياها على الباب. (علی بن ابراہیم)

[۳]. في الآية تقدير فسجن يوسف (تبیان)

سمجھتے ہیں کہ آپ تعبیر خواب کے فن کے ماہر ہیں۔^[۱]

مگر میں سمجھتا ہوں کہ انہیں اس مہارت کا اندازہ بغیر تجربہ سابق کے ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے ہاں نیکو کاری مشاہدہ سے متعلق ہے اور خواب نیک آدمیوں سے عموماً بیان ہی کیا جاتا ہے اس لئے میں اسی ترجمہ کو درست سمجھتا ہوں۔

قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقُنِيهِ إِلَّا نَبَأُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَكُمَا ط
ذِكْمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي ۗ إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ
هُمْ كُفْرُونَ ۝۳۵ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِيِ اِبْرَاهِيمَ ۖ وَاسْتَحَقَّ وَيَعْقُوبَ ۗ مَا كَانَ لَنَا
أَنْ نُشْرِكَ بِاللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ۗ ذَلِكُمْ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ
أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ۝۳۸

انہوں نے کہا تم دونوں تک کوئی کھانا نہیں آئے گا جو تمہیں عطا کیا جائے مگر یہ کہ میں تم کو اس کا انجام بتا سکتا ہوں اس سے پہلے کہ وہ تمہارے پاس آئے۔ یہ اس کا ایک جزء ہے جو اللہ نے مجھے علم عطا کیا ہے میں نے چھوڑا ہے ایسے لوگوں کا مذہب کہ جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور جو آخرت کے منکر ہیں اور میں نے پیروی کی ہے اپنے باپ دادا، ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے مذہب کی۔ ہمیں یہ زیب نہیں کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک کریں۔ یہ اللہ کے فضل و کرم سے ہے ہم پر اور تمام لوگوں پر مگر زیادہ تر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔“

شروع میں جو ہے کہ کوئی کھانا نہیں آئے گا تمہارے سامنے جو تمہیں عطا کیا گیا ہو، اس کا مطلب یہ کہا گیا ہے کہ تم خواب ایسا کھوتو میں

اس کی تعبیر بتا سکتا ہوں۔^[۲]

یہ غالباً اس خیال سے ہے کہ سابق کے مضمون سے مناسبت پیدا ہو مگر یہ اس تصور پر مبنی ہے کہ انہوں نے جو کہا تھا کہ آپ کو ہم محسنین میں دیکھتے ہیں اس کا مطلب یہ تھا کہ تعبیر خواب کا ماہر جانتے ہیں تو حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کے اس خیال کی تصدیق بلکہ مزید تقویت کی کہ ہاں یہ علم مجھے اللہ کی طرف سے خاص طور پر عطا کیا گیا ہے مگر جب کہ ہم نے کہا کہ محسنین کا لفظ بظاہر حسن عمل سے ہے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے جو کچھ ارشاد کیا وہ ان کے خیال میں مزید اضافہ ہے کہ تم نے صرف حسن عمل محسوس کیا ہے اس کے علاوہ یہ چیز ہے کہ اس نے مجھے خاص علوم عطا کئے ہیں، اس صورت میں اسے خواب سے متعلق سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، ہاں اس کے بعد جو الفاظ ہیں کہ میں اس کی تاویل تمہیں بتاؤں گا قبل اس کے کہ وہ سامنے آئے، اس سے یہ تصور ہوتا ہے کہ وہ پہلے جو رزق سامنے آنے کا ذکر تھا، اس سے مراد خواب ہے مگر یہ تصور اس وقت صحیح ہوتا جب پہلے ماضی کا صیغہ ہوتا کہ ما ائتکمما جو تمہارے پاس آیا رزق، جو تمہیں دیا گیا ہو، پھر یہ جملہ کہ اس کے آنے سے پہلے میں تمہیں اس کا انجام بتا دوں گا،

[۱]. جن یعرف تاویل الرؤیا من ذلک قول علیؑ کل امری ما یحسنہ ای ما یعرفہ (تبیان)

[۲]. فی منا مکما (جلالین) یعنی در خواب (شاه ولی اللہ)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے جو رزق دیا گیا تھا، وہ خواب میں تھا اور اس کے انجام بتانے کا مطلب اس کی تعبیر کا بتانا ہے مگر یہاں یا تیبکما مضارع ہے تو یہ معنی کیوں نہ لئے جائیں کہ اللہ نے مجھے مایکون یعنی آئندہ ہونے والی باتوں کا علم بھی عطا کیا ہے جو تمہیں رزق ملنے والا ہے اس کے ملنے سے پہلے اس کے انجام کی تمہیں خبر دے سکتا ہوں۔

اس سے مقصود معاذ اللہ خود ستائی نہیں ہے بلکہ آئندہ جو موعظہ و نصیحت فرمائیں گے اس کے اثر کو بڑھانا ہے اور چونکہ ان کے حسن عمل کا ان کے دل پر اثر ہو چکا تھا، اس لئے ان کا آپ کی بات کو سچ سمجھنا لازمی تھا۔

اب جب کہ پہلے ہی ان کی زبان سے ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ آپ کے حسن کردار سے متاثر تھے اور اب آپ نے جو اپنے علم و ہیبت کا تذکرہ فرمایا، اس سے یقیناً وہ مزید متاثر ہو چکے ہیں اور ان کی ایک غرض بھی آپ سے وابستہ ہے کہ وہ اپنے خواب کی تعبیر آپ سے حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس پس منظر سے فائدہ اٹھا کر آپ نے چاہا کہ تعبیر خواب سے پہلے تبلیغ حق کے فریضہ کو جو بحیثیت ایک داعی حق کے آپ کے ذمہ تھا ادا کریں اور انہیں شرک کی رکاکت سمجھاتے ہوئے توحید کی دعوت دیں۔ کیونکہ وہ یوں اس طرح کی تبلیغ کرنے لگتے تو وہ شاید سننے کی طرف متوجہ ہی نہ ہوتے مگر اب تعبیر خواب کے اشتیاق میں انہیں وہ سب سننا پڑے گا۔ جو حضرت یوسف علیہ السلام کی تعبیر بتانے سے پہلے ان کو سنائیں گے اور اس لئے اس تبلیغ کی بات شروع کرنے سے پہلے ابتدائی الفاظ میں انہیں یہ طمینان دلا دیا کہ میں تمہارے خوابوں کی صحیح تعبیر اللہ کے دیئے ہوئے علم سے بنا سکتا ہوں۔ یہ کہہ دینے کے بعد ان کی بعد کی گفتگو چاہے کتنی ہی طولانی ہو مگر انہیں یہ تصور ہرگز نہیں ہو سکتا کہ یہ ان باتوں میں الجھا کر ہمارے اصل سوال کو نال رہے ہیں اور جو ہمارا اصل مقصد ہے یعنی ہمارے خواب کی تعبیر، وہ ہمیں نہیں بتائیں گے۔

مذکورہ بالا صورت حال میں یہ تصور نہایت کمزور معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں جناب یوسف علیہ السلام خواب کی تعبیر بتانا نہیں چاہتے تھے اور بعد میں وہ آپ کے پیچھے ہی پڑ گئے تو مجبوراً بتا دی۔ [1]

يُصَاحِبِي السِّجْنِ ۚ أَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿٣٩﴾ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ ۗ إِنْ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۗ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ۗ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٤٠﴾

’اے دونوں قید خانہ والو! کیا متفرق خدا اچھے ہیں یا ایک اکیلا اللہ جو سب پر غالب ہے تم لوگ نہیں پوجا کرتے اسے چھوڑ کر مگر ایسے ناموں کی جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے تجویز کئے ہیں اللہ نے اس کے ساتھ کوئی دلیل نہیں اتاری ہے، نہیں ہے حکومت کا مالک مگر اللہ اس کا حکم ہے کہ نہ عبادت کرو سو اس کے کسی کی۔ یہی سیدھا دین ہے مگر زیادہ تر لوگ علم نہیں رکھتے۔‘

پہلے تو اپنے تعارف کے ذیل میں سچے دین کی ترجمانی کی تھی، اب صاف صاف ان کی ضمیر کو دعوت فکر و تامل دے رہے ہیں تاکہ وہ حق و

[1]. قال ابن جریر: انه کره ان یخبرهما بالتاویل.. فلم یترکاهما حتی اخبرهما (تبیان)

باطل میں موازنہ کر کے اپنے غلط راستے کی غلطی محسوس کریں۔

يُصَاحِبِي السِّجْنِ أَمَّا أَحَدُكُمَا فَيَسْقِي رَبَّهُ خَمْرًا ۖ وَأَمَّا الْآخَرُ فَيُصَلِّبُ

فَتَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَأْسِهِ ۗ قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِينَ ﴿١١﴾

’اے دونوں قیدخانہ والو، تم دونوں میں سے ایک جو ہے تو وہ اپنے مالک کو شراب پلانے والا ہوگا اور دوسرا جو ہے اسے سولی دی جائے گی تو چڑیاں اس کے سر میں سے کھائیں گی، طے پا چکی ہے یہ بات جس کے بارے میں تم دونوں دریافت کرتے ہو۔‘

آخر کا جو فقرہ ہے ’طے پا چکی ہے یہ بات‘ اس کے لئے الفاظ میں بظاہر کوئی تشکیکی معلوم نہیں ہوتی ہے کہ اس کے کہنے کا کوئی خاص سبب ہونا چاہیے بلکہ یہ اسی تعبیر کا تتمہ ہو سکتا ہے کہ جو میں نے تعبیر بتائی ہے یہ خالق کی مشیت میں گزری ہوئی ہے اور وہ ہو کر رہے گی مگر بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے تعبیر بتانے کے بعد ان دونوں نے کہا کہ حقیقتاً ہم نے خواب دیکھے ہی نہ تھے فقط تمہارا امتحان منظور تھا [۱] یا یہ کہ اس نے کہا جو تعبیر ناخوش گوار دی گئی تھی [۲] اس پر حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا اب چاہے خواب دیکھے ہوں یا نہ دیکھے ہوں بہر حال جو تعبیر میں نے دی ہے وہ ظہور میں آکر رہے گی مگر مجھے یہ خیال کچھ زیادہ دل کو لگتا ہوا محسوس نہیں ہوتا اس لئے کہ اگر انہوں نے شرارتاً یہ خواب بیان کئے ہوتے اور ان کے دل پر جناب یوسف علیہ السلام کے حسن سیرت و کردار کا واقعہ کوئی اثر نہ ہوتا تو وہ اس صبر و سکون کے ساتھ آپ کے اس طولانی تبلیغ موعظہ کو اتنی دیر تک سن نہیں سکتے تھے بلکہ پہلے ہی مذاق اڑاتے ہوئے چلے جاتے۔

میں تو جناب یوسف علیہ السلام کی شان کے خلاف سمجھتا ہوں یہ تصور کہ آپ ان کے مسخرے پن کو نہ سمجھے اور ان سے سنجیدگی کے ساتھ اتنی طویل تقریر کر ڈالی۔

ہاں! یہ ہو سکتا ہے کہ خواب تو واقعی دونوں نے دیکھے تھے اور دونوں سنجیدگی کے ساتھ اس کی تعبیر کے طالب ہوئے تھے مگر جب ایک کو تعبیر بہت ہی ناخوش گوار ملی تو اپنی ناقص بشریت سے اب اس کو غصہ آیا اور ایک طرف اس غصہ کی بنا پر جناب یوسف علیہ السلام کے تپانے کو اور دوسری طرف اپنے ساتھی سے اپنی خفت کے مٹانے کے لئے اس نے یہ کہہ دیا کہ میں خواب و اب کچھ دیکھا ہی نہ تھا بہر حال دونوں کے یہ کہنے کی ہم نے خواب نہیں دیکھا تھا یونہی کہہ دیا تھا کوئی وجہ وجہ نہیں ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس پہلو سے جو بھی میں لکھ دیا ہے کہ ایک نے غصہ وغیرہ سے یہ کہہ دیا ہوگا میں مطمئن نہیں ہوں اس لئے کہ یہ جملہ قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِينَ ﴿يُوسُفَ: ۱۱﴾ پہلے کلام کا بلا فاصلہ جزء ہے کوئی الگ آیت نہیں ہے جس سے ہمیں یہ سمجھنے کی گنجائش ہو کہ بیچ میں ان میں سے ایک نے یہ کہا میں نے خواب دیکھا ہی نہیں تھا اور اس پر جناب یوسف علیہ السلام نے یہ جملہ کہا لہذا میں تو اس سے پہلے بیان کا تتمہ ہی سمجھتا ہوں۔ کسی بات کا الگ سے جواب نہیں سمجھتا۔

[۱]. قال اماراينا شيئا فقال قضي الامر الذي فيه تستفتيان صدقتم امة كذبتما (جلالين)

[۲]. روى ان صاحب الصلب قال مارايت شيئا (تبيان)

وَقَالَ لِلَّذِي ظَنَّ أَنَّهُ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ فَأَنَسَهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ

رَبِّهِ فَلَيْثَ فِي السِّجْنِ بِضَعَ سِنِينَ ۝٣٢

اور کہا انہوں نے اس سے جس کے متعلق وہ سمجھے تھے کہ وہ نجات پانے والا ہے کہ میرا تذکرہ کر دینا اپنے مالک سے یہاں تو شیطان نے اسے اپنے مالک والا تذکرہ بھلا دیا تو وہ قید خانہ میں رہے کئی سال۔

ظَنَّ أَنَّهُ نَاجٍ مِّنْهُمَا اس کے متعلق وہ سمجھتے تھے کہ نجات پانے والا ہے، اس میں ظن کا لفظ جو ہے اس کے عام معنی تو گمان کے ہوتے ہیں اور اس لئے شاہ عبدالقادر نے لکھ دیا ہے۔

اس کو اٹکا کہ بچے گا۔ معلوم ہوا کہ تعبیر خواب یقین نہیں، اٹکل ہے مگر پیغمبر اٹکل کرے، سو بے شک ہے (موضح القرآن)

مگر حقیقت یہ ہے کہ ظن کبھی یقین کے معنی میں آتا ہے یہاں ایسا ہی ہے کیوں کہ اس سے پہلے آچکا ہے کہ قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِينَ ﴿يوسف: ٣١﴾ طے شدہ ہے یہ بات جس کے بارے میں تمہارا سوال ہے، تو اگر جناب یوسف علیہ السلام نے جو کچھ کہا تھا وہ گمان یا اٹکل کی حد میں ہوتا تو اس حتم و جزم کے ساتھ اس کا اظہار کیوں کرتے کہ یہ تواب ہو کر رہے گا ٹل نہیں سکتا۔ یہ انداز بتاتا ہے کہ یہ فقط گمان نہیں بلکہ علم ہے چنانچہ تفسیر جلالین میں بھی ہے۔ ظن ایقن (یعنی) ”ظن کیا کے معنی ہیں یقین کیا“۔

اسے اپنے رب کا ذکر شیطان نے بلا دیا تو وہ قید خانہ میں رہے کئی سال۔ یہاں قبل کا سیاق ذہن میں اسی تصور کو لاتا ہے کہ یہ ضمیر اس قیدی کی طرف ہے جس نے نجات پائی۔ اس صورت میں بعض لوگوں نے اس دوسرے لفظ رب سے مراد لیا ہے حضرت یوسف علیہ السلام کو شاید اس بنا پر کہ اُن کا احسان اس پر یہ تھا کہ انہوں نے اس کو نجات کا مژدہ دیا تو ایک طرح اس کے ولی نعمت ہوئے، اس لحاظ سے انہیں اس کا رب یعنی سرپرست کہا گیا ہے۔ [۱]

مگر یہ ظاہر کے خلاف ہے دوسری تفسیر یہ ہے جس کی بنا پر ہم نے ترجمہ کیا ہے کہ ذِكْرُ رَبِّهِ کے معنی یہ ہیں کہ اپنے مالک کے یہاں ذکر کرنا یوسف علیہ السلام کا جس کی خواہش حضرت یوسف علیہ السلام نے کی تھی وہ بھول گیا۔ [۲]

بادشاہ مصر کا خواب اور یوسف کی رہائی کا سامان

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَى سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعٌ

سُنْبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَةٍ ۖ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي رُءْيَايَ إِن كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا

تَعْبُرُونَ ۝٣٣ قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ ۖ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعَالِمِينَ ۝٣٤

”اور بادشاہ نے کہا میں نے خواب میں دیکھی ہیں سات گائیں موٹی جنہیں کھا رہی ہیں سات دلی گائیں اور سات

[۱] قال ابن اسحاق والحسن والجبائی يعود على الساقى وتقديره فانسى الساقى الشيطان ذكرو يوسف عليه السلام (تبيان)

[۲] ذكر يوسف عند ربه (جلالين) ياد كند پيش مولای خود (شاه ولی الله) ياد كرنا خداوند اپنے کے پاس (رفع الدين)

بالیوں ہری اور دوسری خشک، اے معزز لوگو! مجھے میرے خواب کے بارے میں بتاؤ، اگر تم خواب کی تعبیر دیا کرتے ہو، ان لوگوں نے کہا کہ یہ خوابہائے پریشان ہیں اور ہم خوابہائے پریشان کی تعبیر نہیں جانتے۔“

وَقَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ أَنَا أُنَبِّئُكُمْ بِتَأْوِيلِهِ فَأَرْسِلُونِ ﴿٣٥﴾
يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعُ عَجَافٍ وَسَبْعِ
سُنْبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَبْسُتٍ ۗ لَعَلِّي أَرْجِعُ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٣٦﴾
قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَابًّا ۖ فَمَا حَصَدْتُمْ فَذَرُوهُ فِي سُنْبُلَةٍ إِلَّا قَلِيلًا ۗ مِمَّا
تَأْكُلُونَ ﴿٣٧﴾ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ سَبْعٌ شِدَادًا يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا
مِمَّا تَحْصِنُونَ ﴿٣٨﴾ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ
يَعْصِرُونَ ﴿٣٩﴾

’اور اس نے کہا کہ جو ان دونوں میں نجات پا گیا تھا اور ایک مدت کے بعد اب اسے یاد آیا تھا، کہا کہ میں تم لوگوں کو اس کی تعبیر بتاؤں گا تو مجھے روانہ کرو۔ یوسف! اے بڑے سچے ہمیں تعبیر بتائیے سات موٹی گائیوں کی جنہیں سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات ہری بالیوں اور دوسرے خشک کی۔ شاید میں ان لوگوں کے پاس جاؤں تو شاید انہیں علم ہو انہوں نے کہا کہ تم لوگ کھیتی کرو سات برس متواتر [۱] تو جو کھیتی کاٹو اسے رہنے دو اس کی بالیوں میں سوا تھوڑی سی مقدار کے جسے کھاؤ۔ پھر اس کے بعد سات برس آئیں گے سخت جو کھا جائیں گے اس سب کو جو تم نے ان کے ذخیرہ کیا تھا۔ سوا بہت کم کے اس میں سے جسے تم محفوظ رکھتے ہو، پھر اس کے بعد ایک سال ایسا آئے گا جس میں لوگوں کے لئے بارش ہوگی اور اس میں وہ پھلوں کا عرق نچوڑیں گے۔

بیچ کا جملہ کہ ”ان لوگوں کے پاس واپس جاؤں تو شاید انہیں علم ہو“ کا ہے کا علم؟ خواب کی تعبیر کا یا آپ کے مرتبہ کا؟ یہ دونوں ہی احتمال ہیں [۲] ان میں سے بعض نے پہلے کو [۳] اور بعض نے دوسرے کو [۴] اختیار کیا۔ ہمارے نزدیک تیسرا احتمال بھی ہے اور غور کیا جائے ”تو شاید وہ جائیں“ میں شاید کا لفظ پہلے احتمال کے ساتھ سازگار نہیں ہے اس لئے کہ جب یہ تعبیر بتادیں گے اور وہ جا کر انہیں اس تعبیر سے مطلع کرے گا تو تعبیر تو انہیں معلوم ہو ہی جائے گی۔ شاید کہنے کا کیا موقع ہے۔

[۱]. الداب استمرار الشیء علی عادۃ (تبیان) دأباً متتابعۃ (جلالین)

[۲]. یحتمل امرین احدہما لعلہم یعلمون، مکانک و منزلک الثانی لعلہم یعلمون تأویل الروایا (تبیان)

[۳]. لعلہم یعلمون تعبیرھا (جلالین)

[۴]. یعنی تیری قدر معلوم ہو (موضح القرآن)

ہاں! ایک اور احتمال یہ ہے کہ یہ مطلب ہو کہ شاید ان کی سمجھ میں آئے کہ یہی تعبیر حق ہے اور یہی صورت حال پیش آنے والی ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ اَتُنُونِي بِهِ ۗ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ اِلَى رَبِّكَ فَاسْئَلْهُ مَا

بِالْنِّسْوَةِ الَّتِي قَطَعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۗ اِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ ﴿٥٠﴾

اور بادشاہ نے کہا کہ لاؤ انہیں میرے پاس تو جب ان کے پاس قاصد آیا تو انہوں نے کہا واپس جاؤ اپنے مالک کے پاس اور ان سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا واقعہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے یقیناً میرا پروردگار ان کی چال کو خوب جاننے والا ہے۔

بادشاہ سے پوچھو۔ بادشاہ کو کیا معلوم؟ مطلب یہ ہے کہ تم انہیں اس واقعہ کی طرف توجہ دلاؤ تو وہ خود پھر اس کے متعلق تحقیق کریں گے

جس سے میری بے گناہی نمایاں ہوگی۔^[۱]

قَالَ مَا خَطْبُكُمْ اِذْ رَاوَدْتُنَّ يُوسُفَ عَنْ نَفْسِهِ ۗ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا

عَلَيْهِ مِنْ سُوْءٍ ۗ قَالَتْ اِمْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْاُنْ حَصَّصَ الْحَقُّ ۗ اَنَا رَاوَدْتُهُ عَنْ

نَفْسِهِ ۗ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٥١﴾

اس نے کہا کہ کیا واقعہ تھا تمہارا جب تم نے یوسف پر ڈول ڈالے تھے؟ ان عورتوں نے کہا کہ پاک ہے اللہ۔ ہمیں ان کی کوئی برائی ثابت نہیں ہوئی۔ عزیز مصر کی بیوی نے کہا کہ اب حق تو نمایاں ہو ہی گیا۔ میں نے ان پر ڈول ڈالے تھے اور وہ بلاشبہ سچے لوگوں میں سے ہیں۔

اس آدمی نے جا کر بادشاہ سے کہا کہ وہ یہ کہتی ہیں تو بادشاہ نے تحقیق کرنا شروع کیا اور ان عورتوں کو طلب کر کے ان سے واقعہ پوچھا۔^[۲]

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخْنُهٗ بِالْغَيْبِ ۗ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخٰٓئِنِيْنَ ﴿٥٢﴾

”یہ اس لئے کہ انہیں معلوم ہو کہ میں نے پیٹھ پیچھے ان کے ساتھ غداری نہیں کی اور یقیناً اللہ غداری کرنے والوں کی چال کو کامیاب نہیں کرتا۔“

اگر کوئی ثبوت قوی اس کے خلاف نہ ہو تو سیاق تو یہی بتلاتا ہے کہ یہ زلیخا کے کلام کا تمہ ہے اور اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ میں نے

اس وقت یہ اقرار جو کیا ہے، وہ اس لئے ہے کہ یوسف کو معلوم ہو کہ پیٹھ پیچھے ان کے بارے میں میں نے حق گوئی سے کام لیا ہے، پھر اس کے بعد کی

آیت جو آئندہ پارہ کی پہلی آیت ہوگی وَمَا اُبْرِيْءُ نَفْسِيْ ۗ وہ بھی زلیخا کا کلام ہوگا۔ ہماری قدیم تفسیر جو زیادہ تر اقوال معصومین پر مبنی ہے، اس کے

[۱]. فسئلہ ان يسأل (جلالین)

[۲]. حين رجع الرسول الى الملك برسالة يوسف جمع النساء وقال لهن ما خطبكن اذ راودتن يوسف عن نفسه (تبیان)

مطابق ہے۔^[۱]

مگر چونکہ زلیخا کا خدا پرست اور موحّد ہونا ثابت نہیں ہوتا، اس لئے ان آیات کے مضمون سے مفسرین نے ایسا محسوس کیا ہے اور یہی تشریح کی ہے کہ یہ جناب یوسف علیہ السلام کا کلام ہے۔^[۲]

اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ یہ جو میں نے اس واقعہ کی تحقیق کرائی ہے اس لئے ہے کہ عزیز مصر کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کے ناموس کے ساتھ اس کے پیٹھ پیچھے کوئی خیانت نہیں کی۔

ہمارے علماء میں سے بھی جناب شیخ الطائف نے اسی کو ترجیح دی ہے۔^[۳]

مگر مجھے اس میں کافی تردّد کی گنجائش معلوم ہوتی ہے اول تو یہ ہے کہ یہاں تحقیق بادشاہ سے کرائی گئی اور خیانت جس کا تصور ہو سکتا تھا اس کا تعلق بادشاہ کے ساتھ نہیں بلکہ عزیز مصر کے ساتھ تھا دوسرے یہ کہ عزیز کو تو اسی وقت پتہ چل گیا تھا کہ یوسف بے گناہ ہیں اور خطا زلیخا ہی کی ہے مگر یہ جانتے ہوئے اس نے سیاسی مصلحت کی بنا پر یوسف کو قید کر دیا تھا پھر اس تحقیق و تفتیش سے عزیز مصر کو معلوم کرانا تحصیل حاصل ہی ہوگا۔

وَمَا أْبْرَأِي نَفْسِي ۚ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي ۗ إِنَّ رَبِّي غَفُورٌ

رَّحِيمٌ ﴿۵۳﴾

’اور میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا ہوں۔ بلاشبہ نفس برائی پر آمادہ کیا ہی کرتا ہے مگر یہ کہ میرے پروردگار کا رحم و کرم شامل حال ہو۔ یقیناً میرا پروردگار بخشنے والا ہے، بڑا مہربان‘۔

اگرگزشتہ آیات جناب یوسف علیہ السلام کی زبان کی ہے جیسا کہ اکثر مفسرین کا خیال ہے تو یہ بھی اسی کا تتمہ ہے یعنی یہ کہنے کے بعد کہ یہ تحقیقات میں نے اس لئے کرائی ہیں کہ میں بے گناہ ہوں جیسے فوراً یہ خیال ہوا کہ کہیں اس میں غرور کا پہلو تو پیدا نہیں ہوتا اس لئے کہا^[۴] کہ گناہ سے بچنا کوئی میرے نفس کا کارنامہ نہیں، نفس تو برائی پر آمادہ کرتا ہے مگر یہ میرے خالق کا رحم و کرم ہے جو گناہ سے بچنے کی توفیق عطا فرماتا ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ اَسْتَخْلِصُهُ لِنَفْسِي ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ

لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ ﴿۵۴﴾ قَالَ اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۚ إِنِّي حَفِيظٌ عَلَيْمُ ﴿۵۵﴾

’اور بادشاہ نے کہا کہ انہیں میرے پاس لاؤ کہ میں انہیں اپنا خاص مقرب بناؤں تو جب اس نے ان سے بات

[۱] ای لا ا کذب علیہ الان کما کذبت علیہ من قبل ثم قالت: وما ابرئ نفسي الخ (علی بن ابراہیم)

[۲] فاخبر يوسف بذلك فقال ذلك اي طلب البراءة ليعلم العزيز (جلالین) گفت يوسف اين همه براي آنست تا بدين اند عزيز (شاه ولی الله) یہ تحقیقات اس واسطے ہے کہ جانے عزیز یعنی خاندان اس کا (فتح الدین)

[۳] اختلفوا في من لهذا الكلام حكاية عنه فقال اكثر المفسرين انه حسن يوسف— وقال الجبائي والبلخي انه من قول المرأة و كلا الامرین جائزان والاوّل اشبهه (تبیان)

[۴] اخبار عما قال يوسف علی وجه التواضع لله (تبیان)

چیت کی تو کہا کہ تم یقیناً اب ہمارے یہاں صاحب اقتدار، بھروسے کے آدمی ہو^[۱] انہوں نے کہا کہ مجھے اس سرزمین کے خزانوں پر مقرر کر دیجئے، یقیناً میں حفاظت کرنے والا ہوں خوب جاننے والا۔
حفاظت کرنے والا بے محل صرف ہونے سے اور خوب جاننے والا صحیح استعمال کا موقع کا۔

وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ ۖ يَتَّبِعُوا مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ ۗ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۵۶﴾ وَلَا جُرْأَخِرَةَ خَيْرٌ لِلَّذِينَ
أَمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿۵۷﴾

اور اس طرح ہم نے یوسف کو اس سرزمین پر اقتدار کا مالک بنایا کہ وہ اس میں جہاں چاہیں قیام کریں^[۲] ہم اپنی رحمت کو پہنچاتے ہیں جس تک چاہتے ہیں یقیناً ہم نہیں برباد کرتے صلہ نیک اعمال والوں کا اور بلاشبہ آخرت کا ثواب بہتر ہے ان کے لئے جو ایمان رکھتے ہوں اور پرہیزگاری سے کام لیتے ہوں۔

وَجَاءَ إِخْوَتَهُ يُوسُفَ فَدَخَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنْكَرُونَ ﴿۵۸﴾ وَلَمَّا
جَهَّزَهُمْ بِجَهَّازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَكُمْ مِّنْ أَبِيكُمْ ۖ أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوْفِي
الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ ﴿۵۹﴾ فَإِنْ لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِي وَلَا
تَقْرَبُونِ ﴿۶۰﴾ قَالُوا اسْتُرْنَا وَدُعِنَا أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ ﴿۶۱﴾

’اور یوسف کے بھائی ان کے پاس داخل ہوئے تو وہ ان لوگوں کو پہچان گئے اور وہ سب ان کو نہیں پہچان رہے تھے اور جب ان کا سامان سفر ان کی روانگی کے لئے تیار کیا تو کہا تم لوگ اب کی بار اپنے اس ایک علاقے کو بھی لیتے آنا، کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں پورا پورا ناپ کر دیتا ہوں اور بہترین طریقے پر میزبانی بھی کرتا ہوں، اب اگر تم اسے نہ لائے تو تمہارے لئے میرے پاس تولنے کے لئے غلہ نہ ہوگا اور تم میرے نزدیک نہ آنا۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہم اس کے باپ پر اس کے بھیجنے کے لئے ڈول ڈالیں گے اور یقیناً ہم ایسا کریں گے۔‘

بھائیوں کی پہلی دفعہ حاضری اور جناب یوسف علیہ السلام کی فرمائش

ان کا نہ پہچاننا عام نظام اسباب کے ماتحت بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت جب ان سے جدا ہوئے تھے تو حضرت یوسف علیہ السلام بچہ تھے اور اب آپ کمال عمر کی منزل میں تھے اور پھر شاہانہ لباس میں تھے اور انہیں یہ سان گمان بالکل نہ تھا کہ جسے انہوں نے کنوئیں میں ڈالا تھا وہ مصر کی کرسی

[۱] . يقال لفلان مكانته عند الملك وهو مكين عنده واصله التمكن من الامر (تبيين)

[۲] . ينزل منها حيث يشاء بعد الضيق والحبس (جلالين)

اقتدار پر ہوگا اس لئے وہ اس نظر سے دیکھ بھی نہیں رہے تھے جو اقتدار زمانہ کے بعد کسی ایسے گم گشتہ کے پہچاننے کا باعث ہو سکتی ہے اور لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ قدرت کی طرف کا کوئی خاص انتظام ہو چنانچہ اس بارے میں دو قول ہو گئے ہیں [۱] بعد کو جناب یوسف علیہ السلام کی گفتگو و واقعات کی ایک کڑی پر مبنی ہے جسے قرآن مجید نے بنظر اختصار ترک کر دیا ہے اور وہ عقل سے سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جناب یوسف علیہ السلام ان سے اس کے پہلے کہ وہ انہیں رخصت کریں، گفتگو کے ذیل میں ان کے حالات مثلاً یہ کہ ان کے والد بوڑھے ہیں اور وہ سب اس پریشان حالی کے دور کرنے کے لئے ان سے رخصت ہو کر چلے آئے ہیں مگر اپنے ایک بھائی کو ان کے پاس چھوڑ آئے ہیں۔ یہ بھی باتوں باتوں میں صراحت ہو گئی کہ یہ سب ایک ماں سے ہے اور وہ چھوٹا بھائی ایک دوسری ماں سے ہے تو جناب یوسف علیہ السلام نے انہی کی بتلائی ہوئی معلومات کی بنا پر یہ کہا کہ اب کی بار آتا تو اپنے اس سوتیلے بھائی کو بھی لیتے آنا۔ [۲]

ہماری ایسی قدیم تفسیر میں جو احادیث پر مبنی ہے اس کو بطور واقعہ درج کیا ہے [۳] یہ بھی قرین قیاس ہے کہ انہوں نے اس بھائی کے کچھ اوصاف بھی بیان کئے ہوں کہ وہ بڑا سمجھدار ہے اور باپ کا پیارا ہے، اس لیے باپ کو اسکی جدائی گوارا نہیں ہے۔ اور بظاہر ہر اسباب یہ جناب یوسف کے اشتیاق کا باعث ہو سکتا ہے کہ وہ ان کے اس بھائی کو دیکھیں کہ اس کے کیا اوصاف ہیں۔ [۴]

اگر انہوں نے اپنی گفتگوؤں میں یہ نجی حالات اپنے بتائے نہ ہوتے تو وہ ضرور جناب یوسف کے از خود کہنے پر کہ اپنے سوتیلے بھائی کو بھی لیتے آنا بھڑک اٹھتے کہ آخر اس میں کیا راز ہے؟

بے شک انہوں نے فطری طور پر یہ چیز بیان نہیں کی ہوگی، وہ اپنے اس ظلم کی روئداد جو خود یوسف پر ڈھایا تھا، اسے جناب یوسف علیہ السلام نے بھی اس وقت اپنے دل میں رکھا اور اس کے بعد جب انہیں مقصد ہوا کہ وہ اپنی شخصیت کو نمایاں کریں جس کا ذکر بعد میں آئے گا تو اس وقت انہوں نے اسی کو چھیڑا کہ سب معلومات تو تم نے میرے لئے فراہم کیں، تو بتایا ہی نہیں کہ تم نے یوسف کے ساتھ سلوک کیا کیا تھا؟ چنانچہ اسی وقت وہ بھڑکے اور کہنے لگے، اچھا تو آپ یوسف ہی ہیں؟

وَقَالَ لِفِتْيَانِهِ اجْعَلُوا بِضَاعَتَهُمْ فِي رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُونَهَا إِذَا انْقَلَبُوا

إِلَىٰ أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۳۷﴾

اور انہوں نے اپنے جوانوں سے کہا کہ ان کی پونجی ان کے سامان میں رکھ دو، ممکن ہے یہ اُسے پہچانیں اس وقت

[۱] قال الجبائی اثمهم فارقوه وهو صبي امر دفجاء و قد التحى و كبر و تغيرت حاله فلم يعر فوه و قال البلخي ان ذلك حين اخرج الله فيه

العادة لنبيّة (تبیان)

[۲] الذي اقتضى طلبه الاخ من ابئهم انه فاوضهم و سألهم عن اخبارهم و احوالهم و اخبار اهلهم كما يتساءل الناس من مثل ذلك و دل الكلام على ذلك (تبیان)

[۳] قال فما ابوكم قال اشبح ضعيف قال ذلكم اخ غيركم قالوا لنا اخ من ابئنا لا من امتنا قال فاذا رجعتم الى فأتوني به. (علی بن ابراهیم)

[۴] ذكر و ان اباهم اثره عليهم بالمحبة مع حکمة و فضله فاحب ان يراة. (تبیان)

جب وہ اپنے گھر بار میں جائیں، شاید پھر واپس آئیں۔

یہ لوگ تو قیمت دے کر غلہ خریدنے آئے تھے انہوں نے غلہ دیا تو چلنے وقت پھر وہ قیمت بھی جو انہوں نے دی تھی، ان کے سامان میں رکھ دی۔

اسے ”پونجی“ اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ وہ اس سے خریداری غلہ کے کاروبار کو چلا رہے تھے۔^[۱]
 ”شاید پھر وہ واپس آئیں، یعنی شاید اس احسان کی وجہ سے وہ دوبارہ آئیں اور اب جو آئیں گے تو حسب وعدہ ان کے سگے بھائی کو بھی ضرور اپنے ساتھ لائیں گے۔

فَلَمَّا رَجَعُوا إِلَىٰ أَبِيهِمْ قَالُوا يَا أَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَأَرْسِلْ مَعَنَا آخَانًا
 نَكْتَلُ وَإِنَّا لَهُ لَحَفِظُونَ ﴿۳۳﴾

”تو جب وہ لوگ واپس گئے اپنے باپ کے پاس تو کہا اے ہمارے والد صاحب! روک دیا گیا ہم سے غلہ کا ناپ
 کر دیا جانا، اس لئے ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیجئے تو نپو کرانا ج لے آئیں گے اور یقیناً ہم اس کی حفاظت
 کریں گے۔“

غلہ روک دیا گیا یعنی آئندہ کے لئے کہہ دیا گیا ہے کہ اگر اپنے اس بھائی کو ساتھ نہ لائے تو غلہ نپو کر نہیں دیا جائے گا۔^[۲]

قَالَ هَلْ أَمْنُكُمْ عَلَيْهِ إِلَّا كَمَا أَمِنْتُكُمْ عَلَىٰ أَخِيهِ مِنْ قَبْلُ ۖ فَاللَّهُ خَبِيرٌ
 حَفِظًا ۖ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّحِيمِينَ ﴿۳۴﴾

”کہا کیا تم پر اس کے بارے میں اطمینان کروں ویسے ہی جیسے اطمینان کیا تھا تم پر اس کے بھائی کے بارے میں
 پہلے، بہر حال اللہ سب سے بہتر حفاظت کرنے والا ہے اور وہ بہترین رحم کرنے والا ہے۔“

چونکہ انہوں نے حفاظت کی نسبت بڑے زور کے ساتھ اپنی طرف دی تھی وَإِنَّا لَهُ لَحَفِظُونَ تو حضرت یعقوبؑ نے جواب میں کہا کہ تم
 کیا حفاظت کرو گے، تم نے اس سے پہلے یوسفؑ کی حفاظت کا بھی تو ذمہ لیا تھا، اس ذمہ داری کو کب تم نے پورا کیا اور اصل حفاظت کرنے والا تو اللہ
 ہے، اس کی حفاظت کے مقابلہ میں تمہاری حفاظت کیا چیز ہے۔^[۳]

وَلَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ إِلَيْهِمْ ۖ قَالُوا يَا أَبَانَا مَا نَبْعِثُ
 هَذِهِ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ إِلَيْنَا ۖ وَنَمِيرُ أَهْلَنَا وَنَحْفَظُ أَخَانًا وَتَزَادُ كَيْلَ بَعِيرٍ ۖ

[۱]. البضاعة قطعة من المال التي للتجارة (تبيان)

[۲]. منع منا الكيل ان لم نأت بأخي... وهو قول الحسن والزجاج والجباثي وهو الصحيح (تبيان)

[۳]. المعنى فالله خير حفظا من حفظكم الذي نسبتوه الى انفسكم (تبيان)

ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ﴿٦٥﴾

’اور جب انھوں نے اپنا سامان کھولا تو اپنی پونجی کو پایا کہ وہ انہیں واپس کر دی گئی ہے کہنے لگے اور ہمیں کیا چاہیے، یہ ہماری پونجی بھی تو ہمیں واپس کر دی گئی ہے اور اب ہم اپنے گھر والوں کے لئے پھر غلہ لائیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور ایک اونٹ پھر اور زیادہ غلہ لائیں گے یہ تو تھوڑا غلہ ہے جو ہمیں ناپ کر ملا ہے۔‘

قَالَ لَنْ اُرْسِلَهُ مَعَكُمْ حَتَّى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتِنِيْ بِهٖ اِلَّا اَنْ يُحَاطَ

بِكُمْ ۚ فَلَمَّا اَتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَ كَيْلٌ ﴿٦٦﴾

انہوں نے کہا کہ میں کبھی نہیں بھیجوں گا اسے تمہارے ساتھ جب تک تم مجھ سے اللہ کی قسم کھا کر یہ عہد و پیمانہ نہ کرو کہ تم اسے اپنے ساتھ ضرور لے آؤ گے سو اس کے کہ تم سب گھیر لئے جاؤ تو جب ان سب نے ان سے عہد و پیمانہ کیا تو انہوں نے کہا کہ اللہ ہماری گفتگو پر گواہ ہے۔ [۱]

وَقَالَ يَبْنَىٰ لَا تَدْخُلُوْا مِنْ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۗ وَمَا

اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۗ اِنْ اِلَّٰهَكُمْ اِلَّا اللّٰهُ ۗ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۗ وَعَلَيْهِ

فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿٦٧﴾

اور انہوں نے کہا اے میرے بیٹو! ایک دروازے سے شہر کے اندر نہ جانا اور مختلف دروازوں سے جانا اور میں تم کو اللہ سے بچاؤ نہیں سکتا، کچھ بھی فیصلہ نہیں ہے مگر اللہ کے قبضہ میں۔ اسی پر میرا بھروسہ ہے اور اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے بھروسہ کرنے والوں کو۔

ایک دروازے سے نہ جانا، یہ اس لئے کہہ دیکھنے والوں کی نظر نہ لگے [۲] بعض علمائے اہل سنت نے نظر کو عوامی چیز بنا کر اس کی اصلیت سے انکار کیا ہے لہذا ایک دروازے سے جانے کی ممانعت کا سبب یہ قرار دیا ہے کہ کہیں مصر کے اقتدار سلطنت کو ان کے قد و قامت سے ان کی طاقت وری کا صحیح اندازہ ہو تو وہ اپنے لئے سیاسی طور پر ان سے خطرہ محسوس نہ کریں اور ان کی ضرر رسانی کے درپے نہ ہو مگر چونکہ نظر بد کی اصلیت شرعاً معتبر طریقہ پر ثابت ہے اس لئے پہلا ہی خیال جو مفسرین کی اکثریت کا ہے درست معلوم ہوتا ہے۔ [۳]

وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ۗ مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ

[۱] وکیل شہید (جلالین)

[۲] تا چشم زخم نرسد (فتح الرحمن)

[۳] الذی قال له غیر صحیح فی امر العین بل غیر منکر ان یکون ما قال المفسرون صحیحاً (تبیان)

إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسٍ يَعْقُوبَ قَضَاهَا ۗ وَإِنَّهُ لَدُوٌّ عَلِيمٌ لِّمَا عَلَّمْنَاهُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ

النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٦٨﴾

اور جب وہ لوگ داخل ہوئے جس طرح ان کے باپ نے انہیں حکم دیا تھا تو انہیں تقدیر الہی ^[۱] سے کوئی چیز بچا تو سکتی نہ تھی مگر یعقوب کے دل کی ایک حسرت تھی جسے انہوں نے نکال لیا ^[۲] اور یقیناً وہ علم رکھنے والے تھے اس کا کہ جس کا ہم نے انہیں علم عطا کیا تھا مگر اکثر لوگ جانتے نہیں۔

یعنی یعقوب بھی جانتے تھے کہ یہ بس ایک ظاہری بچاؤ کی تدبیر ہے ورنہ ہوگا وہی جو منظور خدا ہوگا۔

وَلَمَّا دَخَلُوا عَلَى يُوسُفَ أَوَىٰ إِلَيْهِ أَخَاهُ قَالَ إِنِّي أَنَا أَخُوكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا

كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٦٩﴾ فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَّازِهِمْ جَعَلَ السَّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ

أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيبُ إِنَّا كُنْمُ لَسِرِ قُورُن ﴿٧٠﴾

اور جب وہ لوگ یوسف کے پاس داخل ہوئے تو انہوں نے اپنے پاس رکھا اپنے بھائی کو کہا میں تمہارا سگ بھائی ہوں تو تم پریشان نہ ہونا اس سے جو یہ لوگ کریں، اس کے بعد جب ان کا سامان تیار کر لیا تو پانی پینے کا کٹور اپنے بھائی کے سامان میں رکھوا دیا۔ پھر ایک منادی نے ندا دی کہ اے قافلہ والو! یقیناً تم لوگ چور ہو۔

شاہی کٹورا یقیناً کوئی معمولی کٹور انہیں ہو سکتا، ضرور جو اہرات اس میں جڑے ہوئے ہوں گے۔ ^[۳]

بھائیوں کی دوسری دفعہ حاضری اور یوسف کی اپنے حقیقی بھائی کو اپنے پاس رکھ لینے کے لئے ترکیب

قابل لحاظ یہ امر ہے کہ جناب یوسف علیہ السلام کی ندا میں یہ نہیں ہے کہ یہ چور ہے یعنی ان کا بھائی بلکہ کہا گیا ہے تم چور ہو اس کے لئے

ہمارے یہاں امام جعفر صادق علیہ السلام کی زبانی یہ نہایت لطیف پہلو وارد ہوا ہے

کہ انہوں نے اس وقت نہ چوری کی ہو مگر ان کے چور ہونے میں شبہ ہی کیا ہے کہ انہوں نے خود یوسف کو ان کے باپ سے چرایا۔ جو

یقیناً بڑا جرم عظیم تھا۔ اس طرح یہ جملہ معاذ اللہ جھوٹ نہ تھا۔ جو شان انبیاء کے خلاف ہے بلکہ تو یہ تھا جو معانی بیان کی ایک مستقل صنعت ہے اور فصیح کلام کا ایک جوہر ہے۔

قَالُوا وَقَبِلُوا عَلَيْهِمْ مَاذَا تَفْقِدُونَ ﴿٧١﴾ قَالُوا نَفِقِدُ صُوعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَاءَ

[۱] من اللہ ای من قضائہ (جلالین)

[۲] سر انجام یعقوب علیہ السلام خطر ہوا کہ حذر ضمیر و بود (شاہ ولی اللہ) مگر ایک خطرہ تھا بیچ دل یعقوب کے کہ کر ڈالا اس کو (شاہ رفیع الدین)

[۳] ہی صاع بالذہب مرصع بالجواہر (جلالین) ایک پیالہ مرصع پانی پینے کا (شاہ رفیع الدین)

بِهِ جُمْلٌ بَعِيرٌ وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ ﴿٤٦﴾ قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جُنَا لِنُفْسِدَ فِي
الْأَرْضِ وَمَا كُنَّا سِرْقِينَ ﴿٤٧﴾ قَالُوا فَمَا جَزَاؤُهُ إِنْ كُنْتُمْ كَذِبِينَ ﴿٤٨﴾ قَالُوا
جَزَاؤُهُ مَنْ وَجَدَ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُهُ ۗ كَذَلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ﴿٤٩﴾

انہوں نے ان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا کہ کیا چیز تمہاری کھو گئی؟ انہوں نے کہا کہ بادشاہ کے پینے کا پیالہ ہمیں نہیں مل رہا ہے اور جو اسے لائے اسے اونٹ کے برابر بھر غلام عام میں ملے گا اور میں اس کا ذمہ دار ہوں۔ انہوں نے کہا خدا کی قسم تم جانتے ہو کہ ہم نہیں آئے ہیں اس لئے کہ اس سرزمین میں خرابی پھیلانیں اور ہم چور نہیں ہیں انہوں نے کہا تو کیا سزا ہے اس کی اگر تم جھوٹے ہو، انہوں نے کہا کہ سزا اس کی یہ ہے کہ جس کے سامان میں وہ مل جائے تو یہی آدمی اس کا معاوضہ ہے اس طرح سزا دیتے ہیں ہم مجرموں کو۔ وہی آدمی معاوضہ ہے یعنی اس کو غلام بنا کر اپنے پاس روک لیا جائے گا۔

فَبَدَأَ بِأَوْعِيَّتِهِمْ قَبْلَ وِعَاءِ آخِيهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِعَاءِ آخِيهِ ۗ كَذَلِكَ
كِدْنَا لِيُوسُفَ ۗ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۗ نَرْفَعُ

دَرَجَاتٍ مَّنْ نَّشَاءُ ۗ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ﴿٥٠﴾

”تو انھوں نے اپنے بھائی کے برتن سے پہلے انکے برتنوں سے ابتداء کی، پھر اسے نکال لیا اپنے بھائی کے برتن سے۔ اس طرح ہم نے ترکیب کی یوسف کے لیے۔ وہ نہیں لے سکتے تھے اپنے بھائی کو بادشاہ کے قانون کے مطابق سوا اس کے کہ اللہ چاہے۔ ہم جسے چاہتے ہیں مرتبوں میں بلندی عطا کرتے ہیں اور ہر علم والے سے اوپر ایک علم والا ہوتا ہے“
شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں۔

”یعنی بھائیوں کی زبان سے آپ ہی نکلا کہ چور کو غلام کر لو، اُس پر پکڑے گئے نہیں تو اس بادشاہ کا یہ حکم نہ تھا۔“ (موضح القرآن)

في دين الملك حكم مصر لاق جزاءه عند الصّبر وتقويم مغل المسروق لالا مسترقان الا لان

يشاء الله اخذها بحكم ابيه امي لم يتمكن من اخذها الا بمشيئة الله اى بالهامه سؤال اخوته و جوابه .

بادشاہ کے حکم میں یعنی بادشاہ مصر کے قانون میں کیونکہ ان کے یہاں اس کی سزا جسمانی تعزیر تھی اور جو چیز چرائی گئی ہو، ویسی چیز کی قیمت وصول کرنا، نہ یہ کہ چور کو غلام بنانا، سوا اس کے کہ اللہ چاہے۔ یعنی اسے چاہا کہ یہاں یوسف کے باپ کے قانون کے مطابق عمل ہوا اور وہ القائے ربانی سے اپنے بھائی کو اپنے پاس رکھ سکیں کہ وہ خود بھائیوں سے پوچھیں اور وہ یہ جواب دیں۔

الا ما شاء الله سوا اس کے کہ اللہ چاہے، اس کے بعد یہ ارشاد کہ ہم جسے چاہتے ہیں مرتبوں میں بلندی عطا کرتے ہیں، اس حقیقت

کا اظہار ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کو اپنے پاس رکھنے کا جو منصوبہ بنایا تھا، یہ اللہ کی ہدایت خاص کا نتیجہ تھا [1] اس کے بعد کتنا غلط ہے یہ تصور کہ اسے جناب یوسف علیہ السلام کا ایک ترک اولیٰ سمجھا جائے کہ انہوں نے معاذ اللہ واقعہ کے خلاف ایک بات کہی۔

قَالُوا اِنْ يُّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهُ مِنْ قَبْلُ ۗ فَاَسْرَهَا يُّوسُفُ فِي نَفْسِهِ وَلَمْ

يُبْدِهَا لَهُمْ ۗ قَالَ اَنْتُمْ شَرُّ مَمَّاكَآ ۗ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ﴿٤٥﴾

”انہوں نے کہا کہ اگر اس نے چوری کی ہے تو اس کے ایک بھائی نے بھی اس سے پہلے چوری کی تھی تو اسے یوسف نے اپنے دل میں چھپائے رکھا اور نہیں ظاہر کیا ان کے لئے۔ کہا تم منزل کے لحاظ سے بدتر ہو اور اللہ خوب جانتا ہے اس کیفیت کو جو تم بیان کرتے ہو۔“

انہوں نے کس بنا پر کہا کہ اس کے ایک بھائی (یعنی یوسف علیہ السلام) نے بھی اس سے پہلے چوری کی تھی اس کے لئے مفسرین کا بیان مختلف ہے ایک یہ ہے کہ

حضرت یوسف ننی از طلا از ان جدۃ مادری خود بدزدید تا از عبادت صنم باز ماند۔ مشابہ این قصہ چیزی کہ سبب تہمت او باشد بدزدی بوقوع آمدہ بود (فتح الرحمن)

جناب یوسف علیہ السلام نے سونے کی ایک مورتی اپنی نانی کے پاس سے چرائی تھی تاکہ وہ بت پرستی سے باز آجائے اسی طرح کا کوئی واقعہ ایسا تھا کہ چوری کا الزام ان پر عائد ہو گیا۔

تفسیر جلالین میں ہے:

كان سرق لابي امه صنما من ذهب فكسر لئلا يعبداه

انہوں نے اپنے نانا کی سونے کی ایک مورتی چرائی تھی جسے انہوں نے توڑ دیا تاکہ وہ اس کی عبادت نہ کرے۔

دوسرے یہ کہ:

ان پر چوری کا طعن دیا، وہ قصہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو پھوپھی نے پالا، جب بڑے ہوئے تو باپ نے چاہا اپنے پاس رکھیں پھوپھی کو محبت تھی چھپا کر ایک پٹکان کی کمر سے باندھ دیا پھر اس کو ڈھونڈھنے لگی لوگوں میں چرچا ہوا آخران کی کمر سے نکلا موافق اس دین کے ایک برس پھوپھی کے پاس اور رہے (موضح القرآن)

جناب شیخ طوسی نے ان دونوں اقوال کے علاوہ ایک تیسری بات یہ درج کی ہے کہ وہ دسترخوان پر سے مخفی طور پر کچھ کھانا بچا کر فقراء و مساکین کے لئے رکھ دیتے تھے [2] اس لئے گھر والوں نے یہ الزام ان پر عائد کیا۔

بہر حال وہ چیز کوئی ایسی ہے جو بجائے خود عند اللہ کوئی جرم نہ تھی لیکن برادران یوسف سے چوری کے لفظ سے تعبیر کر رہے تھے اسے

[1] انما قال ذلك لانه تعالى كان امره بذلك (تبیان)

[2] قال قوم انه كان يسرق من طعام الهائد فلكمساكين (تبیان)

یوسفؑ نے اپنے دل میں چھپائے رکھا اور ان کے سامنے ظاہر نہیں کیا۔ یہ وہی بات ہے جسے بعد میں قرآن نے کہا ہے کہ انہوں نے کہا: **أَنْتُمْ شَرُّ مَكَانًا** تم منزل کے لحاظ سے بدتر ہو تو یہ انہوں نے زبان سے تھوڑی کہا، دل میں کہا۔^[۱]

”بدتر“ کا لفظ ان کی اس برائی کے تصور کے لحاظ سے ہے جو وہ جناب یوسفؑ کے لئے ذہن میں لئے ہوئے تھے اور بطور ابہام اس وقت کہہ رہے تھے ورنہ حقیقت میں تو کوئی برائی جناب یوسفؑ میں تھی ہی نہیں، برے یہی لوگ تھے جو ان کی نسبت برائی کا تصور کر رہے تھے اور اشارۃ ظاہر کر رہے تھے۔

قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ إِنَّ لَهُ أَبًا شَيْخًا كَبِيرًا فَخُذْ أَحَدَنَا مَكَانَهُ ۗ إِنَّا نَنزِلُكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۴۸﴾ قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ أَنْ نَأْخُذَ إِلَّا مَنْ وَجَدْنَا مَتَاعَنَا عِندَهُ ۗ إِنَّا إِذَا لَطْمُونَ ﴿۴۹﴾

”ان لوگوں نے کہا اے عزیز مصر! یقین مانے کہ اس کا ایک بہت بوڑھا باپ ہے تو ہم میں سے ایک کو اس کی جگہ پر رکھ لیجئے ہم تو آپ کو بڑے حسن کردار کا حامل دیکھتے ہیں انہوں نے کہا اللہ کی پناہ اس سے کہ ہم لیں کسی کو سو اس کے کہ جس کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے اس صورت میں تو ہم ظالم قرار پائیں گے۔

یہ کہا کہ ”جس کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہیں۔ یہ نہیں کہ جس نے چوری کی ہے“ اس لیے کہ وہ جھوٹ ہوتا۔^[۲]

فَلَمَّا اسْتَيْسَسُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا ۗ قَالَ كَبِيرُهُمْ أَلَمْ تَعْلَمُوا أَنَّ أَبَاكُمْ قَدْ أَخَذَ عَلَيْكُمْ مَوْثِقًا مِنَ اللَّهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُمْ فِي يُوسُفَ ۗ فَلَنْ أBRَحَ الْأَرْضَ حَتَّى يَأْذَنَ لِي أَبِي أَوْ يَحْكَمَ اللَّهُ لِي ۗ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ﴿۵۰﴾ اِرْجِعُوا إِلَىٰ آبَائِكُمْ فَقُولُوا يَا أَبَانَا إِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۗ وَمَا شَهِدْنَا إِلَّا بِمَا عَلَّمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حَافِظِينَ ﴿۵۱﴾ وَسَلِّ الْقَرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا وَالْعَيْرَ الَّتِي أَقْبَلْنَا فِيهَا ۗ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ﴿۵۲﴾

تو جب وہ لوگ ان کی طرف سے ناامید ہوئے تو تخلیہ میں جا کر آپس میں چپکے چپکے مشورہ کرنے لگے۔ ان میں جو سب سے بڑا تھا، اس نے کہا، کیا تمہیں نہیں معلوم ہی کہ تمہارے باپ نے تم سے اللہ کی قسم دے کر عہد لیا تھا اور اس کے پہلے تم نے یوسف کے بارے میں تقصیر کی تھی، لہذا میں تو اس سرزمین سے ہٹوں گا نہیں جب تک کہ میرے

[۱]. قال في نفسه (جلالين) گفت حردل خود (شاهولی اللہ)

[۲]. لعرقيل من سرق تحرز امن الكذب (جلالين)

والد مجھے اجازت نہ دیں یا اللہ میرے لئے اپنا کوئی فیصلہ صادر کرے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے واپس جاؤ اپنے والد کے پاس اور جا کر ان سے کہو کہ اے ہمارے والد صاحب آپ کے بیٹے نے چوری کی اور ہم نہیں گواہی دیتے مگر وہی کہ جو ہمیں معلوم ہے اور غیب کی بات کی ہمیں خبر نہیں ہے اور اس بستی سے پوچھ لیجئے جس میں ہم تھے اور اس قافلہ سے کہ جس میں ہم آئے ہیں اور ہم بلاشبہ سچے ہیں۔

اس سلسلہ کے پہلے ٹکڑے فَلَکَمَا اسْتَيْسَسُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا میں کچھ ایسی کیفیت ہے کہ اسے محسوس کر کے بعض قرآن کے مقابلہ کا ارادہ کرنے والے سپر انڈیٹ ہو کر بیٹھ گئے [۱] مگر ترجمہ سے اس کیفیت کا اندازہ کرنا، ہمیں مشکل بلکہ دشوار معلوم ہوتا ہے۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْراً ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۗ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَنِي

بِهِمْ جَمِيْعًا ۗ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿۸۶﴾

”انہوں نے کہا بلکہ تمہارے نفوس نے تمہارے لئے ایک بات بنائی ہے تو بہر حال میں صبر کرتا ہوں جو بہتر ہے ممکن ہے کہ اللہ ان سب کو میرے پاس لائے، یقیناً وہ بڑا جاننے والا ہے صحیح کام کرنے والا۔“

جناب یعقوب علیہ السلام کو اس کی اطلاع اور ان کا تاثر

ان سب کو یعنی تین بیٹے جو مصر میں رہ گئے ہیں، یوسف اور ان کے حقیقی بھائی اور ان بھائیوں میں سب سے بڑا جس نے مصر سے ہٹنا اس صورت حال میں پسند نہیں کیا۔

اب یہاں ایک پہلو حل طلب یہ ہے کہ یوسف کے بارے میں بھائیوں کے جا کر کہنے سے کہ بیٹھ بیٹھنے نے کہا لیا، یہی الفاظ حضرت یعقوب نے کہے تھے کہ تمہارے نفوس نے تمہارے لئے ایک بات بنائی ہے بہر حال میں صبر کرتا ہوں۔ وہ تو بلا تکلف درست ہے، لیکن وہی الفاظ اب اس دفعہ بھی ان بھائیوں کی اطلاع رسانی پر کہے۔ حالانکہ اس دفعہ ان بھائیوں کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اس کے لئے شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

پہلی بار کی بے اعتباری سے اب کی بار بھی حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کا اعتبار نہ کیا لیکن نبی کا کلام جھوٹ نہیں بیٹوں کی بنائی بات تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام بھی بیٹھے تھے (موضح القرآن)

اس میں سے صرف پہلا جزء تفسیر جلالین میں ہے:

انہم لما سبق منهم في امر يوسف۔

انہوں نے ان پر اعتماد نہ کیا ان کے اس عمل کی وجہ سے جو یوسف علیہ السلام کے بارے میں ہو چکا تھا۔

ہماری نظر میں شاہ صاحب نے جو اضافہ کیا ہے وہ بڑی قدر و قیمت کا حامل ہے یعنی ان کا ضمیر اسلامی اسے گوارا نہیں کرتا کہ ایک نبی کی زبان سے سابق پر قیاس کی بنا پر کوئی خلاف واقعہ بات نکلے مگر اس صورت میں انہیں کسی ایسی حدیث کو بھی رد کر دینا چاہیے جو جناب یعقوب سے بالاتر ذات یعنی ان کے جدا امجد حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے معاذ اللہ جھوٹوں کی فہرست مرتب کر کے پیش کر رہی ہو۔ چاہے وہ کسی بھی صحیح نام کی

[۱] ہذا من عجیب فصاحة القرآن الخارفة للعادة. (تبیان)

کتاب میں درج شدہ ہو، بہر حال اس حدیث کو غیر صحیح ہی ماننا چاہیے۔

وَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَقَالَ يَا سَعْدِي عَلَىٰ يُوسُفَ وَأَبِيصَّتْ عَيْنُهُ مِنَ الْحُزْنِ
فَهُوَ كَظِيمٌ ﴿٨٦﴾ قَالُوا تَاللَّهِ تَفْتُوا تَذَكُرُ يُوسُفَ حَتَّىٰ تَكُونَ حَرَضًا أَوْ تَكُونَ
مِنَ الْهَالِكِينَ ﴿٨٧﴾ قَالَ إِنَّمَا أَشْكُوا بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ وَأَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا
تَعْلَمُونَ ﴿٨٨﴾

’اور ان کی طرف سے انہوں نے منہ پھیر لیا اور پھر کہا ہائے افسوس یوسف پر اور ان کی دونوں آنکھیں رنج و غم سے سفید ہو گئیں تو ایک خاموش مرقع غم [۱] بن گئے۔ ان لوگوں نے کہا خدا کی قسم آپ برابر یوسف کو یاد کرتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ سخت بیمار پڑ جائیں [۲] یا ہلاک ہی ہو جائیں۔ انہوں نے کہا میں تو اپنے رنج و غم کی شکایت بس اللہ سے کرتا ہوں۔ اور جانتا ہوں اللہ کی طرف سے وہ جو تم نہیں جانتے ہو‘۔

جناب یعقوب کا گریہ اور روتے روتے زوالِ بصارت

ان آیات سے جناب یعقوب کا گریہ اور روتے روتے زوالِ بصارت کے واقعے کو بیان کیا گیا ہے۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

یعنی تم کیا مجھ کو صبر سکھاؤ گے لیکن بے صبر وہ ہے جو خلق کے آگے شکایت کرے میں تو اس سے کہتا ہوں جس نے درد دیا اور یہ بھی جانتا ہوں کہ مجھ پر آزمائش ہے دیکھو وہ کس حد پر جا کر بس ہو (موضح القرآن) مگر تفسیر جلالین میں ہے:

واعلم من الله ما لا تعلمون من ان رؤيا يوسف صدق وهو حي

جانتا ہوں اللہ کی طرف سے وہ جو تم نہیں جانتے ہو یعنی یہ کہ یوسف علیہ السلام کا خواب سچا تھا اور وہ زندہ ہیں۔

يَبْنِي أَذْهَبُوا فَتَحَسَّسُوا مِنْ يُوسُفَ وَأَخِيهِ وَلَا تَأْتِسُوا مِنْ رَوْحِ اللَّهِ إِنَّهُ لَا

يَأْتِسُ مِنْ رَوْحِ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ ﴿٨٩﴾

’اے میرے بیٹو! جاؤ، یوسف اور اس کے بھائی کی خبر لو [۳] اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، یقیناً اللہ کی رحمت

[۱]. مکروب مغمو م لا يظهر كربة (جلالین)

[۲]. مشر فاعلى الهلاك لطول مرضك (جلالین)

[۳]. التجسس طلب الشئى بالحا (تبیان)

سے نا امید نہیں ہوتے مگر کافر لوگ۔“

بھائیوں کی تیسری دفعہ حاضری، تعارف اور ان کی توبہ و انابت

ان آیات سے بھائیوں کی تیسری دفعہ حاضری، تعارف اور ان کی توبہ و انابت کے واقعے کو بیان کیا گیا ہے۔

فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَيْهِ قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ مَسَّنَا وَأَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ
مُزْجَجَةٍ فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ۗ إِنَّ اللَّهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِينَ ﴿٨٧﴾
قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مِمَّا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ ﴿٨٨﴾ قَالُوا إِنَّكَ
لَأَنْتَ يُوسُفُ ۗ قَالَ أَنَا يُوسُفُ وَهَذَا أَخِي ۖ قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا ۗ إِنَّهُ مَنْ يَتَّبِعِ
وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٨٩﴾

’جب وہ لوگ ان کے پاس داخل ہوئے تو کہنے لگے اے عزیز مصر! ہمیں اور ہمارے تمام گھر والوں کو بڑی سختی
درپیش ہو گئی ہے اور ہم تھوڑی سی پونجی لائے ہیں تو ہمیں پورا پیمانہ ناپ کر دلواد دیجئے اور ہم پر خیرات کیجئے یقیناً اللہ
خیرات کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے انہوں نے کہا کچھ تمہیں خبر ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ
کیا سلوک کیا جب کہ تم جہالت میں مبتلا تھے انہوں نے کہا سچ تم یوسف ہو؟ کہا میں یوسف اور یہ میرا بھائی ہے
ہم پر اللہ نے احسان کیا ہے یقیناً جو پرہیزگاری سے کام لیتا ہے اور صبر کرتا ہے تو بلاشبہ اللہ نیک اعمال والوں کے
اجرو ثواب کو برباد نہیں کرتا۔

درمیانی کڑی سننے والے کی سمجھ پر چھوڑی گئی ہے یعنی اس کے بعد پھر قحط سالی کی پریشانی سے مجبور ہو کر برادران یوسف نے مصر کا رخ

کیا اور وہاں پہنچے۔^[۱]

معاوضہ چونکہ نا کافی تھا، اس لئے اس عاجزی کے ساتھ غلہ کی خریداری کی درخواست کی اور کہا خیرات سے کام لیجئے، یعنی معاوضہ تو اتنا
نہیں ہے مگر آپ اس کی کمی کو نظر انداز کیجئے اور ہمیں غلہ پورا دلواد دیجئے^[۲] اور یہی عاجزی تھی جس پر جناب یوسف علیہ السلام کو رحم آ گیا ہے^[۳] اور انہوں
نے بتلادیا کہ میں کوئی غیر نہیں ہوں وہی تمہارا بھائی ہوں۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

قحط میں سب اسباب گھر کا بک گیا اب کی بار اون اور پنسیر اور ایسی چیزیں لائے تھے انان خریدنے کو یہ حال سن کر یوسف کو رحم آیا اور

[۱]. فأنطلقوا نحو مصر ليوסף (جلالین)

[۲]. تصدق علينا يا المسامحة عن رداءة بضاعتنا (جلالین)

[۳]. سألوها التصدق عليهم بأبضاعة كيلهم فرق لهم (تبیان)

اپنے تئیں ظاہر کیا اور سارے گھر کو بلوا لیا۔ (موضح القرآن)

قَالُوا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ ﴿٩١﴾ قَالَ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمْ
الْيَوْمَ ۗ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۗ وَهُوَ اَرْحَمُ الرَّحِيْمِيْنَ ﴿٩٢﴾ اِذْهَبُوا بِقِيَصِيْهِ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ
عَلٰى وُجُوْهِ اَبْنِيْ يٰٓاَبَتِ بَصِيْرًا ۗ وَاَنْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۙ ﴿٩٣﴾

”ان لوگوں نے کہا کہ خدا کی قسم اللہ نے تم کو ہم پر مقدم کیا ہے اور ہم بے شک خطاوار تھے انہوں نے کہا اب آج تم کو کوئی لعنت ملامت کرنا نہیں ہے، اللہ تم کو بخش دے اور وہ تمام رحمت والوں میں سب سے زیادہ رحمت والا ہے۔ لے جاؤ میرے اس کرتے کو اور لے جا کر میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو۔ ان کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی اور میرے پاس اپنے تمام گھر والوں کو سب کو لے کر آؤ۔“

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمُ اِنِّيْ لَاجِدُ رِيْحَ يُوسُفَ لَوْلَا اَنْ تَفْنَدُوْنَ ﴿٩٤﴾
قَالُوا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ﴿٩٥﴾ فَلَمَّا اُنْ جَاءَ الْبَشِيْرُ اَلْقَاهُ عَلٰى وُجُوْهِهِ
فَاَرْتَدَّتْ بَصِيْرًا ۗ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَكُمْ اِنِّيْ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٩٦﴾

”اور جب قافلہ روانہ ہوا تو ان کے باپ نے کہا میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں، اگر تم لوگ مجھے بے وقوف نہ بناؤ، ان لوگوں نے کہا خدا کی قسم آپ اپنی پرانی گمراہی میں ہیں تو جب خوش خبری دینے والا آیا، اس نے اُسے ان کے چہرہ پر ڈال دیا تو ان کی آنکھیں دوبارہ روشن ہو گئیں انہوں نے کہا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں اللہ کی طرف سے وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو۔“

جناب یوسف علیہ السلام کی خوشبو اور پیرہن کا جناب یعقوب علیہ السلام تک پہنچنا اور بینائی کا پلٹنا

یہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیٹے ہی نہیں جو برادران یوسف تھے بلکہ گھر کے دوسرے لوگ بھی جناب یعقوب کی شان میں گستاخیاں کرتے تھے اور جناب یوسف علیہ السلام کو اتنا زیادہ یاد کرتے اور ان کے رونے پر طعن و تشنیع کرتے تھے کیونکہ وہ بھائی تو اس وقت مصر میں تھے تو یہ دوسرے ہی لوگ ہو سکتے ہیں جن سے یہ گفتگو ہو رہی تھی۔ [۱]

قَالُوا يَا اٰبَانَا اَسْتَغْفِرُ لَنَا ذُنُوْبَنَا اِنَّا كُنَّا خٰطِئِيْنَ ﴿٩٧﴾ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ
رَبِّيْ ۗ اِنَّهُ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿٩٨﴾

[۱]. اِنَّمَا قَالَ يَعْقُوبُ هٰذَا الْقَوْلَ لِمَنْ حَضَرَ هٗ مِنْ اَهْلِهِ وَقَرَابَتِدُوْنَ وَوَلَدِهٖ لَّا يُمْرُؤْنَ كَانُوْا غِيْبًا عَنْهٖ لَمْ يَصِلُوْا اِلَيْهٖ. (تبیان)

”انہوں نے کہا اے ہمارے والد! ہمارے گناہوں کی مغفرت کے لئے سفارش کیجئے، یقیناً ہم خطاوار تھے انہوں نے کہا میں تمہارے لئے پروردگار سے بخشش کی التجا کروں گا۔ یقیناً وہ بخشنے والا ہے بڑا مہربان۔“

یہ کس نے کہا؟ سیاق تو بتاتا ہے کہ تمیس کے پہنچنے کے وقت ہی جب جناب یعقوبؑ نے کہا کہ میں نہ کہتا تھا کہ میں اللہ کی طرف سے وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، اسی وقت یہ کہا گیا مگر اس وقت جناب یعقوبؑ کے وہ بیٹے ان کے پاس کہاں تھے جو وہ کہتے، معلوم ہوتا ہے کہ درمیان کی کڑیاں یہاں مذکور نہیں ہیں اس تمیس کے پہنچنے اور جناب یعقوبؑ کی بصارت واپس ہونے کے بعد برادران یوسفؑ بھی پھر یوسفؑ کی ہدایت کے مطابق کہ اپنے تمام گھر والوں کو میرے پاس لے کر آؤ۔ کنعان میں اپنے والد کی خدمت میں گئے اور اس وقت انہوں نے یہ کہا۔^[1]

فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَى يُوسُفَ أَوَىٰ إِلَيْهِ أَبُوهُ وَقَالَ ادْخُلُوا مِصْرَ إِن شَاءَ اللَّهُ
 أَمِينٌ ﴿٩٩﴾ وَرَفَعَ أَبُوهُ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا ۖ وَقَالَ يَا بَنِي هَذَا تَأْوِيلُ
 رُؤْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۖ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا ۖ وَقَدْ أَحْسَنَ بِي إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ
 وَجَاءَ بِكُمْ مِنَ الْبَدْوِ مِنْ بَعْدِ أَنْ نَزَغَ الشَّيْطَانُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِي ۗ إِنَّ رَبِّي
 لَطِيفٌ لِّمَا يَشَاءُ ۗ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿١٠٠﴾ رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ
 وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ ۗ فَاطِرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ أَنْتَ وَلِيٌّ فِي
 الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۗ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحَقْنِي بِالصَّالِحِينَ ﴿١٠١﴾

”تو جب وہ سب یوسفؑ کے پاس داخل ہوئے تو انہوں نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا مصر میں داخل ہو جائیے جہاں انشاء اللہ امن واطمینان سے رہے گا اور اپنے ماں باپ کو تخت پر اونچا بٹھایا اور وہ سب ان کے سامنے سجدہ میں گر گئے اور انہوں نے کہا اے بابا! یہ میرے خواب کی جو پہلے دیکھا تھا تعبیر ہے جسے میرے پروردگار نے سچ کر دکھایا ہے اور اس نے مجھ پر احسان کیا جب کہ اس نے مجھے قیدخانہ سے نکالا اور آپ لوگوں کو بیابان سے یہاں لایا جب کہ اس کے پہلے شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان پھوٹ ڈالتی تھی یقیناً اللہ مہربانی کرنے والا ہے جس پر وہ چاہے یقیناً وہ جاننے والا ہے ٹھیک کام کرنے والا۔ اے میرے پروردگار! تو نے مجھے ایک طرح کی سلطنت دی اور مجھے خوابوں کی تعبیر کا علم دیا۔ اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے! تو میرا پروردگار ہے دنیا اور آخرت میں۔ مجھے دنیا سے مسلمان اٹھا اور مجھے نیک اعمال لوگوں میں محسوب فرما۔“

[1] فی الکلام حذف لان تقدیرہ ان اخوة یوسف وصلوا الی ابیہم فلہما رواہ قالوا الہ یا اباانا استغفر لنا ذنوبنا (تبیان)

بچپن کے خواب کی تعبیر ظاہر ہونا اور سب کا یوسفؑ کے سامنے سر بسجود ہونا

یہ تذکرہ جہاں سے شروع ہوا ہے اس میں درمیان کی کڑیاں پھر محذوف ہیں یعنی یوسفؑ کی خواہش کے مطابق برادران یوسف کنعان گئے اور اب تمام گھر کے لوگوں سمیت دوبارہ مصر آئے۔^[1]

یوسفؑ کے پاس داخل ہوئے تو انہوں نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی۔ حالانکہ ابھی مصر میں داخل نہیں ہوئے ہیں اس لئے کہ اس کے بعد ان کا یہ کہنا ہے کہ مصر میں داخل ہو جائیے۔

اس کی تشریح شاہ ولی اللہ اپنے ترجمہ میں یوں کرتے ہیں:

چوں در آمد از نزد یوسف یعنی در خیمہ اش و او بر ائ استقبالی بر آمدہ بود جائے داد بسوی خود پدر و مادر خود را و گفت در آئید بمصر۔“

یعنی یوسفؑ ماں باپ وغیرہ کے استقبال کو شہر سے باہر آئے تو وہاں ان کے لئے ایک خیمہ لگایا گیا تھا جس میں فروکش تھے پہلے یہ لوگ ان کے پاس اس خیمہ میں داخل ہوئے۔ وہاں یہ باتیں ہوئیں جن کا ذکر اس آیت میں ہے:

شاہ عبدالقادر نے مختصر طور پر یوں کہا ہے کہ:

باہر شہر سے استقبال کو نکلے وہاں یہ کہا (موضح القرآن)

وہ تفصیل اور یہ جمال دونوں جلالین سے ماخوذ ہیں جنہوں نے لکھا ہے:

فلما دخلوا علی یوسف فی مضر بہ۔

جب وہ یوسفؑ کے پاس داخل ہوئے ان کے خیمہ میں۔

”وہ سب ان کے سجدہ میں گر گئے“۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

پہلے وقت میں سجدہ تعظیم تھی آپس کی۔ فرشتوں نے حضرت آدمؑ کو کیا ہے اس وقت اللہ نے وہ رواج موقوف کیا: **وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلَّهِ** (سورہ جن ۱۸) یہ اس وقت پہلے رواج پر چلنا ویسا ہے کہ کوئی بہن سے نکاح کرے کہ حضرت آدمؑ کے وقت ہوا ہے، (موضح القرآن)

یہ مثال جو دی ہے اس سے تو ہمیں اتفاق نہیں ہے ہمارے احادیث بتاتے ہیں کہ آدم کے وقت میں بھی بہن سے نکاح نہ تھا مگر اصولاً یہ بات درست ہے کہ سابق شریعت میں اگر کوئی حکم ہو تو اسلام میں منسوخ ہو جانے کے بعد اب اس پر عمل درست نہیں ہے مگر اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ سجدہ غیر خدا کے لئے ذاتاً شرک نہیں ہے اس لئے کہ اگر شرک ہوتا تو کسی دور میں بھی خالق کی طرف سے اس کا حکم نہ ہوتا حالانکہ باعتراف شاہ صاحب ملائکہ نے آدم کو سجدہ کیا۔ اسے رواج کہہ کر ہلکا نہیں بنایا جاسکتا کیونکہ وہ بعض قرآن حکم الہی سے تھا اور یہ ظاہر ہے کہ خالق کی طرف سے کسی دور میں بھی اپنے ساتھ شرک کی اجازت نہیں ہو سکتی۔ لہذا اب سجدہ ممنوع بے شک ہے لیکن وہ ایک شرعی حکم ہے جس کی مخالفت سے انسان گنہگار ہوگا لیکن شرک کا حکم عائد نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ سجدہ بطور عبادت نہ ہو یعنی اس شے کو خدا سمجھ کے خود اس شے کی پرستش کے طور پر سجدہ

[1] فی الکلام حذف لان تقدیرہ ان یعقوب و بنیہ و اہلہم خلوا الی یوسف فلما وصلوا الیہ (تبیان)

کرے اس صورت میں سجدہ نہیں بلکہ جو طریقہ اس سے کمتر درجہ کا بھی اختیار کرے گا تو وہ شرک ہوگا اور اگر اس شخص کی عبادت مقصود نہیں ہے تو سجدہ اس کے لئے معصیت ہی سمجھا جاسکتا ہے اس پر شرک کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔

ہاں بس تفسیر جلالین کے اس محل پر جو صاحب قلم کار ہیں۔ انہوں نے قرآن کی اس تصریح: خروا لہ سجدا کے معنی میں تبدیلی فرمادی ہے: وہ کہتے ہیں:

سجود انحاء لا وضع جبہة وکان تحیتہم فی ذلک الزمان
سجدہ بس خم ہو جانے کی حد تک نہ کہ پیشانی زمین پر رکھنا اور وہ یعنی خم ہونا اس زمانہ کے سلام و آداب کا طریقہ تھا۔
حالانکہ کہ سجدہ کے جو اصل معنی ہیں وہ سب کو معلوم ہیں ان میں اس تبدیلی کی کوئی سند ہونا چاہیے اور یہاں اس کی کوئی سند موجود نہیں ہے بلکہ خروا کے ساتھ جو سجدہ 'گر گئے' کا لفظ ہے وہ قطعی طور پر اس تصریح کی نفی کرتا ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ اِلَيْكَ ۗ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْا اَمْرَهُمْ

وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

”یہ غیب کی خبریں ہیں جن کی ہم آپ کی طرف وحی بھیجتے ہیں اور آپ خود ان کے پاس موجود نہ تھے جب انہوں نے طے کیا اپنے منصوبہ کو اور وہ سازش کر رہے تھے۔“

مطلب یہ ہے کہ اگر الہی تعلیم نہ ہوتی تو آپ کو ذاتاً ان تفصیلات کے علم کا کوئی ذریعہ نہ تھا شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”یہ مذکورہ توریت میں اور پہلے کی کتابوں میں بھی نہیں۔“ (موضح القرآن)

وَمَا اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

”اور چاہے آپ کتنے ہی خواہش مند ہوں، زیادہ تر لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔“

قرآن مجید میں یہ مضمون بہت جگہ ہے اس کے بعد اگر فتح مکہ وغیرہ کے بعد یہ نظر آوے کہ اب زیادہ تر لوگ مسلمان ہو گئے اور مشرکین کی تعداد کم ہو گئی یا اس کا وجود ہی نہ رہا تو قرآن کی ان تصریحات پر ایمان رکھتے ہوئے یقین کرنا پڑے گا کہ ان میں سے زیادہ افراد کا ایمان نمائی ہے اور انہوں نے حقیقت میں ایمان اختیار نہیں کیا ہے۔

وَمَا تَسْأَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۗ اِنَّ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَكَآيِنٌ مِّنْ اٰيَةٍ فِي

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَمَا يُؤْمِنُ

اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾

”اور آپ ان سے اس پر کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتے وہ نہیں ہے مگر یاد دہانی تمام جہانوں کے لئے، اور کتنی ہی نشانیاں ہیں آسمانوں اور زمین میں کہ وہ گزرتے ہیں ان کی طرف سے اس طرح کہ وہ ان سے بے اعتنائی اختیار

کئے ہوتے ہیں اور ان میں سے زیادہ تر نہیں ایمان لاتے اللہ پر مگر یہ کہ شرک اختیار کئے ہوئے ہیں۔“
آخری فقرہ صریحی مشرکین سے متعلق تو ہو سکتا ہے بایں معنی کہ وہ اللہ کو مانتے ہیں جیسا کہ دوسری جگہ قرآن میں ہے کہ:

وَلَمَّا سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ
اگر ان سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ کہیں گے کہ اللہ نے۔ (لقمان- ۲۵)
مگر اللہ کو ماننے کے ساتھ وہ دوسرے معبودوں کو مانتے ہیں اس طرح شرک کے مرتکب ہیں۔
عام مفسرین بھی معنی قرار دیتے ہیں چنانچہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:
یعنی منہ سے سب کہتے ہیں کہ خالق مالک سب کا وہی ہے پھر اوروں کو پکڑتے ہیں۔“ (موضح القرآن)
تفسیر جلالین میں ہے:

وما یؤمن اکثرهم بالله حیث یقرؤن بأنه الخالق الرزاق الا وهم مشرکون به بعبادة الاوثان
”اکثر ان میں سے جو اللہ پر اس طرح ایمان لاتے ہیں کہ اقرار کرتے ہیں اس کا خالق کرنے والا اور رزق دینے والا وہی ہے تو یہ
ایمان نہیں ہے مگر اس طرح کہ وہ اس کے ساتھ بت پرستی کر کے شرک کرتے ہیں۔“

مگر ہمیں اس معنی میں تامل یوں ہے کہ اس طرح کے اقرار کو قرآن نے ایمان نہیں مانا ہے ورنہ دعوت کیوں دی جاتی کہ اللہ پر ایمان
لاؤ؟ اس لئے بعید نہیں ہے کہ یہ آیت اسی پہلو کو نمایاں کرتی ہو جسے اس سے قبل کی آیت میں ہم درج کر چکے ہیں یعنی ان میں سے زیادہ تر جب اللہ
پر ایمان لائیں گے یعنی مسلمان ہونے کا اقرار کریں گے تب بھی دل میں وہ مشرک ہی ہوں گے اس لئے وہ منافق ہوں گے، حقیقی مومن نہ ہوں
گے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ اعتقادی طور پر اللہ کے مقرر ہیں مگر عملاً ان تقاضوں کو پورا نہیں کرتے، اس طرح کہ اس کے احکام کے خلاف دوسروں
کے سامنے سر جھکاتے اور ان کی اطاعت کرتے ہیں اور گویا انہیں خداوند نعمت سمجھتے ہوئے خدا بنائے ہوئے ہیں جو ایک طرح کا شرک ہے چاہے
قانون شرع میں احکام شرک کے ان پر مرتب نہ ہوں۔ ہماری قدیم تفسیر اس تشریح کی موید ہے۔^[۱]

اَفَاٰمَنُوْا اَنْ تٰتِيَهُمْ غٰشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تٰتِيَهُمُ السّٰعَةُ بَغْتَةً وَهُمْ لَا

يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

”کیا وہ مطمئن ہیں اس خطرہ سے کہ ان پر کوئی چھا جانے والا عذاب اللہ کا اچانک یا ان کے سامنے قیامت آجائے
درحالیکہ انہیں خبر نہ ہو۔“

قُلْ هٰذِهِ سَبِيْلِيْ اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ ۚ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَّمَنْ اَتَّبَعَنِ ۗ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَا

[۱]. شرک طاعة و لیس شرک عبادة (علی بن ابراہیم)

اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٠٨﴾

”کہیے کہ یہ ہے میرا راسخا میں اللہ کی طرف دعوت دینا ہوں پوری طرح سمجھ کر میں بھی اور وہ بھی جو میرا پیرو ہے اور اللہ کی ذات ہر برائی سے پاک ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں“۔

پوری طرح سمجھ کر یعنی تحقیقی طور پر جو ہمارے یہاں ایمان کی شرط لازمی ہے تقلیدی طور پر نہیں، تمہاری طرح نہیں کہ بس ہم نے باپ دادا کو ایک راستے پر چلتے دیکھا ہے لہذا ہم بھی اسی راستے پر چلے جائیں گے“۔

جس طرح دوسرے مقامات پر جہاں من اتبعك آیا ہے اس کی تفسیر فردا کمل ہونے کے لحاظ سے حضرت علی بن ابی طالب ؑ کے ساتھ ہوئی ہے اسی طرح یہاں بھی رسول ﷺ کی زبانی جو ارشاد ہوا ہے ومن اتبعنی اس کے بھی معیاری مصداق جناب امیرؓ اور ان کے بعد اپنے اپنے دور کے معصومین ہیں۔^[1]

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوْحِي إِلَيْهِمْ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ ۗ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۗ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٠٩﴾ حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْسَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِّبُوا جَاءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّى مَنْ نَشَاءُ ۗ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُنَا عَنِ

الْقَوْمِ الْمَجرِمِينَ ﴿١١٠﴾

”اور ہم نے آپ کے پہلے نہیں بھیجا مگر انہی بستیوں میں سے ایسے آدمیوں کو جن کی طرف ہم نے اپنی وحی بھیجی تو کیا وہ روئے زمین پر چلے پھرے نہیں کہ وہ دیکھتے کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان کے پہلے تھے اور ضرور آخرت کا گھر بہتر ہے ان کے لئے جو پرہیزگاری سے کام لیں تو کیوں تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ یہاں تک کہ جب بھی پیغمبر نا امید ہونے لگے اور سمجھنے لگے کہ ان سے جھوٹی باتیں کہی گئیں تھیں تو ان کے پاس ہماری مدد آگئی تو جسے ہم نے چاہا، وہ نجات پا گیا، اور ہمارا عذاب ہٹایا نہیں جا سکتا ان لوگوں سے جو گنہگار ہیں“۔

وَلَقَدْ كُذِّبُوا فَقَرَّه مَفْسِرِينَ كَلَّا لَوْ دَعَوْا عِزًّا لَرَفَعْنَا عُوزًا لَقَدْ كُذِّبُوا فَمَعَاذَ اللَّهِ لَأُعَذِّبَنَّهُمْ سَخِرَاءً أَوْ يَخْتَلِفُ عَلَيْهِمُ الْغُفْرَانُ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١١١﴾

یہ جو کہا جا رہا ہے کہ وہ سمجھنے لگے کہ ان سے جھوٹی باتیں کہی گئیں تھیں تو اس سے سچی نگاہ والے جو مفہوم سمجھ سکتے ہیں وہ مرسلین کی شان کے بالکل خلاف ہے اس لئے مفسرین کے درمیان اس کا مفہوم بتانے میں اختلاف ہو گیا ہے۔ شاہ ولی اللہ کہتے ہیں:

”گمان کردند قوم ایشیاں کہ بدروغ وعدہ کردہ شد بایشیاں“

اس کے برخلاف ان کے بیٹے شاہ محمد رفیع الدین نے پہلی ضمیر رسل ہی کی طرف پھیری ہے۔ وہ کہتے ہیں: ”گمان کیا انہوں نے یہ کہ

[1] یعنی علی بن ابی طالب و آل محمد (علی بن ابراہیم)

اُن سے لوگوں نے تحقیق جھوٹ بولا۔“

اس میں بھی مرسلین کی شان کو محفوظ کیا گیا ہے کُذِبُوا جو فعل مجہول ہے، اس کا فاعل مضمّر، لوگوں کو قرار دیا ہے۔ معاذ اللہ خدا کے وعدوں کو نہیں۔ دوسرے بیٹے شاہ عبدالقادر تقریباً اپنے والد شاہ ولی اللہ سے اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-
 ”یعنی وعدہ عذاب کو دیر لگی یہاں تک رسولؐ ناامید ہو گئے کہ شاید ہماری زندگی میں نہ آیا پیچھے آوے اور ان کے یار خیال کرنے لگے کہ شاید وعدہ خلاف تھا“ (موضح القرآن)

یہاں چونکہ بات یاریجی ”اصحاب“ کی آگئی تھی تو شاہ صاحب کو اس کے بعد دفع دخل کی ضرورت محسوس ہوئی ہے کہ:-

”اتنے خیال سے آدمی کافر نہیں ہوتا، اگر جانتا ہے کہ یہ خیال بد ہے“

جلالین صاحبان نے پہلے تو کُذِبُوا کو کُذِبُوا کو کُذِبُوا کے ساتھ قرار دے کر معنی لکھے ہیں:-

ظَنُّوا اِيْقِيْنَ الرَّسُلَ اَنْهُمْ قَدْ كَذَبُوا بِالتَّشْدِيْدِ تَكْذِيْبًا لَا اِيْمَانَ بَعْدَهُ.

انہوں نے گمان کیا یعنی پیغمبروں کو یقین ہو گیا کہ ان کی تکذیب ہو گئی اب ایسی کہ جس کے بعد کسی کے ایمان لانے کا سوال نہیں۔
 پھر کُذِبُوا بغیر تشدید قرار دے کر اس کے معنی کہے ہیں:-

ظَنَّ الْاِمْرَءُ اَنَّ الرَّسُلَ اَخْلَفُوْا مَا وَعَدُوْا بِهِ مِنَ النَّصْرِ :

امتوں نے گمان کیا کہ پیغمبروں سے جو فتح و ظفر کے وعدے ہوئے تھے غلط نکلے۔ ہماری تقاضا سیر بھی اس کے موافق ہیں اے

یعنی ان قوم ہمہ ظنُّوا اَنَّ الرَّسُلَ كَذَبَتْ فِيْهَا اَخْبِرْتَبِه (تبیان)

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةً لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلٰكِن تَصْدِيْقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُوْنَ ﴿١١١﴾

بلاشبہ ان کے واقعات میں سبق ہے صاحبان عقل کے لیے۔ وہ کوئی افسانہ نہیں ہے جسے گھڑ لیا گیا ہو بلکہ وہ تصدیق ہے اس کی جو پہلے موجود تھا اور ہر بات کی تشریح ہے اور ہدایت ہے اور رحمت ان کے لیے جو ایمان لائیں۔

سُورَةُ الرَّعْدِ

مکیہ ----- ۴۱ آیات

عموماً اس کے سرنامہ پر مکیہ ہی لکھا ہوتا ہے مگر جیسا کہ جناب شیخ الطائف نے تبیان میں تحریر فرمایا ہے، یہ متفق علیہ نہیں ہے، دوسرا ایک قول یہ ہے کہ اس میں سے بس ایک آیت مکی ہے: **وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا تُصِيبُهُمْ بِمَا صَنَعُوا قَارِعَةٌ**۔ الخ باقی پورا سورہ مدنی ہے۔ اس سورہ کا نام یہ نام ”رعد“ کے تذکرہ کی وجہ سے ہوا ہے جس کا نام یعنی لفظ ”رعد“ اگرچہ ضمناً پہلے پارہ میں منافقین کی ایک تشبیہ کے ذیل میں آیا ہے مگر اس سورہ میں رعد کا خاص طور پر اس کی ایک کیفیت کے اظہار کے لیے مستقل ذکر ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اس سورہ میں حسب ذیل امور کا بیان ہے:-

سورہ رعد کے خاص خاص مضامین:

- ۱۔۔۔۔ خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے میں تبدیلی کا پیدا نہ کرے:-
- ۲۔۔۔۔ کائنات کی ہر شے بارگاہ الہی میں سر بسجود ہے۔
- ۳۔۔۔۔ بقائے صلح
- ۴۔۔۔۔ برائی کا مقابلہ بھلائی سے (عدم تشدد)
- ۵۔۔۔۔ یاد خدا سب اطمینان دل
- ۶۔۔۔۔ لوح محفوظ اور لوح محووا ثبات
- ۷۔۔۔۔ رسول کے گواہ دو: کتاب اور عالم کتاب وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے۔

الْمُرْتَفِ تِلْكَ آيَةُ الْكِتَابِ ۚ وَالَّذِي أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ

النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ①

الف۔ لام۔ میم۔ را۔ یہ آیات ہیں کتاب کی اور جو اتارا گیا ہے آپ کے پروردگار کی طرف سے حق ہے مگر زیادہ تر لوگ ایمان نہیں رکھتے۔

”کتاب سے مراد بظاہر قرآن ہی ہے اور اسی لیے تلک کا ترجمہ ہم نے ”یہ“ کے ساتھ کیا ہے جیسے سورہ بقرہ کے شروع میں ذلک الكتاب کا ترجمہ ”یہ کتاب“ اکثر کیا جاتا ہے مگر بعض لوگوں نے غالباً تلک کے اشارہ بعید کے لیے ہونے کی وجہ سے الكتاب سے انجیل مراد لی ہے، حالانکہ انجیل کا اس کے پہلے کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس لیے ترجیح پہلے ہی قول کو ہے۔“ [۱]

اللَّهُ الَّذِي رَفَعَ السَّمَوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ وَسَحَّرَ
الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى ۖ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ
لَعَلَّكُمْ بِلِقَاءِ رَبِّكُمْ تُوقِنُونَ ﴿۲﴾

”اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو بلند کیا بغیر کسی اڑانوں کے جنہیں تم دیکھو، پھر وہ پورے اقتدار کے ساتھ عرش پر متمکن ہوا [۲] اور سورج اور چاند کو پورے طور پر قابو میں رکھا کہ ہر ایک ایک مقررہ مدت تک رواں رہے۔ وہ انتظام کرتا ہے پوری سوجھ بوجھ کے ساتھ قدرت کی نشانیاں تشریح کے ساتھ پیش کرتا ہے، شاید تم اپنے پروردگار سے ملنے کا یقین کرو۔“

وَهُوَ الَّذِي مَدَّ الْأَرْضَ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْهَارًا ۖ وَمِنْ كُلِّ الشَّجَرِ جَعَلَ
فِيهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشَى الْبَيْلَ النَّهَارَ ۖ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ
يَتَفَكَّرُونَ ﴿۳﴾ وَفِي الْأَرْضِ قِطْعٌ مُّتَجَوِّرَاتٌ ۖ وَأَعْنَابٌ ۖ وَزُرْعٌ وَنَخِيلٌ
صِنَوَانٌ ۖ وَغَيْرُ صِنَوَانٍ يُسْقَى بِمَاءٍ وَاحِدٍ ۖ وَنُفِضِلُ بَعْضَهَا عَلَىٰ بَعْضٍ فِي
الْأُكُلِ ۖ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۴﴾

”اور وہ ہے جس نے زمین کو پھیلا یا اور اس میں پہاڑ اور نہریں پیدا کیں اور ہر طرح کے پھلوں سے اس میں دو دو قسمیں قرار دیں وہ ڈھانپتا ہے رات کو دن پر یقیناً نشانیاں ہیں ان کے لیے جو غور و فکر سے کام لیں اور زمین میں مختلف طرح کے ٹکڑے پہلو بہ پہلو ہیں اور باغ ہیں انگوروں کے اور کھیتیاں ہیں اور کھجور کے درخت ہیں ایسے کہ ایک ہی جڑ سے کئی درخت نکلے ہیں اور کچھ ایسے نہیں ہیں [۳] اور ایک ہی پانی سے سینچے جاتے ہیں اور ان میں بعض کو بعض پر ذائقہ میں ہم فوجیت دیتے ہیں۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان کے لیے جو عقل سے کام لیں۔“

[۱]. الاول اصح (تبیان)

[۲]. استولى بالاقتدار عليه و نفذوا السلطان (تبیان)

[۳]. الصنوان... ان يكون الاصل واحدا ثم ينشعب من الرأس (تبیان)

وَإِنْ تَعَجَبَ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءِ إِذَا كُنَّا تُرَابًا ؕ إِنَّا لَنَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ۝ أُولَئِكَ
الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ ۖ وَأُولَئِكَ الْأَغْلَلُ فِي آعْنَاقِهِمْ ۖ وَأُولَئِكَ أَصْحَابُ
النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ⑤

”اور اگر تعجب کرو تو قابل تعجب ان کا یہ کہنا ہے کہ کیا جب ہم خاک ہو جائیں گے تو ہم از سر نو پیدا ہوں گے؟ یہ وہ ہیں جنہوں نے کفر اختیار کیا اپنے پروردگار کے ساتھ اور یہ وہ ہیں کہ طوق ہوں گے ان کی گردنوں میں اور یہ لوگ دوزخ والے ہوں گے کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔“

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثَلُط ۖ وَإِنَّ
رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرٍ لِّلنَّاسِ عَلَىٰ ظُلْمِهِمْ ۖ وَإِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيدُ الْعِقَابِ ⑥

”اور وہ آپ سے بھلائی کے پہلے برائی کے لیے جلدی کرتے ہیں حالانکہ ان سے پہلے خداوندی سزاؤں کے نمونے [۱] گزر چکے ہیں اور بلاشبہ اللہ بڑا بخشنے والا ہے لوگوں کو ان کے ظلم و تعدی کے باوجود اور بلاشبہ تمہارا پروردگار سخت سزا بھی دینے والا ہے۔“

”جلدی کرتے ہیں“ اس طرح کہ رسول کی خبروں کا جو عذاب کے متعلق ہوتی ہیں، انکار کرتے یا مذاق اڑاتے ہوئے اکثریوں کہتے ہیں کہ پھر آخر یہ عذاب ہم پر آ ہی کیوں نہیں جاتا یا از خود کچھ صورتیں عذاب کی پیش کر کے کہتے ہیں کہ اگر ہماری بد اعمالیاں اتنی ہی جتنی آپ کہتے ہیں تو پھر ہم پر آسمان سے پتھر بھجوائیے اور کوئی دردناک عذاب ہم پر نازل کرائیے۔ [۲]

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۖ إِنَّمَا أَنْتَ مُنذِرٌ وَلِكُلِّ
قَوْمٍ هَادٍ ④

”اور کافر لوگ کہتے ہیں کہ ان پر کوئی نشانی ان کے پروردگار کی طرف سے کیوں نہیں اترتی! آپ تو بس عذاب سے ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کا ایک رہنما ہوتا ہے۔“

آخری فقرہ ”وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ“ اس کی تشریح میں اختلاف ہے۔ ایک تصور یہ ہے کہ یہ الگ جملہ ہے جس کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا

ہے:-

”اور ہر قوم کا ایک رہنما ہوتا ہے۔۔۔۔۔ شاہ ولی اللہ نے بھی اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔“ و ہر قومی را رہ نمائی می باشد“ تفسیر جلالین

میں ہے:

[۱] ای عقوبات امثالہم من المکذبین (جلالین)

[۲] کہا قالوا: واطر علینا من حجارة من السماء او ائتتنا بعذاب الیم (تبیان)

ولكل قوم هاد يبدعوهم انى ربهم بما يعطيه من الايات لا بما يفترحون :-
ہر قوم کا ایک رہ نما ہوتا ہے پیغمبر جو انہیں ان کے پروردگار کی طرف دعوت دیتا ہے ان نشانیوں کے ساتھ جو اسے عطا ہوتی ہیں، نہ کہ وہ جس کی وہ فرمائش کریں۔

دوسرا تصور یہ ہے کہ یہ قبل سے متعلق ہے یعنی آپ تو بس عذاب سے ڈرانے والے اور ہر قوم کے رہنما ہیں۔ شاہ فہج الدین کا ترجمہ اس کے مطابق ہے:

”تو ڈرانے والا ہے اور واسطے ہر قوم کے ہدایت کرنے والا۔“

ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی تفسیر پہلے قوم کے مطابق ہے اور اس کے لحاظ سے آیت میں یہ کہنے کے بعد کہ ”آپ عذاب سے ڈرانے والے ہیں۔“ یہ کہا گیا ہے کہ ”ہر قوم کا ایک رہ نما ہوتا ہے“ کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے بعد بھی ہر دور کے انسانوں کی رہنمائی کا خالق نے انتظام کیا ہے اور یہ رہنمائی کرنے والا آئمہ معصومین ہیں۔^[۱]

اس کی تائید اہل سنت کی بعض روایات سے بھی ہوتی ہے۔

اللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ أُنْثَىٰ وَمَا تَغِيصُ الْأَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ وَكُلُّ شَيْءٍ

عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ ۝۸ عِلْمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ ۝۹

”اللہ جانتا ہے جو پیٹ میں لیے ہے کوئی عورت اور جو کئی ہوتی ہے پیٹ کے اندر اور جو زیادتی ہوتی ہے اور ہر چیز اس کے یہاں ایک مقررہ مقدار میں ہے۔ وہ پوشیدہ اور ظاہر تمام چیزوں کا جاننے والا بزرگ و بالا ہے۔“

پیٹ کے اندر کی اور زیادتی کا ایک مفہوم یہ ہے کہ خود بچہ کوئی تمام الخلق پیدا ہوتا ہے اور کسی کے کوئی نقص ہوتا ہے^[۲] یہ سب علم الہی میں ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس سے مدت حمل کی کمی و زیادتی مراد ہو^[۳] یعنی یہ بات کہ کون بچہ کتنے دن شکم مادر میں رہے گا، بس اللہ ہی کے علم میں ہوتی ہے اور کسی سے مراد قبل از وقت یعنی حمل ساقط ہونا بھی ہو سکتا ہے اور زیادتی یہ ہے کہ نو مہینہ سے بھی زیادہ گزر جائے اور پھر بچہ پیدا ہو۔^[۴]

سَوَاءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ أَسَرَ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهِ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِاللَّيْلِ وَسَارِبٌ

بِالنَّهَارِ ۝۱۰

[۱] عن ابی بصیر عن ابی عبد اللہ قال المنذر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ والہادی امیر المؤمنین وبعده الاممۃ (علی بن ابراہیم) روی عن ابی جعفر و ابی عبد اللہ رضی اللہ عنہما ان الہادی ہوا امام کل عصر معصوم یموت من علیہ الغلط و تعبد الباطل (تبیان)

[۲] آنچه ناقص می کنند رحمها و آنچه زیادہ می گردانند (شاہ ولی اللہ)

[۳] ماتغیض تنقص الارحام من مدۃ الحمل و ماتزداد منہ (جلالین)

[۴] ماتفیض ای ماتسقط من قبل التام و ماتزداد یعنی علی تسعة اشهر (علی بن ابراہیم)

یکساں ہے تم میں سے وہ جو چپکے چپکے باتیں کرے اور جو اونچی آواز سے بات کرے اور جو رات کے پردہ میں چھپا ہو اور جو دن کو روانہ ہو۔

یعنی اللہ کو یکساں طور پر سب کا علم ہے۔^[۱]

لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَ لَهُ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ۗ وَإِذَا أَرَادَ اللَّهُ بِقَوْمٍ سُوءًا فَلَا مَرَدَّ لَهُ ۗ

وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُونِهِ مِنْ ءَالٍ ۝۱۱

”اس کے لیے پہرے دار ہیں اس کے سامنے سے اور اس کے پیچھے سے جو حکم خدا سے باری^[۲] باری اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ یقیناً اللہ نہیں بدلتا اس حالت کو جو کسی قوم کی ہے جب تک وہ خود اپنے میں تبدیلی پیدا نہ کرے اور جب اللہ چاہے کسی قوم کے لیے برائی تو اس کا پلٹنا ممکن نہیں ہے اور نہیں ہے ان کے لیے اسے چھوڑ کر کوئی حامی و مددگار۔“

کسی قوم میں تبدیلی نہیں ہوتی بغیر اپنے نفوس کی تبدیلی کے

لہ کی ضمیر میں کافی اختلاف ہے کہ یہ خدا کی طرف راجع ہے یا رسول کی طرف مگر زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ اس سے پہلے کہ آیت کی آیت میں جو تھا مِّنْ أَمْرِ الْقَوْلِ وَمِنْ جَهَرٍ بِهِ ”جو چپکے چپکے بات کرے اور جو اونچی آواز سے اور جو رات کے پردہ میں چھپا ہو اور جو دن کی روانہ ہو“ اسی کی طرف ضمیر ہے یعنی اللہ کا علم بھی اس پر حاوی ہے اور اس کی طرف کے فرشتے بھی اس کی حفاظت کرتے ہیں۔^[۳]

هُوَ الَّذِي يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ۝۱۲ وَيَسْبِغُ

الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلِئِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ ۗ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَن

يَشَاءُ وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللَّهِ ۗ وَهُوَ شَدِيدُ الْمِحَالِ ۝۱۳

وہ ہے جو تمہیں بجلی چمکتی دکھاتا ہے ڈرانے اور توقع پیدا کرنے کے لیے اور جو جھل گھٹائیں پیدا کرتا ہے اور بادل کی گرج تسبیح پڑھتی ہے اس کی تعریف کے ساتھ اور فرشتے بھی اس کے ڈر سے اور وہ گرتی ہوئی بجلیاں روانہ کرتا ہے تو انہیں پہنچاتا ہے جس تک چاہتا ہے اور وہ لوگ تکرار کرتے ہیں اللہ کے بارے میں اور وہ سخت عذاب والا ہے۔“

[۱]۔ انہ یعلم اعلیٰ تصرف احوالہ (تبیان)

[۲]۔ المعقبات والمناویات التي يخلف على واحد منها صاحبہ (تبیان)

[۳]۔ فكانه قال للانسان معقبات وهو الاقوى (تبیان)

”ڈرانے اور توقع پیدا کرنے کے لیے“۔۔۔ یہ دونوں کیفیات اس طرح بھی ڈر لگتا ہے کڑک اور چمک سے اور توقع ہوتی ہے اور بارانِ رحمت کی، یوں بھی جنہیں مثلاً سفر در پیش ہے، انہیں بارش کا ڈر ہوتا ہے اور جو اطمینان سے کسی منزل پر ہیں یا زراعت کیے ہوئے ہیں، انہیں بارش بڑی نعمت معلوم ہوتی ہے اور اس کا آسرا لگائے رہتے ہیں۔^[۱]

لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُونَ لَهُمْ بِشَيْءٍ إِلَّا كَبَاسِطٍ كَفَّيْهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِ وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي

ضَلَالٍ ﴿۱۴﴾

”اس کے لیے سچائی والی پکار اور اسے چھوڑ کر جنہیں وہ لوگ پکارتے ہیں، وہ ان کی صدا پر ذرا بھی لبیک نہیں کہتے مگر اس طرح جیسے کوئی دونوں ہاتھ پھیلائے ہو پانی کی طرف کہ وہ پہنچ جائے اس کے منہ تک حالانکہ وہ اس تک پہنچنے والا نہیں ہے اور نہیں ہے کافروں کا پکارنا مگر لا حاصل۔“^[۲]

”اسی کے لیے ہے سچی پکار“ بعد کے جملہ کو دیکھتے ہوئے زیادہ قرین قیاس مفہوم اس کا یہ ہے کہ پکارے جانے کا حق اسی کو ہے^[۳] مگر ایک دوسرے معنی اس کے یہ بھی سمجھ میں آتے ہیں کہ ”اس کی طرف سے ہے سچائی کی طرف دعوت یعنی توحید کا پیغام بعض مفسرین نے اس کے لحاظ سے تفسیر کی ہے۔“^[۴]

اس کے غیر یعنی اصنام کی پرستش اور ان سے التجاء جو کرتے ہیں، اس کی مثال جو دی گئی ہے وہ لا حاصل ہونے میں ہے کہ کوئی کنویں پر جا کے اور فصیل پر کھڑے ہو کے بس ہاتھ پھیلا دے کہ آے پانی میری پیاس بجھا دے تو ظاہر ہے کہ وہ پانی کہاں اس تک آسکتا ہے۔ وہ تو خود اس کا محتاج ہے کہ کوئی اس کھینچے، تب وہ کہیں پہنچے بس یہی صورت ان لوگوں کے بتوں سے دہائی دینے کی ہے کہ وہ بت کہاں ان کی حاجت روائی کر سکتے ہیں؟^[۵] ہو سکتا ہے کہ یہ مثال ’نقش برآب‘ کی طرح عرب میں ’سعی لا حاصل‘ کے لیے عام طور پر استعمال ہوتی ہے۔^[۶]

وَاللَّهُ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَظِلُّهُمْ بِالْغُدُوِّ
وَالْأَصَالِ ﴿۱۵﴾

[۱] قبیل فی معنی قولہ: خوفًا وطمعًا قولان... خوفًا من الصواعق التي تكون مع البرق وطمعًا في الغيث الذي يزيل الجذب... و خوفًا

للمسافرين من اذا هو طمعًا للمقيم في الرزق به (تبیان)

[۲] مگر در بے فاعدگی (شاه ولی اللہ)

[۳] یعنی اور اسجدہ کنند جناب و نیاز کنند و مدعا طلبند و اجابت فرمایند (فتح الرحمن)

[۴] دعوة الحق ای کلمتہ وہی لا الہ الا اللہ (جلالین)

[۵] کبساط کفیه الی الماء علی سفیر البعیر دعوا البیلغ فاه فار تفاعہ من البیر الیہ (جلالین)

[۶] العرب تضر به مثلًا لمن سعی فیما لا یدر کہ کالقابض علی الماء (تبیان)

”اور اللہ کے لیے سجدہ میں ہیں وہ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، خوشی یا ناخوشی اور ان کے سائے ﴿۱۱﴾ صبح اور شام۔“

کائنات کی ہر شے بارگاہ الہی میں سجدہ ریز

ان آیات میں کائنات کی ہر شے بارگاہ الہی میں سجدہ ریز ہونے کا ذکر ہے۔

قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ط قُلِ اللَّهُ ط قُلْ أَفَأَتَّخِذْتُمْ مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ لَا يَمْلِكُونَ لِأَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَلَا ضَرًّا ط قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَى وَالْبَصِيرُ ؕ أَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمَاتُ وَالنُّورُ ؕ أَمْ جَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ خَلَقُوا كَخَلْقِهِ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ط قُلِ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۶﴾

”کہئے کہ کون مالک ہے آسمانوں اور زمین کا؟ کہہ دیجئے کہ اللہ کہئے کہ کیا پھر تم نے اسے چھوڑ کر اور ایسے حوالی موالی بنا لیے ہیں جو خود اپنے لیے نہ نفع پر قدرت رکھتے ہیں اور نہ نقصان پر؟ کہئے کہ کیا یکساں ہے اندھا اور آنکھوں والا؟ یا یہ کہ کیا یکساں ہیں اندھیرے اور روشنی یا یہ کہ انہوں نے اللہ کے لیے ایسے شریک بنائے جنہوں نے اس کے خلق کرنے کی طرح خلق کیا تو یہ خلقت ان پر مشتبہ ہوگئی؟ کہئے کہ اللہ ہر چیز کا خلق کرنے والا ہے اور وہ ایک اکیلا غالب ہونے والا ہے۔“

”کیا یکساں ہے اندھا اور آنکھوں والا“ یعنی جو بصیرت کی روشنی رکھتا ہے اور وہ مومن ہے اور جو نور بصیرت سے عاری ہے وہ کافر ہے

اسی طرح ”اندھیرا“ گمراہی اور ”روشنی ہدایت“ ﴿۱۶﴾

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَابِيًا ط
وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِثْلَهُ ط كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ط فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ؕ وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ط كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ ﴿۱۷﴾

”اس نے آسمان سے پانی اتارا تو ندی نالے بنے اپنی مناسب مقدار کے مطابق تو بجتے ہوئے پانی نے اٹھالیا پھین جو اس کے اوپر آجاتا ہے اور اس سے کہ جسے آگ میں رکھ کر دکھاتے ہیں زیور یا اور کوئی چیز بنانے کے لیے

[۱]. وسجدہ می کنند سایہ بائے ایشان (شاہ ولی اللہ) اور پرچھائیاں ان کی (شاہ فنج الدین)

[۲]. الاعمى والبصير يعنى المؤمن والكافر... اما الظلمات فالكفر واما النور فهو الايمان (علی بن ابراہیم)

ایسا ہی پھین بلند ہوتا ہے اس طرح اللہ مثال دیتا ہے حق اور باطل کی تو جو پھین ہوتا ہے، وہ نیست و نابود ہو جاتا ہے اور وہ جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے تو زمین میں برقرار رہتا ہے۔ اس طرح اللہ مثالیں پیش کرتا ہے۔“
اس مثال کی تشریح شاہ ولی اللہ یوں کرتے ہیں:-

بقائے اصلح

یعنی لا بد است کہ در پر جنس خیر و شر باشد مچنین لا بد است کہ در آدمیاں نیکوکاران و بدکاران باشند لیکن نیکوکاران را مستقر می سازد و کارایشان را پیش می برد و بدکاران ہلاک می کند (فتح الرحمن)
یعنی لازم ہے کہ ہر جنس میں اچھی اور بری دو قسمیں ہوں اسی طرح خود انسانوں میں اچھے اعمال والے اور برے اعمال والے ہوں مگر اللہ نیکوکار افراد کو باقی رکھتا ہے اور ان کے کارنامہ کو ترقی دیتا ہے اور برے اعمال والوں کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔
مگر ان کے فرزند شاہ عبدالقادر اس طرح لکھتے ہیں کہ:

”یعنی آسمان سے دین حق اترتا ہے تو ہر ایک اپنی استعداد کے موافق لیتا ہے، پھر حق اور باطل ٹھہرتا ہے تو میل ابھرتا ہے جیسے مینہ کا پانی زمین سے مل کر یارو پے تانے کو دہکا کر میل ابھرتا ہے تو آخر جھاگ کو بنیاد نہیں اور کام کی چیز کی بنیاد ہے۔ یہ حق اور باطل ٹھہرنا دنیا کی لڑائی مراد ہے۔ آخر حق غالب ہے یا ہر ایک کے دل میں حق و باطل ٹھہرتا ہے۔ پھر حق اس باطل کو مٹا کر صاف حق رہتا ہے۔“ (موضح القرآن)
تفسیر جلالین میں ہے:

كذلك الباطل يضمحل وينمحى وان على الحق بعض الاوقات والحق ثابت باق
یونہی باطل کمزور ہو جاتا ہے اور بالآخر مٹ جاتا ہے چاہے بعض اوقات حق پر غالب بھی آجائے اور حق برقرار رہنے والی چیز ہے۔
ہماری تفسیر بھی اس سے متفق ہیں چنانچہ جناب شیخ الطائف لکھتے ہیں:-

فالحق ثابت.... والباطل.... يذهب لا منفعة فيه بعد ان يري له حركة واضطراب
تو حق امر برقرار ہے اور باطل ختم ہونے والا ہے اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے جب کہ قبل میں وہ بہت متحرک نظر آتا ہے۔

لِلَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ الْحُسْنٰى ۗ وَالَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِى
الْاَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ ۗ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوءُ الْحِسَابِ ۗ
وَمَا لَهُمْ جَهَنَّمُ ۗ وَبِئْسَ الْيِهَادُ ۗ

”ان کے لیے جو اپنے پروردگار کی دعوت پر لبیک کہیں اچھا نتیجہ ہے اور جنہوں نے اس کی دعوت پر لبیک نہیں کہی، اگر ان کے لیے جو کچھ روئے زمین پر ہے، وہ سب ہو یا اس کے ساتھ اتنا ہی اور ہو تو اسے وہ اپنے معاوضہ میں دے دیں ان کے لیے حساب کی سختی ہے اور ان کا ٹھکانا دوزخ میں ہے اور وہ کیا برا ٹھکانا ہے۔“

أَفَمَنْ يَعْلَمُ أَمَّمَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ مِنَ رَبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمَى ۗ أَلَمْ يَتَذَكَّرْ أُولُو
 الْأَلْبَابِ ۙ الَّذِينَ يُؤْفُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَلَا يَنْقُضُونَ الْمِيثَاقَ ۗ وَالَّذِينَ
 يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ ۗ
 وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ
 سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولَئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۗ جَنَّتْ
 عَدْنٌ يَدْخُلُونَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ وَالْمَلَائِكَةُ
 يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ ۗ سَلَّمَ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَبِعَمِّ عُقْبَى
 الدَّارِ ۗ

تو کیا وہ جو جانتا ہو کہ جو آپ کے پاس آپ کے پروردگار کے پاس سے آیا ہے حق ہے وہ مثل اس کے ہے کہ جو
 اندھا ہو؛ نصیحت کا اثر تو بس وہ لیتے ہیں جو صاحبان عقل ہوں۔ جو پورا کرتے ہیں اللہ کے عہد کو اور پیمان شکنی نہیں
 کرتے اور جو ملاتے ہیں ان رشتوں کو جن کے ملانے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور
 حساب کی سختی کا خوف رکھتے ہیں اور جنہوں نے صبر و تحمل سے کام لیا اپنے پروردگار کی خوشنودی کی طلب میں اور نماز
 کی پابندی کی اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے، اس سے مخفی اور ظاہر بظاہر خیرات کی اور جو بھلائی کے ذریعے سے
 برائی کو دور کرتے ہیں، یہ وہ ہیں جن کے لیے اس عالم کا اچھا انجام ہے، جاودانی زندگی والی جنتیں جن میں وہ داخل
 ہوں گے اور ان کے باپ دادا اور بیویوں اور بچوں میں سے جو اس لائق ہوں اور فرشتے ان کے پاس ہر دروازہ
 سے داخل ہو رہے ہوں گے۔ سلام ہو تم پر اس بنا پر کہ تم نے صبر کیا تو کیا کہنا انجام کا اس دور آخرت کے۔“
 دیکھ لیجیے یہاں بھی فرشتے سلام علیکم کہتے ہیں، السلام علیکم نہیں۔
 ان آیات میں برائی کا مقابلہ بھلائی سے کرنے کا حکم دیا گیا ہے

وَالَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ
 يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۗ أُولَئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ ۗ
 ”اور وہ جو توڑتے ہیں اللہ کا عہد اس کی مضبوطی کے بعد اور کاٹتے ہیں ان رشتوں کو جن کے ملانے جانے کا اللہ نے
 حکم دیا ہے اور روئے زمین پر خرابیاں کرتے ہیں، یہ وہ ہیں جن کے لیے لعنت ہے اور اس گھر کی برائی ہے۔“

عہد الہی جس کا دونوں طرح کا ذکر ہے، قبل کی آیت میں تعریف کے سلسلہ میں ینقضون الميثاق اور اس آیت بصورت مذمت ینقضون عہد اللہ اس میں وہ عہد بھی داخل ہے جو بتقاضائے فطرت اور حکم ضمیر ہر انسان کے ذمہ واجب الادا ہے اور وہ بھی پیمان جو انبیاء و مرسلین کے ذریعہ سے لیا گیا ہے اور اس میں وہ عہد و پیمان بھی داخل ہیں جو آپس میں ایک دوسرے سے کیے جاتے ہیں۔^[۱]

اللَّهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۗ وَفَرِحُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۗ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ ﴿۳۶﴾

”اللہ وسعت دیتا ہے رزق میں جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگی بھی کرتا ہے اور وہ دنیوی زندگی سے خوش ہیں اور نہیں ہے دنیوی زندگی آخرت کے مقابلہ میں مگر ذرا سی ناپائیدار چیز۔“^[۲]

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ ۗ قُلْ إِنْ اللَّهُ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أُنَابَ ﴿۳۷﴾ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ ۗ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ﴿۳۸﴾

اور کافر لوگ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں اتری ان پر کوئی نشانی ان کے پروردگار کی طرف سے کہنے؟ کہ اللہ گمراہی میں چھوڑتا ہے جسے چاہتا ہے اور اپنی طرف ہدایت کرتا ہے اس کی جو دل سے متوجہ ہو۔^[۳] جو ایمان لائیں^[۴] اور ان کے دل یاد الہی سے سکون پائیں۔ آگاہ ہونا چاہیے کہ اللہ کی یاد سے دلوں کو سکون ملتا ہے۔“

یاد خدا سببِ اطمینانِ دل

ان آیات میں یاد خدا سببِ اطمینانِ دل کا ذکر ہے۔

الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَىٰ لَهُمْ وَحَسَنُ مَا بِهِمْ

وہ جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال کئے ان کے لیے خوشحالی ہے اور اچھا انجام۔“

”طوبی“ کے معنی میں یوں تو بہت سے قول ہیں^[۵] مگر زیادہ تعداد میں وہ ایسے ہیں جیسے ایک ہی چیز کی متعدد تعبیریں ہوں اور ان سب

[۱]. العهد الذي جعله في عقوله العباد — و قد يكون ايضا على العهد الذي عليه النبي ﷺ و في الآية دلالة على وجوب الوفاء

بالعهد التي تنعقد بين الخلق. (تبيان)

[۲]. قليل ذاهب (تبيان)

[۳]. الرجع اليه (جلالين) موضع الذين نصب لانه من صفة من اناب (تبيان)

[۴]. قيل في معناه عشرة اقاوال (تبيان)

[۵]. انما قال ”بالرحمن“ دون ”الله“ لان اهل الجاهلية من قريش قالوا الله نعرفه والرحمن لانعرفه (تبيان)

کا نتیجہ وہ ہے جس کے ساتھ ہم نے ترجمہ کیا ہے یعنی ”خوشحالی“

كَذَلِكَ أَرْسَلْنَا فِي أُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَا أُمَمٌ لِيَتْلُوا عَلَيْهِمُ الذِّكْرَ
أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمَنِ ۖ قُلْ هُوَ رَبِّي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ
تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابٌ ﴿٣٠﴾

”اسی طرح آپ کو ہم نے بھیجا ایک ایسی قوم میں جس کے پہلے بہت قومیں گزر چکی ہیں تاکہ آپ ان کے سامنے تلاوت کریں اس کی جو ہم نے بطور وحی آپ پر اتارا ہے اور وہ خدائے رحمن کا انکار کرتے ہیں کہتے کہ وہ میرا پروردگار ہے کوئی خدا نہیں سوا اس کے اس پر میرا بھروسہ ہے اور اسی کی طرف میری رجوع ہے۔“
رحمن کے انکار کا مطلب بظاہر وہی ہے جو دوسری جگہ قرآن مجید میں زیادہ صاف طور پر مذکور ہے کہ:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اسْجُدُوا لِلرَّحْمَنِ قَالُوا وَمَا الرَّحْمَنُ أَنَسْجُدُ لِمَا تَأْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُورًا
اور جب ان سے کہا جائے کہ رحمن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ رحمن کیا چیز ہے؟ کیا جس چیز کو بھی آپ کہیے ہم سجدہ کرنے لگیں؟ اور اس سے ان کی وحشت اور بڑھتی ہے۔ (فرقان - ۶۰)

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی خدائی کا اقرار کرتے تھے مگر رحمن کے نام سے اسے یاد کرنا پسند نہ کرتے تھے۔^[۱]

وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِعَتْ بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كَلِمَةٌ بِهِ الْمَوْتَى ۗ بَلْ
لِلَّهِ الْأَمْرُ جَمِيعًا أَفَلَمْ يَأْتِئِسَ الَّذِينَ آمَنُوا أَنْ لَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَهَدَى النَّاسَ
جَمِيعًا ۗ وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا تُصِيبُهُم مِمَّا صَنَعُوا قَارِعَةً أَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا
مِّنْ دَارِهِمْ حَتَّىٰ يَأْتِيَ وَعْدُ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ﴿٣١﴾

”اور کاش ہوتا کوئی ایسا قرآن جس سے پہاڑ حرکت میں لے آئے جاتے یا زمین اس سے ٹکڑے ٹکڑے کی جاتی یا اس کے ساتھ مردوں سے باتیں کی جاتیں بلکہ اللہ کے ہاتھ میں ہے تمام کام تو کیا ایمان لانے والے اس بنا پر ناامید تو نہیں ہوتے کہ اگر اللہ چاہتا تو سب لوگوں کو ہدایت کر دیتا اور برابر کافروں پر ان کے اعمال کی سزا میں کوئی نہ کوئی آفت آتی رہے گی یا ان کے گھروں کے آس پاس آئے گی یہاں تک کہ آئے اللہ کا وعدہ یقیناً اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔“

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں :-

[۱]. انما قال ”بالرحمن“ دون ”الله“ لان اهل الجاهلية من قريش قالوا الله نعرفه والرحمن لا نعرفه (تبيين)

”مسلمان چاہتے ہوں گے کہ ایک نشانی بڑی سی آوے تاکہ کافر مسلمان ہو جائیں۔ سو فرمایا کہ اگر کسی قرآن سے کام ہوتے ہوئے تو البتہ اس سے پہلے ہوتے۔“ (موضح القرآن)

اس پس منظر میں میرے نزدیک زیادہ مناسب یہی ہے کہ شروع میں جو ”لو“ ہے وہ ”لیت“ کے معنی میں ہو، اس کے لیے میں نے ترجمہ ”کاش“ کے لفظ کے ساتھ کیا ہے جس کی نظریں قرآن مجید میں بہت جگہ موجود ہیں۔ جیسا کہ شاہ صاحب کی مذکورہ بالا تشریح سے بھی ظاہر ہے، یہ لوگ اسے ”اگر“ کے معنی میں لیتے ہیں تو اس ”اگر“ والی شرط کے جواب میں جو مخدوف مانا جائے گا [۱] تعبیریں مختلف ہو جاتی ہیں جیسے شاہ صاحب مذکور نے ”اگر“ کے جواب میں لکھا ہے ”تو البتہ اس سے پہلے ہوتے یا یوں کہ کوئی کتاب ہوتی جس کی خاصیت یہ ہوتی کہ اس سے یہ باتیں ہوں تو اس قرآن سے بھی یہ سب باتیں ظہور پذیر ہوتیں یا یہ کہ اگر کوئی کتاب دنیا میں اس طرح کی ہوتی تو بس یہی قرآن ہوتا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی کتاب ایسی نہیں ہو سکتی تھی۔“ [۲]

وَلَقَدْ اسْتَهْزَيْتُمْ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاْمَلَيْتُمْ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُمُوهُمْ

فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۗ ﴿۳۲﴾

’اور آپ سے پہلے بہت سے پیغمبروں کا مذاق اڑایا گیا تو میں نے ڈھیل دی کافروں کو پھر انہیں گرفت میں لے لیا تو کیسا تھا میرا عذاب۔‘

اَمْنَ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۗ وَجَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَاءَ ۗ قُلْ

سَمُوْهُمُ ۗ اَمْ تَنْبِئُوْنَہٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ اَمْ بظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ۗ بَلْ

زِيْنٌ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرَهُمْ ۗ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ۗ وَمَنْ يُضِلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهُ

مِنْ هَادٍ ۗ ﴿۳۳﴾ لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلِعَذَابٌ الْاٰخِرَةِ اَشْقٰۗءٌ ۗ وَمَا لَهُمْ

مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ۗ ﴿۳۴﴾

’تو کیا وہ ذات جو ہر نفس پر حاضر و ناظر ہے اس کے اعمال کے بارے میں (ان کو یونہی چھوڑ دے گا؟ ہرگز نہیں) اور انہوں نے اللہ کے لیے بہت سے شریک بنا لیے۔ کہنے کہ نام لو ان کا یا تم سے بتلاتے ہو ایسی چیز جس کا روئے زمین پر اسے علم نہیں ہے یا بے سمجھے رواروی میں بات کرتے ہو؟ بلکہ کافروں کی نظر میں ان کی چالیں بڑی خوب صورت معلوم ہوتی ہیں اور وہ سیدھے راستے سے ہٹ گئے ہیں اور جسے اللہ گمراہی میں چھوڑ دے تو کوئی اس کا ہدایت کرنے والا نہیں ہے۔ ان کے لیے دنیوی زندگی میں بھی کبھی عذاب ہے اور آخرت کا عذاب اور زیادہ پر

[۱]۔ لہر یحییٰ جو اب لولذلالۃ الکلام علیہ (تبیان)

[۲]۔ لو کان شئی من القرآن کذلک لکان هذا (علی بن ابراہیم)

مشقت ہے اور اللہ سے بچانے والا ان کا کوئی نہیں ہے۔“
 شروع کے فقرہ ”کیا وہ ذات“ کے بعد کے خبر لفاظ میں بلکہ سننے والے کی سمجھ میں انداز کلام سے آتا ہے کہ کیا وہ کسی دوسرے کے برابر ہے؟^[۱]

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ ۖ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ أَكْلُهَا دَائِمٌ
 وَظِلُّهَا ۖ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِينَ اتَّقَوْا ۖ وَعُقْبَى الْكَافِرِينَ النَّارُ ۖ

”اس بہشت کی جس کا پرہیزگاروں سے وعدہ ہوا ہے، یہ صفت ہے کہ اس کے نیچے سے نہریں رواں ہیں، وہاں کی غذائیں ہمیشہ رہنے والی ہیں اور چھاؤں بھی۔ یہ انجام ہے ان کا جو پرہیزگار ہوں اور جو کافر ہیں، ان کا انجام آتش دوزخ ہے۔“

چھاؤں اس لیے ہمیشہ ہے کہ وہاں آفتاب ہے نہیں جس کی دھوپ سایہ کو ختم کرے۔^[۲]

وَالَّذِينَ اتَّبِعَتْهُمْ الْكُتُبُ يَفْرَحُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمِنَ الْأَحْزَابِ مَنْ يُنْكِرُ
 بَعْضَهُ ۖ قُلْ إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ وَلَا أُشْرِكَ بِهِ ۖ إِلَيْهِ أَدْعُوا وَإِلَيْهِ
 مَأبٍ ۖ

”اور جنہیں ہم نے کتاب عطا کی ہے، وہ خوش ہوتے ہیں اس سے جو آپ پر اتارا گیا ہے اور ان جماعتوں میں بعض ایسے ہیں جو اس میں سے کچھ پر اعتراض کرتے ہیں۔ کہتے ہیں تو اس پر مامور ہوں کہ اللہ کی عبادت کروں اور اس کے ساتھ شرک نہ کروں، اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میری رجوع ہے۔“

وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۖ وَلَئِنْ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ مَا جَاءَكَ مِنَ
 الْعِلْمِ ۖ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وِئَالٍ وَلَا وَاقٍ ۖ

”اور اس طرح اتارا ہے ہم نے اس کو عربی زبان کا حکم نامہ^[۳] اور اگر آپ ان کی خواہشات کی پیروی کریں گے بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آگیا تو آپ کا اللہ کے مقابلہ میں نہ کوئی مددگار ہو سکتا ہے اور نہ بچانے والا۔“

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً ۖ وَمَا كَانَ

[۱]۔ کہن لیس بہذا الصفة وحذف الخبر دلالة الكلام عليه (تبیان) کہن لیس كذلك من الاصنام (جلالین)

[۲]۔ ظلها دائم لا تنسخه شمس لعدمها فيه (جلالین)

[۳]۔ بلغة العرب تحکم به بین الناس (جلالین)

لِرَسُولٍ اَنْ يَّاتِيَّ بِآيَةٍ اِلَّا يَادِّنِ اللّٰهُ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿٣٨﴾

”اور ہم نے بھیجے ہیں بہت سے پیغمبر آپ کے پہلے اور ترار دیئے ہم نے ان کے لیے بیوی بچے، اور کسی پیغمبر کے لیے یہ نہیں ممکن کہ وہ کوئی معجزہ پیش کرے مگر اللہ کے حکم سے ہر مدت کے لیے ایک نوشتہ ہے۔“

معجزہ کا حکم الہی پر انحصار

چونکہ عیسائیوں میں رہبانیت معیار کمال روحانیت قرار پائی تھی، اس لیے وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تالیفی زندگی کو خلاف شان رسالت سمجھنے لگے لہذا یہاں گزشتہ انبیاء کا حوالہ دیا گیا ہے کہ سابق میں بس مستثنیات ہیں جیسے عیسیٰ علیہ السلام اور یحییٰ علیہ السلام جن کے بیوی بچے نہ تھے ورنہ دوسرے انبیاء برابر ایسے ہوتے رہے ہیں جن کے بیوی بچے سب تھے تو اسے تم خلاف شان نبوت کیوں کر قرار دے سکتے ہو۔ [1]

اس کے ساتھ شاید یہ کہا گیا ہو کہ آپ وہی معجزے کیوں نہیں دکھاتے جو حضرت عیسیٰ دکھلاتے تھے یعنی کور مادر زاد کو پینا بنانا، اکمہ و ابرص کو شفا دینا اور مردوں کو زندہ کرنا تو اس کے جواب میں کہا گیا کہ ہر نبی کو معجزے خالق کی طرف سے بنظر حکمت اس دور کے تقاضوں کے لحاظ سے دیے گئے یہی عیسیٰ کے زمانہ میں طب کا زور تھا، اس لیے ویسے معجزے عطا ہوئے اور اس وقت فصاحت و بلاغت کا دور دورہ تھا اس لیے بطور معجزہ عمومی قرآن عطا ہوا۔

یوں آپ اور آپ کے اوصیاء علیہم السلام کے ہاتھوں کبھی بوقت ضرورت وہ معجزے بھی ظاہر ہو گئے جیسے بیمار کا صحت یاب ہونا، کور کا پینا ہونا اور مردہ کا زندہ ہونا جس کے واقعات کتب سیر و احادیث موجود ہیں مگر یہ چیزیں ان کے یہاں اہمیت کے ساتھ بطور معجزہ عمومی پیش نہیں ہوتیں کہ ان پر تخری کی جاتی اور انہیں ثبوت رسالت کی دلیل قرار دیا جاتا۔ ویسا معجزہ بس قرآن تھا جس پر طرح طرح سے مفکرین کو دعوت مقابلہ دی گئی اور ان کی لاجوابی نے اس کی حقانیت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ ۗ وَعِنْدَآءِ اُمِّ الْكِتٰبِ ﴿٣٩﴾

”اللہ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور برقرار رکھتا ہے اور اس کے پاس اصل نوشتہ ہے۔“

محو اثبات بداء

یہ آیت بداء سے متعلق ہے۔ بداء کے معنی یہ ہیں کہ بعض تقدیرات الہیہ مشروط طور پر ہیں لہذا اگر وہ شرائط پورے ہوئے تو تقدیر اس طرح رہتی ہے اور اگر شرائط پورے نہ ہوئے تو تقدیر بدل جاتی ہے لیکن علم الہی میں مختتم نتیجہ پہلے سے ہوتا ہے کہ بالآخر ہونے والا کیا ہے؟ تقدیروں کی یہ تبدیلی محو اثبات کہلاتی ہے اور یہ مختتم نتیجہ کا علم وہ ہے جسے کہا ہے کہ ”اس کے پاس اصل نوشتہ ہے۔“ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ تقدیروں کی تبدیلی بالکل ویسی ہے جیسے مصالح کے لحاظ سے احکام شریعت کی تبدیلی جس کا نام نسخ ہے مگر اہل سنت چونکہ نسخ کے قائل ہیں اور بداء کے قائل نہیں لہذا اس آیت کی تفسیر میں جس طرح الجھے ہیں وہ دیکھنے کے قابل ہے۔

[1] لا ینہم کانوا نکر و اتزوج النبی بالنساء فبین اللہ تعالیٰ ان لانیبیا و قد کان لہم ازواج و خریة (تبیان)

شاہ ولی اللہ باوجود یہ کہ اس کے قبل کی آیت میں لکل اجل کتاب کا یہ ترجمہ کر چکے ہیں کہ ”ہر قضاء موت را نامہ است“ اور حاشیہ پر اس کی تشریح یوں کر چکے ہیں کہ:-

چوں قضائے الہی بوجہی متحقق شود آن را در عالم ملکوت ثبت کنند
جب خدائی فیصلہ کسی صورت پر ہو جاتا ہے تو اس کو عالم ملکوت میں تحریر کر دیا جاتا ہے۔ (فتح الرحمن)
جس سے ظاہر ہے کہ بعض وقت قضائے موقت ہوتی ہے تو وقت کی تبدیلی کے ساتھ اس میں تبدیلی ہونا چاہیے اسی کا نام بدوا ہوگا۔
اب اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:-

نابودمی سازد خدا ہرچہ می خواہد و ثابت کنند ہرچہ خواہد و نزدیک او ست ام الکتاب یعنی لوح محفوظ
نیست و نابود کردیتا ہے خدا جو چاہتا ہے اور برقرار کرتا ہے جو چاہتا ہے اور اس کے پاس ام الکتاب یعنی لوح محفوظ ہے۔
حاشیہ پر اس کی تشریح یوں کرتے ہیں:

مترجم گوید صورت حادثہ در عالم ملکوت خلق می فرماید بعد ازاں اگر خواہد محو کند و اگر خواہد ثابت
و ارد و شاید کہ معنی چنین باشد ہر زمانی را شریعتی است نسخ می کند خدا تعالی آنچه می خواہد و ثابت می گزارد
آنچه خواہد نزدیک او ست لوح محفوظ۔ (فتح الرحمن)

میں کہتا ہوں کہ واقعہ کی صورت خداوند عالم ملکوت میں خلق فرمادیتا ہے اور اس کے بعد اگر چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور اگر چاہتا ہے تو قائم
رہنے دیتا ہے اور شاید اس کا مطلب یہ ہو کہ ہر زمانہ کے لیے ایک شریعت ہے۔ تو منسوخ کر دیتا ہے جو چاہتا ہے۔

دیکھ رہے ہیں آپ شاہ صاحب کس طرح کتر رہے ہیں پہلے جو تشریح کی، اس میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ وقوع میں آئے ہوئے حادثہ کی
صورت میں خلق فرمائی جاتی ہے تو آخر اس کے خلق کرنے کا کیا مقصد ہوتا ہے، کیا بعد میں جو واقعہ ہوگا، اس واقعہ کی صورت میں پہلے سے خلق ہوتی
ہے جیسا افلاطون کا ”مثل افلاطونیہ“ والا تصور ہے کہ تمام موجودات و واقعات کی صورتیں مادہ سے الگ ازل سے موجود ہیں مگر پھر یہ ٹپتی کیوں ہیں؟
جب کہ وہ واقعہ بعد میں ہونے والا ہے تو ان کا ثنا خلاف واقعہ ہوگا اور اگر ان کے مٹنے کے بعد وہ واقعہ رونما نہیں ہوتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ
تقدیر میں تبدیلی ہوتی ہے مگر اس کے بعد انہوں نے ”شاید“ کہہ کر اسے نسخ احکام سے متعلق قرار دینا چاہا ہے جو متفق علیہ حیثیت رکھتا ہے۔ پھر اس
صورت میں وہ صورتیں حوادث کی خلق ہونے والی بات کی ہوئی اور نسخ احکام سے پھر اس جز کا کیا لگاؤ ہے کہ لوح محفوظ اللہ کے پاس موجود ہے۔ پھر
جب کہ اس کے پہلے لکل اجل کتاب کا تعلق ”قضائے موقت“ سے تھا تو اس کے بعد والے جملہ کو آپ قضائے تکوینی سے ہٹا کر حکم تشریحی سے
متعلق کیوں کر رہے ہیں؟

شاہ عبد القادر بہت حد تک حقیقت کے قریب آگئے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

”دنیا میں ہر چیز اسباب سے ہے۔ بعض اسباب ظاہر ہیں، بعض چھپے ہیں، اسباب کی تاثیر کا ایک اندازہ ہے۔ جب اللہ چاہے اس کی
تاثیر انداز سے کم زیادہ کر دے، جب چاہے ویسی ہی رکھے۔ آدمی کبھی کنکر سے مرتاہے اور گولی سے بچتا ہے اور ایک اندازہ ہر چیز کا اللہ کے علم میں
ہے، وہ ہرگز نہیں بدلتا، اندازے کو تقدیر کہتے ہیں۔ یہ و تقدیریں ہیں، ایک بدلتی ہے اور ایک نہیں بدلتی۔“ (موضح القرآن)

اس پہلے قسم کی تقدیر کے بدلنے ہی کا نام بداء ہے اور شاہ صاحب کے بیان سے ظاہر ہو گیا ہے کہ اس کی تبدیلی علم الہی میں نقص کی مستلزم نہیں ہے لہذا بداء پر یہ اعتراض غلط ہے کہ وہ اللہ کی طرف نسبت جہل کا مقتضی ہے۔

جلالین کو بھی مجمل اور مبہم الفاظ میں سہی، اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا ہے۔ لکل اجل کتاب کی اس طرح تشریح کرنے کے بعد کہ

لکل اجل مدّة کتاب مکتوب فیہ تحدیدہ
ہر اجل یعنی مدت کے لیے ایک نوشتہ ہے تحریر جس میں اس کی حد بندی ہے
اب یوں تشریح کرتے ہیں کہ:-

بمحو اللہ ما یشاء ویثبت فیہ ما یشاء من الاحکام وغیرہا وعندہ امر الكتاب اصلہ الذی لا یغیر منہ
شی وھوما کتبہ فی الازل

اللہ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے برقرار رکھتا ہے اس میں احکام وغیرہ اور اس کے پاس ام الكتاب ہے یعنی اصل نوشتہ جس میں کوئی چیز بدلتی نہیں اور وہ ہے جسے اس نے ازل میں لکھا ہے۔
غرض یہ آیت بداء کے بارے میں اتنی صاف ہے کہ انکار بداء کرنے والوں کو یہاں کچھ بن نہیں پڑتا۔

وَإِنْ مَا تُرِيَّتْكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَقَّيْتُكَ فَمَا تَمَّ عَلَيْكَ الْبَلْغُ وَعَلَيْنَا

الْحِسَابُ ﴿٣٥﴾

’اور اگر تم آپ کو آنکھوں سے دکھلا دیں کچھ وہ باتیں جن کا ہم ان سے وعدہ وعید کر رہے ہیں یا آپ کو ہم دنیا سے اٹھالیں، بہر حال آپ پر تو بس پہنچا دینا ہے اور حساب کتاب بس ہمارے اوپر ہے۔‘

’وعدہ وعید‘ سے مراد یہاں وہ عذاب کی خبریں ہیں جو ان کی بد اعمالیوں کے نتیجہ میں دی جا رہی ہیں۔^[۱]
چونکہ گزشتہ انبیاء اللہ سے اکثر یہ خواہش کرتے رہے تھے کہ ان کی نافرمان قوم پر ان کی آنکھوں سامنے عذاب آجائے، اس لیے حضرت پیغمبر سے کہا گیا ہے کہ عذاب ہم کب نازل کریں گے؟ یہ ہم سے متعلق چیز ہے۔ آپ کو اس سے بحث نہیں ہونا چاہیے^[۲] آپ تو بس اپنا کام کرتے رہیے جو تبلیغ کرنا اور دعوت حق دیتے رہنا ہے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا ۗ وَاللَّهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقَّبَ

لِحُكْمِهِ ۗ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٣٦﴾

[۱]. بعض الذی نعد الكفار من العقوبة على كفرهم (تبیان)

[۲]. فلا تنظر كونه على ذلك بأن يكون في أيامك (تبیان)

”کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم چلے آتے ہیں گھٹاتے ہوئے زمین کو اس کے اطراف و جوانب سے اور اللہ فیصلہ کرتا ہے اس کے حکم کو ٹالنے والا کوئی نہیں اور وہ تیزی سے حساب لینے والا ہے۔“

شاہ ولی اللہ صاحب نے ترجمہ میں ”الارض“ کے معنی ”زمین“ کے بجائے قرار دیے ہیں کہ ”اس سرزمین کی طرف رخ کرتے ہیں [۱] اور اب اطراف و جوانب سے کم کرنے کی تشریح یوں کرتے ہیں:-

”یعنی روز بروز شوکت اسلام بزمین عرب منتشر می شود و دار الحراب ناقص می گردد و از اطراف آن عامہ مفسرین این آیت را مدنیہ دانند و نزدیک مترجم لازم نیست کو مدنی باشد و مراد از نقصان دار الحرب اسلام اسلم و غفار و جہینہ و قبائل یمن است پیش از ہجرت (فتح الرحمن)

مطلب یہ ہے کہ روز بروز اسلام کی شان و شوکت عرب کی زمین میں پھیلتی جا رہی ہے اور دار الحراب گھٹتا جا رہا ہے اپنے اطراف و جوانب سے۔ عام مفسرین اس آیت کو مدینہ نازل شدہ مانتے ہیں مگر میرے نزدیک یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ مدینہ کی نازل شدہ ہو اور دار الحرب اسلام کی کمی سے (مراد قبائل اسلم و غفار و جہینہ اور ہجرت سے قبل قبائل یمن مراد ہیں۔

اس کے قریب قریب شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں کہ:-

”ہم چلے آتے ہیں زمین پر گھٹانے کفر کو یعنی اسلام پھیلتا جاتا ہے عرب کے ملک میں اور کفر گھٹتا ہے۔“ (موضح القرآن) جلالین کا مطلب بھی یہی ہے:

اولم یروا اهل مکہ انا ناتی الارض نقصدا ر ضهم نقصها اطرافها بالفتح علی النبی صلی اللہ علیہ والہ

وسلم

کیا نہیں دیکھا انہوں نے یعنی اہل مکہ نے کہ ہم آتے ہیں زمین کی طرف یعنی ان کی سرزمین کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ اسے گھٹاتے جاتے ہیں اس کے اطراف و جوانب سے رسول کو کامیاب بنا کر۔

مگر خود الفاظ آیت اس تشریح کو بلا تکلف ذہن میں نہیں لائے۔ الارض کے معنی ”دار الحرب“ کس طرح ہیں؟ پھر کفر کا گھٹانا زمین کا گھٹانا کیوں کر ہے؟ وہ تو اس سرزمین کو ناپاک کرنا ہے، زندگی بخشتا ہے۔

ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر ہے جو غالباً معصوم سے مروی ہے کہ زمین کے اطراف کے اطراف کو گھٹانے سے مراد صاحبان علم کی دنیا سے رحلت ہے [۲] یہ تاویلی مفہوم تو ہو سکتا ہے مگر نفس الفاظ سے سمجھ میں آنے والے معنی یہ بھی نہیں ہیں۔

وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَئِنْ مَكَرْتُمْ بِمَعَاظِ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ۖ وَسَيَعْلَمُ الْكُفْرُ لِمَنْ عَقَبَى الدَّارِ ﴿۳۲﴾

[۱]۔ قصدمی کنیم باین سرزمین (شاہ ولی اللہ)

[۲]۔ جموت علما ہما (علی بن ابراہیم)

”اور ترکیبیں کر چکے ہیں وہ لوگ جو ان کے پہلے تھے تو سب ترکیبیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ جانتا ہے اسے جو کرتا ہے ہر تنفس اور بہت جلد کافروں کو معلوم ہو جائے گا کہ اس عالم کا انجام کس کے حق میں ہے۔“

سب ترکیبیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں، یعنی وہ ان کی ترکیبوں کے توڑ پر بھی قادر ہے اور ان ترکیبوں کی سزا بھی دینا اسی کے ہاتھ میں ہے [۱] اور وہ ترکیبیں کتنی ہی خفیہ ہوں، اس کے علم کی نگاہ سے اوجھل نہیں رہ سکتیں جسے بعد کا فقرہ بتاتا ہے کہ ”وہ جانتا ہے اسے جو کرتا ہے ہر تنفس۔“

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا ۗ قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۗ

وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ ۗ

”اور کافر لوگ کہتے ہیں کہ تم رسول نہیں ہو، کہتے کہ اللہ گواہ ہونے کے لیے کافی ہے میرے اور تمہارے درمیان اور وہ جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔“

رسولؐ کی حقانیت کے دو گواہ، کتاب اور عالم کتاب

مفسرین اہل سنت ”علم کتاب“ رکھنے والے سے مراد علمائے یہود و نصاریٰ یا ان میں سے نو مسلموں کو لیتے ہیں [۲] مگر ہمارے یہاں کی تفسیر یہ ہے کہ اس سے اسسخین فی العلم یعنی معصومین علیہم السلام مراد ہیں جو کتاب الہی کے حقیقی عالم ہیں [۳] اور ظاہر ہے کہ رسولؐ کے بعد ان کی فردا اول واکمل حضرت علی بن ابی طالبؑ کی ذات تھی۔ [۴]

[۱] . معناه كماله جزاء مكرهم (تبیان)

[۲] . ومن عنده علم الكتاب من هو يعني اليهود والنصارى (جلالین)

[۳] . قال ابو جعفر و ابو عبد الله هم ال محمد لا نهم الذين عندهم علم الكتاب بجملة لا شيد شئى من ذلك (تبیان)

[۴] . عن ابى عبد الله عليه السلام قال: الذى عنده علم الكتاب هو امير المؤمنين (على بن ابراهيم)

سُورَةُ اِبْرٰهِيْمَ

مکیہ-----۵۲ آیات

سورہ کا یہ نام ویسا ہی ہے جیسا سورہ ہود کا نام ہے، جس کی وجہ تسمیہ میں کوئی اختصاص کا پہلو نمایاں نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعات تو پورے قرآن میں پھیلے ہوئے ہیں، اس سورہ میں بھی آپ کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ خاص خاص مضامین اس سورہ کے حسب ذیل ہیں:-

سورہ ابراہیم کے خاص خاص مضامین:

- ۱-----ہر قوم میں رسول اس کی زبان بولنے والا آیا ہے۔
- ۲-----اللہ کے دنوں کی یاد قائم رکھنے کا حکم
- ۳-----اچھے اور برے کلمات کی مثال
- ۴-----حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مناجات اور اپنی اولاد کے لیے بت پرستی سے الگ رہنے کی عرضداشت
- ۵-----ذریعت ابراہیمی کے اندر ہر دور میں سچے مسلمانوں کے وجود کی ضمانت۔
- ۶-----حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے والدین کے لیے دعائے مغفرت جس سے ظاہر ہے کہ آذر جس سے بعض قرآن انہوں نے برأت کر لی تھی، ان کا والد نہ تھا۔
- ۷-----قیامت میں آسمان اور زمین کی تبدیلی۔۔۔ وغیرہ وغیرہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے

الرَّٰثِرِ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۗ لِیٰۤاَذِّنَ
رَبُّهُمْ اِلَى صِرَاطٍ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ ۝ اللّٰهُ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی
الْاَرْضِ ۗ وَوِیْلٌ لِّلْکٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ ۝ الَّذِیْنَ یَسْتَحِبُّوْنَ الْحَیٰوةَ

الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا ۗ أُولَٰئِكَ فِي

ضَلَالٍ بَعِيدٍ ﴿٤٥﴾

’الف۔ لام۔ را۔ یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے آپ پر اتاری ہے تاکہ آپ لوگوں کو اندھیروں سے اجالے کی طرف نکالیں ان کے پروردگار کے حکم سے، اس عزت والے قابل تعریف اللہ کے راستے کی طرف۔ جس کا وہ سب ہے جو آسمان میں ہے اور جوزمین میں ہے اور وائے ہو کافروں کے لیے سخت عذاب ہے۔ جو ترجیح دیتے ہیں دنیوی زندگی کو آخرت پر اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اسے ٹیڑھا بنانے کے خواہاں ہیں یہ لوگ سخت گمراہی میں ہیں‘۔
آخری آیت میں جو یصدون کا لفظ ہے، یہ کلام عرب اور نیز قرآن مجید میں وہ معنی میں مستعمل ہے۔ ایک لازم ’روگردانی کرتے ہیں‘ اور دوسرے متعدی ’روکتے ہیں‘

بعض جگہ مفعول مذکور ہے تو دوسرے معنی تعین کے ساتھ قطعی ہو گئے ہیں مگر یہاں مفعول مذکور نہیں ہے لہذا یہاں دونوں احتمال ہیں اے ہمارے ذہن میں اس کے بعد کے فقرہ کی مناسبت سے متعدی معنی رجحان رکھتے ہیں، اس لیے ترجمہ اسی کے مطابق کیا گیا۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۗ فَيُضِلُّ اللَّهُ مَنْ يَشَاءُ

وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۗ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٤٦﴾

’اور ہم نے نہیں بھیجا کوئی پیغمبر مگر اس کی قوم کی زبان کے ساتھ تاکہ وہ ان کے لیے صاف صاف بیان کرے تو اللہ جسے چاہے گمراہ قرار دے اور جسے چاہے منزل تک پہنچائے اور وہ عزت والا ہے، بالکل ٹھیک کام کرنے والا‘۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کے لئے واقف زباں ہونے کی ضرورت

’صاف صاف بیان کرے‘ یعنی کسی دوسرے مترجم کی ضرورت نہ ہو [1] اس سے ظاہر ہے کہ مترجم کی صورت میں افادیت کم ہو جاتی ہے۔ اس لیے بعد میں دوسری قوموں کے افراد جب اس پیغام کو قبول کریں تو پورا پورا فائدہ وہ اس کی تعلیمات سے اسی وقت اٹھا سکیں گے۔ جب وہ اس زبان کو بھی حاصل کریں جس میں اس پیغمبر نے براہ راست مخاطب کیا تھا۔ یہ وہ ضرورت ہے جو مسلمانوں کے لیے عربی زبان کی تعلیم حاصل کرنے کی اہمیت کو ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھے گی۔

فَيُضِلُّ اللَّهُ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۗ كَمَا جَزَمْنَا لَهُمْ أَنْ يَكُونَ لَهُمْ قَوْلٌ مِمَّا يُنَادُونَ بِهِ لِيُنَادُوا بِهِ فَيُرَدُّ عَلَيْهِمْ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ﴿٤٧﴾
فَيُضِلُّ اللَّهُ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۗ كَمَا جَزَمْنَا لَهُمْ أَنْ يَكُونَ لَهُمْ قَوْلٌ مِمَّا يُنَادُونَ بِهِ لِيُنَادُوا بِهِ فَيُرَدُّ عَلَيْهِمْ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ﴿٤٧﴾
تک پہنچائے، وہ اس تفسیر کے مطابق ہے [2] اور وہی ہمارے نزدیک قبل کے جملہ سے یہاں مرتبط ہے یعنی انہی کی زبان میں ہدایت ہونے سے حجت الہی تمام ہو جائے گی۔ اب اس کے بعد جو اس راستے پر نہ آئے گا، وہ گمراہ قرار پائے گا اور جو آجائے گا، وہ منزل مقصود تک جو نجات ہے پہنچے

[1]. لايجتا جون الى من يترجمه عنه (تبیان)

[2]. يحكم يضلل من يشاء فاضلوا هم عن الطريق (تبیان)

گا اور اگر حجت ہی تمام نہ ہوتی تو اس کی تفریق کا محل نہ ہوتا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوسٰى بِآيٰتِنَا اَنْ اَخْرِجَ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۗ
 وَذِكْرُهُمْ بِاللّٰهِ ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شٰكُوْرٍ ۝۵
 اور ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ کہ نکالو اپنی قوم کو اندھیروں سے اجالے کی طرف اور انہیں اللہ کے
 تاریخی دن یاد دلاؤ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ہر بڑے صبر و تحمل والے، شکر گزار کے لیے۔

ایام الہی اور اوران کی یاد کی اہمیت

”اللہ کے تاریخی دن“ سے کیا مراد ہے؟ شاہ ولی اللہ کہتے ہیں :-

”وقائعی کہ از جانب او بودند“ (فتح الرحمن)

شاہ رفیع الدین کہتے ہیں :- ”ساتھ دنوں یعنی کاموں خدا کے“

جلالین فرماتے :- ایام اللہ بنعمہ ”اللہ کے دن یعنی اس کی نعمتیں“

حالانکہ یوم کے معنی نہ واقعہ کے ہیں، نہ کام کے، نہ نعمت کے یوم کے معنی تو دن ہی کے ہیں اور اس کی اضافت اللہ کی طرف ہے، اس سے وہ خصوصیت ظاہر ہوتی ہے جو ان سب پر حاوی ہے کہ اللہ کے دن وہ ہیں جن میں اللہ کے دین کو تقویت پہنچانے والا کوئی اہم کارنامہ ہوا ہو۔ خواہ براست اللہ کی طرف سے جیسے وہ عذاب جو اس کی جانب سے امتوں پر نازل ہوئے ہیں یا اس کے حکم سے اس کے انبیاء و الیاء اور مقرب بندوں نے اس کی راہ میں جو قربانیاں پیش کی ہیں، وہ سب ایام اللہ میں داخل ہیں اور ان کی یاد آوری کا حکم خالق دے رہا ہے۔ ہماری قدیم تفسیر کا مضمون اس کے مطابق ہے۔ [۱]

وَ اِذْ قَالَ مُوسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰكُمْ مِنْ اِلٍ فِرْعَوْنَ
 يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْءَ الْعَذَابِ وَيُدْبِحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاءَكُمْ ۗ وَفِيْ
 ذٰلِكُمْ بَلَاٌءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝۶ وَ اِذْ تَاَذَّنْ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَآ زِيْدَنَّكُمْ
 وَ لَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝۷

”اور جب کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہ یاد کرو اللہ کی اس نعمت کو جو تم پر ہے، جب اس نے تمہیں چھڑایا فرعون والوں سے جو تم کو سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے اور تمہارے لڑکوں کو ذبح کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھ لیتے تھے اور اس میں آزمائش تھی تمہارے پروردگار کی طرف سے بہت بڑی اور جب تمہارے پروردگار نے

[۱] ایام اللہ ثلاثۃ یوم القائم و یوم الموت و یوم القیامۃ (علی بن ابراہیم)

اطلاع دی [۱] کہ اگر شکر ادا کرو گے تو میں اور زیادہ دوں گا اور اگر ناشکر اپن کرو گے تو میرا عذاب یقیناً سخت ہے۔“

جو واقعات قوم موسیٰ علیہ السلام کو یاد دلانے جارہے ہیں، ان کا ذکر سورہ بقرہ میں ہو چکا ہے لہذا مزید تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔

وَقَالَ مُوسَىٰ إِنَّ تَكْفُرًا أَنتُمْ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۖ فَإِنَّ اللَّهَ لَغَيُّ
حَمِيدٌ ۝۸ أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبُؤُا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ ۗ وَالَّذِينَ
مِنْ بَعْدِهِمْ ۗ لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللَّهُ ۗ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَرَدُّوا
أَيْدِيَهُمْ فِي أَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوا إِنَّا كَفَرْنَا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ وَإِنَّا لَفِي شَكٍّ مِمَّا
تَدْعُونَنَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ ۝۹

’اور موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اگر کفر اختیار کرو تم اور وہ سب جو روئے زمین پر ہیں تو یقیناً اللہ بے نیاز ہے قابل تعریف۔ کیا تمہیں نہیں پہنچی خبر ان کی جو تمہارے پہلے تھے، نوح کی قوم والے اور عاد اور ثمود اور وہ جو ان کے پہلے تھے جنہیں سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا؟ ان کے پاس آئے ان کے پیغمبر معجزوں کے ساتھ تو انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے منہ میں دبائے اور کہا ہم انکار کرتے ہیں اس کا جس کے ساتھ تمہیں بھیجا گیا ہے اور ہم شک میں ہیں اس سے جس کی طرف تم ہمیں دعوت دیتے ہو جو پریشان کرنے والا ہے۔‘

فردوا ایدیہم فی افواہہم کا ترجمہ جو ہم نے کیا ہے کہ ’انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے منہ میں دبائے‘ یہ ایک تفسیر کے موافق ہے کہ ضمیریں سب اسی جماعت کی طرف راجع ہیں اور اس صورت میں ہاتھ منہ میں دبانے کے بھی دو مختلف مطلب کہے گئے ہیں، ایک یہ کہ اس سے حیرت کا اظہار مقصود ہے جس کے لیے ہمارے یہاں محاورہ ہے ’انگشت بدن داں ہونا‘ [۲] اور دوسرے یہ کہ اس سے غیظ و غضب کا اظہار مقصود ہے جس کے لیے ہم کہتے ہیں ’اپنی آپ بوٹیاں نوچتے ہیں یا کاٹتے ہیں‘ [۳] اور اس کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں [۴] جن میں سے ایک قول کی بنا پر جو قرین قیاس ہے، یہ ترجمہ ہوگا کہ ’اپنے ہاتھ ان کے منہ میں دیے‘ یعنی تکذیب اور تمسخر کے ساتھ ان کی زبان بندی کی کوشش کی۔ اس صورت میں آخری ضمیر فی افواہہم والی انبیاء کی طرف راجع ہوگی۔

قَالَتْ رُسُلُهُمْ أِنِّي اللَّهُ شَنَّكَ فَاطِرِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ يَدْعُوكُمْ لِيُبْعِثَ

[۱]. اعلم جلالین وقد استعمل تفعّل بمعنى افعل كقولهم اوعدته و توعدته (تبیان)

[۲]. یعنی از نہایت تعجب و انکار انگشت بدن داں گویند (فتح الرحمن)

[۳]. لیعضوا علیہا من شدّة الغیظ (جلالین)

[۴]. فی معنای خمسۃ اقوال (تبیان)

لَكُمْ مِّنْ ذُنُوبِكُمْ وَيُوخِّرْكُمْ إِلَىٰ آجَلٍ مُّسَمًّى ۖ قَالُوا إِنَّ أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ

مِثْلَنَا ۗ تُرِيدُونَ أَنْ تَصُدُّونَنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا فَأْتُونَا بِسُلْطَنٍ مُّبِينٍ ﴿١٥﴾
 ”ان کے پیغمبروں نے کہا کہ کیا اللہ کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے تمہیں دعوت دیتا ہے کہ تمہارے لیے تمہارے گناہوں سے درگزر کرے اور تمہیں ایک مقررہ مدت تک مہلت دے، انہوں نے کہا تم نہیں ہو گے ہمارے ہی ایسے آدمی، چاہتے ہو کہ ہمیں روکو اس سے کہ جس کی عبادت کرتے آئے ہیں ہمارے باپ دادا تو لاؤ ہمارے پاس کوئی کھلی ہوئی دلیل۔“

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَمُنُّ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ
 مِنْ عِبَادِهِ ۗ وَمَا كَانَ لَنَا أَنْ نَأْتِيَكُمْ بِسُلْطَنٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَعَلَىٰ اللَّهِ
 فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿١٦﴾ وَمَا لَنَا أَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَىٰ اللَّهِ وَقَدْ هَدَانَا سُبُلَنَا ۗ

وَلَنْصَبِرَنَّ عَلَىٰ مَا أَدَيْتُمُونَا ۗ وَعَلَىٰ اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ ﴿١٧﴾
 ”کہا ان سے ان کے پیغمبروں نے کہ ہم نہیں ہیں مگر تمہاری ہی طرح ایک آدمی مگر اللہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اپنے کرم سے نوازتا ہے اور ہمارے لیے یہ نہیں ممکن کہ ہم کوئی دلیل پیش کریں مگر اللہ کے حکم سے اور اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے ایمان والوں کو۔ اور ہمیں کیا ہے کہ ہم اللہ پر بھروسہ نہ کریں حالانکہ کہ اس نے ہمیں ہمارے راستوں پر لگایا ہے اور ہم صبر و تحمل سے کام لیں گے، اس پر جو تم ہمیں ایذا پہنچاؤ گے اور اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے بھروسہ کرنے والوں کو۔“

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ أَرْضِنَا أَوْ لَتَعُوذُنَّ فِي مِلَّتِنَا ۗ
 فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظَّالِمِينَ ﴿١٨﴾ وَلَنُسَكِّنَنَّكُمْ الْأَرْضَ مِنْ

بَعْدِهِمْ ۗ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَاهِي وَخَافَ وَعِيدِ ﴿١٩﴾
 ”اور کافروں نے اپنے پیغمبروں سے کہا کہ ہم تم کو اپنی سرزمین سے نکال دیں گے اور نہیں تو ضرور تم ہمارے مذہب میں واپس آؤ گے تو اللہ نے وحی بھیجی ان پر کہ ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے۔ اور تمہیں ساکن کر دیں گے اس سرزمین پر ان کے بعد یہ صلہ ہے اس کے لیے جو میرے سامنے کھڑے ہونے کا [۱] تصور رکھے اور وہ میری تہدید سے ڈرے۔“

[۱]. مقاہی ای مقامہ بین یدی (جلالین)

کافروں کا اپنے پیغمبروں سے کہنا کہ ”تم ہمارے مذہب میں واپس آؤ گے۔“ ان کے خیال ناقص کے مطابق ہے کہ جب تک وہ پیغمبر ان کے افعال پر نکتہ چینی شروع نہیں کرتا، انہیں محسوس نہیں ہوتا کہ یہ کچھ الگ تصورات رکھتے ہیں اور جس دن سے وہ کار ہدایت شروع کرتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ آج یہ اپنے سابق دین سے منحرف ہو گئے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک نبی خدا کبھی بھی گمراہوں میں داخل نہیں ہوتا^[۱] یہ اور بات ہے کہ وہ ابھی گمراہی کے خلاف جہاد پر مامور نہ ہو۔

وَاسْتَفْتَحُوا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ﴿۱۵﴾ مِّنْ وَرَائِهِ جَهَنَّمُ وَيُسْقَىٰ مِنْ مَّاءٍ
صَدِيدٍ ﴿۱۶﴾ يَتَجَرَّعُهُ وَلَا يَكَادُ يُسِيغُهُ وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَمَا
هُوَ بِمَيِّتٍ ط وَمِنْ وَرَائِهِ عَذَابٌ غَلِيظٌ ﴿۱۷﴾

”اور انہوں نے فتح و ظفر کی دعا کی^[۲] اور ناکام ہوا ہر سرکش عنادر کھنے والا۔ اس کے سامنے دوزخ ہے اور اسے پلایا جائے گا پیپ کی قسم کا پانی۔ جسے وہ ایک ایک گھونٹ کر کے پئے گا اور بہت مشکل ہے کہ وہ اسے حلق سے اتار سکے^[۳] اور موت اس کی ہر طرف سے آ رہی ہوگی^[۴] اور پھر بھی وہ مرے گا نہیں اور اس کے سامنے سخت طرح کا عذاب ہے۔“

مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ
عَاصِفٍ ط لَا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلَىٰ شَيْءٍ ط ذَلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ ﴿۱۸﴾

”وہ جو اپنے پروردگار کے ساتھ کفر اختیار کیے ہوئے ہیں، ان کی حالت یہ ہے کہ ان کے اعمال مثل اس خاکستر کے ہیں جس پر ایک جھکڑوں والے دن میں تیز ہوا چلے، وہ جو کچھ کر چکے ہیں اس میں سے کسی چیز پر قبضہ نہیں رکھتے، یہ ہے بڑی سخت گمراہی۔“

یعنی انہوں نے دنیا میں کچھ خیر خیرات وغیرہ کی طرح کام کیے تھے جو بجائے خود نیک کام ہیں اور انہیں ان کے نامہ اعمال میں درج ہونا چاہیے تھا مگر چونکہ ایمان شرط قبول اعمال ہے اور وہ اس سے محروم ہیں، اس لیے ان اعمال میں سے کچھ بھی ان کے پاس نہیں ہے اور وہ آخرت میں خالی ہاتھ ہی ہوں گے۔^[۵]

[۱]. تو هو اذ لك على غير حقيقة ادبهم كانوا على ملتهم (تبیان) ای دعوا (علی بن ابراہیم)

[۲]. طلب فتح کر دند پیغامبران (شاکولی اللہ)

[۳]. فلا يقارب ان يشوبه تکرها و هو يشوبه (تبیان)

[۴]. اسبابه المفیضته له من انواع العذاب (جلالین)

[۵]. اعمالهم الصالحة كصلة و صدقة في عدم الانتفاع بها لعدم شرطه (جلالین) یعنی اعمال ایشاں ہمہ حبط شدند بدان منتفع

نگرند (فتح الرحمن)

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۗ إِنَّ يَشَاءُ يُدْهِبِكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ

جَدِيدٍ ﴿١٩﴾ وَمَا ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ ﴿٢٠﴾

”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو حکمت و مصلحت کے ساتھ اگر وہ چاہے تو تم سب کو ختم کر دے اور ایک نئی مخلوق کو لے آئے۔ اور یہ اللہ پر کوئی دشواری نہیں ہے۔“
یہاں دیکھنے سے مراد معلوم ہونا ہے، اس لیے کہ جو باتیں بعد میں درج ہیں، وہ از قبیل مشاہدات نہیں ہیں جن سے آنکھ کے دیکھنے کا

تعلق ہو۔ [۱]

وَبَرُّوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعْفُو اللّٰذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ

اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۗ قَالُوْا لَوْ هَدٰنَا اللّٰهُ لَهٰدٰيْنٰكُمْ ۗ

سَوَآءٌ عَلَيْنَا اَجْرٌ عَنَّا اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿٢١﴾

”اور وہ ایک ساتھ سب اللہ کے سامنے حاضر ہوئے تو اب کمزور لوگ کہہ رہے ہیں ان سے کہ جو بڑے بنے ہوئے تھے کہ ہم تمہارے پیرو تھے تو کیا تم ہمیں اللہ کے عذاب سے بچا سکتے ہو۔ انہوں نے کہا اگر اللہ ہمیں منزل تک پہنچاتا تو ہم بھی تمہیں منزل تک پہنچاتے۔ ہمارے لیے یکساں ہے، چاہے ہم بے تاب ہوں، چاہے صبر و تحمل سے کام لیں۔ ہمارے لیے کوئی چارہ کار نہیں ہے۔“

”حاضر ہوئے“ کا لفظ ہے تو ماضی کے لیے مگر یہ منظر کشی کا ایک انداز ہے جو قرآن میں کئی جگہ ملتا ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مستقبل

کا یہ واقعہ ایسا یقینی ہے کہ سمجھو جیسے تم دیکھ رہے ہو اور وہ وقوع میں آچکا ہے۔ [۲]

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قَضٰى اَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَاكُمْ وَعَدَ الْحَقِّ ۗ وَعَدْتُكُمْ

فَاَخْلَفْتُكُمْ ۗ وَمَا كَانَ لِىْ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاَسْتَجَبْتُمْ

لِىْ ۗ فَلَا تَلُوْا مُؤْمِنِيْ وَّلَوْ مَوَّآ اَنْفُسَكُمْ ۗ مَا اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَا اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيْ ۗ

اِنِّىْ كَفَرْتُ بِمَا اَشْرَكْتُمْ مِّنْ قَبْلُ ۗ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٢٢﴾

”اور کہے گا شیطان اس وقت کہ جب جو ہوتا ہے وہ ہو جائے گا کہ بے شبہ اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے

[۱] المر تعلم لان الروية تكون بمعنى العلم كما تكون بمعنى الادراك بالبصر و ههنا لا يمكن ان تكون بمعنى الروية بالبصر (تبيان)

[۲] والتعبير فيه وفيما بعد بالماضى لتحقق وقوعه (جلالين) معناه مستقبل (على بن ابراهيم)

تمہیں سبز باغ دکھائے تھے تو وہ سب غلط ثابت ہو گئے اور مجھ کو تم پر کوئی جبری تسلط تو تھا نہیں سوا اس کے کہ میں نے تمہیں دعوت دی تو تم نے میری آواز پر لبیک کہی تو مجھے لعنت ملامت نہ کرو اور خود اپنے کو لعنت ملامت کرو میں تمہاری فریاد رسی نہیں کر سکتا اور نہ تم میری فریاد رسی کر سکتے ہو میں انکار کرتا ہوں اس سے جو تم نے مجھے اس کے پہلے (خدا کا) شریک قرار دیا تھا [۱] بلاشبہ جو ظالم ہیں، ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔“

وَأُدْخِلَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ

خَالِدِينَ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ ط تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ﴿۳۴﴾

”اور داخل کیے جائیں گے وہ جنہوں نے ایمان قبول کیا اور نیک اعمال کیے بہشتوں میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اپنے پروردگار کے حکم سے، ان کی صاحب سلامت [۲] آپس میں سلام کالفظ ہوگا۔“

یہاں بھی سلام ہی ہے، السلام نہیں ہے۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”دنیا میں سلام دعا ہے سلامتی مانگنے پر وہاں سلام مبارک بادی سلامتی پر“ (موضع القرآن)

اس طرح ان کے والد کا ترجمہ ”دعائے خیر ایشان“ اور ان کے بھائی کا ترجمہ ”دعائات ان کی، دونوں غلط ہو جاتے ہیں۔“

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ

وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ﴿۳۵﴾ تُؤْتِي أُكْلَهَا كُلَّ حَبٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا ط وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ

لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۳۶﴾ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ

مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَالَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۳۷﴾

”کیا تم نے نہیں دیکھا کیسی مثال قرار دی ہے اللہ نے اچھے کلمہ کی؟ مثل اچھے درخت کے جس کی جڑ قائم ہو اور شاخ آسمان سے باتیں کر رہی ہو۔ جو اپنا میوہ ہر زمانہ میں دیتا ہو اپنے پروردگار کے حکم سے اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں پیش کرتا ہے، شاید کہ وہ نصیحت قبول کریں اور مثال خراب کلمہ کی مثل خراب درخت کے ہے جو اکھاڑ لیا جائے زمین کے اوپر ہی سے۔ اس کے لیے پائیداری نہ ہو۔“

[۱] بشر کلمہ باللہو متابعتکم لی قبل لهذا الیوم (تبیان)

[۲] تحیتہم فیہا من اللہو من الملائکة و فیہا بینہم (جلالین)

اچھے اور بُرے کلموں کی مثال

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:-

یعنی شریعت حق در ملکوت ثابت و در دنیا پر روز رواجی تازہ می یابد و مردمان منتفع می شوند و ملت جاہلیت در ملکوت استقرار ندارد یک چند در میان مردم شائع شود باز برہم کردہ آید (فتح الرحمن) مطلب یہ ہے کہ سچی شریعت عالم ملکوت میں قائم ہے اور دنیا میں روز بروز نئی مقبولیت حاصل کرتی ہے اور لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور جاہلیت والا دھرم عالم بالا میں قیام نہیں رکھتا اور تھوڑے دن آدمیوں میں پھیلتا ہے، پھر ختم ہو جاتا ہے۔ ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر کچھ دوسری طرح مطلب رکھتے ہیں:-

”مسلمانوں کا دعویٰ درست ہے جس کی دلیل صحیح ہے اور دل میں اثر رکھتا ہے اور روز بروز چڑھتا ہے اور کافروں کا دعویٰ جڑ نہیں رکھتا، تھوڑا دھیان کرنے سے غلط معلوم ہونے لگے دل میں اس سے کچھ نور نہیں۔“ (موضح القرآن)

تفسیر جلالین میں جو ہے، وہ ان دونوں سے الگ ہے:-

كذلك كلمة الايمان ثابتة في قلب المؤمن و عمله يصعد الى السماء ويناله بر كته و ثوابه كل وقت و مثل كلمة خبيثة ك شجرة خبيثة كذلك كلمة الكفر لا تثبات لها ولا فرح ولا بر كة

اسی طرح ایمان کا کلمہ مؤمن کے دل میں قرار پائے ہوئے ہوتا ہے اور اس کا عمل آسمان کی طرف بلند ہوتا ہے اور اسے اس کے برکت و ثواب سے ہر وقت فائدہ پہنچتا ہے اور خبیث کلمہ کی مثال کفر کا کلمہ ہے جو مثل خبیث درخت کے ہے، اسی طرح کفر کا کلمہ، اس کو ناپائیداری ہے، نہ اس سے خوشی ہوتی ہے اور نہ برکت۔

بہر حال الفاظ آیت میں ان سب پہلوؤں کی گنجائش ہے اور ان میں سے کسی ایک کو بھی ہم غلط نہیں کہہ سکتے۔

يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۗ

وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ ۗ وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ ﴿٢٤﴾

”قائم رکھتا ہے اللہ ایمان لانے والوں کو اس بات پر جو پائیدار ہے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی اور گمراہ قرار دیتا ہے اللہ ظالموں کو اور اللہ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔“

”ایمان لانے والوں کو قائم رکھتا ہے۔“ اس کی تشریح میں شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

یعنی وقت مرگ توفیق شہادت می و ہد و وقت سوال منکر و نکیر بقول حق گو یا سازد (فتح الرحمن)

مطلب یہ ہے کہ مرنے کے وقت حق کی گواہی دینے کی توفیق دیتا ہے اور منکر و نکیر کے سوال کے وقت اس کی زبان پر حق کو لاتا ہے۔ ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر میں جناب امیرؒ کی حدیث بھی یہی بتاتی ہے کہ یہ ”قول ثابت“ یعنی پائیدار پر قیام قبر میں نمایاں ہوگا منکر و

[1]۔ یکمہ بضلال الظالمین (تبیان)

نکیر کے سوال کے وقت جب بندہ مومن ان کے سوال کا صحیح صحیح جواب دے گا اور وہ خوش ہو کر اسے دعا دیں گے کہ:-

ثبتك الله بما تحب وترضى
اللہ تجھے برقرار رکھے اس طرح جو تجھے محبوب و دل پسند ہو
حضرت نے فرمایا کہ اس آیت سے مراد یہی موقع ہے۔^[۱]

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۗ
جَهَنَّمَ ۗ يَصَلُّونَهَا ۖ وَيَبُسُّ الْقَرَارُ ۗ وَجَعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا لِّيُضِلُّوا عَنْ
سَبِيلِهِ ۗ قُلْ تَمَتَّعُوا فَإِنَّ مَصِيرَكُمْ إِلَى النَّارِ ۗ^[۲]

”کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جنہوں نے نعمت الہی کے بدلے میں ناشکری سے کام لیا اور اپنی جماعت کو داخل کیا بلاکت کے گھر میں، جو دوزخ ہے۔ جس کی تپش میں وہ مبتلا ہوں گے اور کتنا برا ٹھکانا ہے وہ۔ اور انہوں نے اللہ کے لیے برابر بنا لئے تاکہ اس کے راستے سے بہکائیں، کہتے کہ ابھی فائدہ اٹھالو، یقیناً آخرت میں تو تمہیں آتش دوزخ کی طرف جانا ہے۔“

”نعمت الہی کے بدلے میں ناشکری“ کا مطلب یہ ہے کہ نعمت الہی کا جو تقاضا ہے اور وہ شکر نعمت ہے، اس کے بجائے کفران نعمت سے

کام لیا۔^[۲]

قُلْ لِعِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا يُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا
وَعَلَانِيَةً مِّن قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعُ فِيهِ وَلَا خِلَالٌ ۗ^[۳]

”کہتے میرے ان بندوں سے جو ایمان رکھتے ہیں کہ نماز کی پابندی کریں اور خیرات کریں اس سے کہ جو ہم نے انہیں دیا ہے پوشیدہ طور پر اور ظاہر بظاہر، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جب نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ آپس میں دوستانہ ہوگا۔“

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:-

”یعنی نیک عمل بکتے نہیں اور کوئی دوستی سے رعایت نہیں کرتا۔“ (موضح القرآن)

”دوستانہ“ سے کوئی آدمی بلا معاوضہ بھی کچھ مدد صرف حق دوستی کی بنا پر دیتا ہے یا ”کار خیر“ سمجھ کر، اس لیے ہماری قدیم تفسیر میں اس کی

[۱] . هو قول الله: يثبت الله الذين آمنوا بالقول الثابت الاية (علی بن ابراہیم)

[۲] . لها جعلوا الكفر بالنعمة مكان شكرها كانوا قد بدلوا القبح بتبديل (تبيان)

تشریح صدقہ کے لفظ سے ہوئی ہے [۱] مگر ہو سکتا ہے کہ صدقہ کے لفظ میں کتابت کی غلطی سے الف رہ گیا ہو اور وہ اصل میں صداقتہ ہو تو وہ لفظ خلال کی جو قرآن میں ہے بالکل لفظی تفسیر ہوگی یعنی دوستی یا دوستانہ جو ترجمہ میں پہلے ہی موجود ہے۔

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ
الشَّجَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ ۖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ ۗ وَسَخَّرَ لَكُمْ
الْأَنْهَارَ ۗ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآبِّبِينَ ۗ وَسَخَّرَ لَكُمْ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۗ
وَأَنْتُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ ۗ وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تَحْصُوهَا ۗ إِنَّ
الْإِنْسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ ۗ

”اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی اتارا تو نکالا اس کے ذریعہ پھلوں سے تمہارا رزق اور تمہارے قابو میں دیں کشتیاں کہ وہ چلیں دریا میں اس کے حکم سے اور تمہارے قبضہ میں دیں نہریں۔ اور تمہارے قابو میں دیے سورج اور چاند جو ہمیشہ چلتے رہتے ہیں [۲] اور قبضے میں کیے تمہارے رات اور دن۔ اور تمہیں دیا ہر چیز میں سے جو تم نے مانگا، اور اگر اللہ کی نعمت کا شمار کرو تو اس کا احاطہ تم نہیں کرو گے یقیناً انسان بڑا ظالم ہے، بڑا ناشکرا۔“

مانگ کے پورا کرنے میں من کا لفظ جو صرف کیا گیا جس کے مفہوم سے ”بعض“ کا پتہ لگتا ہے، اس لیے ہے کہ انسان تو اپنی غرض کا بندہ ہے، وہ کبھی ایسی چیز بھی مانگ لیتا ہے جو حکمت نظام عالمی کے خلاف ہے اس لیے ایسا سوال پورا نہیں کیا جاتا، ہاں وہ سوال جو کسی بڑے مقصد سے نہ نکراتا ہو، اسے بتقاضائے رحمت و رافت پورا کر دیا جاتا ہے اور اس کے لیے من کے بعد کل کا لفظ لایا گیا ہے جو اقسام طلب کے لحاظ سے ہے یعنی یہ اس کی حاجت روانی کسی ایک قسم سے مخصوص نہیں بلکہ ہر ایک طرح کی چیز جو تم مانگتے ہو، وہ دیتا ہے [۳] اس لیے ”میں سے“ کے ساتھ ہم نے ترجمہ میں ”ہر وہ چیز“ کہا ہے جس سے بعض اور کل دونوں کے مفہوم محفوظ ہو گئے۔

بہت قابل لحاظ چیز یہ ہے کہ کشتیوں اور نہروں ہی کی طرح سورج اور چاند اور رات دن کے متعلق سخولکم کا لفظ صرف کیا ہے جس کا ترجمہ سب جگہ ایک ہونا چاہیے اس بنا پر ہم نے یہاں بھی یہی ترجمہ کیا ہے کہ ”تمہارے قبضے“ یا ”تمہارے قابو“ میں دیئے مگر مشاہدہ اور وجدان ہر ایک کا یہ ہے کہ یہ چیزیں ہمارے قابو میں نہیں ہیں، اس صورت میں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ مستقبل کے کسی ایسے دور ارتقاء کی طرف انسانی ذہن کو تحریک ہے جب یہ سب چیزیں بھی اس کے قابو میں آجائیں اور اس وقت کے حال میں (جب قرآن اتر ہے) نوع انسانی ہی میں کچھ بلند ہستیاں

[۱]. لاخلال ای صدقة (علی بن ابراہیم)

[۲]. الدؤوب مرور الشئ فی العمل علی عادیة جاریة فیہ (تبیان)

[۳]. معناه ان الانسان قد یسأل له العافیة فیعطی ویسأل له النجاق فیعطی ویسأل له الغنی فیعطی ویسأل له الملک فیعطی ویسأل له الولد فیعطی ویسأل له الغر و تیسر الامور و شرح الصدور فیعطی... مالہ یکن فیہ مفسدة فی الدین علیہ و علی غیرہ (تبیان)

ایسی موجود تھیں جن کے قبضے میں دیے گئے تھے سورج اور چاند اور دن رات کیوں کہ خطاب مجموعہ ظرف زمان کی پوری نوع سے ہے ہر زمانہ کی ہر فرد سے نہیں ورنہ ایک دور میں تو جب تک انسانی ذہن نے اتنی بھی ترقی نہیں کی تھی کشیوں پر بھی قبضہ نہ تھا اور نہہریں بھی قابو میں نہ تھیں اور اب اتنے ارتقاء کے بعد بھی انسانوں کی اکثریت جو ان فنون سے واقف نہیں، وہ نہ کشتیوں پر قابو رکھنی ہے اور نہ نہروں پر۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ
الْأَصْنَامَ ۗ رَبِّ إِنَّهُمْ أَضَلَّلْنِي كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ ۗ فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي ۗ
وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٣٦﴾

”اور جب کہا ابراہیم نے اے میرے پروردگار! اس شہر کو محل امن قرار دے اور بچا مجھے اور میری اولاد کو اس بات سے کہ ہم بتوں کی پرستش کریں۔ اے میرے پروردگار انہوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر رکھا ہے تو جو میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہے اور جو میرا کہا نہ مانے تو یقیناً تو بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔“

حضرت ابراہیم کی مناجات

”میری اولاد کی تشریح شاہ ولی اللہ کو یہ کہنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ”یعنی پسران بلا واسطہ او“ (فتح الرحمن) غالباً یہ اس مشاہدہ کی بنا پر ہے کہ اولاد حضرت ابراہیم علیہ السلام میں بہت سے کافر و مشرک بھی نظر آتے ہیں مگر نہیں ہیں یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ اولاد ابراہیم علیہ السلام ہر دور میں ایسے افراد رہے ہیں جن کی پیشانی کبھی کسی معبود باطل کے سامنے خم نہیں ہوئی اور بنی کے لفظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جود عاتقی، اس کی قبولیت کا ظہور انہی افراد میں ہوا جسے منطقی ذوق رکھنے والے اپنی زبان میں یوں سمجھ سکتے ہیں کہ ”مہملہ“ کا صدق مستقبل کے ہر دور میں بصورت جزئیہ رہا ہے جو اس قضیہ کا قدر متیقن کے طور پر تقاضا ہے۔

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بُوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۗ رَبَّنَا
لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ
الشَّمْرِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ﴿٣٧﴾

”اے میرے پروردگار میں نے بسایا ہے اپنے بال بچوں میں سے کچھ کو [۱] بغیر کھیتی والے ایک چٹیل میدان میں تیرے محترم گھر کے پاس، اے ہمارے مالک! اس غرض سے کہ وہ نماز کی بنیاد قائم کریں، اب تو کچھ انسانوں کے دلوں کو ایسا کر دے کہ وہ ان کی طرف جھکتے ہوں اور انہیں ہر طرح کے پھلوں سے رزق عطا فرما، شاید کہ وہ شکر گزار ثابت ہوں۔“

[۱]. المراد بالندرية ههنا اسماعيل وامة (تبيان)

جناب ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں یہ لفظیں کہ ”تیرے محترم گھر کے پاس“ اس بنا پر ہیں کہ اگرچہ اس کے بعد خود جناب ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیلؑ اس بیت کی تعمیر کریں گے مگر یہ تعمیر کسی نئے مکان کی نہیں بلکہ اسی قدیم مکان کی ہوگی جو پہلے یہیں پر موجود تھا اور پھر حوادث ارضی و سماوی [۱] سے بے نشان ہو گیا تھا، اللہ کے دیے ہوئے علم سے جناب ابراہیم علیہ السلام اس گھر سے واقف تھے، اس لیے انہوں نے یہ الفاظ استعمال کیے۔

**رَبَّنَا اِنَّكَ تَعَلَّمُ مَا نَخْفِي وَمَا نَعْلَمُ ط وَمَا يَخْفَى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ
وَلَا فِي السَّمَاۗءِ ﴿۳۸﴾**

”اے ہمارے پروردگار! یقیناً تو جانتا ہے اسے جو ہم چھپاتے ہیں اور جو ہم ظاہر کرتے ہیں اور نہیں چھپتی اللہ پر کوئی چیز زمین میں اور نہ آسمان میں۔“

آخر کا فقرہ کلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جز بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے کلام کا یہ فقرہ کہ ”تو جانتا آخر کا فقرہ کہ“ تو جانتا ہے اسے جو ہم چھپاتے ہیں اور جو ہم ظاہر کرتے ہیں۔“ ختم ہونے کے بعد خود خالق متعال نے بطور تائید یہ کلام ارشاد فرمایا ہو۔ [۲]

**الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ اِسْمَ عِيْلٍ وَّاسْحَقَ ط اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ
الدُّعَاۗءِ ﴿۳۹﴾ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ؕ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاۗءِ ﴿۴۰﴾
رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴿۴۱﴾**

”شکر ہے اللہ کا جس نے مجھے باوجود کبرسنی کے اسماعیل اور اسحاق (ایسے بیٹے) عنایت فرمائے یقیناً میرا پروردگار دعا کا سننے والا ہے۔ پروردگار مجھے نماز کا قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی اے ہمارے پروردگار! اور میری دعا کو قبول کر۔ ہمارے پروردگار مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور تمام ایمان والوں کو اس دن کہ جب حساب قائم ہوگا۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اواخر عمر میں اپنے والدین کے لئے دعائے مغفرت

ظاہر ہے کہ دعا جناب ابراہیم علیہ السلام کی بالکل اواخر عمر کی ہے جب کہ اسماعیلؑ اور اسحاقؑ دونوں کی ولادت ہو چکی تھی اور پھر وہ استغفار میں اپنی مغفرت کے ساتھ اپنے والدین یعنی والد اور والدہ دونوں کی مغفرت کی التجا کر رہے ہیں، حالانکہ دوسرے مقامات پر قال لابیہ اپنے باپ سے کہا اور ایسے ہی الفاظ سے جس کو ابراہیم علیہ السلام کا باپ کہا گیا ہے اور اس سے مخاطب میں یہ مذکور ہے کہ سوف استغفر لک ربی میں اپنے پروردگار سے تمہارے لیے طلب مغفرت کروں گا، اور اس کے لیے پھر استغفار کیا بھی، اس میں کہیں والد کا لفظ نہیں ہے بلکہ یہ لفظ ہیں کہ: ”واغفر لابی“ میرے باپ کو بخش دے، اور اس کے متعلق قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ:

[۱]. خریة طسمر و اندرس و قبیل ائہر فبیع عند الطوفان الی السماء (تبیان)

[۲]. قال قوم ان قوله ”وما يخفى على الله من شيء في الارض ولا في السماء“ اخبار منه تعالى بذلك دون الحكاية (تبیان)

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرَاهِيْمَ لِاِبْنِهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَا اِيَّاهُ ۗ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ اَنَّهُ عَدُوٌّ لِلّٰهِ تَبَرَّآ
مِنهُ. (توبہ۔ 114)

نہیں تھا ابراہیمؑ کا طالب مغفرت ہوتا اپنے باپ کے لیے مگر ایک وعدہ کی بنا پر جو انہوں نے اس سے کیا تھا مگر جب ان پر ظاہر ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو انہوں نے اس سے برأت کر لی۔

ظاہر ہے کہ یہ اوائل عمر جناب ابراہیمؑ کا تذکرہ ہے اور جیسا کہ ہم نے کہا: زینبنا اغفر لی ولوالدتی کہنا آپ کے اواخر عمر کے الفاظ ہیں۔ اس صورت میں جلالین کے یہ الفاظ کتنے بعید از حقیقت ہیں کہ:

هذا قبل ان يتبين عدواهما لله :

یہ دعا حضرت ابراہیمؑ کی اس وقت کی ہے جب انہیں پتہ نہ تھا کہ ان کے والدین اللہ کے دشمن ہیں:-

اللہ اکبر: انبیاء و مرسلین کے آباؤ اجداد کو مشرک ثابت کرنے کا شوق ان لوگوں کی آنکھوں پر کس طرح پردے ڈال دیتا ہے۔

پوری عمر گزر گئی، خود جلالین صاحبان اس آیت کے شروع میں علی الکبر کے تحت میں لکھ چکے ہیں کہ جب جناب اسماعیلؑ پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ کی عمر 99 برس کی تھی اور جناب اسحاقؑ پیدا ہوئے تو ایک سو بارہ برس کی اور ابھی تک ان کو اپنے والدین کے متعلق یہ علم نہ ہوا کہ وہ معاذ اللہ دشمن خدا تھے مگر جلالین کو اس کا علم ہو گیا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت اس کی دلیل قوی ہے کہ آذر جسے ان آیت میں ”اب“ باپ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، والدین کے لفظ سے نہیں، وہ درحقیقت جناب ابراہیمؑ کا باپ نہ تھا۔^[1]

یاد رکھنا چاہیے کہ اب کا لفظ مجازی طور پر کسی مرئی کے لیے استعمال ہو جاتا ہے مگر والد وہی ہوتا ہے جس کے نطفہ سے انسان پیدا ہو، وہ آذر نہیں تھا بلکہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے بتایا ہے، والد جناب ابراہیمؑ کے تاریخ تھے اور یہاں والدین سے مراد اصلی ماں باپ ہیں جو دونوں ہی مش تمام مرسلین کے آباؤ اجداد کے اہل ایمان تھے۔

یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ یہاں جلالین باپ کے ساتھ ماں کو بھی دشمن خدا ظاہر کر رہے ہیں کہتے ہیں کہ: قبل ان يتبين له عدواً وتبهما لله یعنی اُس وقت تک ان دونوں کی عداوت اللہ سے ظاہر نہ ہوئی تھی، تو پھر قرآن میں دوسری جگہ جو جناب ابراہیمؑ کے استغفار پر ان کا عذر بیان کیا گیا ہے، اس میں فقط باپ کے لیے استغفار کا ذکر نہ ہونا چاہیے بلکہ ماں باپ دونوں کے لیے استغفار اور ماں سے بھی وعدہ استغفار کا تذکرہ ہونا چاہیے حالانکہ ایسا نہیں ہے، اس سے ظاہر ہے کہ نظر الہی میں یہ استغفار جناب ابراہیمؑ جو زینبنا اغفر لی ولوالدتی کے الفاظ میں ہے، کسی معذرت کا محتاج نہیں ہے، ہاں وہ استغفار جو اغفر لابی کے الفاظ میں تھا اور وہاں ماں کا کوئی ذکر نہیں، اس کے لیے قرآن میں ضرورت محسوس کی گئی ہے یہ بتانے کی کہ اس کا کیا سبب تھا؟

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُونَ ؕ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ

[1] قد تنبأ ان ابري ابراهيم لحد يكونا كافرين وفي الآية ولاية على ذلك لانه سأل المغفرة لهما يوم القيامة... قدل ذلك على ان باه الذي كان كافرا جده لامة او عمه على الخلاف (تبيان)

فِيهِ الْاَبْصَارُ ﴿٣١﴾ مُهْطِعِينَ مُقْنِعِي رُءُوسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ إِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۗ

وَافْتَدَتْهُمْ هَوَآءُ ۗ ﴿٣٢﴾

”اور اللہ کو ہرگز بے خبر نہ سمجھنا اس سے کہ جو ظالم یا ظلم کرتے ہیں، وہ تو بس انہیں ڈھیل دیتا ہے اس دن کے لیے جس میں آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی [۱]۔ تیزی سے دوڑتے ہوئے منہ اپنے اٹھائے ہوئے اس عالم میں کہ نگاہ ان کی ان کی طرف پلٹتی نہیں اور دل ان کے پریشان ہوں گے [۲]۔“

”یہ دن وہی جس کی ہولناکیوں کے مختلف رخ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر درج ہیں اور وہ وہی ہے جس کا زیادہ نمایاں اصطلاحی

نام ”قیامت“ ہے۔ [۳]

وَأَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَأْتِيهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُولُ الَّذِينَ ظَلَمُوا رَبَّنَا أَخْرِنَا إِلَىٰ

أَجَلٍ قَرِيبٍ ۖ نُجِيبُ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ۗ أَوَلَمْ تَكُونُوا أَقْسَمْتُمْ مِّنْ

قَبْلِ مَا لَكُم مِّنْ زَوَالٍ ۗ ﴿٣٣﴾ وَسَكَنتُمْ فِي مَسْكِنٍ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ

وَتَبَيَّنَ لَكُم كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْآمَثَالَ ۗ ﴿٣٤﴾ وَقَدْ مَكَرُوا

مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللَّهِ مَكْرُهُمْ ۗ وَإِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ ۗ ﴿٣٥﴾ فَلَا

تُحْسِبَنَّ اللَّهُ مَخْلَفًا وَعَدِيدًا رُّسُلَهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۗ ﴿٣٦﴾

”اور ڈرائیے لوگوں کو اس دن سے کہ جب ان پر عذاب آئے گا تو ظالم لوگ کہیں گے، اے ہمارے مالک! ہمیں مہلت دے ایک قریبی مدت تک تو ہم تیری دعوت پر لبیک کہیں گے اور پیغمبروں کی پیروی کریں گے اور کیا تم نے پہلے سے قسمیں نہیں کھائی تھیں کہ ہمیں کوئی زوال نہیں ہوگا۔ اور تم بے تھے بستوں میں ان کی جو پہلے اپنے نفس پر ظلم کر چکے تھے اور تمہیں معلوم ہوا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا کیا تھا اور ان کے کیفیات ہم نے تم سے بیان کیے۔ اور انہوں نے اپنی ترکیبیں کیں اور اللہ کے پاس ان کی سب ترکیب ہے اور ان کی ترکیب ایسی تو نہ تھی کہ پہاڑ اس سے ہٹ جائیں۔ تو ہرگز نہ سمجھو اللہ کو کہ وہ ان وعدوں کے خلاف کرے گا جو اس نے اپنے پیغمبروں سے کیے ہیں یقیناً اللہ عزت والا ہے، بڑا سخت بدلہ لینے والا۔“

[۱]۔ یقال شخص دجره فلاں ای فتحه فلمه یغضه (جلالین)

[۲]۔ قلوبهم تتصدع من الحفقان (علی بن ابراہیم)

[۳]۔ هو یوم القیمة (تبیان)

يَوْمَ تَبْدَلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَاوَاتُ وَبَرَزُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿٣٨﴾

وہ دن جب یہ زمین بدل کر دوسری زمین ہو جائے گی اور آسمان بھی اور وہ لوگ حاضر ہوں گے اللہ کے سامنے جو ایک اکیلا ہے، سب پر غالب۔

قیامت میں آسمان و زمین کی تبدیلی

ان آیات میں قیامت میں آسمان و زمین کی تبدیلی کا ذکر آیا ہے۔

وَتَرَى الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ مُّقْرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ ﴿٣٩﴾ سَرَّابِلُهُمْ مِّنْ قَطْرَانٍ

وَتَعْشَىٰ وُجُوهُهُمْ النَّارُ ﴿٤٠﴾ لِيَجْزِيَ اللَّهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ۗ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ

الْحِسَابِ ﴿٤١﴾

اور دیکھو گے مجرموں کو اس دن جکڑا ہوا زنجیروں میں۔ ان کے کرتے تار کول کے ہوں گے اور ان کے چہروں کو آگ ڈھانپے ہوئے ہوگی۔ تاکہ اللہ سزا دے ہر ایک کو اس کی جو اس نے کیا ہے، یقیناً اللہ تیزی سے حساب لینے والا ہے۔

هَذَا بَلَّغٌ لِلنَّاسِ وَلِيُنذَرُوا بِهِ ۗ وَلِيَعْلَمُوا أَنَّمَا هُوَ إِلَهٌُ وَاحِدٌ ۗ وَلِيُنذَرُ الَّذِينَ كَفَرُوا

الْأَلْبَابِ ﴿٤٢﴾

یہ تبلیغ ہے تمام لوگوں کے لیے اور اس سے یہ مقصد ہے کہ انہیں تنبیہ ہو اس کے ذریعے سے اور یہ کہ انہیں معلوم ہو کہ وہ بس ایک خدا ہے اور اس لیے کہ صاحبان عقل اثر لیں۔

سُورَةُ الْحَجْرِ

مکیہ ----- ۹۹ آیات ﴿۱﴾

اس سورہ کا نام ”اصحاب حجر“ کے تذکرہ کی وجہ سے ہوا ہے جو خصوصیت کے ساتھ اس سورہ میں ہوا ہے۔

سورہ حجر کے خاص خاص مضامین:

- ۱..... قرآن کی حفاظت کا قطعی وعدہ
- ۲..... فرشتوں کو سجدہ آدم کا حکم اور ابلیس کی سرتابی کا تفصیلی تذکرہ
- ۳..... دوزخ کے ساتھ دروازے
- ۴..... اہل بہشت سے دلوں سے کینہ و عداوت کا دور ہونا
- ۵..... فرشتوں کا جناب ابراہیم علیہ السلام کے پاس آنا اور ولادت اسحاق کی بشارت دینا
- ۶..... قوم لوط علیہ السلام پر عذاب نازل کرنے کے لیے انہی فرشتوں کا جانا
- ۷..... اصحاب ایکہ کا معذب ہونا
- ۸..... سبع مثانی اور قرآن
- ۹..... علانیہ تبلیغ اسلام کا ابتدائی حکم
- ۱۰..... رسول کے ساتھ تمسخر کرنے والوں کا انجام وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے۔

الرَّحْمٰنُ تِلْكَ اٰیَةُ الْكِتٰبِ وَقُرْٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۱﴾

الف۔ لام۔ را۔ یہ دستور خداوندی اور ایک بڑے روشن قرآن کی آیات ہیں۔

عام طور پر الکتاب سے مراد قرآن ہی لیا گیا ہے ﴿۱﴾ اور پھر قرآن تو قرآن ہے ہی..... اس صورت میں یہ ایک چیز کا دوسری چیز کا عطف

﴿۱﴾ مکیہ فی قول قتادہ و مجاہد و ہی تسع وتسعون آية بلا خلاف (تبیان)

﴿۲﴾ الکتاب القرآن (جلالین)

نہیں ہے بلکہ ایک چیز کے دو وصف ہیں جن کو بطور عطف ظاہر کیا گیا ہے [۱] مگر حقیقت یہ ہے کہ لفظ ”کتاب“ کتابت یعنی تحریر سے جس طرح آتی ہے، اسی طرح کتب بمعنی فرض سے بھی، اس لیے قانون الہی جو اس کی طرف کے فرائض پر حاوی ہے ”کتاب“ کہلاتی ہے جو قرآن مجید کی بکثرت آیات میں آیا ہے اور اس لیے ہم نے ترجمہ اس کا ”دستور خداوندی“ کے ساتھ کیا ہے۔

رُبَّمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ ﴿۲﴾

”بسا اوقات کافر لوگ اس کے آرزو مند ہوں گے کہ کاش وہ مسلمان ہوتے۔“

یہ تمنا دنیا میں بھی ہو سکتی ہے، جب مسلمانوں کو فتوحات حاصل ہوئی ہیں اور اسلام کے برکات و فوائد محسوس ہوئے ہیں تو ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے اور آخرت میں بھی ہو سکتی ہے جب وہاں کے شدائد اور کفر و عصیان کے نتائج ان کی آنکھوں کے سامنے آئیں گے۔ بہر حال آخرت میں یہ خواہش تو بعد از وقت ہوگی کیوں کہ وہ جزا و سزا کا دن ہے، اس دن عمل کا دروازہ بند ہو چکا ہوگا مگر دنیا میں یہ خواہش اگر صدق دل سے ہو تو وہ سود مند ہو سکتی ہے کیوں کہ اپنی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے کا موقع ابھی باقی ہے لیکن جو کافر ہیں، ان کے دل میں یہ خواہش چونکہ حقانیت کی تڑپ سے نہیں بلکہ وقتی منافع سے ایک وقتی تاثر کے طور پر ہے لہذا اکثر وہ چنگاری ’اندیشہ ہائے سودوزیاں‘ کی خاکستر کے نیچے دب کر بچھ جایا کرتی ہے۔

ذَرَّهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿۳﴾

”چھوڑ دو انہیں کہ کھائیں اور لذت اند حیات سے بہرہ مند ہوں اور ہوس دنیا انہیں بے خبر بنائے رکھے تو کچھ ہی عرصہ میں انہیں معلوم ہو جائے گا۔“

وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُومٌ ﴿۴﴾

”اور کوئی بستی ایسی نہیں جسے ہم نے تباہ و برباد کیا مگر یہ کہ اس کے لیے ایک جانا پہچانا نوشتہ موجود تھا۔“
یعنی دنیا سے ناگہانی آفت سبھی ہے مگر حقیقت میں خالق کی جانب سے امت کی بقا و فنا ایک منضبط و معلوم ضابطہ کے مطابق تھی جو خالق کی طرف سے مقرر ہے۔ [۲]

مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ ﴿۵﴾

”کوئی قوم اپنی مقررہ عمر کی مدت سے نہ آگے بڑھتی ہے اور نہ وہ پیچھے رہتی ہے۔“

وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ ﴿۶﴾ لَوْ مَا تَأْتِينَا بِالْمَلِكَةِ
إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿۷﴾ مَا نُنْزِلُ الْمَلِكَةَ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوا إِذَا

[۱] انما و صفو ابالكتاب و القرآن لا اختلاف اللفظین و ما فیہما من الفائدین و ان کا ناالم و صوف و انه (تبیان)

[۲] کتاب معلومہ ای اجل مکتوب (علی بن ابراہیم)

مَنْظَرَيْنِ ۸

”اور انہوں نے کہا کہ اے وہ جس پر قرآن اتارا گیا ہے، یقینی تم تو دیوانے ہو۔ کیوں نہیں تم لے آتے خود ہمارے پاس فرشتوں کو اگر تم سچے ہو۔“ ہم نہیں اتارتے فرشتوں کو مگر صحیح موقع پر اور انہیں اس وقت میں پھر کوئی مہلت نہ ہو گی۔“

بعد کے گستاخانہ جملہ سے ان کے کہ ”تم تو دیوانے ہو“ یہ ظاہر ہے کہ پہلے ان کا کہنا کہ ”اے وہ جس پر قرآن اتارا گیا ہے“ بطور تمسخر تھا۔ مطلب یہ ہے کہ تم تو ایسا ادعا رکھتے ہو کہ تم پر قرآن اتارا گیا ہے [۱] مگر ہمارے نزدیک حقیقت یہ ہے کہ تم دیوانے ہو، پھر ہٹ دھرمی والا انہوں نے یہ مطالبہ پیش کر دیا کہ اگر تم سچے ہو تو خود ہمارے پاس فرشتوں کو بلا کر کیوں نہیں دکھا دیتے؟ خالق نے جواب دیا فرشتوں کا اتارا جانا کوئی ہنسی دل لگی کی بات نہیں ہے، وہ امتوں کی طرف بھیجے جاتے ہیں تو عذاب لے کر بھیجے جاتے ہیں، اس وقت جب مہلت کا دور ختم ہو جاتا ہے اور اس امت کا قلع قمع کرنا منظور ہوتا ہے۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۹

”بلاشبہ ہم نے اس قرآن کو اتارا ہے اور یقیناً ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔“

قرآن کی حفاظت کا قطعی وعدہ

یہ آیت اس معرکہ آرا بحث خلق قرآن میں پیش ہوتی رہی ہے جو امت اسلامیہ میں ایک مدت تک ہيجان و اضطراب کی باعث رہی۔ اہل سنت کی اکثریت یعنی اشعری لوگ اس کے قائل ہیں کہ قرآن قدیم ہے اور اسے ”حادث“ کہنا کفر ہے حالانکہ قدیم کی لازمی صفت ہے ”لا زوال“ اور جو شے ذاتاً لا زوال ہو، اس کے لیے حفاظت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، پھر خالق نے یہ کیوں کہا کہ ”ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔“ [۲]

اس کے علاوہ اس آیت کو برابر قرآن مجید کی سالمیت یعنی تحریف و تغیر سے بری، ذمے ہونے کے ثبوت میں بھی پیش کیا جاتا ہے۔ [۳]

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي شَيْعِ الْأَوَّلِينَ ۱۰ وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۱۱ كَذَلِكَ نَسُكُّهُ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ ۱۲ لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ ۱۳

”اور ہم نے آپ کے پہلے بھی پیغمبر بھیجے سابق زمانہ کی مختلف جماعتوں میں“۔ اور کوئی پیغمبر ان کے پاس نہیں آتا

[۱]. نزل عليك على قولك (تبيان)

[۲]. في الآية دلالة على حدوث القرآن (تبيان)

[۳]. من التبديل والتحريف والزيادة والنقص (جلالين)

تھا مگر یہ کہ وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اس طرح ہم اسے داخل کرتے ہیں ان گناہ گاروں کے دل میں۔ وہ ان پر ایمان نہیں لائیں گے اور رہا ہے یہی طریقہ اگلے زمانہ والوں کا۔“

”اسے داخل کرتے ہیں ان گناہ گاروں کے دلوں میں۔“ یہ ”اسے“ کی ضمیر کی طرف راجع ہے؟ مفسرین اہل سنت جنہیں کسی برائی کے انتساب میں اللہ کی طرف کوئی وحشت محسوس نہیں ہوتی، وہ بلا تکلف اسے مذاق اڑانے یا کفر اختیار کرنے کی طرف راجع کر دیتے ہیں [۱] اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان باتوں کا سبب اللہ ہے مگر ہمارے مفسرین اس کے خلاف ہیں۔ جناب شیخ الطائفہ نے اس کے لیے قدیم علمائے جمہور کا قول بھی نقل کیا ہے۔ ”پہلی اور جبائی کہتے ہیں کہ ”اسے“ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے اور اس لیے بعد میں ہے ”وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے“ اگر پہلی جگہ ”اسے“ کی ضمیر کو کفر یا استہزا کی طرف راجع کیا جائے تو ”اس پر ایمان نہیں لائیں گے“ کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اس کفر اور استہزا پر ایمان نہیں لائیں گے، یہ نمایاں طور پر غلط ہے۔ [۲]

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِم بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ ﴿۱۳﴾ لَقَالُوا إِنَّمَا

سُكَّرَتْ أَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُورُونَ ﴿۱۴﴾

”اور اگر ہم ان پر کھول دیں ایک دروازہ آسمان کا جس سے وہ اس میں چڑھنے لگیں تو وہ کہیں گے کہ یہ ہماری آنکھوں پر نشہ غالب کر دیا گیا ہے بلکہ ہم ایسے لوگ ہیں جن پر جادو ہو گیا ہے۔“

”آنکھوں پر نشہ غالب ہو گیا ہے۔“ اس کے معنی یہ ہیں کہ نظریں صحیح کام نہیں کر رہی ہیں اور ان کی کیفیت غیر فطری ہو گئی ہے۔ [۳]

پورا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ نہ ماننے والے کے لیے کوئی معجزہ کارگر نہیں ہے، وہ تو اتنا ہی کہہ رہے ہیں کہ فرشتے خود ہم سے آکر باتیں کیوں نہیں کرتے؟ اگر اس سے بڑھ کر بھی ہو یعنی یہ خود آسمانوں کی طرف بلند ہوں، تب بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے اور نہ اس کی واقعیت کو تسلیم کریں گے بلکہ اسے کسی جادو یا کرتب کا نتیجہ قرار دیں گے۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَرَئِيهَا لِلنَّظِيرِينَ ﴿۱۵﴾ وَحَفِظْنَاهَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ

رَّجِيمٍ ﴿۱۶﴾ إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاتَّبَعَهُ شَهَابٌ مُّبِينٌ ﴿۱۷﴾

اور ہم نے آسمان میں بہت سے برج بنائے ہیں اور انہیں سجا یاد کیلئے والوں کے لیے۔ انہیں محفوظ رکھا ہے ہر مردود شیطان سے۔ سو اس کے کہ جو چوری چھپے سنے تو اس کا پچھا کرے گا ایک ٹٹے والا تارا جو نمایاں ہوگا۔

وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ

[۱] ای مثل ادخالنا التكديب في قلوب اولئك. (جلالین)

[۲] لو كان الراد انه يسلك الشرك في قلوبهم يقول انهم لا يؤمنون بالشرك (تبیان)

[۳] سكرت الابصار فلا ينفذونها ولا تدرك الاشياء على حقيقتها (تبیان)

مَوْزُونٍ ۱۹) وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَسْتُمْ لَهُ بِرِزْقَيْنَ ۲۰

اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور اس میں پہاڑ قائم کیے اور اس میں نبی تلی ہوئی ہر قسم کی چیزیں لگائیں۔ اور تمہارے لیے اس میں ذرائع معاش قرار دیے اور ایسے اشخاص جنہیں تم روزی پہنچانے والے نہیں ہو۔
یعنی نوکر، چاکر، عزیز و اقارب، بال بچے سب سے فائدہ اٹھاتے ہو اور رزق پہنچانے والے نہیں حقیقتاً تم نہیں ہو، اللہ ہے۔^[۱]

وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنزِّلُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ ۲۱

اور کوئی چیز نہیں ہے مگر یہ کہ ہمارے پاس اس کے ذخائر ہیں اور ہم نہیں اتارتے مگر ایک معینہ مقدار پر۔
یعنی جتنی مصلحت متقاضی ہوتی ہے۔^[۲]

وَأَرْسَلْنَا الرِّيحَ لَوَاحٍ فَأَنْزَلْنَا مِنْ السَّمَاءِ مَاءً فَأَسْقَيْنَاكُمُوهُ ۳ وَمَا أَنْتُمْ لَهُ

بِخَيْرِينَ ۲۲

”اور ہم نے ہواؤں کو بھیجا جو بادلوں کو پانی سے بوجھل بناتی ہیں^[۳] اس کے بعد ہم نے اتارا آسمان سے پانی تو اس سے ہم نے تمہیں سیراب کیا اور تم اس کے ذخائر پر قابو نہ رکھتے تھے۔“

آخر کے جملہ کے ایک معنی یہ ہیں کہ ہم بار بار پانی نہ برساتے تو تمہارے بس کی بات نہ تھی کہ ایک دفعہ کے برسے ہوئے پانی کو تم مستقل ذخیرہ کی صورت میں ہمیشہ کے لیے محفوظ رکھتے^[۴] اور یہ بھی کہ تم اس ذخیرہ کو مالک نہ تھے۔ یہ خدا کا فضل و کرم ہے کہ اسے تمہارے لیے برساتا ہے۔^[۵]

یہاں جناب شیخ الطائف نے عجیب بات کی ہے جسے سوا ”مساہمہ“ کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اصل آیت کے آخر میں ہے: وما انتم له بخیرین جس کا ترجمہ اور مطلب ابھی ہم نے لکھا مگر موصوف کے ذہن میں اس مقام پر آ گیا: وما انتم له برزقین اور انہوں نے شرح اس کی فرمادی۔^[۶]

لطف یہ ہے کہ تبیان کا جدید ایڈیشن مطبوعہ دارالاندلس تحقیق و تفسیر احمد حبیب قصیر العالی کے ساتھ شائع ہوا مگر اس میں بھی حاشیہ پر اس ”مساہمہ“ کے ساتھ کوئی تعرض نہیں کیا گیا ہے۔

[۱] من العبيد والذواب والانعام وائمایرز قہم اللہ (جلالین)

[۲] علی حسب المصالح (جلالین)

[۳] تلقح السحاب فیمتلی ماء (جلالین)

[۴] ذای لا تقدرون ان تحزنوه (علی بن ابراہیم)

[۵] ای لیست خزائنه بأیدیکم (جلالین)

[۶] ”وما انتم له برزقین“ ای لستم تقدرون ان ترزقوا احد ذلك الماء (تبیان)

وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٍ وَنُمِيتُ وَنَحْنُ الْوَارِثُونَ ﴿٢٣﴾

بلاشبہ ہم زندہ کرتے ہیں اور ہم مارتے ہیں اور ہم ورثہ پانے والے ہیں۔

یعنی سب کی فنا کے بعد ذات الہی باقی رہنے والی ہے یہی باختلاف الفاظ تمام مفسرین کے تشریحات کا مطلب ہے۔^[۱]

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِينَ ﴿٢٤﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ

هُوَ بِحَشْرٍ هُمْ ط إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿٢٥﴾

”اور ہم جانتے ہیں تم میں سے آگے والوں کو اور جانتے ہیں پیچھے والوں کو۔ اور یقیناً تمہارا پروردگار وہی انہیں حشر میں اٹھائے گا بلاشبہ وہ بالکل ٹھیک کام کرنے والا ہے، بڑا جاننے والا۔“

”آگے والوں کو“ اور ”پیچھے والوں کو“..... اس کے مفہوم میں جناب شیخ الطائف نے چار قول بیان کیے ہیں:-

ایک آگے والے جو گزر گئے اور پیچھے والے جو باقی ہیں۔

دوسرے خلقت کا اول حصہ اور آخری حصہ

یہ دونوں باتیں قریب ہی قریب ہیں اور اہل سنت کی تفسیر جلالین اس کے موافق ہے کہ:

المستقدمين منكم اى من تقدم من الخلق من لدن ادم ولقد علمنا المستأخرين المتأخرين الى

يوم القيامة

”تم میں سے آگے والوں کو، یعنی جو مخلوق آدم کے بعد سے اب تک تھی اور ہم جانتے ہیں پیچھے والوں کو یعنی اب سے لے کر قیامت تک کی

مخلوق“

تیسرا قول ان دونوں سے الگ ہے کہ ”آگے والوں“ کے معنی نیک کاموں میں آگے رہنے والے اور پیچھے والے“ نیک کاموں میں پیچھے

رہنے والے، اور چوتھا جسے شان نزول کے طور پر بیان کیا گیا ہے، یہ ہے پیغمبر خدا ﷺ نے نماز جماعت میں پہلی صف میں رہنے کی جو تاکید

فرمائی تو بعض مسلمانوں نے جو کسی دور دراز مقام پر رہتے تھے یہ ارادہ کیا کہ وہ اپنا گھر فروخت کر کے کہیں قریب کی جگہ پر آکر بس جائیں تاکہ پہلی

صف میں شریک ہو سکیں تو یہ آیت نازل ہوئی مطلب یہ ہے کہ اللہ آگے والوں اور پیچھے والوں کی نیتوں کے لحاظ سے انہیں جزا عطا کرے گا بعد میں

جو حشر میں اٹھانے کا ذکر ہے، وہ ان میں سے ہر قول کے ساتھ مرتبہ ہو سکتا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَإٍ مَسْنُونٍ ﴿٢٦﴾ وَالْجِبَّانَ خَلَقْنَاهُ مِنْ

قَبْلِ مِنْ نَّارِ السَّمُومِ ﴿٢٧﴾

[۱]. الوارثون الباقون نرث جميع الخلق (جلالین) اذا افتى الخلق ولحم يمين احد كانت الاشياء كلهار اجعة اليه ينفر دبال تصرف فيها و

كان هو الوارث لجميع الاملاك (تبيان) یعنی ہر کوئی مرتا جاتا ہے اور اس کی کمائی اللہ کے ہاتھ میں رہتی ہے (موضح القرآن)

اور ہم نے پیدا کیا ہے انسان کو گندھی ہوئی مٹی سے جو سوکھ کر کھٹکھڑ ہوگئی۔ اور قوم جن کو اس سے پہلے پیدا کیا گیا، نے انتہائی تپتی ہوئی جان لیوا آگ سے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ﴿٣٨﴾ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ لِسَجْدِينَ ﴿٣٩﴾ فَسَجَدَ الْمَلِكَةُ كُلُّهُمْ أٰجْمَعُونَ ﴿٤٠﴾ إِلَّا إِبْلِيسَ ۖ أَبَىٰ أَنْ يَكُونَ مَعَ السَّٰجِدِينَ ﴿٤١﴾

’اور جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں پیدا کرنے والا ہوں ایک انسان کو گندھی ہوئی کھٹکھڑ مٹی سے۔ تو جب میں اسے ٹھیک کر لوں اور اس میں اپنی خاص روح پھونک دوں تو گر جانا اس کے لیے سجدہ میں۔ تو فرشتوں میں سے سب نے سجدہ کیا۔ سوا ابلیس کے اس نے اس بات سے کہ وہ سجدہ کرنے والوں کا ساتھ دے، انکار کیا۔‘

فرشتوں کو سجدہ آدم کا حکم اور شیطان کی سرتابی

روح کی نسبت اللہ کی طرف کہ ’’اس میں اپنی روح خاص پھونک دوں‘‘ اس روح کے امتیاز خاص کا اظہار ہے کہ یہ روح صفات الہی کی حد امکان میں جلوہ ہے [۱] اور اسی کی بنا پر اسے امتیازی عظمت بھی حاصل ہے [۲]۔ باقی امور کہ یہ سجدہ کیسا تھا اور ملائکہ سے ابلیس کا استثناء کیا نوعیت رکھتا ہے؟ پہلے پارے میں اس واقعہ کے ذیل میں بیان ہو چکا ہے۔ اب دوبارہ یہاں ان کے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

قَالَ يَا إِبْلِيسُ مَا لَكَ أَلَّا تَكُونَ مَعَ السَّٰجِدِينَ ﴿٣٩﴾ قَالَ لَمَّا كُنْتُ لَّا سَجْدًا لِلْبَشَرِ خَلَقْتَهُ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ﴿٤٠﴾ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ﴿٤١﴾ وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ ﴿٤٢﴾ قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمٍ يُبْعَثُونَ ﴿٤٣﴾ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ ﴿٤٤﴾ إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ﴿٤٥﴾

’’ارشاد ہوا اے ابلیس! تجھے کیا ہے کہ تو سجدہ کرنے والوں کے ساتھ نہ ہوا؟۔ اس نے کہا میں سجدہ کرنے کا نہیں ایک آدمی کو جسے تو نے کھٹکھڑ مٹی سے پیدا کیا ہے۔ ارشاد ہوا تو پھر تو اس میں سے نکل، تو اب راند دیا گیا ہے۔ اور یقیناً تجھ پر لعنت ہے روز قیامت تک۔ اس نے کہا اے میرے مالک! تو پھر مجھے تو ڈھیل دیدے اس دن تک کہ جب

[۱]۔ اپنی جان یعنی خاص جس میں نمونہ ہے اللہ کے صفات کا حکم اور تدبیر اور یا دحق کی اور لگاؤ اللہ سے (موضح القرآن)

[۲]۔ اضافہ روح آدمی اللہ کی نفسہ تکریمہ (تبیان)

لوگ قبروں سے اٹھیں گے۔ کہا تو ان میں سے ہے جنہیں ڈھیل دی گئی ہے۔ مقررہ وقت والے دن تک۔“
اس کے اس سوال پر کہ اسے قیامت تک کی مہلت دی جائے جو قدرت کا جواب ہے اس کے معنی میں اختلاف ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ جو اس نے التجا کی تھی، وہ قبول کی گئی اور یوم الوقت المعلوم سے قیامت ہی مراد ہے۔ اس صورت میں جواب قدرت گویا یہ ہے کہ اچھا جائے اس دن تک مہلت دی گئی۔

دوسرا خیال یہ ہے کہ اس کی التجا بجنسہ قبول نہیں ہوئی۔ اس نے قیامت تک باقی رہنے کے لیے کہا تھا مگر خالق نے وقت معلوم والے دن ہی تک باقی رکھنے کا اقرار کیا تھا اس سے وہ دن مراد ہے جس کے بعد عام بندوں پر تکالیف شرعیہ کا دور ختم ہو جاتا ہے یعنی جب پہلا دور حیات آخری نسل انسانی کا ختم ہو جائے گا اور اب ہدایت پانے اور گمراہ ہونے کا سوال نہیں رہے گا تو اس کے بعد ابلیس کو بھی موت آجائے گی، پھر جس طرح سب پاداش عمل کے لیے دوبارہ زندہ ہوں گے، اسی طرح ابلیس بھی، اس طرح خالق کا جواب گویا اس کے معروضہ پر یہ ہے کہ نہیں۔ تجھے بس یوم وقت معلوم تک کی مہلت دی جاتی ہے [۱]۔

قَالَ رَبِّ مِمَّا اغْوَيْتَنِي لِأَظُنُّنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَا غُورِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۳۹﴾ إِلَّا
عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ﴿۴۰﴾ قَالَ هَذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ ﴿۴۱﴾ إِنَّ عِبَادِي
لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَنٌ إِلَّا مَنْ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ ﴿۴۲﴾ وَإِنَّ جَهَنَّمَ

لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۴۳﴾ لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُومٌ ﴿۴۴﴾
”اس نے کہا اے میرے مالک! اب جب تو نے مجھے گمراہ قرار دے دیا تو میں بھی ضرور ان لوگوں کے لیے روئے زمین میں گناہوں کو آراستہ بنا کر پیش کروں گا اور ان سب کو گمراہ کروں گا۔ سو ان میں سے تیرے خالص قرار دیے ہوئے بندوں کے۔ ارشاد ہوا کہ یہ سیدھا راستہ ہے مجھ پر لازم و ضروری۔ یقیناً میرے خاص بندے تجھے ان پر کوئی قابو نہ ہو گا سوا گمراہوں کے جو تیری پیروی کریں اور یقیناً دوزخ وہ جگہ ہے جس کا ان سب سے وعدہ ہے۔ اس کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازہ کے لیے ان میں سے ایک حصہ مقرر ہے۔“

قیامت تک سلسلہ معصومین علیہم السلام کی بقاء کی ضمانت

بمّا اغویتینی کے ترجمہ میں باختلاف عقائد فرق ہے ہم جو عدل کے قائل ہیں اور غلط کاموں کا انتساب خالق کی طرف اس کی شان جلال و کمال کے منافی سمجھتے ہیں، اس طرح کے ترجمہ پر مجبور ہیں جو میں نے کیا ہے کہ ’جب تو نے مجھے گمراہ قرار دے دیا‘ یا اسی طرح کا مفہوم جس

[۱]. الذی هو آخر ایام التکلیف (تبیان)

سے خالق کا سبب گمراہی ہونا ظاہر نہ ہو [۱] مگر دوسرے جو عدل کے قائل نہیں ہیں اور قبائح و شرور کی نسبت خدا کی طرف درست سمجھتی ہیں، وہ بے جھجک اس کا ترجمہ یوں کر دیتے ہیں کہ ”تو نے مجھے گمراہ کیا۔“ [۲]

بے شک ایک پہلو اس ترجمہ کی صحت کا یہ ہو سکتا ہے کہ یہ تو ابلیس کا قول ہے ہو سکتا ہے کہ اس غلط عقیدہ کا بھی خالق سے شر کا صدور ہو سکتا ہے، آغاز ابلیس سے ہوا ہوا اور اس کا مطلب یہ ہو کہ تو نے مجھے گمراہ کیا تو اب میں تیزی مخلوق کو گمراہ کروں گا جیسا کہ موجودہ زمانہ کے ایک شاعر صاحب نے جو اپنے اشعار میں دہریت والحاد کے علمبردار رہے ہیں، اپنے ایک شعر میں یہ سوال اٹھایا ہے اور کہا ہے کہ:-

”شیطان کو گمراہ کیا ہے کس نے؟“

تو شاعر سے پہلے اس تصور کے ایجاد کا سہرا بھی خود ابلیس کے سر ہو تو کیا تعجب ہے؟!

اس پہلو کو بھی جناب شیخ طوسی نے تحریر فرمایا ہے۔ [۳]

اس صورت میں ”یما اغوتینی“ میں جو ’ب‘ ہے، جسے کسی نے قسم کا اور کسی نے سمیت کا قرار دیا ہے، اس کا ایک تیسرا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ وہ عوضیہ ہو یعنی اس عوض میں کہ تو نے مجھے گمراہ کیا، اب میں تیرے بندوں کو گمراہ کروں گا، ممکن ہے کسی وقت اس پہلو کو میری نظر میں اتنی قوت پہنچ جائے کہ میں ترجمہ آیت کا اس کے مطابق کروں۔

دوزخ کے سات دروازے

دوزخ کے لیے کہا جا رہا ہے کہ ”اس کے سات دروازے ہیں“ شاہ عبدالقادر کہتے ہیں کہ:-

”جیسے بہشت کے آٹھ دروازے ہیں نیک عمل والوں پر بانٹے ہوئے، ویسے ہی دوزخ کے سات دروازے ہیں بد عمل والوں پر بانٹے ہوئے، شاید بہشت کا ایک دروازہ زیادہ ہے کہ بعض لوگ اس کے تفضل سے جائیں گے بغیر عمل، باقی عمل میں دروازے برابر ہیں“ (موضح القرآن)

”شاید“ کے ساتھ بلا ثبوت اگر تو جہہ کا دروازہ کھولا جائے تو شاید زیادہ قرین عقل اور مطابق حقائق دینیہ یہ ہے کہ سات دروازے بہشت کے عام نیوکاروں کے لیے ہیں جو حساب و کتاب کے بعد مستحق بہشت قرار پائیں اور ایک دروازہ ان بلند مرتبہ نفوس کے لیے ہے جن کے یہاں حساب کتاب کا سوال پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ خود دوسروں کے لیے ”موازن اعمال“ کی حیثیت رکھتے ہیں کہ ان کی محبت و اطاعت معیار استحقاق جنت ہے۔“

دوزخ کے ساتھ دروازوں کے متعلق ایک تصور یہ ہے کہ ان کا تعلق سات طباقوں سے ہو سکتا ہے جو کہ شدت عذاب میں ایک دوسرے

[۱] یما اغوتینی ای فیما خیتتینی من رحمتک لانّ الغی الخیة وقال قوم معناہ بما نسبتنی الی الغی و حکمت علی بالغی وقال البلخی معناہ فیما کلقتنی السجود لادم الذی غویت عنده کہا قال فزاد تہم رجسا الی رجسہم المازداد و اعندھا (تبیان)

[۲] ای باغرائک لی والباء للقسمة (جلالین) بسبب آن کہ گمراہ کردی مرا (شاہ ولی اللہ) بسبب اس کے گمراہ کیا تو نے (شاہ رفیع الدین)

[۳] علی ان هذا اقول ابلیس و یجوز ان یکون اعتقد ان الله خلق فیہ الغوایة فکفر بذلک كما کفر بالامتناع عن السجود (تبیان)

سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اس روایت کی نسبت امیر المومنین کی طرف بھی ہے۔^[1]

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۖ أَدْخُلُوهَا بِسَلَامٍ آمِينَ ﴿٣٦﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غَلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ﴿٣٧﴾ لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِينَ ﴿٣٨﴾

بلاشبہ پرہیزگار لوگ بہشتوں اور چشموں کے اندر ہیں، داخل ہوں گے ان میں سلامتی کے ساتھ امن و اطمینان رکھتے ہوئے۔ اور ہم نے دور کر دیا اسے جو ان کے سینوں میں کینہ تھا۔ اب وہ آپس کے بھائی بھائی ہیں، تختوں پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے۔ نہ ان کو چھو جائے گی ان میں کوئی زحمت اور نہ وہ ان سے نکالے جانے والے ہیں۔

اہل بہشت کے دلوں سے کینہ و عداوت کا دور ہونا

اس سے کہ ”ہم نے دور کر دیا اسے جو ان کے سینوں میں کینہ تھا، اب وہ آپس کے بھائی ہیں“ اہل سنت نے اپنے اس تصور میں سہارا لیا ہے کہ بعد رسول صحابہ میں جو آپس میں اختلافات ہوئے، ان میں دونوں فریق آخرت میں رنگارنگ ہوں گے چنانچہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:-
”یعنی دنیا میں جو کچھ آپس میں خفگی تھی، جی صاف ہو گئے، اس لیے معلوم ہوا کہ کبھی دو آدمیوں میں خفگی ہوئی ہے اور دونوں بہشتی ہیں جیسے حضرت کے اصحاب“ (موضح القرآن)

”لیکن غور کیجئے تو یہ خفگی اور باہمی ناراضگی جس کا ذکر یہاں ہے، وہ باہمی خفگی ہو سکتی ہے جس کا دینی نظریات سے کوئی تعلق نہ ہو لیکن جہاں اختلاف حق و باطل کا ہو، یا ایسے افراد سے اس خفگی کا تعلق ہو جن کے رضا و غضب کو معیار نجات و ہلاکت قرار دیا گیا ہو، کسی کے لیے رسول کا ارشاد ہو:

حُبُّكَ إِيمَانٌ وَبُغْضُكَ كُفْرٌ وَنِفَاقٌ
(یعنی) تمہاری محبت ایمان ہے اور تم سے عداوت کفر و نفاق ہے۔

اور

حَرْبُكَ حَرْبِيٌّ وَبِسَلْمِكَ بَسْلَمِيٌّ
تم سے برسر جنگ ہونا مجھ سے برسر جنگ ہونا اور تم سے مصالحت رکھنا مجھ سے میل رکھنا ہے۔
اور کسی کے لیے پیغمبر کا ارشاد ہو:

مَنْ آذَاهَا فَقَدْ آذَانِي وَمَنْ أَعْضَبَهَا فَقَدْ أَعْضَبَنِي

[1]. قال علي بن أبي طالب: وقتلوا ابن جريج: اطباق بعضها فوق بعض (تبيان)

”جس نے اسے اذیت پہنچائی اس نے مجھے اذیت پہنچائی اور جس نے اسے غضبناک کیا، اس نے مجھے غضبناک کیا۔“
تو ایسے افراد سے مخالفت و کینہ پروری بلکہ جنگ اور ظلم و تعدی اس حکم قرآنی میں کیوں کر داخل ہو سکتی ہے؟!

نَبِيِّ عِبَادِي أَنِّي أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿٥٩﴾ وَأَنَّ عَذَابِي هُوَ الْعَذَابُ الْأَلِيمُ ﴿٥٥﴾
”میرے بندوں کو اطلاع دے دو کہ میں بڑا بخشنے والا، مہربان ہوں۔ اور یہ بھی کہ میرا عذاب بڑا تکلیف دہ عذاب ہے۔“

”امید و بیم“ کا اجتماع ہی ایمان کا جوہر ہے اور اس اعلان کے دونوں جزاں کی تکمیل ہیں [۱]۔

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ ابْرَاهِيمَ ﴿٥١﴾ إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَامًا ؕ قَالَ إِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُونَ ﴿٥٢﴾ قَالُوا لَا تَوْجَلْ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ ﴿٥٣﴾ قَالَ أَبَشِّرْهُمُونِي عَلَىٰ أَنْ مَسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَا تَبَشِّرُونَ ﴿٥٤﴾ قَالُوا بَشِّرْ نَكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُن مِّنَ الْقٰنِطِينَ ﴿٥٥﴾ قَالَ وَمَنْ يَقْنَطُ مِن رَّحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ ﴿٥٦﴾ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ﴿٥٧﴾ قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمٍ مُّجْرِمِينَ ﴿٥٨﴾ إِلَّا آلَ لُوطٍ ؕ إِنَّا لَمَنجُوهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٥٩﴾ إِلَّا امْرَأَتَهُ قَدَّرْنَا لِإِمَّتِهَا لَيْسَ الْغَابِرِينَ ﴿٦٠﴾

”اور ان لوگوں سے بیان کیجئے واقعہ ابراہیم کے مہمانوں کا۔ جب کہ وہ ان کے پاس داخل ہوئے اور سلام کیا، انہوں نے کہا، ہمیں تو تم سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ڈریئے نہیں۔ ہم آپ کو ایک بڑے صاحب علم بچہ کی خوش خبری دیتے ہیں۔ کہا کیا تم مجھے اس کی خوش خبری دیتے ہو اس عالم میں کہ کہ سنی مجھ پر چھا چکی ہے تو یہ کیا خوش خبری ہے جو تم مجھے دیتے ہو؟۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے آپ کو سچائی کے ساتھ خوش خبری دی ہے تو نہ ہو جائیے نا امید ہونے والوں میں۔ انہوں نے کہا اور اپنے پروردگار کی رحمت سے نا امید کون ہوگا سوا گمراہ لوگوں کے۔ کہا اچھا تمہاری اصل ہم کیا ہے؟ اے بھیج جانے والو۔ انہوں نے کہا ہم بھیجے گئے ہیں ایک گنہگار جماعت کی طرف۔ سوا لوط کے گھر والوں کے، بلاشبہ ہم ان سب کو چھٹکارا دیں گے۔ سوا ان کی بیوی کے، ہم نے طے کر لیا ہے کہ وہ ان کے ساتھ سے چھوٹ جانے والوں میں سے ہوگی [۲]۔“

فرشتوں کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہاں آنا اور ولادت اسحق علیہ السلام کی بشارت

[۱]. فلا تَعْوَلُوا عَلَىٰ مِحْضِ غَفْرَانِي وَخَافُوا عِقَابِي وَكُونُوا عَلَىٰ حَذَرٍ بِاجْتِنَابِ وَمَعَاصِي وَالْعَمَلِ بِطَاعَتِي (تبیان)

[۲]. الباقين في العذاب لكفرها (جلالین)

”حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ڈر کیوں محسوس ہوا؟ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:-

”ظاہراً“ کچھ سبب نہ تھا ڈر کا، پر ان کے ساتھ جو حکم تھا عذاب، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل پر اس کا اثر پڑا، دل کی صفائی سے یہ ہوتا ہے“ (موضح القرآن)

جلالین نے ایک دوسرے مقام پر جو قرآن میں تذکرہ ہے، اس سے اسے مرتبط کیا ہے جو بعید نہیں ہے کہ صاحب سلامت کے بعد جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے غذا پیش کی اور انہوں نے ہاتھ نہیں بڑھایا، تب انہوں نے یہ کہا کہ ہمیں تو تم سے خوف محسوس ہوتا ہے۔^[1] پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ضعف پیری کی بنا پر تعجب، اس پر شاہ صاحب لکھتے ہیں:-

”معلوم ہوا کہ کامل بھی ظاہر اسباب پر بولتے ہیں۔“ (موضح القرآن)

یہ جملہ حقیقت کے لحاظ سے صحیح بلکہ ناقابل انکار ہے۔

فَلَمَّا جَاءَ آلَ لُوطٍ الْمُرْسَلُونَ ﴿١١﴾ قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُونَ ﴿١٢﴾ قَالُوا بَلْ جُنُنُكَ بِمَا كَانُوا فِيهِ يَمْتَرُونَ ﴿١٣﴾ وَآتَيْنَكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ﴿١٤﴾ فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِنَ اللَّيْلِ وَاتَّبِعْ أَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ وَامْضُ حَيْثُ تُؤْمَرُونَ ﴿١٥﴾ وَقَضَيْنَا إِلَيْهِ ذَلِكَ الْأَمْرَ أَنَّ دَابِرَهُ هُوَ لَا مَقْطُوعٌ مُّصْبِحِينَ ﴿١٦﴾

”تو جب وہ بھیجے ہوئے (فرشتے) لوط علیہ السلام کے پاس آئے۔ تو انہوں نے کہا کہ تم لوگ تو اجنبی معلوم ہوتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ بلکہ ہم آئے ہیں اس (عذاب) کو لے کر جس میں یہ لوگ شک کرتے تھے۔ اور آپ کے پاس ہم حق کے ساتھ آئے ہیں اور بلاشبہ ہم سچے ہیں تو نکل جائیے گا آپ اپنے گھر والوں کو لے کر رات کے ایک حصہ میں اور آپ ان کے پیچھے چلے گا اور آپ میں سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے اور چلے جائیے گا جہاں آپ کو حکم ہوگا۔ اور ہم نے انہیں اس فیصلہ کی اطلاع دے دی کہ صبح ہوتے ہوتے ان لوگوں کی اصل نسل ختم ہو جائے گی۔“

قوم لوط علیہ السلام پر عذاب کے لئے انہی فرشتوں کا جانا

”کوئی مڑ کر پیچھے نہ دیکھے“..... قرآن مجید میں دوسری جگہ ہے کہ زوج لوط علیہ السلام نے اس حکم کی خلاف ورزی کی جس کے بعد وہ بھی عذاب الہی میں گرفتار ہوئی۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:- ”عورت دل سے منافقت تھی لیکن حق تعالیٰ بغیر تقصیر ظاہر کے عذاب نہیں کرتا، ایک حکم ایسا بھیجا کہ اس سے نہ ہوسکا، وہ یہ کہ پیٹھ پھیر کر نہ دیکھو، پھر اس گناہ پر عذاب میں پکڑا۔“ (موضح القرآن) ”مڑ کر پیچھے دیکھنے کا“ ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ کوئی دل چسپی اور لگاؤ اس قوم سے ثابت نہ ہو۔ اگر انسان کو ان سے تعلق خاطر ہو تو ان کے انجام کے متعلق فکر لگی رہے گی کہ ان پر کیا گزری یا ان کے مفارقت شاق ہوگی تو فطری طور سے مڑ کر دیکھے گا حسرت سے کہ اب ان سے جدائی ہو رہی ہے لیکن نہ ان کی کوئی فکر ہے، نہ ان سے کوئی وابستگی تو

[1]. قال ابراہیم لما عرض علیہم الاکل فلم یأکل (جلالین)

مڑ کر دیکھنے کی کوئی وجہ نہیں۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ ”پیچھے مڑ کر نہ دیکھے“ کوئی مستقل حکم نہیں ہے بلکہ یہ حکم الہی پر بلا تامل روانہ ہونے اور سفر کے جاری رکھنے کی تاکید کی تعبیر ہے جیسے محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ ادھر ادھر نہ دیکھو، بس آگے بڑھتے رہو۔^[۱]

وَجَاءَ أَهْلَ الْمَدِينَةِ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿۱۶﴾ قَالَ إِنَّ هَؤُلَاءِ ضَيْغِي فَلَا تَفْضَحُونِ ﴿۱۷﴾
وَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُخْزُونِ ﴿۱۸﴾ قَالُوا أَوْلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعَالَمِينَ ﴿۱۹﴾ قَالَ هَؤُلَاءِ بَنَاتِي
إِنْ كُنْتُمْ فَعَالِينَ ﴿۲۰﴾ لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿۲۱﴾ فَأَخَذْتَهُمْ
الصَّبِيحَةَ مُشْرِقِينَ ﴿۲۲﴾ فَجَعَلْنَا عَلَيْهِمَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ
سِجِّيلٍ ﴿۲۳﴾ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِينَ ﴿۲۴﴾ وَإِنَّهَا لِسَبِيلٍ مُّقِيمٍ ﴿۲۵﴾ إِنَّ فِي
ذَلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿۲۶﴾

’اور آئے اس شہر والے خوش ہوتے ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ میرے مہمان ہیں تو مجھے رسوا نہ کرو۔ اور اللہ سے ڈرو اور مجھے ذلیل نہ کرو۔ ان لوگوں نے کہا کیا ہم نے تم کو تمام دنیا (کے لوگوں کو مہمان کرنے) سے منع نہیں کیا تھا؟۔ کہا یہ میری لڑکیاں موجود ہیں اگر تم کچھ کرنے والے ہو۔ قسم آپ کی جان کی وہ اپنے نشہ میں اندھا دھند بنتلا ہیں۔ تو انہیں سورج نکلنے نکلنے ایک دھماکے نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ تو ہم نے اس کو تہہ و بالا کر دیا اور برسائے ان پر کنگروں کی قسم کے پتھر۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں غور سے دیکھنے والوں کے لیے۔ اور وہ ایک راستے پر ہے جو اب تک برقرار ہے۔ بلاشبہ اس میں نشانی ہے ایمان والوں کے لیے‘۔

درمیان میں جو یہ فقرہ ہے کہ قسم آپ کی جان کی، وہ اپنے نشہ میں اندھا دھند بنتلا ہیں۔‘ یہ اسی قوم لوط سے متعلق ہے اور ہمارے رسولؐ سے خطاب کر کے^[۲] انہی کے حال پر تبصرہ کیا گیا ہے جیسا کہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ”اللہ تعالیٰ حضرت کو فرماتا ہے قسم تیری جان کی، وہ قوم لوط اپنی مستی میں ان کی بات نہیں سنتے“ (موضح القرآن) یا یہ درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر خود خاتم الانبیاء ﷺ کے دور کے مشرکین کی حالت کا بیان ہے جیسا کہ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں: ”اس کلمہ در وسط قصہ حضرت لوطؑ یا کردہ شدتاً معیہہ باشد بر تطبیق حال مشرکین مکہ بر حال قوم لوط و امثال ایشان“ (فتح الرحمن) بہر صورت پیغمبرؐ سے خطاب کر کے یہ لفظ لعمرک قسم آپ کی جان کی، وہ مخصوص انداز خطاب ہے جو ہمارے رسولؐ کے سوا کسی پیغمبر کو حاصل نہیں، اور وہ آپ کی شان حبیب اللہ ہی کا ترجمان ہے۔^[۳]

وَإِنْ كَانَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ لَظَالِمِينَ ﴿۲۷﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۖ وَإِنَّهُمَا لَبِإِمَامٍ

[۱]. كما يقول القائل امض لسانك ولا تعرج على شئ (تبیان)

[۲]. خطاب للنبي ﷺ ای و حیاتک (جلالین)

[۳]. فهذه فضيلة لرسول الله ﷺ على الانبياء (علی بن ابراہیم)

مَبِينٌ ﴿٩١﴾

’اور بے شک ایکہ والے ظالم لوگ تھے۔ تو ہم نے ان سے بدلہ لیا اور یہ دونوں شاہراہ عام پر ہیں جو نمایاں ہے۔‘

اصحاب ایکہ کا معذب ہونا

’دونوں‘ یعنی قوم لوط اور اصحاب ایکہ کے شہر گزرگاہ عام پر ہیں جس طرف سے برابر مشرکین، مکہ سے شام جانے میں گزرتے رہتے ہیں تو یہ ان سے عبرت کیوں حاصل نہیں کرتے۔ [۱] اصحاب ایکہ کون تھے؟ اس کے متعلق شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ’ایکہ کے رہنے والے یعنی قوم شعیب مدین میں رہتے تھے اور پاس اس شہر کے درختوں کا بن تھا، وہاں بھی رہتے تھے‘ (موضح القرآن)

یہ جلالین سے ماخوذ ہے: الايكة هي غبضة شجرة بقرب مدین وهم قوم شعيب۔ ہماری قدیم تفسیر بھی اس سے متفق ہے۔ [۲] ایک خیال یہ ہے کہ جناب شعیب دو گروہوں کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ ایک اہل مدین وہ صحیحہ آسمانی سے ہلاک ہوئے اور دوسرے اہل ایکہ، یہ آتشیں بگولے میں گرفتار ہوئے۔ [۳]

وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحَجْرِ الْمُرْسَلِينَ ﴿٩١﴾ وَاتَّيْنَهُمُ آيَاتُنَا فَأَكَاثُوا عَنْهَا
مُعْرِضِينَ ﴿٩٢﴾ وَكَانُوا يَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا آمِنِينَ ﴿٩٣﴾ فَأَخَذْتَهُمُ الصَّيْحَةُ
مُصْبِحِينَ ﴿٩٤﴾ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٩٥﴾

’اور حجر والوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔ اور ہم نے انہیں اپنی نشانیاں عطا کیں تو وہ ان سے روگردانی کرنے والے ثابت ہوئے۔ اور وہ پہاڑوں کو تراش کر اطمینان کے ساتھ گھر بناتے تھے۔ تو ان کو صبح ہوتے ہوتے ایک دھماکے نے گرفت میں لے لیا۔ تو انہیں فائدہ دیا ان کو اس نے جو وہ حاصل کرتے تھے۔‘

اصحاب حجر کا تذکرہ

’حجر‘ والوں سے قوم ثمود مراد ہے حجر اس جگہ کا نام ہے جہاں وہ آباد تھے۔ [۴] دوسرے مقامات پر قوم ثمود کی جانب سے جناب صالح علیہ السلام کے مبعوث ہونے کا ذکر ہے مگر یہاں کہا جا رہا ہے کہ ’پیغمبروں کو جھٹلایا‘ ممکن ہے کہ ان کے پاس برابر پیغمبر آتے رہے ہوں جن کی وہ تکذیب کرتے رہے اور آخری پیغمبر جن کی تکذیب کے بعد عذاب نازل ہوا، جناب صالح علیہ السلام ہوں اور ممکن ہے جناب صالح علیہ السلام ہی کی جو

[۱] انہما ای قوم لوط و الايكة لبا مام طریق مبین و اضع افلا یعبتر بہم اهل مكة (جلالین)

[۲] اصحاب الغیطة وهم قوم شعیب (علی بن ابراہیم)

[۳] ارسل الی اهل مدین فاهلکوا بالصیحة و اصحاب الايكة فاهلکوا بالظلة التي احترقوا بنارها (تبیان)

[۴] الحجر و ادیین المدینة و الشام و هم ثمود (جلالین)

تکذیب انہوں نے کی اسے ”پیغمبروں کی تکذیب کہا گیا اس اعتبار سے کہ پیغام سب پیغمبروں کا ایک ہی ہے۔“^[۱] ”جو وہ حاصل کرتے تھے“ اس سے مراد مال و دولت بھی ہو سکتا ہے^[۲] اور سیاہ کاریاں اور ہوس رانیاں بھی جو وہ اختیار کیے ہوئے تھے۔^[۳]

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ السَّاعَةَ لَأْتِيَةٌ

فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ ۝۸۵ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلْقُ الْعَلِيمُ ۝۸۶

”اور ہم نے نہیں پیدا کیا آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان کی چیزوں کو مگر بالکل درست اور یقیناً قیامت آنے والی ہے تو آپ اچھے عنوان سے درگزر کرتے رہیے۔ یقیناً آپ کا پروردگار پیدا کرنے والا ہے، بڑا جاننے والا۔“

وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ ۝۸۷

”اور بلاشبہ ہم نے آپ کو عطا کی ہیں سات دہرائی جانے والی آیات اور عظیم قرآن۔“

سبعہ مثانی اور قرآن

”سبع مثانی“ کی تفسیر میں اختلاف ہے مگر جس قول کی تائید میں حدیث رسولؐ بھی وارد ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ ”سات دہرائی جانے والی آیات“ سے مراد سورہ حمد ہے۔^[۴] جس کی آیات کی تعداد سات ہے اور اس کا پڑھنا ہر ایک پر لازم ہے^[۵]۔ اس کا بلحاظ خصوصیت و اہمیت تمام قرآن سے پہلے امتیازی طور پر ذکر کیا گیا ہے بلکہ بعض علماء کا خیال ہے کہ اسی سورہ حمد کو ”قرآن عظیم“ بھی کہا گیا ہے، اس لیے کہ لفظ قرآن جس طرح کل کتاب کا نام ہے، اسی طرح ہر جز پر بھی صادق ہے۔^[۶] مگر زیادہ رجحان اسی کو ہے کہ قرآن عظیم سے سورہ حمد کے علاوہ پورا قرآن مراد ہے۔^[۷]

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ

جَنَاحَكَ لِمُؤْمِنِينَ ۝۸۸ وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ ۝۸۹

”نہ بڑھائیے اپنی آنکھوں کو ان چیزوں کی طرف جن سے ہم نے بہرہ مند کیا ہے ان میں سے مختلف طرح کے

[۱] بتکذیبہم صالحاً لآئہ تکذیب لباقی الرسل لا شترا کہم فی المجیی بالتوحید (جلالین)

[۲] ماکانو ایکسبون من نباء الحصون و جمع الاموال (جلالین)

[۳] ماکانو ایکسبون من الملاذ القبیحة (تبیان)

[۴] فاتحة الكتاب (علی بن ابراہیم) روی عن النبی ﷺ، قال: السبع المثانی امر القرآن (تبیان)

[۵] ہی سبع آیات بلا خلاف فی جملتها و اناسمیت مثانی لا نہاشئی فی صلوة و قراة (تبیان)

[۶] سات آیات مکرر کہا سورہ فاتحہ کو اور بڑا قرآن بھی اسی کو کہا۔ ہر سورہ قرآن ہے، یہ سب سے بڑا ہے، درجہ میں (موضح القرآن)

[۷] تقدیر ہو آتیناک القرآن العظیم سوی الحمد (تبیان)

لوگوں کو [۱] اور نہ ان پر رنج کیجئے اور جھک کر ملنے ایمان والوں سے۔ اور کہئے کہ میں تو کھلا ہوا عذاب سے ڈرانے والا ہوں۔“

كَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِينَ ﴿۹۰﴾ الَّذِينَ جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِينَ ﴿۹۱﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۹۲﴾ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۹۳﴾

”جس طرح ہم نے نازل کیا تقسیم کرنے والوں پر۔ جنہوں نے کتاب الہی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ تو قسم تمہارے پروردگار کی، ہم ان سے جواب طلب کریں گے۔ اس کے متعلق جو وہ کرتے تھے“ ”ہم نے نازل کیا“ یعنی عذاب۔

”تقسیم“ سے کیا مراد ہے؟ وہی جسے دوسری جگہ یوں کہا گیا ہے کہ ”نُوْمِنُ بِبَعْضٍ وَنُكْفِرُ بِبَعْضٍ“ کسی جز پر ایمان لاتے ہیں یا اس پر عمل کرتے ہیں اور کسی جز کا انکار کرتے ہیں یا اس پر عمل کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ [۱] اب چونکہ یہ اہل کتاب کا ذکر ہے، اس لیے کہا گیا ہے کہ یہاں قرآن سے مراد خود ان کی کتاب یعنی توریت ہے [۲] مگر توریت کی تعبیر کے لیے لفظ ”قرآن“ سے مجھے کوئی نظیر قرآن مجید میں معلوم نہیں ہے۔ دوسرے معنی تقسیم کے یہ کہے گئے ہیں کہ مشرکین نے مکہ معظمہ کے راستوں کو آپس میں تقسیم کر رکھا تھا کہ وہ وہاں گردش کر کے لوگو کو اسلام سے روکتے تھے، اب ”مقتسمین“ کا لفظ تو اس طرح کچھ بن جاتا ہے مگر یہ لوگ قرآن کے ٹکڑے ٹکڑے کس طرح کرتے تھے؟ یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ تیسرے معنی یہ کہے گئے ہیں کہ قرآن کے بارے میں وہ تقسیم ہو گئے ہیں، کوئی سحر کہتا ہے اور کوئی کہانت اور کوئی شعر۔

یہ دونوں قول بھی جلالین نے درج کیے ہیں۔ جناب شیخ الطائف نے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ اس قوم ثمود کے لوگ مراد ہیں جن کے متعلق قرآن مجید میں دوسری جگہ یہ ہے کہ انہوں نے آپس میں قسمیں کھا کر جناب صالح عليه السلام کی مخالفت اور ان کی جان لینے کا منصوبہ بنایا۔ [۳] اس میں بھی المقتسمین کے ساتھ دوسرا ٹکڑا چسپاں نہیں ہوتا مشکل یہ ہے کہ ان اقوال میں سے کوئی بھی قول کسی معصوم سے مروی نہیں ہے، اس لیے الفاظ آیت بجائے خود محکم ہوں تو ہمارے لیے از قسم تشابہات ہو گئے ہیں جن کے معنی کو وثوق کے ساتھ معین کرنے سے ہم قاصر ہیں۔

فَاَصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ﴿۹۴﴾

”تو ظاہر کیجئے آپ اسے جس پر آپ مامور ہیں اور مشرکین کا کوئی خیال نہ کیجئے“۔
یعنی اس کی پرواہ نہ کیجئے کہ اس اعلان کے بعد مشرکین کیا کیا کہیں گے اور کیا کریں گے۔

إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ ﴿۹۵﴾ الَّذِينَ يَجْعَلُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ ۖ فَسَوْفَ

[۱] اضا فامنہم (جلالین)

[۲] یعنی براہل کتاب کہ بر بعض آیات عمل ہی کر دندو بر بعض نہ (فتح الرحمن)

[۳] المقتسمین الیہود و النصرانی الذین جعلوا القرآن ای کتبہم المنزلة عضین اجزاء حیث آمنوا ببعض و کفرو ببعض (جلالین)

[۴] قال ابن زیدہم قوم صالح تقاسموا النبیتنہ و اہلہ (تبیان)

يَعْلَمُونَ ﴿٩٦﴾

”ہم نے آپ کی طرف سے نپٹ لیا ہے ان تمسخر کرنے والوں سے۔ جو اللہ کے ساتھ دوسرا خدا قرار دیتے ہیں تو ان کو بہت جلد انجام کا حال معلوم ہوگا۔“

”تفاسیر بتلاتی ہیں کہ یہ کچھ خاص مشرکین تھے [۱] جو طرح طرح کی بلاؤں میں گرفتار ہو کر ختم ہو گئے اور عذاب آخرت کے پہلے عقوبت میں گرفتار ہوئے۔ [۲] ”معلوم ہوگا“ یہ ان کے عمل کی اخروی پاداش پر تشبیہ ہے بلکہ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان کی سزا ان آفتوں سے جو اس دنیا میں ان پر پڑیں مل گئی۔ انہیں بلکہ آخرت کی سزا اس کے علاوہ ہے جس کا حال انہیں بعد میں معلوم ہوگا۔ [۳]

وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرَكَ بِمَا يَقُولُونَ ﴿٩٧﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِنَ

السَّاجِدِينَ ﴿٩٨﴾ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ ﴿٩٩﴾

”اور ہمیں معلوم ہے کہ آپ کو دل تنگی ہوتی ہے اس سے جو وہ باتیں کرتے ہیں۔ تو آپ اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہیے۔ اور سجدہ کرنے والوں میں سے رہیے۔ اور عبادت کیجئے اپنے پروردگار کی جب تک کہ موت والی یقینی ساعت سامنے آئے۔“

مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے فرائض عبودیت کو آخر نفس تک انجام دیتے رہیے، پھر خلق خدا کی پرواہ نہ کیجئے کہ وہ آپ کے لیے کیا کیا کہتی ہے۔ اسی کو سورہ کوثر میں یوں کہا گیا ہے کہ:-

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَأَنْحَرْ. إِنَّ شَأْنَكَ هُوَ الْأَكْبَرُ: آپ نمازیں پڑھتے رہیے اور قربانی کا فرض ادا کیجئے، جو آپ کا دشمن ہے، اسی کی نسل قطع ہوگی

موت کو یقین اسی لیے کہا گیا ہے کہ وہ بالکل یقینی چیز ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

جبہور علمائے امت اس کی یہی معنی سمجھتے اور کہتے ہیں۔ [۴]

[۱]. المستهزءون برسول الله خمسة (علی بن ابراہیم) خمسة نفر من قريش: الولدین المعیرة والعاص بن وائل و ابو صرعة والاولاد

سودین عبد الغوث والحرف بن عطيلة. (تبیان)

[۲]. اهلکنا کلًا منهم بأفة (جلالین)

[۳]. يعلمون وبال ذلك يوم القيمة (تبیان)

[۴]. معناحتی یأتیه الموت (تبیان) الیقین الموت (جلالین)

سُورَةُ النَّحْلِ

مکیہ ----- ۱۲۸ آیات ۱

چونکہ اس سورہ میں شہد کی مکھی کا خاص طور پر ذکر ہے، اس لیے اس کا یہ نام ہوا، اس کے علاوہ اس سورہ میں حسب ذیل مضامین ہیں:-

سورہ نحل کے خاص خاص مضامین:

۱..... مخلوقات الہی مختلف قسم کے حیوانات اور اجرام سماویہ وغیرہ کے ذکر کے ساتھ یہ اعلان کی نعمات الہیہ کے شمار سے تمام انسان مل کر بھی قاصر ہیں۔

۲..... یہ کہ انسان اپنے گناہوں کے ساتھ ان کے عذاب میں بھی شریک ہوگا جنہیں اس نے گمراہ کیا ہے۔

۳..... ملائکہ اور اہل بہشت کے الفاظ سلام۔

۴..... ہر قوم میں پیغمبروں کا بھیجا جانا اور سب کے پیغام کا متحد ہونا۔

۵..... آسمان وزمین کی ہر شے اللہ کے لیے سر بسجود۔

۶..... لڑکیوں کی ولادت پر لوگوں کا رنجیدہ ہونا اہل جاہلیت کا طریقہ

۷..... خود اختیاری اشتراکیت کی دعوت۔

۸..... ہر امت کا ایک گواہ اور رسول ان گواہوں کے گواہ۔

۹..... وہ آیت جو اچھائیوں اور برائیوں کے تمام اقسام پر ہمہ گیر حیثیت سے حاوی ہے۔

۱۰..... نیک اعمال دنیا اور آخرت کی بہتری کے ذمہ دار

۱۱..... تلاوت قرآن کے موقع پر اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ کہنے کا حکم۔

۱۲..... ضرورت کے موقع پر تفسیر کا صریح حکم۔

۱۳..... حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک عبادت گزار امت

۱۴..... اتباع ملت ابراہیم کا حکم

۱۵..... دعوت و تبلیغ کے لیے حکیمانہ انداز کی ہدایت

۱۶..... ضبط و تحمل اور رواداری سے کام لینے کی خصوصی تاکید وغیرہ وغیرہ

[۱] مائتہ و ثمان و عشرون آیتہ لیس فیہا خلاف (تبیان)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے۔

آتَىٰ أَمْرًا لِلَّهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوهُ ۗ سُبْحٰنَهُ وَتَعٰلٰی عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿١﴾

”اللہ کا حکم آ گیا ہے تو تم اس کے متعلق جلدی نہ کرو، پاک ہے وہ اور برتر ہے اس سے جو وہ شرک کرتے ہیں۔“

”اللہ کا حکم“ یعنی اسلام کے غلبہ اور اشاعت دین کے متعلق قدرت کا جو فیصلہ ہے، وہ اب ظہور پذیر ہو اسی چاہتا ہے۔^[۱]

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مشرکین عذاب الہی کا جو تقاضا کرتے تھے، انہیں یہ جواب دیا گیا ہے۔^[۲]

يُنزِّلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ أَنْ أَنْذِرُوا أَنَّهُ لَا

إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاتَّقُونِ ﴿٢﴾ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۗ تَعٰلٰی عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٣﴾

وہ فرشتوں کو اتارتا ہے اپنے حکم خاص کی روح کے ساتھ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے کہ متنبہ کرو کہ کوئی خدا نہیں سوا میرے تو تم میری ناراضگی سے اپنے بچاؤ کا سامان کرو۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا حق کے ساتھ۔ وہ بالاتر ہے اس سے کہ جو وہ لوگ شرک کرتے ہیں۔

بعد میں انبیاء کے جس پیغام کا ذکر ہے کہ ”کوئی خدا نہیں سوا میرے“ یہی وہ ہے جسے اپنے حکم خاص کی روح کہا گیا ہے۔^[۳]

خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ ﴿٤﴾

”اس نے انسان کو ایک قطرہ گندیدہ سے پیدا کیا، اب ایک دم وہ ہے کہ کھلا ہوا جھگڑا نظر آرہا ہے۔“

یعنی یہ انسان اگر اپنی اصلیت پر غور کرے تو تباہی کے محل سے کام نہ لے لے مگر وہ اپنی اصلیت کو بھول جاتا ہے اور خواہ مخواہ سینہ تانے

ہوئے فخر و مباہات پر نظر آتا ہے۔

یاد رہے کہ اپنی ابتداء خلقت پر نظر رکھتا تو دوسری دفعہ کی زندگی پر جو جزا و سزا کے لیے ہوگی بحث و انکار کے لیے آمادہ نہ ہوتا مگر اس قادر

مطلق نے جس طرح اسے پہلی دفعہ پیدا کیا، اسے یہ بھول جاتا ہے اور اس لیے آخرت میں دوبارہ زندہ کیے جانے کو ن کر بحث کرنے اور لڑنے پر

تیار ہو جاتا ہے۔^[۴]

وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا ۗ لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَمَنْفَعٌ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿٥﴾ وَلَكُمْ فِيهَا

[۱]. ائی بصیغۃ الماضی التحقیق وقوعہ ای قرب (جلالین)

[۲]. امر اللہ یراد بہ العذاب فی قول الحسن و ابن جریر و غیرہما (تبیان)

[۳]. فسر ذلك بقوله: ”ان اندروا“ و هو یدل من الروح (تبیان)

[۴]. خصیم شدید الخصومة... قائلان من یجی العظام و هی رمیم (جلالین)

بِحَالٍ حِينٍ تُرِيحُونَ وَحِينٍ تَسْرَحُونَ ۝۶ وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَىٰ بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُوا
بَلِيغِيهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنْفُسِ ۝ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝۷ وَالْحَيْلُ وَالْبِغَالُ
وَالْحَمِيرُ لِنَزْكِبُوهَا وَزِينَةٌ ۝ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝۸

”اور چوپائے اس نے پیدا کیے کہ تمہارے لیے ان میں جڑاول ہے اور دوسرے فائدے اور انہی سے تم غذا حاصل کرتے ہو۔ اور تمہارے لیے ان میں تزک و احتشام کا سامان ہے جبکہ شام کو واپس لاتے ہو اور جب چراگا ہوں کی طرف روانہ کرتے ہو۔ اور وہ تمہارے بوجھوں کو اٹھاتے ہیں شہر کی طرف جہاں تک تم پہنچ نہیں سکتے تھے مگر جانکاہ زحمت و مشقت کے ساتھ، بے شک تمہارا پروردگار بڑا شفیق ہے، بہت مہربان۔ اور گھوڑے، خچر اور گدھے تا کہ تم ان پر سوار ہو اور آرائش کے لیے اور پیدا کرے گا وہ چیزیں جنہیں تم ابھی جانتے بھی نہیں ہو۔“
غور کیا جائے تو اس وقت اور اس کے بعد بھی آئندہ جو جو تیز رفتار ذرائع نقل و حرکت ظہور میں آ رہے ہیں، سب قرآن کے اس مجمل اعلان بَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ”پیدا کرے گا وہ چیزیں جو تم ابھی جانتے نہیں۔“ کی تفصیل ہیں جو سامنے آتی رہتی ہیں۔

وَعَلَى اللَّهِ قَصْدُ السَّبِيلِ وَمِنْهَا جَائِرٌ ۝ وَلَوْ شَاءَ لَهَدَيْكُمْ الْجَمْعِ عَيْنٍ ۝۹
”اور اللہ پر ہے سیدھے راستے کا دکھانا اور بعض ان میں سے کج ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو سیدھے راستے پر لگا دیتا۔“

”اللہ پر ہے سیدھے راستے کا دکھانا“ یعنی اس حد تک رہ نمائی جو جبر کی حد تک نہ پہنچے اس کے ذمہ ہے۔ اس طرح یہ علی کا لفظ ذمہ داری کے اظہار کے لیے ہے اور اس سے مذہب امامیہ کا یہ مسئلہ علم کلام کا ظاہر ہوتا ہے کہ لطف اللہ پر واجب ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر قسم کا لطف ہر حال میں واجب ہے بلکہ لطف وہی جو تمام حجت کے لیے ضروری ہے۔ جیسا کہ تفسیر جلالین میں ہے:-

وعلی الله قصد السبيل ای بیان الطریق المستقیم
اللہ پر ہے سیدھا راستہ یعنی سیدھے راستے کا بیان کرنا۔

جناب ابن عباس کی تشریح اس کے مطابق ہے ^[۱] مگر شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادگان نے اس کے معنی یہ قرار دیے ہیں کہ ”اللہ تک پہنچتا ہے اور سیدھا راستہ۔“ ^[۲]

میرے خیال میں آیت کے بعد والے مضمون سے پہلے مفہوم کا تعلق زیادہ ہے۔ بعد میں جو ہے کہ ”اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو سیدھے

[۱]۔ قال ابن عباس علی الله قصد السبيل (تبیان)

[۲]۔ بر خدا می رسد راه میانہ (شہادہ ولی اللہ) اور او پر اللہ کے پہنچتی ہے سیدھی راہ (شاہ فیض الدین) یعنی اس کی قدرتیں دیکھ کر صاف معلوم ہوتی ہیں اس کی خوبیاں اور جس کی عقل سیدھی نہیں وہ بہکتا ہے۔ (موضح القرآن)

راستے پر لگا دیتا یعنی جبری طور پر [۱] مگر اس کی حکمت کاملہ جبر کی متقاضی نہیں ہے اس لیے کچھ لوگ اپنے سوء اختیار سے غلط راستے پر لگ جاتے ہیں۔

اب پوری آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ بحد تمام حجت سب کو سیدھا راستہ دکھائے، وہ اپنی ذمہ داری کو بہر حال پورا کرتا ہے مگر کچھ لوگ اس کی رہنمائی کا اثر قبول نہیں کرتے، وہ غلط راستے اختیار کر لیتے ہیں اور اگر اللہ جبر سے کام لیتا تو سب ہی منزل مقصد تک پہنچ جاتے پھر جائز کوئی نہ ہوتا مگر جبر سے کام لینا اس کے عدل و حکمت کے تقاضوں کے خلاف ہے۔

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لَكُمْ مِنْهُ شَرَابٌ وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُونَ ﴿۱۰﴾
يُنْبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُونَ وَالنَّخِيلَ وَالْأَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الشَّجَرِ ط
إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۱۱﴾

’وہ وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا تمہارے لیے اس میں سے پینے کا بھی ہوتا ہے اور اسی سے وہ پودے بھی ہوتے ہیں جن سے تم چراگاہ بناتے ہو۔ تمہارے لیے آگاتا ہے اس سے کھیتی اور زیتون اور کھجور کے درخت اور انگور اور طرح طرح کے پھلوں میں سے، یقیناً اس میں نشانی ہے ان کے لیے جو غور و فکر سے کام لیں۔‘

وَسَخَّرَ لَكُمْ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ط وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِ ۙ ط
إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۱۲﴾ وَمَا ذَرَأَ لَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ ط
إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ ﴿۱۳﴾

’اور تمہارے قبضے میں دیئے رات اور دن اور سورج اور چاند اور ستارے سب قبضے میں ہیں اس کے حکم سے، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیں۔ اور جو کچھ رنگ رنگ کی چیزیں پیدا کیں تمہارے لیے زمین میں یقیناً اس میں نشانی ہے ان کے لیے جو سبق لیں۔‘

اب دنیا اس پر غور کرے کہ رات اور دن، اور سورج وغیرہ اس کے قبضے میں کہا ہیں؟ اور اگر نہیں ہیں واقعتاً نہیں ہی تو سمجھنا چاہیے کہ ہم ابھی اس انسانی ترقی کے نقطہ پر نہیں ہیں جن کی نشان دہی قرآن کر رہا ہے اور اب اگر کچھ بلند ہستیاں ایسی سننے میں آئیں کہ رات اور دن اور سورج وغیرہ پر ان کا قبضہ تھا تو اس کے انکار پر تل نہ جائے بلکہ سمجھے کہ قرآنی آیت کی روشنی میں ایسی ہستیاں کا وجود ہر دور میں ممکن ہے بلکہ ہونا چاہیے جن کے قبضہ میں یہ سب چیزیں ہوں۔

وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حَبْلَةً

[۱] قال المحسن والبلخي لوشاء لهذا كمالا لاجاء لانه قادر على ذلك (تبيان)

تَلْبَسُونَهَا ۖ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاجِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلِعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿١٣﴾

”اور وہ وہی ہے جس نے قابو میں کیا ہے دریا کو کہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور نکالو اس میں سے زیور جنہیں تم پہنو اور دیکھو گے تم کشتیوں کو اس میں چلتے ہوئے اور اس لیے کہ تم لوگ اس کے فضل و کرم سے نفع کماؤ اور شاید تم شکر گزار ثابت ہو۔“

”تازہ گوشت“ یعنی مچھلی [۱] اور زیور یعنی موتی مونگا [۲] جو دریا سے برآمد ہوتے ہیں اور نفع کماؤ یعنی تجارت کرو جو منافع حاصل کرنے کا

ذریعہ ہے۔ [۳]

وَأَلْقَى فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ وَأَنْهَارًا وَسُبُلًا لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٤﴾ وَعَلَّمَتْ ط وَالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ ﴿١٦﴾

”اور اس نے زمین میں پہاڑ ڈال دیئے کہ وہ تمہیں لیے ہوئے ڈنوا ڈول نہ ہو [۴] اور نہریں اور سڑکیں شاید کہ تم راستا پاؤ۔ اور طرح طرح کے نشان اور ستاروں [۵] سے وہ لوگ راستا پاتے ہیں۔“

أَفَمَنْ يَخْلُقُ كَمَنْ لَا يَخْلُقُ ۖ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿١٥﴾

”کیا جو خالق ہو، وہ اس کے مثل ہے کہ جو خالق نہ ہو؟ کیوں تم نصیحت قبول نہیں کرتے۔“

اس میں بت پرستوں کے لیے انتباہ ہے کہ آخر ان بتوں کی پرستش کیوں کرتے ہو جو کسی چیز کے خلق کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ [۶] اس کا اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں کہ بندے اپنے افعال کے خالق ہوتے ہیں یا نہیں جو حیر و اختیار کے موضوع میں شیعہ سنی کا ایک مختلف

فیہ مسئلہ ہے۔

وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا ۗ إِنَّ اللَّهَ لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٨﴾

”اور اگر شمار کرنا چاہو اللہ کی نعمتوں کو تو تم ان کا احاطہ نہیں کر سکتے، یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔“

یعنی باوجود گناہوں کے بھی اس کی نعمت کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اس سے بڑھ کر بخشش و ترحم اور کیا ہوگا!؟

[۱]. فتصطادون منه انواع السمك فتناكلون لحمًا طريًا (تبیان)

[۲]. ما يخرج من البحر من انواع الجواهر (علی بن ابراہیم)

[۳]. تطلبوا من فضله تعالى بالتجارة (جلالین)

[۴]. ای لثلا تمید بکم الارض (تبیان)

[۵]. بالنجم بمعنی النجوم (جلالین) فاخذوا بالواحد عن الجميع كما قال: اذا الطفل الذین لحدیظہر و اعلی عورات النساء (تبیان)

[۶]. فی هذه الآية و علی عباد الاصلام و الاوثان (تبیان)

وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّونَ وَمَا تُعْلِنُونَ ﴿١٩﴾ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا
يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ ﴿٢٠﴾ أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ ۗ وَمَا يَشْعُرُونَ ۗ لَا آيَانَ
يُبْعَثُونَ ﴿٢١﴾

”اور اللہ جانتا ہے اسے جو تم چھپاتے ہو اور ظاہر کرتے ہو۔ اور جنہیں وہ پکارتے ہیں اللہ کو چھوڑ کر وہ کچھ بھی پیدا نہیں کرتے۔ وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں۔ وہ مردہ ہیں، زندہ نہیں ہیں اور انہیں خبر نہیں کہ وہ کب دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔“

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں :-

”شاید یہ ان کو فرمایا جو مرے بزرگوں کو پوجتے ہیں“ (موضح القرآن)

اس کے خلاف جلالین نے اسے صاف اصنام سے متعلق کیا ہے [۱] ہماری بھی قدیم تفسیر اسی سے متعلق ہے۔ [۲]

إِلَهُكُمْ إِلَهٌ وَاحِدٌ ۖ فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُمْ مُنْكَرَةٌ وَهُمْ
مُستَكْبِرُونَ ﴿٢٢﴾ لَا جَرَمَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۗ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ
المُستَكْبِرِينَ ﴿٢٣﴾

تمہارا خدا ایک خدا ہے تو وہ لوگ جو آخرت پر ایمان لائے ہوئے نہیں ہیں، ان کے دل انکار کرتے ہیں اور وہ تکبر سے کام لیتے ہیں۔ کوئی شبہ نہیں کہ اللہ جانتا ہے اسے کہ جو وہ چھپاتے ہیں اور (اسے بھی کہ) جو وہ ظاہر کرتے ہیں، یقیناً وہ دوست نہیں رکھتا تکبر کرنے والوں کو۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ مَّاذَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۗ قَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٢٤﴾ لِيَحْمِلُوا
أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ وَمَنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ أَلا
سَاءَ مَا يَزُرُونَ ﴿٢٥﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ کیا اتارا ہے تمہارے پروردگار نے؟ تو وہ کہتے ہیں کہ اگلے لوگوں کی بے بنیاد

[۱]. ما يشعرون ای الاصنام ایان یوم یبعثون ای اخلق فی کف یعبدون اذلا یكون لها الا الخالق الحی العالم بالبعث (جلالین)

[۲]. رد علی عبدة الاصنام (علی بن ابراہیم)

داستانیں ہیں^[۱]۔ جس کا انجام یہ ہے^[۲] کہ وہ اپنے بھی بوجھ پورے اٹھائیں گے قیامت کے دن اور کچھ ان کے بھی بوجھ جنہیں یہ بنا واقفیت میں گمراہ کرتے ہیں، آگاہ رہو کہ کتنا برا ہے وہ بوجھ جو وہ اٹھا رہے ہیں۔

اپنے گناہوں کے ساتھ ان کے گناہوں کا بوجھ جنہیں گمراہ کیا ہے

دوسروں کے بوجھ بھی ان کے سر پر ہیں، اس لیے کہ یہ ان کے لیے معاصی کے ارتکاب کا باعث رہے ہیں، اگرچہ وہ خود بھی اپنے ارادہ و اختیار سے ان کے کہنے میں آنے کی وجہ سے بحیثیت مرتکب گناہ کے ان بوجھوں سے آسودہ نہیں ہیں جیسا کہ حدیث رسول میں ہے:

ایماداع دعا الی الہدی فاتبع فله مثل اجورهم۔ من غیر ان ینقص من اجورهم شیئی وایماداع دعا الی الضلالة فان علیہ مثل اوزار من اتبعہ من غیر ان ینقص من اوزارهم شیئی (تبیان)
جو رہنما راہ راست کی طرف دعوت دے اور اس کی پیروی ہو تو اسے ان تمام لوگوں کے ثواب کے برابر ملے گا، بغیر اس کے کہ خود ان پیروؤں کے ثواب میں کچھ کمی ہو اور جو راستہ بتانے والا گمراہی کی دعوت دے، اس پر ان تمام لوگوں کے بوجھوں کے برابر بوجھ ہے جنہوں نے اس کی پیروی کی بغیر اس کے کہ ان پیروؤں کے بوجھ میں کچھ کمی ہو۔

قَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَأَتَى اللَّهُ بُنْيَانَهُمْ مِنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ

السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَأَتَاهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۳۶﴾

”جو ان کے پہلے تھے، انہوں نے بھی ایسی ہی ترکیبیں کی تھیں تو اللہ آیا ان کی عمارت پر بنیادوں کی طرف سے تو ان پر گر پڑی چھت ان کے اوپر سے اور آگیا ان پر عذاب اس صورت سے کہ انہیں خبر بھی نہ ہوئی۔“

بعض لوگوں نے بنیاد اور چھت وغیرہ کا نام دیکھ کر کہا ہے کہ یہ نمرود کا ذکر ہے جس نے بڑی عالیشان ایک عمارت بنوائی تھی کہ اس کی چھت پر چڑھ کر خدائے آسمانی سے جنگ کرے اور یہ اس عمارت کے گرنے کا ذکر ہے۔^[۳] مگر دوسرا خیال یہ ہے اور یہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمثیلی طور پر ان کے منصوبوں کے شکست کھانے کا ذکر ہے جو اس پیرا میں کہا گیا ہے۔^[۴]

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُخْزِيهِمْ وَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تُشَاقُّونَ

فِيهِمْ ۖ قَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ إِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوءَ عَلَى الْكٰفِرِينَ ﴿۳۷﴾

[۱]. اکاذیب الاولین (علی بن ابراہیم و جلالین)

[۲]. اللام لام العاقبة لا تم لم یقصدوا اما فعلوا لیتصلوا اوزارهم (تبیان)

[۳]. هو نمرود بنی صر حا طویلا لیصور منه الی السماء فیقاتل اهلها (جلالین)

[۴]. قال الزجاج و ابو بکر الانباری... و لهذا الذی ذکرہ یلیق بکلام العرب و یشبهہ (تبیان) این تمثیل است فساد مکر ایشاں را با

بلغ وجوه (فتح الرحمن)

الَّذِينَ تَتَوَفَّوهُمْ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ ۖ فَالْقُوا السَّلَامَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ
مِنْ سُوءٍ ۖ بَلَىٰ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٢٨﴾ فَادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ
خَالِدِينَ فِيهَا ۖ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ ﴿٢٩﴾

”پھر قیامت کے دن وہ انہیں رسوا کرے گا اور کہے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کے بارے میں تم لڑا کرتے تھے؟ کہا ان لوگوں نے کہ جنہیں علم عطا ہوا تھا کہ بلاشبہ رسوائی آج کے دن اور برائی ان کافروں پر ہے۔ جن کی قبض روح کریں گے فرشتے اس عالم میں کہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے تو انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے، ہم کوئی برائی نہیں کرتے تھے کیوں نہیں، یقیناً اللہ جانتا ہے اسے جو تم اعمال کرتے تھے۔ تو اب داخل ہو دو زخ کے دروازوں میں۔ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہتے ہوئے تو کیا برا ٹھکانا ہے وہ سرکشی کرنے والوں کا۔“

وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۖ قَالُوا خَيْرًا ۗ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ
الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۗ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ ۗ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ ﴿٣٠﴾ جَنَّاتٍ عَدْنٍ
يَدْخُلُونَهَا يُجْرَىٰ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ ۗ كَذَلِكَ يَجْزِي اللَّهُ
الْمُتَّقِينَ ﴿٣١﴾ الَّذِينَ تَتَوَفَّوهُمْ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ ۖ يَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ۗ
ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٣٢﴾

”اور کہا گیا ان سے جو سچے رہے تھے [۱] کہ کیا تھا وہ جو تمہارے پروردگار نے اتارا؟ انہوں نے کہا اچھا ہی اچھا، ان لوگوں کے لیے جنہوں نے اس دنیا میں اچھائی کی، اچھائی ہی ہے اور بے شک آخرت کا گھر بہتر ہے اور کیا کہنا پر ہیزگاروں کے گھر کا۔ ہمیشہ رہنے والے بہشت جن میں وہ داخل ہوں گے جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی، ان کے لیے ان میں وہ سب ہوگا جو وہ چاہتے ہوں۔ یقیناً اس طرح صلہ دیتے ہیں ہم پر ہیزگاروں کو۔ جن کی قبض روح کرتے ہیں فرشتے اس عالم میں کہ وہ پاک و پاکیزہ ہیں، کہتے ہیں سلام تم پر، داخل ہو بہشت میں ان اعمال کی بدولت جو تم کرتے تھے۔“

یعنی اہل ایمان کو جو جزا ملے گی، وہ صرف ایمان کی بنا پر نہیں، بلکہ ایمان کے ساتھ ان اعمال خیر کی وجہ سے جو وہ انجام دیتے تھے۔

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلَائِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ أَمْرٌ رَبِّكَ ۗ كَذَلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ

[۱]. اتقوا الشرك (جلالین)

مِنْ قَبْلِهِمْ ط وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٣٤﴾ فَأَصَابَهُمْ

سَيِّئَاتٌ مَا عَمِلُوا وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿٣٥﴾

”کیا وہ انتظار کرتے ہیں سوا اس کے کہ فرشتے ان کے پاس آئیں یا تمہارے پروردگار کا حکم آئے، ایسا ہی کیا تھا ان لوگوں نے کہ جو ان کے پہلے تھے اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا مگر خود انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا۔ تو پہنچیں ان کو برائیاں انہی اعمال کی جو انہوں نے کیے تھے اور نازل ہوا ان پر وہی (عذاب) جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔“

”جب تک حکم پروردگار آئے، اس حکم میں عذاب کا نازل ہونا بھی ہے اور موت کا ہنگام بھی اور امام آخر الزمان کا ظہور بھی۔^[۱]

وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ نَحْنُ وَلَا آبَاؤُنَا

وَلَا حَرَمْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ ط كَذَلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ فَهَلْ عَلَى

الرُّسُلِ إِلَّا الْبَلْغُ الْمُبِينُ ﴿٣٥﴾

”اور کہا ان لوگوں نے جو مشرک ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی کو معبود نہ بناتے، ہم اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام کرتے، ایسا ہی کیا ان لوگوں نے جو ان کے پہلے تھے تو پیغمبروں کا فرض کیا واضح طور پر تبلیغ کے سوا کچھ اور ہے۔“

مشرکین کا استدلال بظاہر تصور جبر پر مبنی ہے یعنی جب بغیر ارادہ باری تعالیٰ پتی نہیں ہلتی تو ہمارے شرک کی ذمہ داری بھی اسی پر ہے اور جو آپ ہم پر معترض ہیں کہ ہم نے احکام ایجاد کیے ہیں تو وہ بھی اللہ ہی کے ارادہ سے ہیں^[۲] پھر ہمیں اس کی سزا کیوں کر مل سکتی ہے؟ مگر شاہ ولی اللہ نے کچھ عجیب طرح اسے مسئلہ اجماع سے مرتبہ کیا ہے وہ فرماتے ہیں:-

یعنی سلف ما اجماع کردہ اندوآں بدو ن رضائے خدا منعقد نمی شود (فتح الرحمن)

یعنی ہمارے اسلاف نے اس پر اجماع کیا ہے اور وہ بغیر رضائے الہی نہیں ہوا کرتا۔

حالانکہ اگر آیت کا یہ مطلب ہو اور یہ آیت کے انداز سے بالکل ظاہر ہے کہ مشرکین کا یہ استدلال صحیح نہیں ہے غلط ہے تو اس سے اجماع کا اعلان ثابت ہوگا جس طرح مشرکین کا یہ استدلال باطل تھا، اور نہ ان کی بت پرستی اور بدعت آفرینی حق ہوتی، اسی طرح کبھی بھی کوئی جماعت صرف اجماع سلف کو اپنی دلیل قرار دے لے تو وہ استدلال باطل ہی ہوگا مگر واقعہ یہ ہے کہ اس آیت قرآن کے الفاظ سے یہ اجماع والا استدلال ظاہر نہیں ہوتا بلکہ وہی جبر والا تصور سمجھ میں آتا ہے اور چونکہ جبر کا تصور باطل ہے، اس لیے ان کا استدلال بھی غلط ہے۔ شاہ عبدالقادر نے جو تشریح کی ہے، اس سے ظاہر مطلب تو یہی نکلتا ہے کہ وہ اسے جبر سے متعلق سمجھتے ہیں مگر چونکہ مسئلہ جبر میں خود ان کا ذہن صاف نہیں ہے، اس لیے انہوں نے

[۱]. امر ربك من العذاب والموت وخروج القائم (علی بن ابراہیم)

[۲]. اراد الله ذلك مثلاً فلذلك فعلنا كما يقول المجيراة الضلال (تبیان)

مشرکین کی رد میں قرآن کے جواب کی جو تشریح کی ہے، اس سے تقریباً ان مشرکین کی تائیدی ہوگئی، رد نہیں ہوئی وہ فرماتے ہیں:-
 ”یہ نادانوں کے کلام ہیں کہ اللہ کو یہ کام برا لگتا تو کیوں کرنے دیتا مگر ہر فرقے کے نزدیک بعض کام برے ہیں۔ پھر وہ کیوں کرتے ہیں؟ یہاں جواب مجمل فرمایا کہ ہمیشہ رسول منع کرتے آئے ہیں اس سے، جس کی قسمت تھی ہدایت پائی، جو خراب ہونے والا تھا خراب ہوا۔ اللہ کو یہی منظور ہے۔“ (موضح القرآن)
 صحیح یہ ہے کہ انسان فاعل مختار ہے اور جبر سے کام لینا اس کی وجہ تخلیق اور اللہ کی حکمت کا مسئلہ کے خلاف ہے لہذا گمراہی اپنے ہاتھوں سے اور اسے قسمت سے وابستہ کرنا غلط ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنْ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ۗ فَمِنْهُمْ
 مَنْ هَدَى اللَّهُ وَمِنْهُمْ مَن حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ ۗ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا
 كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكذِبِينَ ﴿٣٦﴾

اور ہم نے ہر قوم میں ایک پیغمبر بھیجا کہ عبادت کرو اللہ کی اور داعیان باطل سے بچتے رہو تو ان میں سے کوئی وہ تھا جسے اللہ نے منزل تک پہنچا دیا اور کوئی وہ تھا جس کے گمراہی شامل حال رہی تو زمین پر چل پھر کر ذرا دیکھو کہ کیا انجام ہوا جھٹلانے والوں کا۔

ہر قوم میں پیغمبروں کا بھیجا جانا اور سب کے پیغام کا متحد ہونا

طاغوت کی تشریح جو شاہ عبدالقادر نے کی ہے، وہ یہ ہے:-

”ہر ڈنگا میں جو ناحق سرداری کا دعویٰ کرے، کچھ سند نہ رکھے، اسی کو طاغوت کہتے ہیں، بت اور شیطان اور زبردست ظالم سب یہی ہیں۔“ (موضح القرآن)

ہمارے مفسرین میں جناب شیخ الطائفہ نے یہ معنی لکھے ہیں:

اجتنبوا اغواء الشيطان بكل داع يدعو الى الفساد (تبیان)

بچنے کی کوشش کرو شیطان کی کوشش سے ہر ایسے دعوت دینے والے کے ذریعے سے جو خرابی کی دعوت دیتا ہے۔

إِنْ تَحْرِصْ عَلَىٰ هُدَاهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ يُضِلُّ ۗ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ﴿٣٧﴾

”اگر آپ ان کے صحیح راستے پر آنے کی بڑی آرزو رکھتے ہیں تو (کیا ہوتا ہے) یقیناً اللہ منزل تک نہیں پہنچاتا اسے جسے وہ گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور ان کے لیے کوئی مددگار نہیں ہیں۔“

یہ گمراہی میں اس کا چھوڑ دینا یعنی توفیقات کا سلب کر لینا نتیجہ ہوتا ہے ان کے سوء اختیار کا کہ وہ راہ راست پر آنا نہیں چاہتے تو اللہ نے بھی ان سے ہاتھ اٹھالیا، پھر آپ کی آرزو سے کیا نتیجہ نکلے گا۔

وَأَفْسُمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ ۗ لَا يَبْعَثُ اللَّهُ مَنْ يَمُوتُ ۖ بَلَىٰ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا
وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٨﴾ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي يُخْتَلِفُونَ فِيهِ وَيَعْلَمَ
الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ كَانُوا كَذِبِينَ ﴿٣٩﴾

”اور انہوں نے قسم کھائی اللہ کی انتہائی سخت قسمیں کہ اللہ دوبارہ زندہ نہیں کرے گا اسے کہ جو مر جائے، کیوں نہیں؟
یہ اس کے ذمہ وعدہ ہے سچا لیکن زیادہ تر لوگ جانتے نہیں۔ تاکہ ظاہر کرے ان پر وہ کہ جس میں وہ اختلاف رکھتے
تھے اور تاکہ جانیں وہ جو کافر ہیں کہ وہ جھوٹے تھے۔“

یعنی دنیا میں تو کوئی باز پرس نہیں، اکثر باطل پرست عیش و آرام کی زندگی گزار رہے ہیں، اس سے وہ دوسروں کو اس فریب میں مبتلا
کرتے ہیں کہ ہم حق پر ہیں۔ اگر حق پر نہ ہوتے تو ہمیں اللہ طاقت و اقتدار کیوں عطا کرتا؟ ہمیں اپنی نعمتوں سے نوازتا کیوں؟ ضرورت ہے کہ
ایک دوسرا دور حیات ہو جس میں جو جس قابل ہے، اس کا ویسا ہی انجام سامنے آئے، اس طرح حق کے حق ہونے اور باطل کے باطل ہونے میں کسی
اختلاف کی گنجائش نہ رہے اور کافروں کو بھی جو اپنے سچے ہونے کا زعم باطل ہے، وہ ختم ہو جائے، وہ جان لیں یعنی ماننے پر مجبور ہوں کہ وہ جھوٹے
تھے۔

إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَنْ نَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿٤٠﴾

”ہمارا کہنا ہوتا ہے بس کسی چیز کے لیے جب ہم اس کا ارادہ کریں یہ کہ ہم کہیں اسے ہو جا اور بس بلا توقف وہ ہو
جاتی ہے۔“

یہ مضمون تو متعدد مقامات پر قرآن مجید میں آیا ہے مگر اس جگہ اس کا مطلب بشرطیکہ وہ محل تنزیل میں اسی جگہ کی آیت ہو، یہ ہوگا کہ یہ
دوبارہ زندہ کیا جانا ہماری قدرت قاہرہ کے لیے کوئی مشکل بات نہیں ہے۔

وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظَلَمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ
وَلَا جُزْءَ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٤١﴾ الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ
يَتَوَكَّلُونَ ﴿٤٢﴾

”اور وہ جنہوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی، اس کے بعد کہ ان پر ظلم ہوئے، انہیں ہم دنیا میں بھی اچھی جگہ دیں
گے اور آخرت کا ثواب اس سے بھی بڑا ہوگا، کاش کہ وہ جانیں۔ انہیں جنہوں نے صبر کیا اور اپنے پروردگار پر
بھروسہ رکھتے تھے۔“

چونکہ یہ علمون پر وقف نہیں ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا اتصال بعد والے الفاظ کے ساتھ ہے لہذا محسوس ہوتا ہے کہ ”کاش کہ وہ
جانیں،“ کا تعلق ان کے ساتھ ہے جن کا ذکر بعد کو ہے کہ ”جنہوں نے صبر کیا اور اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے تھے۔“ انہیں جاننے کا مطلب یہ ہے

کہ ان کی منزل سمجھیں کہ انہیں آخرت میں کتنا بڑا اجر ملتا ہے تو پھر اس کردار کو اختیار کریں جو بہترین کردار ہے اور بہترین اجر کا ذمہ دار ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوْحِيْ اِلَيْهِمْ فَسَلُّوْا اَهْلَ الدِّيَارِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٣٣﴾ بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ ۗ وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٣٤﴾

’اور ہم نے نہیں بھیجا آپ کے پہلے مگر آدمیوں ہی کو جن کی جانب ہم وحی بھیجتے تو پوچھ لو یادداشت رکھنے والوں سے اگر تم نہیں جانتے۔ کھلی ہوئی دلیلوں اور کتابوں کے ساتھ اور آپ کی طرف ہم نے یہ یادداشت اتاری ہے تاکہ آپ بیان کریں لوگوں کے سامنے وہ جو ان کی جانب احکام اتارے گئے ہیں اور شاید وہ غور و فکر سے کام لیں‘۔

اہل ذکر سے سوال کا حکم

اہل الذکر کا ترجمہ ’یادداشت رکھنے والے‘ لغوی مفہوم کے لحاظ سے ہے لیکن مراد اس سے کون ہیں؟
جمہور مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد علمائے اہل کتاب ہیں چونکہ قرآن مجید میں ایک جگہ الذکر کے لفظ سے تورات مراد لی گئی

ہے:- وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزُّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرْثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (انبیاء ۱۰۵)
مگر اہل بیت معصومین کی تفسیر یہ ہے کہ الذکر سے مراد قرآن ہے جیسا کہ ذکر ہوا ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَخٰفِضُوْنَ (حجر ۹)

بلاشبہ ہم نے یہ ذکر اتارا ہے اور یقیناً ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اور ذکر رسولاً سے مراد قرآن کے حقیقی عالم یعنی اہل بیت طاہرین علیہم السلام ہیں^[۱] جب کہ خود ہمارے رسول کو اہل الذکر کہہ کر ذکر کا مصداق قرار دیا گیا ہے تو اس لحاظ سے بھی اہل الذکر آل رسول ہوئے۔

اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّئَاتِ اَنْ يَّخْسِفَ اللهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٣٥﴾ اَوْ يَأْخُذَهُمْ فِي تَقْلِيْبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿٣٦﴾ اَوْ يَأْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوْفٍ ۗ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿٣٧﴾

’تو کیا مطمئن ہیں وہ جنہوں نے بری بری ترکیبیں کیں اس سے کہ اللہ زمین کو ان کے ساتھ دھنسا دے یا ان پر عذاب آئے ایسی صورت میں جس کی انہیں خبر بھی نہ ہو۔ یا وہ انہیں گرفت میں لے لے ان کی نقل و حرکت کے عالم

[۱] روى جابر عن ابي جعفر عليه السلام انه قال: نحن اهل الذکر (على بن ابراهيم)

میں تو وہ اسے روک نہیں سکتے۔ یا ان کو گرفت میں لے لے خوف و دہشت کے عالم میں مگر حقیقت یہ ہے کہ تمہارا پروردگار تجھنے والا ہے بڑا مہربان۔

”نقل و حرکت کے عالم میں، یعنی جب وہ خرید و فروخت کے سلسلہ میں یا دوسرے کاموں کے لیے ادھر ادھر جاتے ہیں۔“^[1]

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ يَتَفَيَّؤُا ظِلَلُهُ عَنِ الْيَمِينِ وَالشَّمَائِلِ

سُجَّدًا لِلَّهِ وَهُمْ ذُخْرُونَ ﴿٥٨﴾

”کیا نہیں دیکھا انہوں نے کسی چیز کو جو اللہ نے پیدا کی ہے کہ اس کی پرچھائیاں پلٹتی ہیں دائیں اور بائیں سمتوں سے اللہ کو سجدہ کرتی ہوئی اور وہ تذل کے عالم میں ہیں۔“

”ہر چیز ٹھیک دوپہر میں کھڑی ہے، اس کا سایہ بھی کھڑا ہے، جب دن ڈھلا سایہ جھکا، پھر جھکتے جھکتے شام تک زمین پر پڑ گیا جیسے نماز میں کھڑے سے رکوع، رکوع سے سجدہ، اسی طرح ہر چیز آپ کھڑی ہے، اپنے سایہ سے نماز کرتی ہے، کسی ملک میں کسی موسم میں داہنی طرف جھکتا ہے کبھی بائیں طرف۔“ (موضح القرآن)

اس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے سایہ کی ظاہری شکل سے جو اس میں رکوع و سجود کی شکل پیدا ہوتی ہے، عوامی ذہن کو رکوع و سجود کی کیفیت کی طرف منتقل کیا ہے کہ پرچھائیوں میں تو یہ بات، اسباب طبعی کے تغیرات سے قہری طور پر ہوتی ہے، تم اسے ارادی طور پر اختیار کرو۔

وَاللَّهُ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا

يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٥٩﴾ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿٦٠﴾

”اور اللہ کے لیے سربسجود ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے چلنے پھرنے والی مخلوق اور فرشتے اور وہ سرکشی نہیں کرتے۔ وہ اپنے پروردگار سے جو ان کے اوپر ہے، ڈرتے ہیں اور وہ کرتے ہیں وہی کہ جس پر مامور ہوتے ہیں۔“

آسمان اور زمین کی ہر شے اللہ کے لئے سربسجود

ان آیات بیان کیا گیا ہے کہ آسمان اور زمین کی ہر شے اللہ کے لئے سربسجود ہے۔

وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا الْهَيْئِ اثْنَيْنِ ۚ اِمَّا هُوَ الْاَحَدُ ۚ فَاِيَّايْ فَارْهَبُوْنَ ﴿٦١﴾

وَلَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّينُ وَاَصْبًا ۚ اَفَغَيْرَ اللَّهِ تَتَّقُوْنَ ﴿٦٢﴾

”اور اللہ نے کہا کہ دو خدا نہ مانو، وہ بس ایک خدا ہے تو مجھ سے بس ڈرتے رہو۔ اور اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور

[1]. اذا جاءوا اذهبوا في التجارات وفي اعمالهم نأخذهم في تلك الحالة (علي بن ابراهيم)

زمین میں ہے اور اس کی عبادت بہر حال لازم ہے [۱] تو کیا اللہ کے سوا دوسرے سے ڈرو گے۔

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْرُونَ ﴿۵۳﴾ ثُمَّ إِذَا
كَشَفَ الضُّرَّ عَنكُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ ﴿۵۴﴾ لِيَكْفُرُوا بِمَا
آتَيْنَهُمْ ۖ فَتَمَتَّعُوا فَتَفْسُوفَ تَعْلَمُونَ ﴿۵۵﴾

’اور جو تمہارے پاس نعمت ہے، وہ اللہ کی طرف سے ہے، پھر جب تم پر مصیبت آتی ہے تو اسی کی طرف تم چیختے چلاتے ہو۔ پھر جب تم سے مصیبت کو وہ دور کر دیتا ہے تو ایک دم تم میں ایک گروہ اپنے پروردگار کے ساتھ شکر کرنے لگتا ہے۔ تاکہ وہ کفرانِ نعمت کریں، اس پر جو ہم نے انہیں عطا کیا تو فائدہ اٹھا لو، اس کے بعد بہت جلد تمہیں قدر و عافیت معلوم ہوگی‘۔

وَيَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا مِّمَّا رَزَقْنَاهُمْ ۖ تَاللَّهِ لَتُسْأَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ
تَفْتَرُونَ ﴿۵۶﴾

’اور ایسی چیزوں کا جنہیں وہ جانتے نہیں، حصہ قرار دیتے ہیں اس میں جو ہم نے انہیں رزق عطا کیا ہے۔ خدا کی قسم ضرورت سے جواب دہی ہوگی اس کی جو تم من گھڑت باتیں بتاتے ہو‘۔

شاہ ولی اللہ نے تو اپنے ترجمہ میں اس کی تشریح ’یعنی بتان‘ کے لفظ کے ساتھ کر دی ہے یعنی یہ مشرکین کا ذکر ہے جلالین نے بھی لہذا يعلمون کی تشریح یہی کی ہے کہ:-

لہذا يعلمون ائہا لا تضر ولا تنفع وہی الا صنمہ۔

جن کے متعلق انہیں یہ خبر نہیں کہ وہ نہ نقصان پہنچاتے ہیں اور نہ فائدہ اور وہ بت ہیں۔

ہماری قدیم تفسیر بھی اس کے موافق ہے۔ [۲]

مگر شاہ عبدالقادر صاحب نے اسے مطلق نذرو نیاز پر حاوی کر کے ’وہابیت نوازی‘ کا ثبوت دیا ہے وہ فرماتے ہیں:-

’یہ ان کو فرمایا ہے جو اپنے کھیت میں، مویشی میں، تجارت میں اللہ کے سوا کسی کی نیاز ٹھہراتے ہیں، سب مال اللہ کا ہے اور کسی کا حق نہیں مگر اللہ کی راہ میں دے اپنے ثواب پھر اپنے بدلے ثواب کسی کو دیوے‘ (موضح القرآن)

نذرو نیاز کا طریقہ ’مذہب حق‘ کے پرستاروں میں یہی ہے کہ اہدائے ثواب کیا جاتا ہے اسے جس کی نیاز لازم دلانا ہے پھر معلوم نہیں اسے شاہ صاحب اس کو آیت قرآن کے تحت میں کیوں لاتے ہیں؟‘

[۱]. واصبأ ای واجبا (علی بن ابراہیم) قال ابن عباس دائما ای طاعتہ و اجبہ علی الدوام (تبیان)

[۲]. یجعلون للاصنام نصیبا فی زرعہم و ابلہم و غنہم فرد اللہ علیہم (علی بن ابراہیم)

وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ الْبَدَنَ سُبْحَانَهُ ۖ وَلَهُمْ مَا يَشْتَهُونَ ﴿٥٨﴾ وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ
ظَلَّ وَجْهَهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ﴿٥٩﴾ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ ۖ
أَيْمَسُكُهُ عَلَىٰ هُونٍ ۖ أَمْرٌ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ ۗ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿٥٩﴾

”اور وہ اللہ کے لیے پاک ہے اس کی ذات، لڑکیاں قرار دیتے ہیں اور خود ان کے لیے وہ ہے جس کے وہ خواہشمند ہیں۔ اور جب ان میں کسی ایک کو لڑکی کی خوش خبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ کالا پڑ جاتا ہے اور وہ رنج سے بھر جاتا ہے۔ وہ لوگوں کی نظروں سے چھپ جاتا ہے اس خوش خبری کی برائی سے جو اسے دی گئی ہے۔ اب کیا وہ اسے حقارت کے ساتھ رکھے گا یا اسے مٹی میں توپ ہی دے گا، آگاہ ہو کہ کتنا برا ہے وہ جو یہ حکم لگاتے ہیں۔“

لڑکیوں کی ولادت پر رنجیدہ ہونا اہل جاہلیت کا طریقہ

ان کے مزعومہ کے ساتھ جو کہا گیا ’پاک ہے اس کی ذات‘ وہ اس لیے نہیں کہ خاص لڑکی واقعاً کوئی بری چیز ہے بلکہ اس لیے کہ اولاد کی نسبت ہی اس کی شان کے خلاف ہے۔ اب یہ ان کے مزعومہ کی مزید کمزوری اور رکاکت ہے کہ وہ ایک تو اولاد کو اس کی طرف منسوب کرتے ہیں جو واقعاً اس کی شان الوہیت کے خلاف ہے اور پھر یہ خود اپنے لیے لڑکی کو بہت برا جانتے ہیں۔ مگر جسے وہ اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں، اسے اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، اس طرح کہ یہ فرض کر لیا ہے کہ ملائکہ صنف اناث میں ہیں اور یہ اس کی بیٹیاں ہیں، جس کے دونوں جز غلط ہیں۔

لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ مَثَلُ السُّوءِ ۗ وَاللَّهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ ۗ وَهُوَ الْعَزِيزُ
الْحَكِيمُ ﴿٦٠﴾

”ان کی جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، بری حالت ہے [۱] اور اللہ کے لیے بلند ترین اوصاف ہیں اور وہ زبردست ہے، ہر کام ٹھیک انجام دینے والا۔“

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ ذَابْتَةٍ ۖ وَلَكِنْ يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ
أَجَلٍ مُّسَمًّى ۗ فَإِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۗ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٦١﴾

”اور اگر اللہ تمام لوگوں کو ان کی زیادتیوں کی بنا پر گرفت میں لیتا رہے تو روئے زمین پر کسی چلنے پھرنے والے کو چھوڑے ہی نہیں مگر وہ تو انہیں ڈھیل دیتا ہے ایک مقررہ مدت تک تو جب ان کی مدت آجائے گی تو پھر ایک گھڑی نہ پیچھے ہوں گے اور نہ آگے بڑھیں گے۔“

[۱] ای لہم بذلک وصف سوء و لئلا الوصف الاعلیٰ من اخلاص التوحید (تبیان)

وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ مَا يَكْرَهُونَ وَتَصِفُ أَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ أَنَّ لَهُمُ الْحُسْنَىٰ ط لَا

جَرَمَ أَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَأَنَّهُمْ مُّفْرَطُونَ ﴿٣٢﴾

”اور اللہ کے لیے قرار دیتے ہیں وہ جسے وہ ناپسند کرتے ہیں اور ان کی زبانیں غلط بات بیان کرتی ہیں کہ ان کے لیے بھلائی ہے کوئی شک نہیں کہ ان کے لیے آگ ہے اور وہ آگے بھیجے جانے والے ہیں“ [۱]۔
پہلے جز کے متعلق ایک خیال ہے کہ اس سے قبل کی آیات میں جو مضمون تھا، اس سے متعلق ہے یعنی وہ خود تو لڑکیاں ناپسند کرتے ہیں اور اللہ کے لیے لڑکیاں قرار دیتے ہیں چنانچہ شیخ الطائفہ فرماتے ہیں:-

يعني يضيفون الى الله البنات مع كراهية ذلك لنفوسهم (تبيان)

یعنی وہ لڑکیوں کی نسبت اللہ کی طرف دیتے ہیں باوجود یہ کہ خود اپنے لیے اسے ناپسند کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ نے اس ترجمہ پر کہ ”آنچہ ناپسندی دارند“ حاشیہ دیا ہے ”یعنی دختران“ ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر نے اسے ایک دوسری بات سے متعلق قرار دیا ہے، وہ کہتے ہیں:-

”یہ ان کو فرمایا جو ناکارہ چیزیں اللہ کے نام دیں اور اس پر یقین کریں کہ ہم کو بہشت ملے اور روز بروز دوزخ میں بڑھتے ہیں۔“ (موضح

القرآن)

اسی آیت کے بعد والے الفاظ سے مجھے یہ مفہوم زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَا اِلٰى اٰمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ

فَهُوَ وَلِيُّهُمْ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٣٣﴾

”اللہ کی قسم ہم نے پیغمبر بھیجے بہت سی قوموں کی طرف آپ سے پہلے تو شیطان نے ان کے لیے ان کے اعمال سنوار کر پیش کیے جس کے بعد وہی آج ان کا سرپرست ہو سکتا ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔“

وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اٰخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۗ وَهُدًى

وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّٰمِنُوْنَ ﴿٣٤﴾

”اور ہم نے نازل نہیں کی آپ پر یہ کتاب مگر اس لیے کہ آپ ان کے لیے واضح طور پر بیان کر دیں اسے جس میں وہ باہم اختلاف رکھتے تھے اور ہدایت اور رحمت بنا کر ان کے لیے جو ایمان لائے ہیں۔“

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهٖ الْاَرْضَۢ بَعْدَ مَوْتِهَا ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَةً

[۱] متکون فیہا او مقدمون علیہا (جلالین) ای معذبون (علی بن ابراہیم)

لِقَوْمٍ يَسْمَعُونَ ﴿٦٥﴾

”اور اللہ نے اتارا آسمان سے پانی تو اس سے زمین کو اس کی موت کی حالت کے بعد زندگی بخشی، یقیناً اس میں بڑی نشانی ہے ان کے لیے جو سننے کے لیے تیار ہوں۔“

وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۖ نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهِ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ
لَبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِلشَّارِبِينَ ﴿٦٦﴾ وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ

مِنْهُ سَكْرًا أَوْ رِزْقًا حَسَنًا ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿٦٧﴾

”اور بلاشبہ تمہارے لیے چوپایوں میں غور و فکر کا سرمایہ ہے۔ ہم تمہیں سیراب کرتے ہیں اس سے کہ جو ان کے شکم میں فضلہ اور خون کے بیچ میں سے نرا کھرا دودھ ہوتا ہے جو پینے والوں کے لیے خوشگوار ہے۔ اور کھجوروں کے درخت اور انگور کے پھلوں سے کہ جن سے تم شراب اور اچھا رزق تیار کرتے ہو۔ یقیناً اس میں نشانی ہے ان کے لیے جو عقل سے کام لیں۔“

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ”شراب“ کا ذکر اس آیت میں اس لیے ہے کہ اس وقت تک اس کی حرمت نازل نہیں ہوئی تھی [۱] مگر ہم سمجھتے ہیں کہ یہاں خطاب مسلمانوں سے ہے ہی نہیں بلکہ تمام نوع انسانی کو خدا کی قدرت کی نمود کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے، اس لیے انہیں ان انتفاعات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے جو صنایع الہی سے حاصل کرتے ہیں اس میں شریعت کے حلال اور حرام سے بحث نہیں ہے، پھر یہ کہ انگور وغیرہ سے بنائی جانے والی چیزوں میں شراب کے ذکر کے بعد ”اور اچھا رزق“ کہنے سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ شراب اچھا رزق ”نہیں ہے ورنہ اسے“ ”رزق حسن“ سے الگ کر کے ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی، اس سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ اللہ نے یہ سب چیزیں تمہارے فائدہ کے لیے پیدا کی ہیں، اب یہ تمہارا سوء اختیار ہے کہ تم اس سے شراب تیار کرتے ہو جو تمہارے لیے اچھی چیز نہیں ہے۔ [۲]

وَأَوْحَى رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنْ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا
يَعْرِشُونَ ﴿٦٨﴾ ثُمَّ كُلِي مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ۗ يَخْرُجُ مِنْ
بُطُونِهَا شَرَابٌ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ فِيهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِقَوْمٍ
يَتَفَكَّرُونَ ﴿٦٩﴾

”اور تمہارے پروردگار نے حکم پہنچایا شہد کی مکھی کی طرف کہ تو پہاڑوں میں گھر بنا اور درختوں میں اور ان میں

[۱]۔ هذا اقبل تحریمها (جلالین)

[۲]۔ فاتخذتم منها ما هو محرم علیکم وترکتہ ما هو رزق حسن (تبیان)

جنہیں لوگ اونچا کرتے ہیں۔ پھر تو ہر طرح کے پھلوں سے کھا اور اپنے پروردگار کے مقرر کردہ راستوں پر جو آسان ہیں، چلتی رہتے اس کے پیٹ سے مختلف رنگوں کا وہ شربت نکلتا ہے جس میں لوگوں کے لیے شفا ہے، یقیناً اس میں نشانی ہے ان کے لیے جو غور و فکر سے کام لیں۔“

شہد کی مکھی کا ذکر

جنہیں لوگ اونچا کرتے ہیں، اس کے ایک معنی لیے گئے ہیں عمارتیں جو بناتے ہیں اور دوسرے انگور وغیرہ کی بلیں جنہیں کسی بلند چیز پر چڑھایا جاتا ہے۔

شہد کی مکھی کی طرف حکم پہنچانے سے مراد اس کی فطرت میں اسے مضمر قرار دینا ہے جسے حکم تو نبی سمجھنا چاہیے، نہ کہ تشریحی۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفَّكُمْ ۗ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُؤَدِّيْ اِلٰى اَزْوَاجٍ لِّكٰى لَا يَعْلَمَ

بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿٤٠﴾

’اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہیں دنیا سے اٹھالے گا اور تم میں سے بعض انتہائی لمبی عمر تک پہنچائے جاتے ہیں یہاں تک کہ دانائی کے بعد ایسے ہو جاتے ہیں کہ کچھ جانتے سمجھتے نہیں، یقیناً اللہ بڑا جاننے والا ہے، قدرت والا‘۔ خالق نے خود ہی ارشاد فرمایا ہے کہ اتنی عمر تک جس میں یہ کیفیت ہو، بعض ہی لوگ پہنچتے ہیں اور وہ عمر کتنی ہے جس میں یہ بات پیدا ہو جائے، یہ بتایا نہیں ہے تو اب کسی بھی عمر کے بعد لازماً نہیں سمجھنا چاہیے۔ کہ یہ کیفیت پیدا ہوگی، پھر یہ ایک عام طبعی تقاضا ہے۔ زیادتی عمر کا جس میں مستثنیات ہو سکتے ہیں، خصوصاً جب کہ امتداد عمر بقدرت الہی بصورت اعجاز ہو تو قوائے عقل و شعور کا بحد کمال باقی رکھنا بھی بصورت اعجاز ہو سکتا ہے بلکہ ہونا چاہیے۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۗ فَمَّا الَّذِيْنَ فَضَّلُوْا بَرَّ اَدِّيْ رِزْقِهِمْ

عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ۗ اَفْبٰىنِعْمَةَ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿٤١﴾

’اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض سے زیادہ رزق دیا ہے تو وہ جنہیں زیادہ ملا ہے، اپنے رزق کو پلٹا نہیں دیتے ان پر کہ جو ان کے دست نگر ہیں کہ وہ سب اس میں برابر ہو جائیں، کیا وہ اللہ کی نعمت کا جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں‘۔

خود اختیاری اشتراکیت کی دعوت

عام طور پر مفسرین نے اس آیت کا مطلب یہ لیا ہے کہ تم کبھی اپنے غلاموں کو اپنے برابر نہیں لاتے تو پھر اللہ کیوں کر اسے گوارا کرے گا

کہ اس کی مخلوق چیزوں کو اس کے برابر قرار دیا جائے۔^[۱]
مگر ہماری قدیم تفسیر سے پتہ چلتا ہے کہ ”اپنے رزق کو پلٹا نہیں دیتے“ بطور مذمت ہے اور آمادہ کرنا ہے اس پر کہ تمہیں اپنے گھر والوں کے ساتھ مساوات برتنا چاہیے اور اپنا حصان سے زیادہ نہیں رکھنا چاہیے۔^[۲]
آخر کا فقرہ آیت کا اس مفہوم کو تقویت دیتا ہے۔ اس طرح قرآن مجید نے اس معاشی یکسانی کا تصور پیش کیا ہے جسے اشتراکیت جبری طور پر نافذ کرنے کی حامی ہے۔ اسلام ضمیر کی تحریک سے اسے اختیاری طور پر جاری کرنے کا علمبردار ہے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ
وَخَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ ؕ اَفِیْ الْبَاطِلِ یُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ
یَكْفُرُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ شَیْئًا وَّلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ﴿۴۲﴾

”اور اللہ نے تمہارے لیے تمہارے نفوس سے بیویاں قرار دیں اور تمہارے لیے تمہاری بیویوں سے بیٹے، پوتے عنایت کیے اور تمہیں پاک صاف غذاؤں سے رزق عطا کیا تو کیا وہ باطل کو مانتے رہیں گے اور اللہ کی نعمتوں سے ناشکر اپن کریں گے؟ اور وہ اللہ کو چھوڑ کر ایسے کی عبادت کرتے رہیں گے جو آسمان اور زمین سے ان کو رزق دینے کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا اور نہ وہ قدرت ہی رکھتے ہیں۔“

یعنی ملکیت میں بھی ان کے کچھ نہیں ہے، وہ تہی دست ہیں اور توانائی بھی نہیں کہ وہ اپنے دست و بازو سے کچھ کر سکیں۔
دوسرا پہلو یہ ہے کہ جو روزی موجود ہے، وہ ان کی ملکیت میں نہیں اور جو روزی نہیں ہے، اس کا پیدا کرنا ان کی قدرت میں نہیں۔

فَلَا تَصْرِفُوْا اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۳﴾

”تو اللہ کے لیے مثالیں تجویز نہ کرو، یقیناً اللہ جانتا ہے اور تم جانتے نہیں ہو۔“

”ضرب مثل“ کے جو معنی ہیں، اس کے لحاظ سے معلوم تو ایسا ہوتا ہے کہ وہ خداوند عالم کے بارے میں مثالوں کے طور پر کچھ رائے زنی کرتے تھے۔^[۳]

اب وہ کیا تھا جو وہ کہتے تھے؟ اس کا پتہ نہیں، اس لیے بعض مفسرین نے یہ مطلب لیا ہے کہ دوسری اشیاء کو اس کے مثل قرار نہ دو یعنی شرک نہ کرو۔^[۴]

[۱]. یعنی ہیچ کس نمی خواهد کہ حملو کان خود را برابر خود سازد (فتح الرحمن) فکیف یجعلون بعض مما لیک اللہ شرکاء (جلالین)

[۲]. لا یجوز للرجل ان ینخص نفسه بشئی من العاکول دون عیالہ (علی بن ابراہیم)

[۳]. مت بیان کرو واسطے اللہ کے مثالیں (شاہ فہج الدین)

[۴]. معنا لا تجعلوا اللہ الاشیاء و الامثال فانہ لا شجہ لہ ولا مثل (تبیان)

شاہ عبدالقادر نے شرک کی ”ضرب مثل“ کے معنی کے تحت میں تشریح کی ہے:-
 ”مشرک کہتے ہیں مالک اللہ ہی ہے، بزرگ اس کی سرکار ہیں مختار ہیں اس واسطے ان کو پوجیں، سو یہ غلط مثال ہے، اللہ ہر چیز آپ کرتا ہے کسی پر سپرد نہیں رکھا اور اگر صحیح مثال چاہو تو آگے دو (۲) مثالیں فرمائیں“ (موضح القرآن)
 صراحت تو نہیں ہے مگر مجھے موصوف کی تشریح کے بین السطور میں وہابیت جھلکتی نظر آتی ہے اور دیکھا جائے تو ان کا یہ کہنا کہ ”اللہ ہر چیز آپ کرتا ہے، کسی پر سپرد نہیں رکھتا۔“ کلیتہً درست نہیں ہے ورنہ ملک الموت اور انزال وحی کے لیے جبرائیل کا تقرر اور کاتبان اعمال ان سب کا انکار کرنا پڑے گا۔

ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا عَبْدًا مَمْلُوكًا لَا يَقْدِرُ عَلَى شَيْءٍ وَمَنْ رَزَقْنَاهُ مِمَّا رَزَقْنَا حَسَنًا
 فَهُوَ يَنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَجَهْرًا ۖ هَلْ يَسْتَوُونَ ۗ الْحَمْدُ لِلَّهِ ۗ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا
 يَعْلَمُونَ ﴿۴۵﴾

”اللہ مثال پیش کرتا ہے ایک حلقہ بگوش غلام کی جو کسی بات پر قدرت نہیں رکھتا اور اس کی جسے ہم نے اچھی روزی عطا کی ہے تو وہ اس سے خفیہ اور اعلانیہ خیرات کرتا ہے، کیا وہ سب برابر ہیں؟ شکر اللہ کا (کہ تم نے اسے مان تو لیا) بلکہ ان میں زیادہ تر لوگ واقف نہیں ہیں۔“

مطلق تو سول کا انکار کرنے والے اس مثال کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ ”حلقہ بگوش غلام“ جو کسی بات پر قدرت نہیں رکھتا، مثال اصنام کی ہے اور جسے ہم نے اچھی روزی عطا کی ہے تو وہ اس سے خفیہ اور اعلانیہ خیرات کرتا ہے، مثال خود اللہ کی ہے [۱] یعنی جس طرح وہ غلام اور آزاد صاحب ثروت برابر نہیں، اسی طرح یہ اصنام اور اللہ برابر نہیں، مگر ہمارے نزدیک قرآن کی مثال کو اس مفہوم پر منطبق کرنا بالکل درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ حلقہ بگوش غلام کے مقابلے میں جو دوسرا ہے، وہ ذاتی قدرت کا مالک نہیں ہے بلکہ وہاں خالق نے اپنی بالادستی کو نمایاں کیا ہے، یہ کہہ کر کہ ہم نے اسے اچھی روزی عطا کی ہے تو اسے خود خالق پر منطبق کرنا کیونکر درست ہو سکتا ہے؟

ہم اس آیت کو مشرکین کی رد اس لحاظ سے سمجھتے ہیں کہ انہوں نے انتخاب ”وسیلہ“ میں غلطی کی ہے یعنی اپنے دل سے ایسوں کو وسیلہ بنا لیا ہے جنہیں خالق نے کسی قسم کا اختیار عطا نہیں کیا ہے۔ لازم تھا کہ وہ توسل کے لیے خود منشاء قدرت کو دیکھتے کہ اس نے کھیں خلق کے لیے وسیلہ قرار دیا ہے؟ جسے اس کی طرف سے یہ اختیار عطا ہو، اس کے ساتھ توسل صحیح ہے یہ کہ ”وہ جو بالکل بے بس ہیں“ ان کے مثل نہیں ہیں جنہیں اللہ نے قدرت و اختیار عطا کیا ہے، خود اس کی دلیل ہے کہ کچھ ایسے ہیں جنہیں اللہ نے اپنی عطا سے ایسے اختیارات عنایت کیے ہیں کہ وہ اس کی دی ہوئی قدرت سے خلق خدا کی مدد کرتے ہیں۔

یہ مفہوم دور اول کے مفسرین کی تفسیر کے موافق ہے۔ [۲]

[۱]. الاول مثل الاصنام والثانی مثل تعالیٰ (جلالین)

[۲]. انه مثل ضرب الکافر الذی الاخیر عندہ هو المؤمن الذی یکسب الخیر... هو قول ابن عباس وقتادة (تبیان)

اس کے بعد جب یہ پیش نظر ہے کہ ان کو قدرت ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ کی دی ہوئی ہے تو شرک یعنی اللہ کے مد مقابل قرار دینے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

اس مثال کے بعد جو الحمد للہ ہے اور ایسا ہی بعض دوسرے مقامات پر کسی سوال و جواب کے بعد جو ”الحمد للہ“ ہے جیسے:

وَلَيْنَ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۗ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ (القمان ۲۵)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سوال کے جواب میں یا اس مثال کے پیش کیے جانے پر مخاطبین عاجزی سے خاموش رہے یا اعتراف جو حق پر مجبور ہوئے تو قدرت نے فاتحانہ انداز میں کہا: الحمد للہ یعنی شکر خدا کہ تم نے اسے تسلیم تو کیا اور پھر گویا خالق نے ان کی طرف سے ایک عذر پیش کیا ہے کہ اگر سمجھ میں آجائے تو بہت سے حقیقت کا اعتراف کر لیں مگر اصل یہ ہے کہ وہ جاہل ہیں، جانتے نہیں ہیں۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اٰحَدُهُمَا اَبْكُمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰی شَيْءٍ وَّهٗوَ كَلٌّ عَلٰی

مَوْلٰٓئِهٖ ۙ اٰیْنَمَا يُوْجِّهٗهُ لَا يَأْتِ بِخَيْرٍ ۗ هَلْ يَسْتَوِي هٗوَ ۙ وَمَنْ يَّأْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ

وَهُوَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۱﴾

”اور اللہ ایک مثال پیش کرتا ہے دو آدمیوں کی جن میں سے ایک گونگا ہے کہ کسی بات پر قدرت نہیں رکھتا اور وہ اپنے مالک پر بوجھ بنا ہوا ہے، جدھر وہ اسے بھیجتا ہے کوئی اچھا نتیجہ اس کے ہاتھ سے برآمد نہیں ہوتا تو کیا برابر ہے وہ اور وہ جو عدالت کا حکم دیتا ہے اور سیدھے راستے پر قائم ہو۔“

بعض مفسرین نے اسے بھی بتوں اور خدا کی مثال قرار دیا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

حاصل این دو مثل آنست کہ آنچہ در عالم تصرف ندارد دیا خدا برابر نیست چنانکہ مملوک ناتواں بامالک تو انابر این نیست و چنانچہ گنگ بے تمیز با صاحب ہدایت دہندہ برابر نیست (فتح الرحمن)

ان دونوں مثالوں کا مطلب یہ ہے کہ جو کوئی چیز دنیا میں تصرف نہیں رکھتی، خدا کے برابر نہیں ہے، جس طرح کمزور غلام صاحب اقتدار مالک کے برابر نہیں ہے اور جس طرح بے عقل و تمیز گونگا ہدایت کنندہ و ہدایت یافتہ شخص کے برابر ہے۔

مگر ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر کے ضمیر نے یہاں اس تشریح کو گوارا نہیں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

”یعنی خدا کے دو بندے: ایک بہت نکمانہ بل سکے، نہ چل سکے جیسے گونگا یا غلام، دوسرا رسول جو اللہ کی راہ بتا دے ہزاروں کو اور آپ بندگی پر قائم ہے، اس کے تابع بہتر یا اس کے“ (موضح القرآن)

جلالین نے اور تیسری بات کہی: گونگا ہے، کوئی خیر نہیں ظاہر کرتا، وہ کہتے ہیں:

هذا مثل الکافر ”یہ کافر کی مثال ہے“ اور جو عدالت کا حکم دیتا ہے اور وہ سیدھے راستے پر قائم ہے، کہتے ہیں: وهو مثل المؤمن ”یہ مؤمن کی مثال ہے“ اس کے بعد انہوں نے کہا ہے:-

”وقیل لهذا مثل اللہ تعالیٰ والابکھ الاصنام والذی قبلہ فی المؤمن والکافر۔“

اور ایک قول یہ ہے کہ یہ مثال اللہ کی ہے اور گونگا مثال ہے بتوں کی اور جو اس کے قبل والی آیت میں مثال تھی، وہ مومن اور کافر کی ہے۔ ہمارے نزدیک نہ وہ پہلی مثال اللہ اور اصنام کی تھی اور نہ یہ دوسری اللہ اور اصنام کی ہے بلکہ پہلی مثال انتخاب وسیلہ کے متعلق تھی اور یہ دوسری مثل انتخاب رہنما سے متعلق ہے۔

ایسے وسیلہ بنانے کے قابل نہیں، جنہیں اللہ نے ذرہ بھر بھی اختیار نہیں دیا ہے بلکہ وسیلہ بنانے کے قابل وہ ہیں جنہیں خالق نے وسیلہ بننے ہی کے لیے پیدا کیا ہے اور اس لیے اپنی جانب سے انہیں بہت سے خاص اختیارات کا مالک بنایا ہے۔ اسی طرح رہ نمائی کے قابل وہ نہیں جو علم و بصیرت سے محروم ہیں، اور مثل گونگے کے نہ صحیح راستا دوسروں کو بتا سکتے ہیں اور نہ خود ہی جس کام پر مامور کیے جائیں، اسے صحیح طریقہ پر انجام دے سکتے ہیں بلکہ وہ رہ نمائی کے قابل ہیں جو اللہ کی جانب سے علم و بصیرت کے حامل قرار دیے گئے اور وہ خود بھی سیدھے راستے پر قائم ہیں۔ کلیۃً عملی حیثیت سے ”صراط مستقیم“ پر قیام ہی وہ ”عصمت“ ہے جو منجانب اللہ رہ نمائی کے لیے شرط لازم کی حیثیت رکھتی ہے۔

وَاللَّهُ غَيْبُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَمَا أَمْرُ السَّاعَةِ إِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ أَوْ هُوَ

أَقْرَبُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٤٤﴾

’اور اللہ کے لیے آسمانوں اور زمین کا غیب ہے اور قیامت کا معاملہ نہیں ہے مگر مثل چشم زدن کے یا اس سے بھی جلد، یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے‘۔

’اللہ کے لیے غیب ہے‘ اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اس غیب کا علم صرف اسے ہے [۱] اور یہ بھی کہ یہ غیب کی چیزیں تمام اس کی ملکیت میں ہیں [۲] اور ’مثل چشم زدن یا اس سے کم‘، کہنا حقیقت امر کے لحاظ سے کسی شک کا اظہار نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم اس کے انتہائی نزدیک ہونے کے لیے جو تعبیر کرو وہ درست ہوگی، خواہ مثل چشم زدن کہو، خواہ اس سے کم تر کہو، بہر حال اسے بالکل دور نہ سمجھو۔

وَاللَّهُ أَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا ۗ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ

وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۗ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٤٥﴾

’اور اللہ نے نکالا تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے ایسے عالم میں کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے اور اس نے تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل قرار دیئے تاکہ تم شکر گزار ہو‘۔

أَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرَاتٍ فِي جَوْ السَّمَاءِ ۗ مَا يُمَسِّكُهُنَّ إِلَّا اللَّهُ ۗ إِنَّ فِي

ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ مُّؤْمِنُونَ ﴿٤٦﴾

’کیا انہوں نے نہیں دیکھا پرندوں کو جو فضائے آسمان میں قانون قدرت کے پابند رکھے گئے ہیں، نہیں انہیں

[۱]. علم پنہاں آسمانہا وزمین (شاہ ولی اللہ) علم غیب آسمانوں کا اور زمین کا (شاہ رفیع الدین)

[۲]. قال الجبائی: بحتل ان یکون المعنی: والله ملک ما غاب (تبیان)

تھامے رکھتا مگر اللہ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوتِكُمْ سَكَنًا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُودِ الْاَنْعَامِ بُيُوتًا
تَسْتَخِفُّونَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۗ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا
وَاَشْعَارِهَا اَنْثًا وَمَتَاعًا اِلٰى حَيِّنٍ ﴿٨﴾ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِمَّا خَلَقَ ظِلًّا وَجَعَلَ
لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيلَ تَقِيْكُمْ الْحَرَّ وَسَرَابِيلَ
تَقِيْكُمْ بَاسِكُمْ ۗ كَذٰلِكَ يُتَمِّمُ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴿٩﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا
فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿١٠﴾ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمْ
الْكٰفِرُوْنَ ﴿١١﴾

اور اللہ نے کیا تمہارے لیے تمہارے گھروں میں سکونت کا سامان اور بنائے تمہارے لیے چوپایوں کی کھالوں سے ایسے گھر جو تمہیں ہلکے معلوم ہوتے ہیں تمہارے سفر کے دن اور تمہارے قیام کے دن اور ان کے اُونوں اور رونگٹوں اور بالوں سے تمہارے لیے سامان خانہ داری اور اسباب مہیا کیے ایک مقررہ مدت تک کے لیے۔ اور اللہ نے بنائے تمہارے لیے اپنی ان چیزوں سے جو اس نے پیدا کیں سائے اور قرار دیئے تمہارے لیے پہاڑوں میں چھپنے کے مقامات اور قرار دیئے تمہارے لیے لباس جو تمہیں گرمی سے بچاتے ہیں اور ایسے لباس جو تمہیں تمہارے حملہ سے بچاتے ہیں، اس طرح وہ اپنی نعمت تم پر مکمل کرتا ہے، شاید کہ تم سراطعت خم کر دو۔ اب اگر وہ روگردانی کریں تو آپ پر تو بس صاف صاف تبلیغ کی ذمہ داری ہے۔ وہ اللہ کی نعمت کو پہچانتے ہیں، پھر اس کا انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر کافر ہیں۔

چوپایوں کی کھالوں سے جو گھر کہے گئے ہیں، اس سے خیمے اور چھولداریاں مراد ہیں^[۱] اور ایسے لباس جو تمہیں تمہارے حملہ سے بچاتے رہیں، اس سے زربیں^[۲] مراد ہیں جو عموماً تولو ہے کی ہوتی تھیں،

مگر معلوم ہوتا ہے کہ جنہیں اتنی استطاعت نہ ہو یا اتنا بوجھ برداشت نہ کر سکیں ان کے لیے چمڑے وغیرہ کے بھی خول تیار ہوتے تھے جو تلوار وغیرہ سے ایک حد تک بچاؤ کا ذریعہ ہوتے تھے اور شاید وہ افراد کم ہی ہوتے تھے جو لوہے کی زربیں خریدیں اور پہنیں، زیادہ تر فوجی لوگ ایسے ہی لباس استعمال کرتے تھے اس لیے یہاں خالق نے اسے بطور اپنے انعام و احسان کے پیش فرمایا ہے۔

[۱] یعنی الخیم والمضارب (علی بن ابراہیم)

[۲] لڑائی کا بچاؤ زربیں (موضح القرآن)

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا وَلَا هُمْ

يُسْتَعْتَبُونَ ﴿٨٣﴾

”اور اس دن کہ جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ اٹھائیں گے پھر کافروں کو اجازت نہ دی جائے گی اور نہ اب خوشنودی حاصل کرنے کا نہیں موقع ہوگا۔“

یہ ہر امت کا گواہ اس کا پیغمبر ہوتا ہے جو قیامت کے دن اس امت کے اچھے اور برے اعمال پر گواہ کی حیثیت سے پیش ہوگا ﴿٨٣﴾

”اجازت نہ دی جائے گی“ یعنی اصلاح عمل اور توبہ و انابت کا کوئی موقع باقی نہ رہے گا۔ ﴿٨٣﴾

”نہ اب خوش نودی حاصل کرنے کا نہیں موقع ہوگا، یعنی اب رضائے الہی کے حاصل کرنے کی ان کے لیے کوئی صورت نہیں ہوگی ﴿٨٣﴾۔“

وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفِّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿٨٤﴾

”اور جب ظالم لوگ عذاب کو آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو پھر نہ اس میں تخفیف ہوگی اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔“

وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ أَشْرَكُوا شَرَّكَائِهِمْ قَالُوا رَبَّنَا هَؤُلَاءِ شُرَكَائُنَا الَّذِينَ كُنَّا

نَدْعُوا مِنْ دُونِكَ ۖ فَالْقَوْلَ إِلَيْهِمُ الْقَوْلُ إِن كُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿٨٥﴾ وَالْقَوْلُ إِلَى اللَّهِ

يَوْمَئِذٍ السَّلَامَ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٨٥﴾

”اور جب مشرک لوگ اپنے شریکوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے اے ہمارے پروردگار! یہ ہمارے وہ شریک ہیں

جن کی ہم تجھے چھوڑ کر دہائی دیتے تھے تو وہ انہیں جواب دیں گے کہ تم جھوٹے ہو۔ اور وہ اللہ کے سامنے سراطاعت

ختم کر دیں گے اور جو وہ غلط باتیں منڈھتے تھے، وہ سب ان سے غائب ہو گئی ہوں گی۔“

جنہیں وہ شریک خدا قرار دیتے تھے، انہوں نے کسی معنی سے کہا کہ تم جھوٹے ہو؟ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”جو لوگ پوجتے ہیں بزرگوں کو، وہ بزرگ بے گناہ ہیں، ایک شیطان اپنا وہی نام رکھ کر پوجا تا ہے۔ اس سے ان کو کہیں گے کہ تم جھوٹے

ہو۔“ جلالین نے لکھا ہے:-

انکم لکا ذبون فی قولکم انکم عبدتمونا کما فی ایتہ اخری ما کانوا یانا یعبدون سیکفرون بعبادۃہم

تم جھوٹے ہو اس کہنے میں کہ تم نے ہماری عبادت کی تھی جیسا کہ دوسری آیت میں ہے: وہ لوگ ہماری عبادت نہیں کرتے تھے اور یہ کہ

[١]. شہید کل امتہ رسولہ (تبیان)

[٢]. تا عند خود کنند (فتح الرحمن)

[٣]. لا تطلب منهم العتبی ای الرجوع الی ما یرضی اللہ (جلالین)

عنقریب وہ ان کی عبادت کے منکر ہوں گے۔

الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ زِدْنَاهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا
يُفْسِدُونَ ﴿٨٧﴾

’وہ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور اللہ کی راہ سے روکا ان کو عام عذاب سے بالاتر ہم نے عذاب میں اضافہ کیا اس بناء پر کہ وہ فساد پیدا کرتے تھے‘۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ أَنفُسِهِمْ وَجُنَّا بِكَ شَهِيدًا
عَلَىٰ هَؤُلَاءِ ۗ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ
لِّلْمُسْلِمِينَ ﴿٨٨﴾

’اور وہ دن جب اٹھائیں گے ہم ہر امت سے ایک گواہ ان پر خود ان میں سے اور آپ کو لائیں گے گواہ بنا کر ان سب کے اوپر اور ہم نے آپ پر یہ کتاب اتاری ہر چیز کا واضح بیان اور ہدایت اور رحمت اور بشارت بنا کر سرطاعت خم کرنے والوں کے لیے‘۔

ہر امت کا ایک گواہ اور ہمارے رسول ان گواہوں کے گواہ

یہ مضمون دوسری جگہ بھی آچکا ہے کہ ہر امت کا ایک گواہ ہوگا اور وہ اس کا رسول یا اس دور کا امام ہوگا [۱] اور ان تمام گواہوں کے گواہ ہمارے رسول ہوں گے [۲] اور اس سے حضرت پیغمبر خدا ﷺ کی فضیلت تمام مرسلین اور ائمہ معصومین علیہم السلام پر اس درجہ ثابت ہوتی ہے کہ جو نسبت امتوں کو انبیاء کے ساتھ ہے، وہ نسبت انبیاء و ائمہ کو ہمارے رسول خاتم الانبیاء ﷺ کے ساتھ ہے۔ مگر بعض مفسرین نے جو تشریح کی ہے، وہ اس فضیلت کو ختم کر دیتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہؤلاء سے مراد یہ امت ہے یعنی ہم ہر امت کا ایک گواہ لائیں گے اور اس امت کا گواہ بنا کر آپ کو لائیں گے۔ جلالین لکھتے ہیں:

وجنابك يا محمد شهيد اعلى هؤلاء اي قومك :-

آپ کو اے محمد! ہم گواہ بنا کر ان لوگوں پر لائیں گے یعنی آپ کے قوم والوں پر

شاہ ولی اللہ نے ترجمہ کیا ہے :-

وبیاریم ترا گواہ برائیں کافران .

[۱]. لكل زمان وامة امام يبعث كل امة مع امامها. (علی بن ابراہیم)

[۲]. شهيد اعلى هؤلاء يعني على الائمة فرسول الله شهيد اعلى الائمة وهم شهداء على الناس. (علی بن ابراہیم)

آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے ان کافروں پر۔

مگر اس صورت میں اس کہنے کو قرآن کے حاصل ہی کیا ہوا؟ وہ تو ظاہر ہے کہ جب ہر نبی اپنی امت کا گواہ ہے تو یہ رسول اس امت کا گواہ ہوگا یہ ”دندان توجملہ دردہ بان اندچشمان توزیر ابروان اند“ کا ایسا جملہ کیا بلاغت قرآنی کے شایان شان ہے؟

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ
وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۗ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿٩٠﴾

”بلاشبہ اللہ عدالت، حسن سلوک اور صاحبان قرابت کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے شرمی، برائی اور ظلم و تعدی سے منع کرتا ہے، تمہیں نصیحت کرتا ہے، شاید تم اثر قبول کرو“۔

وہ آیت جو تمام اچھائیوں اور برائیوں کے احکام پر حاوی ہے

اہل نظر کا فیصلہ ہے کہ کردار کے روشن اور تاریک پہلوؤں پر حاوی اور انتہائی جامع یہ آیت ہے جس میں مختصر الفاظ میں نیکی اور بدی کے تمام شعبوں کو بیان کر دیا گیا ہے۔^[1]

وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ
جَعَلْتُمُ اللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا ۗ إِنَّ اللَّهَ يُعَلِّمُ مَا تَفْعَلُونَ ﴿٩١﴾

”اور اللہ کے عہد کو پورا کرو جب تم معاہدہ کرو اور قسموں کو توڑو نہیں ان کی مضبوطی کے بعد درحالیکہ تم نے خدا کو اپنے اوپر ضامن بنایا ہے، یقیناً اللہ جانتا ہے اسے جو تم کرتے ہو“۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَقَّضُوا عَهْدَهُمْ بَعْدَ قُوَّةٍ أَنْكَارًا ۗ تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ
دَخْلًا بَيْنَكُمْ أَنْ تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ ۗ إِنَّمَا يَبْلُوكُمُ اللَّهُ بِهِ ۗ
وَلِيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿٩٢﴾

”اور مثل اس عورت کے نہ ہو جس نے اپنے کاتے ہوئے سوت کو اس کی مضبوطی کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، تم اپنی قسموں کو اپنے درمیان مکرو فریب کا ذریعہ بناتے ہو کہ ایک جماعت دوسری جماعت سے بڑھ جائے، اس کے ذریعہ سے تو اللہ صرف تمہاری آزمائش کرتا ہے اور وہ تمہارے لیے روز قیامت ظاہر کر دے گا اسے جس میں تم اختلاف کرتے تھے“۔

”اس لیے کہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ جائے یعنی یہ جھوٹی قسمیں صرف اس لیے کھاتے ہو کہ کچھ مال و دولت زیادہ مل جائے اور دنیا

[1] عن ابن مسعود دہذا جمع آية في القرآن للخير والشر (جلالین)

کی کامیابی دوسروں سے زیادہ نصیب ہو جائے [۱] یا یہ کہ یہ مکرو فریب اس لیے ہوتا ہے کہ تم اکثریت میں ہو یا وہ اکثریت میں ہیں تو چاہتے ہوں ان میں کمی ہو جائے [۲] کاتے ہوئے سوت کا توڑ دینا خود اپنی قسموں کی مخالفت بھی ہو سکتی ہے مگر دوسرا مفہوم اس کا یہ لیا گیا ہے کہ ان قسموں کی مخالفت سے تمہارے کیے کرائے نیک اعمال سب راہیگاں چلے جائیں گے [۳] تیسرا مفہوم یہ لیا گیا ہے کہ ان قسموں کے توڑنے سے نقصان خود اپنا ہی ہوگا۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں :-

”اپنے ہی کام کو خراب کرتا ہے جیسے ایک عورت دیوانی تھی سارے برس سوت کتواتی کہ جڑ اول دوں گی اقربا کو جب جاڑ شروع ہوتا سوت کتر کے بوٹے بوٹے سب کو ہائی“ (موضح القرآن)

**وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَكِنْ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ط
وَلَتُسْأَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۹۳﴾**

”اور اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک دین پر کر دیتا لیکن وہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور بے شک تم سے سوال ہوگا اس کا جو تم اعمال کرتے تھے“۔

اس مضمون کی آیات دوسرے مقامات پر بھی آچکی ہیں اور اس کا مطلب ہر جگہ یہ ہے کہ اللہ جبری طاقت سے کام نہیں لیتا ورنہ تمام دنیا راہ ہدایت پر اور ایک دین مناسب پر جو مذہب حق ہے، ہوتی اور کافر کا وجود ہی نہ ہوتا۔ [۴]

**وَلَا تَتَّخِذُوا أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌ بَعْدَ ثُبُوتِهَا وَتَذُوقُوا السُّوَاءَ
بِمَا صَدَقْتُمْ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۗ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۹۴﴾**

”اور تم اپنی قسموں کو اپنے درمیان مکرو فریب کا ذریعہ نہ بناؤ کہ پیر جے ہونے کے بعد اکھڑ جائیں اور تم برائی کا مزہ چکھو اس سزا میں کہ تم نے اللہ کے راستے سے روکا اور تمہارے لیے بڑا عذاب ہے“۔

پیر جے ہونے کے بعد اکھڑ جائیں، اس کا ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اس سے تمہیں شکست ہوگی اور تمہارا قدم میدان جنگ سے اکھڑ جائے گا اور راہ حق سے ہٹ جائے گا [۵] اور یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ تمہاری قسموں سے دوسرے لوگ جو اب تک شکوک و شبہات میں مبتلا نہیں

[۱] یعنی برای منفعت دنیا تا مال و منال زیادہ تر بدست آرو (فتح الرحمن)

[۲] لانکم اکثر عددا منهم اولان غیرکم اکثر عددا منکم (تبیان)

[۳] حاصل مثل آنست کہ اعمال خود را حبط مکیند چنانکہ این زن عمل خود را تباہ کرد (فتح الرحمن)

[۴] لو شاء لا کرههم علی ان یکونوا امتة واحدة (تبیان)

[۵] یضل بعد ان کان علی الہدی (تبیان)

ہے، وہ بھی شوک و شبہات میں مبتلا ہو جائیں گے [۱]۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے کچھ عجیب مطلب لکھا ہے، وہ کہتے ہیں :-

یعنی درجہ عہد کردہ و قسم خوردہ دغا گردن بسبب آنست کافران من بعد قول ایشان را معتبر ندانند و با ایشان را صحبت ندارند بلکہ مسلمانان در شبہہ افتند . (فتح الرحمن)

یعنی جہاد میں عہد کر کے اور قسم کھا کے دغا کرنا اس سبب سے ہے کہ کافر اس کے بعد ان کے قول کو معتبر نہ جائیں اور ان کے ساتھ رفاقت نہ کریں بلکہ مسلمان شبہ میں پڑ جائیں۔

میری سمجھ میں اس عبادت کا مطلب کچھ نہیں آیا، بہر حال یہ اس معزز جماعت (صحابہ کرام) کے کردار کا کوئی ایسا ہی پہلو ہے جس پر قرآن مجید تنبیہ کر رہا ہے۔

بما صدقہ تم عن سبیل اللہ صد کے معنی روگردان ہونے کے بھی ہوتے ہیں اور دوسروں کو روکنے کے بھی پہلی صورت میں معنی یہ ہوتے ہیں کہ ”اس سزا میں کہ تم اللہ کے راستے سے روگردان ہوئے“ اور دوسری صورت میں یہ کہ ”تم نے اللہ کے راستے سے روکا“ جو ہم نے ترجمہ کیا ہے اور دونوں صورتوں میں ”اللہ کے راستے“ سے مراد مطلق دین حق بھی ہو سکتا ہے اور تقاضائے محل خود یہ قسم کا پورا کرنا بھی ہو سکتا ہے اور اس صورت میں دوسروں کو روکنے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے ایک غلط مثال قائم کر کے دوسروں کے لیے بھی یہ دروازہ کھول دیا کہ وہ جھوٹی قسمیں کھائیں اور عہد شکنی سے کام لیں۔ [۲]

وَلَا تَشْتَرُوا بِعَهْدِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ إِنَّمَا عِنْدَ اللَّهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۹۵﴾ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ بَاقٍ ۖ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِينَ صَبَرُوا أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۹۶﴾

”اور اللہ کے عہد کے مقابلہ میں تھوڑی سی قیمت حاصل نہ کرو، جو اللہ کے یہاں ہے وہی بس تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ جو کچھ تمہارے یہاں ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے یہاں ہو، وہ باقی رہنے والا ہے اور بے شک ہم انہیں کہ جنہوں نے صبر و برداشت سے کام لیا، ان کا صلہ عطا کریں گے ان کے بہترین اعمال کے لحاظ سے جو وہ کرتے تھے۔“

پرہیزگار لوگ جو بھی کام کرتے ہیں، وہ جائز تو ضروری ہوں گے لہذا ایک حد تک حسن تو ان کے ہر کام میں ہوگا لیکن جو خاص رضائے الہی کے لیے کام ہوں گے اور بقصد اطاعت وہ یقیناً ان کے اعمال کی بہترین قسم ہے جن کے لحاظ سے آخرت میں انہیں صلہ عنایت ہوگا۔ [۳]

[۱] یعنی مسلمانوں کو بدنام نہ کرو کہ یقین لانے والے شک میں پڑیں اور تم پر گناہ چڑھے (موضح القرآن)

[۲] ای بصد کم عن الوفاء بالعہد او بصد کم غیر کم عنہ لانہ مسیر بکم (جلالین)

[۳] انما قال باحسن ما کانوا یعملون لان احسن اعمالہم هو الطاعة اللہ تعالیٰ و ما عداہ من الحسن مباح لیس بطاعة (تبیان)

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۗ
وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٩٤﴾

”جو نیک اعمال کرے خواہ مرد ہو یا عورت در آنحالیکہ وہ با ایمان ہو تو ہم اسے ایک پاک و پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور بلاشبہ ہم ان کا صلہ دیں گے ان کے بہترین اعمال کے مطابق“۔

نیک اعمال دنیا اور آخرت کی بہتری کے ذمہ دار

”پاکیزہ زندگی دیں گے“ اس کے متعلق شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:-

”یعنی درد نیانعت دہیم“ (فتح الرحمن) مگر ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر کا جو کہنا ہے، اس کی عبارت عجیب ہے:-
”یعنی زندگی حیات کی جلادیں گے یاد دنیا میں اللہ کی محبت میں اور لذت میں“ (موضح القرآن)
تفسیر جلالین میں ہے:-

قیل ہی حیوة الجنة وقيل في الدنيا بالقناعة او الرزق الحلال

کہا گیا ہے کہ یہ بہشت کی زندگی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ دنیا میں قناعت یا حلال روزی۔

ہماری قدیم تفسیر نے اسی کو بتایا ہے کہ پاکیزہ زندگی سے مراد اللہ کے عطا کردہ رزق پر قناعت ہے۔^[1]

یہی گزشتہ سیاق کلام کے بھی مطابق ہے، اس لیے کہ اس کے پہلے مال دنیا میں ہوس کی مذمت تھی اور حیات طیبہ کی ضمانت ہر نیک اعمال مومن کے لیے ہوئی ہے لیکن رزق میں فراوانی سب کے لیے یکساں نہیں ہے، جو چیز سب میں مشترک ہو سکتی ہے، وہ رزق الہی پر چاہے جتنا ملے قناعت ہی ہے^[2] اور آخرت کی جزا کا ذکر صراحتاً بعد کو ہے۔

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴿٩٨﴾

”تو جب تم قرآن پڑھو تو اللہ سے پناہ مانگو اس شیطان کے شر سے جو راندہ ہوا ہے“۔

قرآن مجید کے آداب تلاوت میں سے یہ ہے کہ پہلے ”أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ“ کہے۔ یہ اسی آیت کے حکم کی ظاہری تعمیل ہے۔

تلاوت قرآن کے موقع پر اعوذ باللہ کہنے کا حکم

اور یہ جوارشاد ہوا کہ ”جب تم قرآن پڑھو“ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تم قرآن پڑھنے کے لیے بیٹھو یعنی قرآن پڑھنے لگو، نہ یہ کہ

[1]. التذوق بما رزقه الله (علی بن ابراہیم)

[2]. قال قوم الاولى ان يكون المراد به القناعة في الدنيا لانه عقيب ما توعد غيرهم به من العقوبة فيها مع ان اكثر المؤمنين

ليسوا بمنع الرزق فيها (تبیان)

پڑھنے کے بعد اعوذ باللہ کہو۔^[۱]

إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَنٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿۹۹﴾ اِنَّمَا سُلْطَنُهُ
عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِينَ هُمْ بِهِ مُشْرِكُونَ ﴿۱۰۰﴾

”بلاشبہ اس کا کوئی قابو نہیں ہے ان پر جو ایمان لائے ہوں اور اپنے پروردگار پر بھروسہ کریں۔ اس کا قابو تو بس انہیں پر چلتا ہے جو اسے دوست رکھتے ہیں اور جو اس کے ساتھ شرک اختیار کیے ہوئے ہیں۔“

”اسے دوست رکھتے ہیں“ یعنی شیطان کو اور ”اس کے ساتھ شرک اختیار کیے ہوئے ہیں۔“ یعنی خدا کے ساتھ۔^[۲] اس آیت میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ انسان جو اپنی بد اعمالیوں کا ذمہ دار شیطان اور بس شیطان کو بنا دیتا ہے، یہ بالکل غلط ہے، شیطان کا سہارا دینے والا تو خود انسان ہوتا ہے۔ اس کی ذہنیت خود جب تک شیطانی نہ ہو، شیطان اس پر قابو نہیں پاسکتا، اس کا اظہار دوسری جگہ آخرت کے موقع پر خود شیطان کی زبان سے قرآن میں ہے کہ وہ کہے گا:

فَلَا تَلُمُونِي وَلَوْلَمُوا أَنفُسَكُمْ.

مجھے ملامت نہ کرو، خود اپنے ہی کو ملامت کرو۔ (ابراہیم - ۲۲)
اس لیے شیطان کا آلکار بننے پر خود انسان باز پرس سے بچ نہیں سکتا۔

وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ ۖ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنزِلُ قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مُفْتَرٍ ط بَل
أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۱۰۱﴾ قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِينَ
آمَنُوا وَهُدًى وَبُشْرَى لِلْمُسْلِمِينَ ﴿۱۰۲﴾

”اور جب بدل کر لے آتے ہیں ہم ایک آیت کو دوسری آیت کی جگہ اور اللہ ہی خوب جانتا ہے اسے جو وہ اتارنا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ تم تو بس اپنے دل سے گھڑتے ہو بلکہ ان میں سے اکثر علم نہیں رکھتے۔ کہتے کہ اسے روح القدس نے اتارا ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے حق کے ساتھ تاکہ وہ انہیں جو ایمان لائے ہیں، ثابت قدمی عطا فرمائے اور ہدایت اور خوش خبری دینے کو سراطاعت جھکانے والوں کے لیے۔“

کتب الہیہ میں نسخ کے ہونے پر عیسائی آج تک معترض ہیں، بس اسی طرح نا سمجھی سے اس وقت والے بھی آیات کی منسوخی پر کتنے چینی کرتے تھے، اللہ خوب جانتا ہے یعنی وہ مصالح سے واقف ہے کہ اسے کون سا حکم دائمی طور پر نازل کرنا چاہیے اور کون سا وقتی طور پر جس کا مصلحت کے بدلنے سے بدلنا لازمی ہے۔

[۱] کمال قال اذا قتم الى الصلوة فاغسلوا والمعنى اذا اردتم القيام بها (تبیان)

[۲] به ای اللہ تعالیٰ (جلالین)

وَلَقَدْ نَعَلِمَ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ لِّسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ

أَعْجَبِي وَهَذَا لِسَانُ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ﴿١٣٦﴾

”اور بے شک وقتاً فوقتاً ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ بس ایک آدمی ہے جو سکھاتا ہے جس کی طرف یہ نسبت دیتے ہیں، اس کی زبان عجمی ہے اور یہ صاف سلیس عربی زبان ہے۔“
یہ کون شخص تھا جس کی طرف وہ نسبت دیتے تھے کہ وہ حضرت کو سکھاتا ہے؟
ایک قول یہ ہے کہ:

”ایک شخص غلام رومی نصرانی مکہ میں تھا، حضرت کے پاس بیٹھتا محبت سے اللہ کا کلام اور پیغمبروں کا احوال سننے کو، کافر کہتے وہی سکھا جاتا ہے“ (موضح القرآن)
دوسرا قول:

ہوقین نصرانی کان النبی ﷺ یدخل علیہ (جلالین)
وہ ایک عیسائی تلواریں بنانے والا تھا جس کے پاس حضرت پیغمبر خدا جایا کرتے تھے۔
ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر میں اس نام ابو قیہ ہے۔ یہ ابن حضرمی کا غلام تھا جو یہودی یا عیسائی تھا، پھر مسلمان ہو گیا تو قریش نے اپنے عناد کے جذبہ میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہی ہے جو رسول گویہ سب باتیں بتاتا ہے (تفسیر علی بن ابراہیم قمی)
شیخ الطائفہ نے کہا ہے:-

قال الضحاك اردوا به سلمان الفارسي (تبیان)

ضحاک کا قول ہے کہ ان کا خیال سلمان فارسی کے متعلق تھا۔

اگر قرآن کی اہمیت صرف بحیثیت مضامین ہوتی تو ان کے اس تصور کا جواب اس طرح نہ ہو سکتا، جس طرح قرآن نے دیا ہے کیوں کہ بہت ممکن ہے کہ مضامین کسی غیر زبان کے آدمی سے معلوم کر کے انہیں اپنی زبان میں منتقل کر لیا جائے مگر چونکہ قرآن کی اہمیت بحیثیت فصاحت و بلاغت بھی ہے جس میں مضامین کے ساتھ اسلوب بیان اور خصوصی عبادات کا دخل ہے۔ اس لیے غیر زبان کے کسی آدمی کی طرف منسوب کرنا بالکل خلاف عقل ہے۔

اس سے اعجاز قرآن کے متعلق اس تصور کا غلط ہونا ثابت ہوتا ہے جو جناب سید المرثی علم الہدیٰ کی طرف نسبت رکھتا کہ قرآن کا اعجاز اس اعتبار سے ہے کہ مقابلہ کرنے والوں کی طاقت کو اللہ سلب کر لیتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو انہیں یوں اس کلام کو سن کر حیرت نہ ہوتی اور وہ اسے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے مقدور سے خارج قرار دے کر اس کے لیے کسی دوسرے مصنف کی تلاش نہ کرتے۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ لَا يَهْدِيهِمُ اللَّهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٣٧﴾

يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ۗ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكٰذِبُونَ ﴿١٣٨﴾

”بلاشبہ وہ جو آیات الہی پر ایمان نہیں رکھتے، انہیں اللہ منزل مقصود تک نہیں پہنچائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ جھوٹ بس وہی گھڑتے ہیں جو آیات الہی پر ایمان نہیں رکھتے اور یہی لوگ جھوٹے ہیں۔“

مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ وَلَكِنْ مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِنَ اللَّهِ ۗ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٦﴾

”جس نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کر لیا، سوا اس کے کہ جو مجبور کیا جائے اور دل اس کا ایمان کے ساتھ مطمئن ہو، بے شک جو کشادہ دلی سے کفر اختیار کرے تو ان پر اللہ کی طرف کا غضب ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔“

ضرورت کے وقت تقیہ کا صریح حکم

اس آیت میں کافروں کے عذاب سے جو استثناء کیا گیا ہے: الا من اکره وقلبه مطمئن بالايمان یہ حکم تقیہ کا بیان ہے جو فطری طور پر تو تمام فرق اسلامیہ نے کیا، عالم انسان کے عقلاء میں متفق علیہ مگر ”سخن“ گسترانہ بحث اور مناظرانہ نوک جھوک کے طور پر اسے فرقہ شیعہ کے مقابلہ میں بطور ایک جرم کے پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں ایک دفعہ تیسرے پارہ میں: اَلَا اَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاتَهُ كَمَا كَرِهْتُمْ لِبَطُورِ اِسْتِثْنَاءِ اِسْ كَا ذِكْرٍ كَمَا كَرِهْتُمْ اَلَا مَنْ اُوْ كَرِهَ وَقَبْلَهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ کہہ کر اس کا استثناء کیا گیا ہے۔ روایتیں بتاتی ہیں کہ یہ آیت جناب عمار بن یاسرؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ انہیں مکہ والوں نے جب پکڑا تو انہوں نے ان کے جبر و تشدد سے کچھ الفاظ ان کی مرضی کے مطابق زبان سے کہہ دیئے مگر اس سے ان کے ضمیر میں ایک پلچل تھی جو ان کے ایمان قلبی کا نتیجہ تھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔^[1]

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”ظالم زبردستی سے اگر منہ سے کفر کا لفظ نکلوا دے، دل میں ایمان ہو تو اس کو گناہ نہیں“ (موضح القرآن)

یہاں تک تو آیت قرآن کی تشریح ہے مگر اس کے بعد وہ اضافہ فرماتے ہیں:-

”لیکن اگر مرنا قبول کرے اور لفظ بھی منہ سے نہ کہے تو شہید اکبر ہے۔“

یہ اضافہ قرآن مجید کی آیت میں تو ہے نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ کلیتہً درست بھی نہیں ہے اس کا باعتبار موارد حکم مختلف ہوتا ہے، جہاں تقیہ بس جائز ہو، وہاں یہ بات ٹھیک ہے لیکن بعض صورتوں میں تقیہ واجب ہوتا ہے۔ اس وقت مخالفت کرنے والا گناہگار اور ”شہید اکبر“ ہونا کیسا، ہلاکت ابدی میں گرفتار ہوگا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلٰى الْآخِرَةِ ۗ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٧﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمِعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۗ

[1] عمار بن یاسر اخذتہ قریش مکہ بقذوبہ بالنار حتی اعطاهم بلسانہ ما ارادوہ وقلبه مطمئن بالايمان (علی بن ابراہیم)

وَأُولَئِكَ هُمُ الْغٰفِلُونَ ﴿١٠٨﴾ لَا جَرَءَ أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُونَ ﴿١٠٩﴾

”یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے دینی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی اور یہ کہ اللہ کا فرجماعت کو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا۔ یہ وہ ہیں کہ اللہ نے مہر لگا دی ان کے دلوں پر اور ان کے سننے کی طاقت اور ان کی نگاہوں پر اور یہی وہ ہیں جو مدہوش ہیں۔ وہ بلاشبہ آخرت میں گھانا اٹھانے والے ہیں۔“

ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا فُتِنُوا ثَمَّ جَهَدُوا وَصَبَرُوا إِنَّ رَبَّكَ

مِّنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١١٠﴾

”پھر یقیناً تمہارا پروردگار ان کے لیے جنہوں نے تکلیفیں پہنچائے جانے کے بعد ہجرت کی، پھر جہاد کیا اور صبر کیا، یقیناً تمہارا پروردگار اس سب کے بعد بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔“

بعض لوگوں نے اس آیت کو تقیہ والی آیت سے مرعبط کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تقیہ کے ساتھ اظہار کفر کرنا تھا تو گناہ مگر اللہ سے بخش دے گا اور اس کا ہمارے بعد مفسرین نے یہ جواب دیا ہے مغفرت کے اصل معنی پردہ پوشی کے ہیں چونکہ ان کے الفاظ سے ظاہراً ان کے متعلقہ گمراہی اور جرم کا خیال قائم ہوتا تھا لیکن اللہ نے ان کی نیت کی صفائی اور ضمیر کے استحکام کو نمایاں کر کے ان سے برائی کے تصور کو دور کر دیا تو اسی کو مغفرت سے تعبیر کیا گیا ہے [۱] مگر ہمیں اس پورے سوال و جواب کی بنیاد ہی سے اتفاق نہیں ہے کیونکہ یہ آیت حکم تقیہ کے بعد بلا فاصلہ تو ہے نہیں بلکہ تقیہ کے استثناء کے بعد ان کا ذکر شروع ہو گیا جنہوں نے خود اپنے سوء اختیار سے یعنی بلا جبر و اکراہ کفر اختیار کیا ان کے عذاب کا ذکر ہوا، اب اس کے بعد کہا جا رہا ہے کہ دباؤ میں آکر واقعی جو کافر ہو گئے یہ بھی اس کے بعد اگر اعتقاد اپنے درست کر کے اس ماحول سے نکل آئیں اور مستقبل کی زندگی سے اس کی تصدیق ہو کہ اب وہ حق کے راستے پر ہیں اس لئے راہ حق میں جہاد کرتے ہیں اور پھر ثابت قدم بھی رہتے ہیں تو وہ جو درمیان میں ان کا کفر تھا اس پر اللہ پر مواخذہ نہ کرے گا کہ وہ غفور و رحیم ہے اس کا حکم تقیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنِ نَفْسِهَا وَتُوْفَىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا

يُظْلَمُونَ ﴿١١١﴾

”جس دن ہر ایک متنفس آئے گا خود اپنی طرف سے لڑتا ہوا اور ہر متنفس کو جو اس نے کیا ہوگا، اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر کوئی زیادتی نہ ہوگی۔“

یعنی اس دن نفسا نفسی کا عالم ہوگا ہر ایک کو بس اپنی فکر ہوگی کسی دوسرے کی فکر نہ ہوگی [۲] اس سے مستثنیٰ وہی افراد ہوں گے جنہیں خالق کی طرف سے شفاعت کا منصب عطا کیا گیا ہے۔

[۱] فلما كشف الله عن باطن امرهم واخبر انهم كانوا مطمئنين بالابمان كان في ذلك مستر عليهم (تبيين)

[۲] لا يبها غيرها (جلالين)

وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِأَنْعَمِ اللَّهِ فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ﴿١١٢﴾

”اور اللہ نے ایک مثال پیش کی ہے اس بستی کی جو امن و اطمینان کے عالم میں تھی تو اس کے پاس اس کی روزی فراغت کے ساتھ آ رہی تھی ہر طرف سے مگر اس نے اللہ کی نعمتوں کے مقابلہ میں ناشکرے پن سے کام لیا تو اللہ نے اسے بھوک اور خوف و دہشت کے غلبہ کا مزہ چکھایا اس کی سزا میں جو وہ کرتے تھے۔“
بعض اہل تفسیر لکھتے ہیں کہ اس بستی سے مراد خود مکہ معظمہ ہے۔^[۱]

اور شاہ ولی اللہ سے ایک عام مثال قرار دیتے ہیں اور حقیقتاً یہ دونوں ہی قول قدیم مفسرین کے یہاں پائے جاتے ہیں جن میں سے بعد کسی نے ایک لے لیا اور کسی نے دوسرا۔

وَلَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظَالِمُونَ ﴿١١٣﴾

”اور ان کے پاس آیا ہے ایک پیغمبر انہی میں سے تو انہوں نے اسے جھٹلایا تو انہیں گرفت میں لے لیا عذاب نے درحالیکہ وہ ظالم تھے۔“

یہ آیت تنزیل میں اگر گزشتہ آیت سے متعلق ہو تو وہ اسی بستی کا ذکر ہوگا مگر یہ اس تفسیر کی بناء پر دشوار ہے جس میں اس بستی سے مراد مکہ معظمہ لیا گیا ہے اس لئے پھر رسول سے مراد یہ حضرت ختمی مرتبت ہو گئے اور یہ آپ کی خصوصیت ہے کہ اپنی قوم کے لئے کبھی بر بنائے تکذیب بد دعا نہیں کی اس لئے آپ کی قوم پر اس دنیا میں عذاب استیصال نہیں آیا۔

چونکہ ترتیب موجود مطابق تنزیل نہیں ہے اس لئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آیت گزشتہ آیت کے ساتھ اتصال رکھتی ہے اور اس بناء پر میں نے اس آیت کو الگ خارج کر کے اس کا ترجمہ کیا اور اس صورت میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس آیت میں کس قوم کا ذکر ہے بہر حال وہ کوئی ایسی قوم ہے جس پر تکذیب رسول کی وجہ سے من حیث القوم عذاب نازل ہوا۔

فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا ۚ وَاشْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ إِن كُنْتُمْ إِنِّيَاةً تَعْبُدُونَ ﴿١١٤﴾ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَالْحَيْزِرَ وَمَا أَهْلٌ لِّغَيْرِ اللَّهِ بِهِ ۗ فَمَنْ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١١٥﴾

”کھاؤ پیو اس سے جو اللہ نے تمہیں پاک، حلال رزق دیا ہے اور اللہ کی نعمت کے شکر گزار رہو۔ اگر تم صرف اس کی

[۱]. مکہ و المراد اہلہا (جلالین) یہ احوال فرمایا کہ یا کی کا (موضح القرآن)

عبادت کرتے ہو، اس نے بس تم پر حرام کیا ہے مردار اور خون اور سور کے گوشت کو اور اسے جسے اللہ کے سوا کسی اور کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو، ہاں جس شخص کو اضطرابی صورت پیش آئے اور نہ وہ باغی ہو، نہ تعدی کرنے والا تو یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔“

اس مضمون کی آیت پہلے آچکی ہے اور وہاں اس پر تبصرہ ہو چکا ہے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَذَا حَلَلٌ وَهَذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۗ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ﴿١٦٦﴾ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٦٧﴾

”اور جن چیزوں پر تمہاری زبانیں غلط طور پر حکم لگاتی ہیں، ان کے لیے یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے کہ اس طرح تم اللہ پر تمہمت لگاتے ہو، یقیناً وہ جو اللہ پر جھوٹ منڈھتے ہیں وہ دین و دنیا کی بہتری نہیں پائیں گے۔ بہت ٹھوڑا فائدہ اور ان کے لیے عذاب دردناک ہے۔“

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۖ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿١٦٨﴾

”اور ان پر جو یہودی ہیں، ہم نے وہ چیزیں جو آپ کے سامنے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، حرام کر دیں اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا مگر وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے رہے تھے۔“

جماعت یہود کے لئے خصوصی طور پر جو چیزیں ممنوع قرار دی گئی تھیں ان کا سورہ انعام میں ذکر ہوا ہے کہ:

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفْرٍ ۖ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۗ ذَلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِبَعْضِ مَا كَفَرُوا (انعام - 146)

اس آیت میں بھی آخر میں کہا گیا ہے کہ یہ پابندیاں ان پر بطور سزا عائد کی گئی تھیں اور یہاں بھی آخر میں کہا جا رہا ہے کہ ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے رہے تھے اس کا مطلب یہی ہے کہ ہماری طرف سے جو ہوا وہ ان کے ظلم و تعدی کی بناء پر سزا کی حیثیت رکھتا تھا۔

ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ عَمِلُوا السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا ۗ إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٦٩﴾

”پھر بلاشبہ تمہارا پروردگار ان کے لیے جو نادانی میں برائی کا ارتکاب کر لیں، پھر اس کے بعد توبہ کر لیں اور عمل درست کر لیں تو یقیناً تمہارا پروردگار اس کے بعد ضرور بالضرور بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔“

گذشتہ کے ربط سے اس کا مطلب یہ کہا گیا ہے کہ:

یعنی حلال اور حرام میں جھوٹ بنانے والے جب مسلمان ہوئے تو بخش دیئے گئے (موضح القرآن)
لیکن اگر آیت کا حکم عام لیا جائے جیسا کہ باعتبار معنی واقعی وہ عام ہے تو گزشتہ سے ربط قائم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا ۖ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٣٠﴾ شَاكِرًا
لِلَّانِعْمَةِ ۖ اجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿١٣١﴾ وَاتَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ
وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ﴿١٣٢﴾ ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنْ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ
حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٣٣﴾

”بلاشبہ ابراہیم علیہ السلام ایک امت تھے جو خالص اللہ سے لو لگانے والے، غلط راستے سے ہٹے ہوئے تھے اور
مشرکوں میں سے نہ تھے۔ اللہ کی نعمتوں کے شکر گزار ہوتے ہوئے۔ اس نے انہیں منتخب کیا اور انہیں سیدھے
راستے پر لگایا۔ اور ہم نے انہیں دنیا میں بھی بھلائی دی اور بلاشبہ وہ آخرت میں بھی نیک لوگوں میں سے ہیں۔ پھر
ہم نے آپ کو بھی پیغام دیا کہ آپ ابراہیم کی ملت کی پیروی کیجئے باطل سے علیحدہ رہتے ہوئے اور وہ مشرکوں میں
سے نہ تھے۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک عبادت گزار امت، اتباع ملت ابراہیم کا حکم

ابراہیم علیہ السلام ایک امت تھے اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ اوصاف حمیدہ کا ایسا مجموعہ تھے کہ ایک پوری قوم میں جتنے الگ الگ اوصاف
کثیر التعداد افراد میں پھیلے ہوئے تھے وہ سب ان میں اکٹھے اور یہ بھی مطلب لیا گیا ہے کہ وہ امام یعنی مرکز اقتدار تھے یا ایک پوری امت کے
لئے مثالی نمونہ تھے۔^[۱]

بعض مفسرین نے ان تمام باتوں کو سمو کر مطلب لیا ہے^[۲] اور بعض نے امت کو مجموعی قوم کے معنی میں لے کر درمیان میں حذف و
تقدیر مان کر یہ مطلب لیا ہے کہ ایک بڑی تعداد نوع انسانی کی ان کی امت تھی۔^[۳]

اس کے بعد یہ قابل بحث بات ہے کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ملت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ
آپ مقتدائے کل ہیں مقتدی نہیں ہیں یہاں پر ہماری قدیم تفسیر بتاتی ہے کہ ملت ابراہیم علیہ السلام سے مراد وہ دس (۱۰) سنن ابراہیمی میں ختنہ وغیرہ

[۱]. تھائیٹوا (شاہ فیح الدین)

[۲]. اما ما قدوة جامع الخیر (جلالین)

[۳]. قال بعضهم كان ذا امة (تبیان)

جنہیں شریعت اسلام کا جز بنا لیا گیا ہے۔^[۱]

إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ ۗ وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ

الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا يَخْتَلِفُونَ ﴿۱۳۷﴾

’ہفتے والے حکم کی پابندیاں تو ان لوگوں پر عائد کی گئی تھیں جنہوں نے اس بارے میں اختلاف کیا تھا، اور بلاشبہ تمہارا پروردگار ان کے درمیان فیصلہ کرے گا قیامت کے دن اس بارے میں جس میں وہ اختلاف رکھتے تھے۔‘
چونکہ قوم یہود میں سبت کا حکم تھا مگر اسلام میں یہ حکم نہیں ہے اور پھر گذشتہ آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقوں پر چلنے کی ہدایت کی گئی تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم تو قوم یہود کے بھی مورث اعلیٰ ہیں۔

جب دونوں ہی حضرت ابراہیم کے ورثہ دار ہیں تو یہ اختلاف کیوں ہے کہ سبت کے احکام وہاں ہیں اور یہاں نہیں اس کا جواب یہ دیا جا رہا ہے کہ یہ احکام ملت ابراہیمی میں تو موجود نہ تھے بلکہ یہ تو یہود کے لئے ان کے باہمی اختلاف کی سزا میں عائد کئے گئے لہذا اب رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو براہ راست ملت ابراہیمی کی پیروی کے ذمہ دار ہیں اس حکم کی پابندی کیوں کریں؟^[۲]
یہ اس صورت میں ہے کہ جب کہ اس آیت کو گذشتہ آیات کے ساتھ نازل شدہ مانا جائے اور اگر یہ آیت علیحدہ نازل ہوئی تو پھر اس سے بس یہ نتیجہ سمجھ میں آتا ہے کہ باہمی اختلاف اللہ کو ہمیشہ سے ان پسند رہا ہے۔^[۳]

أَدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ

أَحْسَنُ ۗ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿۱۳۸﴾

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ ۗ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ

لِلصَّابِرِينَ ﴿۱۳۹﴾ وَأَصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ

مِمَّا يَمْكُرُونَ ﴿۱۴۰﴾

’اپنے پروردگار کے راستے کی طرف دعوت دیجئے حکمت اور اچھے عنوان سے وعظ و نصیحت کے ساتھ اور ان سے بحث کیجئے بہتر سے بہتر ذریعہ سے۔ آپ کا پروردگار خوب واقف ہے کہ کون اس کی راہ سے ہٹا ہوا ہے اور وہ خوب جانتا ہے ان کو جو سیدھی راہ پر قائم ہیں۔ اور اگر تم لوگ سزا دو تو ویسی ہی جیسی تمہیں سزا دی گئی تھی اور اگر صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے۔ اور آپ تو صبر ہی کیجئے اور نہیں آپ کا صبر و تحمل مگر اللہ کی مدد سے اور ان پر رنج

[۱] ہی الحنیفیة العشر التي جاء بها ابراهيم (علی بن ابراہیم)

[۲] یعنی اصل ملت ابراہیم میں ہفتہ کا کچھ حکم نہ تھا اس امت میں بھی نہیں (موضح القرآن)

[۳] حذر عن الاختلاف (تبیان)

نہ کیجئے اور دل تنگ نہ ہو جائیے اس سے جو وہ ترکیبیں کرتے رہتے ہیں۔“

دعوت و تبلیغ کے لئے حکیمانہ انداز کی ہدایت، ضبط و تحمل اور رواداری سے کام لینے کی خصوصی تاکید

اگر ایک ہی سلسلہ کی یہ آیات ہیں اور یہاں کچھ اور نہیں ہے کہ ایسا ہی ہوتو ان میں مجموعی طور پر ایک عجیب شان پیدا ہو گئی ہے۔ شروع میں ”واحد مذکر حاضر“ کے صیغوں کے ساتھ مخاطب تو خود حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے [۱] اور ان میں آپ کو یہ ہدایت ہے کہ آپ نے اپنے پروردگار کے راستے کی طرف دعوت دیجئے علم و حکمت اور اچھے مواعظ و نصیحت کے ساتھ اور بحث کیجئے تو ایسے انداز میں جو بہتر سے بہتر ہو اس میں نہ کسی جارحانہ عمل کا ذکر ہے نہ ان کی ایذا رسانی پر بطور سزا کسی سختی کا تذکرہ ہے پھر صیغے جمع مذکر حاضر کے ہیں ان میں مسلمانوں سے گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تو یہ شان ہی نہیں ہے کہ آپ بدلہ لینے یا سزا دینے کا ارادہ بھی کریں لیکن تم اگر گذشتہ نکالیف کا بدلہ لینا چاہتے ہو تو اس کا خیال رکھنا کہ یہ بدلہ اس عمل سے بڑھنے نہ پائے جو انہوں نے تمہارے ساتھ کیا ہے بس اسی حد تک تشدد کا تمہیں حق ہے جتنا تمہارے ساتھ تشدد ہو چکا ہے اور اتنا بھی کرنا تمہارے لئے کوئی اچھی بات نہیں ہے اگر صبر و برداشت سے کام لو تو وہ بہتر ہے۔

یاد رہے کہ یہ مکافاة بالمثل کی اجازت بتا رہی ہے کہ یہ حکم ان لوگوں کے بارے میں نہیں ہے جو دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں کیوں کہ وہاں تو اصول یہ ہے کہ السلامہ یجب ما قبلہ (یعنی جو کچھ بھی وہ شخص پہلے کر چکا ہو اسلام لانے کے بعد وہ کالعدم ہو جاتا ہے اور اب اس کی مکافات کا کبھی بھی سوال پیدا نہیں ہوتا لہذا یہ صبر و برداشت اور عفو و درگزر کی تعلیم اس غیر قوم کے ان افراد سے متعلق ہے جو اب تک اپنوں کے دائرہ میں داخل نہیں ہوئے ہیں۔

پھر یہ کہ صبر و برداشت کی دعوت بے بسی کے عالم میں نہیں ہے اس لئے اس دور میں جب مسلمان بے بسی کے عالم میں ہوں یہ کہنے کے کوئی معنی نہیں کہ اگر بدلہ لینا ہوگا تو بس اتنا ہی کرنا جتنا تمہارے ساتھ ہوا ہے جب بدلہ لینے پر قدرت ہی نہیں تو بدلہ لینے کا تصور ہی کہاں پیدا ہوگا یہ کہنے سے کہ ”اگر بدلہ لینا چاہو تو بس اتنا ہی کرو“ صاف ظاہر ہے کہ اب طاقتور تھے ہیں کہ جتنا پہلے ہوا تھا اس سے زیادہ بھی کر سکتے ہیں پھر کہا جا رہا ہے کہ صبر و برداشت سے کام لو تو یہ زیادہ بہتر ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ عاجزی کی تعلیم نہیں ہے بلکہ جزبہ انتقام سے کام نہ لے کر اپنے جی کو مارنے کی تعلیم ہے۔

اس کے پہلے عنوان خطاب کے بدلنے ہی سے پتہ چل گیا تھا کہ بدلہ لینے کا تصور خود رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو کریں گے ہی نہیں مگر اب صراحتاً متکلم قرآنی نے پھر پیغمبر خدا کو بصیغہ واحد مذکر حاضر مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ تو بہر حال صبر ہی سے کام لیجئے اور یہ صبر ایک ایسا کارنامہ ہوگا جو عام انسانی قوت برداشت کی حد اور ان کے مظالم کو دیکھتے ہوئے عام انسانی حدود و امکان سے باہر ہے یہ صبر آپ کا بس خداوند عالم کی طرف کی تائید اور اس خصوصی ضبط نفس کے درجہ سے ہے جو آپ کو مبداء فیاض سے عطا ہوا ہے۔

پھر فقط یہی نہیں کہ عملی طور پر ان کے مظالم کا بدلہ نہ لیجئے بلکہ ان کی بدسلوکیوں پر جو وہ کرتے رہے اور پھر اب آپ ان کا کچھ بدلہ بھی

[۱] ادع الناس یا محمد ﷺ (جلالین)

نہیں لیتے اپنے دل میں کڑھیں بھی نہیں اور اس کی فکر نہ کیجئے کہ اب وہ آپ کے خلاف کیا کیا منصوبے بناتے ہیں اس طرح حزن جس سے منع کیا جاتا ہے وہ ماضی کی یاد سے متعلق ہے اور یہ دل تنگی جس سے روکا جا رہا ہے حال اور مستقبل میں ان کی ترکیبوں سے تعلق رکھتی ہے۔

یہ اسلام کی فرخ حوصلگی کی کتنی اہم دستاویز ہے جو قرآن میں موجود ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ بعض جمہوری تصور کے مفسرین جو ذہنی طور پر حقیقت اس کے قائل معلوم ہوتے ہیں کہ اسلام تلوار کا مذہب ہے اس حکم کے لئے اپنے پروردگار کے راستے کی طرف دعوت دیجئے حکمت اور اچھے وعظ و نصیحت کے ساتھ اور ان سے بحث کیجئے ایسے انداز سے جو بہتر سے بہتر ہو۔ یہ لکھ دیتے ہیں کہ:

هَذَا قَبْلَ الْاَمْرِ بِالْقِتَالِ (جلالین) یہ جنگ کا حکم آنے سے پہلے کی بات تھی۔

یعنی ان کے نزدیک جنگ کا حکم آنے کے بعد نہ دعوت و تبلیغ کوئی چیز رہی اور نہ بطریق احسن بحث مباحثہ کی بات رہی اب تو تلوار رہ گئی اور بس تلوار! (لا حول ولا قوة الا باللہ۔

پہلی آیت کو اس کی بلند سطح سے اپنے ذہن کی پست سطح پر لانے کے بعد وہ دوسری آیت کو باوجود پہلی آیت سے متصل ہونے سے نظم قرآنی کے ان پر جوش حامیوں نے پہلی آیت سے بالکل غیر متعلق قرار دیا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک وہ آیت تو حکم جہاد سے آنے سے قبل کی ہے اور اس دوسری آیت جو جب کہ اُس میں جمع مذکر حاضر کے صیغے ہیں جو عام مسلمانوں سے مخاطب کی صاف دلیل ہیں خود رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق کر کے ایک غلط حدیث کا سہارا لیتے ہیں کہ جناب حمزہؓ کی لاش کی جو بے حرمتی ہوئی تھی اس پر رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھالی تھی کہ اب میں ان کافروں کو جب قتل کروں گا تو ان کے ساتھ یہی سلوک کروں گا اس پر یہ آیت اتری ہے۔

ہمارے نزدیک نہ یہ حدیث درست ہے اور نہ الفاظ قرآنی یہاں براہ راست رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہیں ہمارے نزدیک یہ تینوں آیات یہاں کی ایک ڈال ہیں اور ان سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے اس پر اللہ کی دی ہوئی بصیرت قرآنی سے ہم تبصرہ کر چکے ہیں۔ (واللہ یہدی من یشاء الی صراط مستقیم)

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ ﴿١٧٨﴾

’یقیناً اللہ ان کے ساتھ ہے جو (غلط کاری سے) بچتے رہیں اور جو اچھا کردار قائم رکھیں‘۔

یہ آیت بھی مقام تنزیل میں گذشتہ آیات سے متصل ہو تو بعید نہیں ہے تو جس سابقہ کردار کا حکم دیا گیا تھا اس پر ایک عام اصول اور کلیہ کے طور پر اس آیت کا مضمون بالکل چسپاں ہے۔

سُورَةُ بَنِي إِسْرَائِيلَ

مکیہ [۱] ----- ۱۱۱- آیات

ہر شب جمعہ اس سورہ کو پڑھنے کی تاکید ہوئی ہے۔

چونکہ اس سورہ کی پہلی آیت میں ”اسراء“ یعنی معراج کا ذکر ہے اس لئے حق بجات طور پر اس سورہ کو سورۃ الاسراء کہنا درست ہے مگر اس کے بعد بنی اسرائیل کا ذکر اور ان کے ساتھ مخاطب ہے اس لئے عموماً پیشانی پر جو نام لکھا ہوا ملتا ہے وہ بنی اسرائیل ہے حالانکہ بنی اسرائیل کا ذکر دوسرے بعض سوروں میں سے اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ موجود ہے مگر سوروں کے ناموں میں اس کی مثالیں اکثر موجود ہیں جس پر پہلے تبصرہ ہو چکا ہے اس حدیث میں بھی جو اس کے پڑھنے کی فضیلت میں وارد ہوئی ہے اس سورہ کا یہی نام ہے۔ [۲]

ان دو چیزوں کے علاوہ اس سورہ میں حسب ذیل مضامین آئے ہیں:-

سورۃ بنی اسرائیل کے خاص خاص مضامین:

۱----- بنی اسرائیل کی دوسرے تہ خراب کاری اور اس کی پاداش

۲----- نامہ اعمال

۳----- ہلاکت اقوام کا نظام عام

۴----- حقوق والدین

۵----- فضول خرچی کی مذمت

۶----- خرچ میں میانہ روی کی ضرورت

۷----- قانون قصاص

۸----- ناپ تول میں انصاف کا حکم

۹----- منکرین معاد کی رد

۱۰----- مخالفین حق سے روادارانہ گفتگو کی تعلیم

۱۱----- شجرہ ملعونہ

[۱] بعض مفسرین نے پانچ آیتوں کو مستثنیٰ کہا ہے کہ وہ مدینہ کی نازل شدہ ہیں (مجمع البیان)

[۲] عن الصادق قال: من قرء اسورۃ بنی اسرائیل فی کل لیلۃ جمعۃ لحدیث حتی یدرک القائم ویكون من اصحابہ (مجمع البیان)

۱۲----- اوقات نماز کا بیان

۱۳----- پیغمبروں کی بشریت

۱۴----- جناب مویٰ کے معجزات

۱۵----- گریہ کی تعریف

۱۶----- جہر و اخفات کے درمیان نماز ادا کرنے کا حکم وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلٰی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا

الَّذِیْ بَرَّکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیْہٖ مِنْ اٰیٰتِنَا ۗ اِنَّہٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ﴿۱﴾

”پاک ہے وہ جو لے گیا اپنے بندہ کو ایک رات مسجد حرام سے انتہائی اونچے سجدہ کے مقام تک جس کے گرد و پیش ہم نے برکت ہی برکت قرار دی ہے تاکہ ہم انہیں دکھائیں اپنی کچھ نشانیاں یقیناً وہ سننے والا ہے، بڑا دیکھنے والا“۔

معراج پیغمبر اسلام

یہ مشہور و معروف آیت واقعہ معراج پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہے چونکہ کہ زمانہ بنی امیہ میں ”المسجد الاقصیٰ“ نام رکھ لیا گیا فلسطین کی مسجد بیت المقدس کا اس لئے اہل سنت نے اس آیت میں جو المسجد اقصیٰ کا لفظ ہے اسے بیت المقدس ہی پر محمول کیا ہے۔^[۱]

زیادہ سے زیادہ یہ کہا ہے کہ یہ سفر معراج کی پہلی قسط تھی جس کا یہاں قرآن مجید نے ذکر کیا ہے یعنی پہلے آپ کے لئے مکہ سے شام تک کی مسافت طے ہوئی اور پھر آپ آسمان پر تشریف لے گئے جس کا سورہ النجم کی آیات میں ذکر ہے چنانچہ شاہ ولی اللہ تحریر کرتے ہیں۔

یعنی خدا تعالیٰ در شب معراج پیش از صعود بر آسمانہاں حضرت را بمسجد بیت المقدس رسانید (فتح الرحمن)

یعنی معراج کی رات خداوند عالم نے آسمان پر بلند ہونے سے پہلے آنحضرت کی بیت المقدس کی طرف پہنچایا۔

”حق تعالیٰ اپنے رسول کو معراج کی رات لے گیا مکہ سے بیت المقدس براق پر اور آگے لے گیا آسمانوں پر یہاں اتنا ذکر ہے باقی

سورہ نجم میں ہے (موضح القرآن)

ہمارے بھی مفسرین نے جمہور کی اس تفسیر کی جو مسجد اقصیٰ کے لفظ کے متعلق ہے رد نہیں کی ہے مگر اس کی تائید میں معصومین کی روایت بیان نہیں کی ہے بلکہ اسکی نسبت انہی راویوں کی طرف دی ہے جو اہل سنت کے یہاں مقبول ہیں لیکن اعتبار سند کے لئے ہمارے نقطہ نظر سے وہ

[۱]. المسجد الاقصیٰ ہر بیت المقدس و ہو مسجد سلیمان داؤد فی قول الحسن وغیرہ من المفسرین (تبیان)

معیار نہیں بن سکتے اور اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ بن امیہ کے زمانہ کی اس اصطلاح کا وجود عہد تنزیل قرآن میں ثابت نہیں ہے لہذا ہم نے ترجمہ میں مسجد اقصیٰ کا لفظ بطور نام کے نہیں لکھا بلکہ تصنیفی حیثیت سے اس کا جو مفہوم ہے اور جو عالم بالا کے بلند ترین نقطہ پر منطبق ہے تحریر کیا ہے۔

جناب شیخ طوسی نے منفقہ شیعی نقطہ نظر تو یہ پیش کر دیا ہے کہ معراج آسمان کی طرف ہوئی مگر مسجد اقصیٰ کے اس مفہوم کو پیش نظر رکھ کر یہ کہہ دیا ہے کہ بیت المقدس تک سفر قرآن سے ظاہر ہے اور اس کے آگے احادیث سے ثابت ہے [۱] مگر ہمیں یہاں جناب شیخ سے شدید اختلاف ہی نہیں بلکہ شکایت ہے کہ انہوں نے اس سے آگے کے لئے صرف احادیث کا حوالہ دیا جب کہ مفسرین اہل سنت بھی جو اس آیت سے صرف بیت المقدس تک جانے کا استفادہ کرتے ہیں آگے کے سفر کے ثبوت کو صرف احادیث پر محمول نہیں کرتے بلکہ قرآن مجید ہی کے دوسرے محل یعنی سورہ والنجم کا حوالہ دیتے ہیں۔

علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اگرچہ اکثر جگہ صرف جناب شیخ طوسی کی تفسیر تیان کا تتبع کیا ہے مگر یہاں انہوں نے اپنی جانب سے کافی بسط و تفصیل کے ساتھ محققانہ انداز میں بحث کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کے علاوہ معراج کے بارے میں جو احادیث وارد ہیں ان کے مضامین میں بہت اختلافات پایا جاتا ہے لہذا معراج کے متعلق جو نقطہ نظر ہے اور ہونا چاہئے اسے ہم چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

اول جس حد تک قطعی ہے اور ہر مسلمان کو بتقاضائے اسلام اسے ماننا ضروری ہے وہ مجملاً یہ ہے کہ خالق اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو غیر معمولی طور پر لے گیا اور معراج پر آپ کو مشاہدات کرائے اس سے قطع نظر کہ کہا تک لے گیا اور آپ نے کیا کیا دیکھا؟ ”غیر معمولی“ اور ”معجزانہ“ سے یہ نتیجہ پر نکلتا ہے کہ جہاں تک بھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ لے گیا یقیناً عالم بیداری میں تھا خواب نہ تھا۔ [۲]

دوسرے وہ ہے جو اخبار میں آحاد میں ہے اور کسی اصول عقلی یا ضرورت دین کے خلاف نہیں ہے اسے بس ہر ممکن الوقوع سمجھتے ہیں اور ان کے درجہ اعتبار کے لحاظ سے ان کے متعلق گمان غالب یا غیر غالب ہو سکتا ہے۔

تیسرے وہ جن کا ظاہری مفہوم قابل قبول نہیں ہے مگر ان کی معقول تاویل ہو سکتی ہے ان میں در صورت اعتبار روایت کوئی تاویل ضروری ہے جو منطقی دلیل اور ضرورت دین کے موافق ہو اس میں وہ روایات داخل ہیں جن میں یہ ہے کہ حضرت نے کچھ خاص اچھے کام کرنے والوں کو بہشت میں دیکھا کہ وہ نعم الہی سے بہرہ ور ہو رہے ہیں اور کچھ خاص گناہوں کے مرتکب افراد کا انجام دیکھ کہ دوزخ میں ان پر طرح طرح کا عذاب ہو رہا ہے چونکہ ثواب بہشت اور عذاب دوزخ کا اصل ہنگامہ بعد قیامت ہے اس لئے ہم اسکی تاویل یہ کر سکتے ہیں کہ آپ کو تمثیلی طور پر یہ مناظر دکھائے گئے جو بعد میں حقیقی طور پر رونما ہونگے۔

چوتھی قسم وہ ہے جس کا ظاہری مفہوم خلاف مسلمات عقلیہ و ضروریات دین ہے اور ان کی زبردستی کے بغیر کوئی صحیح توجیہ و تاویل نہیں ہو سکتی ان باتوں کا رد ضروری ہے جیسے حضرت کا خالق کو عرش پر دیکھنا اور اس کے پہلو میں بیٹھنا اور مندر منہ ہم کلام ہوتو یہ باتیں شان الوہیت کے خلاف ہیں۔

اس طرح یہ خود حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ کو چاک کیا گیا اور آپ کے دل کو معاذ اللہ آلائشوں سے پاک کیا گیا یہ شان رسالت کے خلاف

[۱] الذی یشہد بہ القرآن الاسراء من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ والباقی یعلم بالخیر۔ (تبدیان)

[۲] ما قال بعضهم ان ذلک کان فی النور فی فظاھر البطلان اذ لا معجز یكون فیہ ولا برهان (مجمع البیان)

ہے ایسی تمام روایتوں کا رد کرنا ضروری ہے۔

وَاتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا تَنخَضُوا مِنْ دُونِي
وَكَيْلًا ۝ ذُرِّيَّةً مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ۝ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا ۝

’اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا کی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت قرار دیا کہ نہ قرار دے مجھے چھوڑ کر کسی کو کارساز۔ [۱] اے اس نسل کے لوگو! جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا تھا! بلاشبہ وہ شکر گزار بندہ تھا۔‘

اسلامی روایت کے لحاظ سے نسل نوح سے خطاب مثل یا ایہا الناس اور یا بنی آدم ہے کہ تمام نوع انسانی کو عام ہے کہ کیونکہ نوح ہمارے نزدیک آدم ثانی ہیں اب موجودہ نسل انسانی سب نوح کی اولاد سے ہے [۲]

بلاشبہ وہ شکر گزار بندہ تھا کون؟ اس ضمیر کو غالباً قرب لفظی کی وجہ سے نوح علیہ السلام کی طرف راجع کیا گیا ہے یعنی نوح علیہ السلام شکر گزار انسان تھا۔ [۳] اور یہ اس لحاظ سے درست سمجھا جاسکتا ہے کہ یہ مستقل آیت ہے لہذا اس کا اتصال مقام تنزیل میں اس کے قبل کی آیت سے یقینی سمجھا جاسکتا ہے۔ ورنہ اسے موسیٰ علیہ السلام سے متعلق ہونا زیادہ نمایاں ہے جن کا ذکر پہلے کی آیت کے سلسلہ کو دیکھتے ہوئے مرکزی طور پر ہے اور اگر یہ آیت اسی سے متصل مانی جائے تو جناب نوح علیہ السلام کا ذکر ضمناً ضمن خطاب ہے۔

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ
عُلُوًّا كَبِيرًا ۝ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولَاهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَنَا أُولِي بَأْسٍ
شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ ۝ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا ۝ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ
عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا ۝ إِنْ أَحْسَنْتُمْ
أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ ۝ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا ۝ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوءُوا
وُجُوهُكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا
تَتَبِيرًا ۝ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يَبْرَحَكُمْ ۝ وَإِنْ عُدْتُمْ عُدْنَا ۝ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ
لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا ۝

[۱] یادگیری من حملنا مع نوح (جلالین) اے فرزندان قومی کہ برداشتیم آن را نوح علیہ السلام یعنی بر کشتی (شاه ولی اللہ)

[۲] . هو خطاب لجميع الخلق لان الخلق كله من نسل نوح من بنیه الثلاثة (تبیان)

[۳] . معناہ ان نوحا كان عبد الله كثير الشكر (مجمع البيان)

”اور ہم نے بنی اسرائیل کو اطلاع دی [۱] اس کتاب میں [۲] کہ تم ضرور ضرور دنیا میں دو مرتبہ خرابی کرو گے اور ضرور تم تکبر سے کام لو گے۔ تو جب ان میں سے پہلی بات کا وقت آئے گا تو ہم تم پر بھیجیں گے اپنے بندے جو بڑی سخت لڑائی لڑنے والے ہوں گے تو وہ گھروں کے اندر داخل ہو جائیں گے اور یہ وعدہ ہے جو ہو کر رہے گا۔ پھر ہم تمہیں ان کے مقابلہ میں غلبہ دیں گے اور تمہیں مال و اولاد کے ساتھ تقویت پہنچائیں گے اور تمہیں تعداد میں بڑی اکثریت دیں گے۔ اگر تم بھلائی کرو گے تو خود اپنے ہی نفس کے لیے بھلائی کرو گے اور اگر برائی کرو گے تو وہ بھی اسی کے لیے ہوگی۔ تو جب دوسری بات کا وقت آئے گا تو یہ نتیجہ ہوگا کہ پھر ویسے ہی لوگ آئیں گے کہ تمہارا حلیہ بگاڑ دیں گے [۳] اور اس مسجد میں اسی طرح داخل ہو جائیں گے جیسے پہلی دفعہ داخل ہوئے تھے۔ اور جس جس چیز پر کہ ان کا قابو ہوگا وہ اسے ملیا میٹ کر دیں گے۔ ممکن ہے کہ اللہ تم پر رحم کرے اور اگر تم نے پھر ایسا کیا تو ہم بھی پھر ایسا ہی کریں گے اور دوزخ کو ہم نے کافروں کے گھیرنے کے لیے قرار دے ہی رکھا ہے۔“

بنی اسرائیل کی دو مرتبہ خراب کاری اور اس کی پاداش

یہ تمام تذکرہ ہے ان انقلابات کا جو بنی اسرائیل کو پیش آئے جس کی خبر پہلے سے کتب سابقہ میں دی جا چکی تھی۔ دو دفعہ بنی اسرائیل نے سرکشی اور نافرمانی سے کام لیا اور اس کے نتیجہ میں ان پر دوسرے طاقتور لوگ غالب آ گئے۔ پہلی دفعہ جالوت کا تسلط ہوا اور عرصہ دراز تک بنی اسرائیل اس کے قہر و غلبہ میں مبتلا رہے جس کے بعد جالوت کی سرکردگی میں اس سے مقابلہ ہوا تو جناب داؤد نے جالوت کو قتل کیا اور اب جناب داؤد اور جناب سلیمان کو اقتدار حاصل ہوا یہ وہ درمیانی دور ہے جس کا قرآن نے حوالہ دیا ہے کہ ہم نے تم کو پھر ان پر غلبہ دیا اور تمہیں اموال و اولاد میں فراوانی عطا کی اس کے بعد دوسری مرتبہ جب ان کی بد اعمالیاں زیادہ ہوئیں تو نجات نصرنے ان پر تسلط قائم کیا اور انہیں تباہ و برباد کر دیا یہ وہ دوسری بار ہے جس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ ایک تشریح ان دو دفعہ کی ہے مگر اس کے علاوہ بعض دوسرے اقوال بھی ہیں جن کا ذکر علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں کیا ہے اور بعض مفسرین نے کہہ دیا ہے تاریخ بنی اسرائیل کے گونا گوں انقلابات میں سے کون دو انقلاب ہیں جنہیں خاص طور پر قرآن مجید نے یاد دلایا ہے؟ اس کا بیان خود قرآن مجید میں ہے نہیں، نہ مستند احادیث موجود ہیں تو ہم یقینی طور پر ان کی تعیین نہیں کر سکتے نہ اس کے جاننے کی کوئی خاص ضرورت ہے۔ [۴]

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ

[۱]. اعلمناہم (علی بن ابراہیم)

[۲]. حر توریت (شاکولی اللہ)

[۳]. بعثناہم لیسوءا (جلالین)

[۴]. فلا نقطع علی شیء مما ذکر عن ابی علی الجبائی (مجمع البیان)

الصَّلٰىحِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۝۹ وَاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْآخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝۱۰

”بلاشبہ یہ قرآن ہدایت کرتا ہے ایسے راستے کی جو انتہائی درست ہے اور خوش خبری دیتا ہے ان اہل ایمان کو جو اچھے اعمال کرتے ہیں کہ ان کے لئے بہت بڑا صلہ ہے اور یہ کہ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان کے لئے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔“

جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے لئے دردناک عذاب بھی مومنین کے لئے جزء بشارت قرار دیا گیا ہے۔^[۱]
معلوم ہوتا ہے کہ فضائل پر مدح کی تکمیل مخالف پہلو کی مذمت کے ساتھ ہوتی ہے۔

وَيَدْعُ الْاِنْسَانَ بِالشَّرِّ دُعَاءً هَالِكًا ۝۱۰ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ۝۱۱

”اور انسان تو بُرائی کی بھی دعا کرتا ہے۔ اسی طرح جیسے وہ بھلائی کی دعا کرتا ہے اور انسان بڑا جلد باز واقع ہوا ہے۔“

چونکہ انسانی علم محدود ہے اس لئے بسا اوقات وہ بھلائی اور برائی میں امتیاز نہیں کرتا لہذا قبولیت دعا بالکل انسان کی خواہش سے وابستہ نہیں رکھی گئی بلکہ خالق اپنی حکمت کے معیار پر جب مناسب سمجھتا ہے اس وقت اس کی دعا قبول کرتا ہے۔
یہی ایک دوسری جگہ بتایا گیا ہے کہ:-

وَعَسَىٰ اَنْ تَكُوْنُوْا شَيْئًا وَّهُوْ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَعَسَىٰ اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوْ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۱۱ (البقرہ)

بہت ممکن ہے کہ کسی چیز کو تم ناپسند کرتے ہو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور بہت ممکن ہے کہ کسی چیز کو تم دوست رکھتے ہو اور وہ تمہارے لئے بری ہو بات یہ ہے کہ اللہ علم رکھتا ہے اور تم علم نہیں رکھتے۔

آخری فقرہ کہ انسان بڑا جلد باز واقع ہوا ہے اس کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ بہت سی بھلائیاں اور برائیاں ایسی برائیاں ہوتی ہیں کہ اگر انسان خود ہی کچھ دن حالات کا مطالعہ کرتا تو ان کا خود اسے علم ہو جاتا مگر وہ جلد بازی کی وجہ سے اکثر اتنا انتظار نہیں کرتا اور بس جذبات کی رو میں بہہ کر جو جس وقت جی چاہا اسے خالق سے مانگ بیٹھتا ہے اب بھلا خالق حکیم اس کی ہر دعا کو کیوں قبول کرے؟

پھر ایک اور صورت بھی ہے کہ انسان جیسے جذبات سے مغلوب اور حالات سے تنگ ہو کر خود کشی کے لئے تیار ہو جاتا ہے ویسے ہی وہ کسی وقتی ناگواری کی بناء پر صر سچا جن چیزوں کو خود برا سمجھتا ہے انہیں اللہ سے مانگنے لگتا ہے جیسے اپنی موت یا بچوں پر غصہ آیا اور انہیں کو کوسنے لگا تو یہ کوسنا بھی اللہ سے دعا ہی ہے خود اس سے صبر و سکون کے لحاظ میں پوچھئے کہ وہ چاہتا کیا ہے کہ اللہ اس کی ایسی دعاؤں کو فوراً قبول کر لیا کرے وہ کہے گا کہ

[۱]۔ یبشر ہم ایضاً بالان الذین لا یؤمنون بالآخرۃ الخ (تبیان و مجمع البیان)

ہرگز نہیں۔^[۱]

پھر جلد بازی اس اعتبار سے بھی ہے کہ دعا کی قبولیت ممکن ہے مناسب موقع کے انتظار میں رکھی ہوئی ہو مگر یہ ادھر کچھ دیر ہوئی اور بس شکوہ کرنے لگا کہ میری دعا قبول نہیں ہوئی یہ اس کی جلد بازی نہیں تو اور کیا ہے؟^[۲]

وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ آيَاتَيْنِ فَمَحْوَنًا آيَةَ اللَّيْلِ وَجَعَلْنَا آيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً
لِتَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ ۗ وَكُلَّ شَيْءٍ
فَصَلَّنَاهُ تَفْصِيلًا ﴿۱۲﴾

”اور ہم نے رات اور دن کو بنیاد و نشانیاں تو مٹا ہوا بنا یا رات والی نشانی کو اور دن والی نشانی کو روشن قرار دیا۔ تاکہ تم اپنے پروردگار کے فضل و کرم کو (کمانی کر کے) حاصل کرنے کی کوشش کرو اور تاکہ تمہیں برسوں کی تعداد اور حساب معلوم ہو اور ہر چیز کو ہم نے پوری طرح کھول کھول کر بیان کر دیا ہے۔“

وَكُلَّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَةً فِي عُنُقِهِ ۗ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ
مَنْشُورًا ﴿۱۳﴾ اقْرَأْ كِتَابَكَ ۗ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا ﴿۱۴﴾

”اور ہر آدمی ہم نے اس کے نامہ اعمال^[۳] کو اس کی گردن سے وابستہ کر دیا ہے اور اس کے لئے قیامت کے دن نکالیں گے نوشتہ جسے وہ کھلا ہوا پائے گا۔ پڑھ لے تو اپنے نوشتہ کو، تو خود کافی ہے اپنے خلاف آج جانچ پڑتال کرنے کے لئے۔“

نامہ اعمال

اعمال نامہ کے گردن سے وابستہ کرنے کا ظاہری مفہوم تو یہی ہے کہ نامہ عمل جو ایک نوشتہ کی صورت رکھتا ہے ہر انسان کے گلے میں پڑا ہوا ہے اور بطور محاورہ اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ یہ ذمہ داری اس کی گردن پر ہے جس سے اسے عہدہ برآ ہونا ہے^[۴] اور قیامت میں وہ اسے نامہ اعمال کی صورت میں سامنے نظر آئے گا بلکہ نص قرآن اس کے ہاتھ میں دیا جائے گا۔

”اعمال نامہ“ کو ”طائر“ کہنا عرب کے اس تصور کے لحاظ سے ہے کہ وہ پرندہ کے دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں جانے کو شگون

[۱]. ویدع الانسان بالشر على نفسه واهله اذا اخجر (جلالین) در حالت تنگدلی بر خود و اولاد خود دعای بدعی کند (فتح الرحمن) فلو

اجاب الله دعاءه لا هلك لكته لا يجيب بفضله ورحمته (مجمع البيان)

[۲]. گھبراتا ہے کہ میری دعا شتاب کیوں قبول نہیں ہوتی (موضح القرآن)

[۳]. طائرہ عملہ الزمنا طائرہ فی عنقه الحکم علیہ ما یرتقہ من ثواب و عقاب (تبیان)

[۴]. فی عرف الناس ویقولون لهذا فی رقتیک (تبیان)

نیک و بد کے طور پر سعادت اور نحوست کی نشان قرار دیتے تھے چونکہ اس کا تعلق مستقبل کے ساتھ ہوتا تھا لہذا قرآن نے حسن و انجام و بد انجامی کی جو آخرت سے وابستہ ہے اور وہ اعمال نامہ کی بناء پر ہے، طائر کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔^[۱]

مَنْ اهْتَدَىٰ فَاِمَّا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۗ وَمَنْ ضَلَّ فَاِمَّا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۗ وَلَا تَزِرُ

وَاِزْرَةَ وِزْرٍ اٰخْرٰى ۗ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾

’جو ہدایت حاصل کرے وہ ہدایت حاصل کرے گا خود اپنے ہی فائدہ کے لئے اور جو گمراہ ہو وہ گمراہ ہو کے خود اپنا ہی نقصان کرے گا اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا اور ہم عذاب کرنے والے نہیں ہیں جب تک کوئی پیغام پہنچانے والا بھیج نہ دیں۔‘

یعنی بغیر اپنی ارادی کوتاہی کے لاعلمی کی وجہ سے اگر انسان غلطیوں میں مبتلا ہو تو سزا دینا عدل الہی کے خلاف ہے اس لئے جب تک وہ پیغمبر بھیج نہیں دیتا جو اس کے احکام پہنچائے اس وقت تک مورد سزا قرار نہیں دیتا، چونکہ زیادہ تر اس کا منشا پیغمبروں ہی کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے لیکن جس حد تک ضمیر انسان کا قطعی طور پر بتا دے کہ یہ باتیں بری ہیں ان میں خود انسان کا ضمیر ہی اللہ کی ترجمانی کے لئے کافی ہے اس لئے انسان ان احکام میں خلاف ورزی کر کے باز پرس سے کبھی بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔^[۲]

وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ

فَدَمَّرْنَا فِيهَا تَدْمِيرًا ﴿۱۶﴾

’اور جب ہم چاہتے ہیں کہ کسی بستی کو ہلاک کریں تو وہاں دولت مندوں کی تعداد بڑھادیتے ہیں۔ تو وہ اس میں فسق و فجور کا ارتکاب کرتے ہیں، تو اس پر فیصلہ قدرت نافذ ہو جاتا ہے تو ہم اسے جیسا چاہتے ہیں تہس نہس کر دیتے ہیں۔‘

ہلاکت اقوام کا عام نظام

یہ آیت مشکلات قرآن میں سمجھی گئی ہے ہمارے اصول کی بناء پر خالق کے تمام کام بر بنائے عدل ہوتے ہیں۔ ’جب ہم چاہتے ہیں کسی بستی کو ہلاک کرنا‘ یہ ارادہ ہلاک کرنے کا بلا جواز نہیں ہو سکتا ضرور ہے ان سے ایسی بد اعمالیاں سرزد ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ ہلاکت کے مستحق ہوتے ہیں اب اس کے بعد جو کچھ ہے وہ انہیں بد اعمالیوں کا خمیازہ ہے اور اب جو ان کے لئے دولت اور سامان

[۱]. قيل للعبل وطائر على عادة العرب في قولهم: جزى طائر بكذا ومثله قوله بسبحانه قالوا طائر كم معكم وقوله: انما طائر

عند الله (مجمع البيان)

[۲]. فتكون الآية خاصة فيما يتعلق بالسمع من الشر غيات فاقاما كانت الحجة فيه من جهة العقل فانه يحق العقاب بتركه (مجمع

البيان)

عیش کی فراہمی و فروانی ہو رہی ہے وہ بھی ان پر بر بنائے مہربانی نہیں بلکہ تمام حجت کے طور پر ان کی مکمل ہلاکت کے استحقاق کی تکمیل ہے۔ پھر یہ فقرہ کہ امرنا متر فیہا اس میں امرنا کا جو لفظ ہے اسے اس امر سے لیا جائے جس کے معنی حکم ہوتے ہیں تو اس کے لئے متعلق کی ضرورت ہے کہ کا ہے کا حکم؟ اب ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اس کے دو لہندوں کو حکم دیتے ہیں تو وہ اس میں فسق و فجور کا ارتکاب کرتے ہیں جیسا کہ شاہ رفیع الدین کے ترجمہ میں ہے:

”بس حکم کرتے ہیں کہ ہم دولت مندوں کو پس نافرمانی کرتے ہیں بیچ اس کے“

تو کیا خالق کی طرف سے معاذ اللہ اسی فسق و فجور کرنے کا انہیں حکم ہوتا ہے اسے کسی منکر عدل کا بھی ضمیر گوارا نہیں کرتا چنانچہ شاہ ولی اللہ ترجمہ میں لکھتے ہیں۔

می فرمائیم سرکشاں آبخا یعنی آنچمی خواہیم پس نافرمانی کردند آنجا

ہم وہاں کے سرکشوں کو حکم دیتے ہیں یعنی ان باتوں کا جو ہمیں مطلوب ہیں تو وہ وہاں نافرمانی سے کام لیتے ہیں

امرنا متر فیہا منعہا بمعنی رؤساءہا بالطاعة علی لسان رسلسنا ففسقوا اخر جو اعن امرنا ہم وہاں کے مترفین ممنعموں یعنی ان کے سرغنہ افراد کو اطاعت کا حکم دیتے ہیں اپنے پیغمبروں کی زبانی تو وہ فسق سے کام لیتے ہیں یعنی ہماری عدل و حکمی کرتے ہیں

مگر احکام تو عمومی ہوا کرتے ہیں یہ خاص طور پر دولت مندوں یا سرغنہ اشخاص کو حکم دینے کے کیا معنی؟ لیکن جب امرنا کو امر بمعنی کثرت سے لے لیا جائے جس کے نظائر کلام عرب میں موجود ہیں جس کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے تو کوئی پیچیدگی باقی نہیں رہتی۔ ہماری قدیم تفسیر بھی اس معنی کو بتاتی ہے [۱] اور علامہ طبرسی نے الحجۃ کے زیر عنوان صدر اول کے بعض ائمہ عربیت کا قول اس کی تائید میں پیش کیا ہے [۲] جس کے بعد اس کے ماننے میں کسی عذر نہ ہونا چاہئے۔

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُونِ مِنْ بَعْدِ نُوْحٍ ۗ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا

بَصِيْرًا ﴿۱۵﴾

”اور کتنی ہی قومیں [۱] تو میں [۲] ہم نے ہلاک کر دیں نوح کے بعد سے اور تمہارے پروردگار سے بڑھ کر اپنے بندوں کے گناہوں کا دیکھنے والا واقف کار کون ہوگا“۔

یہ آیت مضمون کے لحاظ سے قبل والی آیت سے دست و گریباں ہے اس لئے بعید نہیں کہ مقام تنزیل میں بھی اس سے متصل ہو اور اب اس آیت کے آخری فقرہ کو ملا کر دیکھنے قبل والی آیت کے ابتدائی مضمون سے تو صاف سمجھ میں آئے گا کہ اقوام کی ہلاکت کا ارادہ ان کے گناہوں کی

[۱] ای کثرتاً جبار برتہا (علی بن ابراہیم)

[۲] قال ابو عبیدة امرنا اکثر من قولہما امر بنو فلان ای کثراً (مجمع البیان)

[۳] کم یفید التکثیر صد ’رُبّ‘ الذی یفید التقلیل (تبیان)

[۴] من القرون ای من الالہم الکثیرة المکذبة (مجمع البیان)

کثرت کی بناء پر ہوا کرتا ہے نہ کہ بلا وجہ جو کہ عدل و حکمت باری تعالیٰ کے خلاف ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ
جَهَنَّمَ ۖ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَّدْحُورًا ﴿١٨﴾ وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا
وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا ﴿١٩﴾ كَلَّا نُؤْتِيهِمْ هَؤُلَاءِ وَهَؤُلَاءِ مِنْ
عَطَاءِ رَبِّكَ ۗ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا ﴿٢٠﴾

”جو اس دنیا کا طالب ہو اسے ہم اسی دنیا میں دے دیتے ہیں جتنا جسے ہمیں دینا ہوتا ہے پھر اس کے لیے دوزخ قرار دیتے ہیں جس کی گرمی اور وہ مذمت اور لعنت میں گرفتار ہونے کے عالم میں برداشت کرے گا اور جو آخرت کا طلب گار ہوتا ہے اور اس کے لیے اُس کی سعی کوشش کرتا ہے اس صورت میں کہ وہ با ایمان ہے تو یہ وہ ہیں جن کی کوشش کی قدر سمجھی جائے گی اور ہر ایک کو ہم مدد پہنچاتے ہیں انہیں اور انہیں تمہارے پروردگار کے عطا و کرم سے اور تمہارے پروردگار کی عطا پر پابندی نہیں ہے۔“

دنیاوی عطا خالق کی بمقتضائے ربوبیت ہے اور آخرت کی عطا بمقتضائے عدالت ہے ربوبیت اس کی عام ہے اس لئے دنیا کی عطا بھی عام ہے اور عدالت خود مقتضی امتیاز ہے لہذا آخرت کی عطا ایمان و اطاعت کے ساتھ مشروط ہے۔

بے شک دنیاوی عطا بھی ہر شخص کے لئے بلا قید اس کی خواہش کے مطابق نہیں ہوتی بلکہ بلند تر نظام عالمی کے تقاضوں کے اعتبار سے جو ارادہ الہی ہوتا ہے اس کے مطابق ملتی ہے۔ [۱]

دنیا والوں کو عطاے دنیا سے سرفراز کرنے میں بس یوید عاجل کہا کہ وہ دنیا کا طلب گار ہے تو بس دنیا سے مل جاتی ہے لیکن آخرت کی عطا کے لئے بس یہ نہیں کہا کہ وہ طالب آخرت کی کامیابی کے لئے ضروری ساتھ قیود عائد کئے کہ ویسی کوشش بھی کرے یعنی ان اعمال کو بجا لائے جو آخرت کی کامیابی کیلئے ضروری ہیں اور اس کے ساتھ مومن بھی ہو پھر نتیجہ کو بھی اس سعی سے وابستہ کیا گیا ہے اس کی کوشش کی قدر کی جائے گی یعنی بقدر کوشش نتیجہ عطا کیا جائے گا۔

اس سے آنکھیں کھلنی چاہئیں ان کی جو آخرت کو بھی بس تصورات یا تمنائوں سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

أَنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۗ وَلَلْآخِرَةُ أَكْبَرُ دَرَجَاتٍ وَأَكْبَرُ
تَفْضِيلًا ﴿٢١﴾

”دیکھو، ہم نے کس طرح ایک کو دوسرے سے بڑھا ہوا قرار دیا ہے اور بلاشبہ آخرت درجوں کے اعتبار سے کہیں

[۱] یعنی فی الدنيا القدر الذي نريد لمن نريد الا على قدر ما يريدون (تبيين) العبد ما لا يشاء الله فلا يعطيه لكونه مفسدة (مجمع

زیادہ اور بڑھاوے کے اعتبار سے کہیں زیادہ ہے۔“

دنیا میں روزی اور تمام نعمتیں سب کو یکساں نہیں ملی ہیں بلکہ ایک دوسرے سے زیادہ عطا ہوئی ہیں جس کے بلحاظ حکمت بہت سے وجوہ ہوتی ہیں۔^[۱] یہاں تک قرآن وحدیث بتلاتی ہیں کہ کبھی نعمت دنیا کی عطا اور زیادتی بطور سزا بھی ہوتی ہے نعوذ باللہ من ذلک اسی طرح آخرت بھی درجات مختلف ہیں مگر ان کا سبب بر بنائے عدالت ایمان و اطاعت کے مراتب کا فرق ہوتا ہے۔

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُومًا مَّخَذُومًا ۝۳۳

”اس کے سوا کوئی خدا قرار نہ دو، نہیں تو مذمت میں گرفتار، بے بس اور بے کس ہو کر بیٹھو گے۔“

وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۖ إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ
الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَيْهِمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا
كَرِيمًا ۝۳۴ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا
رَبَّيْنِي صَغِيرًا ۝۳۵

”اور تمہارے پروردگار نے یہ حکم نافذ کیا ہے کہ عبادت نہ کرو سوا اس کے کسی کی اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ اگر تمہارے پاس کبر سنی کی منزل تک پہنچ گیا ان میں سے ایک یا وہ دونوں تو ان سے اف بھی نہ کرو اور نہ ان کو جھڑکی دو اور ان سے اعزاز کے انداز میں بات کرو۔ اور ان دونوں کے لیے تذلیل کے ساتھ اپنے بازو کو جھکائے رہو مہربانی سے اور کہو کہ پروردگار! اپنی رحمت ان دونوں کے شامل حال فرما جس طرح انہوں نے چھٹ پن میں میری پرورش کی۔“

حقوق والدین

اُف کہنے سے ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ کسی قسم کی اذیت نہ پہنچاؤ، اس کے لئے سب سے ادنیٰ درجہ جو ہو سکتا ہے وہ اُف ہے کہ اس میں کوئی ایذا پہنچانا نہیں ہے بلکہ اپنے احساس اذیت کا اظہار ہے تو جب اتنے تک سے منع کیا جا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے آگے جو ایذا رسانی کے درجے ہیں وہ باختلاف مراتب کس قدر اللہ کی ناراضگی کا باعث ہونگے؟

چونکہ ایذا رسانی کی ممانعت میں ایک کم سے کم چیز کو عنوان حکم بنایا گیا ہے اس لئے معصوم نے ارشاد فرمایا کہ اُف کہنے سے کم درجہ کی کوئی چیز ہوتی جو ایذا رسانی کے معنی پیدا کرے تو اللہ اسی کو ارشاد فرماتا، اُف کہنے سے ممانعت اس کا ثبوت ہے کہ اس سے کم ترک کوئی چیز دائرہ تصور میں

[۱] بان جعلنا بعضهم اغنياء و بعضهم فقراء بعضهم موالى و بعضهم عبيدا و بعضهم اصحاء و بعضهم مرضى بحسب ما علمنا من مصالحهم (تبیان) علی حسب ما علمنا من المصالح (مجمع البيان)

نہیں ہے۔^[۱]

اس حکم میں کبر سنی کا ذکر بطور قید نہیں ہے کہ اگر والدین اکبر اسن نہ ہوں تو ان کا احترام واجب نہ ہو بلکہ یہ اس لئے ہے کہ اس عمر میں زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر بگڑیں بلا وجہ خفا ہونے لگیں یا تکلیف دہ باتیں کہیں یا کریں مگر ان کے حقوق کی بناء پر ان کی کسی بات پر افسوس کرنا بھی ممنوع قرار دیا گیا پھر یہ کہ اس عمر میں انہیں اولاد سے خدمت لینے کی ضرورت ہوتی ہے اس پر امکان ہے کہ اولاد جزبہ ہو کر افسوس یا ہماری زبان میں انہیں کہے جیسا کہ اکثر ایسا دیکھا اور سنا جاتا ہے لہذا خالق نے خاص طور پر اسے مورد ممانعت قرار دیا ہے۔^[۲]

رُبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلّٰوٰٓءِبِيْنَ

عَفُوْرًا ﴿۲۵﴾

”تمہارا پروردگار تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے، اس سے خوب واقف ہے۔ اگر تم نیک ہو تو وہ لو لگانے والوں کو بخشنے والا ہے۔“

بجائے خود اس آیت کا مفہوم واضح ہے^[۳] لیکن سیاق کلام کے ساتھ مرتبط کرتے ہوئے در صورتیکہ گذشتہ آیت کے ساتھ مقام تنزیل میں متصل ہو مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات ماں باپ کبر سنی کے تقاضے سے یا کسی اور وجہ سے مثلاً سوتیلی ماں بلا وجہ لگائی بجھائی کرتی ہے اور غلط طور پر باپ کے کان بھرا کرتی ہو جیسا کہ کبھی کبھی مشاہدہ میں آتا ہے اولاد سے کلیتہً ایسے خفا ہو جائیں ناحق کہ یہ لاکھان کی رضامندی کی کوشش کرے مگر کامیاب نہ ہو تو قرآن اس کے متعلق کہہ رہا ہے کہ تمہارے ضمیر کو مطمئن ہونا چاہئے کہ تمہارا کردار ٹھیک ہے اب اگر اس کے بعد بلا وجہ تم سے وہ ناراض ہیں تو خدا کے یہاں تم مواخذہ وار نہ ہو گے۔

شاہ عبدالقادر کا ذہن بظاہر ایک دوسرے پہلو کی طرف گیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

یعنی دل میں آوے کہ بوڑھے ماں باپ سے معاملت نباہنی مشکل ہے تو فرمایا کہ جس کی نیت نیکی پر ہے اگر خفا کرے اور پھر رجوع لاوے تو اللہ بخشنے والا ہے۔ (موضح القرآن)

مگر ہم نے جو مطلب لکھا ہے، وہ ہمارے نزدیک الفاظ قرآنی سے زیادہ سمجھ میں آتا ہے۔

وَ اٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمَسْكِيْنَ وَاٰبِى السَّبِيْلِ وَلَا تُبَدِّرْ تَبَدِيْرًا ﴿۲۶﴾ اِنْ

الْمُبَدِّرِيْنَ كَاُوْٓاِخْوَانَ الشَّيْطٰنِيْنَ ؕ وَ كَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾

[۱] قال لو علم ان شيئاً اقل من ان لقاله (علی بن ابراہیم) عن جعفر بن محمد رضی اللہ عنہ قال: لو علم الله لفظاً رجز في ترك عقوق الوالدين من آف لقاله (تبیان) وفي رواية اخرى عنه رضی اللہ عنہ قال: ادنى العقوف آف ولو علم الله شيئاً ايسو منه واهرن لنهى عنه وفي خير آخر: فليعمل العاق ما شاء ان يعمل فلن يدخل الجنة (مجمع البيان)

[۲] انما خص الكبر لان وقت كبر الوالدين مما يفطر فيه الوالدان الى الخدمة (تبیان)

[۳] معنا كان معلوماً انه اكثر من معلوماً تكلم وقيل معناه انه اعلم بجميع ما في ضمائركم ولهذا اوجه (مجمع البيان)

”اور قربت دار کو اس کا حق عطا کرو اور مسکین اور مسافر کو اور بہت زیادہ بے جا خرچ نہ کرو۔ بلاشبہ بیجا خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی بند ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا ناشکر ہی تو تھا۔“

فضول خرچی کی مذمت

آیہ موذت اور حکم خمس کی طرح اس آیت میں بھی ”ذو القربی“ کی تفسیر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحباب قربت سے ہوئی ہے [۱] اور فریقین کے طرف سے وارد ہوا ہے کہ اسی آیت کے نازل ہونے پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فدک اپنی بیٹی حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کو ہب فرمایا۔ اس کے لئے یہ لازم نہیں ہے کہ ات ذوالقربی کا مخاطب رسول ہی کو قرار دیا جائے بلکہ خطاب عمومی ہو تب بھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی تعمیل میں پیش پیش ہونا چاہئے بلکہ اس خطاب کی عمومیت اور لفظ ذوالقربی کی قربت داروں رسول سے خصوصیت کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ خمس میں ذوالقربی کا جو حق ہے اور جو قیامت تک تمام مسلمانوں پر از روئے قرآن واجب الادا ہے، وہ بھی اس ات ذوالقربی کے تحت میں خالق کے منظور نظر ہو سکتا ہے۔

صرف بے جا کرنے کی ممانعت اس آیت میں ”تبذیر“ کے لفظ سے ہوئی ہے بعض مترجمین و مفسرین نے تبذیر کو ”اسراف“ کا ہم معنی قرار دیا ہے چنانچہ شاہ ولی اللہ نے ترجمہ کیا ہے۔

”و اسراف ممکن اسراف کردنی پر آئینہ اسراف کنندگان ہستند برادران شیاطین“
لیکن بعض اہل نظر اسراف اور تبذیر میں فرق قرار دیتے ہیں کہ اسراف کہتے ہیں ”حد سے زیادہ خرچ“ کو اور تبذیر ”بے محل صرف“ کو یعنی صحیح مصرف میں صرف کیا مگر اندھا دھند افراط کے ساتھ تو وہ اسراف ہے اور زیادہ نہ سہی کم ہی صرف کیا ہو مگر غلط مصرف میں تو وہ تبذیر ہے۔ [۲]

وَأَمَّا تَعْرِضْنَ عَنْهُمْ ابْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِّن رَّبِّكَ تَرْجُوهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا

مَّيْسُورًا ﴿٢٨﴾

”اور اگر تم ان کی طرف سے بے توجہی اختیار کرنا چاہو اپنے پروردگار کی رحمت کی طلب میں جس کے تم امیدوار ہو تو ان سے ملائم انداز میں گفتگو کرو۔“

اس سے قبل بلافاصلہ تو مبذورین یعنی بے جا صرف کرنے والوں کا ذکر تھا مگر اس سے مرتبط کر کے اس آیت کا مطلب کچھ نکلتا نہیں لہذا اس کا ربط اُس کے پہلے کی آیت سے قائم کیا جاتا ہے جس میں ذی القربی اور یتیم اور مساکین کو دینے کا حکم تھا اور اس صورت میں یہ ضمیر ”اگر ان سے بے توجہی اختیار کرو“ انہی کی طرف پھرتی ہے [۳] اور مطلب یہ ہے کہ اگر کسی وقت تمہارے پاس نہیں ہے اور تم ان کی حاجت

[۱] هو الذی رواہ اصحابنا ﷺ عن الصادقین علیہما السلام (مجمع البیان)

[۲] فلا تبذیرا بالتفاق فی غیر طاعة الله تعالیٰ (جلالین) قال مجاهد: لو انفق صدًا فی باطل کان مبذورًا ولو انفق جمیع مالہ فی الحق لحد یکن مبذورًا (مجمع البیان)

[۳] عنہم ای الذکورین من ذی القربی وما بعدہ (جلالین)

براری نہ کر سکو، تب بھی سخت کلامی سے پیش نہ آؤ نہ نرم و ملائم الفاظ میں معذرت کرو۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں۔
یعنی جو کوئی ہمیشہ سخاوت کرتا ہے اور ایک وقت اس کے پاس نہیں ہے تو اللہ کے ہاں امید کا محروم ہو جانا خوش نہیں آتا اس محتاج کی
قسمت سے اللہ نعمتوں کو بھیج دیتا ہے سو اس واسطے اگر ایک دفعہ نہ دے تو بیٹھے جواب کہے۔ (موضح القرآن)

ہمارے مفسرین بھی اس کے موافق تشریح کرتے ہیں۔ [۱]

مگر شاہ صاحب کی اردو تشریح کے الفاظ میں الجھاؤ محسوس ہوتا ہے سلیجی ہوئی تشریح کے لئے شاید الفاظ موزوں ہوں کہ ”بے توجہی اختیار
کر والہ کی رحمت کی طلب میں جس کی تمہیں امید ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تمہارے پاس نہیں ہے اس لئے اس کی حاجت براری سے
مجبور ہو مگر اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ وہ عنقریب تمہیں کشائش عطا کرے گا تم اس وقت اس کا سوال پورا کر سکو گے اس بناء پر اس سوال پر بے
توجہی اختیار کرتے ہو یعنی بے توجہی ظاہر کرتے ہو اس طرح کہ سکوت کرتے ہو اور سنی کو ان سنی بناتے ہو تو یہ طرز عمل بھی وجہ بے اعتنائی کا پتہ دے،
اُس لئے تکلیف دہ ہوگا لہذا ایسا نہ کرنا چاہیے اس امید کے ہوتے ہوئے اللہ کشائش دے گا [۲] خاموش کیوں رہو اور بے اعتنائی کا انداز کیوں اختیار
کرو بلکہ اسی امید اور سہارے کی بناء پر اُس سے آئندہ امکانی کوشش کا وعدہ کر لو [۳] کہ اُس کے دل کو ڈھارس ہو جائے اور تمہارے طرز عمل سے
اُس کی دل شکنی نہ ہو۔

ہم نے ”بے توجہی اختیار کرتے ہو“ کے معنی جو یہ لئے کہ بے توجہی اختیار کرنا چاہتے ہو، وہ اس بناء پر نہیں کہ اگر بے توجہی کر ہی لی اور وہ
دل شکستہ مایوس ہو کر چلا گیا تو اس کا محل ہی کیا ہے کہ ان سے ملائم انداز میں گفتگو کرو اس کی نظیریں قرآن مجید میں تلاش سے مل جائیں گی کہ مثلاً
”ایمان لاتے ہو“ کا مطلب ”ایمان لانا چاہتے ہو“۔

یہ سب اس صورت میں ہے جب اس آیت کو مقام تنزیل میں گذشتہ آیت سے متصل سمجھا جائے لیکن اگر یہ آیت سی اور محل پر نازل ہوئی
تھی اور کسی دوسرے موقع سے تعلق رکھتی ہے تو شاید اس کے معلوم ہو جانے کے بعد ہم بلا تکلف اس آیت کا مفہوم سمجھ لیں اور اس کا مطلب بیان
کرنے میں ہمیں کچھ پا پڑیلے نہ پڑیں۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسِطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا

فَحَسْرَةً ﴿۳۹﴾

”اور نہ رکھو اپنے ہاتھ کو بندھا ہوا اپنی گردن سے اور نہ اسے بالکل پھیلا ہی دو، کہ اس صورت میں بیٹھو گے لعنت
ملا مت میں گرفتار رنج و غم، پریشانی میں مبتلا“۔

خرچ میں میانہ روی کی ضرورت

[۱] مٹی ماصر فت و جھک عنہم یعنی عن الذین امر و باعطاءہم حقوقہم میں تقدّم ذکر ۵۰ (تبیان)

[۲] ای لتبغی الفضل من اللہ و السعة التي تمکنک من البذل (مجمع البیان)

[۳] فقل لهم قولا حسنا ای عدهم عن جمیلة (تبیان)

”ہاتھ کو گردن سے بندھا ہوا نہ رکھو“ یعنی بخل سے کام نہ لو اور ”بالکل پھیلا نہ دو“ یعنی اسراف نہ کرو۔ آخر کا فقرہ کے دو جز بالترتیب ان دونوں احکام سے متعلق ہو سکتے ہیں یعنی بخل سے کام لو گے تو لعنت و ملامت میں گرفتار ہو گے اور اسراف سے کام لو گے نتیجتاً رنج و حسرت میں مبتلا ہو گے [۱] اور ممکن ہے دونوں ٹکڑے دوسرے جز یعنی اسراف ہی سے متعلق ہیں کہ اسراف کی صورت میں بھی جب بعد میں پریشان حالی میں مبتلا ہوتا ہے تو لوگوں کے تیر ہائے ملامت کا نشانہ بنتا ہے اور ”نقصان مایہ و شامت ہمسایہ“ میں گرفتار ہوتا ہے۔ [۲]

اس غلط ذہنیت کے ماتحت کہ جہاں واحد مذکر حاضر کے صیغے کے ساتھ خطاب ہو وہاں مخاطب رسول اللہ ہی ہیں یہاں بھی ایسی روایات آگئیں کہ حضرت ہی نے ایسا کیا تھا کہ کپڑے اتار کر سائل کو دیدیئے یہاں تک کہ اب اتنا لباس نہ رہ گیا کہ گھر سے باہر نکلیں اور اس لئے کئی وقت مسجد میں نماز کو نہ جاسکے جس پر کافروں نے کہنا شروع کر دیا کہ رسول اللہ معاذ اللہ اب سوتے رہتے تھے اور تفریحات میں مشغول رہتے ہیں اتنے کہ نماز کے لئے نکلنا چھوڑ دیا ہے۔ اس پر یہ آیت اتری۔

ہمارے نزدیک وہ ذہنیت بھی کہ ایسے موقعوں پر ہر جگہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو مخاطب قرار دیا جائے تو غلط ہے اور یہ روایت بھی درست نہیں ہے۔

إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۗ إِنَّهُ كَانَ بَعْبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا ﴿۲۰﴾
 ”یقیناً تمہارا پروردگار کشائش دیتا ہے روزی میں جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگی میں مبتلا کرتا ہے، یقیناً وہ اپنے بندوں سے خوب واقف ہے، نظر رکھنے والا۔“

آخر کا فقرہ کہ ”وہ خوب واقف ہے اپنی بندوں سے نظر رکھنے والا“ اس کا پتہ دیتا ہے کہ یہ رزق کی کشائش اور تنگی بلا وجہ نہیں ہوتی بلکہ اس میں خود انسان کی کیفیت مثلاً وہ محتج ہے یا سہل انگار، باعمل ہے یا بے عمل اور شکر گزار ہے یا ناشکر؟ اس سب کو دخل ہے پھر اس کو مال و دولت عطا ہونے کے جو نتائج اس کی ذہنی کیفیتوں اور ارادی استعدادات کے لحاظ سے ہو سکتے ہیں، ان سب کا علم بھی اللہ کے عمل میں ذمیل ہوتا ہے۔ [۳]

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ ۗ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ ۗ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطَاً كَبِيرًا ﴿۲۱﴾

”اور اپنے بچوں کی فقر و فاقہ کے خوف سے جان نہ لو۔ ہم انہیں اور تمہیں روزی عطا کرتے ہیں، یقیناً ان کی جان لینا بہت بڑی غلطی ہی ہے۔“

یہی فقر و فاقہ کا ڈر تو وہ ہے جو آج بھی خاندانی منصوبہ بندی وغیرہ کے نام سے آنیوالے بچوں کا راستہ روک رہا ہے خالق مذکورہ بالا اعلان

[۱] ان امسکت قعدت ملو ما عند العقلاء مذمو ما وان اسر فت بقت محسورا ای مغمو ما فتحسر (تبیان) ان امسکت قعدت

ملو ما مذمو ما وان اسر فت بقت بقیات فتحسر امغمو ما عن الجبائی (مجمع البیان)

[۲] یعنی سب لازم دیں کہ اتنا کیوں دیا کہ اب محتاج ہو گئے (موضح القرآن)

[۳] خبیر ابصیر ای عالما باحوالهم بصیرا بمصالحهم (مجمع البیان)

جس طرح اس جاہلیت قدیم کے خلاف تھا اس طرح اس جاہلیت جدید کے مقابلہ میں بھی ہے۔

پہلے جو ہوتا تھا یعنی زمانہ قبل اسلام میں بہت بڑی غلطی تھی تو اب بھی جب ایسا ہو تو وہ بہت بڑی غلطی ہوگی۔^[۱]

وَلَا تَقْرَبُوا الزَّيْنَةَ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً ۖ وَسَاءَ سَبِيلًا ۝۳۲

”اور حرام کاری کے پاس بھی نہ جانا، یقیناً وہ شرمناک گناہ ہے اور بہت برا طریقہ ہے۔“

”کان فاحشۃ“ کے لفظی معنی ہیں ”شرمناک گناہ تھا“ یہاں اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے جیسا کہ سابقہ آیت میں ہم نے کہا کہ اب تک جو ہورہا تھا وہ برا تھا لہذا اب بھی وہ برا ہے، اب تم اس کے قریب بھی نہ جانا لیکن ”کان“ کا لفظ ”ہے“ کے معنی بھی قرآن میں بھی بکثرت موجود ہے لہذا بہت ممکن ہے ان تمام آیات میں ایسا ہی ہو۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۖ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا

لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِفُ فِي الْقَتْلِ إِنَّهُ كَانَ مَنْصُورًا ۝۳۳

”اور نہ لو وہ جان جسے اللہ نے محترم قرار دیا ہے مگر کسی حق کی بنا پر اور جو مظلومیت کے ساتھ قتل ہو، ہم نے اس کے وارث کو قاتل کو عطا کیا ہے تو وہ جان لینے میں حد سے آگے نہ بڑھے یقیناً ان کی مدد ہوگی۔“

قانون قصاص

”نہ لو وہ جان --- مگر کسی حق کی بناء پر“ یعنی سوا اس صورت کے جو بطور قصاص وغیرہ قانون الہی نے اس کو مستحق نقل قرار دیا ہو۔^[۲]

حد سے آگے کا مطلب یہ ہے کہ جیسے جاہلیت میں ہوتا تھا کہ بڑے آدمی کے عوض میں اس دوسرے قبیلہ کے کسی بڑے آدمی کو قتل کرتے تھے حالانکہ وہ بے گناہ ہوتا تھا، قاتل کوئی اور ہوتا تھا یہ کہ کسی بڑے آدمی کے عوض میں ایک آدمی کا قتل کرنا کافی سمجھا جاتا تھا بلکہ بہت سے آدمیوں کی جان لی جاتی تھی تب سمجھا جاتا تھا کہ بدلا ہوا، ان باتوں کی اب اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اس کی مدد ہوگی کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس صورت میں اللہ اس کی مدد کرے گا اور یہ بھی کہ اس کی مدد ہونا چاہئے یعنی دوسرے

لوگوں کو لازم ہے کہ اس کی مدد کریں۔^[۳]

وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ۖ وَأَوْفُوا

بِالْعَهْدِ ۚ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا ۝۳۴

[۱] یعنی ان قتلہم فی الجاہلیۃ کان اثماً عظیماً عند اللہ و هو الیوم کذلک (مجمع البیان)

[۲] ای سلطاناً علی القتل (علی بن ابراہیم)

[۳] بالحق و هو ان ینیب علیہ القتل امّا الکفرہ اور دتہ اولائہ قتل نفساً بغیر حق اوزنی و هو محسن (مجمع البیان)

[۴] یعنی ہر کسی کو لازم ہے کہ ان کا بدلہ دلانے میں مدد کرے نہ الٹا قاتل کی حمایت کرے (موضح القرآن)

”اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو بہتر ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے سن تمیز کو پہنچے اور عہد کو پورا کرو۔ عہد کے متعلق یقیناً جواب دہی ہوگی۔“ [۱]

یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بالغ کے مال میں بلاحق تصرف درست ہے بلکہ چونکہ عموماً یتیموں ہی کے اموال میں لاوارث سمجھ کر اس قسم کی دست درازیاں ہوتی تھیں اس لئے انہیں مورد کلام قرار دیا گیا۔ [۲]

وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ط ذَلِكَ خَيْرٌ
وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۝۲۵

”اور جب ناپو تو لونا پوری کرو اور ٹھیک ترازو سے تولو، یہ بہتر اور نتیجہ کے اعتبار سے زیادہ اچھی بات ہے ان آیات میں ناپ تول میں انصاف کا حکم دیا گیا ہے۔“

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ط إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَئِكَ كَانَ
عَنْهُ مَسْئُولًا ۝۲۶

”اور ایسی بات کے پیچھے نہ جاؤ جس کے متعلق تمہیں علم نہیں، یقیناً کان اور آنکھ اور دل ان میں سے ہر چیز کے متعلق جواب دہی ہوگی۔“

چونکہ اس آیت میں نبی بصیغہ مفرد کی گئی ہے اس لئے اس سے مخاطب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھا گیا ہے لیکن بہر صورت حکم اس کا عام ہے۔ [۳] اور ہم سمجھتے ہیں کہ گذشتہ آیات ہی کی طرح مخاطب بھی سب ہی لوگ ہیں صرف انداز میں تنوع کی خاطر جمع کے صیغہ کو واحد سے بدل دیا گیا ہے جس سے مراد ایک ایک کو مخاطب کر کے بات کہنا مفاد اس جمع اور اس واحد کے صیغہ کا ایک ہی ہے۔

”اس بات کے پیچھے نہ جاؤ جس کے متعلق تمہیں علم نہیں“ اسم کے تحت میں یہ بھی ہے کہ بغیر علم کے کوئی بات نہ کہو اور یہ بھی کہ بلا علم کوئی چیز مانو نہیں اور یہ بھی کہ لاعلمی کے ساتھ کوئی اقدام نہ کرو، غرض کہ قول عمل اور اعتقاد، سب کی بنیاد ضمیر کے اطمینان پر ہونا چاہئے۔ [۴]

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۚ إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ
طُولًا ۝۲۷ كُلُّ ذَلِكَ كَانَ سَيِّئُهُ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوهًا ۝۲۸

[۱] کان مسئولا عنه للجزاء عليه فخذ عنه لانه مفهوم (مجمع البيان)

[۲] انما خص اليتيم بذلك وان كان التصرف في مال البالغ لا يجوز ايضا لان اليتيم الى ذلك اخرج والطبع في ماله اكثر (تبيان)

[۳] هو متوجه الى جميع المكلفين (تبيان)

[۴] الاصل انه عام في كل قول و فعل وعزم يكون على غير علم فكأنه سبحانه قال: لا تقل الا يعلم انه يجوز ان يقال ولا تفعل الا

يعلم انه يجوز ان يفعل ولا تعثقه الا ما تعلم انه يجوز ان يعتقد (مجمع البيان)

”اور نہ چلو زمین میں اٹھلاتے ہوئے، بلاشبہ تم ہرگز زمین کو پھاڑ نہیں سکتے اور ہرگز لمبائی میں پہاڑوں تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہ سب باتیں وہ ہیں جن کی برائی اللہ کو ناپسند ہے۔“
اٹھلانا غرور و تکبر سے بھی ہو سکتا ہے اور اپنے کسی کارنامہ پر خوش ہو کر بے جا فخر سے بھی جسے ”اترانا“ کہہ سکتے ہیں۔ مفسرین نے دونوں پہلو اختیار کئے ہیں۔^[۱]

ذٰلِكَ هِمَّ اَوْحٰى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۗ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ

جَهَنَّمَ مَلُوْماً مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾

”یہ سب اس میں سے ہے جو ہم نے آپ کی طرف حکمت کا ذخیرہ اتارا ہے اور اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا قرار نہ دو، ورنہ دوزخ میں ڈال دیئے جاؤ گے ملامت میں گرفتار، راندے ہوئے۔“

یہ سب یعنی سابق میں جو جو احکام نافذ کئے گئے ہیں اور جو جو ہدایات ہوئی ہیں^[۲] اسے حکمت کا ذخیرہ کہنے میں ایک بڑی بحث کا فیصلہ مضمر ہے۔ اگر ذاتا اشیاء میں بھلائی اور برائی نہ مانی جائے بلکہ یہ سمجھا جائے کہ بھلائی اور برائی صرف شریعت کے امر و نہی سے پیدا ہوئی ہے یعنی جس بات کا حکم دے دیا وہ اچھی ہوگی اور جس سے منع کر دیا وہ بری تو اتنا کہنا کافی تھا کہ ذلک ہما اوحی الیک ربک یہ وہ ہے جو آپ کے پروردگار نے آپ پر وحی بھیجی ہے۔ من الحکمة کہنا اس کا ثبوت ہے کہ یہ احکام بلا وجہ نہیں ہیں بلکہ حکیمانہ طور پر مصالِح و مفاسد کی بناء پر ہیں جنہیں انسان اپنی نادانی سے سمجھتا نہیں تھا خالق نے اپنے احکام کے ذریعہ سے اُن سے پردہ ہٹایا ہے۔^[۳]

اَفَاَصْفٰكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبٰنِيْنَ وَاَتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ۗ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا

عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾

”کیا تمہیں تمہارے پروردگار نے بیٹوں کے ساتھ امتیاز عطا کیا ہے^[۴] اور خود اس نے فرشتوں کی جنس سے لڑکیاں اختیار کی ہیں؟ تم بڑی بات زبان سے نکالتے ہو۔“

یہ مشرکین کا تصور تھا کہ ملائکہ خالق کریم کی بیٹیاں ہیں ان کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر وہ اپنے لئے بیٹیوں کو بہت برا سمجھتے تھے، رد کی جا رہی ہے جس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہئے کہ بیٹیاں واقعی بری چیز ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے لئے بیٹے اور بیٹیاں دونوں بری ہیں یعنی اس کی شان الوہیت کے خلاف ہیں۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ۗ وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴿۴۱﴾

[۱]. معنایا لا تمش علی وجه الاشر و البطرو الخیلاء و الکبر — وقیل المرح شدۃ الفرح بالباطل (مجمع البیان)

[۲]. الذی تقدّم ذکرہ من الاوامر و التواہی (مجمع البیان)

[۳]. من الحکمة المؤدبۃ الی المعرفۃ بالحسن و القبیح و الفرق بینہما (مجمع)

[۴]. اخلص لکم البنین و اختارکم صفوۃ الشئی دونہ (تبیان)

”اور ہم نے اس قرآن میں پلٹا پلٹا کر طرح طرح کی باتیں کہی ہیں تاکہ وہ نصیحت قبول کریں، حالانکہ وہ نہیں بڑھاتا ان کو مگر وحشت کے ساتھ بھڑکنا۔“

پلٹا پلٹا کر یعنی بار بار ایک ایک بات کو دہرایا ہے ^[۱] تاکہ ایک دفعہ نظر تغافل ہو جائے تو شاید دوسری مرتبہ مورد توجہ بن جائے اتمام حجت کے لئے ^[۲] مگر نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہ جو آخر میں ہے کہ بجائے مانوس ہونے کے ان کی وحشت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

قُلْ لَوْ كَانَ مَعَهُ الْهَيْهَةُ كَمَا يَقُولُونَ إِذَا لَابَتَغَوْا إِلَىٰ ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا ^[۳]

سُبْحٰنَهُ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ^[۴]

”کہئے کہ اگر اُس کے ساتھ اور خدا ہوتے جیسا کہ وہ کہتے ہیں تو وہ ضرور عرش والے تک پہنچنے کا راستا تلاش کرتے۔ پاک ہے وہ اور بالا ہے اس سے جو وہ کہتے ہیں بڑی برتری کے ساتھ۔“

”عرش والے“ یعنی اللہ تک جو خدائے حقیقی ہے، پہنچنے کا راستہ تلاش کرتے، یعنی اس کے مقابلہ میں فوج کشی کر کے اسے تخت حکومت سے اتارنے کی کوشش کرتے۔ اس طرح یہ آیت بھی ایک طرح ”برہان تمانح“ ہی کے مفاد پر مشتمل ہے جیسے: لَوْ كَانَ فِيْهِمَا الْهَيْهَةُ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ^[۵] وغیرہ (انبیاء ۲۲۱)

اس کے بالمقابل ایک معنی یہ کہے گئے ہیں کہ اگر ان کے خیال کے مطابق اور خدا ہوتے تو وہ بھی عرش والے خدا کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ ^[۶]

اسے علامہ طبرسی نے بعض قدیم مفسرین کی زبانی نقل کیا ہے مگر پہلے معنی کو کہا ہے کہ اس کے قائل زیادہ مفسرین ہیں۔

تَسْبِيْحٌ لِّهٖ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ^[۷] وَاِنْ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ

بِحَمْدِهَا وَلٰكِنْ لَا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ^[۸] اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ^[۹]

”اس کی تسبیح کرتے ہیں ساتوں آسمان اور زمین اور جو لوگ ان میں ہیں اور کوئی چیز نہیں مگر یہ کہ وہ اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں، بلاشبہ وہ بڑا برداشت کرنے والا ہے، بخشنے والا۔“

کائنات تمام تکمال اس کی کمال ذات کو گواہ ہے اور کمال ذات ہی نقائص سے اس کے بری ہونے کا ضامن ہے، اس لیے یہ گواہی اس

[۱] ای کرنا الدلائل وفضلنا المعانی والامثال (مجمع البيان)

[۲] الحكمة فيه الزام الحجة وقطع المعنفة (مجمع البيان)

[۳] قال الحسن والجبائی: لا بتغوا سبيلا الى مغالبتة ومضادة كما قال: لو كان فيهما الهة الا الله لفسدتا (تبيان)

[۴] ای لطلبوا طريقا تقر بهم الى مالک العرش والتمسوا لزلفة عندا لعلهم بعلوه عليهم و عظمة عن مجاهد و قتادة (مجمع

البيان)

کی تسبیح ہے جس میں تمام کائنات یک زبان ہے [۱] مگر انسان کو ان دلائل حقانیت پر توجہ نہیں ہوتی یہی وجہ ہونا کائنات کی تسبیح کا نہ سمجھنا ہے [۲] اور یہ نہ سمجھنا اتنا بڑا ظلم ہے کہ اس غافل انسان کو ایک دم اس کے فیض کرم سے محروم ہو جانا چاہیے جس کے بعد اس کا نیست و نابود ہو جانا لازم ہے مگر یہ اس کا علم و مغفرت ہے کہ وہ اپنے منکروں کو بھی دنیا میں جینے کا موقع دیتا ہے اور انہیں اپنی نعمتوں سے مالا مال کرتا ہے اور جب بھی ان کی آنکھ کھلے اور وہ اپنے رویہ کو تبدیل کریں تو وہ ان کی خطا سے درگزر بھی کر دیتا ہے۔ [۳]

وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ حِجَابًا

مَسْتُورًا ﴿۵﴾ وَجَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۖ وَإِذَا

ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْآنِ وَحْدَهُ وَلَوَّاعِلَىٰ آذَانِهِمْ نُفُورًا ﴿۶﴾

”اور جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپ کے درمیان اور ان کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے چھپا ہوا پردہ ڈال دیتے ہیں۔ اور ہم ان کے دلوں پر پوششیں چڑھا دیتے ہیں کہ وہ نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں بہرا پن کہ نہ سنیں اور جب آپ قرآن میں اپنے پروردگار کا کیلے ذکر کرتے ہیں تو وہ بھڑک کر اپنے پیچھے پلٹ جاتے ہیں۔“

مستورا کے لفظ کو بعض مفسرین نے ساپرا کے معنی میں قرار دیا ہے اب ترجمہ یہ ہوگا کہ ”چھپانے والا پردہ“ مگر پردہ کا تو کام ہی چھپانا ہوتا ہے، اس لیے یہ قید تاکید سے زیادہ کوئی فائدہ نہ دے گی۔ اس کے برخلاف دوسری صورت میں مستور کے لفظ میں اس کے اصل مفہوم کے لحاظ سے کوئی تصرف نہیں ہوگا بلکہ مستور کے معنی وہی ہوں گے جو اس کی اصل شکل تصریفی کا عام تقاضا ہیں اور پھر مزید افادیت بھی ہو جائے گی۔ یعنی معنی یہ سمجھ جائیں کہ یہ ایسا پردہ ہے جو آنکھوں کو نظر نہیں آتا۔ اس کے آثار غور کرنے ہی سے سمجھ میں آتے ہیں، میں نے اس کے مطابق ترجمہ کیا ہے اور بعض مترجمین و مفسرین اس کے موافق ہیں۔ [۴]

اس آیت سے بہت آسانی کے ساتھ مدعیان جبر یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ خالق ہی کی طرف سے انہیں فہم قرآن اور اس کے ذریعہ سے ہدایت قبول کرنے سے روک دیا گیا ہے مگر غنیمت ہے کہ یہاں شاہ ولی اللہ صاحب نے حقیقت پسندی سے کام لیا ہے اور کہا ہے کہ:

”ایں پرد و آیت کنایت است از عدم انتفاع ایشان بقرآن و مواعظ“ (فتح الرحمن)

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا حقیقت نہیں ہے کہ اللہ پردے ڈال دیتا ہو یا انہیں بہرا بنا دیتا ہو بلکہ ان کا اختیار خود جو اعراض ہے، اس سے جو دیر پا محرومی ان میں پیدا ہوگئی ہے، اس کے لاعلاج ہونے کا بطور کنایہ یہ اظہار ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ سب ان میں قدرتی مجبوریاں

[۱] تنزیہ السموات والارض هو ما فیہا من الدلالة علی توحیدہ و عدلہ (تبیان)

[۲] لستم تفقہون تسبیح هذا الاشياء حیث لم تنظروا فیہا فتعلموا کیفیة دلالتہا (تبیان)

[۳] حلیمایہلکم لایعاجلکم بالعقوبة علی کفرکم

غفور الکم اذا تبتم و انبتم الیہ (مجمع البیان)

[۴] پردہ پوشیدہ (شاہ ولی اللہ) پردہ چھپا ہوا (رفیع الدین) قیل حجابا مستورا عن الاعین لایبصر ائما هو من قدرہ اللہ تعالیٰ (مجمع البیان)

پیدا ہوگئی ہیں جن کی وجہ سے اب یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ ہدایت کا اثر قبول کریں۔
”شاہ عبدالقادر کے الفاظ یہ ہیں:

”یعنی اس قرآن میں ایسی تاثیر ہے اور کافروں پر اثر نہیں آتا یہی واسطے کی اوٹ میں ہیں، آفتاب سے جہاں روشن ہے اور جس کی اس طرف پیٹھے ہے، اس کے حساب میں کہیں نہیں۔“ (موخ القرآن)

مَنْ أَعْلَمَ بِمَا يَسْتَمِعُونَ بِهِ إِذْ يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ وَإِذْ هُمْ نَجْوَىٰ إِذْ يَقُولُ
الظُّلْمُونَ إِنَّ تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَّسْحُورًا ﴿٣٨﴾ أَنْظِرْ كَيْفَ صَبَرُوا لَكَ الْأَمْثَالَ
فَصَلُّوا فَلَا يَسْتَطِيعُونَ سَبِيلًا ﴿٣٩﴾

”ہم خوب جانتے ہیں جس لیے وہ غور سے سنتے ہیں، جب وہ کان لگاتے ہیں آپ کی طرف اور جب وہ چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں۔ جب وہ ظالم کہتے ہیں کہ تم نہیں پیروی کرتے مگر ایسے آدمی کی جو جادو کا شکار ہے۔ دیکھیے وہ کس طرح آپ کے لیے طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں تو وہ گمراہ ہو گئے ہیں ایسے کہ راستہ پا ہی نہیں سکتے۔“
”جس لیے وہ غور سے سنتے ہیں“ یعنی استفادہ کی غرض سے نہیں بلکہ نکتہ چینی کے مطلب سے اور تمسخر کے پہلوؤں کی تلاش میں [۱] جس کے بعد کتنے ہی فوائد و فیوض کا سرمایہ ہو مگر غور سے سننے کے باوجود وہ سننے والا اپنی نیت کی خیانت سے ان فیوض سے بہرہ مند نہیں ہوتا بلکہ عناد کی وجہ سے اس میں اعتراض کے پہلو تلاش کرتا رہتا ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر کے ان پر استفادہ کی راہیں بند کرتا ہے۔

”طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں“ کبھی دیوانہ کہتے ہیں، کبھی شاعر، کبھی جادوگر اور اب یہ کہ یہ خود جادو کا شکار ہے۔ [۲]
اس سے خود ظاہر ہے کہ ایک بات کہہ کر وہ خود مطمئن نہیں ہوتے بلکہ سمجھتے ہیں کہ بات بنی نہیں، اس لیے بدل کر دوسری بات کہتے ہیں اور پھر تیسری۔

وَقَالُوا إِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرَفَاتًا ؕ إِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا ﴿٣٩﴾ قُلْ كُونُوا
حِجَارَةً أَوْ حَدِيدًا ﴿٤٠﴾ أَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ ۚ فَسَيَقُولُونَ مَنْ يُعِيدُنَا
قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُونَ إِلَيْكَ رُءُوسَهُمْ وَيَقُولُونَ مَتَى
هُوَ ۚ قُلْ عَسَىٰ أَنْ يَكُونَ قَرِيبًا ﴿٤١﴾

”اور انہوں نے کہا کہ کیا جب ہم ہڈیوں اور بوسیدہ اعضاء کی شکل میں ہوں گے تو کیا ایک نئی تخلیق کے ساتھ اٹھائے جائیں گے۔ کہہ دیجئے کہ تم پتھر ہو جاؤ یا لوہا۔ یا کوئی اور مخلوق جو تمہارے ذہن میں بہت بڑی ہو تو اس پر وہ یہی

[۱] یعنی بقصد استہزاء و عیب جوئی (فتح الرحمن)

[۲] شبہوا الک الاشیاء فقالوا مجنون وسا حرو و شاعر (مجمع البیان)

کہیں گے کہ کون ہمیں دوبارہ لائے گا؟ کہیے کہ وہی جس نے تمہیں پہلی دفعہ پیدا کیا تھا۔ اب وہ آپ کی بات پر اپنے سر ہلانے لگیں گے اور کہیں گے کہ یہ کب ہوگا؟ کہیے بہت ممکن ہے کہ وہ نزدیک ہی ہو۔

منکرین معاد کی رد

”پتھر ہو جاوے یا لوہا یا کوئی اور مخلوق“ مطلب یہ ہے کہ تم تو ہڈیوں اور بوسیدہ اعضاء ہی کے زندہ ہونے پر حیرت کرتے ہو۔ ارے یہ چیزیں تو وہ ہیں جن سے ایک وقت میں تعلق حیات تھا نہیں، بالکل بے جان چیزوں سے جن سے زندگی کا کوئی لگاؤ ہی نہیں، جیسے پتھر اور لوہا وغیرہ، یہ بھی تم ہو جاؤ تو خدا جب چاہے گا تم میں روح پھونک دے گا اور تم زندہ ہو جاؤ گے۔“
وہ یہ سن کر ”سر ہلانے لگیں گے“ سر ہلانے کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں، قائل ہو کر اقراری طور پر بھی سر ہلایا جا سکتا ہے، بطور تعجب بھی اور بطور تمسخر بھی اس لیے اس کی تشریح میں احوال مختلف ہو گئے ہیں۔^[۱]

يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهِ وَتَظُنُّونَ اَنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۵۲﴾
”جس دن وہ تمہیں بلائے گا تو تم اس کی حمد و ثنا کے ساتھ لبیک کہو گے اور ایسا خیال کرو گے کہ تم نہیں رہے مگر بہت کم۔“

فتستجیبون بحمدہ جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے ”اس کے حمد و ثنا کے ساتھ لبیک کہو گے“ اس کی ایک تشریح یہ ہے کہ حمد و ثنا کرتے ہوئے لبیک کہو گے^[۲] لیکن دوسری تشریح یہ ہے کہ جیسے کسی ایسے شخص کو جو بڑا سرکش ہو، حالات نے سر جھکانے پر مجبور کر دیا ہو تو اس سے طنز یہ طور پر کہیں کہ اب تو بجا اللہ تم بڑے ہی اطاعت گزار ہو، ویسے ہی کہا گیا ہے کہ اس وقت بحمدہ تم صدائے حق پر لبیک کہو گے۔^[۳]
”ایسا خیال کرو گے کہ نہیں رہے مگر بہت کم“ یعنی مرنے کے بعد سے قیامت تک کے وقفہ کا کوئی احساس ہی نہیں ہوگا، سمجھو گے تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ ہم دنیا میں تھے اور جلد ہی دوبارہ اٹھائے گئے ہو۔

شاہ عبدالقادر نے ایک دوسرے معنی کہے ہیں:
”یعنی اب شتابی کرتے ہو، تعجب جانو گے کہ دنیا میں کچھ دیر نہ رہے تھے پچاس برس ان ہزاروں برس کے سامنے کیا معلوم ہوں۔“ (موضح القرآن)
مگر قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر جو تشریحات ہیں، وہ پہلے مفہوم سے زیادہ مطابقت رکھتے ہیں۔

[۱] یعنی ملزم خواہند شد (فتح الرحمن) ینقضون البیک رءوسہم تعجباً (جلالین) حرکوا رءوسہم مستبعدین لذلك وقال ابن عباس یحرکون رءوسہم مستہزءین (تبیان)

[۲] قال سعید بن جبیر: یحرجون من قبورہم یقولون سبحانک و بحمدک ولا تنفعہم فی ذلک الیوم لا یتہم حمدوا حیث لا ینفعہم الحمد (مجمع البیان)

[۳] قیل ولہ الحمد (جلالین)

وَقُلْ لِعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْزِعُ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِينًا ﴿٥٣﴾ رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِكُمْ ۚ إِنَّ يَشَأْ يَرْحَمْكُمْ أَوْ إِنَّ يَشَأْ يُعَذِّبْكُمْ ۚ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ﴿٥٤﴾

”اور میرے بندوں سے کہیے کہ وہ ایسی بات کہیں جو بہت اچھی ہے یقیناً شیطان ان کے درمیان جھگڑے ڈال دیتا ہے بلاشبہ شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے۔ تمہارا پروردگار تم سے خوب واقف ہے چاہے تو اپنی رحمت تمہارے شامل حال کرے اور اگر چاہے تمہیں سزا دے اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو ان پر داروغہ بنا کر۔“

مخالفین حق سے روادارانہ گفتگو کی تعلیم

دونوں آیات کا ایک سلسلہ قرار دے کر مفسرین نے یہی مطلب نکالا ہے کہ مسلمان کافروں سے اس طرح روادارانہ بات کہیں جو بہت اچھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تم سے خوب واقف ہے۔ اگر چاہے تو اپنی رحمت تمہارے شامل حال کرے اور اگر چاہے تو تمہیں سزا دے۔^[۱] یہ اللہ سے متعلق چیز ہے، پیغمبر کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

وَرَبُّكَ أَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّنَ عَلَى بَعْضٍ وَآتَيْنَا دَاوُدَ بُرُورًا ﴿٥٥﴾

”اور تمہارا پروردگار بہت خوب جانتا ہے۔ ان کو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور ہم نے کچھ نبیوں کو کچھ پر فضیلت دی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی۔“

اس آیت کا ارتباط گزشتہ آیت کے ساتھ ضروری نہیں ہے، مستقل طور پر اس کے تمام اجزاء پر نظر ڈالنے سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے انبیاء میں جو آپس میں فرق مراتب ہے جیسا کہ تیسرے بارہ کی ابتداء میں ہے! تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَهُوَ بِالْأُجُوبِ نَبِيُّنَ ۚ بَلْكَ خَالِقٌ جَوْاهِرٍ وَبَاطِنٌ پَرَحَاوِي ۚ هُوَ تَمَامُ نَفْسٍ كَا جَا زَه لَ كَرَان مِي ۚ دَا تَا جَوْ صَفَاتِ كَا فَرَقِ پَا تَا هُ ۚ اَسِي لِحَاظِ سَ اِن كَ مَرَاتِبِ مَقَرَّر فَر مَاتَا هُ۔^[۲]

شاہ عبدالقادر نے اسے بھی گزشتہ آیت سے مربوط کیا ہے وہاں آخر میں تھا ”ہم نے آپ کو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا۔“ اس کی تشریح میں موصوف نے لکھا تھا:-

[۱] یقولوا الکفار... الکلمة التي هي احسن هي: ربكم اعلم بكم (جلالین) بگویند کلمة کہ آن بہتر است یعنی یا کفار... و مراد از این کلمہ این است کہ پروردگار شما دانتر است بحال شما الخ (شاہ ولی اللہ)

[۲] ائما قال ذلك ليدل على ان تفضيل الانبياء بعضهم على بعض وقع موقع الحكمة لانه من عالمه بباطن الامور (تبيين) بين سبحانه بهذا انه لم يختار الملائكة والانبياء للميل اليهم وائما اختارهم لعلمه بباطنهم (مجمع البيان)

”ندا کرنے میں حق والا جھوٹھلا تا ہے کہ دوسرا صریح حق کو نہیں مانتا، سو فرما دیا کہ تم پر ان کا ذمہ نہیں ہے، اللہ بہتر جانے، جس کو چاہے راہ بھادے“

اس کے بعد اس آیت کے تحت میں لکھتے ہیں :-

”یعنی بعض نبی تھے جھوٹھلا گئے، تیرا حوصلہ اُس سے زیادہ رکھائے“ (موضح القرآن)

قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفِ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا

تَحْوِيلًا ﴿٥٦﴾ اُولَئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ

وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ ۗ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا ﴿٥٧﴾

”کیسے کہ بلاؤ انہیں جن کو اللہ کے سوا تم سمجھتے ہو تو (دیکھنا کہ) وہ نہیں قدرت رکھتے سختی کے دور کرنے پر تم سے اور نہ کسی تبدیلی پر، جنہیں وہ پکارتے ہیں خود ہی اپنے پروردگار کی طرف ذریعہ ڈھونڈتے ہیں کہ کون زیادہ تقرب رکھنے والا ہے اور وہ اُس کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اُس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، یقیناً تمہارے پروردگار کا عذاب ڈرنے کی چیز ہی ہے۔“

اس آیت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن اصل وسیلہ اور توسل کی نفی نہیں کرتا۔ ہاں غلط وسائل جنہیں مشرکین اختیار کرتے ہیں، اُن پر اعتراض کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ وسائل تو خود دوسرے وسیلوں کی تلاش میں ہیں تو تم کو تو انہی وسائل کا دامن تھامنا چاہیے جن کے سبب ہی محتاج ہیں اور سب کو ان سے توسل کرنا ہے۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں :-

”یعنی جن کو کافر پوجتے ہیں، وہ آپ ہی اللہ کی جناب میں وسیلہ ڈھونڈتے ہیں کہ جو بندہ بہت نزدیک ہو اسی کا وسیلہ پکڑیں اور وسیلہ سب کا پیغمبر ہے، آخرت میں انہی کی شفاعت ہوگی“ (موضح القرآن)

وَإِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ إِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ أَوْ مُعَذِّبُوهَا عَذَابًا

شَدِيدًا ۗ كَانَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا ﴿٥٨﴾

”اور کوئی بستی نہیں مگر یہ کہ ہم اسے ہلاک کر دیں گے قیامت کے دن سے پہلے یا اسے سخت عذاب میں مبتلا کریں گے یہ کتاب میں لکھی ہوئی بات ہے“..... کتاب سے یہاں مراد بقرینہ مقام لوح محفوظ ہے، اے

وَمَا مَنَعَنَا أَنْ نُرْسِلَ بِالْآيَاتِ إِلَّا أَنْ كَذَّبَ بِهَا الْأَوَّلُونَ ۗ وَآتَيْنَا ثَمُودَ

النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوا بِهَا ۗ وَمَا نُرْسِلُ بِالْآيَاتِ إِلَّا تَخْوِيفًا ﴿٥٩﴾

”اور ہمیں ان معجزات کے بھیجنے سے مانع نہیں ہے مگر یہ چیز کہ پہلے لوگ انہیں جھٹلاتے رہے اور ہم نے قبیلہ ثمود کو

اوتنی عطا کی جو بصیرت عطا کرنے والی تھی تو ان لوگوں نے اس پر ظلم کیا اور ہم نہیں بھیجتے معجزوں کو مگر خوف دلانے کے لئے،

پیغمبر خدا کو معجزات خالق کی طرف سے عطا کئے گئے تھے، اس کا ثبوت قرآن مجید میں موجود ہے مگر کفار طرح طرح کی فرمائشیں کرتے تھے جن میں ایک بات یہ تھی کہ آپ وہی معجزے کیوں نہیں دکھاتے جو گزشتہ انبیاء نے دکھائے تھے؟ اس پر ارشاد ہو رہا ہے کہ اس لئے وہ معجزے اب نہیں دکھلائے جاتے [۱] کہ پہلے جب وہ معجزے دکھائے گئے تو وہ امتیں کب ایمان لائیں جو تم ایمان لاتے اور جب ایسے معجزے دکھائے جاتے تھے تو پھر انکار کی صورت میں عذاب بھی ضرور آجاتا تھا جیسے قبیلہ ثمود کے لئے ہوا، اسی طرح تمہاری فرمائش کے مطابق اگر معجزے آئیں تو پھر انکار پر عذاب الہی آنا لازم ہے اور اس رسول کی قوم کے لئے جو رحمتہ للعالمین ہے، اللہ کو یہ منظور نہیں ہے۔ [۲]

وَإِذْ قُلْنَا لَكَ إِنَّ رَبَّكَ أَحَاطَ بِالنَّاسِ ط وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِي آرَيْنَاكَ إِلَّا
فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْآنِ ط وَمَنْحَوْفُهُمْ ۗ فَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا
طُغْيَانًا كَبِيرًا ﴿٦٥﴾

”اور جب ہم نے آپ سے کہا کہ آپ کا پروردگار تمام انسانوں کو گھیرے ہوئے ہے اور ہم نے نہیں قرار دیا اس منظر کو جو ہم نے آپ کو دکھایا تھا مگر آزمائش کا ذریعہ اور اسی طرح اس درخت کو جو قرآن میں مورد لعنت ہے اور ہم انہیں خوف دلاتے ہیں مگر وہ ان میں اضافہ نہیں کرتا۔ سوا بڑی سرکشی کے۔“

شجرہ ملعونہ

عامہ مفسرین نے اس کو معراج سے متعلق قرار دیا ہے اور درخت سے مراد شجرۃ الزقوم لیا ہے جس کا دوسری جگہ قرآن مجید میں ذکر ہے اور وہ دوزخ میں اہل دوزخ کے لئے ہے چنانچہ جلالین لکھتے ہیں:

الرؤيا التي اريناك عيانا ليلة الاسراء والشجرة الملعونة في القرآن وهي الزقوم التي ثبت في اصل
الحجيم

وہ منظر جو ہم نے آپ کو ظاہر بظاہر دکھایا شب معراج اور وہ درخت جو قرآن میں مورد لعنت ہے، زقوم کا درخت ہے جو دوزخ کی تہ میں
اگتا ہے۔

شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے:

یعنی چوں کافران قصہ معراج شنیدند و آیت ان شجرۃ الزقوم طعام الاثیم بایشان رسید متبعاد کردند و

[۱] یعنی الايات للتي اقترحتها قريش (تبیان)

[۲] كنا اذا ارسلنا الى قرية اية فلم يومنوا بها اهلكناهم ولذلك اخرنا عن قومك الايات (علی بن ابراهیم)

محل طعن ساختند (فتح الرحمن)

یعنی جب کافروں نے معراج کا واقعہ سنا اور یہ آیت جس کا مضمون یہ ہے کہ یقیناً قوم کا درخت گناہ گار آدمی کی غذا ہے ان تک پہنچی تو انہوں نے اسے دو راز قیاس سمجھا اور مرکز اعتراض بنایا۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

وہ دکھاوا معراج ہے اور درخت پھٹکا را۔ یعنی درخت زقوم قرآن میں فرمایا کہ دوزخ والے کھاویں گے۔ (موضح القرآن)
 غالباً اسی بنا پر شاہ ولی اللہ نے الزّویا کا ترجمہ خواب سے نہیں کیا ہے بلکہ لکھا ہے: ”نمائش کہ نمودیم تو“ اور ہم نے بھی ترجمہ میں اس کی رعایت کی ہے اب شاہ رفیع الدین جو ترجمہ میں لکھتے ہیں کہ: ”نہیں کیا ہم نے وہ نمود یعنی خواب“ جو دکھلائی تجھ کو تو یا وہ معراج کو خواب ہی کی بات سمجھتے ہیں وہ اس شان نزول ہی کے قائل نہیں ہیں چنانچہ دوسری روایت جو جناب ابن عباسؓ سے منقول ہے یہ ہے کہ اس خواب سے مراد وہ خواب ہے جو حضرتؓ نے داخلہ مکہ کے متعلق دیکھا تھا جس کے بعد آپ زیارت مکہ معظمہ کے لئے روانہ ہوئے تھے پھر مشرکین سدراہ ہوئے اور حضرتؓ بغیر عمرہ ادا کئے ہوئے واپس تشریف لے گئے۔ اس صورت میں آزمائش سے مراد یہی ہے کہ اس خواب دیکھنے کے باوجود بغیر نیت پوری کئے ہوئے واپس ہوئے تو بہت سے مسلمانوں پر حقانیت پیغمبر میں شک غالب آ گیا۔ کہ اگر یہ سچے رسول ہیں تو ان کی بات پوری کیوں نہ ہوئی اور آپ نے یہ جواب دیا کہ میں نے یہ کب کہا تھا کہ داخلہ اسی سال ہوگا۔ اگر غیب پر ایمان ہے تو وعدہ کی تکمیل کے لئے آئندہ کے منتظر رہو۔ اس شان نزول کے بعد رویا کے معنی خواب قرار پائیں گے۔ مگر اس شان نزول سے اس شجرۃ الزقوم کا کوئی ربط سمجھ میں نہیں آتا۔ اب تو اس شجرہ سے کوئی اور شجرہ مراد ہونا چاہیے جو مورد لعنت پروردگار ہے۔

تیسری شان نزول جو تفسیر اہل سنت میں وارد ہے اس سے خواب کا بھی پتہ چلتا ہے اور اس شجرہ ملعونہ کی بھی نشان دہی ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ رسول خدا ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ آپ کے منبر پر بندرجست و خیز کر رہے ہیں حضرتؓ کو اس سے بہت صدمہ ہوا یہ اشارہ تھا بنی امیہ کے ان صاحبان اقتدار کی طرف جو بنام خلافت رسول حکمرانی کرنے اور آپ کے منبر پر چڑھ کر خطبہ پڑھنے والے تھے۔^[1]
 علامہ طبریؒ نے اپنی تفسیر میں ہماری ہی طرح ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے مذکورہ بالا تمام اقوال نقل کر دیئے ہیں اور پھر آخری قول کی تائید میں کلمات آئمہ معصومینؑ درج کئے ہیں اور واقعات سے اسکے شواہد بھی وارد کئے ہیں۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّا اِبْلِیْسَ ؕ قَالَ ؕ اَسْجُدْ لِمَنْ خَلَقْتَ طٰٓغٰٓئًا ۗ قَالَ اَرَاۤءَیْتَكَ هٰذَا الَّذِیْ كَرَّمْت عَلٰی ذٰلِیْنَ اٰخَرْتِنِ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَا حَتٰیٰنَکِنَّ دُرِّیَّتَهُ اِلَّا قَلِیْلًا ۗ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَاؤُكُمْ جَزَاۤءً مَّوْفُوْرًا ۗ ۝۳۱

[1]. بنو امیہ (علی بن ابراہیم) روى عن ابی جعفر و ابی عبد اللہ ﷺ و روى مثل ذلک عن سهل بن سعد الساعدى من ابیہ — و مثله عن سعد بن بشار. (تبیان)

رَبُّكُمْ الَّذِى يُرْجِى لَكُمْ الْفُلْكَ فِى الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ ؕ إِنَّهُ كَانَ بِكُمْ
رَحِيْمًا ﴿١٦﴾ وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِى الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُونَ إِلَّا آيَاهُ ۗ فَلَمَّا نَجَّكُمْ
إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ ؕ وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴿١٧﴾

”تمہارا پروردگار وہ ہے جو تمہارے لئے کشتیوں کو سمندر میں رواں کرتا ہے تاکہ تم اس کے فضل و کرم سے کسب معاش کرو، یقیناً وہ تم پر بڑا مہربان ہے اور جب تمہیں سمندر میں سختی پڑتی ہے تو اس کے سوا جس جس کو پکارتے ہو، سب غائب ہو جاتے ہیں مگر جب وہ تمہیں چھٹکارا دے کر خشکی میں پہنچاتا ہے تو تم روگردانی کرتے ہو اور انسان بڑا ناشکرا ہے۔“

چونکہ قدیم زمانہ میں سمندر کا سفر عموماً بسلسلہ تجارت ہوتا تھا اور اسی لئے باہموافق کو تجارتی ہوا سے تعبیر کیا جاتا تھا اسی لئے قرآن مجید میں بھی اکثر جگہ کشتیوں کے ذکر کے ساتھ معاشی منفعت کو نمایاں کیا گیا ہے۔

کشتیوں کو وہ رواں کرتا ہے یعنی اگر ہوا موافق ہی نہ ہو تو تم کشتی کیوں کر چلاؤ اور ہوا اس کے قبضہ میں ہے اس لئے روانی کشتی کی اس کی کارفرمائی سے وابستہ ہے۔

أَفَأَمِنْتُمْ أَنْ يُخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ أَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا
تَجِدُوا لَكُمْ وَكِيْلًا ﴿١٨﴾ أَمْ أَمِنْتُمْ أَنْ يُعَيِّدَ كُمْ فِيهِ تَارَةً أُخْرٰى فَيُرْسِلَ
عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيحِ فَيُغْرِقَكُم مِّمَّا كَفَرْتُمْ ۗ ثُمَّ لَا تَجِدُوا لَكُمْ عَلَيْنَا
بِهِ تَبِيْعًا ﴿١٩﴾

”تو کیا تم بے کھٹکے ہو اس سے کہ کہیں وہ خشکی ہی میں تمہیں دھنسانہ دے یا تم پر کوئی آندھی بھیج دے، پھر تم کوئی محافظ اپنے لئے نہ پاؤ، کیا تم اس سے بے کھٹکے ہو کہ وہ دوبارہ تم کو اسی (دریا) میں پلٹائے اور اس کے بعد ایک تیز جھکڑی ہو تم پر بھیج دے اور اس ناشکرے پن کے عوض میں تمہیں ڈبو دے، پھر تم اپنے لئے ہم سے اس سبب سے کوئی باز پرس کرنے والا [] نہیں پاؤ گے۔“

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَيْنَٰى آدَمَ وَحَمْلَنَّهُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَهُمْ مِّنَ الطَّيْبٰتِ
وَفَضَّلْنَهُمْ عَلَىٰ كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴿٢٠﴾

”اور ضرور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی ہے اور انہیں خشکی اور تری کے لئے سواریاں دیں اور انہیں اچھی اچھی

[1]. اى من يتبع اهلاكم للمطالبة بدھائكم او ياخذ ثباركم (تبیان)

غداؤں سے روزی دی اور اپنی بہت سی مخلوقات سے زیادہ انہیں عطا کیا۔“

آیت کے آخری جملہ سے انسان کا اشرف المخلوقات ہونا برقرار رہتا ہے یا نہیں؟ مترجمین نے عموماً جو ترجمہ کیا ہے ”بہت سوں پر فضیلت دی ہے“ اس سے عمومی افضلیت قائم نہیں رہتی بلکہ ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ ایسے ہیں جن پر فضیلت نہیں ہے، جلالین نے لکھا ہے:

كثير من خلقنا كالبهيم والوحوش -

بہت سے اپنے مخلوقات پر جیسے چوپائے اور وحشی جانور۔

مگر اس کے بعد لکھ دیا ہے: وتشمل الملائكة اس میں ملائکہ بھی داخل ہیں یہ سمجھ میں نہیں آیا وہاں جب عموم ہے ہی نہیں تو شمول

کیسا؟

جناب شیخ الطائفہ کے نکتہ رس ذہن نے اس مشکل کو حل کیا ہے اور اسی کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا ہے وہ حل یہ ہے کہ اس آیت میں فضیلت بحیثیت درجہ و مرتبہ کا ذکر ہے ہی نہیں بلکہ اللہ کی نعمتوں کا ذکر ہے اور وہ انسان کو اتنی ملی ہیں جتنی زیادہ تر مخلوقات کو نہیں ملی ہیں اور اس کی نظیر پہلے پارہ میں آچکی ہے جب بنی اسرائیل کے لئے فضلنا کا لفظ صرف کیا گیا ہے اور اس میں صرف نعمتوں کا زیادہ عطا ہونا مراد ہے جو بغرض امتحان بھی ہو سکتا ہے نہ کہ مرتبہ میں بلند ہونا تو یہی فضلنا کے معنی یہاں بھی ہیں۔

رہ گیا انسان کا اشرف المخلوقات ہونا تو وہ خود اس آیت کے پہلے جملہ سے ثابت ہے کہ لقد کرمننا بنی آدم ہم نے بنی آدم کو عزت عطا کی جس میں اسکے مقابل کی کسی نوع کا استثناء نہیں ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ کرامت و بزرگی میں کوئی اس کا مد مقابل نہیں ہے۔^[1]

اس کے علاوہ: لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ہم نے انسان کو بہترین درستی کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس کی تخلیق کے ذکر کے بعد اپنے کواحسن الخلقین کہنا یہ تمام چیزیں قطعی طور پر اس کے اشرف المخلوقات ہونے کی دلیل ہیں۔

يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ ۗ فَمَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِبَيِّنَاتٍ فَأُولَٰئِكَ يَقْرَءُونَ
كِتَابَهُمْ وَلَا يُطْلَمُونَ فَتِيلًا ﴿٤١﴾ وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ
وَأَضَلُّ سَبِيلًا ﴿٤٢﴾

”جس دن ہم ہر دور کے لوگوں کو ان کے امام کے ساتھ بلائیں گے تو جسے نامہ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا تو یہ لوگ (اطمینان کے ساتھ) اپنے نامہ عمل کو پڑھیں گے اور ذرہ بھر بھی ان پر زیادتی نہ ہوگی اور جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں اندھا اور زیادہ کھو یا ہوا ہوگا۔“

ہر دور کے لئے ایک امام کا وجود

[1]. کرمننا بنی آدم ای فضلنا ہم عن ابن عباس و اجوبیت الصنقہ علی جمیعہم من اجل من كان فيهم على هذا الصفة كقوله:

كنتم خيرامة اخر جت للناس (مجمع البيان)

مفسرین اہل سنت نے امام کے لفظ کو حق اور ناحق دونوں طرح کے اماموں کے معنی میں لیا ہے، اس لئے یہ ترجمہ کیا ہے کہ:

بخوانیم ہر فرقہ را با پیشوائے ایشان (شاہ ولی اللہ)

بلاویں گے ہم سب لوگوں کو ساتھی پیشواؤں ان کے کے (شاہ رفیع الدین)

ہمارے نزدیک جس طرح نبی کا لفظ جب بلاقرینہ بولا جائے تو اس میں جھوٹے مدعیان نبوت داخل نہیں ہوتے، اسی طرح امام کا لفظ بھی بلاقرینہ امام حق پر ہی صادق آسکتا ہے اور اس لئے یہ آیت ہر دور میں ایک امام کے موجود ہونے کی دلیل ہے جس پر اصلی اور نقلی دلائل دوسرے بھی ہیں اور ان دلائل میں سے ایک یہ آیت بھی ہوگی جس کی تائید میں امام رضا کی مستند حدیث بھی ہے۔^[۱]

جلالین نے ندعوا لفظ کے معنی ہی بدل دیے ہیں اور جو تفسیر کی ہے، اس کی بنا پر یہ ترجمہ ہوتا ہے کہ ہم ہر جماعت کو اس کے امام کی طرف منسوب کر کے پکاریں گے اور امام کی تفسیر نبی کے ساتھ کی ہے لکھا ہے:

بامامہم نبیہم فیقال یا امة فلان: ان کے امام کے ساتھ یعنی ان کے نبی کے ساتھ تو کہا جائے گا اے فلاں کی امت۔

اور پھر دوسرے معنی امام کے لکھے ہیں:

او بکتاب اعمالہم فیقال یا صاحب الخیر یا صاحب الشر: یا ان کے اعمال کے نوشتہ کے ساتھ تو کہا جائے گا اے

نیک اعمال والے یا اے برے اعمال والے۔

حالانکہ کہ امام کے معنی جو یا متبادل ہیں وہ تو پیشوا ہی کے ہیں۔ یہ نامہ اعمال کو امام قرار دینا تو بالکل ہی خلاف تبادر ہے۔

وَإِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لِتَفْتَرِي عَلَيْنَا غَيْرَةً ۖ وَإِذَا

لَا تَتَّخِذُوكَ خَلِيلًا ۖ وَلَوْلَا أَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدَّتْ تَرُكُنَ إِلَيْهِمْ شَيْئًا

قَلِيلًا ۖ إِذَا لَأَذُقْنَاكَ الْحَيَاةَ وَضَعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُكَ عَلَيْنَا

نَصِيرًا ۖ

”اور بلاشبہ وہ اس منزل سے فریب معلوم ہوتے تھے کہ آپ کو بہلا پھسلا کر الگ کر دیں اس سے جو ہم نے آپ کی

طرف وحی بھیجی ہے کہ آپ اس کے خلاف باتیں ہمارے سر منڈھ دیں اور اس وقت وہ آپ کو دوست جانی بنا لیں

اور اگر ہم آپ کو ثبات قدم عطا نہ کرتے تو نزدیک ہوتا کہ آپ ان کی طرف تھوڑا سا جھک جائیں اس وقت ہم آپ

کو دونوں سختیوں میں مبتلا کرتے زندگی کی بھی اور دونوں سختیوں میں موت کی بھی، پھر آپ اپنے لئے ہمارے

سامنے کوئی مددگار نہ پاتے۔“

پہلی جگہ نزدیک ہونے کی نسبت مشرکین کی طرف ہے، رسول کی طرف نہیں یعنی کوششیں انہوں نے ہر ہر دفعہ ایسی کی تھیں کہ وہ اس

[۱] عن الرضا علی بن موسیٰ بالاسانید الصحیة انہ روی عن اباہ عن النبی ﷺ انہ قال فیہ یدعی کل الناس بامام زمانہم و کتاب

و بہم و السنۃ نبیہم (مجمع البیان)

منزل سے قریب معلوم ہوتے تھے اس کے بعد پیغمبرؐ کے ان کوششوں سے جہاں تک متاثر ہونے کا تعلق ہے اسے فرض محال کے طور پر کہا ہے کہ اگر توفیق ربانی آپ کے شامل حال نہ ہوتی تو نزدیک ہوتا کہ آپ بھی ان کی طرف جھک جائیں یعنی وہ کوششیں اتنی زبردست تھیں کہ ایک عام بشر کا ان سے کچھ متاثر ہونا یعنی تھا مگر آپ تو عام بشر کے درجہ سے بالاتر ہیں اور لطف و خاص ربانی آپ کے شامل حال ہے، اس لئے آپ ان کوششوں سے متاثر نہیں ہو سکتے۔ یہاں جلالین نے بھی حقیقت پسندی سے کام لیا ہے چنانچہ لکھا ہے:

لولا ان ثبتناك على الحق بالعصمة لقد كدت قاربت تر كن تحليل اليهم شيئا ركونا قليلا لشدّة احتياهم المحاحم وهو صريح في انه لم ير كن ولا قارب (جلالین)
اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے حق پر عصمت کے ذریعے سے تو قریب ہوتا۔ کہ آپ مائل ہو جائیں ان کی طرف ذرا سا کیونکہ ان کی حیلہ گری اور ضد اتنی سخت تھی، اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ نہ جھکے اور نہ قریب تھا کہ آپ جھکیں۔
قرآن مجید کی اس طرح کی آیات ان علماء کے قول کی تائید کرتی ہیں جو عصمت کو خداوند عالم کا لطف خاص قرار دیتے ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کردار میں پیغمبر خدا ﷺ کے ارادہ و اختیار کا دخل نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ عصمت کے مقابلہ میں جو تار یک پہلو ہیں ان میں ایک گناہ ہے۔ یہ ارادۂ عدول حکمی اور مخالفت قانون ربانی کا نام ہے۔ اور دوسرے سہو و نسیان اور خطا ہیں جو بصورت وقوع غیر ارادی چیز ہوتے ہیں عصمت ان سب باتوں سے بری ہوتی ہے اب جہاں فعل ارادی ہوتا ہے وہاں ترک بھی ارادی ہوگا۔ اور وہ رسولؐ کا اختیاری کارنامہ ہوگا اور جہاں فعل بصورت وقوع غیر اختیار ہوگا وہاں ترک ارادہ نہیں ہو سکتا۔ وہ لطف خاص ربانی کا نتیجہ ہوگا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن مجید نے جہاں جہاں پیغمبرؐ کے حسن کردار کو لطف ربانی کا نتیجہ قرار دیا ہے وہ سب اس قسم کی غلطیوں سے بچنا ہے اور اس لئے یہاں بھی دیکھئے کہ لطف ربانی نہ ہونے کی صورت میں یہ کہا گیا کہ آپ ان کی طرف تھوڑا سا مائل ہو جاتے۔ یہ ”تھوڑا سا“ آخر کیوں؟ پورے طور پر کیوں نہیں، ہم تو اس سے یہ سمجھتے ہیں کہ لطف خاص بھی نہ ہوتا تب بھی جہاں تک ارادی حیثیت کا تعلق ہے آپ ان کے ہم نوا پھر بھی نہیں ہو سکتے تھے مگر انکے فریبوں سے متاثر ہو کر دھوکا کھا کر غیر ارادی طور پر کچھ ان سے متاثر ہو جاتے اور یہی وہ چیز ہے جس سے بچانا لطف خاص کا کام ہے اور اس کے ضعف الحیوة و ضعف الممات سے عذاب کے معنی کا پیدا کرنا غلط ہے۔ اگر عذاب ہوتا تو زیادہ موزوں ہوتا کہ حیات اور ممات کے بجائے دنیا اور آخرت ہوتا۔ آخرت موت تھوڑی ہے، وہ تو موت کے بعد کی منزل ہے اس لئے ضعف الحیوة و ضعف الممات سے مراد ہم غلط روی کے وہ نتائج سمجھتے ہیں جو قہراً ایک غلط کام پر مرتب ہوتے ہیں اور وہ ارادہ و اختیار سے وابستہ نہیں ہوتے۔

یہاں آ کر جلالین ٹھوکر کھا گئے جو انہوں نے لکھ دیا:

ضعف عذاب الحیوة و ضعف عذاب الممات ای مثل ما یعذب غیرك فی الدنیا و الآخرة.

زندگی کے عذاب کا دونا اور موت کے عذاب کا دونا یعنی جتنا آپ کے سوا دوسرے کو عذاب ہو اس کا دونا دنیا اور آخرت دونوں میں۔

ہم بتا چکے ہیں کہ یہاں نہ عذاب کا ذکر ہے اور نہ دنیا و آخرت کا نام ہے اس لئے یہ تشریح حقیقت سے دور ہے۔

افسوس یہ ہے کہ چونکہ ان آیات کے بارے میں حدیث معصومہ کو دستیاب نہیں ہوئی، اس لئے ہمارے مفسرین نے بھی جیسے علامہ طبری، وغیرہ بس جمہوری مفسرین کے اقوال نقل کرنے پر اکتفا کی جو ایسے مقامات پر عموماً حقیقت سے دور ہوتے ہیں اور خود ان پر کوئی نقد و تبصرہ نہیں فرمایا سواجر الامۃ جناب ابن عباسؓ کے ایک قول کو نقل کرنے کی جو کافی قیمت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ:

رسول الله معصوم و مهكن هذا تخويف الامة لئلا يركن احد من المومنين الى احد من المشركين في شيء من احكام الله وشرائعه (مجمع البيان)
پیغمبر خدا تو معصوم ہیں مگر یہ خوف دلانا ہے آپ کی امت کو کہ اہل ایمان میں سے کوئی شخص مشرکین میں سے کسی کی طرف نہ جھکے خالق کے احکام تو ان میں کسی جز میں بھی۔

وَإِنْ كَادُوا لَيَسْتَفِزُّوكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا وَإِذَا لَا يَلْبَثُونَ
خِلْفَكَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٤٤﴾ سُنَّةٌ مِّنْ قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا
تَحْوِيلًا ﴿٤٥﴾

’اور بلاشبہ وہ نزدیک تھے اس سے آپ کو متزلزل کر دیں اس سرزمین سے کہ نکال دیں آپ کو اس میں سے، اس صورت میں وہ نہ رہتے آپ کی بعد مگر بہت کم اس طریقہ کے مطابق جو رہا آپ کے پہلے والے رسولوں کے بارے میں اور آپ نہ پائیے گا ہمارے طریقہ کار میں تبدیلی۔‘

الارض سے کون سرزمین مراد ہے؟ اس میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے بعض نے مکہ مراد لیا ہے یعنی ان کا منصوبہ یہ تھا کہ آپ کو یہاں سے جلا وطن کر دیں اور کہا ہے کہ یہ آیت اس وقت کی نازل شدہ ہے جب ابھی ان کا بس ارادہ ہی تھا انہوں نے جلا وطن کرنے کا سامان نہیں کیا تھا اور پھر جو کہا گیا ہے کہ وہ آپ کے بعد رہیں گے یعنی وہ سب بتلائے عذاب ہوں گے اور ختم کر دیئے جائیں گے چنانچہ یہ بات جنگ بدر میں وقوع میں آئی کہ وہ سب قتل ہوئے اور بعض مفسرین آیت کو بعد ہجرت کا نازل شدہ قرار دیتے ہیں اور اس صورت میں الارض سے مراد مدینہ ہے [۱] اور منصوبہ بنانے والے اس وقت کے یہودی ہیں جنہوں نے مدینہ میں ہر طرح حضرتؐ کے خلاف منصوبہ سازی کی کہ آپ یہاں نہ رہ سکیں۔

ایک تیسرا قول یہ ہے کہ اس سرزمین سے مراد مکہ ہے اور ان کا پہلا منصوبہ تھا کہ وہ آپ کو مکہ سے باہر نکال دیں جو عمل میں نہیں آیا بعد میں انہوں نے آپ کے مکان کا محاصرہ کر کے آپ کو وہیں قتل کرنا چاہا جس پر آپ کو ہجرت کا حکم ہوا [۲] مگر حقیقت امر یہ ہے کہ ہجرت کا منصوبہ مدینہ منورہ کے لوگوں کی دعوت پر طے پا گیا تھا اور اس غرض سے کہ آپ مدینہ پہنچنے نہ پائیں تاکہ آپ کی جان لینے کا منصوبہ بنا کر گھر کا محاصرہ کر لیا

[۱]. الارض ارض المدينة (جلالین)

[۲]. الصحيح ان المعنيين في الآية مشركو امكة واهل بدر جو هن مكة ولكنهم هموا باخر اجه ثم خرج لهما امر بالهجرة اخر جو الا

ستوصلوا بالعذاب (مجمع البيان)

جائے۔

اقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ ۗ إِنَّ قُرْآنَ
الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا ﴿۱۷۹﴾

”نماز برپا کرو زوال آفتاب سے [۱] رات ڈھلنے تک [۲] اور صبح کو پڑھئے [۳] یقیناً صبح کا پڑھنا وہ موقع ہے کہ جب
مشاہدہ کرنے والوں کی حضوری ہوتی ہے“۔ [۴]

اوقات نماز

اس آیت میں نماز فریضہ کے اوقات بیان کئے گئے ہیں جس میں الگ الگ صرف دو وقت نظر آتے ہیں، ایک زوال آفتاب سے رات
ڈھلنے یعنی نصف شب تک اور دوسرا اس سے الگ نماز صبح کا وقت حالانکہ نماز کے اوقات پانچ ہیں۔

ہمارے نزدیک قرآن مجید کی یہ آیت صاف صاف فقہ امامیہ کے مسئلہ پر منطبق ہے فقہ امامیہ کی رو سے صرف نماز صبح کا وہ وقت ہے جس
کے پہلے اور بعد کسی نماز فریضہ کا وقت نہیں ہے اس لئے اس نماز کو الگ کر کے ذکر کرنا ضروری تھا اس کے علاوہ جتنی نمازیں ہیں وہ زوال آفتاب کے
بعد سے نصف شب تک ہیں [۵] اس طرح کا کوئی لمحہ ایسا نہیں جس میں کسی نہ کسی نماز کا وقت نہ ہو۔ بے شک وہ چار نمازوں پر تقسیم ہے یوں کہ زوال
سے غروب آفتاب تک ظہر اور عصر دونوں نمازوں کا وقت ہے ترتیب کے ساتھ کہ پہلے ظہر پڑھنا لازم ہے اور اس کے بعد عصر اور اس بنا پر عقلی طور
سے زوال کے بعد شروع کی چار رکعت کا وقت ظہر سے مخصوص ہو گیا ہے اور آخر کی چار رکعتوں کا وقت عصر سے مخصوص ہو گیا ہے باقی درمیان کا پورا
وقت۔ دونوں نمازوں میں مشترک ہے اور پھر غروب سے نصف شب تک مغرب و عشاء کا وقت ہے جس میں اسی طرح ترتیب چونکہ لازم ہے اس
لئے عقلی طور پر شروع کا وقت مغرب سے مخصوص ہو اور آخر کا عشاء سے مخصوص ہو گیا بیچ کا وقت مشترک ہے جس میں مغرب بھی ہو سکتی ہے اور عشاء
بھی۔ اس طرح زوال سے لے کر نصف شب تک پورا چار نمازوں کا وقت ہے جس کا قرآن مجید نے ایک ساتھ ذکر کیا ہے اور یہ کہ کس نماز کا کون سا
وقت ہے اسے مجمل چھوڑ دیا ہے جس کی تشریح سنت نبوی و احادیث معصومین علیہم السلام سے ہو گئی اور صبح کی نماز کا جو اس سلسلہ سے جدا تھی الگ ذکر کیا
ہے۔ [۶]

[۱] وقت زوال آفتاب (شاہ ولی اللہ) وهو العروى عن ابى جعفر و ابى عبد الله علیہم السلام (تبیان)

[۲] غسق اللیل انتصافه (علی بن ابراہیم)

[۳] صلوة الصبح (جلالین)

[۴] تشهد ملائكة اللیل وملائكة النهار (علی بن ابراہیم) حاضر می شونند فرشتگان (شاہ ولی اللہ)

[۵] ای الظہر والعصر والمغرب والعشاء (جلالین)

[۶] لزوالها صلوة الظہر و صلوة العصر والی غسق اللیل صلوة المغرب والعشاء الاخره صلوة الفجر فی فردت بالذکر (تبیان)

یہ فقہ امامیہ کا مسلک ہے جو قرآن کی اس آیت سے صاف نمودار ہے [۱] لیکن سواد اعظم کے نقطہ نظر سے ہر نماز کے بعد ایک وقفہ ہے جس میں دوسری نماز کا وقت داخل نہیں ہوتا یعنی ظہر اور عصر کے بیچ میں ایک وقفہ ہے مغرب اور عشاء کے بیچ میں ایک وقفہ ہے اس لحاظ سے قرآن کے لئے ضروری تھا کہ جیسے صبح کی نماز الگ کر کے ذکر کیا گیا ہے ویسے ہی تمام نمازوں کا وقت الگ الگ بیان کرے مثلاً یہ کہ نماز قائم کرو زوال آفتاب کے وقت، پھر آفتاب کی کرنیں زرد ہونے کے وقت، پھر سورج غروب ہونے کے وقت، پھر مغرب کی طرف کی سرخی دور ہونے کے بعد۔ اس طرح پانچ وقت بیان ہوتے یا پھر جُملاً کہ دیا جاتا کہ شب و روز میں پانچ نمازیں ہیں لیکن صبح کی نماز کو الگ نام لے کر کہنا اور پھر زوال سے لے کر نصف شب تک الگ کہنا فقہ اہل سنت کے لحاظ سے کسی طرح نہیں بنتا اور صرف فقہ امامیہ ہے جس کے لحاظ سے صبح و مناسب قرار پاتا ہے جو درحقیقت فقہ اسلامی کی حقیقی تعلیم ہے اور اہل بیت معصومین علیہم السلام نے اس کی ترجمانی فرمائی ہے۔

آخر آیت میں نماز صبح کے لئے خاص طور پر یہ ارشاد کیا:

إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا

یقیناً صبح کا پڑھنا وہ موقع ہے کہ جب مشاہدہ کرنے والوں کی حاضری ہوتی ہے صرف تمام نماز ہائے پنجگانہ نماز صبح کے بروقت ادا کرنے کی تاکید و اہتمام کا مطہر ہے کہ اس میں عبودت اور ذوق عبادت کی آزمائش زیادہ ہے اور اسی لے بہت سے پابند نماز بھی نماز صبح کے وقت سوتے اور بعد میں قضا پڑھتے نظر آتے ہیں جو بر بنائے کرم خالق کی جانب سے معاف سہی مگر ذوق عبودیت کے نقص کا ثبوت ضرور ہے۔ مفسرین نے کان مشہودا کی تشریح یہ کی ہے کہ اس وقت پر رات والے فرشتے اور دن والے فرشتے دونوں یکجا ہوتے اور بندہ الہی کے ادائے فرض اور مظاہرہ عبودت کے گواہ بنتے ہیں۔ اس کے لئے صحیح بخاری کی حدیث میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہوا ہے کہ:

يجتمع ملائكة والنهار في صلوة الفجر۔

صبح کی نماز کے وقت شب و روز کے فرشتے اکٹھا ہوتے ہیں۔

اسے ہمارے بعض علماء نے بھی نقل کیا ہے۔ [۲]

وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدُ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ ۗ عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا ﴿۹﴾
 وَقُلْ رَبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَلْ لِي مِنْ
 لَدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ﴿۱۰﴾ وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۗ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ

[۱] یزید ذلک مارواہ العیاشی بالا سناد عن عبید بن زرارة عن ابی عبد اللہ فی ہذہ الایة قال: ان اللہ افترض اربع صلوات اول وقتہا من زوال الشمس الی انتصاب اللیل منہا صلوة تان اول وقتہا من عند زوال الشمس الی غروبہا الا ان ہذہ قبل ہذہ ومنہا صلوات اول وقتہا من عند زوال الشمس الی غروبہا الا ان ہذہ قبل ہذہ ومنہا صلوات اول وقتہا من غروب الشمس الی انتصاب اللیل الا ان ہذہ قبل ہذہ (مجمع البیان)

[۲] اورده البخاری فی الصحیح (مجمع البیان)

زَهْوَقًا ﴿١١﴾

”اور رات کے کچھ حصہ میں آپ نماز تہجد پڑھئے۔ جو آپ کے لئے ایک اضافہ ہے نزدیک ہے کہ آپ کو آپ کا پروردگار ایک قابل تعریف موقف پر کھڑا کرے اور کہیے کہ اے میرے پروردگار! میرا داخلہ کر سچائی کا داخلہ اور نکال بھی مجھے سچائی کے ساتھ اور میرے لئے قرار دے اپنی جانب سے ایسی قوت جو سہارا دینے والی ہے اور کہیے کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا۔ یقیناً باطل تو مٹنے والا ہی ہے۔“

بہت سے دوسرے مفسرین کی طرح ہمارا تصور یہ نہیں ہے کہ جہاں بھی واحد مذکر حاضر کا مخاطب ہو وہاں ہم مخاطب خاص رسول کو قرار دیں بلکہ اکثر جگہ ہم اس خطاب کا مخاطب عام سمجھتے ہیں یعنی کوئی بھی جو سنے وہ اس کا مخاطب ہو سکتا ہے مثلاً: المر تر كيف فعل ربك با صحاب الفيل کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے اصحاب فیل کے ساتھ کیا کیا؟ ار عيت الذی یکذب بالدين کیا تم نے دیکھا اسے جو روز قیامت کو جھٹلاتا ہے قل ان صلوتی و نسکی و محیای و مماتی لله رب العالمین تمہارا قول یہ ہو کہ میری نماز اور میری تمام عبادتیں اور میری زندگی اور میری موت اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے سبح اسم ربك الاعلیٰ تسبیح کرو اپنے پروردگار کے نام کی جو بلند و برتر ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام مقامات پر ہم یہ درست نہیں سمجھتے کہ ترجمہ میں بریکٹ کے اندر اے رسول! کا اضافہ کیا جائے اور ہم ایسے مقامات پر ترجمہ ”تم“ ”تم“ کے مخاطب کے ساتھ کرتے ہیں اور یہ اس کی علامت ہے کہ ہم وہاں مخاطب عام سمجھتے ہیں خاص رسول کو مخاطب نہیں سمجھتے مگر بعض مقامات قرآن مجید میں اس واحد حاضر کے لفظ کے ساتھ مخاطب کے ایسے ہوتے ہیں جن کا مضمون پتہ دیتا ہے کہ یہاں ذاتاً رسول اللہ ﷺ مخاطب ہیں جیسے: المر نشرح لك صدرک و وضعنا عنک و زرک الذی انقض ظهرک و رفعنا لك ذکوک کیا ہم نے آپ کے سینہ کو کشادہ نہیں کیا اور آپ سے اس بوجھ کو نہیں اتارا جو آپ کی پشت کو توڑے جا رہا تھا۔ اور کیا ہم نے آپ کے ذکر کو اونچا نہیں کیا؟ ما ودعك ربك و ما قلی نہ آپ کو آپ کے پروردگار نے چھوڑا ہے اور نہ وہ آپ سے ناراض ہے انك لمن المرسلین بلاشبہ آپ ضرور پیغمبروں میں سے ہیں قد نزلنا قلب و جهك فی السماء ہم آپ کے چہرے کی گردش کو آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ایسے مقامات پر ضمیر مخاطب کے ترجمہ میں اپنے دور کے معیار تہذیب کے مطابق آپ کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔

اس کے پہلے کی آیت اَفِجِرِ الصَّلٰوةَ لِذُلُوْكَ الشَّمْسِ اِلٰی عَسَقِ الْاَيْلِ کا ترجمہ میں نے کیا نماز برپا کرو زوال آفتاب سے نصف شب تک اس لئے کہ وہ احکام رسول سے مخصوص نہیں ہیں یہاں اس آیت میں بھی اگر فقط و من الیل فتہجدیدہ ہوتا تو ہم اسکو عام حکم سمجھتے کہ رات کے کچھ حصہ میں نماز تہجد ادا کرو مگر یہاں آخر میں عَسَىٰ اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا امید ہے کہ آپ کو آپ کا پروردگار ایک قابل تعریف موقف پر کھڑا کرے گا۔ اور مقام محمود کی تفسیر مقامات شفاعت سے ہوئی ہے ^[1] یہ جز ہمیں مجبور کر رہا ہے کہ ہم اس کا مخاطب رسول اللہ کو مانیں اور اس لئے اس آیت کے ترجمہ میں میں نے آپ کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اگر یہ آخر کار جملہ نہ ہوتا تو نماز تہجد کے ساتھ اس فقرہ کا کہ ”نافلته لك“ یہ مطلب ہو سکتا تھا کہ وہ نماز میں جن کا پہلے حکم تھا کہ زوال آفتاب سے نصف شب تک اور پھر صبح کر برپا کرو، وہ تو نماز ہائے فریضہ ہیں اور یہ نماز تہجد فرض نہیں ہے بلکہ نفل ہے کہ اس کا ترک کرنا باعث

[1]. شفاعت (فتح الرحمن) اجمع المفسرون علی ان المقام المحمود هو مقام الشفاعة (مجمع البیان)

عذاب اُخروی نہیں ہے لیکن جب مخاطب رسولؐ کی ذات ہوگی تو اب نافلۃ لک کے یہ معنی ہو گئے کہ اور سب نمازیں تو آپ کے علاوہ اور تمام مسلمانوں پر بھی فرض ہیں لیکن یہ نماز تہجد اور مسلمانوں کے لئے مستحب ہے اور آپ کے لئے خصوصی طور پر یہ مزید اضافہ ہے کہ آپ کو اس سے بھی ضرور انجام دینا ہے اور ترک نہیں کرنا ہے [۱] اور یہ رہ نما میان دنیا سے خالق کی طرف کے باعظمت رہنما کا امتیاز ہے کہ دوسرے بڑے افراد اپنے لئے مراعات زیادہ قرار دیتے ہیں اور رسولؐ اسلام وہ ہیں جن کا حصہ فرائض میں اور ذمہ داریوں میں دوسروں سے زیادہ ہوتا ہے چنانچہ نماز شب دوسروں کے لئے سنت ہے اور پیغمبرؐ کے لئے یہ بھی ایک فریضہ کی حیثیت رکھتی ہے جسے آپ ترک نہیں فرماتے تھے۔

اس انتباہ کے ساتھ کہ یہ آپ پر ایک مزید فریضہ ہے پھر یہ کہ نزدیک ہے کہ آپ کو آپ کا پروردگار ایک قابل تعریف موقف پر کھڑا کرے یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ”جن کے رتبے ہیں سوا، ان کو سوا مشکل ہے“۔ یعنی چونکہ آپ کو اللہ کی طرف سے شفاعت کا بلند مرتبہ ملنے والا ہے، اس لئے آپ کے عمل کا معیار دوسروں سے بلند ہونا چاہیے۔

اس کے بعد کی آیات چونکہ انداز کلام یعنی عنوان مخاطب میں ان دونوں آیات سے متحد ہیں، اس لئے وہ ایک ڈال معلوم ہوتی ہیں اور ہم نے بھی ان کا ترجمہ ایک ساتھ کیا ہے اور اگر تفسیر کو سامنے نہ رکھا جائے تو ہم کہیں کہ وہ سب ایک ہی موقع یعنی فتح مکہ کے قبل کی نازل شدہ ہیں اور داخلہ سے مراد مکہ میں داخلہ ہے اور نکلنے سے مراد فتح کے بعد وہیں سے مدینہ کی طرف واپسی کے لئے نکلنا ہے اور حق کے آنے اور باطل کے مٹنے کا اعلان بھی اسی فتح کا نتیجہ ہے مگر کیا کیا جائے کہ وہ جو ترتیب قرآن کے مطابق منشاء قدرت ہونے کے بڑے منادی ہیں ان آیات کو شان نزول کے اعتبار سے اتنا پیشیمان و پریشان کر رہے ہیں کہ ان میں آپس میں بڑا فاصلہ ہوتا ہے چنانچہ رَبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مَخْرَجَ صِدْقٍ کو جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے میرا داخلہ کر سچائی کا داخلہ اور نکال بھی سچائی کے ساتھ اسے کہتے ہیں کہ یہ ہجرت کے موقع پر مکہ سے نکلنا اور مدینہ میں داخل ہونا ہے اس سے ظاہر ہے کہ یہ آیت کی ہے اور ہجرت سے قبل کی ہے [۲] حالانکہ ذوق سلیم کا فیصلہ ہے کہ اس صورت میں آخر جنی پہلے ہوتا اور ادخلنی بعد کو ہوتا پھر اس کے بعد کی آیت: وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ کو کہتے ہیں کہ وہ فتح مکہ سے متعلق ہے۔ [۳]

علامہ طبرسی نے بس چار قول بلا تبصرہ نقل کر دیئے ہیں جو کسی نتیجہ تک نہیں پہنچا سکتے۔

بیچ کا فقرہ:

وَاَجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا

اس کا ترجمہ شاہ ولی اللہ یہ کرتے ہیں کہ:

ساز برای من از نزدیک خود قوتی یاری دہندہ

بنا میرے لئے اپنی طرف سے ایک طاقت مدد کرنے والی

اب اگر یہ طاقت کسی ایسی شخصیت کے لباس میں نمایاں ہو جو رسولؐ کی نصرت میں ہر جگہ اس طرح کا کار نمایاں انجام دے کہ فرشتہ سے

[۱] روی ائہا فرضت علیہ ولع تفرض علی غیرہ کو کانت فضیلة له (تبیان)

[۲] ادخلنی المدینة (جلالین)

[۳] وقل عند دخول مکة (جلالین)

لافتی الاعلیٰ کا کلمہ پڑھوالے تو اس روایت کو بالکل درست ماننا چاہیے جو بتاتی ہے کہ سُلْطَمًا نَصِيْرًا سے مراد یہی شخصیت ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ دعائے رسول کی قبولیت اس شخص میں نمایاں ہوئی۔

وَنَزَّلَ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۗ وَلَا يَزِيْدُ الظَّالِمِيْنَ اِلَّا

خَسَارًا ﴿٧٤﴾

”اور ہم اتارتے ہیں اس قرآن کو جو شفا [۱] اور رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لئے اور ظالموں کے لئے اضافہ نہیں کرتا مگر خسارے میں“۔

وہ شفا اور رحمت سب کے لئے ہو سکتا ہے مگر اس وقت جب وہ اس سے نیک نیتی کے ساتھ یہ فوائد حاصل کرنا چاہیں لیکن جو اسے فائدہ اٹھانے کے لئے پڑھتے اور سنتے ہی نہیں بلکہ صرف مکنتہ چینی کرنا ان کا مقصد ہے اور اسی لئے انہیں ظالم کہا گیا ہے کہ وہ اپنے سوء اختیار سے اس کے فوائد سے محروم ہوتے ہیں۔ ان کے کفر و عناد میں اور اضافہ ہی ہوتا ہے جو دین و دنیا میں ان کی تباہی کا سبب ہے اور اسی لئے کہا گیا ہے کہ ان کے لئے تو اور وہ خسارے ہی کا باعث ہوتا ہے [۲] اور اسی لئے سورہ بقرہ کے شروع میں اسے کہا گیا ہے کہ ہدیٰ للمتقین وہ فکر نجات رکھنے والوں کے لئے باعث ہدایت ہے اور وہاں اس کی تشریح کی جا چکی ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے فائدہ یہی لوگ اٹھاتے ہیں۔ دوسرے اس سے باختیار خود محروم رہتے ہیں جس میں اس کا کوئی قصور نہیں خود ان کی تقصیر ہے۔ دوسرا رخ اس کا اور ہے کہ قرآن کی آیات ان کے غلط منصوبوں کی پردہ دری کر کے انہیں رسوا کرتی ہیں۔ اس طرح انہیں خسارہ ہوتا ہے۔ [۳]

وَإِذَا أُنْعِمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ آعْرَضَ وَتَأْبَجَانِبَهُ ۗ وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَكُوفًا ﴿٧٥﴾

قُلْ كُلُّ يَّعْمَلْ عَلَى شَاكِلَتِهِ ۗ فَرَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ أَهْدَى سَبِيْلًا ﴿٧٦﴾

”اور جب ہم انسان کو نعمت عطا کرتے ہیں تو وہ روگردانی اختیار کرتا اور پہلو تہی کرتا ہے اور جب اس کے لئے کوئی خرابی ہوتی ہے تو بے آس ہو جاتا ہے کہ نتیجے کہ ہر ایک اپنے طریقہ پر کام کرتا ہے تو تمہارا پروردگار ہی خوب جانتا ہے کہ کون زیادہ درست راستے پر چلنے والا ہے“۔

پہلا کردار ان انسانوں کا ہے جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے اس کے بعد خود سے ذہن میں صاحب ان ایمان کا کردار آجاتا ہے کہ جب وہ نعمت ملتی ہے تو شکر الہی ادا کرتے ہیں اور جب مصیبت آتی ہے تو بھی مایوس نہیں ہوتے بلکہ اللہ کی طرف سے کشائش کے امیدوار رہتے ہیں اس

[۱]۔ من البیان (جلالین)

[۲]۔ لایزواحدون من عندہ الا خسار ایخسر ثوابہم ویستحقون العقاب لکفرہم بہ وحرمان انفسہم تلك المنافع التي فیہ (تبیان)

[۳]۔ یجتمل ان یریدان القرآن یظہر خبثہم واثمہم و ما یأتمرون بہ من الکیو المکر بالنبی فیفتضہون بذلک (مجمع البیان)

کے بعد یہ فقرہ آیت کا چسپاں ہوتا ہے کہ ہر ایک اپنے طریقہ پر کام کرتا ہے یعنی کافر کا رویہ وہ ہے اور مومن کا رویہ یہ ہے۔^[۱] یہ اس وقت ہے جب یہ آیت نمبر ۸۴ مقام تنزیل میں ۸۳ سے متصل ہی ہو۔

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ۚ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا

قَلِيلًا ﴿۸۵﴾

’اور وہ لوگ آپ سے روح کے متعلق دریافت کرتے ہیں کہہ دیجئے کہ روح میرے پروردگار کے حکم سے ہے اور تمہیں علم نہیں دیا گیا ہے مگر بہت کم‘۔

یعنی روح کی حقیقت کو معلوم کرنا تمہارے ظرف ذہن کو وسعت کے مطابق ہے اور نہ تمہارے لئے کارآمد۔ مگر اتنا سمجھنا تمہارے لئے ضروری ہے کہ یہ روح از خود نہیں بلکہ پروردگار کے ارادہ کا نتیجہ ہے اس لئے اس کی راہ میں صرف ہونا اور اس کے کام آنا چاہیے۔ ایک تفسیر یہ ہے کہ روح سے مراد قرآن ہے جس کے متعلق آئندہ کی آیت میں اشارہ آئے گا۔

وَلَيْنَ شِئْنَا لَنُدَّ هَبْنًا بِالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهِ عَلَيْنَا

وَكَيْلًا ﴿۸۶﴾ إِلَّا رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ ۚ إِنَّ فَضْلَهُ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيرًا ﴿۸۷﴾

’اور اگر ہم چاہیں تو جو کچھ ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی ہے، اسے بھی سلب کر لیں۔ پھر آپ ہمارے مقابلہ میں اپنے لئے کوئی کام بنانے والا نہ پائیں گے، سو اپنے پروردگار کی طرف سے ایک فضل و کرم کے، یقیناً اس کا فضل آپ پر بہت بڑا ہے‘۔

یعنی علم آپ کا ذاتی نہیں ہے، اللہ کے فیض و عطا سے ہے پھر اس کا علم کا تحفظ سہو و نسیاں سے امر اختیاری نہیں ہے بلکہ اللہ کے لطف خاص کا نتیجہ ہے جس پر اس کے پہلے ایک جگہ تفصیل سے تبصرہ ہو چکا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عصمت کے دو پہلو ہیں: ایک ہے ارادہ اور وہ ہے گناہوں سے بچنا اور ایک ہے بہ لطف ربانی اور وہ سہو و نسیاں و خطا سے بری ہونا ہے اور چونکہ عصمت میں یہ دونوں جزء ذخیل ہیں اس لئے بحیثیت مجموعی جیسا بعض علماء کا قول ہے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ عصمت لطف خاص کا نام ہے لیکن اس سے پیغمبر کے ارادہ کارنامہ کی عظمت کو نظر انداز کرنا بھی درست نہیں ہے پھر یہ لطف خاص بھی ہر کس و ناکس کے ساتھ نہیں ہوتا۔ اس کے لئے علم الہی میں صلاحیت نہیں ہے پھر یہ لطف خاص بھی ہر کس و ناکس کے ساتھ نہیں ہوتا۔ اس کے لئے علم الہی میں صلاحیت ظرف کی ضرورت ہے جو اس آیت سے ثابت ہے کہ:

اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ (انعام: ۱۲۴)

اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کا منصب کہاں رکھے۔

اس آیت کو مقام تنزیل میں اگر گزشتہ آیت سے متصل مانا جائے تو یہ ایک قرینہ اس کا ہو سکتا ہے کہ سابق آیت میں روح سے مراد قرآن

[۱] ای کل واحد من المؤمن والكافر يعمل على طبيعته وخلقته التي خلق بها عن ابن عباس (مجمع البيان)

ہی ہے۔ [۱]

قُلْ لِّىْنَ اِجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ اَنْ يَّاتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَأْتُوْنَ
بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانُ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظٰهِيْرًا ﴿۸۸﴾
”کہہ دیجئے کہ اگر انسان اور جنات سب مل کر کوشش کریں کہ اس قرآن کا جواب لے آئیں تو وہ اس کا جواب نہیں
لائیں گے، چاہے وہ کیسے ہی ایک دوسرے کے پشت پناہ بن جائیں۔“

تمام انس و جن مل کر بھی قرآن کا جواب نہیں لاسکتے

یہ قرآن مجید کے تمام مطالبات ’ایسا قرآن لے آؤ‘ دس سو رے ایسے لے آؤ۔ (ارے) ایک سورہ ہی لے آؤ اور اس سب کے
جواب میں دنیا کی عاجزانہ خاموشی کے بعد کا نتیجہ ہے جسے یہاں اس عظیم پر جوش انداز کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے اور جس کی تصدیق اس کے بعد بھی
دنیا کی خاموشی اور بے بسی آج تک کرتی رہی ہے اور ہمیشہ کرتی رہے گی۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِى هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ نَّفَاىِٕ اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا
كُفُوْرًا ﴿۸۹﴾

”اور بے شک ہم نے رخ بدل بدل کر لوگوں کے لئے اس قرآن میں ہر طرح کی مثالیں پیش کر دی ہیں تو زیادہ تر
لوگوں نے انکار کیا سوا ناشکرے پن کے۔“
یعنی ناشکرے پن کے سوا کسی اور راہ کے اختیار کرنے پر عملی طور سے تیار نہ ہونا تھے نہ ہونے۔

وَقَالُوْا لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا ﴿۹۰﴾ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ
مِّنْ مَّجِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿۹۱﴾ اَوْ تُسْقِطَ السَّمٰوٰتُ كَمَا
زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسْفًا اَوْ تَاْتِىَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰىكَةِ قَبِيْلًا ﴿۹۲﴾ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ
زُخْرَفٍ اَوْ تَرْفِىْ فِى السَّمٰوٰتِ ط وَلَنْ نُؤْمِنَ لِرُقِيْبِكَ حَتّٰى تُنْزِلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا
نَّقْرُوْهُ ؕ قُلْ سُبْحٰنَ رَبِّىْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۳﴾

”اور ان لوگوں نے کہا کہ ہم ہرگز آپ کی بات نہ مانیں گے یہاں تک کہ آپ ہمارے لئے زمین سے ایک چشمہ
پھوٹ نکالیں یا آپ کے لئے ایک باغ ہو کھجور اور انگور کا تو اس کے بیچ بیچ ایسا کیجئے کہ نہریں پھوٹ پھوٹ کر بہنے

[۱]. قيل معناه: ولو شئنا لمحونا هذا القرآن من صدرك وصدرا امتك وفي هذا دلالة على ان السؤال دفع عن القرآن (مجمع البيان)

لیکن یا جیسا کہ آپ کو زعم ہے آسمان کو ہم پر ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرا دیجئے یا اللہ اور ملائکہ کی ایک فوج بنا کر لے آئیے یا آپ کا ایک گھر ہو طلائے خالص کا یا آسمان پر چڑھ جائے اور ہم آپ کے چڑھ جانے کا بھی یقین نہیں کریں گے جب تک کہ ہم پر لکھی لکھائی ایک کتاب نہ اتارے جسے ہم خود پڑھیں، کہہ دیجئے کہ پاک ہے میرا پروردگار میں کیا ایک بشر کے علاوہ جو بھیجا گیا ہے اور کچھ ہوں؟

یعنی میرا ذاتی اختیار ان باتوں میں کچھ بھی نہیں ہے میں تو خالق کی حکمت و مصلحت کا پابند ہوں، اور کوئی بھی پیغمبر اپنی طرف سے کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتا بلکہ جتنے اللہ تصدیق و رسالت کے لئے بنائے تمام حجت از روئے حکمت ضروری سمجھتا ہے، اسے معجزات عطا فرماتا ہے۔^[۱] اس سے اور ایسی ہی دوسری آیات سے معجزات کی نفی کس طرح ثابت نہیں ہوتی جس پر ہم نے مقدمہ تفسیر میں کافی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا
رَّسُولًا ﴿۹۴﴾ قُلْ لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَّمشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمُ
مِّنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَّسُولًا ﴿۹۵﴾

’اور نہیں مانع ہوا لوگوں کو ایمان سے جب کہ ان کے پاس ہدایت آئی مگر یہ کہ انہوں نے کہا کیا اللہ نے ایک بشر کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے؟ کہہ دیجئے کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے جو سکون و وقار کے ساتھ چلتے ہوتے تو ہم ان پر آسمان سے کسی فرشتہ کو پیغمبر بنا کر بھیجتے‘

پیغمبروں کی بشریت

یعنی قدرت کا اصول بر بنائے حکمت یہ ہے کہ وہ پیغمبر انہی کے ہم جنس کو بنایا کرتا ہے۔ بعض لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ انبیاء و مرسلین اور ہمارے آئمہ معصوم علیہم السلام صورتہ بشر تھے لیکن حقیقت ان کی اس سے مختلف تھی۔ وہ غور کریں کہ قرآن کہہ رہا ہے کہ عامہ خلاق کے لئے بہت بڑی رکاوٹ بن گیا، ایمان سے یہ امر کہ پیغمبر بشر کیوں ہیں؟ اگر واقعہ یہ ہوتا کہ وہ درحقیقت بشر کے سوا کچھ اور ہوں تو اس رکاوٹ کو دور کرنا کتنا آسان تھا یہ کہہ کر کہ تمہارا یہ سمجھنا کہ وہ بشر ہیں غلط ہے، یہ تو بس صورتہ بشر ہیں حقیقتہً بشر تھوڑی ہیں مگر قرآن ان تمام دشواریوں کو جو انہیں ایمان کی راہ میں اس تصور کی بناء پر ہیں کہ انگیز کرتا ہے اور ان کو قائل معقول کرنے کے لئے دوسرے طریقے اختیار کرتا ہے مگر یہ کسی طرح نہیں کہتا کہ یہ بشر نہیں ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ جس طرح مشرکین کا وہ تصور غلط تھا کہ رسول کو بشر نہیں ہونا چاہیے اسی طرح ان مسلمانوں کو یہ تصور بھی غلط ہے کہ یہ حضرات بشر نہیں تھے اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے اس تصور میں ذہنیت وہی کار فرما ہے جو مشرکین کے اس تصور میں تھی کہ رسالت یا امامت بشریت کے ساتھ یکجا نہیں ہو سکتی۔ فرق اتنا ہے کہ انہوں نے بشریت کو تسلیم کیا اور رسالت کا انکار کیا اور یہ

[۱] المعنی انکم تفرحون علی الایات ولیس امرہا الی وانا امرہا الی الذی ارسلنی (تبیان)

لوگ رسالت یا امامت کو تسلیم کر کے بشریت کا انکار کر رہے ہیں، مگر قرآن نے اصل اس ذہنیت کے خلاف جو دونوں میں مشترک ہے حقیقت پروری کی بنا پر مسلسل جہاد اپنا ایک اہم فریضہ قرار دیا ہے لہذا ہر ایمان بالقرآن رکھنے والے کو اس کی مخالفت ہی کو اپنا نسب العین بنانا درست ہے موافقت اس کی کسی طرح بھی درست نہ ہوگی۔

ہاں ایک سوال یہاں پر جناب شیخ الطائف نے اٹھایا اور وہ یہ ہے کہ اگر عامہ خلائق کی طرف ملک بھیجنا حکمت الہی کے تقاضے کے خلاف ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ رسول کو ان کا ہم جنس ہونا چاہیے جس کی طرف وہ بھیجا جا رہا ہے تو پیغمبروں کی طرف اللہ فرشتوں کو رسول بنا کر کیوں بھیجتا ہے جیسا کہ تاریخ انبیاء سے بدیہی طور پر ثابت ہے اور قرآن مجید میں ہے:

اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ (حج - ۷۵)

اللہ فرشتوں میں سے بھی رسولوں کو منتخب کرتا ہے، اور آدمیوں میں سے بھی۔

اس کا جواب جناب شیخ الطائف نے یہ دیا ہے کہ پیغمبر چونکہ عامہ خلائق سے اپنی صفات کے لحاظ سے ایک خاص امتیاز رکھتا ہے اور معجزات کا حامل ہونے سے ایک خاص شخصیت رکھتا ہے اس لئے اس کو ایک طرح کی ہم جنسی ملائکہ سے بھی حاصل ہوتی ہے جو طبیعت نوعیہ کے لحاظ سے تو نہیں ہے مگر صفات شخصیہ کے لحاظ سے ہے۔^[۱]

اس سوال و جواب کو بعینہ طور پر ملخص کے جناب طبری علیہ الرحمہ نے مجمع البیان میں درج فرمایا ہے جس میں الفاظ بھی جناب شیخ طوسی کے لئے ہیں اور اس پر کسی قسم کا اضافہ نہیں کیا گیا ہے مگر ہم سمجھتے ہیں ملک کی نوعیت رسالت اس رسالت سے مختلف ہے جو پیغمبروں کو حاصل ہوتی ہے ملک کی رسالت نوعیت قاصد ہی کی طرح کی ہے اور پیغمبروں کی حیثیت مرشد اور رہنمائی کی ہوتی ہے اس لئے ہم ملائکہ کو مرسلین سے افضل نہیں جانتے مگر مرسلین کا افرادامت سے افضل ہونا لازم سمجھتے ہیں یہ مرشد اور رہنما ہونے کا مقصد و وجوب اطاعت و اتباع سے پورا ہوتا ہے اور وہ بغیر ہم جنسی کے غیر معقول ہے۔

ایک بڑا اہم سوال یہاں میرے برادر بجان برادر رئیس العلماء سید کاظم صاحب نقوی نے آپس کی گفتگو میں اٹھایا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر یہ اصول ہے کہ رسول کو مرسل الیہم کا ہم جنس ہونا چاہیے تو ہمارے رسول کی رسالت انسانوں کے علاوہ جنات کے لئے بھی کس طرح ہے؟ اس سوال کے بعد مجھے پورے مسئلہ پر از سر نو غائر نظر ڈالنا پڑی کیوں کہ نہ وہ اصول ہمارا طبع زاد ہے کہ اس سے دست برداری ممکن ہو بلکہ وہ صاف قرآن مجید سے مستفاد ہے اور نہ یہ حقیقت کہ رسول کے عموم بعثت میں جنات بھی داخل ہیں۔ قابل انکار ہے کیونکہ اس کا پتہ قرآن مجید کی متعدد آیات سے چلتا ہے۔

اب اس نظر کا جو نتیجہ ہے اس کی تفصیل کے لئے تو کتاب درکار ہے، مجمل یہ ہے کہ فرائض رسالت کے دو جز ہیں ایک قولی ہدایت اور دوسرے عملی مثالیں قائم کرنا۔

یہ دوسرا پہلو وہ ہے جس کے ہم جنسی ہی نہیں بلکہ ہم صنفی بھی درکار ہے اور اسی لئے طبقہ خواتین میں وقتاً فوقتاً ایسی معصوم ہستیوں کی ضرورت عقلاً ثابت ہوتی ہے جو اس طبقہ کے لئے نمونہ عمل بن سکیں اور عموم رسالت جو ہے وہ پہلے پہلو کے لحاظ سے ہے یعنی وہ دین جسے رسول نے پیش کیا وہ

[۱] لا تہ صاحب معجز تو قد اختیر للہدایة فصارت حالہ بذلک مقاربتہ لحال الملک (تبیان)

بلا تفرقی صنف تمام نوع انسانی ہی نہیں بلکہ بلا امتیاز جنس و انس سب کے لئے ہے لیکن نمونہ عمل آپ انہی کے لئے ہو سکتے ہیں جو جنس میں ہی نہیں بلکہ صنف میں بھی آپ کے ساتھ متحد ہوں۔

قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۗ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا ﴿٩٦﴾
 ”کہہ دیجئے کہ اللہ کافی ہے گواہ ہونے کے لئے میرے اور تمہارے بیچ میں۔ وہ اپنے بندوں سے واقف ہے خوب دیکھنے والا۔“

**وَمَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُضِلِّ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِهِ ۗ
 وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ عُمِيَآ وَبُكْمًا ۗ وَصُمًّا ۗ مَا أُولَٰئِكَ
 جَهَنَّمَ ۗ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنَاهُمْ سَعِيرًا ﴿٩٧﴾**

”اور جس کی اللہ ہدایت کرتے تو وہ ہے ہدایت پانے والا اور جسے وہ گمراہی میں چھوڑ دے تو ہرگز ہرگز اسے چھوڑ کر تم اس شخص کے حوالی موالی کوئی نہیں پاؤ گے اور ہم انہیں اٹھائیں گے قیامت کے دن اس طرح کہ منہ اٹھائے ہوئے جاتے ہوں گے اندھے، گونگے اور بہرے، ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے، جب وہ بجھنے لگتا ہے تو ہم ان کے لئے اس کی تپش میں اضافہ کر دیتے ہیں۔“

علی و جوہم کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے کہ ”منہ اٹھائے ہوئے جاتے ہوں گے“ بعض مفسرین و مترجمین کے قول کے مطابق ^[۱] مگر ایک دوسری تفسیر کے مطابق ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ وہ منہ کے بھل کھینچے جارہے ہوں گے اس کی تائید میں ایک حدیث بھی منقول ہے جو ہمارے طرق سے نہیں ہے اور اس کا ظاہر کھینچا جانا نہیں ہے بلکہ یہ کہ قدرت کی طرف سے کچھ ایسا ہوگا کہ وہ خود منہ کے بھل چل رہے ہوں گے۔ ^[۲]

ذٰلِكَ جَزَاؤُهُمْ بِاٰثِمِهِمْ كَفَرُوْا بِآيٰتِنَا وَقَالُوْا اِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿٩٨﴾ اَوْلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَا رَيْبَ فِيْهِ ۗ فَاَبٰى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿٩٩﴾

”یہ ان کی سزا ہے اس وجہ سے کہ انہوں نے ہماری آیات کے ساتھ کفر اختیار کیا اور کہا کہ کیا جب ہم کچھ ہڈیوں اور

[۱]. ماشہین علی و جوہم (جلالین) روان شدہ بروی خویش (شاکہ ولی اللہ)

[۲]. روی انس بن مالک ان بر جلا قال یا نبی اللہ کیف یحشر الکافر علی وجہہ یوم القیامۃ؛ قال: ان الذی امشراہ علی رجليه فی

الدنیا قادر علی ان یمشیه علی وجہہ یوم القیامۃ اور دہ البخاری و مسلم و الصحیح (مجمع البیان)

بکھرے ہوئے اجزاء کی شکل میں ہوں گے تو کیا ہم از سر نو پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے؟ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ قادر ہے اس پر کہ ان کو ایسا پھر پیدا کر دے اور اسی نے ان کے لئے ایک مدت مقرر کی ہے جس میں کچھ شک نہیں تو ظالم لوگ نہیں مانتے سوا انکار کے۔“

قُلْ لَوْ أَنْتُمْ تَمْلِكُونَ خَزَائِنَ رَحْمَةِ رَبِّي إِذًا لَأَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْإِنْفَاقِ ۗ وَكَانَ الْإِنْسَانُ قَتُورًا ۝۱۰

”کہیے کہ اگر تم لوگ میرے پروردگار کی رحمت کے خزانوں کو اپنے قبضہ میں رکھتے ہوتے تو خرچ ہونے کے ڈر سے روک لیتے اور انسان بڑا کنجوس ہے۔“

اس مقدس آیت کے مضمون کی تصدیق آج سے بڑھ کے شاید کبھی ہوئی ہو۔ جب ضروریات حیات قدرت کی طرف سے اکثر فراواں ہوتی ہیں مگر بیوپاری اور سرمایہ دار انہیں اپنے پاس بند کر دیتے ہیں اس طرح لوگوں کو نہیں مل سکتیں اور داندانہ کوترتے ہیں۔

ہم نے آیت کا جو مفہوم لکھا ہے وہ حدیث معصومہ کے مطابق ہے۔^[۱]

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ فَسَأَلَ بَنِي إِسْرَائِيلَ إِذْ جَاءَهُمْ فَقَالَ لَهُ فِرْعَوْنُ إِنِّي لَأَظُنُّكَ يُمُوسَى الْمَسْحُورًا ۝۱۱ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا أَنْزَلَ هَؤُلَاءِ إِلَّا رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ بِصَافِرٍ ۖ وَإِنِّي لَأَظُنُّكَ يَفْرَعُونَ مُثْبُورًا ۝۱۲ فَأَرَادَ أَنْ يَنْتَفِرَ بِهِمْ مِنَ الْأَرْضِ فَأَغْرَقْنَاهُ وَمَنْ مَعَهُ جَمِيعًا ۝۱۳ وَقُلْنَا مِنْ بَعْدِهِ لِبَنِي إِسْرَائِيلَ اسْكُنُوا الْأَرْضَ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيفًا ۝۱۴

”اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو (۹) کھلی ہوئی نشانیاں عطا کیں تو بنی اسرائیل سے پوچھو جب وہ ان کے پاس آئے تو فرعون نے ان سے کہا کہ میں تو اے موسیٰ! ایسا سمجھتا ہوں کہ تم کسی آسیب میں مبتلا ہو گئے ہو، انہوں نے کہا، تجھے معلوم ہے کہ یہ سب نہیں اتارا ہے، مگر آسمانوں اور زمین کے پروردگار نے روشن نشانیوں کی صورت میں اور میں تجھے اے فرعون، سمجھتا ہوں کہ تو ہلاک ہونے والا ہے تو اس نے چاہا کہ ان لوگوں کو اس سرزمین سے ہٹائے تو ہم نے اسے اور ان سب کو جو اس کے ساتھ تھے ڈبو دیا اور کہا ہم نے اس کے بعد بنی اسرائیل سے کہ قیام کرو اس سرزمین پر تو جب آخرت کا وعدہ آئے گا تو ہم تم سب کو اکٹھا کریں گے۔“

جناب موسیٰ کے معجزات

[۱]. قال: لو كانت الاموال بيد الناس لما اعطوا الناس شيئا يخافته النقاد (علي بن ابراهيم)

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”شاید نو نشانیاں نو معجزے ہوں، وہ جو فرعون کے مقابلے میں اللہ نے بھیجے اور شاید نو ۹ حکم ہوں کہ توریت کے سرے پر لکھے جاتے تھے وہ بھی کبیرہ گناہوں سے منع تھا۔ (موضح القرآن)
نو ۹ معجزات کی فہرست جلالین نے حسب ذیل لکھی ہے:

۱۔ الید ۲۔ والعصا ۳۔ والطوفان ۴۔ والجراد ۵۔ والقمل ۶۔ والضفادع ۷۔ والدم ۸۔ والطمس ۹۔ والسنین والنقص الثمرات
ہمارے قدیم مفسر علی بن ابراہیم نے لکھا ہے:

۱۔ الطوفان ۲۔ والجراد ۳۔ والقمل ۴۔ والضفادع ۵۔ والدم ۶۔ والحجر ۷۔ والعصا ۸۔ ویدد ۹۔ والبحر
ان میں سات چیزیں تو مشترک ہیں اور دو چیزیں پہلی فہرست میں خاص ہیں طمس جس کا مفہوم واضح نہیں ہے اور قحط سالی جسے دو الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔ السنین و نقص من الثمرات اور دو چیزیں دوسری فہرست میں خاص ہیں حجر اور بحر۔ یہ دونوں معجزے نصوص قرآنی میں متعدد جگہ درج ہیں:

جناب شیخ طوسی کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان نو معجزوں کی فہرست میں اختلاف صدر اول ہی کے مفسرین میں پیدا ہو گیا تھا ^[۱] چنانچہ انہوں نے اس سلسلہ میں کئی قول نقل کئے ہیں لیکن کسی معصوم کی طرف ایک بھی ان میں سے منسوب نہیں ہے۔

علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان اقوال کو نقل کیا ہے، اور پھر اس قول کی تائید میں کہ اس سے نو ۹ حکم مراد ہیں، ایک روایت درج کی ہے جو غالباً طرق اہل سنت سے وارد ہوئی ہے کہ ایک یہودی نے اپنے ساتھ والے سے کہا کہ آؤ چلیں اس پیغمبر کے پاس اس سے ان نو ۹ چیزوں کے بارے میں دریافت کریں دیکھیں کیا جواب ملتا ہے چنانچہ وہ دونوں آئے اور حضرت سے سوال کیا۔ حضرت نے فرمایا، وہ یہ باتیں ہیں:

۱۔ اللہ کے ساتھ شریک نہ کرو۔ ۲۔ چوری نہ کرو۔ ۳۔ زنا نہ کرو (ناحق خون نہ کرو)۔ ۴۔ کسی بے گناہ کو حکومت وقت سے شکایت کر کے قتل نہ کرو۔ ۵۔ سود نہ کھاؤ۔ ۶۔ کسی عورت پر بلاوجہ بدکاری کی تہمت عائد نہ کرو۔ ۷۔ میدان جنگ سے فرار نہ کرو۔ ۸۔ ان کے علاقہ خاص تم یہودیوں کے لئے یہ ہے کہ سبت کے بارے میں قانون الہی کی مخالفت نہ کرو۔ یہ سن کر سوال کرنے والے نے حضرت کے ہاتھوں کا بوسہ لیا اور کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ سچے نبی ہیں (مجمع البیان)

فرعون کا کہنا کہ ”میں تمہیں ایسا سمجھتا ہوں کہ تم کسی آسیب میں مبتلا ہو گئے“، ہو اس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی آسیب کی وجہ سے تمہارا دل الٹ گیا اور دماغ پلٹ گیا ہے ^[۲] جیسا کہ دوسری جگہوں میں کافروں کا رسول کو مجنوں یعنی دیوانہ کہنا مذکور ہے یہاں اس دیوانگی کے سبب کا اظہار ہے کہ وہ کسی جادو یا آسیب کا نتیجہ ہے۔

وَبِالْحَقِّ أَنْزَلْنَاهُ وَبِالْحَقِّ نَزَّلَهُ ۗ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۗ وَقُرْآنًا

[۱]. اختلافوا فی ہذا التسع (تبیان)

[۲]. مغلوبا علی عقلک (جلالین)

فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَى مُكْتٍ وَنَزَّلْنَاهُ تَنْزِيلًا ﴿١٧﴾

”اور حق کے ساتھ ہم نے اسے اتارا ہے اور حق ہی کے ساتھ وہ اتر ہے اور نہیں بھیجا ہے کہ ہم نے آپ کو مگر خوش خبری دینے والا اور عذاب سے متنبہ کرنے والا بنا کر بھیجا اور اس قرآن کو ہم نے الگ الگ حصوں میں اتارا ہے تاکہ آپ اسے لوگوں کے سامنے وقفہ وقفہ سے پڑھیں اور ہم نے اسے تدریجی طور پر نازل کیا ہے۔“

فرقنا کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے ہم نے الگ الگ حصوں میں اتارا ہے یہ ایک تفسیر کے مطابق ہے [۱] لیکن اس لفظ کی اس کے علاوہ اور تفسیر بھی آئی ہیں [۲] جن کی بنا پر ترجمہ مختلف ہوگا۔ اور ایک تفسیر کے لحاظ سے اس کا ترجمہ بالکل وہ ہوگا جو ہم نے آخری جملہ کا کیا کہ ہم نے اس کو تدریجی طور پر اتارا ہے۔ [۳]

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖ اَوْ لَا تُوْمِنُوْا ۗ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖ اِذَا يُتْلٰى عَلَیْهِمْ

یَخْرُوْنَ لِلاذْقَانِ سَجْدًا ﴿١٨﴾ وَیَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَا اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿١٩﴾

وَیَخْرُوْنَ لِلاذْقَانِ یَبْكُوْنَ وَیَزِیْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴿٢٠﴾

”کیسے تم اس پر ایمان لاؤ یا ایمان نہ لاؤ، یقیناً جنہیں اس کا علم پہلے عطا ہو چکا ہے، ان کے سامنے جب یہ پڑھا جاتا ہے تو وہ منہ کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاک ہے ہمارا پروردگار، بے شک ہمارے پروردگار کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے اور منہ کے بل گرتے ہیں روتے ہوئے اور وہ ان کے قلبی تاثرات میں اضافہ کرتا ہے۔“

گر یہ کی تعریف

یخرون للاذقان جو دو جگہ ہے اس کے لفظی معنی تو ہوئے ٹھوڑیوں کے بل گرتے ہیں مگر یہ مجاورہ سے متعلق چیز ہے اس مفہوم کو ہماری اردو میں منہ کے بھل گرنے سے ادا کیا جاتا ہے اس لئے ہم نے یہ ترجمہ کیا۔ شاہ ولی اللہ نے فارسی میں اس کے مطابق ترجمہ کیا ہے می افتند بر روی خود۔

ہماری قدیم تفسیر بھی جو کلام معصومین علیہم السلام سے ماخوذ ہے اسی کے موافق ہے اس کے الفاظ یہ ہیں

یخرون علی الاذقان سجدا قال علی الوجه (علی بن ابراہیم)

[۱]. نزلنا و شینا بعد شئی آیتہ بعد آیتہ و قصۃ بعد قصۃ (تبیان) جہاد کیا ہم نے اس کو (شاہ فہج الدین)

[۲]. قیل معناه فرقنا به الحق عن الباطل عن الحسن وقیل معناه بعضه خبر او بعضه امر او بعضه نہیا و بعضه وعدا و بعضه وعیدا

(مجمع البیان)

[۳]. نزلناہ متفرقا فی عشرین سنۃ او ثلاث (جلالین)

وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر جاتے ہیں (کیا مطلب؟) انہوں نے فرمایا منہ کے بل۔

جناب ابن عباسؓ سے بھی یہی معنی نقل ہوئے ہیں۔^[۱]

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”نماز میں سجدہ دوبار ہوتا ہے اس واسطے دوبار فرمایا پہلی بار اس کلام کی تاثیر سے تعجب آتا ہے اور دوسری بار عاجزی (موضح القرآن) یہ کوئی الفاظ قرآنی کی تشریح نہیں ہے بلکہ ایک نکتہ ہے جو اپنے ذہن سے پیدا کیا گیا ہے حالانکہ جو سجدے ہماری نماز میں ہیں وہ تو حکم الہی سے ترکیب نماز کا جزء ہیں، نہ وہ تعجب سے ہوتے ہیں نہ عاجزی سے، پھر الفاظ قرآنی سے جو سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں سجدوں کی تعداد بیان ہی نہیں ہو رہی ہے کہ وہ آیات الہی کو سن کر دودفعہ سجدہ کرتے ہیں بلکہ آیات الہی سے ان کا تاثر کا اظہار ہے کہ کبھی انہیں سن کر، وہ سجدے میں گرتے ہیں اور یہ الفاظ بان پر جاری کرتے ہیں اور ان میں بھی الفاظ کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ کسی بھی الفاظ میں اس مضمون کا اظہار کہ بے شک جو اللہ نے وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا اور کبھی وہ سجدہ میں گرتے ہیں اس طرح کہ گریہ کا ان پر غلبہ ہوتا ہے۔

یہاں پر ایک بات یہ یاد رکھنے کی ہے کہ آخرت کی ہنسی سے یہ مطلب نہیں جو نعمات الہیہ کو دیکھ کر یا کفار و منافقین کے انجام پر ہوگی، قرآن میں کسی وقت بھی اس دارد دنیا میں ہنسی کی تعریف نہیں ہوئی ہے لیکن گریہ کا مورد مدح الہی ہونا ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ منہ کے بل سجدے میں گر کر کہتے ہیں کہ سبحان اللہ ہمارے پروردگار کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے یعنی کتب سماویہ میں جیسے نبی کے بھیجے کا اس نے اعلان کیا تھا، یہ ویسا ہی نبی ہے۔^[۲]

یہ سب تعریفیں و توصیف بظاہر تو اہل کتاب کے ایک طبقہ کی ہے مگر یہ طبقہ جس کے یہ اعترافات و تاثرات ہوں، ناممکن ہے کہ مسلمان ہو گیا ہو، اس لئے حقیقتاً یہ ان نومسلموں کی تعریف ہے جو سچے دل سے ایمان لے آئے۔^[۳]

قُلِ ادْعُوا اللَّهَ أَوْ ادْعُوا الرَّحْمَنَ ۗ أَيًّا مَا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ ۗ وَلَا

تَجْهَرُوا بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا ۝۱۱

”کہیے کہ اللہ کہہ کے پکارو یا رحمن کہہ کے پکارو، جسے بھی پکارو تو اسی کے ہیں سب اچھے اچھے نام اور نہ اپنی نماز زور زور سے ہی پڑھو اور نہ اسے چپکے چپکے ہی پڑھو، اور اختیار کرو اس کے درمیان ایک راستا۔“

جہر و اخفاء کے درمیان نماز ادا کرنے کا حکم

عرب عموماً لفظ اللہ سے واقف تھے مگر الرحمن کے لفظ سے واقف نہ تھے اس لئے اس پر وحشت محسوس کرتے تھے چنانچہ دوسری جگہ ہے:

[۱]. ای یسقطون علی الوجوہ مساجدین عن ابن عباس وقتادة (مجمع البیان)

[۲]. وعد ربنا بنزوله وبعث النبي ﷺ (جلالین)

[۳]. هم قوم من اهل الكتاب آمنوا (علی بن ابراہیم)

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اسْجُدُوا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوا وَمَا الرَّحْمٰنُ أَنَسْجُدُ لِمَا تَأْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُورًا ﴿١٠﴾
 ”جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمن کو سجدہ کرو تو وہ کہتے ہیں یہ رحمان کیا چیز ہے؟ کیا جو آپ ہم سے کہیں ہم اس کو سجدہ کر لیں اور وہ اس سے زیادہ بھڑکتے ہیں“۔

اس وحشت کو دور کرنے کے لئے قرآن میں بسم اللہ کی آیت میں اللہ اور رحمن و رحیم سب الفاظ جمع کر دیئے گئے اور اسی کو یہاں سمجھا جا رہا ہے کہ اللہ اور رحمن کوئی الگ الگ شخصیتوں کے نام نہیں ہیں یہ دونوں ایک ہی ذات کے نام ہیں اور یہ کیا بلکہ اور نام جو صفات کمال کا پتہ دیتے ہیں جیسے علیم، قدیر، سمیع، بصیر وہ سب بھی کہے جائیں تو اس سے مقصود ایک ہی ذات ہوگی اور وہ خدائے واحد ہے۔
 آخر میں جو کہا جا رہا ہے کہ نہ زور زور ہی سے نماز پڑھو اور نہ چپکے ہی، اسے ہر نماز سے متعلق لیا جائے تو یہ مطلب ہوگا کہ نہ بہت بلند آواز سے چیخ کر ہی نماز پڑھو اور نہ بالکل آہستہ درمیان کی کیفیت ہونا چاہیے [۱] مگر ہمارے خیال میں اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ یہی ہے کہ ہمیشہ نماز کو زور ہی سے پڑھنے کا حکم ہوا اور نہ یہ کہ آہستہ ہی پڑھنے کا حکم ہو بلکہ اس کے درمیان راستا اختیار کرو کہ بعض نمازیں جہر سے پڑھو اور بعض اخفات سے جس کی تفصیل از روئے سنت ثابت ہوگئی ہے کہ صبح اور مغربین میں قرأت جہر سے ہونا چاہیے اور ظہر و عصر میں قرأت اخفات کے ساتھ ہونا چاہیے [۲] یہ تفریق ہی دونوں کے درمیان کاراستا ہے جس کے اختیار کرنے کا حکم ہے۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَکُنْ لَّهٗ شَرِیْکٌ فِی الْمَمْلٰکِ وَّلَمْ یَکُنْ

لَّهٗ وَّلِیٌّ مِّنَ الدَّٰلِ وَ کَبِّرْهُ تَکْبِیْرًا ﴿۱۱﴾

”اور کہیے کہ سب تعریف اللہ کیلئے جس نے نہ اپنی اولاد قرار دی ہے اور نہ اس کا سلطنت میں کوئی شریک ہے اور نہ اس کا عا جزئی کی بنا پر کوئی یار و مددگار ہے، اور اس کی بڑائی کا اعتراف کیجئے جیسا بڑائی کا اعتراف کرنا چاہیے“۔
 حمد اس تعریف کو کہتے ہیں جو اختیاری کارناموں پر ہو، اس لئے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اس آیت حمد کے ساتھ جن اوصاف کا تذکرہ ہے وہ ذات الہی کے کمال و جلال کے تعارف کیلئے ہیں نہ یہ کہ حمد اس کی ان باتوں پر ہے بلکہ حمد اس کے اعطاف و الطاف اور نظام عالم میں اس کے افعال حکیمانہ پر ہے جو سرا سر خیر ہیں اور ان میں شرکاء گز نہیں ہے۔ [۳]

[۱]۔ نماز میں بہت چلا نا بھی نہیں اور بہت دبی آواز بھی نہیں بیچ کی چال پسند ہے (موضح القرآن)

[۲]۔ قال الطبری: یمتثل ان یکون للراد لا تمجہر بصلاتک بصلوة التہار و لا تخافت بہا یعنی صلوة اللیل الّتی یمجہر فیہا بالقرآۃ قال و لهذا یمتثل غیر اّنه لہ یقل بہ احد من اهل التاویل (تبیان) بان تمجہر بصلوة اللیل و تخافت بصلوة التہار عن ابی مسلم (مجمع البیان)

[۳]۔ ان الحمد فی الایۃ لیس ہو علی ان لہ یفعل ذلک و اّما ہو علی افعالہ المحمودۃ و وجّہ الی من ہذہ صفتہ لا من اجل ان ذلک صفتہ (تبیان) کہا یقال ان اشکر فلانا الجمیل و لا یشکرہ علی جمالہ بل علی افعالہ (مجمع البیان)

سُورَةُ الْكَهْفِ

مکیہ۔۔۔۔۔ ۱۱۰ آیات

چونکہ کہ اس سورہ میں الکہف یعنی پہاڑ کے ایک خاص غار اور اصحاب کہف یعنی اس غار میں پناہ لینے والے کچھ دیندار افراد کا تذکرہ ہے۔ اور وہ کسی دوسری جگہ قرآن مجید میں مذکور نہیں ہے اس لئے اس سورہ کا نام یہ ہوا۔
اس کے علاوہ اس سورہ میں جو مضامین ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:-

سورہ کہف کے خاص خاص مضامین:

- ۱۔۔۔۔۔ آئندہ کے کسی کام کا وعدہ کرتے وقت انشاء اللہ کہنے کا حکم
- ۲۔۔۔۔۔ دو آدمیوں کی گفتگو جن میں ایک مالدار تھا خدا فراموش اور دوسرا غریب مگر اللہ پر توکل رکھنے والا جس کے ذیل میں یہ سبق ہے کہ خدا کو بھول کر اسباب ظاہری پر تکیہ کرنا غلط ہے۔
- ۳۔۔۔۔۔ مال اور اولاد سے زندگی دنیا کی رونق ہے لیکن مال کا دار و مدار حسن عمل پر ہے۔
- ۴۔۔۔۔۔ شیطان کا جنات میں سے ہونا اور اس کے لئے نسل کا وجود۔
- ۵۔۔۔۔۔ حضرت موسیٰ اور جناب خضرؑ کی ملاقات اور اس سے متعلق واقعات۔
- ۶۔۔۔۔۔ ذوالقرنین
- ۷۔۔۔۔۔ یاجوج و ماجوج
- ۸۔۔۔۔۔ کلمات الہی کی وسعت بلا نہایت
- ۹۔۔۔۔۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام بشریت۔ وغیرہ وغیرہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا ہے۔

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۙ قَیْمًا لِّیُنذِرَ
بِاَسْسَ شَدِیْدًا ۙ مَنْ لَّدُنْهُ وِیْبِشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ
اَجْرًا حَسَنًا ۙ مَا كُنْیْنَ فِیْهِ اَبَدًا ۙ ۝۱۰۰ وَیُنذِرَ الَّذِیْنَ قَالُوْا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ ۝۱۰۱ مَا

لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ وَلَا لِإِبَائِهِمْ ۖ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ ۗ إِنَّ
يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا ۝

”سب تعریف اللہ کے لئے جس نے اتارا اپنے بندہ پر اس کتاب کو اور نہیں رکھی اس میں کجی، بالکل ٹھیک تاکہ وہ متنبہ کریں اس کی طرف سخت عذاب سے [۱] اور خوش خبری دیں ان ایمان والوں کو جو نیک اعمال کرتے ہیں ان کے لئے اچھا صلہ ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور عذاب سے متنبہ کریں انہیں جن کا قول یہ ہے کہ اللہ نے اپنے لئے اولاد قرار دی ہے انہیں اس کے متعلق کوئی علم نہیں ہے اور نہ ان کے باپ داداؤں کو، بہت بڑا ہے یہ جملہ جو ان کے منہ سے نکلتا ہے نہیں کہتے وہ بجز جھوٹ کے“۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسِكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ ۖ إِنَّ لَّهُمْ يَوْمَئِذٍ أَسْفًا ۝

”تو شاید آپ جان دے دیجئے گا [۲] رنج و نفوس سے ان کے پیچھے اگر وہ اس کلام پر ایمان نہ لائیں“۔

یہ اپنے پیغمبر سے جو اس کے ساتھ حبیب ہونے کا بھی رشتہ رکھتا ہے ایسا بظاہر غصہ میں بھرا ہوا مخاطب ہے جس میں محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے مطلب یہ ہے کہ آپ کا کام تبلیغ کرنا ہے وہ آپ کر رہے ہیں اب وہ نہیں مانتے اور راہ راست پر نہیں آتے تو آپ ان کے غم میں گھل گھل کر اپنی جان کیوں دیتے ہیں۔ [۳]

اس غم اور فکر کو جو خلق خدا کی ہمدردی کی بناء پر تھا۔ دوسری جگہ قرآن میں رسول کے اوصاف میں بطور مدح پیش کیا ہے ان الفاظ میں کہ:

عزیز عليه ما عنتم حريص عليكم (توبہ: ۱۲۸)

”ان پر شاق ہے تمہارا ابتلائے زحمت ہونا اور انہیں انتہائی طلب تمہاری ہے (کہ کسی طرح تم راہ راست پر آ جاؤ)

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۝ وَإِنَّا

لَجَاعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيدًا جُرُزًا ۝

”بے شک یہ سب جو زمین پر ہے، اسے ہم نے اس کی سجاوٹ کا ذریعہ بنایا ہے تاکہ انہیں آزمائیں کہ ان میں اعمال کے لحاظ سے بہتر کون ہے؟ اور بلاشبہ ہم بنانے والے ہیں اسے جو اس پر ہے ایک وقت میں چٹیل میدان۔

[۴]

[۱]. تقدیر: لیندکم باسا کہا قال یخوف اولیاء (تبیان) معناه: لیخوف العبد الذی انزل علیہ الكتاب الناس عذاباً شدیداً. (مجمع البیان)

[۲]. فی روایة ابی الجاود عن ابی جعفر... یقول قاتل نفسک علی آثارهم (علی بن ابراہیم)

[۳]. لهذا معاتبته من اللہ سبحانہ لرسولہ علی شدتہ وجہ کثرة عرصہ علی ایمان قومہ (مجمع البیان)

[۴]. الجرز الذی لانیات علیہ ولا زرع ولا غرس (تبیان)

یعنی زمین کا تمام ساز و سامان انسان کی عملی آزمائش کے لئے ہے کہ وہ ان نعمتوں کا کس حد تک شکر ادا کرتا ہے یا جیسا شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں کہ:

اس کی طرف دوڑتا ہے یا اس کو چھوڑ کر آخرت کو پکڑتا ہے (موضح القرآن)
بہر صورت یہ آزمائش اس وقت درست ہے جب انسان کے افعال و اعمال کو خود انسان کے ارادہ و اختیار کا نتیجہ سمجھا جائے نہ کہ خالق کے جبر یا اس کی تخلیق کا نتیجہ۔^[۱]

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيمِ كَانُوا مِن آيَاتِنَا عَجَبًا ۙ

”کیا تم سمجھتے ہو کہ اصحاب کہف و رقیم ہماری نشانیوں میں سے کوئی بڑی انوکھی چیز تھے؟“

واقعة اصحاب کہف کا آغاز

یعنی قدرت کی کارگزاریاں تو اس سے بہت بڑی انوکھی مثالوں سے بھری ہوئی ہیں، ان کے لحاظ سے اصحاب کہف کا واقعہ کوئی خاص قدرت نہیں رکھتا ہے اس کے بعد اس واقعہ کو بیان کیا گیا ہے۔

کہف کے معنی ہیں پہاڑ کا غار اور رقیم کے معنی ہیں لوح یعنی تختی۔ ان لوگوں نے جیسا کہ بعد میں بیان ہوگا، ایک غار میں جا کر پناہ لی تھی جہاں خالق نے ان پر ایک طویل نیند طاری کر دی جس کا سلسلہ کئی سو برس تک جاری رہا اور تختی کے لئے ایسا سمجھا تا ہے کہ اس پر ان لوگوں کے نام لکھ کر بعد میں اسے غار کے دہانے پر آویزاں کر دیا گیا دیوار پر نام لکھ دیئے گئے، اس لئے ان کا پتہ دینے میں قرآن مجید نے کہف کے ساتھ رقیم کو یاد دلا یا ہے^[۲] اور کئی قول اس کے ہیں کہ رقیم اس جگہ کا نام ہے جہاں وہ غار واقع تھا۔^[۳]

إِذْ أَوْى الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوا رَبَّنَا آتِنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ

أَمْرِنَا رَشَدًا ۙ فَضَرَبْنَا عَلَىٰ آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا ۙ ثُمَّ بَعَثْنَاهُمْ

لِنَعْلَمَ أَى الْحِزْبَيْنِ أَحْصَىٰ لِمَا لَبِثُوا أَمَدًا ۙ

”جب کہ ان جوانوں نے غار کی طرف پناہ لے کر کہا اے ہمارے پروردگار! ہمیں عطا کر اپنی طرف سے خاص لطف و کرم اور سامان کر ہمارے لئے ہمارے معاملہ میں صحیح راستے پر قائم رہنے کا، تو ہم نے ان کے کانوں پر پردے ڈال دیئے اس غار میں گنتی کے کچھ برسوں کے لئے، پھر ہم نے انہیں اٹھایا، تاکہ ہم جانیں کہ دو گروہوں

[۱]. فی قوله: ”ایہم احسن عملاً“ دلالت علی اند سبحانہ اراد من الخلق العمل الصالح و علی ان افعالہم الصادرة منهم حادثہ من جہنہم (مجمع البیان)

[۲]. الرقیم اللوح المکتوب فیہ اسماءہم و انسابہم (جلالین) نوشتہ کہ بردیو ار غار بود (فتح الرحمن)

[۳]. قال قوم هو اسم قرية ذهب اليه ابن عباس وفي رواية اخرى عنه انه واد بين غضبان و ايلة وقال عطية: الرقیم واد قال و قتادة: اسم الوادي الذي فيه اصحاب الكهف (تبیان)

میں کون زیادہ صحیح طور پر جانتا ہے کہ وہ کتنی مدت تک یوں رہے؟

اصحاب کہف کا غار میں داخل ہونا اور اس کا پس منظر

ان کے کانوں پر پردے ڈال دیئے۔ یعنی نیند غالب کر دی چونکہ خواب سے بیدار ہونے کی سب سے بڑی علامت کان میں آواز پہنچنا ہے اس لئے نیند کے استعارہ قرآن مجید میں کانوں پر پردہ ڈالنے کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے ضمناً یہ پتہ بھی چل جاتا ہے کہ یہ نیند ہی تھی، موت نہیں تھی اس محل پر قرآن مجید کی یہ تعبیر وہ ہے جس میں عربی کے ماہر علماء نے خاص امتیازی طور پر فصاحت کا جو ہر محسوس کیا ہے۔

دو گروہوں میں کون زیادہ صحیح طور پر جانتا ہے اس کے تحت شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

دو فرقے یا تاریخ لکھنے والوں میں ہیں کہ کوئی کتنے برس لکھتے ہیں اور کوئی کتنے یاوے اصحاب کہف جاگ کر بعضے تجویز کرنے لگے کہ ہم ایک دن سوئے، بعض کہنے لگے اس سے کم (موضح القرآن)

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُم بِالْحَقِّ ۗ إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى ۝۱۳
وَرَبَطْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَن
نَدْعُوهُ مِنْ دُونِهِ إِلَهًا لَقَدْ قُلْنَا إِذًا شَطَطًا ۝۱۴ هُوَ آءِ قَوْمًا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ
إِلَهَةً ۗ لَوْلَا يَأْتُونَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطَنٍ بَيِّنٍ ۗ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ
كِبْرًا ۝۱۵ وَإِذْ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَمَا يُعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَأَوْأَىٰ إِلَيْهِ الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ
رَبُّكُمْ مِنْ رَحْمَتِهِ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِنْ أَمْرِكُمْ مَرْفَقًا ۝۱۶

”ہم آپ کے سامنے ان کے واقعہ کو حقیقت کے مطابق بیان کرتے ہیں، بلاشبہ وہ کچھ جوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے اور ہم نے ان کی مزید ہدایت کی اور ان کے دلوں کو مضبوط کیا جب وہ کھڑے ہو کر کہنے لگے کہ ہمارا مالک وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے ہم نہیں پکاریں گے اس کے سوا کسی خدا کو کہ ہم اس وقت بیہودہ بکو اس کرتے ہوں گے یہ ہماری قوم والے، انہوں نے اس کے سوا دوسرے خدا بنا لئے ہیں کیوں نہیں ان کی خدائی پر وہ کوئی کھلا ثبوت پیش کرتے؟ تو کون زیادہ ظالم ہوگا اس سے جو اللہ پر جھوٹ تہمت عائد کرے اور جب کہ تم نے علیحدگی اختیار کی ہے ان سے اور ان چیزوں سے جن کی وہ اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں تو پناہ لو اس غار کی طرف۔ پھیلانے گا تمہارے لئے تمہارا پروردگار اپنی رحمت سے اور سامان کرے گا تمہارے لئے تمہارے معاملہ میں نفع پہنچانے کا۔“

اصحاب کہف کے وصف کے آغاز میں جوان کہنا نوعمری کا اظہار تو کرتا ہی ہے مگر اس کے ساتھ اس میں ان کی عزت نفس، ثابت قدمی اور

جرات و ہمت مردانہ کے اوصاف بھی مضمیر ہیں جن پر مفسرین کی توجہ مبذول ہوئی ہے۔^[۱]

وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَزُورُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَإِذَا غَرَبَتْ
تَقْرُبُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْهُ ۗ ذَٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ ۗ مَنْ يَهْدِ اللَّهُ
فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُضِلِّ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا مُّرْسِدًا ۝۱۸

’اور تم دیکھو گے سورج کو کہ جب وہ طلوع ہوتا ہے تو مڑ جاتا ہے ان کے غار سے دائیں طرف اور جب وہ ڈوبتا ہے تو کتر جاتا ہے ان سے بائیں طرف اور وہ ایک کھلی جگہ پر ہیں اس غار میں سے۔ یہ اللہ نشانیوں میں سے ہے جس کی ہدایت اللہ کر دے، وہ ہدایت پائے ہوئے ہوگا اور جسے وہ گمراہی میں چھوڑ دے تو ہرگز نہیں پاؤ گے اس کے لئے کوئی یار و مددگار جو صحیح راستا بتانے والا ہو۔‘

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

بخاطر فاتر می رسد کہ دیوار جنوبی کھف آن قدر بلند است کہ سایہ اصلی او در تمام سال محل خفتن ایشان رامی پوشاند و دیوار شرقی و غربی آن متصل و دیوار جنوبی بلند تر است و پایہ بیایہ منحط شدہ و این جماعہ سر بجانب شمال و پا بجانب جنوب کردہ خفتہ اند پس و قتیکہ آفتاب طلوع کند ضوء آفتاب بر دیوار غربی و بعضی صحن غار افتدہ ہر چند ارتفاع زیادہ گیرد و بلندی دیوار شرقی از وصول ضوء بالایشان مانع آید و ضوء از جانب راست ایشان منتقل شود بجانب سر کہ جہت شمال است در وقت استواء بجز سایہ اصلی دیوار جنوبی نمی ماند و چون آفتاب مائل بغروب شود ضوء آفتاب بر دیوار شرقی افتد و آہستہ و آہستہ بر سردیوار مرتفع گرد و آن جانب چپ ایشانست (فتح الرحمن)

غار میں ان کے محل قیام کی خاص خصوصیت

ذہن قاصر میں ایسا آتا ہے کہ اس غار کی جنوب کی طرف کی دیوار اتنی اونچی ہے کہ اس کا اصل سایہ پورے سال ان کے سونے کی جگہ کو چھپائے رکھتا ہے اور مشرق اور مغرب کی طرف کی دیوار اُس کی جنوب والی دیوار سے ملی ہوئی ہے اس سے بھی زیادہ اونچی ہے اور پھر رفتہ رفتہ نیچی ہوئی ہے اور یہ لوگ اس طرح سوئے ہوئے ہیں کہ سر ان کا شمال کی طرف ہے اور پیر جنوب کی طرف ہیں تو جب سورج نکلتا ہے تو سورج کی دھوپ مغربی دیوار پر اور غار کے صحن کے کچھ حصہ پر پڑتی ہے اور جتنا جتنا آفتاب بلند ہوتا ہے مشرقی دیوار کی بلندی ان تک دھوپ کے پہنچنے سے مانع ہوتی ہے اور دھوپ ان کے دائیں جانب سے ہٹ جاتی ہے سر کی طرف جو شمال کی طرف ہے جب آفتاب وسط آسمان میں ہوتا ہے تو سوا جنوب کی دیوار کے اصلی سایہ کے کچھ چھاؤں نہیں رہ جاتی اور جب سورج غروب کی طرف جھکتا ہے تو دھوپ مشرقی دیوار پر پڑتی ہے اور آہستہ آہستہ دیوار کے اوپر

[۱]. حکم لہم سبحانہ بانقوۃ لانّ راس الفتوۃ الایمان و قیل الفتوۃ بذل التّدی و ترک الاذی و ترک الشکری عن مجاہد و قیل ہی اجتناب المحارم و استعمال المکارم. (مجمع البیان)

بلند ہوتی ہے اور وہ ان کی داہنی سمت ہوتی ہے۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

حق تعالیٰ کی قدرت سے نہ اس مکان میں ان پر دھوپ آوے، نہ مینہ نہ برف اور کھلی جگہ ہے تنگ حصہ نہیں ہے (موضح القرآن) دیکھا جائے تو باپ بیٹے کے تصور میں بہت بڑا فرق ہے والد یعنی جناب شاہ ولی اللہ قرآن مجید کے بیان کردہ واقعہ کو طبعی اسباب پر مبنی قرار دینا چاہتے ہیں اور وہ انجینئری کے اصول سے اس پہاڑی کی ساخت ایسی بتا رہے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دھوپ ان پر نہ پڑے اور ان کے صاحبزادے اسے اسباب طبعیہ سے الگ کر کے صرف قدرت الہی کا کرشمہ قرار دیتے ہیں۔

ہمارے نزدیک قرآن کا انداز و بیان دوسرے تصور سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے یعنی بظاہر تو دھوپ ان پر پڑنے سے کوئی رکاوٹ نہیں ہے مگر یہ اللہ کی قدرت ہے کہ ان پر بہت سا یرہتا ہے اور کبھی دھوپ ان پر نہیں پڑتی۔

ہمارے مفسرین میں علامہ طبرسی کا رجحان بھی پہلے ہی رخ کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ یہ دھوپ کا نہ پڑنا ان کی آرام گاہ کے محل وقوع کا خاصہ ہے وہ فرماتے ہیں:

اخبر سبحانہ عن لطفہ بہم و حفظہ ایاہم فی مضجعہم باختيارہ لہم اصلح المواضع لوقاءہم فیوا ہم مکانا من الکھف مستقبلا نبات النعش تمیل الشمس عنہم طالعة و غاربة کی لا یؤذہم حرھا او تغیر الوائہم اویبلی ثبا بہم وہم فی متسع ینا لہم فیہ روح الریح وکان باب الغار مقابلا لقطب الشمالی (مجمع البیان)

خداوند عالم نے اپنی خاص مہربانی اور ان کی حفاظت کی صورت ان کی خوابگاہ میں بنائی ہے اور ان کے لئے انتخاب سونے کے لئے بہترین جگہ کا اس طرح کہ غار میں نہیں ایسے مقام پر رکھا جو نبات النعش کے رخ پر ہے اس لئے ان سے طلوع اور غروب دونوں میں سورج مڑا رہتا ہے تاکہ انہیں اس کی گرمی اذیت نہ دے یا ایسا نہ ہو کہ ان کی رنگت میں تغیر ہو یا ان کے لباس بوسیدہ ہوں اور وہ کھلی ہوئی جگہ پر ہیں تاکہ ان تک ہوا کا آرام و سکون پہنچتا ہے اور اس غار کا دروازہ قطب شمالی کے مقابل میں تھا۔

مگر کیا کیا جائے کہ الفاظ قرآنی کو دیکھتے ہوئے میرا دل کسی طرح اس تشریح کو قبول نہیں کرتا۔ میرا ذہن یہ کہتا ہے کہ اس صورت میں اس تذکرہ کے عبد ذلک من فضل اللہ ہوتا ذلک من نعمۃ اللہ ہوتا ذلک من رحمة اللہ ہوتا وغیرہ لیکن ذلک من آیات اللہ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے کہنا بتلاتا ہے کہ یہ کسی جغرافیائی محل وقوع کا لازمی تقاضا نہیں ہے جہاں ریاضی کے اصول سے دھوپ کو پہنچنا ہی نہیں چاہیے بلکہ وہ اللہ کی خاص قدرت کا کرشمہ ہے۔

وَتَحْسَبُهُمْ آيِقَاطًا وَهُمْ رُقُودٌ ۗ وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ

وَكَلِّبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ ۗ لَوِ اطَّلَعَتْ عَلَيْهِمْ لَوَلِيَّتٌ مِنْهُمْ فِرَارًا

وَلَمَلِيَّتٌ مِنْهُمْ رُعبًا ﴿١٨﴾

’اور تم انہیں جاگتا ہوا سمجھو گے حالانکہ وہ سوتے ہوئے ہیں اور ہم انہیں دائیں اور بائیں کروٹ بدلوالیتے ہیں اور ان کا کتا غار کے دہانے پر اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے بیٹھا ہے، اگر تم جھانک کر انہیں دیکھو تو پیٹھ پھرا کر ان سے بھاگو گے اور ان کا رعب تم میں بھر جائے گا‘۔
ان آیات میں سگ اصحاب کہف کا ذکر آیا ہے۔

وَكَذَلِكَ بَعَثْنَاهُمْ لِيَتَسَاءَلُوا بَيْنَهُمْ ۖ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۖ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالُوا رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ۖ فَابْعَثُوا أَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هَذِهِ إِلَى الْمَدِينَةِ فَلْيَنْظُرْ أَيُّهَا أَزْكَى طَعَامًا فَلْيَأْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ أَحَدًا ۗ ۝۱۹ إِنَّهُمْ إِنْ يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوكُمْ أَوْ يُعِيدُوكُمْ فِي مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوا إِذًا أَبَدًا ۝۲۰

’اور یوں ہی ہم نے انہیں اٹھایا کہ وہ آپس میں سوال و جواب کریں ایک کہنے والے نے ان میں سے کہا کہ کتنا تم لوگ رہے؟ انہوں نے کہا ہم رہے ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ انہوں نے کہا کہ تمہارا پروردگار ہی خوب جانتا ہے کہ تم کتنا رہے؟ اچھا تو اپنے میں سے ایک کو بھیجوا اپنے اس چاندی کے سکے کے ساتھ اس شہر کی جانب تو وہ دیکھے کہ کون یہاں کا کھانا زیادہ اچھا ہے تو لے آئے تمہارے پاس اس میں سے کچھ غذا اور لازم ہے کہ مناسب رویہ اختیار کرے اور کسی کو تمہاری خبر نہ ہونے دے۔ یقیناً اگر وہ لوگ تم پر قابو پا گئے تو تمہیں سنسار کریں گے یا تمہیں اپنے مذہب میں واپس لے جائیں گے اور اس صورت میں تم کبھی بھی دونوں جہاں کی بہتری حاصل نہیں کر سکتے‘۔

صدیوں کی نیند کے بعد ان کی بیداری

یونہی ہم نے انہیں اٹھایا یعنی جس طرح ان کی یہ طولانی نیند صرف قدرت الہی کا کرشمہ تھی، ویسے ہی اس کے بعد ان کی بیداری بھی بس اللہ کی قدرت کا نمونہ تھی [۱]

کہ وہ آپس میں سوال و جواب کریں یعنی ان کے اٹھنے پر یہ صورت پیدا ہوئی [۲] نہ یہ کہ ان کے اٹھانے کا مقصد یہی تھا مگر دوسرا رجحان یہی ہے کہ وہ اس حیرت ناک صورتحال پر مطلع ہو کر اور زیادہ معرفت الہی کے درجہ میں ارتقاء حاصل کریں۔ [۳]

[۱] ای کہا حفظنا احوالهم تلك المدة بعثناهم من تلك الرقدة لان احد الامرين كالاخر في الله لا يقدر عليه الا الله تعالى (تبيان)

[۲] عاقبت بايكديگر سوال کنند (شاه ولی اللہ)

[۳] ای لیكون بينهم تساؤل و تنازع اختلاف في مدة لبثهم فينتبهوا اذلك على معرفة صانعهم ويزدادوا يقيناً الى يقينهم (مجمع البيان)

جہاں تک دیکھا جاتا ہے قرآن میں جہاں جہاں موت کے بعد اٹھانے کا ذکر ہے وہاں یہی ہے کہ بعد میں ان کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کتنے عرصہ تک اس عالم میں رہے۔ یہاں جو طویل خواب ہے، اس کے بعد بھی یہی کیفیت ہے شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

سینکڑوں برس رہنا ان کو ایک دن معلوم ہوا مردہ اور سوتا برابر ہے (موضح القرآن)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روح کا جسم کے ساتھ تعلق جو حیات عنصری میں ہوتا ہے شرط ادراک ہے اور اس سے بھی آخرت میں معاد جسمانی کی ضرورت ثابت ہوتی ہے ورنہ جزو سزا کا مقصد پورا نہ ہوگا۔

وَكَذَلِكَ أَخْذْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوا أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَأَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيهَا ۗ إِذْ يَتَنَازَعُونَ بَيْنَهُمْ أَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوا عَلَيْهِم بُيُوتًا ۗ رَبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ ۗ قَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰ أَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِم مَّسْجِدًا ۖ

”اور اسی طرح ہم نے مطلع کیا ان پر تا کہ انہیں معلوم ہو کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یہ کہ قیامت میں کوئی شک نہیں ہے وہ موقع جب لوگ آپس میں ان کے معاملے میں بحث کر رہے تھے تو انہوں نے کہا کہ ان پر ایک عمارت تعمیر کرو، اللہ ہی ان سے خوب واقف ہے کہا انہوں نے جو ان پر غالب آئے تھے تو ہم تو بالضرور ان پر ایک مسجد بنائیں گے۔“

لوگوں کا ان کے محل قیام پر مطلع اور باہمی اختلاف کے بعد وہاں مسجد بنانے کا فیصلہ

”تا کہ انہیں معلوم ہو“ یعنی دوسرے جواب تک حیات بعد الموت کے قائل نہیں تھے، وہ ان کی اس کیفیت کا مشاہدہ کر کے سمجھیں کہ جس طرح اتنی طویل موت کے طاری ہونے پر وہ قادر ہے، اسی طرح وہ موت کے بعد زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔^[۱]

آخر میں اس فیصلہ کے بعد کہ عمارت ان پر بنائی جائے جو لوگ غالب آئے اور انہوں نے مسجد قائم کرنا طے کیا، وہ بلاشبہ کچھ دیندار لوگ تھے^[۲] اور قرآن مجید کا انداز بیان بتاتا ہے کہ وہ ان کے اس منصوبہ کو قابل تعریف سمجھتا ہے اور اس پر معترض نہیں ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صالحین کے مستقر پر جو قبر کی نوعیت سے ہو، بطور یادگار عمارت قائم کرنا کوئی قابل اعتراض امر نہیں ہے اور یہ عمارت مسجد کی قسم سے بھی ہو سکتی ہے جس میں نمازیں پڑھیں جائیں۔^[۳]

سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةً رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۖ وَيَقُولُونَ خَمْسَةً سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا ۗ بِالْغَيْبِ ۗ وَيَقُولُونَ سَبْعَةً وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۗ قُلْ رَبِّي أَعْلَمُ بِعَدَّتِهِمْ مِمَّا

[۱] ليعلم الذين يكذبون بالبعث (تبيان)

[۲] هم المؤمنون (جلالين)

[۳] مسجداً يصلون فيه (جلالين) يتعبد الناس فيه بربك ائتمروا بذلك على ان الغلبة كانت للمؤمنين. (مجمع البيان)

يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ ۖ فَلَا تُثَارِفِيهِمْ إِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا ۖ وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِمْ
مِنْهُمْ أَحَدًا ۝۲۱

”جلد ہی لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے جن کا چوتھا کتا تھا اور کہیں گے کہ پانچ تھے جن کا چھٹا کتا تھا اٹکل پچو، غیب کی باتیں بتانے کے طور پر اور کہیں گے کہ سات تھے اور ان کا آٹھواں کتا تھا کہیے کہ میرا پروردگار ہی ان کی تعداد کو خوب جانتا ہے ان کی تعداد کا علم کوئی نہیں رکھتا سوا کم لوگوں کے تو ان کے بارے میں بحث نہ کیجئے سوا اس بحث کے جو بالکل صاف ہو اور ان کے بارے میں ان میں سے کسی سے دریافت نہ کیجئے۔“

تعداد میں اختلاف اور حقیقت کی طرف اشارہ

چونکہ پہلی دو باتوں کے ساتھ جمابا لغیب ’اٹکل پچو‘ کا لفظ کہا گیا ہے اور تیسری بات کے بعد کوئی اس طرح کا تعریضی جملہ نہیں ہے اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دونوں قول غلط ہیں اور تیسرا صحیح ہے چنانچہ جلالین نے دونوں اقوال کو کہا ہے کہ وہ نصارائے نجران کے تھے اور تیسرے قول کو کہا ہے کہ وہ مؤمنین کا تھا اور اسی تیسرے قول کو جناب ابن عباسؓ نے ذمہ داران طور پر موافق حقیقت کہا ہے [۱] اور ظاہر ہے کہ انہیں اس کا علم پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا [۲] مگر اس پر بحث کرنے سے منع کیا گیا ہے اس لئے کہ کوئی غلط بات کہہ رہا ہو اور آپ کو اصل بات معلوم ہو مگر اس کی بات کو غلط اور اپنی بات کو صحیح ثابت کرنے کا کوئی ذریعہ آپ کے پاس نہ ہو تو ایسی صورت میں اس سے الجھنا اور اس کی غلط بات کو رد کرنے کی کوشش کرنا لا حاصل ہے اس بحث سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

وَلَا تَقُولَنَّ لِشَايٍ اِنِّي فَاعِلٌ ذٰلِكَ عَدَا ۝۲۲ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ ۚ وَاذْكُرْ رَبَّكَ اِذَا
نَسِيتَ ۚ وَقُلْ عَسَىٰ اَنْ يَّهْدِيَنِي رَّبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشْدًا ۝۲۳

”اور کسی چیز کو کبھی نہ کہو کہ میں کل کروں گا مگر (اس شرط کے ساتھ کہ) اللہ چاہے اور اپنے پروردگار کو یاد کرو جب بھول جاؤ اور کہو کہ ممکن ہے میرا پروردگار میری رہنمائی کرے اس سے زیادہ صحیح طریقہ کار کے لئے۔“

انشاء اللہ کہنے کا حکم

آئندہ کے وعدہ کے ساتھ ہمیشہ انشاء اللہ کہنا اس آیت کی تعمیل ہے مگر صحیح محل اس کا یہی ہے کہ انسان خود اس کام کو کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ پھر اس کے ساتھ انشاء اللہ کہے لیکن کرنے کا ارادہ نہ ہو اور صرف مصلحتی یا غلط معنی میں اخلاقاً وعدہ کرتا ہے اور پھر وعدہ خلافی کے الزام سے بچاؤ کے لئے بہانہ کی صورت سے انشاء اللہ کہتا ہے، یہ منشاء قرآنی کے خلاف ہے۔

بعض لوگوں نے اسے قصہ اصحاب کہف سے متعلق قرار دیتے ہوئے یہ روایت بیان کی ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں

[۱] قال ابن عباس: انما من القليل الذي يعملون ذلك كانوا سبعة وثامنهم كلبهم (تبیان)

[۲] الاظهر ان يكون عوف ذلك من جهة النبي ﷺ (مجمع البيان)

نے آکر اصحاب کہف کا واقعہ دریافت کیا تھا آپ نے فرمایا کہ کل بتاؤں گا مگر انشاء اللہ نہیں کہا تو دوسرے دن وحی اتری ہی نہیں اور اس لئے آپ اس وعدہ کو پورا نہیں فرما سکے۔

ہمارے نزدیک یہ روایت درست نہیں ہے اور اس آیت کے متعلق ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ اسی قصہ اصحاب کہف سے متعلق ہے بلکہ اس کا قرینہ موجود ہے کہ وہ اس واقعہ سے تعلق نہیں رکھتی اور وہ یہ ہے کہ اگر اس کا تعلق اس واقعہ سے ہوتا تو بالکل شروع ہی میں یہ آیت آتی اور اگر شروع میں نہ آتی تو پورے واقعہ کے بیان کرنے کے بعد آتی بیچوں بیچ میں اس آیت کا آنا تو صاف بتلاتا ہے کہ جیسے بہت سی بے جوڑ آیات ترتیب قرآن میں اپنے محل سے ہٹا کر رکھ دی گئی ہیں، ویسے ہی یہ آیت بھی یہاں بے جوڑ رکھ دی گئی جس کے متعلق پتہ نہیں کہ وہ کس موقع کی نازل شدہ ہے۔

پھر سورہ کے آغاز پر نظر کیجئے، جہاں کسی سوال کا جواب دیا گیا ہے، وہاں اس قسم کے الفاظ موجود ہیں کہ یستفتنونک لیفتنونک یسالونک وغیرہ وغیرہ مگر یہ اصحاب کہف کا واقعہ بیان کرتے وقت اس قسم کا کوئی لفظ نہیں ہے بلکہ انداز بیان بتاتا ہے کہ خالق از خود اس واقعہ کی پوری حقیقت بیان کر رہا ہے جس کے ذیل میں ان غلطیوں کی اصلاح ہے جو عام طور پر اہل کتاب کے درمیان ہیں یا ان کے اختلاف اقوال کی طرف اشارہ ہے ہرگز اس سے پتہ نہیں چلتا کہ وہ کسی سوال کا جواب یا کسی فرمائش کی تعمیل ہے۔

وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا ۝۲۵ قُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا

لَبِثُوا ۗ لَهُ الْغَيْبُ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ ۗ أَبْصِرْ بِهِ وَأَسْمِعْ ۗ مَا لَهُمْ مِنْ دُونِهِ

مِنْ وَّلِيٍّ زَوْلًا يُشِيرُكَ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا ۝۲۶

”اور وہ لوگ اپنے غار میں رہے تین سو برس اور بڑھ گئے اس پر نو ۹ کہیے کہ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ کتنا رہے؟ اس کو آسمانوں اور زمین کی غیب کی خبر ہے وہ کتنا دیکھنے والا اور سننے والا ہے نہیں ان کے لئے اسے چھوڑ کر کرنی سرپرست اور وہ نہیں شریک کرتا اپنے فیصلہ میں کسی کو۔“

تین سو کہنے کے بعد نو برس کی زیادتی کا جو الگ سے بیان ہوا ہے اس کا مطلب یہ لیا گیا ہے کہ شمسی حساب سے تین سو برس تھے اور قمری حساب سے ۳۰۹ برس ہوتے تھے۔ [۱]

اس کی تائید میں ہمارے یہاں جناب امیر کارشاد بھی وارد ہوا ہے [۲] اس تعداد کے بتانے کے بعد یہ ارشاد کہ ”اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ کتنا رہے؟ اس کے لئے آسمانوں اور زمین کی خبر ہے وہ کتنا دیکھنے والا اور سننے والا ہے“۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اہل کتاب کی جماعت کو اس کے ماننے میں تامل تھا اس لئے یہ کہا گیا کہ ہم جو کہہ رہے ہیں اپنی طرف سے نہیں بلکہ اللہ کے دیئے ہوئے علم سے کہہ رہے ہیں جو غیب کے علم کا مالک ہے۔

[۱] فلثلاثمائة الشمسية ثلاث مائة وتسع قمرية (جلالین)

[۲] روى ان يهود يا سائل على بن ابي طالب عن مدة لبثهم فاخبر بما في القرآن فقال: انا نجد في كتابنا ثلاثمائة فقال ذلك لىنى الشمس وهذا البنى القمر (مجمع البيان)

وَاتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۗ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ ۗ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ

دُونِهِ مُلْتَحَدًا ﴿١٥﴾

”اور پڑھیے اسے جو آپ پر وحی بھیجی گئی ہے آپ کے پروردگار کی کتاب میں سے، اس کی باتوں کا بدلنے والا کوئی نہیں اور نہیں پائے گا بجز اس کے کوئی جائے پناہ۔“

ملتحدہ کے معنی میں قدیم مفسرین سے اختلافی طور پر کئی لفظ وارد ہیں مگر مطلب سب کا ایک ہی ہوتا ہے یعنی جائے پناہ^[۱] جو ہم نے ترجمہ کیا ہے۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا

تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ ۗ تُرِيدُ زِينَةَ الدُّنْيَا ۗ وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ

عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرًا فُرُطًا ﴿١٦﴾

”اور صبر و تحمل سے کام لے کر اپنے کو رکھئے ان کے ساتھ جو اپنے پروردگار کو صبح و شام پکارتے ہیں کہ اس کی رضا کے طالب ہیں اور اپنی نظروں کو ان سے آگے نہ بڑھائے اس طرح کہ زندگانی دنیا کی آرائش کو نصب العین بنایا اور کہا نہ مانے اس کا جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے بے خبر چھوڑ رکھا ہے اور جو اپنی نفسانی خواہش کا پیرو ہے اور اس کا معاملہ حد سے گزرا ہوا ہے۔“

رؤسائے نجد میں سے ایک عینیہ بن حصن تھا کہا جاتا ہے کہ اس نے اور اس کے کچھ ہمراہیوں نے پیغمبر خدا ﷺ سے ایک دفعہ کہا کہ یہ غریب، پریشان حال افراد کو آپ اپنے پاس کیوں بیٹھنے دیتے ہیں؟ اس پر یہ آیت اتری اور اس سے کہ جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے بے خبر چھوڑ رکھا ہے، وہی مراد ہے۔^[۲]

ہماری قدیم تفسیر بتاتی ہے کہ وہ خاص غریب مسلمان جن کا رسولؐ کے پاس بیٹھنا ان رؤسا کو ناگوار تھا، جناب سلمان فارسیؓ تھے انہی کے بارے میں یہ آیت اتری^[۳] جناب شیخ الطائفہ نے بھی اس کو بطور ایک قول کے نقل کیا ہے^[۴] اس طرح یہ آیت جناب سلمانؓ اور ان کے ساتھیوں سے متعلق ہے علامہ طبریؒ نے ساتھیوں کے لفظ کے اجمال کو تفصیل سے بدلا ہے اور ابو ذر و عمارؓ وغیرہ کے نام لئے ہیں اور کہا ہے کہ یہ نادار

[۱]. ملجاً عن مجاهد و قبیل حوزا عن ابن عباس و قبیل مرثلا عن قتادة و قبیل معدلا و محيصا عن زجاج و ابی مسلم و الاقوال متقاربة في المعنى (مجمع البيان)

[۲]. هو عينية بن حصن و اصحابه (جلالین)

[۳]. نزلت في سلمان الفارسی كان عليه كساء فيه يکون طعامه و هو دثار کوردان و لکان کسائده من صوف (علی بن ابراهیم)

[۴]. قبیل اثمها نزلت في سلمان و اصحابه (تبیان)

صحابہ تھے، اس لئے رئیسوں کو ان کا صحبت رسولؐ میں رہنا ناپسند تھا۔^[۱]

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ ۗ اِنَّا اَعْتَدْنَا
لِلظَّالِمِينَ نَارًا ۗ اَحَاطَ بِهَمِّ سُرَادِقِهَا ۗ وَاِنْ يَسْتَغِيثُوا يُغَاثُوا بِمَاءٍ كَالْمُهْلِ
يَشْوِي الْوُجُوهُ ۗ بِئْسَ الشَّرَابُ ۗ وَسَاءَتْ مَرْتَفَقًا ۖ

’اور کہیے کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے، بلاشبہ ہم نے ظالموں کے لئے تیار کر رکھی ہے وہ آگ جس کا سر پردہ انہیں گھیرے ہوئے ہے اور اگر فریاد کریں تو ان کی فریاد سی ہو ایسے پانی سے جو مثل گھلے ہوئے تانبے کے ہو کہ چہروں کو بھون دے، کیا بُرا پینے کا پانی ہے اور کیا بری وہ آرام گاہ ہے۔‘

جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے یہ تکلیفی طور پر اختیار دینا یعنی دونوں باتوں کی اجزت کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ تہدید کی انداز میں ہے^[۲] اسی لئے اس کے بعد فوراً ظالموں کے لئے عذاب کا ذکر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کفر اختیار کرنا بڑا ظلم ہے جس کی سزا یہ ہے۔^[۳]

اس اعلان اختیار کے ساتھ ساتھ سزا کا بیان کرنا اس کا اظہار ہے کہ طاعت و معصیت دونوں کی ذمہ داری تم پر ہے اور تمہارے ارادہ و اختیار سے وابستہ ہے اگر طاعت کرو گے تو نجات پاؤ گے اور مخالفت کرو گے تو عذاب میں مبتلا ہو گے، یہ اختیار کا اظہار عقیدہ جبر کے بالمقابل ہے۔ آخر میں دوزخ کو آرام گاہ کہنا اس کے بعد دالی آیت کے جوڑ پر ہے جس میں جنت کے لئے کہا گیا ہے حسنت مرتفقاً بہت اچھی ہے یہ آرام گاہ ورنہ ظاہر ہے کہ دوزخ آرام کی نہیں بلکہ تکلیف کی جگہ ہے^[۴]۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ۙ
اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتٌ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ
ذَهَبٍ وَيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِيْنَ فِيْهَا عَلٰى
الْاَرَآئِكِ ۗ نِعْمَ الثَّوَابُ ۗ وَحَسُنَتْ مَرْتَفَقًا ۖ

[۱]. نزلت فی سلمان و ابی خذر و صہیب و عمار و خباب و غیر ہم من فقراء اصحاب النبی ﷺ (مجمع البیان)

[۲]. صورتہ صورتہ الامرو المراد بہ التہدید (تبیان)

[۳]. وعید من اللہ سبحانہ و انذار لذلك عقبہ بقولہ: انا اعتدنا (مجمع البیان)

[۴]. مرتفقاً تمیز منقول من الفاعل ای قبح مرتفقاً و هو مقابل لقولہ الاتی فی الجنة: حسنت مرتفقاً و الاتی ارتفاق فی النار

”بلاشبہ وہ ایمان لائے اور نیک اعمال کے پابند رہے تو یقیناً ہم اکارت نہیں کریں گے اگر وہ ثواب کو اس کے جو اچھے اعمال کرے۔ یہ وہ ہیں جن کے لیے ہمیشہ کی زندگی والے بہشتی ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوگی، انہیں پہنائے جائیں گے ان میں سونے کے کنگن اور سبز کپڑے سندس اور استبرق کے۔ ان میں مسندوں پر گاؤتکیہ سے لگے بیٹھے ہوں گے۔ کیا کہنا اس ثواب کا اور کتنی اچھی ہے یہ آرام گاہ“۔

بوقت نزول قرآن ملک عرب میں جو کپڑے بہت قیمتی تھے انہی کا نام لیا گیا ہے جس میں انتہائی دیدہ زیب لباس کی طرف ذہن کو منتقل کرنا منظور ہے۔

سندس اور استبرق کی تشریحات جو ہوئی ہیں [۱] اُن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مختلف قسم کے باریک اور موٹے ریشم کے کپڑے ہوتے تھے اور اُن کی بناوٹ میں سونے کے تار بھی ہوتے تھے۔

چونکہ قرآن میں صراحت ہے بہشت ہر وہ چیز ہوگی جس کی خواہش ہو، اس لیے نعمات جنت کو نہ جنس طعام و شراب میں اُن چیزوں میں محدود سمجھنا چاہیے جن کے نام قرآن میں ہیں اور نہ ملبوسات میں اُن سے مخصوص سمجھنا چاہیے بلکہ ہر زمانہ اور ہر ملک کے باشندوں کے لحاظ سے جس قسم کی طلب ہو، اسے مہیا کیا جانا لازمی ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَحَفَفْنَاهُمَا
بِنَخْلٍ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زُرْعًا ۝۳۱ كَلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اتَتْ أَوْلَاهُمَا وَلَمْ يَتْلَمَّ مِنْهُ
شَيْئًا ۝ وَفَجَّرْنَا خِلْفَهُمَا نَهْرًا ۝ وَكَانَ لَهُ ثَمْرٌ ۝ فَقَالَ لِصَاحِبِهِ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَنَا
أَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَأَعَزُّ نَفَرًا ۝ وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ ۝ قَالَ مَا أَظُنُّ
أَنْ تَبِيدَ هَذِهِ أَبَدًا ۝ وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً ۝ وَلَئِنْ رُدِدْتُ إِلَى رَبِّي لَأَجِدَنَّ
خَيْرًا مِنْهَا مُنْقَلَبًا ۝۳۲

”اور پیش کیجیے ان کے سامنے مثال دو آدمیوں کی جن میں سے ایک کے ہم نے دو باغ قرار دیئے انگور کے اور ان دونوں کو گھیر دیا کھجوروں سے اور ان دونوں باغوں نے اپنے پھل دیئے اور اس میں کچھ بھی کمی نہیں کی اور ہم نے ان کے بیچ نہریں جاری کیں اور اس کی ملکیت میں بہت مقدار پھلوں کی تھی تو اس نے اپنے ساتھی سے کہا جب کہ وہ اس سے گفتگو کر رہا تھا کہ میں تم سے مال میں زیادہ اور آدمیوں کی تعداد میں بھی بڑھا ہوا ہوں اور وہ اپنے باغ میں داخل ہوا اس حال میں کہ وہ اپنے اوپر ظلم کرنے والا تھا، اُس نے کہا مجھے نہیں گمان کہ یہ کبھی بھی مٹ جائے

[۱] سندس مارق من الدیبا ج و استبرق ما غلط منه و فی آیتہ الرحمن: بطائنها من استبرق (جلالین) من سندس و استبرق ای من

الدیبا ج الرقیق و الغلیظ و قیل ان الاستبرق فارسی معرب و قیل هو الدیبا ج المنسوج من الذهب (مجمع البیان)

اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت آنے والی ہے اور اگر میں اپنے پروردگار کی طرف پلٹا یا گیا تو انجام کار اس سے بہتر پاؤں گا،

ایک مالدار اور ایک غریب دو ساتھیوں کی پیہم گفتگو

اس طرح کا تمثیلی انداز انجیل وغیرہ قدیم آسمانی کتب میں بہت زیادہ ہے قرآن مجید نے بھی یہ طریقہ اختیار کیا ہے جو حقیقتوں کے ذہن نشین کرنے کا عمدہ ذریعہ ہے [۱] مگر جناب عباسؓ کی یہ روایت ہے کہ یہ بنی اسرائیل میں سے دو شاہزادوں کی سرگزشت ہے جو وقوع میں آئی تھی اور تفسیر علی بن ابراہیم میں ہے کہ وہ ایک مالدار صاحب جائداد اور اس کے غریب پڑوسی کا ذکر ہے۔ بہر حال جو مقصد تمہیل ہے، اس میں اس اختلاف نوعیت سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَكَفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ
ثُمَّ سَوَّكَ رَجُلًا ۖ لَكِنَّا هُوَ اللَّهُ رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِرَبِّي أَحَدًا ۝۳۸ وَلَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ
جَنَّتِكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللَّهُ ۖ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ ۗ إِنْ تَرَنِ أَنَا أَقَلُّ مِنْكَ مَالًا
وَوَلَدًا ۖ فَعَسَىٰ رَبِّي أَن يُلِيَّتَيْنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ
السَّمَاءِ فَتُصْبِحُ صَعِيدًا زَلَقًا ۝۳۹ أَوْ يُصْبِحُ مَاءً غُورًا فَلَنْ تَسْتَطِيعَ لَهُ
طَلَبًا ۝۴۰

”کہا اس سے کہ ساتھی نے اُس سے گفتگو کے دوران میں کیا تم کفر اختیار کرتے ہو اُس ذات کے ساتھ جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے پھر تمہیں مرد کی صورت میں بنایا، رہا میں، تو وہ اللہ میرا پروردگار ہے اور میں اپنے پروردگار کے ساتھ شریک نہیں رہتا، اور کیوں نہ ایسا ہوا کہ جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تو کہتے جو اللہ چاہے وہ ہوتا ہے، نہیں طاقت کسی کو سوا اللہ کے سہارے کے۔ اگر تم مجھے دیکھتے ہو کہ میں تم سے مال اور اولاد میں کم ہوں تو بہت ممکن ہے کہ میرا پروردگار مجھے تمہارے باغ سے بہتر عطا کر دے اور اس (باغ) پر آسمان سے بجلیاں [۲] بھیج دے جس سے یہ صاف چکنی زمین [۳] ہو جائے یا اس کا پانی خشک ہو جائے تو پھر تم کسی طرح اُسے حاصل نہ کر سکو،

[۱] ضرب الله لعباده مثلاً يستفيهم به الى طاعته ويزجرهم عن معصيته و كفران نعمته (مجمع البيان)

[۲] حسبنا نجمع حسبنا نة اي صواعق (جلالين)

[۳] زمين بے گيا لغزا انندة پائے (شاه ولی الله زمين پھلنی (شاه رفیع الدین)

وَأَحِيطَ بِشَمْرِهِ فَاصْبَحَ يَقْلِبُ كَفَيْهِ عَلَى مَا أَنْفَقَ فِيهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا وَيَقُولُ يَا لَيْتَنِي لَمْ أُشْرِكْ بِرَبِّي أَحَدًا ۝۳۲ وَلَمْ تَكُنْ لَهُ فِئَةٌ يَنْصُرُونَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مُنتَصِرًا ۝۳۳ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلَّهِ الْحَقِّ ۗ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَخَيْرٌ عُقْبًا ۝۳۴

”اور گھیرے میں لے لیا گیا اُس کے پھلوں کو تو ہو گیا وہ اس عالم میں کہ ہاتھ ملتا تھا اُس دولت پر جو اُس نے اس باغ میں صرف کی اور وہ اپنی چھتوں کے ساتھ گرا ہوا تھا اور وہ کہہ رہا تھا کہ کاش میں اپنے پروردگار کے ساتھ شریک قرار نہ دیتا اور نہ تھی اُس کے لیے کوئی جماعت جو اُس کی مدد کرے اللہ کو چھوڑ کر اور نہ خود مدد حاصل کرنے کے قابل تھا۔ اب اس وقت ثابت ہو گیا کہ اختیار فقط اللہ کے لیے ہے جو ایک ثابت حقیقت ہے، وہی بہتر ہے باعتبار ثواب کے اور وہی بہتر ہے بلحاظ انجام کے،

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”آخر اس کے باغ پر وہی ہوا جو اس نیک کی زبان سے نکلا تھا۔ رات کو آگ لگ گئی آسمان سے سب جل کر ڈھیر ہو گیا۔ مال خرچ کیا پونجی بڑھانے کو وہ اصل بھی کھو بیٹھا“ (موضح القرآن)

وَاصْرَبْ لَهُمْ مَثَلِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَا أَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ فَأَصْبَحَ هَشِيمًا تَذْرُوهُ الرِّيحُ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ۝۳۵

”اور ان کے سامنے پیش کیجئے مثال دنیا والی زندگی کی کہ جیسے وہ پانی جسے ہم نے اوپر سے اتارا تو اس کے سبب سے زمین کے نباتات (کثرت کی وجہ سے) ایک دوسرے میں کلا تو ہو گئے [۱] اس کے بعد وہ چورا چورا ہو گئے کہ ہوائیں انہیں ادھر ادھر اڑا رہی ہیں اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔“

الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۗ وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ أَمَلًا ۝۳۶

”مال اور اولاد دنیوی زندگی کی رونق ہیں اور باقی رہنے والی نیکیاں بہتر ہیں تمہارے پروردگار کے یہاں ثواب لے لیاظ سے اور بہتر ہیں آسرے کی حیثیت سے۔“

[۱]. فالتف بعضه ببعض حسنا وعضاضة (تبیان و مجمع البیان)

ان آیات میں مال اور اولاد زندگی کی رونق لیکن مال کی اُمید اعمال سے کا ذکر آیا ہے

وَيَوْمَ نُسِطِرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً ۖ وَحَشَرْنَا لَهُمْ فَلَمَّ نَغَادِرُ مِنْهُمْ
أَحَدًا ۗ وَعَرَضُوا عَلَىٰ رَبِّكَ صَفًّا ۗ لَقَدْ جِئْتُمُونَا كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ نَبَلٌ
زَعَمْتُمْ أَلَّنْ نَجْعَلَ لَكُمْ مَوْعِدًا ۗ

’اور وہ دن کہ جب ہم پہاڑوں کو متحرک بنا دیں گے اور دیکھو گے زمین کو کھلا ہوا صاف اور ان سب کو اکٹھا کر کے
لائیں گے تو ان میں سے کسی کو چھوڑا نہیں ہوگا اور وہ پیش کئے گئے ہوں گے تمہارے پروردگار کے سامنے قطار
باندھے ہوئے تم ہمارے پاس آئے ہو اسی طرح جیسا کہ ہم نے تم کو پہلی دفعہ پیدا کیا تھا ہاں تم نے گمان ایسا کیا تھا
کہ ہم ہرگز تمہارے لئے کوئی وعدہ گاہ قرار نہ دیں گے۔‘

دیکھو گے زمین کو کھلا ہوا صاف یعنی نہ اس پر کوئی عمارت ہوگی نہ درخت نہ پہاڑ [۱] دوسری ان الفاظ میں ارشاد کیا ہے کہ: ’فَيَذَرُهَا

قَاعًا صَفْصَفًا ۗ لَا تَرَىٰ فِيهَا عِوَجًا وَلَا أَمْتًا ۗ‘، چٹیل میدان جس میں کوئی کچی اور ابھار کہیں نظر نہ آتا ہوگا (ط: ۱۰۶-۱۰۷)

اس طرح جیسے پہلے پیدا کیا تھا یعنی بالکل بے کسی اور بے بسی کے عالم میں [۲] اور پھر لباس اور سامان زینت سے بالکل بے بہرہ [۳] جیسے

اس دن تھے کہ جب پہلی دفعہ دنیا میں آئے تھے۔

علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں دونوں مفہوم دو اقوال کی صورت میں درج کئے ہیں۔

وَوَضَعَ الْكِتَابَ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ ۗ مَا فِيهِ وَيَقُولُونَ يَا وَيْلَتَنَا مَالِ
هَذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا ۗ وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا
حَاضِرًا ۗ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا ۗ

’اور زمانہ عمل [۴] رکھ دیا گیا ہوگا تو گناہگاروں کو پاؤ گے خوف زدہ اس سے کہ جو اس کے اندر ہے اور کہتے ہوں گے
وائے بر حال ما، یہ کسی تحریر ہے کہ جو چھوٹی اور بڑی کسی بات کو نہیں چھوڑتی بغیر اس کے کہ اس پر حاوی ہو اور انہوں
نے جو کچھ عمل کیا تھا اسے سامنے موجود پایا اور تمہارا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرتا‘۔

قرآن مجید نے طرح طرح اللہ کے افعال میں عدل کے لازمی ہونے کا اعلان کیا ہے مگر اہل سنت کی اکثریت نے بلاوجہ اسے اصول

[۱] ای ظاہرۃ لیس علیا شیء من جبل او بناء او شجر یترها عن عیون الناظرین (مجمع البیان)

[۲] یعنی جئتم الی الوضع الذی لایملک الامر فیہ الا اللہ کہا خلقناکم اول مرة لایملکون شیئا (تبیان)

[۳] ای فرائض صفاة عراة عزلاء (جلالین)

[۴] یعنی الکتب الی فیہا اعمالہم مثبتة (تبیان)

دین سے خارج کر رکھا ہے اس لئے ان آیات کی تشریح میں بڑی زحمت و مشقت اٹھانا پڑتی ہے ایک طرف اپنے تصورات کا دباؤ ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ قادر مطلق ہے وہ جو چاہے کرے اور دوسری طرف خداوند عالم جزاء وغیرہ کو بقدر عمل دینے میں یہ اعلان کرتا ہے کہ اللہ ظلم نہیں کیا کرتا اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو ظلم ہوتا۔ مثلاً نیکو کاروں کو جزاء کے بجائے سزا دیتا تو ظلم ہوتا، بد اعمالوں کو ان کے استحقاق سے زیادہ سزا دیتا تو ظلم ہوتا، بغیر کسی جرم کے کسی کو سزا دیتا تو ظلم ہوتا۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ قرآن مجید کے آیات اصول اشعریت کو منہدم کرنے والے ہیں مگر انہیں تو اپنی بات نباہنا ہے چنانچہ شاہ عبدالقادر اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

رب جو کرے ظلم نہیں سب اس کا مال ہے ہر ظاہر میں جو ظلم نظر آتا ہے وہ بھی نہیں کرتا، بے گناہ دوزخ میں نہیں ڈالتا اور نیکی ضائع نہیں کرتا اور جو کوئی کہے گناہ میں ہمارا کیا اختیار۔ سو یہ بات نہیں، اپنے دل سے پوچھ لے، جب گناہ پر دوڑتا ہے اپنے قصد سے دوڑتا ہے اور جو کوئی کہے قصد بھی اسی نے دیا۔ سو قصد دونوں طرف لگ سکتا ہے اور جو کہے اس نے ایک طرف لگایا۔

سو بندے کی دریافت سے باہر ہے بندے سے معاملت ہے، اس کی سمجھ پر، بندہ بھی پکڑے گا اسے جو اس سے بدی کرے نہ کہے گا کہ اس کا کیا قصور؟ اللہ نے کروایا (موضح القرآن) دیکھتے ہیں آپ اس ژولیدہ بیانی کو؟

قرآن تو بعض باتوں کو صاف کہتا ہے کہ ایسا ہو تو تو ظلم ہوتا خدا ظلم قرار پاتا اور خدا ظلم سے بری ہے اس لئے وہ ایسا نہیں کرتا اور آپ کہتے ہیں جی نہیں جو بھی وہ کرے وہ حقیقت میں ظلم نہیں ہوگا لیکن ظاہر میں ظلم نظر آئے گا یعنی غلط طور پر اس لئے خدا وہ بھی نہیں کرتا۔

پھر وہاں آکر قصد کو خدا ہی تو ایک طرف لگاتا ہے آپ کہتے ہیں کہ ہے تو ایسا ہی مگر یہ بندے کی دریافت سے باہر ہے اس لئے بندے سے معاملت ہے اس کی سمجھ پر گویا اس بندے کی بے وقوفی سے اللہ فائدہ اٹھاتا ہے کہ تو اپنے کو غلط طور پر ذمہ دار سمجھتا ہے تو لے، میں تجھے سزا بھی دیئے دیتا ہوا حالانکہ واقعاً تو بے قصور ہے وہ تو سب میرا کیا ہوا ہے۔

افسوس اپنی بات نباہنے کے لئے کتنے صاحبان علم بے علمی سے اور کیسے سمجھ دار لوگ نا سمجھی سے کام لیتے ہیں۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ ط كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ
عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ ط أَفْتَتَّخِذُونَهُ وَذُرِّيَّتَهُ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِي وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ط بئس
لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا ۝۵۰

’اور جب کہا ہم نے فرشتوں کے آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا سوا ابلیس کے۔ وہ جنات میں سے تھا تو اس نے پروردگار کے حکم سے سرتابی کی تو کیا تم لوگ اسے اور اس کی اولاد کو حوالی موالی بناؤ گے مجھے چھوڑ کر؟ حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں، کیا برابر بدل ہے یہ ظالموں کے لئے۔‘

شیطان کا جنات میں سے ہونا اور اس کے لئے نسل کا وجود

یہ آدم کا قصہ حکم سجدہ اور ملائکہ کی اطاعت اور ابلیس کی نافرمانی یہ سب تو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مذکور ہے مگر یہاں جو ایک بڑا

اہم اضافہ ہے وہ یہ ہے کہ:

كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ -

وہ جنات میں سے تھا تو اس نے اپنے پروردگار کے حکم سے سرتابی کی۔

بعض لوگوں نے خواہ مخواہ جن کے لفظ کو معنی لغوی ”پوشیدہ“ یعنی آنکھ سے چھپی ہوئی مخلوق کے معنی میں قرار دے کر فرشتوں پر بھی حاوی کر دیا ہے مگر میرے خیال میں یہاں فرشتوں کے ذکر کے بعد خصوصیت کے ساتھ ابلیس کو کہنا کہ وہ جن سے تھا اور پھر ”ف“ کے ساتھ جس کے معنی فارسی اور پرانی اردو میں پس کے کہے جاتے تھے اور اب ہم اس کا ترجمہ تو کے ساتھ کرتے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ جن ملائکہ سے علیحدہ ایک خاص نوع ہے اور قرآن مجید کا درمیان میں یہ صراحت کرنا، درحقیقت اس شبہ کے دفعیہ کے لئے ہے کہ فرشتے تو ہواؤ و ہوس سے بری ہونے کی وجہ سے طبعاً معصوم ہوتے ہیں۔ پھر ابلیس سے یہ سرتابی ہوئی ہی کیوں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ درحقیقت فرشتہ تھا ہی نہیں بلکہ جنات میں سے تھا اور اسی بنا پر اس سے یہ نافرمانی سرزد ہوئی اور اس بنا پر پہلے پارے میں جو اس واقعہ کے ذکر میں ابی و استکبر کے ساتھ وکان من الکفرین ہے اس کا مطلب بھی میں یہی سمجھتا ہوں کہ ”اس نے انکار کیا اور تکبر سے کام لیا اور وہ تھا ہی کافروں میں سے“ یعنی اس جماعت میں سے تھا کہ جو پہلے زمین میں کفر اور سرکشی کر چکی تھی اور یہ ایک اپنے انفرادی نیکو کاری کے حق کی بنا پر اس عذاب سے بچ گیا تھا جو اس جماعت پر نازل ہوا۔ اب سجدہ آدم کے سوال پر اس کی وہ طبیعت کفر و سرکشی ابھرائی اور سجدہ آدم سے انکار کی صورت میں نمایاں ہوئی۔

”کیا برابر ہے ظالموں کے لئے“ کہ وہ اطاعت خالق کے بدلے بیرونی شیطان کرتے ہیں۔^[۱]

مَا أَشْهَدْتُهُمْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَا خَلَقَ أَنْفُسِهِمْ ۖ وَمَا كُنْتُ

مُتَّخِذًا الْمُضِلِّينَ عَضُدًا ۝۵۱

”میں نے انہیں سامنے کھڑا نہیں کیا تھا آسمان اور زمین کے پیدا کرتے وقت اور نہ خود ان کی خلقت کے وقت اور میں ایسا نہیں ہوں کہ گمراہوں کو اپنا دست و بازو بناؤں“۔

سامنے کھڑا کرنے کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ہمیں ضرورت نہیں تھی کہ ہم اپنے کاموں میں مدد کے واسطے انہیں بلائیں^[۲] اور ہو سکتا ہے کہ صرف اسرار کائنات سے ان کی ناواقفیت کا اظہار ہو مگر آیت کا تمہ پہلے مفہوم سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔^[۳]

وَيَوْمَ يَقُولُ نَادُوا شُرَكَائِيَ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَوْبِقًا ۝۵۲ وَرَأَى الْمَجْرُمُونَ النَّارَ فَظَنُّوا أَنَّهُمْ مُوَاقِعُوهَا وَلَمْ

[۱]۔ معناه بئس ما لستبدلو ابعبادہم و اطاعوا ابلیس عن الحسن و قیل بئس البذل طاعة الشيطان من طاعة الرحمن عن قتادة (مجمع البيان)

[۲]۔ قیل معناه ما اشهدتہم مستغنا بہم (تبیان)

[۳]۔ ہذا اخبار عن کمال قدرتہ و استغنائہ عن الاعوان و الانصار و يدل علیہ قولہ و ما کنت متخذًا الضلّیین عضداً (مجمع البيان)

يَجِدُوا عَنْهَا مَضَرٍ قَاتٍ ﴿٥٣﴾

”اور وہ دن جب وہ کہے گا کہ پکارو میرے ان شریکوں کو جو تمہارے زعم ناقص میں تھے اس پر انہوں نے پکارا تو انہوں نے ان کی صدا پر لبیک نہ کہی اور ہم نے قرار دیا ان کے درمیان تباہی کا سامان اور دیکھا گنہگاروں نے آگ کو تواب جانا کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں اور نہیں پایا انہوں نے اس سے دوری کا کوئی طریقہ۔“

موبقا کے لفظ کے معنی بعض تفاسیر میں جہنم کی ایک وادی کے نام کے طور پر کہے گئے ہیں ^[۱] مگر اس کے ثبوت کے لئے حدیث کی ضرورت ہے، اس لئے لغوی معنی کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا ہے تباہی کا سامان جو بعض تفاسیر کے مطابق ہے۔ ^[۲]

تیسری تشریح یہ ہے کہ خندق آگ سے بھری“ (موضح القرآن) مگر اس کے لئے بھی ثبوت کی ضرورت ہے۔

ایک چوتھی تفسیر اس کی جو ہماری قدیم تفسیر نے کی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے معنی پردہ کے ہیں۔ ^[۳] یہ معنی الفاظ قرآنی سے کچھ زیادہ سمجھ میں آتے ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ ان مشرکین اور ان شرکاء کے درمیان ہم نے ایک بڑا پردہ قرار دیا ہے کہ نہ وہ ان کی بات سنتے ہیں اور نہ ان کی مدد کر سکتے ہیں۔

فَطَنُّوْا کے لفظی معنی تو ہیں گمان کیا مگر قرآن میں بہت جگہ ظن کا لفظ علم کے معنی میں آیا ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ ^[۴]

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَذَا الْقُرْآنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۗ وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ

شَيْءٍ جَدَلًا ﴿٥٤﴾

”اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے طرح طرح سے ہر چیز کی مثال پیش کیا اور انسان جھگڑا کرنے میں ہر چیز سے زیادہ ہے۔“

پہلا جملہ تھوڑا سے فرق الفاظ کے ساتھ یا بالکل ایسے ہی الفاظ میں متعدد جگہ قرآن میں آیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے لئے ہم نے ایک ہی بات کو بار بار مختلف طریقوں اور گونا گوں مثالوں کے ساتھ بیان کیا ہے ^[۵] اب یہاں آخری فقرہ کا مطلب یہ ہوگا کہ باوجود اتنے انتظام و اہتمام کے آدمی ہے کہ کسی طرح نہیں مانتا اور طرح طرح کی مین میخیں نکالتا ہے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ وَيَسْتَغْفِرُوا رَبَّهُمْ إِلَّا أَنْ

[۱] وادیامن اودیة جھٹم یہلکون فیہا جمیعاً (جلالین) یعنی وادی ازواد یہائے دوزخ تابکی بدیگری نتواند رسید (فتح الرحمن)

[۲] مہلکا (تبیان) کریں گے ہم درمیان ان کے جائے ہلاکت (شاہ فیح الدین)

[۳] موبقا ای ستر (علی بن ابراہیم)

[۴] ای علموا فہذا ظن یقین (علی بن ابراہیم) ای ایقنوا (جلالین)

[۵] فقال المعانی فی الجهات المختلفة فی هذا القرآن فتصرف المثل فیہ تنقیلہ فی وجوہ البیان علی تمکین الافہام (تبیان)

تَأْتِيَهُمْ سُنَّةٌ الْأُولِينَ أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ۝٥٥ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا
مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ ۚ وَيُجَادِلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ
وَاتَّخَذُوا الْآيَتِي وَمَا أَنْذَرُوا هُزُوعًا ۝٥٦

’اور نہیں مانع ہو ان لوگوں کو اس سے کہ وہ ایمان لائیں جب کہ ان کے پاس ہدایت آئی اور طلب مغفرت کریں
اپنے پروردگار کی بارگاہ میں سو اس انتظار کے کہ آئے ان کے سامنے اگلے لوگوں کا طریقہ یا ان کے پاس منہ درمنہ
عذاب آئے اور ہم نہیں بھیجتے پیغمبروں کو سوا خوش خبری دینے والے اور (عذاب سے) ڈرانے والے کے اور جو کافر
ہیں وہ غلط دلائل سے بحث کرتے ہیں تاکہ ان سے حق کو شکست دیں اور انہوں نے بنا لیا میری آیات کو اور جو انہیں
ڈرایا گیا مذاق‘۔

اگلے لوگوں کا طریقہ کیا مطلب؟ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں:

یعنی کچھ اور انتظار نہیں مگر یہ کہ پہلوں کی طرح ہلاک ہوویں یا قیامت کا عذاب آنکھوں سے دیکھیں (موضح القرآن)
تفسیر جلالین میں ہے:

ہی الاهلاك المقدر عليهم
یعنی وہ ہلاکت جو ان کی تقدیر میں لکھی ہے۔
شیخ الطائفہ تحریر فرماتے ہیں:

من هجيع العذاب من حيث لا يشعرون او مقابلة من حيث يرون (تبیان)
یعنی پہلوں کے طریقہ سے مراد یہ ہے کہ عذاب اچانک آئے اس طرح کہ انہیں خبر نہ ہو یا اس طرح سامنے آئے کہ آنکھوں سے دیکھ
رہے ہوں۔

علامہ طبری تقریباً یہی الفاظ لکھتے ہیں۔^[1]

اب یہ کہ انہیں ایمان سے مانع صرف یہ انتظار ہے کہ ان پر عذاب ان دنوں صورتوں میں سے کسی ایک سے آئے اس کی تشریح میں
علامہ طبری فرماتے ہیں کہ:

یہ بطور استعارہ کے ہے یعنی وہ ایمان نہ لانے میں ایسے ہیں جیسے کسی کو انتظار ہو کہ عذاب آئے خواہ اس طرح یا اس طرح، دوسری جگہ
کہا گیا ہے:

لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ حَتَّىٰ يَرَوْا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ۝٥٦ (شعراء)

[1]. من تأتیهم العادة فی الاولین من عذاب الاستیصال حیث اتاہم العذاب من حیث لا يشعرون او طلب ان یأتیہم العذاب
عیاناً مقابلة من حیث یرون (مجمع البیان)

وہ ایمان نہیں لائیں گے جب تک دردناک عذاب کو آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔
 حالانکہ یہ وقت وہ ہوتا ہے کہ پھر ایمان لانا سود مند نہیں ہوتا۔
 اور پھر مشرکین نے جیسا کہ قرآن مجید میں اور جگہ ہے فرمائیں بھی ایسی کی تھیں مثلاً
 اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ ۖ أَوْ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٥٨﴾ (انفال)
 خداوند! اگر یہ تیری طرف سے آئی ہوئی واقعی حقیقت ہے تو برسہا برسہا ہم پر پتھر آسمان سے یا ہماری طرف لاگوئی (اور) بڑا دردناک

عذاب۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ فَأَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدُهُ ۖ إِنَّآ
 جَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً ۙ أَن يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۖ وَإِن تَدْعُهُمْ إِلَى
 الْهُدَىٰ فَلَن يَهْتَدُوا إِذًا أَبَدًا ﴿٥٩﴾

’اور کون زیادہ ظالم ہوگا اس سے کہ جسے نصیحت کی جائے اس کے پروردگار کی آیات کے ساتھ تو وہ ان سے رو
 گردانی کرے اور بھول جائے اسے کہ جو اس کے ہاتھوں ہو چکا ہے، بلاشبہ ہم نے ان کے دلوں پر ڈال دیے ہیں
 پردے اس سے کہ وہ اسے سمجھیں اور ان کے کانوں میں گرانی کر دی ہے اور اگر نہیں ہدایت کی طرف بلائے تو اس
 وقت میں وہ ہدایت قبول نہ کریں گے کبھی۔‘

وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ ۖ لَوْ يُؤَاخِذُهُم بِمَا كَسَبُوا لَعَجَل لَهُمُ الْعَذَابُ ۗ
 بَل لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّن يَجِدُوا مِنْ دُونِهِ مَوْجِدًا ﴿٦٠﴾

’اور آپ کا پروردگار بڑا بخشنے والا ہے، رحمت والا اگر وہ انہیں ان کے گناہوں کی پاداش میں گرفت کے اندر لے تو
 ابھی بھیج دے ان پر عذاب مگر ان کے لئے ایک وعدہ کا دن مقرر ہے کہ نہیں پائیں گے اس سے اور کوئی جائے
 پناہ۔‘

’وعدہ کا دن‘ یعنی قیامت کہ اصل مکافات عمل کا دن وہ ہے۔^[1]

وَتِلْكَ الْقُرَىٰ أَهْلَكْنَاهُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ﴿٦١﴾

’اور یہ ہیں وہ بستیاں جنہیں ہم نے تہس نہس کر دیا جب کہ ان لوگوں نے ظلم و ستم سے کام لیا اور قرار دی ہم نے
 ان کی ہلاکت کے لئے ایک مقررہ معیاد۔‘

ظاہر ہے کہ ظلم کا ارتکاب بستیوں کے باشندے کرتے ہیں اور ہلاک بھی وہی کئے جاتے ہیں نہ کہ وہ بستیاں۔ اس لئے بعد میں ضمیریں

[1] ہو یوم القیامت والبعث (مجمع البیان)

سب جمع مذکر غائب کی لائی گئی ہیں جو ان بستیوں کے باشندوں کی طرف راجع ہیں۔^[۱]

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِفَتْنِهِ لَآ آتِبْرُحُ حَتَّىٰ أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ حُقُبًا ۝

’اور جب کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے جوان (ساتھی) سے کہ میں سفر جاری رکھوں گا یہاں تک کہ پہنچوں اس جگہ جہاں دو سمندر اکٹھا ہوتے ہیں یا مجھے مدتیں گزر جائیں اس سفر میں‘۔

حضرت موسیٰ کا سفر اور اس کی درمیانی رونداد

یہاں سے جناب موسیٰ اور حضرت کاوا قد شروع ہوتا ہے۔ یہ سفر کیوں شروع ہوا تھا؟ اس کا پس منظر کیا ہے؟ اس کا ذکر قرآن مجید میں کہہ دیا کہ میں تمام دنیا میں سب سے زیادہ صاحب علم ہوں یہ ایک طرح کا ترک اولیٰ تھا جس پر ان کی تنبیہ کے لئے انہیں جناب حضرت کے محل قیام کے طرف بھیجا گیا۔^[۲]

یہ جوان کون تھے؟ تفسیر جلالین میں ہے:

یوشع بن نون و کان تبعه و یخدمه و یاخذ منه العلم

یہ یوشع بن نون تھے جو ان کے پیچھے پیچھے رہتے تھے اور خدمت کرتے تھے اور ان سے علم حاصل کرتے تھے۔

مگر جناب شیخ الطائفہ نے فرمایا ہے کہ اس میں دو قول ہیں، ایک تو یہی ہے کہ وہ یوشع بن نون تھے اور دوسرا یہ ہے کہ یوشع کے فرزند

تھے (تبیان)

مگر زیادہ تر مفسرین پہلے قول سے متفق ہیں۔^[۳]

شاہ عبدالقادر نے لکھا؛

’یہ جوان فرمایا یوشع کو۔ حضرت موسیٰ کے خادم خاص تھے، پیچھے، ان کے روبرو پیغمبر ہوئے اور ان کے بعد خلیفہ ہوئے، (موضع

القرآن)

کاش شاہ صاحب موصوف یہ بھی بتا دیتے کہ خلافت خدا اور رسول ﷺ کے تقرر سے ہوئی تھی، یا جمہوریت کے اجماع یا شوریٰ سے؟

دونوں دریا کون تھے؟ اس لیے تفسیر جلالین میں ہے؛

ملتقى بحر الروم و بحر فارس فیما یلی المشرق

مشرق کی سمت سے متصل جہاں دریائے روم اور فارس کا سنگم ہے۔

[۱] لان القرية هي المسكن نحو المدينة والبلد تو هي لا تستحق الهلاك واما يستحق الهلاك اهلها. (مجمع البيان)

[۲] سعید بن جبیر عن ابن عباس قال اخبرني ابي بن كعب قال خطبنا رسول الله ﷺ فقال ان موسى قام خطيبا في بني اسرائيل

فسئل ابي الناس اعلم فقال انا فغضب الله عليه (مجمع البيان)

[۳] اكثر المفسرين على انه موسى بن عمران وقتناه يوم شاع بن نون (مجمع البيان)

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيًا حُوَّتَهُمَا فَا تَخَذَا سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿١١﴾ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتْنِهِ آتِنَا غَدَاءَنَا لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هَذَا نَصَبًا ﴿١٢﴾ قَالَ أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْخُبُوتَ وَوَمَا أَنْسِينِيهِ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ ۗ وَاتَّخَذَا سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا ﴿١٣﴾ قَالَ ذَلِكَ مَا كُنَّا نَبِغُ ۖ فَارْتَدَّآ عَلَىٰ آثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿١٤﴾ فَوَجَدَا عَبْدًا مِنْ عِبَادِنَا آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا ﴿١٥﴾

”تو جب دونوں ان دونوں سمندروں کے یکجا ہونے کی جگہ پر پہنچے تو وہ دونوں اپنی مچھلی کو بھول گئے تو اس نے دریا میں ایک سرنگ کی صورت سے اپنا راستا بنا لیا۔ اب جب وہ دونوں آگے بڑھے تو انہوں نے اپنے ساتھ والے جوان سے کہا کہ لاؤ ہمارا ناشتہ۔ ہمیں تو اپنے سفر میں بڑی مشقت اٹھانا پڑی۔ انہوں نے کہا کیا آپ نے دیکھا تھا جب ہم ایک چٹان کی پناہ لیے ہوئے تھے تو میں مچھلی کو بھول گیا اور نہیں بھولایا مجھے اس کے ذکر کو مگر شیطان نے اور اس نے عجیب طریقہ سے راستا دریا میں بنا لیا، کہا یہ ہی تو منزل ہے وہ جس کے طلب گار تھے تو وہ پلٹے اپنے نقش قدم کو ڈھونڈتے ہوئے تو ان دونوں نے پایا ہمارا بندوں میں سے ایک بندہ کو جسے ہم نے اپنی طرف سے خاص رحمت کے ساتھ نوازا اور اُسے ہم نے اپنی طرف سے علم عطا کیا،

حضرت موسیٰ کا سفر اور اس کی درمیانی رونداد

جو لوگ مظاہر قدرت کی العجوبہ آفرینی کے منکر ہیں، وہ معلوم نہیں ان آیات کے کیا معنی کہتے ہیں؟ لیکن قرآن صاف طور پر اس واقعہ کو عجیب کہہ کے بیان کر رہا ہے۔ اس لیے اُسے عجیب تو ماننا ہی پڑے گا۔
شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:-

”وہاں پہنچ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سو رہے اور یوشع دریا سے وضو کرنے لگے۔ انکی مچھلی زندہ ہو کر دریا میں نکل پڑی اور پانی میں بیٹھ گئی۔ وہاں طاق سا کھلا رہ گیا، ان کو دیکھ کر تعجب ہوا، چاہا کہ جب موسیٰ جاگیں تب ان سے کہیں۔ وہ جاگے تو دونوں آگے چل کھڑے ہوئے۔ یہ کہنا بھول گئی، (موضح القرآن)

صورت واقعہ میں اصل بھول جناب یوشع کی ظاہر ہوتی ہے۔ معیت کی بنا پر اُس کی نسبت دونوں کی طرف دی گئی: آخر میں جناب موسیٰ کا یہ کہنا ہے کہ یہی تو وہ منزل ہے جس کے ہم طلب گار تھے، اُس سے پتہ چلتا ہے کہ خالق کی طرف سے اس ہستی کے جائے قیام کا جس سے ملاقات کے لیے حضرت موسیٰ کے لیے جارہے تھے، پتہ یہی دیا تھا اور شاید یہ علامت بتائی گئی تھی کہ جس جگہ کو چیر تمہاری

نذر طاق نسیاں ہو جائے، وہیں وہ شخص ملے گا جس کی طلب میں ہم تم کو بھیج رہے ہیں۔^[۱]

قَالَ لَهُ مُوسَى هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَنْ تُعَلِّمَ مِنِّي مَا عَلَّمْتَ رُشْدًا ۖ قَالَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۖ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا ۖ قَالَ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا وَلَا أَعْصِي لَكَ أَمْرًا ۖ قَالَ فَإِنِ اتَّبَعْتَنِي فَلَا تَسْأَلْنِي عَنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ أُحَدِّثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ۖ

”ان سے موسیٰ نے کہا کہ کیا میں آپ کا پیرو ہوں اس اقرار پر کہ آپ اُس علم سے جو آپ کو ملا ہے مجھے بھی صحیح راستے کی تعلیم دیجئے انہوں نے کہا تم میرے ساتھ صبر برداشت سے کام نہیں لے سکو گے اور کیوں کہ تم صبر و تحمل سے کام لو گے اس چیز پر جو تمہارے اطلاع کے دائرہ میں نہیں ہے انہوں نے کہا عنقریب اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر و تحمل کرنے والوں میں پائیے گا۔ اور میں کسی بات میں آپ کی عدول حکمی نہ کروں گا۔ انہوں نے کہا اچھا اگر تم میرے پیرو بنتے ہو تو مجھ سے کسی بات کا پوچھنا نہیں۔ جب تک میں خود اس کا تذکرہ تم سے نہ چھیڑوں۔

حضرت موسیٰ اور خضرؑ کی ابتدائی گفتگو

حضرت خضرؑ کا قول کہ ”صبر برداشت سے کام نہ لے سکو گے“ قدرت کی نئی نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ ان افعال کی تہ تک نہ پہنچنے کی بنا پر انہیں غلط سمجھ کر بالارادہ ان پر اعتراض کرنا ان کا جناب خضرؑ کے نزدیک یقینی تھا جیسا کہ بعد میں وقوع میں آیا اور یہ اس بنا پر تھا کہ حضرت موسیٰؑ اسباب ظاہری پر عمل کرنے ہی کا منصب رکھتے تھے اور جناب خضرؑ خاص طور پر اللہ کی جانب سے باطنی حقیقتوں کے علم کے حامل اور اس کے تقاضا پر عمل کے پابند بنائے گئے تھے۔^[۲]

غالباً یہی اس حدیث کا مقصد ہے جو امام جعفر صادقؑ کی زبانی وارد ہوئی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا معیار علم وہ تھا جو الواح توریت میں قلم بند تھا اور جناب خضرؑ کو وہ علم عطا ہوا تھا جو توریت میں نہیں تھا۔^[۳]

آغاز سفر اور خضرؑ کا کشتی میں سوراخ کرنا اور پھر ایک لڑکے کو قتل کر دینا

فَانْطَلَقَا ۖ حَتَّىٰ إِذَا رَكِبَا فِي السَّفِينَةِ خَرَقَهَا ۖ قَالَ أَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا ۖ

[۱]. قال قتادة قيل لموسى عليه السلام اية لقبك اياها ان تنسى بعض متاعك (تبيين)

[۲]. انما قال له ذلك لان موسى كان يأخذ الامر على ظواهرها والخضر كان يحكم بها علمه الله من بواطن الامر فلا يسهل على موسى مشاهدته ذلك (تبيين)

[۳]. قال الصادق عليه السلام كان عنده علم لم يكتب في الواح وكان موسى يظن ان جميع الاشياء التي يحتاج اليها في تايوتها وان جميع العلم ما كتب له في الواح. (مجمع البيان)

لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا إِمْرًا ﴿٤٥﴾ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٤٦﴾ قَالَ لَا
تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ وَلَا تُرْهِقْنِي مِنْ أَمْرِي عُسْرًا ﴿٤٧﴾ فَانْطَلَقَا ۖ حَتَّىٰ إِذَا لَقِيَا
عُلَمَاءَ فَقَتَلَهُ ۗ قَالَ أَقْتَلْتِ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ ۗ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا نُكْرًا ﴿٤٨﴾

تو وہ دونوں چلے یہاں تک کہ جب کشتی پر بیٹھے تو انہوں نے اس میں سوراخ کر دیا انہوں نے کہا کیا آپ نے اس میں سوراخ کر دیا اس لئے کہ آپ اس کے بیٹھے والوں کو ڈبودیں؟ یہ تو آپ نے بڑی سنگین بات کی انہوں نے کہا میں نے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ ہرگز صبر و تحمل سے کام نہیں لو گے۔ مجھ سے مواخذہ نہ کیجئے ایسی بات پر جو مجھ سے بھولے سے ہو اور نہ کیجئے مجھ پر میری اس بات پر زیادہ سختی اس کے بعد پھر دونوں آگے بڑھے یہاں تک کہ جب ان دونوں کو ایک لڑکا ملا تو ان صاحب نے اسے قتل کر دیا۔ انہوں نے کہا کیا آپ نے ایک پاک جان کو بغیر کسی دوسری جان کے بدلے قتل کر دیا آپ نے بہت بُرا کام کیا۔

پھر دونوں آگے بڑھے یعنی کشتی سے اترے اور اب خشکی پر روانہ ہوئے۔^[۱]

ان آیات میں آغاز سفر اور خطر کا کشتی میں سوراخ کرنا اور پھر ایک لڑکے کو قتل کر دینے کا ذکر آیا ہے۔

قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٤٥﴾ قَالَ إِنْ سَأَلْتِكِ عَنْ

شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصَحِّبْنِي ۖ قَدْ بَلَغْتَ مِنَ لَدُنِّي عُذْرًا ﴿٤٦﴾

”انہوں نے کہا کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر و تحمل نہیں کر سکو گے؟ یہ کہنے لگے کہ اگر اس کے بعد اب میں کسی چیز کے متعلق آپ سے پوچھوں تو مجھے اپنی صحبت میں نہ رکھیے گا، بے شک آپ پہنچ گئے ہیں میری طرف سے معذوری کی حد تک؟

باتیں جو آنکھوں کے سامنے آتی تھیں، وہ تاب صبر باقی نہیں رکھتی تھیں اور بے ساختہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بول اٹھتے تھے۔ پہلی مرتبہ انہوں نے بھول کا عذر کیا اور ایک دفعہ کی بھول پر معافی کی درخواست کی کہ اگر اس دفعہ آپ نے مجھے اپنی صحبت سے جدا کر دیا تو یہ بڑی سختی ہوگی۔ گویا اس دفعہ کی معافی کو وہ اپنا حق سمجھتے تھے مگر جب پھر ایسا ہی ہوا تو اب لجاجت کا انداز پیدا ہو گیا اور اب یہ اقرار کر لیا کہ بس اس دفعہ اور معاف کر دیجئے۔ اس کے بعد پھر اگر ایسا ہو تو آپ مجھ سے علیحدگی اختیار کر لیجئے گا۔” آپ معذوری کی حد تک پہنچ جائیں گے یعنی میرے لئے عذر کی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔

شاہ عبدالقادر نے اس کے متعلق حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں جن سے مقصود ممکن ہے یہی ہو مگر یہ الفاظ بظاہر ادائے مطلب سے قاصر

ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”پوچھنا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھول کر ہوا اور دوسرا اقرار کرنے کو اور تیسرا اخصت کو“ (موضح القرآن)

[۱]. معناہ فخر جامن البحر فانطلقا ہمیشیان فی الدبر (مجمع البیان)

ان الفاظ سے ایسا پتہ چلتا ہے جیسے دوسرا اور تیسرا پوچھنا بھول کر نہیں بلکہ اراداً تھا یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام جان کر ایسی صورت پیدا کر رہے تھے کہ انہیں ساتھ چھوڑنا پڑے مگر ظاہر ہے کہ قرآنی انداز بیان اس کے مطابق نہیں ہے جب کہ اتنی زحمت و مشقت کے ساتھ وہ انتہائی ذوق سے جناب خضر علیہ السلام سے استفادہ علمی کرنے کے آئے تھے اور اس کے لئے اقرار کیا تھا کہ وہ کچھ پوچھیں گے نہیں تو پھر وہ اب جان کر ایسی صورت کیوں پیدا کرتے کہ ان کا ساتھ چھوٹ جائے؟

فَانْطَلَقْنَا حَتَّىٰ إِذَا آتَيْنَا أَهْلَ قَرْيَةٍ اسْتَطَعْنَا أَهْلَهَا فَاذْبَأْنَا أَنْ يُضَيِّفُوهُمَا
فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُرِيدُونَ أَنْ يَنْقُضُوهُ فَاقَامَهُ ط قَالَ لَوْ شِئْنَا لَنَخَذُنَا عَلَيْهِ
أَجْرًا ﴿٤٧﴾ قَالَ هَذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ ۖ سَأُنَبِّئُكَ بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ
عَلَيْهِ صَبْرًا ﴿٤٨﴾

’اس کے بعد دونوں آگے بڑھے یہاں تک کہ ایک بستی والوں کے پاس پہنچے جہاں کے باشندوں سے انہوں نے کچھ کھانے کے لئے مانگا تو انہوں نے انکار کیا اس سے کہ وہ اُن کی مہمان داری کریں تو انہوں نے وہاں ایک دیوار پائی جو گر اچا ہتی تھی..... اُسے بنا کر سیدھا کھڑا کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ آپ چاہتے تو اس کام کا کچھ معاوضہ لے لیتے، انہوں نے کہا بس اب میری اور تمہاری جدائی ہے۔ اب میں تمہیں بتلاؤں دیتا ہوں حقیقت اُن باتوں کی جن پر تم صبر و تحمل سے کام نہ لے سکتے۔‘

جنہوں نے کھانا کھلانے سے انکار کیا ان کے یہاں کی دیوار کی بلا معاوضہ تعمیر:

سابق میں شاہ عبدالقادر کے کلام سے ضمنی طور پر جو مفہوم پیدا ہوا تھا، اُسے انہوں نے یہاں صاف ظاہر کر دیا ہے، وہ کہتے ہیں:

’اب کے موسیٰ علیہ السلام نے جان کر پوچھا رخصت ہونے کو، یہ سمجھ لیا کہ یہ عالم میرے ڈھب کا نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا علم وہ تھا جس میں بیرونی کرے خلق تو اُن کا بھلا ہو۔ حضرت خضر علیہ السلام کا علم وہ کہ دوسرے کو اُس کی بیروی ہی نہ آوے۔‘ (موضح القرآن)

حالانکہ وہ اگر اس ارادہ سے پوچھتے تو وہ یہ کہتے کہ بس جناب! اب مجھے آپ کے ساتھ نہیں رہنا ہے لیکن ایسا نہیں ہے، انہوں نے تو جیسے پہلے اعتراض کیا تھا، حسب عادت اب بھی ساختہ اعتراض کر دیا۔ اس پر اُن کے اس سے پہلے اس اقرار کے مطابق کہ اگر اب ایسا ہو تو مجھے الگ کر دیجیے گا، جناب خضر علیہ السلام نے کہا کہ بس اب میری اور تمہاری جدائی ہے۔

پھر یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو ان افعال کو ایک بلا وجہ کا یا غلط کام سمجھ رہے تھے چنانچہ پہلی دفعہ صاف کہا: لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا أَمْرًا ۗ يٰۤاٰرْتَابِیْ نَعْمَ اَلْعَمَلُ الَّذِیْ اٰتٰی بِکُمْ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا کَبِیْرًا ۗ آپ نے بری بات کی ہے، تیسری دفعہ اُن کے عمل کو بلا وجہ کی زحمت سمجھ رہے تھے تو ابھی ان افعال کے علمی پہلوؤں کا اندازہ کہاں ہوا تھا جو وہ سمجھتے کہ یہ علم ان کے ڈھب کا نہیں ہے۔ علم کا پہلو تو اُس کے بعد نمایاں ہوا ہوا ہے جب حضرت خضر علیہ السلام نے اپنے ان تمام افعال کے وجوہ و اسباب بتائے۔ اس کے بعد جناب موسیٰ علیہ السلام یہ طے کر سکتے تھے کہ یہ علم اُن کے ڈھب کا

ہے یا نہیں۔

پھر اگر وہ اس علم کو اپنے لئے بے کار سمجھ لیتے تو خالق کا وہ مقصد جو اس سفر کے کرانے سے تھا کہ انہیں محسوس ہو کہ مجھ سے بڑھ کر عالم اس روئے زمین پر موجود ہیں، پورا کیوں کر ہوتا۔

أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسْكِينٍ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدْتُ أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ
وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا ٥٩ وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبُوهُ مُؤْمِنًا
فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَكُفْرًا ٦٠ فَأَرَدْنَا أَنْ يُبَدِّلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِمَّنْهُ
زَكَاةً وَأَقْرَبَ رُحْمًا ٦١ وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ
تَحْتَهُ كَنْزٌ لَهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا
وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ٦٢ رَحْمَةً مِّنْ رَبِّكَ ٦٣ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي ٦٤ ذَلِكَ تَأْوِيلُ
مَا لَمْ تَسْطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا ٦٥

’وہ کشتی تھی، وہ کچھ غریبوں کی تھی جو دریا میں کام کرتے تھے تلو میں نے چاہا کہ اُسے ناقص بنا دوں اور ادھر ایک بادشاہ ہے جو ہر (ثابت) کشتی پر زبردستی قبضہ کر لیتا ہے اور وہ جوڑ کا تھا اس کے ماں باپ مومن ہیں تو ہمیں خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ اُن دونوں کو سرکشی اور کفر میں مبتلا کر دے گا تو ہم نے چاہا کہ اُن کا پروردگار انہیں بدلے میں اس کے عطا کرے ایک ایسا لڑکا جو اس سے بہتر ہو پاکیزگی میں اور اس سے بڑھ کر صبر و محبت میں اور وہ دیوار جو تھی تو وہ اس شہر کے دو ۲۰ یتیم بچوں کی تھی اور اس کے نیچے ایک دفینہ تھا اُن دونوں کے لئے اور ان کا باپ نیک آدمی تھا۔ تو تمہارے پروردگار نے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی کی منزل تک پہنچیں اور خود نکالیں اپنے دفینہ کو، تمہارے پروردگار کی مہربانی سے اور یہ میں نے خود اپنی طرف سے نہیں کیا۔ یہ ہے وضاحت اُس کی جس پر صبر و تحمل نہ کر سکے۔‘

جناب خضر علیہ السلام کی طرف سے حقیقتوں کا اظہار

’یہ میں نے خود اپنی طرف سے نہیں کیا‘، گزشتہ تمام باتوں سے متعلق ہو سکتا ہے۔ [۱] یعنی یہ تمام اعمال میرے حکم الہی تھے اور اس کے بعد یہ سوال ختم ہو جاتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک بچہ کی جان کیوں لی؟ میں نے کبھی کبھی اُس کے جواب میں کہا کہ ملک الموت تو ہر لمحہ کنتوں کی جان لے لیا کرتے ہیں۔

[۱] ای ما ذکر من خرق السفینة وقتل الغلام واقامة الجدار (جلالین)

اصل یہ ہے کہ جو خالق جان ہے، وہ اپنی حکمت و مصلحت کی بناء اس جان کا علاقہ اس جسم سے قطع کرتا ہے تو کسی کو اس میں اعتراض کی کیا گنجائش ہے، جیسے ملک الموت اُس کی مشیت کی تکمیل کا ذریعہ ہوتے ہیں ویسے ہی جناب خضر علیہ السلام کی مشیت الہی کی تکمیل کا ذریعہ تھے اس میں کسی کو چوں و چرا کا کیا حق ہے!

اور اگر یہ فقرہ بس آدمی جز یعنی دیوار بنانے سے متعلق ہو تو اس فقرہ کا مطلب یہ ہے جو شاہ عبدالقادر صاحب نے لکھا ہے:

”یعنی جو کام خدا کے حکم سے ہو اور اس کا کرنا ضروری ہو، اُس پر مزدوری نہیں ملتی“ (موضح القرآن)

قرآن مجید کی لفظ موسیٰ علیہ السلام سے عام معلومات کی بناء پر تصور حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام ہی کا ہوتا ہے مگر جناب شیخ الطائف نے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ بن عمران نہیں بلکہ بنی اسرائیل میں ایک اور بزرگ موسیٰ بن یثا تھے۔ یہ واقعہ ان سے متعلق ہے۔ اس قول کے نقل کے بعد لکھا ہے: واللہ اعلم بذلک۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ قول ایسا نہیں ہے جو بالکل ناقابل لحاظ ہو بلکہ اس کی وجہ سے شخصیت کسی حد تک مشتبہ ہو جاتی ہے مگر علامہ طبری نے ابن اسحاق کے حوالہ سے اس کی نسبت اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کی طرف دی ہے اور خود اس سے اختلاف کیا ہے اُسی تبادلہ کی بناء پر جسے ہم نے لکھا ہے۔^[۱]

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْقُرْنَيْنِ ط قُلْ سَأَتْلُوا عَلَيْكُمْ مِنْهُ ذِكْرًا ط
 ”اور وہ لوگ آپ سے ذوالقرنین کے متعلق دریافت کرتے ہیں، کہیے کہ میں ابھی ان کا کچھ تذکرہ تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں۔“

قصہ ذوالقرنین کی ابتداء:

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ”یہ بھی یہود کے سکھانے سے مکہ کے لوگ پوچھتے تھے پیغمبر کے آزمانے کو جیسے اصحاب کہف کا احوال۔ اس بادشاہ کو ذوالقرنین کہتے ہیں، اس واسطے کہ دنیا کے دونوں سروں پر پھر گیا تھا مشرق اور مغرب پر بعض کہتے ہیں یہ لقب سکندر کا ہے، بعض کہتے ہیں کہ کوئی بادشاہ پہلے گزرا ہے“ (موضح القرآن) تفسیر جلالین میں ہے: اسمہ الا سکندر ولہ یکن نبیاً: اس کا نام سکندر ہے اور پیغمبر نہ تھا۔

”ذوالقرنین کے ساتھ وجہ تسمیہ میں شاہ صاحب نے جو لکھا ہے، یہ ایک قول ہے جسے جناب شیخ الطائف نے پانچ قولوں کے آخر میں درج کیا ہے، پہلے چار قول یہ ہیں:

- (۱) ان کے سر پر دو سینگوں کی شکل والی ایک چیز تھی۔
- (۲) ان کے سر پر دونوں جانب تلوار پڑی تھی۔
- (۳) ان کے دو گیسو تھے۔
- (۴) قرنی الشمس یعنی آفتاب کے طلوع و غروب کے نطقوں کا انہوں نے مشاہدہ کیا جس کا ذکر یہیں پر قرآن مجید میں موجود ہے۔

[۱] الذی علیہ الجمہور اثنہ موسیٰ بن عمران وان اطلاقہ یوجب صرفہ الی موسیٰ بن عمران کما ان اطلاق محمد ینصرف الی نبینا ﷺ (مجمع البیان)

علامہ طبرسی نے ان کے علاوہ بھی کچھ اقوال نقل کیے ہیں، ان کے یہاں ایک بیش قیمت اضافہ ہے کہ انہوں نے اس قول کی تائید میں کہ ان کے سر پر دو مرتبہ ضربت پڑی تھی، حضرت امیر المؤمنین علیؑ کی طرف منسوب ایک حدیث بھی درج کی ہے۔^[۱]

ان کا نبی ہونا ہمارے یہاں بھی کوئی طے شدہ مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس علوی حدیث کا ظاہری یہی ہے کہ وہ پیغمبر نہ تھے، صرف اللہ کے ایک نیک بندے تھے مگر آئندہ الفاظ قرآنی سے ہمارا یہ رجحان ظاہر ہوگا کہ ان سے جناب ذوالقرنین کے نبی ہونے کا ہی استفادہ ہوتا ہے۔

إِنَّا مَكْنَانُهُ فِي الْأَرْضِ وَآتَيْنَهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ۗ فَاتَّبَعِ سَبَبًا ۗ حَتَّىٰ إِذَا
بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ ۖ وَوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۗ قُلْنَا
يٰۤا قُرْآنِ إِنَّمَا أَنْتَ تُعَدِّبُ وَإِنَّمَا أَنْتَ تَتَّخِذُ فِيهِمْ حُسْنًا ۗ قَالَ أَمَّا مَنْ ظَلَمَ
فَسَوْفَ نُعَذِّبُهُ ثُمَّ يُرَدُّ إِلَىٰ رَبِّهِ فَيُعَذِّبُهُ عَذَابًا نُكْرًا ۗ وَأَمَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ
صَالِحًا فَلَهُ جَزَاءٌ الْحُسْنَىٰ ۗ وَسَنَقُولُ لَهُ مِنْ أَمْرِنَا يُسْرًا ۗ

”ہم نے اُسے زمین میں اقتدار عطا کیا، اور اسے ہر چیز کے لئے ذریعہ عطا کیا، تو اُس نے ایک ذریعہ سے کام لیا یہاں تک کہ جب وہ پہنچا سورج کے ڈوبنے کی جگہ تو پایا اُسے کہ وہ ڈوبتا ہے ایک ٹیالے چشمے میں اور اس کے پاس ایک قوم کو پایا۔ ہم نے کہا کہ اے ذوالقرنین! یا تو تم سزا دو اور یا اُن سے حسن سلوک کا طریقہ اختیار کرو۔ اس نے کہا کہ جو کوئی ظالم ہوگا اور جو ایمان لائے گا اور نیک اعمال کرے گا اسے اچھا صلہ ملے گا اور اپنے معاملہ میں ہم اس کے لئے آسانی کریں گے۔“

سبب کے لفظی معنی رسی کے بھی ہوتے ہیں اور جس پر کوئی اثر مرتب ہو، اسے بھی سبب کہتے ہیں۔ بہر صورت ذریعہ کی لفظ کے ساتھ اس کا ترجمہ درست ہے جس پر سبب تفسیریں منطقی ہوتی ہیں۔^[۲]

”زمین میں اقتدار عطا کیا اور ہر چیز کا ذریعہ دیا۔“ یہاں تک تو صرف بادشاہت ہی سمجھ میں آتی ہے لیکن بعد کے الفاظ کہ ہم نے ان سے یوں کہا اور انہوں نے یہ جواب دیا، ان سے بظاہر نبوت ثابت ہوتی ہے۔ جناب شاہ ولی اللہ صاحب نبوت کے منکر ہیں۔ اس لئے انہوں نے اسے مخاطب اور اس کے جواب پر محمول کرنے کے بجائے یہ کہا ہے کہ: ”اِس كُنَايَتِ اسْتِ از قَدْرَتِ او بَرِيں دُو كَارُ“ (فتح الرحمن)

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ارشاد کہ ”ہم نے کہا کہ خواہ تم سزا دو یا معاف کرو“ یہ کہنا زبان حال سے ہے یعنی اس کے ہاتھ میں یہ دونوں

[۱] عن علي بن ابي طالب عليه السلام انه كان عبدا صالحا احبب الله و احبته الله و ناصح الله و ناصحه الله امر قومہ بتقوى الله فصر بوه على قرنه ضربة بالسيف فغاب عنهم ما يشاء الله ثم رجع اليهم فدعاهم الى الله فصر بوا على قرنة الاخر بالسيف فذلك قرناه (مجمع البيان)

[۲] سببا طريقا يوصل الى مرادة (جلالين) يقال للطريق الى الشئ سبب وللجبل سبب وللباب سبب (تبيان) ازهر چيز ساماني (شاہ ولی اللہ) ہر چیز سے راہ (شاہ رفیع الدین)

باتیں تھیں تو گویا اس سے کہہ رہی تھی کہ چاہے یوں کرو یا یوں کرو۔ اس صورت میں وہ جواب بھی لفظی نہیں ہوگا بلکہ عملی ہوگا یعنی اس نے رو یہ ایسا اختیار کیا کہ جو مجرم اور گنہگار ہوتا تھا، اس کے ساتھ وہ سختی کرتا تھا لیکن جو مومن اور نیکو کار ہوتے تھے، ان کے ساتھ وہ حسن سلوک کرتا تھا۔ الفاظ قرآنی کا ظاہری مفہوم یہ نہیں لیکن اگر دلائل عقلی یا نقلی مجبور کریں تو تاویل کی جاسکتی ہے اور چونکہ ہمارے علم میں کوئی عقلی و نقلی دلیل نبوت ذوالقرنین کے خلاف نہیں ہے، اس لئے بلا ضرورت تاویل کے کوئی معنی نہیں۔

شاہ عبدالقادر بھی یہاں اپنے والد ہی کے نقش قدم پر چلے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

”اس کو یہ کہا یعنی دونوں بات کی قدرت دی۔ ہر بادشاہ کو ہر حاکم کو قدرت ملتی ہے، چاہے خلق کو ستاوے، چاہے اپنی خوبی کا ذکر جاری رکھے۔“ (موضح القرآن)۔ لیکن جلالین نے قلنا یا ذوالقرنین کے ساتھ لکھا ہے: بالہام یعنی یہ پیغام الہام کے ذریعہ سے پہنچایا۔ اس کے بعد بھی نبوت ضروری نہیں ہے، ہاں ایک مرد صالح ہونا ان کا ظاہر ہوگا، جو ان کے کردار سے بھی، جو قرآن نے اس آیت کے آخر میں پیش کیا ہے، ظاہر ہے۔ علامہ طبرسی فرماتے ہیں کہ جو لوگ نبوت کے قائل ہیں، وہ ارشاد بانی کو اس وحی کی طرح مانتے ہیں جو انبیاء پر ہوتی ہے اور منکر نبوت ہیں، وہ وحی کے معنی الہام کے سمجھتے ہیں، جیسا کہ مادر موسیٰ کے لئے آیا ہے وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ ہم نے مادر موسیٰ کی طرف بھیجی۔“ (قصص ۷)۔ بہر صورت ہم اپنا خیال پہلے لکھ چکے ہیں کہ الفاظ قرآنی اسی طرح کی گفتگو کو بتاتے ہیں جو انبیاء سے ہوتی ہیں اور نبی نبوت ذوالقرنین کی اب تک کوئی دلیل میری نظر سے نہیں گزری۔ اس لئے ظاہر قرآن سے عدول کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

ہاں اب ارشاد دالی کی نوعیت پر غور کرنا ہے۔ یہ ارشاد کہ اِمَّا اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّا اَنْ تَنْخِذَ فِيهِمْ حُسْنًا حکم تکلفی تو ہونے لگتا ہے کہ خالق کی طرف سے دونوں باتیں جائز قرار دی جا رہی ہوں کیوں کہ مطلق تعذیب کسی قوم کی بلا تفریق گنہگاروں بے گنا خالق کی جانب سے جائز نہیں ہو سکتی۔ اب اگر اس کے معنی صرف خبر کے سمجھے جائیں کہ تم کو دونوں باتوں کی قدرت حاصل ہے تو اس میں کوئی افادیت نہ ہوگی جب تک ایک کڑی مضمزنہ مانیں جو میرے خیال میں ظاہر ہے۔ اس لئے اس کے اضما میں کوئی حرج نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ کہنے کے ساتھ کہ ان دونوں باتوں کی تمہیں قدرت حاصل ہے، خالق انتباہ فرماتا ہے کہ اب تمہارا امتحان ہے اور دیکھنا ہے کہ تم کیا کرتے ہو۔ جناب ذوالقرنین علیہ السلام کا جواب بھی اس سے بالکل مرتبط ہے۔ ”آفتاب ٹیالے چشمے میں ڈوبتا ہے، یہ سائنس اور فن بیت و ریاضی کے لحاظ سے مشکل چیز ہے۔ اس لئے شاہ ولی اللہ نے اس کے تحت میں یہ فقرہ لکھا ہے ”یعنی بحسب نظر مردمان“۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کسی حقیقت واقعہ کا اظہار نہیں ہے بلکہ سورج کے ڈوبنے کی جو شکل آنکھوں کو نظر آتی ہے، وہ یہی ہے کہ پانی میں ڈوبتا ہے جس کا سمندر کا سفر کرنے والے جہاز پر سے برابر مشاہدہ کرتے ہیں۔ تفسیر جلالین میں بھی یہی ہے کہ:

غروبها في العين في رأي العين، والأفهي اعظم من الدنيا

پانی میں اس کا ڈوبنا آنکھ کے مشاہدہ میں ہے ورنہ حقیقت میں تو وہ اس دنیا سے بڑا ہے۔ جناب شیخ الطائف نے بس دو قول نقل کر دیئے ہیں، خود کچھ نہیں فرمایا ہے، مگر شاہ عبدالقادر صاحب جو لکھ رہے ہیں، اس کا مطلب کچھ سمجھ میں نہیں آتا، وہ فرماتے ہیں: مغرب کی طرف اُس جگہ پہنچا کہ دلدل تھی۔ نہ گزر آدمی کا، نہ کشتی، اللہ کے ملک کی حد نہ پاسکا، (موضح القرآن) مگر قرآن تو یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ وہ ٹیالے چشمے تک پہنچ کر رہ گئے ہیں۔ وہ تو کہہ رہا ہے کہ انہوں نے سورج کو پایا ٹیالے چشمے میں ڈوبتا ہوا۔ اس پر شاہ صاحب کی تفسیر کہاں منطبق ہوتی ہے۔

ثُمَّ اتَّبَعَ سَبَبًا ﴿٨٩﴾ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطَّلُعُ عَلَىٰ قَوْمٍ لَّمْ

نَجْعَلْ لَهُم مِّن دُونِهَا سِتْرًا ﴿٩٠﴾ كَذٰلِكَ ؕ وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿٩١﴾

”پھر اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا، یہاں تک کہ جب وہ سورج نکلنے کی جگہ تک پہنچا تو پایا اُسے کہ وہ نکلتا ہے ایک ایسی قوم پر کہ نہیں رکھا ہے ہم نے اُن کے لئے اس سے کوئی پردہ۔ ایسا ہی تھا اور ہم جو کچھ اُس کے پاس ہے، اُس پر حاوی ہیں۔“

”نہیں رکھا ہے ہم نے اُن کے لئے اُس سے کوئی پردہ“ اس کے ذیل میں شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ”شاید وہ لوگ جنگلی سے ہوں گے کہ گھر بنانا اور چھت ڈالنا ان میں دستور نہ ہوگا“ (موضح القرآن) تفسیر جلالین میں ہے:

هم الزنج..... ارضهم لا تحمل بناء ولهم سروب يغيبون فيها عند طلوع الشمس و يظهرون عند ارتفاعها.

یہ قوم زنج کے لوگ تھے۔ ان کی سرزمین کسی عمارت کو برداشت نہیں کر سکتی اور اُن کے یہاں سرنگیں ہوتی تھیں کہ سورج نکلنے کے وقت وہ اُن میں داخل ہو جاتے تھے اور جب سورج بلند ہوتا تھا تو وہ نکل آتے تھے۔ تیان میں شیخ طوسی کا بیان بھی اسی کے مطابق ہے، حالانکہ یہ ایسی بات معلوم ہوتی ہے۔ اگر تمازت آفتاب سے بچتا ہے تو سورج اونچے ہونے کے بعد سرنگوں میں داخل ہونا چاہیے۔ ممکن ہے کہ پہلے جس کے قلم سے یہ الفاظ نکلے اس نے غلطی سے عند غروبہا کے بجائے عند ارتفاعها لکھ دیا، پھر یہ غلطی رواں ہو گئی۔ علامہ طبری فرماتے ہیں:

معناه انه لم يكن بها جبل ولا شجر ولا بناء لان ارضهم لم يكن يثبت عليها بناء فكانوا اذا طلعت الشمس يغورون في المياة والاسراب واذا غربت تصرفوا في امورهم. (مجمع البيان)

اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سرزمین پر پہاڑ نہ تھے اور نہ کوئی درخت اور نہ کوئی عمارت، اس لئے کہ اُن کی زمین پر کوئی عمارت قائم نہیں ہو سکتی تھی تو جب آفتاب نکلتا تھا تو وہ پانیوں میں اور سرنگوں کے اندر چلے جاتے تھے اور جب ڈوبتا تھا تو اپنے کاموں میں مصروف ہوتے تھے۔ اس کے بعد ابوبصیر کی روایت امام محمد باقر علیہ السلام سے درج کی ہے کہ انہیں گھر بنانے کا فن نہیں آتا تھا چنانچہ ہماری قدیم تفسیر میں بھی یہی ہے کہ لم يعلموا صنعه البناء یعنی انہیں تعمیر کا کام آتا نہیں تھا (علی ابن ابراہیم)

ثُمَّ اتَّبَعَ سَبَبًا ﴿٩٢﴾ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُونِهِمَا قَوْمًا لَّا

يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا ﴿٩٣﴾ قَالُوا يَا قَرْنَيْنِ إِنَّ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مُفْسِدُونَ

فِي الْأَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلَىٰ أَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿٩٤﴾

”پھر ایک اور راستہ اختیار کیا یہاں تک کہ جب وہ اُن دونوں رکاوٹ والی دیواروں کے بیچ میں پہنچا تو اُن دنوں کے ادھر ایک قوم کو پایا جو تقریباً کوئی بات سمجھتے ہی نہیں تھے۔ انہوں نے کہا اے ذوالقرنین! یا جوج اور ماجوج

دنیا میں فساد کرنے والے ہیں تو کیا ہم آپ کے لئے کچھ رقم مقرر کر دیں اس شرط پر کہ آپ ہمارے اور ان کے بیچ میں ایک رکاوٹ کی دیوار بنا دیجئے۔“

یا جوج و ما جوج کا ذکر:

پہلی جو رکاوٹ والی دیواروں کا ذکر ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ کوئی مصنوعی قسم کی دیواریں نہیں بلکہ وہ ”دو آڑ دو پہاڑ تھے اُس ملک میں“ (موضح القرآن) یہ تفسیر جلالین سے ماخوذ ہے کہ اُس میں لکھا ہے:

جبلان بمنقطع بلاد الترت سد الا سکندر ما بینہما (جلالین)

یہ دو پہاڑ تھے ترکوں کے شہر کے ختم ہونے پر جن کے بیچ کے راستے کو سکندر نے بند کر دیا

جناب شیخ الطائفہ کا بیان بھی اس کے مطابق ہے جس کے لئے صدر اسلام کے مفسرین کا انہوں نے حوالہ دیا ہے۔

ہما الجبلان الذان جعل الترد ما بینہما فی قول ابن عباس وقتنادة والضحاك (تبیان)

وہ دو پہاڑ تھے جن کے درمیان دیوار اٹھائی گئی، یہ ابن عباس، قتادہ اور ضحاک کا قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ رکاوٹیں اُس وقت وجود نہیں رکھتی تھیں بلکہ ان رکاوٹوں کا ذکر اس جگہ کے تعارف کے طور پر ہے یعنی اُس جگہ پہنچے جہاں اس کے بعد رکاوٹ کے لئے دو دیواروں کی تعمیر ہوئی، اگر یہ رکاوٹ اُس وقت موجود ہوتی تو وہ یہ خواہش ہی کیوں کرتے کہ رکاوٹ کے لئے دیوار بنا دیجئے۔^[۱]

قَالَ مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ۝
أَتُونِي زُبَرَ الْحَدِيدِ ۙ حَتَّىٰ إِذَا سَاوَى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوا ۙ حَتَّىٰ إِذَا
جَعَلَهُ نَارًا ۙ قَالَ أَتُونِي أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ۙ فَمَا اسْطَاعُوا أَن يَظْهَرُوهُ وَمَا
اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا ۝۹۵

”انہوں نے کہا جو مجھے اللہ نے وسعت عطا کی ہے وہ بہتر ہے، بس تم جسمانی طاقت کے ساتھ میری مدد کرو تو میں تمہارے اور ان کے درمیان ایک موٹی دیوار بنا دوں گا۔ لاؤ میرے پاس لوہے کے ٹکڑے یہاں تک کہ جب انہوں نے دونوں پہاڑوں کے درمیانی حصہ کو برابر کر لیا، کہا کہ پھونکو اس میں یہاں تک کہ جب اُسے آگ بنا دیا تو کہا کہ لاؤ میں اس پر ڈالوں پگھلاتا بنا تو وہ اس پر چڑھ نہیں سکے اور نہ اُس میں سوراخ کر سکے۔“

دیوار کے بنانے کی ترکیب جو قرآن نے بتائی ہے، اس کی تشریح شاہ عبدالقادر یوں لکھتے ہیں:

”اول لوہے کے بڑے بڑے تختے بنائے، ایک پر ایک دھرتا گیا کہ دونوں پہاڑوں کے برابر ملا دیا، پھر تانبہ پگھلا کر اس کے اوپر سے

ڈالا اور وہ درزوں میں بیٹھ کر جم گیا، سب مل کر ایک پہاڑ سا ہو گیا“ (موضح القرآن)

[۱] قبیل اراہا بالسندان الموضع الذی فیہ السندان البیومر لاثہ لوکان هناك سد لدہ لحد یکن لطلبہم السد معنی (مجمع البیان)

قَالَ هَذَا رَحْمَةٌ مِنْ رَبِّي ، فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَّاءَ ، وَكَانَ وَعْدُ رَبِّي

حَقًّا ۝۹۸

”انہوں نے کہا یہ میرے پروردگار کی مہربانی ہے تو جب میرے پروردگار کی طرف مقرر کردہ میعاد ہو جائے گی تو وہ اسے صاف چٹیل میدان [۱] کر دے گا اور میرے پروردگار کا وعدہ سچا ہے۔“
مقرر کردہ میعاد کے معنی یہی سمجھے گئے کہ اس سے قیامت مراد ہے اور اس دیوار کا ٹوٹنا یا جوج و ماجوج کا نکلنا علامات قیامت میں سے قرار پا گیا ہے، ترتیب بیان قرآن کے لحاظ سے اس کے بعد نفع صورتوں کا ذکر اس خیال کی تقویت کا باعث ہے۔

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَجَمَعْنَاهُمْ بِجَمْعٍ ۝۹۹

وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِلْكَافِرِينَ عَرْضًا ۝۱۰۰ الَّذِينَ كَانَتْ أَعْيُنُهُمْ فِي غِطَاءٍ

عَنْ ذِكْرِي وَكَانُوا لَا يَسْتَطِيعُونَ سَمْعًا ۝۱۰۱

”اور اس دن ہم انہیں چھوڑ دیں گے ایک دوسرے کے ساتھ تھپیڑے مارتے ہوئے اور صور پھونک دیا جائے گا تو ان سب کو پورے طور پر ہم اکٹھا کر دیں گے اور اُس دن دوزخ کو کافروں کے سامنے پورے طور پر لے آیا جائے گا، جن کی آنکھیں میری یاد سے پردہ میں رہیں اور وہ سن نہیں سکتے تھے۔“
”اُس دن ہم انہیں چھوڑ دیں گے تھپیڑے مارتے ہوئے۔“ اس میں دو احتمال ہیں یہ بھی کہ وہ بیچ کی رکاوٹ دور ہو جائے گی، تو یا جوج و ماجوج اپنی کثرت تعداد کے ساتھ تھپیڑے مارتی ہوئی سمندر کی لہروں کی طرح چاروں طرف پھیل جائیں گے اور یہ بھی کہ تمام دوسری مخلوق باہمی اختلافات و تصادمات سے اُس وقت اس عالم میں ہوگی۔ [۲]

أَنحَسِبَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ يَتَّخِذُوا عِبَادِي مِنْ دُوْنِي أَوْلِيَاءَ ۗ إِنَّا أَعْتَدْنَا

جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ نُزُلًا ۝۱۰۲

”تو کیا انہوں نے کہ جو کافر ہیں ایسا ہی سمجھتا ہے کہ وہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو سرپرست بنائیں؟ بلاشبہ ہم نے کافروں کی مہمانی کے لئے دوزخ کو تیار کر رکھا ہے۔“

ایک تفسیر کے لحاظ سے ”نُزُلًا“ کے معنی ”مُنزَل“ کے ہوتے ہیں۔ [۳] مگر دوسری تفسیر وہ ہے جس کے مطابق میں نے ترجمہ کیا ہے [۴]

[۱] ای مد کو کا... تریا بالارض من قولهم نافتة دكاء (لا سنام لها) (تبیان)

[۲] تر کنیا جوج و ماجوج یوم القضاء امر السندیمو جون فی الدنیا مغلطین لکثر تبهم وقیل انہہ اراد سائر الخلق۔ (مجمع البیان)

[۳] ای ماوی و منزلا (تبیان)

[۴] ای ہی معدہ لهم كالنزل المعدل للضعيف (جلالین)

اسے علامہ طبرسی نے بطور نقل قول کے درج کیا ہے۔^[۱] مگر میرے نزدیک وہ مجاورہ عرب سے زیادہ قریب ہے۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝۱۴۱ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا
وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝۱۴۲ أُولَئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ
وَلِقَائِهِ فَمَبْطُطْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزَنًا ۝۱۴۳ ذَلِكَ جَزَاءُ هُمُ
جَهَنَّمَ بِمَا كَفَرُوا وَاتَّخَذُوا الْبَيْتَ وَرُسُلِي هُزُوًا ۝۱۴۴

”کہیے کیا ہم تم لوگوں کو بتائیں کہ اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ گھائے میں کون ہیں؟ وہ لوگ جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں اکارت گئی حالانکہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اچھے اعمال کر رہے ہیں، یہ وہ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی آیات اور اُس کی بارگاہ میں حاضری کا انکار کیا تو اُن کے اعمال اکارت گئے۔ اب ہم روزِ قیامت اُن کا کوئی وزن نہ سمجھیں گے۔ یہ ان کی سزا ہے۔ دوزخ، اس کی وجہ سے کہ انہوں نے کفر کیا اور میری آیات اور میرے پیغمبروں کا مذاق اڑایا۔“

اس زمانہ کے بعض مفکرین کے اس تصور کا جو کافی پھیلتا جاتا ہے کہ نجات کے لئے اعمال کافی ہیں عقائد چاہے جو بھی ہوں، ذرا ان آیات کو سامنے رکھ کر جائزہ لیجئے۔ یہ اعمال جن کے اکارت ہونے کا ذکر قرآن کر رہا ہے، کیا فسق و فجور کی قسم کے برے اعمال ہیں؟ یہ تو ہیں باعثِ سزا۔ ان کے اکارت ہونے کے کوئی معنی نہیں۔ جی یہ اعمال جن کا ذکر قرآن کر رہا ہے، بڑے اچھے اچھے کام ہیں اور اس لئے ان کے کرنے والے ان پر حسن انجام اور جزاء کے امیدوار ہیں مگر کفر و انکار کی بنا پر قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ ان اعمال کی کوئی جزا نہیں ہوگی بلکہ انجامِ عذابِ دوزخ کی صورت میں سامنے آئے گا اور اس لئے ان کو سب سے زیادہ خسارے میں کہا جا رہا ہے۔ اگر اعمال نیک کیے ہی نہیں تو خسارہ کا ہے کا؟ سرمایہ فراہم کیا ہی نہیں، خسارہ تو یہ ہے کہ پوری عمر ریاضت اور بخیال خود عبادت اور خدمتِ خلق وغیرہ میں گزاری مگر نتیجہ میں وہ سب بے کار ہوا اور اس کا ثمرہ کچھ نہیں ملا۔

اُمم سابقہ میں اس کی مثال میں یہود و نصاریٰ کے تارک الدنیا عابدوں کو کہا گیا ہے اور اس امت میں اس کی نمایاں مثال خوراج نہروان تھے جن زہدہ تقویٰ اور عبادت و ریاضت کو شہرہ آفاق مثالی حقیقت حاصل تھی مگر نص رسول ﷺ کے مطابق ان کا اسلام سے کوئی لگاؤ نہیں رہ گیا تھا۔^[۲] مگر یہ حکم ان جماعتوں سے مخصوص نہیں ہے، ہر شخص کو اپنے گرد و پیش میں بخیال خود عبادت میں غیر معمولی مشقتیں اٹھانے والے ملیں گے۔ آپ کو ان پر کتنا ہی ترس آئے کہ انہو، اتنی محنت یہ کرتے ہیں اور یہ بربادی ہوگی، مگر کیا کیا جائے کہ جو ثواب عطا کرنے والا ہے، اُس نے

[۱] قبیل معناہ انا جعلنا جہنم معدۃ مہتیا للکافرین عندنا کما یہیا النزل للضعیف (مجمع البیان)

[۲] قبیل اثمہم الیہود والنصارى و قبیل اثمہم الرہبان منهم وروی عن امیر المؤمنین علیہ السلام انه قال ہم اهل حروراء من الخوارج فسألہ ابن الکواء عن ذلك فقال لا بنت واصحابک منهم (تبیان) روی العیاشی باسنادہ قال قام ابن الکواء الی امیر المؤمنین علیہ السلام سالہ عن اهل هذه الایة فقال اولئك اهل الكتاب کفروا برّبهم وابتدعوا فی دینہم فمبیط اعمالہم وما اهل التہر منهم ببعید یعنی الخوارج (مجمع البیان)

اپنے ثواب کو جس شرط کے ساتھ مقید کر دیا ہے وہ ان میں مفقود ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿١٧٤﴾

خَلِيدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿١٧٨﴾

’یقیناً وہ جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال کیے، ان کے لئے سامانِ مہمانی میں فردوس کے بہشت ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، وہاں سے منتقل ہونا نہ چاہیں گے۔‘

قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مَدَادًا لِكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي

وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا ﴿١٧٩﴾

’کہیے کہ اگر سمندر روشنائی ہو جائے تو میرے پروردگار کے کلموں کے لئے تو سمندر ختم ہو جائے قبل اس کے کہ میرے پروردگار کے کلمے ختم ہوں، چاہے ہم ویسا ہی ایک اضافہ کے لے آئیں۔‘

یعنی ایک سمندر کے ختم ہونے پر دوسرے سمندر کا اس میں اضافہ بھی کر دیا جائے تو وہ کلمات رب کے لکھنے کے لئے کافی نہ ہوگا۔ کلمات الہی سے کیا مراد ہے؟ اس کے لئے علامہ طبرسی نے متعدد اقوال نقل کیے ہیں مگر کوئی بھی معصوم کی طرف مستند نہیں ہے۔

قُلْ ائِمَّا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ اِلَىٰ ائِمَّا اِلَهُكُمْ اِلَهٌ وَّاحِدٌ ؕ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا

لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ اَحَدًا ﴿١٨٠﴾

’کہیے کہ میں تو بس تمہاری طرح ایک انسان ہوں (ہاں ایسا) جس کی طرف یہ پیغام آئے کہ تمہارا خدا ایک اکیلا خدا ہے، تو جو شخص اپنے پروردگار سے ملنے کی امید رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ نیک اعمال انجام دیتا رہے اور اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔‘

اس آیت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامِ بشریت کو بیان کیا گیا ہے۔

سُورَةُ مَرْيَمَ

مکیہ ۹۸ آیات

اگرچہ جناب مریم سلمہ اللہ علیہا کا تذکرہ قرآن مجید کے دوسرے سوروں میں بھی آیا ہے مگر جتنی تفصیل کے ساتھ اس سورہ میں ذکر ہوا ہے کہیں نہیں ہے۔ اس لئے اس سورہ کا نام ان خاتونِ معصومہ کی طرف نسبت کے ساتھ ہو گیا۔ اس کے علاوہ اس سورہ میں جو مضامین درج ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

سورہ مریم کے خاص خاص مضامین:

- ۱..... جناب زکریا علیہ السلام کی دعا، اس کی قبولیت اور جناب یحییٰ علیہ السلام کی ولادت۔
- ۲..... حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اوصاف و کمالات کے تذکرہ کے ساتھ ان کے ابن اللہ ہونے کی رو۔
- ۳..... حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تبلیغ اور اپنے منہ بولے باپ سے گفتگو
- ۴..... حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر
- ۵..... جناب اسماعیل علیہ السلام صادق الوعد کا ذکر جو اس سورہ کے مختصات میں سے ہے۔
- ۶..... جناب ادریس علیہ السلام کا ذکر اور ان کی عالم بالا میں رفعت کا ذکر، یہ بھی بس اسی سورہ میں ہے۔
- ۷..... باغمائے بہشت کے اوصاف
- ۸..... اثبات معاد
- ۹..... دوزخ کی طرف سے عمومی طور پر گزر۔ یہ بھی اسی سورہ میں ہے۔
- ۱۰..... ثبوت شفاعت
- ۱۱..... یہ کہ اللہ کے لئے اولاد کا تصور شان الوہیت کے خلاف ہے۔
- ۱۲..... ایک خاص اوصاف بلند رکھنے والی جماعت کی محبت فرض قرار دیے جانے کا پیشگی اعلان، جس کا نفاذ آئیہ موڈت سے ہوا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

”سہار اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

كَهَيْعِصَ ۝۱ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدًا زَكِرْتَا ۝۲ اِذْ نَادَى رَبَّهُ نِدَاءً خَفِيًّا ۝۳ قَالَ

رَبِّ اِنِّى وَهَنَ الْعَظْمُ مِئِّى وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا وَلَمْ اَكُنْ بِدُعَايِكَ رَبِّ شَقِيًّا ﴿٥٠﴾ وَاِنِّى خِفْتُ الْمَوَالِىَ مِنْ وَّرَآءِى وَكَانَتْ اِمْرَاَتِى عَاقِرًا فَهَبْ لِى مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا ﴿٥١﴾ يٰرَبِّ ثُنِّى وَيَرِّثْ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۗ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ﴿٥٢﴾

”کاف-ہا-یا-عین-صاد- ذکر ہے آپ کے پروردگار کی رحمت کا اپنے بندے زکریا پر، جب کہ انہوں نے اپنے پروردگار کو چپکے چپکے پکارا۔ کہا اے میرے پروردگار! یقیناً میرا عالم یہ ہے کہ میری ہڈیاں کمزور ہو چکی ہیں اور سر میں بڑھاپے سے شعلے بھڑک اٹھے ہیں اور میں تجھ سے اے میرے پروردگار! دعا کر کے بے نصیب تو (کبھی) نہیں رہا ہوں، اور بلاشبہ میں اپنے عزیزوں سے ڈرتا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔ اب تو ہی عطا کر مجھے اپنی طرف سے ایک وارث جو میرا ترکہ پائے اور یعقوب کی اولاد کا ترکہ پائے اور اسے اے میرے پروردگار! اپنی پسند کے قابل بنا؟“

جناب زکریا علیہ السلام کی دعا اور میراث انبیاء کا ثبوت:

آخری فقرہ آیت کا انہیں یاد رکھنا چاہیے جو ایک ساختہ و پرداختہ حدیث کے معتقد ہیں کہ:

نحن معاشر الانبياء لانورث ولا نورث: ہم گروہ انبیاء نہ کسی کا ورثہ پاتے ہیں اور ہمارا ورثہ کسی کو ملتا ہے۔

اگر ایسا ہوتا تو حضرت زکریا علیہ السلام اپنی دعائیں ترکہ کا ذکر زبان پر کیوں لاتے؟ اور کہا جائے کہ ترکہ سے مراد علم ہے [۱] تو علم کیا چرانے یا غصب کرنے کی چیز ہے جو اس کے متعلق دور کے عزیزوں سے کوئی اندیشہ ہو؟ یہ اندیشہ صاف اس کا ثبوت ہے کہ وہ ترکہ از قبیل اموال اور اگر کہا جائے کہ یہ اندیشہ تخریب دین کا ہے [۲] تو دین کی حفاظت کے لئے انہی کے ہاں اولاد ہونے کی کیا ضرورت ہے؟! اسکے لئے کوئی شخص اس نبی سے خاندانی تعلق نہ رکھتا ہو اور نظر خالق میں ان اوصاف کا حامل ہو، مبعوث ہو سکتا ہے اور دین کی حفاظت کر سکتا ہے۔

چونکہ جناب زکریا خود بھی نبی ہیں اور جس فرزند کے پیدا ہونے کے لئے دعا ہے، وہ بھی نبی ہوگا، تو یہ آیت دونوں جزوؤں کو خود ساختہ حدیث کے باطل کر دیتی ہے یعنی یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبی وارث ہوتا بھی ہے اور دوسرے کو اس کی میراث پہنچتی بھی ہے اور چونکہ جو سچی حدیث ہو وہ قرآن کے خلاف کبھی نہیں ہو سکی، لہذا ماننا پڑے گا کہ وہ حدیث غلط ہے جو صرف دستبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو باپ کی میراث سے محروم کرنے کے لئے وضع کی گئی تھی۔

ہمارے قدیم اکابر علماء و مفسرین نے بھی اس آیت کو اس باب میں مرکز استدلال قرار دیا ہے،

چنانچہ شیخ الطائفہ فرماتے ہیں:

[۱] العلم والنبوة (جلالین)

[۲] خفت الموالى على الدين ان يضيعوه (جلالین)

فی الآية دلالة علی ان الانبیاء یورثون المال بخلاف ما یقول من خالفنا انهم لا یورثون لان زکریا صرح بدعائه و طلب من یرثه و یحجب بنی عمه و عصبته من الولد و حقیقة المیراث انتقال ملک المورث الی ورثه بعد موته بحکم الله و حمل ذلك علی العلم و النبوة علی خلاف الظاهر لان النبوة و العلم لا یورثان لان النبوة تابعة للمصلحة لامدخل النسب فیها و العلم موقوف علی من یتعرض له و یتعلمه علی ان زکریا انما سأل ولیا من ولده یحجب موالیه من بنی عمه من المیراث و ذلك لا یلیق الا بالمال لان النبوة و العلم لا یحجب الولد غیره بحال علی ان اشتراطه ان یجعله رضیاً لا یلیق بالنبوة لان النبوة لا یكون الا مرضیاً معصوما فلا معنی لمسئلته ذلك و لیس كذلك المال لانه یرثه الرضی و غیر الرضی. (تبیان ج. ۵ ص ۱۰۶)

یہ آیت اس امر کی دلیل ہے کہ انبیاء کی میراث مال میں ورثہ کو ملتی ہے برخلاف ہمارے مخالفین کے جن کا قول یہ ہے کہ ان کی میراث ورثہ کو نہیں ملتی، اس لئے کہ جناب زکریا نے اپنی دعا میں صراحت کی ہے اور خواہش کی ہے ایسے فرزند کی جو ان کا وارث ہو اور چچا زاد بھائیوں اور دوسرے ان کے عزیزوں کو محبوب کر دے۔ اور میراث کی حقیقت مورث کے مال کا منتقل ہونا ہے اس کے ورثہ کی طرف، اس کے مرنے کے بعد حکم الہی سے اور اسے محمول کرنا علم اور نبوت پر ظاہر الفاظ قرآنی کے خلاف ہے اس لئے کہ نبوت اور علم میں میراث نہیں ہوتی کیونکہ نبوت تو مصلحت کی پابند ہے، اس میں کسی رشتہ کا دخل نہیں ہے اور علم مخصوص ہوتا ہے، اس شخص سے جو اس کا درپے ہو اور حاصل کرے۔ اس کے علاوہ زکریا نے طلب کیا ہے ایک وارث اپنی اولاد میں سے جو ان کے دور کے عزیزوں کو جو بنی اعمام میں سے ہیں، میراث سے محروم کر دے اور یہ بات مال ہی کے لئے ہو سکتی ہے کیوں کہ نبوت اور علم میں اولاد کو دوسروں کو محبوب نہیں کرتی کسی صورت میں بھی پھر ان کا شرف لگانا کہ اللہ اُسے پسند کے لائق بنائے، نبوت کے ساتھ سازگار نہیں ہے، اس لئے کہ نبی تو ہوتا وہی ہے جو پسندیدہ خالق اور معصوم ہوتو اس کے طلب کرنے کے کوئی معنی نہیں لیکن مال ایسی چیز نہیں ہے، اس کا وارث پسندیدہ اور ناپسندیدہ ہر ایک ہو سکتا ہے۔

اس کو ذرا بدلے ہوئے الفاظ میں علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی مجمع البیان میں لکھا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اٰتُوْا زَكَرِيَّاَ مِمَّا كَسَبْتُمْ مِنْ قَبْلِ يَوْمِ تَلْوٰىٓ ۙ وَرِثٰهُ مِنْ زَوْجٰتَيْهِ وَهُوَ صِدِّقٌ ۚ اٰتُوْهُ مِنْ قَبْلِ يَوْمِ تَلْوٰىٓ ۙ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۙ
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اٰتُوْا زَكَرِيَّاَ مِمَّا كَسَبْتُمْ مِنْ قَبْلِ يَوْمِ تَلْوٰىٓ ۙ وَرِثٰهُ مِنْ زَوْجٰتَيْهِ وَهُوَ صِدِّقٌ ۚ اٰتُوْهُ مِنْ قَبْلِ يَوْمِ تَلْوٰىٓ ۙ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۙ
كٰذٰلِكَ ۙ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلٰى هٰٓئِيْنَ ۙ وَوَقَدْ خَلَقْتُمْ مِنْ قَبْلُ وَاَلَمْ تَكُنْ شٰٓئِيًّا ۙ

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۙ قَالَ اٰيٰتُكَ اِلَّا تَكْلَمُ النَّاسُ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ۙ

”اے زکریا علیہ السلام، تم تمہیں خوش خبری دیتے ایک لڑکے کی جس کا نام یحییٰ علیہ السلام ہے جس کا ہم نے اس کے پہلے کوئی ہمنام قرار نہیں دیا ہے، کہا اے میرے پروردگار! لڑکا میرے کہاں ہوگا جب کہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بڑھاپے کی انتہائی حد تک پہنچ چکا ہوں؟ کہا یوں ہی ہوگا تمہارے پروردگار نے کہا ہے کہ وہ مجھ پر آسان ہے

اور میں نے تمہیں اس کے پہلے پیدا کیا جب کہ تم کچھ تھے ہی نہیں۔ کہا پروردگار! میرے لئے کوئی نشانی قرار دے۔ کہا تمہارے لئے نشانی یہ ہے کہ تم لوگوں سے تین دن بات نہ کرو گے۔“

ولادت جناب یحییٰ علیہ السلام کی بشارت:

ان آیات میں جو مضمون ہے، وہ پہلے آچکا ہے اور وہاں ہم نے انسانی نفسیات کی اس بقلمونی پر روشنی ڈالی ہے کہ خود ہی تو جناب زکریا علیہ السلام دعا کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کو خدا کی قدرت کے لحاظ سے امر ممکن سمجھتے ہیں اور جب خدا کی طرف سے بشارت ملتی ہے تو اظہارِ تعجب کرنے لگتے ہیں کہ یہ کیوں کر ہوگا اور پھر اطمینانِ قلب کے لئے اللہ سے نشانی چاہتے ہیں کہ یہ امر خارقِ عادت یعنی استغراقِ عمل ہو تو میں اس نشانی سے سمجھ سکوں اور خالقِ نشانی یہ قرار دیتا ہے کہ اُس وقت تین دن تم ذکرِ الہی کے سوا کوئی بات نہ کر سکو گے۔

فَخَرَجَ عَلَى قَوْمِهِ مِنَ الْمِحْرَابِ فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ أَنْ سَبِّحُوا بُكْرَةً وَعَشِيًّا ۝۱۱
 ”تو وہ عبادت گاہ سے نکل کر اپنی قوم کے پاس آئے تو انہیں اشارہ سے کہا کہ صبح و شام تسبیح کرتے رہا کرو۔“

یعنی جب استغراقِ حمل ہوا تو وہ آیت الہی ظاہر ہوئی اور اب انہوں نے قوم سے جو گفتگو کی تو زبان سے نہیں بلکہ بس اشارہ سے بعض مفسرین کا قول ہے کہ انہوں نے زمین پر لکھ کر اس بات کو پہنچایا۔^[۱] میں اسے اس لئے قابلِ قبول سمجھتا ہوں کہ یہ پوری بات فقط اشاروں میں ادا نہیں ہو سکتی۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے یہاں عجیب و غریب بات لکھی ہے کہ:

چوں یحییٰ متولد شد و دو سالہ گشت (فتح الرحمن) جب یحییٰ پیدا ہوئے اور ان کی عمر دو برس کی ہوئی، یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں کہ بچہ کی دو سال عمر ہونے کے بعد یہ بات کیوں پیدا ہوئی؟ میرا خیال یہ ہے کہ یہ حاشیہ غلطی سے اس آیت کے ساتھ درج ہو گیا ہے۔ وہ حقیقتاً اس کے بعد کی آیت سے متعلق جیسا کہ تفسیر جلالین میں زیرِ تحریر آیت کے تحت میں تو یہ لکھا ہے کہ:

فعلہم منعه من كلامهم حملها بيحيى
 کلام سے قدرتی طور پر روک دیئے جانے سے وہ سمجھے کہ ان کی زوجہ کے شکم میں یحییٰ کا حمل قائم ہو گیا ہے۔
 اور اس کے بعد آئندہ آیت کی تمہید کے طور پر لکھا ہے:

وبعد ولادته بسنتين قال تعالى يا يحيى خذ الكتاب----- الخ

اور ان کی ولادت کے دو برس کے بعد ارشادِ الہی ہوا، اے یحییٰ! لوقانون خداوندی کو-----

اب تو دل یہ کہتا ہے کہ وہ کتاب کی غلطی نہ تھی بلکہ جناب شاہ صاحب نے جلالین کو سامنے رکھ کر یہ حاشیہ لکھا ہے بغیر عقل و ذہن سے کام لئے ہوئے صرف ترجمہ کے طور پر تو جلالین کے اس فقرہ کو جو کہ آئندہ آیت سے متعلق تھا، انہوں نے آنکھ بند کر کے قیل کی آیت سے مرتبط قرار دے دیا۔ اس صورت میں اسے ”خطائے بزرگان“ کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے؟

[۱] اشار الیہم واولیٰ بیدہ و قیل کتب لہم فی الارض عن مجاہد (مجمع البیان)

لِيَحْيِيَ خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ ۖ وَاتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۗ ۱۴ وَحَنَانًا مِّن لَّدُنَّا وَزَكَاةً ۖ
وَكَانَ تَقِيًّا ۗ ۱۵ وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُن جَبَّارًا عَصِيًّا ۗ ۱۶ وَسَلَّمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ
وَيَوْمَ مَيِّتَ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۗ ۱۷

”اے یحییٰ! بوقتِ خدادادی کو [۱] طاقت کے ساتھ اور ہم نے اسے بچنے ہی میں علم و حکمت عطا کیا اور مہر و محبت اپنی طرف سے اور نیک نامی اور وہ پرہیزگار تھا اور نیک سلوک کرنے والا اپنے ماں باپ کے ساتھ اور وہ نافرمان سرکش نہیں تھا اور سلام ہے اس پر جس دن وہ پیدا ہوا اور جس دن وہ دنیا سے اٹھے گا اور جس دن وہ دوبارہ زندہ ہو کر اٹھایا جائے گا“۔

جناب یحییٰ علیہ السلام کے اوصاف:

اس کے قبل والی آیت کے ذیل میں بعض مفسرین کی یہ تشریح آچکی ہے کہ جب یحییٰ علیہ السلام دو برس کے تھے، اس وقت وہ منصب نبوت پر مامور ہوئے بعض نے تین برس لکھے ہیں۔ [۲]

اس کے برخلاف شاہ عبدالقادر رکھتے ہیں: ”یعنی باپ ضعیف تھے اور یہ جوان تھی“ (موضح القرآن) مگر جوان کو عربی میں صبی نہیں کہا جاتا۔

یا یحییٰ کے لفظ کے ساتھ جو خطاب ہے، وہ بوقتِ مخاطب کوئی لفظی خطاب نہیں تھا بلکہ حکم کون کی طرح ارادہ الہی کی لفظی تعبیر ہے اور اس لئے اس کے ساتھ کسی لفظ کے مقدر ماننے کی ضرورت نہیں ہے جیسا کہ بعض مفسرین یا مترجمین قرآنی الفاظ میں اپنی طرف سے اضافہ کرتے ہیں۔ [۳]

حَنَانًا مِّن لَّدُنَّا ”مہر و محبت ہماری طرف سے“ ”وزکوة“ اس لفظ کے معنی میں اختلاف ہوا ہے بعض نے اُس کی تفسیر طہارت و پاکیزگی کے ساتھ کی ہے۔ [۴] اور بعض نے اسے اس زکوة سے لیا ہے جو خیرات کی قبیل سے ہوتی ہے یعنی ان کی ذات اللہ کی طرف سے بندوں پر ایک خیرات کی حیثیت رکھتی تھی [۵] اور تیسری تشریح یہ ہے کہ اس کا مفہوم وہ ہے جس کے لحاظ سے قرآن میں ہے: فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ یعنی اپنے آپ کو سراہو نہیں [۶] (نجم: ۳۲)

[۱] یعنی التوراة التي انزلتها على موسى (تبیان)

[۲] صبیبا ابن ثلث سنین (جلالین)

[۳] گفتیم اے یحییٰ (شاہ ولی اللہ)

[۴] طہارت نفس (شاہ ولی اللہ) پاکیزگی (شاہ رفیع الدین)

[۵] صدقة علیہم (جلالین)

[۶] ای اثار کیناہ بحسن الثناء علیہ کہا یزگی الشهود الانسان (تبیان)

ہم نے جو ”نیک نامی“ کے ساتھ ترجمہ کیا ہے، وہ اس تشریح کے لحاظ سے ہے۔
علامہ طبرسی نے اس بارے میں معتقدین کے پانچ قول نقل کیے ہیں، جن میں سے ایک یہ بھی ہے۔

وَإِذْ كُنَّا فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرِيحًا ﴿١٦﴾ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿١٧﴾ قَالَتْ اإِنِّي آعُودُ بِالرَّحْمَنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿١٨﴾ قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكَ غُلَامًا زَكِيًّا ﴿١٩﴾ قَالَتْ أَنَّى يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَلَمْ يَمَسِّنِي بَشَرٌ وَلَمْ أَكْ بَغِيًّا ﴿٢٠﴾ قَالَ كَذَلِكَ ۚ قَالَ رَبِّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّئٌ ۚ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِنَّا ۚ وَكَانَ أَمْرًا مَقْضِيًّا ﴿٢١﴾

’اور یاد کرو کتاب میں سے مریم علیہا السلام کو جب انہوں نے اپنے گھر والوں سے الگ مشرق کی جانب ایک گوشہ میں جا کر ان کی طرف سے پردہ ڈال لیا تو ہم نے ان کی طرف اپنی جانب سے روح (فرشتے) کو بھیجا تو وہ ان کے سامنے بالکل آدمی کی صورت میں نمودار ہوا۔ انہوں نے کہا میں خدائے رحمن سے مانگتی ہوں پناہ تجھ سے اگر تو خوف خدا رکھتا ہو۔ اس نے کہا میں کوئی اور نہیں، تمہارے پروردگار کی طرف کا بھیجا ہوا ہوں کہ تمہیں ایک پاکیزہ فرزند عطا کروں۔ انہوں نے کہا میرے فرزند کہاں سے ہوگا حالاں کہ مجھے کسی انسان نے چھوا تک نہیں ہے اور میں بدکار نہیں ہوں۔ اس نے کہا ہاں یونہی ہوگا۔ تمہارے پروردگار نے کہا کہ وہ میرے لئے آسان ہے اور یہ اس لئے کہ ہم اُسے لوگوں کے لئے ایک معجزہ قرار دیں، اور اپنی طرف کی رحمت کا ثبوت اور یہ بالکل طے شدہ چیز ہے۔“

تذکرہ جناب مریم سلام اللہ علیہا اور ولادت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تفصیلی حال:

فرشتے کے آنے کے موقع پر جلالین نے اچھا حاشیہ دیا ہے: بعد لبسھا ثیابہا ”جب وہ اپنے کپڑے پہن چکیں“۔
یہ فرشتوں کی شان پارسائی کے بھی لائق ہے اور جناب مریم علیہا السلام کی شان احترام کے بھی مطابق۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهِ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿٢٢﴾ فَأَجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلَى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يَا لَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَ هَذَا وَكُنْتُ نَسِيًّا مَّسِيًّا ﴿٢٣﴾

’تو وہ حاملہ ہو گئیں اُس (بچے) کے ساتھ تو وہ اس کے سبب سے ایک دور جگہ پر گوشہ نشین ہو گئیں۔ اس کے بعد درد زہ انہیں کھجور کے درخت کے تنہ کے پاس لے گیا۔ انہوں نے کہا کاش میں مرجاتی اس کے پہلے اور بالکل نیست و نابود ہو گئی ہوتی۔“

عام طور پر موت کو ”بَابِ نَصَرَ يَنْصُرُ“ سے لیا جاتا ہے اس طرح اس کا ماضی و مضارع مات یموت ہوتا ہے اور قرآن مجید میں یہ لفظ اس طرح کئی جگہ موجود ہے مثلاً: **وَلَيْسَ مُتَمِّمًا اَوْ فُتِلْتُمْ لِرَا اِلَى اللّٰهِ تُخَشِّرُونَ** (سورہ آل عمران ۱۵۸)۔ اس کے اعتبار سے یہاں جناب مریم علیہا السلام کے قول میں یا الیٰتھی کے ساتھ مُتَمِّمًا کا لفظ ہونا چاہیے تھا مگر یہاں بغیر کسی اختلاف قرأت کے مُتَمِّمًا (میم کے کسرہ کے ساتھ) ہے۔ تعجب ہے کہ مفسرین جو لغت و نحو و صرف پر خاص توجہ رکھتے ہیں، یہاں پر خاموش ہیں۔ بہر حال قرآن مجید کے دو طرح استعمال کرنے سے لازماً پتہ چلتا ہے کہ کلام عرب میں یہ لفظ دونوں طرح استعمال ہوا کرتے تھے۔

فَنَادَاهَا مِنْ تَحْتِهَا اَلَا تَحْزَنِي قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ۝۳۴ وَ هُزِّي اِلَيْكَ بِمِجْدَعِ

النَّخْلَةِ تَنْسِقُطُ عَلَيْكَ رَطْبًا جَنِيًّا ۝۳۵

تو اس نے انہیں آواز دی اُن کے نیچے سے کہ رنجیدہ نہ ہوئے آپ کے پروردگار نے آپ کے نیچے ایک نہر پیدا کی ہے اور اپنی طرف کر کے حرکت دیجیے کھجور کی شاخ کو تو وہ گرانے لگے گی آپ پر تروتازہ کھجوریں۔

”اُس نے انہیں آواز دی“ کس نے؟ شاہ ولی اللہ کہتے ہیں: ”طفل يا جبرئيل والله اعلم“

ان کے بیٹے شاہ عبدالقادر نے تعین کے ساتھ لکھا ہے: ”یہ آواز دی فرشتے نے“ (موضح القرآن)

جلالین نے بھی یہی لکھا ہے: ای جبرئیل کان اسفل منها: یعنی جبرئیل، جو اس جگہ سے جہاں وہ تھیں، نیچے تھے“ مگر ہماری قدیم تفسیر پہلے خیال کی مؤید ہے [۱] اور شیخ الطائفة تلمیذ علامہ طبرسی نے بغیر ترجیح دونوں قول نقل کر دیئے ہیں۔

فَكُلِّي وَاشْرَبِي وَقَرِّي عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيْنَ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فِقُولِي اِنِّي نَذَرْتُ

لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اَنْسِيًّا ۝۳۶

”تو کھائیے، پیجیے اور آنکھیں خنک رکھیے، اس کے بعد اگر کسی آدمی کو دیکھیے تو کہیے کہ میں نے خدائے رحمن کے لئے چپ رہنے کی منّت مانی ہے تو میں آج کسی آدمی سے بات نہیں کروں گی۔“

”آنکھیں خنک رکھیے“ عربی کا محاورہ ہے جس کا ترجمہ لفظی تو یہی ہو گا مگر مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ خوش دل اور بے فکر رہیے۔ اس کے

بعد ہدایت یہ ہوتی ہے کہ ”کسی آدمی سے بات نہ کیجیے اور یوں کہیے“ تو بغیر بات کیے ہوئے کہنے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اشارہ سے ایسا ظاہر

کیجیے کہ آپ نے چپ کا روزہ رکھا ہے۔ یہ روزہ اُمم سابقہ میں رائج تھا جیسا کہ ہندوؤں میں بھی اب موجود ہے اور گاندھی جی رکھا کرتے تھے۔ مگر

اسلام میں اس قسم کے روزہ کا حکم منسوخ ہو گیا ہے، اس لئے شریعت اسلام میں اس طرح کی منّت بھی جائز نہیں ہے اس میں فرق اسلامی کے

درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ چنانچہ شاہ عبدالقادر بھی لکھتے ہیں کہ:

”اُن کے دین میں یہ منّت درست تھی کہ بولنے کا بھی روزہ رکھتے۔ ہمارے دین میں یہ منّت درست نہیں“ (موضح القرآن)

[۱] فناداھا عیسیٰ (علی بن ابراہیم)

بے شک ایک سوال یہاں حل طلب یہ ہے کہ صورت حال سے ظاہر ہے کہ جناب مریم علیہا السلام نے ایسی کوئی منت مانی نہیں تھی۔ اگر مانی ہوتی تو وہ خود ہی ایسا کہتیں۔ اس ہدایت کی ضرورت ہی کیا تھی؟ پھر ان کی یہ ہدایت کہ یوں کہنا کیا خلاف واقعہ ایک بات اظہار کی ہدایت نہ ہو گی؟

اس صورت میں یا یہ سمجھا جائے کہ ان کو یہ ہدایت ضمناً اس بات کی ہدایت بھی ہے کہ اس طرح نذر ابھی کر لو [۱] اور یا یہ سمجھا جائے کہ خطرات میں جیسے جناب مریم علیہا السلام کو درپیش تھے، اس طرح کے ”مصلحت امیز“ اظہار کی اجازت کی ہے جو اصول تقیہ کے مطابق بالکل درست ہے۔

فَأَتَتْ بِهِ قَوْمَهَا تَحْمِيلُهُ ۖ قَالُوا ايمَرِيْمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا ﴿٢٤﴾ يَا خُتُّ هُرُونَ
مَا كَانَ اَبُوكَ اَمْرًا سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكَ بَغِيًّا ۗ ﴿٢٥﴾ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ۗ قَالُوا
كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۗ ﴿٢٦﴾ قَالَ اِنِّي عَبْدُ اللّٰهِ ۗ اُنزِلْنِي اِلَيْكَ يٰ
وَجَعَلْنِي نَبِيًّا ۗ ﴿٢٧﴾ وَجَعَلْنِي مُبْرَأًا مِّنْ مَّا كُنْتُ ۙ وَاَوْصِنِي بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ
مَا دُمْتُ حَيًّا ۗ ﴿٢٨﴾ وَبَرًّا بِوَالِدَيْنِي ۙ وَاَوْصِنِي بِالْحَقِّ وَالْحَقِّيًّا ۗ ﴿٢٩﴾ وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ
وُلِدْتُ وَيَوْمَ اَمُوتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ۗ ﴿٣٠﴾

”تو وہ اس (بچے) کو گود میں اٹھائے اپنی قوم کی طرف لائیں۔ انہوں نے کہا اے مریم علیہ السلام! یہ تم نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ اے ہارون کی بہن! تمہارے باپ برے آدمی نہ تھے اور نہ تمہاری ماں ہی بدکار تھیں۔ اس پر انہوں نے اُس بچے کی طرف اشارہ کر دیا۔ انہوں نے کہا ہم اُس سے کس طرح بات کریں جو ابھی گہوارے میں ہے۔ اس نے کہا میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب عطا کی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے اور مجھے برکت والا قرار دیا ہے جہاں بھی میں ہوں اور مجھے مامور کیا ہے نماز اور زکوٰۃ پر، جب تک کہ میں زندہ رہوں اور نیک سلوک رکھنے والا اپنی ماں کے ساتھ اور مجھے اس نے بدنصیب، سرکش نہیں بنایا ہے اور اسلام ہے مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن میں دنیا سے اٹھوں گا اور جس دن میں دوبارہ زندہ کیا جاؤں گا۔“

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ابن اللہ ہونے کی رد:

”اے ہارون کی بہن“۔ اس مخاطب میں اختلاف ہے بعض مفسرین کہتے ہیں کہ ہارون سے مراد وہی حضرت ہارون علیہ السلام یعنی حضرت

[۱] قال الجبائی: كان الله تعالى امر بان نذرته تعالى الصمت فاذا كلمها احد قومي باثمها نذرت صوما صمنا لا لله لا يجوز ان يامرها بما
ثمها نذرت ولما نذرت لان ذلك كذب (تبیان)

موسیٰ علیہ السلام کے بھائی مراد ہیں اور جناب مریم سلام اللہ علیہا انہی جناب ہارون سلام اللہ علیہما کی اولاد سے تھیں اور اُخت ہارون کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قبیلہ ہارون کی ایک خاتون چونکہ عرب میں بنی تمیم کو تمیم اور بنی جرہم کو جرہم کہا جاتا ہے اسی طرح بنی ہارون کو ہارون کہا گیا ہے۔^[۱]

اور بعض کے خیال میں یہ ہارون کوئی اور شخص ہے۔ اب وہ شخص کیسا تھا؟ ایک خیال یہ ہے کہ وہ کوئی بہت نیک آدمی تھا اور اُس کی طرف نسبت دینے کا مطلب یہ ہے کہ تم جو اب تک نیکی میں ہارون کی ایسی تھیں^[۲] اور تمہارے باپ ماں بھی اچھے اور پارسا لوگ تھے، اب تم نے یہ کیا کیا ہے؟ اور بعض کا تصور یہ ہے کہ یہ ہارون بہت برا آدمی تھا اور جناب مریم سلام اللہ علیہا کو انہوں نے اُخت ہارون بزعم خود ان کے اس عمل کی برائی کے لحاظ سے کہا ہے۔ ہماری قدیم تفسیر اس کے مواقع ہے۔^[۳]

علامہ طبرسی نے بھی یہ تمام اقوال بغیر کسی تفسیر کے درج کر دیے ہیں اور جب کوئی مستند تشریح اسکی معصومین علیہم السلام سے ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے تو اس کے سوا چارہ کار ہی کیا ہے؟

ذٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۗ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ ﴿۳۳﴾ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ
يَتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۗ سُبْحٰنَهُ ۗ اِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِذَا مَا يَقُوْلُ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۳۴﴾ وَاِنَّ
اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاَعْبُدُوْهُ ۗ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۳۵﴾ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْ
بَيْنِهِمْ ۗ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۳۶﴾ اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصُرْ ۗ
يَوْمَ يَأْتُوْنَ نٰلِكَنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۷﴾

”یہ ہیں مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام، سچی بات میں وہ خواہ مخواہ شک کرتے ہیں۔ اللہ کیلئے یہ سزاوار نہیں کہ وہ بیٹا اختیار کرے۔ پاک ہے اُس کی ذات، جب وہ کوئی فیصلہ کرتا ہے تو وہ بس اس کیلئے کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے اور یقیناً میرا اور تمہارا پروردگار اللہ ہے تو بس اُس کی عبادت کرو۔ یہ صاف سیدھا راستہ ہے۔ اس پر ان جماعتوں نے اختلاف کر رکھا ہے تو وائے ہوں گے اور یہ سننے والے اُس دن جب ہمارے پاس آئیں گے مگر ظالم لوگ آج کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہیں۔“

اس پر ان جماعتوں نے آپس میں اختلاف کر رکھا ہے، یعنی عیسائیوں کے مختلف فرقے اور مسلمان، سب کی الگ الگ باتیں ہیں۔ کوئی خدا کہتا ہے، کوئی خدا کا بیٹا، کوئی تین میں ایک اور اس سب کے برخلاف مسلمانوں کا قول ہے کہ وہ اللہ کے ایک خاص بندے ہیں اور بس۔^[۴]

[۱] قال السدی نسبت الی ہارون اخی موسیٰ علیہ السلام لہا کانت من ولدہا کہا یقال یا اخابنی فلان (تبیان)

[۲] ہورجل صالح ای یا شہیدہ فی العقۃ (جلالین)

[۳] ان ہارون کان جلا فاسقا زانیاً فشتموہا بہ (علی بن ابراہیم)

[۴] قال قوم ہو اللہ وہم العقوبتہ وقال آخرون ہو ابن اللہ وہم النسب طوریۃ وقال قوم ہو ثالث ثلاثہ وہم الاسر ایللیۃ وقال قوم

ہو عبد اللہ وہم المسلمون (تبیان)

”اس دن کتنے دیکھنے اور سننے والے ہوں گے، چونکہ غیب کی باتیں عالم آخرت میں سب منظرِ شہود پر آجائیں گی تو اب نہان کی نگاہوں میں کوئی دھندلا پن ہوگا اور نہ کانوں پر کوئی پردہ کیوں کہ نظریات نے اس وقت مشاہدات کا لباس پہنا ہوگا جیسا کہ قرآن مجید میں دوسری جگہ ہے:

فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ ﴿۳۶﴾

ہم نے تیری آنکھ سے پردے ہٹا دیے ہیں، تو آج تیری نگاہ بڑی تیز ہے۔ (سورہ ق)

مگر اس دار دنیا میں وہ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں یعنی اس دن وہ یقین لائیں گے جب اُس یقین کی کوئی قیمت نہیں ہوگی لیکن آج جب کہ وہ باتیں ابھی پردہ غیب میں ہیں، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کے تقاضے سے وہ انہیں مان لیتے تو یہ ایمان معتبر ہوتا اور وہ ہدایت یافتہ قرار پاتے۔^[۱]

وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ وَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۳۷﴾

”اور انہیں متنبہ کیجیے اُس رنج و حسرت کے دن سے جب کہ جو ہونا ہے وہ ہو جائے گا اور وہ ہیں کہ بے خبری میں مبتلا ہیں اور وہ ایمان نہیں لاتے۔“

”رنج و حسرت کے دن سے، یعنی جب گمراہ اور بے عمل افراد اعتقادِ عمل میں اپنی کوتاہی پر دستِ حسرت مل رہے ہوں گے۔“^[۲]

إِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْأَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَإِنَّا يُرْجَعُونَ ﴿۳۸﴾

”یقیناً ہم ہیں جو تمام زمین کے آخری مالک ہیں اور اُن کے جو اس پر بستے ہیں اور ہماری ہی طرف وہ بالآخر پلٹنے والے ہیں۔“

”وارث“ وہ ہوتا ہے جو دوسرے کے مرنے کے بعد اس کی املاک کا حقدار ہو، یہاں جتنے ہیں وہ فنا ہونے والے ہیں اور اس پر رہنے والی ذات صرف پروردگار عالم کی ہے^[۳] اس لئے کہا گیا ہے کہ ہم ہیں جو زمین اور اس پر رہنے والوں کے وارث ہیں اور اسی کا مفہوم ادا کرتے ہوئے ہم نے اس کا ترجمہ ”آخری مالک“ کی لفظوں میں کیا ہے۔

وَأَذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ ۖ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا ﴿۳۹﴾ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا ﴿۴۰﴾ يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿۴۱﴾ يَا بَتِ لَا تَعْبُدِ

[۱] یعنی ان الکافرین فی الدنیا اُثروا الہدی علی الہدی فہم فی ذہاب عن الدین وعدول عن الحق والمراد انہم فی الدنیا جاہلون وفی الآخرۃ عارفون حیث لا تنفعہم المعرفۃ (مجمع البیان)

[۲] الیوم الذی یتحسّر فیہ الناس علی ما فرطوا فیہ من طاعته اللہ علی ما ارتکبوا من معاصیہ (تبیان)

[۳] ای یعود الینا التصرف فی الارض وفی من علیہا من العقل او غیرہم لایبقی لاحد ملک (مجمع البیان)

الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمَنِ عَصِيًّا ﴿٣٤﴾ يَا بَتِ إِيَّيْ أَخَافُ أَنْ يَمْسَكَ

عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمَنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطَانِ وَلِيًّا ﴿٣٥﴾

”اور ذکر کیجئے کتاب میں ابراہیم کا، بلاشبہ وہ ایک پیغمبر بڑے سچے تھے۔ جب انہوں نے کہا اپنے باپ سے کہ اے باپ! کیوں عبادت کرتے ہیں ایسی چیز کی جو نہ سنتی ہے اور نہ دیکھتی ہے اور آپ کو کچھ فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ اے باپ! یقین مانئے کہ مجھے وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا ہے تو آپ میری پیروی کیجئے میں آپ کو سیدھے راستے پر لگاؤں گا۔ اے باپ! شیطان کو نہ پوجیے، یقیناً شیطان خدائے رحمن کا نافرمان ثابت ہوا ہے۔ اے باپ! مجھے ڈر ہے کہ آپ کو پہنچ جائے خدائے رحمن کا عذاب تو آپ شیطان کے شریک حال ہو جائیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تبلیغ اور اپنے منہ بولے باپ سے گفتگو:

لغت میں آپ میں ”آب“ کے معنی باپ ہیں، اس لئے ترجمہ تو یہی لفظ لکھنا پڑے گا مگر ہر زبان میں ”باپ“ کا اطلاق صلیبی باپ کے علاوہ بنظر احترام اور قسم کے بزرگوں پر بھی ہوا کرتا ہے اور چچا نانا پر باپ کا اطلاق تو خود قرآن مجید سے ثابت ہے جس پر اس تفسیر میں پہلے مہتمم یہ کیا جا چکا ہے، اس لئے احادیث اہل بیت علیہم السلام سے جو ثابت ہوا ہے کہ یہ شخص جس سے مخاطب ہے ابراہیم علیہ السلام کا صلیبی باپ نہ تھا بلکہ چچا یا جیسا کہ بعض علماء کا خیال ہے، نانا تھا [۱] اسے قرآن کے خلاف سمجھا نہیں جا سکتا۔

قَالَ أَرَأَيْتُ أَنْتَ عَنِ الْهَتَقِ يَا بُرْهَيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهَ لِأَرْجَمَتِكَ وَاهْجُرْتَنِي

مَلِيًّا ﴿٣٦﴾ قَالَ سَلِّمْ عَلَيْكَ ۚ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي ۚ إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا ﴿٣٧﴾

وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَأَدْعُوا رَبِّي ۚ عَسَىٰ الْأَاكُونَ بِدُعَاءِ رَبِّي

شَقِيًّا ﴿٣٨﴾

”اس نے کہا کیا تم میرے خداؤں سے اے ابراہیم! روگردانی کیے ہوئے ہو؟ اگر تم نے نہ مانا تو میں تمہیں سنگسار کروں گا اور پھر تمہیں مجھ سے مدتوں کے لئے چھوٹنا ہوگا۔ انہوں نے کہا خدا حافظ میں بہر حال آپ کے لئے اپنے پروردگار سے بخشش کی درخواست کروں گا۔ یقیناً وہ مجھ پر بڑا شفیق ہے اور میں خود آپ لوگوں سے اور جس کی آپ لوگ اللہ کے سوا دہائی دیتے ہیں علیحدگی اختیار کر لوں گا اور بس اپنے پروردگار سے دعا کرتا رہوں گا۔ غالباً میں اپنے پروردگار کی دعا سے بد نصیب نہیں رہوں گا۔“

[۱] الذی یقر له اصحابنا اِنَّه کان جدہ لامۃ لان اباء النبی ﷺ کلہم کانوا مسلمین الی ادم (تبیان) ان الذی یقر له اصحابنا ان هذا الخطاب من ابراہیم علیہ السلام اِنَّمَا توجہ الی من سمّاه الله ابا له لانه کان جد ابراہیم لامۃ وان اباه الذی ولده کان اسمہ تاریخ (مجمع البيان)

آز کے اتنے سخت مخاطب کے بعد جناب ابراہیم علیہ السلام کا جواب رواداری اور بزرگ کی بزرگداشت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

ان کا کہنا سلام علیک، اس کا ترجمہ جو ہم نے کیا ”خدا حافظ“ اس تصور پر مبنی ہے کہ یہ سلام وداع ہے۔^[۱]
دوسرا خیال یہ ہے کہ سلام علیک کا مطلب یہ ہے کہ آپ میری طرف سے اطمینان رکھیے میں آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کروں

گ۔^[۲]

تیسرا مطلب یہ کہا گیا ہے کہ آپ کے لئے میری طرف سے آداب و تسلیمات کا سلسلہ قائم رہے گا، کیوں کہ آپ کا مجھ پر تربیت و بزرگی کا حق ہے۔^[۳]

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس وعدہ کو کہ ”میں اپنے پروردگار سے آپ کے لئے دعائے مغفرت کی درخواست کروں گا، پورا کیا جس کا سورہ شعراء میں ذکر ہے:

إِنَّهُ كَانَ مِنَ الصَّالِينَ ﴿۵۰﴾ میرے باپ کی بخشش کر دے، وہ یقیناً کم کردہ راہوں میں سے تھا۔ (شعراء)

اور قرآن مجید میں دوسری کفار و مشرکین کے لئے طلب مغفرت کی مخالف میں رفع دخل کے طور پر اس کا حوالہ بھی دیا ہے کہ:

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَاهَا آيَاتُهُ ۖ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ۗ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ﴿۵۱﴾ (سورہ توبہ)

اور ابراہیم علیہ السلام کا طلب مغفرت کرنا اپنے باپ کے لئے وہ نہ تھا مگر ایک وعدہ کی بنا پر جو انہوں نے اس سے کر لیا تھا مگر جب ان پر بالکل ثابت ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو انہوں نے اس سے بیزاری اختیار کر لی یقیناً ابراہیم اللہ سے لو لگانے والے بڑے متحمل آدمی تھے۔

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۗ وَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۗ وَكُلًّا

جَعَلْنَا نَبِيِّنًا ﴿۵۹﴾ وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِنْ رَحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿۶۰﴾

”تو جب وہ ان لوگوں سے علیحدگی اختیار کر چکے، اور اُس سے کہ جن کی وہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر پرستش کرتے تھے، تو

ہم نے انہیں اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام ایسی اولاد عنایت کی اور ان میں سے ہر ایک کو نبی بنایا اور ان

لوگوں کو اپنی رحمت سے حصہ عطا کیا اور ان کے آوازہ شہرت کو حق بجانب طور پر بلند کیا۔“

علیحدگی ذہنی اور عملی پہلے ہی تھی اس لئے کہ انبیاء و مرسلین اپنی قوم کے عقائد فاسدہ اور اعمال سیئہ سے بری ہوتے ہیں، یہاں جس علیحدگی

کا ذکر ہے، وہ جسمانی علیحدگی ہے یعنی اس کے بعد وہ وہاں سے ہجرت کر کے سرزمین شام کی طرف چلے گئے۔^[۴]

[۱] سلام تو دیع و ہجر علی الطف الوجوہ و ہوسلام متارکتہ و مباحداۃ (مجمع البیان) تیری سلامتی رہے، یہ رخصت کا سلام ہے (موضح القرآن)

[۲] سلام علیک یعنی ائی لا اصیبک، مکروہ (جلالین)

[۳] ای اکرام و بڑھتی الابو تو شکر التربیۃ (تبیان)

[۴] بان ذہب الی الارض المقدسة (جلالین) قیل انہ اعتزلہم بان خرج الی ناحیۃ الشام (تبیان) ای فارقہم و ہاجر ہم الی

الارض المقدسة (مجمع البیان)

وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِمَّن رَّحِمْنَنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ۝۵۱ کا لغوی مفہوم کے لحاظ سے ترجمہ درج ہو چکا ہے جو عام مفسرین کی تفسیروں کے موافق ہے جس کی تشریح علامہ طبری نے یہ فرمائی ہے کہ مختلف مذاہب کے افراد جناب ابراہیم علیہ السلام کی جلالت و عظمت پر متفق ہیں اور یہ دعویٰ رکھتے ہیں کہ وہ ان کے دین پر ہیں اور اسلام میں ان کی یاد اس طرح قائم کی گئی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر جو مفصل درود کے الفاظ ہیں ان کا جزء ہے:

”كَمَا صَلَّيْتَ عَلَيَّ اِبْرَاهِيْمَ وَاٰلِ اِبْرَاهِيْمَ“ (مجمع البيان)

یہ درود نماز جنازہ میں دوسری تکبیر کے بعد ہمارے یہاں عموماً پڑھا جاتا ہے۔

مگر ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر جو مسند عالی معصوم علیہ السلام سے وارد ہوئی ہے، یہ ہے کہ ”ہم نے اپنی رحمت کا ایک حصہ انہیں عطا کیا۔ اس سے مراد علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ذات گرامی ہے۔“ [۱]

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مُوسَىٰ ۙ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلِصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝۵۲ وَنَادَيْنَاهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَّقَرَّبْنَاهُ نَجِيًّا ۝۵۳ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمٰنِنَا اَخَاهُ هٰرُونَ نَبِيًّا ۝۵۴

”اور ذکر کیجئے اس کتاب میں موسیٰ کا۔ یقیناً وہ بڑے کھرے بنائے گئے تھے [۱] اور نبی تھے بھیجے ہوئے۔ اور ہم نے انہیں طور کے دائیں جانب سے صدادی اور ہم کلامی شرف دیتے ہوئے تقرب عطا کیا اور انہیں اپنی رحمت سے ہارون ایسا بھائی نبی بناتے ہوئے عطا کیا۔“
ان آیات میں جناب موسیٰ و ہارون علیہما السلام کا ذکر آیا ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ اِسْمٰعِيْلَ ۙ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝۵۵ وَكَانَ يٰمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَّكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ۝۵۶

”اور ذکر کیجئے اس کتاب میں اسماعیل کا، بلاشبہ وہ وعدے کے سچے تھے اور وہ بھیجے ہوئے نبی تھے اور وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے اور وہ اپنے پروردگار کے نزدیک پسندیدہ تھے۔“

جناب اسماعیل علیہ السلام صادق الوعد کا تذکرہ:

عام خیال یہ ہے کہ یہ جناب اسماعیل علیہ السلام فرزند حضرت ابراہیم علیہ السلام کے علاوہ ایک دوسرے بزرگوار تھے۔ جلالین نے لکھا ہے:

[۱] حدیثی بذلک ابی عن الحسن بن علی العسکری (مجمع البيان)

[۲] ان الله اخلصه لطاعته (تبيان) بفتح اللام يكون معناه اخلصه الله بالنبوة واختاره للرسالة (مجمع البيان) خالص كرده شده (

شاه ولی الله)

رَسُولًا لِّإِي جَرَهْم: وہ قبیلہ جرہم کی طرف بحیثیت پیغمبر مبعوث ہوئے تھے۔

اس سے یہ بات صاف نہیں ہوتی کہ وہ جناب اسماعیل علیہ السلام فرزند خلیل تھے یا کوئی اور؟ اس لئے کہ جناب ہاجرہ اور اسماعیل علیہ السلام کے خانہ کعبہ کے پاس آباد ہونے کے بعد قبیلہ جرہم ہی تھا۔ جس نے آکر مکہ میں بود و باش اختیار کی تو ممکن ہے وہی جہان اسماعیل جو ذبیح اللہ ہیں، اس قبیلہ کی طرف مبعوث شدہ نبی ہوں جن کا ذکر ہو رہا ہے۔

جناب شیخ الطائف نے صراحتاً اس تذکرہ کو انہی حضرت اسماعیل علیہ السلام سے متعلق کیا ہے ^[۱] مگر ہماری قدیم تفسیر جو علی بن ابراہیم قمی کی ہے، پہلے خیال سے متفق ہے۔

علامہ طبرسی نے پہلے تو صاف اسے جناب اسماعیل علیہ السلام فرزند خلیل علیہ السلام کے بارے میں بتایا ہے اور دوسرا قول یہ نقل کیا ہے کہ وہ دوسرے اسماعیل فرزند حوزیل ہیں اور اس کے متعلق امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث نقل کی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ امام علیہ السلام کی طرف منسوب حدیث دونوں طرف موجود ہے، اس لئے تعارض کی بناء پر اس سے کسی قول کو ترجیح حاصل نہیں ہوتی۔

وَأَذْكَرُ فِي الْكِتَابِ إِدْرِيسَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا ۗ وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا ۝۵۴

’اور ذکر کیجئے اس کتاب میں ادریس علیہ السلام کا۔ وہ بلاشبہ بہت سچے نبی تھے اور ہم نے انہیں اونچے مقام پر بلند کیا۔‘

جناب ادریس علیہ السلام اور ان کی رفعت جسمانی:

یعنی انہیں آسمان کی سیر کرائی جو ایک محدود درجہ تک کی معراج تھی۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے بھی ترجمہ میں لکھا ہے: ’بمکانی بلند یعنی بر آسمان‘

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ’بہشت کی سیر مانگی، پھر وہاں رہ گئے اللہ کے حکم سے‘ (موضح القرآن)

اب جب انبیاء ماسلف میں آسمان کی طرف معراج کی مثال مسلم طور پر موجود ہے تو کتنے افسوس کی بات ہے کہ اہل سنت میں سے ایک طبقہ معراج رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت المقدس تک محدود کر کے افضل المرسلین کی منزل جو جناب ادریس علیہ السلام کی منزل سے بھی کم تر قرار دیتا ہے۔ رفعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تقاضا جو آزر وئے قرآن ثابت بھی ہے، یہ ہے کہ آپ کی منزل معراج کو جناب ادریس علیہ السلام سے بالاتر مانا جائے۔

أُولَئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ الْعِبَادِ ۗ وَمِنْ ذُرِّيَّةِ آدَمَ ۖ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ۖ وَمِنْ ذُرِّيَّةِ إِبْرَاهِيمَ ۖ وَإِسْرَائِيلَ ۖ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ۖ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا ۝۵۵

’یہ ہیں پیغمبروں میں سے وہ جنہیں اللہ نے اپنی خاص نعمت سے نوازا ہے آدم کی اولاد میں سے اور ان میں سے

[۱] اسماعیل ابن ابراہیم (تبیان)

جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا اور ابراہیم اور اسرائیل کی اولاد میں سے اور اُن میں سے جن کو ہم نے رہنمائی کی اور منتخب کیا، جب اُن کے سامنے آیات الہی کی تلاوت ہوتی تھی تو وہ گر پڑتے تھے سجدہ میں اور روتے ہوئے۔

ان آیات کو گزشتہ آیات کے ساتھ دیکھا جائے تو لف و نشر غیر مرتب کی صورت ہے۔ وہاں ادریس علیہ السلام کا سب سے آخر میں ذکر تھا، یہاں سب سے پہلے ہے: **مِنْ ذُرِّيَّةِ آدَمَ** ”آدم کی اولاد میں سے“ اور جناب ادریس علیہ السلام صرف اس کے تحت میں آتے ہیں اس لئے کہ انہیں بتایا جاتا ہے کہ وہ جناب نوح علیہ السلام سے مقدم اور ان کے اجداد میں سے تھے۔^[۱]

اس کے بعد ہے کہ اُن کی نسل کا ذکر جو جناب نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی پر سوار تھے اس میں جناب ابراہیم علیہ السلام ہیں اور پھر ذریت ابراہیم کا ذکر ہے اس میں اسحاق علیہ السلام اور یعقوب ہیں اور پھر اسرائیل کا ذکر ہے، اس میں جناب موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام ہیں جن کا ذکر وسط میں ہے اور زکریا یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام ہیں جن کا ذکر اس سورہ میں گزشتہ انبیاء سے مقدم ہے۔

اب اس کے بعد از سر نو آغاز کلام کر کے جس جماعت کا ذکر ہو رہا ہے کہ ”اور اُن میں سے جنہیں ہم نے رہنمائی کے لئے منتخب کیا“۔ یہ انداز بتاتا ہے کہ یہ جماعت پہلے لوگوں سے الگ ہے جس کے خوف و خشیت الہی کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ ہمارے یہاں کی حدیث میں ہے کہ اس سے محمد و آل محمد علیہم السلام مراد ہیں۔^[۲]

**فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهْوَاتِ فَسُوفَ يَلْقَوْنَ
عَذَابًا ۝۵۹ إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ
شَيْئًا ۝۶۰ جَنَّاتٍ عَدْنٍ الَّتِي وَعَدَ الرَّحْمَنُ عِبَادَهُ بِالْغَيْبِ ۗ إِنَّهُ كَانَ وَعْدُهُ
مَأْتِيًّا ۝۶۱**

”اب اُن کے بعد اُن کی جگہ پر آئے ایسے ناخلف جنہوں نے نماز کو برباد کیا اور خواہشوں کی پیروی کی، تو یہ اس گمراہی کے انجام سے دو چار ہوں گے، سوا اُس کے جو توبہ کرے اور ایمان اختیار کرے اور نیک اعمال کرے تو یہ لوگ بہشت میں داخل ہوں گے اور اُن کے ساتھ ذرا بھی نا انصافی نہ ہوگی، جاودانی زندگی والے باغ جن کا وعدہ خدائے رحمن نے غیب کے طور پر اپنے بندوں سے کیا ہے یقیناً اس کا وعدہ سامنے آنے والا ہے۔“

باغیہائے بہشت کی اوصاف:

نماز کو برباد کرنے کا مطلب ترک نماز بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ بعض افراد کا خیال ہے مگر اس سے زیادہ مفہوم لفظ سے قریب تر وہ ہے جس

[۱] فكان لا حريس شرف القرب من آدم لانه جند نوح (تبيين)

[۲] روى عن علي بن الحسين رضي الله عنه قال نحن غيبنا بها (مجمع البيان)

کی تائید ہمارے رہنمایان دین کے ارشاد سے ہوتی ہے کہ اس سے مراد اوقات فضیلت نماز کا لحاظ نہ کرنا اور اس کی ادائیگی میں تساہلی برتنا ہے۔ غی کے عام معنی تو گمراہی کے ہیں جس کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے جس میں ہم تنہا نہیں ہیں ^[۱] اور اُس کی نظیر قرآن مجید میں موجود ہے، دوسری جگہ:

وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ أَثَامًا ۖ اور جو ایسا کرے گا وہ اپنے گناہ سے دوچار ہوگا، (یعنی گناہ کے انجام سے) فرقان-۶۸
مگر دوسرا قول اس آیت میں ہے کہ غی آخرت کے کسی ہولناک مقام کا نام ہے، اس صورت میں اسے ترجمہ میں تبدیل نہ ہونا چاہیے بلکہ ترجمہ یہ ہوگا کہ ”وہ غی سے دوچار ہوں گے۔“ ^[۲]

لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا إِلَّا سَلَامًا ۖ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا ۗ تِلْكَ

الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ۝۶۸

”نہیں سنیں وہاں کوئی مہم بات، ہاں بس سلام کی صدا ہوگی اور اُن کے لئے ان کی مقررہ روزی ہے وہاں صبح اور شام یہ ہے وہ بہشت جس کا ورثہ بنائیں گے ہم اپنے بندوں میں سے اُسے جو پرہیزگار ہو۔“

وَمَا نَنْزِلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ ۗ لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذَلِكَ ۗ وَمَا

كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۝۶۹ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ

لِعِبَادَتِهِ ۗ هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا ۝۷۰

”اور ہم نہیں اترتے مگر آپ کے پروردگار کے حکم سے اُس کے قبضہ میں ہے جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو ہمارے پیچھے ہے اور جو اس کے درمیان ہے اور آپ کا پروردگار بھولنے والا نہیں ہے، پروردگار آسمانوں اور زمین اور اُن کے درمیان کی چیزوں کا، تو اُس کی عبادت کیجئے اور اُس کی عبادت کے لئے مشکلات کو برداشت کیجئے۔ کیا اُس کا کوئی دوسرا ہم نام آپ کو معلوم ہے؟“

موجودہ نظم قرآنی اور سلسلہ آیات کو اہمیت دینے والے بھی ان آیات کا ربط گزشتہ سلسلہ کلام سے قائم نہیں کر سکے ہیں بلکہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ جبریل علیہ السلام ایک مدت دراز تک وحی نہیں لائے، اُس کے بعد آئے تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے عرصہ تک نہ آنے کی شکایت کی اُس کے جواب میں انہوں نے یہ کہا۔

ہمارے مفسرین میں سے جناب شیخ الطائف نے قیل کہہ کر (بطور قوم ضعیف کے) درج کیا ہے حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام سے ایک دفعہ فرمایا کہ آخر تم اتنا کم کیوں آتے ہو؟ زیادہ کیوں نہیں آتے! اس پر انہوں نے یہ جواب دیا۔ یہ قول ابن عباس، قتادہ

[۱] خواہند یافت جزائے گمراہی (شاہ ولی اللہ) قبیل معنایا بلقون مجازاۃ غیبہم (تبیان)

[۲] ملاقات کریں گے غی کی (شاہ رفیع الدین) ہو وادفی جہنم (جلالین) قال عبد اللہ بن مسعود الغی وادفی جہنم (تبیان)

ضحاک، مجاہد اور ابراہیم کا ہے۔

شاہ ولی اللہ نے ترجمہ کا جزء بنا کر لکھ دیا ہے: ”فرشتگان گفتند“

شیخ الطائف نے اس قول کے ضعف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھی یہ نہیں بتایا کہ اس کے مقابل میں دوسرا قول کیا ہے جو قوت رکھتا ہے اور جب متقدمین کو کوئی چیز دست یاب نہیں ہوئی تو آج چودہ سو برس کے بعد ہم کہاں سے اُسے لاسکتے ہیں؟ بہر حال صورت حال یہ ہے کہ اس شان نزول سے ضمیر مطمئن نہیں ہے اور صحیح شان نزول کی تشنگی شدت سے محسوس ہوتی ہے جس کی سیرابی کا بھی کوئی ذریعہ نہیں نکلا ہے۔

”اُس کے قبضہ میں ہے جو کچھ ہمارے آگے ہے“۔ اسے شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں ”قیامت“ اور جو ہمارے پیچھے ہیں، وہ فرماتے ہیں: ”یعنی ازابتداء خلق آسمان و زمین“ (فتح القرآن)

یہ تفسیر جلالین کے مطابق ہے۔ اس میں کچھ اضافہ کے ساتھ ہے:

ما بین ای دیننا ای امامنا من الامور الاخرة وما خلفنا من امود الدنیا وما بین ذلك ای مایکون من هذا الوقت الی قیام الساعة ای له علم ذلك جمیعا۔

اس کے برخلاف شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”ہمارے آگے پیچھے کہا آسمان و زمین کو۔ اترتے ہوئے زمین آگے، آسمان پیچھے چڑھتے ہوئے وہ پیچھے، یہ آگے (موضح القرآن)

ایک تفسیری پیچیدگی جو اُس شان نزول کے لحاظ سے ہے، یہ ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا اور فرشتہ نے یہ جواب دیا تو یہ جواب جزء قرآن کیوں کر ہو گیا؟ قرآن تو وہ کلام ہے جس کا ملک کو حامل بنایا جاتا ہے نہ کہ خود ملک کی بات چیت جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو، اس کا حل شاہ عبدالقادر نے یوں کیا ہے کہ:

”اللہ تعالیٰ نے یہ کلام سکھایا جبرئیل علیہ السلام کو کہ جواب یوں کہو کلام ہے اللہ کا جبرئیل کی طرف سے جیسا: اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ہم کو سکھایا ہے“

مگر جیسا کہ ہم نے پارہ اول میں سورہ حمد کی تفسیر کے شروع میں تحریر کیا ہے: اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِينُ جس سلسلہ کا جز ہے، یعنی سورہ الحمد، اس کے پہلے اقراء تھا جو کلام عبد کو کلام الہی میں منسلک کرتا ہے۔ یہاں اُس طرح کی کوئی چیز نہیں ہے۔

بہر حال جیسا کہ پہلے میں اپنی بے اطمینانی ظاہر کر چکا ہوں، میں اس شان نزول سے مطمئن نہیں ہوں مگر جب ہمارے متقدمین اس آیت کے محل تنزیل کا صحیح طور پر پتہ نہیں لگا سکتے تو ہم اب کیوں کر پتہ لگا سکتے ہیں۔

”اللہ کے نام سے سب اُس کی صفت ہیں۔ یعنی کوئی ہے اُس صفت کا“ (موضح القرآن)

ہمارے مفسرین بھی اس سے متفق ہیں [۱] اور یہ سوال کیا کہ ”کیا تمہیں اس کا ہم نام معلوم ہے؟“ صورتہ سوال ہے مگر حقیقتہً نفی مقصود ہے کہ اُس کا ہم نام کوئی نہیں ہے یعنی اُس کے صفات و کمالات، دوسری لفظوں میں اُلُوہیت میں اُس کا شریک کوئی نہیں ہے۔ [۲]

[۱] سمیایا ای مثلاً و شہباً (تبیان)

[۲] هذا استفهام بمعنى التثني ای لانعلم من یسمی بلفظة الله (مجمع البیان)

وَيَقُولُ الْإِنْسَانُ إِذَا مَا مِثُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا ۝۶۶ أَوْلَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ أَنَّا
خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ۝۶۷ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيَاطِينَ ثُمَّ
لَنَحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ۝۶۸ ثُمَّ لَنُنزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيعَةٍ أَيُّهُمْ أَشَدُّ عَلَى
الرَّحْمَنِ عِتِيًّا ۝۶۹ ثُمَّ لَنَحْنُ أَعْلَمُ بِالَّذِينَ هُمْ أَوْلَىٰ بِهَا صِلِيًّا ۝۷۰

’اور انسان کہتا ہے کہ کیا جب میں مر جاؤں تو پھر مستقبل میں زندہ ہو کر باہر لایا جاؤں گا؟ کیا انسان کو یاد نہیں ہے کہ ہم نے اُس کو پیدا کیا اس کے پہلے جب کہ وہ کچھ تھا ہی نہیں تو قسم ہے تمہارے پروردگار کی ہم انہیں شیطانوں کے ساتھ ساتھ حشر میں لائیں گے، پھر اُن کو دوزخ کے ارد گرد گھٹنوں کے بل گرتی ہوئی شکل میں حاضر کریں گے۔ پھر ہم ہر پارٹی میں سے الگ کریں گے کہ کون ان میں سے زیادہ خدائے رحمن کے مقابلہ میں سرکشی کرنے والا تھا؟ پھر ہم خوب واقف ہیں کہ ان میں سے کون اُس میں داخل ہونے کے زیادہ سزاوار ہیں‘۔

اثبات معاد:

مذکورہ بالا آیات میں معاد کو ثابت کیا گیا ہے۔

وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۝۷۱ ثُمَّ نُنْجِي الَّذِينَ
اتَّقَوْا وَنَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا ۝۷۲

’اور کوئی تم میں ایسا نہیں ہے، جو اُس کی طرف جائے نہیں، یہ تمہارے پروردگار کا یقین طور پر طے شدہ فیصلہ ہے، پھر جو پرہیزگار ہوں گے، انہیں ہم نجات دیدیں گے اور ظالموں کو اس میں چھوڑ دیں گے اس عالم میں وہ گھٹنوں کے بل گئے ہوئے ہوں گے‘۔

دوزخ کی طرف سے عمومی گزر:

اس آیت کی تفسیر میں بعض مفسرین کا تصور ہے کہ داخل جہنم سب ہی ہوں گے چاہے و مؤمنین ہوں [۱] مگر دوسرے معنی یہ ہیں اور وہی درست معلوم ہوتے ہیں کہ گزریں گے اُدھر سے سب لیکن جو اہل ایمان میں وہ گزرتے ہوئے آگے بڑھ جائیں گے [۲] اور جو کافر ہی یا منافق، وہ اُس میں گر جائیں گے، ہماری قدیم تفسیر جو معصوم علیہ السلام سے وارد ہے اس کے موافق ہے۔ [۳] اور دوسرے آیات قرآن بھی اسے تقویت دیتے ہیں جیسے:

[۱] ای داخل جہنم (جلالین)

[۲] قال قوم وهو الصّحيح ان ورودهم هو وصولهم اليها و اشرافهم عليها من غير دخول منهم فيها (تبيين).

[۳] عن ابي عبد الله عليه السلام قال ما سمع الرجل يقول وردنا ماء بنى فلان فهو الورود ولم يدخالها (علي بن ابراهيم)

إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَىٰ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ ﴿٥١﴾ (انبیاء)

جن پر ہمارا احسان پہلے سے ہے، یہ اُس سے دور رہیں گے۔^[۱]

وَإِذَا تَنَلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا لَا إِلَهَ إِلَّا الْفَرِيقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَأَحْسَنُ نَدِيًّا ﴿٥٢﴾ وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّن قَرْنٍ هُمْ أَحْسَنُ أَثَانًا وَرِعْيًا ﴿٥٣﴾ قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلَالَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمَنُ مَدَدًا ۗ حَتَّىٰ إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ إِمَّا الْعَذَابَ وَإِمَّا السَّاعَةَ ۗ فَسَيَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضْعَفُ جُنْدًا ﴿٥٤﴾

’اور جب اُن کے سامنے ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو کافر لوگ اُن سے کہ ایمان لائے، کہتے ہیں کہ دونوں گروہوں میں سے کون بہتر ہے، مکان کے لحاظ سے اور کون زیادہ اچھا ہے رونقِ محفل کے اعتبار سے، حالانکہ کتنی نسلیں ہم نے ان کے پہلے ہلاک کی ہیں جو ساز و سامان اور دکھاوے میں ان سے بہتر تھیں، کہیے کہ جو گمراہی میں ہوتا ہے تو بالک ٹھیک ہے کہ سب کو فیض پہنچانے والا اُسے زیادہ عطا کرتا ہے، یہاں تک کہ جب آنکھوں سے دیکھیں گے وہ جس کا وعدہ وعید اُن سے ہوا ہے، خواہ یہیں کا عذاب اور خواہ قیامت، تب اُنہیں معلوم ہوگا کہ کون زیادہ بُرا ہے مکان کے اعتبار سے اور زیادہ کمزور ہے لاؤ لشکر کے لحاظ سے۔‘

یہ کفار بھی ذہنیت جو ان آیات میں اُن کے عمل سے نمایاں کی گئی ہے، اس کوتاہ اندیشی پر مبنی ہے کہ یہی دنیا سب کچھ ہے، لہذا جس کے پاس ساز و سامان دنیا زیادہ ہے، وہی کامیاب و کامران ہے^[۲] اس کے بالمقابل آخرت کا تصور اس ساز و سامان دنیا کو بے اعتبار قرار دیتا ہے جس کی تصدیق کے لئے ان آیات میں اور دوسرے مقامات پر قرآن میں گزشتہ امتوں کے انجام کی طرف ان کو متوجہ کیا گیا ہے کہ ساز و سامان دنیا تو ان کے پاس اس سے زیادہ تھا۔ پھر انجام کیا ہوا؟

وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى ۗ وَالْبُقِيَّتِ الصَّلَاحُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ مَّرَدًّا ﴿٥٥﴾

’اور جنہوں نے ہدایت حاصل کی، اللہ ان کی اور زیادہ ہدایت کا سامان کرتا ہے اور باقی رہنے والے نیک کام تمہارے پروردگار کے یہاں بہتر ہیں ثواب کے لحاظ سے اور بہتر ہیں مال کے اعتبار سے۔‘

[۱] کیف یكون مبعودا مع انهم اذ خلها و ذلك متناقض (تبیان)

[۲] اثمنا خروا بالمال وزينة الدنيا ولحميتنا فگرو في العاقبة (مجمع البيان)

الفاظ سے ظاہر ہے کہ پہلا حصول ہدایت باختیار خود ہے جس کے صلہ میں مزید تفیقات ان کے شامل حال ہوتے ہیں۔^[۱]

أَفْرَأَيْتَ الَّذِي كَفَرَ بِآيَاتِنَا وَقَالَ لَأُوتِيَنَّ مَالًا وَوَلَدًا ۗ أَطَّلَعَ الْغَيْبَ أَمِ
اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَنِ عَهْدًا ۗ كَلَّا ۖ سَنَكْتُبُ مَا يَقُولُ وَنَمُدُّ لَهُ مِنَ الْعَذَابِ
مَدًّا ۗ وَنُرِيهِ مَا يَقُولُ وَيَأْتِينَا فَرْدًا ۗ

’کیا دیکھا آپ نے اُسے جس نے ہماری آیات کے ساتھ کفر اختیار کیا اور کہا مجھے مال اور اولاد کی نعمت ضرور مل جائے گی۔ کیا اسے غیب کی خبر معلوم ہوئی ہے۔ اس سے اللہ کے یہاں سے کوئی عہد و پیمانہ حاصل کر لیا ہے؟ ہرگز ایسا نہیں ہم جو وہ کہتا ہے، اسے لکھ لیں گے اور اس کے عذاب میں پورے طوراً اضافہ کریں گے اور جو کچھ وہ کہتا ہے، اس کے بعد ہم اس کے وارث ہوں گے اور وہ ہمارے پاس ایک اکیلا آئے گا۔‘

کافر کے اس کہنے کا مطلب یہ بتایا گیا ہے کہ اگر اس موت کے بعد دوبارہ زندگی ہے تو اس زندگی میں بھی اسی طرح میری اولاد ہوگی اور مال و دولت حاصل ہوگا^[۲] اس کی رد کی گئی ہے کہ یہ مال و اولاد تو بس اس دنیا سے رخصت ہونے تک ہے۔ وہاں یہ کچھ نہیں ہوگا، وہاں تو ہر ایک اکیلا آئے گا۔

دوسرا مفہوم یہ بتایا گیا ہے کہ کافر کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں ایمان لا کر کیا کروں، اپنے کفر پر قائم ہوں تب بھی مال اور اولاد جو میرا مطمح نظر ہیں، وہ تو میرے لئے اس حالت کفر میں بھی حاصل رہیں گے۔^[۳]

آخر کا فقرہ: نُرِيهِ مَا يَقُولُ اس تشریح کے زیادہ مطابق ہے یعنی یہ مال اولاد جنہیں وہ کہتا ہے اس کے پاس ”تا بکے“ رہیں گے؟ اگر ان سب نے اس کی زندگی میں ساتھ بھی دیا تو وہ خود بیٹھا نہیں رہے گا۔ آخر میں وہ چلا جائے گا اور اس کے بعد نتیجہ میں تو وہ مال اور اولاد سب ہمارے ہی قبضہ میں ہوگا، جب تک چاہیں رکھیں اور جب چاہیں ختم کر دیں۔

بڑے تعجب کی بات ہے کہ شاہ رفیع الدین نے اس کا ترجمہ کیا ہے: ”وارث کریں گے ہم اُس چیز کا جو کہتا ہے“۔

یہ ترجمہ نُورِ ثَمَّة کے لفظ کا ہے جو قرآن میں نہیں ہے، نُورِ ثَمَّة کا نہیں جو قرآن میں ہے۔

وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ إِلَهَةً لِيَكُونُوا لَهُمْ عِزًّا ۗ كَلَّا ۖ سَيَكْفُرُونَ
بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ۗ

اور انہوں نے بنائے ہیں اللہ کو چھوڑ کر بہت سے خدا کہ وہ ان کے لئے شان و شوکت کا باعث ہوں ہرگز ایسا نہ ہوگا

[۱] ان يفعل بهم اللطاف يستكشرون عندها الطاعات (تبیان)

[۲] لا تبين على تقدير البعث مالا وولدا (جلالین) اگر پھر جیوں گا تو یہی مال اور اولاد وہاں بھی ہوگا۔ (موضح القرآن)

[۳] قيل اعطى في الدنيا اذا اقامت على دين ابائى وعبادة الهى اعطى امالا وولدا (مجمع البيان)

وہ عنقریب اُن کی عبادت سے انکاری ہوں گے۔

کون؟ کس سے؟ اس میں دو قول ہیں [۱] ایک قول یہ ہے کہ یہ کافر لوگ اہوالِ قیامت دیکھنے کے بعد ان معبودانِ باطل سے انکاری ہوں گے [۲] اور دوسرے یہ کہ وہ معبودانِ باطل ان سے انکاری ہوں گے۔ [۳]
قرآن مجید کی دوسری آیات سے دونوں باتوں کا وقوع ثابت ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّا أَرْسَلْنَا الشَّيَاطِينَ عَلَى الْكُفْرِيِّينَ تَوَؤُّهُمُ أَزًّا ۗ فَلَا تَعْبَلُ عَلَيْهِمْ ۗ إِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَذَابًا ۗ يَوْمَ تَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمَنِ وَفْدًا ۗ
وَتَسْؤِقُ الْمُجْرِمِينَ إِلَى جَهَنَّمَ وَرِدًّا ۗ لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَنِ عَهْدًا ۗ

’کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ہم نے شیطانوں کا کافروں تک بھیجا کہ وہ انہیں شدت سے جنس میں لاتے ہیں، تو جلدی نہ کرو ان پر تو گن گن کر اُن کی عمر کے دن پورے کر رہے ہیں جس دن پر ہیزگاروں کو محشر کے دن خدائے رحمن کی طرف ہم سوار یوں پر لائیں گے اور گن گاروں کو دوزخ کی طرف داخلہ کے لئے تشنگی کے عالم میں ہنکا کر لے جائیں گے۔ انہیں شفاعت کا کوئی اختیار نہ ہوگا مگر جس کے لئے اللہ کی طرف سے یہ منصب حاصل ہو گیا ہو‘۔

ثبوت شفاعت:

’ہم نے شیطانوں کو کافروں کی طرف بھیجا‘۔ یعنی اُن کی طرف جانے سے راستے میں رکاوٹ پیدا نہیں کی۔ [۴]
قرآن مجید میں جہاں بھی نفی شفاعت ہے، وہاں اکثر کسی طرح کا استثناء موجود ہے۔ اس آیت میں جو استثناء ہے اس سے ظاہر ہے کہ ہر کوئی ہستی یا کچھ ہستیاں ایسی ضرور ہیں جنہیں خالق نے شفاعت کا منصب عطا کیا ہے۔ ایک دوسرے معنی اس کے یہ قرار دیئے گئے ہیں کہ اُس کی شفاعت ہو سکے گی جس نے اللہ کے یہاں سے وعدہ مغفرت لے لیا ہو یعنی شہادتین کا قرار رکھتا ہو اسلام کی بنیاد ہے۔ [۵]
اس صورت میں بھی چاہے شفاعت کرنے والے کے وصف پر کوئی روشنی نہ پڑے لیکن اجمالی طور پر اصل شفاعت کا ثبوت تو ہو ہی جاتا

[۱] قبل فی معنایہ قولان (تبیان)

[۲] منکر خواہند شد پیر ستش کنندگان معبودان خود را (شاه ولی اللہ)

[۳] سیفکرون ای الالہة بعبادتهم ای یقرنہا (جلالین)

[۴] ای خلنا بینہم و بین الشیاطین اذا وسوا بینہم و دعوہم الی الضلال (مجمع البیان)

[۵] عہد ای شہادۃ ان لا الہ الا اللہ (جلالین) یعنی مسلمان شدہ (شاه ولی اللہ)

ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَنُ وَلَدًا ۗ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ۙ ﴿٩٨﴾ تَكَادُ السَّمَوَاتُ
يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۙ ﴿٩٩﴾ أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمَنِ وَلَدًا ۙ ﴿١٠٠﴾
وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمَنِ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا ۗ ﴿١٠١﴾ إِنَّ كُلُّ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي
الرَّحْمَنِ عَبْدًا ۗ ﴿١٠٢﴾ لَقَدْ أَحْصَاهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ۗ ﴿١٠٣﴾ وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ
فَرْدًا ۗ ﴿١٠٤﴾

”اور انہوں نے یہ کہا کہ خدائے رحمن نے بیٹا قرار دیا ہے، ارے تم نے ایسی بری بات کہی ہے کہ جس سے عجب نہیں آسمان شگافہ ہو جائیں اور زمین پھٹ جائے اور پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین پر گر جائیں کہ انہوں نے خدائے رحمن کیلئے بیٹا تجویز کیا حالانکہ خدائے رحمن کیلئے سزاوار نہیں کہ وہ بیٹا بنائے۔ آسمانوں اور زمین میں کوئی نہیں مگر یہ کہ وہ خدائے رحمن کی بارگاہ میں ایک بندہ کی صورت میں آنے والا ہے۔ وہ ان کے احاطہ کئے ہوئے ہے اور اُس نے پوری طرح اُن کا جائزہ لیا ہے اور ہر ایک ان میں سے اس کے پاس قیامت کے دن اکیلا آئے گا۔“

خالق کے لئے تصور اولاد کے جرم کی اہمیت:

اس کے پہلے جب یہ الفاظ آئے تھے کہ اللہ نے بیٹا قرار دیا ہے تو بعض اہل نظر کی رائے اسکے مفہوم پر نظر کرتے ہوئے یہ درج کی گئی تھی اور ہم نے بھی اس کے موافق رجحان ظاہر کیا تھا کہ اس کے معنی منہی بنانے کے ہیں جس کی تائید میں تلاش سے عیسائیوں کے ایک طبقہ کا خیال مل گیا تھا کہ وہ جناب عیسیٰ کو حقیقی بیٹا نہیں مانتے بلکہ منہی سمجھتے ہیں مگر یہاں شروع کے الفاظ وہی کرتے ہوئے کہ: اتَّخَذَ الرَّحْمَنِ وَلَدًا ”اللہ نے بیٹا قرار دیا ہے“ بعد میں جس ہولناک انداز میں اس قول کے شدید طور پر غلط ہونے کا اظہار کیا گیا ہے، وہ منہی بنانے کے تصور پر منطبق نہیں کیوں کہ یہ بات غلط سہی مگر اسی شدت سے عظمت الٰہی کو صدمہ نہیں پہنچاتی کہ اُس کے نتیجہ کو اتنے شدید انداز میں پیش کیا جائے۔ یہ تو ایسے ہی تصور کے ساتھ سا زگار ہے کہ واقعی کسی کو اس کا بیٹا کہا جائے۔ اس سے نتیجاً لوہیت حضرت باری تعالیٰ اور اس کے جلال کو شدید صدمہ پہنچتا ہے جسے اس انداز میں پیش کرنا درست ہے جو یہاں قرآن مجید نے اختیار کیا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَنُ وُدًّا ۙ ﴿٩٦﴾

”بلاشبہ وہ جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال کیے، اُن کے لئے خدائے رحمن محبت قرار دینے والا ہے۔“

ایک خاص جماعت کی محبت کے فرض قرار دیئے جانے کا پیشگی اعلان:

”قرار دینے والا ہے“ یعنی فطری طور پر دلوں کو ان کی جانب مائل کرنے والا اور ان کی محبت دلوں میں ڈالنے والا ہے [۱] یا حکمی طور پر ان کی محبت کا فریضہ عائد کرنے والا ہے۔

الفاظ قرآن یہی بتاتے ہیں اور مزید نگاہ دوڑائی جائے تو خلیل ﷺ کی دعا اپنی ذریت کے لئے اسی قرآن میں ملے گی کہ:
فَاَجْعَلْ اَفِيْدَةً مِّنَ النَّاسِ يَتَّبِعُوْنِي الْيَوْمَ وَالْيَوْمَآءِ: قرار دے انسانوں کے دلوں کو کہ وہ ان کی طرف مائل ہوں۔ (ابراہیم۔ ۳۷)
پھر متفق علیہ احادیث کی روشنی میں اس کا مصداق آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود بھی ہے جن کی محبت فریضہ ایمانی کی حیثیت رکھتی ہے مگر معلوم نہیں جلالین نے کس بنیاد پر یہ معنی دیئے ہیں کہ:

وَدَفِيْمًا بَيْنَهُمْ يَتَوَادُّوْنَ وَيَتَحَابُّوْنَ وَيَحْبِبُهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى: محبت آپس میں وہ کہ ایک دوسرے سے محبت اور الفت رکھیں اور خداوند عالم ان سے محبت رکھتا ہے۔

شاہ ولی اللہ نے بھی حاشیہ میں یہ غیر متبادر لکھے ہیں کہ:

”یعنی با یکدیگر دوست باشند“ (فتح الرحمن)

ان سے اچھان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر ہیں جنہوں نے بڑے شگ اور تذبذب کیساتھ سہی مگر جو اصل آیت سے معنی سمجھ میں آتے ہیں اور جو دوسرے دلائل کے مطابق ہیں، وہ بھی درج کر دیے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

”یعنی ان سے محبت کرے گا یا ان کے دل میں اپنی محبت پیدا کرے گا یا خلق کے دل میں ان کے محبت“ (موضح القرآن)

قدیم مفسرین میں سے ربیع بن انس کا قول ہے جسے جناب شیخ طوسی نے نقل کیا ہے:

اِذَا احَبَّ اللّٰهُ عِبْدًا طَرَحَ مَحَبَّتَهُ فِيْ قُلُوْبِ اَهْلِ السَّمَآءِ وَفِيْ قُلُوْبِ اَهْلِ الْاَرْضِ (تبیان)۔

”جب اللہ کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو اسے محبت ڈال دیتا ہے اہل آسمان کو دلوں میں اور اہل زمین کے دلوں میں۔

علامہ طبرسی نے متعدد احادیث درج کی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ آیت آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے بارے میں ہے، جن کے گل سرسید حضرت علی بن ابی طالب ﷺ ہیں ایک روایت جناب ابن عباسؓ سے ہے کہ انہوں نے کہا کہ وہ حضرت علی ﷺ کے بارے میں ہے۔

فَمَا مِنْ مَّوْمِنٍ اِلَّا وَفِيْ قَلْبِهِ مَحَبَّةٌ لِّعَلِيٍّ:

کوئی بھی مومن نہیں ہے مگر یہ کہ اس کے دل میں علی ﷺ کی محبت ہے۔

دوسری ابو حمزہ ثمالی کی روایت ہے امام محمد باقر ﷺ سے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی ﷺ سے فرمایا تم اللہ سے دعا کرو کہ:

اللّٰهُمَّ اجْعَلْ لِيْ عِنْدَكَ عَهْدًا وَاجْعَلْ لِيْ فِيْ قُلُوْبِ الْمُوْمِنِيْنَ وَدَا:

خداوند! مجھے اپنے یہاں ایک خاص منصب عطا کر اور میرے لئے مومنین کے دل میں محبت قرار دے۔

[۱] پیدا خواہد کردہ برائے ایشان دوستی (شاہ ولی اللہ) کرے گا واسطے ان کے رحمن محبت (شاہ رفیع الدین)

حسب ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؑ نے بارگاہ الہی میں یہ مناجات کی اور اس پر یہ آیت نازل ہوئی اس طرح کا مضمون جابر بن عبد اللہ انصاریؓ کی روایت میں بھی وارد ہے۔

فَاِمَّا يَسِرُّنَّهِ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لُدًّا ﴿٩٤﴾ وَكَمْ

اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ۗ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿٩٥﴾

”اور ہم نے اُسے آپ کی زبان کے ذریعے اس لئے آسان بنا دیا ہے کہ آپ اس کے ذریعے سے پرہیزگاروں کو خوش خبری سنا سکیں اور اس کے ساتھ اہل عناد کو عذاب سے متنبہ کریں اور کتنی ہی ہم نے ان کے پہلے نسلیں ہلاک کیں، کیا ان سے کسی کو بھی اب تم دیکھتے ہو یا ان کی کوئی ہلکی سی بھی آواز سنتے ہو؟“

قرآن کو ’آسان‘ کہہ کے تفسیر سے بے نیازی کا دعویٰ کرنے والے دیکھیں کہ قرآن نے اس آسانی کو زبان پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ کیا ہے [۱] اس لئے اس زبان کے بیان کو چھوڑ کر اگر قرآن کو بطور خود دیکھیے تو اسے آپ کا آسان سمجھنا غلط ہوگا اور اسے بطور خود سمجھ کر نتائج آپ نکالیں گے، وہ بھی غلط ہوں گے۔

[۱] آسان ساختیہ قرآن را بزبان تو (شاہ ولی اللہ) آسان کیا اس قرآن کو ساتھ زبان تیری کے (شاہ رفیع الدین)

ابھی تک میرا ذہن اس کے ماخذ کی دریافت سے قاصر ہے۔

شان نزول میں وارد ہوا ہے پیغمبر ﷺ اس سورہ کے اترنے سے پہلے عبادت خدا بڑی مشقت اٹھاتے تھے۔ اسی کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ یہ قرآن اس لئے آپ پر نہیں اتارا گیا ہے کہ آپ اس قدر زحمت و مشقت برداشت کریں یعنی عبادت میں زحمت شاقہ اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ [۱]

اس سے مختلف دوسری شان نزول بھی آئی ہے مگر وہ کسی معصوم ﷺ کی زبانی وارد نہیں ہے۔ [۲] جب کہ پہلی شان نزول کے لئے معصومین ﷺ کی زبانی روایت موجود ہے۔ [۳]

الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰی ﴿۵﴾

”وہ سب کو فیض پہنچانے والا ہے [۴] اُس کا عرش پر اقتدار قائم ہے“

چونکہ پہلے پارہ میں تھم استوی علی العرش آچکا ہے، اس لئے اس کی تشریح جتنی ممکن ہے، وہ ہو چکی ہے۔ بہر حال وہ عرش پر قائم ہے مگر ایسا قائم ہونا۔ جو اس کی ذات لامکان کے شایان شان ہو [۵] اور جس سے جسمیت لازم نہ آتی ہو، اس لئے کہ وہ جسم و جسمانیت سے بری ہے۔ [۶]

لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰی ﴿۶﴾ وَاِنْ تَجَهَّرْ

بِالْقَوْلِ فَاِنَّهُ يَعْزَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰی ﴿۷﴾ اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ لَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی ﴿۸﴾

”اُس کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور جو ان دونوں کے درمیان ہے اور جو زمین کے نیچے ہے اور اگر تم زور سے زور بات کہتے ہو تو (خبر کہو) یقیناً اللہ چپکی کی بات اور اس سے بھی زیادہ چھپی ہوئی چیز کو جانتا ہے۔ کوئی خدا نہیں سوائے اس اللہ کے۔ اُسی کے ہیں تمام اچھے نام“

”چپکے کی بات“ سے بھی زیادہ چھپی چیز، دل ہی دل میں یاد الہی کرنا اُس کی میت ہے، خدا اس سب سے واقف۔ [۷] اور جب وہ اس

[۱] لتتعبد مما فعلت بعد نزوله من طول قيامك لصلوة الليل اي خفف عن نفسك. (جلالین)

[۲] قال الحسن هو جواب للمشرکین حين قالوا انه شقی (مجمع البيان)

[۳] عن ابی عبدالله و ابی جعفر علیهما السلام قال کان رسول الله ﷺ اذا صلی قام علی اصابع رجلیه حتی تور ما قنزل الله (علی ابن

ابراھیم)

[۴] ای هو الرحمن (مجمع البيان)

[۵] استواء یلیق به (جلالین)

[۶] اما الاستواء معنی الجلو س علی الشیء فلا یجوز علیہ تعالیٰ لانه من صفة الاجسام والاجسام کلها محدثة (تبیان)

[۷] اخفی منه ای ما حدثت به النفس وما خطر ولم تحدث به (جلالین)

سب سے واقف ہے تو اسے پکارنے میں آواز زیادہ بلند کرنے کی کیا ضرورت ہے۔^[۱]

چونکہ اس سے پہلے خالق کا ذکر ’الرحمن‘ سے ہوا ہے اور اس رحمن کی لفظ سے مشرکین وحشت محسوس کرتے تھے جس کا کئی جگہ قرآن مجید میں تذکرہ ہے تو اسی وحشت کو دور کرنے کے لئے سمجھا یا گیا ہے کہ رحمن ایک اچھی صفت کی حامل لفظ ہے اور جتنے اچھے صفات ہیں، وہ خالق کی ذات میں ہیں، اس لئے رحمن بھی وہی اللہ ہے۔

اس میں وحشت کی کوئی بات ہے؟^[۲]

وَهَلْ آتٰكَ حَدِيْثُ مُوسٰى ۙ اِذْ رَا نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِيْهِ امْكُثُوْا اِنِّىْ اَنْتُمْ نَارًا
لَّعَلِّىْ اْتِيْكُمْ مِنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجْدُ عَلٰى النَّارِ هُدٰى ۙ فَلَمَّآ اْتٰهَا نُودِيَ
بِمُوسٰى ۙ اِنِّىْ اَنَا رَبُّكَ فَارْحَلْ نَعَلَيْكَ ۗ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۙ وَاَنَا
اخْتَرْتُكَ فَاَسْتَمِعْ لِمَا يُوحٰى ۙ اِنِّىْ اَنَا اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدْنِىْ ۙ وَاَقِمِ
الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ ۙ اِنَّ السَّاعَةَ اَتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا
تَسْعٰى ۙ فَلَا يَصُدُّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهٗ فَتَرٰ دِى ۙ

’اور کیا پہنچا ہے تم تک واقعہ موسیٰ علیہ السلام کا؟ جب انہوں نے ایک آگ دیکھی تو اپنے بال بچوں سے کہا کہ تم ٹھہرو میں نے ایک آگ دیکھی ہے، بہت ممکن ہے کہ میں تمہارے پاس اُس میں سے کچھ آگ لے آؤں یا اُس آگ پر کوئی رہنمائی حاصل کروں، تو جب اس کے پاس پہنچ گئے تو انہوں نے صدا دی گئی کہ اے موسیٰ علیہ السلام! میں تمہارا پروردگار ہوں تو اپنی دونوں جوتیاں اتار دو۔ بلاشبہ تم مقدس و محترم وادی طویٰ میں ہو اور میں نے تمہیں منتخب کیا ہے تو غور سے سنو اُسے جو وحی ہوتی ہے، بلاشبہ میں اللہ ہوں، کوئی خدا نہیں سوا میرے تو میری عبادت کرو اور میری یاد کے لئے نماز ادا کرو، یقیناً قیامت آنے والی ہے، چاہتا ہوں کہ پوشیدہ رکھوں اُسے تاکہ ہر نفس کو معاوضہ ملے اس کا جو وہ کوشش کرے تو تمہیں اُس سے روکے نہ کوئی جو اُس پر ایمان نہیں رکھتا اور جو اپنی نفسانی خواہشوں کا پیرو ہے کہ تم ہلاک ہو جاؤ گے۔‘

جناب موسیٰ علیہ السلام کے واقعات کا تفصیلی بیان ---- آگ لینے کو جانا اور پیغمبری پانا:

[۱] فلا تجهر نفسك برفع الصوت (مجمع البيان)

[۲] کافر جب رحمن سنتے تو کہتے تم ایک کو ٹھہراؤ، کبھی کسی کو پکارتے ہو، کبھی کسی کو (موضح القرآن)

آگ کو دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے متعلقین سے دو باتیں کہیں، اس لئے کہ اجاڑ شدت سے تھا اور راستہ بھی بھول گئے تھے ^[1] یہاں پر ایک شاعر کا شعر بطور عوامی مثل کے اردو زبان والوں کے زبان زد ہے کہ:

خدا کے فضل کا موسیٰ سے پوچھیے احوال

کہ جائیں آگ کو لینے پیہری مل جائے

اس کا مضمون زیادہ مکمل طور پر حدیث معصوم علیہ السلام میں وارد ہوا ہے:

قال الصادق عليه السلام حدثني ابي عن جدّي عن امير المؤمنين عليه السلام قال: كن لما تروح ارجي منك لما تروح ارجي فان
موسى بن عمران خرج تقنيس لاهله ناراً فكلّمه الله عزّوجلّ فرجع نبياً وخرجت ملكة سبا كافرّة فاسلمت مع
سليمان وخرج سحرّة فرعون يطلبون الغزّة لفرعون فرجعوا مؤمنين. (مجمع البيان)

امام جعفر صادق علیہ السلام نے کہا مجھ سے میرے والد نے میرے دادا کی زبانی امیر المؤمنین علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ فرمایا جس کی (بظاہر اسباب) تمہیں امید نہ ہو اسکے حصول کے اس زیادہ امید وار جتنے اس کے جس کی بظاہر امید ہو، دیکھو موسیٰ بن عمران گئے اپنے گھر والوں کے لئے آگ لینے، تو اللہ نے ان سے کلام کیا اور وہ نبی ہو کر پلٹے اور ملک سبا کی ملکہ نکلی اس عالم میں کہ وہ کافر تھی اور سلیمان علیہ السلام کے ساتھ وہ درجہ اسلام پر فائز ہو گئی اور فرعون کے یہاں کے جادوگر نکلے تھے فرعون کے غلبہ کی خاطر اور نتیجہ میں ایمان قبول کیا۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَمْوَسَىٰ ۗ قَالَ هِيَ عَصَايَ ۗ أَتَوَكَّأُ عَلَيْهَا وَأُشْفَىٰ بِهَا عَلَىٰ

غَيْبِي ۚ وَلِي فِيهَا مَارِبٌ أُخْرَىٰ ۗ قَالَ أَلْقَهَا يَمْوَسَىٰ ۗ فَأَلْقَهَا فَإِذَا هِيَ حَبِيبَةٌ

تَسْعَىٰ ۗ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۗ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَىٰ ۗ وَاضْمُمْ يَدَكَ

إِلَىٰ جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ آيَةً أُخْرَىٰ ۗ لِنُرِيكَ مِنْ آيَاتِنَا

الْكُبْرَىٰ ۗ إِذْ هَبْنَا فِرْعَوْنَ أَنَّهُ طَغَىٰ ۗ

”اور یہ تمہارے دائیں ہاتھ میں کیا ہے اے موسیٰ!؟ کہا وہ میرا عصا ہے جس کا میں سہارا لیتا ہوں اور اُس سے اپنی بکریوں پر درخت سے پتے گراتا ہوں اور میرے لئے اس میں اور دوسرے فائدے بھی ہیں۔ کہا اسے پھینک دو اے موسیٰ! اس پر انہوں نے اُسے پھینک دیا تو ایک دم وہ ایک سانپ ہو گیا جو دوڑ رہا تھا۔ اس نے کہا پکڑ لو اُسے ڈرو نہیں۔ ہم ابھی اُسے پہلی صورت پر پلٹا دیں گے اور اپنا ہاتھ اپنے بازو کی طرف سمیٹو۔ وہ باہر آئے گا چمکتا ہوا بغیر کسی برائی کے جو دوسرا معجزہ ہو گا تا کہ ہم دکھائیں تمہیں اپنی قدرت کی نشانیوں میں سے کچھ۔ جاؤ فرعون کی طرف کہ اس نے بڑی سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔“

[1] وکان فی شتاء وقد منع علیہ القدح وذلّ عن الطريق (تبیان)

عصا اور ید بیضاء:

”بغیر کسی برائی کے، اس کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ جسم میں سفید کا نمودار ہونا مرض ہوتا ہے جس سے پناہ مانگی جاتی ہے تو یہ ظاہر کر دیا گیا کہ یہ ہاتھ کی سفیدی ضیاء و نور کی حیثیت سے ہوگی جس سے کسی قسم کے (معاذ اللہ) عارضہ کا تصور پیدا نہ ہوگا۔^[1]

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ۝ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ۝ وَاحْلِلْ عُقْدَةً مِنِّي لَيْسَانِي ۝
يَفْقَهُوا قَوْلِي ۝ وَاجْعَلْ لِي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي ۝ هَرُونَ أَخِي ۝ اَشْدُدْ بِهٖ أَرْزَمِي ۝
وَاشْرِكْهُ فِي أَمْرِي ۝ كَيْ نَسْبِحَكَ كَثِيرًا ۝ وَنَذْكُرَكَ كَثِيرًا ۝ إِنَّكَ كُنْتَ بِنَا
بَصِيرًا ۝

”کہا انہوں نے پروردگار! میرا سینہ کو کشادہ کر دے اور میرے لئے میرے کام کو آسان کر دے اور میری زبان سے گرہ کھول دے کہ وہ لوگ میری بات سمجھ لیں اور میرے لئے میرے خاندان میں سے میرے بھائی ہارون کو قرار دے دے۔ ان کے ذریعہ سے میری کمر کو مضبوط بنا اور انہیں میرے کام میں شریک کر دے کہ ہم بہت زیادہ تیری تسبیح کریں اور بہت زیادہ تجھے یاد کریں یقیناً تو ہمارے حالات کا دیکھنے والا ہے۔“

جناب موسیٰ علیہ السلام کی مناجات اور ہارون کو اپنا وزیر اور شریک کار بنانے کی التجا:

احادیث سے ثابت ہے کہ ایسے ہی الفاظ میں دعا ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کی اور اپنے بھائی علی بن ابی طالب علیہ السلام کیلئے اپنے ساتھ وزیر اور شریک کار بنائے جانے کی دعا فرمائی جس کا جواب سمجھنا چاہیے اللہ سبحانہ کی طرف سے ان الفاظ میں کہ:

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِي أَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝ فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝

کیا ہم نے آپ کے سینہ کو کشادہ نہیں کیا اور آپ کے اُس بوجھ کو جو آپ کی پشت کو شکستہ کیے دے رہا تھا، آپ سے اتارا نہیں اور آپ کے ذکر کو بلند نہیں کیا؟ یقیناً مشکلوں کے ساتھ ہی آسانی ہوتی ہے یقیناً مشکلوں کے ساتھ ہی آسانی ہوتی ہے۔“

(یعنی یہ سب باتیں تو بغیر آپ کی دعا کے پہلے ہی آپ کیلئے حاصل ہو چکی ہیں، اب رہا آخری جزء، وہ بھی خالق کی طرف سے تو مقرر ہو چکا ہے، اس کا اعلان عام ہے فَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ ۝ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝) اب جب حجۃ الوداع سے فارغ ہو کر پلٹے تو بعد کا انتظام حسب منشاء پروردگار کر دینے کی زحمت کیجیے اور اپنے جانشین کے تقرر کا اعلان کر دیجیے اور پھر بارگاہ پروردگار کا رخ کرتے ہوئے دنیا سے اٹھ جائیے، اسی فرمان اعلان کی تجدید تھی جو پیغمبر پر حکم تاکید یا لَیْسَ بِهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۝ (مانندہ ۶۷) کے الفاظ میں آئی جس

[1] من غیر سوء ای من غیر برص (تبیان) فی قول الجمع (جمع البیان)

کی تعمیل میں رسول نے غدیر خم کا تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا اور آخر میں یہ اعلان کیا کہ: من کنت مولاه فهذا علی مولاه جس پر یہ آیت اتری کہ: **الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا**. (سورہ مائدہ - ۳)

یہ پورا واقعات کا حلقہ بحلقہ ایک سلسلہ ہے جس کی ہر کڑی کے ثبوت کیلئے کتب فریقین میں شہادتیں کر کے ایک دم یعنی بلا کسی تشبیہ کے آیت کے ذیل میں ”آدم برسر مطلب“ کے طور پر قیدیوں قصیدہ شروع فرمادیتے ہیں جس کا ابتداء میں بیان کیا ہوا فلسفہ بھی عجیب و غریب ہے کہ:

”ایسے بڑے پیغمبران کو خالق کی طرف سے خیال نہیں ہوتا۔ ایک پیش کار چاہیے کہ خلق کو بیچ میں سمجھاوے۔ ہمارے پیغمبر کے آگے ابو بکر تھے۔ اول پیغمبر کے وقت سب لوگ انکے سمجھانے سے ایمان میں آئے (موضح القرآن)

واہ واہ، جناب شاہ صاحب! واہ واہ۔ دعائے موسوی میں من اھلی اور انی دو دو نسبتوں کے بعد اسی کی مطابقت کرتے ہوئے اہل بیتؑ اور آج (بھائی) کی خصوصیت کو نظر انداز کرنا۔ سرکار والا ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ گویا خداوند عالم اور قرآن دونوں غیر جمہوری مزاج رکھتے ہیں کہ خاندانی خصوصیت کو سامنے لاتے ہیں اور آپ جمہوریت نواز ہیں کہ خاندان کو نظر انداز فرمانا چاہتے ہیں۔ چاہے اس کے ساتھ اہلیت بھی نظر انداز ہو جائے۔ بے شک ”ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے ابو بکر تھے“ کے فقرہ میں اس ”تھے“ کی تعریف نہیں ہو سکتی یعنی یہاں دعا و عا اور بارگاہ الہی سے تقریر و قرآن کا سوال نہ تھا۔ یہ شروع سے یہاں ہو گئے تھے لیکن یہ بات اگر ”تھے“ اور ”ہو گئے“ سے ہو جایا کرتی تو بچاے حضرت موسیٰ کو بارگاہ الہی میں التجا کی کیا ضرورت تھی؟

حضرت ہارون علیہ السلام کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آگے نہ تھے؟ یہ التجا تو بتاتی ہے کہ یہ منصب خود ”ہو جائے“ سے کیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار و انتخاب سے بھی وابستہ نہیں ہے۔ وہ خود نہ اپنا وزیر مقرر کر سکتے ہیں، نہ جانشین، جب تک خالق کی طرف سے اس کی نامزدگی نہ ہو۔ یہ تو سواد اعظم کے جمہوری تصور کے بالکل خلاف وہ نص والا تصور ہے جسے تنزیل قرآن کے وقت سے اس وقت تک شیعہ اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں جو دنیا کی نظر میں ان کا سب سے بڑا تصور ہے مگر کیا کیا جائے کہ سنتِ انبیاء اور قرآن مجید کے تصریحات اسی کے آئینہ دار ہیں۔

قَالَ قَدْ أُوتِيتَ سُؤْلَكَ يَا مُوسَىٰ ﴿٣٦﴾ وَلَقَدْ مَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰ ﴿٣٧﴾ اِذْ اَوْحَيْنَا اِلَىٰ اُمِّكَ مَا يُوحَىٰ ﴿٣٨﴾ اِنْ اَقْدَفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاَقْدَفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيَلْقِهٖ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَأْخُذْهُ عَدُوُّوْنِي وَعَدُوُّوْلَهُ ۗ وَالْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّمِّي ۗ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِي ﴿٣٩﴾ اِذْ تَمْشِيْ اُخْتِكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدْلُكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ ۗ فَرَجَعْنَا اِلَىٰ اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ۗ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنَاكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنَّاكَ فُتُوْنًا ۗ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْ اَهْلِ مَدْيَنَ ۗ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يُّمُوْسٰى ﴿٤٥﴾

”ارشاد ہوا کہ تمہاری مانگ تمہیں عطا ہوئی اے موسیٰ! اور ہم نے تم پر ایک دفعہ اور بڑا کرم کیا ہے جب ہم نے

تمہاری ماں کی طرف جو وحی بھیجتا تھی، وہ سمجھی یہ کہ تم اس صندوق میں ڈال کر اُسے دریا میں ڈال دو تو دریا اُسے پھینک دے ساحل پر کہ اُسے اٹھالے وہ جو میرا بھی دشمن ہے اور اس کا بھی دشمن ہے اور میں نے تمہارے لئے اپنی طرف سے محبت و الفت پیدا کی، اور اس لئے کہ تم خاص میری نگرانی میں پروان چڑھو، جب تمہاری بہن چلیں اور جا کر کہا کہ کیا میں تم لوگوں کو ایسی شخصیت بتاؤں جو اس کی پرورش کرے، اس طرح ہم نے تم کو تمہاری ماں کی طرف واپس بھیج دیا تاکہ اُن کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ رنجیدہ نہ ہوں اور تم نے ایک آدمی کو جان سے مار ڈالا تو ہم نے تم کو رنج و ملال سے چھٹکارا دیا اور تمہارا پورے طور پر امتحان لیا تو تم کئی برس مدین والوں میں رہے، پھر ایک خاص تقدیر کے فیصلہ پر ادھر آئے۔ اے موسیٰ علیہ السلام!

جناب موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے واقعات اور مدین جانا اور مراجعت:

یہاں پوری تاریخ نامی ہے جو بطور خطاب جناب موسیٰ علیہ السلام کے سامنے دہرائی گئی ہے، پہلے ولادت کے بعد تابوت میں سپرد دریا کیا جانا اور نتیجہ بیان کیا گیا ہے اور پھر جناب موسیٰ علیہ السلام کا مدین جانا اور پھر مراجعت ان واقعات کی کڑیاں اور بہت سے تفصیلات قرآن مجید میں دوسرے مقام پر مذکور ہیں۔

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي ﴿٣١﴾ اِذْ هَبْتَ اَنْتَ وَاخُوكَ بَالِيْتِي وَلَا تَنِيَا فِي ذِكْرِي ﴿٣٢﴾
 اِذْ هَبَا اِلَى فِرْعَوْنَ اِنَّهُ ظَلِيَ ﴿٣٣﴾ فَقَوْلَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشَى ﴿٣٤﴾
 قَالَا رَبَّنَا اِنَّا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَا اَوْ اَنْ يَّظْلِمَنَا ﴿٣٥﴾ قَالَ لَا تَخَافَا اِنِّي مَعَكُمْ اَسْمَعُ وَاَرَى ﴿٣٦﴾ فَاْتِيَهُ فَقَوْلَا اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسَلْ مَعَنَا بَنِي اِسْرَائِيْلَ ﴿٣٧﴾ وَلَا تَعْدِبْهُمْ ؕ قَدْ جِئْنَاكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَبِّكَ ؕ وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴿٣٨﴾ اِنَّا قَدْ اَوْحٰى اِلَيْنَا اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنِ كَذَّبَ وَتَوَلٰى ﴿٣٩﴾

”اور میں نے تمہیں خود اپنے لئے تیار کیا ہے، جاؤ تم اور تمہارا بھائی میری نشانوں کے ساتھ اور مجھے یاد کرنے میں سستی نہ کرنا۔ جاؤ تم دونوں فرعون کی طرف! یقیناً اُس نے سرکشی اختیار کر رکھی ہے تو اُس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا کہ شاید وہ نصیحت قبول کرے یا ڈرے، ان دونوں نے کہا کہ پروردگار! ہمیں ڈر ہے کہ وہ ہمارے مقابلہ میں پیش قدمی کرے [۱] یا یہ کہ سرکشی سے کام لے۔ ارشاد ہوا کہ ڈرو نہیں۔ میں تم دونوں کے ساتھ سنتا ہوں گا اور دیکھتا ہوں گا تو جانا اس کے پاس۔ جا کر کہنا کہ ہم دونوں تمہارے پروردگار کے پیغمبر ہیں تو ہمارے ساتھ بنی

[۱] الفرط المتقدم امام القوم الى المآء..... فالاصل فيه التقدم (تبيين)

اسرائیل کو روانہ کر دو اور انہیں تکلیف نہ پہنچاؤ ہم تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف کا معجزہ لے کر آئے ہیں
 [۱] اور سلام ہو اُس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔ ہماری طرف وحی بھیجی گئی ہے کہ عذاب ہے اُس پر جھٹلائے اور
 روگردانی کرے۔

فرعون سے گفتگو می نرمی اور رواداری برتنے کا حکم:

دعوت و تبلیغ کے لئے اس خاص ہدایت کے ساتھ کہ ”نرمی کے ساتھ گفتگو کرنا“ یہ ارشاد کہ لَعَلَّہ یَعْنٰکُمْ اَوْ یَحْشٰی شَیْئًا وَّہ نَصِیْحَتِ
 قبول کرے یا ڈرے، عالم الغیب کی طرف سے اُس امید کا اظہار نہیں ہے جو پوری ہونے والی تھی بلکہ اس حقیقت پر متنبہ کرنا ہے کہ سخت کلامی اور
 درشت انداز میں گفتگو خود اکثر قبول حق میں رکاوٹ بن جاتی ہے کہ اگر وہ نصیحت قبول کرنے والا ہوتا تو بھی اب قبول نہیں کرتا جس کی بنا پر اب اُس
 کی گمراہی یا گمراہی میں شدت اختیار کرنے کی ذمہ داری اس داعی حق کی غلط انداز سے گفتگو پر ہوتی ہے لہذا عموماً انداز گفتگو ایسا ہونا چاہیے کہ جس
 سے امکان اس کے اثر پذیر ہونے کا ہو۔ اب یہ اور بات ہے کہ یہ امکان اُس کے عناد کی وجہ سے وقوع میں نہ آئے جیسا کہ فرعون کے بارے میں
 علم الہی میں یہی تھا کہ وہ اثر قبول نہ کرے گا جو بعد میں ظہور میں آیا۔ مگر داعی حق کا عمل ایسا ہونا چاہیے جیسے وہ اس شخص کے راہ راست پر آنے سے
 مایوس نہیں ہے، اس لئے وہ ممکن حد تک اُس سے نرمی برتا ہے۔ [۲]

قَالَ فَمَنْ رَبُّكُمَا يَا مُوسَىٰ ﴿۴۸﴾ قَالَ رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ حَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ ﴿۴۹﴾
 قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُونِ الْأُولَىٰ ﴿۵۱﴾ قَالَ عَلِمَهَا عِنْدَ رَبِّي فِي كِتَابٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّي
 وَلَا يَنْسَى ۚ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا ۖ وَسَلِّكَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا ۖ وَأَنْزَلَ
 مِنَ السَّمَاءِ مَاءً ۖ فَأَخْرَجْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّن تَبَاتٍ شَتَّىٰ ﴿۵۳﴾ كُلُوا وَارْعَوْا
 أَنْعَامَكُمْ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِي النُّهَىٰ ﴿۵۴﴾ مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ
 وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ ﴿۵۵﴾

”اُس نے کہا تو کون ہے پروردگار تم دونوں کا اے موسیٰ علیہ السلام! انہوں نے کہا ہمارا پروردگار وہی وہ ہے جس
 نے ہر چیز کو اُس کا وجود عطا کیا ہے، پھر منزل تک پہنچانے کا سامان کیا ہے، کہا تو گزشتہ نسلوں کا کیا ہے؟ انہوں نے
 کہا ان کا علم میرے پروردگار کے یہاں ہے ایک نوشتہ میں۔ نہ میرا پروردگار بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔ وہ وہ ہے

[۱] آیت من ربک ای معجزہ ظاہرہ (تبیان)

[۲] ای کون علی الرجاء والطبع لا علی الباس من فلاحہ فوق وقع التعبید لہما علی هذا الوجه لآئہ ابلغ لہما فی دعائہ الی الحق (مجمع
 البیان)

جس نے قرار دیا تمہارے لئے زمین کا بچھونا اور چلائیں تمہارے لئے اُس میں راہیں اور آسمان سے پانی اتارنا تو ہم نے اُس سے مختلف نباتات کے جوڑے نکالے۔ کھاؤ خود بھی اور چراؤ اپنے مویشیوں کو، یقیناً اس میں نشانیاں صاحبان عقل کے لیے، اسی سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی میں پلٹائیں گے اور اسی سے تمہیں دوبارہ نکالیں گے“

جناب موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی گفتگو:

آیات کے اسلوب سے ظاہر ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام کو جو خطاب فرعون سے تھا، اسے نقل کرتے ہوئے ان کے کلام کو کہ ”وہ وہ ہے جس نے قرار دیا تمہارے لئے زمین کا بچھونا اور تمہارے لئے اُس میں راستے بنائے اور آسمان سے پانی اتارا“، یہاں تک اس بات کو پہنچا کر خالق نے خود اپنی زبان سے اپنی قدرت کا اظہار وقت نزول قرآن کے آدمیوں کو مخاطب کر کے فرمانا شروع کر دیا ہے [1] اور اسی سلسلہ میں آئندہ آیت سے تذکرہ فرعون یوں شروع ہوا ہے کہ:

وَلَقَدْ آرَيْنَهُ آيَاتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَأَبَىٰ.

ہم نے اسے اپنی تمام قدرت کی نشانیاں دکھائیں مگر اُس نے جھٹلایا اور انکار کیا۔

اور اُس کے بعد پھر موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام سے فرعون کا مکالمہ شروع ہو گیا۔

رب کے متعلق پوچھنے اور یہ سننے کے بعد کہ وہ وہ ہے جس نے ہر شے کی صورت گری کی ہے فرعون کا یہ سوال کہ:

فَمَا بَالُ الْقُرُونِ الْأُولَىٰ: تو گزشتہ نسلوں کا کیا حال ہے؟

اس کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ اس نے ایسا تصور کیا کہ جب وہ رب ہے تو جن کو اس نے پیدا کیا، ان سب کو باقی رہنا چاہیے، وہ آخر ختم کیوں ہو گئے؟ اس کا جواب جناب موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا کہ ان کا علم میرے پروردگار کو ہے نہ وہ بھٹکتا ہے، نہ تو وہ بھولتا ہے یعنی یہ باتیں حکمت الہی سے متعلق ہیں اور ”خالق نے بعد کے نغمہ میں جو اس نے اب کے لوگوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا ہے، آخر تک اس کا جواب ذرا تفصیل سے دیا ہے کہ وہ سب بالکل ختم تھوڑی ہو گئے ہیں۔ ہم نے نظام بھی مقرر کیا ہے کہ اس زمین سے یعنی خاک سے جو جزء زمین ہے پیدا کرتے ہیں اور پھر اسی زمین کے اندر لے جاتے ہیں اور پھر قیامت میں اُن کو اسی زمین سے دوبارہ برآمد کریں گے جو اس سفر کی آخری منزل ہوگی۔

وَلَقَدْ آرَيْنَهُ آيَاتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَأَبَىٰ ﴿٥٦﴾ قَالَ أَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ أَرْضِنَا

بِسِحْرِكَ يَمْؤُوسِي ﴿٥٥﴾ فَلَنَأْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهِ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَا

تُخْلِفُهُ نَحْنُ وَلَا أَنْتَ مَكَانًا سَوِيًّا ﴿٥٨﴾ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمَ الزَّيْنَةِ وَأَنْ يُخَشِرَ

النَّاسُ ضُخْيٰی ﴿٥٩﴾ فَتَوَلَّىٰ فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهُ ثُمَّ أَتَىٰ ﴿٦٠﴾

”اور ہم نے اپنی قدرت کی سب نشانیاں دکھائیں، اس پر بھی اُس نے جھٹلایا، اور انکار کیا، اس نے کہا کیا تم اے

[1] قال تعالیٰ تتبعا لهما و صفه به موسیٰ خطابا لاهل مکتبه (جلالین)

موسیٰ! ہمارے پاس آئے ہو اس لئے کہ ہمیں اپنے جادو کے زور سے ہماری سر زمین سے نکال دو تو ضرور تمہارے مقابلہ میں ویسا ہی جادو ہم بھی لائیں گے، تو ہمارے اور اپنے درمیان ایک وعدہ کا وقت قرار دو جس کے خلاف نہ ہم کریں اور نہ تم، ایسی جگہ جو بیچ میں ہو، انہوں نے تمہارے لئے وعدہ کا دن آرائش والا دن ہے اور یہ کہ تمام لوگ دھوپ چڑھے جمع کر لئے جائیں تو فرعون پلٹا اور پلٹ کر اُس نے اپنے منصوبہ کا پورا انتظام کیا اور پھر آیا۔“

ساحروں کے مقابلہ کا اہتمام:

”سب نشانیاں دکھائیں“، یعنی وہ معجزات جو حضرت موسیٰ ﷺ کو اس وقت تک عطا ہوئے تھے، وہ سب دکھلا دیے گئے، نہ یہ کہ جو اللہ کی نشانیاں ازل سے ابد تک ظاہر ہوتی رہیں یا رہیں گی، وہ سب فرعون کو دکھادی گئیں۔ ایسا نہیں بلکہ خود حضرت موسیٰ ﷺ کے کچھ معجزات اس کے بعد ظاہر ہوئے، وہ بھی اس وقت فرعون کو دکھائے گئے۔

قَالَ لَهُمْ مُوسَىٰ وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوا عَلَيَّ اللَّهُ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۖ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرَىٰ ۖ فِتْنَا زَعْوَا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَأَسْرُوا النَّجْوَىٰ ۖ قَالُوا إِنَّ هٰذِهِ لَسِحْرَانِ يُرِيدَانِ أَنْ يُخْرِجَكُم مِّنْ أَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيقَتِكُمُ الْمُثَلَىٰ ۖ فَأَجْمَعُوا كَيْدًا كُفْرًا ثُمَّ اتُّو صَفًّا ۖ وَقَدْ أَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلَىٰ ۖ

”کہا اُن لوگوں سے موسیٰ علیہ السلام نے کہ ارے وائے ہوتے پر، بہتان نہ باندھو اللہ پر جھوٹا کہ قلع قمع کر دے وہ تمہارا عذاب سے اور بے شک ناکام ہوا وہ جس نے بہتان باندھا تو اُن لوگوں میں آپس میں بحث ہونے لگی اور کچھ چپکے چپکے باتیں کیں۔ کہا یہ دونوں جادو گر ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنے جادو سے تم لوگوں کو تمہاری سر زمین سے نکال دیں اور تمہارے مذہب کو تباہ کر دیں تو اپنی تمام تیاریاں مکمل کر لو۔ پھر صف بندی کر کے آ جاؤ اور یقیناً بہتری آج وہی حاصل کرے گا جو غلبہ حاصل کرے۔“

قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِمَّا أَنْ تُلْقِيَ وَإِمَّا أَنْ نَكُونَ أَوَّلَ مَنْ أَلْقَىٰ ۖ قَالَ بَلْ أَلْقُوا ۖ فَإِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ ۖ فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُّوسَىٰ ۖ قُلْنَا لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلَىٰ ۖ وَأَلْقِ مَا فِي يَمِينِكَ ۖ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوا ۖ إِمَّا صَنَعُوا كَيْدًا سِحْرًا ۖ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ ۖ

فَالْقِي السِّحْرَةَ سُجَّدًا قَالُوا اَمَّا يَرْبِ هَارُونَ وَمُوسَى ۝٤٥

”اُن لوگوں نے کہا اے موسیٰ علیہ السلام! یا تم پھینکو یا ہم ہوں پہلے پھینکے والے، انہوں نے کہا نہیں بلکہ تم ہی پھینکو تو ایک دم ان کی رسیاں اور لکڑیاں ان کے آگے ایسی معلوم ہونے لگیں ان کے جادوں سے کہ وہ دوڑ رہی ہیں، تو اپنے دل میں موسیٰ علیہ السلام نے ذرا محسوس کیا۔ ہم نے کہا ڈرو نہیں، بلاشبہ غالب آنے والے تم ہی ہو اور تکلیف اور پھینک دو جو تمہارے سیدھے ہاتھ میں ہے۔ وہ نکل جائے گا اُسے جو انہوں نے بنایا ہے وہ ایک جادوگر والی ترکیب ہے اور جادوگر نتیجہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا جب بھی وہ آئے، نتیجہ یہ ہوا کہ سب جادوگر سجدہ میں گر پڑے، کہنے لگے ہم ایمان لائے ہارون اور موسیٰ کے پروردگار پر۔“

معجزہ کا عقلی معیار:

”ایسی معلوم ہونے لگیں ان کے جادوں سے“۔ اس سے نتیجہ نکالا گیا ہے کہ حقیقت میں وہ سانپ کی طرح دوڑ نہیں رہی تھیں بلکہ یہ کوئی کرتب تھا کہ نظر ایسا آ رہا تھا جیسے ”ڈھٹ بندی“ میں ہوتا ہے۔^[۱]

موسىٰ ﷺ کو ڈر کس بات کا ہوا؟ امیر المؤمنین ﷺ نے نبی البلاغہ میں فرمایا ہے:

لَمَّا يُوسُفُ جَسَّ مُوسَى خَيْفَةً عَلَى نَفْسِهِ أَشْفَقَ مِنْ غَلْبَةِ الْجُهَالِ وَدَوَّلِ الضَّلَالِ (خطبہ نمبر ۴)

موسىٰ ﷺ نے اپنی جان کے لئے خطرہ محسوس نہیں کیا بلکہ انہیں خوف ہوا مگر اہی کے تسلط اور جاہلوں کے غالب آنے کا۔ اسی کو شیخ الطائف نے اس طرح لکھا ہے کہ:

اِثْمًا خَافَ دُخُولَ الشُّبُهَةِ عَلَى قَوْمِهِ.

انہیں خوف بس اس کا ہوا کہ ان کی قوم شہ میں نہ پڑ جائے۔

اور پھر اسی کو جلالین نے بھی لکھ دیا ہے:

اى خاف من جهة ان سحرهم من جنس معجزته ان يلبتس امره على الناس فلا يؤمنوا به
يعنى انهم خوفوا من سحرهم من جنس معجزته ان يلبتس امره على الناس فلا يؤمنوا به
ان پر ایمان نہ لائیں۔

خالق نے جن الفاظ میں انہیں بعد میں اطمینان دلا یا ہے، وہ بھی اس توجہیہ کے بالکل مطابق ہیں۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۗ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمْ الَّذِى عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۗ

[۱] اِثْمًا قَالَ يَحْتَمِلُ لَانَّهُمَا لَمْ تَكُنْ تَسْعَى حَقِيْقَةً وَاِنَّمَا تَحْرِكُ لَانَّهُ قَبْلَ اَنْ يَكُنْ جَعَلَ دَاخِلًا زَبِيْحًا فَلَمَّا حَمِيَتْ بِالشَّمْسِ طَلَبَ التَّوْبِيْحَ الصَّعُوْدَ فَتَحْرِكُ الْعَضِي وَالْحَبَالَ (تبیان)

فَلَا قُطْعَانَ أَيْدِيكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ مِنْ خِلَافٍ وَلَا وَصَلَبَيْنَكُمْ فِي جُدُوعِ
النُّخْلِ وَلِتَعْلَمَنَّ أَيْنَا أَشَدُّ عَذَابًا وَأَبْقَى ۝٤١ قَالُوا لَنْ نُؤْتِيَكَ عَلَى مَا جَاءَنَا
مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالَّذِي فَطَرَنَا فَاقْضِ مَا أَنْتَ قَاضٍ ۖ إِنَّمَا تَقْضِي هَذِهِ الْحَيَاةَ
الدُّنْيَا ۝٤٢ إِنَّا أَمْنَا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطِيئَاتِنَا وَمَا أَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۖ

وَاللَّهُ خَيْرٌ وَأَبْقَى ۝٤٣

’کہا اُس نے کہ تم لوگ اُس پر ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دوں، یقیناً یہی تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے تو میں ضرور اب تمہارے ہاتھوں اور پیروں کو قلم کراؤں گا مختلف سمتوں سے اور ضرور تمہیں سولی دوں گا کھجور کے درختوں پر اور ضرور تم جانو گے کہ ہم میں سے کس کا عذاب سخت اور پائدار ہے۔ اُن لوگوں نے کہا کہ ہم ہرگز تجھے مقدم نہیں کریں گے اُس پر جو ہمارے پاس آگیا کھلے دلائل میں سے اور اُس ذات پر جس نے کہ ہمیں پیدا کیا ہے، تو کر ڈال جو تجھے کرنا۔ تو بس اسی دنیوی زندگی کو ختم کرے گا۔ بلاشبہ ہم ایمان لائے ہیں اپنے پروردگار پر تا کہ وہ ہماری خطاؤں کو اُس جادوگری کو جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا، بخش دے اور اللہ بہتر اور بہت زیادہ پائدار ہے۔‘

ساحروں کی فرعون سے گفتگو:

فرعون نے کہا کہ ’تمہارا بڑا ہے جس نے تم کو جادو سکھایا ہے‘ اُس سے پہلی ہی نگاہ میں جو سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے ان سے کہہ رہا ہے کہ میں سمجھتا ہوں یہ تم لوگوں کی ملی بھگت تھی اور موسیٰ علیہ السلام کوئی اور نہیں۔ تمہارے ہی گروہ کے تھے جنہوں نے تمہیں جادو سکھایا ہے، اس لئے اتنی جلدی تم اُن کے سامنے سپر انداختہ ہو گئے یہی ہمارے مستند مفسرین کی تفسیر بھی ہے۔ [۱] مگر شاہ عبدالقادر معلوم نہیں کیوں لکھ رہے ہیں کہ:

’یہ شاید رب کو کہنے لگا‘ (موضح القرآن)

بے شک جادوگروں کا یہ کہنا کہ ’اللہ ہماری خطاؤں کو معاف کرے اور اُس جادو کرنے کو جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا، اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے جو شاہ صاحب نے ان لفظوں میں لکھا ہے کہ:

’جادوگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نشان دیکھ کر سمجھ گئے تھے کہ وہ جادو نہیں مقابلہ نہ کرتے پھر فرعون کی خاطر سے کیا‘ (موضح القرآن)

[۱] انہ یعنی موسیٰ لکیر کم ای رئیس کم و مقدّم کم (تبیان) معناه ائہ استاذ کم و انتم تلامذتہ وقد یعجز التلمیذ عما یفعلہ الاستاذ (مجمع البیان)

إِنَّهُ مَنْ يَأْتِ رَبَّهُ مُجْرِمًا فَإِنَّ لَهُ جَهَنَّمَ ۖ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ ﴿٤٣﴾ وَمَنْ يَأْتِهِ
مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصَّالِحَاتِ فَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الدَّرَجَاتُ الْعُلَىٰ ﴿٤٤﴾ جَدَّتْ عَدْنٌ
تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ وَذَٰلِكَ جَزَاؤُا مَنْ تَزَكَّىٰ ﴿٤٥﴾

”بلاشبہ جو اپنے پروردگار کی بارگاہ میں مجرم ہونے کی حالت میں آئیں تو یقیناً اسے استحقاق ہوگا دوزخ کا جس میں نہ وہ مرتا ہوگا اور نہ وہ زندہ رہتا ہوگا اور جو اُس کے پاس مومن ہونے کی حالت میں آئے کہ نیک اعمال انجام دیے ہوں تو یہ وہ ہیں جن کے لئے بڑے اونچے درجے ہیں، زندگی جاوید والے بہشت جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے، یہ صلہ ہے اُس کا جو پاک بازرہا ہے۔“

مجرم کے مقابلہ میں ”مومن“ کا لفظ ہوتا تو ہم کہتے کہ پہلے مجرم سے مراد کافر ہے مگر یہاں اس کے مقابلہ میں مومن کا عمل الصالحات ہے لہذا اُس کے مقابلہ میں جو مجرم ہے، اُس میں دونوں داخل ہیں، کافر بھی اور وہ مسلمان بھی جس نے اعمال صالحہ کی پابندی نہ کی ہے اور اسی لئے ہم نے ”لہ جہنم“ کا ترجمہ یہ کیا جو افعال اُس لفظ کے معنی ہیں کہ ”اُسے استحقاق ہوگا دوزخ کا“۔

اس استحقاق کے ساتھ اب دو صورتیں ہیں کہ ایک یہ کہ وہ بخشا نہ جائے اور داخل جہنم ہو ہی جائے جیسا کہ کفار کے لئے ہے اور ان گناہوں کے مرتکبین کے لئے جن کی شفاعت نہ ہو اور کسی طرح بھی مغفرت نہ ہو اور یہ بھی کہ وہ شفاعت کے ساتھ یا کسی عمل خیر کے صلہ میں یا صرف تفضل ربانی سے بخش دیا جائے۔ یہ اُن کے لئے ہے جو اصول عقائد کے اقرار کے ساتھ کسی حد تک بد اعمال ہیں اور ان کی بد اعمالی اُس درجہ پر نہ ہو جو شفاعت وغیرہ سے محروم کر دیتا ہے۔

وَلَقَدْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ ۖ أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي فَاصْرَبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ
يَبْسًا ۖ لَا تَخَفْ دَرَكًا وَلَا تَخْشَىٰ ﴿٤٦﴾ فَاتَّبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُودِهِ فَغَشِيَهُمْ مِنَ
الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ﴿٤٧﴾ وَأَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهُ وَمَا هَدَىٰ ﴿٤٨﴾

”اور جو ہم نے وحی بھیجی موسیٰ علیہ السلام کی طرف کہ رات کے وقت میرے بندوں کو لے کر روانہ ہو تو طے کرنا ان کے لئے ایک راستہ دریا کے اندر خشک کہ نہ ڈر ہو گا تم کو کسی نقصان کا اور نہ کوئی خطرہ تمہیں ہوگا تو پیچھا کیا اُن لوگوں کا فرعون نے اپنی افواج کے ساتھ تو ڈھانپ لیا اُسے سمندر نے جیسا اُسے ڈھانپنا تھا اور گمراہ کیا فرعون نے اپنی قوم کو اور انہیں صحیح راہ نہیں دکھائی۔“

فرعون اور اس کی فوج کا غرق دریا ہونا:

صرب کے معنی راستہ طے کرنے کے بھی ہوتے ہیں جیسا کہ قرآن میں ہے وَإِذَا صَرَّبْتُمْ فِي الْأَرْضِ (نساء ۱۰۱) اسی لئے ہم نے

طریقہ کے ساتھ ”فاضرِب“ کا لفظ ہے، اُس کا ترجمہ کیا ”طے کرنا“، مگر ضرب کے معنی مارنے کے بھی ہیں اور یہاں واقعہ یہ تھا کہ حکم ہوا دیا پر عصا سے ضرب لگاؤ۔ وَ اَضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ، اسی ضرب سے راستا بنا تھا تو یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ضرب لگا کہ بنی اسرائیل کے لئے خشک راستہ بناؤ^[۱] مگر الفاظ قرآنی میں ضرب یعنی مارنے کا تعلق دریا کے ساتھ نہیں بلکہ راستے کے ساتھ ہے، اس لئے علامہ طبرسی نے اس کے ساتھ اس مفہوم کا اضافہ کیا کہ ضرب عربی میں سکہ ڈھالنے کے لئے بھی آتا ہے تو حکم یہ ہوا ہے کہ بنی اسرائیل کے لئے سمندر میں ایک راستہ بنا دو۔^[۲] آخری الفاظ: اَضَلَّ فِرْعَوْنَ قَوْمَهُ وَمَا هَدَىٰ ”گمراہ کیا فرعون نے اپنی قوم کو اور صحیح راہ نہیں دکھائی“ ناظر ہیں فرعون کے اُس قول کی طرف جو اس نے اپنی قوم والوں سے کہے تھے کہ اَهْدِكُمْ سَبِيلَ الرَّشَادِ ”میں تم کو صحیح راہ دکھاؤں گا“۔

يٰۤاِسْرٰٓءِیْلَ قَدْ اٰتٰیْنَاكَ الْاٰیٰتِیْنَ فَذٰرَکَ الْکٰفِرِیْنَ
وَنَزَّلْنَا عَلَیْکُمُ الْمَنَّٰنَ وَالسَّلٰوٰی ﴿۸۵﴾ کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنَاکُمْ وَلَا تَطْغَوْا
فِیْہِ فَبِجَلِّ عَلَیْکُمْ غَضَبِیْ ۗ وَمَنْ یَّجْلِلْ عَلَیْہِ غَضَبِیْ فَقَدْ هَوٰی ﴿۸۶﴾ وَاِیُّ لَغَفٰرًا
لِّمَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صٰلِحًا ثُمَّ اٰهْتَدٰی ﴿۸۷﴾

”اے بنی اسرائیل ہم نے تم کو نجات دی تمہارے دشمن سے قول و قرار کیا تم سے طور پر کے دائیں پہلو کا اور اتار تم پر من و سلوئی کہ کھاؤ ان اچھی غذاؤں سے جو ہم نے تم کو عطا کی ہیں اور اس کے بارے میں زیادتی نہ کرو کہ نازل ہوگا تم پر غضب میرا اور جس پر میرا غضب نازل ہو وہ ہلاک ہو اور بلاشبہ میں بخشنے والا ہوں اس کو جو توبہ کرے اور ایمان اختیار کرے اور نیک اعمال کرے، پھر راہ راست پر قائم رہے۔“

ان واقعات کی تفصیل دوسرے مقامات پر جہاں جہاں ان امور کا ذکر ہے درج ہوئی ہے، ”کھاؤ ان اچھی غذاؤں سے“ یعنی اگر کھانا چاہو تو کھاؤ، کوئی ممانعت نہیں ہے۔^[۳]

وَمَا اَعْجَلٰکَ عَنْ قَوْمِکَ یٰمُوسٰی ﴿۸۶﴾ قَالَ هُمْ اَوْلَآءِ عَلٰی اَثَرِیْ وَعَجَلْتُ اِلَیْکَ
رَبِّ لِتَرْضٰی ﴿۸۷﴾ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَکَ مِنْۢ بَعْدِکَ وَاَضَلَّہُمْ السّٰمِرِیُّ ﴿۸۸﴾
فَرَجَعَ مُوسٰی اِلٰی قَوْمِہٖ غَضَبًاۢنَ اَسْفًا ۗ قَالَ یَقَوْمِ اَلَمْ یَعِدْکُمْ رَبُّکُمْ وَعَدًّا
حَسَنًا ۗ اَفَطَالَ عَلَیْکُمُ الْعٰہِدُ اَمْ اَرَدْتُمْ اَنْ یَّجِلَّ عَلَیْکُمْ غَضَبٌ مِّنْ

[۱] المعنی واضرب بعصاک البحر يجعل طریقاً فکأنه قیل اجعل طریقاً بالضرِب بالعصا (تبیان)

[۲] کانه قد ضرب الطريق كما يضرب الدینار (مجمع البیان)

[۳] صورته صورة والمراد به الاباحة (تبیان و مجمع البیان)

رَبِّكُمْ فَأَخْلَفْتُمْ مَوْعِدِي ﴿٨٧﴾ قَالُوا مَا أَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلِكِنَا وَلَكِنَّا حَمَلْنَا
 أَوْزَارًا مِّن زِينَةِ الْقَوْمِ فَقَدْنَا فَنُهَا فَكَذَلِكَ أَلْقَى السَّامِرِيُّ ﴿٨٨﴾ فَأَخْرَجَ لَهُمْ
 عِجْلًا جَسَدًا لَهُ خُورٌ فَقَالُوا هَذَا إِلَهُكُمْ وَإِلَهُ مُوسَىٰ فَنَسِيَ ﴿٨٩﴾ أَفَلَا يَرَوْنَ أَنَّ
 يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا ۖ وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ﴿٩٠﴾ وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هُرُونُ
 مِّن قَبْلِ يَقُومِ إِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهِ ۗ وَإِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمَنُ فَاتَّبِعُونِي وَأَطِيعُوا
 أَمْرِي ﴿٩١﴾ قَالُوا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِينَ حَتَّىٰ يَرْجِعَ إِلَيْنَا مُوسَىٰ ﴿٩٢﴾

”اور کیا بات ہوئی اے موسیٰ علیہ السلام کہ تم جلد بازی سے کام لے کر اپنی قوم کو چھوڑ آئے تو انہوں نے کہا وہ میرے پیچھے ہی ہیں اور میں جلدی تیری بارگاہ میں حاضر ہو گیا کہ تو خوشنود ہو۔ ارشاد ہوا تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے بعد تمہاری قوم کو ہم نے آزمائش میں ڈال دیا اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا ہے تو واپس آئے موسیٰ اپنی قوم کی طرف غصہ میں افسوس کرتے ہوئے کہا اے میری قوم والو! کیا اللہ نے تم سے بہت اچھا وعدہ نہیں کیا تھا؟ کیا مدت تم پر بہت طولانی ہو گئی یا ارادہ تم نے چاہا کہ تم پر تمہارے پروردگار کا غضب نازل ہو تو تم نے مجھ سے وعدہ خلافی نہیں کی مگر ہمیں اس جماعت کے بہت سے زیور اکٹھا کر کے لانے پر آمادہ کیا گیا اور یہ طرح ڈالی سامری نے تو اس نے نکالا ان لوگوں کے لئے ایک مجسمہ بچھڑے کا جس میں سے گائے کی آواز پیدا ہوتی تھی تو ان لوگوں نے کہا یہ تمہارا خدا ہے اور موسیٰ کا خدا ہے جسے وہ بھول گئے تو کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ ان سے ہارون نے اس کے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اے میری قوم والو! تم اس کی وجہ سے آزمائش میں پڑے ہو اور یقیناً تمہارا پروردگار وہ ہے جو سب کو فیض پہنچانے والا ہے تو تم میری پیروی کرو اور میرے حکم کی تعمیل کرو، انہوں نے کہا ہم اس کی عبادت میں برابر لگے ہیں یہاں تک کہ موسیٰ ہماری طرف واپس آئیں۔“

سامری کی گوسالہ سازی اور اس کا انجام:

ابتدائی الفاظ: وَمَا أَجْحَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يُمُوسَىٰ ”کیا بات ہے اے موسیٰ علیہ السلام کہ تم جلد بازی سے کام لے کر اپنی قوم کو چھوڑ

آئے“ (سورہ طہ - ۸۳)

اس تشریح کا پتہ دیتے ہیں کہ دراصل جناب موسیٰ علیہ السلام کو طور پر جب بلایا گیا ہے تو یہ حکم ہوا تھا کہ تم اپنی قوم کے ساتھ آنا لیکن یہ محسوس کر کے کہ پوری قوم کے تیار ہونے میں بہت دیر لگے گی، وہ ان سے یہ کہہ کر میں جاتا ہوں تم میرے پیچھے آؤ، خود چلے گئے اور یہاں قوم سامری

کے جال میں پھنس کر رہ گئی۔^[۱]

قَالَ يٰهُرُونَ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْا ۗ اَلَا تَتَّبِعِنِ ۙ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِي ۗ ﴿۹۳﴾
 قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي ۗ اِنِّىْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ
 بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ وَكَمْ تَرْقُبُ قَوْلِيْ ۗ ﴿۹۴﴾

”انہوں نے کہا اے ہارون! تمہیں کون امر مانع تھا کہ جب تم نے دیکھا کہ وہ گمراہ ہو گئے تو تم میرے پیچھے نہ چلے آئے۔ تو کیا تم نے میرے حکم کی مخالفت کی؟ انہوں نے کہا اے میرے مانجائے!

میری داڑھی اور میرے سر کے بال نہ پکڑیے، مجھے ڈر تھا کہ آپ کہیں گے تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور میری بات کا خیال نہ کیا۔“
 اس کا ایک مطلب جو جناب ہارون علیہ السلام کے جواب سے مرتبط ہے، یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کہہ رہے تھے کہ تم اُن ثابت قدم افراد کو جو گوسالہ پرستی سے الگ رہے تھے، لے کر میرے پاس کیوں نہ آگئے۔^[۲]

اس پر جناب ہارون علیہ السلام نے کہا کہ مجھے یہ اندیشہ تھا کہ آپ کہیں گے تم نے جماعت میں انتشار پیدا کر دیا، شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:
 ”چلتے وقت موسیٰ علیہ السلام ہارون علیہ السلام کو نصیحت کر گئے تھے کہ سب کو متفق رکھیو۔ اس واسطے انہوں نے بچھڑا پوجنے والوں کا مقابلہ نہ کیا، زبان سے سمجھایا، وہ نہ سمجھے“ (موضح القرآن)

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ۗ ﴿۹۵﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرْ وَاِبِهَ فَفَقَبْتُ قَبْضَةً
 مِّنْ اَثْرِ الرَّسُوْلِ فَنَعَبْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِىْ نَفْسِيْ ۗ ﴿۹۶﴾ قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ
 فِى الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مَسَاسَ ۗ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهُ ۗ وَاَنْظُرْ اِلَى الْاِهٰكِ
 الَّذِيْ ظَلَّتْ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۙ لَنُحَرِّقَنَّهُ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهُ فِى الْيَمِّ نَسْفًا ۗ ﴿۹۷﴾ اِنَّمَا
 اِلٰهُكُمْ اللّٰهُ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۗ ﴿۹۸﴾

”کہا اچھا، تیرا معاملہ ہے اے سامری! اس نے کہا میں نے ایسی چیز دیکھی جو ان لوگوں نے نہیں دیکھی تو میں نے ایک مٹھی خاک لے لی (خدا کے) بھیجے ہوئے (فرشتے) کے قدم کے نیچے سے تو اس کو میں نے ڈال دیا اور ایسا میرے نفس نے مجھے آمادہ کیا۔ انہوں نے کہا اچھا جا۔ اب تیرے لئے اس زندگی میں یہ ہے کہ تو کہتا رہے کہ کوئی چھوئے نہیں اور یقیناً تیرے لئے ایک وعدہ کا دن ہے اور وہ جس کے خلاف تو جان نہیں سکتا اور دیکھ اپنے خدا کو جس

[۱] تعجل موسىٰ بينهم مشوقا الى ربهم وخلقوا به (مجمع البيان)

[۲] قال ابن عباس: معناه من اقام على ايمانه (تبيان)

کی عبادت میں تو لگا رہا کہ ہم اسے جلائیں گے، پھر اس کی خاک کو دریا میں بہا دیں گے، تم لوگوں کا اصل خدا تو بس اللہ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں، وہ ہر شے پر علم کے اعتبار سے حاوی ہے۔

اس گوسالہ کے لئے سامری سے یہ مخاطب کہ **وَإِنظُرْ إِلَى إِلَهِكَ** دیکھ اپنے اس خدا کو، حالانکہ سب کا خدا اللہ ہے اور وہی سامری کا بھی حقیقت میں خدا ہے، اس اعتبار سے ہے کہ اس نے اسے خدا بنایا تھا۔ [۱]

اسے مخاطب کر کے متوجہ کرنا کہ جو تیرا معبود تھا، دیکھ اسے آگ میں جلائیں گے، پھر اس کی خاک کو دریا میں بہا دیں گے، ظاہر ہے کہ اس گوسالہ کو کوئی زمین سزا دینا نہیں ہے کیوں کہ وہ بے جان اور بے شعور ہونے کی بنا پر بے خطاب ہے بلکہ یہ اس کے عبادت گزار کے لئے ایک سخت سزائش اور بہت بڑی سزا ہے اس کے اس آیت پر بڑی تیز روشنی پڑتی ہے جو پہلے پارے میں آچکی ہے کہ دوزخ کے لئے کہا گیا ہے: **وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ**، اس کا ایندھن آدمی ہیں اور پتھر جس کی قومی تفسیر یہی ہے کہ وہی پتھر جن کی وہ عبادت کرتے تھے ان کے ساتھ ساتھ آتش کیے جائیں گے، اس کے علاوہ یہ جلانا اور اس کا جل جانا اور دریا میں بہانا اور اس کا بہہ جانا اس کی دلیل بھی ہے کہ وہ مجبور اور بے بس ہے اور اسے خدا سمجھنا غلط تھا۔ [۲]

كَذَلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۗ وَقَدْ آتَيْنَاكَ مِنْ لَدُنَّا ذِكْرًا ۗ^(۹۹)
مَنْ أَعْرَضَ عَنْهُ فَإِنَّهُ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وِزْرًا ۗ^(۱۰۰) خَلِيدًا فِيهِ ۗ وَسَاءَ لَهُمْ
يَوْمَ الْقِيَامَةِ حِمْلًا ۗ^(۱۰۱) يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ رُقَا ۗ^(۱۰۲)
يَتَخَفَتُونَ بَيْنَهُمْ إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا عَشْرًا ۗ^(۱۰۳) نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ إِذْ يَقُولُ
أَمْثَلُهُمْ طَرِيقَةً إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا يَوْمًا ۗ^(۱۰۴)

’اس طرح ہم بیان کرتے ہیں آپ کے سامنے خبروں میں سے اور ہم نے عطا کی ہے آپ کو اپنی طرف سے یادداشت جو اس سے روگردانی کرے گا تو وہ برداشت کرے گا قیامت کے دن ایک بوجھا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور بہت برا ہوگا ان کے لئے قیامت کے دن یہ بار جس دن صور پھونکا جائے گا اور مجرموں کو محشر میں لائیں گے ہم اس دن اس عالم میں کہ آنکھیں ان کی نیلی ہوں گی، چپکے چپکے آپس میں کہتے ہوں گے کہ تم نہیں رہے ہو مگر دس دن۔ ہم خوب جانتے ہیں جو وہ کہہ رہے ہیں، جب کہ ان میں کا سب سے زیادہ سمجھ دار آدمی یہ کہتا ہوگا کہ تم نہیں رہے ہو مگر ایک دن۔‘

’آنکھیں نیلی ہوں گی‘ پیاس سے یا یہ کہ بے نور ہوں گی، ان میں چمک نہ رہے گی۔ نیلا ہٹ ہی نیلا ہٹ محسوس ہوگی یا کہ یہ اس سے

[۱] إلهك یعنی معبودك فی نفسك (تبیان)

[۲] نَبِيَّهُ بَدَّلَكَ عَلَىٰ آثَمِهِ مَا يَكُنْ سَخَقَهُوَ أَحْرَاقَهُ لَا يَصْلِحُ الْعِبَادَةَ (مجمع البيان)

بس بد شکل ہونے کا اظہار ہے کہ سیاہ ہوں گے اور آنکھیں نیلی۔ یہ تینوں احتمال ہیں جنہیں جناب شیخ الطائف نے تیان میں درج کیا ہے

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا ۖ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۖ^[۱۰۶]
لَا تَرَى فِيهَا عِوَجًا وَلَا أَمْتًا ۗ يَوْمَ يَدُودُ يُتَّبِعُونَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهُ ۖ وَخَشَعَتِ
الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمَنِ فَلَا تَسْمَعُ إِلَّا هَمْسًا ۗ يَوْمَ يَدُودُ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ
أُذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ۗ^[۱۰۹]

’اور وہ آپ سے پہاڑوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجیے کہ انہیں میرا پروردگار بالکل سرمہ کر کے چٹیل میدان بنا دے گا جس میں تمہیں کچی نظر نہ آئے گی اور نہ بلندی۔ اس دن وہ لوگ پکارنے والے کی آواز کے پیچھے خوب آئیں گے جس میں ذرا بھی انحراف نہ ہوگا اور تمام آوازیں خدائے رحمن کے سامنے مدہم پڑ جائیں گی تو سنو گے سوا قدموں کی چاپ کے۔ اس دن سفارش کوئی فائدہ نہ دے گی سوا اس کے جس کو خدائے رحمن کی اجازت اور اس کے کہنے سے راضی ہو۔‘

ثبوت شفاعت:

پہلے کئی جگہ توجہ دلائی گئی ہے۔ یہاں پھر دیکھیے۔ نفی شفاعت میں استثناء ہو گیا^[۱] جس کے بعد مستثنیٰ میں ثبوت شفاعت ظاہر ہے۔^[۲]
اس کے بعد مطلق طور پر یہ کہنا کہ اسلام میں شفاعت کوئی چیز نہیں، از روئے قرآن صراحتاً غلط ہے۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا ۗ وَعَدَّتِ الْوُجُوهُ
لِلْحَيِّ الْقَيُّومِ ۗ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ۗ وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ
وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخْفُ ظُلْمًا وَلَا هَضْمًا ۗ^[۱۲]

’وہ جانتا ہے اسے جو ان کے آگے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور ان کا علم اس پر حاوی نہیں ہے اور چہرے جھک گئے ہوں گے اس زندہ نظام عالم کو قائم رکھنے والے کے سامنے اور ناکام ہو اوہ جس نے ظلم کا بوجھ اٹھایا اور جو نیک کام کرے اس حالت میں کہ وہ با ایمان ہو تو وہ نہیں ڈرے گا زیادتی سے اور نہ کمی سے۔‘

’اسے جو ان کے آگے ہے یعنی مستقبل خواہ امور دنیا ہوں جو بعد میں ہو گے اور خواہ قیامت اور جو ان کے پیچھے ہے یعنی ماضی‘^[۳]

[۱] الأشفاعة من اذن الله له ان يشفع ورضى قوله فيها من الانبياء والاولياء الصالحين والشهداء (مجمع البيان).

[۲] یعنی اس کی سفارش چلے گی (موضح القرآن)

[۳] ای یعلم ما بين ايدى الخلائق من امور القيامة وحواله و يعلم ما سبق في ما تقدم مهم (تبيان)

بعض نے یوں کہا ہے ”جو ان کے آگے ہے، وہ آخرت ہے اور اس کے احوال و احوال اور جو پیچھے ہے، وہ یہ دنیا ہے۔“^[۱]

وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا وَصَرَّفْنَا فِيهِ مِنَ الْوَعِيدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ أَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾

”اور اسی طرح اتارا ہم نے اس کو عربی زبان کا قرآن بنا کر اور اس میں طرح طرح سے عذاب کی خبریں دیں، شاید وہ پرہیزگاری اختیار کریں یا یہ ان میں کچھ نصیحت کا اثر کریں۔“

فَتَعَلَى اللَّهِ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۗ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُقْضَى إِلَيْكَ وَحْيُهُ ۚ وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾

”تو وہ بلند و برتر ہے۔ اللہ جو سلطنت کا حقیقی مالک ہے اور جلدی نہ کیا کیجیے قرآن میں قبل اس کے پہنچائیں کی طرف اس کی وحی اور کہیے کہ پروردگار! میرے علم میں اضافہ فرما۔“

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”جبریل علیہ السلام جب قرآن لاتے، حضرت ان کے پڑھنے کے ساتھ خود بھی پڑھنے لگتے کہ بھول نہ جاؤں اس کو پہلے منع فرما یا تھا، سورۃ قیامت میں اور تلی کر دی تھی کہ اس کا یاد رکھنا اور لوگوں تک پہنچانا ذمہ ہمارا ہے۔ پھر تقید کیا۔“ (موضح القرآن)

مگر یہ روایت ہمارے طرق سے وارد نہیں ہوئی ہے اور عدم امکان سہو نسیان پیغمبر خدائے کے لئے اس کے منافی ہے۔ ہماری تفسیر میں اس جملہ کے دو معنی اور ہیں: ایک یہ کہ وحی کے اترنے میں دیر ہو تو اس کے لئے جلدی نہ کیا کیجیے۔

دوسرے یہ کہ جب خالق کی طرف سے مکمل تشریح نہ آجائے، لوگوں تک اس حصہ قرآن کے پہنچانے میں جواتر ہے، جلدی نہ کیا

کیجیے۔^[۲]

علامہ طبرسی نے بلا تمبرہ تینوں قول نقل کر دیے ہیں۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِنْ قَبْلِ فَنَسَىٰ وَلَمْ نُجِدْ لَهُ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ ط أَبَىٰ ﴿۱۱۶﴾ فَقُلْنَا يَا آدَمُ إِنَّ هَذَا عَدُوٌّ لَكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقَى ﴿۱۱۷﴾ إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ﴿۱۱۸﴾ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ ﴿۱۱۹﴾ فَوَسَّوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ

[۱] ما بین اید یہم من امور الآخر تو ما خلفہم من احوال الدنیا (مجمع البیان)

[۲] ای لا تسأل انزلہ قبل ان یأتیک و حیو قبل معناہ لا تلتقہ الی الناس قبل ان یأتیک بیان تاویلہ (تبیان)

يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَى ﴿٢٠﴾ فَأَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتَ لَهُمَا
سَوَاتِرُهُمَا وَطِفْقًا يُخِصِفْنَ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۖ وَعَصَى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَى ﴿٢١﴾
ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَى ﴿٢٢﴾

”اور اس کے پہلے آدم علیہ السلام سے ہم نے عہد و پیمان لیا تو وہ بھول گئے اور انہیں پایا ہم نے ان میں مضبوط ارادہ اور جب ہم نے کہا فرشتوں سے کہ سجدہ کرو آدم علیہ السلام کو تو ان سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، اس نے انکار کیا تو ہم نے کہا اے آدم! بلاشبہ یہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے تو ایسا نہ ہو کہ تم دونوں کو بہشت سے نکلوا دے تو تم زحمت و مشقت میں ہو۔ بلاشبہ اس میں تمہارا رے لئے یہ کہ تم بھوکے نہیں ہوتے اور نہ برہنہ ہوتے اور نہ دھوپ کھاتے ہو تو شیطان نے وسوسہ انگیزی کی۔ کہا اے آدم! کیا میں تمہیں بتاؤں ہمیشہ کی زندگی والا درخت اور ایسی سلطنت کا ذریعہ جو کبھی بوسیدہ نہ ہو تو ان دونوں نے اُس میں سے کھا لیا تو ظاہر ہو گئے ان کے لئے اُن کے وہ اعضاء جو چھپانے کے ہیں اور وہ دونوں جوڑنے لگے اپنے اوپر بہشت کے درختوں کے پتے اور کھانا مانا آدم نے اپنے پروردگار کا، تو بہک گئے، پھر اللہ نے انہیں عزت دی تو اُن کی توبہ قبول کی، اور انہیں صحیح راستہ دکھایا۔“

جناب آدم علیہ السلام کا ترک اولیٰ:

مذکورہ بالا جنت میں رہنے کے جو فوائد اور وہاں سے نکلنے میں جو نقصان دکھائے گئے ہیں، وہ امر کی دلیل وافی ہیں کہ انہیں جو حکم ہوا تھا، وہ مولوی نہ تھا، ارشاد ہی تھا جیسا کہ پہلے پارے میں تشریح کی گئی ہے یعنی اس کی تعمیل دنیوی فوائد ہیں اور ترک میں مضرتیں ہیں جن کی فہرست یہاں ان کے سامنے پیش کی گئی ہے اس طرح کہ:

(۱) ففتشقی یعنی تمہیں زحمت و مشقت برداشت کرنا پڑے گی کہ یہاں تو بعطائے الہی مفت میں تمہیں ہر طرح کی نعمت ملی ہوئی ہے اور زمین کی دنیا جو عالم اسباب ہے، وہاں جب تک محنت و مشقت نہ کرو گے دانہ مُنہ تک نہ جائے گا۔

اس ذیل میں خاص طور پر حضرت آدم علیہ السلام کو مخاطب کر کے کہا کہ تم مشقت میں پڑ جاؤ گے، حالانکہ درخت کے قریب جانے، جنت سے نکالے جانے اور زمین پر اتارے جانے میں جناب حواؑ بھی شریک تھیں، یہ اس نظام فطری کی بناء پر ہے جس کے مطابق شریعت اسلام کا حکم ہے کہ تحصیل معاش کا تعلق مرد سے ہے اور زوجہ کی کفالت اس کے ذمہ ہے۔^[۱]

(۲) یہاں بھوک نہیں لگتی

[۱] ففتشقی معناه تتعب بان تاكل من كذا مینك وما تكسبه لنفسك وقيل ففتشقی علی خطاب الواحد والمعنی ففتشقی انت وزوجك وقيل خص بالشقاء لان الرجل يكذل على زوجته (تبیان)

(۳) یہاں پیاس نہیں لگتی

(۴) یہاں مفت میں جسم پر لباس ہے۔

(۵) دھوپ کی تکلیف اٹھانا نہیں پڑتی۔

دنیا میں یہ سب برکتیں ختم ہو جائیں گی۔

اب جب کہ وہ حکم ارشادی تھا تو نافرمانی کا لفظ تو بالکل درست ہے کیوں کہ حکم پر عمل نہ کرنے ہی کو نافرمانی کہتے ہیں [۱] مگر اس نافرمانی میں وہ بات نہیں رہتی جو منافی عصمت قرار پائے۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۗ فَاِمَّا يَنْتِيكُم مِّنِّي هُدًى ۙ
فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ ﴿٣٦﴾ وَمَنْ اَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَاِنَّ لَهُ
مَعِيشَةً ضَنْكًا وَمَنْحُشِرُهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمَىٰ ﴿٣٧﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْ اَعْمَىٰ وَقَدْ
كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿٣٨﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَّكَ اٰتٰنَا فَتَنٰسِيْتَهَا ۗ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ
تُنْسَىٰ ﴿٣٩﴾ وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ۗ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ
اَشَدُّ وَاَبْقَىٰ ﴿٤٠﴾

”ارشاد ہوا کہ دونوں اترو اس میں سے ایک ساتھ تم سب ایک دوسرے کے دشمن ہو گے۔ اب اگر تمہارے پاس میری طرف کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کی پیروی کریگا، وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ زحمت اٹھائے گا اور جو میری نصیحت سے روگردانی کرے گا تو اس کے لئے سخت زندگی ہوگی اور اسے ہم حشر میں روز قیامت اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا: پروردگار! کے کیوں تو نے مجھے حشر میں اندھا اٹھایا حالانکہ میں آنکھوں والا تھا؟ ارشاد ہوگا اسی طرح ہماری نشانیاں تیرے پاس آئیں تو تو نے انہیں بھلاوے میں ڈالا اور اسی طرح اب آج تو بھلا یا جا رہا ہے اور یوں ہی ہم مزادیں گے اسے جو حد سے تجاوز کرے اور ایمان نہ لائے اپنے پروردگار کی نشانیوں پر اور بلاشبہ آخرت کا عذاب سخت تر اور زیادہ دیر پا ہے۔“

یہ ارشاد جمع کے عنوان سے کہ ”تم سب ایک دوسرے کے دشمن ہو گے“ حالانکہ اس کے پہلے خطاب تشنیہ آدم اور حوا علیہما السلام سے تھا، ابلیس کی شرکت سے ہے جو آپ مستقل طور پر نکال دیا گیا تھا۔ [۲]
اب جب کہ ان تینوں سے خطاب ہو تو اس کے لئے یہ کافی ہے کہ ابلیس اور اس کی اولاد، آدم و حوا علیہما السلام اور ان کی اولاد آدم و حوا اور ان

[۱] المعصية مخالفة الامر سواء كان واجبا او ندبا (تبيين مجمع البيان)

[۲] یعنی آدم و حوا و ابلیس و ذریعہ (تبيين)

کی اولاد کی دشمن ہے جس کی صراحت دوسری جگہ موجود ہے کہ: ”اِنَّ هَذَا عَدُوٌّ لَّكُمْ“، یہ (ابلیس) تم دونوں (یعنی آدم وحواء) کا دشمن ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ خود آدم اور حوا علیہما السلام کی اولاد میں جو ایک دوسرے کے دشمن ہیں، وہ مراد ہیں۔^[۱]

اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمَا اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنَ الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسْكِنِهِمْ ط اِنَّ فِي

ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي التَّوْبَةِ ﴿۱۷۸﴾

”کیا ان کے لئے رہ نمائی کا سرمایہ نہیں ہے یہ کہ کتنی ہلاک کر دیں ہم نے ان کے پہلے والی نسلیں کہ یہ چلتے پھرتے ہیں ان کے رہنے کے گھروں میں یقیناً اس میں نشانیاں ہیں صاحبانِ عقل کے لیے“۔

ہمارے مفسرین اس یہد کی لفظ کو ہدایت ہی سے قرار دیتے ہیں^[۲] جس کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے بعض علمائے اہل سنت کے تشریحات بھی اس کے مطابق ہیں^[۳] مگر بعض لہم یہد کے معنی یہ لیتے ہیں کہ ان پر امر ظاہر نہیں ہوا^[۴] اس کے لئے لغت سے ثبوت کی ضرورت ہے کہ یہد کے لفظ کے معنی نمایاں ہونے کے آئے ہیں یا نہیں؟

”یہ چلتے پھرتے ہیں اُن کے گھروں میں“ یعنی وہ تباہ شدہ بستیاں ان کے سفیروں میں ان کی راہ میں پڑتی ہیں۔

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاجِلٌ مِّنْهُ ﴿۱۷۹﴾

”اور اگر نہ ہوتا ایک قول جو تمہارے پروردگار کی طرف سے پہلے ہو چکا اور ایک مدت مقرر نہ ہوتی تو عذاب لازمی طور پر آ کے رہتا“۔

یعنی اس اُمت کے بھی اعمال تو ویسے ہی ہیں جیسے اعمال کی وجہ سے اُمم سابقہ پر عذاب نازل ہوتا رہا ہے مگر خالق نے قول دے دیا ہے کہ اس رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر دنیا میں بحیثیت مجموعی عذاب نازل نہ ہوگا۔ اور ان کے لئے قیامت کی میعاد مقرر کر دی ہے، اس لئے عذاب نازل نہیں ہوتا۔^[۵]

فَاَصْبِرْ عَلٰی مَا يَقُولُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ

غُرُوْبِهَا ۗ وَمِنْ اٰنَآئِ الْيَلِّ اَلَيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافِ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰی ﴿۱۸۰﴾

”تو آپ صبر کیجئے اُس پر کہ جو وہ کہتے ہیں اور اپنے پروردگار کے حمد کے ساتھ نماز پڑھیے، سورج نکلنے سے پہلے اور

[۱] بعضکم بعض الدرۃ (جلالین) بعض اولاد شہما بعض را ددشمن، باشند (شاکہ ولی اللہ)

[۲] فاعل یہد مضر یفسرہ کم اهلکنا والمعنی ولم یهد لهم اهلکنا من قبلهم من القرون (تبیان) المعنی افلم یبیین لهم طریق الاعتبار کثرة اهلکنا القرون (مجمع البیان)

[۳] آیارہ نمود ایشاں را (شاکہ ولی اللہ) کیا پس راہ نہیں دکھاتا ان کو (شاکہ رفیع الدین)

[۴] افلهم یهدیتبیین (جلالین) فی سفرهم الی الشام وغیرها (جلالین)

[۵] لولا کلمة سبقت من ربک تأخیر العذاب عن هوء لاء الکفار الی یوم القیامة (مجمع البیان)

غروب سے پہلے اور رات کے کچھ اوقات میں بھی نماز پڑھیے، اور دن کے حصول میں شاید کہ آپ خوش ہو جائیں۔“

اوقات نماز کی طرف اشارہ:

اس آیت میں اجمالی طور پر اوقات نماز کا ذکر ہے جس میں ایک دفعہ قبل طلوع وغروب نمازیں بتائی ہیں۔ یہ نماز صبح ہے جو قبل طلوع آفتاب ہوتی ہیں اور قبل غروب متفق علیہ طور پر نماز عصر ہے اور رات کے کچھ حصوں میں یہ۔ یہ بلا اختلاف مشترک طور پر مغرب اور عشاء کا وقت ہے جو فقہ امامیہ ہی پر منطبق ہے جو مغرب کے بعد سے نصف شب تک دونوں نمازوں کا وقت قرار دیتی ہے۔

ہاں اس کے بعد جو اطراف التھار کی لفظ ہے اس کے لئے مفسرین اہل سنت کہتے ہیں کہ اس سے ظہر کا وقت مراد ہے کہ وہ نصف اول کا آخر اور نصف دوم کے شروع کا حصہ ہے [۱] مگر ہر صاحب زبان سمجھ سکتا ہے کہ دن کے دونوں طرف دونوں کنارے ہوتے ہیں۔ نصف اول اور آخر کے کنارے اگر طرف ہوا کریں تو وسط اور طرف کا فرق ختم ہو جائے۔

شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں:

”دن کی حدوں پر یعنی پہر پہر پر وقت ہیں نماز کے سوائے پہلے پہر کے“۔ (موضح القرآن)

اول تو دن اور رات کی پہروں کی طرف تقسیم کوئی من جانب اللہ نہیں ہے بلکہ ہمارے ہندوستان کے عرف عام کی چیز ہے۔ پھر یہ کہ اطراف کے معنی پہروں کے کس لغت میں ہیں؟ جب کہ ان میں کا دوسرا پہر طرف میں واقع نہیں ہوتا اور پہلا پہر واقعی طرف کہا جا سکتا ہے، اسے آپ خارج کیے دیتے ہیں۔

ہم تو سمجھتے ہیں کہ یہاں اوقات الگ الگ بیان ہو ہی نہیں رہے ہیں بلکہ تغنی فی التعبیر کے طور پر ایک ادبی انداز میں دو مقابل نکلوں میں اجمالی طور پر ان اوقات کو بے ان کیا گیا ہے جن میں نمازیں ہوتی ہیں۔

پہلا نکل (قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا) ”طلوع آفتاب کے پہلے اور غروب کے پہلے“ اس کے انداز میں نمازوں کا وقت آ گیا۔ نماز صبح طلوع آفتاب کے پہلے اور ظہرین غروب کے پہلے۔ پھر دوسرا نکل یہ کہ اوقات شب میں اور اطراف روز میں نمازیں پڑھو اس میں مغرب اور عشاء اوقات شب میں ہوتی ہیں۔ اور صبح اور ظہرین اطراف نہار میں ہیں اور اس طرح کہ آغاز نہار طلوع صبح سے لیا جائے جو نہار شرعی اور مدت امتدادِ صوم ہے اور اسی طرح بئر یعنی کنوئیں سے پانی کھینچنے میں دفع نجاست کے لئے جب تڑاؤح کا حکم ہوتا ہے جس میں نھارا کا ملا یعنی پورے دن چار آدمیوں کے پانی کھینچنے کا حکم ہے، اسے طلوع فجر سے لیا جاتا ہے۔ طلوع آفتاب سے نہیں اس طرح ایک طرف نہار میں نماز فجر ہوتی ہے اور دوسری طرف نہار میں زوال کے بعد سے مغرب تک ہے ظہر و عصر واقع ہے۔ اس طرح اس نکلے میں سب نمازیں آ جاتی ہیں جس میں کوئی زحمت نہیں ہے۔

یہ دونوں الگ الگ فقرے ہیں جن میں وقت کا دو حیثیتوں سے بیان ہے۔ نہ یہ کہ دوسرا جزء متمم ہو پہلے فقرہ کا اور کوئی مضائقہ نہیں کہ صبح

[۱] ای صل الظہر لان وقتہ داخل بزوال الشمس فی طرف النصف الاول و طرف النصف الثانی (جلالین)

کا پہلا قبل الشمس میں بھی اظہار ہوا اور پھر اطراف النہار کے تحت میں بھی وہ درج ہو جائے۔ اسی طرح ظہرین کا قبل غروبہا کی لفظ سے بھی بیان ہو، پھر اسی اطراف النہار کی لفظ کے تحت میں بھی ہو جائے۔
ادبی طور پر تفتن تعبیر میں اس طرح کی تکرار کوئی قابل انکار چیز نہیں ہے۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ
لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۗ وَرِزْقُ رَبِّكَ حَيِّرٌ ۚ وَأَبْقِ ۝۱۳۱ ۖ وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ
عَلَيْهَا ۗ لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا ۗ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ ۝۱۳۲

”اور نہ ڈالو اپنی نگاہ اُس پر جس سے ہم نے ان میں سے بہت سوں کو بہرہ مند کیا ہے دنیوی زندگی کی زیب و زینت سے تاکہ اس سے ان کی آزمائش کریں اور تمہارے پروردگار والا رزق بہتر ہے اور زیادہ باقی رہنے والا ہے اور اپنے والوں کو نماز کا حکم دو اور اس پر صبر و برداشت کے ساتھ برقرار ہو۔ ہم تم سے نہیں مانگتے ہم ہی تمہیں روزی پہنچاتے ہیں اور انجام کی بہتری پر ہیزگاری سے وابستہ ہے۔“

اگر خاص طور پر خطاب رسولؐ سے بھی جیسا کہ اس میدان شان نزول سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے ایک یہودی سے کچھ اناج بطور قرض طلب فرمایا۔ اس نے کہا کچھ گروی رکھیے تو دوں گا۔ اس پر رسولؐ کو بہت رنج ہوا، تو یہ آیت بطور تسلیٰ نازل ہوئی۔ پھر بھی مقصود اس سے خاص رسولؐ کی ذات نہیں ہے بلکہ سب ہی افراد ہیں جو قرآنی تعلیم کو سننا اور اس پر عمل پیرا ہونا چاہتے ہوں۔^[۱]
طرق اہل سنت سے ابی بن کعبؓ کی طرف نسبت ہے کہ انہوں نے اس آیت کے سلسلہ میں کہا:

فمن لم يتعز بعزاء الله تقطعت نفسه حسرات على الدنيا ومن يتبع بصره ما في ايدي الناس يطل حزنه ولا يشقى غيظه ومن لم ير الله عليه نعمة الا في مطعمه ومشر به نقص علمه وودنا عذابه۔
جو اللہ کی دی ہوئی تسلیٰ سے دلا سا قبول نہ کرے اس کا دنیا پر غم و غصہ سے کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگا اور جس کی نگاہ درپے رہے گی اس کی جو دوسرے لوگوں کے ہاتھ میں ہے، اس کا رنج و ملال طولانی ہوگا اور اسے سکون نہیں مل سکتا اور جو اللہ کی نعمت کا تصور صرف سامان اکل و شرب میں رکھتا ہو، اس کا علم ناقص ہوگا اور عذاب اس سے قریب ہوگا۔

ہمارے یہاں امام جعفر صادقؑ کی حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت اتری تو خود پیغمبر خدا ﷺ نے اس کی تشریح میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے (مجمع البیان)

آخر میں جو آیا ہے کہ ”اپنے والوں کو نماز کا حکم دو“ اگر حکم عام بھی ہو جیسا کہ وہ حقیقہ ہے، تب بھی رسول ﷺ سب سے اولیٰ ہیں کہ اس کی تکمیل فرمائیں، حالانکہ آپ کے اہل بیت وہ تھے جن کے لئے اس کی ضرورت نہ تھی مگر فرمان رب کے احترام میں ابو سعید خدریؓ کی مشہور رو

[۱] یہی اللہ تعالیٰ نبیہ محمدؐ اور المراد بہ جمع المخلفین (تبیان)

معروف روایت ہے کہ اس آیت کے اترنے کے ۹ مہینے ہر نماز کے وقت پیغمبر خدا ﷺ علی وفاطمہ علیہما السلام کے دروازہ پر تشریف لے جاتے اور فرماتے تھے: الصَّلَاةُ رَحْمَةٌ مِنْ رَبِّهِ. اِنَّمَا يُرِيدُ اللهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ آپ کے اہل اور اہل بیت کا اس گھر والوں میں انحصار ہے، کسی دوسرے گھر میں کوئی ایسا نہیں ہے جو آپ کے اہل اور اہل بیت کا مصداق ہو۔

وَقَالُوا لَوْلَا آيَاتُنَا بِآيَةِ رَبِّهِ ؕ أَوَلَمْ تَأْتِهِم بَيِّنَةٌ مَّا فِي الصُّحُفِ الْأُولَى ﴿٣٦﴾

’اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں لاتے ہمارے پاس کوئی نشانی اپنے پروردگار کی طرف سے! اور کیا آیا نہیں ان کے پاس کھلا ہوا ثبوت گزشتہ کتابوں میں ہے‘۔

’کوئی نشانی‘، یعنی جو ان کی فرمائش ہو، ورنہ نشانیاں یعنی معجزات تو رسول ﷺ برابر پیش کرتے ہی رہے تھے [۱] اور قرآن ہی کیا کم حقیقت کی نشانی تھا مگر وہ صرف دھاندلی کے طور پر اور کبھی بطور تمسخر ہی نہیں قسم کے معجزوں کی فرمائش کرتے تھے تو اُس کی جا بجا قرآن مجید میں ایک خاص انداز میں روکی گئی ہے یہاں یہ کہا گیا ہے کہ انہیں ایمان لانا ہوتا تو گزشتہ دور کے انبیاء کے بیانات ہی جو اس پیغمبر کے بارے میں موجود ہیں، اُن کے ایمان کے لئے کافی تھے، وہ انبیاء تو اسی قسم کے معجزات لائے تھے جس کی یہ فرمائش کرتے ہیں تو اُن پر یہ کب ایمان لائے ہوئے ہیں جو ایسے ہی معجزات کی فرمائش اب اس رسول پر ایمان لانے کے لئے وہ کر رہے ہیں۔

وَلَوْ اَنَّا اَهْلَكْنَاهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهِ لَقَالُوا رَبَّنَا لَوْلَا ارْسَلْتَ إِلَيْنَا رَسُولًا

فَنَتَّبِعَ آيَاتِكَ مِنْ قَبْلِ أَنْ نُنزِلَ وَنُحْزِي ﴿٣٧﴾

’اور اگر ہم انہیں ہلاک کر دیتے کسی عذاب سے اس کے پہلے تو وہ کہتے کہ اے ہمارے پروردگار! کیوں نہ تو نے کوئی پیغمبر ہمارے پاس بھیجا کہ ہم تیری آیتوں پیروی کرتے قبل اس کے کہ ذلیل اور رسوا ہوں‘۔

یعنی خلق کو ہمارے مقابلے میں عذر پیش کرنے کا موقع ہوتا اور ہماری حجت ان کے مقابلہ میں تمام نہ ہوتی، مطلب یہ ہے کہ پیغمبروں کے آنے کا مقصد تمام حجت ہوتا ہے جیسا کہ پہلے ارشاد ہو چکا ہے:

رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِيَعْلَمَ لِكُلِّ سُلُوفٍ لِّئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ

ہم نے پیغمبر بھیجے ثواب اور عذاب کی خبریں دیتے ہوئے کہ لوگوں کے پاس اللہ کے سامنے کوئی حجت ان پیغمبروں کے بعد نہ

رے۔ (نساء۔ ۱۶۵)

اور اس آیت سے مثل بہت سی دوسری آیات کے صاف پتہ چلتا ہے کہ خالق فول فنج سے جس پر کوئی اعتراض یا اس کی جائز شکایت کر سکے، منتر ہ وہ مبرا ہے یہی وہ وجوب عدل ہے جس یک اعتقاد کو شیعہ فرقہ کے خصوصی جرائم میں سمجھا جاتا ہے۔

[۱] یزیدون الایة التي یقنر حوہا لائہ اتی بالآیات (تبیان)

قُلْ كُلُّ مُتَرَبِّصٍ فَتَرَبِّصُوا ۗ فَسْتَعْلَمُونَ مَنْ أَصْحَابُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ

اهْتَدَى ﴿١٣٥﴾

”کہہ دیجئے کہ ہر ایک انتظار کرنے والا ہے لہذا تم بھی منتظر رہو تو تمہیں عنقریب معلوم ہوگا کہ کون سیدھی راہ والے ہیں اور کون دہ ہیں جنہوں نے صحیح راستہ پالیا ہے۔“

”ہر ایک انتظار کرنے والا یعنی ہم بھی اور تم بھی“ [۱] منتظر ہیں کہ ہم سے جو اللہ کے وعدے ہیں کہ دین اسلام کا غلبہ ہوگا، اُن کے پورے ہونے کا وقت آئے اور تم اس کے منتظر ہو کہ ہماری اصل نسل قطع ہو جائے اور تمہیں دنیا میں پھلنے پھولنے کا موقع ملے۔ اب دیکھنا ہے کہ کس کی توقع پوری ہوتی ہے!؟

یاد رہے کہ یہ آیت امام منتظر علی اللہ فرجہ الشریف کے انتظار کا سنگ بنیاد ہے۔ اب جو جماعت اس انتظار کو چھوڑ بیٹھی ہے وہ گویا قرآن کے چیلنج کی شکست تسلیم کرتی ہے اور نتیجہ کے اعتبار سے کفار و مشرکین یا منافقین کی توقع کے پورے ہونے کی قائل ہے جو قرآن کے منشاء کے صریحی خلاف ہے۔

[۱] ای کلّ واحد منّا ومنکم (تبیان)

سُورَةُ الْأَنْبِيَاءِ

مکیہ ۱۱۲ آیات

اس سورہ کا نام ویسا ہی ہے جیسے اس سے پہلے سورہ ہود اور سورہ ابراہیم کے نام ہو چکے ہیں، بایں معنی کہ متعدد انبیاء کا ذکر مسلسل اور بھی سوروں میں آیا ہے جیسے سورہ صافات اور ص و غیرہ مگر یہ نام اسی سورہ کا قرار پایا ہے۔ اس سورہ میں حسب ذیل خصوصی مضامین ہیں

سورہ انبیاء کے خاص مضامین:

- ۱----- خدا کے افعال کھیل یعنی عبث نہیں جو حکمت الہی کا تقاضا ہے۔
- ۲----- حق اور باطل کے ٹکڑاؤں میں نتیجتاً حق غالب اور باطل پاش پاش ہوتا ہے۔
- ۳----- فرشتوں کے اوصاف۔
- ۴----- اگر کوئی خدا ہوتے تو آپس میں کش مکش ہوتی جو علم کلام کی زبان میں ”برہان تمناع“ کہلاتا ہے۔
- ۵----- توحید الہی انبیاء کا متفقہ پیغام ہے۔
- ۶----- ہر ذی حیات کی زندگی پانی سے۔
- ۷----- آسمانوں کے ٹھوں جسم نہ ہونے بلکہ سیال مادہ کی نوعیت سے ہونے کی طرف اشارہ۔
- ۸----- ہر تنفس کے لئے موت کا ذائقہ چکھنا لازمی۔
- ۹----- قیامت میں میزان اعمال۔
- ۱۰----- حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بت شکنی اور قوم سے گفتگو۔
- ۱۱----- حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آگ میں پھینکا جانا اور اُس کا سرد ہو جانا۔
- ۱۲----- زراعت کے بارے میں حضرت داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کے فیصلے۔
- ۱۳----- حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ تمام چیزوں کا تسبیح الہی میں مصروف ہو جانا۔
- ۱۴----- حضرت سلیمان علیہ السلام کی دوش ہوا پرواز۔
- ۱۵----- جناب ایوب علیہ السلام کا امتحان اور اُن کا صبر۔
- ۱۶----- حضرت یونس علیہ السلام کی تسبیح۔
- ۱۷----- جناب زکریا علیہ السلام کی دعا۔

۱۸-----یا جوج اور ماجوج کا ذکر۔

۱۹-----انجام کار میں نیکو کاروں کا مکمل اقتدار۔

۲۰-----خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا رحمۃ للعالمین ہونا..... وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ ۝۱ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِنْ رَبِّهِمْ مُّحَدَّثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۝۲ لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ۝۳ وَاَسْرُوْا النَّجْوٰى ۝۴ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۝۵ هَلْ هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۝۶ اَفَتَأْتُوْنَ السَّحَرٰى وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝۷ قُلْ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۝۸ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝۹

”قريب آگيا ہے لوگوں کے لئے ان کے حساب کتاب کا وقت اور وہ ہیں کہ بے خبری میں مبتلا ہیں، بے اعتنائی کرنے والے نہیں آتی ان کے پاس کوئی تازہ بتازہ یاد دہانی مگر یہ کہ وہ اسے سنتے ہیں اس طرح کہ وہ کھیل کود میں مصروف ہیں اس عالم میں کہ ان کے دل غفلت میں مبتلا ہیں اور وہ چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں، وہ ظالم لوگ کہ کیا یہ ہے کہ سو ایک آدمی کے جو تمہارا ہی ایسا ہے۔ ک یا تم جادو کی طرف متوجہ ہوتے ہو، حالانکہ تم دیکھتے ہو؟“ اُس نے کہا کہ میرا پروردگار جانتا ہے ہر بات کو جو آسمان اور زمین میں ہے اور وہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا۔

قال ربِّي يعلم القول میں قال کے بجائے دوسری قرأت قُلْ ہوئی ہے [۱] جس کی بنا پر آخری آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ ”کہیے میرا پروردگار جانتا ہے“۔

تعجب ہے کہ جناب شیخ الطائف نے متن میں قال لکھا ہے مگر تشریح قُلْ کے لحاظ سے کی ہے اور لطف یہ ہے کہ علامہ طبرسی نے اس تضاد میں بھی اُن کی بیروی کی ہے۔ [۲]

بَلْ قَالُوْا اَضْغَاثٌ اَحْلَامٍ ۝۱۰ بَلِ افْتَرٰهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۝۱۱ فَلْيَاْتِنَا بِآيَةٍ ۝۱۲ كَمَا اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ۝۱۳ مَا اَمْنَتْ قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۝۱۴ اَفْهَمْ يَوْمِنُوْنَ ۝۱۵

[۱] قرأه الكوفة الا ابا بكر وخلفاء قال ربِّي على وجه الخبر والباقون قل ربِّي على وجه الامر (تبيان)

[۲] قل يا محمد ربِّي الخ (تبيان وجمع البيان)

”بلکہ کہا انہوں نے کہ یہ خواہائے پریشان ہیں، بلکہ اس نے غلط تہمت لگائی ہے، بلکہ وہ شاعر ہے، اچھا تو وہ ہمارے سامنے کوئی معجزہ پیش کر دے جس طرح اگلے پیغمبر بھیجے گئے۔ ان کے پہلے بھی وہ بستیاں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا ایمان نہیں لائی تھیں تو کیا یہ ایمان لے آئیں گے؟“ اُن کا بدل بدل باتیں کہنا، پہلے یہ کہ خواہائے پریشان ہیں، پھر یہ کہ اس نے غلط تہمت لگائی ہے، پھر اس کے بجائے یہ کہ وہ شاعر ہے۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ وہ اس غیر معمولی کلام سے حیرت میں مبتلا تھے کہ گھبرا کے ایک بات کہتے ہیں، پھر خود محسوس کرتے ہیں کہ بات بنی نہیں تو اس کے بجائے دوسری بات کہتے ہیں، اُس کے بھی غلط ہونے کا احساس ہوتا ہے تو تیسری بات کہتے ہیں [۱] چونکہ جو اصل حقیقت ہے کہ وہ خالقِ بشر کا نازل کیا ہوا کلام ہے، اُس کے ماننے اور ظاہر کرنے کے لئے وہ تیار نہیں ہیں تو پریشان ہو ہو کے وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جن کے غلط ہونے کا خود انہیں احساس ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِمْ فَسَلُّوا أَهْلَ الدِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ④ وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوا خَالِدِينَ ⑤ ثُمَّ صَدَقْنَاهُمُ الْوَعْدَ فَأَنْجَيْنَاهُمْ وَمَنْ نَشَاءُ وَأَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِينَ ⑥

”اور ہم نے آپ کے پہلے نہیں بھیجے مگر آدمی ہی جن کی طرف ہم وحی بھیجیں تو در یافت کرو صاحبانِ علم سے اگر تم نہیں جانتے اور نہیں بنایا تھا ہم نے انہیں ایسے مجسمے جو کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ وہ ہمیشہ رہنے والے تھے۔ پھر ہم نے ان سے جو وعدہ کیا تھا، اسے سچ کر دکھایا تو انہیں اور جن کو ہم نے چاہا چھٹکارا دیا اور حد سے تجاوز کرنے والوں کو ہم نے ہلاک کر دیا۔“

اہل ذکر سے سوال کا حکم:

”ان سے جو وعدہ تھا، اسے ہم نے سچ کر دکھایا، یعنی نصرت کا جو وعدہ اور اُسی وعدے کا پورا کرنا ہے جس کا بعد کو بیان ہے۔ [۲]“

”چھٹکارا دیا انہیں“ یعنی خود ان پیغمبروں کو اور جن کو ہم نے چاہا“ یہ ان پیغمبروں پر ایمان لانے والے افراد ہو سکتے ہیں جو ان کے ساتھ تھے۔ [۳]

اس کے لئے اہل الذکر کی طرف رجوع کا حکم دیا گیا ہے، جہاں جہاں اہل الذکر کی لفظ قرآن میں آئی ہے کہ ان سے پوچھو، وہاں اُس کے مفہوم میں اختلاف ہوا ہے اور ہر جگہ قریب تحقیق یہ تفسیر ہے کہ ہیں اہل الذکر کے معنی ہیں اہل العلم اور ظاہر ہے کہ

[۱] بل الانتقال من غرض الى آخر في المراضع الثلاثة (جلالین) قول متحیر قد یہرہ ما سمع فمترّی بقول ساحر و مترّی بقول شاعر ولا

يجزم على امر واحد (تبیان و مجمع البیان)

[۲] صدقناهم الوعد یعنی الانبیاء الماضین ما وعدناهم به من النصر العاجل (تبیان)

[۳] ای المصدّقین لهم (جلالین)

مصدق اتم اس کا اسلام کے حقیقی رہنمایاں معصومین علیہم السلام ہیں اور اس لئے ہمارے آئمہ علیہم السلام نے اکثر فرمایا ہے کہ ہم اہل الذکر ہیں پھر جب کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خود قرآن میں ذکر کا لقب موجود ہے تو اس لحاظ سے بھی آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم اہل الذکر ہوئے [۱] اور قرآن کو الذکر کہا گیا ہے، اس طرح بھی اہل الذکر وہی ہستیاں ہیں جنہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مستقل طور پر قرآن کا ساتھی بتایا ہے۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۵

”ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب اتاری ہے جس میں تمہاری نصیحت ہے تو کیا تم عقل سے کام نہیں لو گے؟“

فیہ ذکر کم کا ترجمہ جو ہم نے کیا ہے، وہ ایک تفسیر کے مطابق ہے [۲] لیکن ایک معنی اس کے یہ کہے گئے ہیں کہ اس میں تمہاری عزت ہے جیسا کہ دوسری آیت میں ہے کہ:

وَ اِنَّ لَدُنْكُمْ لَكُمْ وِلْيٰتٌ مِّنْكُمْ ۗ وَ لَقَوْمِكُمْ ۗ وَ هُمْ ضَرُوْرًاۙ لَّكُمْ ؕ لَئِن لَّمْ يَکُنْ لَّكُمْ اَوْلٰٓءُ لَکُمْ اَعْمٰیۙرٌ مِّنْ اَعْمٰیۙرِہِمْ ۗ وَ لَیْسَ لَہُمْ عَلَیْکُمْ سُلْطٰنٌ شَیْۤءٌ ۗ وَ لَیْسَ لَہُمْ عَلَیْکُمْ حَیۡرٌ شَیْۤءٌ ۗ وَ لَیْسَ لَہُمْ عَلَیْکُمْ حَیۡرٌ شَیْۤءٌ ۗ وَ لَیْسَ لَہُمْ عَلَیْکُمْ حَیۡرٌ شَیْۤءٌ ۗ (زخرف - ۴۴)

علامہ طبرسی نے اسی تفسیر کو مقدم قرار دیا ہے۔ [۳]

وَ کُمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْیَۃٍ کَانَ ظٰلِمَۃً ۗ وَ اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخِرِیْنَ ۝۱۱ فَلَمَّا

اَحْسَوْا اَبَاسَنَا اِذَا ہُمْ مِنْہَا یُرْکَضُوْنَ ۝۱۲ لَا تَرٰکُضُوْا وَ اَرْجِعُوْا اِلَی مَا اُتْرِفْتُمْ

فِیْہِ وَ مَسٰکِیْنُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَسْـَٔلُوْنَ ۝۱۳ قَالُوْا یٰوٰیِلْنَا اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیْنَ ۝۱۴ فَمَا زِلْتَ

تِلْکَ دَعُوْہُمْ حَتّٰی جَعَلْنٰہُمْ حَصِیْدًا لِّمُحْمِدیْنَ ۝۱۵

”اور کتنی ہی ہم نے قلع قمع کر دیں بستیاں جو ظالم تھیں اور ان کے بعد دوسری قوم پیدا کی اور جب انہوں نے ہمارے عذاب کو محسوس کیا تو ایک دم وہ اس سے (بچنے کے لیے) دوڑ بھاگ کرنے لگے۔ اب دوڑ بھاگ نہ کرو اور رہو اسی عیش و عشرت میں جو اب تک رہا ہے اور اپنے انہیں محلات میں، شاید تمہاری پوچھ گچھ کچھ ہو۔ انہوں نے کہا ہائے غضب! بلاشبہ ہم ظالم تھے تو یونہی وہ دہائی مچاتے رہے، یہاں تک کہ ہم نے ان کو کٹا چھٹا، خاموش و افسردہ کیا۔“

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰۗءَ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَہُمَا الْعِیْبِیْنَ ۝۱۶ لَوْ اَرَدْنَا اَنْ نَّتَّخِذَ لَہٗوَآ

لَا نَتَّخِذُنْہُ مِنْ لَّدُنَّا ۝۱۷ اِنْ کُنَّا فٰعِلِیْنَ ۝۱۸ بَلْ نَقْدِفُ بِالْحَقِّ عَلَی الْبٰطِلِ فِیۡدَمَّغُہٗ

[۱] اختلاف فی المعنی بأهل الذکر علی اقوال فروی عن علیؑ انه قال نحن اهل الذکر ووردی ذلک عن ابی جعفرؑ ویریدہ ان اللہ

تعالی سَمَّی النَّبِیَّ ذِکْرًا لِّرَسُوْلًا (مجمع البیان)

[۲] اپند شما (شاہ ولی اللہ)

[۳] ای فیہ شرفکم ان تمسکتہم بہ (مجمع البیان)

فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۖ وَلَكُمْ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ ﴿١٨﴾

”اور انہیں پیدا کیا ہم نے آسمان اور زمین اور اُن کے درمیان کی چیزوں کو تفریحی طور پر اگر ہم چاہتے دل بستگی کا سامان تو اُسے بناتے اپنے پاس سے، اگر ایسا کرنا چاہتے بلکہ ہم حق کو باطل سے ٹکراتے ہیں تو وہ اسے توڑتا ہے جس کے نتیجے میں وہ ایک دم نیست و نابود ہو جاتا ہے اور تمہارے لئے وائے ہو اس سے جو تم باتیں کہتے ہو۔“

افعال الہی عبث نہیں، حق و باطل کے تصادم کا عام انجام:

دل بستگی کے سامان سے مراد بیوی بچے ہیں ^[۱] اور اگر ایسا کرنا ہوتا تو اُسے اپنے پاس سے بناتے، یعنی فرشتوں اور حوروں سے ایسا سامان اپنے لئے مہیا کرتے۔ ^[۲]

اس مناسبت سے آخری فقرہ کا مطلب شاہ عبد القادر کی الفاظ میں یوں ہے کہ ”اللہ تعالیٰ غیب سے ایک قدرت کاملہ کا نمونہ بھیجتا ہے جھوٹ کے مٹانے کو۔ اُن کاموں کو تم کہتے ہو ”خدا کا بیٹا“۔ (موضح القرآن)

”تمہارے لئے وائے ہو اُس سے جو تم باتیں کہتے ہو“ یعنی اللہ کی طرف زوجہ اور اولاد کی نسبت دیتے ہو۔ ^[۳]

وَلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَمَنْ عِنْدَهُ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ ۗ وَلَا

يَسْتَحْسِرُوْنَ ﴿١٩﴾ يُسَبِّحُوْنَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴿٢٠﴾

”اور اُس کے ہیں وہ سب آسمانوں اور زمین میں ہیں اور جو اس کے پاس ہیں، وہ اس کی عبادت سے سرتابی نہیں کرتے اور نہ تھکتے ہیں، رات اور دن کی تسبیح کرتے ہیں، سست نہیں ہوتے۔“

فرشتوں کے اوصاف:

یہ فرشتوں کے اوصاف ^[۴] جن کی فطرت ایسی ہے کہ وہ لگا تار عبادت کرتے ہیں ۲۔ نہ ان کے جسم ایسے ہیں کہ ان میں تھکن پیدا ہو، نہ طبیعتیں ایسی ہیں کہ ایک حالت پر رہنے سے اکتا جائیں اور تنوع کو دل چاہے۔

اَمْ اَتَّخِذُوا الْاِلٰهَةَ مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنۡشِرُوْنَ ﴿٢١﴾ لَوْ كَانَ فِيۡهِمَا اِلٰهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ

[۱] یعنی زن و فرزند (فتح الرحمن) کھلونا یعنی بیٹا (موضح القرآن)

[۲] من عندنا من الحور العين والملائكة (جلالین)

[۳] تصفون اللہ من اتخذ الاولاد (تبیان) من اتخذ الصاحبة والولد (مجمع البیان)

[۴] یعنی الملائكة (علی ابن ابراہیم) اذ ائمون علیہ (تبیان)

لَفَسَدَتَا فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿٢٢﴾

”کیا انہوں نے زمین سے ایسے خدا بنائے ہیں کہ جو دوبارہ زندہ کرتے ہوں؟ اگر دونوں میں اللہ کے علاوہ کئی خدا ہوتے تو وہ دونوں تباہ و برباد ہو جاتے، تو پاک ہے اللہ جو عرش کا مالک ہے اُس سے، جو وہ بیان کرتے ہیں۔“

توحید کی مشہور دلیل اور ”برہان تمنع“:

”اگر ان دونوں میں، یعنی زمین اور آسمان میں ”کئی خدا ہوتے تو وہ دونوں تباہ و برباد ہو جاتے۔“ اس سے متکلمین نے نصی شرک پر برہان تمنع مرتب کیا ہے اور غالباً اسی لئے جلالین نے دونوں جگہ لفسد تا کی تشریح میں لفظ تمنع صرف کی ہے۔“

خرجتا من نظامها المشاهد لوجود التمانع بينهم على وفق العادة عند تعدد الحاكم من التمانع في الشيء وعدم الاتفاق عليه۔

دونوں خارج ہو جاتے اپنے نظم و ترتیب سے جس کا مشاہدہ ہو رہا ہے اس لئے کہ ان خداؤں میں تمنع ہوتا جیسے کہ عموماً حاکموں کے کئی ہونے کی صورت میں ہوتا ہے کہ کسی بات میں ان کے درمیان تمنع ہوتا ہے اور اس پر وہ متفق نہیں ہوتے۔

اسی طرح شیخ الطائفہ نے بھی ایک دفعہ لفظ تمنع صرف کی ہے۔ فرماتے ہیں:

لو صح الهان او الهة لصح بينهما التمانع فكان يؤدى ذلك الى ان احدهما اذا اراد فعلا واراد الاخر ضده ان يضع مرادهما فيؤدى الى اجتماع الضدين اولا يقع مرادهما فينتقض كونهما قادرين او يقع مراد احدهما فيؤدى الى نقض كون الاخر قادرا (تبیان)

اگر دو یا کئی خدا ہونے کا امکان ہوتا تو ان دونوں کے درمیان تمنع ایک دوسرے کے خلاف (ارادہ) بھی ممکن ہوتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جب ایک نے ایک کام کا ارادہ کیا اور دوسرے نے اُس کے خلاف کا ارادہ کیا تو یا دونوں کا مقصد وقوع میں آئے تو نتیجہ یہ ہو کہ دو متضاد باتیں ایک ساتھ ہوں یا دونوں کا مطلب پورا نہ ہو تو دوسرا صاحب قدرت قرار نہیں پائے گا۔

علامہ طبرسی نے صاف لکھ دیا ہے کہ: هذا هو دليل التمانع الذي نبى عليه المتكلمون مسألة التوحيد۔
یہ وہی دلیل تمنع ہے جس پر متکلمین نے توحید کے مسئلہ کی بنیاد رکھی ہے۔

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ ﴿٢٣﴾

”جو کچھ وہ کرے، اُس کے متعلق اُس سے نہیں پوچھا جائے گا، بے شک ان سے پوچھ گچھ کی جائے گی۔“

اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ سے بالاتر کوئی حاکم نہیں ہے کہ وہ اس سے حاکمانہ طور پر باز پرس کرے اور یہ جتنے ہیں جنہیں دنیا والے معبود قرار دے رہے ہیں، اللہ کے بندے ہیں، اس لئے ان سے جواب دہی ہوگی، یہ اور بات ہے کہ جواب دہی کے بعد وہ بے گناہ قرار پائیں جیسے دوسری جگہ تفصیل سے جناب مسیح علیہ السلام سے سوال و جواب جو روز قیامت ہوگا، مذکور ہے۔

آیت کا ترجمہ بالکل صاف ہے چنانچہ شاہ رفیع الدین نے بھی لکھا ہے ”نہیں سوال کیا جاتا اُس چیز کہ کرتا ہے“ مگر ان کے والد بزرگوار جناب شاہ ولی اللہ نے معلوم نہیں کسی غلطی میں یہ ترجمہ کر دیا ہے کہ ”پرسیدہ نمی شود خدا از آنچہ صفت فی کند“ معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ کرتے وقت آیت کے الفاظ بجائے عملاً یفعل کے عملاً یصفون اُن کے ذہن میں آئے۔ بلاشبہ ”یہ خطائے بزرگان“ کی بڑی اہلی مثال ہے۔

بہر حال ”جو کچھ وہ کرتا ہے، اُس کے متعلق اس سے پوچھا نہیں جائے گا“۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ کے افعال کا واقعاً بھی کوئی معیار نہیں ہے۔ وہ جو چاہے کرے، اُس کے لئے روا ہے جیسا کہ جمہور اہل سنت کا جو عدل کے منکر ہیں، اُس کے بارے میں تصور ہے، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ وہ اس کی قدرت و قوت ہے، جس کی بنا پر اس سے کوئی دوسری طاقت سوال کرنے والی نہیں ہے اور یہ خود اُس کا علم و حکمت اور شانِ کمال ہے کہ سوانیر کے کسی شرکاء تصور اس کے افعال میں درست نہیں ہے۔

ایک مفہوم اس کا اور سمجھا گیا ہے کہ چونکہ اُس کے افعال سب عدل و حکمت پر مبنی ہوتے ہیں لہذا اُس سے پوچھنے کی گنجائش ہی نہیں کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اور دوسرے چونکہ غلط باتیں بھرتے ہیں لہذا اُن سے مواخذہ کا موقع ہوتا ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟^[۱] مگر ہمارے نزدیک پہلا ہی مفہوم زیادہ درست ہے۔

أَمْ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ الْهَيْهَةِ قُلُوبًا بَرَّهَا نَكْمٌ ۚ هَذَا ذِكْرٌ مِّنْ مَّعِي وَذِكْرٌ
مِّنْ قَبْلِي ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۗ الْحَقُّ فَهُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿۳۳﴾ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ
قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِيَ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ ﴿۲۵﴾

”کیا انہوں نے اُسے چھوڑ کر بہت سے خدا بنائے ہیں؟ کہیے کہ اپنی دلیل پیش کرو، یہ اُن کی تعلیم ہے جو میرے ساتھ ہیں اور اُن کی تعلیم جو میرے پہلے تھے بلکہ ان میں اکثر اشخاص حق کو جانتے نہیں تو وہ بے اعتنائی اختیار کیے ہوئے ہیں، اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کے پہلے کوئی پیغمبر مگر یہ کہ اُس کی طرف ہم نے وحی بھیجی کہ کوئی خدا سوا میرے نہیں تو میری عبادت کرو“۔

توحید الہی تمام پیغمبروں کا متفقہ پیغام:

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”پہلے اُن معبودوں کا ذکر فرمایا جو برابر خدا کے کوئی سمجھے اگر دو حاکم ہوتے تو جہاں خراب ہوتا۔ اب اُن کا ذکر فرمایا جو خدا کے نائب ٹھہراتے ہیں اس پر مالک کی سند چاہیے، اُس کے بغیر کیونکہ نائب ہووے“۔ (موضح القرآن)

”میرے ساتھ والوں کی تعلیم“ یعنی قرآن جو میرے ساتھ والوں کو تعلیم دینے والی کتاب ہے اور ”میرے پہلے والوں کی تعلیم“ یعنی

[۱] معنا ان جميع افعالہ حکمة و صواب ولا يقال للحکيم لم فعلت الصواب وهم يسألون لا تهم يفعلون الحق و الباطل (مجمع البيان)

توریت اور انجیل سب میں اللہ کی وحدت ہی کا اعلان ہے، شرک کی حمایت کوئی کتاب نہیں کرتی [۱]، اور تمام پیغمبر یہی تعلیم دیتے رہے۔ یہ وہ چیز ہے جسے علمائے متکلمین 'اجتماع انبیاء و مرسلین' سے استدلال کی صورت سے پیش کرتے رہے ہیں۔ اس بنا پر کہ رسالت وجود خدا پر موقوف ہے لہذا اقوال مرسلین سے وجود خدا پر استدلال نہیں ہو سکتا۔ اُس پر صرف عقلی دلائل ہی سے استدلال ہو سکتا ہے لیکن انبیاء کی سچائی معجزات سے ثابت ہونے کے بعد ان کے اقوال سے توحید پر استدلال میں کوئی خرابی نہیں ہے۔

اس استدلال کو جناب امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے اپنے ایک کلام میں جو نوح البلاغہ کے اندر ہے بالکل عقلی لباس پہنا کر اس طرح پیش فرمایا ہے:

لو كان مع الله اله لا تنارسله ولراينا اثار قدرته.

اگر اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا ہوتا تو اس کے پیغمبر بھی ہمارے پاس آتے اور اس کی قدرت کے آثار بھی ہم دیکھتے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهُ ۗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ ﴿۱۶﴾ لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ
وَهُمْ بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ ﴿۱۷﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا
لِمَنِ ارْتَضَىٰ وَهُم مِّنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ ﴿۱۸﴾ وَمَنْ يَقُلْ مِنْهُمْ إِنِّي إِلَهٌ مِّنْ
دُونِهِ فَذَلِك نَجْرِيهِ جَهَنَّمَ ۗ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظَّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾

’اور وہ کہتے ہیں کہ خدائے رحمن نے اولاد بنائی ہے۔ پاک ہے اس کی ذات بلکہ وہ معزز بنے ہیں وہ اس پر کسی بات میں سبقت نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم پر عمل کرنے والے ہیں۔ وہ جانتا ہے اُسے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ سفارش نہیں کرتے مگر اس کی کہ جسے وہ پسند کرے اور وہ اس کے ڈر سے سہمے ہوئے رہتے ہیں اور جو ان میں سے کہے کہ اسے چھوڑ کہ میں خدا ہوں تو اسے ہم دوزخ کی سزا دیں گے، اسی طرح سزا دیتے ہیں ظالموں کو‘۔

معصومین علیہم السلام کی توصیف:

فرشتوں کو مشرکین اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اس لئے عموماً اسے فرشتوں ہی سے متعلق قرار دے دیا گیا ہے [۲] اور اس فقرہ کو کہ لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ ﴿۱۷﴾ (سورہ انبیاء) ملائکہ کی صفت قرار دیا جاتا ہے مگر جب کہ اولاد قرار دیا جانا فرشتوں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ جہاں فرشتوں کی نسبت مشرکین کے تصور کا تذکرہ قرآن مجید میں ہے وہاں صراحتاً کہا گیا ہے کہ وہ اس کے لئے بنات (بیٹیاں) قرار

[۱] ذِکْرٌ مِّنْ مَّعَىٰ اٰمِيٍّ وَهُوَ الْقُرْآنُ وَذِکْرٌ مِّنْ قَبْلِيْ مِنَ الْاَمَمِ وَهُوَ التَّوْرَةُ وَهِيَ الْاَنْجِيْلُ وَغَيْرُهُمَا مِّنْ كِتَابِ اللّٰهِ لَيْسَ فِيْ وَاٰحِدٍ مِّنْهَا نَّ

مَعَ اللّٰهِ الْهٰجِئًا قَالُوْا (جلالین)

[۲] وَلِدًا مِّنَ الْمَلَائِكَةِ (جلالین)

دیتے ہیں۔ اولاد قرار دینے سے زیادہ تر یہودی عقیدہ عزیز کے متعلق اور عیسائیوں کا عقیدہ مسیح کے متعلق ذہن میں آتا ہے تو اس عبادت کو مومن اور اس کے بعد کے اوصاف کو ان بندگان الہی یعنی انبیاء مرسلین پر بھی کیوں حاوی نہ سمجھا جائے؟ اس طرح وہ فقط ملائکہ نہیں بلکہ انبیاء کی بھی عصمت کی دلیل ہوگی جب کہ شفاعت جس کا بعد میں تذکرہ ہے، وہ بلاشبہ انبیاء سے متعلق ہے۔

بحیثیت واقعہ انہیں کسی ناپسند بات کے ارتکاب سے بری کہہ دینے کے بعد اب جو اصولوں کا اعلان ہے ”جو ان میں سے کہے کہ اسے چھوڑ کر میں خدا ہوں تو اسے ہم دوزخ کی سزا دیں گے“۔ وہ اصول کی ہمہ گیری کو پوری قوت کے ساتھ ظاہر کرنے کے لئے بطور مفروضہ ہے جیسے خاتم الانبیاء ﷺ سے بظاہر مخاطب ہو کر اعلان کیا ہے: لَيْدِنْ اَشْرَكْتَ لَيْحَبَطَنَّ عَمَلُكَ (زمر۔ ۶۵) اگر آپ شرک کیجیے تو ضرور آپ کے اعمال سب اکارت ہو جائیں گے، لہذا اس کے لئے پہلے کلام کو ملائکہ سے متعلق کرنے کے بعد مصداق کے تلاش کی ضرورت نہیں ہے کہ اس سے مراد ابلیس ہے جو ملائکہ کی صفوں میں شامل تھا مگر اس نے اپنی عبادت کی طرف دعوت دی۔^[۱]

چونکہ قرآن نے ملائکہ کی شان وہ بتلا دی ہے جس کا پہلے ذکر ہے تو ابلیس سے حقیقتاً اس کے ملائکہ میں سے ہونے کے مفروضہ پر ایسا کردار ظاہر ہی کیوں کر ہو سکتا تھا؟

واقعہ یہ ہے کہ نہ ابلیس ملک تھا اور نہ یہاں کو کہا جا رہا ہے، وہ کسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے بلکہ وہ جیسا کہ ہم نے کہا اور اس کی نظیر قرآن سے پیش کی، صرف بحیثیت مفروضہ ہے جس سے اصول کی ہمہ گیری پر زور دینا مقصود ہے۔

اَوَلَمْ يَرِ الدِّينَ كَفَرُوا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَهُمَا ط
 وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ط اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۳۰ وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِي
 اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ۝ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝۳۱ وَجَعَلْنَا
 السَّمٰوٰتِ سَفَافًا مَّحْفُوْظًا ۝ وَهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ۝۳۲ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ الْاَيْلَ
 وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ط كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُوْنَ ۝۳۳

”کیا کافروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین سب ملے ہوئے تھے تو ہم نے ان میں شکاف پیدا کیا اور ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے قرار دیا تو کیا یہ ایمان نہیں لائیں گے؟ اور ہم نے زمین میں پہاڑ قرار دیے کہ وہ ان لوگوں کو لے کر ڈنوا ڈول نہ ہو اور ان کی درمیانی خلاؤں میں راستے بنائے۔ شاید کہ وہ ہدایت پائیں اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنایا اور دن اور سورج اور چاند کو پیدا کیا۔ ہر ایک ایک دائرہ میں تیر رہا ہے۔“

ہر ذی حیات کی خلقت یا بقاء پانی سے، آسمانوں کے ٹھوس جسم نہ ہونے کی طرف اشارہ:

”ہر زندہ چیز کو پانی سے قرار دیا“۔ اس کا جو بالکل ظاہری مفہوم ہے، وہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ ان کی خلقت نطفہ سے ہوئی اور نطفہ کو بھی

[۱] وهو ابليس دعا الى عباده فو امر بطاعته (جلا لہین)

خالق نے دوسرے مقامات پر مآء ہی سے تعبیر کیا ہے [۱] اور یہ بھی کہ پانی اس کا سبب حیات ہے۔ [۲]

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّن قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ أَفَأَن مَّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُونَ ﴿۳۴﴾ كُلُّ نَفْسٍ

ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ۖ وَنَبَلُّوكُمْ بِالْمُنَىٰ وَالْحَيْرِ فِتْنَةً ۖ وَاللَّيْنَا تُرْجَعُونَ ﴿۳۵﴾

”اور آپ کے پہلے بھی کسی آدمی کے لئے ہمیشگی زندگی ہم نے قرار نہیں دی۔ تو کیا اگر آپ دنیا سے اٹھ جائیں تو وہ ہمیشگی زندگی پا جائیں گے؟ ہر تنفس موت کا مزہ چکھنے والا ہے اور ہم تم لوگوں کو برائی اور بھلائی کے ساتھ آزمائش میں مبتلا کرتے ہیں اور ہماری ہی طرف تم پلٹو گے۔“

ہر تنفس کے لئے موت کا مزہ چکھنا ضروری ہے:

آیت کا پس منظر جلالین نے یہ لکھا ہے: قال الكفار ان محمدًا يموت۔ کافروں نے کہا کہ محمدؐ عنقریب مرجائیں گے۔ شاہ عبدالقادر نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ: ”کافر کہتے تھے اس شخص تک ہے یہ دھرم، جہاں یہ مرا پھر کچھ نہیں۔“ (موضح القرآن) دیکھا جائے تو دونوں باتیں ایک دوسرے کا تہمتہ ہیں۔ جلالین کی تفسیر ”کافروں نے کہا یہ عنقریب مرجائیں گے“ یہ کوئی واقعہ کی اطلاع تھوڑی تھی۔ اس کہنے میں یہی تمنا مضمر ہے کہ بس یہ مرجائیں تو ان کا دین ختم ہو جائے۔ اس کو علامہ طبرسی نے یوں کہا ہے کہ:

قالوا انتربص به ريب المنون (مجمع البيان) انہوں نے کہا ہمیں انتظار ہے ان کے لئے موت کی کارگزاری کا خالق کریم نے مذکورہ بالا آیات میں اس کے جواب میں کئی باتیں کہی ہیں:

۱۔ نئی بات کیا ہے جو انہی کے لئے انتظار ہے اس کے پہلے جتنے انبیاء آئے، سب ہی کو ایک دن موت سے دوچار ہونا پڑا۔
۲۔ اس پر کہ وہ خوش نصیب ہو رہے ہیں کہ یہ مرجائیں گے، کہا جا رہا ہے کہ ارے یہ مرجائیں گے تو کیا تم ہمیشہ کے لئے رہ جاؤ گے۔ اے دوست بر جنازہ دشمن چو بگذری شادی کن کہ بر تو ہمیں ماجرا رود۔

۳۔ موت ہر تنفس کے لئے ہے جس کے ساتھ آزمائش اس کی ہے کہ اس دار دنیا میں کردار کیا رہتا ہے؟
ظاہر ہے کہ رسولؐ دنیا سے اٹھیں گے تو پوری زندگی قابل تعریف گزار کر۔ تم اپنی خبر لو کہ دنیا سے جاؤ گے تو کیا کر توت چھوڑ کر جاؤ گے۔
۴۔ اس دنیا سے اٹھ کر سب کسی اور طرف تھوڑی جائیں گے۔ ہماری ہی طرف پلٹیں گے تو ہم اس دار دنیا والے کردار کے لحاظ ہی سے ان کا انجام ان کی آنکھوں کے سامنے لائیں گے تو یہ سوچنے کی بات ہے کہ وہاں انجام کس کا کیا ہوتا ہے؟! ان کا انجام ان کی آنکھوں کے سامنے لائیں گے تو یہ سوچنے کی بات ہے کہ وہاں انجام کس کا کیا ہوتا ہے!؟

وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ يَتَّخِذُونَكَ إِلَّا هُزُوًا ۖ أَهَذَا الَّذِي يَذْكُرُ

الِهَتِكُمْ ۖ وَهُمْ يَذُكُرُونَ ۝ كَفَرُونَ ﴿۳۶﴾

[۱] المعنى ان كل شىء صار حيا فهو معمول من الماء (تبيان) بييدا كر ديمه از آب (شاه ولي الله)

[۲] اى الماء سبب الحيوته (جلالين)

”اور جب کافر لوگ آپ کو دیکھتے ہیں تو بس آپ کا مذاق اڑاتے ہیں ”کیا یہی وہ ہے جو تمہارے خداؤں کا ذکر کیا کرتا ہے“؟ اور ان کا عالم یہ ہے کہ وہ خدائے رحمن کے ذکر سے منکر ہیں۔“

”خداؤں کا ذکر کیا کرتا ہے“ یعنی ان کی برائی کرتا ہے اور ان کی عبادت پر نکتہ چینی کرتا ہے۔^[۱]

اس کا جواب ایک خاص انداز میں یوں گیا ہے کہ ان بتوں پر حرف گیری کو مورد الزام قرار دیتے ہیں جن کا ان پر نہ کوئی احسان ہے اور نہ کوئی ویسا کارنامہ ہے اور یہ خود وہ ہیں جو اس خدا کا انکار کرتے ہیں جو حقیقتاً ان کا ولی نعمت ہے اور ان کی پشت جس کے احسانات کے باسے خمیدہ ہے۔^[۲]

ایک دوسرا پہلو اس جواب کا میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ ان کے بتوں کا ذکر برائی کے ساتھ ہوتا ہے وہ ان کو ناگوار ہوتا تو محل تعجب نہیں۔ لیکن رسول تو جب مثبت پہلو اختیار کر کے خدائے رحمن کی حمد و ثناء کرتے ہیں تو اس پر پھر بھی ان کو اعتراض ہے اور یہ اس کا انکار کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انہیں اظہار حق کسی صورت سے گوارا نہیں تو ان کی اس خوئے انکار و اعتراض کا کہاں تک خیال کیا جائے؟ یہی حال ہے متعصب مخالفین مذہب حق اس وقت بھی کہ ان کے پیشواؤں کو برا کہا جائے۔ یہ انہیں ناگوار ہوتا تو پھر ایک بات ہے مگر ان سے تعرض کیے بغیر فضائل اہل بیت رسول ﷺ اور بالخصوص مناقب حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کیے جائیں تو وہ بھی انہیں ناگوار ہوتے ہیں۔ اس کا آخر کیا علاج ہے۔

خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ۗ سَأُورِيكُمْ آيَاتِي فَلَا تَسْتَعْجِلُونِ ۗ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَذَا الْوَعْدَانِ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۗ لَوْ يَعْلَمُ الَّذِينَ كَفَرُوا حِينٍ لَا يَكْفُونُ عَنْ وُجُوهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُورِهِمْ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ۗ بَلْ تَأْتِيهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ۗ

”آدمی کا خمیر ہوا ہے جلد بازی سے عنقریب میں اپنی نشانیاں تمہیں دکھلاؤں گا تو تم جلدی سے کام نہ لو اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو؟ کاش جانیں وہ جو کافر ہیں اُس وقت کا عالم جب وہ نہ روک سکیں گے اپنے چہروں سے آگ کو اور نہ اپنی پشت سے اور نہ ان کی مدد ہوگی بلکہ وہ ساعت ان پر اچانک آئے گی تو انہیں ششدر کر دے گی تو وہ اُسے پلٹا نہیں سکیں گے اور نہ انہیں مہلت ملے گی۔“

”جلد بازی سے خمیر ہوا ہے“ اس کے معنی میں کافی اختلاف ہے، قرین قیاس یہی مفہوم ہے جلد بازی اُس کی طبیعت میں داخل ہے اور یہی بعد کے فقرہ سے مناسبت رکھتا ہے کہ میں عنقریب اپنی نشانیاں تمہیں دکھلاؤں گا تو تم جلد بازی سے کام نہ لو۔“^[۳]

[۱] یاد می کندی یعنی باہانت (شاہ ولی اللہ) یعیہا (جلالین)

[۲] اثمهم نعیبون مجد الہیۃ من لانعمۃ لہو ہم یجدون الہیۃ ”من کل نعمة فهو منه وهذا نہایۃ الجہل (تبیان)

[۳] قال قتادة معناه خلق الانسان عجولا..... والذي قاله قتادة اقوى الوجوه (تبیان)

”نہ روک سکیں گے اپنے چہروں سے آگ کو اور نہ اپنی پشت سے، یعنی وہ چاروں طرف سے انہیں گھیرے ہوئے ہوگی۔“^[۱]

وَلَقَدْ اسْتَهْزِئِي بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُمْ مَا كَانُوا بِهِ

يَسْتَهْزِئُونَ^[۲]

”اور مذاق اڑایا گیا بہت سے پیغمبروں کا جو آپ سے پہلے تھے تو آگے آیا ان کے جنہوں نے ان سے تمسخر کیا تھا،

وہی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔“

یعنی عذاب الہی کی خبریں سن کر ہی وہ مذاق اڑاتے تھے، اب وہی عذاب ان کے سامنے آ گیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے اور اس نے

انہیں گھیر لیا۔

قُلْ مَن يَّكْلُوْكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ۗ بَلْ هُمْ عَن ذِكْرِ رَبِّهِمْ

مُعْرِضُونَ^[۳] اَمْ لَهُمْ اِلٰهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ۗ لَا يَسْتَطِيعُوْنَ نَصْرَ

اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ^[۴] بَلْ مَتَّعْنَا هٗؤُلَاءِ وَاٰبَاءَهُمْ حَتّٰى طَالَ

عَلَيْهِمُ الْعُمْرُ ۗ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۗ اَفْهَمُ

الْغٰلِبُوْنَ^[۵]

”کہیے کہ کون تمہاری حفاظت کر سکتا ہے رات اور دن میں اللہ سے؟ بلکہ وہ اپنے پروردگار کی یاد سے بے اعتنائی

اختیار کرنے والے ہیں؟ یا کیا ان کے خدا ایسے ہیں کہ ہمارے علاوہ وہ ان کی حفاظت کر سکیں وہ تو خود اپنی مدد نہیں

کر سکتے اور نہ ہماری طرف سے ان کیلئے ہمد ہے۔“^[۶]

بلکہ ہم نے انہیں اور ان کے باپ دادا کو مال و منال سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا ہے یہاں تک کہ وہ لمبی عمروں تک جیا کیے ہیں۔ کیا وہ

نہیں دیکھتے کہ ہم چلے آ رہے ہیں گھٹاتے ہوئے اس زمین کو اس کے اطراف و جوانب سے تو کیا وہ غالب آسکتے ہیں؟“

شروع میں جو ہے کہ ”کون تمہاری حفاظت کر سکتا ہے رات اور دن میں اللہ سے؟“ اس کے بظاہر یہی معنی ہوتے ہیں کہ اللہ کے عذاب سے

تمہاری کون حفاظت کر سکتا ہے؟^[۷] لیکن ایک معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ رات اور دن میں جو حادثے پیش آتے ہیں، ان سے تمہیں کون بچا سکتا ہے^[۸] مگر

اس صورت میں من اللہ کے معنی بدل لا من اللہ کے ہوں گے یعنی اللہ کے بدلے میں دوسرا کون ہے جو تمہیں ان خطروں سے بچا سکے؟ بعد میں جو ہے

[۱] یعنی ان الثار یحبط بہم من جمیع وجوہہ (تبیان) من جمیع جوانبہم (مجمع البیان)

[۲] معناه لا یصح بہم صاحب منہم مٹا (تبیان)

[۳] ای من یحفظکم من باس الرحمن وعذابہ (تبیان)

[۴] قیل من عوارض الاوقات (مجمع البیان)

کہ ”کیا ان کے کچھ خدا ہیں جو ہمارے علاوہ ان کی حفاظت کریں“۔ یہ اس دوسرے معنی کے ساتھ زیادہ چسپاں ہے، پھر یہ کہ ”نہ ہماری ہی طرف سے ان کا کوئی ہمد ہے“ یعنی ہم بذات خود بچاتے ہیں۔ ہماری طرف سے بھی کوئی دوسرا ایسا نہیں ہے جو ان کے ساتھ رہے اور ہر خطرہ سے بچائے۔

آخر میں جو ہے کہ ”ہم چلے آ رہے ہیں گھٹاتے ہوئے زمین کو اس کے اطراف و جوانب سے“..... یہ مضمون دوسرے مقام پر بھی ہے اور وہاں بھی اور یہاں بھی عام مفسرین یہ مطلب قرار دیتے ہیں کہ ہم اسلامی فتوحات کے ذریعہ سے کفار کے قبضہ والی زمینوں کو گھٹاتے چلے جاتے ہیں۔^[۱] مگر وہاں بھی ہم نے اس تفسیر سے بے اطمینانی ظاہر کی ہے۔

علامہ طبرسی نے اس آیت کی تفسیر میں کئی قول درج کرتے ہوئے اسے سب سے آخر میں لکھا ہے لیکن پہلے ایک مفہوم یہ ہے کہ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ حادث ارضی و سماوی آیا کرتے ہیں جن سے زمین کے اکثر حصے تباہ و برباد ہو جاتے ہیں، بعض احادیث میں اس کی تفسیر موت علماء سے ہوئی ہے مگر اس کا آیت کے قبل اور بعد والے الفاظ سے کوئی ربط معلوم نہیں ہوتا۔

قُلْ اِنَّمَا اُنذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۗ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَاءَ اِذَا مَا يُنذَرُونَ ﴿۳۵﴾ وَلَٰئِن

مَسَّتْهُمُ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُولُنَّ يَٰوَيْلَتَنَا اِذَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۳۶﴾

”کہیے کہ میں تو تمہیں وحی الہی کی بنا پر عذاب سے ڈراتا ہوں اور بہرے لوگ پکار نہیں سنتے جب وہ ڈرائے جاتے ہیں اور اگر انہیں ایک دفعہ بھی ذرا سا تمہارے پروردگار کا عذاب چھو جائے تو وہ کہیں گے کہ وائے بر حال ماہم بے شک ظالم تھے۔“

پہلے جملہ میں خطاب ہے۔ اس کا تقاضا یہ تھا کہ تم بہرے ہو، اس لئے نہیں سنتے مگر یہ انداز سخت کلامی کا ہوتا لہذا دوسرے جملہ کو بصیغہ غائب عمومی طور پر لایا گیا ہے کہ جو بہرے ہوا کرتے ہیں، وہ پکارنے والے کی آواز کو نہیں سنا کرتے۔ اس کے بعد آخر تک صیغہ غائب کے ہیں جیسے کہ کسی اور جماعت کا ذکر ہے حالانکہ مراد وہی مخاطب افراد ہیں جن سے آغاز کلام میں مخاطب تھا۔ یہ بھی ایک قسم ہے قرآن مجید کے اندازِ رواداری کی جس سے دنیا سبق حاصل کر سکتی ہے۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۗ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ۗ وَاِنْ كَانَ

مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۗ وَ كَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴿۳۷﴾

”اور ہم قیامت کے دن ترازو قائم کر دیں گے جو معیار عدالت ہوگی تو کسی تنفس پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا اور اگر ایک رائی کے دانہ بھر بھی ہوگا تو اسے ہم لے آئیں گے اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے۔“

عموماً ”الموازین القسط“ کا ترجمہ ایسا ہوتا ہے جو اضافی ترکیب کو ظاہر کرتا ہے^[۲] حالانکہ اس صورت میں عربی قواعد کے لحاظ سے

[۱] نقص ارضہم بالفتح علی التثنی (جلالین)

[۲] درمیان نهم ترازوئے عدل (شاہ ولی اللہ) رکھیں گے ہم ترازو و سبب عدل کی (شاہ رفیع الدین) انصاف کی میزانیں (مولانا مقبول احمد صاحب)

موازن پر الف لام نہیں ہونا چاہیے۔ موجودہ حالت میں اسے اضافت نہیں، بیان سمجھنا چاہیے جس سے نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ترازو میں معیار عدالت ہی کی ایک تعبیر ہیں۔ [۱]

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاءً وَذِكْرًا لِّلْمُتَّقِينَ ﴿۳۸﴾ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُونَ ﴿۳۹﴾ وَهَذَا ذِكْرٌ مُّبْرَكٌ أَنزَلْنَاهُ ۗ أَفَأَنْتُمْ لَهُ مُنْكَرُونَ ﴿۴۰﴾

”اور ضرور بالضرور ہم نے موسیٰ اور ہارون کو عطا کیا حق اور باطل سے اختیار کا سامان روشنی اور نصیحت بنا کر پرہیز گاری کے لئے جو اپنے پروردگار سے بے دیکھے ڈرتے ہیں اور وہ قیامت سے خوف زدہ اور یہ ایک برکت والا نصیحت نامہ ہے جسے ہم نے اتارا ہے تو کیا تم اس کا انکار کیے جاؤ گے؟“
”یہ یعنی قرآن [۳۸] ”برکت والا“ بایں معنی کہ وہ منسوخ ہونے والا نہیں لہذا اس کے فیوض و برکات لازوال ہیں۔ [۳۹]

وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِن قَبْلُ وَكُنَّا بِهِ عَلِيمِينَ ﴿۴۱﴾ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا هَذِهِ التَّمَاثِيلُ الَّتِي أَنْتُمْ لَهَا عَاقِفُونَ ﴿۴۲﴾ قَالُوا وَجَدْنَا آبَاءَنَا لَهَا عِبَادِينَ ﴿۴۳﴾ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۴۴﴾ قَالُوا اجْعَلْنَا مِنَ الْمُحْسِنِينَ أَمْ أَنْتَ مِنَ اللَّاعِبِينَ ﴿۴۵﴾ قَالَ بَلْ رَبُّكُمْ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الَّذِي فَطَرَهُنَّ ۗ وَإِنَّا عَلَىٰ ذَلِكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ ﴿۴۶﴾ وَتَاللَّهِ لَأَكِيدَنَّ أَصْنَامَكُمْ بَعْدَ أَنْ تُوَلُّوا مُدْبِرِينَ ﴿۴۷﴾

”اور ہم نے ابراہیم کو راہ راست پر چلنے کی سمجھ عطا کی پہلے ہی سے اور ہم ان پر مطلع تھے، جب انہوں نے اپنے باپ، اور اپنی قوم والوں سے کہا کہ یہ کیا صورتیاں ہیں جن کی عبادت میں تم لگے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے ہوئے پایا۔ کہا تم بھی اور تمہارے باپ دادا بھی کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔ انہوں نے کہا تم ہماری طرف واقعی کوئی سچا پیغام لائے ہو یا تفریح کر رہے ہو؟ کہا نہیں بلکہ واقعی تمہارا پروردگار وہ آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے جس نے انہیں پیدا کیا ہے اور اس کی گواہی دینے والوں میں

[۱] قال قتادة نضع العدل في المجازاة بالحق (تبیان)

[۲] ثم اخبر عن القرآن فقال ”هذا ذكر مبارك“ ای القرآن (تبیان)

[۳] اراد به القرآن لانه ثابت نافع دائم نفعه الى يوم القيمة (مجمع البيان)

سے ہوں اور بخدا میں تمہارے بتوں کے ساتھ ایک کاروائی کروں گا جب کہ تم پیٹھ پھرا کر گئے ہوئے ہو گے۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بت شکنی اور اس کے پہلے اور بعد قوم سے گفتگو:

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”یہ علاج ہونا انہوں نے چپکے سے کہا، پھر جب وہ شہر سے باہر گئے میلے میں، تب تنہائی میں جا کر سب کو توڑا،“ (موضح القرآن)
اس کا مطلب یہ ہے کہ آخری جملہ: تَاللّٰہِ لَا کِیْدَ لَہٗ اِصْنَامُ کَہ جس کا ترجمہ ہم نے کیا کہ ”بخدا میں تمہارے بتوں کے ساتھ ایک کاروائی کروں گا“۔ یہ سابق سلسلہ گفتگو میں انہوں نے زور سے نہیں بلکہ چپکے سے یاد دل ہی میں کہا تھا جسے وہ سن یا سمجھ نہیں سکتے تھے، یہ صورت واقعہ بالکل قرین قیاس ہے جسے متعلق علامہ طبرسی نے قدیم مفسرین کا بھی قول نقل کیا ہے۔^[۱]

فَجَعَلَهُمْ جُودًا اِلَّا کَبِیْرًا لّٰہُمْ لَعَلّٰہُمْ اِلَیْہِ یَرْجِعُوْنَ ﴿۵۸﴾ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ ہٰذَا

بِالْہِنْتَا اِنَّہٗ لَیْمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۹﴾ قَالُوْا سَمِعْنَا فَاْتٰی یُّدُّ کُرْہُمْ یُقَالُ لَہٗ اِبْرٰہِیْمُ ﴿۶۰﴾

قَالُوْا فَاْتٰوْا بِہٖ عَلٰی اَعْیُنِ النَّاسِ لَعَلّٰہُمْ یَشْہَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

”تو انہوں نے اُن بتوں کو چور کر دیا سو اُن میں کے ایک بڑے کے، شاید وہ اُن کی طرف رجوع کریں۔ اُن لوگوں نے کہا کہ ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا؟ وہ بلاشبہ ظالموں سے ہے، لوگوں نے کہا کہ ایک جوان کو ہم نے سنا ہے کہ وہ اُن کی نسبت بات کیا کرتا ہے جس کا نام ابراہیم ہے۔ ان لوگوں نے کہا کہ اچھا اُسے لوگوں کی نظروں کے سامنے لاؤ، شاید کہ وہ گواہی دیں۔“

ایک خیال ہے یہ ہے اور وہ ترتیب کلام میں قرب لفظی کی وجہ سے ذہن میں آتا ہے کہ الیہ یرجعون کے معنی یہ ہوں کہ وہ اس بڑے بت کی طرف رجوع کریں یعنی وہ اپنی حماقت سے یہ دیکھ کر کہ وہ ”چشم دید گواہ“ کے طور پر کھڑا ہے، اُس سے مجرم کا پتہ لگانے میں رجوع کریں اور وہ بول سکتا نہیں تو انہیں شرمندگی ہوگی اور اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو انہیں قائل کرنے کا موقع ملے گا کہ جو بول تک نہیں سکتے، خدا کیوں کر ہو سکتے ہیں؟ مگر میرے خیال میں وہ احمق سہی، پھر اتنے احمق نہیں تھے کہ یہ نہ جانتے کہ وہ بت بول نہیں سکتے۔ اس لئے قرینہ عقلی کی بنا پر میری نظر میں اس کو قوت ہے کہ یہ ضمیر خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف راجع ہے کہ وہ ان کی طرف رجوع کریں تو پھر یہ کہیں کہ اس بڑے بت سے پوچھ لو اور وہ ان کے جواب میں کہیں کہ یہ بول نہیں سکتے تو یہ نفعی الوہیت پر اُس سے استدلال کریں جیسا کہ بعد میں ہوا۔^[۲]

قَالُوْا اَنْتَ فَعَلْتَ ہٰذَا بِالْہِنْتَا یٰ اِبْرٰہِیْمُ ﴿۶۲﴾ قَالَ بَلْ فَعَلْہٗ کَبِیْرُہُمْ ہٰذَا

[۱] قبیل انما قال ذلك فاستر من قومه... عن قتادہ و مجاہد (مجمع البیان)

[۲] لعلہم یرجعون الی ابراہیم فیسألونہ عن جال الاصنام فینبہم علی جہلہم (مجمع البیان)

فَسَلُّوهُمْ إِنْ كَانُوا يَنْطِقُونَ ﴿٦٤﴾ فَرَجَعُوا إِلَىٰ أَنفُسِهِمْ فَقَالُوا إِنَّكُمْ أَنْتُمُ
الظَّالِمُونَ ﴿٦٥﴾ ثُمَّ نَكَسُوا عَلَىٰ رُءُوسِهِمْ ۗ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا هَؤُلَاءِ يَنْطِقُونَ ﴿٦٥﴾
قَالَ أَفَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَلَا يَضُرُّكُمْ ﴿٦٦﴾ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٦٦﴾

”اُن لوگوں نے کہا کیا تم نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ کیا ہے؟ اے ابراہیم! کہا بلکہ یہ اُن کے اس بڑے بُت نے کیا ہے تو اُن سے خود پوچھ لو اگر وہ بات کرتے ہوں۔ یہ سُن کر انہوں نے اپنے دل میں غور کیا۔ کہا یقیناً تم خود ہی حد سے آگے بڑھے ہو۔ انہوں نے سر جھکا کر کہا تم جانتے ہو کہ یہ بات نہیں کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا تم اللہ کو چھوڑ کر ایسے کی پوجا کرتے ہو جو نہ تمہیں کوئی فائدہ پہنچائے اور نہ تمہیں نقصان پہنچا سکے۔ افسوس ہے تم پر اور اُس پر جس کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو، تو کیا تم عقل سے کام نہیں لو گے؟“

بُت شکنی کے کام کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ ”ان میں کے بڑے نے کیا ہے“ اسے اہل سنت کی بعض احادیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان کا (معاذ اللہ) ایک جھوٹ قرار دیا گیا ہے مگر قطع نظر کرتے ہوئے اُس دلیل عقلی قطعی سے جو عصمت انبیاء پر قائم ہے، آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی حدیث بھی بتاتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کلام قطعاً جھوٹ نہیں تھا، اس لئے کہ اُنہوں نے اس بات کو شرط کے ساتھ مشروط کر دیا تھا کہ اگر یہ بات کرتے ہوں۔ جب یہ بات مسلم ہوگئی کہ وہ بات نہیں کر سکتے یعنی کوئی کام نہیں کر سکتے تو اس سے ظاہر ہے کہ یہ کام بھی ان کا کیا ہوا نہیں ہو سکتا۔ [۱] مگر اس سے پرستش کرنے والوں کی آنکھوں کو کھل جانا چاہیے کہ جب یہ کسی گفتار روگردار پر قادر نہیں ہیں تو اس سے ظاہر ہے کہ ”انہیں خدا سمجھنا درست نہیں ہے۔“

اس کے لئے علمی و فنی زبان میں میری نظر میں یہ پہلو ہے کہ صدق و کذب کا سوال خبر میں ہوتا ہے جس سے مقصود حکایت واقع ہو لیکن مقام مناظرہ میں مخالف سے کوئی بات منوانے کے لئے جو بات کہی جائے اُس سے مقصود حکایت واقع ہوتی ہی نہیں لہذا وہ ایک قسم انشاء ہے اور حقیقت یہ ہے کہ علمائے خود وغیرہ نے جو اقسام انشاء درج کیے ہیں، وہ کسی حصر عقلی پر مبنی نہیں ہیں، بلکہ استقراری طور پر انہوں نے چند اقسام کا ذکر کیا ہے جن کے علاوہ بہت سے اقسام ہو سکتے ہیں اور ہیں۔

”اپنے دل میں غور کیا“ اس کو ہم اپنے محاورہ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ”انہوں نے اپنے گریبان میں منہ ڈالا“ اور پھر جو ”کہا“ ہے اُس کے معنی ہم زبان سے کہنے کے نہیں سمجھتے بلکہ دل میں کہنے کے سمجھتے ہیں در سر جھکا کر پھر جو ”کہا“ ہے وہ زبان سے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مخاطب ہو کر کہا ”تم جانتے ہو کہ یہ بات نہیں کرتے ہیں۔“

[۱] قَالَ الصَّادِقُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: وَاللَّهِ مَا فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ وَمَا كَذَبَ اِبْرَاهِيمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَكَيْفَ ذَلِكَ قَالَ اِنَّمَا قَالَ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هُوَ اَنْ نَطِقَ وَاِنَّه لَمِ يَنْطِقُ فَلِمَ يَفْعَلُ (علی بن ابراہیم)

قُلْنَا يِنَارُ كُوْنِي بَرْدًا وَسَلْمًا عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ ﴿٤٩﴾ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ
 الْاٰخِسْرِيْنَ ﴿٥٠﴾ وَنَجَّيْنٰهُ وَلَوْ ظَلَّ اِلَى الْاَرْضِ النَّبِيُّ لَبُرْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿٥١﴾
 ”انہوں نے کہا کہ اسے آگ میں جلادو اور اگر تمہیں کرنا ہے تو اپنے خداؤں کی مدد کرو ہم نے کہا اے آگ سرد
 ہو جا اور ابراہیم پر سلامتی رہے اور انہوں نے ان کے ہلاک کرنے کا منصوبہ بنایا تو ہم نے انہی کو گھانا اٹھانے والا
 کر دیا اور انہیں اور لوٹ کو ہم نے چھڑکا رادے کر پھینچایا اُس سرزمین کی طرف جس میں ہم نے برکت عطا کی ہے
 تمام لوگوں کے لیے“۔

خلیل خدا کا آگ میں پھینکا جانا اور آگ کا سرد ہو جانا:

یعنی شام کے ملک میں پہنچا یا جہاں اللہ نے طرح طرح کی نعمتیں پیدا کی ہیں۔^[۱]
 عام طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں جلانے کا ذمہ دار نمرود کو قرار دیا جاتا ہے مگر قرآن مجید نے نمرود کا تذکرہ، وہ بھی نام کے ساتھ
 نہیں، ایک دعویٰ اور لوہیت بادشاہ کے وصف کے ساتھ، بس ایک مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ایک بحث اور مکالمہ کی شکل میں کیا ہے لیکن
 اس آگ میں جلانے کا فیصلہ کر دیا، یوں کہنا چاہیے کہ وہ نام نہاد جمہور کا ایک پختی فیصلہ تھا جو داعی حق کے خلاف کیا گیا تھا۔
 ”ہم نے کہا: اے آگ سرد ہو جا اور ابراہیم پر سلامتی رہے“۔ یہ کہنا الفاظ کا زبان پر جاری کرنا نہیں بلکہ ارادہ تکون کی ایک لفظی تعبیر ہے
 جسے دوسری جنہوں پر قول ”گن“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہر جگہ یہ ہے کہ ”ارادہ الہی سے بلا توقف و تاخیر“ ایسا ہو گیا۔^[۲]
 ”سلامتی رہے ابراہیم علیہ السلام کے لیے، یعنی برودت نقطہ اعتدال پر ہو جو اپنی شدت سے ابراہیم علیہ السلام کے لئے ضرور رساں نہ ہو۔

وَوَهَبْنَا لِهٰٓسْحٰقَ ط وَيَعْقُوْبَ نٰفِلَةً ط وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ﴿٥٢﴾

”اور ہم نے اسحاق کیسی اولاد عطا کی اور مزید برآں یعقوب۔ اور ان سب کو نیکو کار بنایا“۔

”مزید برآں“ بایں معنی کہ دعائ کی سارہ کے بطن سے فقط اپنے بیٹے کے لئے تھی مگر خالق نے اس کی قبولیت میں ان کی آئندہ نسل
 کے سامان بقاء کا اضافہ کر دیا کہ اسحاق علیہ السلام ہی پر ان کی ذریت ختم نہ ہو بلکہ پھر اسحاق علیہ السلام کے یہاں یعقوب علیہ السلام پیدا ہوئے اور سلسلہ نسل کا
 آگے بڑھا۔^[۳]

جناب ابن عباس وغیرہ نے بھی اس کا یہی مفہوم قرار دیا ہے۔^[۴]

[۱] بکثرة الاہبار والاشجار وھی الشام (جلالین)

[۲] لہٰیکن لیکن ہنآک امر علی الحقیقۃ والمعنی ائہ فعل ذلک کما قال: کونوا قردۃً خاسئین ای صیرہم کذلک من غیر ان امرہم

بذلک (تبیان) المراد ائآ جعلنا الثآر بردا علیہ وسلامۃ لا یصیبہ من اذا ہاشئ (مجمع البیان)

[۳] نافلة ای زیادۃ علی مادعا اللہ الیہ (تبیان) ق

[۴] قال ابن عباس وقتادۃ نافلة راجع الی یعقوب فائتذادہ من غیر دعاء فہو نافلة (مجمع البیان)

وَجَعَلْنَاهُمْ آيَةً يُهْدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلَاةِ
وَإِيتَاءَ الزَّكَاةِ ۚ وَكَانُوا لَنَا عِيدِينَ ﴿٤٦﴾

”اور ہم نے انہیں امام بنایا جو ہمارے حکم کے مطابق ہدایت کرتے ہیں اور ان کی جانب وحی بھیجی نیک کاموں کے کرنے اور نماز ادا کرنے اور کلوۃ دینے کی اور وہ صرف ہماری عبادت کرتے تھے“۔

وَلَوْ طَا آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ تَعْمَلُ الْخَبِيثَاتِ
إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمَ سَوْءٍ فَسَقِينَ ﴿٤٧﴾ وَأَدْخَلْنَاهُ فِي رَحْمَتِنَا ۗ إِنَّهُ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿٤٨﴾

”اور لو ط علیہ السلام کو ہم نے حکمت اور علم عطا اور انہیں چھٹکارا دیا اُس بستی سے جو گندے کام کرتی تھی، بلاشبہ وہ بڑے بڑے، بدکار لوگ تھے اور انہیں ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا۔ بلاشبہ وہ نیکوکاروں میں سے تھے“۔
جناب لوط علیہ السلام کو کیوں کر چھٹکارا اور اُس پر قوم پر عذاب کس نازل ہوا؟ اس کی تفصیل قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر ہے۔

وَنُوحًا إِذْ نَادَى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ مِنَ الْكَرْبِ
الْعَظِيمِ ﴿٤٩﴾ وَنَصَرْنَاهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۗ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمَ سَوْءٍ
فَاعْرَفْنَاهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٥٠﴾

”اور نوح کو جب پکارا انہوں نے اس سے پہلے تو ہم نے اُن کی دعا پر لبیک کہتے ہوئے اُنہیں اور اُن کے ماننے والوں کو بڑے کرب و اذیت سے چھٹکارا دیا اور ان کو فتح عنایت کی اُس قوم پر جس نے ہماری آیات کو جھٹلایا۔ بلاشبہ وہ بہت برے لوگ تھے تو ان سب کو ہم نے ڈبو دیا“۔

وَدَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ إِذْ يَحْكُمُونَ فِي الْحَرْثِ إِذْ نَفَشَتْ فِيهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا
لِحُكْمِهِمْ شَاهِدِينَ ﴿٥١﴾ فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ ۚ وَكُلًّا آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ۚ وَسَخَّرْنَا
مَعَ دَاوُدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۗ وَكُنَّا فَاعِلِينَ ﴿٥٢﴾ وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوسٍ
لَكُمْ لِتُحْصِنَكُم مِّنْ بَأْسِكُمْ ۚ فَهَلْ أَنْتُمْ شَاكِرُونَ ﴿٥٣﴾

”اور داؤد اور سلیمان جب کہ وہ دونوں فیصلہ کر رہے تھے کھیت کے بارے میں، جب لوگوں کی بھیڑیں اُس پر راتی راتا گئیں اور ہم اُن کے فیصلہ کے دیکھنے والے تھے تو ہم نے اُسے سلیمان کو سمجھا دیا اور ہر ایک کو ہم نے حکمت اور علم عطا کیا تھا اور داؤد کے ساتھ پہاڑوں سے ہم نے تسبیح پڑھوائی اور طائروں سے اور ہم اس کو کرنے والے

تھے اور ہم نے انہیں لکھائی کارگیری لباس کی تمہارے لئے جو تمہیں تمہاری جنگ کے صدموں سے بچائے تو کیا تم شکر گزار ہو گے؟“

زراعت سے متعلق جناب داؤد و سلیمان علیہما السلام کا فیصلہ:

قرآن کو صرف قرآن سمجھنے کا اذعاء کرنے والے کیا اس واقعہ کی گم شدہ کڑیوں کا پتہ لگا سکتے ہیں کہ داؤد علیہ السلام نے کیا فیصلہ کیا اور سلیمان علیہ السلام کا کیا فیصلہ تھا جسے کہا گیا ہے کہ ہم نے انہیں سکھایا اور کیا بغیر یہ معلوم ہوئے انہیں کوئی تشکیکی محسوس نہیں ہوتی؟ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی ساخت ایسی رکھی گئی ہے کہ دنیا معلمین قرآن سے بے نیاز نہیں ہو سکتی، چنانچہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب داؤد علیہ السلام نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اُس زراعت کے عوض میں وہ بھیڑیں کے مالک زراعت کو دو بارہ درست کرنے کے ذمہ دار ہوں اور جب تک وہ زراعت اپنی اصلی حالت پر آئے، اس زراعت کے مالک کو یہ حق ہو کہ وہ اُن بھیڑوں کے دودھ وغیرہ سے فائدہ اٹھائے اور جب وہ زراعت اصلی حالت پر آجائے تو وہ بھیڑوں کو ان کے مالکوں کے حوالہ کر دے یہی فیصلہ تھا جسے خالق کریم نے صحیح قرار دیتے ہوئے اس کا تذکرہ فرمایا ہے۔

یہ بعض تفاسیر میں روایت ہے مگر اس سے ذہن میں ایک خلش یہ پیدا ہوتی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نبی خدا نے فیصلہ غلط کس طرح کیا؟ جب کہ قرآن میں یہ نہیں پر بعد میں جناب داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام دونوں کے لئے آیا ہے: **وَوَجَّلا اتینا حکماً وعلماً** (ان میں سے) ہر ایک کو ہم نے حکمت اور علم عطا کیا تھا، مگر تفسیر علی ابن ابراہیم قمی میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی جو حدیث ہے، اس میں ہے کہ سب لوگ فیصلہ کے لئے جناب داؤد علیہ السلام کے پاس آئے تو آپ نے خود فیصلہ کرنے کے بجائے، فریقین کو سلیمان علیہ السلام کے پاس بھیج دیا اور انہوں نے وہ فیصلہ کیا اور اسی کو حضرت داؤد علیہ السلام نے نافذ کر دیا۔ اس سے مقصود اس کا اظہار تھا کہ جناب داؤد علیہ السلام کے بعد ان کے صحیح جانشین جناب سلیمان علیہ السلام ہیں۔ اس طرح باپ بیٹے میں کوئی اختلاف لازم نہیں آتا۔

اس کی نظیر ہمارے یہاں بعض روایات میں ہے کہ کبھی جناب امیر علیہ السلام سے کسی نے بخیال خود کوئی بڑا مشکل سوال کیا تو حضرت نے امام حسن علیہ السلام سے فرمایا کہ تم اس کا جواب دو۔ جناب داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کے اس واقعہ کی نوعیت یہی تھی۔

جناب داؤد علیہ السلام کی زرہ سازی:

جناب داؤد علیہ السلام کے زرہ بنانے کا ذکر جس انداز میں ہے، اُس سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں اس وقت تک زرہ ایجاد ہی نہیں ہوئی تھی اور دشمنوں کی تلواروں سے بچنے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ سب سے پہلے قدرت کی طرف سے جناب داؤد علیہ السلام کو اس صنعت کا علم دیا گیا جس کے بعد در نیاز نہیں بنانے لگی۔

وَلِسْلَيْمِنَ الرِّيحِ عَاصِفَةً تَجْرِي بِأَمْرِهَا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَرَكْنَا فِيهَا ط وَكُنَّا
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمِينَ ﴿٨١﴾ وَمِنَ الشَّيْطَانِ مَنْ يَّعُوْصُونَ لَهُ وَيَعْمَلُونَ عَمَلًا دُونَ
ذَلِكَ ه وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِينَ ﴿٨٢﴾

”اور سلیمان علیہ السلام کے قبضہ میں ہم نے تیز و تند ہوا کو کیا کہ وہ ان کے حکم سے چلتی تھی اس سرزمین کی طرف جس میں ہم نے برکت قرار دی تھی اور ہم ہر چیز کو جاننے والے تھے اور جنات میں کچھ وہ تھے جو ان کے لئے (دریاؤں میں) غوطہ زنی کرتے تھے اور اس کے سوا دوسرے کام کرتے تھے اور ہم ان کے نگہبان تھے۔“

جناب سلیمان علیہ السلام کا دوش ہوا پر پرواز کرنا:

معجزات انبیاء کو خلاف فطرت سے کہہ کر ان کا انکار کرنے والے تو معلوم نہیں ان آیات کے کیا کیا معنی کہتے ہوں گے مگر ان آیات قرآن سے صاف ظاہر ہے کہ یہ غیر معمولی قدرت تھے جو جناب سلیمان علیہ السلام کے لئے وقوع میں آئے تھے۔ ”ہو ان کے قبضہ میں دی گئی تھی اور ان کے حکم سے چلتی تھی، اس کی تفصیل بھی دوسری جگہ قرآن میں موجود ہے کہ وہ صبح کو ایک مہینے کی راہ تک تخت سلیمان کو لے کر جاتی تھی اور شام کو ایک مہینے کی راہ تک، اور جنات ان کے قبضہ میں دیے گئے تھے، اس کے بھی مزید تفصیلات دوسری جگہ موجود ہیں، اس لئے قرآن پر ایمان رکھنے کے ساتھ ان واقعات کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔“

وَأَيُّوبَ إِذْ نَادَى رَبَّهُ أِنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّحِيمِينَ ﴿٨٢﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَكَشَفْنَا مَا بِهِ مِنْ ضُرٍّ وَآتَيْنَاهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُمْ مَعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرَىٰ لِلْعَابِدِينَ ﴿٨٣﴾

”اور ایوب علیہ السلام کو جب انہوں نے اپنے پروردگار کو صدادی کہ مجھے بڑی اذیت ہو گئی ہے اور تمام رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والا تو ہے، تو ہم ان کی دعا قبول کی اور جوازیت انہیں تھی، اُسے دور کیا اور انہیں ان کی جو اولاد تھی، وہ عطا کی اور ان کے ساتھ اتنے ہی اور، مہربانی کی بنا پر اپنی جانب سے اور انتباہ کے طور پر عبادت گزاروں کے لئے۔“

جناب ایوب علیہ السلام کا امتحان اور ان کا صبر:

جناب ایوب علیہ السلام کی دعا ایک انتہائی لطیف پیرایہ کہ حامل ہے کہ بندہ بس اپنی تکلیف بیان کرتا ہے اور خالق کے عمومی لطف و کرم کا اظہار کرتا ہے اس کے علاوہ لفظوں میں اظہار مطلب کچھ بھی نہیں کرتا [۱] جسے میرا انیس علی اللہ مقامہ نے یوں ادا کیا ہے:

کریم! جو تجھے دینا ہے بے طلب دیدے

فقیر ہوں، پر نہیں عادت سوال مجھے

یہی انداز دوسری جگہ قرآن میں جناب موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے ہے کہ: رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنْزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ. (قصص - ۲۴)

چونکہ تیرا فیض و کرم میرے شامل حال رہا ہے بہر حال میں اس وقت ضرورت مند ہوں۔

[۱] ہو من لطيف الكنايات في طلب الحاجة (مجمع البيان)

وَاسْمِعِيْلَ وَاَدْرِيسَ وَذَا الْكِفْلِ ط كُلُّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿٨٥﴾ وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ

رَحْمَتِنَا ط اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٨٦﴾

”اور اسماعیل علیہ السلام اور ادریس علیہ السلام اور ذوالکفل علیہ السلام کو۔ یہ سب صبر کرنے والوں میں سے تھے اور انہیں ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا، بلاشبہ وہ نیکو کاروں میں تھے۔“

ذوالکفل کے متعلق شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”ایوب علیہ السلام کے بیٹے تھے، ایک شخص کے ضامن ہو کر کئی برس قید رہے“ (موضح القرآن)

ذوالکفل کی وجہ تسمیہ میں جلالین نے لکھا ہے:

سَمِّيَ ذَا الْكِفْلِ لِاَنَّهُ تَكْفَلَ بِصِيَامِ جَمِيْعِ نَهَارِهِ وَ قِيَامِ جَمِيْعِ لَيْلِهِ وَ اِنْ يَقْصِيْ بَيْنَ النَّاسِ وَ مَا يَغْضَبُ فَوْقِيْ

بِذَلِكَ وَقِيلَ لَهُمْ يَكُنْ نَبِيًّا۔

ان کا نام ذوالکفل اس لئے ہوا کہ وہ کفیل یعنی ذمہ دار ہوئے کہ تمام دنوں کو روزہ رکھیں گے اور راتیں نماز میں گزاریں گے اور یہ کہ وہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں گے اور کبھی انہیں غصہ نہیں آئے گا تو انہوں نے اسے پورا کیا اور کہا گیا ہے کہ وہ نبی نہیں تھے۔

مگر جناب شیخ الطائفہ فرماتے ہیں:

معنى وصفه بالكفل انه ذو الضعف اى ضعف ثواب غير ممن فى زمانه لشر ف عمله۔

اُن کے لقب میں کفل کی لفظ کے معنی یہ ہیں کہ وہ دونا پانے والے ہیں یعنی اپنے زمانہ کے تمام لوگوں کے ثواب کا دونا اپنے عمل کی بلندی

کی وجہ سے۔

کفل کا یہ مفہوم قرار دینے میں شاید قرآن مجید کی یہ آیت سامنے ہے کہ:

يُوْتِيْكُمْ كِفْلًا مِّنْ رَّحْمَتِهِ۔ (حدید ۲۸)۔

وہ اُسے اپنی رحمت کے دوئے حصے عطا کرے گا۔

مگر دُونے کے معنی تو یہاں کفلین کے تشبیہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ کفل کے معنی تو دُونے کے نہ ہوئے علامہ طبرسی نے ان کی شخصیت کے

بارے میں اور زیادہ اقوال نقل کر دیئے ہیں جن میں سے معصوم علیہ السلام کی طرف کسی کی نسبت نہیں ہے۔

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ

لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ﴿٨٧﴾ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٨﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَنَجَّيْنٰهُ

مِنَ الْغَمِّ ط وَكَذٰلِكَ نُنَجِّي الْمُوْمِنِيْنَ ﴿٨٩﴾

”اور مچھلی والے کو جب وہ غصہ میں بھرے ہوئے گئے تو وہ سمجھے کہ ہم اُن پر سختی نہ کریں گے تو اُن تاریکیوں میں

انہوں نے آواز دی کہ کوئی خدا نہیں سوا تیرے۔ پاک ہے تیری ذات بلاشبہ میں ظالموں میں سے تھا تو ہم نے اُن کی دعا قبول کی اور انہیں اُس رنج و غم سے چھٹکارا دیا اور اس طرح ایمان والوں کو ہم چھٹکارا دیتے ہیں۔

حضرت یونس علیہ السلام کی شکم ماہی کے اندر تسبیح:

”مچھلی والے“ سے مراد جناب یونس علیہ السلام ہیں [۱] جن کو مچھلی نے نگلا تھا جس کا ذکر خود قرآن مجید میں دوسری جگہ موجود ہے۔ غصہ میں بھرے ہوئے گئے تو کیا ہوا جس کے بعد انہوں نے یہ دعا کی؟ یہ درمیان کی کڑی یہاں صراحتہ درج نہیں ہے، صرف یونس علیہ السلام کو ذوالنون ”مچھلی والے“ کہنے سے اس کی طرف اشارہ ہو گیا اور یہ وہ ہے کہ مچھلی نے ان کو نگل لیا۔ اس سے وہ تاریکیاں پیدا ہوئیں جن میں گھبرا کر انہوں نے دعا کی۔ ایک تورات، اور پھر دریا کی موجیں اور پھر شکم ماہی۔ [۲]

وَزَكَرِيَّا إِذْ نَادَى رَبَّهُ رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ ﴿۹۷﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَوَهَبْنَا لَهُ يَحْيَىٰ وَأَصْلَحْنَاهُ زَوْجَهُ ۗ إِنَّهُمْ كَانُوا يُسِرُّ عُونَ فِي الْحَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا ۗ وَكَانُوا النَّاسِخِعِينَ ﴿۹۸﴾

”اور زکریا کو جب انہوں نے صدا دی اپنے پروردگار کو پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو بہترین ورثہ دار ہے تو ہم نے اُن کی دعا قبول کی اور انہیں یحییٰ ایسا فرزند عطا کیا اور ان کی بیوی کو ان کی خاطر ٹھیک کر دیا، یہ لوگ نیکیوں کی طرف لپکتے تھے اور ہمیں امید و بیم دونوں حالتوں میں پکارتے تھے اور وہ ہمارے لئے جھکنے والے تھے۔“

جناب زکریا علیہ السلام کی دعا اور اس کی قبولیت:

”اکیلا نہ چھوڑنا، یعنی بے اولاد [۳]“ اُن کی بیوی کو ٹھیک کر دیا، اس کی تفصیل قرآن مجید کے دوسرے مقامات سے ملتی ہے کہ وہ بانجھ تھیں۔ خالق نے اس نقص کو دور کر دیا اور اُن میں اولاد پیدا ہونے کی صلاحیت ہو گئی اور پھر عمر بھی اُن کی زیادہ ہو چکی تھی، اس لئے اصلحنا کے معنی بعض لوگوں نے یہ لئے ہیں کہ اُن کا دور شباب واپس آ گیا اور بعض نے نہ معلوم کیوں اس درستی کو اخلاق کی درستی قرار دیا ہے۔ [۴]

وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُوحِنَا وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا آيَةً لِلْعَالَمِينَ ﴿۹۱﴾

[۱] ہو یونس (علی ابن ابراہیم) النون الحوت وصاحبها یونس بن متی (تبیان)

[۲] ظلمة اللیل و ظلمة البحر و ظلمة بطن الحوت (جلالین) اظهر فی اقوال المفسرین (تبیان)

[۳] ای وحید ابل ارزقنی ولدا (تبیان)

[۴] بان كانت عقیمة فخرنا ها ولودا عن قتادة وقیل كانت حرمة فردنا علیها شبا بها عن ابی مسلم وقیل كانت سیئة الخلق فجعلناها حسنۃ الخلق (مجمع البیان)

”اور اس خاتون کو جس نے اپنے مرد کے تصرف سے بچایا تو ہم نے اُس میں اپنی روح کا ایک حصہ پھونک دیا اور اُسے اور اُس کے بیٹے کو تمام جہانوں کے لئے قدرت کی ایک نشانی قرار دیا۔“

”اپنی روح“ میں اضافت ویسی ہی ہے جیسی خلقت آدم ﷺ کے اعلان کے وقت ملائکہ سے کہا گیا تھا: فَإِذَا سَوَّيْتَهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي ”جب میں اس کو تیار کر لوں اور اس میں اپنی روح کا ایک حصہ پھونک دوں“ (حجر- ۲۹) اس نسبت میں شرف و فضیلت کے اظہار کا پہلو ضرور ہے اور جیسی ”من روحی“ میں اضافت آدم ﷺ کے لئے ہے، وہی من روحنا کی لفظ میں اضافت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے یہاں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حضرت آدم ﷺ چونکہ سلسلہ ظہور انبیاء میں مرکز انتخاب الہی ہونے میں نمبر اٹھے لہذا انہیں صفت انتخاب کے پہلے پہل ظہور میں آنے سے لقب صفی اللہ ملا اور حضرت عیسیٰ ﷺ کا لقب آخر میں اس ”روحنا“ کے لفظ کی بنا پر روح اللہ ہو گیا مگر لفظ کے اختصاص کی وجہ سے صفت کا اشتراک ختم نہیں ہوتا جیسے معنی کے لحاظ سے صفی خدا ہر نبی ہے، ویسے ہر رسول کی روح اس مرتبہ فضیلت کی ہے کہ وہ ”روح اللہ“ قرار پاسکتا تھا۔ جب کہ من روحی اور من روحنا کی اضافت جناب آدم ﷺ اور حضرت عیسیٰ ﷺ کے درمیان مشترک ہے اور دونوں میں من موجود ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ روح اس معیار کے تمام بندگان الہی میں پائی جاتی ہے تو اس سے عیسائیوں کا الوہیت عیسیٰ ﷺ پر استدلال بلاوجہ ہے۔

إِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً ۖ وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ ﴿۱۴۲﴾ وَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ

بَيْنَهُمْ ۖ كُلُّ إِلَهِنَا رِجْعُونَ ﴿۱۴۳﴾

”بے شک یہ تمہاری ملت ہے، ایک ملت۔ اور میں تمہارا پروردگار ہوں، تو میری عبادت کرو اور اُن سب نے اپنے معاملات کو جدا جدا کر رکھا ہے (بہر حال) سب ہماری ہی طرف پلٹنے والے ہیں۔“

”امت“ جس کا ترجمہ ہم نے ”ملت“ کے ساتھ کیا ہے، اس کے معنی بعض مفسرین نے دین کے لئے ہیں۔^[۱]

اس طرح اس کا مطلب یہ ہوتا کہ صحیح دین خلق خدا کا ایک ہے اور اقتراق و اختلاف بعد والوں ذہنی جدت طرازیوں سے پیدا ہوا ہے جنہیں اصطلاح قرآنی میں اھواء کہا جاتا ہے اور معیار حق نہیں ہو سکتے، (ولو اتبع الحق اھواء ہم لفسدت السموات الارض) (مومنون- ۱۷)

علامہ طبرسی نے قدیم مفسرین کے حوالہ سے اُس کی یہ تفسیر پیش کرتے ہوئے اس کی تشریح بہت خوب فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں:

ان هذا دينكم دين واحد عن ابن عباس ومجاهد والحسن واصل الامة الجماعة التي على مقصد واحد فجعلت الشريعة امة واحدة لاجتماعهم بها على مقصد واحد (مجمع البيان)
یعنی تمہارا دین ایک اکیلا دین ہے۔ یہ تفسیر ابن عباس، مجاہد اور حسن سے منقول ہے اور اصل میں امت اس جماعت کو کہتے ہیں جس کا ہدف نگاہ ایک ہو تو قانون الہی ایک امت اس معنی میں ہے کہ اُس سے پوری جماعت ایک ہدف نگاہ پر متفق ہو جاتی ہے۔

[۱] هذه اى ملّة الاسلام امتكم (جلالین)

فَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهِ ۖ وَإِنَّا لَهُ كَنُوبُونَ ﴿٩٧﴾
 ”تو جو شخص نیک کام کرے در آں حالیکہ وہ صاحب ایمان ہو تو اس کی کوشش کی ناقدری نہ ہوگی اور ہم اس کے لکھ لینے والے ہیں۔“

یہاں بھی مثل دوسرے مقامات کے حسن عمل کے صلہ کو ایمان کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے، اس کے بعد یہ تصور کہ:

”ہوگی نجات اس کی عمل جس کے نیک ہوں کافر ہو وہ عقیدہ ہیں یا دیندار ہو غلط ہے۔“^[۱]

”ہم اس کے لکھنے والے ہیں“ یعنی بعد میں وہ خود چاہے بھول جائے لیکن ہمارے یہاں اُس کا نیک عمل بہر حال محفوظ ہے اور اُس کا

صلہ ملنا ضروری ہے۔

”ہم“ کہہ کر اپنی طرف نسبت لکھنے کی ویسی ہی ہے، جیسے قرض روح کی نسبت اپنی طرف دی ہے جب کہ یہ دوسری جگہ صاف اُسے فعل ملائکہ اور خاص طور پر ملک الموت کا کام قرار دیا ہے، اسی طرح قرآن مجید میں دوسری جگہ کا تباہ اعمال کا ذکر ہے جو فرشتے ہیں مگر چونکہ اُن کا لکھنا بحکم الہی ہے، اس لئے اُس کی نسبت خالق نے اپنی جانب دی ہے۔^[۲]

**وَ حَرَمٌ عَلَى قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿٩٥﴾ حَتَّىٰ إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ
 وَمَأْجُوجُ وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُونَ ﴿٩٦﴾ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَإِذَا هِيَ
 شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۗ يَوِيلُنَا قَدْ كُنَّا فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَذَا بَلْ كُنَّا
 ظَالِمِينَ ﴿٩٧﴾**

”اور جس بستی کو ہم نے تہس نہس کر دیا اس کے لئے ناممکن ہے کہ وہ پھر واپس نہ آئے یہاں تک کہ جب یا جوج و ما جوج کھول دیے گئے اور وہ ہر بلندی سے امنڈ پڑیں گے اور سچا وعدہ قریب آجائے گا تو ایک دم کافروں کی نگاہیں پتھر اجائیں گی: وائے بر حال ما! ہم اس سے بے خبری میں رہے بلکہ ہم بڑے ظلم کے مرتکب تھے۔“

یا جوج اور ما جوج کا ذکر:

حرام کے معنی سب ہی جانتے ہیں کہ وہ حلال کے مقابل ہے یعنی جو جائز نہ ہو۔ اب یہ کس بات کو کہا جا رہا ہے کہ حرام ہے؟ انہیں لا یرجعون ”کہ واپس نہ ہوں“ یعنی واپس نہ ہونا حرام ہے تو واپس آنا لازم ہے۔

ہماری قدیم تفسیر بتاتی ہے کہ یہ آیت ”رجعت“ کے وقوع کا پتہ دیتی ہے^[۳] مگر جو رجعت کے قائل نہیں وہ کیا کریں؟ تو کوئی صاحب

[۱] اتمام شرط الايمان لان هذه الاشياء لو فعلها الاكافر لحدثت رجعت بها (تبیان)

[۲] ای نامر ملائكة ان يكتبو اذلك (مجمع البيان)

[۳] لارائة — ای منتعرجو عهده الى الدنيا (جلالین) محال است — آن کہ باز گردند یعنی بدنیا (شاه ولی اللہ)

”﴿۹۸﴾ کو غائب کرتے ہیں یعنی ”(لا یرجعون“ کا ترجمہ کرتے ہیں وہ جو رجعت کا ہونا چاہیے کہ ”اس دنیا میں ناممکن ہے کہ وہ واپس آئیں“ ﴿۹۸﴾ اور کوئی صاحب حرام کے معنی واجب کے قرار دیتے ہیں یعنی لازم ہے کہ وہ اب واپس نہیں آئے گی۔

ترجموں میں یہ زمین آسمان کا فرق خود ظاہر کرتا ہے کہ نقطہ حقیقت ان کی نظر سے دور ہے اور اصل دروازوں سے ہٹ کر آدمی کو قرآن فہمی میں بیٹھو کریں کھانا ہی چاہئیں مگر تعجب علامہ طبرسی سے ہے کہ انہوں نے وہی اقوال جو اکثریت کے یہاں ہیں، قدیم مفسرین کے حوالہ سے درج کر دینے پر اکتفا فرمائی ہے۔ جن میں سے کوئی الفاظ آیت پر منطبق نہیں ہے اور خود اپنے یہاں جو تفسیر موجود ہے اور وہ بالکل الفاظ قرآنی کے مطابق ہے اسے انہوں نے بطور نقل قول بھی درج نہیں کیا ہے۔

إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ۗ أَنْتُمْ لَهَا وَرِدُونَ ﴿۹۸﴾

”بلاشبہ تم اور وہ چیزیں جن کی تم عبادت کرتے ہو، اللہ کو چھوڑ کر، دوزخ کا ایندھن ہیں تمہیں وہاں پہنچانے۔“

”جن چیزوں کی تم عبادت کرتے ہو، اس سے مراد بت ہیں کہ جو بے جان چیزیں ہیں، انہیں دوزخ میں ڈالنا، ان کو سزا دینا نہیں ہے بلکہ ان کے عبادت گزاروں کو تکلیف پہنچانا ہے جیسا کہ سورہ بقرہ میں ہے و قو دھا الناس الحجارة اس کا ایندھن انسان ہیں اور پتھر۔“

لَوْ كَانَ هُوَ لِآلِهَةٍ مَّا وَرَدُّهَا ۗ وَكُلٌّ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۹۹﴾ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَهُمْ

فِيهَا لَا يَسْمَعُونَ ﴿۱۰۰﴾

”اگر خدا ہوتے تو وہ اس (دوزخ) میں نہ جاتے اور سب ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ ان کی اس میں چیخ پکار

ہوگی اور وہ اس میں سنیں گے نہیں۔“

”وہ اس (دوزخ) میں نہ جاتے“ اس میں دو احتمال ہیں جو دونوں بحسب واقعہ درست ہیں۔ ایک یہ کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ جو ان کے معبود ہیں، وہ بھی دوزخ میں پھونک دیے جائیں گے تو ”وہ“ کی ضمیر انہی (معبودوں) کی طرف راجع ہے کہ اگر یہ واقعی خدا ہوتے تو جہنم میں کیوں کہ جھونکے جاسکتے تھے؟ ﴿۹۹﴾! دوسرے یہ کہ خود کافروں کی طرف ضمیر راجع ہو کہ اگر وہ اصنام خدا ہوتے تو ان کی عبادت کرنے والوں کا یہ انجام کیوں ہوتا کہ وہ دوزخ میں ڈالے جائیں۔

”سنیں گے نہیں“ اس محاورہ کے معنی میں ہے کہ انکی چیخ و پکار سے کان پڑے آواز سنائی نہ دیتی ہوگی ﴿۱۰۰﴾ اور بعض نے کہا کہ آگ کے شعلوں کے زور و شور سے انہیں کچھ سنائی نہ دیتا ہوگا ﴿۱۰۰﴾ ان کے علاوہ مزید دو معنی بیان کیے گئے ہیں: ایک یہ کہ وہ سنیں گے نہیں یعنی کوئی ایسی چیز جو

[۱] لازم ہے اوپر اس بستی کے کہ وہ نہیں پھرتے (شاہ فیح الدین)

[۲] یحتمل ان یکون اراد ما وردت الا صنما جہنم (تبیان)

[۳] یعنی اپنے چلانے کے شور سے (موضح القرآن)

[۴] لا یسمعون شبیال شدۃ غلیبا ہا (جلالین)

دل خوش کن اور کار آمد ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ آگ کے صندوقوں میں بند ہوں گے کہ ان تک کوئی ادھر ادھر کی آواز جاتی ہی نہ ہوگی۔ [۱]

إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَىٰ ۗ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ ﴿۱۵۱﴾ لَا يَسْمَعُونَ
حَسْبِيَ سَهَا ۗ وَهُمْ فِي مَا اشْتَهَتْ أَنفُسُهُمْ خَالِدُونَ ﴿۱۵۲﴾ لَا يَحْزَنُهُمُ الْفَزَعُ
الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقَّهِمُ الْمَلَائِكَةُ ۗ هَذَا يَوْمُكُمْ الَّذِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ﴿۱۵۳﴾

”بلاشبہ وہ جن کیلئے ہماری طرف سے بھلائی پہلے مقرر ہو چکی ہے، یہ اس سے دور رہیں گے، وہ اس کی آواز نہیں سنیں گے اور وہ اس میں کہ جسے انکا جی چاہتا ہے ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، انہیں وہ سب سے بڑی گھبراہٹ کوئی رنج نہ پہنچائے گی اور فرشتے ان کا استقبال کریں گے۔ یہ تمہارا وہ دن جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا تھا۔“
چونکہ قرآن مجید میں ایک جگہ ہے:

وَإِنَّ مِنكُمْ لَأَٰلَآءَ وَإِرْهَآءَ: اور کوئی تم میں ایسا نہیں جس کا گزر دوزخ پر نہ ہو۔ (مریم۔ ۷۱)

اس لئے یہاں دور رہنے کا مطلب یہ ہے کہ ادھر سے گزر کر جب آگے بڑھ جائیں گے تو پھر ہمیشہ کے لئے اہل جنت اس دوزخ سے دور رہیں گے [۱]۔ مگر ہماری قدیم تفسیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت اس آیت کے تکملہ کی حیثیت رکھتی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک مقبول بارگاہ الہی طبقہ ایسا ہے جو ادھر سے گزرے گا بھی نہیں۔ [۲]

اس تفسیر میں الفاظ اگرچہ ایسے ہیں کہ یہ آیت اس آیت کو منسوخ کر دیتی ہے مگر چون کہ نسخ احکام شرعیہ میں ہوتا ہے۔ احوال و احوال قیامت کے متعلق جو خبریں ہیں ان میں نسخ کا لفظ ایک تعبیر ہو سکتی ہے اسی امر کی یہ افراد اس حکم سے خارج ہیں اور اس کا سمجھنا یوں زیادہ آسان ہے کہ اس آیت (إِنَّ مِنكُمْ لَأَٰلَآءَ وَإِرْهَآءَ) میں جو کچھ عموم ہے، وہ گم کے مخاطب میں ہے کہ تم میں سے کوئی ایسا نہیں جو دوزخ کی طرف نہ جائے۔ لیکن یہ آیت بتلاتی ہے کہ ایک طبقہ جس کی طرف رحمت الہی نے سبقت کی ہے اور وہ وہی ہو سکتے ہیں جو خود اللہ بقون والسا بقون اور اللہ السابقون الی الخیرات کے مصداق ہیں، وہ اس ”گم“، یعنی ”تم“ کی مخاطب جماعت سے از اول خارج ہیں لہذا اس آیت کے مضمون کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اب ترتیب قرآن چونکہ مطابق تنزیل نہیں ہے، اس لئے یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ آیات گزشتہ سلسلہ کلام سے مربوط ہی ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ آیات اُس سے الگ ہوں اور ”جن کے لئے بھلائی لکھی جا چکی ہے“ اس سے وہی خاص درجہ والے اہل ایمان مراد ہوں جو معصوم ہیں بغیر اس کے کہ اس کی نظر کسی سوال اور اس کے جواب پر ہو لیکن جب ان کا تعلق گزشتہ آیات سے مانا جائے تو یہ پریشان نزول قرین قیاس ہے کہ چونکہ گزشتہ آیات میں آیا تھا کہ جن جن کی اللہ کے سوا عبادت کی جاتی تھی، وہ سب ہی دوزخ میں ڈالے جائیں گے تو اس سے یہ

[۱] ای لا یسمعون ما یسئرون ولا ما ینفعون بہ—وقیل یجعلون فی توابعیت من النار فلا یسمعون شیئاً (مجمع البیان)

[۲] یعنی ایک بار گزر کر پھر ہمیشہ دور رہیں گے (موضح القرآن)

[۳] ناسخۃ لقولہ: وان منکم الا وادھا (علی بن ابراہیم)

بلاشبہ پیدا کیا گیا کہ پھر جناب مسیح علیہ السلام اور جناب عزیز علیہ السلام وغیرہ بھی اس کے مستوجب ہیں کہ دوزخ میں ڈالے جائیں، تو اس تصور کے دفعیہ کے لئے یہ آیات نازل ہوئیں۔ [۱]

پھر بھی جو مفہوم آیت ہے، وہ ان اشخاص سے مخصوص نہیں ہو جائے گا بلکہ جو اس پایہ کے یا ان سے برتر، جو ہر عصمت میں ان کے ساتھ مشترک افراد ہوں، سب ہی اس میں داخل ہوں گے۔

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجْلِ لِلْكِتَابِ ط كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ ط

وَعَدًّا عَلَيْنَا ط إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ ﴿۱۰۴﴾

”جس دن ہم آسمان کو لپیٹ دیں گے جس طرح کاغذ خطوط کے لئے لپیٹا جاتا ہے، جس طرح ہم نے پہلے پہل مخلوق کو پیدا کیا تھا۔ اب اسے ہم پلٹائیں گے بھی۔ یہ وعدہ ہے ہمارے ذمہ یقیناً ہم ایسا کر کے رہیں گے۔“ ایک تفسیر یہ ہے کہ سَجَل فرشتہ کا نام ہے اور کَتَب سے مراد نامہ ہائے عمل ہیں [۲] اب ترجمہ یہ ہوگا کہ ”جیسے سَجَل نامہ ہائے عمل کو لپیٹتا ہے“ ہماری قدیم تفسیر بھی جو غالباً معصوم علیہ السلام سے وارد ہے، اس کے مطابق ہے۔ [۳]

جناب شیخ الطائف نے ایک قول نقل کیا ہے کہ سَجَل پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب کا نام ہے اور یہ معنی ہیں کہ جیسے سَجَل خطوط کو لپیٹتے ہیں [۴] لیکن وہ تفسیر جس کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے کہ سَجَل وہ کاغذ ہے جو لفظ کی طرح خطوط پر لپیٹا جاتا ہے، قدیم مفسرین میں سے زیادہ کی طرف نسبت رکھتی ہے۔ [۵]

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ

الصَّالِحُونَ ﴿۱۰۵﴾

”اور بے شک ہم نے توریت کے بعد زبور میں بھی یہ لکھ دیا ہے کہ زمین کے ورثہ دار میرے نیک بندے ہوں گے۔“

انجام کار میں نیکو کاروں کا مکمل اقتدار:

ہم نے جو ترجمہ کیا ہے جس کے رو سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذکر کے معنی اس مقام پر توریت کے ہیں، اکثر مفسرین کے قول کے مطابق ہے

[۱] نزل النما قال ابن الزبدي عبدعزیزوالمسیح والملائكة فہم فی النار علی مقتضى ماتقدم (جلالین)

[۲] السجل اسم ملك للكتب صحیفة ابن ادم عند موتہ (جلالین)

[۳] قال السجل اسم ملك الذى بطوى الكتب (علی بن ابراہیم)

[۴] فروایة اخزی السجل کاتب کان لرسول الله ﷺ (تجلیان)

[۵] السجل صحیفة فیہا الكتب عن ابن عباس و مجاهد و قتادہ و الکلبی (مجمع البیان)

مگر علامہ طبرسی نے اس کے قبل دو قول اور نقل کیے ہیں: ایک یہ کہ زبور کے معنی تمام انبیاء کی کتابیں ہیں اور ذکر سے مراد لوح محفوظ ہے، اسے بعض متداول تفاسیر اہل سنت میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔^[۱]

دوسرے یہ کہ ذکر تو توریت ہی ہے اور زبور سے مراد وہ سب کتابیں ہیں جو توریت کے بعد نازل ہوئیں پھر آخر میں ایک عجیب قول یہ نقل کیا ہے کہ ذکر سے مراد قرآن ہے اور بعد کے معنی قبل کے ہیں یعنی تمام کتابیں جو قرآن سے پہلے تھیں، ان میں سب میں یہ بات درج ہے لیکن یہ تمام اقوال خلاف ظاہر ہیں، ظاہری مفہوم وہی ہے جو پہلے لکھا گیا ہے۔

اب وہ بات کیا ہے جو ان سب کتابوں میں درج ہے؟

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں: یعنی درآ خر زمان پیغمبری مبعوث شود و امت او بر زمین غالب شود (فتح الرحمن)

مطلب یہ ہے کہ آخری زمانہ میں ایک پیغمبر بھیجا جائے گا اور اس کی امت تمام روئے زمین پر غلبہ حاصل کر لے گی۔

مگر ”ورثہ دار“ کا لفظ جس غلبہ کا پتہ دیتی ہے، وہ سب سے آخری مختتم غلبہ ہے جو پھر مغلوبیت سے تبدیل نہ ہو اور شاہ صاحب کے پیش نظر جو غلبے ہیں، وہ سب مغلوبیت سے تبدیل نہ ہو اور شاہ صاحب کے پیش نظر جو غلبے ہیں، وہ سب مغلوبیت سے تبدیل نہ ہو گئے لہذا انہیں ہمارے ساتھ مل کر اس ”وارث ارض“ کا انتظار کرنا چاہیے جس کا غلبہ مختتم حیثیت رکھتا ہو اور جس کے بعد کوئی دوسری جماعت روئے زمین پر غالب نہ آسکے۔ وہ مہدی آخر الزمان علیہ السلام کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا^[۲] امام محمد باقر علیہ السلام کی حدیث بھی نتیجتاً اس کے مطابق ہے۔^[۳]

بعض مفسرین اہل سنت نے شاید اس نتیجے سے بچنے کے لئے ایک دور از فہم تفسیر کردی ہے کہ ارض سے مراد سرزمین جنت ہے اور صالحون سے مراد تمام نیکو کار لوگ ہیں۔^[۴]

إِنَّ فِي هَذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عِبْدِ رَبِّكَ ۗ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ﴿۱۵﴾

”بلاشبہ اس میں ایک پیغام ہے ان کے لئے جو عبودیت خالق کا احساس رکھتے ہوں اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا ہے مگر رحمت بنا کر تمام جہانوں کے لئے۔“

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا رحمۃ اللعالمین ہونا:

قرآن کے الفاظ صاف اس رحمت کی ہمہ گیری کو ظاہر کر رہے ہیں اور اُس میں کسی قید کا پتہ نہیں چلتا بلکہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس کی آواز ہے جو خود رب العالمین ہے اور وہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض کو اتنا ہی وسیع بنا رہا ہے۔

اب بعض مفسرین اُس کی وسعت کو اپنی کوتاہی کے حدود میں مقید کر دیں^[۵] تو اس کی ذمہ داری نہ خالق پر ہے۔ نہ اُس پر جو

[۱] الزبور بمعنی الكتاب ای كتب الله المنزل من بعد الدُّر. بمعنی امر الكتاب الذی عند الله (جلالین)

[۲] قال: القائم ﷺ اصحابه (علی ابن ابراہیم)

[۳] عن ابي جعفر ﷺ ان ذلك وعد للمؤمنين بآبائهم يرثون جميع الارض (تبیان)

[۴] الارض ارض الجنتة..... عامر فی کل صا (جلالین)

[۵] العالمین لانس والجن امؤ منین بک (جلالین)

رحمۃ للعالمین بن کر آیا تھا حالانکہ صدراؤں کے مفسرین میں جناب ابن عباسؓ نے اس کو بلا تفریق مذہب ولّت سب کے لئے ہمہ گیر بتایا تھا۔^[۱]

قُلْ إِنَّمَا يُوحِي إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَهُمُ اللَّهُ وَاحِدٌ ۖ فَهَلْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿۱۰۸﴾ فَإِنْ تَوَلَّوْا

فَقُلْ اذْنُبْتُمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ ۗ وَإِنِ ادْرَبْتُم مِّنِّي أَقْرَبُ ۖ أَمْ بَعِيدٌ مَّا تُوْعَدُونَ ﴿۱۰۹﴾

”کہہ دیجئے کہ میرے پاس یہی وحی آتی رہی ہے کہ تم سب کا خدا بس ایک خدا ہے، تو کیا تم اس کی بارگاہ میں سر جھکتے ہو؟ اس کے بعد اگر وہ روگردانی کریں تو کہہ دیجئے کہ میں نے تم کو برابر سے باخبر کر دیا اور مجھے نہیں معلوم کہ جلد یا بدیر (بہر حال) وقوع میں آئے گا وہ جس سے ڈرا یا جاتا ہے۔“

”تم کو برابر سے باخبر کر دیا ہے“ اس کی تشریح جناب شیخ الطائفہؒ نے بالکل درست فرمائی ہے:

تتساو دن فی العلم بہ لہ اظہر بعضکم علی شئ کتمتہ عن غیرہ

تم اس کے علم میں بالکل برابر ہو۔ میں نے یہ نہیں کیا ہے کہ کسی ایک کو کوئی ایسی بات بتائی ہو جسے دوسرے سے چھپایا ہے۔

مگر موصوف نے اس سے نتیجہ ایک عجب و غریب نکالا ہے:

ہو دلیل علی بطلان قول اصحاب الرموز ان للقرآن بواطن خص بالعلم بہا اقوام (تبیان)

یہ رموز و اشارات والے لوگوں کے قول کے غلط ہونے کی دلیل ہے اور اس کی رد ہے کہ قرآن کے اندر کچھ اندرونی مطالب ہیں جن کا

علم خاص اشخاص کو دیا گیا ہے۔

ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے، یہ بات اور ہے کہ باطنی جماعت نے رموز و اشارات کے دائرہ کو غیر معقول حد تک وسیع کیا ہے مگر بنیادی طور پر یہ خیال کہ علم قرآن میں سب برابر ہیں، درست نہیں ہے۔ نہ قرآن کی اس آیت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ یہاں تو مخاطب حقیقتاً منکرین توحید ہیں اور پیغام توحید کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ میں نے تم سب کو یہ پیغام یکساں طور پر پہنچایا ہے اور جس حد تک کہ تمام حجت کے لئے ضروری ہے، میری تبلیغ تم سب کے لئے برابر سے ہوئی ہے۔ نہ یہ کہ حقائق و معارف قرآنی آپ نے سب کو یکساں طور پر بتائے تھے اور جتنا بتایا ہو، اُسے سب یکساں طور پر سمجھے بھی ہوں، ورنہ راسخون فی العلم کے گروہ کی کوئی خصوصیت نہ ہوتی اور اس آیت کے کوئی معنی نہ ہوتے کہ

بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ

بلکہ وہ کھلی ہوئی آیات ہیں ان اشخاص کے سینوں میں جنہیں علم عطا ہوا ہے۔ (عنکبوت۔ ۴۹)

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ وہ کوئی خاص طبقہ ہے جن کے سینوں میں علم قرآن کا ذخیرہ ہے، ہر کس و ناکس اُس سے بہرہ ور نہیں

ہے۔

اس کے علاوہ متعدد احادیث معصومین علیہم السلام نے قرآن مجید میں باطنی اسرار اور تہ در تہ رموز و اشارات کا پتہ دیا ہے جس کے بعد اس کا

مطلق طور پر انکار مشکل ہو گیا ہے۔

علامہ طبرسی نے اس آیت کی تشریح ایسی کی ہے جس کے بعد اس کا تعلق علم سے کچھ رہتا ہی نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

أذنتكم اى علمتكم بالحرب على سوى ايدانا على سواء اعلا مه نستوى نحن و انتم فى علمه (مجمع البيان) میں نے تم کو برابر سے آگاہ کر دیا یعنی جنگ کا اعلان صاف الفاظ میں کر دیا ہے جسے ہمارے آدمی بھی خوب سمجھ گئے اور تم بھی۔ اگرچہ موصوف کے پیش نظر جناب شیخ الطائفہ کا ارشاد ہے۔ چنانچہ بعد میں اُس کا خلاصہ بطور قول ضعیف درج کیا ہے مگر اس کا کوئی اشتقاقی جائزہ نہیں لیا ہے جیسا بحمدہ باوجود اختصار کے سیر حاصل طور پر ہم نے جائزہ لیا ہے۔

إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُونَ ﴿۱۱﴾ وَإِنْ أَدْرَىٰ لَعَلَّهُ فِتْنَةً لِّكُمْ وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ ﴿۱۲﴾

”بلاشبہ وہ جانتا ہے اسے بھی کہ جو با آواز بات ہو اور جانتا ہے اُسے بھی کہ جو تم کو چھپاتے ہو اور مجھے نہیں معلوم ممکن ہے وہ آزمائش ہو تمہارے لئے اور عارضی فائدہ ہو ایک وقت تک کے لیے۔“

”مجھے نہیں معلوم“، یعنی ظاہری اسباب سے انسان نہیں جانتا ﴿۱۱﴾ جیسے ہمارے محاورہ میں آتا ہے۔

”نجانے“ اور ”کیا معلوم“ وغیرہ، چاہے کہنے والا کسی غیر معمولی ذریعہ سے جانتا بھی ہو کہ ایسا ہی ہے۔

قُلْ رَبِّ احْكُم بِالْحَقِّ ۗ وَرَبُّنَا الرَّحْمَنُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ﴿۱۳﴾

”کہیے کہ پروردگار تو فیصلہ کر دے حق کے ساتھ۔ اور ہمارا پروردگار سب کو فیض پہنچانے والا وہ ہے جس سے مدد طلب کی جائے اس پر جو تم کہتے ہو۔“

قرآن مجید میں متداول اس آیت کے شروع میں قُل ہی ہے جس کا ہم نے ترجمہ کیا ’کہیے‘ اور ترجمہ کا عام اصول یہ ہے کہ وہ متداول لفظوں کے مطابق ہوتا ہے جیسا کہ ہمارے جلیل القدر مفسرین نے تفسیر میں بھی اس کی پابندی کی ہے ﴿۱۳﴾ مگر بعض مترجمین نے یہاں ترجمہ قال کے لفظ کا کیا ہے ﴿۱۳﴾ جو بعض قاریوں کی قرأت بتائی جاتی ہے ﴿۱۳﴾ کہ انہوں نے پڑھا ہے: قُلْ رَبِّ احْكُم الخ اس میں دو تبدیلیاں ہیں قُل کے بجائے قال اور رب (بغیر یا) کے بجائے: ربی (ی کے ساتھ) مگر ہم اسے بہتر سمجھے سے قاصر ہیں۔

”مدد طلب کی جائے اس پر جو تم کہتے ہو۔“ یعنی جن غلط عقائد کا تم ادعا کرتے ہو ﴿۱۳﴾ یا میری ایذا رسانی کے جو منصوبے بناتے ہو۔

﴿۱﴾ وان ادري اى وما ادري لعله كناية عن غيره (مجمع البيان)

﴿۲﴾ قل يا محمد (تبیان) اى فرض امورك يا محمد الى الله (مجمع البيان)

﴿۳﴾ پیغامبر گفت (شاہ ولی اللہ) کہا پیغمبر نے (شاہ فیض الدین)

﴿۴﴾ وفى قراءت قال (جلالین)

﴿۵﴾ من كذبكم على الله فى قولكم: اتخذوا لداو على فى قولكم ساحرو على القرآن فى قولكم شعر (جلالین)

سُورَةُ الْحَجِّ

اس کے کئی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے [۱] لیکن اکثر نسخہ ہائے قرآن میں اس ”سورہ“ کی پیشانی پر ”مدنیہ“ لکھا ہوا ہے۔ آیات کی تعداد ۷۸ ہے۔

حج کا ذکر پہلے بھی کئی دفعہ آچکا، اس سورہ میں بھی ہے مگر نام یہ اسی سورہ کا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ خاص مضامین جو اس سورہ میں ہیں، وہ حسب ذیل ہیں۔

سورہ حج کے خاص خاص مضامین:

- ۱.....قیامت کا انتہائی ہولناک زلزلہ۔
- ۲.....انسانی تخلیق اور زندگی کے مختلف بدلتے ہوئے ادوار کے تصورات و تغیرات سے حیات بعد الموت کے امکان پر روشنی۔
- ۳.....اختلاف عقائد کا اصل فیصلہ قیامت میں جو اس کی دلیل ہے کہ عقیدوں کا اختلاف نجات پر اثر انداز ہوتا ہے۔
- ۴.....حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مذائے حج اور قیامت تک اس کا اثر۔
- ۵.....شعائر اللہ کی تعظیم کا حکم جو اس کی دلیل ہے کہ تعظیم غیر اللہ کو مطلق طور پر شرک سمجھنا غلط ہے۔
- ۶.....دفاعی جنگ کی اجازت اور اس کی بین الاقوامی طور پر ضرورت۔
- ۷.....اللہ کے یہاں کا ایک دن ایک ہزار برس کے برابر۔
- ۸.....پیغمبروں کی تمناؤں میں شیطان کی دراندازی۔
- ۹.....مکھی کی مثال دے کر قدرت الہی کے سامنے انسان کی عاجزی کا ثبوت۔
- ۱۰.....دین میں عسرو حرج کی نفی۔
- ۱۱.....”مسلم“ نام کی ابتداء..... وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

[۱] مکئیة عن ابن عباس وعطاء آیات وقال الحسن ہی مدنیة غیر آیات نزلت فی السفر وقال بعضهم غیر ست آیات وقال بعضهم

غیر اربع آیات (مجمع البیان)

يَأْيُهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ ۚ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ ① يَوْمَ تَرَوُنَّهَا
تَدْهَلُ كُلُّ مَرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ
سُكَرَىٰ وَمَا هُمْ بِسُكَرَىٰ وَلَكِنَّ عَذَابَ اللَّهِ شَدِيدٌ ②

”اے انسانو! اپنے پروردگار کی ناراضی سے بچو۔ بلاشبہ قیامت کا زلزلہ بہت بڑی چیز ہے جس دن تم اُسے دیکھو
گے ہر دودھ پلانے والی بھول جائے گی اُسے کہ جسے وہ دودھ پلاتی ہے اور ہر حاملہ کا حمل ساقط ہو جائے گا اور تم
لوگوں کو دیکھو گے مدہوش نشہ میں، حالانکہ وہ نشہ میں نہیں ہیں مگر اللہ کا عذاب بہت سخت ہے۔“

قیامت کا زلزلہ

”قیامت کا زلزلہ“ اس کے معنی اُس تلاطم اور تہلکے کے بھی ہو سکتے ہیں، جو قیامت میں ہوگا اور اس صورت میں یہ چیزیں جو بعد میں ہے
کہ ہر دودھ پلانے والی بھول جائے گی اُسے جسے وہ دودھ پلاتی ہے اور ہر حاملہ کا حمل ساقط ہو جائے گا اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ اس دن نفسا
نفسی کا عالم ہوگا اور اُس کی شدت ایسی ہوگی جس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ اگر کوئی دودھ پلانے والی ہو تو اُس بچہ کو بھول جائے جیسے وہ دودھ پلاتی اور
حاملہ کا حمل ساقط ہو جائے، اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اُس دن ایسی عورتیں ہوں گے جو دودھ پلاتی ہیں اور ایسی عورتیں جنہیں حمل ہے۔^[۱]
لیکن بہت سے مفسرین نے قیامت کا زلزلہ کا مطلب یہ لیا ہے کہ قیامت کے پہلے ایک زلزلہ ایسا آئے گا۔^[۲] اس صورت میں زلزلہ
کے نتائج جو بیان ہوئے ہیں انہیں بطور واقعہ سمجھنا چاہیے کہ ”دودھ پلانے والی اپنے بچہ کو بھول جائے گی اور حاملہ عورت کا حمل ساقط ہو جائے گا اور
لوگ عذاب کی شدت اور اس کے اثر سے مدہوش نظر آتے ہوں گے۔“ علامہ طبرسی نے دونوں نقل کر دیئے ہیں، کسی کو ترجیح نہیں دی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطَانٍ مَّرِيدٍ ③ كَتَبَ
عَلَيْهِ أَنَّهُ مِنَ تَوَلَّاهُ فَأَنَّهُ يُضِلُّهُ وَيَهْدِيهِ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ ④

”اور انسانوں میں وہ بھی ہے جو اللہ کے بارے میں بے جانے بوجھے بحث کرتا ہے اور ہر سرکش شیطان کی پیروی
کرتا ہے جس کے لئے یہ بات طے شدہ ہے کہ جو اُس کا ساتھ دے، وہ اُسے گمراہ کر کے چھوڑے گا اور اُسے آتش
دوزخ کے عذاب کا راستہ دکھائے گا۔“

[۱] لهذا تهبويل ليوم القيمة وتعظيم لما يكون فيه من الشدة على وجه لو كان هناك مرضعة لشغلت عن الذي ترضعه ولو كان
هناك حامل لا سقطت من هول ذلك اليوم وان لم يكن هناك حامل ولا مرضعة (تبيان)

[۲] اي الحركة الشديدة للارض التي يكون بعدها طلوع الشمس من مغربها الذي وهو من اشراط الساعة (جلالين) زلزلہ کہ
نزدیک قیامت باشد (شاہولی اللہ)

ہم نے جو ترجمہ کیا ہے، وہ اس پر مبنی ہے کہ کتب علیہ والا جملہ شیطان مرید کی ہے جو ایک تفسیر ہے [۱] دوسری تفسیر کے مطابق یہ اس شخص کو کہا گیا ہے جو بلا وجہ اللہ کے بارے میں بحث کرتا ہے۔ اس صورت میں ترجمہ یوں کیا جائے گا کہ ”اُس کے لئے یہ بات طے شدہ ہے۔“ یہ دوسرا قول ہے [۲] جو بعید نہیں ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِمَّنْ
 نُطْفَةٍ ثُمَّ مِمَّنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِمَّنْ مُضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُّخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۗ وَنُقِرُّ فِي
 الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ آجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا
 أَشُدَّكُمْ ۗ وَمِنْكُمْ مَّن يُّتَوَفَّىٰ وَمِنْكُمْ مَّن يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ
 مِن بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا ۗ وَتَرَىٰ الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ
 وَرَبَّتْ ۖ وَأَنْبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ۝۵ ذَلِك بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ
 وَأَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝۶ وَأَنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيهَا ۗ وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ
 مِّن فِي الْقُبُورِ ۝۴

اے انسانوں! اگر تمہیں دوبارہ اٹھانے جانے میں شک ہو تو (اس پر غور کرو کہ) ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفہ سے پھر جمے ہوئے خون سے، پھر گوشت کے لوتھڑے سے جسے صورت دی گئی ہے اور ایسے سے بھی جسے صورت نہ دی گئی ہوتا کہ تمہارے لئے ظاہر کریں اور ماؤں کے پیٹ میں جو چاہتے ہیں ہم رکھتے ہیں، ایک مقررہ مدت تک۔ پھر تمہیں بچہ کی صورت میں باہر لاتے ہیں پھر نشوونما دیتے ہیں کہ تم اپنی پوری قوت کی منزل تک پہنچو اور کوئی تم میں سے وہ ہے جسے اٹھا لیا جاتا ہے اور کوئی تم میں سے پہنچ جاتا ہے انتہائی عمر کی منزلوں تک، یہاں تک کہ علم و دانش کے بعد پھر ایسا ہو جاتا ہے کہ کچھ جانتا بوجھتا نہیں اور تم دیکھو گے زمین کو خشک تو جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ لہلہا اٹھتی ہے اور نشوونما پیدا کرتی ہے اور ہر قسم کے خوشنما نباتات اگاتی ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ بس اللہ ایک برقرار، نہ بدلنے والی ذات ہے اور وہ بلاشبہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ کہ قیامت آنے والی ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں اور یقیناً اللہ انہیں جو قبروں میں ہیں زندہ کرے گا۔“

ادوارِ انسانی کی تبدیلیوں سے حیات بعد الموت کے امکان پر روشنی:

[۱] قفلی علی الشیطان (جلالین)

[۲] قیل معناه کتب علی المجادل بالباطل (مجمع البیان)

پہلے جو کہا گیا ہے کہ ”مٹی سے پیدا کیا“ یہ پوری نوع کے آغاز کا ذکر ہے یعنی ابوالبشر حضرت آدم ﷺ کو مٹی سے پیدا کیا اور اس کے بعد والے ”پھر“ سے وہ نظام ہے جو ان کی اولاد کی خلقت میں جاری ہے۔

”النجبین لکم“ ”تا کہ تمہارے لئے ظاہر کریں“۔ یعنی مبداء خلقت میں مٹی سے پیدا کرنے کے بعد پھر یہ تدریجی نظام تخلیق جو اولاد آدم میں جاری ہے اور جو اب تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے اس نظام کے قرار دینے کا مقصد یہی تھا کہ تم پر اللہ کی قدرت نمایاں ہو [۱] اور معلوم ہو کہ وہ جس طرح چاہے پیدا کر سکتا ہے لہذا قیادت میں دوبارہ پیدا کرنے کے امکان میں بھی تمہیں کوئی شک و شبہ پیدا نہ ہو۔ [۲]

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُّبِينٍ ۝ ثَانِي

عَظْفِهِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۗ لَهُ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَنُذِيقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

عَذَابَ الْحَرِيقِ ۝ ذَلِكُمْ بِمَا قَدَّمْتَ يَدَكَ وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ۝

”اور انسانوں میں وہ بھی ہے جو اللہ کے بارے میں بحث کرتا ہے بغیر کسی علم اور بغیر کسی رہنمائی اور بغیر کسی روشن کتاب کے موڑے ہوئے اپنے شانے کوتا کہ اللہ کی راہ سے بھٹکائے۔ اس کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور اسے قیامت کے دن ہم آگ کا مزہ چکھائیں گے۔ یہ اس وجہ سے ہے جو تیرے ہاتھ کر چکے ہیں اور یقیناً اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔“

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللَّهَ عَلَىٰ حَرْفٍ ۖ فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ اطْمَأَنَّ بِهِ ۚ وَإِنْ

أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ انْقَلَبَ عَلَىٰ وَجْهِهِ ۗ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ۗ ذَلِكُمْ هُوَ الْخُسْرَانِ

الْمُبِينِ ۝

”اور انسانوں میں وہ بھی ہے جو اللہ کی عبادت کنارے پر کھڑا کرتا ہے۔ اگر اس کے لئے کوئی بھلائی ہوتی ہے تو وہ اس سے مطمئن ہو جاتا ہے اور اگر اسے کوئی آزمائش سامنے آتی ہے تو اپنا منہ اٹھائے ہوئے پلٹ جاتا ہے۔ وہ دنیا اور آخرت دونوں کے گھائے میں ہے۔ یہ کھلا ہوا خسارہ ہے۔“

”عبادت کنارے پر کھڑا کرتا ہے“ اس کی تشریح دوسرے جملہ میں موجود ہے۔ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں:

”یعنی دنیا کی نیکی پاوے تو بندگی پر قائم رہے اور تکلیف پاوے تو چھوڑ دے۔ ادھر دنیا گئی ادھر دین گیا۔ کنارے پر کھڑا ہے یعنی ابھی

نہ اس طرف ہے نہ اس طرف ہے جیسا کہ کوئی مکان کے کنارے پر کھڑا ہو، جب چاہے نکل جاوے“ (موضح القرآن)

تفسیر جلالین میں ہے:

[۱] لند لکم علی مقدور نابتصر یفہ فی ضروب الخلق (تبیان)

[۲] النجبین لکم کمال قدرتنا لتسدلوا بہا فی ابتداء الخلق علی اعادة (جلالین)

علیٰ حرف ای شک فی عبادتہ مشبہہ بالحال علیٰ حرف جبل فی عدم ثباتہ۔
علیٰ حرف کے معنی یہ ہیں کہ اپنی عبادت میں شک کی حالت پر ہے، اس شک کو تشبیہ دی گئی ہے پہاڑ کے کنارے سے ڈانوا ڈول اور بے ثبات ہونے ہیں۔

جناب شیخ الطائف نے اس طرح فرمایا کہ:

ای فی الناس من یوجہ عبادتہ الی اللہ علیٰ ضعف فی العبادۃ کضعف القیام علیٰ حرف وذلك من اضطر
ابہ فی استیفاء النظر المودی الی المعرفۃ فادنی شہبہ تعرض لہ ینقاد لہا ولا یعمل فی حلہا۔
یعنی لوگوں میں ایسا شخص بھی ہے جو اپنی عبادت کو اللہ سے متعلق کرتا ہے مگر اس عبادت میں کمزوری ہوتی ہے اور یہ اس لئے ہوتا ہے کہ وہ اس غور فکر میں جو معرفت تک پہنچاتی ہے ڈانوا ڈول ہے تو ذرا بھی شک و شبہ پیدا ہوتا ہے تو وہ شبہ کے سامنے جھک جاتا ہے اور اس کے حل کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔

ہماری قدیم تفسیر کا اجمال اس پوری تفصیل پر حاوی ہے۔ علی بن ابراہیم قتی نے لکھا ہے اور بظاہر معصوم کی طرف نسبت ہے:

علیٰ حرف قال علیٰ شک: علیٰ حرف فرمایا (یعنی) شک کی حالت میں۔

اس صورت میں قرآن مجید کی بعد کی تفصیل اس مفہوم کی تشریح تکمیل ہوگی مگر علامہ طبرسی نے اسکے علاوہ حسن بصری کا یہ قول نقل کیا ہے:

الدین حر فان احدهما اللسان والغانی القلب فمن اعترف بلسانه ولم یسا عده قلبه فهو علیٰ

حرف. (مجمع البیان)

دین کے دو کنارے ہیں، ایک زبان اور دوسرے دل تو جو زبان سے اقرار کرے اور اُس کا دل اُس کا ساتھ نہ دے رہا ہو تو وہ ایک

کنارہ پر ہے۔

اس صورت نے قرآن مجید کے بعد کے جملے اس حرف کے مفہوم کی تشریح قرار نہ پائیں گے بلکہ اس کے نتیجہ کو ظاہر کرنے کے والے ہوں گے کہ چونکہ اُس کا ایمان صرف زبانی ہے، دل اُس کا ہم آہنگ نہیں ہے، تو اس میں ثبات قدم بھی نہیں ہے۔ جب دنیا کے منافع نظر آتے ہیں، تو قدم جمائے رکھتا ہے۔ اور ذرا سختی پیش آئی تو بس دین سے منحرف ہونے کی سوچنے لگتا ہے یا منحرف ہو ہی جاتا ہے۔

يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُهُ وَمَا لَا يَضُرُّهُ وَمَا لَا يَنْفَعُهُ ۗ ذَلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ ﴿١٤﴾

يَدْعُوا الْمَنَ ضُرًّا أَقْرَبَ مِنْ نَفْعِهِ ۗ لِبَيْسِ الْمَوْلَىٰ وَلِبَيْسِ الْعَشِيرِ ﴿١٤﴾

’پکارتا ہے اللہ کو چھوڑ کر اسے کہ جو اسے نہ نقصان پہنچاتا ہے اور نہ اسے کوئی نفع پہنچاتا ہے، یہی سخت گمراہی ہے، وہ پکارتا ہے ایسے کو جس سے نقصان کا امکان اس کے فائدے سے زیادہ ہے۔‘ ”کیا برا ہے آقا اور کتنا برا ساتھی“

مَنْ ضُرًّا أَقْرَبَ مِنْ نَفْعِهِ ۗ کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے کہ جس سے نقصان کا امکان اس کے فائدے سے زیادہ ہے، صاف ہے اور اس

میں کوئی پیچیدگی نہیں مگر بعض مفسرین کو اقرب کے لفظ میں دشواری محسوس ہوئی ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اُن اصنام کی پرستش میں کوئی فائدہ ہے مگر

وہ دور ہے اور ضرر جو ہے، وہ ان کی بہ نسبت نزدیک ہے۔ اس تصور کے دفعیہ کے لئے انہوں نے کہا ہے کہ عرب میں یہ محاورہ ہے کہ جو چیز کوئی وجود نہ رکھتی ہو، اسے بعید کہتے ہیں تو اس بعید کے محاورہ کو سامنے رکھ کر قرآن مجید نے ضرر کے لئے قریب کی لفظ استعمال کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس میں نفع بالکل نہیں ہے۔^[۱]

ہمیں نہ عرب کا یہ محاورہ معلوم ہے اور در صورتیکہ بعید میں اس قسم کا محاورہ ہو تو اس کے مقابلہ میں ضرر کو قریب کہنا پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا اور محاورات قیاسی چیز نہیں ہوتے کہ ان میں عقلی تقابل سے تصرف صحیح ہوا کرے۔

إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا

الْأَنْهَارُ ۗ إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ﴿۱۴﴾

”بلاشبہ اللہ داخل کرتا ہے انہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کئے ان بہشتوں میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، یقیناً اللہ کرتا ہے جو کچھ وہ چاہتا ہے۔“
اور چاہتا اسی کو ہے جو حکمت کا ملکہ تقاضا ہوتا ہے۔

مَنْ كَانَ يَظُنُّ أَنْ لَنْ يَنْصُرَهُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ فَلْيَمِدُّ ذِرَاعَيْهِ إِلَى

السَّمَاءِ ۗ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُدْهِبَنَّ كَيْدَهُ مَا يَغِيبُ ﴿۱۵﴾

”جو سمجھتا ہو کہ اللہ ہرگز دنیا اور آخرت میں ان کی مدد نہیں کریگا تو وہ کوئی رسی بلندی تک کھینچ کر لے جائے، پھر اسے کاٹ ڈالے۔ اس کے بعد دیکھے کہ اس کی ترکیب اس کے غم و غصہ کو دور کرتی ہے؟“

میں نے جو ترجمہ کیا ہے کہ ”ان کی مدد نہیں کرے گا“ یہ اس بنیاد پر ہے کہ ضمیر لن ینصرہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہے، جو ابن عباسؓ وغیرہ کا قول ہے۔^[۱] اس صورت میں بعد کے جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کا گمان غلط ثابت ہوگا اللہ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد ضرور کرے گا۔ اس سے اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو کوئی چارہ کار نہیں سوا اس کے کہ یہ اپنے گلے میں پھندا ڈال کر لٹک جائے اور پھر وہاں سے گر کر جان دے دے۔ آخری فقرہ کا مطلب تقریباً سب نے یہی لیا ہے مگر مجھے اس میں تامل ہے۔ اس لئے کہ الفاظ قرآنی میں رسی لٹکانے اور اس کے کاٹنے کا ذکر ہے۔ خود اس کے لٹکنے اور گر کر مرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے اور پھر بالکل آخری الفاظ کہ ”اس کے بعد دیکھیے کہ یہ ترکیب اس کے غم و غصہ کے سبب کو دور کرتی ہے“۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رسی کا لٹکانا اپنی جان دینے کے لئے نہیں تھا بلکہ اس اپنے غم و غصہ کے سبب کو دور کرنے کی کوئی ترکیب تھی۔ اس لئے میرے ذہن میں اس کا مطلب یہ آتا ہے جو ہمارے اس محاورہ میں ادا ہوتا ہے کہ زمین آسمان کے قلابے ملا لے، اس کے بعد بھی وہ

[۱] وان كان لا نفع عندك ولكن العرب تقول لعل لا يكون هذا بعيد و نفع الصنم بعيد لانه لا يكون فلما كان نفعه بعيدا قيل لضره

انه اقرب من نفعه على معنى انه كالمين (مجمع البيان)

[۲] اي محمد نبويه صلى الله عليه واله وسلم (جلالين) فالهاء في قوله ينصره الله عائدا الى النبي صلى الله عليه واله وسلم (تبيان) عن

ابن عباس وقتاده والمعنى من كان يظن ان الله لن ينصره نبيه محمدا ولا يعينه على عدوه (مجمع البيان)

اللہ کی اس مدد کو نہیں روک سکتا جو اس کے غم و غصہ کی باعث ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ضمیر خود اس شخص کی طرف راجع ہے یعنی ”جو یہ گمان کرتا ہے کہ خدا اس کی مدد نہیں کرے گا“۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے بالکل مایوس ہو جائے۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ”دنیا کی تکلیف میں جو کوئی خدا سے ناامید ہو کر اس کی بندگی چھوڑ دے اور جھوٹی چیزیں پوجے، جن کے ہاتھ نہیں برا بھلا وہ اپنے دل کے ٹھہرانے کو یہ صورت قیاس کر لے جیسے ایک شخص اونچی رسی سے لٹک رہا ہے۔ اگر چڑھ نہیں سکتا، تو قیاس تو ہے کہ رسی اوپر کھینچے تو چڑھ جاوے، جب رسی توڑے تو پھر کیا توقع۔ رسی کہا اللہ کی امید کو طرف آسمان کے یعنی اونچان کے“۔ (موضح القرآن)

میں پہلے قول کو زیادہ ترین قیاس سمجھتا ہوں، اس میں یہ الجھاؤ نہیں ہے جو آپ کو مذکورہ عبارت میں نظر آ رہا ہے، پھر دینی حقیقت یہ ہے کہ کافر کو تو رحمت خدا سے مایوس ہونا ہی چاہئے تو اس کی اس بات پر مذمت کیوں ہوگی کہ وہ گمان رکھتا ہے کہ اللہ اس کی دنیا و آخرت میں مدد نہیں کرے گا۔ اسے چونکہ وہ کافر ہے، گمان کیسا، یقین ہونا چاہئے کہ اللہ دنیا اور آخرت میں اس کی مدد نہیں کرے گا۔ یہ اس کا گمان یا یقین بالکل صحیح ہے تو اس پر مذمت کیوں ہو؟

وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ ۖ وَأَنَّ اللَّهَ يَهْدِيَ مَن يَشَاءُ ﴿١٦﴾

”اور اسی طرح ہم نے اسے اتارا ہے کھلی ہوئی نشانیوں کی صورت میں اور اس بنا پر کہ اللہ منزل مقصود تک پہنچاتا ہے جسے چاہتا ہے“۔

بے شک چونکہ وہ حکیم علی الاطلاق ہے، اس لئے بلاوجہ ترجیح سے کام نہیں لیتا کہ کسی کو مقصد تک بالخصوص پہنچا دے بلکہ یہ اس کا پہنچانا جو جبری طور پر نہیں ہے بلکہ توفیق خاص کی صورت سے ہوتا ہے، خود اس شخص کے حسن نیت، سچے ذوق و شوق اور راہ طلب میں امکان بھر قدم زنی سے ہوتا ہے (وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا) (عنکبوت ۶۹)

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِغِينَ وَالنَّضِرَىٰ وَالْمَجُوسَ وَالَّذِينَ

أَشْرَكُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ يُفَصِّلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿١٧﴾

”بلاشبہ جو ایمان لائے ہیں اور جو یہودی ہیں اور صابغی اور عیسائی اور مشرکین، یقیناً ان سب کے درمیان اللہ فیصلہ کرے گا قیامت کے دن، بلاشبہ اللہ ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے“۔

اختلاف عقائد کا اصل فیصلہ قیامت میں:

”فیصلہ کرے گا“، یعنی اپنا فیصلہ نمایاں کر دے گا ان کے آخری انجام کو سامنے لا کر۔^[۱] اب قابل توجہ ہے یہ پہلو کہ اگر نجات کا تعلق صرف اعمال سے ہوتا اور عقائد کا اس میں دخل نہ ہوتا تو ان عقائد کو جماعتی نشان بنا کر ان گروہوں میں فیصلہ کا اعلان کیوں ہوتا کہ دنیا دیکھے کہ ان

[۱] بادخال المؤمنین المجرمات وغيرہم النار (جلالین)

میں کس کا کیا انجام ہوتا ہے۔^[۱]

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ
وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ ۗ وَكَثِيرٌ حَقٌّ عَلَيْهِ
الْعَذَابُ ۗ وَمَنْ يُهِنِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِن مُّكْرِمٍ ۗ إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ^{الصحيفة} ۗ^(۱۸)

’کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ کے لئے سجدہ میں ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت سے آدمی اور بہت سے وہ ہیں جن پر عذاب مقرر ہو گیا ہے اور جسے اللہ ذلیل کرے، اسے عزت دینے والا کوئی نہیں، بلاشبہ اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے‘۔

کائنات کی ہر شے اللہ کے لئے سربسجود:

جہاں اختیار کا دخل نہیں بلکہ قوانین قدرت کی تکوینی و قہری اطاعت ہے، وہاں تفریق اور امتیاز کا گز نہیں بلکہ وہاں سب ہی اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہیں، اگر انسان بھی دوسرے اشیائے کائنات کی طرح جو ہر اختیار سے عاری ہوتا تو یہاں بھی ’نا فرمان‘ کا وجود غیر ممکن ہوتا مگر وہ تو نظام حکمت الہی میں ’فاعل مختار‘ بنایا گیا ہے، اس لئے اختیاری حدود میں یہاں یہ فرق ہو گیا کہ بہت سے تو سجدہ میں سرنگوں ہیں، اور بہت سے ایسے بھی ہیں جو نافرمان ہیں اور چونکہ یہ نافرمانی ان کے ’سوء اختیار‘ کا نتیجہ ہے، اسی لئے اس کا انجام یہ ہے کہ ان پر عذاب مقرر ہے۔

اب یہاں ایک بحث طلب بات یہ آگئی ہے کہ پہلے آفتاب و ماہتاب اور ستاروں اور پہاڑ کے ذکر کے قبل ذی شعور مخلوقات کا بھی ذکر تھا کہ من فی السموات و من فی الارض جو لوگ آسمانوں میں ہیں اور جو لوگ زمین میں ہیں‘۔ اب آسمان پر تو خیر، فرشتے ہیں، ان کے بلا استثناء سربسجود ہونے میں کوئی شک نہیں مگر زمین پر کے لوگ کون ہیں؟ وہ تو انسان ہی ہیں جن میں اس کے بعد صراحت ہے کہ کچھ سجدہ کرتے ہیں کچھ نہیں۔ اس مشکل کے ذہن میں آنے کی وجہ سے جناب شیخ الطائفہ کو کہنا پڑا کہ:

وان كان ظاهراً العموم فالمراد به الخصوص لا تاقاً علمنا ان كثيراً من الناس ككافرون بالله تعالى
بظاہر تو اس میں عموم ہے مگر مراد اس سے خاص گروہ ہے کیوں کہ ہمیں معلوم ہے کہ بہت سے انسان اللہ کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔
مگر نظر غائر رہنمائی یہ کرتی ہے کہ من فی الارض میں انسان کا ذکر ہے، شمس و قمر و نجوم وغیرہ کے ساتھ جہاں سجدہ کی نوعیت فطری اطاعت کی ہے جو تکوینی طور سے انجام پاتی ہے، جس میں ارادہ و اختیار کو دخل نہیں ہے، یہ پیدائش کے وقت مثل تمام کائنات کے ہر انسان بھی کرتا ہے۔ اس میں مومن و کافر کی تفریق نہیں ہے۔ وہ انسان بھی جو اس کا شدید منکر ہے، عین انکار کی حالت میں اپنی تمام جسمانی و روحانی طاقتوں کے ساتھ خالق کے قانون معینیت کے مطابق چل رہا ہے جو اس طرح کا سربسجود ہونا ہے، جیسے کائنات کا ہر ذرہ سربسجود ہے اور بعد میں جو کثیر من الناس

[۱] يضطر الى العلم بصحة الصحيح حيث يبيض وجه المحق ويسود وجه البطل (تبيان)

کہا گیا، وہاں ارادی و اختیاری اطاعت و عبادت مراد ہے۔ یہاں بہت سے وہ ہیں جو نافرمان ہیں اور عبادت کا فرض انجام نہیں دیتے۔ [۱] تو ان کے لئے کہا گیا ہے کہ ”ان پر عذاب مقرر ہو گیا ہے۔“

اگر فاعل خیر و شر اللہ ہوتا، اس انسان کے اختیار کو دخل نہ ہوتا تو بر بنائے عدالت عذاب کی کوئی وجہ نہ تھی، اس سے ظاہر ہے کہ وہ ذلت جسے بعد میں کہا گیا ہے کہ ”جسے اللہ ذلت دے، اس کا عزت دینے والا کوئی نہیں“ ان کے اس استحقاق کی بنا پر ہے جو ان کے اختیاری کردار سے متعلق ہے اور اس لئے وہ مشیت بھی جسے کہا گیا ہے کہ اللہ جو چاہتا کرتا ہے، بلا وجہ نہیں ہے بلکہ یہ مشیت برود استحقاق بمقتضائے عدل ہے۔ [۲]

هٰذِهِ خَصْمَانِ اخْتَصَمُوا فِي رَبِّهِمْ فَالَّذِينَ كَفَرُوا قُطِعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ تَارٍ ط يُّصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوسِهِمُ الْحَمِيمُ ﴿١٩﴾ يُصْهَرُ بِهِ مَا فِي بُطُونِهِمْ وَالْجُلُودُ ﴿٢٠﴾
وَلَهُمْ مَقَامِعٌ مِّنْ حَدِيدٍ ﴿٢١﴾ كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ أُعِيدُوا فِيهَا ۗ وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ﴿٢٢﴾

”یہ دو فریق ہیں جو اپنے پروردگار کے بارے میں باہم دگر مقابل ہیں، تو جنہوں نے کفر اختیار کیا ان کے لئے آگ کے کپڑے قطع کئے جائیں گے، ان کے سروں پر گرم پانی انڈیلا جائے گا جس سے ان کے پیٹ کے اندر کی تمام چیزیں اور کھالیں گل جائیں گی اور ان کے لئے لوہے گرز ہوں گے۔ جب چاہیں گے اس سے نکل کر رنج و صدمہ سے چھٹکارا پائیں تو پھر اس میں پلٹا دیئے جائیں گے اور پچھو عذاب جلنے کا۔“

”یہ دو فریق ہیں“..... فریق کے لئے قرآن مجید میں خصم کی لفظ ہے، یہ واحد کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے اور جمع کے لئے بھی۔ [۳] چونکہ لفظ یہ واحد ہے اس لئے دو فریق کے لئے تشبیہ کی لفظ استعمال ہوئی ہے۔ خصمان مگر چونکہ درحقیقت وہ دو شخص نہیں ہیں بلکہ دو گروہ ہیں جن میں کثیر افراد ہیں، اس لئے بعد میں فعل جمع لایا گیا ہے: اختصموا جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے ”باہم دگر مقابل ہیں“ اور ایک جگہ تو قرآن میں یہ لفظ بطور واحد لاکر فعل جمع لایا گیا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے تذکرہ میں آیا ہے۔ هَلْ أَتَاكَ نَبِيُّ الْخَصْمِ إِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ. (یعنی) کیا ان فریقوں کی خبر آپ تک پہنچی ہے، جب وہ ان کے پاس عبادت گاہ میں داخل ہوئے۔ (سورہ ص - ۲۱)

إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ يُجْلُونَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا ط وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ ﴿٢٣﴾ وَهَدُوا

[۱] ایک سجدہ ہے کہ سب اس میں شامل ہیں، آسمان و زمین جو کوئی ہے، وہ یہ کہ اللہ کی قدرت میں بے بس ہیں اور ایک سجدہ ہر ایک کا جدا۔ وہ یہ کہ اس کو جس کام کا بنایا اس کام میں لگے۔ یہ بہت آدمی کرتے ہیں، اور بہت نہیں کرتے، اور خلق سارے کرتے ہیں (موضح القرآن)

[۲] ایک مہر من یشاء اذا استحق ذالك (تبیان)

[۳] یستوی فیہ الواحد والجمع والذکر والانثی (مجمع البیان)

إِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۖ وَهُدًى إِلَى صِرَاطٍ الْحَمِيدِ ﴿٢٣﴾

”بلاشبہ اللہ داخل کرے گا انہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کئے ان بہشتوں میں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں انہیں پہننے کو ملیں گے نلکن سونے کے اور موتی اور ان کے کپڑے وہاں ریشم کے ہوں گے اور ان کی ہدایت ہوئی پاک و پاکیزہ گفتگو کی طرف اور ان کی ہدایت ہوئی اُس کے راستے کی طرف جو حمد و ثناء کا حق دار ہے۔“

”ان کے کپڑے وہاں ریشم کے ہوں گے۔“ اس مقام پر شاہ ولی اللہ نے عجیب حاشیہ دیا ہے، ”یعنی درد نیا“ (فتح الرحمن) حالانکہ اس کے پہلے جو ذکر ہے وہ جنت کے لباس کا ہے۔ دنیا کا نہیں اور پھر دنیا میں تو ریشم کا لباس مردوں کے لئے حرام ہی قرار دیا گیا ہے جیسا کہ جلالین نے بھی لباس سحر فیہا حریر کی تشریح میں لکھا ہے:

هو المحرم لبسه على الرجال في الدنيا: وهي جس کا پہننا مردوں پر دنیا میں حرام ہے۔

اور اس سے غالباً اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے جس پر صاف الفاظ میں جناب شیخ الطائف نے روشنی ڈالی ہے چونکہ دنیا میں وہ حکم الہی کے دباؤ سے ریشم پہننے سے محروم رہے تھے تو خالق نے جنت میں جہاں تکلیف کا کوئی تصور نہیں اور وہ دارالجزاء ہے، ریشمی لباس عطا فرمانے کا اعلان کیا اور قرآن کے وعدہ پر ایمان رکھنے والوں کے لئے اس اطمینان دہانی کے ذریعہ سے چند روزہ دنیا میں (اس لباس) سے پرہیز کو طبیعت پر آسان بنا دیا ۱؎ پھر شاہ صاحب یہ کیا فرما رہے ہیں کہ اہل جنت کا لباس دنیا میں ریشم ہوگا، مجھے شبہ ہوتا ہے بلکہ گمان غالب ہے کہ یہ ’درد نیا‘ کا تب کی غلطی ہے۔ شاہ صاحب نے لکھا ہوگا ’یعنی ازدیبا‘ اور اس طرح اُن کا مقصد اس آیت کے مضمون اور دوسری جگہ جو ارشاد ہوا ہے: من استبرق اس میں مطابقت ظاہر کرنا ہوگا۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِي جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً الْعَاكِفِ فِيهِ وَالْبَادِ ۗ وَمَن يُرِدْ فِيهِ بِالْحَادِ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِن عَذَابِ آئِمَّةٍ ۖ

عَذَابِ آئِمَّةٍ ۖ

”بلاشبہ وہ جو کافر ہیں اور روکتے ہیں اللہ کے راستے اور اُس مسجد حرام سے جسے ہم نے تمام لوگوں کے لئے قرار دیا ہے، برابر ہیں اُس میں مجاور وہاں کے اور باہر سے آنے والے اور جو اُس میں ظلم و تعدی کے ساتھ غلط روی کرنا چاہے ہم اسے دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔“

کعبہ پر سب کا برابر سے حق:

[1] حرم الله على الرجال لبس الحرير في الدنيا وشر قهه اليه في الآخرة (تبيان)

”برابر ہیں اس میں مجاور وہاں کے اور باہر سے آنے والے“، یعنی وہاں ملکی اور غیر ملکی کا سوال نہیں ہے [۱] کعبہ پر سب کا حق ہے اور اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ حجاز کا جو بھی فرمان روا ہو، اُسے اپنے کو وہاں کی عبادت گاہوں کا تمام مسلمانان عالم کی طرف سے امین سمجھنا چاہیے لہذا وہاں کی عبادت گاہوں پر اُسے اپنے کسی خاص مسلک یا فرقہ کے مسلط کرنے کا بھی حق نہیں ہے، جب کہ وہاں تمام اسلامی دنیا کے افراد کا برابر حق ہے۔

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ
وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ﴿۲۶﴾ وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَى كُلِّ
ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ﴿۲۷﴾ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي
أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنَ الْبَيْمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعَمُوا
الْبَائِسَ الْفَقِيرَ ﴿۲۸﴾ ثُمَّ لِيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلِيُوفُوا نُدُورَهُمْ وَلِيَبْطِئُوا
بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴿۲۹﴾

”اور جب ہم نے معین کیا ابراہیم کے لئے خانہ کعبہ کی جگہ کو کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور میرے گھر کو پاک رکھنا طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو تو وہ آئیں گے تمہاری آواز پر پیادہ پا اور ہر لاغر سواری پر کہ آئیں گی (وہ سواریاں) ہر دور و دراز راستے سے تاکہ لوگ اپنے فائدوں کے لئے حاضر ہوں اور اللہ کے نام کا ورد کریں مقررہ دنوں میں، اس پر کہ اُس نے انہیں چوپالیوں سے روزی عطا کی تو کھاؤ اُن سے اور محتاجو، غریبوں کو بھی کھاؤ، پھر وہ اپنے جسم کی کثافت دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں اور اُس قدیم گھر کا طواف کریں۔“

سب سے پہلے ندائے حج اور اس کی تاثیر کے لئے اللہ کی ضمانت:

یہ ”ندائے حج“، گویا ”صدا بصرہ“ کے طور پر بلند کرائی گئی تھی جب کہ مکہ کے گرد و پیش آبادی نہ تھی مگر خالق نے اُسی وقت اس کی اثر انگیزی کی ضمانت کر لی تھی کہ نتیجے کے اعتبار سے یہ صدا بصرہ نہ ہوگی بلکہ دائمی اثر کی مالک ہوگی، اس آواز پر سعید رحیم لبیک کہیں گی، اُسی دور میں نہیں بلکہ قیامت تک اس آواز پر آنے والے آئیں گے۔

”لاغر سواریوں پر“ کیا مطلب؟ یعنی تیز رفتار سواریوں پر چونکہ اس زمانہ میں مرکب از قسم شتر وغیرہ ہوتے تھے اور وہ جتنے دبلے ہوتے تھے، اتنی رفتار ان کی تیز ہوتی تھی، اس لئے بطور کنایہ تیز رفتاری کے اظہار کے لئے ضامر یعنی لاغر کی لفظ لائی گئی ہے۔

اب دور زمانہ کے لحاظ سے جس طرح ”دور دراز“ کے مفہوم میں وسعت ہوتی جائے گی، یہاں تک کہ موجودہ دور میں وہ کرہ کے

[۱] العاکف المقیم فیہو الباد الذی نیبتا بہ من غیر اہلہ (مجمع البیان) سواء بینہم النزول والدخول الحرم (علی بن ابراہیم)

دوسرے رخ یعنی امریکہ کو اپنے دائرہ میں لیتا ہے اور کسی مستقبل کے وقت میں جب دوسرے سیاروں پر قانون اسلام کے ماننے والے بسنے لگیں تو اس دور دراز والی پیشین گوئی کا دامن نہیں بھی اپنے اندر لے لے گا اور علی کل ضامر میں جو تیز رفتاری مضمحل ہے، اس کے حدود بڑھتے ہوئے موٹروں تک آئے اور پھر ہوائی جہازوں تک پہنچے اور اس سے بھی تیز رفتار مثلاً راکٹ پر سفیر ہونے لگے تو وہ بھی اس لفظ کے حدود میں داخل ہوگا۔

”بیت عتیق“ کے ایک لغوی معنی تو یہی ہیں جیسے ہم نے ترجمہ کیا ہے ”قدیم گھر“ لیکن ایک روایت میں ہے کہ عتیق کی لفظ عتیق سے ہے جس کے معنی آزد کرنے کے ہیں، چونکہ طوفانِ نوح میں غرق ہونے سے یہ جگہ محفوظ اور عذابِ الہی سے آزد رہی، اس لئے اس کا نام ”البیت العتیق“ ہوا [۱] اس کے علاوہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ کافروں کے تسلط سے آزد رہا اور یہ بھی کہ اُسے تباہ کرنے کو مششوں کو ناکام کر کے بچاتا رہا۔ ان اقوال کو علامہ طبری نے مجمع البیان میں درج فرمایا ہے۔

ذٰلِكَ ۙ وَ مَنۢ يَّعۡظُمُ حُرْمَتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّہٗ عِنۡدَ رَبِّہٖ ۙ وَاٰجَلَتۡ لَکُمُ الْاَنْعَامُ
اِلَّا مَا يَتَنَلٰ عَلَیۡکُمۡ فَاجْتَنِبُوۡا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوۡثَانِ وَاَجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوۡرِ ۗ
حُنَفَآءَ لِلّٰہِ غَیۡرَ مُشْرِکِیۡنَ بِہٖ ۙ وَ مَنۢ یُّشۡرِکۡ بِاللّٰہِ فَکَاۡتَمَآ خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ
فَتَخَطَفۡہُ الطَّیۡرُ اَوْ تَهۡوِیۡ بِہِ الرِّیۡحُ فِیۡ مَکَانَ سَمِیۡقٍ ۝۳۱

”یہ بات ہے، اور جو اللہ کی حرمتوں کی عزت کرے تو اُس کے لئے اُس کے پروردگار کے نزدیک وہ بہتر ہے اور تمہارے لئے چوپائے حلال ہیں سوا اُس کے کہ جو تم سے بیان کیے جاتے رہتے ہیں تو بتوں کی ناپاکی سے پرہیز کرو اور جھوٹی باتوں سے پرہیز کرو، اللہ کے دین حنیفی کو اختیار کرتے ہوئے، اُس کے ساتھ شرک نہ کرنے والے ہو کر اور جو اللہ کے ساتھ شرک کرے وہ گویا آسمان سے گرا تو اُسے اچک لیں پرندے یا ہوائیں اُسے کسی دور دراز جگہ پر پھینک دیں۔“

اللہ کی حرمتوں کی عزت:

”اللہ کی حرمتوں کی عزت“ اس کے معنی عموماً یہ کہے گئے ہیں کہ جن چیزوں کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے ان کے ترک کا پابند رہے [۲] لیکن جب غور کیا جاتا ہے تو اس آیت میں جو حرمتوں کی لفظ ہے، وہ اس کے بعد والی آیت میں شعاع کی لفظ سے معنی میں متحد ہے چنانچہ بعض اکابر اہل سنت نے حرمت اللہ کا ترجمہ ہی شعاع اللہ کے ساتھ کیا ہے [۳] اور حقیقت میں لغت کے لحاظ سے بھی حرام اور محترم دونوں کا مادہ ایک ہی ہے بلکہ جتنی الفاظ اس قسم کی ہیں، اُن کے ساتھ کوئی شرعی حکم حرمت و ابستہ ہے جیسے بیت حرام اور مسجد حرام، اُس میں محترم ہونے کے لحاظ سے بھی حرمت ہے اور

[۱] انما ستمی عتیقا لانه اعتق من الغرق (علی بن ابراہیم)

[۲] بان یترک ما حرّم اللہ (تبیان)

[۳] ہر کہ تعظیم کند شعاع خدا را (شاہ ولی اللہ)

پھر اُس میں شکار حلال ہے۔ اشہر حُرْمہ جس کے ذیل میں ہم کہتے ہیں ”محرم الحرام“ کیا معنی؟ کہ اُس میں جدال و قتال حرام ہے۔ عورتوں میں محرم اور نامحرم، محرم کون؟ جن سے نکاح حرام ہے، اس طرح حُرْمَاتِ اللہ میں قانونِ الہی کی حرمت بھی داخل ہے جس کے تحت میں محرمات یعنی معہیات سے بچنے کی پابندی ہے اور وہ محترم چیزیں جن کی اہانت حرام ہے، انہی کو بعد کی آیت میں ”شعائر اللہ“ کہا گیا ہے۔

قول الزور کا ترجمہ ”جھوٹی بات“ لغت کے لحاظ سے ہے لیکن ہماری قدیم تفسیر میں یہ ہے کہ قول الزور سے گانا مراد ہے [۱] اور بتوں کی ناپاکی کے ساتھ اس کا جوڑا اس لحاظ سے ہو سکتا ہے کہ شاید وہ پوجا گانے بجانے کی صورت سے کرتے تھے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر قسم کی زبان و دہن کی بے راہ روی جو خالق کو ناپسند ہے، اس سے مراد وہ اس طرح اُس کا ایک عام مفہوم ہو جائے جس میں جھوٹ اور گانا دونوں داخل ہیں۔ [۲]

پھر جھوٹ میں خاص اہمیت عدالت میں جھوٹی گواہی کی ہے اور اس کا بُت پرستی کے ساتھ جوڑ گناہ کی اہمیت دکھانے کے لئے ہے جیسے کہ ایک مقام پر والدین کے ساتھ حسن سلوک کو توحیدِ الہی کے ساتھ مقرون کیا گیا ہے اور سورۃ نساء کی پہلی آیت میں رشتوں کے لحاظ کو تقوائے الہی کے ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

اس کے متعلق حضرت پیغمبر خدا ﷺ کا ارشاد وارد ہوا ہے۔ [۳]

ذٰلِكَ ۙ وَ مَنۢ يُعۡظِمۡ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنۢ تَقْوٰی الْقُلُوۡبِ ۝۳۱

”یہ ہے حقیقت حال اور جو اللہ کے شعائر کی تعظیم و تکریم کرے تو وہ عظمتِ الہی سے دلوں کے تاثر لازمی نتیجہ ہے۔“

شعائرِ الہیہ کی تعظیم کا حکم:

شعائر یعنی وہ علامتیں جن سے ذہنِ خدا کی طرف متوجہ ہو، جس طرح ”علامت“ کی لفظ علم سے ہے کہ وہ علم کا ذریعہ ہوتی ہے اسی طرح شعائر کی لفظ شعور سے ہے جو علم و ادراک ہی کے ہم معنی ہے۔

”دلوں کے تاثر کا لازمی نتیجہ ہے“ یا ”دلوں کے تاثر ایک جزء ہے“۔ یہ دونوں ہی مفہوم من سے پیدا ہو سکتے ہیں [۴] اور اصل عملی پرہیز گاری کو اس وقت تک نہ اعتبار ہے، نہ اُس میں استحکام جب تک اس کے پس پشت دلوں کا احساس نہ ہو، اس لئے بھی تقویٰ کا بڑا تعلق دل ہی کے ساتھ ہے جو اصطلاح قرآنی میں مرکز شعور کا نام ہے، نہ کہ وہ دل جس کا ”ناگہانی موت“ میں انگریزی نام لے کر کہا جاتا ہے کہ فیل ہو گیا۔ شعائر اللہ کی تعظیم کا قرآنی حکم اُس تصور کی عمارت کا مسمار کرنے والا ہے جو دینی تقدس کے مرکزوں کی تعظیم اور خصوصیت سے بوسہ لینے کے وقت ایک حلقہ سے ”شرک، شرک“ کی آوازیں بلند کرتا ہے۔

[۱] قول الزور الغناء (علی بن ابراہیم)

[۲] روی اصحابنا ائہ یدخل فیہ الغناء و سائر الاقوال المنہیۃ بغیر حق (تبیان)

[۳] روی ایمن بن حزیم عن رسول اللہ ائہ قام خطیباً فقال: ایہا الناس عدلت شہادۃ الزور بالشک باللہ ثم قرأ۔ فاجتنبوا الزجس من الاوثان و اجتنبوا قول الزور۔ یرید ائہ قد جمع فی الآیۃ بین عبادة الوثن و شہادۃ الزور (مجمع البیان)

[۴] اضافة التقویٰ الی القلوب لان خفیفة التقویٰ تقویٰ القلوب (مجمع البیان)

لَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ فَحِلُّهَا إِلَىٰ الْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴿٣١﴾
 ”تمہارے لئے ان میں فائدے ہیں ایک مقرر مدت تک، پھر ان کی جگہ اسی قدیم گھر کی طرف ہے۔“

حیواناتِ قربانی مجملہ شعائر اللہ:

چونکہ شعائر اللہ کے ایک فرد کی خصوصیت کے ساتھ اسی سورہ میں نام لیا گیا ہے اور وہ قربانی کے جانور ہیں تو بظاہر اس آیت کا مضمون انہی سے متعلق ہے یعنی قربانی کے جانوروں کے احترام کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ذبح ہونے سے پہلے انہیں اچھوتا سمجھ لیا جائے کہ ان سے فائدہ اٹھانا بار برداری یا دودھ سے غذا وغیرہ کی شکل میں جائز نہ ہو بلکہ ذبح یا نحر ہونے کے وقت تک ان سے فائدے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔^[۱]

البیت العتیق یعنی خانہ کعبہ جس کی تشریح پہلے ہو چکی ہے اور یہاں مقصود اُس سے خاص خانہ کعبہ نہیں بلکہ اس کے حدود ہیں جسے بظاہر الیٰ کی لفظ سے ظاہر کیا گیا ہے جس سے ترجمہ ہوا ”قدیم گھر کی طرف“ کیوں کہ بعض صورتوں میں قربانی خاص کعبہ کے پاس یعنی مکہ ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں منیٰ میں جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں ہے۔^[۲]

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةٍ
 الْأَنْعَامِ ۗ فَالْهُكْمُ إِلَهُ ۖ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ ﴿٣٢﴾ الَّذِينَ إِذَا
 ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَّتْ قُلُوبُهُمْ وَالصَّابِرِينَ عَلَىٰ مَا أَصَابَهُمُ الصَّلَاةُ ۖ وَحَمَّا
 رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ﴿٣٥﴾

”اور ہر قوم کے لئے ہم نے ایک عبادت کا طریقہ مقرر کیا ہے تاکہ وہ اللہ کا نام لیں جو پالیوں پر جو اللہ نے ان کی روزی کے لئے مقرر کیے ہیں تو تمہارا خدا بس ایک خدا ہے لہذا اُسی کی بارگاہ میں سر جھکاؤ اور خوش خبری دو ان لوگ نے والوں کو کہ جب اللہ کا ذکر ہوتا ہے تو اُن کے دل دہل جاتے ہیں اور جو صبر کرنے والے ہیں اُن مصائب پر جو انہیں درپیش ہوں اور جو نماز ادا کرتے ہیں اور جو ہم نے انہیں عطا کیا ہے، اُس میں سے خیرات کرتے ہیں۔“

وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ ۗ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ
 عَلَيْهَا صَوَافٍ ۗ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۗ
 كَذَلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٣٦﴾

[۱] منافعہا کر کوب ظہرہا و شرب البانہا اذا احتاج اليہا و هو المودى عن ابى جعفر (تبیان) الی اجل مسمی وقت نحرہا (جلالین)

[۲] قال اصحابنا ان كان الهدى للحج فمحلہ منیٰ وان كان للعبرة المفردة فمحلہ مکة قبالة اعکبة (مجمع البیان)

”اور قربانی کے اونٹ، اُنہیں ہم نے تمہارے لئے اللہ کے شعائر میں سے قرار دیا ہے، تمہارے لئے اُن میں بھلائی ہے تو اللہ کا نام لو اُن کو لائے گا کرکھڑے کرنے کی حالت میں تو جب وہ کروٹ کے بھل زمین پر گر جائیں تو کھاؤ، اُن میں سے اور ہر قسم کے محتاجوں کو، جو دستِ سوال دراز نہیں کرتے اور جو دستِ سوال دراز کرتے ہیں کھلاؤ، اسی طرح ہم نے اُنہیں تمہارے قبضہ میں دیا ہے، شاید کہ تم شکر گزار ثابت ہو۔“

”کھاؤ“ اور ”کھلاؤ“ یہ دونوں کوئی حاکمانہ فرمان نہیں ہیں کہ کھانا اور کھلانا بھی احکام حج میں سے ہو۔ اصل واجب تو قربانی کا مصرف کیا ہو؟ اس کے لئے یہ بطور اجازت کہا گیا ہے یعنی تم خود بھی کھا سکتے ہو اور دوسروں کو کھلا بھی سکتے ہو اور اس اجازت کی صراحت ضرورت اس لئے ہوئی کہ زمانہ جاہلیت میں قربانی کے کھانے کو حرام سمجھا جاتا تھا۔^[1]

لَنْ يَتَّالِ اللَّهُ لُحُومَهَا وَلَا دِمَآؤَهَا وَلَكِنْ يَتَّالِيهِ التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ ط كَذَلِكَ

سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَيْكُمْ ط وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِينَ ﴿٢٥﴾

”ان کے گوشت اور خون ہرگز اللہ کو نہیں پائیں گے مگر تمہاری پرہیزگاری اسے پالے گی۔ اس طرح ہم نے تمہارے قبضہ میں اُنہیں دیا ہے تاکہ تم اللہ کی بڑائی کو محسوس کرو، اس بات پر کہ اُس نے تمہیں صحیح راستہ دکھایا اور خوش خبری دو نیک اعمال والوں کو۔“

اصل چیز قربانی کی ظاہری شکل نہیں بلکہ اصل خوشنودی خدا کی فکر:

”ان کے گوشت اور خون ہرگز اللہ کو نہیں پائیں گے، یعنی اسے رسم و عادت کے طور پر انجام دینے سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ حکم الہی کی تعمیل اور رضائے الہی کی تحصیل مقصود ہونا چاہیے۔“

یہ حکم اس نذر و نیاز کے کھانے پر بھی حاوی ہے جو مقربین الہی کی طرف نسبت دے کر تیار کیا جاتا ہے اور دسترخوان پر چننا جاتا ہے، اس میں بھی ان ظاہری رسموں کو بنیادی حیثیت حاصل نہیں ہے، نہ کھانے کی نوعیت کو بلکہ اصل چیز خلوص اور اُن ہستیوں کے ساتھ قلبی لگاؤ ہے جس کا لازمی نتیجہ ان کی بیرونی احساس ہونا چاہیے۔ وہاں بھی ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کو تمہاری ان میٹھی پوریوں سے ذائقہ اندوز ہونا نہیں ہے اور سیدہ سلام اللہ علیہا کو تمہاری اس صحت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت عباسؓ کو اس حاضری کی خواہش نہیں ہے بلکہ اصل چیز ان ہستیوں کے ساتھ دلی تعلق کا احساس ہے جو انسان کی زندگی میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے مگر جس طرح اس قرآنی اعلان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ قربانیاں بے کار ہیں اور بند کر دینے کے قابل ہیں اسی طرح کسی مصلح کا اس کہنے سے کہ یہ نذر و نیاز کا کھانا معصومین تک نہیں پہنچتا، یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس نذر و نیاز کا مخالف ہے اور اس سب کو بند کر دینے کا حامی ہے، بلکہ اُس قرآنی آواز کا مطلب ہوگا کہ ان قربانیوں کے ساتھ تقویٰ کا جو ہر ہونا چاہئے۔ اُسی طرح نذر و نیاز کے لئے یہ کہنے کا مطلب ہوگا کہ ان نذروں اور نیازوں کے ساتھ اُن ہستیوں کی عظمت کا احساس اور اُن کے

[1] هذا اخذ ولبيس بامر لان اهل الجاهلية كانوا يحرّمونها على نفوسهم (مجمع البيان)

حقوق کا تصور ہونا چاہیے جن کے نام پر یہ نذر کی جاتی ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُدْفِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُورٍ ﴿٣٨﴾
 ”بلاشبہ اللہ دفاع کرتا ہے اُن کی طرف سے جو ایمان لائیں، بلاشبہ اللہ کسی خیانت کرنے والے ناشکرے کو دوست نہیں رکھتا۔“

یاد رکھنا چاہیے کہ خداوند کریم نے اپنی طرف کے حکم جہاد کو دفاع کی لفظ سے تعبیر کیا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ جہاد کے معنی جارحانہ جنگ کے نہیں ہیں۔

أَذِنَ لِلَّذِينَ يُقْتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظَلَمُوا ۗ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ﴿٣٩﴾ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَهَادِمَتِ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذَكَّرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿٤٠﴾ الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَاللَّهُ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ﴿٤١﴾

”اجازت دی جاتی ہے اُنہیں جن سے جنگ کی جارہی ہے اس بنا پر کہ اُن پر ظلم ہوا ہے، اور بلاشبہ اللہ اُن کی مدد پر قادر ہے، وہ جو اپنے گھروں سے نکالے گئے بغیر کسی جرم و خطا کے سوا اس کے کہ اُن کا قول یہ تھا کہ ہمارا مالک اللہ ہے اور اگر نہ ہوتا اللہ کا دفع کرنا، بعض کو بعض کے ساتھ تو گرادیئے جاتے راہیوں کے ٹھکانے اور گرجے اور یہودیوں کے عبادت کدے اور مسجدیں جن میں اللہ کے نام کا بہت ورد ہوتا ہے اور یقیناً اللہ مدد کرے گا اُس کی جو اس کی مدد کرے، بلاشبہ اللہ طاقت والا ہے، غالب آنے والا، وہ جنہیں ہم اگر اقتدار عطا کریں زمین میں تو وہ نماز کی پابندی کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور نیک باتوں کی ہدایت کریں گے اور بُرے کاموں سے روکیں گے اللہ کے ہاتھوں میں تمام باتوں کا انجام ہے۔“

دفاعی جنگ کی اجازت اور اس کی بین الاقوامی طور پر ضرورت:

یہ آیت اسلام کے قانون جہاد اور اس کے شرائط میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے، اس کے قبل کی آیت میں جہاد کو دفاع کے نام سے تعبیر کر کے جس طرف ضمنی اشارہ تھا کہ کہ ابتدائے جنگ دوسری طرف سے ہے، اُسے اس آیت میں صاف طریقہ پر ظاہر کیا گیا ہے ان لفظوں میں کہ اَذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ یہاں یقاتلون مجہول کا صیغہ ہے، اگر یقاتلون ہوتا (”ت“ کے کسرہ کے ساتھ) تو وہ معرف کا صیغہ ہوتا، اُس صورت

میں یہ معنی ہوتے کہ انہیں اجازت دی جاتی ہے جن سے جنگ کی جارہی ہے اس سے ظاہر ہے کہ جنگ کی ابتداء کرنے والے دوسرے ہیں۔ پھر اگر یہ ہوتا کہ انہیں حکم یا جاتا ہے تو یہ سمجھنے کی گنجائش تھی کہ ان شرائط کے نہ ہونے کی صورت میں بھی جنگ جائز ہے، ہاں واجب نہیں ہے، مگر اذن کی لفظ جس سے یہ ارشاد شروع ہوتا ہے بتلاتی ہے کہ بغیر اس کے جنگ جائز ہی نہیں ہے کیوں کہ اذن کے مقابلہ میں ممانعت ہوتی ہے، صرف عدم حکم نہیں مطلب یہ ہے کہ اب تک جنگ ممنوع تھی۔ باوجودیکہ مظالم کا سلسلہ جاری تھا جو باہم کی لفظ سے ظاہر ہے کہ پھر بھی ابتداء جنگ کی ادھر سے نہ تھی لہذا جنگ کی اجازت نہ ملی تھی۔ اب چونکہ ابتداء جنگ کی ادھر سے ہوگئی تو اب جنگ کی اجازت ہو رہی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سلسلہ آیات جہاد کی سب سے پہلی آیت ہے۔ اب حتی آیات قرآن میں قتال کے متعلق ہیں، وہ سب دوران سلسلہ جنگ سے متعلق ہیں۔ آغاز جنگ سے ان میں کوئی بھی آیت متعلق نہیں ہے۔ اسی لئے میں نے کہا ہے کہ یہ آیت جہاد کے بارے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

وَإِنْ يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَعَادٌ وَثَمُودٌ ﴿٣٢﴾ وَقَوْمَ إِبْرَاهِيمَ
 وَقَوْمَ لُوطٍ ﴿٣٣﴾ وَأَصْحَابَ مَدْيَنَ ۖ وَكَذَّبَ مُوسَىٰ فَأَمَلَيْتُ لِلْكَافِرِينَ ثُمَّ
 أَخَذْتُهُمْ ۖ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿٣٤﴾

’اور اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو ان کے پہلے جھٹلایا ہے نوح علیہ السلام کی قوم اور عاد اور ثمود اور ابراہیم علیہ السلام کی قوم اور لوط علیہ السلام کی قوم اور مدین کے باشندوں نے اور موسیٰ کو جھٹلایا گیا تو میں نے کافروں کو مہلت دی اور پھر ان کو گرفت میں لے لیا تو کیسی میری سزا تھی‘۔

مخملہ اور طریقوں کے جو قرآن میں اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے اختیار کیے گئے ہیں، ایک طریقہ یہ ہے کہ جو متعدد آیات قرآنی میں مختلف مقامات پر ہے، یعنی یہ کوئی نئی بات تھوڑی ہے۔ اس کے پہلے برابر ہر پیغمبر کو جھٹلایا گیا تو جو ہمیشہ ہوتا رہا، وہی آپ کے ساتھ ہو رہا ہے۔ [1]

ہر جگہ تکذیب کی نسبت اس پیغمبر کی قوم کی طرف دی گئی ہے مگر موسیٰ کے یہاں تکذیب کی نسبت قوم کی طرف نہیں ہوئی بلکہ صیغہ مجہول کے ساتھ تکذیب کے وقوع کا ذکر کیا، اس لئے کہ موسیٰ کی قوم والے تو بنی اسرائیل تھے، انہوں نے بعد میں پریشان بہت کیا جس کے تذکرے قرآن مجید میں جا بجا ہیں مگر شروع میں جناب موسیٰ علیہ السلام پر ایمان انہوں نے ہی اختیار کیا، تکذیب کرنے والے فرعون اور اس کی قوم والے تھے نہ کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم والے۔ [2]

فَكَأَيُّ مِّنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فِيهَا خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَبُرِّ مُعْتَلَّةٍ
 وَقَصْرِ مَشِيدٍ ﴿٣٥﴾

[1] قال لنبييه مسلينا له تكذيب قوم له وقله قبو لهم منه (تبيان)

[2] ثم قيل وقوم موسى لان قوم بني اسرائيل وكانوا امنوا به واما كذب به قوم فرعون (تبيان)

”تو کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے نیست و نابود کر دیا اس عالم میں کہ وہ ظالم تھے، اب وہ گری ہوئی ہیں اپنی چھتوں پر اور کتنے کنویں ہیں جو بے کار پڑے ہیں اور مضبوط محلات“۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ
بِهَا ۚ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ﴿٣٦﴾
وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ ۗ وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ
سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ﴿٣٧﴾

”کیا وہ اطراف زمین میں چلے پھرے نہیں ہے کہ اُن کے لئے ایسے دل و دماغ ہوتے جن سے وہ سمجھتے یا کان جن سے وہ سنتے کیوں کہ اصل اندھا پن آنکھوں کا نہیں ہے مگر اندھا پن تو دلوں کا ہے جو سینوں کے اندر ہوتے ہیں اور وہ آپ سے عذاب کی جلدی کرتے ہیں اور اللہ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہ کرے گا اور بلاشبہ ایک دن تو آپ کے پروردگار کے یہاں کا تم لوگوں کے شمار کیے ہوئے برسوں کے برابر ہے“۔

اللہ کے یہاں کا ایک دن ایک ہزار سال کے برابر:

جلدی اسے ہوتی ہے جسے وقت کے نکلنے کا اندیشہ ہو، خالق کو جلدی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اُس کے تو سب کام حکمت کے مطابق ہوتے ہیں، لوگوں کی خواہشوں یا ان کے طعن و تشنیع سے متاثر ہو کر نہیں ہوتے، جو اُس کا وعدہ ہے، وہ پورا ہو کر رہے گا، چاہے کتنی ہی مدت گزر جائے، بہر حال اُس کے پورے ہونے کا یقین رکھنا چاہیے۔

اگر اسے پیش نظر رکھا جائے تو ظہور مہدی آخر الزمان علیہ السلام کے طول مدت پر کوئی وحشت و پریشانی پیدا ہو سکتی۔ تمہاری طویل سے طویل مدت اس کے حساب سے مختصر ہی ہے، اسے یوں کہا گیا ہے کہ ”ایک دن پروردگار“ کے یہاں کا اس کے شمار کئے ہوئے ہزار برس کے برابر ہے“۔

شاہ ولی اللہ نے اسے کچھ اور طرح سمجھا ہے، وہ کہتے ہیں:

”یعنی اگر خواہد کا ہزار سال دریک روز تمام کند، س امہال بسبب عجز نیست بلکہ بنا بر مصالحی کہ جزا و کسی نمی داند“ (فتح الرحمن)

یہاں ان کے فرزند شاہ عبدالقادر نے بھی ان کا تتبع کیا ہے وہ لکھتے ہیں: ”یعنی ہزار برس کا کام ایک دن میں کر سکتا ہے“ (موضح القرآن)

اس کے برخلاف بعض مفسرین نے اُس کا مطلب یہ لیا ہے کہ آخرت کا ایک دن عذاب کا دنیا کے ہزار برس کے برابر ہوتا ہے۔^[1]

[1] ان یوما عند ربك من ايامه الآخرة من العذاب كالف سنة مما تعدون في الدنيا. (جلالین)

بہر صورت جہاں تک بیان قرآنی کے اندر سے ظاہر ہوتا ہے، یہ ایک دن اور ہزار سال صرف قلت و طول مدت کی تعبیر ہیں۔ اس میں ایک اور ہزار یا دن اور سال کو بنیادی مقصدیت حاصل نہیں ہے، اس لئے بعض مذاہب باطلہ اور بالخصوص بہائی اور قادیانی جماعت نے ان اعداد و شمار پر جو عمارتیں کھڑی کی ہیں، وہ کسی مستحکم بنیاد پر مبنی نہیں ہیں۔

وَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ أَمَلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ أَخَذْنَاَهَا ۖ وَالْيَوْمِصِيرُ ﴿٥٨﴾
 ”اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں میں نے مہلت دی اس عالم میں کہ وہ ظلم و ستم کی مرتکب تھیں پھر میں نے ان کو گرفت میں لے لیا اور آخر میں رجوع تو میری ہی طرف ہوتا ہے۔“

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿٥٩﴾ فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
 لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿٦٠﴾ وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا مُعْجِزِينَ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ
 الْجَحِيمِ ﴿٦١﴾

”کہیے کہ اے لوگو! میں تو بس تمہارے لئے کھلا ہوا تنبیہ کرنے والا ہوں تو جو ایمان لائیں اور نیک اعمال بجالائیں، اُن کے لئے بخشش ہے اور عزت کے ساتھ روزی اور جو ہمارے آیات کے مقابلہ میں عاجز کرنے کی کوشش کریں تو یہ دوزخ والے لوگ ہیں۔“

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَلَّى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي
 أُمْنِيَّتِهِ ۖ فَيَنْسُخُ اللَّهُ مَا يُلْقَى الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكُمُ اللَّهُ أَيْنَهُ ۖ وَاللَّهُ عَلِيمٌ
 حَكِيمٌ ﴿٦٢﴾ لِيَجْعَلَ مَا يُلْقَى الشَّيْطَانُ فِتْنَةً لِلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ
 وَالْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ ۖ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ﴿٦٣﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ
 أُوتُوا الْعِلْمَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَيُؤْمِنُوا بِهِ فَتُخْبِتَ لَهُ قُلُوبُهُمْ ۖ وَإِنَّ اللَّهَ
 لَهَادِ الَّذِينَ آمَنُوا إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿٦٤﴾

”اور انہیں بھیجا ہم نے آپ کے پہلے کوئی رسول اور نہ نبی مگر یہ کہ جب اس نے توقعات باندھے تو شیطان نے اس کی توقع (کے پورے ہونے) میں دراندازی کی تو اللہ ختم کر دیتا ہے اُسے کہ جو شیطان دراندازی کرتا ہے، پھر مضبوط کرتا ہے اپنی نشانوں کو اور اللہ جاننے والا ہے، ہر کام ٹھیک ٹھیک انجام دینے والا تاکہ وہ اُسے کہ جو شیطان دراندازی کرتا ہے قرار دے آزمائش کا ذریعہ، اُن کے لئے جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جن کے دل سخت ہیں

اور بلاشبہ ظالم لوگ بڑی سخت تفرقہ اندازی میں ہیں اور تاکہ وہ جنہیں علم عطا ہے جائیں کہ وہ آپ کے پروردگار کی طرف سے حق ہے تو وہ اُس پر ایمان لائیں تو اس کے لئے ان کے دل کے خشوع و خضوع سے جھک جائیں اور بلاشبہ اللہ انہیں کہ جو ایمان لائیں سیدھے راستے تک پہنچانے والا ہے۔“

پیغمبروں کی تمناؤں میں شیطان کی دراندازی:

جو ترجمہ ہم نے کیا ہے، اس میں نہ کوئی پیچیدگی ہے اور نہ کوئی پہلو ایسا ہے جو شان رسالت کے خلاف ہو مگر جمہور اہل سنت نے اس کی شان نزول جو تخریر کی ہے، اس میں شان رسالت پر بڑا حرف آتا ہے اور اس کے لئے ترجموں میں بھی بڑا خلفشار نظر آتا ہے۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں: چوں آرزوئی بخاطر..... افگند شیطان چیزیں را در آرزوی پس دور می کند خدا آنچه شیطان انداختہ ست باز محکم می کند خدا آیات خود را۔

جب کوئی آرزو دل میں کرتا ہے تو شیطان ڈال دیتا ہے کوئی چیز اُس کی آرزو میں تو دور کر دیتا ہے خدا سے جو شیطان نے ڈالا ہے پھر مضبوط کر دیتا ہے اپنی آیات کو۔

”جس وقت آرزو کرتا تھا، ڈال دیتا تھا شیطان بیچ آرزو اُن کی کہ پس مقوف کر دیتا ہے اللہ جو ڈالتا ہے شیطان“۔
شاہ ولی اللہ نے اس کی تشریح یوں فرمائی ہے:

مثلاً آن حضرت ﷺ بخواب دیدنا کہ ہجرت کردہ اند بزمینی کہ نخل بسیار دار و پس و و ہم۔ بجانب یمامہ در ہجرت رفت و در نفس الامر مدینہ بود و مثلاً آن حضرت ﷺ بخواب دید نہ کہ بمکہ آمدہ اند و حلق و قصر می کنند پس و ہم آمد کہ در ہماں سال این معنی واقع شود و در نفس الامر بعد از سالہای چند متحقق شد و در امثال این صورت امتحان مخلصان دو منافقان در میان می آید (فتح الرحمن)

مثلاً حضرت ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ ایک ایسی زمین کی طرف ہجرت فرمائی ہے جہاں کھجور کے درخت بہت ہیں تو حضرت ﷺ کو یمامہ کی طرف ہجرت کا تصور ہوا اور واقع میں وہ زمین مدینہ تھی اور مثلاً حضرت ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ مکہ میں آئے ہیں اور حلق و تقصیر فرما رہے ہیں تو خیال ہوا کہ یہ اسی سال ہوگا اور درحقیقت وہ چند سال کے بعد وقوع میں آیا اور ایسی صورت میں نرے کھرے مسلمانوں اور منافقوں کا امتحان ہو جاتا ہے۔

اس کا تتبع ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر نے کیا ہے، وہ لکھتے ہیں: ”نبی ﷺ کو ایک حکم اللہ سے آتا ہے، اس میں ہرگز تفاوت نہیں ہے اور ایک اپنے دل کا خیال اس میں در آئے، کبھی خیال ٹھیک پڑا، کبھی نہ پڑا، جیسے حضرت ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ مدینہ سے مکہ میں گئے، عمرہ کیا، خیال میں آیا کہ اب کی لڑائی میں۔ اُس میں نہ ہوا، پھر اللہ جتا دیتا ہے۔“ (موضح القرآن)

ان دونوں بزرگوں کے ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ جو خواب پیغمبر خدا ﷺ دیکھتے تھے، اس کے ساتھ جو خیال یا تصور آپ کو ہوتا تھا اسے قرآن میں تمثیل کی لفظ سے ادا کیا ہے۔ اس صورت میں القی الشیطان فی امدیۃ کا مطلب ہوگا کہ وہ خیال و تصور معاذ اللہ شیطان کا پیدا

کیا ہوا ہوتا تھا یا پھر یہ مطلب لیا جائے کہ اُس خواب ہی کو اللہ نے تمہاری فطرت سے یاد کیا ہے تو یہ نتیجہ ہوگا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب ان کی آرزوؤں کی پیداوار ہوتے تھے اور پھر اُس خواب کی تعبیر جو آپ کے ذہن میں آتی تھی وہ نعوذ باللہ شیطان کی کارفرمائی سے ہوتی تھی مگر جو حقیقت ایمانی ہمارے ذہن میں ہے، وہ یہ ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سمجھ میں نہ آئے مگر شاہ صاحبان کا تصور یہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس کا خواب کا مطلب سمجھنے میں غلطی کر جاتے تھے مثلاً ہجرت کے لئے آپ نے یہ خیال تھا کہ وہ یمامہ کی طرف ہوگی اور مکہ میں داخلہ کے لئے سمجھا تھا کہ اسی سال ہوگا مگر اس صورت میں قرآن کے بعد والے ارشاد کا کیا مطلب ہے کہ اللہ شیطان کی دراندازی کو ختم کر دیتا ہے اور پھر اپنی آیات کو مستحکم کر دیتا ہے اور جب کہ بخیاں شاہ صاحب قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ وہ غلط تصور شیطان کی طرف سے تھا تو پھر خالق اسے کیوں کہہ رہا ہے کہ یہ اللہ کی طرف مومنوں کا امتحان تھا اور پھر یہ ارشاد کیوں کر درست ہے کہ اللہ الحق من ربکم وہ آپ کے پروردگار کی طرف سے ایک حق بات تھی، جب کہ ان کے نزدیک وہ تصور اللہ کی طرف سے تھا ہی نہیں بلکہ وہ معاذ اللہ شیطان کی دسمیہ کاری کا نتیجہ تھا۔ غرض شاہ صاحبان باوجودیکہ اپنی تشریح میں اُس عام غلط روایت سے جو اس آیت کی تفسیر میں کہیں سے آگئی ہے جس کا ذکر ابھی آئے گا، بچے ہیں، پھر بھی موصوفین کی تشریح حقیقت کے مطابق نہیں ہے اور شان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق بھی نہیں ہے۔

لیجئے! اب جل تو جلال تو، آئی بلا کونال تو، حضرتین جلالین صاحبان کی زبان سے آیت کی تشریح اُس شان نزول کے ساتھ سن لیجئے، جس سے شاہ صاحبان نے اپنی گزشتہ تشریح میں بچنے کی کوشش کی تھی وہ لکھتے ہیں:

اذا تممتی قرأ القی الشیطان فی امتیہ قرء ته مالیس من القرآن ثم یرضاه المرسل الیہم (نعوذ باللہ من ذلک)
”جب وہ (نبی اور رسول) تمنا کرتا ہے کتاب الہی پڑھتا ہے“

شیطان اُس کی تمنا میں یعنی پڑھنے میں ڈال دیتا ہے ایسی چیز جو اس کتاب کا جز نہیں ہے جس سے وہ لوگ جن کی طرف وہ رسول بھیجا گیا ہے خوش ہو جائیں۔

اب سینے بطور واقعہ اس کی نظیر ان علمائے اہل سنت کی زبان سے:

وقد قرأ النبی ﷺ فی سورة النجم بمجلس من قریش بعد ”افریتم اللات و العزى و منوة الثلاثة الاخرى بالقاء الشیطان علی لسانہ ﷺ من غیر علمہ ﷺ تلک الفرانبع العلی وان شفاعتن لترتجی ففر حوا بذلک ثم اخبرہ جبریل بما القاه الشیطان علی لسانہ من ذلک فحزن فسلی بہ ذہ الا یہ لیطمئن۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ نجم میں قریش کے ایک مجمع کے اندر اس آیت کے بعد کہ کیا تم نے دیکھا ہے لات اور عزی اور ان کے علاوہ تیسرے منات کو شیطان کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر جاری کر دینے سے بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں یہ الفاظ پڑھ دے کر بڑے خوبصورت بلند مرتبہ مجسمے ہیں اور یقیناً ان کی شفاعت کی امید ہے تو اس سے وہ پورا مجمع مشرکین کا بڑا خوش ہوا پھر جبریل علیہ السلام نے آپ کو بتایا کہ شیطان نے آپ کی زبان پر کیا الفاظ جاری کر دیئے تو آپ کو بہت رنج ہوا، اس پر آپ کو تسلی دینے کے لئے یہ آیت اتری کہ آپ کو اطمینان ہو۔

ہمارے مفسرین اسے قطعاً باطل سمجھتے ہیں، قدیم ترین تفسیر میں جو زیادہ تر معصومین علیہم السلام کے احادیث پر مبنی ہے، اسے اہل سنت کی

روایت قرار دیا ہے۔^[۱]

امَّا الْاِحَادِيثُ الْمَرْوِيَّةُ فِي هَذَا الْبَابِ فَهِيَ مَطْعُونَةٌ وَمُضَعَّفَةٌ عِنْدَ اصْحَابِ الْحَدِيثِ وَقَدْ تَضَمَّنَتْ مَا يَنْزَعُ الرَّسْلَ مِنْهُ (مجمع البيان)
اس سلسلہ میں جن حدیثوں کی روایت ہوئی ہے وہ سب علمائے حدیث کے نزدیک مجروح ہیں اور انہیں ضعیف قرار دیا گیا ہے اور ان کا مضمون ایسا ہے جس سے اللہ کے پیغمبر بری ہوتے ہیں۔

وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً أَوْ يَأْتِيَهُمْ

عَذَابٌ يَوْمَ عَقِيمٍ ﴿٥٥﴾

’اور ہمیشہ رہیں گے وہ جو کافر ہیں شک و شبہ میں اُس سے یہاں تک کہ آئے ان پر قیامت اچانک یا آئے ان پر عذاب اُس دن کا جو بڑا سخت ہوگا۔‘

’اس دن‘ سے مراد بعض مفسرین کے خیال میں جنگ بدر والا دن ہے اور بعض نے اُسے قیامت سے متعلق قرار دیا ہے۔^[۲]
بعد والی آیت اگر مقام تنزیل میں اسی سے متصل ہے تو وہ دوسرے خیال کو تقویت پہنچاتی ہے بہر حال اس طرح کی جتنی آیات ہیں، وہ سب عمومیت کے ساتھ تمام کافروں سے متعلق نہیں ہیں، یا وہ کچھ خاص افراد تھے یا اس قسم کے کفار جن کا کفر ارادی اور عنادی تھا جس کی تشریح بعض دوسرے مقامات پر اس تفسیر میں ہو چکی ہے۔

الْمَلِكِ يَوْمَ مِيزَانٍ ۗ يُحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۗ فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي جَنَّاتِ

النَّعِيمِ ﴿٥٦﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿٥٧﴾

’سلطنت اُس صرف اللہ کی ہوگی، وہ اُن کے درمیان فیصلہ کرے گا تو جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے وہ آرام والے بہشتوں میں ہوں گے اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا تو اُن کے لئے ایک بڑا عذاب ہے، ذلیل کرنے والا۔‘

پہلی آیت میں ’وہ اُن کے درمیان فیصلہ کرے گا‘ اب وہ فیصلہ کیا ہوگا؟ وہ یہ جو اس آیت کے ذیل میں اور پھر دوسری آیت میں ہے^[۳]
اس فیصلہ میں بھی دیکھ لیجئے کہ بہشت کو تنہا ایمان سے نہیں بلکہ اس کے ساتھ نیک اعمال سے وابستہ کیا ہے اور عذاب کو بس کفر اور کمندیب آیات سے وابستہ کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس صورت میں اعمال زیر بحث ہی نہیں ہیں یعنی چاہے بظاہر نیک اعمال کتنے ہی ہوں لیکن کفر کی

[۱] ان العامة وردان رسول الله صلى الله عليه واله كان في الصلوة فقر سورة النجم (على بن ابراهيم)

[۲] هو يوم بدر الاخير فيه لقتل كفار كالمريخ العقيم التي لاتاتي بخير او هو يوم القيامة لاليل له (جلالين)

[۳] يفصل بين المؤمن والكافر ثم بين حكمه (مجمع البيان)

صورت میں فیصلہ وہی ہے جو بیان ہوا ہے۔

وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ قُنُوتًا أَوْ مَاتُوا لَيَزُفَّهُمُ اللَّهُ رِزْقًا
حَسَنًا ۗ وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ خَيْرُ الرَّزُقِينَ ﴿٥٨﴾ لِيُدْخِلَنَّهُمْ مُدْخَلًا يَرْضَوْنَهُ ۗ وَإِنَّ اللَّهَ
لَعَلِيمٌ حَلِيمٌ ﴿٥٩﴾

’اور جنہوں نے ہجرت کی اللہ کی راہ میں، پھر قتل ہو گئے یا مر گئے تو ضرور اللہ انہیں عطا کرے گا اچھی روزی اور یقیناً اللہ بہترین روزی عطا کرنے والا ہے۔ وہ ضرور انہیں داخل کرے گا ایسی جگہ جسے وہ پسند کریں گے اور بلاشبہ اللہ جاننے والا ہے، بڑا برداشت کرنے والا‘

ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوِّقِبَ بِهِ ثُمَّ بُعِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ
لَعَفُوفٌ غَفُورٌ ﴿٦٥﴾

’یہ بات ہے [۱] اور جو سزا دے ویسی ہی جیسی اُسے سزا ملی ہے، پھر اُس کے خلاف زیادتی سے کام لیا جائے تو بلاشبہ اللہ اس کی مدد کرے گا، یقیناً اللہ معاف کرنے والا ہے، بڑا بخشنے والا‘۔

پہلے جو ہوا تھا، وہ حقیقتاً سزا نہیں تھا بلکہ ابتدائی ظلم تھا لیکن عرب کا محاورہ اس طرح ہے کہ وہ ایسے موقعوں پر ’’مشاکلتہ‘‘ سے کام لیتے ہیں یعنی جس لفظ سے ایک طرف کے عمل کا ذکر کرتے ہیں، اُسی لفظ سے اس کے مقابل والے ردِ عمل کا ذکر کر دیتے ہیں جیسے: کما تدبیر تدان جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ’’جیسا کرنا ویسا بھرنا‘‘ [۲]

اس کی نظیریں قرآن مجید میں بھی بکثرت ہیں اُسی طریقہ پر یہاں بھی ادھر کا عمل چونکہ بطور عقاب یعنی سزا ہے تو ادھر کے کام کا ذکر بلطف ’’عقاب‘‘ کیا گیا ہے، مطلب یہ ہے کہ ادھر سے جوتشہدہ بطور ظلم ہوا ہے، اُس کے عوض میں ادھر سے جوتشہدہ بطور سزا ہو، اور جو حق ہے، اب اس کے مقابل میں اگر پھر ادھر سے ظلم و زیادتی ہوگی تو خدا اسی اسلامی جماعت کا ساتھ دے گا جس پر ابتداءً ظلم ہوا تھا لیکن اس کے ساتھ آخری جملہ کہ ’’اللہ معاف کرنے والا ہے‘‘ کہ وہ ’’بدلہ لینا‘‘ بھی ایک ’’تزکِ اولیٰ‘‘ کی حیثیت ضرور رکھتا ہے یعنی بہتر یہی تھا کہ بدلہ نہ لیا جائے مگر چونکہ یہ بدلا انسانی فطرت کا ایک عام تقاضا اور اپنے حق کا مطالبہ ہے، جسے بطور قانون روکنا بھی عدل کے خلاف ہے، اس لئے خالق اُسے جائز قرار دیتا ہے اور بلندی نفس کے خلاف پہلو کو اُس کے نظر انداز کرتا ہے۔ اس محل پر عنفود مغفرت کے معنی یہی ہیں۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوَلِّجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوَلِّجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ

[۱] الامر ذٰلِكَ الَّذِي قَصَصْنَا عَلَيْكَ (جلالین)

[۲] كَفُوَالِهْم. الْجَزَاءُ بِالْجَزَاءِ وَالْأَوَّلُ لَيْسَ بِجَزَاءٍ وَأَمَّا هُوَ لَازِدْوَالِ الْكَلَامِ (تبیان)

بَصِيرَةٌ ﴿٦١﴾

”یہ اس بنا پر ہے کہ اللہ رات کو دن کے اندر لے جاتا ہے اور دن کو رات کے اندر لے جاتا ہے اور بلاشبہ اللہ سننے والا ہے، دیکھنے والا۔“

سابق آیت کے تعلق سے کہ ایک وقت اُس فریق نے اسے تکلیفیں پہنچائی تھیں، اب یہ فریق اس کا بدلہ لے رہا ہے اور اب اس کے خلاف وہ تشدد سے کام لیں تو اللہ اس فریق کی مدد کرے گا جو پہلے مظلوم تھا۔ اس کے بعد یہ الفاظ کہ ”یہ اس بنا پر ہے کہ اللہ رات کو دن کے اندر لے جاتا ہے اور دن کو رات کے اندر لے جاتا ہے“ بالکل اسی محاورہ کے مطابق ہیں کہ ”دنیا میں ہوتا یہی ہے کبھی کے دن بڑا کبھی کی راتیں“..... اگر وہ پہلے طاقتور تھے اور یہ بے بس، اسی لئے انہوں نے ان کو ستایا تو یہ صورت حال نالہ و فریاد کا سننے والا ہے اور اُن کی حالت کو دیکھنے والا۔^[۱]

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ

الْكَبِيْرُ ﴿٦٢﴾

”یہ اس بنا پر ہے کہ اللہ بس قرار حقیقت ہے اور جس کی وہ اُس کے سوا ڈھائی دیتے ہیں، وہ سب حقیقت ہے اور بلاشبہ اللہ ہی ہے جو بلند و بزرگ ہے۔“

گزشتہ سلسلہ ہی کی اس آیت کو بھی ایک کڑی سمجھا جائے تو مطلب یہ ہے کہ اللہ جب ان کا مددگار ہے تو آخر میں اُن کی فتح ہونا لازمی ہی ہے اس لئے کہ اللہ ایک لازوال حقیقت ہے اور دوسرے فریق کی پشت پر جو معبودانِ باطل ہیں، وہ خود ہی مٹنے والے ہیں اور اللہ ہے جو بلند و بزرگ ہے۔ اس لئے آخر میں کامیابی بہر حال اہل حق کی ہے اور گردشِ لیل و نہار سے نظامِ دنیا کے عبوری مراحل میں وقتاً فوقتاً اہل حق کو اگر شکستیں ہوتی بھی ہیں تو آخر میں از روئے قرآن یہی ماننا پڑے گا کہ اہل حق کی مکمل فتح ہوگی اور وہی روزِ منتظر ہے جس کے لئے امامِ منتظر کا تصور اسلامی مسلمات کا لازمی نتیجہ ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿٦٣﴾ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهٗوَ الْغَنِيُّ

الْحَمِيْدُ ﴿٦٤﴾

”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے اتارا آسمان سے پانی تو زمین سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ اللہ لطف و کرم والا ہے، خبر رکھنے والا، اُس کا ہے جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے اور بلاشبہ اللہ ہی وہ بے نیاز ہے جو تعریف کا حق دار ہے۔“

[۱] اسمیع لدعاء المؤمنین بصیر بہم (مجمع البیان)

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ ۗ
وَيُمَسِّكُ السَّمَاءَ أَنْ تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ

رَّحِيمٌ ﴿٦٥﴾

”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے تمہارے قابو میں دیا ہے جو کچھ زمین میں ہے اور کشتیوں کو جو سمندر میں چلتی ہیں اُس کے حکم سے اور وہ روکے ہوئے ہے آسمان کو اس سے کہ وہ گرے زمین پر مگر اُس کے حکم سے، بلاشبہ اللہ لوگوں کے ساتھ شفیق ہے، بڑا مہربان“۔

اب چاہے اس وقت کے سائنسی مسلمات کے ماتحت کوئی اسی بات کی کہ ”وہ روکے ہوئے ہے آسمان کو اس سے کہ وہ گرے زمین پر“ ان الفاظ سے تعبیر کرے کہ وہ اس کشش کے نظام کو قائم رکھے ہوئے ہیں جس سے اجرام سماویہ اور زمین کے درمیان فاصلہ ہے۔ وہ چاہے تو اس کشش کے توازن کو ختم کر دے اور اجرام سماویہ اس زمین سے ٹکرا جائیں۔ اسی طرح کی تعبیر یا تشریح مفاد قرآنی کے خلاف نہ ہوگی، جب تک کہ اصل مقصد قائم رہے کہ پورا نظام اللہ کے ارادہ سے قائم ہے، جب وہ چاہے اس پورے نظام کو باطل کر دے۔

وَهُوَ الَّذِي أَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ۗ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُورٌ ﴿٦٦﴾
”اور وہ ہے جس نے تمہیں زندگی عطا کی، پھر تمہیں موت دے گا، پھر تمہیں زندگی دے گا، یقیناً آدمی بڑا ناشکرا ہے“۔

اس زندگی و موت کی ادل بدل کے بعد آدمی کو ”ناشکرا“ کہنا صاف ظاہر کرتا ہے کہ یہ پورا نظام اللہ کی طرف نعمت اور رحمت ہے اور یہ بھی اس کا ثبوت ہے کہ موت انسان کے لئے کوئی بری چیز نہیں ہے بلکہ وہ ایک نعمت خداوندی ہے، اُس طرح جیسے اس کے پہلے اور بعد کی زندگی اُس کی نعمت ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ وہ درمیان میں پہلی زندگی کے بعد ایک وقفہ سکون ہے منزل حیاتِ ابد تک بڑھنے کے لیے۔ ہمارا ترجمہ ”بڑا ناشکرا“ اس پر مبنی ہے کہ کفور کی لفظ کفرانِ نعمت سے ہے مگر ہو سکتا ہے یہ کفر سے ہو، تب ترجمہ اور مطلب یہ ہوگا کہ بڑا کافر ہے کہ اللہ کی قدرت کاملہ کا مشاہدہ کرتے ہوئے بھی موت کے بعد زندگی کو غیر ممکن سمجھتا ہے یا سرے ہی سے خدا کا منکر ہے۔^[۱] مگر ہماری نظر میں پہلے ہی پہلو کو ترجیح ہے کیوں کہ گزشتہ منزلوں میں سے حیاتِ اوّل اور پھر موت، یہ تو خیر مشاہدہ میں ہے لیکن دوسری حیاتِ مشاہدہ میں کب ہے اور اُسے کافر کب مانتا ہے جو یہ کہا جائے کہ اس سب کا مشاہدہ کرتے ہوئے کیوں انکار کرتا ہے؟ اسے تو وہی مانے گا جو اصطلاحی حیثیت سے مؤمن ہو، وہ پھر کفرانِ نعمت والے ہی معنی سے کفور ہوگا جس کے معنی وہی ”بڑے ناشکرے“ کے ہیں۔

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَكَ فِي الْأَمْرِ ۗ وَادْعُ إِلَىٰ

[۱] کفور ای مجود فائتہ مع ہذا الادلۃ الدالۃ علی الخلق بیجد الخالق (مجمع البیان)

رَبِّكَ ۗ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ ﴿٦٥﴾ وَإِنْ جَدَلُوكَ فَقُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا

تَعْمَلُونَ ﴿٦٦﴾ اللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿٦٦﴾

”ہر قوم کے لئے ہم نے ایک طریقہ عبادت قرار دیا جسے وہ اختیار کیے ہوئے ہیں، اس لئے انہیں آپ سے جھگڑا نہ کرنا چاہیے اور آپ اپنے پروردگار کے راستے کی طرف بلاتے رہے بلاشبہ آپ صحیح رہنمائی کے جادہ پردہ ہیں اور اگر وہ آپ سے خواہ مخواہ بحث کریں تو کہیے کہ اللہ تمہارے کرتوت سے خوب واقف ہے۔ اللہ تمہارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا اُس میں کہ جس میں تم باہم اختلاف کرتے رہتے تھے۔“

مختلف طریقے عبادت کے اللہ کی طرف سے آتے رہے نہ کہ مختلف معبود:

اس آیت کے ذیل میں سب سے پہلی بات تو یہ سمجھا چاہیے کہ اس میں طریقہ عبادت کا ذکر ہے، معبود باطل کا نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اس کا تعلق ان جماعتوں سے نہیں ہے جو جہرام پرستی، اصنام پرستی، آتش پرستی وغیرہ کسی بھی قسم کی غیر اللہ پرستی میں مصروف ہیں، اُن کے لئے قرآن یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ ان کی یہ عبادتیں ہماری طرف کی قرار دی ہوئی ہیں بلکہ یہ اُنہی مذہبی جماعتوں کا تذکرہ ہو سکتا ہے جو اپنا معبود اللہ ہی کو قرار دیتی ہیں مگر طریق عبادت میں مسلمانوں سے اختلاف رکھتی ہیں۔

قطع نظر عقیدہ تثلیث وغیرہ کے جو توحید کے منافی ہے مگر وہ اُسے کھینچ تان کر توحید کے تحت میں لاتے ہیں، تعین معبود میں اُن کو مسلمانوں سے اختلاف نہیں ہے مگر طریقہ عبادت ان کا مسلمانوں سے مختلف ہے۔ آیت کا تعلق انہی جماعتوں کے ساتھ ہے۔ وہ مسلمانوں سے اختلاف نہیں ہے مگر طریقہ عبادت اختیار کیا ہے اور اس پر وہ مسلمانوں سے بحث و جدال کرتے تھے۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ آخر اس بات پر پیغمبر اسلام ﷺ سے جھگڑا کرنے کیا معقولیت ہے؟ تم نے جو طریقہ اختیار کیا تھا، وہ دل بخوا تو نہ تھا خالق ہی نے مقرر کیا تھا۔ اب اگر اُسی خالق نے اپنی طرف سے ایک پیغمبر بھیج کر طریقہ عبادت کو بدل دیا ہے تو اس کے تسلیم کرنے میں تمہیں کیا عذر ہے اور کس بنا پر تم ان سے برسر پیکار ہوتے ہو۔^[1]

اس سے وہ افراد کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے جو یہ تبلیغ کرنے لگے ہیں کہ نجات کسی ایک فرقہ سے مخصوص نہیں بلکہ ہر فرقہ کے صاحب کردار لوگ نجات کے مستحق ہیں یا یہ کہ مذاہب کا اختلاف صرف راستوں کا ہے۔ منزل سب کی ایک ہے جو سیاست کے تقاضوں سے آج کل کا ایک بڑا چلتا ہوا نعرہ بن گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مذاہب سب حق ہیں، اس لئے کہ اگر قرآن کو یہ کہنا ہوتا تو وہ اس اعلان کے بعد کہ سب طریقے ہمارے ہی مقرر کردہ ہیں، پیغمبر اسلام ﷺ سے کہتا کہ آپ دوسروں سے نہ لجھئے اور ان سے منازعات نہ کیجئے۔

مگر وہ ایسا نہیں کہتا بلکہ ان جماعتوں کو کہتا ہے کہ وہ آپ سے ظاہر ہے کہ اُسے اُن مذاہب کو حق ثابت کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ وہ اہل مذاہب جو ایک ”نئی بات سمجھ کر اسلام کے پیش کردہ طریقہ عبادت کی مخالفت کر رہے ہیں، اُن کی تشبیہ مقصود ہے کہ جیسے وہ طریقہ عبادت تھیں اس

[1] درایں آیہ اشارہ است کہ اختلاف شرائع بسبب اختلاف عصور است و ہمہ شرائع حقند و در زمان خود معمول بہ است پس نزاع در حقیقت آن نباید کرد۔ (فتح الرحمن)

رسول ﷺ کی زبان سے اللہ نے بتایا تھا، اسی طرح اب اُس نے اس پیغمبر ﷺ کی زبانی اس طریقہ کی تعلیم دی ہے تو اب یہی طریقہ واجب العمل ہوگا جو بعد میں بتایا گیا ہے، نہ کہ وہ پہلا طریقہ جو کہ منسوخ ہو گیا اور اسی لئے اس کے بعد رسول ﷺ کو یہ فرمایا ہے کہ آپ اپنے پروردگار کی طرف دعوت دیتے رہے اگر وہ باہر ہوتی کہ ہر مذہب والوں کے لئے ان کا طریقہ حق ہے تو پھر اُن کو دوسرے طریقہ کی طرف دعوت دینے کی ضرورت ہی کیا رہتی ہے اور پھر اس کے بعد یہ کہ ”یقیناً آپ سیدھے ہدایت کے جادہ پر ہیں“۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس راستے کو اختیار نہ کرنے والے گمراہ ہیں اور گمراہوں کا منزل تک نہ پہنچنا ظاہر ہے۔

اس کے بعد پھر آخری فقرہ ملاحظہ ہو۔ اگر سب حق پر ہوتے تو روز قیامت فیصلہ کا سوال ہی کیا تھا، سب کو سیدھے جنت میں پہنچ جانا چاہیے۔ یہ ارشاد کہ روز قیامت تمہارے درمیان فیصلہ ہوگا، اس کی دلیل کافی ہے کہ اس اختلاف میں کوئی نجات پانے والا ہے اور باقی نجات سے محروم رہنے والے ہیں یہی وہ فیصلہ عدل الہی ہے جس کے لئے قیامت کا حوالہ دیا جا رہا ہے۔

أَلَمْ تَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ﴿٤٠﴾

”کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اللہ جانتا ہے اُسے کہ جو آسمان اور زمین میں ہے یقیناً یہ سب ایک نوشتہ میں محفوظ ہے، بلاشبہ یہ اللہ پر آسان بات ہے۔“

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَمْ يَنْزِلْ بِهِ سُلْطَانًا وَمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهِ عِلْمٌ ط وَمَا

لِلظَّالِمِينَ مِنْ نَصِيرٍ ﴿٤١﴾

”اور وہ عبادت کرتے ہیں اللہ کو چھوڑ کر اُس کی جس کے لئے اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور نہ اُس کے متعلق انہیں کوئی علم ہے اور ان ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔“

اس کے قبل اُن جماعتوں کا ذکر تھا جن کا معبود اللہ ہے مگر طریقہ عبادت دوسرا ہے اور اب یہ وہ ہیں جنہوں نے معبود ہی غلط تراش لیا ہے جس کی کوئی بنیاد ہی نہیں، من جانب اللہ نہیں ہے اور اسی کو یوں کہا گیا ہے کہ اللہ نے اس کے لئے کوئی دلیل نہیں اتاری۔ پھر ان کے لئے سبب تحقیقیت بھلا کیا ہو سکتی ہے؟

وَإِذَا تَتْلَى عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِ الَّذِينَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ط

يَكَادُونَ يَسْطُونَ بِالَّذِينَ يَتْلُونَ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا قُلْ أَفَأَنْبِيئُكُمْ بِشَرٍّ مِنْ

ذَلِكُمْ ط أَلْتَارُ ط وَعَدَّهَا اللَّهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ط وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿٤٢﴾

”اور جب اُن کے سامنے ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں، درآنحالیکہ وہ بالکل صاف ہیں تو تم اُن لوگوں کے چہروں

میں جو کافر ہیں ناگواری محسوس کر دے، قریب ہوگا کہ وہ حملہ کر بیٹھیں۔ اُن پر جو ہماری آیات کو پڑھ کر سناتے ہیں کیسے کہ کیا میں اس سے زیادہ بری خبر تمہیں سناؤں! وہ آتشِ دوزخ ہے جس کا اعلان کیا ہے اللہ نے اُن کے لئے جو کافر ہیں اور کیا بری ہے وہ منزل۔“

یہ تبلیغ جو رسول کرتے ہیں، حقیقت میں تو کوئی بری بات ہے ہی نہیں مگر کافر اسے برا سمجھتے اور ناگواری محسوس کرتے ہیں تو اُن کے مزعومہ کی بنا پر کہا جا رہا ہے کہ اس سے زیادہ بری خبر میں تمہیں سناتا ہوں، اور وہ ابدی آگ ہے جو تمہارے اس انکار کا نتیجہ ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ ضَرْبٌ مِّثْلُ مَا سَمِعْتُمْ أَلَّهُ ط إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوْ اجْتَمَعُوا لَهُ ط وَإِنْ يَسْأَلُكُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَنْقِذُوهُ مِنْهُ ط ضَعْفَ الطَّالِبِ وَالْمَطْلُوبِ ﴿٤٧﴾

”اے انسانو! سمجھانے کو بطور مثال ایک بات کہی جاتی ہے، اسے دھیان سے سنو، یہ جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر دہائی دیتے ہو، ہرگز ایک مکھی کو پیدا نہیں کر سکتے چاہے وہ سب اس کے لئے اکٹھا ہو جائیں اور اگر مکھی کو پیدا نہیں کر سکتے چاہے وہ سب اس کے لئے اکٹھا ہو جائیں اور اگر مکھی اُن سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اس سے چھڑا نہیں سکتے، طالب و مطلوب دونوں ہی کمزور۔“

مکھی کی مثال سے انسان کی عاجزی کا ثبوت:

ان آیات میں خداوند قدوس نے معبودانِ باطل کی کمزوریوں کا ایک مثال کے ذریعہ اظہار کیا کہ تو ایسے ہیں کہ جو ایک مکھی کے پیدا کرنے پر بھی قدرت نہیں رکھتے۔

”طالب و مطلوب“ سے مراد وہ مکھی اور یہ معبودانِ باطل بھی ہو سکتے ہیں [۱] اور وہ معبودانِ باطل اور یہ ان کے بچاری بھی۔ [۲]

مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ ط إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿٤٨﴾

”انہوں نے نہیں سمجھا اللہ کی اُس شان کو جو اُس کے شایان ہے، بلاشبہ اللہ طاقت ور ہے، غالب آنے والا۔“

یہ اللہ کی شان سے تغافل ہی تو ہے کہ اُس طاقتور، غالب ذات کو چھوڑ کر اُن کی دہائی دیتے ہیں جو ایک مکھی تک کے مقابلہ میں بے حس ثابت ہوں جیسا کہ اس کے قبل کی آیت میں تذکرہ ہوا ہے [۳] اور اسی لئے اُن اصنام کی عاجزی کے تذکرہ کے بعد اس آیت کا اختتامی جملہ یہ ہے کہ

[۱] ان الطالِبِ الضَّمْرُ وَالْمَطْلُوبِ الذُّبَابِ (مجمع البيان)

[۲] الطالِبِ العبدِ وَالْمَطْلُوبِ المعبود (جلالین) یعنی عابد و معبود (فتح الرحمن)

[۳] اذا شرکوا به مالاً لم يمنع من الذُّبَابِ ولا ينتصف منه (جلالین)

اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ” اللہ طاقتور ہے، غالب آنے والا، یعنی اُسے کوئی بے بس نہیں بنا سکتا۔ [۱]

اللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ط اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ ﴿۵۶﴾ يَعْلَمُ

مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ط وَاِلٰى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۵۷﴾

”اللہ منتخب کرتا ہے فرشتوں میں سے بھی انہیں کہ جن کو وہ بھیجے اور آدمیوں میں سے بھی، بلاشبہ اللہ سننے والا ہے دیکھنے والا جانتا ہے اُسے جو ان کے سامنے ہے اور اُسے جو ان کے پیچھے ہے اور اللہ ہی کی طرف تمام معاملات کو رجوع ہوتا ہے۔“

انبیاء کا انتخاب نوع انسان سے نہ کسی دوسری نوع سے:

فرشتوں میں سے جنہیں بھیجتا ہے، وہ اُس کی وحی پہنچانے والے ہوتے ہیں، انبیاء و مرسلین کی طرف اور انسانوں میں سے جنہیں بھیجتا ہے، وہ انبیاء و مرسلین ہیں جو افراد انسانی کی ہدایت کے منصب پر فائز ہوتے ہیں۔

”اصطفاء“، یعنی انتخاب اور چننے کی لفظ ایک ساتھ دو حقیقتوں کی مظہر ہے۔

ایک یہ کہ صفات کی بلندیاں اُس فرد میں کہ جسے وہ منتخب کرے بنفس خود اُس کے وجود کے ساتھ ساتھ موجود ہوتی ہیں، انہی صفات کی بنا پر وہ رسول بنایا جاتا ہے۔ انتخاب کا لازمی تقاضا یہی ہے بلکہ اس کے معنی ہی ہیں اس ایک کا چھانٹنا جو اس منصب کے لائق ہے [۲] ایسا نہیں ہے کہ ”دل بخواہ“ کسی ایک کو اس نے رسول بنالیا اور اب رسالت ملنے کی وجہ سے وہ عصمت وغیرہ سے متصف ہو گیا۔

دوسرے یہ کہ ماہیت و حقیقت میں رسول ایک ایسی نوع کی فرد ہوتا ہے جس کے بہت سے افراد ہیں۔ اس لئے ان افراد میں انتخاب کا مفہوم متحقق ہوتا ہے اور رسالت و امامت وغیرہ اصل خلقت کے بعد ایک منصب ہے جس سے برائے اوصاف جعل متعلق ہوتا ہے یہی ”اصطفاء“ کی لفظ کا تقاضا ہے اور یہی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ارشاد الہی: اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا اور پھر اُن کے سوال و من ذرّتی اور خالق کے جواب:

لَا یُنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ کا تقاضا ہے کہ نہ یہ انبیاء و مرسلین یا ائمہ کی کوئی الگ نوع ہے جو مبدأ خلقت سے نوع انسان سے امتیاز رکھتی ہے کیوں کہ اس صورت میں بھی اصطفاء و انتخاب کا مفہوم متحقق نہیں ہوتا اور نہ خلقت اولیٰ کے بعد پھر جعل امام اور عطائے نبوت وغیرہ کے الفاظ جو قرآن مجید میں صاف درج ہیں، ان کا کوئی مفہوم باقی رہتا ہے۔

پھر اسی آیت سے اُس نوع مشترک کا تعین بھی ہو جاتا ہے جیسے کہ پہلا اصطفاء جن کے درمیان ہے، ان میں مشترک حقیقت ملکیہ ہے، اس لئے ارشاد ہوا: مِنَ النَّاسِ جسے دوسرے مقام پر اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (سورۃ فصلت۔ ۶) کے الفاظ سے بھی ظاہر کیا ہے۔

[۱] قادر لایقدر۔ احد علی مغالبتہ (مجمع البیان)

[۲] سورۃ کہف۔ ۱۱۰

اب اس نوع مشترک میں جو پہلے من الملائكة اور پھر من الناس سے ظاہر کی گئی ہے، اصطفاء بعض اشخاص کا جو ہوتا ہے، وہ یقیناً شخصیات فردیہ کی بنا پر ہے، نہ کہ انفصال نوعی کی بنا پر۔ اس لئے بشر مغلکم کے ساتھ جو یوحی الی کی لفظ ہے، وہ ”فصل مقسم“ کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ امتیاز فردی کو نمایاں کرتی ہے۔

آخری فقرہ یہ بتلاتا ہے کہ یہ فرشتے اور پیغمبر بھی باوجود یکہ خاص امتیاز رکھتے ہیں، پھر بھی اللہ کے مقابلہ میں بے بس اور اُس کی نگرانی اور احتساب کے قیود میں مقید ہیں تو مشرکین کے ان معبودوں کا کیا ذکر کہ جو کسی خاص امتیاز و خصوصیت کے حامل ہیں ہی نہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ
تُفْلِحُونَ ﴿٢٤﴾ وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ ۗ هُوَ اجْتَبَكُمْ وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي
الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۗ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ۗ هُوَ سَمَّكُمُ الْمُسْلِمِينَ ۗ مِنْ قَبْلُ
وَفِي هَذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ۗ
فَأَقِمْوَا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ ۗ فَنِعْمَ الْمَوْلَى
وَنِعْمَ النَّصِيرُ ﴿٢٥﴾

”اے ایمان لانے والو! رکوع و سجد کرو اور اپنے پروردگار کی عبادت کرو اور نیک اعمال بجالاؤ، شاید کہ تم ہر طرح کی بہتری حاصل کر لو اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ اُس کے لئے جہاد کا حق ہے۔ اس نے تم کو امتیاز بخشا ہے اور دین میں تمہارے لئے کوئی دشواری قرار نہیں دی ہے، وہ تمہارے مورث اعلیٰ ابراہیم کا دین ہے۔ انہوں نے ہی تمہارا نام ”مسلم“ رکھا ہے پہلے سے اور اس میں بھی تا کہ پیغمبر تم پر گواہ ہوں اور تم لوگوں پر گواہ ہو تو نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور اللہ سے وابستہ رہو، وہ تمہارا حاکم ہے تو کتنا اچھا حاکم ہے اور کتنا اچھا مددگار۔“

دین میں عسر و حرج کی نفی اور ”مسلم“ نام کی ابتداء:

ہو سَمَّا كُمُ الْمُسْلِمِينَ کی ضمیر باعتبار قرب حضرت ابراہیم ؑ کی طرف راجع معلوم ہوتی ہے اور وہ اس واقعہ کے مطابق ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں اس کے پہلے آچکا ہے کہ جب ابراہیم ؑ اور اسماعیل ؑ خانہ کعبہ کی بنیادیں اونچی کر رہے تھے تو اُن کی عرض تھی بارگاہ الہی میں:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ (بقرہ: ۱۲۸)

پروردگار! ہمیں اپنی بارگاہ میں مسلم قرار دے اور ہمارے اولاد میں سے بھی ایک گروہ قرار دے جو تیرے لئے مسلم ہو۔ جس کی تفسیر پہلے بھی لکھی جا چکی ہے۔ ہم نے ترجمہ اسی کے مطابق کیا ہے مگر بعض مترجمین و مفسرین اس ضمیر کو اللہ کی طرف راجع کرتے

ہیں [۱] اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ ”اس نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے“۔ یہ دونوں احتمال تقریباً برابر کے ہیں اور دونوں واقعیت کے مطابق ہیں اور یہ دونوں قول قرون اولیٰ سے پائے جاتے ہیں [۲] مگر لفظی قرب جو اس ضمیر کو ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ حاصل ہے، میرے نزدیک پہلے احتمال کو ترجیح دینے کے لئے کافی ہے۔

اس کے بعد جو ہے من قبل ”پہلے سے“ تو پہلی صورت میں اس سے اشارہ ہوگا اسی واقعہ بنائے کعبہ کی طرف اور دوسری صورت میں ”پہلے“ کے معنی ہوں گے، ان آسمانی کتابوں میں جو گزشتہ انبیاء پر نازل ہوئیں [۳] پھر ”فی ہذا“ اور اس میں ”اسے قریبی طور پر اسی نام کے معاملہ سے متعلق ہونا چاہیے یعنی یہ پہلے سے بھی نام تھا اور اس مذہب یا اس کتاب (قرآن) میں بھی تمہارا نام ”مسلم“ ہے [۴] مگر اسے بعض لوگ سابق میں جو حکم تھا: جاہدوا فی اللہ اُس سے متعلق قرار دیتے ہیں اور ہذا سے اشارہ قرآن ہی کی طرف لیتے ہیں یعنی اللہ کے بارے میں جہاد کرو اور اس قرآن کے بارے میں۔ [۵]

یہاں خداوندی عالم کے لئے جو ہو مو لکم کی لفظ ہے، اُس کے معنی بلا تکلف حاکم اور مختار کے لئے جاتے ہیں [۶] مگر یہی لوگ جب حدیث غدیر میں من کنت مولاً فعلي مولاً پر بحث کرنے لگتے ہیں تو سرے سے منکر ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مولیٰ کے معنی یعنی حاکم کے ہیں ہی نہیں۔

[۱] ہوا ی اللہ (جلالین) خدا نام نہاد شمار مسلمانان (شاہ ولی اللہ)

[۲] قابل ابن عباس و مجاہدان سماکم المسلمین فہو کنایۃ عن اللہ وقال ابن زیدہ کنایۃ عن ابراہیم (تبیان)

[۳] یعنی در کتب سابقہ (فتح الرحمن)

[۴] اور بیچ اس کتاب کے بھی نام رکھا گیا مسلمان (شاہ رفیع الدین)

[۵] ودر قرآن نیز جہاد کنید (شاہ ولی اللہ)

[۶] متولی امورکم (جلالین) اوست خدا وند شما پس نیکو خدا وند است (شاہ ولی اللہ)

سُورَةُ الْمُؤْمِنُونَ

مکیہ --- ۱۱۸ --- آیات

چونکہ آغاز اس سورہ کا ”المؤمنون“ یعنی اہل ایمان کے ذکر سے ہے، اس لئے اس کا یہ نام ہوا اور اس سلسلہ میں جماعتِ مؤمنین کے اوصاف بلند کا اتنا جامع اور بسیط سلسلہ ہے جس کی نظیر کسی دوسرے سورہ میں نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس سورہ میں جو خاص خاص مضامین ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

سورہ مؤمن کے خاص خاص موضوعات:

- ۱..... مراتب تخلیق انسان
- ۲..... خلقت انسان پر خالق کا ایک خاص انداز سے اپنی تعریف کرنا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بہترین شاہکار قدرت ہے۔
- ۳..... طوفانِ نوح اور کشتی کا تذکرہ ان تفصیلات کے ساتھ جن میں سے بعض پہلے نہیں آئے تھے۔
- ۴..... حق انسانی آراء و خواہشات کا تابع نہیں ہو سکتا۔
- ۵..... آیات توحید میں ”برہانِ تمنع“ کی زیادہ واضح تقریر۔
- ۶..... برائی کے مقابلہ میں اچھائی کی تعلیم جو مناسب موقع پر ”مقاومتِ مجہول“ کا ماخذ ہو سکتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

’سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے‘

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝۱ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَشِعُونَ ۝۲ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ
اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۝۳ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ ۝۴ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ
حَافِظُونَ ۝۵ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝۶
فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ۝۷ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمْتِهِمْ
وَعَهْدِهِمْ رِعُونَ ۝۸ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ۝۹ أُولَٰئِكَ هُمُ

الْوَرِثُونَ ﴿١٥﴾ الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ ه هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿١٦﴾

”ضرور بالضرور دین کی بھلائی حاصل کی ان ایمان لانے والوں نے جو اپنی نماز میں رجوع قلب رکھتے ہیں، جو بیہودہ باتوں سے منہ موڑے ہوئے ہیں، جو ادائے زکوٰۃ کا فرض انجام دینے والے ہیں، جو اپنے پوشیدہ اعضاء کی حفاظت کرنے والے ہیں سو اپنی بیویوں کے یا جو ان کی مملکت میں کنیزیں ہیں ﴿١٦﴾ کہ اس پر وہ قابل ملامت نہیں ہیں مگر جو اس کے آگے جانا چاہیں تو یہ لوگ تجاوز کرنے والے قرار پائیں گے اور وہ جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کا لحاظ رکھتے ہیں، جو اپنی نمازوں کی پابندی کرنے والے ہیں، یہی وہ حق دار ہیں جو بہشت کے ورثہ دار ہوں گے، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے“؟

نجات کے حق دار اور اہل ایمان کے اوصاف:

قرآن مجید میں ہر جگہ فلاح و نجات کو ایمان اور عمل صالح دونوں سے وابستہ کیا گیا ہے۔

یہاں سرنامہ اوصاف مومنوں کو قرار دے کر اعمال صالحہ کی اجمال کو تفصیل کے ساتھ تبدیل کر دیا گیا ہے اس جامعیت کے ساتھ کہ اُس میں حقوق اللہ کے ساتھ حقوق الناس بھی آجائیں اور ادا کر کے ساتھ نواہی کی پابندی کا بھی تذکرہ ہو جائے چنانچہ صلوة حق اللہ کی نمائندہ ہے تو زکوٰۃ اور امانت داری اور غرباء پروری کے اوصاف حق العباد کی نمائندگی کر رہے ہیں، اسی طرح ادھر یہ سب از قبیل ادا کر ہیں اور ادھر اپنے پوشیدہ اعضاء کی حفاظت کا ذکر زنا کاری وغیرہ ایسے منہیات سے پرہیز کا ترجمان ہے۔

اس میں حفاظت اعضاء نہانی کا عام حکم دے کر بیویوں اور کنیزوں کا استثناء دونوں قسم کے جنسی جرائم کے حرام ہونے کا اظہار ہے یعنی زنا کاری اور لواط بلکہ بھینٹیں ہے کہ جلق وغیرہ کے غیر فطری حرکات بھی اس میں داخل ہوں ﴿١٦﴾ اور یہاں تو صراحتاً مردوں ہی کے طبقہ کا ذکر ہے مگر دوسری جگہ قرآن میں والمحافظین فروجھم کے ساتھ والمحافظات کا اضافہ کر دیا گیا ہے جس سے ایک جدید مسئلہ کے حکم کا استنباط بھی آسان ہے جو سانس کی بدولت پیدا ہوا ہے یعنی ٹیوب کے ذریعہ سے کسی شخص کا نطفہ عورت کے رحم تک پہنچا دیتے ہیں۔ یہ از روئے قرآن حرام ہی قرار پائے گا، اس لئے کہ عموم والمحافظات سے استثناء صرف ان کے ازواج کا ہے، اور کسی کا نہیں، باقی ہر ایک سے ان کو حفظ فرج واجب ہے خواہ ذریعہ کوئی انسانی حصہ نہ ہو بلکہ بے جان آلہ ہو۔ یہ سب صورتیں ناجائز ہیں۔

ہاں اگر شوہر کسی زخم وغیرہ کی وجہ سے مادہ تولید بصورت متعارف پہنچانے سے قاصر ہو اور اس شوہر کا یہ مادہ ٹیوب وغیرہ کے ذریعہ سے داخل کیا جائے تو بے غیر نہیں ہے کہ وہ الا علیٰ ازواجھم کے استثناء میں داخل ہو اور اسے جائز سمجھا جائے۔

ہاں ازواج کا لفظ عام ہے، اس میں دائمی عقد جو نکاح کہلاتا ہے اور عارضی جو متعہ ہے، دونوں داخل ہیں۔

قرآن مجید کے ارشاد: او ما مملکت ایمانہم کے بعض نئی روشنی والے اور دنیا کے عام رجحانات کے دباؤ سے مرعوب مسلمان جو کنیزوں

﴿١٦﴾ المراد به الاماء لان الذکور من الممالیک لا خلاف فی وجوب حفظ الفرج منهم (تبیان)

﴿١٧﴾ کالاستمناء بیدہ (جلالین)

کے ساتھ تعلقات ازدواجی قائم کرنے کے جواز سے انکار کرتے ہیں اُن کے انکار کی کوئی حقیقت نہیں ہے جب کہ قرآن صاف ازواجہم کے ساتھ ساتھ برابر مملکت ایمانہم یعنی مملوکہ کنیزوں کا ذکر کر رہا ہے جس سے ظاہر ہے حلیت تصرف کے دو مستقل سبب ہیں۔

ایک زوجیت اور دوسرے ملوکیت لہذا یہ سمجھنا چاہیے کہ کنیزوں کے ساتھ عقد کر کے اُن کی رضا سے تصرف کیا جائے گا، از روئے قرآن درست نہیں ہے۔

”اللغو“ جس کا ترجمہ ہم نے ”بیہودہ باتوں“ کے ساتھ کیا ہے، اس کی تفسیر ہمارے یہاں غناء یعنی گانے کے ساتھ ہوئی ہے [۱] مگر یہ ایک روایت ہے۔ دوسری روایات اور وہ بھی معصوم علیہ السلام سے ہیں، یہ ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دوسروں کی سخت کلامی اور دشنام طرازی کے مقابلہ میں چشم پوشی سے کام لے۔ [۲]

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ ۝۱۳ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝۱۴ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظْمًا فَكَسَوْنَا الْعِظْمَ لَحْمًا ۝۱۵ ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۝۱۶ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ۝۱۷ ثُمَّ أَنْكُمُ بَعْدَ ذَلِكَ لَمَيِّتُونَ ۝۱۸ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ ۝۱۹

’اور ہم نے انسان کو پیدا کیا نچوڑ سے مٹی کے، پھر اُسے قرار دیا نطفہ کی صورت میں ایک پرسکون جگہ پر، پھر نطفہ کو منجند خون کی شکل میں لائے، پھر اُس منجند خون کو گوشت کے ایک لوتھڑے کی صورت عطا کی، پھر اُس گوشت کے لوتھڑے کو کچھ ہڈیوں کی صورت دی، پھر اُن ہڈیوں پر گوشت کا لباس پہنایا، پھر اُسے ایک دوسری مخلوق بنا دیا۔ تو بڑا برکت والا ہے وہ جو خلق کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے، پھر تم اسکے بعد مر جاؤ گے اور اس کے بعد پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔‘

خلق انسانی پر خالق کی نوازش:

سلسلہ تخلیق کے بیان میں تخلیق فرد و نوع کے منازل کو سمودیا گیا ہے یعنی سب سے پہلے جو کہا گیا ہے کہ نچوڑ سے مٹی کے پیدا کیا، وہ آغاز نوع بشر کا ذکر ہے جو ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سے متعلق ہے [۱] اور پھر نطفہ، علقہ، مضغہ، عظام اور لحم کی منازل سے گزرتا ہوا خلقاء آخر پر ختم ہونے والا سلسلہ نسل آدم کی ہر فرد سے متعلق ہے۔ [۲]

[۱] یعنی الغناء والملاھی (علی بن ابراہیم)

[۲] عن ابی عبد اللہ علیہ السلام ان یتقول الرجل علیک بالباطل او یأتیک بما لیس فیک فتعرض عنه اللہ (مجمع البیان)

[۳] خلقنا الانسان آدم (جلالین)

[۴] ثم جعلنا الانسان و هو من ولد من نسل آدم (تبیان)

احسن الخالقین کا لفظ جس کے معنی ہیں ”خلق کرنے والوں میں سب سے بہتر“ اس کا پتہ دیتا ہے کہ خلق کرنے کی صفت کسی نہ کسی درجہ تک اللہ کے سوا دوسروں کے لئے بھی ثابت ہے [۱] جس کے شواہد قرآن مجید میں اور بھی موجود ہیں۔ اس طرح یہ تصور کہ انسان کو کسی درجہ میں بھی، یہاں تک کہ خود اپنے افعال کا خالق ماننا بھی شرک کی حیثیت رکھتا ہے، از روئے قرآن غلط ثابت ہوتا ہے۔

تخلیق انسان کے تذکرہ کے بعد، اُس کو اپنے کو احسن الخالقین کہنا، اس کی دلیل ہے کہ انسان اشرف المخلوقات یعنی اس کی تمام خلقت میں سب سے بہتر ہے اور ایسا نقش اکمل ہے جس پر نقاش ازل کو ناز ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا نمونہ وہی کامل افراد ہیں جو واقعی ہر حیثیت سے خالق کا بلند ترین شاہکار ثابت ہوتے ہیں۔ انہیں اس نوع کے افراد کا ملہ سمجھنا وہ نقطہ حقیقت ہے۔ جو از روئے قرآن درست ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَائِقٍ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غَافِلِينَ ﴿۱۷﴾

”اور ہم نے تمہارے اوپر سات راستے پیدا کیے ہیں اور ہم خلقت سے بے خبر نہیں رہا کیے۔“

یہاں قرآن مجید میں سات آسمانوں کو سات راستوں سے تعبیر کیا ہے [۲] یہ اور بات ہے کہ اُس وقت تک یہ راستے فرشتوں ہی کے لئے ہوں [۳] مگر جب قرآن نے جو انسانوں کے لئے اترا ہے، ہم انسانوں کو یہ راستے بتلائے ہیں تو اسے قیامت تک ظرف ارتقاء میں کسی دور کے سالکوں کے لئے وہ نوردی کا محرک کیوں نہ سمجھا جائے اور اگر خالق اُس رہبر کو جو اس قرآن کا حامل ہے، اُسی دور میں عملی طور سے ان راستوں کا سالک بنا بھی دے تو اس میں حیرت کی کوئی بات ہے؟

وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ فَأَسْكَنَتْهُ فِي الْأَرْضِ ۖ وَإِنَّا عَلَىٰ ذَهَابٍ بِهَ لَقَدِيرُونَ ﴿۱۸﴾ فَأَنْشَأْنَا لَكُمْ بِهِ جَنَّتٍ مِّنْ مَّحْضِلٍ وَأَعْنَابٍ ۖ لَّكُمْ فِيهَا فَاوَاكِهِ كَثِيرَةٌ ۖ وَ مِنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿۱۹﴾ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُورِ سَيْنَاءَ تَنْبُتُ بِالذَّهْنِ ۖ وَصَبِغٍ لِللَّكْلِينِ ﴿۲۰﴾

”اور ہم نے اتار آسمان سے پانی ایک معین مقدار میں تو اُسے ہم نے زمین میں ٹھہرایا اور بلاشبہ ہم اُس کو لے جانے پر بھی قادر ہیں تو ہم نے اُس سے پیدا کیے تمہارے لئے باغ کھجوروں اور انگوروں کے جس سے تمہیں بہت پھل ملتے ہیں اور اُس میں سے تم غذا حاصل کرتے ہو اور وہ درخت جو نکلتا ہے طور سیناء سے جو اُگتا ہے سامان تیل کا اور کھانے والوں کے لئے ایک خاص قسم کی غذا“۔

اس آیت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زمین میں دریاؤں وغیرہ کی صورت میں جو پانی ہے، یہ اصل میں ابر سے برسا ہوا ہے جسے آسمان سے

[۱] فیہ دلالت علی ان الانسان قد یخلق علی الحقیقۃ لانه لولہ یوصف بخالق الا اللہ لما کان لقولہ ”احسن الخالق“ معنی (تبیان)

[۲] السَّمُوت (علی ابن ابراہیم)

[۳] طرائق ای سَمُوت جمع طریقۃ لہا طرق الملائکۃ (جلالین) قال الجبائی۔ لہا طرق الملائکۃ (تبیان)

اتارنے کے ساتھ تعمیر کیا گیا ہے۔^[۱]

علم فقہ کی بعض ادنیٰ کتابوں میں بھی اس تصور کا وجود ملتا ہے کہ روئے زمین کے تمام پانی کی اصل آب باراں ہے۔

وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۖ نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهَا وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ

كَثِيرَةٌ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ۗ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُونَ ۗ

”اور بلاشبہ تمہارے لئے چوپایوں میں سرمایہ بصیرت ہے، ہم تمہیں سیراب کرتے ہیں اُس سے جو اُن کے اندر ہے اور تمہارے لئے ان میں بہت فائدے ہیں اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو اور اُن پر اور کشتیوں پر سوار ہوتے ہو۔“

”جو کچھ ان کے اندر ہے، اس سے مراد مسلمان دودھ ہے^[۲] اور اس لئے اگرچہ بطن کے عام معنی پیٹ کے ہوتے ہیں اور اسی لئے عام مترجم یہاں بھی ترجمہ یہی کرتے ہیں کہ ”جو اُن کے پیٹوں میں ہے“^[۳] مگر چونکہ ہماری اُردو کے محاورہ میں دودھ کو پیٹ کے اندر نہیں کہا جاتا، اس لئے ہم نے ترجمہ میں ”پیٹ“ کا لفظ نہیں لکھا، اصل لغت کے اعتبار سے بطن باطن کے معنی میں ہے جو ظاہر کے مقابل ہے اس لئے اس لفظ سے صرف ”اندر“ کے معنی کا سمجھنا بالکل درست ہے۔

یہی غلطی ہے جو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ایک ارشاد کے ذیل میں راوی کے ایک فقرہ کے ترجمہ میں ہوئی ہے کہ:

”إِنَّ لَهُنَا لَعِلْمًا جَمًّا وَإِشَارَةً إِلَى بَطْنِهِ“

ترجمہ کیا جاتا ہے ”یہاں علم کا بڑا ذخیرہ موجود ہے اور اشارہ کیا اپنے شکم کی طرف“..... یہاں بقرینہ مقام عربی میں جو بطن کا لفظ ہے، اس کے معنی ”شکم“ قرار دینا درست نہیں بلکہ ”سینہ کے اندر“ کہنا جو ہمارا محاورہ ہے اور سینہ کی طرف اشارہ کیا جائے تو بھی عربی میں بطن کا لفظ استعمال درست ہوگا۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ مَالِكُكُمْ مِنْ آلِهِ خَيْرُ مَنْ

أَفَلَا تَتَّقُونَ ۗ فَقَالَ الْمَلِكُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا هَذَا إِلَّا بَشَرٌ

مِثْلُكُمْ لَا يُرِيدُ أَنْ يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۗ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَنْزَلَ مَلَائِكَةً ۗ مَا سَمِعْنَا

بِهَذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ ۗ ۗ إِنَّ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ بِهِ جِنَّةٌ فُتَرَبِّصُوا بِهِ حَتَّىٰ حِينٍ ۗ

”اور بے شک ہم نے بھیجا نوح علیہ السلام کو اُن کی اپنی قوم کی طرف تو انہوں نے کہا اے میری قوم والو! عبادت

[۱] یعنی الانہار والعیون والابار (علی بن ابراہیم)

[۲] ارادانا جعلنا مافی ضر وعها من الدین سقیالکم (مجمع البیان)

[۳] از آنچہ در شکم (ایشان) است (شاه ولی اللہ) بیچ پیٹوں ان کے ہے (شاه فنج الدین)

کروا اللہ کی نہیں ہے کوئی خدا سوا اُس کے۔ کیوں تم نجات کی فکر نہیں کرتے تو اُس جماعت نے ان کی قوم میں سے جو کافر تھی کہا کہ یہ نہیں ہے مگر تمہارا ہی ایسا آدمی جو چاہتا ہے تم پر بڑائی حاصل کرے اور اگر اللہ ایسا ہی چاہتا تو وہ فرشتے اتارتا، ہم نے ایسی بات نہیں سنی اپنے پہلے باپ داداؤں میں۔ یہ نہیں ہے مگر ایک شخص جس میں کچھ دیوانگی ہے۔ تو ایک مقررہ مدت تک کے انجام کا انتظام کرو۔

کافروں کے حلق سے یہ کسی طرح نہیں اترتا تھا کہ جو ہماری ہی طرح انسان ہیں، وہ اللہ کے رسول ہو جائیں۔ وہ کہتے تھے کہ اللہ کو رسول بنانا ہوتا تو کسی فرشتہ کو اتارتا مگر اس کے جواب میں قرآن شروع سے آخر تک دیکھا جائے تو کسی نبی یا رسول نے یہ نہیں کہا کہ ہمیں انسان نہ سمجھو، ہم حقیقت میں فرشتے ہی ہیں یا اس سے بڑھ کر کوئی الگ قسم کی مخلوق ہیں۔ یہ صرف ہمارا ظاہری لباس ہے جو تم سے ملتا جلتا ہے، اس صورت میں کافروں کی زبان بند ہو جاتی مگر یہ جواب مقصد خالق کے خلاف اور حقیقت کے لحاظ سے غلط تھا۔ اس لئے یہ کبھی نہیں کہا گیا۔ اس سے اُن مسلمین یا مومنین کی آنکھیں کھلنا چاہئیں جو تلے ہوئے ہیں یہ ثابت کرنے پر کہ انبیاء اور ائمہ نوع انسان میں داخل نہیں بلکہ ایک الگ قسم کی مخلوق ہوتے ہیں جو انسان سے ذاتاً الگ ہے۔ یہ تصور قرآن کے بالکل خلاف ہے۔

قَالَ رَبِّ انصُرْنِي بِمَا كَدَّ بُونِ ﴿٣١﴾ فَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ أَنْ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا
وَوَحَيْنَا فَإِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّورُ ۖ فَاسْلُكْ فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ
وَأَهْلَكَ إِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۗ وَلَا تُخَاطِبُنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا ۗ
إِنَّهُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿٣٢﴾ فَإِذَا اسْتَوَيْتَ أَنْتَ وَمَنْ مَعَكَ عَلَى الْفُلِّ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ
الَّذِي نَجَّيْنَا مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٣٣﴾ وَقُلْ رَبِّ انزِلْنِي مُنْزَلًا مُّبْرَكًا وَأَنْتَ خَيْرُ
الْمُنْزِلِينَ ﴿٣٤﴾ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ وَإِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِينَ ﴿٣٥﴾

”انہوں نے کہا اے میرے پروردگار! میری مدد فرما کہ انہوں نے مجھے جھٹلایا تو ہم نے اُن کی طرف وحی بھیجی کہ تم کشتی بناؤ، ہماری نگاہوں کے سامنے اور ہماری وحی کے مطابق تو جب ہمارا حکم نافذ ہوا اور تندور سے پانی اُبلے تو سوار کر دو اس میں ہر قسم کے دو جوڑے اور اپنے گھر والوں کو سوا اُن میں سے ایسے اشخاص کے جن کے لئے ہماری طرف سے پہلے ہی بات طے ہو چکی ہے اور جو ظالم ہیں، اُن کے بارے میں تم مجھ سے کوئی گفتگو نہ کرنا وہ یقینی غرق ہو کر رہیں گے، تو جب تم اور تمہارے ساتھ والے کشتی پر سوار ہو جائیں تو کہنا کہ شکر اللہ کا جس نے ہم کو ظالم قوم سے نجات دی اور کہنا کہ پروردگار! مجھے اتارنا برکت والی جگہ پر اور تو اتارنے والوں میں سب سے بہتر ہے، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں اور بلاشبہ ہم آزمائش کیا کرتے ہیں۔“

کشتی نوح علیہ السلام:

”میری مدد فرما کہ انہوں نے مجھے جھٹلایا“ تو ہم نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ کشتی بناؤ، اس میں مدد فرمانے کی التجاء کے ساتھ یہ جو کہ انہوں نے مجھے جھٹلایا اور پھر اس پر فائے تفریح کے ساتھ مرتب کر کے کشتی بنانے کا حکم کچھ یہ پتہ دیتا ہے کہ مدد سے اُن کی مراد یہی تھی کہ اس قوم پر عذاب نازل کیا جائے، مگر دوسری جگہ قرآن مجید میں ہے کہ ہم نے وحی بھیجی کہ بس جتنے ایمان لائے ان سے زیادہ ایمان نہیں لائیں گے، تو اب کشتی بناؤ اُس سے سمجھ میں آتا ہے کہ پہلے جو انہوں نے اپنی قوم کی تکذیب کی بنا پر مدد کی درخواست کی تھی، اس کا مطلب اس طرح کا تھا کہ انہیں تو نینق خیر عطا فرما کہ یہ اس تکذیب سے باز آجائیں۔ پھر کچھ افراد کے ایمان لانے کے بعد اللہ نے یہ اطلاع دی کہ جن میں صلاحیت قبول حق کی تھی اور جن کے ضمیر میں کچھ زندگی تھی، وہ ایمان لے آئے، اب اس کے بعد امید نہ رکھو کہ کوئی ایمان لائے گا، لہذا اب ان مومنین کی نجات کے سامان کے لئے کشتی بناؤ اور باقی افراد جو مستحق عذاب ہیں، وہ غرق ہوں گے، ان میں سے کسی کے لئے کوئی سفارش نہ کرنا۔

”وہ اشخاص جن کے لئے پہلے سے بات طے ہوئی ہے“ یعنی فیصلہ قدرت ہے کہ وہ عذاب سے نہیں بچیں گے، یہ زوجہ تھی جناب نوح علیہ السلام کی اور ایک لڑکا اور اس طرح عملی طور پر اس اصول کا اعلان ہو گیا کہ ذاتی اوصاف ایمان و کفر اور طاعت و معصیت کے مقابلہ میں نہ نسب کا اعتبار ہے، نہ سبب کا۔

ثُمَّ أَنشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ ﴿٣١﴾ فَأَرْسَلْنَا فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ ۖ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿٣٢﴾ وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِإِلْقَاءِ الْآخِرَةِ وَأَتْرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ مَا هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ ۖ يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ ﴿٣٣﴾ وَلَئِنْ أَطَعْتُمْ بَشَرًا مِثْلُكُمْ ۖ إِنَّكُمْ إِذَا لَخَسِرُونَ ﴿٣٤﴾ أَيْعِدُكُمْ أَنَكُمْ إِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَعِظَامًا أَنَّكُمْ مُخْرَجُونَ ﴿٣٥﴾ هِيَ هَاتِ هَاتِ لِمَا تُوعَدُونَ ﴿٣٦﴾ إِنَّ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ ﴿٣٧﴾ إِنَّ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا وَمَا نَحْنُ لَهُ بِمُؤْمِنِينَ ﴿٣٨﴾

”پھر ان کے بعد ہم نے ایک اور نسل پیدا کی تو ان میں ایک پیغمبر انہی میں سے بھیجا کہ عبادت کرو اللہ کی، تمہارا کوئی خدا نہیں سوا اس کے تو کیوں تم نجات کی فکر نہیں کرتے اور اس کی قوم کے بڑے بڑے آدمیوں نے جو کافر تھے اور جنہوں نے آخرت میں حضوری کو جھٹلایا تھا اور جنہیں ہم نے عیش و عشرت کا سامان دیا تھا، کہا کہ نہیں ہے یہ

مگر تمہارا ہی ایسا ایک آدمی جو کھاتا ہے انہی کھانوں میں سے جو تم کھاتے ہو اور پیتا ہے اسی قسم میں سے جو تم پیتے ہو اور اگر تم کہنا مانو گے اپنے ہی ایسے ایک آدمی کا تو بلاشبہ تم کھائے میں رہو گے۔ کیا وہ تم سے وعدہ کرتا ہے کہ تم جب مر جاؤ گے اور خاک اور بوسیدہ ہڈیوں کی شکل میں ہو جاؤ گے تو پھر تم برآمد کئے جاؤ گے؟ حاشا وکلا، بد دور ہے یہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے، کچھ نہیں ہے سوا اس دنیوی زندگی کے۔ یہیں مرنا ہے اور جینا اور ہم دوبارہ اٹھائے جانے والے کچھ نہیں ہیں۔ وہ نہیں ہے مگر ایک شخص جو اللہ کے سر جھوٹی باتیں منڈھتا ہے اور ہم اس پر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔“

دیکھتے چلے جائے! پیغمبروں کا پیغام بھی ہر دور میں ایک ہی رہتا ہے اور کافروں کے اعتراضات اور نکتہ چینیوں بھی ہمیشہ یکساں ہی رہی ہیں، چاہے وہ عہد جاہلیت کے کافروں یا اس علم اور سائنس کی ترقی والے دور کے۔ خواہ زمانہ وحشت کے ہوں یا دور تہذیب کے۔ خواہ عصر ظلمت کے ہوں یا اس ہنگام برق و نور کے۔ شیوہ کافر ہی ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے، چاہے ظاہری انداز اس کا کچھ بدلتا رہا ہو۔

قَالَ رَبِّ انصُرْنِي بِمَا كَذَّبْتَنِي ﴿٣٩﴾ قَالَ عَمَّا قَلِيلٍ لِيُصْبِحَنَّ نُدِمِينَ ﴿٤٠﴾

فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنَاهُمْ غُثَاءً ۗ فَبَعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٤١﴾

”اس نے کہا اے میرے پروردگار! میری مدد فرما کہ انہوں نے مجھے جھٹلایا، ارشاد ہوا کہ ذرا ہی میں وہ وقت آئے گا کہ انہیں پشیمان ہونا پڑے، تو لے لیا انہیں سخت آواز نے حق بجانب طور پر تو کر دیا ہم نے انہیں بھوسا، تو لعنت ہو اس ظالم گروہ پر۔“

اس مقام پر قرآن مجید نے اس قوم اور اس کے رسول کا نام نہیں لیا ہے مگر جو عذاب ان پر نازل ہوا یعنی صحیحہ جس کا ترجمہ ہو ”سخت آواز“ وہ چونکہ دوسری جگہ قرآن میں قوم ثمود کے لئے مذکور ہے، اس لئے ایسا سمجھا جاتا ہے کہ اس قوم سے مراد ثمود اور اس پیغمبر سے مراد حضرت صالح علیہ السلام ہیں۔ [۱] حالانکہ یہ ممکن ہے کہ صحیحہ کی اور قوم کے لئے بھی ہلاکت کا سبب ہو اور یہاں ثمود نہیں بلکہ وہ دوسری قوم مراد ہو جس کا نام نہیں لیا گیا۔

بعض لوگوں نے اس سے کہ قوم نوح کے بعد بلا فاصلہ اس قوم کا ذکر ہے کہ ان کے بعد دوسری قوم پیدا کی، اس سے مراد قوم عاد کو لیا ہے اور وہ نبی جن کا ذکر ہے، جناب ہوڈ ہیں کیوں کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جو نبی مبعوث ہوئے، وہ جناب ہود علیہ السلام ہی تھے۔ [۲]

علامہ طبرسی نے اس کو بطور مختار لکھا ہے اور پہلے کو بطور قول ضعیف درج کیا ہے۔ [۳] مگر مجھے اس کے قبول کرنے سے یہ چیز سدا رہے کہ قوم عاد کی ہلاکت کا سبب خود قرآن مجید میں ہے کہ وہ ”رج صرص“ یعنی تیز آندھی تھی ”صحیحہ“ کا ذکر قوم ثمود ہی کے یہاں ہے تو یا وہ مراد ہوں اور یا جیسا ہم نے امکان ظاہر کیا کوئی دوسری قوم جس کی ہلاکت بھی صحیحہ سے ہوئی ہے اور یہ تصور کہ جناب نوح علیہ السلام کے بعد بلا فاصلہ جناب ہود علیہ السلام ہی مبعوث ہوئے تھے، بظاہر کسی نص قطعی پر مبنی نہیں ہے۔

[۱] یعنی قوم حضرت صالح کو (شاہ رفیع الدین) معلوم ہوا کہ یہ قصہ ہے ثمود کا کہ چنگھاڑ سے وہی مرے ہیں (موضح القرآن)

[۲] قبیل ہود لانہ المرسل بعد نوح علیہ السلام (تبیان)

[۳] یعنی عاد قوم ہود لانہ المبعوث بعد نوح علیہ السلام قبیل یعنی ثمود لانہم اهل کواہل الصیحة عن الجبائی (مجمع البیان)

ثُمَّ أَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قُرُونًا آخَرِينَ ﴿٣٣﴾ مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ ﴿٣٤﴾ ثُمَّ أَرْسَلْنَا رَسُولَنَا تَتْرَاطُ كُلَّمَا جَاءَ أُمَّةٌ رَسُولَهَا كَذَّبُوهُ فَاتَّبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ ۖ فَبُعْدًا لِلْقَوْمِ لَآئِيُومِنُونَ ﴿٣٥﴾

”پھر ہم نے پیدا کیں ان کے بعد دوسری قومیں، نہ کوئی قوم اپنی مقررہ عمر سے آگے بڑھتی ہے اور نہ پیچھے رہتی ہے، پھر ہم نے اپنے پیغمبر بھیجے لگاتار۔ جب کسی قوم کے پاس اس کا پیغمبر آیا انہوں نے اس کا انکار کیا تو ہم نے یکے بعد دیگرے ان کا خاتمہ کیا اور ہم نے انہیں قصہ پارینہ بنا دیا تو لعنت ہو ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے۔“

ثُمَّ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ وَأَخَاهُ هَارُونَ ۖ بِآيَاتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ﴿٣٦﴾ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا عَالِينَ ﴿٣٧﴾ فَقَالُوا أَنُؤْمِنُ مِنْ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عِبَدُونَ ﴿٣٨﴾ فَكَذَّبُوهُمَا فَكَانُوا مِنَ الْمُهْلَكِينَ ﴿٣٩﴾ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ الْكِتَابَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ﴿٤٠﴾

”پھر ہم نے بھیجا موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون کو اپنے معجزات اور کھلی ہوئی دلیل کے ساتھ فرعون اور اس کے بڑے بڑے آدمیوں کی طرف تو انہوں نے غرور سے کام لیا اور وہ بڑے گھمنڈ والے لوگ تھے تو انہوں نے کہا۔ کیا ہم ایمان لائیں اپنے ہی ایسے دو آدمیوں پر حالانکہ ان دونوں کی قوم والے خود ہماری پوجا کرتے ہیں تو انہوں نے ان دونوں کو جھٹلایا تو وہ لوگ ہلاک کئے جانے والوں میں شامل ہو گئے اور بے شک موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے کتاب عطا کی۔ شاید کہ وہ لوگ ہدایت قبول کریں۔“

”خود ہماری پوجا کرتے ہیں“ لفظی معنی یہی ہیں اور جب کہ فرعون خدائی کا دعویٰ بیدار تھا تو بر بنائے واقعہ یہ بعید بھی نہیں ہے کہ بنی اسرائیل اس کی مورتی کی پوجا کرتے ہوں جیسا کہ ایک قول ہے اور ہو سکتا ہے کہ انتہائی فرماں برداری کو بطور مبالغہ پوجا کرنے سے تعبیر کیا گیا ہو۔^[۱] وہ یعنی قوم فرعون تو ہلاک ہو گئی۔ اب یہ جنہیں کہا گیا ہے کہ ”شاید وہ ہدایت قبول کریں“ قوم موسیٰ و ہارون یعنی بنی اسرائیل ہیں۔^[۲]

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّةً آيَةً ۖ وَأَوَيْنَهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ ۖ وَمَعِينٍ ﴿٤١﴾ يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُّوْا مِنَ الطَّيِّبَاتِ ۖ وَاعْمَلُوا صَالِحًا ۗ إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿٤٢﴾ وَإِنَّ

[۱] ای مطیعون طاعة العبد لمولا قال الحسن كان بنو اسرائيل يعبدون فرعون (مجمع البيان)

[۲] ای قومہ بنی اسرائیل (جلالین)

هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ ﴿٥٢﴾

”اور ہم نے مریم سلام اللہ علیہا کے بیٹے اور ان کی ماں کو ایک قدرت کی نشانی بنایا اور ان دونوں کو پناہ دی ایک ٹیلے کی طرف جو سکون و آرام اور میٹھے پانی والا تھا، اے پیغمبرو! کھاؤ اچھی غذا میں اور نیک کام کرو اور بلاشبہ میں تمہارے اعمال کا جاننے والا ہوں اور یہ تمہاری قوم ہے ایک قوم اور میں تمہارا پروردگار ہوں۔ تو میرے غضب سے بچو۔“

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور جناب مریم سلام اللہ علیہا قدرت خدا کی ایک نشانی:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی ماں کو ”ایک قدرت کی نشانی“ کہا۔ نہ کہ ”دو قدرت کی نشانیاں“ اس لئے کہ جو پہلو ہے اعجاز کا، وہ دونوں میں الگ الگ نہیں ہے بلکہ وہ ایک ہے بغیر مرد کے اولاد کا ہونا جس سے وہ ماں بھی نشانی قدرت ہوئی اور یہ بیٹا بھی۔^[۱] چنانچہ دوسری جگہ الٹ کر بھی یونہی کہا ہے کہ ہم نے مریم سلام اللہ علیہا اور ان کے بیٹے کو ایک نشانی قرار دیا تمام جہانوں کے لئے۔^[۲]

ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ دونوں ہستیوں میں دو پہلو قدرت الہی کے ظہور کے تھے، عیسیٰ میں یہ کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور جناب مریم سلام اللہ علیہا میں یہ کہ وہ بغیر کسی مرد کے ماں بنیں۔ لہذا جناب مریم سلام اللہ علیہا ذاتاً قدرت کی خاص نشانی نہ سہی مگر اس بیٹے کی ماں ہونے کے لحاظ سے وہ بھی مستقل قدرت کی نشانی ہیں، اس لئے قرآن مجید میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اور مریم سلام اللہ علیہا دونوں قدرت کی نشانیاں تھے بلکہ ایک جگہ عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی ماں کہا اور ایک جگہ مریم سلام اللہ علیہا اور ان کا بیٹا کہا۔ اس طرح ان میں سے ہر ایک اس رشتہ کے لحاظ سے جو دوسرے کے ساتھ رکھتا تھا، آیت الہی ہے۔ لہذا عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی ماں ایک آیت تھے، اس کا مطلب یہی ہے کہ ہر ایک ان میں کا آیت الہی تھا اور اس طرح دونوں کو ملا کر یہ کہنا کہ دونوں ایک آیت تھے، مطلب اس کا وہی ہوتا ہے کہ یہ دونوں خدا کی آیات تھے، ایک آیت اور دو آیات کہنے میں مفہوم کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔^[۳]

فَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبْرًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ﴿٥٣﴾ فَذَرَهُمْ فِي

غَمْرَتِهِمْ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿٥٤﴾

”تو وہ اپنے مذہب کے لحاظ سے مختلف کتابوں (کی طرف نسبتوں) میں بٹ گئے، ہر گروہ کے لوگ اس سے جو ان کے پاس ہے، خوش ہیں تو چھوڑ دیجئے ان کو ان کی غفلت کے عالم میں ایک خاص وقت تک۔“

”وہ“ یعنی جنہیں ایک قوم اور ایک ملت ہونا چاہئے تھا، بٹ گئے بہت سے فرقوں میں کہ کوئی توریثت کو مانتا ہے، انجیل کو نہیں اور کوئی ان

[۱] لحد یقل آیتیں لان الآیة فیہما واحد قولادبۃ من غیر مغل (جلالین)

[۲] ہذا مثل قولہ: وجعلناہا وابنہا آیۃ للعالمین (مجمع البیان)

[۳] الآیة ہنہا فی عیسیٰ ائہ ولد من غیر فعل ونطق فی المہد وفي ائہا حملتہ من غیر ذکر و بزّ اھا کلامہ فی المہد من الغا حشۃ. (تبیان)

دونوں کو مانتا ہے، قرآن کو نہیں۔“

عام قرأت جس کے مطابق تمام قرآنی نسخوں میں اعراب لگے ہوئے ہیں... زُبْرًا... کا لفظ ہے جس کے لحاظ سے وہ ترجمہ ہوتا ہے جو ہم نے کیا ہے اور وہ اکثر تفاسیر کے مطابق ہے۔ [۱] مگر تعجب ہے کہ کچھ مفسرین و مترجمین نے ایک شاذ قرأت جو زُبْرًا ہے، اس کے اعتبار سے ترجمہ کر دیا ہے اور وہی تشریح کی ہے۔ [۲] جو نہ ہونا چاہئے۔

أَيَحْسَبُونَ أَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهِ مِنْ مَّالٍ وَبَنِينَ ۗ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرَاتِ ۗ بَلْ لَا

يَشْعُرُونَ ۗ (۵۶)

”کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو ان کے مال اور اولاد میں اضافہ کرتے ہیں، تو ان کے لئے تیزی کے ساتھ بھلائیوں کا سامان کرتے ہیں؟ بلکہ انہیں شعور نہیں ہے۔“

یعنی یہ مال و اولاد کی فراوانی ان کے لئے استحقاق عذاب میں اضافہ کا باعث ہے جس پر اگر انہیں شعور ہو تو فکر مند ہونا چاہئے نہ کہ

مطمئن۔ [۳]

ایک حدیث قدسی میں جو بطریق ائمہ اہل بیت پیغمبر خدا ﷺ سے وارد ہوئی ہے، اس آیت کے تحت میں اہل ایمان کے لئے انتباہ کیا گیا ہے کہ انہیں تکالیف و مصائب سے گھبرانا نہیں چاہئے کہ وہ بارگاہ الہی میں مزید قرب کا سبب ہو سکتے ہیں اور دنیا کے راحت و آرام اور اموال کی فراوانی سے خوش نہیں ہونا چاہئے کہ یہ چیزیں بارگاہ الہی سے دوری کا باعث ہو سکتی ہے۔ [۴]

إِنَّ الَّذِينَ هُمْ مِنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُونَ ۗ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِ رَبِّهِمْ

يُؤْمِنُونَ ۗ وَالَّذِينَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُونَ ۗ وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوْا

[۱] زُبْرًا ای کتباً وهو جمع زبور عن الحسن وقتادة و مجاهد (مجمع البيان) المعنى تفرقوا اکتبا دانوا بهار و کفروا بما سواها ليهود دانوا بالتوراة و کفروا بالانجيل و القرآن و النصارى دانوا بالانجيل و کفروا بالقرآن (تبيان)

[۲] زُبْرًا حال من فاعل تقطع او احوالاً متخالفين كالیهود و النصرى و غیرهما (جلالین) متفرق ساختند امتان کار خود را در میان خویش پارہ پارہ (شاه ولی اللہ) کاٹ لیا انہوں نے کام اپنا در میان اپنے ٹکڑے ٹکڑے (شاه رفیع الدین) من قرأ زبرا بفتح الباء و هو ابن عامر فمعناها جماعت لانہ جمع زبرة (تبيان)

[۳] لا يشعرون ان ذلك استدراج لهم (جلالین) یعنی نعمت نیست بلکہ استدراج است (فتح الرحمن)

[۴] السکونی عن ابی عبد اللہ عن ابیہ عن اباہ قال قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ تعالیٰ بقول: یہزن عبدی المؤمن اذا قترن علیہ شیئاً من الدنیا و ذلك اقرب لدمنی و یفرح اذا بسطت له الدنیا و ذلك ابعد لی عنی ثم تلا هذه الآية. ثم قال: ان ذلك فتنة لهم (مجمع البيان)

وَقُلُوْبُهُمْ وَجِلَّةٌ اَتَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ﴿٦٠﴾ اُولٰٓئِكَ يُسِرُّوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ

وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴿٦١﴾

”بلاشبہ وہ جو اپنے پروردگار کی ہیبت سے خوف زدہ رہتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کی آیات پر ایمان لاتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کے ساتھ شرک نہیں کرتے اور جو دیتے ہیں جو دینا ہوتا ہے اس عالم میں کہ ان کے دل ترسان و لرزاں ہوتے ہیں اس سے کہ انہیں اپنے پروردگار کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ یہ لوگ نیکیوں میں تیزی کرتے ہیں اور ان کے انجام دینے کے لئے آگے آگے رہتے ہیں۔“

ظاہر میں تصور ہوتا ہے کہ تیزی کرنے میں بھی سبقت مضمر ہے۔ [۱] تو دوسرے جملہ وہم لہا سابقون کا کیا مفاد ہے، مگر غور کیا جائے تو تیزی کرنے میں سبقت کی کوشش ہے اور ہم لہا سابقون میں اس کے نتیجے کا اظہار ہے کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ ایک یہ بھی پہلو ہے کہ تیزی کرنا بجائے خود عمل کی نوعیت ہے اور سابقون دوسروں کے مقابلہ میں ان کا آگے رہنا ہے، ایک تفسیر یہ ہے کہ تیزی عمل میں ہے اور اس کے نتیجے میں جو سبقت ہے وہ جنت کی طرف ہے۔ [۲]

وَلَا تُكَلِّفْ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَاَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٦٢﴾

”اور ہم کسی نفس کو احکام نہیں دیتے مگر اس کے مقدور بھرا اور ہمارے پاس ایک نوشتہ ہے جو حق ہی بات کہتا ہے اور ان پر ظلم نہیں ہوتا۔“

یعنی اللہ ہر ایک کی طاقت کے پیمانہ سے واقف بھی ہے اور جس حد تک وہ مجبور ہے، اس پر مواخذہ ظلم ہے جس سے وہ بمقتضائے عدل بری بھی ہے لہذا ناممکن ہے کہ مقدور سے زیادہ کسی پر پابندی عائد کرے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس میں وہ عقل و ذہن کا تصور بھی داخل ہے جو جسمانی طور پر یا فقدان ذرائع و اسباب سے ہو جس کی وجہ سے اس کے دماغ میں یا تو معارف حقہ کے سمجھنے کی صلاحیت بالکل ہی نہیں ہے یا کسی نہ کا کسی حد تک کم ہے لہذا خواہ وہ ظاہری طور پر منکرین میں داخل ہو یا عمر بھر شک و شبہ میں گرفتار رہے ہے، ہم چاہے اپنے قانون شرع کے تقاضوں کے مطابق اسے زمرہ کفار میں داخل کریں اور وہی سلوک کریں جو اس طبقہ کے ساتھ ہونا چاہیے لیکن اصل میں یہ خدا ہی جانے کہ کون وا قعز یا دہ مستحق سزائے خردی ہے اور کون کم مستحق ہے اور کون بالکل ہی مستحق سزا نہیں ہے، بہر حال اللہ کے پیمانہ عدل کے تمام گمراہ جماعتوں کے افراد میں بھی مجازاۃ کے اعتبار سے فرق ہونا لازمی ہے۔

بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عَمَلُوْنَ ﴿٦٣﴾
حَتّٰى اِذَا اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذٰبِ اِذَا هُمْ يَّجْعَرُوْنَ ﴿٦٤﴾ لَا تَجْعَرُوْا الْيَوْمَ تَف

[۱] یجتہدون فی السبق الیہا رغبتہا (تبیان)

[۲] ہم من اجل تلك الخیرات سابقون الی الجنة (تبیان)

اِنَّكُمْ مِّنْ اٰلِ تَنْصُرُوْنَ ﴿٦٥﴾ قَدْ كَانَتْ اٰيَتِي تُنٰثِرُ عَلَيْكُمْ فَاَنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ

تَنْكِبُوْنَ ﴿٦٦﴾ مُسْتَكْبِرِيْنَ ۗ بِهٖ سَمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴿٦٧﴾

”بلکہ اُن کے دل اس سے بے خبری کے عالم میں ہیں اور اس کے علاوہ اُن کے دوسرے کرتوت ہیں جو وہ کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان کے دولت مندوں کو ہم عذاب کی گرفت میں لیتے ہیں تو وہ ایک دم چیخ اٹھتے ہیں، اب آج چیخو چلاؤ نہیں، تمہیں ہماری طرف سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ ارے میری آیات تمہارے سامنے پڑھی جاتی تھیں تو تم پچھلے پیروں پلٹ جاتے تھے غرور سے کام لیتے ہوئے قصوں کہانیوں میں لگ کر چھوڑ دیتے تھے۔“

تہجرون کا ترجمہ ”چھوڑ دیتے تھے“ ایک تفسیر کے مطابق ہے، دوسری تفسیر کے اعتبار سے ترجمہ ہوتا ”بیہودہ بکواس کرتے ہو“ [۱]

اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَاءَهُمْ مَّا لَمْ يَأْتِ اٰبَاءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٦٨﴾ اَمْ لَمْ

يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكَرُوْنَ ﴿٦٩﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ۗ بَلْ جَاءَهُمْ

بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كُرْهُوْنَ ﴿٧٠﴾

”کیا انہوں نے اس کلام پر غور نہیں کیا یا اُن کے پاس ایسی چیز آئی ہے جو اُن کے پہلے والے باپ داداؤں کے پاس نہیں آئی تھی؟ یا انہوں نے اپنے پیغمبر کو پہچانا نہیں ہے اس لئے وہ انکار کرتے ہیں؟ یا وہ کہتے ہیں کہ اس میں دیوانگی ہے؟ بلکہ وہ تو حق لے کر آیا ہے اور ان میں سے زیادہ تر لوگ حق کو ناپسند کرتے ہیں۔“

یہ تہجرون کا انداز اس حقیقت کے اظہار کے لئے ہے کہ یہ کلام ایسا دلائل حقانیت کا حامل ہے کہ کسی صاحب عقل کو اس کا انکار نہیں کرنا چاہیے اور اس کے خلاف جتنے وجودہ انکار ہو سکتے ہیں، وہ سب بے جا اور غلط ہیں۔

”انہوں نے غور نہیں کیا تو کیوں؟“ وہ نئی چیز ہے؟ تو ایسا بھی نہیں۔ وہ اس پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتے ہیں؟ یہ بھی غلط ہے۔ وہ چالیس سال ان کے درمیان زندگی گزار چکا۔ وہ دیوانہ ہے؟ ایسا بھی نہیں۔ اس نے تو انسان کو درس آگہی دے کر عقل کو جو ہر عطا کیا ہے، آخر میں ان سب باتوں کے غلط ہونے کو ہدایت عقل کے حوالے کر کے اصلیت بتادی کہ یہ کتاب چونکہ حق پر مشتمل ہے اور ان میں اکثر حق کے دشمن ہیں، اس لئے وہ جان بوجھ کر اس کا انکار کرتے ہیں اور کچھ بھی نہیں ہے۔

وَلَوْ اَتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۗ بَلْ

اَتَيْنَهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٧١﴾

”اور اگر حق ان کی نفسانی خواہشوں اور ذاتی خیالات کا تابع ہو جائے تو آسمان اور زمین جو ان کے اندر ہیں سب

[۱] تہجرون الحق بالاعراض عنه و تہجرون ای تفحشون فی المنطقی (مجمع البيان)

تباہ و برباد ہو جائیں بلکہ ہم نے ان کے سامنے ان کی نصیحت کا سبق پیش کیا ہے مگر وہ اپنے سبق سے روگردانی کرتے ہیں۔

حق انسانی آراء اور خواہشات کا تابع نہیں ہو سکتا:

غور کیا جائے تو انسانی خواہشوں سے دنیا میں فساد تو سمجھ میں آتا ہے لیکن اس فساد کی لپیٹ میں آسمان بھی آجائے، یہ سمجھ میں نہیں آتا، لیکن جب ہم قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر اھو آء کے لفظ کا استعمال دیکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ انسان کے طمع زاد خیالات جو عقائد باطلہ کی شکل میں ہیں انہیں بھی قرآن مجید نے اھو آء کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور اسی لئے ہم نے اھو آء کے لفظ کے ترجمہ میں دو الفاظ صرف کئے ہیں، "نفسانی خواہشوں اور ذاتی خیالات"۔

اب اس میں جب تمام عقائد باطلہ آگئے جن کے ساتھ توحید اور عدل کسی کی کوئی حقیقت نہیں رہتی اور قرآن میں دوسری جگہ تعدد آلہہ کے لئے موجود ہے: لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا ۗ (انبیاء۔ ۲۲) اگر خدائے حقیقی کے علاوہ اور خدا ہوتے تو زمین و آسمان کا نظام درہم برہم ہو جاتا اور اس کے بعد حق کے تابع اھو آء ہونے کے بعد زمین و آسمان کا نظام درہم برہم ہو جانا بالکل عقل و منطق کے مطابق ہے۔

أَمْ تَسْأَلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖ وَهُوَ خَيْرُ الرَّزِقِينَ ﴿۴۶﴾ وَإِنَّكَ لَتَدْعُهُمْ
إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۴۷﴾ وَإِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ
لَنَكِبُونَ ﴿۴۸﴾

”اچھا! کیا آپ ان سے معاوضہ کے طلب گار ہیں؟ تو آپ کے پروردگار کی طرف کا معاوضہ زیادہ بہتر ہے اور وہ روزی عطا کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے اور یقیناً آپ ان کو کوسیدھے راستے کی طرف بلا تے ہیں اور بلاشبہ وہ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اُس راستے سے منحرف ہیں۔“

”جیسے خالق عالم کو قرآن میں دوسری جگہ احسن الخالقین ”خلق کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے“ اور یقیناً آپ ان کو سیدھے راستے کی طرف بلا تے ہیں اور بلاشبہ وہ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اُس راستے سے منحرف ہیں۔“

جیسے خالق عالم کو قرآن میں دوسری جگہ احسن الخالقین ”خلق کرنے والوں میں سب سے بہتر“ کہا گیا ہے، ویسے ہی اس روزی رسان کو یہاں خیر الرزقین ”روزی دینے والوں میں سب سے بہتر“ کہا گیا ہے۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ اللہ کی دی ہوئی طاقت اور اس کے پیدا کیے ہوئے رزق سے کسی دوسرے کو خالق اور رازق کہنا یا سمجھنا بھی شرک نہیں ہے۔ [۴۸]

[۴۸] سورۃ انبیاء۔ ۲۲

[۴۹] فی ہذا دلالت علی ان فی العباد من یرزق غیرہا بذن اللہ (مجمع البیان)

”وہ اس راستے سے منحرف ہیں، یعنی باطل ہیں، اس لئے کہ حق دو مختلف سمتوں میں نہیں ہو سکتا۔“^[۱]

وَلَوْ رَحِمْنَاهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِنْ ضُرٍّ لَلَجُّوا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۴۵﴾

”اور اگر ہم اپنی رحمت اُن کے شامل حال کرتے اور جس مصیبت میں وہ ہیں اُس کو دور کر دیتے تو وہ اور زیادہ اپنی سرکشی میں اندھا دھند سرگرم ہوتے۔“

کہا گیا ہے کہ جب رسول خدا ﷺ مبعوث ہو چکے تو مکہ میں شدید قحط پڑا۔ اس وقت ابوسفیان وغیرہ نے رسول ﷺ کے پاس آ کے کہا کہ آپ تو اپنا خالق کائنات سے تعلق بتاتے ہیں تو پھر اس مصیبت کو ہم سے دور کیوں نہیں کراتے؟ اس پر آیت اتری۔ مطلب یہ ہے کہ مصیبت پڑنے پر تو عموماً خدا یاد آتا ہے مگر یہ ایسے ہیں کہ مصیبت پڑنے پر بھی اللہ سے کوئی لگاتے بلکہ سرکشی پر قائم رہتے ہیں تو اگر مصیبت دور ہو جائے، تب تو اُن کے سرکشی میں اور اضافہ ہو جائے گا مگر یہ شان نزول کوئی مستند حیثیت نہیں رکھتی، جب کہ یہ شان نزول ثابت نہیں ہے تو یہ عام خدا فراموش بندوں کا کردار ہو سکتا ہے اور ایک خیال یہ ہے کہ وہ آخرت سے متعلق ہے کہ وہاں انسان آرزو کرے گا کہ میں پھر دنیا میں واپس ہوں تو نیک اعمال کروں گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ آخرت کا عذاب ان سے ہٹ جائے اور وہ دنیا میں واپس ہوں تو پھر بھی وہ صحیح راستے کو اختیار نہیں کریں گے۔^[۲]

وَلَقَدْ أَخَذْنَاهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكْبَرُوا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَنْتَصِرُ عَوْنٌ ﴿۴۶﴾ حَتَّىٰ إِذَا

فَتَحَنَّنَا عَلَيْهِمْ بِآبَاءِ إِذْ أَخَذْنَا مِنْهُمُ الْمُبْلِسُونَ ﴿۴۷﴾

”اور ہم نے اُنہیں سزا میں گرفتار کیا ہے، پھر بھی اُنہوں نے اپنے پروردگار کے سامنے عاجزی نہ کی اور نہ وہ تضرع و زاری سے کام لیتے ہیں، یہاں تک کہ جب ہم سخت عذاب والا دروازہ کھول دیں گے تو اُنہیں ایک دم ناامید ہو جانا پڑے گا۔“

یعنی ابھی تو یہ عذاب استیصال نہیں ہے، صرف بیدار کرنے کے لئے ایک جھنجھوڑی ہے مگر اس پر ان کی آنکھ نہ کھلی تو پھر وہ عذاب آجائے گا جس کے بعد کوئی امید نجات ہو ہی نہیں سکتی۔^[۳]

وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَ لَكُمْ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۗ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ﴿۴۸﴾

وَهُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿۴۹﴾ وَهُوَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ وَلَهُ

اخْتِلَافُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۵۰﴾

[۱] (ان طریق الاستقامت و احدمانحالہ فکثیر (رازی)

[۲] کہا قال: ولورڈوالعادالمادہو عنہ (تبیان)

[۳] (الابلاس الیاس من کلّ خیر) (رازی)

”اور وہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے کان، نگاہیں اور دل پیدا کیے، تم بہت کم شکر گزار ہوتے ہو اور وہ وہ ہے جس نے تمہیں اطراف زمین میں پھیلا دیا اور اُس کی طرف تم سمت کر جاؤ گے اور وہ وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے اور شب و روز کی آمد و رفت اُس کی کارگزاری ہے تو پھر تم عقل سے کام کیوں نہیں لیتے؟“

ذرا کم کا ترجمہ ہم نے کیا ہے ”پھیلا دیا“ یہ اس لفظ کے ایک معنی کے لحاظ سے ہے [۱] لیکن دوسرا قول یہ ہے کہ ذرا کے معنی خَلَقَ کے ہیں یعنی تم کو زمین میں پیدا کیا ہے [۲] مگر میرا ذہن یہ کہتا ہے کہ ذرا کے معنی خَلَقَ کے ہوتے ہیں تو اس صورت میں من الارض ہوتا کہ اُس نے زمین میں تمہیں پھیلا دیا۔

اختلاف کا ترجمہ ”آمد و رفت“ بھی ایک معنی کے لحاظ سے ہے۔ [۳]

دوسری تشریح یہ ہے کہ اس اختلاف کا وہی مفہوم جس کے لحاظ سے عام طور پر ہماری زبان میں اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے یعنی ایک دوسرے کے خلاف ہونا، بعض ترجمے اس کی طرف ناظر معلوم ہوتے ہیں۔ [۴]

بَلْ قَالُوا مِثْلَ مَا قَالَ الْأَوَّلُونَ ﴿۸۱﴾ قَالُوا إِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا إِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ﴿۸۲﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَآبَاؤُنَا هَذَا مِنْ قَبْلُ إِن هَذَا إِلَّا آسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿۸۳﴾

”بلکہ انہوں نے کہی ایسی بات جیسی پہلے والوں نے کہی، انہوں نے کہا کہ کیا جب ہم مرجائیں گے اور خاک اور متفرق ہڈیوں کی شکل میں ہو جائیں گے تو کیا ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟ ہم سے بھی یہ وعدہ ہوا ہے اور ہمارے باپ داداؤں سے بھی اس سے پہلے، یہ نہیں ہیں مگر پہلے والوں کی من گڑھت باتیں۔“

”انہوں نے کہی ویسی ہی بات“ یعنی اس دور کے کافروں کے پاس کوئی بنیاد اعتراض اور کوئی نئی دلیل دعوت رسول کے خلاف نہیں ہے بلکہ وہی باتیں ہیں جو ہر دور میں انبیاء کی دعوت کے خلاف کہی گئیں اور یہ اس کی دلیل ہے کہ تمام انبیاء کا پیغام ایک ہی رہا ہے: اُن کا یہ کہنا کہ ہم سے یہ وعدہ ہوا ہے اور ہمارے باپ داداؤں سے یہ بھی اس کی دلیل ہے اور پہلے والوں کی سی باتیں کہنا بھی اس کا ثبوت ہے۔

قُلْ لِّمَنِ الْأَرْضُ وَمَنْ فِيهَا إِن كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۸۴﴾ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۸۵﴾ قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَوَاتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴿۸۶﴾

[۱] قال ابو مسلم: بجمثل بسطكم فيها ذرية بعضكم من بعض حتى كثرتم (رازی)

[۲] خلکم و اوجدکم (تبیان)

[۳] کہا بقال اذا اتى الرجل الدار مرة بعد مرة هو يختلف في هذه ارا (تبیان)

[۴] اس کے سبب سے رات اور دن کا اولنا بدلنا ہے (مقبول ترجمہ)

سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿٨٥﴾ قُلْ مَنْ بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ
وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٨٦﴾ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ قُلْ فَاِنِّي تَسْحَرُونَ ﴿٨٧﴾ بَلْ
اَتَيْنَهُم بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُونَ ﴿٩٠﴾

”کہیے کہ کس کی ہے زمین اور جو اُس میں رہتے ہیں، اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہیں گے کہ اللہ کی، پھر اس کے بعد بھی کیا تم نصیحت نہ مانو گے؟ کہیے کہ کون پروردگار ہے، ساتوں آسمانوں کا اور پروردگار ہے اُس بڑے تخت سلطنت کا؟ وہ کہیں کہ پھر بھی کیا تم پر ہیزگار نہ بنو گے؟ کہیے کہ کس کے ہاتھ میں ہے ہر چیز اقتدار اور وہ پناہ دینے والا ہے اور اُس کے مقابلہ میں پناہ نہیں دی جاسکتی، اگر تم جانو؟ وہ کہیں گے اللہ کے ہاتھ میں، کہیے کہ پھر بھی تم طلسم باطل میں گرفتار ہو گے؟ بلکہ ہم حق ان کے سامنے لے آئیں ہیں اور بلاشبہ وہ جھوٹے ہیں۔“

وحدانیت رب کی دلیل جن مقدمات پر مبنی ہے یعنی ان آثار قدرت کا مشاہدہ اور اُن کا اللہ کے ساتھ مخصوص ہونا، وہ سب مشرکین کے لئے بھی مسلم ہیں یعنی آثار قدرت کو وہ اپنے اصنام سے وابستہ کرنے کا کوئی توہم بھی نہیں رکھتے اور یقیناً طور پر سمجھتے ہیں کہ کائنات میں کارگزاری صرف اللہ کی ہے مگر جب نتیجہ کی منزل آتی ہے تو وہ بھٹک جاتے ہیں اور اللہ کو چھوڑ کر معبود دوسروں کو بتالیتے اور اُن کی پرستش کرنے لگتے ہیں، اس فکر و عمل کے تضاد کو قرآن مجید نے یہاں ان الفاظ میں اور بعض دوسرے مقامات پر انہی سے ملتے جلتے الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے اور ان کے ضمیر کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

چونکہ اس کے پہلے حشر و نشر کے بارے میں اُن کے متعجبانہ سوال کا جو درحقیقت انکار کی حیثیت رکھتا تھا ذکر ہے، اس لئے علامہ مطبری علیہ الرحمۃ نے اسے اسی حشر و نشر پر ان کے سوال کا جواب قرار دیا ہے کہ جو ان سب باتوں پر قادر ہے، وہ مردوں کو بھی زندہ کرنے پر قادر ہے [۱] لیکن چونکہ ترتیب قرآن مطابق تنزیل نہیں ہوئی ہے اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ آیات مقام تنزیل میں بھی قبل والی آیات کے بعد ہی اتری ہیں تاکہ اُن سے یہ نتیجہ برآمد کیا جائے۔

مَا اَتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ اِلٰهٍ اِذَا لَذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ مَّا خَلَقَ وَّلَعَلَّا
بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿٩١﴾ عَلِيْمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعَلٰى
عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٩٢﴾

”اللہ نے کوئی بیٹا نہیں بنایا ہے اور نہ اُس کے ساتھ کوئی خدا ہے، اس وقت تو ہر خدا اپنے مخلوقات کو اپنی طرف جاتا اور اُن میں ایک کا دوسرے پر فوقیت حاصل کرنا چاہتا، پاک ہے خدا اُس سے جو وہ اُس کی طرف منسوب کرتے ہیں، ان دیکھے اور دیکھے سب کا جاننے والا تو وہ بالاتر ہے اُس سے جو یہ شرک کرتے ہیں۔“

[۱] من قدر علیہ قدر علی احياء الموتى لا لله ليس ذلك باعظم منه (مجمع البيان).

اثباتِ توحید میں برہانِ تمنع کی زیادہ واضح تقریر:

علم کلام میں جو ”برہانِ تمنع“ کہا جاتا ہے جسے بہت آسان لفظوں میں بچوں کو سمجھانے کی یوں کوشش کی جاتی ہے کہ ”اگر کئی خدا ہوتے تو ان میں آپس میں جھگڑا ہوتا۔ ایک خدا کچھ کہتا تو دوسرا خدا کچھ کہتا تو کوئی چیز پیدا نہ ہو سکتی۔ اس ”برہان“ کا اصل ماخذ قرآن مجید کی یہ آیت قرار دی جاتی ہے کہ:

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلَٰهَةٌ ۙ إِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا۔ (انبیاء - ۲۲)

اگر ان دونوں (زمین و آسمان) میں ایک اللہ کے علاوہ کئی خدا ہوتے تو وہ دونوں درہم برہم ہو جاتے۔

مگر میرے خیال میں اُس سے زیادہ صاف یہ مضمون اس آیت میں ہے، وہاں پھر الگ سے یہ سوچنے سمجھنے کی بات رہ جاتی ہے کہ کئی خداؤں کے ہونے سے وہ دونوں (زمین و آسمان) درہم برہم کیوں ہو جاتے؟ مگر یہاں یہ وجہ صاف خود الفاظ قرآنی میں بتائی جا رہی ہے کہ ”ہر خدا اپنی مخلوقات کو اپنی طرف لے جاتا، یعنی اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہتا اور ہر ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنا چاہتا“ یعنی اپنے ہی قائم کردہ نظام کو کامیاب بنانا چاہتا تو کائنات کا پورا نظام جو اس وقت ایک واحد کی شکل میں نظر آ رہا ہے، افراتفری کی نذر ہو جاتا۔ کائنات کے اندر باوجود اُس کی کثرت کے نظام کی وحدت کا ہونا منتظم کے واحد ہونے کے قطعی دلیل ہے۔

اس کی کافی تشریح ہماری قدیم تفسیر میں جو زیادہ تراواں معصومین علیہم السلام پر مبنی ہے یعنی تفسیر علی بن ابراہیم میں جسے تفسیر قمی بھی کہتے ہیں، موجود ہے اور علامہ طبرسی نے بھی فلسفی انداز میں اُس کی وضاحت کی ہے اور اُسے مثل اُس دوسری آیت کے برہانِ تمنع کا ماخذ قرار دیا ہے۔^[۱]

قُلْ رَبِّ اِمَّا تُرِيْبِيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿۹۵﴾ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۶﴾ وَاِنَّا

عَلٰى اَنْ تُرِيْكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۹۷﴾

”کہیے کہ اے میرے پروردگار! اگر میری آنکھوں سے مجھے دکھلا دے وہ موقع جس سے انہیں ڈرایا جا رہا ہے تو اے میرے پروردگار! مجھے ظالم جماعت میں شامل نہ کرنا اور بلاشبہ ہم اس بات پر قادر ہیں کہ جو انہیں اطلاع دے رہے ہیں، اُسے آپ ہی کی آنکھوں کے سامنے لے آئیں۔“

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ دعا کرنا اُس عذاب کی ہولناکی کا اظہار ہے کہ وہ جنہیں اُس عذاب کی خبر دی جا رہی ہے، وہ ڈریں یا نہ ڈریں لیکن وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو حقیقت میں بے گناہ ہے، اُس عذاب سے ڈر رہا ہے اور اپنے سچے رہنے کی دعا کرتا ہے^[۲] حالانکہ یہ یقینی ہے کہ وہ عذاب جب بھی آئے، رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔^[۳]

پھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس مکان کا اظہار کہ اگر میرے سامنے یہ عذاب آجائے اور خالق کی طرف سے اپنی قدرت کا اظہار کہ

[۱] ہو مثل قوله: لو كان فيهما آلهة إلا الله لفسدتا (مجمع البيان)

[۲] ای لا تجعلني في جملة من يشملهم العذاب لظلمهم (تبیان)

[۳] في هذه دلالة على جواز نداء الإنسان ما يعلم ان الله يفعل له لا محالة... وذلك الاظهار الرغبة الى الله تعالى (مجمع البيان)

ہاں ہو تو سکتا ہے کہ ہم آپ کے سامنے ہی اُسے لے آئیں، ان کو جو اصل میں مستحق عذاب ہیں ایک تنبیہ ہے کہ اس عذاب کو دور نہیں سمجھنا چاہیے لیکن جو بات اللہ کی قدرت میں ہو وہ ضروری نہیں کہ وقوع میں بھی آجائے، اس لئے دوسری جگہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے خالق کریم نے یہ ضمانت کر لی ہے کہ:

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ (انفال- ۳۳)

اللہ ایسا نہیں ہے کہ انہیں عذاب کرے دارنحالیکہ آپ ان میں موجود ہیں۔

یعنی وہ تو قدرت کا ظہار تھا کہ وہ چاہے تو عذاب آپ کی آنکھوں کے سامنے ہی نازل کر دے مگر اللہ آپ کو اطمینان دلائے دیتا ہے کہ ایسا ہونے والا نہیں ہے کہ آپ کی موجودگی میں اُن پر عذاب آجائے۔

یہ بھی ایک بڑی وہ خصوصیت ہے جو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمۃ للعالمین ہونے کے عملی نتیجے کے طور پر خالق کی طرف سے آپ کو حاصل ہے، اُمم سابقہ میں برابر اُن انبیاء کی آنکھوں کے سامنے اُن کی امتوں پر عذاب آتا رہا مگر ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود تمام کفار کے لئے نزول عذاب سے مانع ہو گیا اور اب بھی عذاب نہیں آ رہا ہے تو سمجھنا چاہیے کہ ان کا ایسا نائب خلق میں موجود ہے جس کی بدولت یہ نظام قائم و برقرار ہے۔

إِذْفَعِ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةِ ۗ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَصِفُونَ ﴿۹۶﴾ وَقُلْ رَبِّ أَعُوذُ بِكَ

مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيْطَانِ ﴿۹۷﴾ وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَنْ يَحْضُرُونِ ﴿۹۸﴾

’برائی کو ختم کیجئے ایسے طرز عمل سے جو بہتر سے بہتر ہو۔ ہم خوب جانتے ہیں جو جو وہ کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے میرے پروردگار! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں شیطانوں کے وسوسوں سے اور پناہ مانگتا ہوں تجھ سے اے میرے پروردگار! اس سے کہ وہ میرے قریب آئیں۔‘

برائی کے مقابلہ میں بھلائی کرنے کی تعلیم:

پہلی آیت صحیح حدود میں ’مقاومت مجہول‘ اور مخالفین اسلام کے مقابل میں بمناسبت حکمت و مصلحت ’رواداری‘ کی تعلیم ہے، جیسا کہ جناب شیخ الطائفہ فرماتے ہیں:

إذا ذكرو المنكر من القول..... الشرك..... ذكرك الحجة في مقابلته و ذكرك الموعدة التي تصرف عنه إلى ضده من الحق على وجه اللطف والدعاء إليه والحث عليه (تبيين)

جب وہ ہری باتیں شرک آمیز کہیں تو آپ اُن کے مقابلہ میں دلیل بیان کریں اور اس طرح کا وعظ و نصیحت پیش کریں جو انہیں اُس سے پلٹا سکے اُس کے مخالف پہلو کی طرف جو حق ہے رواداری کے ساتھ اور دعوت دینے کے طور پر اور ترغیب و تحریر کی صورت میں اس کے ساتھ یہ ارشاد کہ ’ہم خوب جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں‘ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ تو تبلیغ حق کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر نرمی ہی برتتے، اُن کی سخت کلامی یا دشنام طرازی یا باطل پروری سے ہم خوب واقف ہیں اور وقت آنے پر ہم اُس کی سزا دیں گے۔^[۱]

[۱] نحن أعلم بما يستحقون به من الجزاء في الوقت الذي يصلح الاخذ بالعقوبة (تبيين)

بعد کی دو آیات اگر مقام تنزیل میں بھی پہلی آیت سے متصل ہیں تو یہ مفہوم نکلتا ہے کہ جذبہ انتظام پیدا کرنا اور سخت کلامی کے جواب میں جوش دلانا کہ تم اُس سے زیادہ سخت کلامی سے کام لو، یہ سب شیطان کی ترکیبیں ہوتی ہیں، اُس سے پناہ مانگنا چاہیے۔

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ ﴿١٩﴾ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا

تَرَكْتُ كَلَّا ۗ إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا ۗ وَمِنْ وَرَائِهِمْ بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿٢٠﴾

”یہاں تک کہ جب اُن میں سے کسی ایک کے سر پر موت آکھڑی ہو تو وہ کہے گا کہ اے میرے پروردگار! مجھے پلٹا دو، شاید میں اب نیک اعمال کروں اُس میں کہ جو میں چھوڑ آیا ہوں، ہرگز نہیں۔ یہ ایک لفظ ہے جو وہ بس کہہ رہا ہے اور اُن کے آگے اب برزخ کا زمانہ ہے اُس دن تک کہ جب وہ جزاؤں کے لئے اٹھائے جائیں گے۔“

”یہ ایک لفظ ہے جسے وہ کہہ رہا ہے، یعنی اس سے کوئی فائدہ نہیں یا اس کی کوئی اہلیت نہیں [۱] اس میں قابل غور بات یہ ہے کہ کافر کا قول ہے: رب ارجعون اس میں خطاب پروردگار سے ہے اور پھر جمع کا صیغہ ”تم لوگ مجھے پلٹادو“۔ اس کے لئے بعض ہندوستانی مذاق کے اہل قلم نے یہ کہہ دیا ہے کہ یہ جمع بطور تعظیم ہے [۲] مگر یہ ہماری اُردو میں ہوتا کہ تعظیم ”تم“ اور ”آپ“ کہیں مثلاً دام ظلک کے بجائے کسی بزرگ کو دام ظلکم کہیں، جدید عربی میں بھی کسی حد تک اس کا رواج ہو چلا ہے مگر عربی قدیم میں جو قرآن کی زبان ہے، ایسا نہیں ہوتا ہے انبیاء کرام کے مخاطب بارگاہ الہی میں قرآن میں موجود ہیں، ہر جگہ واحد کا صیغہ ہے مثلاً رب اغفر لی، ہب لی، اتنا وغیرہ وغیرہ یہاں تک کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی بھی ہے: رب زدنی علماً... والحقنی بالصلحین۔ حالانکہ خالق کی عظمت کے تقاضے انبیاء سے زیادہ کس کے پیش نظر ہوں گے؟ اس لئے اس اختلاف اسلوب کا ایک لطیف پہلو بعض مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ کافر نے گھبرا کر خدا کو پکارا: رب جیسے ہم کہیں ’اے اللہ‘ اور پھر ملائکہ سے خطاب کر کے کہا: ارجعون ”مجھے واپس کر دو دنیا کی طرف“ [۳]

اس آیت کے مضمون سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے جو احادیث سے بھی ثابت ہے کہ موت کے ساتھ ہی انسان کو اپنے اچھے اور برے انجام کا پتہ چل جاتا ہے۔ [۴]

فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ ﴿٢١﴾

”تو جب صور پھونکا جائے گا تو اُن کے درمیان کوئی خونی رشتے نہیں ہوں گے اُس دن اور نہ آپس میں اُن میں پوچھ گچھ ہوگی۔“

یعنی کوئی کسی کا خبر گیر نہ ہوگا، نفسی نفسی کا عالم ہوگا۔ ”نہ اُن میں آپس میں کچھ پوچھ ہوگی۔“ یہ اُس آیت کے خلاف نہیں ہے کہ:

[۱] کلام بقولہ ولا فائدة في ذلك وقيل معناه يقول لها بلسانہو لیس لها حقيقة (مجمع البيان)

[۲] رب ارجعون اس میں و او جمع کا نہیں ہے بلکہ تعظیم کا ہے (مولانا مقبول احمد صاحب)

[۳] استغاثوا ولا باللہ ثم رجعوا الى مسئلة الملائكة (مجمع البيان)

[۴] في الآية دلالة على ان احدا لا يموت حتى يعرف اضطرار منزلة عند اللہ و اللہ من اهل الثواب والعقاب (تبیان)

وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ (صافات. ۲۴) (طور. ۲۵)

اور ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوگا آپس میں پوچھ گچھ کرتا ہوا۔

اس لئے کہ دونوں مختلف وقتوں کے تذکرے ہیں، صورت کی قیامت خیز آواز ایک دم آئے گی تو لوگ دہشت زدہ، ششدر اور حیران ایسے ہوں گے کہ کوئی دوسرے سے پوچھ گچھ نہیں کر سکے گا، پھر جب اپنے آپے میں آئیں گے اور اب ایک طویل المیعاد دور سے گزر رہے ہوں گے جو آخری انجام کے سامنے آنے تک ہے تو اب ایک دوسرے سے گفتگو بھی ہوگی اور سوال و جواب بھی جس کا متعدد موقعوں پر قرآن مجید میں ذکر ہے۔^[۱]

فَمَنْ ثَقَلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۱۲۰﴾ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ
فَأُولَئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ ﴿۱۲۱﴾ تَلْفَحُ وُجُوهَهُمُ النَّارُ
وَهُمْ فِيهَا كَالِحُونَ ﴿۱۲۲﴾ أَلَمْ تَكُنْ أَيْتِي تَتْلَىٰ عَلَيْهِمْ فَاكُنْتُمْ بِهَا تُكذِّبُونَ ﴿۱۲۳﴾
قَالُوا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَالِّينَ ﴿۱۲۴﴾ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْهَا
فِيَا عَدُوْنَا فَإِنَّا ظَالِمُونَ ﴿۱۲۵﴾ قَالَ اخْسُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ ﴿۱۲۶﴾ إِنَّهُ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْ
عِبَادِي يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّحِيمِينَ ﴿۱۲۷﴾
فَاتَّخَذُوا لَهُمْ سَخِرِيًّا حَتَّىٰ أَنسَوْكُمْ ذِكْرِي وَكُنْتُمْ مِنْهُمْ تَضْحَكُونَ ﴿۱۲۸﴾ إِنِّي
جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوا ۗ إِنَّهُمْ هُمُ الْفَٰئِزُونَ ﴿۱۲۹﴾

”تو جس کے نیک کاموں کا پلہ بھاری ہوگا تو یہ لوگ ہر طرح کی بہتری حاصل کرنے والے ہوں گے اور جس کا پلہ ہلکا ہوگا تو یہ وہ ہیں جنہوں نے اپنے لوگھائے میں مبتلا کیا ہے، وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، آگ ان کے چہروں کو جھلسا رہی ہوگی اور ان کی شکلیں اس میں بگڑ گئی ہوگی کیا ایسا نہیں ہے کہ میری آیات تمہارے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو تم انہیں جھٹلاتے تھے؟ وہ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم پر ہماری کم بختی غالب آگئی تھی اور ہم گمراہ لوگ تھے۔ اے ہمارے پروردگار! ہم کو یہاں سے نکال دے، پھر اگر ہم ایسا کریں تو بے شک ہم سراسر ظالم ہوں گے، ارشاد ہوا کہ اب چپکے اسی میں پڑے رہو اور مجھ سے کوئی بات نہ کرو، بلاشبہ میرے بندوں میں سے جو کچھ کہتے تھے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے تو تو ہمیں بخش دے اور رحمت ہمارے شامل حال فرما۔ اور تو بہترین رحم کرنے والا ہے، اس پر تم ان کا مذاق اڑاتے تھے، یہاں تک کہ انہوں نے تمہیں میری یاد دلانا چھوڑ دی اور تم ان پر ہنستے تھے، بے شک میں نے اب آج ان کو صلہ عطا کیا ہے ان کی صبر برداشت کا یقیناً وہی

[۱] المقیامۃ احوال و موطن..... و لهذا معنی قول ابن عباس لما سئل عن الایتین فقال: لهذا تارات یوم القیامۃ (مجمع البیان)

کامیاب ہیں۔“

انسو کم ذکر می کا ایک مفہوم وہی ہے جس کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا ہے کہ ”انہوں نے تمہیں میری یاد دلانا چھوڑی دی“ اور ایک یہ مفہوم ہے کہ ان کو بنانے اور مذاق اڑانے کی دھن نے تمہیں میری یاد سے بالکل غافل کر دیا۔^[1]

قُلْ كَمْ لَبِئْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ ﴿١١٢﴾ قَالُوا لَبِئْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ
فَسَلِّ الْعَادِيْنَ ﴿١١٣﴾ قُلْ إِنْ لَبِئْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا لَّوْ أَنْكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١١٤﴾
أَنْحَسِبْتُمْ أَنْمَّا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنْكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ ﴿١١٥﴾

”اس نے کہا کہ تم لوگ زمین میں کتنے برس رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم ایک دن یا دو دن کے کچھ حصہ میں رہے تو جو گنے والے ہوں ان سے پوچھ لے۔ ارشاد ہوا کہ نہیں رہے تم مگر بہت کم اگر تم جانتے۔ تو کیا تم سمجھتے تھے کہ ہم نے تم کو بے کار پیدا کیا اور یہ کہ تم ہماری طرف پلٹ کر نہیں آؤ گے؟“

یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ دور کائنات میں وقفہ حیات عنصری انسان کا کتنا مختصر ہے، پھر بھی وہ اسے اہمیت دیتا ہے اور آخرت کے دور حیات ابدی کی فکر نہیں کرتا۔

فَتَعَلَى اللَّهِ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ ﴿١١٦﴾ وَمَنْ يَدْعُ
مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ ۖ لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ ۗ فَأَيُّمَا حِسَابُهُ عِنْدَ رَبِّهِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ
الْكَافِرُونَ ﴿١١٧﴾ وَقُلْ رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّحِيمِينَ ﴿١١٨﴾

”تو بلند ہے اللہ جو حقیقی سلطنت کا مالک ہے، کوئی خدا نہیں سوا اس کے، وہ جو بزرگ مرتبہ عرش کا مالک ہے اور جو اللہ کے سوا کسی خدا کی دہائی دے جس کے لئے اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے تو اُس کا حساب کتاب بس اُس کے پروردگار کے یہاں ہوگا، بلاشبہ کفر اختیار کرنے والے دین و دنیا کی بہتری نہیں پائیں گے اور کہیے کہ اے میرے پروردگار! بخش دے اور رحم فرما اور تو سب سے اچھا رحم کرنے والا ہے۔“

اس سورہ کے آغاز و انجام میں مناسبت قابل لحاظ ہے کہ آغاز سورہ کا تھا قد افلح المؤمنون سے اور انتہا تقریباً ہورہی ہے لا یفلح الکافرون پر اس طرح مثبت اور منفی دونوں پہلو سامنے لا کر گویا موضوع کلام کو مکمل کیا گیا لیکن حسن اختتام کے لئے آخر میں پھر اہل ایمان کو دعائے مغفرت و رحمت کی تلقین کے لئے ایک آیت کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

[1] معنایاً لغتاً غلکم بالسخریة نسیتم ذکر می (تجیان)

سُورَةُ النُّورِ

مدنیہ..... ۶۴..... آیات

چونکہ بعض احادیث میں خواتین کو سورہ نور کی خاص طور پر تعلیم دینے کا حکم ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سورہ شروع سے اسی نام سے موسوم ہے، اگرچہ وہ آیت جسے آیہ نور کہتے ہیں: **اللَّهُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، مَثَلُ نُورٍ كَمِشْكُوٰةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ...** الخ موجودہ ترتیب کے لحاظ سے درمیان میں ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی حیثیت اس سورہ میں اسی آیت کو دی گئی ہے جس کی بناء پر اس سورہ کا نام ”سورہ نور“ ہو گیا۔ اس کے علاوہ دوسرے مضامین اس سورہ میں حسب ذیل ہیں۔

سورہ نور کے خاص خاص مضامین:

- ۱.....جنسی گناہ (زنا) کی حد شرعی
- ۲.....تہمت زنا عائد کرنے والے کی حد شرعی۔
- ۳.....ثبوت کے لئے چار گواہان عادل کی شہادت عینی کی ضرورت ورنہ تہمت عائد کرنے والے پر حد شرعی جاری ہوگی۔
- ۴.....لعان یعنی شوہر کی طرف سے اپنی زوجہ پر الزام زنا لگانے کی صورت میں شرعی قانون۔
- ۵.....ازواج رسول ﷺ میں سے ایک پر اس قسم کی تہمت لگانے والوں کی مذمت۔
- ۶.....ایسی غلط خبر سن کر اس کا چرچا کرنے والوں کی شدید مذمت۔
- ۷.....گھروں میں بلا اجازت داخلہ کی ممانعت۔
- ۸.....سلام کا حکم
- ۹.....اجنبی مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے پر نظر ڈالنے کی ممانعت۔
- ۱۰.....خواتین کے پردہ کا حکم اور اس کی اہمیت
- ۱۱.....نکاح کی ترغیب
- ۱۲.....غلام و کنیز کے مکاتبہ کا حکم
- ۱۳.....عبادات الہی کے لحاظ کے ساتھ تجارت کا حکم
- ۱۴.....کافروں کے اعمال کا بے کار ہونا۔
- ۱۵.....ہر ذی روح کی خلقت پانی سے۔
- ۱۶.....صاحب ایمان صالحین سے مکمل اقتدار کا وعدہ۔

- ۱۷..... گھر کے خاص افراد یہاں تک کے بچوں سے بھی ایک حد تک پردہ۔
 ۱۸..... ضعیف العمر خواتین کے برقع، چھوڑنے کی اجازت کے باوجود پردہ داری کی ضرورت۔
 ۱۹..... صاحبان ایمان کی شان۔
 ۲۰..... رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے امتیازی طور پر تعظیم و احترام کا حکم..... وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

سُورَةٌ أَنْزَلْنَاهَا وَفَرَضْنَاهَا وَأَنْزَلْنَا فِيهَا آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ①

”یہ ایک سورہ ہے جسے ہم اتار رہے ہیں اور ان احکام کو نافذ کر رہے ہیں اور ہم اس میں کھلی ہوئی آیات اتار رہے ہیں کہ شاید تم نصیحت قبول کرو۔“

آیات کے ایک مجموعہ کے لئے ”سورہ“ اور سورہ کے اجزاء کے لئے ”آیات“ کی اصطلاح جو مسلمانوں میں ہے، اس کا سب سے زیادہ واضح ماخذ اس سورہ کا آغاز ہو سکتا ہے اس لئے عموماً ترجمہ انزلنا اور فرضنا اور پھر انزلنا کا جو سب ماضی کے صیغے ہیں، لوگ زمانہ گزشتہ ہی کے ساتھ کرتے ہیں [۱] مگر ہم نے حال کے ساتھ کیا ہے، اس لئے کہ ہمارے خیال میں یہ ویسا ہے جیسے عقود میں نکاح کے انکحت اور قبلیت اور خرید و فروخت کے لئے بیعت اور اشدتیریت سب ماضی کے صیغے ہوتے ہیں مگر مقصود اس سے یہ ہوتا ہے کہ اسی وقت ان الفاظ سے یہ نکاح یا بیع واقع کیا جا رہا ہے یہی حیثیت ان الفاظ سے اس تنزیل اور فرض کے عمل کا آغاز ہو رہا ہے جس کا اعلان کیا جا رہا ہے بے شک جہاں تک میری نظر ہے مفسرین نے اس پہلو سے تعرض نہیں کیا ہے۔

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۚ وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا

رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللّٰهِ اِنَّ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۗ وَلَيْشَأْهَدَا عَبْدًا بِيَهُمَا

طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ②

”زنا کار عورت اور زنا کار مرد، ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ اور تمہیں ان پر اللہ کی اطاعت میں ترس نہ آئے اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو اور ان دونوں کی سزا کے موقع پر مؤمنین میں سے ایک جماعت کو موجود ہونا چاہیے۔“

جنسی گناہ (زنا) کی حد شرعی:

یہ ”زنائے غیر محصنہ“ یعنی غیر شوہر دار عورت اور غیر صاحب زوجہ مرد کی سزا ہے۔ یہ مجرم کی سزا ہے اصلاح خلق کے لئے ضروری ہے، اس میں جذبات کو دخل دینا درست نہیں ہے، ”رحم دلی“ جو فرائض میں سد راہ ہوا چھی چیز نہیں ہے۔

[۱] یہ ایک سورہ جس کو ہم نے نازل کیا، جس کو ہم نے فرض گردانا، اس میں کھلے کھلے اصول نازل کیے (مقبول ترجمہ)

بے شک وہ منظر بڑا دردناک ہوتا ہے جب ایک شخص پر کوڑے پڑ رہے ہوں، ایک جاندار جسم تکلیف سے مضطرب ہو ہو کر بے تاب ہو رہا ہے، تلوار سے گردن اڑا دیا جانا شاید آسان ہے، نسبت اس طریقہ قتل کے جو اس تدریجی عذاب کے ساتھ ہے اور اس سے ہم محسوس کرتے ہیں کہ اسلام نے اس جنسی ظلم کو جو عزت ناموس پر ڈاکہ ڈال کر ہوتا ہے، قتلِ نفس سے زیادہ اہمیت دی ہے۔

اب کوئی یہاں رحم دلی کا مظاہرہ کرے کہ یہ تڑپ ایک آدمی کی ہم سے دیکھی نہیں جاسکتی لہذا ہم اس سزا کو ختم کرادیں، یا کم از کم اس موقع سے ٹل جائیں، اپنی آنکھ سے نہ دیکھیں تو رحمن و رحیم خالق اس رحم و کرم کو پسند نہیں کرتا اور اس کے برخلاف ارشاد ہو رہا ہے کہ تمہیں اس موقع پر موجود ہونا چاہیے،

الزَّانِي لَا يَنْكِحُ إِلَّا زَانِيَةً أَوْ مُشْرِكَةً وَالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَا إِلَّا زَانٍ أَوْ

مُشْرِكٌ ۖ وَحَرِّمَ ذَلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ﴿۳۱﴾

’زنا کار مرد نہیں نکاح کرے گا سوا زنا کار یا مشرک عورت کے اور زنا کار عورت نہیں نکاح کرے گا اس سے سوا زنا

کار یا مشرک کے اور ایمان والوں پر یہ چیز حرام قرار دی گئی ہے‘۔

ایک قول تو تفسیر میں موجود ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے [۱] اس صورت میں فقہ کے احکام پر اس کے منطبق ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا ورنہ اس آیت کی روشنی میں اگر علمائے اسلام کے فقہی نظریات پر غور کیا جائے تو سخت دشواری محسوس ہوگی، اس لئے کہ زانی اور زانیہ جن کی سزا بیان ہوئی ہے، غیر مسلم جماعت میں کے تو ہیں نہیں، ہیں تو وہ مسلمانوں ہی میں سے اور اس جرم کے بعد وہ بس فاسق ہی ہوں گے۔ کافر تو ہونے نہیں جائیں گے اور ظاہر ہے کہ کسی مسلمان مرد سے مشرک عورت کا یا مسلمان عورت سے مشرک مرد کا نکاح نہیں ہو سکتا، پھر یہ کیوں کر کہا جا رہا ہے کہ زانی کا نکاح زانیہ یا مشرک سے ہوگا اور زانیہ سے بس زانی یا مشرک نکاح کرے گا؟

ثبوتِ زنا کے لئے چار عینی گواہوں کی ضرورت، عدم ثبوت پر الزام لگانے والوں پر حد شرعی کا اجراء:

وَالَّذِينَ يَزُمُونَ الْمَحْضَنَاتِ ثُمَّ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوا وَهُمْ ثَمَنِينَ

جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا ۖ وَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿۳۲﴾ إِلَّا الَّذِينَ

تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا ۖ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۳۳﴾

’اور وہ جو پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں، پھر اس پر چار گواہ پیش کریں تو انہیں اسی کوڑے لگاؤ اور ان کی کوئی گواہی کبھی قبول نہ کرو اور یہ لوگ فاسق ہیں، سوائے ان کے جو اس کے بعد توبہ کریں اور اپنی اصلاح کر لیں تو بلاشبہ اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان‘۔

[۱] قال سعيد بن المسيّب كان ذلك حكم كلّ زان وزانية ثمّ نسخ (تبیان)

ایک خیال یہ ہے کہ یہاں سے وہ سلسلہ آیات کا ہے جو بروایت مشہور ائمہ المؤمنین عائشہ کی پاک دامنی کے خلاف الزام لگائے جانے پر نازل ہوا، حالانکہ موجود ترتیب کے لحاظ سے اس کے بعد بلا فاصلہ ایسے احکام درج ہیں جن کا اس واقعہ سے کوئی تعلق نہیں، بہر صورت اگر یہیں سے وہ سلسلہ مانا جائے، تب بھی شان نزول کی تخصیص کا نتیجہ یہ نہیں ہوتا کہ جو احکام شرعیہ اس ذیل میں بیان ہوئے ہیں، وہ خاص محل سے متعلق ہو جائیں بلکہ ان احکام کی نوعیت عام تو انیم الہیہ کی ہوتی ہے جو زمان و مکان کے قیود سے بری ہوتے ہیں۔^[۱]

کوڑوں میں ایک قول یہ ہے کہ وہ ننگی پیٹھ پر لگیں گے لیکن ہمارے یہاں کی میں یہ ہے کہ وہ کپڑوں کے اوپر سے لگیں۔^[۲]

آخر میں جو استثناء ہے اس کا ظاہر یہی ہے کہ وہ صدق دل سے توبہ کر لیں تو اب وہ فاسق بھی نہیں کہلا سکیں گے اور ان کی گواہی بھی قابل قبول ہو جائے گی یہی بہت سے فقہائے جمہور کے علاوہ ہمارے آئمہ طاہرین علیہم السلام کا بھی ارشاد ہے۔^[۳]

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ شُهَدَاءُ إِلَّا أَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ أَحَدِهِمْ أَرْبَعُ شَهَدَاتٍ بِاللَّهِ ۖ إِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ ① وَالْخَامِسَةَ أَنَّ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَيْهِ إِنْ كَانَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ② وَيَدْرَأُ عَنْهَا الْعَذَابَ أَنْ تَشْهَدَ أَرْبَعُ شَهَدَاتٍ بِاللَّهِ ۖ إِنَّهُ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ ③ وَالْخَامِسَةَ أَنَّ غَضَبَ اللَّهِ عَلَيْهَا إِنْ كَانَ مِنَ الصَّادِقِينَ ④

”اور جو اپنی بیویوں پر زنا کاری کا الزام لگائیں اور ان کے پاس خود ان کے سوا کوئی گواہ نہ ہوں تو ان میں سے کسی ایک گواہی معتبر یوں ہوگی کہ وہ اللہ کی قسم چار دفعہ کھا کر کہے وہ یقیناً سچوں میں ہے اور پانچویں دفعہ یہ کہ اللہ کی لعنت اُس پر اگر وہ جھوٹا ہو اور عورت سے حد شرعی ختم کر دے گی یہ صورت کہ وہ چار دفعہ اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ وہ (مرد) یقیناً جھوٹوں میں سے ہے اور پانچویں دفعہ یہ کہ اللہ کا غضب ہو اس (عورت) پر اگر وہ (مرد) سچوں میں سے ہو۔“

لعان کی صورت اور اُس کی ترکیب:

یہ وہی چیز ہے جسے فقہ لعان“ کہتے ہیں، اس کے قرآن مجید سے جتنے احکام معلوم ہوئے ہیں حسب ذیل ہیں:

(۱) مرد محکمہ عدالت شرعی میں استغاثہ دائر کرتا ہے کہ اس کی عورت زنا کی مرتکب ہوئی ہے اس پر اس سے گواہ طلب کیے جائیں گے،

[۱] قال سعيد بن جبیر هذه الآية نزلت في عائشة وقال الضحاك في نساء المؤمنين وهو الاولى لانه اعم فائدة وان كان يجوز ان يكون سبب نزولها في عائشة فلا تقصر الآية على سببها (تبيين)

[۲] عليه ثياب به وهو قول ابي جعفر عليه السلام (تبيين)

[۳] قول ابي جعفر عليه السلام وابي عبد الله (مجمع البيان)

وہی چار جو جرم زنا کے ثبوت کے لئے ضروری ہیں، اگر وہ کہے کہ میں خود شاہد یعنی ہوں اور گواہ میرے پاس نہیں ہیں تو اس سے کہا جائے گا کہ تم اس طرح قسم کھاؤ جس کا ذکر قرآن مجید میں بالتفصیل موجود ہے۔

(۲) اگر عورت اس قسم کے بعد خاموش رہے اور کوئی اپنی صفائی پیش نہ کر سکے تو جرم ثابت ہو جائے گا اور حد شرعی جاری ہوگی۔

(۳) لیکن اگر عورت ارتکاب جرم سے انکار کرتے تو پھر اُس سے اس طرح قسم لی جائے جو صراحۃً متن قرآن میں درج ہے اب اُس پر حد شرعی جاری نہ ہو سکے گی مگر اس کے بعد کیا ہوگا؟ یہ قرآن سے ظاہر نہیں ہوتا، جو فقہ کا مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ اب وہ عورت اس مرد پر ہمیشہ کے لئے حرام ہو جائے گی، ان دونوں میں افتراق ہو جائے گا اور لعان کے وقت سے عدہ کے دن گزار کر پھر وہ دوسرے جس مرد سے چاہے عقد کر سکے گی۔^[۱]

وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ وَأَنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ حَكِيمٌ ﴿۱۰﴾

’اور اگر نہ ہوتا تم پر اللہ کا لطف و کرم اور اس کی مہربانی اور یہ کہ اللہ ہے توبہ قبول کرنے والا صحیح کام کرنے والا‘۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ اسے سننے والے کی عقل پر چھوڑ دیا گیا ہے، مختصر سمجھ لیجئے کہ بس غضب ہو جاتا تم ہلاکت ابدی میں گرفتار ہو جاتے، دوزخ کے عذاب میں مبتلا ہوتے۔ وغیرہ وغیرہ۔^[۲]

پھر یہ لطف و کرم گزشتہ احکام سے بھی متعلق ہو سکتا ہے کہ زنا کاری کا حرام قرار دینا اور اس پر اتنی سخت سزا مقرر کرنا اور پھر اُس کا غلط الزام لگانے پر بھی ایسی ہی شدید سزا کا اعلان، یہ سب اللہ کا فضل و کرم ہے جو نہ ہوتا تو تمام جامعہ بشری جنسی بے راہ روی کی اس تباہی و ہلاکت میں مبتلا ہو جاتا جس کا مشاہدہ آج بھی اپنی آنکھوں سے ان قوموں میں کیا جاسکتا ہے جہاں یہ احکام نہیں ہیں۔^[۳]

إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ۗ لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَّكُم ۗ بَلْ هُوَ خَبِيرٌ
لَّكُم ۗ لِكُلِّ أَمْرٍ مِّمَّا كَتَبْنَا عَلَيْكُم بِالْبَيِّنَاتِ ۗ وَالَّذِي تَوَلَّى كِبْرَهُ مِنْهُمْ
لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۱﴾

’بلاشبہ وہ لوگ جنہوں نے بدکاری کی جھوٹی تہمت لگائی، وہ تم ہی میں سے ایک جماعت ہے، اسے تم لوگ اپنے لئے برا نہ سمجھو بلکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہے، ہر آدمی کے لئے ان میں سے وہ ہے جتنا اس نے گناہ کیا اور جو اُس کے بڑے حصہ کا ذمہ دار ہے اُن میں سے، اس کے لئے بہت بڑی سزا ہے‘۔

[۱] (تخلّ له ابدًا و كان عليها العدة من وقت لعانها) (مجمع البيان)

[۲] لولا فضل الله عليكم ورحمة لفضلكم. مما تر كبون من الفاحشة واما جلکم بالعقوبة واهلکتکم وما یجری مجراة (تبیان)

[۳] جواب لولا محذوف و تقدیر لولا فضل الله علیکم بالثبہ علیکم بالثبہ عن الزنا و الفواحش و اقامة الاحدود لتهاک الناس و لغد النسل و انقطع الانساب (مجمع البيان)

واقعہ ”افک“ اور اس قسم کی تہمت لگانے والوں کی مذمت:

یہاں سے سلسلہ شروع ہوتا ہے ان آیات کا جو تمہات المؤمنین یعنی ازواج رسول ﷺ میں سے کسی خاتون کی پاک دامانی کے خلاف تہمت لگائے جانے کے واقعہ سے متعلق ہے۔

جمہوری روایت یہ ہے کہ وہ خاتون جناب عائشہؓ تھیں اور یہ آیات انہی کی نسبت واقعہ افک سے متعلق ہیں مگر ایک شیعہ تفسیر جس کی تائید میں معصوم ﷺ سے روایت بھی ہے یہ ہے کہ ان آیات کا تعلق جناب ماریہؓ قبطیہ سے ہے اور الزام لگانے والی شخصیت جناب عائشہؓ کی تھی [۱] پھر بھی زیادہ تر شیعہ مفسرین اس بارے میں جمہوری کے ہم آواز ہیں اور اس کا واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ غزوہ بنی مصطلق سے واپسی میں جناب عائشہؓ رفع حاجت کے لئے اونٹ سے اترتی تھیں، وہاں ان کے گلے کا ہار گر گیا جس کی تلاش میں ذرا دیر لگی، قافلہ والوں کو اس کی خبر نہ تھی، قافلہ روانہ ہو گیا، اب جو وہ ہار لے کر واپس آئیں تو قافلہ جا چکا تھا، اتفاق سے صفوان بن معطل سلمیٰ ایک صحابی بھی پیچھے رہ گئے تھے، انہوں نے جناب عائشہؓ کو حیران و پریشان دیکھا تو انہیں اپنے اونٹ پر سوار کر لیا اور جب کہ قافلہ دوپہر کے آرام کے لئے ایک منزل پر ٹھہرا تھا، وہ جناب معطلہ کو لے کر وہاں پہنچ گئے، یہ قصہ محدث زہری نے خود جناب عائشہؓ کی زبانی بیان کیا ہے جسے جناب شیخ الطائف نے بھی تبیان میں درج کیا ہے اور اس سب کو علامہ طبرسی نے بھی مجمع البیان میں دہرایا ہے۔

اس روئداد کی بنا پر منافقین نے تہمت کا پہاڑ کھڑا کر دیا مگر یہ منافقین فقط عبد اللہ بن ابی وغیرہ تھوڑی تھے، ان میں ایسے صحابہ بھی تھے جو جنگ بدر میں شریک ہو چکے تھے جیسے سطح بن اثاثہ اور ان میں جناب حسان بن ثابت بھی ہیں۔ یہ سب افراد وہ ہیں جنہیں قرآن مجید۔ عذاب عظیم کا مستوجب بتا رہا ہے۔

اب یہ دو روایتیں موجود ضرور ہیں مگر انصاف کا فیصلہ یہ ہے کہ قرآن مجید کا انداز بتا رہا ہے کہ یہ بہت بڑا جرگہ ہے جسے متنبہ کیا جا رہا ہے اور یہ اسی مشہور روایت پر منطبق ہے نہ کہ کسی گھریلو واقعہ پر جس میں ایک بیوی نے دوسری بیوی پر الزام لگایا ہو۔ اس لئے اس محل پر ہم تفسیر قتی کی روایت کو جسے انہوں نے تمام فرقہ شیعوں کی طرف منسوب کیا ہے اور حدیث معصوم ﷺ کا حوالہ دیا ہے قبول کرنے سے قاصر ہیں۔

لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۖ وَقَالُوا هَذَا

إِفْكٌ مُّبِينٌ ﴿۱۲﴾

”کیوں نہ ایسا ہوا کہ جب تم لوگوں نے اسے سنا تو با ایمان مرد اور با ایمان عورتیں اپنوں کی نسبت اچھا ہی گمان رکھتے اور کہتے کہ یہ کھلا ہوا بہتان ہے۔“

[۱] ان العامة رووا انہا نزلت في عائشه..... واما الخاصة فاتهم رووا انہا نزلت في ماریة لقبطیة و ما رمتہا بہ عائشه (علی بن

ایسی خبر کو سن کر اس کا چرچا کرنے والوں کی سرزنش:

یہ حکم کسی شخصی خصوصیت کا حامل نہیں ہے بلکہ ایک عام اصول ہے یعنی عوام کار جحان تو یہ ہے کہ چاہے نیکی کے کتنے ہی مشاہدے کسی سے ہو چکے ہوں مگر ایک بدکاری کی خبر اگر اڑتی ہوئی کسی کے متعلق سنی تو بس اس کے چرچے کرنے لگے، ایسے وثوق کے انداز میں جیسے کہ وہ مشاہدہ ہے قرآن کہتا ہے کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے بلکہ کسی کی نیکی پر اپنے اعتماد کو مضبوط رکھنا چاہیے اور اُس اعتماد کی بنا پر ایسی خبروں کو جھٹلانا چاہیے جو اُس کی نیکی کو مجروح بناتی ہیں۔

لَوْلَا جَاءُوا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ ۚ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَٰئِكَ عِنْدَ اللَّهِ هُمُ الْكٰذِبُونَ ﴿١٣﴾

”کیوں نہیں لائے وہ اس پر چار گواہ اب جب گواہ نہیں لائے تو اللہ کے نزدیک یہی جھوٹے ہیں۔“

گواہوں کے نہ لانے پر جو جھوٹے ہونے کا اعلان ہے، وہ کسی واقعیت کا اظہار نہیں ہے اور عند اللہ کے معنی علم الہی کے نہیں ہے، وہ اس لئے کہ گواہ کا نہ لاسنا اس دعوے کے واقعی غلط ہونے کی دلیل نہیں ہوتا اور علم الہی کسی گواہی سے وابستہ نہیں ہے بلکہ یہ حکماً جھوٹا ہونا ہے اور عند اللہ کا مطلب یہ ہے کہ قانون خداوندی کے لحاظ سے وہ جھوٹے ہیں یعنی جو جھوٹے الزام لگانے کی سزا ہے، اُس کے یہ مستحق ہیں۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِي مَا أَفَضْتُمْ فِيهِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٤﴾ اِذْ تَلَقُّوْهُ بِالْسِيْنَةِ كُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ وَتَحْسَبُوْنَهُ هَيِّنًا ۗ وَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ﴿١٥﴾

”اور اگر اللہ کا فضل و کرم تم پر نہ ہوتا اور اُس کی رحمت دنیا اور آخرت میں تو جس بارے میں تم نے چرچا کیا، اُس میں تم پر عذاب آجاتا جب کہ تم اُس حکایت کو اپنی زبانوں پر لا رہے تھے اور اپنے منہ سے کہہ رہے تھے وہ بات جس کا تمہیں خود علم نہیں ہے اور تم اُسے بڑی معمولی چیز سمجھ رہے تھے، حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بڑی بات تھی۔“

یعنی عام لوگ غیبت کو تفریح طبع کے طور پر معمولی کام سمجھ کر کرتے ہیں اور اس طرح افواہی الزاموں کا ایک دوسرے سے چرچے کرنے کو وقت گزاری کا دل چسپ مشغلہ سمجھتے ہیں حالانکہ وہ اس وقت ایک ”گناہ کبیرہ“ کے مرتکب ہو رہے ہوتے ہیں جو شاید زنا سے کم نہ ہو۔

وَلَوْلَا اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَا يَكُوْنُ لَنَا اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۗ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتٰنٌ عَظِيْمٌ ﴿١٦﴾ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْذُوْا بِالْمِثْلَةِ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٧﴾ وَيُبَيِّنُ

اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتُ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿١٨﴾

”اور کیوں نہ ایسا ہوا کہ جب تم نے اسے سنا تو کہتے کہ ہمیں زیبا نہیں کہ یہ بات زبان سے نکالیں حاشا وکلا یہ بہت بڑا بہتان ہے۔ اللہ تمہیں سمجھاتا ہے کہ اب دوبارہ کبھی ایسی بات نہ کرنا تم با ایمان ہو، اور اللہ تمہارے لئے اپنی باتیں صاف صاف پیش کرتا ہے اور اللہ جاننے والا ہے بڑی سوجھ بوجھ والا۔“

إِنَّ الَّذِينَ يُجِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ لَّ فِي

الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿١٩﴾

”بلاشبہ وہ جو چاہتے ہیں کہ بدکاری کی مسلمانوں کی جماعت میں اشاعت ہو، اُن کے لئے دنیا اور آخرت میں درد ناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم جانتے نہیں ہو۔“

”بدکاری کی اشاعت کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ یہ کام عوام میں پھیل جائے یعنی کثرت سے لوگ اس کا ارتکاب کرنے لگیں جیسا کہ بعض مترجمین نے یہی ترجمہ کیا ہے [۱] مگر بقرہ میں مقام اس کے معنی اس چرچے اور ذکر کی اشاعت کے معلوم ہوتے ہیں چنانچہ حدیث بھی اس کی مؤید ہے [۲] اور ہمارے معتبر مفسرین نے یہی تشریح کی ہے۔ [۳]

وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ وَأَنَّ اللَّهَ رءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿٢٠﴾

”اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل و کرم تم پر اور اُس کی رحمت اور یہ کہ اللہ بڑا شفیق ہے، مہربان، یعنی تم خود سمجھ لو کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو نتیجہ کیا ہوتا یعنی عذاب آجاتا یا نہیں؟

میں تو اسے سوالیہ انداز میں پڑھ کر لفظ اُس کے لئے جزا کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا مگر نحویین کو ترکیب بنانے کے لئے جزا کو محذوف ماننا پڑتا ہے اس لئے مترجمین کو بھی اکثر اس کا تتبع کرنا پڑا ہے، وہ بریکٹ میں لکھ کر سہی [۴] اور مفسرین بھی کہہ دیتے ہیں کہ جزاء محذوف ہے۔ [۵]

يَأْتِيهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ط وَمَنْ يَتَّبِعْ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ فَإِنَّهُ يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ط وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ

[۱] ایمان لانے والوں میں بے حیائی کی باتیں رائج ہوں (مولوی مقبول احمد صاحب)

[۲] عن هشام عن أبي عبد الله قال من قال في مؤ من مارايت عيناهو ما سمعت اذفاة كان من الذين قال الله فيهم: ان الذين يجيبون ان تشيع الفاحشه انخ (علی بن ابراہیم)

[۳] ان تشيع الفاحشه ان يفشو ويظهر والزنا والقبايح في الناس امنوا بان يسبوها اليهم ويقذفوهم بها (مجمع البيان)

[۴] اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی (تو وہ تم پر جلد عذاب نازل کرتا) مقبول ترجمہ

[۵] لعاجلكم بالعقوبة..... وجواب لولا محذوف لدلالة الكلام عليه (جمع البيان)

مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۗ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ

عَلِيْمٌ ﴿٢١﴾

”اے ایمان لانے والو! قدم بقدم نہ چلو اور جو شیطان کے قدم بقدم چلے گا تو وہ بلاشبہ شرم ناک کام اور برائی کے لئے کہتا ہے اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل و کرم تم پر اور اُس کی رحمت تو تم میں سے ایک بھی کبھی پاک و صاف نہ رہتا مگر اللہ جسے چاہتا ہے، اس کے نفس کو پاک رکھتا ہے اور اللہ سننے والا، بڑا جاننے والا۔“

دوسروں کی بدگونی میں ایک جذبہ اپنے حسن عمل کے پندار کا نمایاں ہوتا ہے۔ اس آیت میں اُسے ختم کیا جا رہا ہے یعنی راہ نیک پر استقامت میں اکثر شرائط و مقتضیات معصیت کے فقدان اور موانع کے سدّ راہ ہونے کا بھی دخل ہوتا ہے جو خالق کی طرف سے ایک توفیق ہوتی ہے، لہذا انسان کو اس پر نازاں نہ ہونا چاہیے کہ ہم اس معصیت سے بری ہیں، کیا معلوم کہ اسے بھی خراب ماحول ملتا اور توفیق رب شامل نہ ہوتی تو یہ بھی کیسے کیسے جرائم کا ارتکاب کرتا اس لئے کہ کسی دوسرے کو مبتلائے گناہ دیکھ کر اسے اچھالنا ٹھیک نہیں ہے بلکہ خود اسے مناسب انداز میں نصیحت کرنا چاہیے اور خدا سے دعا کرنا چاہیے کہ وہ توفیق خیر اُس کے شامل حال فرمائے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نیکی اور بدی دونوں صرف خدا کی جانب سے ہیں اور انسان کی قوت ارادی کچھ ہے ہی نہیں، اگر ایسا ہوتا تو امر بالمعروف اور نہی المنکر کا نظام ہی نہ ہوتا اور برے کو اُس کی برائی پر تنبیہ بھی درست نہ ہوتی اور سزا بھی حق بجانب نہ پڑتی۔

وَلَا يَأْتِلِ اَوْلُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُؤْتُوْا اَوْلِيَ الْقُرْبٰى وَالْمَسْكِيْنَ

وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۗ وَلِيَعْفُوْا وَلِيَصْفَحُوْا ۗ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ

لَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٢﴾

”اور تم نہیں کھانا چاہیے [۱] تم میں سے انہیں جن کو اللہ نے مال و دولت کی فراوانی اور گنجائش عطا کی ہے اس بارے میں کہ وہ دیں صاحبانِ قرابت اور عزیزوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو اور چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر سے کام لیں، کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں بخش دے اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔“

اہل سنت کی مشہور روایت کے مطابق گذشتہ آیات کی شان نزول کے تناسب سے اس آیات کا تعلق ایک ایسے شخص سے لیا گیا ہے جس نے جناب عائشہؓ پر تہمت لگانے اور اس کا چرچا کرنے میں حصہ لیا تھا، حالانکہ حضرت ابو بکرؓ اس شخص کی کفالت کرتے تھے اس واقعہ کے بعد انہوں نے عہد کر لیا کہ اب میں اس شخص کے ساتھ کوئی سلوک نہ کروں گا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور متنبہ کیا گیا کہ کسی غلطی پر بھی مستطیع افراد کو یہ نہیں چاہیے کہ غربا کے ساتھ حسن سلوک ترک کر دیں۔

علامہ طبرسیؒ نے ان صاحب کا نام مسطح لکھا ہے جو اہل بدر میں سے تھے اور اسی ذیل میں قدیم معترلی عالم جبائی کا تبصرہ درج کیا ہے کہ

[۱] (لا يتلاء القسم (تبيين) نه قسم كهابيٰءهين (تاج العلماء)

اس سے ثابت ہوتا کہ بدروا لے صحابہ بھی گناہوں سے بری نہ تھے۔^[۱]
 ہمارے یہاں کی ایک قدیم تفسیر ایسا ظاہر کرتی ہے کہ یہ آیت مستقل حیثیت رکھتی ہے گزشتہ واقعہ سے مرتبط نہیں ہے اور اس میں صاحبانِ قرابت سے مراد وہی قرابت دارانِ رسول ﷺ ہیں جنہیں آیت خمس میں ذوی القربی سے تعبیر کیا گیا ہے۔^[۲]
 جناب شیخ الطائف نے اس قول کو ترجیح دی ہے کہ وہ ایک عام حکم ہے مال دار لوگ کسی وجہ سے خفا ہو کر غرباء پر حسن سلوک ترک کرنے کی قسم نہ کھالیا کریں۔^[۳]

إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغُفْلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لَعُنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ
 وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۳۱﴾ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ
 بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۳۲﴾ يَوْمَئِذٍ يُوفِّيهِمُ اللَّهُ دِينَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ
 هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ ﴿۳۵﴾

’وہ جو تہمت لگاتے ہیں پاک دامن، بے خبر، باایمان خواتین کو، ان پر لعنت ہے دنیا اور آخرت میں اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے، جس دن ان کے خلاف گواہی دیں گی خود ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پیر ان تمام کاموں کے متعلق جو وہ کرتے تھے، اس دن اللہ ان کی پوری پوری جزاء سزا انہیں پہنچائے گا اور انہیں معلوم ہوگا کہ اللہ ہی وہ حق ہے جو روشن و نمایاں ہے۔‘

اس قرآنی لعنت والی آیت کو پڑھتے وقت یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ یہ افراد جن پر لعنت ہو رہی ہے، صحابہ ہی کی معزز جماعت میں ہیں اور معمولی صحابی نہیں بلکہ ان میں سے بعض مہاجرین ہیں اور بعض اہل بدر، اس کے بعد بھی قرآن نہ صرف یہ کہ لعنت کر رہا ہے بلکہ صراحتاً روز قیامت کے عذاب کی اطلاع بھی دے رہا ہے۔ اگر اہل بدر کا مغفور ہونا کوئی قطعی فیصلہ ہوتا تو اس عذاب کی اطلاع کے کوئی معنی نہ تھے۔
 اس نتیجے سے بچنے کی بس ایک ترکیب ہے اور وہ یہ کہ ان بعد والی آیات کو قصہ اقل سے متعلق نہ لیا جائے بلکہ یہ سمجھا جائے کہ یہ علیحدہ آیات ہیں جو عمومی طور پر تہمت زنا کا نہ کرنے والوں سے متعلق ہیں، جیسا کہ ہمارے علماء ہیں امین الاسلام طبرسی کا رجحان معلوم ہوتا ہے^[۴] اور

[۱] قال الجبائی فی قصۃ مسطح دلالة علی انہ قد یجوز ان یقع المعاصی من شہد بدر (مجمع البیان)

[۲] ہم قرابت رسول اللہ ﷺ (علی بن ابراہیم)

[۳] قال قوم ہذا نہی عام لجمیع اولی الفضل والسعة ان یخلفوا الا یؤتوا اولی القربی والمساکین والفقراء وهو اولی واتم فائدة (تبیان)

[۴] بدأ سبحانہ فبیئین حکم القاذف اولاً وواجب علیہ الحدودۃ شہادۃ ثم عقبہ بحديث الافک اللتصالہ بہ ثم ذکر صنفاً اخر من القذفة وهم المنافقون بقوله: ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشة فی الذین امنوا ینزلونهم من السماء بغصبات اللعنة ثم غم الجمیع بالوعید فی قوله: ان الذین یرمون المحصنات الغافلات (مجمع البیان)

مجھے بھی اس کے ماننے میں کوئی عذر نہیں ہے مگر اس صورت میں پھر اس میں ان افراد کے لئے جن کی نسبت تہمت لگائی جاتی ہے جو مدحیہ الفاظ ہیں المحصنات الغافلوات المؤمنات ان سب کو بھی اس واقعہ سے متعلق افراد پر منطبق کرنا درست نہ ہوگا۔

الْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ ۖ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ
وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ ۖ أُولَئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ ۖ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ
كَرِيمٌ ﴿٦٦﴾

”ناپاک باتیں ناپاک لوگوں کے لئے ہوتی ہیں اور ناپاک آدمی ناپاک باتوں کے لئے اور صاف ستھری باتیں صاف ستھرے آدمیوں کے لئے ہوتی ہیں اور صاف ستھرے آدمی صاف ستھری باتوں کے لئے یہ لوگ بری ہوتے ہیں اس سے جو وہ لوگ کہتے ہیں، اُن کے لئے بخشش ہے اور عزت دار روزی“۔

عربی زبان میں خصائل و عادات اور اوصاف کے لئے مؤنث ضمیریں اور موصوف اشخاص کے لئے مذکر ضمیریں استعمال ہوتی ہیں جیسا کہ متنبی شاعر نے بھی کہا ہے:

ان الكرائم كفوها الكرماء: شريفانه اوصاف کے لئے شريف لوگ ہی ہوتے ہیں۔“

اس بنا پر بہت سے مفسرین اہل سنت نے بھی اس آیت میں خبیثات اور طیبات کے معنی بری اور اچھی باتیں اور خبیثین اور طیبین کے معنی برے اور اچھے آدمیوں کے لئے ہیں اور اس طرح مطلب آیت کا یہ ہوتا ہے کہ یہ بدگوئی اور اتہام اور پاک دامن افراد کی نسبت بدکاری کی حکایات کو شہرت دینا خبیث ہی افراد کا شیوہ ہو سکتا ہے، اچھے آدمی اس قسم کی حرکتوں سے بری ہوتے ہیں لیکن بعض اہل سنت نے ان مؤنث اور مذکر لفظوں سے فائدہ اٹھا کر اس کے معنی یہ قرار دیے ہیں کہ خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے ہوتی ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لئے اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لئے ہوتی ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لئے، اس طرح انہوں نے بلا استثناء تمام ازواج رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کا ایک پہلو پیدا کیا ہے۔

چونکہ اس کا ظاہری مفہوم قطعی طور پر واقعیت کے خلاف ہے جس کی مثال تمام مسلمانوں میں متفق علیہ اور بعض قرآن ثابت شدہ زوجہ نوح علیہ السلام اور زوجہ لوط علیہ السلام اور دوسری طرف آسیہ زوجہ فرعون کی شکل میں موجود ہے اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض ازواج کو شیعہ ممدوح نہیں سمجھتے اس لئے علمائے شیعہ کو اس کا جواب دینے کی ضرورت پڑی ہے چنانچہ جناب تاج العلماء نے اس آیت سے متعلق حاشیہ میں لکھا ہے: ”یعنی شایان یہی ہے اگرچہ اتفاق سے کبھی ایسا نہ ہو جیسے فرعون کو آسیہ ملی یا حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی ان کی بیویاں اور عائشہ اور حفصہ ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گلے منڈھی گئیں“۔

ہمارے نزدیک اوّل تو جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے مؤنث اور مذکر کے الفاظ سے عورت اور مرد کا سمجھنا ہی ضروری نہیں ہے، پھر اگر ایسا ہو

بھی جیسا کہ علامہ طبرسی نے اس کی روایت، ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی طرف بھی منسوب بتائی ہے [۱] تو جس طرح کا الزام یہاں محل بحث ہے یعنی جنسی جرم کا ارتکاب، اس سے ازواج رسول ﷺ کے پاک ہونے پر جب علمائے شیعہ بھی متفق ہیں کیوں کہ اس طرح کے جرم ناموس سے رسول ﷺ کی عزت پر حرف آتا ہے تو پھر اضافی طور پر اس پاکیزگی کے قبول کرنے میں حرج ہی کیا ہے؟ لیکن اس سے زندگی کے تمام شعبوں اور ایمان اور عمل کے تمام پہلوؤں میں ان کی بلندی و رفعت کسی کے نزدیک بھی ثابت نہیں ہے، ورنہ تمام مسلمانوں کو بلا استثناء ازواج رسول ﷺ کو معصوم ماننا چاہیے جس کا میرے علم میں کوئی بھی قائل نہیں ہے لہذا کلی پاکیزگی جس سے یہ آیت آیہ تطہیر بن جائے اہل سنت کے نزدیک بھی ثابت نہیں اور جزئی پاکیزگی یعنی ایک خاص جرم سے برأت شیعوں کو بھی تسلیم ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْذِنُوا وَتُسَلِّمُوا
عَلَىٰ أَهْلِهَا ۗ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿۲۷﴾ فَإِنْ لَمْ تَجِدُوا فِيهَا أَحَدًا
فَلَا تَدْخُلُوهَا حَتَّىٰ يُؤْذَنَ لَكُمْ ۗ وَإِنْ قِيلَ لَكُمْ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا هُوَ أَزْكَىٰ
لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿۲۸﴾

”اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا اور گھروں میں داخل نہ ہو جب تک کہ اجازت حاصل نہ کر لو اور سلام نہ کر لو اس کے رہنے والوں کو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے، شاید تم نصیحت قبول کرو، تو اگر ان میں کسی آدمی کو نہ پاؤ تو داخل نہ ہو ان میں جب تک کہ تمہیں اجازت نہ مل جائے اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس جاؤ تو واپس ہو جاؤ۔ یہ تمہارے اخلاق کی درستی کا زیادہ ثبوت ہوگا اور اللہ ان کاموں کو جو تم کرتے ہو جاننے والا ہے۔“

گھروں میں بلا اجازت داخل ہونے کی ممانعت اور اسلام کا حکم:

ان آیت میں اہل خانہ کی اجازت کے بغیر اس کے گھر میں داخلہ کو منع کیا ہے اور اسے اخلاق کے منافی قرار دیا ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ مَسْكُونَةٍ فِيهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ
يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ ﴿۲۹﴾

”تمہارے لئے کوئی حرج نہیں ہے کہ تم داخل ہو ایسے مکانات میں جن میں کوئی بود و باش نہیں رکھتا ہو جس میں تمہارے فائدہ کا کوئی سامان ہے اور اللہ جانتا ہے اُسے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔“ غیر مسکونہ کی تشریحات مختلف ہوئی ہیں جیسے سفر کے راستوں میں مسافروں کے لئے سرائیں ہوتی ہیں یا ایسے کھنڈر میں جن میں ایسا انسان رُفح حاجت کے لئے جانا چاہتے ہیں یا تجارتی مراکز جن میں لوگوں کی خریداری کے لئے سامان ہوتا ہے

[۱] هو المروى عن ابى جعفر و ابى عبد الله عليهما السلام (مجمع البيان)

لیکن بہتر یہ ہے کہ الفاظ قرآنی کے عموم کا جو تقاضا ہے، اسے باقی رکھا جائے اور ان تمام چیزوں کو اس میں داخل سمجھا جائے۔

چونکہ اجازت لینے کا حکم اس خطرہ سے ہے کہ وہاں کوئی نامحرم ہو جس کی ہمارے بے دھڑک چلے جانے سے بے پردگی ہوتی ہو۔ ان مقامات پر یہ خطرہ نہیں ہے لہذا اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں۔^[۱]

قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ذَلِكَ أَزْكَى لَهُمْ ط

إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا يَصْنَعُونَ ﴿۳۰﴾

”ایمان لائے ہوئے مردوں سے کہیے کہ وہ ذرا بند رکھیں اپنی آنکھیں اور بچائے رہیں اپنے اعضائے پوشیدہ۔ یہ ان کے اخلاق کی درستی کا زیادہ ثبوت ہے، یقیناً اللہ باخبر ہے اس سے جو وہ کرتے ہیں۔“

اجنبی مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے پر نظر ڈالنے کی ممانعت:

”ذرا بند رکھیں“ یعنی نامحرم اشخاص یا ننگ دیکھنے کے لائق اعضاء یا بخش مناظر سے نگاہ الگ رکھیں^[۲] اور نہ آنکھیں کھلی رکھنے کے لئے عطا ہوئی ہیں، بند رکھنے کے لئے نہیں۔

اعضائے پوشیدہ کے بچائے رکھنے کا مفہوم دوسرے مقامات پر تو زنا کاری سے پرہیز ہے مگر یہاں حدیث معصومہ عَلَيْهَا بتاتی ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان اعضاء کو نگاہ خلق سے بچانا لازم ہے جس سے ستر عورتیں کا وجوب مستفاد ہوتا ہے جو مرد اور عورت دونوں کے لئے اسلام کا ایک ضروری حکم ہے^[۳] اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا مفہوم عام لیا جائے جس میں دونوں باتیں داخل ہو جائیں، حرام کاری سے بچنا بھی اور ان اعضاء کو نگاہ اغیار سے بچانا بھی۔^[۴]

وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبْدِينَ

زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَى جُيُوبِهِنَّ ۖ وَلَا يُبْدِينَ

[۱] قال قوم هي جميع ذلك حملوه على عمومه لان الاستئذان انما جاء لئلا يهجم على مالا يجوز من العورة وهو الاقوى لانه اعم

فائدة (تبيان) الاولى حمل على الجميع (مجمع البيان)

[۲] عن عورات النساء وما يجره النظر اليه (تبيان)

[۳] عن ابي بصير عن ابي عبد الله قال كل اية في القرآن في ذكر الفروج فهو من الزنا الا هذه الاية فاتها من النظر ولا يجبل لرجل مؤمن

ان ينظر الى فرج اخيه ولا يجبل للمراة ان ينظر الى فرج اختها (على بن ابراهيم)

[۴] عن الحر او عن ابيها حيث تزي (تبيان)

زَيْنَتُهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ آبَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاؤِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي أَخَوَاتِهِنَّ أَوْ نِسَائِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التَّبِيعِينَ غَيْرِ أُولِي الْأَرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا عَلَى عَوْرَاتِ النِّسَاءِ ۖ وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ ۖ مِنْ زَيْنَتِهِنَّ ۗ وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٣١﴾

”اور ایمان والی عورتوں سے کہیے کہ اپنی نگاہوں کو ذرا بند رکھیں اور اپنے پوشیدہ اعضاء کی حفاظت کریں اور اپنے بناؤ سنوار کو ظاہر نہ کریں سوا اُس کے جو اوپر سے نمایاں ہو اور چاہیے کہ اپنی اور ہنسیوں کو لٹکا کر گریبان پر ڈال لیں اور اپنے بناؤ سنوار کو ظاہر نہ کریں کسی پر سوا اپنے شوہروں یا اپنے باپ داداؤں یا اپنے شوہروں کے باپ داداؤں یا اپنی اولاد..... یا اپنے شوہروں کی اولاد یا اپنے (نسبی) بھائیوں یا اپنے بھتیجیوں یا اپنے بھانجیوں یا اپنی عورتوں یا اپنے اُن غلاموں اور اُن نوکر چاکر مردوں کے جن میں جنسی خواہش باقی نہیں رہی ہے یا ان بچوں کے جو عورتوں کے پوشیدہ خصوصیات سے واقف نہیں ہیں، اور اپنے پیر نہ ماریں کہ جو بناؤ سنوار وہ چھپائے ہوئے ہیں، معلوم ہو اور تم سب اے اہل ایمان! اللہ سے لو لگاؤ، شاید تم دین و دنیا کی بہتری حاصل کرو۔“

خواتین کے پردہ کا حکم اور اس کی اہمیت:

قبل کی آیت میں جو مردوں سے متعلق تھی اور اس آیت میں جو عورتوں سے متعلق ہے، دو حکم مشترک ہیں: ایک غضب بصر یعنی آنکھوں کو ذرا بند رکھنا جس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح مردوں کو غیر عورت پر نظر کرنا ناجائز ہے، اسی طرح عورت کو غیر مرد پر بالکل یکساں صورت ہے مگر افسوس ہے کہ پردہ دار خواتین بھی جو اب دنیا میں بڑی اقلیت کی شکل میں ہیں، انہیں بھی پہلے حکم کا احساس ہے کہ غیر مرد کی نظر ہم پر نہ پڑے اور غیر مرد اگر عورت کو دیکھے تو وہ قابل اعتراض ہے لیکن وہ خود غیر مردوں پر نظر کریں اسے وہ اپنے لئے قابل اعتراض بات نہیں سمجھتیں یہ تفریق از روئے قرآن بالکل غلط ہے۔

دوسرے حفظ فروج یعنی جنسی گناہ سے پرہیز یا نظر اجانب سے محفوظ رکھنا یا دونوں باتیں، اس میں بھی مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں ہے جس طرح مردوں کے لئے ایک دوسرے کے سامنے بالکل برہنہ ہونا یا دوسرے کو برہنہ دیکھنا اسلام میں ممنوع ہے، اسی طرح عورت کے لئے یہ حکم ہے۔

اس میں استثنائی صورت وہی حالت اضطراب کی ہے اور اضطراب کے نتیجے میں جو حکم ہو، وہ مقدر ضرورت پر منحصر ہوتا ہے لہذا ناگزیر علاج یا

بچہ کی ولادت کے موقع پر استثناء ہوگا تو صرف اس لیڈی ڈاکٹر قابلہ کا جو معالج ہے۔ ان حالتوں میں وسعت کی کوئی گنجائش شرعاً نہیں ہے مگر غالباً خواتین کے طبقہ میں اس پر بھی عمل پورے طور پر نہیں ہے۔

قرآن مجید کا حکم جو ”حفظ فروج“ کی لفظوں کے ساتھ ہے، اس جدید طریقہ کو بھی حرام قرار دیتا ہے جو ٹیوب سے کسی معلوم یا لامعلوم مرد کے نطفہ کے داخل کرنے کا ہے، اس طریقہ سے بھی شوہر کے سوا کسی شخص کا نطفہ داخل کرنا جائز نہیں ہے۔

ان دونوں مرد اور عورت میں مشترک پابندیوں کے علاوہ مزید حکم عورتوں کے لئے پردہ کا ہے جس میں مکاتب فقہیہ کے اختلاف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کتنا ہی استثناء کیا جائے مگر وہ اُس بے پردگی کے ساتھ ہرگز نہیں دے سکتا جو تہذیب جدید کے نتیجہ میں دنیا کے اندر پھیلی ہوئی ہے۔

اس آیت میں جو حکم پردہ ہے اس کے حدود پر مکمل بحث کے لئے ہماری کتاب ”اثبات پردہ“ دیکھنے کی ضرورت ہے۔
 ”پیر نہ ماریں“ اس کے ایک معنی تو یہ ہوتے ہیں کہ زمین پر پیر زور سے رکھنے کی ممانعت ہے جس سے پازیب وغیرہ کی جھنکار دوسروں کے کان تک جاتی ہے اور ایک تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد ایک پیر کا دوسرے پیر پر مار کے چلنا ہے جس سے خاص طور پر جھنکار پیدا ہو۔^[۱]
 ایک تصویر یہ بھی گوش زد ہوا ہے کہ اس سے مقصود ناچ کی ممانعت ہے کیوں کہ اُس کا پیروں کے زمین پر مارنے سے تعلق ہے مگر اس صورت میں آخری فقرہ کی ضرورت نہ تھی کیوں کہ ناچ تو بذات خود ممنوع ہے، اُس کی ممانعت اس بنا پر نہیں ہے کہ پیروں کے زیور کی جھنکار باہر جائے گی، یہ کہنا کہ لیعلمہ ما یخفی عنہن من زینتہن کہ جو بناؤ سنگار وہ چھپائے ہوئے ہیں، معلوم ہو، بتلاتا ہے کہ وہ پیروں کا زمین پر مارنا یا ایک پیر کا دوسرے سے ٹکرانا بذات خود ممنوع نہیں ہے بلکہ اس بنا پر ممانعت ہو رہی ہے کہ چھپے ہوئے زیور کی آواز دوسروں کے کانوں تک نہ جائے اور اسے ضمنی طور پر لازماً یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ خود خلخال (پازیب یا چھاگل) پر نظر نامحرموں کی نہ پڑنا چاہیے^[۲] اور اس سے دل چاہے تو یہ نتیجہ نکالنے کے پھر خود پیروں کا اور جسم کے دیگر حصوں کا نامحرموں کی نگاہوں کا مرکز بننا کیوں کر درست ہو سکتا ہے؟!

وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ ۖ وَإِمَائِكُمْ ۗ إِنَّ يَكُونُوا

فَقَرَّاءَ يُعْزِمُهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۳۲﴾

”اور شادی کرو بے شوہر عورتوں اور نیک چلن اشخاص کی اپنے غلاموں اور کنیزوں میں سے۔ اگر وہ محتاج ہوں گے تو اللہ اپنے فضل و کرم سے انہیں مالدار بنا دے گا اور اللہ گنجائش والا ہے، بڑا جاننے والا۔“

نکاح کی ترغیب:

ہماری زبان میں جتنے الفاظ ہیں جیسے ”کنواری“ اور ”بن بیاہی“ یا ”غیر شادی شدہ“ وہ اُس وسعت کے حامی نہیں ہیں جو عربی

[۱] لا تضر اب احدی رجليها بالاخری لیقرع الخلل بالخلخال (علی بن ابراہیم)

[۲] معناه لا تضر اب امرأة برجلها لیعلم صوت الخلل فی رجليها كما كان يفعلها نساء اهل الجاهلیة وذلك يدل علی ان اظهار الخلل لا یجوز (تبیان)

میں ’ایامی‘ کی لفظ کو حاصل ہے، اس میں کنواری لڑکیاں بھی داخل ہیں اور بیوہ عورتیں بھی۔ اردو محاورہ کی اس تنگی کی وجہ سے ہمیں ترجمہ میں ایک ”محاورہ سے خارج“ لفظ ”بے شوہر“ کا استعمال کرنا پڑا تا کہ اس کی وسعت ”عقد بیوگان“ کے حکم کو ظاہر کر سکے۔^[۱]

اس وسعت کے پیش نظر آیت کا مفاد یہ ہو گیا کہ صنف اناث میں کسی فرد کو بلا شوہر نہیں رہنا چاہیے۔ اب جو چیز ہمارے عمومی تصورات میں نکاح سے سدّ راہ ہوتی ہے وہ لڑکی کے عقد میں خود اس کا بے روزگار ہونا۔ قرآن کہتا ہے کہ اسے بالکل نہیں سوچنا چاہیے بلکہ اسے خدا پر چھوڑنا چاہیے، وہ اس وقت اگر محتاج ہیں تو اللہ اپنے فضل و کرم سے انہیں غنی کر دے گا مگر کیا کیا جائے کہ ہم آج اُس توکل کے جوہر سے محروم ہیں۔ اس لئے قرآن کی اس تشبیہ کے باوجود ان اسباب ظاہری کو ضرور دیکھتے ہیں جس سے شاید کوئی مستثنیٰ نہ ہو لیکن حدیث میں وارد ہے کہ یہ اللہ کے ساتھ بدگمانی اور اس پر بے اعتمادی ہے^[۲] نعوذ باللہ من ذلك۔

وَلَيْسَتَعْزِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّىٰ يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ۗ وَالَّذِينَ
يَبْتَغُونَ الْكِتَابَ مِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا ۗ
وَأَتَوْهُمْ مِنْ مَالِ اللَّهِ الَّذِي آتَاكُمْ ۗ وَلَا تَكْرِهُوا فَتْيَتَكُمْ عَلَىٰ الْبِغَاءِ إِنْ
أَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِيَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۗ وَمَنْ يُكْرِهْنَهُنَّ فَإِنَّ اللَّهَ مِنْ
بَعْدِهَا كَرَاهِيَهُنَّ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝۳۳

”اور ضبط نفس سے کام لینا چاہیے انہیں جن کے لئے شادی کا موقع نہ ہو، یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل و کرم سے انہیں وسعت عطا فرمائے اور جو تمہارے مملوکہ غلاموں کنیزوں میں بالمعاوضہ آزادی کا معاہدہ چاہیں یا ان کے ساتھ معاوضہ لے کر آزاد کرنے کا معاہدہ کر لو، اگر جانوں ان میں کسی طرح کی بھلائی اور انہیں ہیں کچھ عطا کرو اللہ کی طرف کے مال سے جو اس نے تمہیں دیا ہے اور اپنی جو کنیزوں کو اگر وہ اپنے کو محفوظ رکھنا چاہتی ہیں، بدکاری پر مجبور نہ کرو، صرف اس لئے کہ تم کچھ دنیوی زندگی کا سامان حاصل کرو اور جو کوئی زبردستی کرے گا ان پر تو اللہ ان کے مجبور کیے جانے کے بعد بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔“

غلام و کنیز کے مکاتبہ کا حکم:

اس آیت میں ایک ساتھ کئی احکام کا ذکر ہے:

پہلے یہ کہ اگر کسی شخص کے لئے ایسا امکان نہیں ہے کہ وہ شادی کرے تو اسے ضبط نفس سے کام لینے کی ضرورت ہے اور ایسا نہ ہونا چاہیے

[۱] ”جمع ایمر“ وہی المرأة التي لا زوج لها سواء كانت بكرًا أو شبيبا (تبیان)

[۲] قال ابو عبد الله من ترائى التزوج مخافة العلية اساء الظن برتبه يقول سبحانه: ان يكونوا افقرآء يعنهم الله من فضله (مجمع

کہ اپنی خواہش نفس کی تسلی کیلئے حرام ذرائع اختیار کرے۔

ضبط نفس اور حرام کاری سے پرہیز ہی وہ ”عفت“ ہے جس کے لئے خالق کا مطالبہ ہے۔

دوسرے مکاتبہ کا حکم جو اس دور کے لئے تھا جب غلام اور کنیز ہوا کرتے تھے، اس کے احکام کی تفصیل کتب فقیہہ میں مذکور ہے۔

تیسرا حکم، اس دور حالات کے لحاظ سے اس کا پس منظر یہ تھا کہ بعض اشخاص اپنی کنیزوں سے طوائف کا پیشہ کراتے تھے تاکہ ان کی کمائی سے خود فائدہ اٹھائیں۔ انہیں منع کیا گیا ہے کہ یہ تمہارا عمل ناروا ہے۔

اب کنیزیں نہیں ہیں تو ایسے اشخاص ہو سکتے ہیں جو اپنے زیر اثر یا زیر پرورش لڑکیوں سے یہ ناروا کام کرائیں، وہ آیت کے اس حکم میں داخل ہیں۔

اس حکم کے ذیل میں تفسیری لحاظ سے تشریح طلب یہ فقرہ ہے کہ ”اگر وہ محفوظ رہنا چاہتی ہیں“۔ اس سے ایسا تو ہم ہو سکتا ہے کہ یہ اس ممانعت میں شرط ہے مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اصول فقہ کی کتابوں میں مفہوم شرط کی بحث میں واضح کیا گیا ہے، یہ شرط اشتراط کی غرض سے نہیں ہے بلکہ ایک تو ان مالکوں یا سرپرستوں کے طرز عمل کی شرمناک قوت کے ساتھ اظہار مقصود ہے کہ وہ ناقص العقل ہونے کے باوجود پارسائی اختیار کرنا چاہتی ہیں تو کتنے غضب کی بات ہے کہ تم انہیں اس کے خلاف مجبور کرو اور پھر یہ کہ وہ خود اپنے کو محفوظ نہیں رکھنا چاہتیں تو مجبور کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب وہ خود ان کی طرف متوجہ ہیں، بے شک یہ مالک اعانت جرم کے مرتکب ہیں، اس لئے یہ بھی گنہگار ہیں۔

اب بعض احادیث رہنمایان دین میں ہے کہ:

اِنَّ لِكُلِّ عَضْوٍ مِنْ اِبْنِ اَدَمَ حِطًّا مِنْ الزَّوَانِفِ نَالِ الْعَيْنِ النَّظْرُ اِلَى الْحَرَامِ۔

زنا کاری میں آدمی کے اعضائے جسم میں سے ہر ایک کا ایک حصہ ہے تو آنکھ کی زنا کاری (نامحرم پر) نگاہ ہے۔

اس حدیث معصوم ﷺ کے لئے اس حکم کے بعد کہ وہ اوپر کا لباس برقع وغیرہ اتار سکتی ہیں، ارشاد ہوا ہے کہ: وان يستعففن خیر لهنّ ”وہ عفت و پارسائی اختیار کریں تو ان کے لئے بہتر ہے، یعنی ایسی ضعیف العمر عورتیں بھی مکمل پردہ اپنا قائم رکھیں تو بہتر ہے، اس کو کہا گیا ہے کہ وہ ”عفت و پارسائی اختیار کریں“ اس سے ظاہر ہے کہ بے پردگی عفت و پاک دامانی کے خلاف ہے تو زیر تحریر آیت میں جو ارشاد ہوتا ہے کہ وہ محفوظ رہنا چاہتی ہیں تو کتنی شرمناک بات ہے کہ تم انہیں خلاف عفت عمل پر آمادہ کرو، اس کے احاطہ میں میرے نزدیک وہ مرد بھی آتے ہیں جو اپنی عورتوں کو ترقی پسندی کی خاطر پردہ سے نکلنے پر مجبور کرتے ہیں۔

آخر میں جو کہا گیا ہے کہ ”اللہ ان کے مجبور کئے جانے کے بعد بخشنے والا ہے، بڑا مہربان“ اس بخشش اور مہربانی کا تعلق ان بے چاریوں سے ہے جنہیں مجبور کیا گیا ہے، نہ کہ ان ظالموں کے ساتھ جو مجبور کرنے والے ہیں۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ اٰیٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنۡ قَبْلِكُمْ

وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٣٧﴾

اور بے شک ہم نے تم لوگوں کی جانب کھلی ہوئی نشانیاں بھیجی ہیں اور مثالیں ان لوگوں کی جو تمہارے پہلے گزر گئے

اور نصیحت پر ہیزگاروں کے لئے،۔

”مثال ان لوگوں کی، یعنی پہلے کی امتوں پر کس طرح ان کی بد اعمالیوں سے عذاب نازل ہوا تھا کہ تمہیں ان مثالوں سے سبق ملے اور تم ان بد اعمالیوں سے پرہیز کرو۔“^[1]

اللَّهُ نُورُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ مَثَلُ نُورِهِ كَمِشْكَاةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ ۗ الْمِصْبَاحُ فِي زُجَاجَةٍ ۗ الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُبْرَكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ ۗ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ۗ نُورٌ عَلَى نُورٍ ۗ يَهْدِي اللَّهُ لِنُورِهِ مَن يَشَاءُ ۗ وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ ۗ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٣٥﴾

”اللہ آسمان اور زمین کا اجالا ہے، اس کی روشنی کی مثال اس گلوب کی سی ہے جس میں چراغ ہو، وہ چراغ ایک شیشہ کی چینی کے اندر ہو، وہ شیشہ ایسا ہو جیسے چمکتا ہوا تارا، وہ روشن ہوتا ہو ایک بابرکت درخت زیتون سے جو مشرق کی طرف کا ہے اور نہ مغرب کی طرف کا کہ کچھ دور نہیں اس کا تیل آپ ہی آپ بھڑک اٹھے، چاہے اس سے آگ چھو بھی نہ جائے روشنی بالائے روشنی، اللہ اپنی روشنی کی طرف رہنمائی کرتا ہے جس کی چاہتا ہے اور وہ مثالیں پیش کرتا ہے لوگوں کے لئے اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔“

آیہ نور:

چونکہ اجالے کا کام چیزوں کو سامنے لانا ہے اور خالق وہ ہے جس نے کتم عدم سے کائنات کو عالم شہود میں جلوہ گر کیا، اس لئے اس کی ذات حقیقت نور کی مصداق اتم و اکمل ہے۔ پھر یہ کہ نور رہنمائی کا کام کرتا ہے اور رہنمائے حقیقی اللہ ہے اس لئے بھی وہ نور اکمل ہے۔^[2] ورنہ جسے ہم عرف عام میں ”نور“ کہتے ہیں یہ تو مخلوق اور اس کی بعض مخلوقات کا اثر ہے۔

اب اس کے بعد جو ”اس کا نور“ کہا ہے تو اس سے مراد اس کی طرف کی ہدایت اور تیز حق و باطل ہے جو نور کا حاصل ہوتا ہے۔ اب خواہ یہ تیز اس کی طرف کی کتاب سے ہو یا اس کی طرف کے رہنما کے ذریعہ سے جو نور بنا کر بھیجا گیا ہے، اور اس لئے اس کی تفسیر قرآن سے بھی ہوئی ہے اور ذات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اور اس فیض ربانی سے بھی جو مومن کے دل کو چراغ ہدایت سے روشن کرتا ہے۔

اب اس کے بعد عربی ادب کے اسلوب کے موافق اس نور کی کمال ضیاء باری کے لئے جس چراغ سے تشبیہ دی گئی ہے، اس میں اس دور کے لحاظ سے زیادہ سے زیادہ روشنی کا انتظام کیا گیا ہے۔

[1] غفور للمکرہات لالمکرہ لان الورد علیہ رحیم بہن (مجمع البیان)

[2] قبیل فی معناہ قولہن احدہما ان اللہ ہادی اهل السموات والارض... والثانی انہ منور السموات والارض (تبیان)

آج کل کے دور والوں کو یہی مضمون سمجھایا جائے تو اس زمانہ میں جتنا زیادہ سے زیادہ اہتمام روشنی کے تیز کرنے کا سائنس کے ذرائع سے ہو سکتا ہے، وہ سب اس مطلب کے اظہار کا ذریعہ ہوگا۔

فِي بُيُوتِ الَّذِينَ أَنْتَنَ اللَّهُ أَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ ۖ يُسَبِّحُ لَهُ فِيهَا بِالْغُدُوِّ
وَالْأَصَالِ ﴿٦٨﴾ رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ
وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ ۗ يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ ﴿٦٩﴾ لِيَجْزِيََهُمُ
اللَّهُ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَيَزِيدَهُم مِّن فَضْلِهِ ۗ وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ

حِسَابٍ ﴿٦٨﴾

’ان گھروں میں جن کے لئے اللہ نے طے کر دیا ہے کہ وہ بلند کئے جائیں اور ان میں اللہ کو یاد کیا جائے، اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں ان میں صبح و شام وہ افراد جنہیں کوئی بیوپار اور کوئی بیچ کھوج کرنے کا مشغلہ اللہ کو یاد کرنے اور نماز کو قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے سے غافل نہیں بناتا، وہ ڈرتے ہیں اس دن سے جس میں دل اور نگاہیں الٹ پلٹ ہو جائیں گی تاکہ اللہ انہیں معاوضہ دے بہترین اعمال کا جو انہوں نے کئے اور انہیں اور زیادہ عطا کرے اپنے فضل و کرم سے اور اللہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے بے سان گمان کے‘۔

عبادت الہی کے اوقات کا لحاظ رکھنے کے ساتھ تجارت کی تعریف:

یہ جو تعریف کی گئی ہے کہ وہ افراد جنہیں کوئی بیوپار اور کوئی بیچ کھوج کا مشغلہ اللہ کو یاد کرنے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے سے غافل نہیں بناتا، اس سے خود صحیح عقل یہ نتیجہ نکال سکتی ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ وہ تجارت وغیرہ کسب معاش کے کام انجام نہیں دیتے بلکہ ان کاموں کی انجام دہی کے ساتھ وہ حقوق اللہ اور حقوق الناس دونوں میں سے کسی کو فراموش نہیں کرتے، یہی اس کا مفہوم اہل بیت علیہم السلام کی تفسیر میں بتایا گیا ہے۔^[۱]

اب یہ گھر کون ہے؟ اس کی تفسیر خانہ خدا یعنی مسجدوں سے بھی ہوئی ہے اور یہ بھی کہا وہ انبیاء کے گھر ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ کسی نے حضرت علی وفاطمہ علیہما السلام کے گھر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ گھر بھی ان گھروں میں سے ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نعم من افاضلہا ’ہاں، ان میں کے امتیازی فضیلت رکھنے والے گھروں میں سے ہے (مجمع البیان)

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيَعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً ۗ حَتَّىٰ إِذَا

[۱] روى عن ابي جعفر عليه السلام و ابي عبد الله عليه السلام انه قال: مدح قرما اذا دخل وقت الصلوة تركوا تجارتهم و بيعهم و اشتغلوا بالصلوة. (تبیان)

جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَوَجَدَ اللَّهُ عِنْدَهُ فَوْقَهُ حِسَابًا ۖ وَاللَّهُ سَرِيعٌ

الْحِسَابِ ﴿٣٥﴾

”اور جنہوں نے کفر اختیار کیا، ان کے اعمال مثل سراب کے ہیں ایک ریگستانی میدان میں جسے پیسا پانی سمجھتا ہے، یہاں تک کہ جب اس کے پاس گیا تو اسے کچھ نہ پایا اور اللہ کو اس کے پاس پایا تو اس نے اس کا پورا پورا حساب لے لیا اور اللہ بڑا تیز حساب لینے والا ہے۔“

کافروں کے اعمال خیر و خیرات کا بے کار ہونا:

یہ اعمال جن کی مثال سراب سے دی جا رہی ہے، برے اعمال تو ہونے نہیں سکتے، اس لئے کہ برے اعمال میں کوئی چمک دمک ہے ہی نہیں جس سے پیسا پانی سمجھے، یہ بظاہر اعمال خیر ہی ہو سکتے ہیں جن پر جزاء کی امید کی جاسکتی ہے اور اس لئے وہ پانی کی طرح لہریں مارتے نظر آتے ہیں اور پیاس بجھانے کی امید دلاتے ہیں۔ [۱] مگر قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ وہ مثل سراب کے ثابت ہوں گے جس کے پاس پیسا دوڑ کر جاتا ہے تو سوا التہاب میں اضافہ کے اور کوئی نتیجہ نہیں ہوتا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اعمال خیر کے سود مند ثابت ہونے کے لئے اسلام و ایمان ضروری شرط ہے، اس کے بعد یہ خیال کتنا غلط ہے جو اس دور میں کافی پھیل رہا ہے کہ اصل چیز اعمال ہیں، اگر اعمال اچھے تو انسان بہتر سے بہتر جزاء کا استحقاق رکھتا ہے چاہے وہ کسی بھی مذہب و ملت سے متعلق ہو یا لا مذہب ہو۔ یہ خیال از روئے قرآن کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔

أَوْ كَظُلُمٍ فِي بَحْرِ لُجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهِ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهِ سَحَابٌ ۖ

ظُلُمٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۖ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكْدِئْ بِهَا ۖ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ

اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَالَهُ مِنْ نُورٍ ﴿٣٦﴾

”یامش اندھیروں کے گہرے سمندر کے جس پر لہر پر لہر آ کر چھا رہی ہو جس کے اوپر سے بادل ہوا اندھیرے ایک کے اوپر ایک جب اپنا ہاتھ نکالے تو اسے دیکھنے کا امکان بہت کم ہے اور جس کے لئے اللہ روشنی قرار نہ دے، اس کے لئے کوئی روشنی نہیں ہے۔“

اس طرف نور علی نور روشنی بالائے روشنی اور اس طرف ظلمات بعضہا فوق بعض ”تاریکیاں ہیں، ایک کے اوپر ایک“ اب عقل صحیح

کا فیصلہ کیا ہے؟ کدھر جانا چاہئے؟

جب اپنا ہاتھ نکالے تو اسے دیکھنے کا امکان بہت کم ہے، یہ اس معنی میں ہے جیسے ہمارے یہاں محاورہ ہے کہ ”ہاتھ کو ہاتھ سمجھائی نہیں

دیتا۔“

[۱] یعنی التي يعتقدون الهات طاعات و قربات (تبیان) يعملون و يعتقدون الهات طاعات (مجمع البیان)

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالطَّيْرِ صَفِيَّةٌ كُلُّ قَدْ
 عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ ﴿٣١﴾ ۝ وَاللَّهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ
 وَالْأَرْضِ ۖ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ ﴿٣٢﴾

”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ کی تسبیح کرتے ہیں وہ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور پرندے صف باندھے ہوئے
 ہر ایک جانتا ہے اپنی نماز اور تسبیح کو اور اللہ جاننے والا ہے اس کا جو وہ کرتے ہیں اور اللہ کے لئے ہے سلطنت
 آسمانوں اور زمین کی اور اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے۔“

آسمان اور زمین میں سب اللہ کی تسبیح کرتے ہیں، یعنی ہر عیب و نقص سے اس کے بری ہونے کا اظہار کرتے ہیں۔^[۱]
 کل قد علمہ صلاتہ و تسبیحہ، اس میں علم جو فعل ماضی ہے، اس میں جو ضمیر پوشیدہ ہے، اس کا مرجع ایک تفسیر کے لحاظ سے اللہ
 ہے۔^[۲] اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ ”ان میں سے ہر ایک وہ یعنی اللہ جانتا ہے اس کی نماز اور تسبیح کو“ مگر بعد میں موجود ہے، واللہ علیہم
 بما یفعلون۔ ”اللہ جانتا ہے اسے جو وہ کرتے ہیں“ پھر ایک ہی مطلب کے دو جملوں کے لانے سے فائدہ کیا حاصل ہوگا؟ اس لئے ہمارے
 نزدیک دوسرے قول کو ترجیح ہے کہ علم کی ضمیر کل کی طرف راجع ہے جو اس فعل ماضی سے پہلے بلافاصلہ مذکور ہے۔ اب معنی وہی ہوتے ہیں جو ہم نے
 ترجمہ میں لکھے ہیں کہ ہر ایک جانتا ہے اپنی نماز اور تسبیح کو یعنی ہر ایک کا جو طریقہ تسبیح کا ہونا چاہئے، وہ اس سے خوب واقف ہے۔
 اس کے ضمن میں بہت سے زعم خودی میں بتلا انسانوں پر تعریض بھی ہے کہ بہت سے ”اشرف المخلوقات“ کی نوع میں داخل افراد اس
 احساس و شعور سے خود اختیاری طور پر محروم ہیں۔

یہ اور بات ہے کہ کائنات کی دوسری چیزوں کا واقف ہونا فطرت الہی کے نتیجے میں از خود ہے لیکن انسان کے ”اشرف المخلوقات“ ہونے
 کا تقاضا یہ ہے کہ اُس جو ہر کو جو دوسری کائنات کی چیزوں میں بجز فطرت ہے، ارادی و اختیاری طور پر حاصل کرے۔
 یہ مفہوم بھی قدیم تفاسیر میں درج ہے، یہ اور بات ہے کہ انہوں نے اسے قول ضعیف کے طور پر درج کیا ہے۔^[۳] مگر مجھے وہی درست
 معلوم ہوتا ہے۔

علامہ طبرسی نے پہلے قول کو قوت دیتے ہوئے اس کی توجیہ فرمائی ہے کہ اشیائے کائنات کی تسبیح کے معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ کے جلال و کمال کا
 ثبوت ہے، اور ہر شے کس کس حیثیت سے اس کے جلال و کمال کو ظاہر کر رہی ہے، اسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔^[۴] مگر اس توجیہ سے بھی مجھے
 اتفاق نہیں ہے، اس لئے کہ اشیاء کی دلالت ذات الہی کے جلال و کمال پر تو وہی ہے جس کو عقلائے زمانہ سمجھ سکتے ہیں، تب ہی دلالت کا مفہوم متحقق

[۱] خدا ہی کی پاکیزگی ظاہر کرتے ہیں۔ (تاج العلماء)

[۲] معناہ ان جمیع ذلک قد علم اللہ تعالیٰ صلاتہ (تبیان)

[۳] قیل کل قد علم صلاتہ ای صلواتہ نفسہ (تبیان)

[۴] هو احوال الاشياء كلها لا يعلم كيفيته دلالتها على الله وانما يعلم الله تعالى ذلك (مجمع البيان)

ہوگا، ورنہ خود اللہ تعالیٰ کو اپنے جلال و کمال کو سمجھنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت تھوڑی ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُرْسِلُ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهُ ثُمَّ يَجْعَلُهُ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ
يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ ۖ وَيُنزِلُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا مِنْ بَرَدٍ فَيُصِيبُ بِهِ
مَنْ يَشَاءُ وَيَصْرِفُهُ عَنْ مَنْ يَشَاءُ ۗ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهِ يَذْهَبُ بِالْأَبْصَارِ ۗ يُقَلِّبُ
اللَّهُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ ۝۳۳

’کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ حرکت میں لاتا ہے بادل کو، پھر اس کے اجزاء کو جمع کرتا ہے پھر اسے تہہ بہ تہہ بناتا ہے، تو تم دیکھو گے بڑے بڑے بوندوں کو کہ وہ نکلتے ہیں اس کے اندر سے اور اتارتا ہے پہاڑوں کی بلندی سے ابر جس میں اولے ہوتے ہیں تو گر اتا ہے انہیں جس پر چاہتا ہے اور ہٹائے رکھتا ہے انہیں جس سے چاہتا ہے، نزدیک ہے کہ اس کی بجلی کی چمک نگاہوں کی طاقت ختم کر دے اور رات اور دن کو پلٹے کھلاتا ہے، بلاشبہ اس میں آنکھ کھولنے کا سامان ہے نگاہ والوں کے لئے‘۔

یہ صاف صاف مطالعہ کائنات کی دعوت ہے جس کا ترقی یافتہ نام ’سائنس‘ ہے اور پتہ چلتا ہے کہ ان چیزوں کا علم حاصل کرنا بھی اللہ کو مطلوب ہے تاکہ ان سے ذہن ان کے خالق کی طرف متوجہ ہو۔^[۱]

وَاللَّهُ خَلَقَ كُلَّ دَابَّةٍ مِنْ مَّاءٍ ۖ فَمِنْهُمْ مَنْ يَمْشِي عَلَى بَطْنِهِ ۖ وَمِنْهُمْ مَنْ
يَمْشِي عَلَى رِجْلَيْنِ ۖ وَمِنْهُمْ مَنْ يَمْشِي عَلَى أَرْبَعٍ ۗ يَخْلُقُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ ۗ إِنَّ اللَّهَ
عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝۳۴

’اور اللہ نے پیدا کیا ہر نقل و حرکت کرنے والے جاندار کو ایک خاص شان کے پانی سے تو ان میں کوئی وہ ہے جو اپنے پیٹ کے بھل چلتا ہے اور کوئی دو پیروں پر چلتا ہے اور کوئی چار پر، اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے‘۔

ہر جاندار کی خلقت پانی سے:

دوسری جگہ قرآن مجید میں ہے:

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۗ : اور ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے قرار دیا ہے (انبیاء۔ ۳۰)

اس کے معنی عموماً یہ سمجھے گئے ہیں کہ آغاز تخلیق پانی سے ہوا ہے اور یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ بقا سہرزی حیات کی پانی سے وابستہ ہے۔ عام

[۱] فی الآية دلالة على وجوب النظر وفساد التقليد (تبیان)

طور پر اس آیت کو بھی جو یہاں ہے اسی مفہوم میں لیا گیا ہے مگر وہاں الماء کا لفظ بطور جنس وارد ہوا ہے۔ وہ مفہوم قرین قیاس ہے اور یہاں ماء بطور نکرہ ہے جس کے معنی ایک پانی کے ہیں لہذا بعض مفسرین کو تاویل کی ضرورت محسوس ہوئی ہے اس طرح کہ یہاں ماء کا لفظ جمع کے معنی میں ہے، کہ پانیوں سے۔^[۱]

مگر ابھی مطلب حل نہیں ہوتا، اس لئے کہ جنس کے لحاظ سے پانی بہت سے نہیں ہوتے، وہ ایک ہی جنس ہوتی ہے لہذا مفرد لفظ ہی ہونا چاہئے مگر الف لام (ال) کے ساتھ جیسے دوسرے مقام پر الماء ہے مگر یہاں الماء نہیں ہے ماء ہے، اس لئے یہاں میرے نزدیک زیادہ ترجیح دوسرے قول کو ہے جسے بطور قول ضعیف درج کیا گیا ہے کہ یہاں پانی سے مراد نطفہ ہے جو ظاہر ہے کہ ہر ہر فرد کا الگ الگ ہوتا ہے۔^[۲] جسے دوسرے مقامات پر ماء مہین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہذا یہاں پانی سے مراد وہ پانی نہیں ہے جو پیا جاتا ہے اور جو بقائے حیات کا سبب ہے یا جس سے سانس کی رو سے ابتدائی تخلیق ہے۔

علامہ طبری نے ہماری اختیار کردہ تفسیر ہی کو اختیار کیا ہے اس لئے پہلے ماء کی تفسیر نطفہ سے کی ہے، پھر اس دوسرے مفہوم کو بطور قول ضعیف درج کیا ہے۔^[۳]

لَقَدْ أَنْزَلْنَا آيَاتٍ مُّبِينَاتٍ ۗ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۳۶﴾
 ”بلاشبہ ہم نے اتاریں پردہ کشائی کرنے والی آیات اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدے راستے پر چلنے کی توفیق دیتا ہے۔“

اگر مُبِينَات (یائے مشدد کے فتح کے ساتھ) ہوتا تو معنی ہوتے کھلی ہوئی واضح نشانیاں، جیسا کہ بعض تفاسیر میں اس کے معنی دیئے ہیں۔^[۴] مگر متداول قرأت جس کے مطابق عام طور پر اعراب لگائے گئے ہیں مُبِينَات (ی کے کسرہ کے ساتھ ہے) جو اسم فاعل ہے تو ہم نے ”پردہ کشائی کرنے والی“ کے ساتھ ترجمہ کیا ہے یعنی وہ آیات جو حقیقتوں کو نمایاں کرنے والی ہیں۔^[۵]

وَيَقُولُونَ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالرَّسُولِ وَأَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلَّى فَرِيقٌ مِّنْهُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ ۗ وَمَا أُولَٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ ﴿۳۷﴾ وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿۳۸﴾ وَإِنْ يَكُنْ لَهُمُ الْحَقُّ يَأْتُوا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ ﴿۳۹﴾ أَفِي

[۱] من ماء ای من میاء (علی بن ابراہیم)

[۲] قیل من ماء ای من نطفة ذکرة الحسن وجعل قوله "کل دابة خاصافی من خلق من نطفة" (تبیان)

[۳] قیل عنی به الماء لان اصل الخلق من الماء (مجمع البیان)

[۴] ای دلالات و اضمحلت بینات (مجمع البیان)

[۵] تظهر بها المعانی... حتی تعلم مفصلة (تبیان)

قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ آمِرَاتُ تَابُوا أَمْ يَخَافُونَ أَنْ يَحْيِفَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُولُهُ أَوْلِيَاءُ لَكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٥٠﴾

”اور وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور پیغمبر پر اور ہم نے اطاعت کی، پھر اس کے بعد ایک جتھان میں کاروگردانی اختیار کرتا ہے اور یہ لوگ ایمان والے ثابت نہیں ہوتے اور جب انہیں اللہ اور اس کے پیغمبر کی طرف بلا یا جاتا ہے کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کر دے تو ایک دم یہ نظر آتا ہے کہ ان میں کی ایک جماعت روگردانی اختیار کرتی ہے اور اگر حق میں ان کا فائدہ ہو تو آئیں گے اس کی طرف سر جھکائے ہوئے۔ کیا ان کے دلوں میں کوئی بیماری ہے یا وہ شک میں مبتلا ہو گئے ہیں یا وہ ڈرتے ہیں کہ اللہ ان کے ساتھ زیادتی کرے گا یا اس کے پیغمبر؟ (ہرگز نہیں) بلکہ یہ لوگ خود زیادتی کرنے والے ہیں۔“

ایمان کے خلوص کی علامت یہ ہے کہ وہ بے لوث ہو لیکن جب اس میں خود غرضی نمایاں ہوئی تو یہ اس کی دلیل ہوگی کہ ایمان دل میں جاگزیں نہیں ہے۔

یہ جو منافقین کا کردار بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو حکم بنانے پر اسی وقت راضی ہوتے ہیں جب وہ سمجھتے ہیں کہ فیصلہ ان کے موافق ہوگا ورنہ وہ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فیصلہ سے انحراف کر جاتے ہیں، کیا یہی حالت اکثر مدعیان ایمان کی اس وقت بھی نظر نہیں آتی؟

عالم دین یعنی وہ مجتہد جسے وہ نائب امام کہتے ہیں، ادھر اس کا فتویٰ ان کے مفاد کے خلاف ہو اور بس تقلید چھوڑنے کے لئے تیار ہو گئے، یہاں تک کہ استخارہ جسے وہ خدا کا حکم سمجھتے ہیں، اگر ان کی مرضی کے مطابق ہو تو مانا اور اگر ان کی خواہش کے خلاف ہو تو دوسرے عالم کے پاس جا کر استخارہ دکھلانے کے لئے تیار ہو گئے، کیا یہ استخارہ پر اعتقاد کا ثبوت ہے؟ اور اگر وہ استخارہ کو واقعی اللہ کا حکم مانتے ہیں تو کیا یہ خود اللہ کے ساتھ مذاق نہیں ہے۔ نعوذ من ذلك

اس تذکرہ کے آغاز میں یہ بات بس اب قابل تشریح ہے کہ اذا دعوا الى الله ورسوله في شيء مما حرم الله فاستمعوا له وانصتوا لعلكم ترحموا۔ یہاں تشبیہ نہیں کیا گیا کہ ”وہ دونوں ان کے درمیان تصفیہ کر دیں“ یہ کیوں؟ یہ اس لئے کہ لفظاً اگرچہ وہ دو ہیں مگر مقام فیصلہ میں وہ ایک ہیں، یعنی جو رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے وہی حقیقت میں اللہ کا فیصلہ ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے۔

مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ۗ

جس نے پیغمبر کی اطاعت کی، اس نے خدا کی اطاعت کی (ساء۔ ۸۰)

تو مقام فیصلہ میں اللہ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے الگ نہیں ہے۔^[۱]

[۱] انما افر دقوله: ليجكم بعد قوله: الى الله ورسوله (لانه حكم واحد يوقعه النبي ﷺ بامر الله (تبيان)

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۗ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٥١﴾ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقْهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْغَازِيُونَ ﴿٥٢﴾

”ایمان والوں کی جب انہیں اللہ اور اس کے پیغمبر کی طرف بلایا جاتا ہے کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کر دیں، بس یہ بات ہوتی ہے کہ وہ کہتے ہیں ہم نے سنا اور اطاعت کی اور یہی لوگ دین و دنیا کی بہتری حاصل کرنے والے ہیں اور جو اللہ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرے اور اس سے ڈرے اور اس کی مخالفت سے بچے، تو یہی لوگ کامیاب ہیں۔“

یہ ان منافقین کے مقابل کا کردار ہے جو مومنین کے وصف میں پیش کیا جا رہا ہے اور یہی کردار ان کے صحت ایمان اور خلوص کی علامت

ہے۔

وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ أَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ۗ قُلْ لَا تُقْسِمُوا ۗ طَاعَةٌ مَّعْرُوفَةٌ ۗ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٥٣﴾

”اور وہ اپنی ممکن طاقت بھر اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر آپ انہیں حکم دیں گے تو وہ ضرور نکلیں گے، کہیے کہ قسمیں نہ کھاؤ، یہ تو فرماں برداری کا عام تقاضا ہی ہے۔ بلاشبہ اللہ جو کچھ تم کرتے ہو، اس سے واقف ہے۔“

میں نے جو ترجمہ کیا ہے، وہی الفاظ قرآنی سے میری سمجھ میں آتا ہے لیکن دوسرے مفسرین نے اس کے دو معنی اس سے الگ کہے ہیں۔ ایک یہ کہ خالق نے ان کے جواب میں یہ کہا ہے کہ یہ اطاعت کا زبانی اقرار تو پہلے ہی جب تم نے اظہار ایمان کیا تو اس وقت ہو چکا ہے مگر کہاں تک وہ حقیقت کے مطابق ہے، اُسے اللہ جانتا ہے۔

دوسرے یہ کہ قسمیں کھانے سے کیا فائدہ؟ تم عملی طور پر اطاعت اور اچھی گفتگو کرو تو وہ قسمیں کھا کھا کر اس کے اقرار کرنے سے بہتر ہے اسے جناب شیخ الطائف نے بطور قول دوم نقل کیا ہے۔^[۱]

حالانکہ جس میں طاعة وقول معروف ہیں، وہ دوسری آیت ہے، اس کی تفسیر کو یہاں درج کرنا میرے خیال میں تو مسامحہ ہی ہے لطف یہ ہے کہ علامہ طبرسی نے مسامحہ میں بھی جناب شیخ کا اتباع کیا ہے۔^[۲]

[۱] قبیل فی معناہ قولان: احدهما هذه طاعة معروفة منكم یعنی بالقول دون الاعتقاد والثاني طاعة وقول معروف امثل من هذا القسم (تبیان)

[۲] قبیل معناہ لیکن منکم طاعة والقول المعروف (مجمع البیان)

تیسرا مطلب یہ کہا گیا ہے کہ اطاعت تو اللہ کو پسند ہے ہی، اس کے اظہار کی ضرورت کیا ہے۔^[۱]

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ ۚ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ

مَا حُمِّلْتُمْ ۗ وَإِنْ تُطِيعُوا فَتُهْتَدُوا ۗ وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلْغُ الْمُبِينُ ﴿۵۷﴾

”کہہ دیجیے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور اس پیغمبر کی اطاعت کرو، اب اگر تم روگردانی کرو تو اُس کے اوپر تو وہ ہے جو اُس پر بار ڈالا گیا ہے اور تمہارے اوپر وہ ہے جو تم پر بار ڈالا گیا ہے اور اگر تم اُس کی اطاعت کرو تو سیدھا راستہ حاصل کرو گے اور پیغمبر کے ذمہ نہیں ہے مگر صاف طور پر پہنچا دینا“۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ

كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۗ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ

لَهُمْ وَلَيَبَدِّلَنَّهُمْ مِمَّنْ بَعَدَ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ۗ يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا ۗ

وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿۵۸﴾

”اللہ کا وعدہ ہے تم میں اُن افراد سے جو با ایمان ہیں اور نیک اعمال کرتے رہے ہیں کہ وہ اُنہیں روئے زمین پر خلیفہ قرار دے گا جس طرح اُنہیں خلیفہ بنایا تھا جو اُن کے پہلے تھے اور ضرور اقتدار عطا کرے گا ان کے سوا اُس دین کو جو اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے اور ضرور اقتدار عطا کرے گا ان کے اُس دین کو اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے اور ضرور بدل دے گا اُنہیں اُن کے ہر اس کے بعد امن و اطمینان، وہ میری عبادت کریں گے اس طرح کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے اور جو اسکے بعد کفر اختیار کرے تو یہی فاسق لوگ ہوں گے“۔

صاحب ایمان صالحین سے مکمل اقتدار کا وعدہ:

ظاہر ہے کہ یہ خطاب کافروں سے نہیں، مسلمانوں سے ہے لیکن جو وعدہ کیا جا رہا ہے، وہ اُن سب سے نہیں بلکہ اُن میں خاص افراد سے ہے، ان خاص افراد کو جو وصف بیان کیا جا رہا ہے کہ وہاں با ایمان ہیں اور نیک اعمال والے ہیں تو یہ وہ عام ایمان اور عمل صالح نہیں ہو سکتا جس کا ہر مسلمان کو حامل ہونا چاہیے بلکہ وہ خاص مرتبہ ایمان حقیقی اور حقیقی عمل صالح کا ہے جو خاص افراد ہی میں ہوا کرتا ہے۔

جناب شیخ طوسی نے اس آیت کے ذیل میں کافی بسیط بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے استخلاف کے معنی اُس خلیفہ بنانے کے ہیں ہی نہیں جو اسلامی اُمت کے سربراہ کے مفہوم میں لیا جاتا ہے بلکہ گزشتہ اقوام کے بجائے اب اس قوم کو با اقتدار بنانا ہے جس کی نظیریں قرآن مجید میں بکثرت ہیں مثلاً:

[۱] تابع داری پسند ہے (تاج العلماء)

هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ ۗ ^[۱]

عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يُبَدِّلَ عُدَّتَكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ ^[۲]

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۗ إِنَّ كَيْدَ الْيَهُودِ لَشَدِيدٌ ۗ وَيَسْتَخْلِفُ مِنْ بَعْدِكُمْ مَا يَشَاءُ ^[۳]

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً ^[۴]

ان تمام آیات میں اس لفظ کے معنی ایک کے جانے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں تو یہی یہاں بھی مراد ہے۔ اس صورت میں یہ وعدہ زمانہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں پورا ہو گیا جب کہ جزیرۃ العرب میں مسلمانوں کا غلبہ ہو گیا۔ لہذا اسے فتوحات سے متعلق کرنا درست نہیں ورنہ ماننا پڑے گا کہ ابھی تک وہ وعدہ پورا نہیں ہوا کیوں کہ معمورہ ارض کا زیادہ تر حصہ مسلمانوں کے قبضہ میں نہیں ہے۔ اس صورت میں اہل بیت علیہم السلام کے اس ارشاد کو قبول کرنا چاہیے کہ یہ وعدہ زمانہ امام مہدی علیہ السلام سے متعلق ہے جب کہ اسلام کو تمام بسط ارض پر غلبہ حاصل ہوگا۔ ^[۵]

تفسیر کے ذیل میں اتنا بیان کافی ہے، ورنہ اصل میں تو اس آیت پر پوری بحث علم کلام کی کتابوں میں بحث امامت کے ذیل میں ہوتی ہے۔ ^[۶]

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿۵۶﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ ۗ وَمَأْوَهُمُ النَّارُ وَلَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿۵۷﴾

”اور نماز ادا کرتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور پیغمبر کی اطاعت کرو، شاید تم پر رحمت کا نزول ہو۔“

”انہیں جو کافر ہیں، ہرگز نہ سمجھو قابوسے باہر ہو جانے والے اطراف زمین میں اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور کیا بری جگہ وہ ہے۔“

”قابوسے باہر ہو جانے والے“ یعنی میرے عذاب سے بچ کر نکل جانے والے، ایسا ہرگز انہیں نہ سمجھو، حقیقت یہ ہے کہ وہ دنیا میں کہیں جا کر میری گرفت سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ^[۷]

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِيَسْتَأْذِنَكُمْ الَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ وَالَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا

[۱] فاطر۔ ۳۹

[۲] اعراف۔ ۱۲۹

[۳] انعام۔ ۱۳۳

[۴] فرقان۔ ۲۶

[۵] فان التمكن في المرض على الاطلاق لم يحصل فهو منتظر ان الله عز وجل لا يخلف وعده (مجمع البيان)

[۶] قد استوفينا ما يتعلق بالآية في كتاب الامامة فكلنا طول بذكره ههنا (تبيان)

[۷] اي لا يفوقون (جلالين)

الْحُلْمَ مِنْكُمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ط مِنْ قَبْلِ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُمْ
مِنَ الظَّهِيرَةِ وَمِنْ بَعْدِ صَلَاةِ الْعِشَاءِ ۗ ثَلَاثُ عَوْرَاتٍ لَكُمْ ط لَيْسَ عَلَيْكُمْ
وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ بَعْدَهُنَّ ط طَوُّفُونَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلَى بَعْضٍ ط كَذَلِكَ
يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ ط وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٥٩﴾

”اے ایمان لانے والو! اُن غلاموں کو جو تمہاری ملکیت میں ہوں اور اُن بچوں کو بھی تم میں سے جو حد بلوغ تک نہیں پہنچے، لازم ہے کہ تین وقتوں میں تمہارے پاس اجازت لے کر آئیں: نماز صبح کے پہلے تک اور اُس وقت جب تم دوپہر کو اپنے کپڑے اتار دیتے ہو اور عشاء کی نماز کے بعد۔ یہ تین وقت تمہارے لئے پردہ داری کے ہیں۔ ان اوقات کے علاوہ تم پر اور اُن پر کوئی سختی نہیں ہے۔ تمہیں آپس میں ایک دوسرے کی طرف چکر لگانا ہی ہیں، اس طرح اللہ تمہارے لئے آیات کو صاف صاف پیش کرتا ہے اور اللہ جاننے والا ہے، بڑی سوجھ بوجھ والا۔“

گھر کے خاص افراد یہاں تک کہ بچوں سے بھی ایک حد تک پردہ:

عام حکم پردہ کے بعد جو اغیار اور بالغ نامحرموں سے ہے، اب خاص الخاص گھر کے دوسرے آدمیوں، یہاں تک کہ نابالغ بچوں تک سے بھی اتنے پردہ کی تاکید کی جا رہی ہے کہ انہیں بھی اُن حالات میں جب تم لباس شب خوابی میں ہوتے ہو، تمہارے پاس آزادی کے ساتھ نہیں آنا چاہیے بلکہ ہماری قدیم تفسیر سے، جو زیادہ ترا تو ال معصومین علیہم السلام پر مبنی ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محرم عورتیں ماں بہن تک اس حکم میں داخل ہیں۔ [۱]

وَإِذَا بَلَغَ الْأَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلْمَ فَلْيَسْتَأْذِنُوا كَمَا اسْتَأْذَنَ الَّذِينَ مِنْ
قَبْلِهِمْ ط كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ ط وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٥٩﴾

”اور جب لڑکے تم میں سے بالغ ہو جائیں تو انہیں اُسی طرح اجازت لینا چاہیے جیسے اُن کے پہلے دوسرے لوگ لیا کیے ہیں، اس طرح اللہ اپنی آیات کو تمہارے لئے واضح طور پر پیش کرتا ہے اور اللہ جاننے والا ہے، بڑی سوجھ بوجھ والا۔“

یعنی نابالغ لڑکوں کو تو بس اُن تین وقتوں میں اجازت لینے کی ضرورت ہے مگر اب جب وہ بالغ ہو گئے تو اب وہ دوسرے نامحرم مردوں کی طرح ہو گئے، اب کسی وقت بھی بغیر اجازت انہیں اندر آنا درست نہیں کیوں کہ اب اُن سے عورتوں کو ویسا ہی پردہ کرنا چاہیے جیسا تمام اجنبی مردوں سے لازم ہے۔

[۱] ان اللہ نہی ان یدخل احدی هذه الثلاثة الاوقات علی احد الاب ولا اخت ولا ام ولا خادم الا باذن (علی بن ابراہیم)

بہر حال ہوائے زمانہ کے خلاف جو مطلق پردہ کی مخالف ہے، مذکورہ بالا آیات سے مجموعی طور پر حسب ذیل نتائج آمد ہوتے ہیں:

(۱) صرف غیر ممیز بچوں سے کسی حال میں پردہ نہیں ہے۔

(۲) وہ بچے جو ابھی حد بلوغ تک نہیں پہنچے ہیں مگر طفل ممیز کی حیثیت رکھتے ہیں، ان سے خاص حالات میں جب کہ انسان عریاں نہیں تو نیم عریاں ہوتا ہے، پردہ لازم ہے، لیکن دوسرے حالات میں جب تک وہ طفل یعنی نابالغ ہیں، پردہ واجب نہیں ہے۔

(۳) وہ بچے جو اب بالغ ہو گئے ہیں، ان سے پورے طور پر پردہ لازم ہے اور چونکہ لڑکے کا بلوغ شرعی ۱۵ برس میں اور لڑکی کا نو برس میں ہو جاتا ہے لہذا پندرہ برس کے لڑکے سے پردہ ویسا ہی لازم ہے جیسا کہ کسی بھی نامحرم مرد سے لازم ہوتا ہے اور نو برس کی لڑکی پر اسی طرح پردہ واجب ہے جس طرح کسی بھی عورت پر نامحرم مردوں سے پردہ واجب ہوتا ہے لہذا ۱۵ برس کے لڑکے اور ۹ برس کی لڑکی کا جن دونوں کو عرف عام میں بچہ ہی سمجھا جاتا ہے، آپس میں کھیلنا اور ساتھ رہنا، اسی طرح شرعاً حرام ہے۔ جس طرح کسی بھی غیر مرد اور غیر عورت کا آپس میں بغیر پردہ کے میل جول ناجائز ہے۔

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ الَّتِي لَا يَرْجُونَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ أَنْ
يَضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجَاتٍ بِزِينَةٍ ۗ وَأَنْ يَسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ
عَلِيمٌ ﴿۶۰﴾

”اور وہ ازکار افتادہ عورتیں جو تعلقات ازدواجی کا کوئی تصور نہیں رکھتیں، ان پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ اپنے اوپر کے کپڑے اتار کر رکھ دیں درانحالیکہ آرائش کر کے ادھر ادھر نہ پھیریں اور اگر پارسائی سے کام لیں تو ان کے لئے بہتر ہے اور اللہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا“۔

ضعیف العمر عورتوں کے لئے برقع چھوڑنے کی اجازت کے باوجود پردہ داری کی تاکید:

”ازکار افتادہ“ کے معنی؟ یعنی ضعیف العمری کی وجہ سے جن کے یہاں اور جن کی طرف میلانات جنسی کا کوئی تصور ہی نہیں رہا ہے۔^[۱]

یہ اوپر کے کپڑے مثلاً برقع یا چادر اتار کر سامنے آئیں تو ناجائز نہیں مگر پھر شرط یہ ہے کہ ”آرائش کر کے ادھر ادھر پھریں نہیں اور پھر بغیر اس کے بھی فضیلت اسی میں ہے وہ اُس طرح بھی سامنے نہ آئیں۔

”اگر پارسائی سے کام لیں“..... یہ پارسائی بقرینہ سابق کیا ہے؟ یہی کہ برقع وغیرہ کے اوپر کے کپڑے بھی نہ اتاریں، معلوم ہوا کہ یہ اوپر کے لباس کا اترنا ایسی ضعیف العمر عورتوں کے لئے بھی پارسائی کے خلاف چیز ہے، چہ جائیکہ جوان جہاں عورتیں تقریباً نیم برہنہ عالم میں ماری ماری پھرا کریں اور پھر ”پارسا“ کی پارسائی رہیں۔

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَى حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ وَلَا

[۱] هن المسنات من النساء اللاتي قعدن عن التزوج لانه لا يرغب في تزويجهن (مجمع البيان)

عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَنْ تَأْكُلُوا مِنْ بُيُوتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ آبَائِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أُمَّهَاتِكُمْ أَوْ
بُيُوتِ إِخْوَانِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخَوَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَعْمَامِكُمْ أَوْ بُيُوتِ عَمَّاتِكُمْ
أَوْ بُيُوتِ أَخَوَالِكُمْ أَوْ بُيُوتِ خَلَتِكُمْ أَوْ مَا مَلَكَتُمْ مَفَاتِحَهُ أَوْ صَدِيقِكُمْ ۗ
لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَأْكُلُوا جَمِيعًا أَوْ أَشْتَاتًا ۗ فَإِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوتًا
فَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ مُبْرَكَةً طَيِّبَةً ۗ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ
لَكُمْ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿١١﴾

’اندھے پر کوئی گناہ نہیں ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی گناہ ہے اور نہ بیمار پر کوئی گناہ ہے اور نہ خود تم اس بات میں کہ کھاؤ
و اپنے گھروں سے یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے
یا اپنی پھپیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالائوں کے گھروں سے یا جس گھر کی
کنجیاں تمہارے ہاتھ میں ہیں یا اپنے دوست کے یہاں سے۔ نہیں ہے تم پر کوئی گناہ کہ تم کھاؤ اکٹھا یا الگ الگ تو
جب کچھ گھروں میں داخل ہو تو اپنے آدمیوں کو سلام کرو۔ ہدیہ ہے کہ اللہ کی طرف کا مبارک، پاکیزہ۔ اس طرح
اللہ آیات تمہارے لئے واضح طور پر پیش کرتا ہے شاید تم عقل سے کام لو۔‘

بعض مفسرین نے پہلے جملہ کو جس میں معذورین کا ذکر ہے، الگ کر دیا ہے۔ اب یہ بات مجمل رہے گی کہ اندھے وغیرہ میں کس بات
میں گناہ نہیں کہ تم ان کے گھروں سے کھاؤ۔

بعض نے قبل کے اجمال کو جہاد وغیرہ سے متعلق کیا ہے [۱] اس صورت میں یہ بعد کے ذکر سے بالکل ہی غیر متعلق ہوگا۔
بعض نے یہ مطلب فرمایا ہے کہ ان معذورین کے ساتھ کھانے میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ یہ نہ سوچو کہ وہ معذور ہونے کی وجہ سے کم
کھائیں گے اور ہم زیادہ کھالیں گے مگر وہاں تو یہ ہے کہ ان معذورین پر کوئی گناہ نہیں۔ دوسروں کا ذکر کہاں ہے کہ تم پر کوئی گناہ نہیں۔
ایک تصور یہ ہے کہ یہ پورا سلسلہ کلام ایک ڈال ہے یعنی ان معذورین پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ دوسروں کے گھروں سے اپنی ضرورت
بھر کھائیں [۲] اور تم میں سے دوسرے لوگوں کیلئے بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ ان گھروں سے جن کا ذکر بعد کو ہوا ہے کھائیں۔

سردست اصل الفاظ قرآن سے یہ آخری مفہوم ہی زیادہ قابل ترجیح معلوم ہوتا ہے خصوصاً جب کہ اس کی نسبت ہمیں معصومین علیہم السلام کی
طرف بھی مل رہی ہے اگرچہ اس نسبت کی نقل میں یہ فروگزاشت معلوم ہوتی ہے کہ بعد والے گھروں کی تخصیص ان معذورین کیلئے بھی کر دی گئی ہے

[۱] جہاد و جماعت وغیرہ کا (حواشی تاج العلماء)

[۲] الَّذِي رَوَى عَنْ أَهْلِ الْبَيْتِ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَنَّهُ لَا بَأْسَ بِالْأَكْلِ لَهُمْ وَلَا مِنْ بَيْوتِهِمْ إِذْ هُمْ فِيهَا جَاهِلُونَ مِنْ غَيْرِ اسْرَافٍ
(تبیان)

اس کے معنی یہ ہیں کہ معذور اور غیر معذور سب کا ایک حکم ہے تو خصوصیت سے قبل میں ان معذورین کے خاص طور پر ذکر کی ضرورت کیا تھی؟ مجھے معذورین اور غیر میں الفاظ قرآنی سے یہ فرق محسوس ہوتا ہے کہ معذورین کیلئے سب ہی گھروں سے بقدر ضرورت کھانے یعنی اپنی جائز ضرورت پوری کرنے کا حق ہے اور دوسروں کیلئے خاص اُن گھروں سے جو بعد میں بیان ہوئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ فقہی حیثیت سے مسلمہ اصول و قواعد کی بناء پر اُن معذور اشخاص کے دوسروں کے گھروں سے کھانے کو بھی ہم شرائط کے ساتھ مشروط کریں اور دوسروں کو جو اپنے عزیزوں یہاں تک کہ دوستوں کے گھروں سے کھانے کی اجازت دی گئی ہے، اُس پر بھی کچھ شرائط عائد کریں جن کی تحقیق کا یہ محل نہیں ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ يَسْتَأْذِنُوهُ ۗ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۗ فَإِذَا اسْتَأْذَنُوكَ لِبَعْضِ شَأْنِهِمْ فَأَذِنَ لِمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ اللَّهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢٤﴾

”ایمان والے بس وہ ہیں جو اللہ اور اس کے پیغمبر پر ایمان رکھتے ہوں اور جب اس (پیغمبر) کے ساتھ کسی مشترک معاملہ پر غور میں مصروف ہوں تو جائیں نہیں جب تک آپ سے اجازت نہ لے لیں، یقیناً وہ جو آپ سے اجازت طلب کرتے ہیں، یہ وہ ہیں جو اللہ اور اس کے پیغمبر پر ایمان رکھتے ہیں تو جب وہ آپ سے اپنی کچھ ضروریات کی وجہ سے اجازت مانگیں تو ان میں سے جسے چاہیے اجازت دے دیجیے اور ان کیلئے اللہ سے بخشش کی دعا کیجیے، بلا شبہ اللہ بخشنے والا ہے بڑا مہربان“۔

صاحبان ایمان کی شان:

”مشترکہ معاملہ“ سے مقصود یہ ہے کہ کوئی ایسا معاملہ جس میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو اکٹھا کیا ہے کہ وہ اپنے اپنے خیالات کا اظہار کریں یا اپنے اپنے خدمات کو اس مہم کے لئے پیش کریں [1] بعض صحابہ اس موقع پر اثنائے گفتگو میں یا مشورہ کے درمیان چپکے سے کھسک جاتے تھے، خالق نے اس بد تمیزی پر ٹوکا ہے اور انہیں ہدایت کی ہے کہ وہ آدابِ مجلس اور احترامِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مد نظر رکھتے ہوئے کسی ضرورت سے جانا بھی چاہیں تو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت حاصل کریں، پھر جائیں۔

”جسے چاہیے اجازت دیجیے کے ساتھ یہ کہنا کہ ”اُن کیلئے بخشش کی دعا کیجیے“ یہ پتہ دیتا ہے کہ یہ اجازت لے کر جانا بھی ایک نامناسب اور خلاف ادب بات ہے کہ اُس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی اس ضرورت کو جس کے لئے جارہے ہیں، اُس مقصد سے جس کے لئے وہ جمع کیے

[1] هو الذي يقتضى الاجتماع عليه والتعاون فيه (تبیان)

گئے ہیں، زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔

لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ۗ قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ
الَّذِينَ يَتَسَلَّلُونَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۗ فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ
تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٦٣﴾

”نہ بناؤ پیغمبر کے پکارنے کو اپنے درمیان اُس طرح جیسے تم میں ایک دوسرے کو پکارتا ہے۔ اللہ جانتا ہے تم میں
کے ان لوگوں کو جو پناہ لیتے ہوئے کھسک جاتے ہیں تو ڈرنا چاہیے انہیں جو اُس حکم سے انحراف کرتے ہیں اس بات
سے کہ پہنچے انہیں کوئی آزمائش یا پہنچے انہیں دردناک عذاب۔“

رسول خدا ﷺ کے لئے امتیازی طور پر تعظیم و احترام کا حکم:

یعنی پیغمبر کو نام یا نسب کے ساتھ عام آدمیوں کی طرح نہ پکاریں بلکہ آپ کے منصب اور القاب کو سرنامہ خطاب قرار دے کر آپ کی
تعظیم و تکریم کے تقاضا کو پورا کریں۔^[۱]

یہ تعظیم و اجلال کی صاف دعوت ہے جسے ایک طبقہ معیار توحید کے منافی قرار دیتا ہے۔

”ان لوگوں کو جو پناہ لیتے ہوئے کھسک جاتے ہیں“ یعنی رسول ﷺ کے خطبہ سے گھبرا کر ایک دوسرے کی پشت کے پیچھے چھپتے
ہوئے مسجد سے نکل جاتے تھے^[۲] اس پر خالق کریم نے تنبیہ کی ہے اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہے۔

أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ قَدْ يَعْلَمُ مَا اَنْتُمْ عَلَيْهِ ۗ وَيَوْمَ

يُرْجَعُونَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٦٤﴾

”معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ جانتا ہے اُسے جس پر تم ہو اور جس دن وہ اس
کی طرف پلٹیں گے تو وہ بتائے گا انہیں جو کچھ وہ کرتے رہے تھے اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔“

”جانتا ہے اسے جس پر تم ہو“ یعنی ایمان دل سے ہے یا نمائشی؟ اور پھر نیک اعمالی اور بد اعمالی کے اعتبار سے جو تمہارا عالم ہے^[۳] اس
سب سے اللہ خوب واقف ہے۔

[۱] يقول لا تقولوا يا محمد ولا يا ابا القاسم لكن قولوا يا نبى الله ويا رسول الله (على بن ابراهيم)

[۲] كان ينقل عليهم طول خطبة النبي ﷺ يوم الجمعة فيلوذون ببعض اصحابه فخرجون من المسجد في استتار من غير استئذان
وفيه معنى التهديد بالمجازاة (مجمع البيان)

[۳] ما ائتم عليه من الخيرات والمعاصي ومن الايمان والتفائق لا يخفى عليه شيء من احوالكم (مجمع البيان)

سُورَةُ الْفُرْقَانِ

مکیہ..... ۷۷..... آیات

اس سورہ کی پہلی ہی آیت میں لفظ فرقان وارد ہے، اس مناسبت سے اس سورہ کا نام الفرقان ہوا حالانکہ یہ لفظ اور سوروں میں بھی وارد ہوا ہے لیکن اس کی نظیریں پہلے آچکی ہیں کہ وہ ذکر ہے متعدد سوروں میں مگر نام اس کی مناسبت سے ایک ہی سورہ کا ہوا۔ مضامین اس سورہ میں حسب ذیل ہیں۔

سورہ فرقان کے خاص خاص مضامین:

- ۱۔۔۔۔۔ تعلیمات پیغمبر خدا اور قرآن مجید کے لئے مشرکین کی پریشان خیالیاں۔
- ۲۔۔۔۔۔ آتش دوزخ کے کیفیات کا تفصیلی بیان۔
- ۳۔۔۔۔۔ تمام پیغمبروں کا بشر اور بشری ضروریات کا پابند ہونا۔
- ۴۔۔۔۔۔ پیغمبر کی بارگاہ الہی میں شکایت کہ آپ کی امت نے اس قرآن کو پس پشت ڈال دیا۔
- ۵۔۔۔۔۔ قرآن مجید کے بتدریج اتارے جانے کی حکمت۔
- ۶۔۔۔۔۔ بد اعمال انسانوں کا جانوروں سے بدتر ہونا۔
- ۷۔۔۔۔۔ پانی کے ذریعہ طہارت ہونے کا بیان۔
- ۸۔۔۔۔۔ میٹھے اور کھاری پانی کے علم میں قدرت الہی کا ظہور۔
- ۹۔۔۔۔۔ اللہ کے بندوں کی شان..... وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

’سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے‘

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لَیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۝ الَّذِیْ لَهُ
مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَلَمْ یَكُنْ لَهُ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ
وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَرًا تَقْدِیْرًا ○

’اپنے کمال ذات کے ساتھ قائم و برقرار ہے وہ جس نے قرآن اتارا اپنے بندہ پر تاکہ وہ تمام جہانوں کے لئے

تنبیہ کرنے والا ہو، جس کے لئے بادشاہت ہے آسمانوں اور زمین کی اور اس نے کوئی اولاد یقیناً نہیں کی اور نہ اُس کا سلطنت میں کوئی شریک ہے اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا تو اس کا پورے طور پر پیمانہ مقرر کیا۔
تبارک کے لفظ کا ترجمہ ان الفاظ میں بہت آسان تھا کہ 'با برکت ہے وہ ذات'، مگر اردو میں برکت کا لفظ اُس مفہوم کو ادا نہیں کرتا جو عربی میں اس لفظ کے تحت میں موجود ہے۔

بس ایک محل استعمال اس لفظ کا اردو میں ہے جو اس کے اصل معنی سے قریب ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کھانے یا۔ پیسے میں بڑی برکت ہے، اس میں دوام و قرار کا پہلو نمایاں ہے، جو اس کے عربی میں معنی جو ہیں ان کے مطابق ہے۔^[۱]

وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ آلِهَةً لَا يُخْلِفُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلِفُونَ وَلَا يَمْلِكُونَ

لَا نَفْسِهِمْ صَرًّا وَلَا نَفْعًا وَلَا يَمْلِكُونَ مَوْتًا وَلَا حَيَاةً وَلَا نُشُورًا ﴿۳﴾

’اور انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر ایسے خدا بنائے ہیں جو کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے اور وہ خود پیدا کیے ہوئے ہیں اور نہ وہ اپنے لئے کسی نقصان پر قدرت رکھتے ہیں اور نہ فائدہ پر اور نہ موت پر اختیار رکھتے ہیں اور نہ زندگی پر اور نہ دوبارہ زندہ اٹھانے پر۔‘

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَذَا إِلَّا إِفْكٌ افْتَرَاهُ وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ ۖ

فَقَدْ جَاءُوا ظُلْمًا وَزُورًا ﴿۴﴾ وَقَالُوا آسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اٰكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمَلَّى عَلَيْهِ

بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴿۵﴾ قُلْ أَنْزَلَهُ الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ

كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿۶﴾

’اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ نہیں سوا ایک جھوٹ کے جسے اس نے گھڑا ہے اور اُس پر کچھ دوسرے لوگوں نے اُس کی مدد کی ہے، اس طرح انہوں نے ظلم اور غلط بیانی کا ارتکاب کیا ہے اور انہوں نے کہا یہ پرانی داستانیں ہیں جنہیں اس نے لکھ لیا ہے تو وہ اسے لکھوائی جاتی ہیں صبح و شام، کہیے کہ اُسے اتارا ہے اُس نے جو آسمانوں اور زمین کے بھیدوں سے واقف ہے، بلاشبہ وہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔‘

تعلیمات پیغمبر خدا ﷺ اور قرآن کے لئے مشرکین کی پریشان خیالیاں:

چونکہ اُن کی غلط اندیشیوں کا منشا یہ تھا کہ رسول ﷺ کی زبان پر وہ معلومات آتے تھے جو اُن کے نزدیک قوم عرب میں سے کسی کو نہیں

[۱] تقدس و جل بمالہ یزل علیہ من الصفات ولا یذال کذلک (تبیان) ثبت وقام فیما لہ یزل ولا یزال عن جماعة من المفسرین

ہوسکتے اور پھر کچھ باتیں ایسی تھیں جو ان کہنے والوں کے حدودِ علم سے باہر تھیں اس لئے ان باتوں کو جو ان کے علم میں نہ تھیں، وہ آپ کی طبع زادیاً 'دروغ' کہتے تھے اور جو ان کے علم میں تھیں مگر ان کے نزدیک آپ کو ان کا علم ہونا چاہیے، ان کے لئے کبھی یہ کہتے تھے کہ کچھ اور لوگ بتاتے ہیں اور کبھی یہ کہ پرانے نوشتے کچھ لوگوں کے ہاتھ آگئے ہیں اور وہ لوگ آپ کے پاس آکر انہیں بول بول کر لکھوادیا کرتے ہیں، اس ان کے ذہنی پس منظر کے مقابلہ میں خالق نے یہ جواب دیا ہے کہ یہ ان کے ذاتی معلومات بے شک نہیں ہیں مگر جو عالم الغیب خالق ہے، وہ ان پر بذریعہ وحی نازل کرتا ہے، اس لئے ان میں وہ باتیں بھی ہیں جو تمہیں معلوم ہیں اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تمہارے نزدیک ان کا علم نہ ہونا چاہیے اور وہ باتیں بھی ہیں جو تمہارے حدودِ علم میں نہیں، اس لئے انہیں ان کا طبع زاد اور دروغ قرار دیتے ہو لیکن تم کو معلوم ہونا چاہیے۔ نہ یہ ان کے ذہن کی اختراع ہے اور نہ کسی آدمی یا آدمیوں کو بتائی ہوئی ہیں اور نہ پرانے نوشتوں سے حاصل کردہ ہیں، یہ تمہارے تصورات سب بے بصیرتی اور خام خیالی کا نتیجہ ہیں۔

شروع میں آیت کے مضمون سے تو ذہن میں یہی آتا ہے کہ یہ سب کہنے والے کھلے ہوئے کفار و مشرکین ہونگے مگر آیت کا اختتامی جملہ: **كَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا**: "بلاشبہ وہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان" میرے ذہن میں یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ ظاہری مسلمان ہیں جو اصطلاحاً منافق کہلاتے ہیں، انہی کی باہمی سرگوشیوں کی پردہ کشائی کی گئی ہے کیوں کہ انہیں کے لئے کم از کم دنیا میں اس کی عفو و مغفرت ایسی کارفرما ہے کہ وہ انہیں نہ سزا دیتا ہے اور نہ انہیں نام بنام ان کے راز افشا کر کے رسوا کرتا ہے۔^[۱]

وَقَالُوا مَالِ هَذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ ۗ لَوْلَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونُ مَعَهُ نَذِيرًا ۙ أَوْ يُلْقَى إِلَيْهِ كَنزٌ أَوْ تَكُونُ لَهُ جَنَّةٌ يَأْكُلُ مِنْهَا ۗ وَقَالَ الظَّالِمُونَ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَّسْحُورًا ۗ ۙ أَنْظِرْ كَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ الْأَمْثَالَ فَضَلُّوا فَلَا يَسْتَطِيعُونَ سَبِيلًا ۙ

’اور انہوں نے کہا یہ پیغمبر عجیب ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ کیوں نہ اس پر کوئی فرشتہ اتارا گیا کہ وہ اُس کے ساتھ ساتھ ڈرانے والا ہوتا یا اُس پر کوئی خزانہ اتارا جاتا یا اُس کے لئے گھنا باغ ہوتا جس سے وہ کھاتا اور ظالموں نے کہا کہ تم پیروی نہیں کرتے مگر ایک آدمی کی جو کسی آسیب میں گرفتار ہے، دیکھیے کیسی کیسی باتیں آپ کے لئے انہوں نے کیں تو وہ گمراہ ہوئے ایسے کہ قدرت نہیں رکھتے اب راستے پر‘۔
یعنی یہ ان کا بدل بدل کر باتیں کہنا خود اس کی دلیل ہے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ آپ کے خلاف کیا معقول بات کہیں جو قابل قبول ہو، انہیں اپنی مخالفت کے حق بجانب ثابت کرنے کے لئے کوئی راستہ نہیں ملتا۔^[۲]

[۱] کان غفوراً معناه الذى يعلم السر فى السموات والارض لا يعا جلهم بالعقوبة بل يستر عليهم (تبیان)

[۲] قيل معناه لا يستطيعون سبيلاً الى ابطال امرك (تبیان)

تَبْرَكَ الَّذِيْ اِنْ شَاءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنَّتِ تَجْرِجِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ ۙ
وَيَجْعَلُ لَكَ فُضُوْرًا ۝۱۵

”قائم و برقرار ہے وہ ذات جو اگر چاہے تو آپ کیلئے اُس سے بہتر قرار دے، وہ بہشت جن کے نیچے سے نہریں رواں ہوں اور وہ آپ کے لئے عالی شان محلات قرار دے“
یعنی حکمت الہی اس کی متقاضی نہیں ہے کہ اُس کے پیغمبر کچھ غیر معمولی عیش و آرام اور اقتدار ظاہری کی زندگی گزاریں بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ وہ محنت و مشقت کرتے ہوئے نظر آئیں اور سختیاں بھی جھیلیں۔

مطلب یہ ہے کہ جسے وہ نقص قرار دے رہے ہیں کہ یہ کھاتا پیتا ہے اور بازاروں میں نقل و حرکت کرتا ہے یہی اللہ کے نزدیک اُن کا جوہر ہے کہ اس طرح وہ دنیا کے لئے مثال بنتے ہیں ورنہ قدرت الہی میں تو یہ کوئی مشکل کام نہ تھا کہ وہ انہیں ایسی بلند معیار کی عیش و آرام والی زندگی دیتا۔ جس پر دنیا عیش و عیش کرتی۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ ۙ وَاعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ۝۱۱ اِذَا رَاٰهُمْ مِّنْ
مَّكَانٍ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغِيْظًا وَزَفِيْرًا ۝۱۲ وَاِذَا الْاُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا
مُّقَرَّرِيْنَ دَعُوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ۝۱۳ لَا تَدْعُوْا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَاَدْعُوْا ثُبُوْرًا
كَثِيْرًا ۝۱۴

”بلکہ انہوں نے قیامت کو جھٹلایا اور ہم نے اُس کے لئے جو قیامت کو جھٹلائے تیار رکھا ہے دوزخ کی آگ کو، جب وہ انہیں دیکھے گی دور سے بھی تو وہ سنیں گے اُس کے غیظ و غضب کی آواز اور شدید چنگھاڑ اور جب وہ ڈالے جائیں گے اس کی کسی تنگ جگہ میں لوہے میں جکڑے ہوئے تو اُس وقت وہ ہائے واویلا کریں گے، آج ایک دفعہ واویلا نہ کرو بلکہ بہت دفعہ ہائے واویلا کرو۔“

اگر یہ آیت ترتیب تنزیل میں بھی قبل کی آیات سے متصل ہے تو اُس کا رابطہ یہ ہے کہ اصل میں یہ چیز نہیں ہے کہ رسول کا بازاروں میں پھرنا اور آب و طعام کا محتاج ہونا ہی اُن کے لئے ایمان میں سدّ راہ ہو، بلکہ اصل تو یہ ہے کہ اس دنیا کی مادی زندگی کے آگے وہ کسی دور حیات کے قائل نہیں ہیں اس واسطے طرح طرح کی باتیں کر کے ایمان سے گریز کر رہے ہیں۔

قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمَّ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۙ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاءً
وَمَصِيْرًا ۝۱۵ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَاءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ۙ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُوْلًا ۝۱۶
”کہنے کہ کیا یہ اچھا ہے یا وہ زندگی جاوید والا بہشت جس کا پرہیزگاروں سے وعدہ ہے وہ ان کے اعمال کا صلہ اور

آخری ٹھکانا ہے، ان کے لئے وہاں وہ ہے جو وہ چاہیں ہمیشہ ہمیشہ رہتے ہوئے یہ تمہارے پروردگار کے ذمہ ایک وعدہ ہے جس کا مطالبہ کیا جائے۔

”یہ“ یعنی عذاب جہنم جس کے شدائد کا ذکر پہلے ہوا ہے۔^[۱] کیا یہ اچھا ہے یا پرہیزگاروں کا انجام بخیر جو بہشت کی نعمتوں کی صورت میں ہوگا؟ خود تمہاری عقل کیا کہتی ہے؟ کس تمہیں اختیار کرنا چاہئے؟

وعدا مسئلہ..... کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے، وہ اس پر مبنی ہے کہ یہ سوال بمعنی طلب ہے علامہ طبری نے کئی قول نقل کئے ہیں، سب اسی محور پر گردش کرتے ہیں۔^[۲]

بعض لوگوں نے اسے سوال بمعنی استفسار سے لیا ہے کہ اس کے متعلق دریافت کیا جائے گا۔^[۳] مگر میرے خیال میں اس صورت میں مسئلہ عدا ہونا چاہئے نہ کہ خالی مسئلہ جو کہ قرآن میں ہے۔

وَيَوْمَ يَجْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَقُولُ ءَأَنْتُمْ أَضَلَلْتُمْ عِبَادِي هَؤُلَاءِ أَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيلَ^[۴] قَالُوا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يُنْبَغِي لَنَا أَنْ نَتَّخِذَ مِنْ دُونِكَ مِنْ أَوْلِيَاءَ وَلٰكِنْ مَتَّعْتَهُمْ وَآبَاءَهُمْ حَتَّىٰ نَسُوا الذِّكْرَ ۗ وَكَانُوا قَوْمًا بُورًا^[۵] فَقَدْ كَذَّبْتُمْ بِمَا تَقُولُونَ ۗ فَمَا تَسْتَطِيعُونَ صَرْفًا وَلَا نَصْرًا ۗ وَمَنْ يَظْلِم مِّنكُمْ نُدِقْهُ عَذَابًا كَبِيرًا^[۶]

”اور جس دن وہ حشر میں ان سب کو لائے گا اور انہیں جن کو وہ اللہ کو چھوڑ کر پوجا کرتے تھے وہ کہے گا کہ کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا یا وہ خود راستے سے بھٹک گئے؟ تو وہ کہیں گے کہ پاک ہے تیری ذات، ہمارے لئے یزید بنا نہیں تھا کہ ہم تجھے چھوڑ کر کوئی اہلی موالی بنائیں مگر تو نے انہیں اور ان کے باپ داداؤں کو خوب مال و دولت دیا یہاں تک کہ وہ یاد دہانیوں کو بھول گئے اور وہ تباہ ہونے والے لوگ تھے۔ اس طرح انہوں نے جھٹلادیا تمہیں اس میں جو تم کہتے ہو تو تم نہ ہٹانے پر قدرت رکھتے ہو اور نہ مدد پر اور جو تم میں سے ظلم کا مرتکب ہو، اسے ہم بڑا عذاب چکھائیں گے۔“

”جن کی اللہ کو چھوڑ کر انہوں نے عبادت کی تھی“ ان کا جو جواب قرآن نے بیان کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایسے ہی اشخاص ہیں

[۱] بمعنی ما ذکرہ من السعیر و اوصافہ (تبیان)

[۲] قال ابن عباس معناه ان الله سبحانه وعد لهم الجزاء فسألوا الوفاء وقيل معناه ان الملائكة سألو الله تعالى ذلك لهم وقيل انهم سألو الله تعالى في الدنيا الجنة بالدعاء فاجابهم في الاخرة الى ما سألوه (مجمع البيان)

[۳] یہ وعدہ اس سے پوچھ گچھ کے قابل ہوگا (تاج العلماء)

جو خود اپنی عبادت کرنے والوں کے دعا دی باطلہ اور غالیانہ عقائد و اقوال سے راضی نہ تھے اور اس لئے اس کی تفسیر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور جناب عزیر علیہ السلام وغیرہ معصومین علیہم السلام کے نام لئے گئے ہیں۔ [۱] مگر حقیقت یہ ہے کہ بے جان معبود بھی یعنی بت اگر شعور کے مالک ہوں۔ تو وہ بھی اپنے عبادت گزاروں سے راضی نہ ہوں اور خدا کی قدرت سے بعینہ نہیں کہ وہ روز قیامت ان میں بھی شعور ماضی و حال پیدا کر دے اور ان سے یہ سوال و جواب ہو جیسا کہ دوسرا قول ہے۔

مگر وہ خود قرآن مجید کی ان دوسری آیات کے ساتھ سازگار نہیں ہے جن میں بتوں کا بھی اپنے عبادت گزاروں کے ساتھ دوزخ میں جھونکا جانا مذکور ہے، اس لئے میں پہلے ہی قول کو درست سمجھتا ہوں۔ [۲]

وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا إِنَّهُمْ لَيَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَيَمْشُونَ فِي
الْأَسْوَاقِ ۗ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۗ أَتَصْبِرُونَ ۗ وَكَانَ رَبُّكَ
بَصِيرًا ﴿۲۰﴾

”اور انہیں بھیجا ہم نے آپ کے پہلے پیغمبروں کو مگر یہ کہ وہ بھی کھانا کھاتے تھے، اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے اور ہم نے تم میں سے ایک کو دوسرے کے لئے ذریعہ آزمائش بنایا ہے، کیا تم لوگ صبر و برداشت سے کام لو گے؟ اور آپ کا پروردگار خوب دیکھنے والا ہے۔“

یہ ان کی اس بات کا جواب ہے جو چند آیات کے پہلے آچکی ہے، کہ یہ پیغمبر عجیب ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ [۳] کہا جا رہا ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، جتنے انبیاء پہلے آئے ہیں، وہ سب ایسے ہی تھے۔
”ایک دوسرے کے لئے ذریعہ آزمائش“ یعنی یہی تو تمہارا امتحان ہے کہ اپنے ایسے انسانوں کے سامنے ان کے کمالات اور معجزات سے ان کے نمائندہ خالق معلوم ہونے کے بعد تم سر جھکاتے ہو یا نہیں اور ان کا بھی امتحان ہے کہ وہ انسان ہوتے ہوئے عصمت کے اس نقطہ پر کس طرح باقی رہتے ہیں جو ان کے شایان شان ہے۔ اس طرح تمہارے اور ان کے دونوں کے صبر کا امتحان ہے۔
ان جنہوں نے بشر کہہ کے رسول ماننے سے انکار کیا، وہ بھی اس امتحان میں ناکام ہوئے اور جو آج رسول یا امام مانتے ہوئے ان کی بشریت سے انکار کر رہے ہیں یا بشر کے آگے کوئی نوع تجویز کرتے ہیں، وہ بھی اس امتحان میں ناکام ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْنَا الْمَلِيكَةُ أَوْ نَرَى رَبَّنَا ۗ لَقَدْ
اسْتَكْبَرُوا فِي أَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْا عُتُوًّا كَبِيرًا ﴿۲۱﴾

[۱] قال مجاهد یعنی عیسیٰ و عزیر (تبیان)

[۲] قیل یعنی الا صنم عن عکرمه والضحاك (مجمع البیان)

[۳] هو جواب لقولهم: ما لهذا الرسول يأكل الطعام ويمشي في الأسواق (تبیان)

”اور وہ جنہیں ہم سے ملنے کی کوئی توقع نہیں، کہتے ہیں کہ کیوں نہ ہم پر فرشتے اتارے گئے یا ہم اپنے پروردگار کو آنکھوں سے دیکھتے؟ انہوں نے اپنے دل میں گھمنڈ کیا اور بڑی سرکشی سے کام لیا۔“

یہ ان کا کہنا ہے کہ ”ہم پر“ فرشتے کیوں نہ اترے یا اپنے پروردگار کو ہم نے اپنی آنکھوں سے کیوں نہ دیکھا“ اس کے اندر یہ جذبہ کارفرما ہے کہ ایک اپنے ایسے آدمی کے سامنے سر جھکانا ہماری شان کے خلاف ہے یہی ذہنی پس منظر ہے جس کی پردہ کشائی قرآن نے استکبر و فی انفسہم کہہ کر کی ہے یعنی یہ کہنا تکبر اور اپنے اوپر گھمنڈ کے باعث سے ہے جس کا نتیجہ ”خواری“ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلَائِكَةَ لَا بُشْرَىٰ يَوْمَئِذٍ لِلْمُجْرِمِينَ وَيَقُولُونَ حَجْرًا مَّحْجُورًا ﴿٣٢﴾
وَقَدِمْنَا إِلَىٰ مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُ هَبَاءً مَنْثُورًا ﴿٣٣﴾ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَأَحْسَنُ مَقِيلًا ﴿٣٤﴾

”جس دن فرشتوں کو آنکھوں سے دیکھیں گے، اس دن گنہگاروں کے لئے کوئی خوشخبری نہیں ہوگی اور وہ کہیں گے ارے یہ تو مکمل محرومی رہی اور ہم متوجہ ہوں گے ان کے اعمال کی طرف جو انہوں نے کئے ہیں تو کر دیں گے انہیں بالکل بے حقیقت، اس دن بہشت والے اچھے ہوں گے قرار گاہ کے لحاظ سے اور بہتر ہوں گے جائے استراحت کے اعتبار سے۔“

فرشتوں کا عام لوگوں کے سامنے آنا قیامت سے وابستہ:

یہ قیامت کے دن کا حوالہ ہے ان کے یہاں جیسا کہ اس کے قبل کی آیت میں گزرا، دو باتیں تھیں، ایک یہ کہ فرشتے ہم پر اتریں اور دوسرے ہم خود اپنے پروردگار کو آنکھوں سے دیکھیں۔ اگر قیامت کے ہنگامہ میں پروردگار کے دیدار کا تصور صحیح ہوتا تو خالق اپنے جواب میں قیامت کے دن کی کیفیت میں اس کا ذکر کرتا مگر قیامت کے دن بھی جس چیز کو ثابت کیا گیا ہے وہ فرشتوں کا آنکھوں سے دیکھنا ہے جو کہ ممکن ہے لیکن اللہ کا آنکھوں سے دیکھنا، وہ تو جس طرح اس دنیا میں ناممکن ہے، ویسے ہی قیامت میں بھی لہذا اس کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔

اب یہ فرشتوں کا دیکھنا بھی جس کے وہ آرزو مند تھے، قیامت میں وقوع میں تو آئے گا مگر وہ ان پر بہت مہنگا پڑے گا کیوں کہ اس دن ان کی بد اعمالیوں کی سزا تو ملے ہی گی، جو دنیا میں اچھی قسم کے کام کئے ہوں گے، انہیں بھی اس دن وہ اپنے کفر کی وجہ سے دیکھیں گے کہ ا کارت گئے اور جو محنت ان کے سلسلہ میں کار خیر سمجھ کو انہوں نے کی تھی، وہ برباد ہو گئی۔

وَيَقُولُونَ حَجْرًا مَّحْجُورًا ﴿٣٢﴾ ”وہ کہیں گے، کون کہیں گے؟ اس میں اختلاف ہے، ایک تفسیر یہ ہے کہ وہ کافر یہ کہیں گے اس کے لحاظ سے ہم نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ ارے! یہ تو مکمل محرومی ہے، دوسرا احتمال یہ ہے کہ فرشتے کہیں گے اور مطلب یہ ہے کہ آج کسی قسم کی خوشی یا سکون و آرام کی چیز تم پر حرام ہے۔“^[۱]

[۱] یقولون حجراً محجوراً ای حراماً محزوماً قال قتادة قال الضحاك هو من قول الملائكة يقولون حراماً محزوماً علیکم البشرى (تبیان)

کافروں ہی کا قول قرار دیتے ہوئے بھی ایک دوسرا تصور یہ ہے کہ حجرا مہجورا ایک محاورہ ہے کہ جب کوئی جان لینے آئے تو امان مانگنے کے لئے یہ الفاظ کہتے ہیں جن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہماری جان کا لینا تم پر حرام ہے۔^[۱]

وَيَوْمَ تَشْقُقُ السَّمَاءُ بِالْغَمَامِ وَنَزَّلَ الْمَلِكَةُ تَنْزِيلًا ۚ ۲۵ الْمَلِكُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ

لِلرَّحْمَنِ ط وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكَافِرِينَ عَسِيرًا ۚ ۲۶

”اور جس دن بادل کے ساتھ ساتھ آسمان شق ہو جائے گا اور فرشتے اتارے جائیں گے جیسا اتارا جانا چاہئے، اس دن اقتدار کل حقیقی معنی میں سب خدائے رحمن سے مخصوص ہوگا اور وہ دن کافروں پر سخت ہوگا۔“

دنیا کے بادشاہوں کی جو سلطنت کہلاتی ہے، وہ تو نام کی ہے اور وہ نام بھی اس دنیا تک ہے۔ اصل اقتدار خالق کائنات کا یہاں بھی ہے مگر وہ مجاز کے تدرت پر دلوں کی وجہ سے بہت سی دھندلی نظروالوں کو دکھائی نہیں دیتا۔ قیامت کے دن وہ بالکل بے حجاب طور پر سب کے سامنے ہوگا اور تب سب کو پتہ چلے گا کہ حقیقی سلطنت کس کی ہے۔^[۲]

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَى يَدَيْهِ يَقُولُ يَا لَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ سَبِيلًا ۚ ۲۷

يَا لَيْتَنِي لَيْتَنِي لِمَ اتَّخَذْتُ فُلَانًا خَلِيلًا ۚ ۲۸ لَقَدْ أَضَلَّنِي عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ إِذْ جَاءَنِي ط

وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِلْإِنْسَانِ خَدُوًّا ۚ ۲۹

”اور جس دن ظالم آدمی اپنے ہاتھوں کو اپنے دانتوں سے کاٹتا ہوگا، کہے گا کاش میں پیغمبر سے رسم و راہ رکھتا، کاش میں فلاں شخص کی بات نہ مانتا، اس نے مجھے نصیحت قبول کرنے سے بھٹکا یا بعد اس کے وہ مجھ تک پہنچی، اور شیطان انسان کو بڑا بے سہارا چھوڑ دینے والے۔“

وہ فلاں شخص جو قیامت تک گمراہی کا ذمہ دار ہے:

آخر والی آیت کے آخری جز سے تو ذہن کہتا ہے کہ قبل والی آیت میں ”فلاں شخص“ سے مراد شیطان ہی ہے، لیکن اس لفظ کے ابہام میں ایسا انسان بھی مراد ہو سکتا ہے جو شیطان ہی کی طرح گمراہ کرے اور وقت آنے پر اس کا کردار بھی وہی ہوگا جو شیطان کا بتایا گیا ہے کہ وہ انسان کو بے سہارا چھوڑ دیا کرتا ہے۔^[۳]

غور کرنے پر اس پہلے سے مزید تقویت اسی کو ہوتی ہے کہ جب بعد میں صاف شیطان کا نام موجود ہے تو قبل میں فلاں کی لفظ کے ساتھ ابہام رکھنے کی ضرورت کیا تھی؟ اس ابہام سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے ہر دور میں کوئی بھی ایسا شخص مراد ہے جس نے کسی کو بھی حق کے قبول کرنے سے

[۱] كانوا يقولون في الدنيا اذا القوا من يخافون عنه القتل حجرا مہجورا دماؤنا عن مجاهد (مجمع البيان)

[۲] اي الملك الذي هو الملك حقا ملك الرحمن يوم القيامة (تبيان)

[۳] ليتناول كل خليل مضلل عن الدين (مجمع البيان)

روکا ہوا اور اپنی باتوں سے اسے گمراہ کیا ہو جس میں سب سے مقدم وہ ہوگا جس نے شروع ہی میں کوئی جملہ ایسا کہہ دیا ہو یا کوئی کاروائی ایسی کر دی ہو جو قیامت تک کے ایک بڑے طبقہ کی گمراہی کا سبب بن جائے تو یہ فلاں شخص اس کا مستحق ہوگا کہ قیامت تک ہر گمراہ ہونے والا فلاں کی جگہ اس کا نام لے۔

وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا ﴿٣٥﴾
 ”اور پیغمبر کہیں گے اے میرے پروردگار! میری امت نے اس قرآن کو بالکل ترک کر دیا تھا“۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ الہی میں شکایت:

یہ پیغمبر جو اپنی امت کا شکوہ کر رہا ہے، کسی اور دور کا پیغمبر نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ [۱] جو القرآن کی لفظ سے ظاہر ہے اور یہ امت جس کا شکوہ ہے، وہ غیر مسلم نہیں ہیں جنہوں نے قرآن کو کلامِ ربانی مانا ہی نہیں بلکہ وہ مسلمان ہیں جو اسے اپنی کتاب مانتے ہیں مگر اس پر عمل نہیں کرتے یہ ان کا شکوہ وہ کر رہا ہے جسے گناہگاروں کی سفارش کے منصب پر مامور کیا گیا ہے۔
 کسی شاعر نے آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ستم ڈھانے والوں کے لئے جو کہا تھا:

وِيل لِمَنْ خَصِمَاؤُهُ شَفَعَاؤُهُ.

غضب ہے ان کے لئے کہ جو ان کی سفارش کرنے والے ہیں، وہی ان کے خلاف فریق ہیں۔

یہ کیا یہاں پر منطق نہیں ہے.....؟

یاد رہے کہ شکوہ اور سفارش، دو متضاد چیزیں ہیں، اس لئے یہ وہی بد نصیب گناہگار ہو سکتے ہیں جو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے محروم ہوں اور اس صورت میں وہ ظالمین بھی جن کا اس کے قتل ذکر تھا کہ وہ اپنی بوٹیاں کاٹ رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کاش میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تک راستہ رکھتا ہوتا۔ مسلمان ہی ہیں ”مخالص مسلمان“ اور اب وہ فلاں بھی جس کے دوست بنائے جانے پر وہ ہاتھ مل رہے ہیں، کہیں دور پر نہیں ہوگا۔ آس پاس ہی ہوگا جس کی پیروی نے انہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نصوص و ہدایات پر عمل کرنے سے باز رکھا اور سب سے بڑھ کر یہ نص رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں اجماع اور شورائی وغیرہ کا ڈھونگ رچایا۔

یہی وہ ہے جو لفاظِ آیت سے ہمارے ذہن میں آتا ہے مگر عام مفسرین اس پورے سلسلہ کو مکہ کے مشرکین سے متعلق قرار دیتے ہیں جو قرآن کو سن کر کانوں میں انگلیاں دے لیتے تھے اور سمجھنے کا کیا ذکر سننے ہی کے لئے تیار نہ تھے۔

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِينَ ط وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ هَادِيًّا

وَنَصِيْرًا ﴿٣٦﴾

”اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے ایک دشمن قرار دیا گنہگاروں میں سے اور کافی ہے آپ کا پروردگار بحیثیت

رہنما و مددگار۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا نے ہر ایک نبی کا اپنے جبر و قہر سے کسی کو دشمن بنا دیا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ ایسے لوگ ہوا کئے ہیں جنہیں ان کے کردار کی وجہ سے اللہ دشمنانِ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں محسوب کرتا رہا۔^[۱] ہمارے یہاں تفسیر میں اس کے متعلق جتنے اقوال ہیں سب کا ہر پھر کر مطلب یہی ہوتا ہے۔

بے شک علامہ طبرسی نے ایک دوسرا پہلو پیدا کیا ہے، جو محسب و اقدہ بھی درست ہے، اور الفاظ قرآنی سے بعید بھی نہیں، وہ یہ ہے کہ خالق نے اپنے رسولوں کو بھیجا اور انہیں مامور فرمایا ایسی باتوں کے کہنے پر جو ان لوگوں کی افتاد طبع کے خلاف اور ان کے ذہن پر بارتھیں جیسے ان کے غلط عادات و افعال پر اعتراض اور ان کے معبودوں کی مذمت جس سے وہ لوگ ان رسولوں کے دشمن ہو گئے تو چونکہ ان کی دشمنی کا باعث جو باتیں تھیں وہ اللہ کے حکم سے تھیں، اس لئے ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے ہر رسول کا بہت لوگوں کو دشمن بنا دیا۔^[۲]

ہم نے اس آیت کو گزشتہ آیات کے ساتھ ملا کر دیکھا تو وہ گزشتہ آیات کے اس مضمون کے ساتھ جسے ہم نے ترجیح دی ہے، چسپاں نظر آتی ہے، خصوصاً آخر کے فقرے کی وجہ سے کہ کافی ہے آپ کا پروردگار بحیثیت رہنما و مددگار، کیوں کہ نبی کی دشمنی اور خالق کی رہنمائی میں بظاہر کوئی ربط نظر نہیں تھا لیکن جب سابق میں جو فلاں تھا اس کے کردار میں جو قرآن نے بتایا ہے، یہ دیکھتے ہیں کہ لقد اضلّ عن الذّکر، اس نے بھٹکا یا نصیحت قبول کرنے سے، تو اب اس کے اضلال کے ساتھ اللہ کا ہادی یعنی رہنما ہونا بالکل مرتبط ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ دشمن بھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا وہی فلاں ہے کہ جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نصب العین ہے قیامت تک کے لئے خلق خدا کی ہدایت کا سامان کرنا (لن تضلّوا بعدی) اور یہ فلاں جو آپ کا اور آپ کے اس مقصد کا دشمن ہے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے اور اس طرح خلق خدا کی گمراہی کا سامان کرتا ہے تو اس کے مقابلہ میں ارشاد ہو رہا ہے کہ کافی ہے آپ کا پروردگار بحیثیت رہنما و مددگار، یعنی لاکھ یہ گمراہی کا سامان کرے، پھر بھی توفیق الہی اور ہدایت ربانی سے ایک گروہ راہ ہدایت پر قائم و برقرار رہے گا، چاہے وہ اقلیت میں ہو تو تاریخ ہدایت کی سنت مستمرہ یہ رہی ہے کہ حق کے جادہ پر قائم رہنے والے کم ہوتے ہیں، جو قرآن کی کثیر التعداد آیات سے ظاہر ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ مِجْلَةً وَاحِدَةً ۚ كَذَلِكَ لِنُثَبِّتَ

بِهِ فُؤَادَكَ ۖ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلاً ﴿۳۲﴾

اور کافر لوگ کہتے ہیں کہ ان پر پورا قرآن اکٹھا کیوں نہیں اتارا گیا (ہاں) اسی طرح مقصد یہ ہے کہ ہم اس سے آپ کے دل میں ثبات و استقلال پیدا کریں اور (اسی لئے) ہم نے اسے پوری طرح ٹھہر ٹھہر کر سنایا ہے۔

قرآن مجید کے بتدریج اتارے جانے کی حکمت:

[۱] المعنى ان الله حكم بآئه على هذه الصفة..... وقيل جعلنا ببياننا اثمهم اعداء وهم كما يقال اجعله لصاً او حثنا وقيل معناها امرنا ان يسئروهم اعداء (تبیان)

[۲] وكانت هذه اسباب داعية الى العداوة فاذا امره بها فقد جعلهم عدوا له (مجمع البيان)

نکتہ چینی کے لئے تو کوئی بہانہ چاہئے چنانچہ ایک بات منکرین قرآن نے یہ کہہ دی کہ آخر یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے کیوں اتر رہا ہے؟ ایک دم پوری کتاب کیوں نہیں آگئی، خالق نے پہلے خود رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس کی مصلحت بیان کی ہے کہ وقتاً فوقتاً مختلف حالات میں جو آپ کو مشکلات پیش آتی ہیں، ان میں یہ ہر وقت پر وحی کا اترا اور قرآن مجید کی آیات کا آنا آپ کے لئے نفسانی طور پر بڑی ڈھارس کا باعث ہوتا ہے اور آپ کے لئے مشکلات کے مقابلہ میں بڑا سہارا رہتا ہے۔^[۱] چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ جب چند روز وحی کے آنے میں تاخیر ہوتی تھی تو رسول پریشان ہو جاتے تھے اور کبھی کبھی یہ پریشانی اضطراب کی حد تک پہنچ گئی ہے۔

وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا^{۳۱}

”اور وہ آپ کے سامنے کوئی خاص بات نہیں لاتے، مگر یہ کہ ہم حقیقت پیش کر دیتے ہیں اور زیادہ تشریح کی صورت میں“

مخالفین کے مقابلہ میں دوسری مصلحت یکجائی طور پر ایک کتاب کی صورت میں قرآن نہ اترنے کی یہ ہے کہ حسب موقع جیسی بات یہ کہیں فوراً اس کا جواب دے دیا جائے اور سننے والوں کے ذہن کو بلند سے بلند مطالب حقہ سے بہر مند کیا جائے۔^[۲]

الَّذِينَ يُحْشَرُونَ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ إِلَىٰ جَهَنَّمَ ۗ أُولَٰئِكَ سُوءُ مَكَانًا وَأَضَلُّ

سَبِيلًا^{۳۲}

”وہ جو دوزخ کی طرف منہ کے بھل روانہ کیے جائیں گے، یہ بدترین عمل کے لحاظ سے اور زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں راستے کے اعتبار سے۔“

بحشر و علی و جوہہم کا عموماً مطلب یہی کہا گیا ہے، وہ منہ کے بھل محشر ہوں گے^[۳] اور اس کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ منہ کے بھل کھینچے جا رہے ہوں گے اور ایک حدیث نقل کی گئی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ منہ کے بھل چل رہے ہوں گے، یہ حدیث صحاح اہل سنت میں وارد ہوئی ہے جسے ہمارے علماء نے بھی نقل کیا ہے^[۴] قرآن مجید میں بھی ایک دوسری جگہ صراحت ہے کہ

يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ ۖ ذُوقُوا مَسَّ سَقَرَ

جس دن وہ آگ میں چہروں کے بھل کھینچے جا رہے ہوں گے، چکھو اس آگ کا مزہ۔ (سورہ قمر- ۴۸)

[۱] ای ليقوى به قلبك وتزداد بصيرة وذلك الله اذا كان بآتيه الوحي متجددا في كل حادثة وكل امر كان ذلك اقوى لقلبه وازيد في بصيرته (مجمع البيان)

[۲] ای لم ينزل القرآن جملة واحدة لا تهم لا ياتونك بشئ يريدون به ابطال امرك الا جئناك بالحق الذي يبطله واحسن تفسير احبنا ياتونك به و اجود معاني (تبیان)

[۳] الفتاوى ودروى خویش (شاه ولی اللہ)

[۴] فی الحدیث: ان الذی امشاهم علی اقدامهم قادر علی ان یمشیهم علی وجوههم (تبیان) اور ادة لبخاری فی الصحیح (مجمع البیان)

مگروہاں دوزخ میں کھینچے جانے کا ذکر ہے اور یہاں موقف حشر کی طرف جانے کا جس کیلئے ایک مقام پر قرآن مجید میں ہے:
مُّهْطِعِينَ إِلَى الدَّاعِ: (قمر-۷) پکارنے والے کی آواز کی طرف سر جھکائے۔
 اور ایک جگہ ہے:

نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ: (سجدہ-۱۲) اپنے سر جھکائے ہوئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ مختلف مقامات پر مختلف موقعوں کی تصویریں ہیں کیوں کہ دور قیامت کے احوال و احوال کا سلسلہ طولانی ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَا مَعَهُ أَخَاهُ هَارُونَ وَزِيْرًا ۗ فَقُلْنَا اذْهَبَا

إِلَى الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۗ فَدَمَّرْنَاهُمْ تَدْمِيرًا ۗ

”اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عنایت کی اور ان کے ساتھ ان کے بھائی ہارون کو وزیر بنایا، اس کے بعد کہا کہ تم دونوں بھائی اس جماعت کی طرف جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، اس کے بعد ہم نے ان لوگوں کو تہس نہس کر دیا۔“

ظاہر ہے کہ درمیان کی کڑیاں سلسلہ بیان میں چھوڑ دی گئی ہیں، اس لئے کہ وہ قرآن ہی میں مختلف موقعوں پر بیان ہوتی رہی ہیں یعنی وہ اس حکم کے بعد جو ان کے پاس گئے اور اپنی رسالت کا اظہار کیا تو اُس جماعت کو جھٹلایا اور ان کا مقابلہ کیا جس کے ذیل میں ساحروں کا پورا واقعہ ہے اور جناب موسیٰ کا مصر سے نکلنا اور فرعون کا اپنی قوم والوں کے ساتھ ان کا تعاقب کرنا اور سامنے دریا کا آنا اور جناب موسیٰ علیہ السلام کے لئے بحکم الہی عصا کی ضرب سے دریا کا شگافتہ ہونا اور موسیٰ کا مح بنی اسرائیل کے اُس پار جانا اور فرعون اور اُس کے تمام قوم کا اس دریا میں ڈوب جانا، بس یہ آخری انجام وہ ہے جسے یہاں قرآن نے یوں کہا ہے کہ ہم نے ان کو پورے طور پر تہس نہس کر دیا۔^[۱]

وَقَوْمَ نُوحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ أَغْرَقْنَاهُمْ وَجَعَلْنَاهُمْ لِلنَّاسِ آيَةً ۗ وَآعْتَدْنَا

لِلظَّالِمِينَ عَذَابًا أَلِيمًا ۗ وَعَادًا وَنَمُودًا وَأَصْحَابَ الرَّسِّ وَقُرُونًا بَيْنَ ذَلِكَ

كَثِيرًا ۗ وَكُلًّا ضَرَبْنَاهُ الْأَمْثَالَ ۗ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيرًا ۗ

”اور نوح کی قوم والے، جب انہوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا تو ہم نے انہیں غرق کر دیا اور انہیں لوگوں کے لئے ایک نشانی قرار دیا اور ہم نے ظالموں کے لئے دردناک عذاب تیار رکھا ہے اور عاد اور ثمود اور رس والے واران کے بیچ میں بہت سی نسلیں اور ہر ایک کے لئے ہم نے مثالیں پیش کیں اور پھر ہم نے ہر ایک کو پوری طرح تہس نہس کر دیا۔“

”نوح علیہ السلام کی قوم نے براہ راست تو نوح علیہ السلام کی تکذیب کی مگر چونکہ پیغام تمام پیغمبروں کا بنیادی طور پر ایک ہوتا ہے، اس لئے ایک

[۱] فی الکلام حذف ای فذہبا الیہم فلم یقبلوا منہما و مجدوا اثنو تہما فدمرناہم (مجمع البیان)

کے ساتھ تمام پیغمبروں کی تکذیب ہوتی ہے۔^[۱]

رس کے معنی کنویں کے ہیں^[۲] اس کنویں کا واقعہ کیا ہے؟ اس میں اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے پیغمبر کو اُس کنویں میں ڈال دیا^[۳] دوسری روایت یہ ہے کہ وہ لوگ اُس کنویں کے ارد گرد بیٹھے تھے کہ وہ زمین دھنس گئی اور وہ سب مع مکانات کے زیر زمین چلے گئے^[۴] تیسرا قول یہ ہے کہ وہ اُس کنویں کے پاس کی بستی میں رہتے تھے۔ اُن کا پتہ دینے کے لئے کنویں کا نام لیا گیا ہے۔^[۵] مثالیں پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ گزشتہ امتوں پر جس طرح عذاب نازل ہوا، اُس کے تذکرے دوسری قوموں کے سامنے پیش کیے گئے تاکہ وہ اس سے سبق لیں اور سمجھیں کہ ہم نے اس طرح کفر کیا اور بد اعمالیاں اختیار کیں تو ہم بھی عذاب میں گرفتار ہوں گے^[۶] پھر جب اُنہوں نے اس سے اثر نہیں لیا تو آخر ایسا عذاب آیا کہ وہ تہس نہس ہو گئے۔

وَلَقَدْ آتَوْنَا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِي أُمِطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ۖ أَفَلَمْ يَكُونُوا يَرُونَهَا ۖ بَلْ

كَانُوا لَا يَزُجُّونَ نُشُورًا ۝۳۰

’اور یہ گئے ہیں اُس بستی میں جس پر بری طرح کا میٹھ برسایا گیا تھا، تو کیا وہ اسے آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ کوئی حشر و نشر ہوگا۔‘

فریقین کی تفسیریں متفق ہیں کہ بستی سے مراد قوم لوط کی سرزمین ہے جس پر پتھروں کی بارش کا عذاب نازل ہوا تھا۔^[۷]

وَإِذَا رَأَوْكَ إِن يَتَّخِذُ وَنَكَ إِلَّا هُزُؤًا ۖ أَهَذَا الَّذِي بَعَثَ اللَّهُ رَسُولًا ۝۳۱ إِن كَادَ

لِيُضِلَّنَا عَنِ الْهَيْتِنَا لَوْلَا أَن صَبَرْنَا عَلَيْهَا ۖ وَسَوْفَ يَعْلَمُونَ حِين يَرُونَ

الْعَذَابَ مَنْ أَضَلُّ سَبِيلًا ۝۳۲

’اور جب وہ آپ کو دیکھیں گے تو بس آپ کا مذاق اڑائیں گے‘ کیا یہ وہ ہے جسے اللہ نے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے؟ وہ تو قریب تھا کہ ہمیں ہمارے خداؤں سے بھٹکا ہی دے۔ ’اگر ہم اُن پر استقلال کے ساتھ جے نہ رہتے، اور اُنہیں معلوم ہوگا جب عذاب آنکھوں سے دیکھیں گے کہ کون راستے سے زیادہ بھٹکا ہوا ہے۔‘

[۱] لان الانبياء يصدق بعضهم بعضاً..... فمن كذبوا احد منهم فقد كذب بهم جميعهم (تبیان)

[۲] رہنے والے کنویں کے (شاہ رفیع الدین)

[۳] کہتے ہیں کہ ایک امت نے اپنے رسول کو کنویں میں بند کر دیا پھر ان پر عذاب آیا، تب وہ رسول خلاص ہوا (منہج القرآن)

[۴] اسم ثبر ونبیہم شعیب و قبیل غبرو کانوا قعودا حولہا فاء بہارت بہم و منازلہم (جلالین)

[۵] رہنے والے کنویں کے (شاہ رفیع الدین)

[۶] ای کلابینا لہم ان العذاب نازل بہم ان لہم منواعن مقاتل (مجمع البیان)

[۷] ہی سدوم قریۃ قوم لوط (علی بن ابراہیم) ہی عظمیٰ قومی قوم لوط (جلالین) قریۃ قوم لوط امطر و بالحجارة (مجمع البیان).

ان کا رسول ﷺ کی ہدایت کو یہ کہنا کہ وہ ہمیں گمراہ کر دیتا، بالکل ویسی ہی دھاندلی ہے جو ”خرد کو جنون اور جنوں کو خرد“ کہنے یا سمجھنے میں ہوا کی ہے، چونکہ ایسوں کو قائل معقول کرنا عموماً بے سود ہوتا ہے، اس لئے خالق نے اُن کی بات کے مقابلہ میں صرف مستقبل کا حوالہ دیا ہے کہ جب عذاب سامنے آئے گا، تب سمجھیں گے کہ کون بھٹکا ہوا تھا؟ وہ جو ایمان اختیار کرتے ہیں یا یہ جو ایمان سے منحرف ہیں۔^[۱]

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ ۗ أَفَأَنْتَ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكِيلًا ﴿۳۳﴾ أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ
أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ ۗ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا ﴿۳۴﴾

”کیا آپ نے دیکھا ہے اُسے کہ جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنائے رکھا؟ تو کیا آپ اس کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں؟ یا آپ کیا ایسا سمجھتے ہیں کہ ان میں سے زیادہ تر سنتے یا سمجھتے ہیں؟ نہیں ہیں یہ مگر مثل چوپایوں کے بلکہ ان سے زیادہ گمراہ ہیں۔“

پست کردار انسانوں کا جانوروں سے بدتر ہونا:

چوپایوں کے مثل کردار میں ہیں جیسے اُن کے افعال صرف خواہشات اور جذبات کی بنا پر ہوتے ہیں، امتیاز حق و باطل سے بحث نہیں ہوتی، ویسے ہی یہ لوگ صرف جذبات کی رو میں بہتے اور خواہشات کے جھکڑوں میں اڑتے ہیں، امتیاز حق و باطل سے اُنہیں تو کوئی مطلب نہیں تو ان میں چوپایوں میں فرق ہی کیا ہوا؟ اور ”چوپایوں سے بدتر ہیں“ اس لئے کہ وہ جانور عقل و شعور رکھتے ہیں نہیں اور یہ کمبخت عقل و شعور کی طاقتیں رکھتے ہوئے ان سے کام نہیں لیتے پھر یہ کہ جانور بھی ان غذاؤں سے جو ان کے لئے مضر ہیں، طبعی طور پر پرہیز کرتے ہیں اور یہ جان بوجھ کر وہ باتیں کرتے ہیں جو اُن کے لئے ہلاکت دینا دین کی باعث ہیں۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۗ وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلَهُ سَاكِنًا ۖ ثُمَّ جَعَلْنَا
الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيلًا ﴿۳۵﴾ ثُمَّ قَبَضْنَاهُ إِلَيْنَا قَبْضًا يَسِيرًا ﴿۳۶﴾

”کیا تم نے نہیں دیکھا اپنے پروردگار کو کہ اُس نے کیوں کر سائے کو پھیلایا اور اگر وہ چاہتا تو تمہا ہوا کر دیتا، پھر ہم نے سورج کو اُس کا رہنما قرار دیا۔ پھر اسے اپنی طرف سمیٹا تھوڑا تھوڑا کر کے۔“

اُس کے مضمون کو عام سمجھنے کے ساتھ پھر بھی بعض حضرات ایسے مفرد مخاطب کا روئے خطاب رسول ﷺ ہی کی طرف لیتے ہیں^[۲] جو ہمارے نزدیک بلاوجہ ہے جس پر مختلف مقامات پر اسی تفسیر میں تبصرہ کیا جا چکا ہے۔

[۱] ای من اخطاء طريقا عن الهدى احمد امر المؤمنون (مجمع البيان)

[۲] يقول الله تعالى لنبيه محمد ﷺ متوجه الى جميع المكلفين المترى يا محمد ﷺ (تبيان)

سورج کو اُس کارہ نما قرار دیا یعنی سایہ سورج کے ادھر اُدھر ہونے سے گھٹتا بڑھتا ہے [۱] اب خواہ یہ ادھر اُدھر ہونا خود سورج ہی کی گردش ہو جو اب سے پہلے کا تصور تھا یا زمین کی گردش سے ہو جو اب کا مسلم الثبوت تصور ہے۔

”اگر وہ چاہتا تو اسے تھما ہوا کر دیتا“ یعنی وہ سایہ ایک حال پر رہتا، گھٹتا بڑھتا نہیں، یہ بھی ان میں سے کسی ایک تصور سے وابستہ نہیں ہے، بہر حال وہ چاہتا تو اس شے کو جس کی حرکت سے سایہ گھٹتا بڑھتا ہے، ساکن کر دیتا اور چونکہ سایہ کا گھٹتا بڑھتا ہوتا ہے اس کی حرکت سے ہے تو جب وہ شے ساکن ہو جاتی تو یہ ایک حال پر ٹھہر جاتا، نہ گھٹتا، نہ بڑھتا۔ [۲]

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ اللَّيْلَ لِبَاسًا وَالنَّوْمَ سُبَاتًا وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُورًا ﴿۳۷﴾

”اور وہ ہے جس نے تمہارے لئے رات کی پوشش بنائی اور نیند کو آرام اور دن کو چہل پہل بنایا“۔

اس سے ظاہر ہے کہ بعض والیان ملک اور رؤسا کا یہ دستور جو ہم نے دیکھا ہے اور ان کے پہلے شاید سلاطین روزگار کا ہوگا کہ وہ رات کو جاگتے اور دن کو سوتے تھے، یا کوئی اب ایسا کرے وہ اصولِ فطرت کے بالکل خلاف ہے۔

وَهُوَ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۗ وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً

طَهُورًا ﴿۳۸﴾ لِنُنْحِيَ بِهِ بِلْدَةَ مَدْيَنًا وَنُسْقِيَهُ مِمَّا خَلَقْنَا أَنْعَامًا وَأَنْاسٍ كَثِيرًا ﴿۳۹﴾

”اور وہ ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا خوش خبری دیتا ہو اس کی رحمت کے آگے آگے اور ہم نے آسمان سے پانی جو پاک اور پاک کرنے والا ہے تاکہ اس سے زندہ کریں مردہ زمین کو اور اسے پلائیں مخلوقات میں سے چوپایوں اور بکثرت آدمیوں کو“۔

پانی کا ذریعہ طہارت ہونا:

پانی کے لئے طہور کا لفظ قرآن میں آیا ہے اور زمین کے لئے حدیث کے لئے حدیث میں آئی ہے اس طرح کہ ارشاد حضرت رسالت ہے:

جعلت لي الارض مسجدا و طهورا:

میرے لئے زمین محلِ سجدہ اور طہور بنائی گئی۔

یہ طہور کا لفظ طہارت سے مبالغہ کے ساتھ ہے جس کے لفظی معنی تو زیادہ پاک کے ہوئے لیکن شیعہ سنی دونوں فریقوں کے یہاں اس

[۱] الظللة يتبع الدليل الذي هو الشمس كما يتبع السائر في المفادة الدليل (تبيين) یعنی بہر حال صفت کہ آفتاب تقاضا می کند می رود (فتح القرآن)

[۲] قادر علی تسکین الشمس حتی یبقی الظل ممدودا (مجمع البیان)

کے معنی مُطَهَّرِ يَتَّ كَاجِزءِ دَاخِل ہے جس کی بنا پر طہور کے معنی ہوں گے بجائے خود طاہر ہونے کے ساتھ دوسری چیزوں کو طاہر کرنے والا۔^[۱] یہ مفہوم اس لفظ سے کس طرح نکلتا ہے؟ یہ بحث شرح لمعہ سے لے کر جوہر الکلام تک فقہ کی استدلالی کتابوں میں کافی وضاحت کے ساتھ موجود ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيهِمْ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوا فَأَبَىٰ أَكْثَرُ النَّاسِ إِلَّا كُفُورًا ۝۵۱

اور ہم نے اسے ان کے درمیان طرح طرح سے پیش کیا ہے تاکہ وہ نصیحت قبول کریں، پھر زیادہ تر لوگوں نے نا شکرے پن کے سوا (کسی دوسرے راستے کے اختیار کرنے سے) انکار کیا۔

پہلی ہی نظر میں اس کا کوئی تعلق قبل کی آیت سے ہمارے ذہن میں نہیں آیا بلکہ صرفناہ کی ضمیر کا مرجع بلا غور و خوض ہمارے ذہن نے اس ہدایت یا تعلیم و تلقین اور نصیحت کو قبول کیا اور اس لئے ہم نے صرفناہ کا ترجمہ ”طرح طرح سے پیش کیا“ کے الفاظ میں کر دیا اور کچھ مترجمین و مفسرین اس سے منفق ملے^[۲] مگر اس کے برخلاف ایک تشریح اس آیت کی اسے قبل والے مضمون سے متعلق کرتے ہوئے اس طرح ہوئی ہے کہ صرفناہ کی ضمیر پانی کی طرف راجع ہے۔ اب معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے اس (پانی) کو ان کے درمیان مختلف صورتوں سے گردش دی۔^[۳] مگر اکثر نا شکرے پن سے کام لیتے ہیں کہ بارش کو ستاروں وغیرہ سے متعلق کرتے ہیں اور ہماری قدرت کی کار فرمائی کے منکر ہیں^[۴] مگر یہ تشریح ہمارے ذہن سے چسپاں نہیں ہوتی خصوصاً بعد کی آیات کو دیکھتے ہوئے لہذا ہم نے ترجمہ اس تفسیر کا تتبع نہیں کیا۔

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ نَذِيرًا ۝۵۲ فَلَا تُطِيعُ الْكُفْرِينَ وَجَاهِدْهُمْ بِهِ

جِهَادًا كَبِيرًا ۝۵۲

”اور اگر ہم چاہتے تو ہر گاؤں میں ایک عذاب الہی کی اطلاع دینے والا بھیجتے تو آپ کافروں کا کہنا نہ مانے اور اس کے ذریعہ سے اُن کے مقابلہ میں بہت بڑا جہاد کرتے رہیے۔“

ابھی تک انہیں ایک رسول کے آنے پر اتنا تعجب ہے، یہ تو اب حکمت الہی متقاضی ہوئی کہ اس رسول ﷺ کو تمام دنیا کے لئے اکیلا رسول بنا کر بھیجا جائے ورنہ اس کے پہلے تو ایک ایک وقت میں کئی کئی نبی ہوا ہی کیے تھے، اگر خدا چاہتا تو اب بھی ایسا ہی کرتا۔ اس میں حیرت و استعجاب کی کیا بات ہے۔

دوسرا رخ اس آیت کے مفہوم میں یہ سمجھا گیا ہے کہ یہ رسول ﷺ خدا پر ایک طرح سے اپنے خصوصی فضل و کرم کا اظہار ہے کہ ہم چاہتے تو ان کاموں کے لئے جو آپ کے ذمے میں بہت سے انبیاء بھیجتے اور کام تقسیم ہو جاتا مگر ہم نے آپ کو اُن تمام فرائض کا حامل بنایا ہے تاکہ

[۱] طہور ای طاہر امطہرا مز یلا للاحداث النجاسات مع طہارتہ فی نفسہ (تبیان) مطہرا (جلالین) پاک کرنے والا (شاہ رفیع الدین)

[۲] گوناگوں بیان کر دیم پند (شاہ ولی اللہ) طرح طرح سے بیان کیا ہم نے اُس کو (شاہ رفیع الدین)

[۳] قیل معنہا لا قسمناہ بینہم یعطی المطر (تبیان) صر فناہ ای المطر (مجمع البیان)

[۴] بحود التبعہ حیث قالوا امطرنا بنوع کذا (جلالین)

آپ کا درجہ اجر و ثواب میں بڑھے۔^[۱]

یہ معنی کچھ ہمارے دل کو لگتے نہیں ہیں۔ پہلا مطلب زیادہ ذہن نشین ہے۔

جاہد ہم بہ ”اس قرآن کے ذریعہ سے جہاد کرتے رہیے“ اس سے ظاہر ہے کہ یہ جہاد تلوار سے نہیں ہے بلکہ دلائل حق کو پیش کر کے باطل عقائد کو رد کرنے کا جہاد ہے جو علما کا کام ہوتا ہے۔^[۲]

وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ ۖ وَجَعَلَ

بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَجُزْأً مَّجْجُورًا ﴿۵۳﴾

”اور وہ ہے جس نے دریاؤں کو اکٹھا کیا ہے۔ یہ شیریں و خوش گوار ہے اور یہ نمکین کھاری ہے اور ان دونوں کے درمیان اس نے درمیانی پردہ اور مستقل رکاوٹ قائم کی ہے۔“

میٹھے اور کھارے پانی کے سنگم میں قدرتِ الہی کا ظہور:

یہ قدرتِ الہی کی کار فرمائی ہے ہر آدمی اس وقت بھی دیکھ سکتا ہے ہر اُس جگہ جہاں کسی ندی کا سمندر کے ساتھ اس طرح اتصال ہو کہ دونوں برابر برابر جاری ہوں جیسے وہ مقام جسے عراق کے راستے میں زائرین دیکھتے ہیں خلیج فارس سے دریائے دجلہ کے اتصال کا کہ وہاں کھاری اور میٹھا پانی دونوں کا ندھے سے کا ندھاملائے رواں ہیں اور نہ وہ کھاری اس میٹھے میں مخلوط ہو کر اس کی شیرینی میں خلل ڈالتا ہے۔ نہ یہ میٹھا اُس کھاری میں مل کر اُس کے کھاری پن میں کمی کرتا ہے۔ یہی قدرتی رکاوٹ ہے جسے قرآن نے ”برزخ“ اور ”جزا مججوراً“ سے تعبیر کیا ہے جو کوئی جسمانی رکاوٹ نہیں بلکہ صرف قانونِ خداوندی کی رکاوٹ ہے۔^[۳]

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا ۗ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا ﴿۵۴﴾

”اور وہ ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا تو اسے خوئی اور سسرالی رشتے کا مرکز بنایا اور تمہارا پروردگار بڑی قدرت والا ہے۔“

نسبتی رشتہ کے ساتھ ازدواجی رشتہ بھی تقاضائے فطرت:

یہاں ابتدائے آفرینش سے انسان کو نسب یعنی خوئی رشتہ اور صہر یعنی سسرالی رشتہ کا مرکز بنانا اس پر اہمیت ہے کہ رہبانیت یعنی ازدواجی رشتوں سے آزادی کی تعلیم فطرت کے تقاضوں کے خلاف ہے اور اسی لئے دین فطرت کے رہنما نے اعلان فرمایا کہ لا رہبانیت فی الا سلام اور نیز یہ کہ:

[۱] یعنی نبی کا آنا تعجب نہیں، اللہ چاہے پیغمبروں کی بہتات کر دے، ہرستی میں ایک نبی ہو (موضح القرآن)

[۲] فی هذا دلالة على ان من اجل الجهاد اعظمه منزلة عند الله سبحانه جهاد المتكلمين في حل شبهة المبطلين (مجمع البيان)

[۳] حجرا مججورا ای حراماً محجوراً مان یفسد الملح العذاب (مجمع البيان)

النكاح من سنتي فمن رغب عن سنتي فليس مني۔
شادی بیاہ میرے آئین کا جز ہے تو جو میرے آئین سے روگردانی کرے، وہ مجھ سے کوئی ربط نہیں رکھتا۔

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ۗ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلَىٰ رَبِّهِ

ظَاهِرًا ۝۵۵

”اور وہ عبادت کرتے ہیں اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیز کی جو انہیں نہ نفع پہنچاتی ہے اور نہ انہیں نقصان پہنچاتی ہے اور کافر

اپنے پروردگار کے خلاف پشت پناہی کرنے والا ہے۔“

کس کی پشت پناہی؟ بلا تکلف جو ذہن میں آتا ہے، وہ یہ کہ ایک کافر دوسرے کافر کی پشت پناہی کرتا ہے، اس طرح وہ اللہ کے مقابلہ

میں جتھ بندی کرتے ہیں لیکن بعض نے کہا ہے کہ یہ کافر شیطان کا پشت پناہ بنا ہے۔^[۱]

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝۵۶

”اور ہم نے نہیں بھیجا ہے آپ کو مگر خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا۔“

اس حصہ کا مقصد وہی ہے جو ما علی الرسول الا البلاغ (نہیں پیغمبر پر مگر تبلیغ کر دینا) کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کا کام

زبردستی لوگوں کو راہ راست پر لانا نہیں ہے۔

قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِلَّا مَنْ شَاءَ أَنْ يَتَّخِذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ۝۵۷

”کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس پر کوئی معاوضہ نہیں مانگتا مگر جو چاہے کہ اپنے پروردگار کی طرف راستہ بنائے۔“

اجر رسالت جو طلب ہو اللہ کی طرف پہنچنے کا ذریعہ ہے:

ہر نبی نے مطلق طور پر اجر کی نفی کی ہے۔ کہیں کوئی ”اجر“، ”مگر“، نہیں ہے لیکن ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نفی اجر میں یہاں بھی

ایک ”مگر“ کی لفظ لگی ہوئی ہے، اسے ملائے قُلْ لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ (سورہ شوریٰ ۲۳) کے ساتھ کہہ دیجئے

کہ میں تم سے اس پر کوئی معاوضہ نہیں مانگتا مگر ذوی القربیٰ کی محبت، تو نتیجہ نکلے گا کہ وہ ”ذوی القربیٰ“، جن کی محبت اجر رسالت ہے اللہ کی

طرف پہنچنے کا راستہ اور اُس کی جانب سے خلق خدا کے لئے وسیلہ ہیں اور اب تیسری آیت میں جو صراحۃً ”سوال اجر“ کا اثباتی انداز میں اقرار

کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ:

مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ (سبا۔ ۴۷) میں نے جو تم سے اجر مانگا ہے، وہ تو تمہارے ہی لئے ہے۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اجر جس کی تمام انبیائے نے نفی کی ہے وہ وہ ہے جس کا فائدہ اجر طلب کرنے والے یعنی پیغمبر کی طرف

راجع ہو۔ یہی وجہ ہے جو بلندی عمل پر اثر انداز ہوتا ہے، اس قسم کا کوئی اجر ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی طلب نہیں فرمایا، انہوں نے حکم خدا سے جو

[۱] معین اللہ شیطان بطاعتہ (جلالین) قال الحسن و عجاہد و ابن زید: یطایر الشیطان علی معصۃ اللہ (تبیان)۔

چیز بطور اجر طلب فرمائی، وہ وہ ہے جو خود ان کے مقصد رسالت کا جزء ہے یعنی خلق خدا کی ہدایت اور ان کے لئے سامان نجات کی فراہمی اور وہ ”ذوی القربی کی محبت“ انہی مفادوں کی حامل ہے، اس لئے اس اجر کا سوال پیغمبر ﷺ کے عمل کی بے غرضی پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهِ ۗ وَكَفَىٰ بِهِ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ
خَبِيرًا ۝۵۸ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ
اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۗ الرَّحْمٰنُ فَسَلِّ بِهٖ خَبِيْرًا ۝۵۹

”اور بھروسا کیجئے اُس زندہ پر جو کبھی مرنے والا نہیں اور اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجئے اور اپنے بندوں کے گناہوں سے اُس سے زیادہ باخبر کون ہوگا؟ وہ جس نے آسمانوں اور زمین اور اُن کے درمیان میں جو کچھ ہے سب کو چھ دن میں پیدا کیا۔ پھر عرش پر جلوہ گر ہوا، وہی رحمن ہے اس کے متعلق کسی باخبر آدمی سے دریافت تو کرو۔“

کوئی کسی پر بھروسا کرے تو اندیشہ یہ ہوگا کہ ایک وقت میں ہو سکتا ہے یہ مدد کرنے والا دنیا سے اٹھ جائے تو پھر کون مدد کرے گا؟ مگر اللہ کا بندہ جو اللہ پر بھروسا کرتا ہے، اُسے اندیشہ کبھی نہیں اس لئے کہ جس پر اُس کو بھروسا ہے، اس کی حیات لازوال ہے جس پر موت کی دسترس نہیں۔

کَفَىٰ بِهٖ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ خَبِيْرًا کے لفظی معنی تو یہ ہوئے کہ ”کافی ہے وہ اپنے بندوں کے گناہوں پر بحیثیت باخبر کے، مگر اس مفہوم کے لئے اُردو زبان میں ہمارے خیال میں وہی الفاظ ہیں جن کے ساتھ ہم نے ترجمہ کیا ہے یعنی ”اُس سے زیادہ باخبر کون ہوگا؟“

اس کے بعد چونکہ مشرکین عرب رحمن کے لفظ سے وحشت کرتے تھے اور اس بنا پر قرآن میں طرح طرح سے رحمن کے لفظ سے ان کی وحشت دور کی گئی ہے چنانچہ ایک طرف ہر سورہ کے ساتھ بسم اللہ کی آیت اتاری جس میں اللہ کا وصف ”رحمن“ قرار دے کر رحیم کے ساتھ توصیف کی تاکہ انہیں محسوس ہو کہ رحمن وہی اللہ ہے اور اس کے مفہوم میں (ہمہ گیری کے وصف کے اضافہ کے ساتھ سہی) وہی ”رحمت“ ہے جو رحیم کے وصف میں ہے، کوئی نئی چیز نہیں ہے لہذا اس کو یہاں بتایا جا رہا ہے کہ رحمن کوئی اور نہیں ہے، وہی ہے جو خالق کائنات ہے اور اسی کا پس منظر وہ ہے جسے صاف طور پر اس کے بعد والی آیت میں پیش کیا گیا ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اسْجُدُوا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۚ أَنَسْجُدُ لِمَا تَأْمُرُنَا
وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ۝۶۰

”اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ رحمن کو سجدہ کرو تو وہ کہتے ہیں کہ یہ رحمن کیا چیز ہے؟ کیا جس چیز کو تم کہو ہم سجدہ کرنے لگیں اور اس سے اُن کی وحشت میں اضافہ ہوتا ہے۔“

یہی اُن کی جہالت اور یوں کہا جائے کہ لکیر کا فقیر ہونا ہے جس میں اکثر عوام مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ لفظوں کے استعمال میں بھی ”تقلید آباء“ سے ہٹنا نہیں چاہتے، وہ تھی جس کے لئے قرآن نے اپنی ایک مہم یہ بنالی کہ وہ اللہ کے ساتھ ساتھ لفظ ”الرحمن“ سے بھی انہیں مانوس بنائے اور ان

کی اس وحشت کو بہر صورت دور کرے۔ یہ چیز اس آیت میں اور اس کے پہلے اور اس کے بعد کی آیات میں برابر کارفرما ہے۔

تَبَارَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُنِيرًا ﴿٦١﴾

”قائم و دائم ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور ان میں روشن چراغ اور چمکتا ہوا چاند قرار دیا۔“

”روشن چراغ“ سے مراد آفتاب ہے جس کے لئے دوسری جگہ **وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَاجًا ﴿٦٢﴾** (سورہ نباء۔ ۱۳) اور تیسری جگہ صاف

طور پر **جَعَلْنَا الشَّمْسُ سِرَاجًا ﴿٦٣﴾** کہا گیا ہے۔ (سورہ نوح)

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنۢ بَدَا لَهُ يُدۡرِكُ أَوۡ آرَادَ شُكُورًا ﴿٦٤﴾

”اور وہ ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین بنایا اس کے لئے جو نصیحت قبول کرے یا شکر گزار

ہونا چاہے۔“

دوسری جگہ اس نعمت کی صاف لفظوں میں تشریح کی ہے کہ اگر دن ہی دن ہوتا تو تم کیسے بے چین ہوتے اور اگر رات ہی رات ہوتی تو

کیسے پریشان ہوتے۔ اُس کی بڑی نعمت ہے کہ ندرات ہی یکساں طور پر قائم رہتی ہے اور نہ دن ہی برقرار۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ

قَالُوا سَلَامًا ﴿٦٥﴾ وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَقِيَامًا ﴿٦٦﴾ وَالَّذِينَ يَقُولُونَ

رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۚ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿٦٧﴾ إِنَّهَا سَاءَتْ

مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا ﴿٦٨﴾ وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ

ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿٦٩﴾ وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي

حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ ۗ وَمَن يَفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ أَثَامًا ﴿٧٠﴾ يُضَعَّفُ لَهُ

الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيُحْلَدُ فِيهِ مَهَانًا ﴿٧١﴾ إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا

صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿٧٢﴾ وَمَن

تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا ﴿٧٣﴾ وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ ۗ

وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا ﴿٧٤﴾ وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يُخِرُّوا

عَلَيْهَا صُمًّا وَهُمْ كَوٰمُونَ ﴿٧٥﴾ وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَرْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا

فُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا ﴿٥٧﴾ أُولَٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا

وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا ﴿٥٨﴾ خُلِدِينَ فِيهَا ۗ حَسَنَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا ﴿٥٩﴾

”اور رحمن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر آہستہ (قدم رکھ کر) چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے مخاطب کرتے ہیں تو وہ سلامتی کی دعا دیتے ہیں اور جو پروردگار کے لئے رات گزارتے ہیں سجدہ اور قیام میں اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارے پروردگار! دررکھ ہم سے دوزخ کے عذاب کو یقیناً اُس کا عذاب وہ ہے جس پیچھا چھڑانا مشکل ہے وہ بہت برا ٹھکانا اور جگہ ہے اور وہ کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ شاہ خرچی زیادہ کرتے ہیں اور نہ کنجوس اور وہ اس کے بیچ میں اعتدال کے درجہ پر ہوتا ہے اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور خدا کی دہائی نہیں دیتے اور اُس نفس کی جس کی اللہ نے حرمت قرار دی ہے ناحق جان نہیں لیتے اور زنا کاری نہیں کرتے اور جو ایسا کرے گا، وہ بڑے گناہ کا مرتکب ہوگا، اُسے روز قیامت دونوں سزا دی جائے گی اور اُس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ذلیل بنا کر رکھا جائے گا، سوا اُس کے کہ جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک اعمال کرے اور یہ وہ ہیں جن کی غلطیوں کو اللہ بدل دیتا ہے نیکیوں کے ساتھ اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان اور جو توبہ کرے گا اور نیک اعمال کرے گا تو وہ پورے طور پر اللہ سے لو لگائے گا اور وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب لغو باتوں کی طرف گزر رہتا ہے تو اپنے شان و وقار کو لئے ہوئے (دامن بچائے) گزر جاتے ہیں اور وہ کہ جب اُنہیں ان کے پروردگار کی آیات کے ذریعے سے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ بہروں اور اندھیروں کی طرح منہ کے بھل گرنہیں پڑتے اور وہ جو کہتے ہیں کہ پروردگار! ہمیں عطا کرنا ہماری بیویوں اور بچوں کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک اور ہمیں پرہیزگاروں کا پیش رو بنا۔ یہ وہ ہیں جنہیں ان کے صبر و تحمل کے صلہ میں بہشت میں اونچا درجہ ملے گا اور وہاں اُن سے سلام اور آداب و احترام کے ساتھ پیش آیا جائے گا جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، بہت اچھا ہے وہ مقام اور ٹھکانا رہنے کا۔“

اللہ کے بندوں کی شان:

ذرا اس طویل سلسلہ اوصاف کا محل و رود دیکھے جس میں زندگی کے تمام شعبوں میں مثالی کردار کا نمونہ پیش کیا گیا ہے، یہ سب رحمن کے تعارف میں ہے جس سے مشرکین عرب وحشت محسوس کرتے تھے، پہلے رحمن کا تعارف اُس کی قدرت کے کرشموں کے ذریعے کیا گیا کہ وہی تو وہ ہے جس نے آسمان و زمین پیدا کیے۔ وہی تو وہ ہے جس نے رات اور دن کا نظام قائم کیا اور اب اُس کا وہ تعارف ہے جو اُس کے بندوں کا مثالی کردار دکھلا کر کیا جا رہا ہے کہ دیکھو! رحمن وہ ہے جس کے بندے اس شان کے ہوتے ہیں۔

بس یہی ہم سے اس دور میں اور ہر دور کے مسلمانوں سے اُس دور میں اسلام کا مطالبہ ہے کہ وہ اس شان کے حامل ہوں کہ اُنہیں دکھا کر اُن کے معبود حق کا تعارف کیا جاسکے کہ دیکھو اُس خدائے واحد کہ دیکھو! خاتم الانبیاء کے ماننے والے اس شان کے ہوتے ہیں اور اگر یہ معیار برحق ہے اور جب قرآن نے اُسے پیش کیا ہے تو اس کے برحق ہونے میں شبہ ہی کیا ہو سکتا ہے؟ تو پھر اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں اور اپنے

کو شیعہ علیؑ بلکہ امامیہ اثنا عشریہ میں محسوب ہونے والوں پر ذمہ داری زیادہ ہے کہ وہ اپنا کردار ایسا پیش کریں کہ خود مسلمانوں کو بھی دکھایا جاسکے کہ آل محمد ﷺ کے ماننے والے علیؑ کی رہبری قبول کرنے والے اور بارہ ۱۲ معصوم رہبروں کی پیغمبر خدا ﷺ کے بعد پیروی کرنے والے اس شان کے ہوتے ہیں۔ کیا ہم اس معیار پر پورے اترتے ہیں؟ افسوس اور ہزار افسوس۔

قُلْ مَا يَعْبُوْا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دَعَاؤُكُمْ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَمَانٍ
”کہیے کہ میرا پروردگار تمہاری پرواہ نہیں کرتا اگر تم دعائے مانگو، اب تم نے جھٹلایا ہے تو اس کے نتائج تمہیں بھگتنا ہوں گے“۔

مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے کے بعد بھی اگر تمہاری اس کی بارگاہ میں دعا، التجا نہ ہو تو اس کی خصوصی رحمتیں اکثر متوجہ نہیں ہوتیں، چہ جائیکہ تم تو انکار و تکذیب سے کام لے رہے ہو، اب تو تمہیں عذاب کے سوا کوئی اور توقع رکھنے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔
یہ ہمارا ترجمہ اور تشریح ایک تفسیر کے مطابق ہے [۱] مگر علامہ طبرسی نے اس کے بجائے دوسرے کئی معنی نقل کیے ہیں:
ایک یہ کہ اسے تمہیں حق کی طرف دعوت دینا نہ ہوتا تو تمہیں کوئی اس کا حق نہ تھا کہ اسے تمہاری پرواہ ہو۔ اس طرح دعاء کی اضافت مفعول کی طرف ہوگی۔

دوسرے یہ کہ اگر تم اللہ کو خدا نہ کہو یعنی اس کی خدائی نہ ہو تو وہ تمہاری کوئی پرواہ نہ کرے گا۔
تیسرے یہ کہ اگر تمہارا بتوں کی دہائی دینا نہ ہوتا یعنی تم مشرک نہ ہوتے تو اسے تمہاری کوئی پرواہ نہ ہوتی یعنی وہ تمہیں بتلائے عذاب کرنے کا ارادہ نہ کرتا۔ ایک اور چوتھے ۴ معنی بلخی صاحب کی طرف منسوب ہیں کہ اگر تم لوگ باہم ایک دوسرے کو شرک اور گمراہی کی طرف دعوت نہ دو تو اللہ تم سے کیا مطلب یعنی وہ تمہیں سزا کیوں دے؟ ہماری نظر میں یہ سب اقوال خلاف ظاہر ہیں اور جس مفہوم کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا ہے، اس کی تائید میں معصوم ﷺ کا ارشاد بھی موجود ہے۔ [۲] لہذا قابل ترجیح وہی ہے۔

[۱] لو كان دعاءوكم اياتا في الشدا ئد فيكشفيها (جلالين) اگر نباشد عبادت شما (شاه ولی اللہ) اگر نہ ہوتی التجا تمہاری (شاه رفیع الدین)

[۲] روى العياشى باسناداه عن بريدين معوية العجلي قال قلت لابي جعفر عليه السلام كثرة القراء افضل ام كثرة الدعاء قال كثرة الدعاء افضل وتر هذا الآية (مجمع البيان)